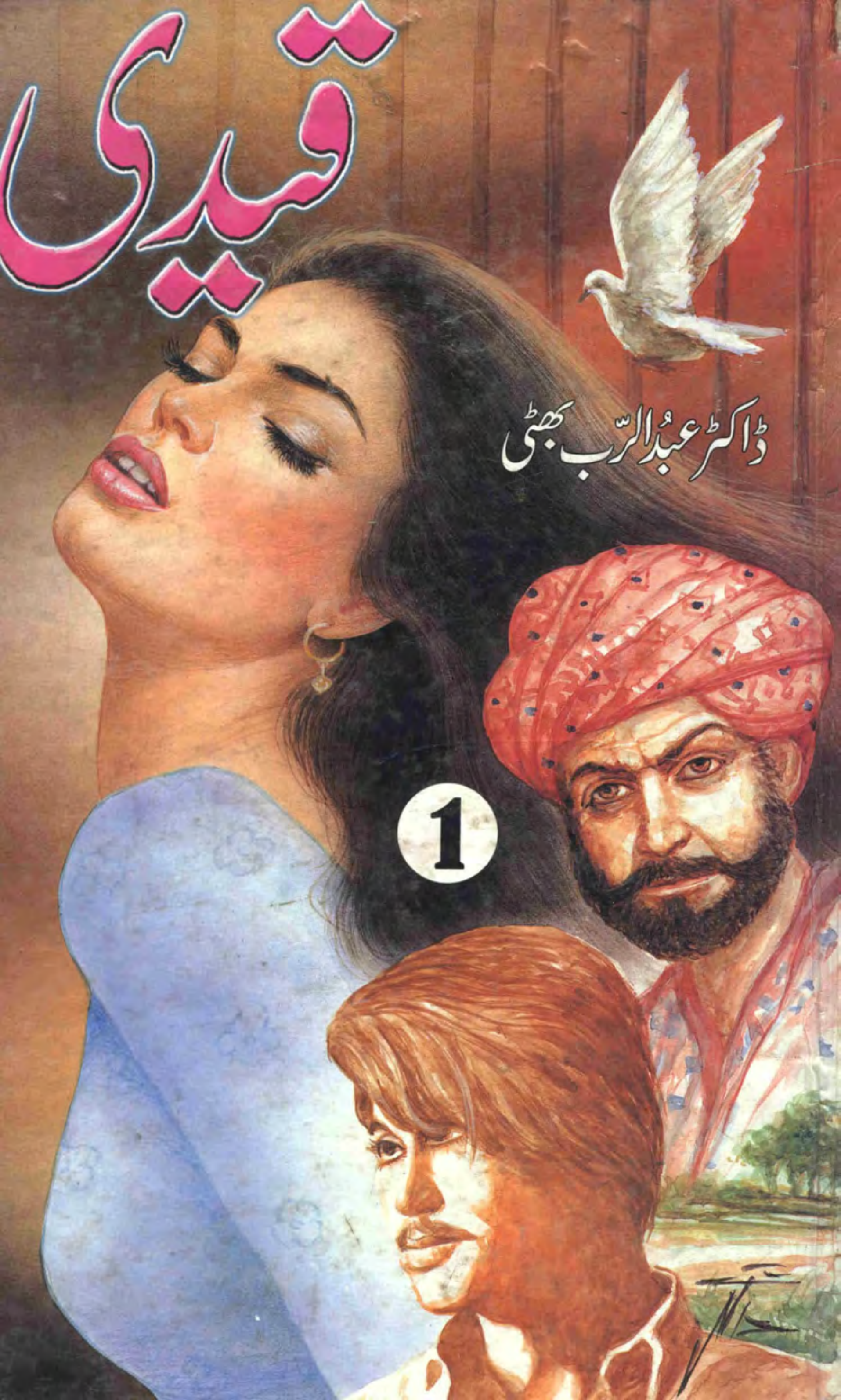

قیدی
ڈاکٹر عبدُالرّب بھٹی
1

اس عورت کے انداز میں آج بھی ویسا ہی والہانہ پن تھا۔ وہی بے تابانہ شدت .... اور ایک زخمی سی بے نام تڑپ تھی، جو میں آج سے نہیں بلکہ اپنے بچپن سے ہی محسوس کرتا اور دیکھتا آیا تھا۔
یہ عورت کون تھی؟ اور اس کے والہانہ پن میں، اس کی بے تابانہ شدت اور تڑپ میں میرے لئے کوٹ کوٹ کر ممتا جیسی محبت کیوں بھری رہتی تھی؟ یہ میں نہیں جانتا تھا۔
جب میں چھوٹا تھا تو ماموں حیدر گل مجھے اپنی گود میں یہاں لایا کرتے تھے۔ اس وقت میں بالکل معصوم بچہ تھا مگر آج جبکہ میں گیارہ بارہ سال کا ہونے کو تھا تو مجھے اب بھی دھندلا دھندلا سا یاد تھا کہ میں اس عورت کا غمگسار چہرہ اپنے بچپنے سے ہی دیکھتا آ رہا تھا۔ اسی طرح .... آنسوؤں سے تر، بجھا ہوا، غمگین چہرہ اور جسے میں ہوش سنبھالتے ہی آہنی سلاخوں کے پیچھے ہی دیکھتا آیا تھا۔
وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں اپنے ماموں حیدر گل کی انگلی پکڑ کر یہاں آنے لگا تو میرے معصوم ذہن میں اس دکھی دکھی سی عورت کے متعلق کئی سوال ابھرتے تھے مگر وہ معصومانہ سوال میرے ننھے ذہن تک ہی محدود رہتے تھے۔ ابھی شاید میں ان کا اظہار کرنے کی عمر تک نہیں پہنچا تھا۔ لیکن ایسا بھی ہوتا تھا کہ یہی سوال میرے معصوم ذہن میں حیرت بن کر ابھرتے اور پھر جلد ہی محو بھی ہو جاتے۔ کیونکہ میرا اس عورت کے ساتھ ملاقات کا عرصہ بہت محدود رہتا تھا۔ اس کے بعد ماموں حیدر گل اس عجیب گھٹن زدہ، خاموش، بے کیف اور اُداس ماحول سے دوبارہ واپس گھر لے آتے تھے۔
اس عمر میں ماموں حیدر گل سے میں نے اس سیلن زدہ ماحول سے متعلق جو پہلا سوال پوچھا تھا، وہ یہ تھا۔
"ماموں!........ یہ کون سی جگہ ہے؟"
ماموں نے مجھے اس سوال کا جتنا مختصر جواب دیا تھا، وہ اتنا ہی مشکل تھا، جو میں اس وقت نہیں سمجھ سکا تھا۔ ہاں البتہ اب مجھے اس عجیب و غریب جگہ پر آنے سے وحشت سی ضرور ہونے لگی تھی۔ اس جگہ ایک جیسا ہی ماحول .... جیسے وقت کو موت آ گئی ہو۔
سچی بات تو یہ تھی کہ مجھے اب اس اجنبی عورت سے بھی حد درجہ بیزاری اور کوفت ہونے لگی تھی اور اس بیزاری نے از خود اس فطری سوال کو جنم دیا تھا جو میں نے چڑ کر ماموں سے پوچھا تھا۔
"ماموں!........ یہ عورت کون ہے؟"
"یہ عورت تمہاری ماں ہے۔" حسب عادت ماموں نے مجھے مختصر جواب دیا۔
"ماں .... وہ کیا ہوتی ہے؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا تھا۔ ماموں نے ایک سسکاری بھری اور گھائل لہجے میں بولے۔
"ماں .... اس کو کہتے ہیں جس نے تمہیں جنم دیا۔"

''مگر ماموں! ماسٹر صاحب تو کہتے ہیں کہ ہمیں اللہ میاں نے پیدا کیا ہے؟''

''ہاں ......تمہارے ماسٹر صاحب صحیح کہتے ہیں ......ہمیں اللہ میاں نے ہی پیدا کیا ہے ہم سب کو......مگر ایک ماں کے ذریعے......''

تب اچانک مجھے ماں کے عنوان سے کچھ یاد آیا اور میں چہک کر بولا۔

''اچھا...... ماموں! جیسے عبداللہ کی ماں ہے اور ......اور جیسے نومی اور عالی کی ماں ہے؟''

''ہاں بیٹا! یہی ماں ہوتی ہے۔''

''لیکن ماموں! عبداللہ، نومی اور عالی کی مائیں تو ہر وقت ان کے پاس، ان کے ساتھ رہتی ہیں، ان کے گھروں میں رہتی ہیں، انہیں نہلاتی ہیں، انہیں کپڑے پہناتی ہیں، ان کے بالوں میں کنگھا کرتی ہیں، انہیں اپنے ساتھ سلاتی ہیں اور روٹی بھی ......اپنے ساتھ......''

''بس......بس کر میرا بچہ! بس کر۔'' ماموں میرے سوالات کی بوچھاڑ سے یکدم گھبرا جاتے۔ ان کا گلا شدتِ جذبات سے رندھ جاتا اور میں سہم کر خاموش ہو رہتا۔

پھر وقت گزرنے لگا تو مجھے ماموں سے تو نہیں البتہ گاؤں میں اپنے ساتھ کھیلتے کودتے بچوں سے رفتہ رفتہ پتہ چلنے لگا کہ میری ماں جس سلاخوں والی جگہ میں رہتی ہے، اسے جیل کہا جاتا ہے۔

''ماموں!......جیل کیا ہوتی ہے؟'' ماموں خاموش رہتے تو میں اپنے ہم جولیوں سے سنا ہوا جواب دہرا کر پوچھتا۔ ''ماموں! جیل ایک گندی جگہ ہوتی ہے نا، جہاں گندے اور برے لوگوں کو بند کر دیا جاتا ہے......تو کیا میری ماں بھی گندی ہے؟''

''نہیں بیٹا! تمہاری ماں گندی نہیں ہے۔ گندی نہیں ہے وہ۔ اسے گندا کہنے والے خود گندے ہیں۔'' ماموں غم سے چور لہجے میں بولتے۔

''تو پھر......تو پھر......عبداللہ اور نومی مجھ سے یہ کیوں کہتے ہیں کہ تمہاری ماں گندی ہے اسی لئے تو اسے جیل میں بند کر دیا ہے۔''

''جھوٹ بولتے ہیں وہ......تم ان کی باتیں نہیں سنا کرو۔''

ماموں کی طرف سے میں بالکل مایوس ہو گیا۔ وہ میرے کسی بھی سوال کا تسلی بخش جواب نہیں دے پائے تھے۔ پھر میں نے ہی چپ سادھ لی تھی اور میری زندگی کا یہی وہ دور تھا جب میری نفسیات، میرا دل میرا ذہن اور تمام احساسات شکست و ریخت کا شکار ہونے لگے۔ میں حد درجہ حساس ہوتا چلا گیا اور چپ چاپ سا رہنے لگا۔ یہاں تک کہ میں اُپنے خول میں بند ہو کر رہ گیا۔

ماموں حیدر گل مجھے تقریباً ہر تیسرے چوتھے روز جیل میں اس عورت سے ملوانے کے لئے لے جاتے رہتے تھے۔ ایک تنگ و تاریک، گھٹن آمیز اور ننگی اینٹوں والے کمرے میں مجھے اور ماموں کو اس عورت سے ملوایا جاتا تھا۔ دو پولیس والے میری ماں کو لے کر آتے تھے۔ اب میں اس کو ایک بے نام سی حیرت سے نہیں بلکہ بڑے غور سے دیکھا کرتا تھا۔ وہ ایک گورے چٹے رنگ اور تیکھے نقوش والی بڑی دبنگ عورت نظر آتی تھی۔ قد بھی اس کا نکلتا ہوا تھا۔ بال بھی لمبے تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ مجھ سے تو وہ ممتا بھرے لہجے میں بولتی تھی مگر میں نے اکثر دیکھا اور محسوس کیا کہ جب وہ ماموں حیدر گل سے بات کرتی تو اس کے لہجے کی ممتا بھری گرمی جلتی سلگتی آگ میں بدل جایا کرتی تھی۔ بعض اوقات تو وہ ماموں حیدر گل سے اس قدر غضب ناک لہجے میں عجیب و غریب گفتگو کرتی تھی کہ خود میں سہم جایا کرتا تھا۔

''گل!......میرا نادر اب بڑا ہو گیا ہے ......اسے حقیقت بتا دو تو اچھا ہے۔'' ایک روز اس عورت نے بڑے پیار سے میرے سر کے بال اپنی نرم انگلیوں سے سہلاتے ہوئے ماموں سے کہا۔

''ابھی اس کا ذہن کچا ہے شبینہ!...... یہ بچہ ہے ابھی۔'' ماموں ہولے سے میری طرف ایک نظر ڈال کر اس عورت سے کہتے۔ مجھے اس عورت کا نام ذہن نشین ہو گیا۔

''نہیں گل!......'' وہ عورت ماموں کو دیکھ کر تیز لہجے میں کہتی۔ ''یہی وہ عمر ہوتی ہے جب دھیرے دھیرے کوئی بات اندر پروان چڑھتی ہے اور بعد میں ایک عزمِ صمیم کا تناور درخت اُگاتی ہے۔ ورنہ جب اِدھر اُدھر سے اس کو حقیقت کا علم ہوگا تو ہو سکتا ہے اس کا دل میری طرف سے خراب ہو جائے۔''

اس عورت کی بات پر ایک بار پھر میرے چھوٹے سے ذہن میں سوالوں کے تھوہر اُگ آئے اور میں حیرت سے سوچتا۔

'آخر وہ کیا حقیقت تھی، جو اس عورت کی طرف سے میرا دل خراب کرنے کا باعث بنتی؟'

اس طرح مجھے مزید کرید لگ گئی۔ میں نے اب ماموں سے سوالات پوچھنا ترک کر دیا تھا مگر یہ سن کر مجھے مزید شہ مل گئی تھی کہ مجھے ہم جولیوں سے اپنے سوالات کے جوابات مل سکتے تھے۔ ماموں خاموش رہے۔ اس کے بعد وہ مجھے واپس گھر لے آئے۔

ماں کے خلا کے ساتھ ساتھ میرے ننھے دل و دماغ میں باپ سے متعلق بھی سوال ابھرتا کہ میرا باپ کون تھا؟ کہاں تھا؟ مگر ماموں حیدر گل نے تو حسب دستور چپ شاہ کا روزہ رکھ لیا تھا۔ وہ شاید میرے بڑے ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک بار تو میرے جی میں آئی کہ میں خود ہی اس عورت ''شبینہ'' سے پوچھ لوں۔ آخر وہ کون تھی؟ اگر وہ میری ماں تھی تو میرے ساتھ کیوں نہیں رہتی؟ یہاں جیل کے سیلن زدہ ماحول میں آہنی سلاخوں کے پیچھے کیوں قید تھی؟ ......اور ......اور وہ کیا حقیقت تھی، جواب تک مجھ سے چھپائی جا رہی تھی۔ مگر باوجود کوشش کے میں اس عورت سے کچھ بھی نہ پوچھ سکا۔

❄ ❄ ❄

ماموں حیدر گل نے میری پرورش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ انہوں نے مجھے شہر کے ایک اچھے اسکول میں داخل کروا رکھا تھا۔ میں ساتویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ میرا اسکول ہمارے گاؤں سے تقریباً آٹھ، دس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ فضل چاچو جو ہمارا پرانا خدمت گار تھا، وہ مجھے روزانہ ایک سفید رنگ کی جیپ میں اسکول لے جایا کرتا تھا اور ٹھیک دو بجے چھٹی کے وقت دوبارہ لینے آ جاتا۔

صغراں......چاچا فضل کی بیوی تھی اور میں نے شروع ہی سے خود کو اس کی گود میں پایا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں پہلے پہل اسے ہی اپنی ماں سمجھتا تھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کی خاتون تھی۔ میری ماں سے بھی بڑی عمر کی تھی۔ وہ مجھ سے محبت بھی بہت کرتی تھی۔ فضل چاچا بھی مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ میں نے باری باری ان دونوں سے بھی اپنی ماں اور اپنے باپ کے متعلق کچھ پوچھنے کی کوشش کی تھی مگر جواب ندارد...... وہ مجھے بڑی خوب صورتی سے ٹال دیا کرتے تھے۔ یقیناً ماموں نے ہی انہیں مجھے کچھ بتانے سے منع کر رکھا تھا۔

ہمارا گاؤں ڈونگا گلی اور نتھیا گلی کے وسط میں ایک خوب صورت اور سرسبز وادی میں تھا جس کے چہار اطراف چیڑ اور صنوبر کے لانبے لانبے درختوں کا گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ ان کے ساتھ ساتھ زرد آلو، ناشپاتی اور آلوچے کے پیڑوں کا سلسلہ بھی دور تک چلا جاتا تھا۔ ان کے عقب میں دور سربفلک پہاڑی چوٹیاں، پُرغرور شہزادیوں کی طرح برف کا تاج سجائے نظر آتیں۔ پہاڑی مقام ہونے کی وجہ سے یہاں موسلا دھار بارشوں کا سلسلہ بھی لگا رہتا تھا۔ عموماً یہاں دسمبر میں برف باری ہوتی تھی۔ گنگناتی آبشاریں

جلترنگ بجاتے جھرنے اس وادی کا قدرتی حُسن دوبالا کئے دیتے تھے۔ بارشوں کے بعد تو یہ حُسن مزید نکھر جاتا۔ جنگلی گلاب، خوشنما پھول سب مہک اٹھتے۔ کشمیر کی وادیوں سے آنے والے ہمالیائی سنہولے (سنہرے مرغ) اپنے نیلے، سنہرے اور سرخ پنکھ نما پر پھیلائے ترائیوں میں اپنی کلغیوں والے خوبصورت سر اٹھائے سرمستی کے عالم میں گنگناتے، اُڑتے رہتے تھے۔ پھر جب سنہرا سورج پہاڑیوں کی سربفلک چوٹیوں پر آن نکلتا تو جیسے ہر سُو نارنجی، نیلے، پیلے، سرخ اور جامنی رنگوں کی خوب صورت قوسِ قزح بکھرنے لگتی۔ غرض فطری حُسن سے مالا مال ہمارا گاؤں قدرت کی صناعی کا ایک جیتا جاگتا شاہکار تھا۔

ہمارا پختہ اینٹوں والا مکان، گاؤں کی آبادی سے ذرا ہٹ کر خاصی بلندی پر واقع تھا۔ یہاں سے یہ سب نظارے اور بھی دلفریب نظر آتے تھے۔ ہمارا قرمزی اینٹوں والا مکان بہت کشادہ اور خوبصورت تھا۔ ایک باغیچہ بھی تھا جس میں چنبیلی کے پودے اور بوگن ویلیا کی خوش رنگ پھولوں والی بیلیں بھی لگی ہوئی تھیں۔ بید مشک اور شاہ بلوط کے پیڑ بھی تھے۔ دیواروں سے ملحقہ آئیوری کی بیلیں بھی جڑی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ ہمارے پہاڑی مکان کے سامنے ذرا دور ڈھلوان چھتوں والے ریسٹ ہاؤس کی جھونپڑی نما خوبصورت عمارتیں چیڑ کے درختوں کے عقب سے جھلکتی صاف نظر آتی تھیں۔

ماموں حیدر گل کے پاس بارہ بور کی دو عدد بندوقیں بھی تھیں۔ وہ شکار کے بھی رسیا تھے۔ ان کے ساتھ کبھی کبھار میں بھی چلا جاتا تھا۔ اس موقع پر فضل چاچا ہمیشہ ان کے ہمراہ ہوتے۔ ماموں ایک بندوق ان کے حوالے بھی کر دیتے۔ چھرے والے کارتوسوں کے علاوہ سکے کی گولیاں بھی رکھتے تھے۔ ان کی بارہ بور کی ڈبل بیرل بندوق کی ایک نال میں چھروں والا کارتوس ڈلتا تھا جبکہ دوسری نال میں سکے والی گولی۔ یہ اس احتیاط کے پیشِ نظر ڈالی جاتی تھی کہ کبھی کبھار چھوٹے شکار جانوروں اور پرندوں کے علاوہ بھیڑیئے، ریچھ اور تیندوے جیسے خونخوار جانوروں سے بھی پالا پڑ جایا کرتا تھا۔ ماموں حیدر گل عموماً جنگلی خرگوشوں، بکروں (آئی بیکس) اور سنہرے مرغوں کا شکار کرتے تھے۔ سنہرے مرغ (سنہولے) کا گوشت کم از کم تین کلو کے قریب نکلتا تھا۔ ماموں بڑی احتیاط سے ان کی کھالیں اتار کر چاچا فضل کو دے دیتے۔ وہ انہیں مری یا ایبٹ آباد لے جا کر کاریگر کو دے دیتے جو ان میں مصالحہ لگا کر بھس بھر دیتا اور دوبارہ انہیں ٹانگوں پر کھڑا کر دیتا۔ بعد میں شوقین اسے کمروں کے کارنس پر سجاتے۔

میرے ماموں لکڑی کی ایک بہت بڑی ٹال کے مالک تھے۔ انہوں نے شادی نہیں کی تھی مگر مجھے اولاد کی طرح پالا تھا۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ اگر میرا باپ ہوتا تو وہ بھی ایسی ہی محبت کرتا۔

❄❄❄

ایک روز جب حسب معمول ماموں حیدر گل مجھے جیپ میں بٹھا کر شہر لائے۔ میں نے تھوڑی بہت شاپنگ کی۔ وہاں سے انہوں نے جیپ گاؤں کی طرف موڑنے کی بجائے جب جیل جانے والی سڑک پر ڈالی تو میں نے ماموں حیدر گل سے جیپ روکنے کو کہا۔

وہ سمجھے شاید میں نے پیشاب وغیرہ کرنے کے لئے ایسا کہا تھا۔ جب انہوں نے سڑک کے کنارے چیڑ کے صف بستہ ایستادہ درختوں کی چھاؤں میں جیپ روکی تو میں نے پوچھا۔

''ماموں! آپ جیل جا رہے ہیں؟''

انہیں میرے سوال پر حیرت تو ہوئی تاہم انہوں نے حسب عادت اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مختصراً کہا۔ ''ہاں۔''

''مگر میں اب وہاں نہیں جانا چاہتا۔''

ماموں کو شاید مجھ سے ایسی بات کی توقع نہ تھی۔

''کیوں بیٹا؟......کیا تم اپنی ماں سے ملنے نہیں جاؤ گے؟'' پہلی بار ماموں نے جرح کی۔

''نہیں ماموں! وہ میری ماں نہیں ہے۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

ماموں نے فوری طور پر کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے دزدیدہ نظروں سے ان کے چہرے کی طرف دیکھا مگر ان کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ اس کے بعد انہوں نے جیپ خاموشی سے واپس موڑ لی۔

میرا خیال تھا کہ ماموں اس بارے میں گھر جا کر مجھ سے خوب جرح کریں گے۔ مگر وہ مجھ سے کچھ بھی نہ بولے۔ مجھے حیرت تو ہوئی مگر میں بھی چپ رہا۔

پھر یوں ہوتا رہا کہ ماموں مجھے ساتھ لے جانے کو کہتے تو میں انکار کر دیتا اور وہ خاموشی سے خود ہی چلے جاتے۔

ایک روز وہ ماں سے مل کر شام گئے لوٹے۔ وادی میں اندھیارے اُترنے لگے تھے۔ ماحول پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں اپنے کمرے میں موجود تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ آواز پہچان کر میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

''جی ماموں......!'' دروازہ کھلا اور ماموں حیدر گل اندر داخل ہوئے۔

ہمیشہ کی طرح ان کے چہرے پر گہری متانت طاری تھی۔ مگر آج ان کا چہرہ قدرے مختلف تاثرات کی غمازی کر رہا تھا۔ ان کے چہرے پر دکھ کے آثار تھے۔ وہ خاموشی کے ساتھ ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں بھی ان کے سامنے بچھے بیڈ پر بیٹھ گیا۔

وہ چند ثانیے میرے چہرے کو تکتے رہے، اس کے بعد بولے۔

''نادر بیٹے! تم اپنی ماں سے اب کیوں نہیں ملنا چاہتے؟''

''ماموں! میرے اس سوال کا جواب آپ کے پاس ہی ہے۔'' میں نے اپنی ذہنی وسعت کے اعتبار سے کہا۔

وہ خاموش رہے جیسے مزید وضاحت چاہتے ہوں۔ میں نے دوبارہ ذرا واضح لفظوں میں کہا۔

''ماموں! کیا میرا اتنا بھی حق نہیں ہے کہ میں اپنی ماں کے متعلق آپ سے جان سکوں؟ وہ جیل میں کیوں ہے؟......میری ماں جیل میں آخر کون سی سزا بھگت رہی ہے؟ اور......اور مزید یہ کہ میرا باپ کون ہے؟ وہ کہاں ہے؟ مجھے جب تک اس بارے میں تسلی بخش جوابات نہیں مل جاتے، میں اب اس عورت سے ملنے نہیں جاؤں گا۔''

میرا ہٹیلا پن اب پوری طرح بیدار ہو گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب ماموں مجبور ہو کر مجھے ان سارے سوالوں کے جوابات ضرور دیں گے۔ مگر ہمیشہ کی طرح ان کے چہرے پر برف جمی رہی۔ وہ نہیں پگھلی تھی۔ اس کے بعد وہ خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے تھے۔ میں اپنے ہونٹ کاٹتا رہ گیا۔ میرے اندر بھی اب اس راکھ کو کریدنے کی ایک ضد سی پیدا ہونے لگی تھی۔ ایسی راکھ جس کے نیچے مجھے کسی اندر ہی اندر سلگتی ہوئی چنگاری کی تپش سی محسوس ہونے لگی تھی۔

اور میں اس دبی ہوئی چنگاری کو بھڑکانا چاہتا تھا۔ میں اس کی تپش کا اندازہ کرنا چاہتا تھا اور جاننا چاہتا تھا کہ آخر یہ کون سی آگ کی پیدا کردہ خاکستر راکھ تھی؟ یہ جاننا میرا حق تھا اور جب تک مجھے میرا یہ حق نہیں مل جاتا، میں اس عورت کو اپنی ماں تسلیم نہیں کر سکتا تھا۔

❄❄❄

کئی موسم بدلے، پہاڑوں پر برف پگھلتی رہی۔ درختوں نے نئے پیرہن اوڑھے مگر میرے اندر کا خلا

پُر نہ ہو سکا بلکہ گزرتے وقت کے ساتھ اس قدر وسیع ہوتا چلا گیا کہ میں اپنے آپ میں ہی گم رہنے لگا۔ اس طرح زندگی کے مزید کئی سال بیت گئے اور میں ایک کڑیل جوان کے روپ میں اُبھرا۔ سرخ و سپید رنگت، دراز قد، چوڑے شانے، وجیہہ صورت۔ دل میں نئے نئے جہان کھوجنے کی تمنا، والہانہ جذبوں کی ترنگ۔ مگر گاؤں کے دیگر نوجوانوں کے برعکس میری آنکھیں نہ صرف خوف سے عاری تھیں بلکہ ان میں ہر سمے ایک اُداسی سی ہلکورے لیتی رہتی۔ ایک سوالیہ نشان تھا جو پھانس کی صورت اٹک کر رہ گیا تھا۔ میں خواب دیکھنے والا نوجوان نہ تھا۔ میں حقیقت پسند تھا۔

میٹرک کرنے کے بعد ماموں نے مجھے پنڈی کے ایک گورنمنٹ ڈگری کالج میں داخل کروا دیا تھا۔ وہیں میں ہاسٹل میں رہنے لگا۔ میرا ایک روم میٹ جو میرا ہم عمر تھا، میرا گہرا دوست بن گیا۔ اس کا نام کبیر احمد تھا۔

وہ ایک سرکاری ٹھیکے دار، نظر حیات کا بیٹا تھا۔ کبیر احمد کی ایک چھوٹی بہن بھی تھی۔ وہ آٹھویں میں پڑھتی تھی۔ کبیر احمد میرے برعکس ذرا لاابالی طبیعت کا مالک تھا۔ میں جتنا سنجیدہ اور خاموش خاموش رہتا تھا، وہ اتنا ہی چلبلا اور شوخ و شنگ تھا۔ پھر بھی ہمارے درمیان کوئی ایسی قدر مشترک تھی جو ہمیں دوستی کی ڈور میں باندھے ہوئے تھی۔ میری طرح وہ بھی خوبرو نوجوان تھا۔

ہم دونوں ابھی ایف۔ایس۔سی کے پہلے سال میں تھے کہ ان دنوں کالج میں سالانہ اسپورٹس ڈیک کا انعقاد کیا گیا اور ایک ہفتہ پہلے ہی گراؤنڈ میں مختلف ٹولیوں نے مختلف کھیلوں میں حصہ لینے کے لئے ریہرسل شروع کردی۔ ہمارے کالج میں ٹیبل ٹینس اور اسکواش کے لئے جمنازیم بھی تھا۔ مجھے ٹیبل ٹینس کا شوق تھا اس لئے میں نے ٹیبل ٹینس میں اپنا نام درج کروالیا تھا۔ جبکہ کبیر احمد نے اسکواش کا انتخاب کیا۔

ہم اپنی پریکٹس مکمل کر چکے تھے۔ اگلے ہفتے کے پہلے دن سے باقاعدہ میچوں کا انعقاد شروع ہو گیا۔ ان میچز میں دیگر کالجز اور یونیورسٹیوں کی ٹیموں نے بھی حصہ لیا۔

ہمارے پول کے ابتدائی دو میچ سینٹ جانز اور سینئر کیمبرج والوں سے ہوئے تھے۔ اس کے بعد ہم نے انہی سے اگلے میچ کھیلے اور پے در پے شکست سے دوچار کر کے نہ صرف اپنے پوائنٹ برابر کر لئے بلکہ ہم نے دو پوائنٹ فائن آؤٹ کروا ڈالے۔ اب میری حکمت عملی انہی اضافی پوائنٹس کو برقرار رکھنے کی حد تک تھی اور اسی لئے ہماری ٹیم نے دفاعی کھیل کھیلتے رہنے کو آخر تک ترجیح دی۔ آخری یا فائنل میچ میں ہماری مدمقابل ٹیم میں لڑکے کے علاوہ جو لڑکی شامل تھی اس کی عمر بمشکل اٹھارہ سال ہوگی۔ بہت طرح دار، حسین اور پُرکشش ہونے کے ساتھ ساتھ الٹرا ماڈرن اور شوخ و شنگ دکھائی دے رہی تھی۔ صاف ملائم جلد، صنوبر کے درخت کی طرح دراز قد، جسم بھی متناسب اور گداز تھا۔ بال شہد رنگ کے بوائے کٹ تھے۔ نچلا ہونٹ بہت ہی گداز تھا مگر اس کے حسنِ دل آرا اور بے داغ میں جو شے سب سے زیادہ پُرکشش تھی وہ اس کی بڑی بڑی سرگیں آنکھیں تھیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک گہرا نشہ ہلکورے لیتا محسوس ہوتا تھا اور بے اختیار ان میں ڈوب کر کھو جانے کو دل کرتا۔

''واہ .... واہ ....'' میری نگاہیں اس پر جم کر رہ گئیں اور دلِ بے اختیار نے اسے داد دے ڈالی۔ وہ بہت بولڈ اور الٹرا ماڈرن نظر آ رہی تھی۔ اس نے سرخ ربن سے اپنے ریشمی بال باندھ رکھے تھے۔ پیروں میں سفید اور نیلی لکیروں والے اسپورٹس شوز تھے، بیش قیمت مائیکل پیٹر کا نیلا ٹراؤزر اور اوپر زپ والی فل آستین کی شرٹ تھی۔ میں تو اسے دیکھ کر ایک لمحے کو مبہوت رہ گیا۔ پل بھر کو تو مجھے یوں لگا جیسے جھیل سیف الملوک سے کوئی اپسرا بھٹک کر ادھر آ نکلی ہو۔

ٹاس میں نے جیت لیا۔ سروس شروع کی۔ اور پھر تو جیسے اس نازک اندام دوشیزہ نے ایسے ایسے شاٹس کھیلے کہ مجھے دانتوں تلے پسینہ آ گیا۔ اب میں اس کے ملکوتی حُسن کے ٹرانس سے نکل آیا اور جم کر کھیلنے لگا۔ جب اس نے مجھے جم کر کھیلتے دیکھا تو میری حکمت عملی کو فوراً سمجھ گئی کہ میں پوائنٹ لینے کے چکروں میں نہیں تھا۔ اب اس نے پوائنٹ حاصل کرنے کی اپنی جستجو کو میری ساتھی کی طرف موڑا اور اگلے راؤنڈ میں اس نے اپنے ساتھی کو میرے مقابل چھوڑ کر سختی سے یہ ہدایت کردی کہ وہ میری دفاعی چال کی نہ تک کھیلے اور خود اس نے پوائنٹ حاصل کرنے کے لئے تابڑ توڑ میری ساتھی کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ وہ بے چاری دو ایک حملوں میں ہی چاروں شانے چت ہو گئی اور یوں اس نے اپنے پوائنٹ نہ صرف برابر کر لئے بلکہ اوپر تلے پورے چار اضافی پوائنٹ لے کر ہمیں بری طرح شکست سے دوچار کر دیا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بے مثال حُسن کے ساتھ ساتھ ایک زرخیز ذہن کی بھی مالک تھی۔

آخری راؤنڈ شروع ہوا تو میں نے پوری ذمے داری کے ساتھ کھیلنا شروع کیا اور اس کی چال کو کور کرتے ہوئے اس پر ہی الٹ دیا۔ یعنی اب وہ جس طرح میری نسبتاً کمزور ساتھی سے پوائنٹ لینے کی کوشش کر رہی تھی، اسی طرح میں نے پوائنٹ کے لئے اس کے ساتھی کے خلاف تابڑ توڑ شاٹس کھیلنے شروع کر دیئے۔ ادھر جب اس طرح دار اپسرا نے یہ دیکھا کہ میں اب دفاعی کھیل کو ترک کر کے باقاعدہ حملوں پر اتر آیا ہوں تو وہ میرے مدمقابل آ گئی۔

اب ہمارے درمیان کانٹے کا سنسنی خیز مقابلہ شروع ہو گیا۔ میری نظریں اس کے شہابی رنگ والے رخِ روشن کے بجائے بال اور نیٹ پر تھیں۔

بالآخر بڑی مشکلوں سے ہمیں محض ایک پوائنٹ کی برتری حاصل ہوئی اور یوں ہم یہ میچ بڑے سخت مقابلے کے بعد جیت گئے۔ میں میچ تو جیت گیا تھا مگر اپنا دل ہار بیٹھا۔ اس نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ مجھے جیت کی مبارک باد دیتے ہوئے مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا روئی جیسا نرم ہاتھ تھامتے ہی میرا اندر تہہ و بالا ہونے لگا۔

''بہت اچھا کھیلے ہیں آپ۔'' اس نے آہستگی سے ہاتھ واپس کھینچا۔

''آپ نے بھی خوب شاٹس کھیلے ہیں۔ محض ایک پوائنٹ کی برتری کو میں جیت نہیں سمجھتا۔ یہ بہت کم لیڈ ہے۔'' میں نے اس کی سیاہ جھیل جیسی گہری آنکھوں میں گویا ڈوب کر اُبھرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ وہ خوش دلی سے مسکرائی۔

''نہیں .... فتح بہرحال فتح ہے۔ آپ جیت چکے ہیں۔ اور میں ہار چکی ہوں۔''

اس کی آواز ایسے تھی جیسے دور کہیں مرغزاروں میں کوئل کوک رہی ہو۔

''ہار تو میری ہوئی ہے۔'' میں نے کھوئے کھوئے گہرے لہجے میں کہا۔

''جی.......؟'' اس کے چونکنے کی ادا بھی کیا تھی۔ دلِ بے چین کو گرماتی ہوئی ادا۔

''آں .... ہاں، پپ....... پتہ نہیں .... میں کیا کہہ گیا۔'' میں جھینپ کر بولا۔ میں نے اس کے گداز ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ کو کھیلتے ہوئے دیکھا اور پھر وہ اپنی اسپورٹس کٹ کندھے پر ڈالے چلی گئی۔



مجھے اس اپسرا کا نام نگینہ معلوم ہوا تھا۔ وہ واقعی ایک خوب صورت اور جگمگاتا ہوا نگینہ تھی۔ ایسا انمول نگینہ جس کی کوئی قیمت نہ تھی

اس روز کے بعد میرے دل کا چین غارت ہو کر رہ گیا تھا۔ میں اپنی اس کیفیت پر خود حیران تھا حالانکہ جس کالج میں، میں پڑھتا تھا وہ کو ایجوکیشن تھا۔ پھر اپنے گاؤں کی الہڑ پہاڑی لڑکیوں کو بھی میں نے دیکھا تھا لیکن کسی مہ جبین کے چہرے نے میرے دل کے اک تارے کو ابھی تک نہیں چھیڑا تھا۔ مگر نگینہ نے تو جیسے میرے دل کے تاروں کو جھنجھنا ڈالا تھا۔

پہلی بار میرے جذبات پر چھائی ہوئی برف محبت کی شدت سے پگھلنے لگی۔ ہاں، پہلی بار .... میں رنگوں کی اس خوب صورت قوسِ قزح سے آشنا ہونے لگا۔ مجھے آج پتہ چلا، دل کیا ہے؟ یہاں کون رہتا ہے؟ کون گھر کرتا ہے؟ اور یہ دل جسے ہم اپنے وجود کا حصہ سمجھتے ہیں شاید یہ غلط ہے۔ یہ دل تو اپنا ہوتا ہی نہیں ہے۔ یہ تو کسی اور کی امانت ہوتا ہے۔ اس کا مالک تو کوئی اور ہوتا ہے۔ کنواری لڑکی کی طرح، ادھر جوان ہوا اور ادھر وداع ہو گیا۔ ہاں، میرا دل بھی جیسے آج وداع ہو گیا تھا۔ مگر نہیں، میرے دل کو تو کوئی چرا لے گیا تھا اور چور ایک حسین اور پری وش اپسرا .... نگینہ تھی۔ اس روز کے بعد سے جیسے میرے اندر کا چھایا ہوا غبار کافور ہونے لگا۔ سنجیدگی اور قنوطیت کا وہ خول اس دن کے بعد بالکل ترک کر رہ گیا۔ میٹھی میٹھی محبت کی نرم نرم دھوپ نے جیسے میرے دل پر چھائے ہوئے گلیشیر کو پگھلا دیا تھا۔ بہار کے ایک ہی معطر، خوشگوار جھونکے نے میرے اندر کے خزاں رسیدہ سناٹے کو گلزار بنا دیا تھا۔ ایکا ایکی مناظر فطرت کے حسین نظارے مجھے دلفریب محسوس ہونے لگے تھے۔ میرا چہرہ کھویا کھویا ضرور رہنے لگا لیکن اس خاموشی کے اندر سرخوشی کا عالم تھا۔

سب سے پہلے ماموں حیدر گل نے میرے اندر کی اس تبدیلی کو محسوس کیا مگر حسب عادت انہوں نے مجھے کریدا نہیں تھا۔ میرے انکار کے بعد اب وہ اکیلے جیل جایا کرتے تھے۔ میری ماں ان کی بہن تھی، بھائی کی حیثیت سے ان سے ملنے جاتے اور اپنا بھائی ہونے کا فرض ادا کرتے۔

میں تقریباً ہر ویک اینڈ پر گاؤں آتا تھا۔ چاچا فضل جیپ لے کر شہر پہنچ جاتے تھے۔ گاؤں میں اب میرا دل نہیں لگتا تھا۔ جب سے نگینہ کو میں نے دیکھا تھا، دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے کے مصداق اس کا پھر دیدار کرنے کو دل بے چین رہنے لگا تھا۔ مگر ایسا موقع نہیں مل رہا تھا۔

بہرطور اس بار میں پورے بیس روز بعد گاؤں آیا۔ وہ بھی محض دو دنوں کے لئے۔ ایک بار رات ماموں حیدر گل میرے کمرے میں آئے۔

''نادر! تمہیں بہت روز ہو چکے ہیں اپنی ماں سے ملے ہوئے....... کم از کم ایک بار ان سے مل لو پھر نہ جانے کب تم گاؤں لوٹو۔'' انہوں نے گہری متانت سے کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس بار ان کے لہجے میں ایک موہوم سی التجا تھی۔

جواباً میں ایک تلخ مسکراہٹ سے بولا۔

''ماموں! پہلے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ جس عورت کو آپ میری ماں کہتے ہیں.......''

''نادر.......!'' اچانک ماموں حیدر گل نے ذرا تیز لہجے میں میری بات کاٹی اور میں ہکا بکا ان کا منہ تکنے لگا۔ آج پہلی بار ماموں نے مجھ سے سخت لہجے میں بات کی تھی۔

''وہ عورت نہیں، واقعی تمہاری ماں ہے .... تمہاری سگی ماں....... جس نے تمہیں جنم دیا ہے۔ تم....... ہاں.......''

میں ماموں کے اس درشت رویے کا برا نہیں مان سکتا تھا کیونکہ انہوں نے میری پرورش اسی طرح کی تھی جیسے کہ کوئی باپ اپنی اولاد کی کر سکتا ہے۔ اس لئے ماموں کو مجھے ڈانٹنے کا پورا حق تھا۔

''سوری ماموں!'' میں نے ہولے سے سر جھکا کر کہا، پھر بولا۔ ''مگر ماموں! آخر مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی جا رہی ہے کہ میری ماں....... جیل میں اپنے کس جرم کی سزا بھگت رہی ہے....... آخر انہوں نے ایسا کون سا سنگین جرم کیا ہے کہ .... کہ .... میری پیدائش بھی جیل کی چہار دیواری میں ہوئی اور .... اور اب جبکہ میں اٹھارہ برس کا ہو چکا ہوں لیکن ماں کی سزا ابھی تک پوری نہیں ہوئی۔ میں نے تو آج تک اپنے باپ کی بھی شکل نہیں دیکھی ہے۔ وہ کہاں ہے؟ کون ہے؟''

میں اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ میرا خیال تھا، ماموں آج بھی ہمیشہ کی طرح خاموشی سے لوٹ جائیں گے۔ مگر آج ایسا نہیں کیا انہوں نے....... وہ میری طرف دیکھ کر ایک طویل سانس لے کر بولے۔

''نادر!....... تمہارے لئے کیا یہ کافی نہیں کہ تمہارا باپ تمہاری پیدائش سے قبل ہی انتقال کر چکا تھا اور تمہاری بدنصیب ماں حالات کی اس سیاہ آندھی کی لپیٹ میں آ گئی کہ اس بے گناہ کو عمر قید کی سزا سنا دی گئی۔ آخر تم .... ماضی کی یہ راکھ کریدنے پر کیوں بضد ہو؟''

میں نے ان کی بات پر قدرے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ میری ماں تو مجھے حقیقت بتانے کے لئے ماموں سے اصرار کرتی رہی تھی۔ مگر جانے کیوں ماموں مجھے کچھ بتانے پر قطعاً راضی نہ تھے۔

''ماموں! آپ میرا مسئلہ نہیں سمجھ رہے....... میرے اندر ایک پھانس ہے، جواب ایک ناسور بن گئی ہے۔ یہ پھانس مجھے ایک پل کے لئے بھی چین سے نہیں رہنے دیتی۔ پہلے تو میں بچہ تھا، مگر اب تو میں جوان ہو چکا ہوں۔ شہر کے ایک بڑے کالج میں پڑھتا ہوں، باشعور ہوں....... اور برے بھلے کی تمیز بھی رکھتا ہوں۔ میرا اُٹھنا بیٹھنا اعلیٰ تعلیم یافتہ اور معزز گھرانوں کے لوگوں کے درمیان ہے۔ میں اب معزز معاشرے کا ایک فرد بن چکا ہوں جہاں سب سے پہلے اپنے تعارف کی بجائے اپنے باپ کا تعارف کروایا جاتا ہے۔ آپ نے تو ایڈمیشن فارمز میں سرپرست کے خانے میں اپنا نام درج کروا دیا ہے مگر میں لوگوں کو کیا جواب دوں جو مجھ سے سب سے پہلے میرے نام کی بجائے میرے باپ کا نام پوچھتے ہیں۔ کون ہے، کیا کرتا ہے؟ ماموں! پلیز....... میں آپ سے گستاخی کا تصور بھی نہیں کر سکتا....... مگر .... مگر ماموں! مجھے یہ تو معلوم ہونا چاہئے کہ میرا باپ کون تھا؟ اگر وہ مر چکا ہے تو کیسے مرا؟ .... اس کا نام کیا تھا؟ کیا .... کیا مرنے والوں کے نام بھی ان کے ساتھ مر جاتے ہیں؟ نہیں....... نہیں ماموں! نہیں....... آپ مجھے اس طرح اندھیرے میں رکھ کر بے موت نہیں مار سکتے۔ پلیز ماموں! پلیز.......''

فرطِ رقت و جذبات سے میرا لہجہ رندھ گیا تھا۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔

ماموں نے آگے بڑھ کر مجھے اپنے گلے لگا لیا۔ میری غم زدہ آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں نے ان کا شانہ بھگو دیا۔ اس کے بعد ماموں نے آہستگی سے مجھے خود سے علیحدہ کیا اور میری آبدیدہ آنکھوں میں جھانکنے لگے۔ ان کی آنکھوں میں بھی نمی سی تیر رہی تھی۔ پھر وہ میرے دونوں شانوں کو مضبوطی سے تھام کر بولے۔

''نادر! تمہارے لئے میرے دل میں ایک باپ جیسی ہی محبت ہے۔ ویسی ہی شفقت ہے جیسی ایک باپ کو اپنی اولاد سے، اپنے بیٹے سے ہوتی ہے۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ تم اپنے دل میں اس بات کا بھرپور اعتراف رکھتے ہو۔ تو بیٹا! میں تمہاری بھلائی چاہتا ہوں۔ میں تمہیں حکم نہیں دوں گا بلکہ ایک درخواست کروں گا کہ اس وقت تم جس کرب سے گزر رہے ہو، اس کا احساس راکھ میں دبی اس چنگاری سے کہیں بہتر ہے جسے تم کریدنا چاہتے ہو۔ میرے بیٹے! میں چاہتا ہوں تم پر، تمہارے درخشاں مستقبل پر

اور ہنستی بستی زندگی پر تمہارے ماضی کا وہ بھیانک سایہ نہ پڑنے دوں جسے میری دور اندیش نظریں ایک سیاہ طوفان کی صورت میں تمہاری طرف بڑھتا ہوا دیکھ رہی ہیں۔ بیٹے! اس راکھ کو اسی طرح دبا رہنے دو......... اسی طرح دبا رہنے دو........ اس چنگاری کو مت چھیڑو........ اسے مت کریدو .... مت کریدو۔'' ان کا لہجہ مرتعش ہوگیا۔ وہ دوسری طرف منہ پھیر کر کھڑے ہوگئے۔

میرے اندر عجیب سی اتھل پتھل ہونے لگی تھی۔ آج پہلی مرتبہ ماموں نے بڑے عجیب وغریب لہجے میں اور بڑی اسرار بھری باتیں کی تھیں۔ جو بظاہر مبہم تھیں مگر ماضی کے کسی ناخوشگوار اور تلخ واقعے کی طرف اشارہ بھی کر رہی تھیں۔ مجھے واقعی اعتراف تھا کہ ماموں حیدر گل کی میرے لئے شفقت اور محبت بے غرض تھی۔ حتیٰ کہ انہوں نے تو مجھے یہ تک بھی بتا ڈالا تھا کہ وہ جس ٹال کو کامیابی کے ساتھ کاروباری بنیادوں پر چلاتے رہے، وہ ان کی ملکیت نہ تھی۔ یہی نہیں، گاؤں میں تعمیر شدہ یہ خوبصورت پہاڑی بنگلہ سارا بینک بیلنس میری ماں کی ملکیت تھا اور وہ جیل جا کر اپنی بہن کو ایک ایک پائی کا حساب دیتے تھے۔ یہی نہیں، انہوں نے اپنی بہن کی رضامندی سے پاور آف اٹارنی میرے سپرد کر دی تھی اور لکڑی وغیرہ کی خرید و فروخت، ٹینڈر وغیرہ کی مطلوبی سے متعلق دیگر کاغذات اور چیکس وغیرہ پر بھی میرے ہی دستخط ہوتے تھے۔ لیکن میری سمجھ میں ان کی یہ منطق نہیں آرہی تھی کہ آخر میرے ماضی سے متعلق ایسی کون سی چنگاری تھی، جسے وہ کریدنا نہیں چاہتے تھے؟ اور ....اور آخر اس بھیانک طوفان کی کیا حقیقت تھی جو ان کی دور اندیش نظریں دیکھ رہی تھیں۔

چند ثانیے ماحول میں گمبھیر سناٹے کی سی فضا طاری رہی۔ وہ میری طرف بڑھے اور پُرسوچ نظریں میرے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے بولے۔

''نادر بیٹے! تمہیں ایک اور بات بتاؤں، جس دن تم نے میرے ساتھ جیل جا کر اپنی ماں سے ملنے سے انکار کر دیا تھا، یقین کرو مجھے بے پناہ خوشی ہوئی تھی۔''

میں ان کی اس بات پر بری طرح چونکا۔ وہ میری کیفیت کو بھانپتے ہوئے دوبارہ گویا ہوئے۔

''ہاں بیٹا! دراصل میں خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ تم اپنی ماں سے ملو۔ بلکہ........ بلکہ میں تو یہ بھی چاہتا تھا کہ تمہیں یہ بھی نہ پتہ چلے کہ تمہاری ماں زندہ ہے اور جیل میں اپنے ناکردہ جرم کی طویل سزا بھگت رہی ہے۔''

ماموں کا لہجہ بری طرح کپکپا رہا تھا اور میرے سر پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔ میرا دل جیسے رک رک کر دھڑک رہا تھا۔ میرے اعصاب چھلنی ہو رہے تھے۔

''مگر........ یہ تمہاری ماں کا اصرار تھا کہ میں تمہیں اس سے ملاتا رہوں۔'' وہ کہنے لگے۔ ان کی آواز ہنوز مرتعش تھی۔ ''میں اس کی خواہش رد نہ کر سکا اور دل پر جبر کر کے میں ایسا کرتا رہا۔ لیکن تمہاری ماں اور بھی بہت کچھ چاہتی تھی........ مگر میں نے اس کی مزید کوئی بات ماننے سے انکار کر دیا۔''

''کیوں........ کیوں ماموں! آپ آخر ایسا کیوں چاہتے تھے؟'' مجھ پر ایک بار پھر کرب ناک سی رقت طاری ہونے لگی۔ میں ایک تکلیف دہ کیفیت سے گزر رہا تھا کہ آخر ماموں ایسا کیوں چاہتے تھے؟ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ میرے ماں سے ملاقات سے انکار پر ماموں آخر کار تنگ آکر مجھے اس حقیقت سے آگاہ کر دیں گے جو مجھ سے پوشیدہ رہ گئی اور جس نے میری نفسیات پر بھی برے اثرات مرتب کئے تھے۔

بہرطور میرے احتجاج آمیز استفسار پر ماموں نے میرے شانوں کو گرم جوشی سے تھاما اور بولے۔

''نادر بیٹے! ابھی تم اپنی پڑھائی مکمل کرو، میں تمہیں ایک بڑے اور کامیاب آدمی کے روپ میں دیکھنا

چاہتا ہوں۔ اور یہ تبھی ممکن ہے جب تم اپنی پڑھائی پر پوری توجہ مرکوز رکھو۔ ٹھیک ہے........ تم اپنی ماں سے نہیں ملنا چاہتے ہو تو نہ ملو مگر اپنی زندگی کو بھرپور طریقے سے انجوائے کرو۔ ٹھیک ہے بیٹا!'' ماموں نے میرا کندھا تھپتھپایا اور پھر کمرے سے نکل گئے۔

پھر مجھے باہر جیپ اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی جو لحظہ بہ لحظہ دور ہوتی چلی گئی۔ اور میں اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔ ماموں اکیلے ہی اپنی بہن سے ملنے شہر چلے گئے تھے۔

❊ ❊ ❊

اب تو میں ماموں حیدر گل کی طرف سے بالکل ہی مایوس ہو چکا تھا۔ اتنا تو میں سمجھ ہی چکا تھا کہ ماموں اپنے تئیں میرے کسی بھلے کی خاطر ہی مجھے کسی ایسی نادیدہ آگ سے دور رکھنا چاہتے ہیں جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ اس کی تپش میری زندگی کو تلپٹ کر کے رکھ دے گی۔ وہ مجھے میری ماں کے تلخ ماضی کے متعلق کچھ نہیں بتانا چاہتے تھے۔ حالانکہ جب میں اس سے پہلے ماموں کے ساتھ جیل، ماں سے ملنے جایا کرتا تھا تو ماں بڑے پیار سے میرے بالوں کو سہلاتے ہوئے ماموں سے یہ کہا کرتی تھی کہ۔

''گل!........ نادر کو دھیرے دھیرے حقیقت سے آگاہ کرتے رہو۔ ورنہ اِدھر اُدھر سے اگر اسے (مجھے) حقیقت کا علم ہوا تو اس کے منفی اثرات اس کے دل و دماغ پر مرتب ہو سکتے ہیں۔ کہیں........ کہیں یہ........ میرا بیٹا ہی مجھ سے نفرت نہ کرنے لگ جائے۔''

مجھے اس وقت یہ سن کر بہت حیرت ہوئی۔ آج جب ماں کی اپنے بھائی (ماموں) کو کی گئی تاکید میرے دل و دماغ میں گونجی تو میرے اندر کی کرید مزید سوا ہونے لگی تھی کہ آخر اس حقیقت میں ایسی کون سی پراسرار بات پوشیدہ تھی جسے اگر میں اِدھر اُدھر سے معلوم کر لیتا تو میرے دل میں اپنی ماں کے خلاف غلط فہمی پیدا ہو سکتی تھی۔ حتیٰ کہ میں نے فضل چاچا اور اس کی بیوی صغراں سے بھی پوچھنے کی کوشش کی تھی مگر ان دونوں بے چاروں نے نہایت غریبانہ انداز میں ہاتھ جوڑ کر کہا تھا۔

''چھوٹے صاحب! ہم نوکر ہیں........ ہمیں نوکر ہی رہنے دیں۔ ہم کچھ نہیں جانتے۔ ہمارے منہ پر تالے لگا دیئے گئے ہیں۔'' مجھے اور غصہ آتا۔ حالانکہ ہونا تو ایسا چاہئے تھا کہ میں اگر ''اپنے تئیں'' نیچے وادی میں جا کر گاؤں کے کسی عمر رسیدہ شخص یا دیگر لوگوں سے استفسار کرنے کی کوششیں کرتا تو مجھے حقیقت کا کچھ نہ کچھ علم ہو سکتا تھا۔ مگر پھر سوچتا کہ کیا ان لوگوں سے اپنے خاندان کے ماضی کے بارے میں پوچھنا مناسب ہوگا؟ میں اپنا ارادہ بدل دیتا۔ البتہ مجھے اتنا تو علم اب تک ہو ہی چکا تھا کہ میری ماں، ایک قتل کے جرم میں عمر قید کی سزا بھگت رہی ہے۔ اس نے کس کا اور کیوں قتل کیا تھا؟ یہ میں نہیں جانتا تھا۔ تب اچانک ایک روز مجھے یہ بھی خیال آیا کہ کیوں نہ جیل سپرنٹنڈنٹ سے مل کر اپنی ماں کے بارے میں استفسار کروں؟ لیکن مجھے یہ بھی نامناسب ہی لگا تھا۔ بالآخر میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ میں احتجاجاً ماموں حیدر گل کے ساتھ ماں سے ملنے ہی نہ جایا کروں۔ پھر وہ خود ہی مجھے تنگ آکر حقیقت سے آگاہ کر دیں گے۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی اُلٹ ہوگیا تھا۔ کیونکہ وہ تو خود بھی یہی چاہتے تھے کہ میں ماں سے نہ ملوں۔

میں تنگ آکر ان باتوں کو ذہن سے کھرچنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر نگینہ سے سامنا ہونے کے بعد تو اب میں کسی اور ہی دنیا کا باسی ہوگیا تھا۔

❊ ❊ ❊

میں دو دن بعد ہی شہر آگیا۔

نگینہ کا سحر آفریں اور دل گزیں چہرہ بھلائے نہیں بھول رہا تھا مجھے۔ میں اب سنجیدگی سے اس مہ جبیں کے متعلق سوچنے لگا۔ آخر اس کے دیدار کی کوئی تو سبیل ہوگی۔ کبیر احمد یوں تو میرا روم میٹ تھا مگر اس کا گھر شہر ہی میں ہونے کی وجہ سے وہ اکثر ہوسٹل سے غائب ہی رہتا تھا۔ البتہ امتحانات کے دنوں میں جب اسے کالج لائبریری یا ''کمبائن اسٹڈی'' کی ضرورت پڑتی تو وہ ہاسٹل ہی میں آکر رہنے لگتا تھا۔

سنا ہے کہ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ میں اس مہ جبیں کو دیکھنے کے لئے بے چین تھا کہ ایک دن مجھے وہ رُخِ روشن نظر آ ہی گیا۔ مگر میں اسے اپنے روم پارٹنر کبیر احمد کے ساتھ دیکھ کر دل مسوس کر رہ گیا۔

نگینہ اسے کالج میں ملنے آئی تھی۔ ایک لیکچر فری تھا اس لئے میں کالج لائبریری میں بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ میں نے پری انجینئرنگ لے رکھی تھی۔ کبیر احمد کا سبجیکٹ بھی یہی تھا۔

میں پون گھنٹے تک پڑھتا رہا۔ کبیر بھی میرے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ معاً ہماری ایک کلاس میٹ نزہت نے ہولے سے کبیر احمد کو مخاطب کر کے کہا۔

''کبیر!......تمہاری مہمان آئی ہیں۔''

چونکہ میں بھی اس کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ میں نے بھی سر اٹھا کر نزہت کی طرف دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ اس کے ساتھ نگینہ کھڑی تھی۔ وہی من موہنی صورت لئے......وہی دلنشیں سراپا اور ویسی ہی گداز لبوں پر مچلتی شوخ مسکراہٹ جس نے میرے دل کی دنیا کو تہہ و بالا کر ڈالا تھا۔ وہ بلیو رنگ کی جینز اور سلکی گلابی شرٹ میں ملبوس تھی۔ پیروں میں سفید اور نیلے جوگرز تھے۔ سادہ سے لباس میں اس کا ملکوتی حُسن مزید نکھرا نکھرا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ایک نگاہ مجھ پر بھی ڈالی تھی۔ کبیر احمد تو یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں نے مصافحہ کیا۔

''تھینک یو!'' کبیر احمد نے نزہت کا مسکرا کر ہولے سے شکریہ ادا کیا۔ گویا اسے فارغ کرنے کے بعد کبیر احمد نے اپنی کتابیں سمیٹیں اور مجھ سے کہا۔

''یار نادر! تم ابھی بیٹھو گے یا چلو گے کینٹین؟''

میں چونکا۔ جی تو چاہا، اس کی آفر قبول کرلوں۔ لیکن یہ عامیانہ پن ہوتا اس لئے میں نے شکریہ کہہ کر اس سے معذرت کرلی۔ وہ دونوں چلے گئے۔

اب میرا پڑھائی میں کہاں دل لگتا۔

دو باتوں نے میرے دل کو دھچکا پہنچایا تھا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ نگینہ، کبیر احمد سے ملنے آئی تھی۔ ان کی آپس میں دوستی کی نوعیت کچھ بھی سہی لیکن میں اپنے اندر رقابت کا جذبہ محسوس کرنے لگا تھا۔ جبکہ دوسری بات نگینہ کی مجھ سے بے رخی تھی۔

بے شک وہ گزشتہ دنوں ہونے والے اسپورٹس ویک میں میری مدِ مقابل تھی اور میرا اس سے ذرا دیر کا سامنا ہوا تھا لیکن پھر بھی اسے کم از کم مجھ سے تو تھوڑی بہت شناسائی ظاہر کرنا چاہئے تھی۔ بھلے سے یونہی اک ذرا ہائے ہیلو ہی کہہ دیتی۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔

اب میں اس ''ہونا چاہئے تھا، نہ ہونا چاہئے تھا'' کی گردان میں بری طرح اُلجھ کر رہ گیا۔ وہ دونوں جا چکے تھے اور میں اپنے دل کے کسی گوشے میں بھڑکتی ہوئی آتش شوق کو بری طرح محسوس کرنے لگا جو بار بار اپنی تپش سے میری انا کے مضبوط خول کو پگھلانے کا باعث بن رہی تھی اور مجھے ایک پچھتاوے کی سی کیفیت میں مبتلا کرنے کا سبب بھی بن رہی تھی۔

'کاش!......میں کبیر احمد کی آفر قبول کر لیتا......'

'نہیں......محبت میں اس طرح کا عامیانہ پن رنگِ اُلفت کو پھیکا کر ڈالتا ہے۔' دل نے دماغ کو سرزنش کی۔

'کیسا عامیانہ پن؟......یہی تو دیوانگی ہے......محبوب سے ملنا، اس کے دیدار کی سبیل کرنا دیوانوں کا حق ہوتا ہے۔'

'لیکن یہ حق تو تب ہی مانا جائے گا جب دونوں طرف برابر آگ لگی ہو۔ یک طرفہ محبت ایک نادانی کے سوا کچھ بھی نہیں۔' دماغ نے ایک توجیہہ پیش کی۔

'ہونہہ......نادانی......'' دلِ وحشی بضد رہا۔ 'یہ دیوانگی نہیں تو پھر کیا ہے؟ بے شک محبت کی آگ یکطرفہ سہی لیکن کسی کو اپنانے کی جستجو تو دلِ بے قرار کو دودھ کی نہر کھودنے اور سگِ لیلیٰ سے بھی دوستی پر مجبور کر دیتی ہے۔ صحرا بہ صحرا لیلیٰ لیلیٰ پکارنے پر آمادہ کر کے رکھ دیتی ہے......اور یہ سب منظور نہیں تو نادر میاں! محبت کا خیال ہی دل سے نکال دو۔ یہ تمہارے بس کی بات نہیں۔ پھر تم اپنی انا ہی کے خول میں بند رہو۔ وہ اور ہی لوگ ہوتے ہیں جو اس جذبۂ محبت میں اپنا سب کچھ وار دیتے ہیں۔'

دماغ نے بردبارانہ تنبیہہ کی۔ 'خبردار نادر! محبت کا ایک معیار ہوتا ہے۔ اس کی ایک اپنی ہی معراج ہوتی ہے۔ تمہاری یک طرفہ محبت اگر سچی ہے تو تقدیر ایک دن تمہارا خود ساتھ دے گی۔'

'لیکن تقدیر بھی تدبیر کے تابع ہوتی ہے۔' دل نے کہا۔ اور میں نے بے اختیار جھلا کر اپنی کتابیں بند کر کے سر پکڑ لیا۔ کچھ دیر اسی کیفیت میں رہا۔ اس کے بعد دوبارہ کتاب کھولی تو سامنے درسِ علم کی بجائے نصاب محبت وا ہو گیا جہاں نگینہ کا چہرہ دمک رہا تھا۔ پھر اس کے بعد میں نے کتاب دوبارہ بند کر دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کتابیں سمیٹیں، لائبریری سے باہر آ گیا۔ اب میرے قدم کشاں کشاں کینٹین کی جانب اُٹھنے لگے۔ دل و دماغ کی اس تکرار سے مجھے چائے کی طلب ہونے لگی۔ مگر اصل مقصد تو دیدار یار تھا۔

میں سیدھا کینٹین پہنچا۔ یہ وسیع ہال تھا جہاں ذرا ذرا فاصلے پر میزیں اور کرسیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ کینٹین میں خلافِ معمول رش کم تھا۔ میں نے ایک طائرانہ نظر ہال پر ڈالی تو مجھے ایک کونے میں کبیر اور نگینہ بیٹھے چائے پیتے دکھائی دے گئے۔ سموسوں اور پیٹیز کی پلیٹ بھی ان کی میز پر رکھی ہوئی تھی۔ نگینہ سامنے کے رخ پر بیٹھی ہوئی تھی جبکہ کبیر کی میری طرف پشت تھی۔ نگینہ نے مجھے ہال میں داخل ہوتے دیکھا، ایک لمحے کو ہماری نگاہیں چار ہوئیں اور پھر میں جبراً اپنی نظریں اس سے پھیر کر ایک قریب کی میز پر براجمان ہو گیا۔ ویٹر نے فوراً میرے آگے پانی کا گلاس رکھ دیا۔ میں نے اسے چائے لانے کا کہا اور پانی کا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ میں نے دانستہ اپنا رخ نگینہ کی طرف کر رکھا تھا۔ تاہم اس کی طرف براہِ راست دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ ایک بار جونہی میری نظر اس کی طرف اُٹھی تو مجھے لگا جیسے وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی ہو۔ اچانک اس نے کبیر احمد کی طرف ذرا جھک کر کچھ کہا تھا جسے سن کر کبیر نے فوراً مڑ کر میری طرف دیکھا اور وہیں سے اپنا ایک ہاتھ بلند کر کے مجھے آواز دی۔

''نادر! آ جاؤ یار ادھر ہی۔'' میرے دل کی دھڑکنیں یکبارگی اتھل پتھل ہونے لگی تھیں مگر پھر دوسرے ہی لمحے میں اٹھ کھڑا ہوا اور ان کی میز کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

''یار! میں نے تو تم سے کہا تھا......مگر تم......چلو خیر، آؤ بیٹھو۔'' وہ فراخ دلی سے بولا۔

میں جھینپی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ ایک کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔

''لگتا ہے آپ کے دوست کو پڑھائی سے خاصا شغف ہے۔'' نگینہ نے مترنم سی آواز میں کبیر سے کہا اور مسکراتی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ اس کے نرم و گداز ہونٹ ویسے ہی دل موہ لینے والے تاثرات

پیش کر رہے تھے۔

میں نے ہولے سے گلا کھنکھار کر کہا۔

''دراصل میرا بھی چائے پینے کو جی کر رہا تھا۔ لیکن پھر میں نے سوچا کہ تم دونوں کے بیچ کیوں خواہ مخواہ مخل ہوا جائے۔'' میرے لہجے میں کوٹ کوٹ کر نارسائی بھری ہوئی تھی۔

''ارے یار! ہم یہاں کون سا چونچیں لڑا رہے تھے......لو، سموسہ کھاؤ۔'' کبیر احمد نے ازراہِ تفنن کہا اور پلیٹ میری طرف کھسکا دی۔ میں نے پلیٹ ہی میں سموسے کا ایک ٹکڑا توڑا اور منہ میں ڈال لیا۔ اسی اثناء میں ویٹر میری چائے کا کپ ٹرے میں اٹھائے نمودار ہوا۔ پھر مجھے یہاں بیٹھا دیکھ کر سیدھا ادھر آ گیا۔

''ان سے ملو نادر! یہ نگینہ ہیں۔'' کبیر نے مجھ سے نگینہ کا تعارف کرواتے ہوئے کہا تو نگینہ ایک ہلکی سی مسکراتی نگاہ مجھ پر ڈال کر فوراً کبیر سے بولی۔

''جی......یہ نادر ہیں، میں ان سے مل چکی ہوں......اور وہ بھی بڑے ہنگامی انداز میں۔''

''اوہ، اچھا......مگر بھئی ہنگامی انداز میں کیوں......خیریت؟'' کبیر نے مصنوعی حیرت سے پوچھا اور نگینہ نے اسپورٹس ویک کے دوران ٹیبل ٹینس کے اس گرم جوش میچ کا حوالہ دے ڈالا تو کبیر احمد لاابالی انداز میں ایک ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

''اوہ......اب سمجھا۔ ارے بھئی نادر! ذرا ہوشیار رہنا، تم پر اُدھار کھائے بیٹھی ہے یہ نگینہ۔''

میرا دل مسرت سے بھر گیا۔ نگینہ نے بالآخر میچ کا حوالہ دے کر ثابت کر دیا تھا کہ میں اسے یاد تھا۔ لیکن پھر اچانک ایک کسک سی میرے دل میں اُبھری۔

اگر میں اسے یاد تھا تو اس نے لائبریری میں مجھ سے شناسائی کیوں نہ ظاہر کی تھی اور مجھے سراسر نظرانداز کر کے صرف کبیر احمد سے ہی مصافحہ کیوں کیا تھا؟ مگر پھر فوراً ہی میں نے اسے محبوب کی ایک ادائے بے نیازی پر محمول کر کے ذہن سے جھٹک دیا۔ تاہم میں کبیر احمد کی بات کے جواب میں نگینہ کے چہرے پر ایک گہری نگاہ ڈال کر معنی خیز لہجے میں بولا۔

''ظاہر ہے، انہیں اب اپنا ادھار چکتا کرنے کے لئے اگلے اسپورٹس ویک کا انتظار کرنا پڑے گا۔''

میری بات پر نگینہ بے اختیار کھنکتی ہوئی ہنسی کے ساتھ پہلی بار براہِ راست مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔

''خیر نادر صاحب! اب ایسی بات بھی نہیں......کھیل تو کھیل ہوتا ہے۔ جس میں ہار جیت تو ہوتی ہی ہے۔''

''جی ہاں......اور جیت آپ ہی کی ہوئی تھی۔'' میرے لبوں سے بے اختیار نکلا تو وہ چونک سی گئی۔

''کیا مطلب؟......جیتے تو آپ تھے۔''

''آں......ہاں......میں ہی جیتا تھا۔ لیکن آپ سے جیتنے کے لئے مجھے جس طرح دانتوں پسینہ آ گیا تھا، وہ میں ہی جانتا ہوں۔ اور میرا خیال ہے، اس طرح جیتنا......جیتنا نہیں ہوتا۔''

میں نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ بات بنائی تھی لیکن میں نے نگینہ کے چہرے پر پل بھر میں اُمڈتے ہوئے ایک گہرے اور پُرسوچ تاثر کو فوراً محسوس کیا تھا اور اسی ایک پل میں اس نے بھیدوں بھری نگاہ سے میرے چہرے کو دیکھا، پھر اس سنجیدہ تاثر کو اپنی مخصوص کھلکھلاتی مترنم ہنسی میں بدل کر بولی۔

''نادر صاحب! جیتنے کا لطف بھی تو محنت کر کے جیتنے میں آتا ہے۔ کیا آپ اتنے ہی سہل پسند کھلاڑی ہیں؟'' اس نے جیسے میری اسپرٹ کو جھنجوڑا تو میں بھی چپ نہ رہ سکا۔ اور اس کی دلنشیں نگاہوں میں جیسے دور تک اترتے ہوئے بولا۔

''میں آپ سے متفق ہوں نگینہ صاحبہ! لیکن کبھی کبھی جیت کر ہارنے کا بھی تو لطف آتا ہے۔''

ایک بار پھر اس نے چونکتی ہوئی پُرتاثر نگاہوں سے میری طرف دیکھا تھا۔

''ارے بھئی، یہ تم دونوں کیا خشک موضوع لے کر بیٹھ گئے؟'' کبیر احمد بور ہوتے ہوئے جھنجلا کر بولا۔ ''ابھی سپورٹس ویک میں پورا سال پڑا ہے۔ بعد میں تم دونوں لڑ لینا آپس میں۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''اچھا سنو نادر!......میں نے مری گھومنے کا پروگرام بنایا ہے......اور چونکہ تم ملکہ کوہسار کے دامن میں رہتے ہو اس لئے تم سے زیادہ بہترین ہمارا اور کوئی گائیڈ نہیں ہو سکتا۔''

''کیا واقعی......؟'' میں اس کی بات پر جیسے یک گونہ خوشی سے چونک کر بولا۔ ''موسٹ ویلکم......میں تم لوگوں کو اپنے گاؤں کی بھی سیر کراؤں گا۔ میرا تو وہ گھر ہے۔ یوں بھی آج سیزن ہے۔ تم اسنو فالنگ سے بھرپور لطف اٹھاؤ گے۔''

''بس پھر ڈن ہوا......ہم چند دوست ایک مختصر سا ٹرپ ترتیب دے لیتے ہیں۔ پھر ہم تمہیں اپنے حتمی پروگرام سے آگاہ کر دیں گے۔ کیوں نگینہ! ٹھیک رہے گا نا یہ؟'' کبیر نے آخر میں نگینہ کی رائے لینا چاہی۔

وہ بولی۔ ''ہاں......میری چند گہری سہیلیاں تو ابھی سے تیار بیٹھی ہیں۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔ ہم پرسوں صبح سویرے یہاں سے نکلیں گے۔ تمہارا کیا خیال ہے نادر! ابھی پروگرام ٹھیک رہے گا۔''

''ایز یو وِش۔'' میں نے خوش دلی سے مسکرا کر کہا۔

❄❄❄

نگینہ سے میری یہ دوسری ملاقات با تقدیر ہی نہیں، با تدبیر بھی ثابت ہوئی تھی۔ میں بہت خوش تھا۔ انجانی مسرتوں کی خوشگوار پھوار میرے پیاسے دل کو سیراب کر رہی تھی۔

تاہم اس کے باوجود میرے اندر ایک پھانس بھی تھی۔ وہ پھانس نگینہ کی کبیر احمد سے دوستی کی تھی اور میں جاننا چاہتا تھا کہ اس دوستی کی نوعیت کیا تھی؟ محض دوستی تھی یا کوئی تعلق خاطر بھی تھا؟......اور اگر ان کے بیچ واقعی کوئی جذباتی وابستگی ہوئی تو......؟ اس تصور سے میرا دل بے اختیار دہل اٹھتا تھا۔ تاہم میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر ان کے درمیان ''تعلق خاطر'' کا کوئی جذبہ پنپ چکا تھا تو مجھے ان دونوں کی محبت پر شب خون مارنے کا کوئی حق نہ تھا۔ مگر میں پھر بھی ساری عمر یک طرفہ آتشِ عشق میں جلتا رہوں گا۔ یہ تصور ہی میرے لئے سوہانِ روح تھا۔

بہرطور موضوع چونکہ تازہ تھا اس لئے میں نے ہاسٹل آ کر باتوں باتوں میں کبیر احمد کو اس طرح کریدا کہ میری نگینہ سے متعلق غیر معمولی دلچسپی بھی ظاہر نہ ہونے پائے۔

اس نے بتایا کہ نگینہ پنڈی کے ہی ایک گرلز کالج میں ایف ایس سی کی طالبہ تھی۔ میری طرح اسے بھی اسپورٹس سے دلچسپی تھی۔ وہ ایک بڑے باپ کی بیٹی تھی، جس کا نام شاہ میر تھا۔ وہ محکمہ جنگلات میں گیم وارڈن (فاریسٹ آفیسر) رہ چکا تھا اور اب کنزرویٹو آفیسر تھا۔ ساتھ ہی اس کا اپنا ٹمبر مرچنٹ کا بھی کاروبار تھا جو بہت وسیع کاروباری بنیادوں پر پھیلا ہوا تھا۔ نگینہ کا ایک بڑا بھائی میر داور خان اسے سنبھالتا تھا جو شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ تھا۔

''تمہاری اس اپسرا سے کب سے دوستی ہے؟'' بالآخر میں نے اصل بات کی طرف آتے ہوئے

دوستانہ شوخی سے پوچھا۔

میری بات پر کبیر نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور میرا دل ڈوبنے لگا۔

''یار!.......دوستی تو خاصی پرانی ہے مگر.......یہ ہے ذرا لاابالی سی لڑکی۔

''کیا مطلب.......؟'' میں نے خوش امیدی سے قدرے چونک کر پوچھا۔

''بس.......اپنے دل کا کچھ پتہ نہیں چلنے دیتی۔ پل میں تولہ پل میں ماشہ۔''

''تم اپنی کہو کہ تم اس میں کس حد تک انوالو ہو؟'' میں نے کسی خاص خیال کے تحت پوچھا۔

''یار! ایسی کافر ادا حسینہ تو ہر نوجوان شخص کا خواب ہوتی ہے میں تو اسے بہت چاہتا ہوں....... مگر.......''

''مگر کیا.......؟'' میں نے جلدی سے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''یہی کہ اب تک اس نے ایسا کوئی خاص رسپانس مجھے نہیں دیا ہے۔''

''پھر بھی، کوئی عندیہ تو لیا ہوتا اس کا۔ خاصی بولڈ اور تعلیم یافتہ ہے۔ پھر تم دونوں کی دوستی بھی اتنی پرانی ہے۔ اب جھجکنے کا زمانہ کہاں رہا؟ اب تو پہلی ہی نظر میں پروپوزل دے دیا جاتا ہے۔'' میں اسے بدستور کریدے جا رہا تھا۔

''ہاں.......عندیہ تو میں نے لینے کی بارہا کوشش کی تھی اس سے۔''

''پھر.......؟'' ایک بار پھر میرا دل ڈوبنے لگا۔ وہ حسرت زدہ لہجے میں بولا۔

''میں نے کہا نا، اپنے دل کا کچھ پتہ نہیں چلنے دیتی ہے۔ ہمیشہ ٹال دیتی ہے۔''

''پھر بھی، کچھ تو کہا ہوگا.......تم سے تو بڑی گہری دوستی لگتی ہے۔ آج تو باقاعدہ تم سے کالج میں ملنے آ گئی۔''

''چھوڑو یار! میں نے کہا نا، وہ عجیب فطرت اور کھلنڈرانہ طبیعت کی مالک ہے۔ پہلے میں بھی اسی خوش فہمی میں تھا مگر پل میں تولہ پل میں ماشہ۔ اس کی ہائے ہیلو بس لڑکوں سے رہتی ہے۔ اب تم خود کو ہی دیکھ لینا، وہ تم سے راہ و رسم بڑھانے میں دیر نہ کرے گی اور تم سمجھو گے کہ تمہیں پسند کرنے لگی ہے۔''

''ہاں یار! بعض لڑکیاں فلرٹ، کریزی بھی ہوتی ہیں۔ دوسروں کو خواہ مخواہ ہی سودائی بنانے کا جنون ہوتا ہے ان میں۔'' یہ الفاظ میں نے بظاہر برا سا منہ بنا کر کہے تھے۔

میرے سینے سے بے اختیار طمانیت بھری سانس خارج ہوئی مگر میں نے کبیر احمد پر کچھ ظاہر نہ ہونے دیا۔

'ہوں.......اس کا مطلب ہے، نگینہ کہیں بھی منسوب نہیں ہے۔ اور نہ ہی کسی میں دلچسپی رکھتی ہے۔' میں نے خوش امیدی سے سوچا۔

پھر اچانک کبیر احمد نے قدرے چونک کر اسرار بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں ڈر گیا، کہیں اسے مجھ پر کسی بات کا شک تو نہیں ہو گیا۔

''یار نادر! تم میرا ایک کام کرو گے؟ دیکھو، تم میرے اچھے دوست ہو نا؟'' وہ قریب آ کر میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دوستانہ لجاجت سے بولا۔

''ہاں، ہاں....... بولو، کون سا کام ہے؟''

''تم ذرا اپنے طور پر نگینہ کو میرے بارے میں ٹٹولنے کی کوشش کرو۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے اسے گھورا۔

''ارے یار! مطلب صاف ہے، تم اس سے یونہی میرے بارے میں پوچھو کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے یا نہیں؟''

''اچھا.......تا کہ وہ ادھر سینڈلوں سے میرا سر گنجا کر دے۔ نہ بابا نہ....... میں باز آیا ایسے کاموں سے۔'' میں نے دونوں کانوں کو پکڑ کر کہا۔

''یار پلیز! دوستی کی خاطر تم اتنا بھی نہیں کر سکتے؟'' وہ دوستی جتانے لگا اور میں سوچ میں پڑ گیا۔ پھر گویا اسے ٹالنے کی غرض سے بولا۔ ''اچھا ٹھیک ہے، میں کوشش کر کے دیکھ لوں گا۔ مگر وعدہ نہیں کرتا۔''

''یہ ہوئی نا بات۔'' وہ خوش ہو کر مجھ سے لپٹ گیا۔

''اچھا، اب یہ مکھن بازی نہ کر اور مجھے پڑھنے دے۔'' میں نے اسے دھیرے سے الگ کیا۔

❋ ❋ ❋

اب مجھے بے چینی سے اگلے دن کا انتظار تھا جب میں، کبیر اور نگینہ مری کے ٹور پر روانہ ہونے والے تھے۔ ہر لمحہ نگینہ کی ہم رکابی کے جاں گداز تصور سے میرا دل عجیب سی سرشاری محسوس کرنے لگا تھا۔ نگینہ کے ساتھ اس کی چند گہری اور قریبی سہیلیوں کا ٹولہ بھی متوقع تھا۔

پروگرام یہی ترتیب پایا تھا کہ اگلے دن علی الصباح نگینہ اور کبیر اپنی اپنی گاڑیوں میں روانہ ہوں گے اور جاتے وقت مجھے یہاں کالج کیمپس سے ''پک'' کرتے چلیں گے۔

ٹور بس اس حد تک تھا کہ سرِ شام مری سے واپس لوٹ آنا تھا۔ مگر میں نے سوچ رکھا تھا کہ کم از کم ایک رات انہیں اپنے ہاں ضرور مہمان رکھوں گا۔

مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری برسوں کی امید بر آ رہی تھی نگینہ کی ہم سفری کوئی معمولی بات تو نہ تھی۔ میں نے احتیاطاً پہلے ہی فون کر کے ماموں حیدر گل کو دوستوں سمیت اپنی آمد کے بارے میں مطلع کر دیا تھا۔

کبیر احمد حسب معمول کالج ٹائم کے بعد اپنے گھر جا چکا تھا۔ میں نے کالج میس میں دوپہر کا کھانا کھایا اور واپس ہاسٹل روم میں آ گیا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد میں قیلولہ کرنے کا قائل تھا۔ اس لئے میں کپڑے بدل کر سونے کے لئے بیڈ پر جا لیٹا۔

شام پانچ بجے اٹھا تو میرے موبائل کی بیل گنگنا رہی تھی۔

''ہیلو.......!'' میں نے موبائل کان سے لگا کر کہا۔

''نادر!....... میں ہوں.......کبیر۔'' دوسری طرف سے اس کی آواز اُبھری۔

''ہاں کہو.......تیاری ہے نا پھر؟'' میں نے پوچھا

''نہیں یار!'' اس کی مری مری سی آواز اُبھری۔

''کیوں.......خیریت تو ہے؟'' میں نے کسی قدر چونک کر پوچھا۔

''بس یار! باقی تفصیل کالج آ کر بتاؤں گا۔ تم کل کا پروگرام کینسل سمجھو۔ میں نے یہی بتانے کے لئے فون کیا تھا۔'' اس کی آواز میں عجیب سا ارتعاش تھا۔ اس کے لہجے سے مایوسی کے علاوہ پریشانی بھی جھلک رہی تھی۔ ''اچھا پھر.......ابھی میں ذرا پریشان ہوں، کل کالج آیا تو ساری تفصیل بتا دوں گا۔ خدا حافظ!'' یہ کہہ کر اس نے مجھ سے کچھ سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا اور میں ہکا بکا سا رہ گیا۔

نہ جانے اچانک کیا ہوا تھا؟ میں سوچ میں پڑ گیا۔ مجھے کبیر کا لب و لہجہ حد درجہ پریشان سا محسوس ہوا تھا۔

''کک...... کہیں خدانخواستہ ...... نگینہ کی طبیعت تو اچانک خراب نہیں ہوگئی تھی؟'' میں پریشانی سے بڑبڑایا۔ آخر کبیر کو مجھے کچھ تو بتانا ہی چاہئے تھا۔ ایسی بھی کیا پریشانی تھی کہ اس نے موبائل پر مجھ سے مزید بات کرنا بھی ضروری نہ سمجھا تھا۔ مجھے تفکر آمیز پریشانی نے آن گھیرا تھا۔

بہرطور میں نے اسی وقت ماموں حیدر گل کو اپنے گاؤں نہ پہنچنے کی اطلاع دی کہ کہیں وہ ہمارے انتظار میں پریشان نہ ہو جائیں۔ اس کے بعد میں پریشان کن خیالات میں گرفتار ہوگیا۔

***

اگلے دن کالج پہنچا تو کبیر نہیں آیا۔ میں نے موبائل پر اس سے رابطہ کرنے کا سوچا مگر پھر کچھ سوچ کر ارادہ بدل دیا۔ اس روز میرا کالج میں دل نہ لگا۔ میں نے میس میں جا کر دوپہر کا کھانا بے دلی سے کھایا اور اپنے روم میں آ گیا۔ مجھے ایک پل کو بھی چین نہیں مل رہا تھا۔ مجھے نگینہ کی طرف سے زیادہ فکر ہو رہی تھی۔ ساتھ ہی مجھے کبیر احمد پر بھی غصہ آ رہا تھا جس نے ادھوری بات کر کے مجھے بھی پریشان کر دیا تھا۔

بالآخر میں نے کبیر کے گھر جانے قصد کیا۔ اس کا گھر کالج سے زیادہ دور نہ تھا۔ کبیر کے والد نظر حیات کی نیو پنڈی صدر کے علاقے میں عالی شان کوٹھی تھی۔ وہ اکثر مجھے لے جایا کرتا تھا۔ میرے پاس موٹر بائیک تھی۔ میں اس پر سوار ہو کر اس کے گھر حیات لاج کی طرف روانہ ہوگیا۔ پندرہ بیس منٹ بعد میں لیاقت باغ سے گزرا اور صدر کے علاقے میں داخل ہوگیا۔ چیڑ اور صنوبر کے درختوں کی چھاؤں میں گھری قطار اندر قطار عالی شان بنگلے اور کوٹھیاں تھیں۔ میں نے حیات لاج کے قریب اپنی بائیک روک دی۔

گیٹ پر ایک باوردی گن مین کھڑا تھا۔ وہ مجھے کبیر کے دوست کی حیثیت سے پہچانتا تھا۔ اس نے خوش خلقی سے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

''کیسے ہو تم؟ ٹھیک ہو نا؟''

''جی صاحب!...... دعا ہے آپ کی۔'' وہ ایک پہاڑی شخص تھا۔

''کبیر احمد ہوگا اندر؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں ...... آیئے ...... چھوٹے صاحب اندر ہی ہیں۔'' اس نے مہذبانہ انداز میں مسکرا کر کہا اور بڑے سے آہنی گیٹ کا بغلی دروازہ کھول دیا۔

میں نے اندر قدم رکھا تو پودوں اور پھولوں کی خوشگوار مہک میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ یہاں بنگلوں کا رنگ زیادہ تر سفید ہی ہوتا ہے۔ میں پختہ روش پر کھڑا تھا۔ روش کے دونوں جانب سرسبز لان تھا جہاں خوشنما پھول رنگِ بہار بکھیر رہے تھے۔ دیوار کے ساتھ ساتھ گارڈینیا (موگرا) کی باڑ نے پوری کوٹھی کا احاطہ کر رکھا تھا۔ اسی طرح روش کے دونوں طرف بھی آبیاری کی گئی تھی۔ خوشنما پھول کھلے ہوئے تھے۔ پورٹیکو میں نئے ماڈل کی ڈبل کیبن انٹرکولر جیپ کھڑی تھی۔ یہ پہاڑی علاقوں میں چلنے والی ایک لاجواب فیملی پک اپ گاڑی تھی۔ یہ کبیر احمد کا شوق تھا۔ ایک ٹویوٹا کرولا بھی تھی جو اس وقت نظر نہیں آ رہی تھی۔ پورٹیکو کے اوپر خوب صورت ٹیرس تھی۔ وہاں فیس ریلنگ سے جھانکتے ہوئے گملوں میں گیندے کے پھول نظر آ رہے تھے جبکہ دائیں بائیں لان میں سفیدے کے خوبصورت مخروطی انداز میں تراشیدہ پیڑ سبک خرام ہواؤں میں جھوم رہے تھے۔ سامنے روش کے اختتام پر کوٹھی کا مرکزی دروازہ تھا جو ساگوان کی لکڑی کا تھا۔ جسے ایک خاص وسیع و عریض اور سیمنٹ کی پختہ محراب کے اندر نصب کیا گیا تھا۔ دائیں بائیں بیگونیا، کولیس کے خوشنما پھولوں کے گملے بھی نظر آ رہے تھے مگر ان کے پتے بھی اتنے

ہی دیدہ زیب تھے۔

گن مین، جس کا نام بابو خان تھا، وہ مجھے دروازہ کھول کر اندر لے آیا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ بابو خان وہاں موجود ایک ادھیڑ عمر ملازمہ کو اندر میری اطلاع دینے کی تاکید کر کے واپس لوٹ گیا۔

میں نے ذرا کھڑے کھڑے یونہی کمرے کا طائرانہ جائزہ لیا۔ دیواروں پر شکاری جانوروں کے سر نصب تھے۔ جبکہ کئی نایاب پرندوں اور آئی بیکس کے حنوط شدہ مجسمے بھی نظر آ رہے تھے۔ ایک طرف دھاڑتے ہوئے انداز میں بھس بھرا تیندوا بھی کھڑا نظر آ رہا تھا جس پر اصل ہونے کا گمان ہوتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کبیر اندر داخل ہوا۔

''مجھے پورا یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔'' وہ مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''بیٹھو......!''

''یار! خیریت تو ہے؟ تم......؟''

''ہاں، بتا رہا ہوں۔ پہلے یہ بتاؤ، کیا پیو گے؟'' وہ میری بات کاٹ کر یکدم بولا۔

''کچھ نہیں یار! جی نہیں چاہ رہا۔'' میں نے بے دلی سے کہا۔ مگر کبیر نے ملازم سے کولڈ ڈرنک لانے کا کہہ ہی دیا اور میرے سامنے والے صوفے پر براجمان ہوگیا۔ وہ ہلکے پھلکے گھریلو لباس میں تھا اور پیروں میں سوفٹی پہن رکھی تھی۔

''یار! آخر بتاؤ تو...... کیا بات ہے؟ یہ اچانک تم لوگوں کا پروگرام کیوں کینسل ہوگیا؟'' میں نے بے چینی سے پوچھا تو وہ ایک گہری متفکر سی ہنکاری خارج کر کے بولا۔

''بس یار نادر! کیا بتاؤں۔ ایک ٹریجڈی ہوگئی۔''

''کیسی ٹریجڈی؟'' میں نے یکدم قدرے پریشان ہو کر پوچھا اور جانے کیوں نگینہ کے متعلق میں کچھ پوچھتے پوچھتے رہ گیا۔

''ٹریجڈی تو نہیں البتہ کچھ مخدوش اور عجیب ہی صورت حال سے دوچار رہے ہیں۔ ایک بہت ہی عجیب سی، پراسرار اور سنگین صورتِ حال۔''

''ارے یار کبیر! تم کیا عورتوں کی طرح پہیلیاں بجھوانے لگے۔ اب کچھ بتا بھی چکو۔'' میں نے آخر تنگ آ کر جھنجلائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''نگینہ ہے نا......''

''ہاں ...... کیا ہوا نگینہ کو......؟'' میں نے یکدم دھڑکتے دل کے ساتھ اور پریشان کن بے قراری سے پوچھا۔

''اس پر کل سہ پہر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔''

''کک...... کیا......؟'' میں لرز اُٹھا۔

''ہاں ...... لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ اس حملے سے بال بال بچ گئی۔'' کبیر احمد نے بتایا۔

میرا دل جیسے رک رک کر دھڑکنے لگا۔

''کک...... کیسی ہے اب وہ؟...... کہاں ہے؟'' میں نے اپنی بے ترتیب دھڑکن پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے تشویش آمیز لہجے میں پوچھا۔

''وہ بالکل ٹھیک ہے اور اپنے گھر پر ہی ہے۔'' وہ بولا۔

''مجرم کون تھے؟ کس نے یہ حملہ کیا تھا اور کیوں؟'' دوسرے ہی لمحے میں نے مضطربانہ انداز پوچھا۔ نگینہ پر قاتلانہ حملے کی اندوہناک خبر نے مجھے یہ بھلا دیا تھا کہ میرا اس کے لئے اس قدر پریش ہونا کبیر کو کھٹکا سکتا تھا۔

''پتہ نہیں یار! ہم خود پریشان ہیں۔ آخر ہمارا کون دشمن بنا بیٹھا ہے؟ مجرم تو ہمیشہ کی طرح فرار ہو میں کامیاب ہو چکا تھا۔'' اس نے قدرے مضطربانہ لہجے میں بتایا۔ اور میں اس کے ''ہمارا'' کے صیغہ کا پر چونک سا گیا۔

''ہمارا سے کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا وہ پراسرار دشمن......؟'' میں نے یونہی دانستہ اپنا جملہ ادھ چھوڑا تو کبیر پُرسوچ انداز میں سر ہلا کر صراحت سے بیان کرنے لگا۔

''ہاں......وہ جو کوئی بھی ہے، ہمارا مشترکہ دشمن ہے۔ اس سے پہلے وہ نگینہ کے باپ شاہ میر پر دو مرتبہ قاتلانہ حملہ اور ایک بار ان کی کوٹھی پر فائرنگ بھی کر چکا ہے۔ یہی نہیں، اس پراسرار حملہ آور میرے ڈیڈی پر بھی دو مرتبہ حملہ کیا اور بالکل اسی طرح ہماری کوٹھی پر بھی اندھا دھند فائرنگ کر چکا ہے۔''

اتنا بتا کر وہ ایک ثانیے کے لئے رکا اور بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔

''سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ آخر کیا گھن چکر ہے؟''

''تم لوگوں نے اس نامعلوم حملہ آور کے خلاف پولیس میں رپورٹ تو ضرور درج کرائی ہو گی؟'' میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''ہاں......کرائی تو ہے۔ مگر پولیس کا حال تو تمہیں معلوم ہے۔ وہ اندھیرے میں محض ٹامک ٹوئیاں مارنے کے سوا اور کچھ بھی نہیں کر پائی ہے۔''

اس کی گفتگو نے مجھے ایک عجیب سی اُلجھن آمیز پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ نگینہ پر قاتلانہ حملے کی خ نے تو مجھے ایک لمحے کو بالکل سن کر کے رکھ دیا تھا۔ مگر پھر اس کے بال بال بچ جانے پر میں نے ـ اختیار اطمینان کی سانس لی لیکن یہ بات میرے لئے بہر حال باعثِ تشویش ہی تھی کہ آخر ان لوگوں کا اي وہ کون پُراسرار دشمن ہو سکتا ہے جو بیک وقت اتنی دیدہ دلیری سے ان دونوں خاندانوں کے مکینوں کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا؟ تاہم کبیر نے مزید انکشاف کیا کہ حملہ آور ہمیشہ تین چار کی تعداد میں ہوتے تھے سبھی ایک پوٹھوہار جیپ میں سوار ہو کر آتے تھے یا موٹر سائیکلوں پر۔ اور ان کے چہروں پر ہمیشہ نقاب چڑھے ہوتے تھے۔ نیز کبیر نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ نگینہ اور کبیر کے والد، شاہ میر اور نظر حیات آپس میں بہت پرانے اور گہرے دوست تھے۔ جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا ہے کہ نگینہ کے والد شاہ میر محکمہ جنگلات کے کنزرویٹو آفیسر تھے۔ جبکہ کبیر علی کے ڈیڈی سرکاری ٹھیکے دار تھے اور وہ عمارتی لکڑیوں کے ٹھیکے ل کرتے تھے۔ اس طرح ان دونوں کے بیچ دوستی کے علاوہ کاروباری لین دین بھی چلتا رہتا تھا بلکہ دونو کی دوستی کی بنیاد ہی یہی تھی۔

''یار کبیر! تم نے کبھی اپنے ڈیڈی کو اس بارے میں کریدنے کی کوشش کی ہے کہ آخر ان کی کسی سے کوئی دیرینہ چپقلش تو نہیں چل رہی؟'' چند ثانیے کی پُرسوچ خاموشی کے بعد میں نے اپنے ذہن میں اُبھرنے والے ایک خیال کے تحت اس سے پوچھا۔

''ہاں۔'' وہ صوفے پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدل کر بولا اور بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ ''بلکہ میں نے ہی نہیں، نگینہ نے بھی اپنے پپا کو اس بارے میں کریدنے کی کوشش کی تھی مگر انہوں نے اس بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ لیکن میری طرح نگینہ کو بھی اس بات کا شبہ ہے کہ ہمارے ڈیڈی ہم سے کچھ

چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''مگر یار! آخر تفتیشی آفیسر کے سامنے انہوں نے اپنے شک کا اظہار تو کیا ہی ہو گا؟'' میں نے پوچھا وہ نفی میں سر ہلا کر بولا۔

''پولیس کو بھی انکل اور ڈیڈی نے یہی مشترکہ بیان دیتے ہوئے بتایا ہے کہ ان کی کسی کے ساتھ دشمنی ہیں ہے اور نہ ہی ماضی میں کبھی کسی سے ان کا کوئی اتنا سنگین تنازعہ رہا ہے کہ کوئی یوں ان کی جان کا ری بن بیٹھے۔''

''عجیب ہی چکر لگتا ہے۔ کوئی بلاوجہ آخر کیوں اتنا انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہوا کہ پہلے اس نے نگینہ رتمہارے ڈیڈی پر قاتلانہ حملہ کیا، اس کے بعد اب اس پراسرار حملہ آور کی دشمنی اس قدر سنگین صورت ختیار کر چکی ہے کہ اب وہ ان کی اولادوں کو بھی نشانہ بنانے پر تلا ہوا ہے۔''

''ہاں......میرے ڈیڈی کو تو اب میری طرف سے بھی فکر ستانے لگی ہے۔ انہیں خدشہ ہے کہ نگینہ ں طرح اب نامعلوم حملہ آور مجھے بھی ٹارگٹ بنائیں گے۔'' کبیر احمد نے مرتعش سے لہجے میں بتایا۔ میں نے اس کے لرزیدہ لہجے میں پنہاں خوف کو صاف محسوس کیا تھا۔

''یار کبیر! یہ تو واقعی بہت تشویش ناک بات ہے۔ تم لوگوں کو اس سنگین مسئلے پر سنجیدگی کے ساتھ سوچنا ہو گا اور جلد سے جلد نامعلوم دشمنوں کا کھوج بھی لگانا ہو گا۔''

میرے لہجے میں تشویش تھی۔ مجھے سب سے زیادہ فکر نگینہ کی تھی۔ بھلے خاموش سہی مگر وہ میری پہلی ور آخری محبت تھی۔ اسے خدانخواستہ کچھ ہو جاتا تو میں تا عمر لق و دق صحرا کا مسافر بن کر رہ جاتا۔

''یار! تمہارے والدین کوئی معمولی حیثیت تو نہیں رکھتے۔ انہیں پولیس ڈیپارٹمنٹ کے اعلیٰ افسران سے مدد لینا چاہئے۔'' میں نے کہا۔

''ایس پی وجاہت قریشی، ڈیڈی کے قریبی دوستوں میں سے ایک ہیں۔ اس کے علاوہ ڈیڈی اور نکل شاہ میر (نگینہ کے والد) نے کمشنر سے بھی رابطہ کیا ہے۔ مگر بات پھر وہیں پر آ کر رکتی ہے کہ ڈیڈی ر انکل شاہ میر آخر کسی پر اپنے شک کا اظہار تو کریں تا کہ پولیس انتظامیہ بھی کچھ ہاتھ پاؤں ہلا سکے۔ نض نامعلوم اور پراسرار دشمنوں کا کھوج لگانا ناممکن حد تک مشکل ہی نظر آتا ہے۔''

اس دوران ادھیڑ عمر ملازمہ ایک ٹرے میں کولڈ ڈرنک کے چار گلاس رکھ کر جا چکی تھی۔

چند ثانیے کبیر اپنے گلاس کے مشروب کی سطح پر تیرتی ہوئی برف کی ڈلیوں کو پُرخیال نظروں سے گھورتا ہا پھر میں نے ہی اس خاموشی کو توڑا اور بولا۔

''تم لوگوں نے اپنی طرف سے کوئی احتیاطی تدابیر کر رکھی ہیں؟''

''ہاں......'' اس نے ایک گھونٹ لیا۔ ''ڈیڈی نے اپنے طور پر مسلح گارڈز تو رکھ لئے ہیں۔'' ابھی س نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک اس کے کُرتے کے سائیڈ پاکٹ میں رکھے موبائل کی بیل گنگنائی۔

''ہیلو......'' اس نے موبائل جیب سے نکال کر کہا۔

''ارے نگینہ!......تم کیسی ہو؟......کہاں سے بول رہی ہو؟''

نگینہ کے نام پر میرا دل بے طرح دھڑکنے لگا اور میں نے اپنی بے چین نظریں کبیر کے چہرے پر فوکس کر دیں۔

''ہاں......میں نے نادر کو پروگرام کے کینسل ہونے کی اطلاع کر دی تھی۔ بلکہ وہ بے چارہ خود بھی ریت معلوم کرنے یہاں آ گیا ہے۔ میرے پاس ہی بیٹھا ہے۔ ہاں ہاں، میں نے اسے ساری بات بتا

دی ہے۔ وہ تمہاری طرف سے پریشان ہو رہا تھا۔ لو، بات کرو گی نادر سے؟''

وہ مجھے موبائل دینے کی نیت سے نگینہ سے بولا۔ میرا دل یکبارگی ایک گداز خیال سے دھڑکا۔

''کیا؟...... اچھا، پھر ایسا کرو تم مت آؤ۔ ہم دونوں خود ہی آ جاتے ہیں۔ چند بلاک چھوڑ کر تمہارا گھر ہے...... او کے، خدا حافظ!'' یہ کہہ کر اس نے موبائل آف کیا اور دوبارہ جیب میں ر ہوئے اٹھ کر مجھ سے بولا۔

''چلو نادر! نگینہ کے ہاں چلتے ہیں۔''

نگینہ کی مزاج پرسی کا موقع، یہ تقاضائے اخلاق بھی تھا اور کچھ دلِ نادان کا اشتیاق بھی۔ اس لئے فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔

پھر ہم دونوں باہر پورٹیکو میں آ گئے۔ کبیر اسی لباس میں تھا۔ وہ چابیوں کا گچھا لہراتے ہوئے کیبن انٹر کلر کی ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہوا اور میری طرف کے دروازے کا لاک کھول کر اسے و دیا۔ میں بھی اس کے برابر والی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک دو بار ہارن دے کر گن مین کو گ کھولنے کے لئے باخبر کیا اور پھر گیٹ کھلتے ہی وہ ڈبل کیبن انٹر کلر پک اپ کو تیزی سے ریورس میں ہوا باہر سڑک پر آ گیا۔

نگینہ سے دوبارہ ملنے کے مسرت آگیں تصور نے مجھے نہال کر دیا تھا لیکن اس بار سرخوشی کے پُرکیف احساس میں ایک بے چینی بھی پنہاں تھی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں نگینہ کے اس بزدل د کی بوٹیاں نوچ لوں جس نے میری محبوب ہستی نگینہ کو جان سے مارنے کی جرأت کی تھی۔ دس منٹ اندر اندر ہم نگینہ کی پُرشکوہ کوٹھی پر پہنچ چکے تھے۔

اس کوٹھی کی شان بھی کبیر احمد کی کوٹھی سے کم نہ تھی۔ ہم جب نگینہ کی کوٹھی کے بڑے سے گیٹ قریب پہنچے تو میں نے گیٹ سے ایک سفید رنگ کی لینڈ کروزر کو باہر نکلتے دیکھا تھا جس کی چھت پر ہوٹر اور مخصوص مونوگرام سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی اعلیٰ پولیس افسر کی گاڑی ہے۔ اس میں چند باو پولیس والے بھی بیٹھے تھے۔ میں نے سفید سوٹ میں ملبوس ایک شخص کو بھی ڈرائیور کے برابر میں برا دیکھا تھا۔ بعد میں کبیر نے مجھے بتایا تھا کہ یہ ایس پی وجاہت قریشی تھے۔

بہرطور جب ہماری گاڑی اندر داخل ہوئی تو میں نے دو مسلح باڈی گارڈز کی معیت میں ایک قامت مگر خاصی گٹھی ہوئی جسامت والے پختہ عمر شخص کو کوٹھی کے مرکزی دروازے کی طرف بڑھتے ہ دیکھا۔ اس نے گرے کلر کا سفاری سوٹ پہن رکھا تھا۔ ہماری گاڑی کی آواز پر وہ چونک کر رکا اور ہ طرف رخ کر کے کھڑا ہو گیا۔

''یہ نگینہ کے ڈیڈی انکل شاہ میر صاحب ہیں۔'' کبیر نے ہولے سے مجھے بتایا۔ پھر کبیر نے گاڑی کار پورچ کے قریب روک دی اور ہم اتر کر سیدھے نگینہ کے ڈیڈی کی طرف بڑھے۔ ان کے شیو چہرے پر حد درجہ سنجیدگی طاری تھی۔

''السلام علیکم انکل!'' کبیر نے ادب سے انہیں سلام کیا۔ کبیر کو دیکھ کر شاہ میر کے چہرے پر شا مسکراہٹ ابھری۔

''یہ میرے دوست ہیں نادر...... نادر علی خان۔'' کبیر نے ان سے میرا تعارف کروایا تو میں بھی مسکرا کر ان سے مصافحہ کیا۔

''آؤ...... اندر ہی آ جاؤ۔'' وہ دروازے کی طرف مڑتے ہوئے بولے اور ہم دونوں ان کے ع

یں اندر داخل ہو گئے۔

اندر کا ماحول سینٹرلی ایئر کنڈیشننگ کی وجہ سے خاصا سرد ہو رہا تھا۔

دبیز اور منقش قالین پر چلتے ہوئے ہم سبز رنگ کے صوفوں کی طرف بڑھے تو شاہ میر صاحب نے ہمیں ان پر بیٹھنے کو کہا اور خود اپنی بیٹی کو مطلع کرنے دوسرے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

یہاں بھی دیواروں پر حنوط شدہ شکاری جانوروں کے سر لگے نظر آ رہے تھے۔

ایک کونے میں تیندوے کا بھس بھرا اصلی کھال کا چنگھاڑتا ہوا مجسمہ دکھائی دیا اور پھر دوسرے میں آئی بکس کا بھی بالکل ایسا ہی حنوط شدہ وجود ایستادہ تھا۔

میں اور کبیر خاموشی سے صوفوں پر براجمان ہو گئے۔

میرا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ کبیر بھی مضطربانہ انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔ پھر ذرا ہی دیر بعد جس دروازے سے شاہ میر صاحب غائب ہوئے تھے، وہاں سے نگینہ نمودار ہوئی۔ میں چونکہ مذکورہ دروازے کے رخ پر ہی بیٹھا ہوا تھا اس لئے سب سے پہلے ہم دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر بڑی دلکش سی مسکراہٹ اُبھری۔ ہمیشہ کی طرح وہ گلاب کی مانند نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے یا انداز میں کوئی خوف یا کسی قسم کی پریشانی کا ذرا بھی شائبہ نہ تھا۔ میں اسے دیکھ کر فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔

اس نے ہلکے نارنجی کلر میں چکن کا بیش قیمت سوٹ زیب تن کر رکھا تھا جس میں اس کی گلاب سی رنگت کا گل بدن مزید نکھرا اور ستھرا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے بدستور میری طرف دل موہ لینے والی مسکراہٹ سے تکتے ہوئے فوراً مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کا نرم و گداز اور پھول سا نازک ہاتھ تھام کر جیسے میرے وجود میں برقی لہر دوڑ گئی۔

''ہائے نادر! کیسے ہو؟'' وہ مجھ سے مترنم لہجے میں بولی۔

''آئی ایم فائن۔'' میں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ پھر وہ کبیر سے ملی اور اس کے ذرا قریب صوفے پر براجمان ہو گئی۔

''نادر! میں معذرت خواہ ہوں کہ ہمارا پروگرام میری وجہ سے کینسل ہو گیا۔'' وہ خجالت آمیز لہجے میں بولی تو میں نے اس کی بات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اس کی خیریت پوچھی۔

''نگینہ! مجھے بہت دکھ ہوا یہ سن کر کہ تم پر قاتلانہ حملہ ہوا۔''

میری بات پر وہ بے خوف انداز میں ذرا ہنسی، پھر بولی۔

''مگر مجھے سب سے زیادہ افسوس ملکہ کوہسار کی سیر کے ملتوی ہونے پر ہوا۔ بلکہ میں تو چاہ رہی تھی کہ چلے چلتے مگر پپا نے اجازت نہ دے کر سارے ایڈونچر کا سوا ستیاناس کر ڈالا۔''

''اوہو...... نگینہ! ہماری جان پر بنی ہوئی ہے اور تمہیں ایڈونچر کی سوجھ رہی ہے۔ آخر تم سنجیدگی سے اس مسئلے کو ٹچ کیوں نہیں کرتی ہو؟'' کبیر نے جھلا کر اس سے کہا تو نگینہ نے لاابالی پن سے کہا۔

''موت ایک دن آنی ہے تو اس سے کیوں ڈرا جائے؟ خواہ مخواہ کسی انجانے خوف میں مبتلا ہو کر اپنا خون جلانے کا کیا فائدہ؟''

''بے شک نگینہ! موت کا ایک وقت معین ہے۔ لیکن جان بوجھ کر اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنا بھی تو دانشمندی نہیں ہوتی۔ آپ کو بہرحال محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔'' میں نے ذرا سنجیدگی سے کہا۔

''نادر بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے نگینہ!'' کبیر نے میری بات کی فوراً تائید کرتے ہوئے کہا۔

''اوہو...... بھئی یہ تم دونوں نے کیا بڑے بوڑھوں کی طرح مجھے نصیحت کرنا شروع کر دی ہے۔''

پلیز! فارگیٹ اِٹ۔'' نگینہ نے کھلنڈرے پن سے کہا۔ ''اچھا یہ بتاؤ، کیا پیو گے تم دونوں؟''

''سردست تو ہم تمہاری باتیں سن کر اپنا ہی خون پی رہے ہیں۔'' کبیر نے زچ ہو کر کہا تو نگینہ بے اختیار کھنک دار قہقہہ بلند کیا۔ اس کے موتیوں کی لڑی جیسے سفید دانتوں کی جھلک مجھے بڑی بھلی مح ہوئی تھی۔ پھر اس نے ملازمہ کو آواز دی۔ میں نے منع کرنا چاہا مگر اس نے ملازمہ کو بلا کر کولڈ ڈ لانے کا کہہ ہی ڈالا۔

''نگینہ! ایک بات بتاؤ؟'' میں نے ہولے سے کھنکار کر کہا۔ وہ میری طرف دیکھنے لگی۔ ''کیا تم اس حملے کی تھوڑی تفصیل بتانا پسند کرو گی؟''

اس نے آنکھیں بند کر کے ایک گہری مگر قدرے خوشگوار چہرے کے تاثرات کے ساتھ ہمکاری بھر ''شکر ہے .... کسی نے تو مجھ سے اس انداز میں تفصیل پوچھی۔'' پھر لمحہ بھر توقف کے بعد بتا لگی۔ ''میں کل سہ پہر ہلکی پھلکی شاپنگ کے لئے صدر بازار گئی تھی۔ کار میں خود ڈرائیو کر رہی تھی۔ ہلکی پھلکی شاپنگ میں تنہا ہی کرنے جاتی ہو۔ واپسی میں اپنی ایک سہیلی عروسہ سے مل کر ایوب نیشنل پا سے گزرنے لگی تو ایک پرانے ماڈل کی ٹویوٹا کرولا کار نے عقب سے میری کار پر فائرنگ کر ڈالی۔ مے گاڑی کے سارے شیشے چکنا چور ہو گئے۔ مگر شکر رہا کہ کسی گولی نے میرا مزاج نہ پوچھا۔ میں پہلے تو اچانک حملے پر بوکھلا سی گئی لیکن پھر دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے حواس پر قابو پایا اور کار کی ر خطرناک حد تک بڑھاتی ہوئی کافی دور نکل گئی۔''

اتنا بتا کر وہ خاموش ہو گئی۔ میں چند ثانیے پُرسوچ نظروں سے اس کا چہرہ تکتا رہا، پھر توصیفی لہجے اس سے بولا۔

''یہ تم نے بہت بہادری کا کام کیا کہ بروقت کار دوڑا لے گئیں۔ خیر!'' میں نے لمحہ بھر توقف کے اصل بات کی طرف آتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔ ''کیا تم نے ان نامعلوم حملہ آوروں کے چہرے دیکھنے کوشش کی تھی؟ یا وہ تعداد میں کتنے تھے؟''

میرے استفسار پر وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر قدرے گومگو سے لہجے میں بولی۔

''میرے عقب میں چونکہ کچھ خاص ٹریفک نہ تھی اس لئے جب ان حملہ آوروں کی کار عقب میرے ذرا قریب آئی تھی تو اچانک غیر ارادی طور پر میری نگاہ اپنی گاڑی کے بیک ویو مرر پر پڑی تھ بس ایک سرسری سی نظر میں مجھے اگلی سیٹوں پر دو افراد بیٹھے دکھائی دے گئے تھے۔ پھر اس کے اگلے لمحے میری کار پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ میں نے بریک لگانے کے بجائے فوراً ایکسیلیٹر دبا دیا۔ میری گا کا عقبی شیشہ چکنا چور ہو گیا تھا۔''

''حملہ آوروں نے کتنی دور تک تمہارا پیچھا کیا تھا؟'' میں نے پوچھا تو کبیر احمد بیزار ہو کر درمیان جھلا کر مجھ سے بولا۔

''ارے یار!......... تم نے کیا پولیس والوں کی طرح تفتیش شروع کر دی ہے۔ پولیس یہ سار سوالات پہلے ہی نگینہ سے کر چکی ہو گی۔''

''نہیں کبیر!......... نادر کو پوچھنے دو۔'' نگینہ نے گہری متانت کے ساتھ کبیر کو ٹوکتے ہوئے ''میں جانتی ہوں .... پولیس محض ضابطے کی کارروائی نمٹا کر اور ہمیشہ کی طرح طفل تسلی دیتے ہو چل دیتی ہے۔''

''اوہو .... بھئی تو پھر یہ نادر میاں کیا کر سکتے ہیں بھلا؟ پولیس تو اب تک کچھ نہیں کر پائی ہے۔''

کبیر کی جھلاہٹ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس کی بیزاری کو دیکھتے ہوئے میں نے بھی گہری متانت ے ساتھ اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''کبیر! نگینہ اور تمہارے ڈیڈی پر دو نامعلوم حملہ آور دو دو مرتبہ قاتلانہ حملہ کر چکے ہیں۔ اب ان لوں کے ناپاک عزائم اس قدر خطرناک نہج پر آ پہنچے ہیں کہ ان بزدلوں نے نگینہ پر بھی قاتلانہ حملہ کر الا........ اور خدانخواستہ تم پر بھی یہ آفت نازل ہو سکتی ہے۔ لیکن میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگوں و محض پولیس پر بھروسہ کرتے ہوئے یوں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھے رہنا چاہئے۔''

''ذیٹس رائٹ۔'' نگینہ فوراً چمک کر بولی۔ اس کے گل رنگ چہرے سے ایکا ایکی جوش ظاہر ہونے لگا ۔ پھر وہ میری تائید میں کبیر سے مزید بولی۔ ''نادر بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے کبیر! تم خود سوچو، ہم ان پے پے حملوں میں کتنی بار بال بال بچے .... ہمیں کم از کم اپنے طور پر بھی تو کچھ ہاتھ پاؤں ہلانا ہوں گے۔''

''مگر ہم کیا کر سکتے ہیں؟ .... جبکہ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہمارا دشمن کون ہے جو سات پردوں ں چھپا بیٹھا ہے۔'' کبیر نے اس بار قدرے تفکر آمیز لہجے میں کہا تو میں مستحکم انداز میں بولا۔

''دیکھو کبیر! تم لوگوں کے مشترکہ دشمن کا کھوج تم دونوں کو اپنے گھر کے سوا کہیں سے نہیں مل سکتا۔ ں چاہتا ہوں تم دونوں کسی طرح اپنے بڑوں کو کریدنے کی کوشش کرو۔ معاف کرنا، شاید تم دونوں کو میری ت بری لگے لیکن موجودہ سنگین حالات میں یہ اشد ضروری ہے کہ تم دونوں اپنے بڑوں کا ماضی کریدنے ں کوشش کرو .... مگر اپنے اپنے طور پر۔ مجھے پورا یقین ہے کہ تمہارے نامعلوم دشمنوں کا سراغ اسی رح لگ سکتا ہے۔''

میری بات پر چند ثانیے کے لئے ماحول پر خاموشی چھا گئی۔ کبیر کا چہرہ تو بے تاثر ہی رہا البتہ نگینہ بڑی ہری دلچسپی کے ساتھ میری باتوں پر غور کرتی محسوس ہو رہی تھی۔

''مجھے تمہاری بات سے پورا اتفاق ہے۔'' چند ثانیے کی پُرخیال خاموشی کے بعد بالآخر نگینہ نے میری رف دیکھ کر ٹھوس لہجے میں کہا اور مزید بولی۔ ''اِٹ اِز فیکٹ .... کہ دشمنی کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے اور اس وجہ سے یقیناً ہمارے بڑے بہ خوبی واقف ہوں گے۔''

میں نے اس کی بات کے اختتام پر فوراً ایک پُرمغز لقمہ دیا۔ ''اور میں سمجھتا ہوں کہ اس وجہ کا تمہارے ے ذکر نہیں کرنا چاہتے ہیں۔''

''نہیں، ایسی کوئی بات قطعاً نہیں ہو سکتی۔'' کبیر نے پورے وثوق کے ساتھ نفی میں سر ہلاتے ہوئے ہا۔ ''بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ہمارے ڈیڈی اپنے دشمن سے واقف ہوں اور اتنے جان لیوا قاتلانہ لوں کے باوجود وہ پولیس کو اپنے دشمن کا نام بتانے سے بھی گریز کریں........؟''

''کیا خبر .... ان کی کوئی مصلحت آڑے آ رہی ہو؟'' میں نے جرح کی۔

''باوجود اس کے میرا جواب نفی میں ہو گا .... کیونکہ اب تو ہمارے بڑوں کے علاوہ وہ نامعلوم دشمن یں بھی اپنا نشانہ بنانے لگے ہیں .... اور کوئی باپ یہ نہیں چاہے گا کہ اپنی مصلحت کے آگے اپنی اولاد و قربان کر دے۔''

میں نے محسوس کیا کہ کبیر کے لہجے میں قدرے تلخی سی اتر آئی تھی۔ میں نے ذرا خفیف ہو کر ہولے ے کہا۔ ''سوری یار کبیر! میرا مقصد تم دونوں کو اپنے بڑوں سے متعلق شبہے میں مبتلا کرنا نہیں تھا۔'' اتنا کہہ کر میں خاموش ہوا۔ مگر لگتا تھا کبیر کا دلی تکدر کم نہیں ہوا تھا۔ وہ بدستور اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے بڑانے والے انداز میں بولا۔

"بہرحال میں تمہاری بات کا مطلب سمجھ چکا ہوں۔ تم یہ سمجھ رہے ہو کہ ہمارے بڑوں سے ماضی
ضرور کوئی ایسی لغزش یا جرم سرزد ہوا ہے .... اسی لئے وہ نہ صرف اپنے دشمن سے بھی واقف ہیں
اس کا نام لینے سے اس لئے کترا رہے ہیں کہ .... کہیں ...."

"اوکے، اوکے .... لیو دِس ٹاپک۔" میں بدمزگی کی فضا کو بدلنے کی غرض سے اس کی بات کا
سنجیدہ لہجے میں بولا۔ مجھے دکھ ہو رہا تھا کہ کبیر نے میری بات کا غلط مطلب اخذ کیا تھا۔ اگرچہ اس کی
بھی غلط نہ تھی۔ میں ان دونوں کو جو سمجھانا چاہ رہا تھا وہ اشاروں کنایوں میں سمجھا چکا تھا۔ لیکن کبیر
سوچنے کا انداز منفی تھا۔

"کبیر ....!" اچانک نگینہ نے ذرا سخت لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر سرد انداز میں کہا۔ "تم
جذباتی ہو رہے ہو .... نادر جو بات سمجھانا چاہ رہا ہے، وہ تلخ ضرور ہے لیکن اس میں ہمارا فائدہ
پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "نادر! تم بالکل درست خطوط پر سوچ
ہو۔ میں اب اپنے پپا کو کسی نہ کسی طرح کریدنے کی کوشش کروں گی۔"

"تو گویا اب ہم اپنے والدین کی ٹوہ لینے کی کوشش کریں .... لاحول ولا ...." کبیر کا
بدستور خراب تھا۔ میں گفتگو کو ختم کرنے کی نیت سے اٹھا تو کبیر نے بھی میری تقلید کی۔ نگینہ سے رخص
ہوتے وقت میں نے اس کی دل نشیں آنکھوں میں ایک مرتبہ پھر اپنے لئے ایک بھیدوں بھری چمک
محسوس کی تھی۔

میں اور کبیر واپس گاڑی میں آبیٹھے۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ وہ گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کے چہ
سے صاف عیاں تھا کہ وہ مجھ سے کچھ خفا خفا سا لگ رہا تھا۔ میں نے بھی اس سے کوئی بات کرنا ضر
نہ سمجھا۔ لیکن مجھے دکھ کے ساتھ عجیب سی حیرت بھی ہو رہی تھی کہ آخر کبیر کو میری یہ بات بہ الفاظِ دیگر
اس قدر بری کیوں لگی تھی؟ حالانکہ میں نے تو ایک حقیقت آمیز بات کہی تھی کہ نگینہ اور کبیر کو اپنے پپا
ڈیڈی سے اس بارے میں کھل کر گفتگو کرنی چاہئے تھی کہ ان کے بڑوں کی ماضی میں کسی کے ساتھ
دشمنی تو نہیں رہی تھی؟ نگینہ نے البتہ کھلے دل سے میری اس تجویز کی تائید کی تھی۔ کیونکہ میں نے ا
باتوں سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ ان نامعلوم حملہ آوروں کا ذاتی طور پر کھوج لگانے کی نہ صرف اپ
میں خواہش رکھتی تھی بلکہ عزم بھی کر رکھا تھا۔

کبیر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا بدستور خاموشی کے ساتھ گاڑی چلا رہا تھا۔ ذرا دور جا کر اس نے ا
موڑ کاٹا تو مجھے سڑک کے دائیں کنارے پر ایک گرین کلر کی ہائی روف کھڑی نظر آئی۔ ہماری ڈبل
انٹرکولر نے جیسے ہی موڑ کاٹا اور اس کے قریب سے گزرنے لگی تو اچانک میری چھٹی حس نے خطر
الارم بجایا۔ ہائی روف کا سلائیڈنگ ڈور کھلا ہوا تھا۔ جہاں میری نظر ڈرائیور کے علاوہ دو نقاب پوشو
پڑی۔ پھر ان کے ہاتھوں میں سیاہ رائفلوں کی مہیب جھلک دکھائی دی۔ میرا دل یکبارگی زور سے
اور اگلے ہی لمحے میں حلق کے بل چیخا۔

"کبیر ....! نیچے جھک جاؤ۔"

اس کی بھی غالباً ان پر نظر پڑ چکی تھی۔ دوسرے ہی لمحے فضا میں گولیوں کی سمع خراش تڑتڑاہٹ ا
مگر میں اور میرے بروقت ہوشیار کرنے پر کبیر احمد بھی اپنا سر نیچے جھکا چکا تھا۔ گولیوں کی بھیا
تڑتڑاہٹ کے ساتھ ہی گاڑی کی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹنے کی آواز اُبھری تھی۔

"ایکسلیٹر دبا دو .... فوراً ...." میں نے نیچے سر کرتے ہوئے کبیر سے چلا کر کہا۔ وہ بری

بوکھلاہٹ کا شکار ہو گیا تھا لیکن میری بروقت ہدایات پر اس کا عمل کرنا غیرارادی ہی تھا۔ اس لئے اس کے بدحواس ہونے کے باوجود ہم دونوں ہی گولیوں کی اس خونی بوچھاڑ سے محفوظ رہے تھے۔

گاڑی کے شیشے ٹوٹنے کے علاوہ کئی گولیاں گاڑی کی باڈی میں بھی پیوست ہوئی تھیں۔

بہرطور کبیر نے جیسے ہی میری ہدایات کے مطابق ایکسلیٹر پر اپنے پاؤں کا سارا زور صرف کر دیا، ہماری گاڑی کا انجن زور سے غرایا اور ٹائروں کی چرچراہٹ کے اُبھرتے ہی وہ آندھی طوفان کی طرح دوڑنے لگی۔

ہم دونوں اب سیدھے ہو کر بیٹھ چکے تھے۔ کبیر کے چہرے پر ارتعاش تھا۔ خود میری رگوں میں خون کی گردش تیز تر ہو چکی تھی۔ ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ نامعلوم حملہ آوروں کی گرین ہائی روف ہمارے تعاقب میں تھی۔ وہ ہماری گاڑی پر اب وقفے وقفے سے فائرنگ کر رہے تھے۔

سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ اتفاق ہی تھا ورنہ ایوب پارک اور نیو پنڈی کے صدر جیسے علاقوں میں اس سے ٹریفک کا سیل رواں ہوتا ہے۔ کبیر احمد خاصی تیز رفتاری سے گاڑی دوڑائے لئے جا رہا تھا۔ اس کا رخ اب اپنے گھر کی بجائے دوسری طرف ہو گیا تھا۔

یہ سڑک دونوں طرف سے صنوبر اور چیڑ کے درختوں میں گھری ہوئی تھی جو آرمی میوزیم کے سامنے سے گزرتی تھی۔ اچانک عقب سے ایک فائرنگ کے نتیجے میں ہماری گاڑی کا عقبی شیشہ ایک زوردار چھناکے کی آواز سے ٹوٹا تو غیرارادی طور پر ہم دونوں نے اپنے سروں کو ذرا نیچے جھکائی دی۔ نتیجتاً کبیر کے اسٹیئرنگ پر جمے ہوئے دونوں ہاتھ بہک گئے۔ گاڑی چونکہ خاصی اسپیڈ میں تھی اس لئے وہ بری طرح ڈولنے لگی۔ یہ بہت جان لیوا حد تک خطرناک صورتِ حال تھی۔

"بریک مت لگانا کبیر!" میں حلق کے بل چیخا۔ "گاڑی کو آہستہ آہستہ کنٹرول کرنے کی ...." ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ بھاری بھرکم ڈبل کیبن انٹرکولر کسی شترِ بے مہار کی طرح ڈولتی ہوئی کبیر کے قابو سے باہر ہو گئی اور دائیں جانب ایستادہ درختوں کے جھنڈ کی طرف لپکی اور کبیر نے وہی غلطی کر ڈالی جس کا مجھے ڈر تھا۔ غیرارادی طور پر اس کا پاؤں بریک پیڈل پر پڑا۔ گاڑی کے ٹائر زور سے چرچرائے اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ الٹ گئی۔ یوں لگا جیسے پوری دنیا گھوم گئی ہو۔ زبردست جھٹکوں کے ساتھ بھیانک دھماکے مجھے اپنی ڈوبتی ہوئی سماعتوں میں سنائی دیئے۔ اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا ....!

❊❊❊

بے ہوشی سے ہوشمندی کی طرف لے جانے والی حس کے بیدار ہوتے ہی مجھے سب سے پہلے ایک ٹیس زدہ سی اذیت کا احساس ہوا اور تکلیف کے باعث میرے منہ سے بے اختیار کراہ آمیز سسکاری نکل گئی۔ اگرچہ ابھی میرے حواس خمسہ پوری طرح بیدار نہیں ہوئے تھے۔ لیکن جتنے بیدار ہو سکے تھے اسی سے میں نے اپنے اردگرد لوگوں کا شور سا محسوس کیا تھا۔ میرا نیم بے ہوش ذہن اندھیروں کے بھنور سے نکلنے کی ازخود مسلسل جدوجہد کر رہا تھا لیکن باوجود اس کے میں نے شاید ابھی تک آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔

پھر یوں لگا جیسے کوئی بے حس و حرکت وجود کو کھینچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اسی لمحے دوبارہ میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبنے لگا۔ ایک بار پھر دنیا و مافیہا سے رابطہ ٹوٹنے کے دوران میری نیم بیدار سماعتوں نے ایمبولینس کے سائرن کی آوازیں سنی تھی۔

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو اس مرتبہ بیک وقت میری پانچوں حسیات نے بیدار ہو کر میرے تاریک ذہن کو مکمل شعور عطا کیا تھا۔

میں نے خود کو ایک صاف ستھرے اور آرام دہ بیڈ پر پڑے پایا تھا۔ میرے نتھنوں سے ادویا مخصوص کی بُو ٹکرائی تو فوری ادراک ہوا کہ میں کسی ہسپتال کے کمرے میں تھا۔ لیکن اس بار میں اپنے ج میں کچھ خاص تکلیف محسوس نہیں کر رہا تھا۔ البتہ کراہ کا سبب جسمانی اینٹھن ہی تھا۔ میرے دائیں جان ایک ڈرپ اسٹینڈ نظر آ رہا تھا اور تب اچانک ہی میری نیم وا آنکھوں نے ایک گلرنگ چہرہ دیکھا...... نگینہ تھی۔

مجھے اپنے حلق میں کانٹوں کی چبھن کا احساس ہوا۔

''پ...... پانی......!''

میرے لرزیدہ ہونٹوں سے نکلا تھا۔ پھر اچانک ہی مجھے یوں لگا جیسے میرا ذہن دوبارہ لامتناہی تار کے گرداب میں ڈوبنے لگا ہو۔ میری نیم وا آنکھوں کے سامنے نگینہ کا چہرہ جیسے ایک لمحے کے لئے ہی محو تھا مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ پھر نظر آئی تو میں نے جسم و جاں کی ساری توانائی صرف کرتے ہوئے ذہ کو ظلمت کی دلدل میں پھنسنے سے بچایا۔ نگینہ نے مجھے ایک ہاتھ ذرا سہارا دیا تو میری رگِ جاں تک مج توانائیوں کا سمندر موجزن ہو گیا۔

اس نے پانی کا گلاس میرے متحرک لبوں سے لگا دیا تھا۔ پیاس کی شدت سے سوکھے حلق میں پا کی تراوٹ اُترتے ہی میں نے پوری طرح اپنی آنکھیں کھول دیں۔ میں نے اٹھنے کی ایک غیر ارا کوشش کی تو مجھے اپنے دائیں بازو کی نس میں چبھن کا احساس ہوا۔

''پلیز نادر!...... آرام سے لیٹے رہو۔ تمہیں ڈرپ لگی ہوئی ہے۔'' نگینہ کی مدھر آواز اُبھری۔ ''ش ہے...... تمہیں ہوش تو آیا۔''

جسمانی اور شعوری طور پر بیدار ہوتے ہی مجھے وہ سب یاد آنے لگا جس کے باعث میں یہاں ز حالت میں ہسپتال کے بیڈ پر تھا۔

''کبیر...... کیسا ہے؟ وہ کہاں ہے؟'' میں نے نگینہ کے خود پر قدرے جھکے چہرے کی طرف دیکھ متوحش سی بے قراری سے پوچھا۔

''وہ بھی ٹھیک ہے۔ تم دونوں اتنے بڑے حادثے میں موت سے بال بال بچے ہو۔'' نگینہ نے ایک طمانیت بھری سانس لے کر کہا۔ ''تمہاری طرح اسے بھی معمولی چوٹیں آئی ہیں۔''

میں نے بے اختیار ایک گہری سانس لے کر ذرا دیر کے لئے اپنی آنکھیں موند لیں۔ یہ معجزہ ہی کہ ہم دونوں نہ صرف زندہ تھے بلکہ زخم بھی معمولی آئے تھے۔ میرے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی، باقی و صحیح سلامت تھا۔

''نگینہ!...... پلیز...... نرس کو بلا کر یہ ڈرپ اتار دو۔ میں اب خود کو بہتر محسوس کر رہا ہوں۔'' نے ملتجی لہجے میں اس سے کہا تو وہ بولی۔

''ٹھہرو...... میں ڈاکٹر صاحب کو بلا کر لاتی ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

میں اور کبیر جن سنگین حالات کا شکار ہوئے تھے، وہ دوہری نوعیت کے تھے۔ ہمارے تعاقب نامعلوم حملہ آور تھے۔ پھر ہماری گاڑی بے قابو ہو کر الٹ گئی تھی۔ مگر مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ ہمار حملہ آور متعاقبین ہمیں اس حالت میں چھوڑ کر کیوں لوٹ گئے تھے؟ کیا انہیں یقین تھا کہ اس جا حادثے میں کبیر اور میں جانبر نہیں ہو سکتے تھے یا پھر کوئی اور وجہ تھی؟

بہر طور ذرا دیر بعد نگینہ کے ہمراہ ایک سفید گاؤن میں ڈاکٹر نمودار ہوا۔ اس کے ہمراہ ایک نرس

ہاتھوں میں کلپ بورڈ اور بی پی اپریٹس وغیرہ اٹھائے اندر داخل ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب خاصے پختہ عمر تھے۔ انہوں نے سیاہ رنگ کے موٹے فریم کی عینک چڑھا رکھی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''نادر صاحب! کیسا محسوس کر رہے ہیں آپ؟''

میں نے اپنی نقاہت کو خاطر میں لائے بغیر بشاشت سے مسکرا کر کہا۔

''ڈاکٹر صاحب! میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ مگر میرا دوست...... کبیر کیسا ہے؟''

وہ جواباً اسی طرح اپنے بشرے پر مسکراہٹ سجائے بولے۔ ''وہ بھی تمہاری طرح بالکل ٹھیک ہے۔ اللہ کا شکر ادا کرو میاں! تم دونوں نہ صرف معجزانہ طور پر زندہ بچے ہو بلکہ اس قدر جان لیوا حادثے میں تم دونوں کو معمولی فریکچر بھی نہیں ہوا ہے۔ بہر حال میری طرف سے نئی زندگی کی مبارک باد قبول کرو۔''

''بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب!'' میں نے ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! کیا اب میں فارغ ہوں؟''

''بالکل......'' وہ بولے۔ ''میں ذرا آخری ایک معائنہ کر لوں، اس کے بعد ایک نسخہ لکھ کر دے دیتا ہوں۔ باقاعدگی سے پانچ روز تک استعمال کرتے رہنا۔''

اسٹینڈ پر جھولتی ہوئی ڈرپ بھی نصف سے زیادہ ختم ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر نے نرس کو اسے اتارنے کا کہا۔

تھوڑی دیر بعد میں بیڈ پر ٹانگیں لٹکائے اُٹھ بیٹھا تو دروازے پر ایک شخص کو نمودار ہوتے دیکھ کر میں ذرا سا چونک گیا۔ وہ شاہ صاحب تھے، نگینہ کے پپا۔ ان کے چہرے پر بلا کی تشویش تھی۔ میں نے فوراً ہولے سے سر کے اشارے سے انہیں سلام کیا۔

''جیتے رہو بیٹے! کیسے ہو اب؟'' انہوں نے جبراً مسکرا کر مجھ سے پوچھا۔

''کافی بہتر ہوں۔'' میں نے مختصراً کہا۔

''اوکے!'' اتنا کہہ کر وہ قریب کھڑے ڈاکٹر سے مخاطب ہوئے۔ ''کیا آپ انہیں اب ڈسچارج کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟''

''جی ہاں......'' ڈاکٹر صاحب نے کہا اور نرس کے ساتھ کمرے سے نکلتے چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد میرا ڈسچارج کارڈ ایک وارڈ بوائے لے کر آیا۔ میں سہارے کے بغیر چل سکتا تھا۔ کبیر کا کمرا بھی میرے برابر ہی تھا۔ اس کے سر پر اور دائیں بازو پر بینڈیج تھی۔ اس کے ڈیڈی نظر حیات وغیرہ بھی اس کے ہمراہ تھے۔ چار عدد باوردی پولیس اہلکاران کے ہمراہ تھے۔ اس کے علاوہ شاہ میر اور نظر حیات کے مسلح محافظ بھی چوکس انداز میں وہاں موجود تھے۔

ہم سب ہسپتال کی عمارت سے باہر آئے تو کشادہ احاطے میں دو کاریں کھڑی تھیں۔ نگینہ مجھے لئے ایک کار کی طرف بڑھ گئی۔ وہاں باوردی شوفر مستعد کھڑا تھا جس نے لپک کر ہمارے لئے دروازہ کھولا تھا۔ میں اور نگینہ عقبی سیٹوں پر براجمان ہو گئے جبکہ شاہ میر صاحب ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر تھے۔ ایک پولیس افسر کی نیلی جیپ بھی وہاں موجود تھی۔ نظر حیات کے ہمراہ چار پولیس گارڈ اور ایک پولیس آفیسر بھی تھا، جس کے شولڈر اور سینے پر لگے پھولوں سے وہ ایس پی رینک کا افسر نظر آ رہا تھا۔ ہماری گاڑی میں سب کے براجمان ہوتے ہی تینوں گاڑیاں ہسپتال سے روانہ ہو گئیں۔ ان گاڑیوں کی منزل کبیر کے والد نظر حیات کی رہائش گاہ تھی۔

مجھے اب اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔ میں واپس اپنے ہاسٹل جانا چاہتا تھا مگر مجبور تھا۔ کیونکہ کم از کم ڈیڑھ

دو گھنٹوں سے پہلے میں یہاں سے ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ ایس پی نے، جن کا نام مظفر حسین تھا اور جو نظ حیات اور شاہ میر کے چند قریبی مشترکہ دوستوں میں سے تھے، ہم دونوں سے نہایت باوقار اور دھیم دھیمے لہجے میں حالاتِ گزشتہ کی تفصیل پوچھی۔ درمیان میں وقتاً فوقتاً سوالات بھی کرتے رہے۔ زیادہ تر مجھ سے ہی مخاطب رہے تھے۔

بالآخر پورے ڈیڑھ گھنٹے بعد میں نے جانے کی اجازت چاہی اور پھر میں واپس اپنے ہاسٹل آ گیا۔

میرا ارادہ چند روز کے لئے گاؤں جانے کا ہوا مگر پھر یہ سوچ کر کہ کہیں ماموں حیدر گل پریشان نہ ہ جائیں، دوسری بات میرے امتحانات بھی سر پر تھے لہٰذا میں نے بہ غرضِ آرام کالج سے صرف دو روز کی چھٹی لے لی۔

تیسرے روز میں بالکل بھلا چنگا ہو گیا۔ میرے سر سے پٹی بھی اتر گئی تھی۔ باقی چھوٹے موٹے ز بھی بھر گئے تھے۔ پیشانی پر البتہ زخم کا ہلکا سا نشان باقی رہ گیا تھا۔ یہ معمولی قسم کا زخم تھا جو وقت گزر کے ساتھ ساتھ خود ہی بھر جاتا۔ اس عرصے میں نہ کبیر کا فون آیا اور نہ ہی وہ خود کالج آیا۔

چوتھے روز صبح کو جب میں تیار ہو کر کالج جانے لگا تو نگینہ نے موبائل کے ذریعے مجھ سے رابطہ کر بتایا کہ وہ آج مجھ سے کالج آ کر ملنا چاہتی ہے۔ میں نے اسے کالج کینٹین میں بارہ بجے کا وقت دیا۔ پہلا موقع تھا کہ نگینہ نے مجھ سے نہ صرف بذاتِ خود میرے موبائل پر مجھ سے رابطہ کیا تھا بلکہ مجھ ملاقات کرنے کی خواہش کا بھی اظہار کیا تھا۔ میرے دل میں عجیب سی مسرتیں پھوٹنے لگیں تاہم مجھ حیرت تھی کہ اسے میرے موبائل کا نمبر کس طرح پتہ چلا تھا؟ ہو سکتا ہے کبیر سے میرا موبائل نمبر لے ہو؟ میں نے سوچا اور نگینہ سے ایک "تنہا" ملاقات کی سرشاری میں شاداں و فرحاں کالج پہنچا۔

مجھے بے چینی سے بارہ بجنے کا انتظار تھا۔ تین لیکچرز بھگتانے کے بعد میں ٹھیک بارہ بجے دھڑکتے دل کے ساتھ کالج کینٹین پہنچا تو میری بے قرار متلاشی نظروں نے ایک قدرے دور افتادہ گوشے میں نگینہ بیٹھے پایا۔ وہاں دو کرسیوں پر اس کی سہیلیاں بھی موجود تھیں۔ اسے سہیلیوں کے ساتھ بیٹھا دیکھ کر مجھ کوفت سی محسوس ہوئی تھی۔ بہرطور جب میں ان کے قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ دونوں سہیلیاں آ کالج کی طالبات تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ نگینہ سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئیں۔ نگینہ کو شستہ لہجے میں آداب کہہ کر میں قریبی چیئر پر براجمان ہو گیا۔ اس کا چہرہ ویسے ہی تازہ گلاب کی مانند دمک رہا تھا۔

"کیا آپ نے باہر نکلنا شروع کر دیا مس نگینہ؟" میں نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔

جواباً وہ بھی مسکرا کر بولی۔ "ظاہر ہے، گھر میں آخر کتنے روز بند ہو کر بیٹھا رہا جا سکتا ہے؟"

"ہاں .... یہ تو آپ کی بات درست ہے۔" میں نے اس کی تائید ضروری سمجھی۔ "لیکن پھر بھ موجودہ حالات میں آپ کو محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔" میں نے ساتھ ہی اپنی فکرمندی بھی ظاہر کر دی

"موت تو ایک دن آنی ہے۔ پھر ڈرنا کیسا۔ یوں خوف زدہ ہو کر گھر میں قید ہو کر زندگی گزارنا بھی موت سے بدتر ہے۔ خیر چھوڑیئے، آپ سنائیں .... اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" اس نے بے پرواہی سے کہا اور آخر میں میری خیریت پوچھی۔

مجھے اس کا کبھی "تم" اور کبھی "آپ" کا صیغہ استعمال کرنا عجیب ہی لگتا تھا۔

"خاصی بہادر ہیں آپ .... ویسے مجھے کیا ہوا تھا؟ میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ البتہ کبیر کی خیر نہیں معلوم ہو سکی مجھے۔ نہ ہی اس نے مجھ سے رابطہ کیا دوبارہ۔"

"لگتا ہے وہ تم سے چڑ گیا ہے۔" نگینہ نے میرے چہرے پر نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے عجیب

مسکراہٹ سے کہا تو میرے ہونٹوں پر بھی ایک پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی مگر میں بولا کچھ نہیں۔ نگینہ کا چہرہ تکنے لگا۔ پھر پوچھا۔

"کیا پئیں گی آپ؟"

"آں .... نہیں .... ابھی ابھی میں نے عذرا اور شہلا کے ساتھ چائے پی لی تھی۔" وہ بولی۔ میں نے اس کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں لہراتے دیکھیں۔

"پھر بھی .... میرے ساتھ تو آپ کو کچھ نہ کچھ لینا ہی پڑے گا۔" میں نے اس کے چہرے کو پُرشوق نظروں سے دیکھتے ہوئے نیم باز مسکراہٹ سے کہا۔ میرے لئے یہ بڑے گراں قدر لمحات تھے۔ محبت کا سرمایہ۔

"اچھا، پھر ایسا کرتے ہیں ذرا دیر بعد کولڈ ڈرنک پی لیتے ہیں۔" اس نے کہا پھر چند ثانیے میری طرف سوچتی ہوئی نگاہوں سے تکتے رہنے کے بعد بولی۔

"نادر صاحب.......!"

"آں .... نہیں، صاحب نہیں چلے گا .... صرف نادر......." میں نے دوستانہ بے تکلفی سے اسے ٹوکا۔ وہ بے اختیار مسکرا دی۔ پھر دوسرے ہی لمحے سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔

"نادر! .... درحقیقت میں آپ کے پاس ایک گزارش لے کر آئی تھی۔"

میں اس کی بات پر ذرا چونکا۔ "گزارش .... کیا مطلب؟ .... بھلا دوستوں میں یہ باتیں زیب دیتی ہیں؟" میں نے اپنے بے لگام دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے اس سے کہا۔ میرے لہجے میں اپنائیت کا سمندر موجزن تھا۔ اس کے سرخ لبوں پر صرف ایک لمحے کے لئے بڑی معنی خیز مسکراہٹ اُبھری تھی۔

"یہ آپ کا ظرف ہے .... دراصل اس روز مجھے آپ کی باتوں نے کافی متاثر کیا تھا۔ آپ نے ہماری پریشانیوں سے شیئر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بڑی غور طلب باتیں کی تھیں جو میرے لئے کافی سودمند ثابت ہوئی تھیں۔"

میں اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا تھا، وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی۔ اس لئے مسکرا کر بولا۔ "پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے آپ کو متاثر کرنے کے لئے کوئی بات نہیں کی تھی۔ ہاں، محض دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے میں نے تمہارے اور کبیر احمد کے سامنے ایک تجویز رکھی تھی مگر لگتا ہے .... کبیر احمد مجھ سے ناراض ہو گیا ہے۔"

"اسے ناراض ہونا چاہئے تھا۔" وہ عجیب اسرار بھرے لہجے میں بولی اور میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ میری استفہامیہ نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے دوبارہ بولی۔

"کبیر کو تمہاری بات اس لئے بری لگی تھی کہ تم نے ہمارے نامعلوم دشمن کا کھوج لگانے سے متعلق جو بامقصد تجویز ہمیں دی تھی، اس سے میں تو سو فیصد متفق تھی۔ لیکن کبیر تمہاری اس تجویز سے بری طرح چڑ گیا تھا۔ اس پر مجھے بھی بڑی حیرت ہوئی تھی کہ آخر وہ .... وہ یہ بات تسلیم کرنے سے کیوں انکاری تھا کہ ہمارے والدین کی ماضی میں ضرور کسی سے دشمنی رہ چکی تھی اور وہ یہ وجہ بتانے سے دانستہ کترا رہے تھے کہ کیا خبر .... اس میں ہمارے بڑوں کی غلطی بھی شامل رہی ہو .... اس لئے ہمیں اپنے بڑوں کی ٹوہ لینا ہو گی۔ یہ بات بری سہی لیکن اس کے نتائج ہمارے لئے سودمند ثابت ہو سکتے ہیں۔ تمہاری تجویز کے فوراً بعد میں نے اس پر عمل کر ڈالا اور جلد ہی اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہونے لگے۔" وہ یہاں

تک بتا کر خاموش ہوئی تو میں ذرا ٹھٹک سا گیا۔

''کیا نتائج برآمد ہوئے.......پھر؟'' میں نے فوراً پوچھا تو وہ گہری سنجیدگی کے ساتھ بتانے لگی۔

''سب سے پہلے تو میں نے اپنے پپا سے ان کے ماضی کے حوالے سے یہی پوچھنے کی کوشش کی کہ ماضی میں ان کی کسی کے ساتھ دشمنی تو نہیں رہی۔ انہوں نے اگرچہ پورے وثوق کے ساتھ انکار کیا تھا مگر میں نے صاف طور پر محسوس کیا تھا کہ ان کے چہرے کے تاثرات ان کے لہجے کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ مجھے یہ بات کھٹک گئی اور میرا تمہاری اس بات پر پختہ یقین ہونے لگا کہ ہمارے نامعلوم دشمنوں کا تعلق ہمارے بڑوں سے رہ چکا ہے۔ ابھی کل رات ہی کی بات ہے.......'' وہ انکشاف کرنے کے انداز میں آخر میں بولی اور میں بہ غور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے ایک ذرا توقف کے بعد دوبارہ کہنا شروع کیا۔

''کل شام پپا کو انکل نظر حیات صاحب (کبیر کے ڈیڈی) کا فون آیا تھا۔ انہوں نے پپا کو رات نو بجے اپنے ہاں بلوایا تھا۔ انکل (نظر حیات) نے شاید پپا سے کوئی ضروری بات کرنا تھی ورنہ اکثر وہی پپا کے پاس آتے تھے۔ جب وہ ٹھیک نو بجے رات کو ان کے ہاں جانے لگے تو میں نے بھی ان کے ساتھ جانے کی ضد کی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتے تھے مگر میرے اصرار پر وہ مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ جب ہم دونوں انکل نظر حیات کے ہاں پہنچے تو اس وقت انکل اور کبیر ان کے منتظر تھے۔ البتہ مجھے ان کے ہمراہ دیکھ کر وہ دونوں خاصے جز بز ہوئے۔ اس کے بعد انکل نظر حیات پپا کو اوپری منزل کے ایک کمرے میں لے گئے اور میں کبیر کے ساتھ بیٹھ گئی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ کبیر میری خلاف توقع آمد پر ذرا بے چین اور الجھا الجھا سا نظر آنے لگا تھا حالانکہ اس سے پہلے وہ میری آمد پر چہک اٹھتا تھا۔ خیر، تھوڑی دیر بعد وہ مجھے اپنی چھوٹی بہن ہما کے ساتھ چھوڑ کر اوپر چلا گیا۔ مجھے اس کے یوں اچانک اٹھ کر چلے جانے پر اچنبھا ہوا۔ تاہم مجھے شک ہوا کہ وہ بھی اوپر پپا اور اپنے ڈیڈی انکل نظر حیات کے ساتھ شامل گفتگو ہونے گیا ہے۔ اوپر کس قسم کی خفیہ میٹنگ ہو رہی تھی؟ یہ میں نہیں جانتی تھی۔ درحقیقت میں پپا کے ساتھ آئی ہی اس لئے تھی کہ میں یہ جاننا چاہتی تھی، آخر انکل پپا کے ساتھ کون سی ضروری میٹنگ میں مصروف تھے؟ پھر میں تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر کسی بہانے اوپر گئی تو ایک بند کمرے میں پپا، انکل نظر حیات اور کبیر کی موجودگی کا احساس ہوا۔ کمرے کا دروازہ اگرچہ بند تھا مگر ان تینوں کے آپس میں دھیمے لہجے میں باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں جسے میں نے دروازے کے ساتھ لگ کر سننے کی کوشش کی تو اچانک کبیر باہر نکلا اور مجھے دروازے سے کان لگائے کھڑا دیکھ کر پہلے تو بری طرح چونک گیا مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ غصے سے میرا بازو پکڑ کر مجھے نیچے لے آیا اور سخت لہجے میں مجھ سے بولا۔ ''یہ کیا حرکت ہے؟''

اس کا یہ درشت رویہ میرے لئے باعث تعجب تھا مگر مجھے بھی غصہ آ گیا اور میں نے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے اس سے کہا۔ ''میں نے کوئی غلط حرکت نہیں کی۔''

''بڑوں کی باتوں پر کان لگانا تم اچھا سمجھتی ہو؟'' وہ بدستور خار کھائے لہجے میں بولا تو میں نے کہا۔

''تم بھی تو اندر موجود تھے۔ کیا میں اپنے پپا کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتی؟''

''ہم بہت اہم باتیں کر رہے تھے۔ تمہارے مطلب کی کوئی بات نہ تھی۔'' اس نے خشک لہجے میں کہا تو اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔

''وہ اہم باتیں میں سن چکی ہوں۔'' میرے انکشاف پر اس کے چہرے سے غصہ کافور ہو گیا اور وہ

پریشان نظر آنے لگا۔ پھر مضطرب لہجے میں بولا۔

''تت.........تم نے.........کیا سنا.........؟''

''میں نے سب سن لیا ہے.......کیا تمہیں بتانا ضروری ہے؟'' میرے سرد لہجے نے اسے جب بری طرح زچ کیا تو وہ میری طرف چند لمحے بھانپتی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا پھر ایک ایک لفظ چبا کر مجھے سمجھانے والے انداز میں بولا۔

''نگینہ!.......بعض باتوں کو جاننا ہمارے لئے ضروری نہیں ہوتا۔ اس طرح خواہ مخواہ پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔'' اس کا لہجہ ذرا نرم پڑ گیا تھا۔ مگر میں بدستور خشک لہجے میں بولی۔

''مگر میں جاننا چاہتی تھی کہ اندر ہمارے کون سے نامعلوم دشمنوں کے بارے میں خفیہ ڈسکشن ہو رہی ہے؟''

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے نگینہ!'' وہ ایک دم آپے سے باہر ہو گیا۔ پھر دانت پیس کر بولا۔ ''یہ سارا کیا دھرا نادر کا ہے۔ اس نے ہی تمہارے دماغ میں یہ خناس بھر دیا ہے کہ اپنے بڑوں کی ٹوہ لگاؤ۔''

''یہ خناس نہیں، حقیقت ہے۔'' میں نے بھی سخت لہجے میں کہا۔ کیونکہ میں جان چکی تھی کہ اندر ان تینوں کے درمیان ضرور ان نامعلوم حملہ آوروں کے بارے میں خفیہ میٹنگ ہو رہی تھی جو ہمارے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ تاہم میں نے کبیر احمد سے صاف صاف کہہ دیا کہ نادر کی بات سو فیصد درست ثابت ہوئی ہے کہ پپا اور انکل ہی نہیں بلکہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ ہمارے دشمن کون ہو سکتے ہیں؟ مگر ان کا نام لینے سے دانستہ گریز کیا جا رہا ہے۔ اتنا کہہ کر میں باہر چلی آئی۔''

نگینہ یہ سب بتا کر خاموش ہوئی تو میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کبیر کا رویہ غیر فطری اور کچھ معاندانہ سا تھا۔ کچھ دیر دریائے سوچ بچار میں غوطہ زن رہنے کے بعد میں نگینہ سے مخاطب ہوا۔

''نگینہ! درحقیقت میں نے تو دوستی کے ناتے اپنا ایک فرض نبھانے کی کوشش کی تھی جو شاید کبیر کو بری لگی۔ میرا خیال ہے کہ مجھ سے ناراضگی بجا ہے۔ مجھے واقعی تم لوگوں کے معاملے میں ٹانگ اڑانے کی کوشش نہیں کرنا چاہئے تھی۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ بعد میں تمہیں بھی میری بات ناگوار گزرے....... اور میں.......تمہاری دوستی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھوں جو مجھے بہرحال قطعاً گوارا نہیں۔'' نہ جانے میں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ کیسے کہہ ڈالا تھا کہ اچانک نگینہ کے چہرے پر ایک گہرا تاثر ابھرا تھا۔ میری بات پر اسے ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں نے دیکھا، اس کے نرم و گداز لبوں پر ایک گہری مسکراہٹ اُبھری اور آنکھوں میں عجیب سی چمک نمودار ہوئی۔ پھر وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

''نادر.......!'' اس کے پکارنے میں بھیدوں بھری عمیق گہرائی تھی۔

''ہوں.......؟'' میں نے بدستور اس کی دل نشین آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مختصراً کہا۔

''کیا تم مجھے کبیر جیسا انسان سمجھتے ہو؟''

میں اس کی بات پر ذرا چونکا پھر ہلکی مسکراہٹ سے بولا۔

''نہیں.......ایسی بات نہیں۔ دراصل.......''

''مجھے تمہاری دوستی پر ذرا بھی شبہ نہیں ہے نادر.......!'' وہ اچانک میری بات کاٹ کر جیسے دل کی گہرائیوں سے بولی اور مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ سے کہہ رہی ہو کہ.......نادر! مجھے تمہاری محبت پر ذرا بھی شبہ نہیں۔

''مجھے اگرچہ تمہارے ساتھ دوستی میں زیادہ عرصہ نہیں ہوا.......مگر دوستی تو دوستی ہوتی ہے۔ جو دنوں،

سالوں اور صدیوں کی محتاج نہیں ہوتی .... اور کیا یہ ضروری ہے کہ دوستی جیسے جذبات پنپنے کے طویل مدت درکار ہو؟ خلوص تو خلوص ہوتا ہے، جو پہلی ہی نظر اور پہلی ہی ملاقات میں بے لوث اور دوستی کو جنم دے ڈالتا ہے۔'' وہ جیسے عالمِ بے اختیاری میں کہے جا رہی تھی۔ میں اسے آج بالکل ایک روپ میں دیکھ رہا تھا جو میرے لئے خوشگوار حیرت کا باعث تھا۔

میرے اندر پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگیں اور اس کے بے اختیار اور دھیمے لہجے کی چاشنی نے مجھے ا سرشاری میں مبتلا کر ڈالا کہ بے اختیار میرے مرتعش ہونٹوں سے اُبھرا۔

''نگینہ! پھر تم نے مجھے کیسا دوست پایا؟''

''میں نے تمہیں واقعی ایک سچے اور پُرخلوص دوست کے روپ میں دیکھا ہے۔'' اس کا جواب فو اور بلا جھجک تھا۔

''بس .... اس سے آگے کچھ نہیں ....؟'' میرے اندر کا دیوانہ پن اپنے جوبن کو چھو رہا تھا جذبات کی سرکشی نے مجھے ایکا ایکی دلیر بنا دیا۔ کیا محبت ایسی ہی دلیری بخشتی ہے؟

وہ بہ غور میری آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ یقیناً میری آنکھوں میں اسے اُلفت کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمن موجزن نظر آیا ہوگا۔ تب میں نے بھی اس کی آنکھوں میں مدھ بھری جھیل کو ہلکورے لیتے محسوس کیا۔ ا نے ایک گہری سانس خارج کی تو جیسے میں ایکا ایکی سرشاری کی کیفیت سے نکلا اور ذرا کھنکار کر قدر خفیف لہجے میں جھینپ کر بولا۔

''سوری ....! پتہ نہیں میں کیا کہہ گیا آپ سے۔''

وہ بدستور میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی مگر بولی کچھ نہیں۔ ہم دونوں لمحہ بھر کے لئے انجانے تاثر کی غیر مرئی ڈور میں بندھ سے گئے تھے۔ میں نے ویٹر کو آواز دی۔ پھر اسے کولڈ ڈرنک لانے کو کہا

نگینہ نے ایک گہری سانس کھینچی اور میز پر رکھے پانی کے جگ کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا تو میں جلدی سے ایک کانچ کے گلاس میں پانی انڈیل کر اسے تھما دیا۔

''تھینکس!'' کہہ کر اس نے گلاس میرے ہاتھ سے لے لیا اور اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ چند گھون پینے کے بعد وہ بولی۔ ''نادر! میں بہت پریشان ہوں۔ مجھے اپنے پپا اور گھر والوں سے بہت محبت ہے گھر کے کسی فرد کو چھینک بھی آجاتی ہے تو پورے گھر کا سکون درہم برہم ہو جاتا ہے۔ میں خوف زدہ نہیں ہوں لیکن .... لیکن ....''

اچانک اس کے لہجے میں رقت اُتر آئی۔ اس کا گلا رندھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی جسے نے پونچھنے کی ذرا بھی کوشش نہ کی۔

''نادر! مجھے .... مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔'' وہ رندھے ہوئے سے لہجے میں بڑی ا کے ساتھ مجھ سے بولی۔ ''مم .... مجھے پورا یقین ہے کہ تم ہی وہ شخص ہو جو میری ہیلپ کر سکتے ہو اس کا لہجہ مرتعش تھا۔ اس کی التجا نے مجھے اندر سے بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس کے رندھے ہو سے لہجے میں ایک آس تھی، ایک حسرت تھی۔ وہ مجھ سے ملنے ایک امید کے سہارے آئی تھی اور میں ا کی امید کا ایک فروزاں چراغ بن جانا چاہتا تھا۔ اور یہ جان کر کہ وہ اس وقت ایک مصیبت کا شکار مجھے خود پر، اپنے جذبات پر قابو پانا تھا کہ کہیں میرے دلِ بے قرار کی تمنا اظہارِ محبت کی صورت میں لا تک نہ آجائے اور یہ میرے نزدیک ایک انتہائی درجے کی خود غرضی تھی اور محبت کا عامیانہ پن بھی اس کا پورے تیقن اور امید بھرے انداز میں مجھے یہ کہنا کہ۔ ''مجھے پورا یقین ہے کہ تم ہی وہ شخص

جو میری ہیلپ کر سکتے ہو۔'' میرے لئے اس کا یہ مان کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس کے وجدان نے یقیناً میرے پُرخلوص، دوستانہ اور سچے جذبات کو محسوس کیا تھا۔ اس کے اس ایک جملے نے مجھے سرشار کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ اب بڑی پُر اُمید نگاہوں سے میرے چہرے کی طرف یک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ چنانچہ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مستحکم لہجے میں کہا۔

''نگینہ! میں تم سے اپنے دل کی بات کہوں کہ تم اور کبیر کو پریشان دیکھ کر میں نے یہ پختہ عزم کر لیا تھا کہ میں اس سنگین صورتِ حال میں تم دونوں کا ساتھ ضرور دوں گا۔ یہی سبب تھا کہ میں نے اس پُراسرار مسئلے کے حل کے سلسلے میں تمہارے اور کبیر کے سامنے ایک تجویز رکھی تھی مگر کبیر کو میری بات شاید حد درجہ ناگوار گزری تھی۔ لیکن تم نے جب خود میری اس تجویز پر عمل کیا تو یہ پُراسرار حقیقت واضح ہونے لگی کہ میری بات کسی حد تک درست ثابت ہوئی ہے .... تم بے فکر ہو جاؤ۔ میں تمہارے ساتھ ہوں اور ایک اچھے اور مخلص دوست کی حیثیت سے مجھ سے جو ہو سکا، وہ میں ضرور کروں گا۔''

میں نے دانستہ کبیر کے تذکرے کو بھی شاملِ گفتگو رکھا تھا۔ کیونکہ نگینہ اس وقت ایک مصیبت کا شکار تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے میری طرف سے ذرا بھی کسی تعلق خاطر یا جذباتی لگاوٹ کا احساس ہو۔ البتہ میری تشفی آمیز اور یقین دلانے والی گفتگو نے اس کا بجھا بجھا چہرہ کنول کی طرح کھلا دیا تھا اور وہ ایک گہری پُرطمانیت سانس خارج کر کے ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔

''نادر ....! تم ایک ذہین شخص ہو .... مجھے پورا یقین ہے کہ تم اپنی غیر معمولی ذہانت کے ذریعے یہ سنگین معاملہ حل کرنے میں ضرور میری مدد کرو گے۔''

''مدد کیسی؟ .... دوستی کے ناتے یہ میرا فرض ہے۔'' میں جلدی سے بولا۔ ''اب پلیز! مدد اور گزارش جیسے الفاظ دوبارہ استعمال نہ کرنا۔''

ویٹر کولڈ ڈرنکس کی بوتلیں رکھ کر جا چکا تھا۔ میں نے دھیرے سے کولڈ ڈرنک پینے کو کہا۔

تقدیر اب مجھ پر یوں مہربان ہونے لگی کہ اس مسئلے کے بہانے نگینہ، کبیر سے دور اور میرے بتدریج قریب ہوتی چلی گئی۔ باتوں باتوں میں، میں نے یہ پتہ چلا لیا تھا کہ نگینہ اور کبیر کی دوستی محض اچھے دوستوں کی سی رہی تھی۔ اس کی ایک فطری وجہ ان دونوں کے پپا اور ڈیڈی کا آپس میں پرانے اور گہرے دوست ہونا بھی تھا اور اس دوستی میں کم از کم نگینہ کی طرف سے کبیر کے لئے کوئی جذباتی لگاؤ یا تعلق خاطر نہ تھا۔ یوں میرے ضمیر پر بھی اس بات کا بوجھ نہ رہا تھا کہ میں نے خدانخواستہ کبیر کی محبت پر شب خون مارا ہو۔ یہ تو اپنی اپنی قسمت کی بات تھی۔ تاہم مجھے اب بھی یہ دعویٰ نہ تھا کہ نگینہ کی مجھ سے دوستی محبت میں بدل گئی تھی۔ میں ابھی خود بھی اس خوش فہمی سے دور ہی تھا۔ ہماری گفتگو کا لب لباب صرف اور صرف ان پُراسرار حملہ آوروں کے بارے میں ہوتا جو ان دونوں خاندانوں کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔

تاہم کبیر کو نگینہ کا مجھ سے بار بار ملنا، بری طرح کھٹکنے لگا تھا۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ مجھے اس بات کا بھی احساس ہونے لگا تھا کہ کبیر نہ صرف مجھ سے روکھا روکھا رہنے لگا تھا بلکہ بسا اوقات تو اس نے مجھے نگینہ کے ساتھ راہ و رسم بڑھانے پر ٹوکنے کی بھی کوشش کی تھی۔ اس نے ایک روز تو حد ہی کر دی۔

''نادر! .... تمہارا نگینہ کے ساتھ پینگیں بڑھانا کیا معنی رکھتا ہے؟''

اس کے لہجے میں طنزیہ کاٹ کو میں ۔ نے محسوس تو بہت کیا اور مجھے غصہ بھی آیا مگر میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے معتدل لہجے میں اس سے پوچھا۔

''یہ پینگیں بڑھانے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

''مطلب صاف ہے ......تم اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو۔ وہ بھی بے وقوفوں کی طر تم پر بھروسہ کئے ہوئے ہے۔ مگر ایک بات یاد رکھنا نادر! پہلی بات تو یہ کہ تمہیں ہمارے ذاتی معاملا میں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دوسری اور سب سے اہم بات یہ کہ نگینہ میری پہلی اور آخری مح ہے۔ سمجھے تم......؟'' نوبت یہاں تک آ گئی تھی کہ کبیر کا رویہ میرے ساتھ اب رقیبانہ ہونے لگا تھا۔ اس کے اس اندازِ گفتگو پر جہاں دکھ ہوا تھا وہاں غصہ بھی آیا۔ تاہم میں نے بدستور کول مائنڈڈ ہو ہوئے دوستانہ انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''یار کبیر! ...... یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم کس قسم کی غلط فہمی میں پڑ چکے ہو؟ میں نے تو آج تک نگینہ سے کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی ہے۔ اگر نگینہ کو بھی تمہاری طرح تم سے محبت ہے تو خوف ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ اور جہاں تک تمہارے معاملات میں ٹانگ اڑانے والی بات ہے تو معاف کرنا یار! تم اس سلسلے میں بھی بڑی خطرناک غلط فہمی کا شکار ہو۔ نگینہ جیسی تمہاری دوست ہے، ویسی میر بھی ہے۔ اس نے مجھ سے دوستانہ استدعا کی ہے کہ میں ان پراسرار دشمنوں کا کھوج لگانے میں اس مدد کروں۔ حیرت ہے، تم بھی تو اس مسئلے سے دوچار ہو۔ پھر مجھ سے تم اس قسم کی جرح کیوں کر رہے ہو؟''

میری وضاحت پر اس کے ہونٹوں پر بڑی گہری اور استہزائیہ مسکراہٹ اُبھری اور وہ اپنے ہونٹ بھ کر مجھ سے بولا۔

''تم مجھے ڈاج نہیں دے سکتے نادر! کیونکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ نگینہ کی مدد کی آڑ میں تم ا سے کیا چاہتے ہو۔ ایک بات صاف صاف کان کھول کر سن لو نادر! تم نے پہلے ہی نگینہ کو مجھ سے برگشتہ رکھا ہے۔ اب تم اس کے ساتھ یہ چال چل رہے ہو کہ اسے اپنے باپ سے بھی متنفر کرنا چاہتے ہو۔ مگر تمہیں ایسی اوچھی حرکت ہرگز نہیں کرنے دوں گا۔'' اس کا لب ولہجہ بتدریج جارحانہ ہوتا جا رہا تھا۔

''یار!...... میں نگینہ کو اس کے باپ سے کیوں متنفر کرنا چاہ رہا ہوں ...... ذرا اس کی تفصیل بھی بتا دو۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں ہلکی سی ترشی عود کر آئی۔

''اپنے باپ کی ٹوہ میں لگانا...... ان سے برگشتہ کرنا نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟'' وہ گرم لہجے میں بولا۔

''اور ذرا یہ بھی بتا دو کہ مجھے اس کا کیا فائدہ ہو گا؟'' میں بڑے تحمل کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

''اگر تم سننا چاہتے ہو تو سن لو......'' وہ انکشاف کرنے والے انداز میں بولا۔ ''میں نے پہلے دل سے محسوس کر لیا تھا کہ تم نگینہ میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگے ہو۔ مگر میں دوستی کی خاطر خاموش رہا۔''

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔'' میں نے اسے سختی سے ٹوکا۔

''میں اسی طرف آ رہا ہوں ...... ذرا حوصلے سے سننا۔'' وہ بلا تامل زہریلے لہجے میں بولا۔ ''کیونکہ تم اچھی طرح جانتے تھے کہ نگینہ کے پپا اور میرے ڈیڈی آپس میں بچپن کے گہرے دوست ہیں اور اس ناتے میرے اور نگینہ کے درمیان دوستی کا رشتہ اور بھی مضبوطی اختیار کر گیا ہے۔ تم نے مار آستین بن کر سب سے پہلے نگینہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسے مجھ سے بدگمان کیا اور اب نگینہ کو یہ باور کرانا چاہتے ہو کہ ہمارے والدین سے ماضی میں ضرور کوئی ایسی مجرمانہ غفلت ہوئی ہے جس کے نتیجے میں ہمارا کوئی نادیدہ دشمن پیدا ہو گیا ہے۔ چونکہ تم اچھی طرح سے حقیقت جانتے ہو کہ نگینہ کے پپا مجھے اپنی بیٹی کا رشتہ دینے میں ذرا بھی تامل سے کام نہیں لیں گے اسی لئے تم نے موقع سے فائدہ اٹھانے کا یہ منصوبہ بنایا کہ نگینہ کے پپا کو اس کی نگاہوں میں مجرم بنانے کی ٹھانی تاکہ کل کلاں تم نگینہ کو اپنی جھوٹی محبت کے دام میں پھانس لو تو نگینہ اپنے پپا کے سامنے سرکشی پر اُتر آئے۔''

وہ یہ فضول بیانی کر کے خاموش ہوا تو میری کنپٹیاں سلگ اُٹھیں ...... مگر میرا طیش میں آنا اس کے ک کو تقویت میں بدل سکتا تھا اس لئے میں نے اپنے اندر کے ابال پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے قدرے لخ لہجے میں کہا۔

''کبیر!...... میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم میرے بارے میں اتنی گری ہوئی سوچ رکھتے ہو۔''

''مجھے ایک سوال کا جواب دو ...... کیا تم نگینہ سے محبت نہیں کرتے؟''

''یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔'' مجھے اس سے اس سوال کی پہلے ہی سے توقع تھی اس لئے میں نے بلا مل جواب دیا تھا۔

''مجھے صاف صاف جواب چاہئے۔ اگر تم نگینہ سے محبت کرتے ہو تو مجھے بتانے سے کیوں ڈرتے ہو؟'' اس نے جیسے مجھے جھنجھوڑ ڈالا تو میں نے بھی برملا اس سے سوال کر ڈالا۔

''تم یہ بتاؤ، کیا کبھی نگینہ سے تم نے اظہارِ محبت کیا ہے؟'' میری بات پر اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ ''بولو ...... تمہارے سوال کا جواب تمہیں مل جائے گا۔'' میں نے اسے اکسایا۔

''نہیں ...... مگر ہماری شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔'' اس نے جواباً کہا۔

''تو بس ...... پھر بات ہی ختم۔ نگینہ نہ تمہاری ملکیت ہے نہ میری ...... اب یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ ہم دونوں میں سے کسے اپنا جیون ساتھی چنتی ہے۔'' میں نے بھی صاف گوئی سے کہا۔

کبیر کے چہرے پر اشتعال کی سرخی اُبھر آئی۔ اور پھر وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زہریلے لہجے میں بولا۔

''نادر! تم اپنی حیثیت پہچان کر بات کرو ...... تمہاری کیا اوقات ہے؟ یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں...... اور تمہارا ماضی کیا ہے، میں اس سے بھی واقف ہوں۔ جس طرح تم ہمارے بڑوں کی ٹوہ لگانے کی کوشش کر رہے ہو، اسی طرح میں بھی تمہاری ٹوہ لگا چکا ہوں۔ میں چاہوں تو نگینہ کو تمہاری ساری حقیقت سے آگاہ کر دوں۔ جسے جاننے کے بعد وہ تم پر تھوکنا بھی گوارا نہیں کرے گی۔''

میں اُس کی اس بے ہودگی پر پھٹنے کے قریب ہو گیا۔ میں اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر حلق کے بل دہاڑا۔

''کبیر!...... زبان سنبھال کر بات کرو ورنہ......'' میں اشتعال کے مارے لرزنے لگا۔ اس نے میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''ورنہ ...... ورنہ کیا؟ میری بات کی کریہہ سچائی نے تمہیں آخر کھولا دیا نا ...... اس لئے تو سیانے کہتے ہیں کہ دوسروں کی ٹوہ لینا اچھی بات نہیں۔'' وہ استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا اور وہاں سے چلا گیا۔ میں اپنی جگہ بے حس وحرکت کھڑا رہ گیا۔ میرے اندر الاؤ سا بھڑکنے لگا تھا۔ کبیر کی باتوں نے میرا ندر بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ میرے اندر کی دبی دبی ازلی چنگاری نے ایکا ایکی آگ پکڑ لی۔

میں اپنے تاریک ماضی سے غافل نہ تھا بلکہ بذاتِ خود میں اپنے ماضی کے بارے میں جاننے کی ازلی واہش رکھتا تھا۔ تو پھر ...... تو پھر کیا کبیر میرے ماضی سے واقف ہو چکا تھا؟ مجھ سے پہلے وہ میرے ضی کے بارے میں جان چکا تھا؟ ...... میرے اندر لرزہ خیز خیال اُبھرا۔ میرا پورا وجود ایک لاوے کی مورت کھولنے لگا۔ مجھے اپنے حلق میں کانٹے سے چبھتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ میں نے لرزتے رموں کے ساتھ کونے میں رکھے فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور ڈھکنا کھول کر منہ سے لگا لی۔ ٹھنڈا پانی بھی میرے سینے کی تپش کو سرد نہ کر سکا تو میں نے ہسٹریائی انداز میں چلا کر بوتل کونے میں

پھینک دی۔ میرے اندر کی ازلی آگ پوری طرح بھڑ کنے لگی تھی۔

❋ ❋ ❋

دوسرے دن نگینہ نے مجھے اپنی برتھ ڈے کی تقریب میں شرکت کا دعوت نامہ دیا۔ کبیر بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ دونوں ایک لمبی چوڑی ٹویوٹا کریسیڈا کار میں آئے تھے اور ان دونوں کے ہمراہ تین علا... بردار باڈی گارڈز بھی تھے۔ کبیر کو دیکھ کر میری طبیعت مکدر سی ہونے لگی۔ مگر مجھے ایک بات کی حیرت... کہ اس کے چہرے پر گزشتہ روز کی گرما گرمی کا کوئی تاثر ظاہر نہیں تھا۔ یا شاید وہ بڑی مکاری سے ا... نگینہ کے سامنے مجھ سے اپنی ناراضگی کو ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

بہرطور میں نے بھی مسکرا کر دونوں کا استقبال کیا۔ پھر نگینہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس سے کا... لے لیا مگر اسے ٹالنے کی غرض سے یہ بھی کہہ ڈالا کہ میں اس کی سالگرہ میں شریک ہونے کا وعدہ نہ... سکتا۔

”نہیں نادر! وعدہ کرو .... تم ضرور آؤ گے۔“ وہ اصرار کرتے ہوئے بولی۔

”میں کوشش کروں گا۔“ میں نے مختصراً کہا۔

”پلیز نادر! .... تم ضرور آنا .... ورنہ مجھے بالکل مزہ نہیں آئے گا۔“ وہ اصرار کئے جا رہی تھی۔

میں نے دزدیدہ نظروں سے کبیر کی طرف دیکھا، اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ البتہ دوسرے ہی لمحے وہ... سے دوستانہ بے تکلفی سے بولا۔

”ارے یار نادر! بے چاری نگینہ کتنے مان سے تمہیں بلا رہی ہے۔ کچھ دوستی کا ہی خیال کرو... دے دو .... ورنہ یہ تمہارے انتظار میں بلاوجہ کھلتی رہے گی۔“

میں نے ایک پُرمتانت نگاہ کبیر کے چہرے پر ڈالی۔ اسنے بڑی مکاری سے کینچلی بدلی ہوئی تھی۔ اس کا یہ دوہرا انداز عجیب بھی لگا اور میں اُلجھن آمیز پریشانی میں بھی مبتلا ہو گیا۔

”اچھا .... پھر میں ضرور آؤں گا۔“ بالآخر میں نے ہار مانتے ہوئے وعدہ کر لیا۔ نگینہ کا چہرہ گلاب کی طرح کھل گیا۔ اس کے بعد وہ دونوں واپس چلے گئے۔

❋ ❋ ❋

سالگرہ کی دعوت رات دس بجے تھی اور ڈنر کا بھی پروگرام کارڈ پر درج تھا۔ مجھے سالگرہ کے اوقا... حیرت سی ہوئی۔ کیونکہ عموماً سالگرہ جیسی تقریباً شام چھ بجے ہی ہوا کرتی تھیں۔ بہرطور میں نے ا... بڑے لوگوں کے وطیرے جان کر کندھے اچکائے اور سب سے پہلے یہ سوچنے بیٹھ گیا کہ نگینہ کو ا... سالگرہ کا کون سا تحفہ دینا چاہئے۔ میں چاہتا تھا تحفہ ایسا ہو جو مادی قیمت سے زیادہ جذبے کی قیمت... بالکل انمول ہو اور جو نگینہ کے لئے میرے جذبات کی بھی صحیح طور پر ترجمانی کرتا ہو۔

کافی سوچ بچار کے بعد میں نے اچھا تحفہ خریدنے کے لئے صدر مارکیٹ کا رخ کیا اور کافی... دھوپ اور تا کا جھانکی کے بعد مجھے ایک سرخ گلاب پسند آیا۔

سرخ گلاب کا یہ پھول اگرچہ مصنوعی تھا مگر اس کی خاصیت یہ تھی کہ اس میں گلاب ہی کی مہ... خوشبو کا اسپرے کیا گیا تھا۔ یہ گلاب ایک چھ انچ کے چوکور شیشے کے ڈبے میں بند تھا جس کے نیچے... چھوٹا سا بٹن دبانے کی صورت میں گلاب کی سرخ پتیاں روشن ہو جاتی تھیں اور ساتھ ہی ڈبے کا... ڈھکنا خودکار طریقے سے کھل کر گلاب کی سی خوشبو بکھیرنے لگتا۔ ڈھکن اوپر اٹھتے ہی برتھ ڈے کی م... باد کے نغمے کی سریلی میوزیکل آواز بھی اُبھرتی تھی۔ مجھے یہ تحفہ بہت بھایا۔ میں نے اس کی دیدہ...

پیکنگ کروائی، پھر ایک کشمشی رنگ کا لارنس ٹراپیکل کا بیش قیمت ٹو پیس سوٹ خریدا اور ایک اعلیٰ درجے کا پرفیوم اسپرے بھی خرید لیا۔ یہ سارا اہتمام کرنے اور تیاری کے بعد میں مقررہ دن اور وقت پر نگینہ کی رہائش گاہ پر پہنچا تو مجھے سب سے پہلے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔

رہائش گاہ کو دیکھ کر قطعی طور پر یہ نہیں لگتا تھا کہ یہاں کسی تقریب کا انعقاد کیا گیا ہو۔ نہ کوئی سجاوٹ تھی، نہ آرائش تزئین اور نہ ہی مہمانوں کی آمد و رفت دیکھنے میں آئی تھی۔ کوٹھی پر ایک عجیب سی ویرانی اور پراسراری خاموشی طاری تھی۔ مجھے سخت اچنبھا ہوا، ایک لمحے کو میں نے سوچا کہ کہیں میں غلطی سے کسی اور جگہ پر تو نہیں آ گیا۔ مگر گیٹ کے دوطرفہ گول محرابی ستونوں پر جلتے ہوئے گلوب کی روشنی میں نیم پلیٹ پر جلی اُبھرواں لفظوں والی تحریر میں نگینہ کے پپا کا نام شاہ میر صاف پڑھنے میں آ رہا تھا۔ جسے میں نے دو بار ذرا غور سے پڑھا تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ کہیں اس تقریب کا انعقاد کسی مقامی فائیو اسٹار ہوٹل میں نہ کیا گیا ہو۔ احتیاطاً میں کارڈ اپنے ساتھ لایا تھا۔ میں نے اسے اپنے کوٹ کی جیب سے نکال کر بہ مقام ...الے کالم کو پڑھا تو اس میں کسی فائیو اسٹار ہوٹل کی بجائے تقریب کا انعقاد رہائش گاہ ہی درج تھا۔ میں نے کندھے اچکا کر کارڈ دوبارہ جیب میں رکھا اور اُلجھن آمیز انداز میں سر کو جھٹک کر کال بیل پر انگلی رکھ ...ی۔ تھوڑی دیر بعد بغلی دروازہ کھلا اور کبیر نظر آیا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ اُبھری۔

”آؤ .... آؤ ....“ اس نے بے تاثر لہجے میں کہا اور میں گومگو سے انداز میں اندر داخل ہو گیا۔

کبیر رُکے بغیر مجھ سے آگے تیز تیز قدموں سے کوٹھی کے مرکزی دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ مجھے اس کے انداز پر حیرت سی ہوئی۔ میں اس سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر وہ تو جیسے دوڑا جا رہا تھا۔ بہرطور میں بھی خاموشی کے ساتھ اس کے عقب میں چلتا ہوا اندر ایک کشادہ کمرے میں پہنچا تو بری طرح ٹھٹک گیا۔

اندر کمرے میں بھی کوئی سجاوٹ نہیں کی گئی تھی اور نہ ہی مہمان نظر آ رہے تھے۔ البتہ سامنے صوفوں پر نگینہ، اس کے پپا شاہ میر اور کبیر کے ڈیڈی نظر حیات براجمان تھے۔ کبیر بھی البتہ میرے ذرا قریب کھڑا ہو گیا۔ وہ سب عام گھریلو لباس میں تھے اور میری طرف عجیب گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھے جا رہے تھے۔ نگینہ کے چہرے پر بھی حد درجے سنجیدگی طاری تھی اور اس کی بھی سرد نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ میرا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ ایک عجیب سی پراسراریت اور تناؤ محسوس کر کے نہ جانے کیوں مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی محسوس ہونے لگی۔

”بیٹھو نادر ....!“ کبیر نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر خشک لہجے میں کہا اور میں غیر ارادی انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ گفٹ پیک ہنوز میرے ہاتھوں میں تھا اور میں حیران پریشان ایک ایک کا چہرہ تکے جا رہا تھا۔

”تحفہ لائے ہو میرے لئے .... نادر صاحب!“ معاً نگینہ نے عجیب سی مسکراہٹ سے میری طرف دیکھ کر کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آئی۔ ”لاؤ .... مجھے دو ....“

میں نے میکانکی انداز میں تحفہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے میرے ہاتھوں سے گفٹ پیک لیا اور انتہائی رُکھائی کے ساتھ نیچے دبیز قالین پر پھینک دیا اور پھر اپنے ایک پاؤں سے اسے روند ڈالا۔

میرے سر پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ مجھے نگینہ کی یہ حرکت انتہائی ناگوار گزری اور میں غصے سے ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

”یہ .... یہ کیا مذاق ہے .... نگینہ ....!“

”بیٹھ جاؤ آرام سے نادر!“ اچانک شاہ میر نے مجھے گھورتے ہوئے درشت لہجے میں کہا اور میرے

اوسان خطا ہونے لگے۔ دل مضطربانہ انداز میں بے تحاشا دھڑکنے لگا۔

''کیا مجھے بے عزت کرنے کے لئے یہاں بلایا گیا تھا؟ .... میں پوچھتا ہوں، یہ سب کیا ہے؟'' میں غصے سے پھنکارتے ہوئے شاہ میر سے بولا تو کبیر کے ڈیڈی نظر حیات مجھے گھورتے ہو سرسراتے لہجے میں بولے۔

''پہلے آرام سے بیٹھ جاؤ .... نادر علی خان! .... ولد قادر علی خان........!''

میں اس کے منہ سے پہلی بار اپنی ولدیت کے بارے میں سن کر بری طرح ٹھٹکا۔ 'قادر علی خان میرے باپ کا نام قادر علی خان تھا........؟ مگر انہیں کس طرح معلوم ہوا جبکہ میں نے تو آج تک نہ باپ کا نام سنا تھا اور نہ ہی اسے دیکھا تھا' میں نے دل میں سوچا۔

''کیوں .... ششدر ہو گئے نا........ دیکھ لو، ہم نے نہ صرف تمہیں پہچان لیا بلکہ تمہاری سا سے بھی اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں۔'' کبیر نے مجھ سے زہریلے لہجے میں کہا۔

میرے سینے میں بری طرح ہلچل ہونے لگی۔

''سازش........کیسی سازش........؟'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ نہ جانے کیوں مجھے اپنے پ پر کھڑا ہونا دوبھر محسوس ہونے لگا اور میں صوفے پر گر سا گیا۔ نہ جانے یہ کیا پراسرار چکر تھا۔ نگینہ کا سراسر بدلا بدلا اور اجنبی سا ہو رہا تھا۔

''دشمن ہماری بغل میں تھا اور ہم شہر بھر میں ڈھنڈورا پیٹ رہے تھے۔'' اس بار نگینہ نے ا زہریلے لہجے میں مجھ سے کہا۔ میں شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہو رہا تھا۔ ایک لمحے کو تو مجھے یوں محسوس ہو تھا جیسے میرا نروس بریک ڈاؤن ہو جائے گا۔

''پلیز نگینہ! خدا کے لئے مجھے کچھ بتاؤ تو سہی، یہ سب کیا ہے؟ .... ورنہ میں .... میں پاگل جاؤں گا۔'' میں نے اپنا سر پکڑ کر نگینہ سے التجا کی۔

''نگینہ تمہیں کیا بتائے گی نادر علی خان! ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ تم کون ہو اور کیا ہو........؟'' اس نظر حیات نے اسرار بھرے لہجے میں مجھ سے کہا اور پوچھا۔ ''تمہاری ماں اس وقت جیل میں عمر قید کا کاٹ رہی ہے نا؟'' میں دھک سے رہ گیا اور تھوک نگل کر ہولے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کیا تم نہیں جانتے کہ وہ عمر قید کی سزا کیوں کاٹ رہی ہے؟'' نظر حیات نے استہزائیہ انداز پوچھا۔ میں نے بے اختیار نفی میں سر ہلا دیا۔

''او .... بڑے بھولے بادشاہ بن رہے ہو .... تمہاری اداکاری کی داد دینے کو جی چاہتا ہے اس بار شاہ میر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''چلو .... یہ بھی ہم ہی بتائے دیتے ہیں تاکہ تمہارے سر سے اداکاری کا بھوت اتر جائے۔'' کہہ کر شاہ میر اپنی جگہ سے اٹھا اور چند قدم اٹھاتا ہوا میرے ذرا قریب پہنچ کر انتہائی سفاکی سے بو ''تمہاری ماں نے اپنے شوہر کا قتل کیا تھا .... یعنی تمہارے باپ .... قادر علی خان کا قتل........''

میں یہ سن کر یکدم سناٹے میں آ گیا تھا۔



میری زخمی ساعتوں میں جیسے وحشتوں کے سناٹے چیخ رہے تھے۔ میں ایک ٹک اپنے سامنے کھڑے نگینہ کے باپ شاہ میر کو تکے جا رہا تھا۔ نگینہ سمیت کبیر اور اس کے ڈیڈی نظر حیات میرے چہرے کے اثرات کا گہری نظروں سے جائزہ لے رہے تھے۔ گویا یہ بھانپنے کی کوشش میں ہوں کہ ابھی ذرا دیر پہلے شاہ میر کے لرزہ خیز انکشاف سے میں واقعی لاعلم تھا یا یہ لاعلمی میری اداکاری تھی۔

مجھے ذرا چکر سا آیا اور میں چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا کر صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔ برا سانس نہ جانے کیوں چڑھ گیا تھا، سینہ لوہار کی دھونکنی بنا ہوا تھا۔

''........انکل........آ ....آپ کیا........ کہہ رہے ہیں؟'' مجھے علم نہیں ہو سکا کہ یہ جملہ کیونکر میرے لبوں سے ادا ہوا۔

وہ میری حالت پر استہزائیہ مسکراہٹ سے بولا۔

''خوب .... بہت خوب! .... جیسے تم تو کچھ جانتے ہی نہیں۔'' اس نے زہریلی آنکھوں سے ری طرف دیکھا، پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری کبیر احمد اور بعد میں میری بیٹی نگینہ ے دوستی کا مقصد ہی یہی تھا کہ ہماری پشت میں بہ آسانی خنجر پیوست کر سکو۔''

میرے اندر ابھی تک سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ میں نے باری باری سب کے چہروں پر نگاہ ڈالی۔ رف نگینہ کے چہرے پر مجھے اُلجھن آمیز تاثرات نظر آئے تھے۔

میں نے سب سے پہلے خود پر قابو پایا اور عجیب سے متحمل لہجے میں شاہ میر کی طرف دیکھ کر بولا۔ انکل! .... میں واقعی کچھ نہیں جانتا۔ خدا کے لئے، میری بات پر بھروسہ کریں۔ اگر آپ لوگوں کو یہ ط فہمی ہے کہ درحقیقت میں ہی آپ لوگوں پر قاتلانہ حملے کروا رہا ہوں تو اس کے پیچھے دشمنی کی کوئی ٹھوس بہ ہونا چاہئے۔''

''تمہاری بات بالکل درست ہے۔'' اس بار کبیر احمد کے ڈیڈی نظر حیات نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ ھڑا ہوا۔ پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے دوبارہ مجھ سے بولا۔ ''غلط فہمی ہمیں نہیں، تمہارے ماموں بدر گل اور تمہیں ہے اور تم دونوں مل کر ہمارے خلاف دشمنی کا جو جال بُن رہے ہو، ہم اس سے بھی اچھی رح واقف ہیں اور تمہیں یہاں ڈرامائی انداز میں بلانے کا ہمارا مقصد محض یہی تھا کہ ہم تمہیں یہ بتا سکیں ہ ہم تمہاری درپردہ سازش سے واقف ہو چکے ہیں۔ اور ہاں، اگر دوبارہ ہم پر یا ہمارے بچوں پر تم نے تمہارے ماموں حیدر گل نے حملہ کرنے کی کوشش کی تو تم دونوں ماموں بھانجے یاد رکھنا .... ہمیں ی نبھانی اچھی طرح آتی ہے۔ ناؤ یو گیٹ آؤٹ فرام ہیئر۔'' اس نے آخر میں تضحیک آمیز لہجے میں ے دھتکارا۔

احساسِ ذلت سے میری کنپٹیاں سلگ اُٹھیں۔ میرا دماغ پہلے ہی جل رہا تھا۔ میں گویا ایک ابال کی

سی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ چنانچہ میں بھی اڑ گیا۔ خود کو سنبھالتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور میر اور نظر حیات کے چہروں پر نظریں گاڑتے ہوئے اٹل لہجے میں بولا۔

''اب میں یہاں سے اس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک کہ مجھے ماموں حیدر گل اور میرے خلا آپ لوگوں کے دلوں میں پروان چڑھتی دشمنی یا غلط فہمی کی تفصیل معلوم نہیں ہو جائے گی۔''

ماحول میں یکلخت پراسرار سناٹا طاری ہو گیا تھا جسے کبیر احمد کی نفرت آمیز آواز نے پارہ پارہ کر کہہ رہا تھا۔ ''نادر! .... بس، اب بہت ڈراما رچا لیا تم نے۔ تمہارے چہرے سے نقاب اتر چکا اب تم ہمارے ساتھ مزید ڈھٹائی آمیز مکاری نہیں کر سکتے .... جاؤ اور اپنے ماموں حیدر گل کر کہہ دینا کہ آئندہ تم لوگوں نے ہمارے خلاف کوئی چال چلنے کی کوشش ....''

میں اس کی بات کاٹ کر یکدم چیخ اُٹھا۔ ''پلیز .... پلیز، فار گاڈ سیک! میں پاگل ہو جاؤں گا...... مجھے .... مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم لوگ کس دشمنی اور کون سی سازش کی بات کر رہے ہو؟...... میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ مجھے کچھ بھی معلوم نہیں۔ اگر تم لوگ میرے ماضی کے متع جانتے ہو تو مجھے بتاؤ، میں تم لوگوں کا ممنون رہوں گا۔ اتنا تو میں بھی جانتا ہوں کہ میری ماں اس وا سے جیل کی سلاخوں کے پیچھے عمر قید کی سزا کاٹ رہی ہے جب میں پیدا بھی نہیں ہوا تھا اور .... حد یہ کہ مجھے میری ماں نے جیل کی سیلن زدہ کوٹھڑی کے ننگے فرش پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جنم دیا تھا۔ یہ وہ پھانس ہے جس نے آج تک مجھے بے چین کر رکھا ہے۔ میں نے تو .... میں نے تو اپنے ماموں حیدر گل سے بھی کئی بار دریافت کرنے کی کوشش کی تھی کہ میری ماں جیل کے پیچھے اپنے کس جرم کی بھگت رہی ہے؟ میرا باپ کون اور کہاں ہے؟ لیکن نہ ماں نے کبھی مجھے یہ حقیقت بتانے کی کوشش کی نہ ہی ماموں حیدر گل نے۔ میں نے تو اب ماں سے بھی ملاقات کرنا چھوڑ دی ہے۔ حتیٰ کہ ماموں گل، جنہوں نے مجھے آج تک بڑے ناز و نعم سے پالا پوسا ہے، تنگ آ کر میں نے ان سے بھی پوچھنا چھوڑ دیا ہے۔ اب جبکہ آپ لوگوں کی زبانی مجھے اس حقیقت کا پتہ چلا ہے کہ میری ماں نے میرے باپ قادر خان کا قتل کیا ہے اور وہ اسی جرم کی پاداش میں سزا بھگت رہی ہے تو .... میں جوڑ کر آپ لوگوں سے التجا کروں گا کہ خدارا، مجھے یہ ساری حقیقت بتائیں کہ میری ماں نے میرے کا قتل کس وجہ سے کیا تھا؟''

میں نے اتنا کہا اور خاموش ہو کر ہانپنے لگا۔ میرے اعصاب شل ہو رہے تھے۔ میری رگوں جذباتیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، جس نے مجھے جوالا مکھی بنا کر رکھ دیا تھا۔ میرے وجود کے سوالیہ نشانات کے جو نوکیلے آنکڑے پھنسے ہوئے تھے، ان کی چبھن سے میرا اندر چھلنی ہوا جا رہا تھا۔ آگ تھی جو مجھے خاکستر کئے دے رہی تھی۔

میں خاموش ہوا تو ہر طرف گہرا سناٹا چھا گیا۔ اس میں مجھے اپنے سانسوں کی آواز بہت بلند محسوس ہو رہی تھی۔

کبیر احمد نے دانت نکوس کر دوبارہ مجھ سے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر نظر حیات نے ہاتھ کے اشارے سے بیٹے کو روک دیا۔ اس کے ہی نہیں بلکہ شاہ میر کے چہرے پر بھی مجھے پہلی مرتبہ پُرسوچ خاموشی آنے لگی تھی۔ البتہ نگینہ سے نہ رہا گیا اور وہ میرے چہرے پر اپنی گہری نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے اپنے شاہ میر سے بولی۔

''پپا! میرا خیال ہے کہ نادر واقعی کچھ نہیں جانتا۔ اس نے اپنی صفائی میں جو کچھ کہنا تھا، وہ یہ کہا ہے۔ اب میری آپ سے اور انکل نظر حیات سے درخواست ہے کہ اگر آپ لوگوں کو حقیقت کا علم ہے تو اسے آگاہ کر دیں۔''

اس بات پر میں نے نگینہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ میری نظروں میں اس کے لئے کسی گلے، کسی شکوے کا شائبہ تک نہ تھا۔ ہاں، ایک تشکر تھا، ایک التجا تھی۔ مجھے اندازہ ہونے لگا تھا کہ نگینہ ہی شاید وہ ہستی ہو سکتی ہے جو میرے اندر کے ہیجان اور تڑپ کو سمجھ سکتی تھی۔ وہ سب شاید میری طرف سے کسی بھیانک غلط فہمی کا شکار تھے تو میں اس کی وجہ جاننے کے ساتھ ساتھ یہ بھی جاننے کے لئے بے چین تھا کہ آخر مجھے اپنا دشمن سمجھنے کی کیا وجہ تھی؟ یہ بہت اہم سوال تھا میرے لئے۔

نظر حیات نے ایک طویل ہنکاری لی اور صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا اور پھر شاہ میر کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''میرا خیال ہے، نگینہ بیٹی کی بات صحیح ہے .... پھر کیا کہتے ہو شاہ میر! نادر کو وہ ساری داستان سنا دی جائے؟''

میں اب شاہ میر کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر گمبھیرتا طاری تھی۔ چند ثانیے کی پُرسوچ خاموشی کے بعد وہ جواباً اپنے دوست نظر حیات سے بولا۔

''یہ ابھی قبل از وقت ہو گا۔ کیونکہ اسے شاید ہماری بات پر یقین نہ آئے۔ اس کے لئے ابھی اتنا جاننا ہی کافی ہو گا کہ اسے یتیم کرنے والی خود اس کی اپنی ماں تھی۔ اب اسے چاہئے، یہ اپنے ماموں حیدر گل کا گریبان پکڑے اور اس سے پوچھے کہ اس نے اپنی بہن شبینہ کا جرم اپنے بھانجے سے چھپانے کی کوشش کیوں کی۔ کیا اس لئے کہ وہ عورت اس کی بہن تھی؟''

آخری جملہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں استہزائیہ کاٹ اتر آئی تھی۔ جس سے میرا دماغ جلنے لگا۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا، ماموں بھلا مجھے کس منہ سے اپنی بہن کے اس ناقابلِ معافی اور بھیانک جرم کا جواب دیتے۔ آج مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ماموں حیدر گل میرے سوالوں کے جواب دینے سے کیوں کتراتے تھے۔ تاہم میں نے شاہ میر کی طرف دیکھ کر اٹل لہجے میں کہا۔

''نہیں انکل! .... ماموں حیدر گل سے تو میں اچھی طرح پوچھوں گا ہی .... مگر میں چاہتا ہوں کہ آپ کو جو حقیقت معلوم ہے وہ مجھے بتائیں۔ کیونکہ آپ لوگوں کو سب سے پہلے مجھ پر ہی اس بات کا شبہ ہوا تھا کہ نگینہ پر گمنام قاتلانہ حملے کروانے والا میں ہی ہوں۔ آپ کی اس غلط فہمی کی ضرور کوئی ٹھوس وجہ ہو گی۔ رہی بات ماموں کی تو میں اچھی طرح جانتا ہوں، وہ مجھ سے کئی باتیں پوشیدہ رکھنے کی کوشش کریں گے۔ اس لئے میں نے ان سے کچھ پوچھنا ہی چھوڑ دیا ہے۔''

''یہی تو ہم بھی دیکھنا چاہتے ہیں برخوردار!'' اس بار شاہ میر کی آواز میں خاص انداز کا تحمل تھا اور لہجے میں بھی پہلے والی کاٹ نہ تھی۔

''ہم بھی یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ تم سے کتنا سچ بولتے ہیں؟ کیونکہ یہ سچ بڑا کڑوا ہے۔ ہو سکتا ہے تم سے ہمارے منہ سے سن کر آپے سے باہر ہو جاؤ اور یہاں کسی قسم کی بدمزگی ہو۔'' شاہ میر نے پہلی بار ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کی تو نظر حیات بھی مجھ سے ذرا معتدل لہجے میں بولا۔

''ہمیں اب اس بات کا احساس ہو رہا ہے کہ ہم شاید تمہاری طرف سے غلط فہمی کا شکار تھے۔ کیونکہ تمہارے چہرے اور لہجے کی سچائی سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ تمہیں بہرحال حقیقت کا علم نہیں ہے اس لئے ہم بھی اب اپنے رویے کی تم سے معافی چاہتے ہیں لیکن ہمارا اب بھی تمہیں وہی مشورہ ہے کہ اپنے ماموں حیدر گل کو کریدنے کی کوشش کرو پھر ہمارے پاس آنا، ہم تمہیں ساری حقیقت بتا دیں گے۔''

میں اس کی بات سے ذرا متذبذبانہ سوچ میں پڑ گیا۔

"پلیز نادر!......... پپا اور انکل کا مشورہ مان لو۔ اس طرح ہمارے دل بھی ایک دوسرے سے صاف ہو جائیں گے۔" معاً نگینہ نے مجھے مخاطب کر کے بڑے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ میں نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی تو وہاں مجھے شرمندگی کے آثار محسوس ہوئے۔ مگر کبیر کا منہ ابھی تک پھولا تھا۔ میں نے بالآخر انکل نظر حیات سے کہا۔

"انکل! میرے لئے بہرحال یہ خوشی کی بات ہے کہ آپ لوگوں نے میری بات پر بھروسہ کیا۔ آپ لوگوں کی باتوں کا لب لباب یہی نکلتا ہے کہ آپ لوگوں پر قاتلانہ حملے کروانے میں میرے ماموں حیدر گل کا ہی ہاتھ ہے۔ کیا آپ مجھے اتنا بھی نہیں بتا سکتے کہ آخر ماموں اور آپ لوگوں کے درمیان کی کیا وجہ ہے؟"

میری بات پر نظر حیات نے شاہ میر کی طرف دیکھا۔ وہ شاید اس کی نظروں کا مطلب سمجھتے ہو فوراً بولا۔

"یہ بات کہنا ابھی قبل از وقت ہوگا۔ تم پہلے اپنے ماموں حیدر گل سے بات کرو لیکن اس بار خاص خیال رہے کہ ان سے ہمارے حوالے سے کوئی بات مت پوچھنا۔"

"لیکن انکل! مجھے ماموں سے کچھ پوچھنے کے لئے آپ لوگوں کا حوالہ دینا ضروری ہوگا۔" میں نے جواز پیش کیا اور مزید بولا۔ "کیونکہ ماموں نے آج تک میری کسی بات کا جواب نہیں دیا ہے۔"

میری بات پر وہ دونوں کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئے، پھر نظر حیات بولا۔

"اس میں قباحت یہ ہے کہ تمہارا ماموں حیدر گل ایک دم محتاط ہو جائے گا۔ ہم اس کا جھوٹ چاہتے ہیں۔ جب اسے یہ معلوم ہوگا کہ تمہارے ہم سے دوستانہ مراسم پیدا ہو گئے ہیں تو وہ کئی باتوں پہلو تہی کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ پہلے تم بغیر ہمارے کسی حوالے کے ایک صرف یہ کریدنے کی کوشش کرو کہ اس کی بہن یعنی تمہاری ماں شبینہ نے اپنے شوہر کا قتل کیوں کیا آگے وہ خود ہی کھلتا چلا جائے گا۔ اب تم بچے تو نہیں رہے کہ وہ تمہیں ٹالنے کی کوشش کرے۔ تم اب ا کڑیل جوان ہو۔ شبینہ تمہاری ماں ہے۔ اس کے بارے میں، اس کے ماضی کے بارے میں جانن تمہیں پورا حق حاصل ہے۔ بس، اس بار تم اس سے دوٹوک بات کرو۔" وہ خاموش ہوا اور میں دھیرے دھیرے اپنے سر کو تفہیمی جنبش دینے لگا۔

میں واپس یونیورسٹی کیمپس آیا۔ میں نے اگلے روز ایک دن کے لئے گاؤں جانے کا فیصلہ کیا۔ اب ماموں حیدر گل سے حتمی بات کرنے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا۔

صبح یونیورسٹی میں مجھے صرف دو لیکچرز اٹینڈ کرنا تھے۔ پہلا ساڑھے آٹھ بجے اور دوسرا ساڑھے سے تقریباً گیارہ بجے تک تھا۔ باقی لیکچرز اتنے اہم نہ تھے۔ یوں بھی امتحانات قریب تھے۔ کورس تقر مکمل ہو چکا تھا۔ اکا دکا اسپیشل لیکچر ہوتے تھے۔ میں صبح ساڑھے سات بجے بیدار ہوا۔ غسل و کرنے کے بعد میں آٹھ بجے کالج پہنچا۔ سینٹرل کینٹین میں ناشتہ کیا اور ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے لیکچر ہا کی طرف بڑھ گیا۔

گیارہ بجے جب میں دوسرے لیکچر سے فارغ ہوا تو نگینہ کو میں نے ہال میں جھانکتے ہوئے دیکھا میں نے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلا دیا۔ وہ مسکرائی، میں اس کی طرف بڑھا۔

"کیسی ہو؟"

"ٹھیک ہوں۔"

"آؤ، کینٹین میں چل کر بیٹھتے ہیں۔"

"نہیں.........لان بہتر رہے گا۔"

"جیسے تمہاری مرضی........."

ہم دونوں سرسبز لان کے ایک قدرے الگ تھلگ گوشے میں نرم نرم گھاس پر بیٹھ گئے۔ ہمارے عقب میں خوشنما پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ میری نظریں نگینہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں اس کے بولنے کا منتظر تھا۔ اس کے شفاف اور ستھرے چہرے پر مجھے ہلکا سا ارتعاش نظر آ رہا تھا۔ نرم و گداز لبوں پر موہوم سی کپکپاہٹ تھی۔ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا تو مجھے اس کی گہری آنکھوں کے گوشوں میں نمی سی چمکتی نظر آئی۔ تب اس کے لب متحرک ہوئے۔

"نادر! آئی ایم سوری.........ایکسٹریملی سوری........." آواز میں رقت آمیز لرزش تھی۔

"واٹ.........؟" میں چونکا۔ "کس بات کی سوری بھئی؟"

"ہاں.........کم از کم مجھے تمہیں غلط نہیں سمجھنا چاہئے تھا۔ ساری رات میں یہی سوچ کر تڑپتی رہی ہوں نادر!.........کہ دوستی میں اول تو کسی غلط فہمی کی گنجائش ہی نہیں ہونی چاہئے۔" وہ جیسے بے اختیاری میں کہے جا رہی تھی۔ "اور پھر دوستی تو.........دوستی ہوتی ہے۔ کیونکہ دوستی سہنا بھی تو سکھاتی ہے۔"

میں اب کہیں جا کر اس کا "مسئلہ" سمجھا تھا اور بے اختیار میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ عود آئی۔

"اوکے.........کم آن.........نگی! تم تو یکدم سنجیدہ ہو گئیں۔ اگنور کر دو.........رات گئی، بات گئی۔ ویسے بائی دا وے، یہ کیا منافقت ہے بھئی؟" میں نے آخر میں موضوع کا سنجیدہ پن ختم کرنے کی کوشش کی۔

"کیسی منافقت.........؟" وہ کجراری آنکھیں پھیلا کر بولی اور میرا ان میں ڈوب ڈوب جانے کو دل چاہنے لگا۔

"تو اور کیا.........؟" میں ٹھنک کر بولا۔ "یہ آخر دوستی سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"دوستی.........یعنی........." وہ ذرا رکی تو اس کے چہرے پر شفق پھوٹی تاہم اس نے ہولے سے اپنا مختصر جملہ پورا کیا۔ "دوستی.........!"

"نہیں، تم کچھ اور کہنا چاہتی تھیں؟" میں نے معنی خیز انداز میں اصرار کیا۔

"مثلاً........" اس کی آنکھوں میں بھید بھری چمک اُبھری

"مثلاً.........یہ کہ جو تمہارے دلنشین اور گداز ہونٹوں پر آتے آتے رہ گیا۔"

"تم نے کیسے اندازہ لگا لیا کہ.........میں دوستی کی جگہ کچھ اور کہنا چاہتی ہوں؟" اس کی مسکراہٹ جتنی خفیف تھی، اتنی ہی دل موہ لینے والی بھی۔

"بھئی.........میرے دل نے محسوس کیا۔" میں بولا۔

"آخر بتاؤ تو.........کیا کہنا چاہتی تھی میں؟" جو اعلیٰ و ارفع لفظ نگینہ کہتے کہتے رہ گئی تھی، شاید وہ لفظ میرے ہونٹوں سے سننا چاہتی تھی لہٰذا میں نے محبت پاش نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"محبت.........دوستی.........یعنی محبت!" میں جیسے اسے درسِ اُلفت پڑھانے لگا۔

تھوڑی دیر پہلے ضمیر کی چبھن سے کمہلایا ہوا اس کا اُداس چہرہ یہ لفظ سننے کے بعد ایک دم تازہ گلاب کی

طرح کھل گیا۔ اس کے نرم و گداز ہونٹوں پر انجانے جذبوں کے شگوفے پھوٹنے لگے۔ شہابی گالوں شفق مزید گہری ہوگئی۔ اس نے ایک ادائے دل ربانہ کے ساتھ اپنی گھنیری زلفوں کو جھٹکا اور میں اس جانب ذرا جھک کر بولا۔ ''کیوں .... یہی کہنا چاہتی تھیں نا تم؟''

''ہاں۔'' اس نے سر کو خفیف جنبش دیتے ہوئے ہولے سے جواب دیا۔ ''نادر!'' پھر وہ یکدم سنجیدہ گئی تھی۔

میں مستفسرانہ نظروں سے اس کا چہرہ تکنے لگا۔

''کل تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا، میں اس کی تم سے معافی چاہتی ہوں .... پلیز، مجھے اپنا بار کرنے دو۔'' وہ پھر سنجیدہ موضوع کی طرف آنے لگی تو میں نے اسے دوبارہ ٹوکنا چاہا۔ مگر اس نے مجھے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ ''دراصل پے در پے ہم پر ہونے والے گمنام قاتلانہ حملوں نے میری بھی عق ایک لمحے کو ماؤف کر دی تھی پھر پپا اور انکل حیات نے تمہارے حوالے سے تمہاری ماں کے ماضی کے بارے میں جو باتیں مجھے بتائیں، اسے سن کر میں خود ایک لمحے کو چکرا گئی تھی اور یوں تمہیں بھی مجرم سمجھ بیٹھی تھی۔ لیکن شکر ہے کہ پپا اور انکل حیات کی طرح میرا دل بھی اب تمہاری طرف سے صاف ہوگیا لیکن میرے ضمیر پر بوجھ سا بن گیا تھا کہ کم از کم مجھے کبیر احمد کے ورغلانے میں نہیں آنا چاہئے تھا۔''

''کبیر احمد ....؟'' میں نے استفہامیہ لہجے میں قدرے اُلجھ کر کہا۔

''ہاں .... یہ ساری کھچڑی کبیر احمد نے ہی تو بنائی تھی۔'' وہ تلخ لہجے میں بولی۔ ''ہماری دوستی کے بعد وہ تم سے خار کھانے لگا تھا۔ تمہارے باپ اور ماں کے حوالے سے وہ کھٹک گیا تھا پھر اس نے تمہا بیک گراؤنڈ کھنگالا تو اسے ہمیں اور بالخصوص مجھے تم سے متنفر کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا مگر اس کی یہ ساز بری طرح ناکام ہوئی۔'' اس نے اپنی بات مکمل کی۔

مجھے کبیر احمد کی اس کینہ پروری پر دکھ ہوا تاہم میں کھلے دل سے مسکرا کر بولا۔ ''چلو چھوڑو اب۔ دو کا بول بالا .... دشمن کا منہ کالا۔ مجھے اب تم یہ بتاؤ کہ تمہارے پپا انکل شاہ میر اور ان کے دوس انکل حیات کا آخر میری ماں کے ماضی کے حوالے سے ایسا کون سا پراسرار تعلق ہے کہ انہیں مجھ پر شک ہوا؟ کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گی کہ آخر تمہارے پپا اور انکل حیات نے میری ماں کے ماضی کے حوالے سے کیا باتیں تمہیں بتائیں؟''

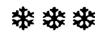
میری بات پر وہ آنکھیں جھکا کر بولی۔ ''نادر! ابھی مجھ سے کچھ نہ پوچھو .... پلیز، تم صرف و کرو جو پپا اور انکل حیات نے تم سے کہا ہے .... لیکن پپا اور انکل کی طرح میرا بھی تم سے وعدہ کہ تمہیں سب کچھ بتا دیا جائے گا۔''

''سمجھ میں نہیں آتا کہ تم لوگوں کو پہلے حقیقت بتانے میں کون سی مصلحت مانع ہے؟'' میں قدرے اُلجھ کر کہا تو وہ میری طرف دیکھ کر بڑی رسان سے بولی۔

''بے فکر رہو نادر! بڑوں کے فیصلے میں بھی ایک بھید ہوتا ہے۔ جس میں چھوٹوں کی بھلائی کا راز مضم ہوتا ہے۔ کیا خبر ہمارے پہلے حقیقت کھولنے پر تم بدگمان ہو جاؤ ہم سے؟''

میں پُرسوچ خاموشی میں مستغرق ہوگیا۔

پھر میں اسی روز گاؤں روانہ ہوگیا۔



گاؤں پہنچا تو ماموں حیدر گل ''گرین لاج'' میں موجود نہیں تھے۔ (گرین لاج .... ہماری پہا

رہائش گاہ کا نام تھا)

چاچا فضل بھی نہ تھے۔ البتہ ان کی بیوی صغراں موجود تھی۔ اس سے مجھے پتہ چلا کہ ماموں حیدر گل آج سویرے ہی ''ٹال'' کی طرف نکل گئے تھے۔ میں اس قدر بھرا ہوا تھا کہ ماموں کا انتظار بھی نہ ہو پا رہا تھا۔ جیپ بھی نہیں تھی۔ فضل چاچا بھی غائب تھے۔ صغراں البتہ قدرے پریشان ہو کر بولی۔

''بیٹا! خیریت تو ہے نا؟ .... تم ....'' الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے اور میں ہونٹ سکیڑ کر لاج سے نکل آیا۔

ہمارا لکڑیوں کا ٹال، مال روڈ کے آخری سرے پر واقع تھا۔ میں لاج سے نکل کر باہر سرسبز قطعہ پر آ کر ذرا دور شمال مغرب میں واقع گلیات کی طرف جانے والی سڑک کو گھورنے لگا جس کے دو رویہ بلند و بالا صنوبر اور چیڑ کے درخت ایستادہ تھے۔ وہاں سے شہر آنے جانے والا ٹریفک صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں چند ثانیے پُرسوچ خاموشی کے ساتھ کھڑا رہا، پھر میں نے آگے قدم بڑھا دیئے۔ سڑک کے کنارے پہنچ کر گلیات کی طرف سے آتی ہوئی ایک ہائی ایس کو ہاتھ کے اشارے سے روکا اور اس میں سوار ہوگیا۔ تقریباً بیس پچیس منٹ بعد میں مال روڈ پر اپنے مطلوبہ اسٹاپ پر پہنچ کر اتر گیا۔ یہاں سے ہمارا ٹال زیادہ دور نہ تھا۔ تھوڑا ہی پیدل راستہ تھا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چل پڑا۔

ماموں حیدر گل سے آج دوٹوک بات کرنے کے جوش میں مجھے اس بات کا بھی خیال نہ رہا تھا کہ میں پہلے ''گرین لاج'' سے فون کر کے پوچھ ہی لیتا کہ آیا وہ وہاں موجود بھی تھے یا نہیں؟

ذرا دیر بعد میں ٹال کے قریب پہنچ گیا۔ سڑک کی طرف کھلنے والے دفتر ٹائپ کمروں کے دو شیشے دار دروازے بند تھے۔ دیوار پر شٹر بھی نصب تھے۔ میں ایک دروازے کو پش کرتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔ کمرا خالی تھا، دوسری طرف کا حصہ کھلا پڑا تھا۔ میں وہاں آ گیا۔

اب میرے سامنے وسیع و عریض احاطہ پھیلا ہوا تھا۔ ایک طرف آرا مشین کا ہال نما کمرا تھا۔ باقی سارا میدان بھانت بھانت کی لکڑیوں اور بھاری بھرکم شہتیروں سے اٹا پڑا تھا۔ مذکورہ کمرے میں خاموشی تھی۔ ورنہ بجلی سے چلنے والے ووڈ کٹر کی گھگھناتی ہوئی آواز تو ہر وقت ہی گونجتی رہتی تھی۔ غرض مجھے یہاں بھی خاموشی اور سناٹے کا احساس ہوا۔ کوئی ملازم، مزدور بھی نہ تھا۔ البتہ ایک خالی راکٹ ٹرک احاطے کے پرے دیوہیکل چوبی گیٹ کے باہر کھڑا نظر آ رہا تھا۔

''جی .... سر جی! آپ ....'' اچانک ایک آواز پر میں چونکا۔ یہ مشتاق سیال تھا۔ ہمارا منیجر۔ بھاری بھرکم اور درمیانے قد کاٹھ کا مالک۔ وہ چالیس کے پیٹے میں تھا اور خاصا منکسر المزاج تھا۔

''کیا بات ہے منیجر؟ .... کام بند پڑا ہے؟'' میں نے پُرمتانت لہجے میں پوچھا۔

''بس جی کیا بتاؤں .... مزدوروں نے تنخواہ بڑھانے کے لئے ہڑتال کر رکھی ہے۔ جتنا بھی دو، ان کا پیٹ ہی نہیں بھرتا۔'' وہ ناگواری سے بولا۔ ''آیئے .... آپ اندر تشریف لائیں۔'' وہ آخر میں مؤدبانہ لہجے میں بولا۔

''ماموں کدھر ہیں؟'' میں نے اپنی جگہ سے ہلے بغیر پوچھا۔

''صاحب آنے والے ہیں۔ آپ آیئے۔''

''گئے کہاں ہیں؟'' میں بدستور سنجیدگی سے بولا۔

''وہ جی .... اعظم خان کے رئیس خانے تک گئے ہیں۔'' وہ جواباً بولا۔

''اعظم خان ....؟'' میں نے استفہامیہ انداز میں یہ نام دہرایا۔

”آپ اعظم خان کو نہیں جانتے سر جی؟“

اس کے استعجاب پر مجھے یاد آ گیا۔ ”یہ وہی تو نہیں، جسے سرکاری مال خانے سے کروڑوں روپوں کی خورد برد پر معطل کر دیا تھا؟“

میری بات پر منیجر مشتاق سیال کے چہرے پر ایک لمحے کو عجیب سی مسکراہٹ اُبھری اور وہ کھسیانی ہنسی کے ساتھ بولا۔

”چھوڑیں سر جی! بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہیں۔“

مجھے اس گھسے پٹے اور بے محل مقولے پر تلخی محسوس ہوئی جس کا میں اظہار کئے بغیر نہ رہ سکا۔

”منیجر!........ ملک و قوم کی دولت پر غاصبانہ طریقے سے ہاتھ صاف کرنے والوں کو تم بڑے لوگ کہتے ہو؟“

وہ میرے طنز کی کاٹ پر ذرا بوکھلا سا گیا۔

”نہیں سر جی! مم........ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ یہ تو بہت پرانی بات ہے........ اب تو اعظم صاحب پر یہ کیس بھی جھوٹا ثابت ہو چکا ہے اور وہ دوبارہ اپنی سیٹ پر........“

”مجھے یہ بتاؤ کہ ماموں کی وہاں سے کب تک آمد متوقع ہے؟“ میں نے اس کی بات کاٹ کر پُرمتانت لہجے میں پوچھا۔ مجھے اس کا اعظم خان کو ”صاحب“ کہنا بھی برا لگا تھا۔

”کچھ کہہ نہیں سکتا جی میں........ ظاہر ہے، وہ بڑے آدمی سے ملنے........“ اچانک اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ چپ ہو رہا۔ میں اسے گھورنے لگا۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے........ ماموں سے اسی وقت موبائل پر رابطہ کرو۔“

”جی سر!........ ابھی کرتا ہوں“ وہ فوراً بولا اور جلدی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل نکالا۔ ماموں کے نمبر پنچ کرنے لگا۔ پھر کان سے لگا لیا۔ ”سر جی! میرا خیال ہے انہوں نے موبائل اپنا آف کر رکھا ہے۔“

”ہوں........“ میں نے طویل ہنکاری خارج کی، پھر اس سے پوچھا۔ ”انہیں یہاں سے گئے کتنی دیر ہوئی ہے؟“

”میرا خیال ہے جی، بس آپ کے آنے سے آدھا گھنٹہ پہلے ہی وہ نکل کر گئے ہیں۔“

”بتایا نہیں کہ کب تک واپسی ہو گی؟“ میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

”کہہ تو رہے تھے کہ گھنٹہ ڈیڑھ لگ ہی جائے گا۔“ وہ گومگو سے لہجے میں بولا۔

”سمجھ نہیں آتا آخر ماموں نے اپنا موبائل کیوں آف کر رکھا ہے؟“ میں ہولے سے بڑبڑایا۔

”بس جی........ بڑے آدمی سے ملنے گئے ہیں۔ ڈسٹرب ہونا نہیں چاہتے ہوں گے صاحب۔“ وہ اپنی عادت سے مجبور لگتا تھا۔ میں نے اسے گھورا۔ وہ جلدی سے اپنی غلطی محسوس کر کے دوبارہ اپنی بات دہرانے لگا۔ ”مم........ میرا مطلب ہے جی........ چھوٹے آدمی سے ملنے گئے ہیں........ ڈیڑھ........“

”بکواس بند کرو۔“ میں جھلا کر بولا۔ ”تم پر اعظم خان جیسا چور اچکا کسی بھوت کی طرح سوار ہو گیا ہے۔ آخر تم کس وجہ سے اس کے لئے بڑا آدمی، بڑا آدمی کی گردان لگائے ہوئے ہو؟“

میرے گھرکنے پر وہ شرمندہ سا نظر آنے لگا تھا۔

”وہ سیدھا ادھر ہی آئیں گے نا؟“ میں نے اس کے جھکے ہوئے سر پر نظر ڈال کر پوچھا۔

”جی، سر جی!“

”کمال ہے........ یہاں مزدوروں نے ہڑتال کر رکھی ہے، کام بند پڑا ہے۔ اور ماموں کو کوئی واہ نہیں۔ سمجھ نہیں آتا آخر وہ اعظم خان کے پاس کیا کرنے گئے ہیں؟“ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو خود لامی کے انداز میں بڑبڑانے لگا۔

اچانک ٹال کے دیوہیکل چوبی گیٹ سے ایک سنگل ڈور پجیرو اندر داخل ہوئی۔ اس کا رنگ سیاہ تھا۔ ں نے قدرے چونک کر جیپ کی طرف دیکھا۔ ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر ایک بیل جیسا فربہ اندام ص سوار تھا۔ اس نے آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھا رکھا تھا۔ جیپ کی ونڈ اسکرین کے عقب میں اندر عقبی بٹ پر مجھے چار عدد مسلح سواروں کی جھلک دکھائی دے گئی۔

”ارے........ ملک صاحب بھی تشریف لے آئے۔ بڑے آدمی ہیں جی۔“ منیجر کے منہ سے بے ختیار مجھے چڑا دینے والا لفظ کسی تکیہ کلام کی طرح برآمد ہوا تھا۔

جیپ عین ہمارے قریب آ کر ایک جھٹکے سے رک گئی۔ گول مٹول سا منیجر پکے ہوئے شلجم کی طرح ڑھکتا ہوا جیپ پر جا گرا۔ مجھے اس کا یہ خوش آمدانہ رویہ ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ وہ بیل جیسا ٹھسے دار شخص نیچے اُترا تو اس سے پہلے ہی اس کے اسلحہ بدست چاروں محافظ کار پرداز کدکڑے مار کر نیچے اُتر چکے تھے۔

”آئیے، آئیے ملک صاحب!........ زہے نصیب........ اندر تشریف لائیں۔“ منیجر مشتاق سیال دیا اس کے قدموں پر کسی کتے کی طرح لوٹتے ہوئے خوشامدانہ انداز میں بولا۔

بیل جیسے خاکستری رنگت والے لحیم شحیم شخص نے چشمہ اتار کر بہ غور میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ ر اس کی میری جانب گھورتی نظروں کا مطلب فوری بھانپتے ہوئے باچھیں پھیلا کر اس سے بولا۔

”ملک صاحب! یہ اپنے چھوٹے صاحب ہیں........ نادر علی خان۔“

”ہوں........“ اس نے ایک گمبھیر اور پراسرار ہنکاری خارج کی، پھر وہیں کھڑے کھڑے منیجر سے مرکھراتی آواز میں بولا۔ ”کدھر گئے ہیں........ آپڑیں حیدر گل صاحب؟“

”وہ جی........ صاحب، اعظم خان صاحب سے ملنے گئے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ ئیں تو میں آپ کو بٹھا دوں۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ ملنا بھی ضروری ہے۔ انتظار کر ہی لیتے ہیں۔“ وہ پُرنخوت لہجے میں اطراف پر نظر لتے ہوئے بولا اور پھر منیجر کے ساتھ چلتا ہوا آفس کی طرف بڑھنے لگا۔ میں نے اس کرخت صورت ص سے ملنے کی کوشش نہیں کی مگر جب وہ میرے قریب سے گزرنے لگا تو عین میرے سامنے رک گیا۔ س کے بعد میری طرف مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بے تاثر لہجے میں بولا۔

”تم........ حیدر گل کے بھانجے ہو نا؟“

میں نے اس سے مصافحہ کیا اور محض اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اس نے اپنے کاندھوں پر ررے، بغیر گردن کے سر کو گینڈے کی طرح بہ مشکل موڑ کر اپنے چاروں مسلح محافظوں کی طرف دیکھا۔ راز ایسا ہی تھا جیسے وہ اپنے چاروں خبیث صورت کارندوں سے کہہ رہا ہو، پہچان لیا اسے؟

میں نے دیکھا، ان چاروں نے بیک وقت میرے چہرے پر اپنی پراسرار نظریں مرکوز کرتے ہوئے لے سے اپنے سر ہلا دیئے۔ مجھے ان کا یہ پراسرار انداز جانے کیوں بہت ہی عجیب لگا تھا۔ پھر وہ آگے ھ گئے تھے۔ منیجر مشتاق ان کو لے کر ماموں حیدر گل کے شاہانہ آفس میں داخل ہو گیا تھا۔ میں خاموشی ے ساتھ چلتا ہوا ماموں کے کمرے میں جانے کی بجائے دوسرے کمرے میں آ کر ایک کرسی پر براجمان

ہو گیا۔ یہ منیجر کا کمرا تھا۔ دونوں کمرے آپس میں متصل تھے۔ درمیان میں چھ بائی چار کی چوکھٹ کھڑکی تھی۔ یہاں اس بیل جیسے شخص نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''اوئے کاکے! اندر آ جا .... ہم تو تیرے ماموں کے پرانے یار بیلی ہیں .... آ شاباشے۔'' اس کا انداز بے تکلفانہ تھا۔ مگر لہجے میں عجیب سا اکھڑ پن تھا۔ اس کی بات نہ ماننا غیر اخلا ہی ہوتا۔ چنانچہ میں طوعاً و کرہاً اپنی جگہ سے اٹھا اور گھوم کر ماموں والے کمرے میں آ گیا۔ منیجر نے مجھے ماموں کی بھاری بھرکم ریوالونگ چیئر پر بیٹھنے کو کہا۔ یوں بھی میں جب آتا، ماموں کی غیر موجودگی میں ا چیئر پر بیٹھا کرتا تھا اس لئے میں وہیں براجمان ہو گیا۔

''کمال ہے .... آپ ماموں کے اتنے پرانے دوست ہیں لیکن میں آج پہلی بار آپ کو دیکھ ہوں؟'' میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس سے ہمکلام ہونا ضروری سمجھا۔

''وہ جی .... یہ .... اپنے ملک سردار خان صاحب ہیں، بڑے آدمی ہیں جی۔ ان کی ا ذرا کم ہی آوک جاوک ہوتی ہے نا۔'' منیجر نے فوراً اپنی باچھیں کانوں کی لوؤں تک پھیلا کے لقمہ ضروری سمجھا اور میں نے اس کی اس مداخلت بے جا پر اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا تو اس نے یکدم گھبرا کر اپنی گردن کچھوے کی طرح شانوں میں دبکا لی۔ مگر باز وہ پھر بھی نہ آیا۔ منمنا کر ہولے سے بولا۔ ''بڑے آدمی ہیں جی.........''

''یہ منیجر بڑا دلچسپ آدمی ہے۔'' ملک سردار خان نامی وہ شخص غیر تاثرانہ مسکراہٹ سے میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''بس ذرا بڑبولا ہے اور اس کی یہ عادت مجھے پسند ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے مکلف کرتے کی سائیڈ پاکٹ سے بینسن اینڈ ہیجز کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ پیکٹ سے ذرا ابھار کر میری طرف کیا۔

''شکریہ، میں سگریٹ نہیں پیتا۔'' میں نے معذرت خواہانہ مسکراہٹ سے کہا۔ اس نے خاموشی اپنے لئے سگریٹ نکال کر اپنے بدہیئت سیاہ ہونٹوں میں دابا اور بیش قیمت لائٹر سے اسے سلگانے کے بعد منیجر سے بولا۔

''کیا بات ہے مشتاق میاں! آج مزدوروں کی چہل پہل نظر نہیں آ رہی؟''

''وہ جی .... ملک صاحب! مزدوروں نے ہڑتال جو کر رکھی ہے۔''

''او .... اچھا .... کر لینے دو یہ شوق بھی پورا۔ پیٹ کی آگ بڑھے گی تو خود ہی آٹے دال بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ کیوں جی، نادر میاں.........؟'' اس نے تضحیک آمیز انداز میں بے محل تبصرہ اور آخر میں مجھ سے تائید چاہی لیکن میں خاموش رہا۔

''مگر یہ ہڑتالی ہیں کدھر؟ نظر تو نہیں آ رہے۔ نہ اندر .... نہ باہر۔'' میری طرف سے جواب پا کر اس نے دوبارہ منیجر سے پوچھا۔

''وہ لوگ جی .... اپنے بیوی بچوں کو لینے گئے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی آ کر مجمع لگائیں گے۔'' منیجر نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک باہر سے بہت سے لوگوں کے چیخنے چلانے اور شور مچانے کی آوازیں ابھریں......... دھواں دھار نعروں اور شور شرابے نے مجھے بے اختیار ریوالونگ چیئر سے اٹھنے پر مجبور کر دیا مگر ملک سردار سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر مجھے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھے رہنے کو کہتے ہوئے بولا۔

''بیٹھے رہو کاکے! انہیں اہمیت دو گے تو یہ اور منہ کو آئیں گے۔ ان لوگوں کا کام ہی مالکان کو بلیک میل کرنا ہوتا ہے۔''

اس کے لہجے میں ان معصوم اور غریب محنت کشوں کے لئے تضحیک آمیز حقارت کو محسوس کر کے میں نے چبھتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ملک سردار علی خان! سب سے پہلی بات تو یہ کہ میں کاکا نہیں ہوں، میرا نام نادر علی خان ہے۔ دوسرا یہ کہ اس ٹال کا مالک میں خود ہوں اور یہاں کے مزدوروں کے مسائل سے واقف ہونا میرا اولین فرض ہے۔ لہٰذا آپ یہاں آرام سے بیٹھ کر اپنے دوست حیدر گل کا انتظار کریں اور بس۔'' یہ کہہ کر میں کمرے سے باہر نکلنے لگا تو مجھے منیجر مشتاق سیال کے ہولے سے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی۔

''بڑے آدمی ہیں جی۔''

''محنت کشوں کے پسینے کا حساب دو .... حساب دو۔''

''غریب مزدوروں کے خون پسینے پر تجوریاں بھرنے والو! ہمارا حساب دو۔''

''تپتی دھوپ میں ہاتھوں سے کمائی کرنے والے غریب محنت کشوں کو روٹی کے نام پر بلیک میل کرنے والو! اپنے ایئر کنڈیشنڈ کمروں سے باہر نکلو، ہمارا احساس کرو، احساس کرو۔''

ویران سے ایک مکان میں
ایک بیوہ بیٹھی روتی ہے
اس کا بچہ یہ پوچھ بیٹھا ہے
عید بنگلوں میں کیوں ہوتی ہے

میرے کانوں میں پڑنے والے ان درد انگیز نعروں نے میرا جگر چھلنی کر کے رکھ دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں فطری طور پر ایک حساس طبع انسان تھا۔ میں گیٹ کے باہر آیا تو یکدم جیسے مجمع کو سانپ سونگھ گیا۔

ان محنت کشوں کی تعداد بیس پچیس سے کم نہ تھی۔ ان کا اوپری بدن برہنہ، نیچے بوسیدہ میلی چیکٹ شلواریں تھیں۔ پسینے اور گرد میں اٹے ہوئے مدقوق جسموں والے ان مزدوروں کے مفلوک الحال چہروں سے عسرت اور تنگ دستی پسینے کی صورت ٹپک رہی تھی۔ ان لوگوں کے ہمراہ ان کے بیوی بچے بھی تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ان کے یکدم خاموش ہونے کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ مجھے حیدر گل کے بھانجے کی حیثیت سے جانتے تھے۔ سب سے آگے میری عمر کا نوجوان تھا جو شاید ان کا لیڈر تھا۔ خاصا تنومند تھا۔ میرا دیکھا بھالا تھا۔ مردان شاہ نام تھا اس کا۔

میں نے ایک طائرانہ نظر ان سب پر ڈالی پھر مردان شاہ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''کیا بات ہے؟ تم لوگوں نے اتنا شور کیوں مچا رکھا ہے؟''

مردان شاہ میری طرف دیکھ کر سنجیدگی سے بولا۔

''چھوٹے صاحب! ہمیں بڑے صاحب سے بات کرنی ہے۔''

بڑے صاحب سے اس کی مراد ماموں حیدر گل ہی تھے۔ تاہم میں نے کہا۔

''وہ یہاں موجود نہیں ہیں .... تم لوگوں کا جو مسئلہ ہے، مجھے بتاؤ۔''

''چھوٹے صاحب! ہم صرف مالک سے ہی بات کریں گے۔'' وہ اٹل لہجے میں جواباً بولا۔

''تم مجھے نہیں جانتے؟'' میں نے اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں، آپ مالک کے بھانجے ہیں جی۔ .... لیکن.........''

میں نے اچانک اس کی بات کاٹی۔

''بس اتنا ہی جانتے ہو مجھے..........؟''

اس پر وہ ایک ذرا چونکتی نظروں سے میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

''اس ٹال کا اصل مالک میں ہوں۔''

''جی ہاں چھوٹے صاحب! یہ تو ہم جانتے ہیں۔ مگر آپ تو ہر وقت ادھر نہیں ہوتے۔ ہم صرف مالک سے ہی بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''مالک تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ مجھ پر بھروسہ رکھو۔ میں جو مذاکرات کروں گا، وہ حتمی ہوں گے۔''
میں نے اس بار ٹھوس لہجے میں کہا تو مردان شاہ چند ثانیے کی پُرسوچ خاموشی کے بعد بولا۔

''دیکھئے چھوٹے مالک..........''

''میرا نام صرف نادر علی خان ہے۔ مالک والی ذات کوئی اور ہے۔'' میں نے دوبارہ اس کی بات کاٹ کر اپنی انگلی آسمان کی طرف اٹھائی۔

''جی..........نادر علی صاحب! بات یہ ہے کہ ہماری ہڑتال کو آج ساتواں روز ہے مگر بڑے صاحب (ماموں حیدر گل) نے ہم سے باہر نکل کر بات تک کرنا گوارا نہیں کیا ہے۔''

اس نے بتایا اور مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ گویا سات روز سے کام بند تھا۔ میں نے دل میں سوچا، یہ غریب مزدور تو روز کمانے اور روز کھانے والے لوگ تھے۔

''تم لوگوں کا اصل مسئلہ کیا ہے؟ وہ بتاؤ مجھے۔''

وہ بتانے لگا۔ ''دن بہ دن بڑھتی ہوئی مہنگائی کے تناسب سے ہماری تنخواہیں بہت کم ہیں۔ ہم نے مالک سے تنخواہ بڑھانے کا مطالبہ کیا تو انہوں نے ہماری تنخواہیں تو بڑھا دیں لیکن روز کی مزدوری کو ''بھتا مزدوری'' کا نام دے کر بند کر دیا۔ آپ خود انصاف کریں کہ ہم صبح چھ بجے یہاں بغیر ناشتہ کئے آتے ہیں۔ بھاری شہتیر اٹھاتے ہیں، ٹرکوں پر لادتے ہیں، بجلی اکثر جاتی رہتی ہے تو ہم ان ہاتھوں سے خود آرا مشین چلاتے ہیں۔ رات نو بجے تک۔ کیا ہمیں یہاں دو وقت کی روٹی بھی نہ ملے؟ وہ اگر گھر کھانے جائیں تو مالک اسے وقت کا زیاں سمجھتا ہے۔ آپ ہی بتائیں، ہم کیا کریں؟''

یہ کہہ کر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں میرے سامنے پھیلا دیں۔ اس کی دیکھا دیکھی تمام مزدوروں نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا کر میرے سامنے کر دیئے۔

میں نے ان کی ہتھیلیوں کو دیکھا تو احساسِ دروں کی ایک ٹیس سی اٹھی۔ ان بے چاروں کی ہتھیلیاں سرخ اور پھٹی پھٹی سی ہو رہی تھیں۔ چھالے پرانے ہو کر سیاہ پھوڑوں کی صورت نظر آ رہے تھے۔

''تم لوگوں کی اس وقت ماہانہ تنخواہ کتنی ہے؟'' میں نے ایک ہنکاری لے کر مردان شاہ سے پوچھا تو وہ بولا۔

''پہلے دو ہزار تھی۔ پھر صرف دو سو روپے بڑھا کر ہماری روز کی دو وقت کی روٹی اور چائے کا مزدوری میں ملنے والے پچھتر روپے فی کس بند کر دیئے گئے۔ اس طرح تو ہمیں اُلٹا نقصان ہو گیا۔ یہ تو ہمارا حق غصب کرنے والی بات ہوگئی۔''

اس نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ اچانک مجمع میں ایک مزدور سے نہ رہا گیا اور اس نے اپنے لیڈر کے منہ سے ناانصافی کی کتھا سننے پر جوش سے مغلوب ہو کر بہ آواز نعرہ لگا دیا۔

''ہمارے پسینے کا حساب دو..........حساب دو۔''

''مزدوروں کی کمائی سے کروڑوں کمانے والو! ہمارے ایک ایک روپے کا حساب دو۔''

میں نے ہاتھ بلند کر کے انہیں خاموشی اختیار کرنے کو کہا تو ان کے مزدور لیڈر مردان شاہ نے بھی تھ کے اشارے سے مجمع کو خاموش رہنے کی تلقین کی۔

اس دوران منیجر مشتاق بھی وہاں آ گیا۔ پھر میرے قریب آ کر عادت سے مجبور ہو کر بڑبڑایا۔

''چھوٹے لوگ ہیں..........جی۔''

میں نے گردن موڑ کر کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا۔ وہ جلدی سے گھبرا کر بولا۔ ''مم.........برا مطلب ہے..........سب بڑے لوگ ہیں جی۔'' پھر میری بدستور اپنی جانب گھورتی ہوئی نظروں کی ب نہ لاتے ہوئے میری مرضی کے مطابق جملہ بنانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے منمنا کر دوبارہ بولا۔ نکے ہیں جی۔''

اس کی پھر بھی تسلی نہیں ہوئی تو اس بار مسمسی سی صورت بنا کر باریک آواز میں بولا۔ ''ابھی جے ہی ں جی!''

''منیجر!..........'' میں زور سے دہاڑا۔ ''تمہاری دماغی حالت درست نہیں۔ تم اندر جاؤ۔''

وہ ایسی صورت بنا کر واپس جانے کے لئے پلٹنے لگا جیسے اسے قبض کی شکایت ہو گئی ہو۔ مجھے اس کی ت پر ہنسی تو آئی مگر یہ موقع نہ تھا۔

میں نے ایک طائرانہ نظر دوبارہ مجمع پر ڈالی، پھر مردان شاہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''اب مجھے یہ بتاؤ ماموں حیدر گل پر تم لوگوں کے مطالبے کا کیا اثر ہوا ہے؟''

''وہ تو جی ہم سے بات کرنا ہی گوارا نہیں کر رہے ہیں۔'' وہ تلخی سے بولا۔ ''ہم چھ روز تک ادھر ہی کے پیاسے دھرنا مارے گرمی اور دھوپ میں بیٹھے رہتے ہیں۔ آج مجبور ہو کر ہم اپنے بیوی بچے بھی آئے ہیں۔ مالک ہم سے یہی کہتا ہے کہ پہلے کام شروع کرو، مذاکرات بعد میں ہوں گے۔ یہ تو ہم بوں کو ٹالنے والی بات ہوئی نا جی!''

میں اس کی بات پر کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ بات واضح تھی۔ اگر مردان کے کہنے کے مطابق واقعی ں حیدر گل نے ان کے ساتھ ناانصافی کی تھی اور تنخواہ کے محض دو سو روپے بڑھا کر ان کی روز کی ئے روٹی کے جو ان کا بہرحال حق تھا، پچھتر روپے دینا بند کر دیئے تھے تو اس طرح ماموں نے ان کا حق مارا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔

مجھے ٹال سے ہونے والی ماہانہ آمدنی کا اندازہ تھا، جو ایک لاکھ اسی ہزار سے دو لاکھ دس ہزار کے ان تھی۔ خرچ اخراجات اور مزدوروں کی تنخواہ کی مد میں کٹ کٹا کر یہ آمدنی ایک لاکھ ساٹھ ہزار کے ب قریب بنتی تھی۔ یہ سارا حساب کتاب کرتے ہی میں مردان شاہ سے ذرا بلند آواز میں بولا تا کہ دیگر بھی میرے فیصلے سے آگاہ ہو جائیں۔

''ٹھیک ہے..........تم لوگ اپنے بیوی بچوں کو گھر چھوڑ آؤ اور آج سے کام شروع کر دو۔ میں تم سا کے روز کے نہ صرف پچھتر روپے بحال کرتا ہوں بلکہ اسے بڑھا کر پورے سو روپے کرتا ہوں اور ہ میں بھی مزید تین سو روپے کا اضافہ کرتا ہوں۔ اس طرح وہ ڈھائی ہزار روپے ہو جائے گی۔ کیا ں میرا یہ فیصلہ قبول ہے؟''

میرے فیصلے پر جیسے ان لوگوں کے بدحال چہروں پر زندگی کی رونق دوڑ گئی اور انہوں نے خوشی کے ے ''چھوٹے مالک زندہ باد'' کے نعرے لگانا شروع کر دیئے۔ مردان شاہ نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر

کے مجمع کو خاموش کروایا۔ میں نے دیکھا، اس کے چہرے پر اب بھی عدم اطمینان کی سی کیفیت طاری تھی
''صاحب جی! ہم آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے ہمارے دکھوں اور ہماری پریشانیوں کا احسا
کیا۔ لیکن کیا یہ فیصلہ بڑے مالک قبول کریں گے؟''
مجھے اس کی بے اطمینانی کی وجہ معلوم ہوگئی۔ لہٰذا میں ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ ازراہ تشفی ان
بولا۔ ''اس ٹال کا اصل مالک میں ہوں..........اور میرے ماموں کو میری بات ماننا پڑے گی۔ تم لو
بے فکر ہوکر آج سے کام شروع کردو۔''
یہ کہہ کر میں واپس آفس کی طرف لوٹ گیا۔ وہ لوگ خوشی سے میرے حق میں نعرے بلند کر
ہوئے لوٹ گئے۔ منیجر گھبرائے ہوئے اُلّو کی طرح آفس کے باہر ہی کھڑا تھا۔
اس نے شاید وہاں کھڑے ہوکر میرے فیصلے کی روداد، مذاکرات سمیت سن لی تھی۔ وہ ڈرتے ڈر
مجھ سے مخاطب ہوا۔
''سس.........سر جی!.........یہ.........یہ آپ نے کیا کردیا؟''
''تم اپنی اوقات میں رہو منیجر! سمجھے.........؟'' میں نے اسے گھور کر جھڑکا اور ماموں کے کم
میں جانے کی بجائے دوسرے کمرے میں آکر بیٹھ گیا۔
ملک سردار خان ماموں والے کمرے میں ہی بیٹھا تھا اور شیشے کے چوکھٹے سے بہ مشکل اپنی گر
موڑے میری طرف عجیب نظروں سے گھورے جارہا تھا۔
ذرا دیر بعد تمام مزدوروں نے آکر کام شروع کردیا۔ ان لوگوں کے آنے کے پندرہ بیس منٹ
ہی ماموں حیدر گل بھی لوٹ آئے۔ ان کی سفید رنگ کی پوٹھوہاری جیپ گیٹ سے اندر داخل ہوئی
کے ہمراہ ایک آدمی بھی تھا۔ وہ نیچے اُترے اور دائیں بائیں مزدوروں کو کام میں مگن دیکھ کر چونک ا
پھر عجیب انداز میں اپنا سر جھٹک کر اپنے کمرے کی جانب بڑھے۔ میں بھی کرسی سے اٹھ کر باہر آیا
دیکھ کر اس کے قدم جیسے یکدم زمین میں گڑ گئے۔
میں نے اخلاقاً مگر بے تاثر لہجے میں انہیں سلام کیا۔
''ارے نادر بیٹا! تم یہاں کیسے؟''
''کیوں ماموں؟.........کیا میں یہاں نہیں آسکتا؟'' میں نے غیر معمولی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔
''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' جواباً وہ بھی سنجیدہ بلکہ خشک لہجے میں بولے۔ ''بہرحال.........اندر آ
یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں داخل ہوگئے۔ ملک سردار خان نے کھڑے ہوکر ماموں سے معانقہ کیا
کے بعد وہ اپنی بھاری بھرکم چیئر پر براجمان ہوگئے۔ میں بھی ملک سردار خان کے برابر والی کرسی پ
گیا۔ منیجر پاس ہی آن کھڑا ہوا۔ وہ بڑی بے تابی سے ماموں کے بولنے، بہ الفاظ دیگر ان کے کچھ
کا منتظر تھا اور ہوا بھی یہی۔
''منیجر! کیا ان مزدوروں کے کس بل نکل گئے؟'' ماموں حیدر گل کے لہجے میں طنز کی گہری کاٹ
جو مجھے حد درجے ناگوار گزری۔ مگر میں نے ابھی دخل اندازی مناسب نہیں سمجھی تھی۔
''وہ جی.........کس بل تو ہمارے نکل گئے۔'' وہ جیسے پھٹ پڑا۔
''کام کی بات کرو۔'' ماموں نے چبھتے ہوئے لہجے میں اس سے کہا۔
''سر جی! آپ کے بھانجے صاحب، نادر میاں نے مزدوروں کے سارے مطالبے مان لئے ہ
ان کی بھتا مزدوری کے علاوہ ماہانہ تنخواہیں بھی بڑھادی ہیں۔'' ذرا اس کے لہجے میں میرے لئے شکایت

ٹ کر بھری ہوئی تھی۔
''ایں.........یہ کیا.........؟'' ماموں یکدم جیسے بدک گئے اور میری طرف دیکھ کر مستفسر ہوئے۔
''یہ منیجر کیا کہہ رہا ہے نادر بیٹے! کیا تم نے.........؟''
''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے ماموں!'' میں نے مستحکم لہجے میں ماموں کی طرف دیکھ کر کہا۔
''نادر بیٹے! یہ تم نے کیا بے وقوفی کرڈالی؟ تمہیں معلوم ہے کہ ان لوگوں کے دماغ خراب ہوجائیں
ے اور آئے روز اسی طرح بلیک میل کرکے اپنے مطالبے منواتے رہیں گے۔''
میرے بولنے سے پہلے ہی منیجر بول پڑا۔ ''سر جی! میں نے تو سمجھانے کی کوشش کی تھی نادر میاں کو
کہ اس طرح یہ ہر روز ہمارے منہ کو آنے لگیں گے۔ آخر چھوٹے لوگ جو ہوئے۔'' وہ اپنے تکیۂ کلام کے
ریعے دل کی بھڑاس نکالنے پر تلا بیٹھا تھا۔
''تم اپنی چونچ ذرا دیر کے لئے بند رکھو۔'' ماموں حیدر گل نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ پھر میری
رف دیکھ کر بولے۔ ''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟''
''جواب تو آج تک مجھے بھی میری باتوں کا نہیں ملا ہے ماموں!'' نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے
پنے کاٹ دار لہجے میں دیرینہ تپش سموتے ہوئے ماموں سے کہا۔
''یہ آج تم کس لہجے میں مجھ سے بات کررہے ہو؟'' ماموں نے قدرے سخت لہجے میں مجھ سے کہا تو
میں ان سے مرعوب ہوئے بغیر ملک سردار خان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔
''ماموں! پہلے آپ ان سے فارغ ہولیں، پھر بات ہوگی۔''
میری بات پر ماموں نے ایک نظر ملک سردار خان کی طرف دیکھا پھر بہ غور میرے چہرے کے
تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے سرد لہجے میں بولے۔
''تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی نادر!.........گھر جاؤ۔ وہیں تم سے بات ہوگی۔''
''نہیں ماموں! مجھے آپ سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔ میں اسی لئے پنڈی سے صبح سویرے ہی
ؤں چلا آیا تھا۔ مگر آپ گھر سے جاچکے تھے۔ یہاں آکر میں گھنٹے بھر سے آپ کا انتظار کررہا ہوں۔''
ں نے بھی چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔
''ہاں ٹھیک ہے.........اسی لئے تو کہہ رہا ہوں، تم گھر جاؤ.........میں.........''
''ماموں! آپ پہلے ملک صاحب کو فارغ کردیں۔'' میں نے ان کی بات کاٹی تو ان کے چہرے پر
واری کے تاثرات ظاہر ہونے لگے۔ پھر ان کے کچھ بولنے سے پہلے ہی ملک سردار خان نے اپنی جگہ
ے اٹھتے ہوئے ماموں سے کہا۔
''حیدر!.........میں چلتا ہوں۔ تم کسی وقت آکر مجھ سے مل لینا۔'' یہ کہہ کر وہ ماموں کا جواب سنے
ر باہر نکلتا چلا گیا۔
''نادر!.........یہ کیا بدتمیزی ہے؟ تمہیں چھوٹے بڑے کا بھی خیال نہیں رہا ہے۔ شہر کی پڑھائی نے
ارا اتنا ہی دماغ خراب کردیا ہے؟'' وہ درشتی سے بولے۔
''ماموں! شہر کی پڑھائی نے اب میرا دماغ درست کیا ہے۔'' میں نے بھی ترکی بہ ترکی کہا۔ ''مجھے
لوم ہوچکا ہے کہ آپ نے آج تک مجھے میرے سوالوں کے جواب سے کیوں محروم کررکھا تھا.........
ائیے نا کہ آپ کی لاڈلی بہن کا مکروہ جرم مجھ سے پوشیدہ رہے؟'' میرے لہجے میں نفرت کی زہریلی
واہٹ اُتر آئی اور ماموں کا منہ پہلے تو حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا پھر دوسرے ہی لمحے وہ حلق کے

بل گرج کر بولے۔

''نادر.........!''

''آہستہ بولیں ماموں! کہیں ہمارے خاندان کی یہ لرزہ خیز کتھا کوٹھوں تک نہ جا پہنچے۔'' میں بدستور تلخی سے کہا۔ ماموں کے چہرے پر غصے کا ارتعاش لرزاں تھا۔

پھر وہ اپنے ہونٹ بھینچ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور میرے قریب آ کر میرا بازو پکڑا۔

''آؤ میرے ساتھ ....گھر چل کر تم سے بات کرتا ہوں۔''

میں نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا اور ان کے ساتھ گھر چلنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

***

''ہاں .... بولو، کیا کہنا چاہتے تھے تم مجھ سے؟'' گرین لاج پہنچنے کے بعد ماموں حیدر گل میرے چہرے پر نظریں مرکوز کر کے کہا۔

''ماموں! ....میرے باپ کو تمہاری بہن نے کیوں قتل کیا تھا؟''

میرا خیال تھا کہ میرے اس سنسنی خیز انکشاف پر انہیں حیرت و پریشانی کا زبردست جھٹکا لگے گا! ان کے چہرے پر ہلکی سی چونکنے کی علامت بھی ظاہر نہ ہوئی۔ البتہ میرے منہ سے ماں کی بجائے ''ا کی بہن'' کے الفاظ پر ماموں نے مجھ سے کہا۔

''وہ میری بہن ہی نہیں، تمہاری ماں بھی ہے۔ کیا تم اتنے ہی بے حس ہو چکے ہو کہ اپنی مظلوم ا ماں بھی نہیں کہہ سکتے؟''

''مظلوم ....ہونہہ.........!'' میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ عود کر آئی۔ ''ماموں! مظ میرا باپ قادر خان تھا، جسے اس ناگن.........''

''نادر.........!'' ماموں پھٹ پڑے اور مارے طیش کے مجھے تھپڑ مارنے کے لئے انہوں نے ہاتھ اٹھا دیا۔ مگر وہ اٹھا کا اٹھا رہ گیا۔ میرے اندر بھی غم و غصے کی ایک شدید لہر اُٹھی تھی۔

''ماموں! .... کیا میرا سچ اتنا ہی کڑوا ہے کہ آج آپ کا ہاتھ بھی مجھ پر اٹھنے لگا؟ لیکن آپ کس کے منہ پر یہ تھپڑ ماریں گے؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ سچ کو جتنا دبایا جاتا ہے، وہ اتنا ہی شدت ساتھ اُبھرتا ہے۔'' میں فرطِ جوش سے پھٹ پڑا۔

''مجھے آج معلوم ہوا ہے کہ آپ نے بچپن سے لے کر اب تک مجھے میرے سوالوں کے جواب کیوں محروم رکھا .... میں پوچھتا ہوں ماموں! کہ تمہاری بہن نے میرے باپ قادر خان کا کیوں کیا تھا؟''

''نادر!.........تم اس وقت میری نظروں سے دور ہو جاؤ.........ایسا نہ ہو، میرا ہاتھ واقعی اٹھ جا ماموں نے سرخ چہرے کے ساتھ مجھ سے کہا۔ ان کا لہجہ غصے کی شدت کے باعث لرزنے لگا تھا۔

میں نے ایک گہری ہنکاری بھری اور چند لمحے ماموں کے چہرے کو تکتا رہا۔ اگرچہ مجھے پہلے بھی اس بات کا پورا یقین تھا کہ ماموں میرے اس سوال کا جواب بھی نہیں دے پائیں گے کیونکہ آج تک ہی ہوتا چلا آیا تھا۔ وہ مجھے ٹالتے چلے آئے تھے مگر میں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ اب اس خونی راز سے اٹھا کر رہوں گا۔ کیونکہ اب معاملہ میرے باپ کے قتل کا تھا اور قاتل بھی کون ....یعنی میری اپنی ماں!

''ماموں! مجھے گاڑی کی چابی دو۔'' چند ثانیوں کی اعصاب شکن خاموشی کے بعد میں نے جیپ

چابی مانگی۔ ماموں نے خاموشی کے ساتھ چابیاں مجھے تھما دیں۔ میں جانے لگا تو عقب سے ان کی بھکتی ہوئی آواز ٹکرائی۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

میں ایک پل کے لئے رکا اور گردن موڑ کر عقب میں ماموں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''اپنے سوال کا جواب لینے۔''

یہ کہہ کر میں تیزی سے نکل گیا۔

میں جیپ میں آ کر بیٹھا اور اسے اسٹارٹ کر کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ صنوبر اور چیڑ کے لانبے لانبے پیڑوں سے گھری بل کھاتی سڑک پر میں جیپ خطرناک رفتار کے ساتھ دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ مضبوطی سے اسٹیئرنگ پر جمے ہوئے تھے۔ نظر ونڈ اسکرین کے پار چکنی سڑک پر مرکوز تھی اور دل و دماغ میں زناٹے دار ہواؤں کی شائیں شائیں ہو رہی تھی۔

میرے اس سوال پر کہ میری ماں نے میرے باپ کا خون کیوں کیا تھا؟ ماموں حیدر گل کا جواب دینے کی بجائے آپے سے باہر ہونا میرے اس شبہے کو یقینی بنا رہا تھا کہ شاہ میر اور نظر حیات نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا، وہ غلط نہ تھا۔ چنانچہ اب مجھے اس بات کا پورا یقین ہو چکا تھا کہ ماموں حیدر گل بھی میرے سوالوں کا تسلی بخش جواب نہیں دے سکتے۔ یقیناً وہ یہ ہرگز نہیں چاہتے ہوں گے کہ میری ماں یعنی اپنی بہن کے اس بھیانک اور ناقابل معافی جرم کا میرے سامنے اقرار کریں۔ یہی وجہ تھی کہ اب میں جیل جا کر خود اپنی ماں سے ان سوالوں کا جواب لینا چاہتا تھا۔

نصف گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد میں نے جیل کی عمارت کے سامنے جیپ روکی اور اندر داخل ہو گیا۔ یہاں لیڈیز عملہ بھی نظر آتا تھا۔ یہ ایک چھوٹی سطح کی وومن جیل تھی، جس کے ساتھ Juvenile Crime کی جیل بھی منسلک تھی۔

جیل سپرنٹنڈنٹ اظہر اقبال مجھے ماموں حیدر گل کے بھانجے اور قیدی عورت کے بیٹے کی حیثیت سے جانتا تھا۔ اس نے فوراً میری ماں سے ملاقات کا بندوبست کروا دیا۔

دو پولیس والے مجھے ایک تنگ و تاریک اور سیلن زدہ سی بیرک کے سلاخ دار دروازے کے سامنے چھوڑ کر چلے گئے۔ سامنے وہ عورت کھڑی تھی جو میری ماں تھی۔

وہ اب تک اُنیس سال کی سزا کاٹ چکی تھی۔ اس کی عمر چالیس کے پیٹے میں تھی۔ میری محدود معلومات کے مطابق اسے اکیس سال کی عمر میں جیل ہوئی تھی اور اس چہار دیواری کے اندر اس عورت نے مجھے ننگے فرش پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جنم دیا تھا۔ میں کئی سال بعد اس سے ملنے آیا تھا۔ اس وقت وہ ایک بھرپور جوان عورت تھی۔ اگرچہ اب بھی اس کی صحت میں کچھ خاص فرق نہیں نظر آتا تھا۔ تاہم عمر رفتہ کے روز و شب، جیل جیسی گھٹن اور پُر مصائب فضا میں بتانے کے بعد اس کے سرخ و سپید چہرے کی پہلے الی رونق ماندی پڑنے لگی تھی۔ بالوں میں کہیں کہیں چاندی کے تار بھی جھلکنے لگے تھے۔ لیکن اس کی بڑی بڑی کشادہ آنکھوں میں آج بھی وہی ایک عجیب سی خوں ناک چمک محسوس کر رہا تھا، جو میں اپنے بچپن سے دیکھتا آیا تھا۔ اس کی مجھ پر نگاہ پڑی اور پھر جیسے اس کا پژمردہ چہرہ کھل اُٹھا۔ ممتا بھرے جذبات کی ایک مخصوص سرخی اس کے چہرے پر امڈ آئی اور وہ بے اختیار سلاخوں کے قریب آ گئی۔

''نادر! ....میرے بچے! میرے جگر کے ٹکڑے!.........تو آ گیا؟''

یہ کہتے ہوئے اس نے سلاخوں کے پیچھے سے اپنا ایک کپکپاتا ہوا ہاتھ میرے سر پر پھیرنے کے لئے

باہر نکلا تو میں ایک نفرت انگیز نگاہ اس کے چہرے پر ڈال کر ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ماں کے چہرے پر ایکا ایکی تاریکی اترتی چلی گئی۔ وہ ہکا بکا سی رہ گئی۔ آنکھوں میں درد کی رمق سی اُبھر آئی۔

میں نے اسے غور سے دیکھا پھر دانت کچکچا کر لفظوں کو چبا چبا کر اس سے مخاطب ہوا۔

''جس طرح میں تیرے جگر کا ٹکڑا تھا ماں! اسی طرح میں اپنے باپ قادر خان کا بھی لخت جگر تھا۔ پھر...... پھر تُو نے اسے قتل کر کے، مجھے باپ کے سائے سے کیوں محروم کر دیا؟...... میں تجھ سے یہ سوال پوچھنے آیا ہوں ماں!...... مجھے جواب دے۔ ابھی...... اور اسی وقت۔''

میں جیسے پھٹ پڑا۔ ماں سناٹے میں آ گئی۔ اس کا رنگ گہرا ہو گیا اور چہرے پر سیاہی کے ساتھ زردی بھی نمودار ہو گئی۔ وہ ایک سراسیمگی کی سی کیفیت میں مجھے تکتی رہی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں گویا غم کا سمندر موجزن تھا۔ چند لمحے اسی طرح گزرے۔ پھر اس کے لرزیدہ ہونٹوں سے نکلا۔

''ی...... یہ...... یہ تُو کیا...... کہہ رہا ہے بیٹا؟''

''مجھے بیٹا مت کہہ۔ صرف میرے سوال کا جواب دے...... کہ تُو نے میرے باپ کا خون کیوں کیا تھا؟''

میں نے انتہائی سرد مہری سے اس کے دھواں دھواں ہوتے چہرے کو گھور کر کہا مگر وہ میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے ایک ٹک مجھے تکنے لگی۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے صاف عیاں تھا کہ شدید تذبذب کا شکار ہے۔ مگر اس کے ہونٹ لرز رہے تھے جیسے ان کہے سے الفاظ اس کے لرزیدہ لبوں پر دم توڑ رہے ہوں۔ تب پھر اس نے اپنی آنکھیں موند کر ایک گہری سانس لی اور یاس زدہ لہجے میں بولی۔

''میں...... تمہارے اس سوال کا جواب ابھی نہیں دے سکتی۔''

''کیوں؟...... کیا میرے سامنے اپنے بھیانک جرم کا اقرار کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی؟'' میرے لہجے میں طنز کی بڑی زہریلی کاٹ تھی۔ ''ماں! تُو نے اور ماموں حیدر گل نے کیا سمجھ رکھا تھا؟ مجھے کبھی اس کریہہ حقیقت کا پتہ نہیں چل سکتا؟''

''نادر!'' ماں غضب ناک آواز میں چلا اُٹھی۔

''کیوں ماں!...... میرا سچ اتنا ہی کڑوا لگا تمہیں؟'' میں نے دوبارہ کاٹ دار لہجے میں کہا۔

''تم...... تم...... میری نظروں سے دور ہو جاؤ...... جاؤ، چلے جاؤ یہاں سے۔'' وہ چلائی اور میرے اندر اس کے خلاف ایک نفرت انگیز لہر اُبھری۔

لہٰذا میں اسی لہجے میں بولا۔ ''تمہارے پاس اور کہنے کے لئے رہا بھی کیا ہے۔ مگر یاد رکھنا ماں! میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم اور ماموں حیدر گل میرے سوالوں کے جواب دینے سے کیوں کترا رہے ہو۔ لیکن مجھے بہت جلد اصل حقیقت کا علم ہونے والا ہے۔'' میں یہ کہہ کر غصے سے پاؤں پٹخ کر ماں کو حیرت و پریشان چھوڑے، وہاں سے چلا آیا۔

میں واپس گرین لاج میں آیا۔ ماموں اندر موجود تھے۔ وہ شاید گاڑی کے انتظار میں ابھی وہیں تھے۔ انہوں نے مجھ سے جیپ کی چابیاں مانگیں۔ میں نے انہیں چابیاں تھماتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

''ماموں! ایک بات کا خیال رکھئے گا۔ میں نے ٹال کے مزدوروں کے لئے جو فیصلہ کیا ہے، وہ اسی طرح برقرار رہنا چاہئے۔''

وہ میری طرف دیکھ کر سرد مہری سے بولے۔ ''ٹال کے معاملات میں خود بہتر طریقے سے حل کرنا جانتا ہوں۔ تم صرف اور صرف اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔'' یہ کہہ کر وہ جانے لگے تو میں نے انہیں پکارا۔

''ماموں......!''

میرے پکارنے پر وہ رکے مگر میری طرف گردن موڑے بغیر خاموشی سے کھڑے میرے بولنے کے منتظر رہے۔

''میری پڑھائی جاری ہے۔ آپ اس کی فکر نہ کریں۔ لیکن جہاں تک ٹال کے معاملات کا تعلق ہے، انہیں حل کرنے کا مجھے بھی حق پہنچتا ہے۔'' میں نے کہا اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید بولا۔

''اور...... میں نے مزدوروں کے حق میں جو فیصلہ کیا ہے، وہ کاروبار کے مفاد میں جاتا ہے۔ اس لئے ہمارے درمیان مزید کسی قسم کی ناچاقی اور بدمزگی سے پہلے میں آپ کو متنبہ کرتا ہوں کہ میرے فیصلے کو حتمی سمجھا جائے۔''

میری دوٹوک بات پر ماموں حیدر گل میری طرف گھومے۔ پھر چند قدم چلتے ہوئے میرے قریب آئے۔ چند ثانئے میری آنکھوں میں جھانکنے کی سعی کرتے رہے۔ پھر پُرسوچ انداز میں سر کو دھیرے دھیرے جنبش دیتے ہوئے بولے۔

''ٹھیک ہے۔''

ان کے جانے کے بعد میں اسی دن واپس پنڈی روانہ ہو گیا۔ میرے اور نگینہ کے درمیان جذباتی تعلق خاطر پنپنے کے بعد سے کبیر نے میرے روم سے اپنا مختصر سا بوریا بستر سمیٹ لیا تھا۔ اس نے اب اپنے کسی اور دوست کے روم میں شراکتی رہائش اختیار کر لی تھی۔ مجھے بہر حال اس پر مطلق اعتراض نہ تھا۔ میں جب کالج کیمپس پہنچا تو شام کے سائے جھک آئے تھے۔

میں تھکا تھکا سا اپنے بیڈ پر دراز ہو گیا۔

میں نے اب ماں اور ماموں حیدر گل سے مایوس ہو کر یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اپنے ماضی کے بارے میں نگینہ کے پپا شاہ میر صاحب سے مکمل تفصیل جاننے کی کوشش کروں گا۔ ماں اور ماموں حیدر گل کی پراسرار خاموشی انہیں میری نظروں میں مجرم بنا رہی تھی۔ اگرچہ مجھے اس بات کا تو پورا یقین ہو چکا تھا کہ میری ماں ہی نے میرے باپ کا قتل کیا تھا اور وہ اپنے اسی بھیانک جرم کی سزا اب عمر قید کی صورت جیل میں بھگت رہی تھی۔ مگر میں اب یہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر میری ماں نے میرے باپ کا خون کیوں کیا تھا؟ وہ کیا عوامل تھے کہ جس نے میری ماں کو اپنے ہی شوہر کے قتل پر اُکسایا تھا۔

یہ وہ اہم سوال تھے جو میرے اندر اب لاوے کی طرح کھولنے لگے تھے۔ میں بہر حال ماموں حیدر گل اور ماں سے یہ کریہہ حقیقت اُگلوانے میں ناکام رہا تھا۔ مگر میری یہ ''ناکامی'' اس بات کا واضح اور ٹھوس ثبوت تھی کہ میرے باپ قادر خان کے قتل میں میری ماں کے ساتھ میرا ماموں حیدر گل بھی ضرور برابر کا شریک رہا ہو گا۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے نگینہ کے پپا شاہ میر اور ان کے دوست انکل نظر حیات کے حوالے سے بھی ایک کرید سی لگ گئی تھی کہ آخر ان دونوں نے کبیر احمد کے ورغلانے پر یہ کیسے سمجھ لیا تھا کہ ان لوگوں پر گمنام قاتلانہ حملے کروانے میں ماموں حیدر گل اور میں ہی ملوث تھا؟ اگرچہ میری طرف سے ان کے دل اور ذہن صاف ہو چکے تھے مگر میرے لئے سوچنے کی بات یہ تھی کہ آخر کس حوالے سے شاہ میر اور نظر حیات نے یہ بھی سمجھا تھا کہ یہ گمنام دشمنی ہمارے سوا ان کے ساتھ اور کوئی نہیں کر سکتا؟ دوسرے ان کی باتوں سے ہی یہ بھی صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ لوگ میری ماں کے ماضی سے بہ خوبی واقف تھے۔ لیکن کیوں؟ ان کا میری ماں کے ماضی سے ایسا کون سا پراسرار تعلق تھا؟

چنانچہ اب مجھے نگینہ کے پپا اور انکل نظر حیات سے ہی اصل حقیقت کا پتہ چل سکتا تھا۔ اور اب وا
اس پُراسرار راز سے پردہ اٹھا سکتے تھے۔

میں نے یونیورسٹی کیمپس پہنچتے ہی نگینہ سے موبائل پر رابطہ کر کے اسے بتا دیا کہ میں ماموں حیدر
سے اس بار بھی حقیقت اگلوانے میں ناکام رہا ہوں۔ حتیٰ کہ میں پہلی بار خود جیل جا کر ماں سے بھی ملا
مگر اس کی پُراسرار خاموشی کو بھی میں نہیں توڑ سکا ہوں۔

''اس کا مطلب ہے ....اب ہمیں ہی اس حقیقت سے پردہ اٹھانا پڑے گا۔'' میری بات س
کے بعد نگینہ پُرخیال لہجے میں بولی۔

''ہاں نگینہ! یہ میری زندگی کا ایک اہم ترین مسئلہ ہے۔ پلیز نگینہ! اب تم لوگ ہی میری مدد کر سک
ہو۔'' میں نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

''نادر! تمہاری جذباتی طبیعت کو دیکھ کر مجھے جانے کیوں خوف آتا ہے کہ......... کہیں.........''
کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ مگر میں اس کی ادھوری بات کا مطلب فوری سمجھتے ہوئے بولا۔

''تم بے فکر رہو۔ میں بہت مضبوط اعصاب کا مالک ہوں۔ لیکن جب تک اس راز سے پ
نہیں اٹھے گا، میں بے چین ضرور رہوں گا۔ کیا یہ اچھا نہیں کہ حقیقت بتا کر، چاہے وہ کتنی ہی کریہہ ا
کڑوی کیوں نہ ہو، مجھے ایک ڈگر پر تو لا کھڑا کر سکتی ہے۔''

''ہاں .... میں پہلے پپا سے بات کرتی ہوں .... پھر تمہیں فون کر کے اپنے ہاں بلا لو
گی۔'' اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا پھر بولی۔ ''اور ہاں، تم ذرا کبیر احمد سے محتاط رہنا۔ اور ا
کے منہ لگنے کی کوشش ہرگز مت کرنا۔''

میں اس کی تنبیہہ پر قدرے چونکا۔ ''کیوں؟......کیا اس نے تم سے میرے بارے میں کچھ کہا تھا؟''

وہ چند ثانیے پُرسوچ خاموشی کے بعد بولی۔ ''ہاں .... وہ مجھ سے ملا تھا اور زبردستی اپنی محب
جتانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر میرے صاف جواب دینے پر وہ آگ بگولا ہو گیا تھا۔ اس نے آنکھیں
نکالتے ہوئے مجھے دھمکی دی تھی کہ میں نادر کو بھی دیکھ لوں گا۔''

اس کی بات پر میری کنپٹیاں سلگ اُٹھیں۔ مارے طیش کے میرا رواں رواں کانپنے لگا۔

''پلیز نادر! میری بات یاد رکھنا۔ تم اس سے بھڑنے کی کوشش نہیں کرو گے۔ میں تم سے یہ بات
چھپانا چاہتی تھی لیکن تمہارے اصرار پر میں نے تمہیں بتا دی ہے۔'' وہ میری گمبھیر خاموشی سے میرے
جذبات کا اندازہ کرتے ہوئے محبت آمیز فکرمندی سے بولی۔

میں نے اپنے ابال پر قابو پایا اور اپنے لہجے کو متحمل رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے ازراہِ تشفی نگینہ سے
بولا۔ ''تم فکر مت کرو۔ میں اپنی طرف سے اس حاسد کو موقع نہیں دوں گا۔'' اس کے بعد میں نے موبائل
آف کر دیا۔

اگلے روز میں یونیورسٹی پہنچا تو وہاں میں نے اپنے کلاس فیلوز کے درمیان کچھ عجیب سا ماحول محسو
کیا۔ میرے کلاس فیلوز مجھے عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے اکرم نامی اپنے ایک کلاس میٹ سے دوستانہ مسکراہٹ کے سا
پوچھا۔ ''ارے بھئی، کیا بات ہے؟ تم لوگ مجھے ایسے گھور رہے ہو جیسے پہلے کبھی دیکھا ہی نہ ہو؟''

میرے استفسار پر اکرم بولا۔ ''نادر! کیا کبیر احمد کی یہ بات درست ہے کہ تمہاری ماں جیل میں ا
شوہر کے قتل کی سزا بھگت رہی ہے اور تم نے بھی جیل ہی میں جنم لیا تھا؟''

میں اس کی بات سن کر سکتے میں آ گیا اور پتہ نہیں کب تک اسی حالت میں رہا۔ جب سکتہ ٹوٹا تو اکرم
جا چکا تھا۔

اب میری کیفیت بدل گئی، مجھے کبیر جیسے کینہ پرور اور حاسد پر طیش تو بہت آیا مگر نگینہ کی التجا میرے
دماغ میں گردش کرنے لگی۔ اس لئے میں ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے لیکچر ہال کی طرف بڑھ گیا۔ میرا
موڈ خراب ہو چکا تھا۔ لیکچر میں میرا ذرا دل نہ لگا۔

اکرم کے علاوہ چند دوسرے کلاس فیلوز نے بھی مجھ سے یہی سوال کیا تو میں پوچھنے والے اپنے
دوست پر ہی چڑھ دوڑا۔

وہ بے چارہ گھبرا کر مجھ سے دور بھاگ گیا۔ میں اپنے طیش پر قابو پاتے ہوئے لائبریری کی طرف
بڑھا تو کوریڈور میں ہی مجھے کبیر احمد نظر آ گیا۔ وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ سامنے سے آ رہا تھا۔ اس
نے میری طرف دیکھا اور ہونٹوں پر اس کے بڑی زہریلی مسکراہٹ رقصاں ہو گئی۔

''یہ قاتل ماں کا بیٹا ہے۔ بے چارے نے جیل میں جنم لیا تھا۔ واہ، کیا دردناک اسٹوری ہے اس کی
.........چچ.........چچ......... بے چارہ۔''

میرے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے تضحیک آمیز استہزاء سے ایک زہریلا جملہ اُگلا۔ میرے تن
بدن میں آگ لگ گئی۔ ایکا ایکی میرے دماغ میں نگینہ کی التجا کی جگہ لاوا کھولنے لگا۔ میں طوفانی بگولے کی
طرح پلٹا اور کبیر کو عقب سے کالر کے ذریعے پکڑ لیا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو تم؟.........اب میرے سامنے بولو.........'' میں غضب ناک انداز میں
اس سے مخاطب ہو کر بولا۔ اس نے نفرت سے میرا ہاتھ جھٹک کر اپنی قمیص کا کالر چھڑایا اور میرے چہرے
پر گھونسا رسید کرنا چاہا مگر میں نے یکدم اپنا چہرہ پیچھے ہٹا لیا۔ وہ اپنی جھونک میں گھوم گیا اور میں نے پوری
قوت کے ساتھ اس کی کمر پر اپنی لات رسید کر دی۔ وہ کئی قدم لڑکھڑاتا چلا گیا۔ اس کے ساتھیوں میں
سے ایک نے ''دوستی'' نبھاتے ہوئے مجھے گھور کر غصیلے لہجے میں کہا۔

''نادر! یہ کیا بدتمیزی ہے؟''

''تم چپ رہو .... ورنہ.........'' میں نے اسے جلتی سلگتی نظروں سے گھور کر کہا اور تہدیدی
انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس دوران کبیر احمد نے پلٹ کر دانت پیستے ہوئے مجھ پر
چھلانگ لگا دی اور میں بھی اسی وقت اس پر جھپٹ پڑا۔ ہم دونوں بیک وقت ایک دوسرے سے ٹکرائے۔

ہم دونوں کے قد و قامت میں انیس بیس کا ہی فرق تھا۔ میں کسرتی جسم کا تنومند پہاڑی نوجوان تھا
جبکہ وہ قدرے فربہی مائل تھا۔ میں اسپورٹس بوائے تھا اور وہ سہل پسند مگر باوجود اس کے وہ طاقت کا ایک
چلتا پھرتا پہاڑ تو تھا ہی، مجھ سے ٹکراتے ہی وہ مجھے رگیدتا ہوا لے گیا حتیٰ کہ میرے قدم کوریڈور کے چکنے
فرش سے اُکھڑ گئے۔ میرا سر زور سے پکے فرش پر لگا اور میری آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچ گئے۔

کبیر میرے سینے پر سوار ہو گیا اور دونوں ہاتھوں سے میری گردن دبوچ لی۔

اس کے دوست نیم دائرے کی صورت کھڑے گویا تماشا دیکھ رہے تھے۔ کبیر احمد کا چہرہ مارے غصے
کے کریہہ سا ہو رہا تھا۔ مگر میری رگوں میں اس سے کہیں زیادہ وحشیانہ کھولن اُتری ہوئی تھی۔ میں نے
خرخراتی آواز کے ساتھ فرش پر پڑے پڑے پوری قوت کے ساتھ لوٹ لگائی اور کبیر احمد کو اپنے سینے سے
نیچے گرانے میں کامیاب ہو گیا۔ گرتے گرتے اس نے زور سے اپنے گھٹنے کی زوردار ضرب میرے پیٹ
میں رسید کر دی۔ اذیت کی ایک دردناک لہر میری رگِ جاں تک میں اترتی چلی گئی۔ مگر آتشِ جنوں خیزی

کے سامنے یہ تکلیف میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ میں نے لیٹے لیٹے ہی اس کی ناک پر گھونسا جڑ دیا۔ اس کی ناک سے بھل بھل خون جاری ہو گیا۔ میرے ایک ہی طاقت ور گھونسے نے اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے کر کے رکھ دیئے اور میں اس کے بے سدھ وجود کو حقارت سے ٹھوکر مار کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے دوستوں میں سے کسی کو میرے آگے آنے کی جرأت نہ ہو سکی تھی۔ البتہ وہاں دیگر لڑکوں کا ہجوم ضرور اکٹھا ہو گیا۔

اس اثناء میں کبیر احمد اپنی خون آلود ناک کو سہلاتا ہوا کھڑا ہونے کی کوشش کرنے لگا اور پھر اس سے پہلے کہ ہم دونوں پھر ایک دوسرے سے جا بھڑتے، دوسرے لڑکوں نے بیچ بچاؤ کرا لیا۔ کبیر احمد خون آلود چہرے سے مجھے گھورتے ہوئے نفرت انگیز لہجے میں بولا۔

"میں......... میں .... تمہیں یونیورسٹی سے نکلوا کر رہوں گا۔ دیکھنا تم........."

یہ دھمکی دینے کے بعد وہ ہانپتا کانپتا اپنے چند دوستوں کے ساتھ اسی حالت میں وائس چانسلر صاحب کے کمرے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ جبکہ میں اپنے ہاسٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔

اپنے روم میں پہنچا ہی تھا کہ وی سی کے دفتر سے بلاوا آ گیا۔ ناچار میں دوبارہ یونیورسٹی پہنچا اور سیدھا وائس چانسلر کے کمرے میں جا گھسا۔ وہ مجھے کڑی نظروں سے گھورتے ہوئے بولے۔

"نادر!......... تم کب سے یہ بدمعاشی کرنے لگے ہو؟ مجھے اگر یونیورسٹی کی بدنامی کا ڈر نہ ہوتا تو میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دیتا۔" وہ غصے سے بری طرح کھول رہے تھے۔ میں نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا تو وہ دھاڑ کر بولے۔ "اسی وقت کبیر احمد سے معافی مانگو......... اور اب اپنے گارجین کے بغیر یونیورسٹی مت آنا۔"

"سر!......... آپ نے مجھے صفائی کا موقع دیئے بغیر کس طرح یکطرفہ فیصلہ کر لیا؟" مجھے بھی غصہ آ گیا تھا۔

وہ مجھے سخت نظروں سے گھورتے ہوئے بولے۔ "تم میرا حکم نہیں مانو گے؟" ان کے خار کھائے لہجے میں چھپی تہدید کو محسوس کرنے کے باوجود میں نے نہایت سنجیدگی سے انہیں مخاطب کر کے کہا۔

"آئی ایم سوری سر! میں آپ کا یہ حکم نہیں مان سکتا۔ البتہ میں اپنے گارجین کو لے آؤں گا۔"

"ہوں........." انہوں نے مجھے گھورتے ہوئے اندر ہی اندر ایک گہری ہمکاری بھری۔ "شاید تمہیں اب اپنے سرپرست کو بھی لانے کی ضرورت نہ پڑے۔" وہ دانت بھینچ کر بولے۔ "ناؤ یو گیٹ لاسٹ..... او کے!" وی سی کے اس یکطرفہ فیصلہ پر مجھے طیش آ گیا۔

"سر! میں پھر بھی یہی درخواست کروں گا کہ......... آپ........."

"آئی سے......... گیٹ آؤٹ......... اینڈ بی آف۔" وہ میری بات کاٹ کر چلائے۔ اور پھر میں ایک حقارت بھری نظر ان پر ڈالتا ہوا اپنے ہاسٹل آ گیا۔ میں وی سی کے جانبدارانہ رویے پر بری طرح جل بھن رہا تھا۔ مجھے دکھ تھا کہ انہوں نے مجھے صفائی کا ذرا بھی موقع نہ دیا تھا۔ کیوں......... اس لئے کہ وہ شاید جانتے تھے کہ میں کون تھا؟ جبکہ کبیر احمد ایک بااثر شخص کا بیٹا تھا۔ یہ درست تھا کہ میں نے کبیر احمد کو زخمی کیا تھا مگر سب سے پہلے اس نے ابتداء کی تھی اور مجھے نہ صرف اشتعال دلایا تھا بلکہ مجھ پر سب سے پہلے حملے کی ابتداء بھی اس نے ہی کی تھی۔ اب یہ کبیر احمد کی مکاری تھی کہ وہ اس وقت اپنا خون آلود چہرہ لئے وی سی کے کمرے میں پہنچا تھا اور یوں وہ مظلوم کہلایا تھا۔ میں اپنے کیریئر سے اب مایوس سا ہونے لگا تھا۔ وائس چانسلر کے ارادے مجھے ٹھیک نظر نہیں آ رہے تھے۔ میرے چند قریبی خیر خواہ

دوستوں نے مجھے اس ڈر سے یہی مشورہ دیا تھا کہ میں نہ صرف وی سی صاحب سے معافی مانگ لوں بلکہ کبیر احمد سے بھی "سوری" کہہ دوں ورنہ نہ صرف میرا نام یونیورسٹی سے خارج کر دیا جائے گا بلکہ بیڈ کیریکٹر سرٹیفکیٹ بھی میرے ہاتھ میں تھما دیا جائے گا۔

نگینہ تک جب یہ بات پہنچی تو اسے بہت دکھ ہوا اور وہ پریشان بھی ہو گئی۔ پھر اس نے اندر ہی اندر نہ جانے کس طرح کبیر احمد کے والد نظر حیات سے یہ معاملہ رفع دفع کروا دیا اور یوں مجھے شوکاز نوٹس دے کر آئندہ کے لئے سختی سے "وارن" کر دیا گیا۔ گویا میرے رقیب کبیر احمد کو میرے خلاف ہرزہ سرائی کی کھلی چھوٹ دے دی گئی۔

"نادر! تم نے میری نصیحت بھلا دی نا؟" نگینہ نے اس روز مجھ سے شکوہ کیا تھا۔

میں جواباً تلخ لہجے میں بولا۔ "میں کیا کرتا نگی! کبیر احمد نے مجھے ہاتھ اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔"

"تم اگنور کر دیتے۔ یہی سمجھ کر کہ اس میں سارا قصور تمہارے تلخ ماضی کا ہی ہے۔" اس نے مثبت اندازِ فکر کا منطقی فلسفہ مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

"مگر نگی! اس میں میرا کیا قصور ہے؟ اگر میری ماں ایک قاتلہ ہے اور اس نے مجھے جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جنم دیا تھا تو میری پیشانی پر یہ کلنک زبردستی کیوں تھوپا جا رہا ہے؟"

میرے کرب انگیز لہجے پر نگینہ کے لہجے پر بھی گہرے دکھ کی پرچھائیاں پھیل گئیں۔

"نادر!......... تم ایک باحوصلہ نوجوان ہو۔ ابھی سے ہمت ہار بیٹھو گے تو آگے تم حالات کا کس طرح مقابلہ کرو گے؟" اس نے مجھے دوسرے انداز سے سمجھانے کی کوشش کی اور مزید پُرزور لہجے میں بولی۔ "تم ایک اسپورٹس مین ہو۔ ایک اچھے کھلاڑی۔ تمہارے اندر بھرپور اسپرٹ ہونا چاہئے اور......... اور پھر میں بھی تو تمہیں ایک باہمت اور باحوصلہ انسان کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ کیا تم مجھے مایوس کرو گے نادر؟"

میں نے ایک نظر نگینہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی گفتگو مجھے ایک عجیب طرح کا حوصلہ بخش رہی تھی۔

"نگینہ! میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔" میں نے بلا توقف فوراً جواب دیا۔ "لیکن نگی! میرا اپنے تلخ ماضی سے فرار بھی ممکن نہیں۔ وہ کوڑے کی طرح کبھی میری پیٹھ پر اور کبھی سینے پر پڑتا ہے۔ مگر میں بھی حوصلے سے اس کی ضربیں سہے جا رہا ہوں۔"

"شاباش نادر!......... میں تمہیں ایسا ہی دیکھنا چاہتی تھی۔" نگینہ یکدم کھل کر بولی۔ "حالات کا سوچ سمجھ کر مقابلہ کرو۔ جذباتیت اور جوش سے کام بگڑتے ہیں۔ کبیر احمد جیسے سازشی نے تمہاری اس طبیعت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور تمہارا نام یونیورسٹی سے خارج کروانا چاہا۔ مگر شکر ہے کہ ایز یو نو، انکل نظر حیات میرے پپا کے پرانے دوست ہیں، معاملہ رفع دفع ہو گیا۔"

"انکل نظر حیات تو مجھ سے ضرور ناراض ہوئے ہوں گے۔" میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں، میری ساری تفصیل بتانے پر الٹا انہوں نے اپنے بیٹے کو ہی سرزنش کی تھی۔" وہ جواباً بولی۔

"اس کا مطلب ہے انکل حیات فراخ دل انسان ہیں؟" میں متاثر کن لہجے میں بولا۔ "ورنہ میں تو یہی سمجھا تھا کہ وہ بھی مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔"

"ہاں......... انہیں احساس ہو گیا تھا کہ قصور ان کے بیٹے کبیر احمد کا ہی ہے۔"

"نگینہ!" اچانک میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہاں .... کہو۔" وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔

"میں تمہارے پپا سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اب وہ ہی مجھے میرے ماضی کے متعلق........" کہ جملہ ادھورا چھوڑ کر میں نے یک دم کسی خیال کے تحت پوچھا۔ "تم نے اپنے پپا اور انکل حیات سے اس بات کا ذکر کیا تھا کہ میں ماموں حیدر گل اور ماں سے اپنے ماضی کے بارے میں کچھ اُگلوانے میں ناکام رہا ہوں؟"

"ہاں........" وہ پُرسوچ لہجے میں مختصراً بولی۔

"پھر کیا کہا انہوں نے؟ ....میرا مطلب ہے اب تو وہی مجھے یہ سب بتا سکتے ہیں۔"

وہ میری بات پر کسی گہری سوچ میں غلطاں ہوگئی۔ پھر ایک گہری سانس خارج کر کے بولی۔

"میں پپا سے بات کروں گی۔ پھر وہ تمہیں بلانے کے لئے جو وقت مجھے دیں گے، میں فون پر تمہیں آگاہ کر دوں گی۔" اس کی بات سن کر میں چپ ہو رہا۔

ہم دونوں اس وقت حسب معمول یونیورسٹی کے لان میں بیٹھے تھے۔ اچانک میں نے کبیر احمد کو دیکھا، وہ تنہا تھا اور ہماری طرف ہی آ رہا تھا۔ نگینہ کی بھی اس پر نظر پڑ چکی تھی۔ اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر نہ جانے کیوں میری کنپٹیاں سلگ اُٹھیں مگر میں تحمل سے بیٹھا رہا۔ تاہم میں نے بھی تہیہ کر رکھا تھا کہ اگر اب اس نے کوئی بکواس کی تو اسے اچھی طرح سبق سکھاؤں گا۔"

"ہیلو نگینہ........!" وہ قریب آ کر مسکراتے ہوئے نگینہ سے مخاطب ہوا۔ نگینہ نے بھی جواباً ہلکے سے مسکرا کر سر کی اثباتی جنبش سے اسے ہیلو کہا۔

پھر وہ میری طرف دیکھ کر قدرے شرمندگی سے بولا۔ "نادر! آئی ایم سوری یار........ میں نے واقعی تمہارے ساتھ اس روز زیادتی کر ڈالی تھی۔"

مجھے اس کے لہجے پر خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ وہ شرمسار نظر آ رہا تھا۔ میرا جواب دینا اب ضروری بن گیا لہٰذا میں بھی دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"کوئی بات نہیں ....آؤ بیٹھو یار!"

وہ ہم دونوں کے قریب سرسبز گھاس پر بیٹھ گیا۔ کتابیں اس نے اپنی گود میں رکھ لیں۔

"چلو، اب دونوں شیک ہینڈ کرو۔" نگینہ ہم دونوں سے مسکرا کر بولی۔

میں نے کبیر کی طرف مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اس نے بھی گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ہم دونوں کی صلح کی خوشی میں نگینہ نے اپنی طرف سے کولڈ ڈرنک پلایا۔ اس کے بعد کبیر ہم سے رخصت ہوا تو نگینہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں اسے اس کی کار تک چھوڑنے آیا تھا۔

میں یونیورسٹی آورز سے فارغ ہونے کے بعد اپنے ہاسٹل آیا۔ میس میں لنچ کیا پھر اپنے روم میں آ گیا۔ کبیر احمد کے رویے نے مجھے متاثر کیا تھا۔ اس نے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے میرا دل صاف کر دیا تھا۔ میرے دل میں اب اس کے لئے کوئی ناراضگی نہ تھی۔ تاہم میں یہ سوچ رہا تھا کہ کیا اس نے نگینہ کی خاطر مجھے سوری کیا تھا؟ یا پھر اسے ازخود اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا؟

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ انٹر لاک تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو ذرا سا چونک گیا۔ میرے سامنے کبیر احمد کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور پریشانی کے آثار دیکھ کر میرا دل جانے کیوں کسی انجانے خدشے سے دھڑکا تھا۔

"خیریت تو ہے ....تم اتنے پریشان کیوں ہو؟ آؤ........ اندر........" میں نے اس کی طرف

دیکھ کر قدرے تفکر سے پوچھا اور اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ وہ اندر داخل ہوتے ہوئے لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

"نادر! نگینہ کو کڈنیپ کر لیا گیا۔"

اس نے جیسے دھماکہ کیا اور میں ایک لمحے کے لئے اپنی جگہ پر سُن ہو کر رہ گیا۔

"یہ ....کک ....کیسے ہوا؟ ....کب ہوا؟" بالآخر میں نے اپنے حواس پر بمشکل قابو پاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"وہ جب تم سے ملنے کے بعد واپس اپنے گھر لوٹ رہی تھی ....میرا خیال ہے، اس وقت یہ واقعہ ہوا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"لل........ لیکن تمہیں کیسے پتہ چلا کہ اسے اغواء کیا گیا ہے؟ ہوسکتا ہے، وہ اپنی کسی سہیلی........"

"اس کے زخمی باڈی گارڈ نے بتایا تھا۔" وہ میری بات کاٹ کر بولا اور بہ غور میرے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ میں اس وقت بری طرح پریشان تھا ورنہ کبیر احمد کے چہرے کے عجیب تاثرات مجھ سے چھپے نہیں رہ سکتے تھے۔

"کیا بتایا باڈی گارڈ نے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"یہی کہ چند مسلح نقاب پوش ایک ہائی روف میں سوار تھے۔ انہوں نے ان کی کار پر فائرنگ کر ڈالی۔" وہ صراحت سے بتانے لگا اور میرا دل سینے میں بے تحاشا دھڑ دھڑا رہا تھا۔

"ایک باڈی گارڈ تو موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا جبکہ دوسرا زخمی ہوا ہے نامعلوم حملہ آوروں نے ان کی کار کا ٹائر بھی برسٹ کر ڈالا تھا۔ پھر وہ نگینہ کو زبردستی اپنی ہائی روف میں بٹھا کر آناً فاناً رفو چکر ہو گئے۔"

"اوہ ....یہ تو بہت برا ہوا ....بہت ہی برا ہوا........" میں دانت بھینچ کر اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر مکا مارتے ہوئے غصے اور پریشانی سے بڑبڑایا۔ "پولیس کو انفارم کر دیا گیا؟" اچانک میں نے پوچھا۔

"ظاہر ہے، زخمی گارڈ کی حالت قدرے بہتر ہے۔ پولیس نے اس کا بیان قلم بند کر لیا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ اس کی نظریں ہنوز ایک ٹک میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جیسے وہ میرے چہرے کے تاثرات سے کچھ اخذ کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ مگر میں اس وقت خود بری طرح پریشان تھا۔ نگینہ میرا سب کچھ تھی۔ میرا دل، میری جان، میری پہلی اور آخری محبت۔

"تم ....اب کہاں جا رہے ہو؟" میں نے اچانک کسی خیال کے تحت کبیر احمد سے پوچھا۔

"انکل شاہ میر کے ہاں۔"

"چلو، میں بھی چلتا ہوں۔" میں نے فوراً کہا۔

اس کے بعد میں اس کی کار میں بیٹھ کر نگینہ کے پپا شاہ میر کے ہاں روانہ ہو گیا۔ نگینہ کے اغواء سے متعلق یہ اندوہناک خبر مجھ پر بجلی بن کر گری تھی۔ مجھے ایک پل کے لئے بھی سکون نہیں مل رہا تھا۔ میں بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

"یہ کس کی حرکت ہوسکتی ہے؟" میں سوچنے لگا۔

ظاہر ہے، ان اغواء کنندگان کا تعلق انہی نامعلوم دشمنوں سے ہوسکتا تھا جو انکل شاہ میر اور انکل نظر حیات کے مشترکہ دشمن تھے اور ان پر کئی بار ناکام قاتلانہ حملے بھی کر چکے تھے۔

یوں تو انہوں نے اشاروں کنایوں میں مجھ پر یہ باور کرا دیا تھا کہ یہ پراسرار دشمن حیدر گل کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ مگر انہوں نے کھل کر کبھی اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ

میں ان کا سگا بھانجا تھا۔ یہ خیال آتے ہی مجھے اپنے وجود میں ایک جانی پہچانی تپش کا احساس ہونے لگا
''کبیر!.........کار روکو۔'' اچانک میں نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

اسے ذرا حیرت ہوئی۔ مگر میرے چہرے پر چھائی ہوئی پُرتپش سنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے اس نے کار روک دی۔ میں کار کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ پھر ایک رکشے میں بیٹھا اور سیدھا ویگن اسٹینڈ پہنچا۔

میں اب جلد از جلد ''گرین لاج'' پہنچنا چاہتا تھا۔

❊❊❊

سہ پہر کے وقت میں گرین لاج پہنچا تو ذرا ٹھٹک سا گیا۔ مجھے وہاں غیر معمولی گہما گہمی کا احساس ہوا تھا۔ کوٹھی کے وسیع و عریض احاطے میں چار پانچ دیگیں پک رہی تھیں۔ نوکر چاکر اِدھر اُدھر دوڑتے نظر آئے۔ تین چار گاڑیاں بھی کھڑی نظر آئیں۔ ان میں ایک تو ہماری سفید پوٹھوہاری جیپ تھی جبکہ دوسری ایک گرے کلر کی لینڈ کروزر اور ایک سنگل ڈور پجیرو تھی۔ ایک کار بھی تھی۔ سنگل ڈور پجیرو کو میں فوراً پہچان گیا۔ یہ ماموں حیدر گل کے دوست ملک سردار خان کی تھی۔ مجھے وہاں ٹال کے مزدور بھی ہاتھوں میں پلیٹیں تھامے نظر آئے۔ گویا ایک بھرپور دعوت کا سماں تھا۔

کوٹھی کو باہر سے سجایا گیا تھا۔ رنگین بلب اور قمقمے روشن تھے۔ جھنڈیاں بھی لہراتی نظر آ رہی تھیں۔ مجھے یہ سب دیکھ کر اچنبھا سا ہوا۔ جب میں اندر پہنچا تو فضل چاچا کی مجھ پر نظر پڑی۔ ان کے چہرے پر خوشی دیدنی تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی دوڑتے ہوئے میری طرف آئے۔

''نادر بیٹا! تم آ گئے .... بہت ٹھیک وقت پر آئے۔'' وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔

میں نے پوچھا۔ ''چاچا! یہ سب کیا ہے؟''

میری بات پر وہ اپنی خوشی کے بے اندازہ احساس کو دباتے ہوئے بولے۔

''بس بیٹا! ہم سے کچھ نہ پوچھو۔ اندر جاؤ اور تم بھی اس خوشی میں شریک ہو جاؤ۔''

مجھے تعجب ہوا اور میں اندر کی طرف بڑھ گیا۔

فضل چاچا کی بیوی صغراں سے میری مڈبھیڑ ہوئی مگر اس نے بھی مجھے کچھ نہیں بتایا اور ایک بڑے کمرے کی طرف اشارہ کر کے خاموشی سے چلی گئی۔

میں اپنے دل و دماغ میں عجیب و غریب احساسات لئے مذکورہ کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ میں اسے دھکیل کر اندر داخل ہوا اور بری طرح چونک گیا۔

نیم دائرے میں بچھے صوفوں پر مجھے پانچ افراد براجمان نظر آئے۔ ماموں حیدر گل، منیجر مشتاق اور ملک سردار خان کے علاوہ چوتھا ایک بارُعب شخص میرے لئے اجنبی تھا۔ اس نے لارنس پور کا بیش قیمت سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کی عمر پینتالیس کے پیٹے میں تھی۔ وہ چوڑے شانوں اور دراز قد و قامت کا مالک تھا۔ رنگت پہاڑی لوگوں کی طرح سرخ و سپید تھی مگر چہرے پر عجیب قسم کی کرختگی چھائی ہوئی تھی۔

ان میں جو پانچواں شخص تھا بلکہ ''تھی'' وہ ایک پُروقار عورت تھی۔ وہ بہ مشکل چالیس کی عمر کے قریب تھی۔ اس نے بڑے سلیقے اور نفاست کے ساتھ ہلکے آسمانی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بالوں کا جوڑا بنا رکھا تھا۔ آنکھوں پر نظر کا بیش قیمت فریم والا چشمہ تھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں پژمردگی اس بات کی غماز تھی کہ اس نے عمر کا بیشتر حصہ بڑے کڑے حالات میں بتایا تھا۔ بادی النظر میں وہ بڑی دبنگ خاتون نظر آ رہی تھی۔ وہ صوفے پر ماموں حیدر گل کے بالکل قریب بیٹھی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں

ظر میں اس خاتون کو پہچان ہی نہیں پایا تھا مگر بہ غور دیکھنے پر میں اس قدر بری طرح چونکا تھا کہ مجھے اپنی نکھوں پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا اور میں ایک ٹک اسے دیکھتا ہی چلا گیا تھا۔ اس وقت تک ماموں حیدر ل سمیت اس عورت کی بھی مجھ پر نگاہ پڑی تھی۔ پھر وہ ممتا بھری مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھتے ہی یکدم نی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''نادر!...... بیٹا! تم آ گئے......؟'' وہ عورت یہ کہتے ہوئے میری طرف بڑھتی چلی آئی۔ ہاں...... ہ میری ماں تھی۔ مگر اسے جیل کی سلاخوں سے باہر دیکھ کر میرے ذہن کو ایک تکلیف دہ جھٹکا لگا تھا۔ ہاں موجود سب لوگ گردن موڑ کر میری طرف دیکھنے لگے۔ ماموں حیدر گل بھی اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ں میرے قریب آئی اور محبت بھرے انداز میں اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرنے کے بعد میری پیشانی وم لی اور میرا ہاتھ پکڑے صوفے کی طرف بڑھی۔

میں میکانکی انداز میں ماں کے شانہ بہ شانہ چلتا ہوا آگے بڑھا۔ ماموں حیدر گل نے بھی مجھ سے عانقہ و مصافحہ کرنے کے بعد وہاں موجود چیدہ چیدہ افراد سے تعارف کروا دیا۔

تھری پیس سوٹ میں ملبوس اس بارعب شخصیت کے علاوہ سب کو میں جانتا تھا اس لئے ماموں نے بھی صرف اس کا مجھ سے خاص طور پر تعارف کروانا ضروری سمجھا اور اس کی طرف احتراماً اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے بولے۔

''نادر بیٹا! ان سے ملو۔ آپ اعظم خان صاحب ہیں سیاست کی سدا بہار شخصیت!'' میں اس وقت ان کی وہاں غیر متوقع موجودگی پر دم بہ خود سا ہو کر رہ گیا تھا۔ تاہم میں نے آگے بڑھ کر ان سے مصافحہ کیا۔ ان کے بھاری بھرکم چہرے پر چندی چندی سی آنکھیں نہایت پُراسرار سا تاثر پیش کر رہی تھیں۔ اس کے بال بھی چھوٹے یعنی ''میجر کٹ'' کے تھے۔ بالوں کا یہ اسٹائل آفیسر طبقے میں بہت رائج تھا۔ یہ سولجر کٹ کے قریب قریب کٹنگ تھی۔ یونیورسٹی کے بیشتر لڑکوں نے بھی لمبے بال اور لانبی لانبی قلمیں چھوڑ کر یہی ''میجر کٹ'' اپنا رکھی تھی۔ میں اب ماموں اور ماں کے درمیان صوفے پر بیٹھ گیا اور سخت کشمکش و پیچ میں مبتلا تھا۔ یہاں کی اچانک بدلی ہوئی صورت حال پر میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں نگینہ کے متعلق کیسے بات کروں؟ اور پھر مجھے اس کے پاپا شاہ میر اور انکل نظر حیات کی نصیحت بھی یاد تھی کہ میں نے کسی صورت میں بھی ان کا ماموں حیدر گل اور ماں کے سامنے ذکر نہیں کرنا تھا۔ میں بظاہر خاموش بیٹھا تھا مگر اندر ہی اندر میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔

''نادر میاں! کیا تمہیں اپنی ماں کے جیل سے رہائی پانے کی خوشی نہیں ہوئی؟'' معاً سامنے اعظم خان کے قریب بیٹھے ملک سردار خان نے عجیب سے لہجے میں بہ غور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ نے یہ اندازہ کیسے لگا لیا؟'' میں نے ان سے ہی الٹا سوال کر ڈالا تھا۔

اس کی گھنی مونچھوں تلے ہونٹوں پر اسرار بھری مسکراہٹ اُبھری اور بولا۔ ''تم اپنی ماں کو دیکھ کر بجائے خوش ہونے کے کچھ پریشان سے نظر آ رہے ہو۔''

پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، اعظم خان کے کلین شیو چہرے پر غیر تاثرانہ مسکراہٹ اُبھری اور وہ مجھ پر اپنی چندی چندی نظریں مرکوز کرتے ہوئے کھرکھراتی آواز میں بولا۔

''شاید .... میڈم شبینہ (ماں) کی غیر متوقع رہائی پر نادر میاں سے خوشی سنبھالے نہیں جا رہی۔ یکدم خوشی بھی تو انسان کو پریشان کر کے رکھ دیتی ہے۔''

''شاید آپ نے درست فرمایا خان صاحب!''

میرے ذہن نے ایک فوری لائحہ عمل کی تیاری کرتے ہوئے ان میں گھلنے ملنے کا فیصلہ کیا تو میں
فوراً اس کی تائید کر ڈالی۔ میں نے محسوس کیا، میری بات پر بالخصوص ماموں اور ماں کے چہروں پر طما
بھری مسکراہٹ اُبھری تھی۔ اب شاید میں انکل شاہ میر اور نظر حیات کی ہدایات کے مطابق کینچلی بدل
درست ڈگر پر آ رہا تھا۔

"خان صاحب! نادر آخر میرا بیٹا ہے۔ میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ بھلا اسے کیسے خوشی نہیں ہوگی؟"
نے ایک ممتا بھرے فخر کے ساتھ مجھے اپنے سے لگاتے ہوئے کہا۔

اس پر منیجر مشتاق میاں جو شاید کافی دیر سے بولنے کو بے چینی سے منتظر تھا، اعظم خان کی خوشامد
ماموں اور ماں کی طرف دیکھ کر بولا۔

"یہ سب اپنے خان صاحب کی مہربانی ہے کہ میڈم (میری ماں) اپنی مدت سے چند برس پہلے
رہائی پا چکی ہیں۔ آخر بڑے آدمی جو ہوئے۔" اس نے عادتاً تکیہ کلام اُگل کر جیسے خود کو پُرسکون کیا۔

"ہاں، اس میں کوئی شک نہیں کہ خان صاحب کی کوششوں سے آج میری بہن شبینہ نے اپنی م
سے پہلے رہائی پا کر گرین لاج کی رونقیں بڑھا دیں اور اب آپا شبینہ کے آنے سے میں اپنے اندر ا
عجیب سا حوصلہ بھی محسوس کر رہا ہوں۔" ماموں حیدر گل نے مسرور ہو کر کہا۔

"ارے نہیں بھئی، اس میں میری کوششوں کا کیا دخل ہے" اعظم خان نے خالصتاً ایک گھا
سیاستدان کی طرح کسرِ نفسی سے کام لیا۔ "میڈم شبینہ کا چال چلن اچھا ہونے کی وجہ سے ان کی سزا م
تخفیف کی گئی تھی۔"

"پھر .... خان صاحب! آپ بھی کم شخصیت تو نہیں ہیں۔ میں نے ابھی نادر بیٹے سے آپ
تعارف کرواتے ہوئے آپ کے بارے میں ایک جملہ کہا تھا یعنی سیاست کی "سدابہار" شخصیت۔ اس
مطلب تھا کہ آپ جیسی قد آور شخصیت کے تو ہر آنے جانے والی حکومتوں سے بڑے گہرے روابط ر
ہیں۔" ماموں حیدر گل نے خوشامدانہ توصیف سے کہا۔

"بڑے آدمی جو ہوئے جی۔" منیجر مشتاق کو پھر اپنے مخصوص تکیہ کلام کا دورہ پڑا۔ وہاں موجود ہر
اعظم خان کے گن گا رہا تھا۔ مجھے اس کے بارے میں صرف اسی قدر معلوم تھا کہ یہ کوئی سیکرٹری کی
بیورو کریٹ آفیسر تھا۔ میں جب پچھلے دنوں ماموں حیدر گل سے دوٹوک گفتگو کرنے کے لئے ٹال
پہنچا تھا تو اس وقت ماموں اسی شخص سے ملنے کے لئے گئے ہوئے تھے۔

یوں اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں خود کو نروس ہی ظاہر کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد
پُرتکلف ڈنر کا اہتمام کیا گیا۔

ناچار میں نے بھی ان سب کے ساتھ کھانا زہر مار کیا۔

میرے دل و دماغ میں اس وقت شدید طوفان کروٹیں لے رہے تھے۔ نگینہ کا فریاد کرتا چہرہ بار با
میری نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ اس کی مدد کو پکارتی ہوئی کرب ناک چیخیں جیسے میری سماعتوں کو چھل
کئے دے رہی تھیں۔ یہ میرا جگر ہی جانتا تھا کہ ان لوگوں کے درمیان اپنی بے چینی اور اپنے ذہنی کرب
میں کس طرح دبائے ہوئے تھا۔ سب لوگ خوش گپیوں میں مگن تھے مگر میرے اندر ایک ناقابل بیان
آگ سلگ رہی تھی۔

"نادر بیٹے! تم کچھ کھا نہیں رہے۔ کیا بات ہے؟ .... چپ چپ سے کیوں ہو؟" ماں نے بالآخر
ممتا بھرے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

حالانکہ وہ اور ماموں میری خاموشی کی وجہ جانتے تھے اور میرا دیرینہ مسئلہ بھی .... کیونکہ اکثر میری
دل حیدر گل سے گرما گرمی ہوتی رہتی تھی۔ حتیٰ کہ جیل جا کر میں نے اپنے ماضی کے بارے میں جاننے
لئے ماں کو بھی کریدنے کی کوشش کی تھی اور اس بات کا بھی ماں سے جواب مانگا تھا کہ اس نے آخر
ے باپ قادر علی خان کو کیوں قتل کیا تھا؟

بھی وجہ تھی کہ وہ دونوں ہی مجھے سرِ دست نظر انداز کئے ہوئے تھے۔ لیکن نگینہ کی وجہ سے میری
شانی اور تشویش میرے چہرے، میری آنکھوں اور میری حرکات و سکنات کے مضطربانہ ارتعاش نے
ماموں کو یہ باور کروا ہی دیا تھا کہ اس بار میرے ساتھ معاملہ سوالوں کا نہیں بلکہ کچھ اور ہی ہے۔

"نہیں ماں! ایسی بات نہیں۔ بس تھکا ہوا آیا ہوں نا۔ بھوک نہیں لگ رہی تھی۔"

"گل! میں تم سے کہہ رہی تھی نا کہ فضل چاچا کو گاڑی دے کر نادر کو لانے کے لئے بھیج دیتے۔ میرا
بسوں ویگنوں میں دھکے کھاتا ہوا آیا ہے۔" ماں نے ماموں حیدر گل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
ے لئے ماں کے یہ ممتا بھرے جملے جانے کیوں میرے اندر ایک دردناک سی ہوک اُبھارنے کا
ث بنے تھے۔ جواباً ماموں ایک نظر مجھ پر ڈالتے ہوئے ماں سے مختصر بولے۔

"میں دراصل نادر بیٹے کو اچانک سرپرائز دینا چاہتا تھا۔" اس کا لہجہ کسی بات کی چغلی کھا رہا تھا۔

خاصی دیر بعد جب اعظم خان نے رخصت ہونا چاہا تو میں نے دیکھا، ماموں حیدر گل اور ماں نے
ے احترام کے ساتھ ان کا شکریہ ادا کیا پھر آخر میں ماموں نے بڑے اسرار بھرے انداز میں اعظم خان
ے مخاطب ہو کر کہا۔

"خان صاحب! آپ نے ایک اور اہم معاملے میں بھی ہمارا ساتھ دیا۔ میں اپنی طرف سے اور آپا
ینہ کی طرف سے آپ کا ایک بار پھر تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

ماموں حیدر گل کے ذومعنی الفاظ پر میں اندر سے چونکے بنا نہ رہ سکا۔ مگر میں نے یہ ظاہر نہ ہونے
۔ تاہم میری تمام تر سماعتوں کا رخ اسی طرف تھا۔

"میں تمہاری آخری دم تک اس اہم معاملے میں مدد کرتا رہوں گا۔ تم کیوں فکر کرتے ہو؟" اعظم
ن نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ ماموں اور ماں کی طرف دیکھ کر کہا پھر تائید طلب انداز میں ملک
ار خان سے مخاطب ہو کر بولا۔ "کیوں جی اپنے سردار خان صاحب؟"

"ہاں .... ہاں جی۔ کیوں نہیں۔" وہ یکدم چونک کر بولا۔

"یار حیدر گل! تُو بالکل فکر مت کر اور نہ ہی آپا کو فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم جو ہیں۔"

اس کے بعد ہم لوگ اسے اس کی لینڈ کروزر تک چھوڑنے آئے۔ میرے ذہن میں پُراسراری کھٹک
ا ہو گئی۔

نیجر مشتاق کو بھی اس کے ساتھ روانہ کر دیا گیا تھا۔ اب مجھے اپنے خیر خواہ انکل شاہ میر اور نظر حیات
خود کو ماموں اور ماں کے سامنے ظاہر نہ کرنے کی حکمتِ عملی سمجھ میں آنے لگی تھی۔ ان کا یہ کہنا بالکل بجا
کہ اس طرح ماموں اور ماں میری طرف سے بھی محتاط ہو جاتے۔ میرے ذہن میں بار بار یہی سوال
ڈش کر رہا تھا کہ ان لوگوں نے آخر کس اہم معاملے کے سلسلے میں ذومعنی گفتگو کی تھی؟

بہرحال اِدھر ماموں حیدر گل، ماں اور ملک سردار خان اندر لوٹے تو میں دانستہ آرام کرنے کے
ئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

میرے ذہن میں یکبارگی ایک خیال آیا تھا اور اب میں اسے عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا۔ مجھے ایسا لگ

رہا تھا کہ میرا بروقت یہاں گرین لاج آنا، خالی از علت نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ ماں کا جیل سے اچانک ہونا اور پھر نگینہ کا اغواء......... ان سب لوگوں کا یہاں جشن منانا......... کسی پُراسرار کہانی کی ابتدا معلوم ہو رہا تھا۔

میں نے رِسٹ واچ میں وقت دیکھا، رات کے دس بج رہے تھے۔ میں نے آہستگی سے اپنے کمرے کے دروازے کی جھری سے جھانکا۔ ڈرائنگ روم کی لائٹ آف ہو چکی تھی۔ صرف سبز رنگ کا زیرو بلب روشن تھا۔ میں بہ آہستگی دروازہ کھول کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ تب مجھے اچانک ڈرائنگ روم ملحقہ ایک کمرے کے دروازے کی جھری سے روشنی آتی نظر آئی۔ میں دبے پاؤں مذکورہ کمرے کی جانب بڑھا۔ میرا دل سینے میں بے طرح دھڑک رہا تھا۔ دروازہ بند تھا۔ اندر سے دھیمے دھیمے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں مطلق دیر نہ لگی کہ اندر ماموں حیدر گل، ملک سردار خان اور ماں کے درمیان کوئی اہم گفتگو ہو رہی ہے۔ میں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی مگر آوازوں کے غیر واضح ''آہنگ'' کے سوا کچھ سنائی نہ دیا۔ میں بے چین سا ہو گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا، پھر اچانک مجھے کھڑکی کا خیال آیا۔ یہ کھڑکی مذکورہ کمرے کی مشرقی دیوار کی طرف تھی۔ اس کے قریب پہنچنے کے لئے مجھے ڈرائنگ روم سے باہر نکل کر ایک مختصر کوریڈور میں آنا پڑتا۔

میں بہ سرعت وہاں پہنچا۔ میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ کھڑکی کھلی تھی۔ اگرچہ اس کی چوبی چوکھٹ میں فینسی آہنی گرِل نصب تھی مگر میں یہاں کھڑے ہو کر خاموشی سے اندر ہونے والی گفتگو بہ آسانی سن سکتا تھا میں دبے پاؤں آگے بڑھا اور کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ کھڑکی کی دوسری جانب پردہ جھول رہا تھا۔ اندر اس کھڑکی کے قریب ہی صوفے دھرے تھے۔ اس لئے اب مجھے صوتی آہنگ کے ساتھ گفتگو کا مفہوم بھی صاف سمجھ میں آ رہا تھا۔

''ملک صاحب! اس لڑکی کو فوراً قتل کر کے اس کی لاش دشمنوں کو بھیج دو۔'' مجھے ماں کی غضبناک آواز سنائی دی۔ اس کے منتقمانہ لہجے میں زخمی ناگن کی سی پھنکار تھی۔ میں ''لڑکی'' کے ذکر پر بری طرح چونکا تھا۔

''ہاں......... آپا شبینہ درست کہتی ہے سردار خان!'' یہ ماموں حیدر گل کی آواز تھی۔ ''ہمارے دشمنوں نے پے در پے قاتلانہ حملوں کے باوجود ہماری بات نہیں مانی ہے۔ اب ان کو ایک عدد لاش کا تحفہ دے دینا چاہئے۔''

''تم دونوں کو شاید ابھی تک ایک اہم بات کا علم نہیں ہوا ہے۔'' لمحے بھر کی اسرار بھری خاموشی کے بعد معاً ملک سردار خان کی بھاری آواز اُبھری۔ میں دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پائے ہمہ تن گوش تھا۔

''کون سی بات؟'' مجھے بیک وقت ماں اور ماموں حیدر گل کی قدرے چونکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ملک سردار خان ہولے سے کھنکھارنے کے بعد دونوں سے مخاطب ہوا۔

''اپنا کاکا نادر، نظر حیات کے بیٹے کبیر احمد کا دوست ہے۔'' اس نے بتایا اور میری رگوں میں بہتے خون کی گردش تیز ہو گئی۔

''کیا.........؟'' میں نے ماموں اور ماں کی چونکتی ہوئی آوازیں سنیں۔

''مم......... مگر تمہیں کیسے پتہ چلا ملک سردار خان؟'' ماموں حیدر گل نے غیر یقینی لہجے میں استفساراً پوچھا تھا۔

''ہاں، میں صحیح کہہ رہا ہوں۔ اب آگے سنو.........'' ملک سردار خان کی گمبھیر آواز اُبھری۔ ''میں نے تمہارے کہنے پر نظر حیات کے بیٹے کبیر احمد کی گاڑی پر حملہ کیا تھا تو اس وقت کاکے نادر کو میں نے اس کے برابر میں بیٹھے دیکھا تھا۔ یہ تو شکر ہوا کہ وہ حملے سے بچ گیا۔ کیونکہ میں نے اس سے پہلے کاکے کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو اس دن اتفاق سے ٹال آیا تھا تو میں اسے دیکھ کر بری طرح چونکا۔ خیر.........''

وہ اتنا بتا کر چند ثانیے کے لئے رکا۔ میرا دل سینے میں رک رک کر دھڑکنے لگا۔

''اس کے بعد سے میں نے کاکے نادر کی باقاعدہ ٹوہ لینا شروع کی تو مجھ پر اس حقیقت کا بھی انکشاف ہوا کہ کاکا نادر، شاہ میر کی بیٹی نگینہ کے بھی بہت قریب آ چکا ہے۔ دونوں کے درمیان لگتا ہے، پیچ لڑ چکا ہے۔''

وہ اتنا کہہ چپ ہوا تو اندر جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا۔ خود ادھر میری حالت جیسے قطب شمالی کے برفزاروں کی سی ہو رہی تھی۔

''یہ......... بہت برا ہوا......... بھائی حیدر گل! بہت برا ہوا یہ.........'' معاً اس سناٹے میں ماں کی کپکپاتی آواز اُبھری۔ اس کے لہجے میں زبردست جلن تھی۔

ماموں جواباً کچھ نہیں بولے تھے۔ البتہ ملک سردار خان نے ازراہِ تشفی ماں سے کہا۔ ''میڈم! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ تم دونوں کو اب کاکا نادر سے ہوشیار و محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

اس کی اس بات پر ماموں حیدر گل نے سفاک لہجے میں ملک سردار خان سے کہا۔

''اچھا ہوا......... تم نے یہ بات ہمیں بتا دی۔ بہرحال، اب تم اس لڑکی کو فوراً قتل کر کے اس کی لاش دشمنوں کو بھیج دو۔ بس، یہی ہمارا آخری فیصلہ ہے۔''

میرا ذہن سائیں سائیں کرنے لگا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ لڑکی سے مراد یقیناً نگینہ ہی تھی۔ میرے اندر ایک جوار بھاٹا اُٹھنے لگا۔ ماموں حیدر گل اور ماں آتشِ انتقام میں اس قدر بے رحم اور سفاک بھی ہو سکتے ہیں، مجھے اس کی امید نہ تھی اور پھر یہ لوگ، میری نگینہ کو قتل کرنے کا گھناؤنا ارادہ کر چکے تھے۔ میں یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا؟ ایک بار تو جی میں آئی کہ اسی وقت اندر داخل ہو کر ان کے مکروہ چہرے نوچ ڈالوں۔ میرا رواں رواں غیظ و غضب کے مارے تھرتھرانے لگا تھا۔ میں نے اتنی مشکلوں سے اپنی اس اُبلتی کھولتی کیفیات پر قابو پایا تھا، یہ میرا دل ہی جانتا تھا۔ میں نے بہ مشکل خود کو کسی جنونی اقدام سے باز رکھا اور مزید کن گن لینے کی کوشش کی۔ لیکن اچانک ہی ملک سردار خان نے رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔ میں یکدم محتاط ہو گیا۔

ان لوگوں کی گفتگو سے میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ نگینہ کو ماموں حیدر گل اور ماں نے ملک سردار خان کے ذریعے اغواء کروایا تھا اور اب یہ لوگ میری نگینہ، میرے دل، میری محبت کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتارنے کا سفاکانہ فیصلہ کر چکے تھے۔

لیکن میرے ہوتے ہوئے بھلا کون نگینہ کا بال بھی بیکا کر سکتا تھا؟ اب مجھے شاہ میر اور نظر حیات کی باتوں پر سو فیصدی یقین ہو چکا تھا کہ ان کا شک ماموں حیدر گل پر بے بنیاد نہیں تھا۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ماموں حیدر گل اور ماں ان سے کون سی دشمنی کا بدلہ چکانا چاہتے تھے؟ وہ اہم بات کیا تھی، جس کے منوانے کے لئے ماں اور ماموں نگینہ کے باپ شاہ میر اور انکل نظر حیات پر ہر طرح کا دباؤ ڈال رہے تھے؟

میں نے کمرے میں کھٹ پٹ کی آوازسنی اور پھر بہ سرعت وہاں سے ہٹ گیا۔ لیکن میں اپنے ک
میں کانے کی بجائے گرین لاج سے باہر نکل کر تاریکی میں آ گیا۔ دور نیچے وادی میں تاریک سناٹا تھا۔ آسمان پر چھائے ہوئے گھنیرے بادلوں کے عقب میں چاند چھپ چکا تھا۔

میں نے سب سے پہلے گرد و پیش کا جائزہ لیا، پھر سامنے وسیع احاطے میں کھڑی ملک سردار خا
سنگل ڈور پجیرو کی طرف دیکھ کر، وہاں آس پاس کوئی ذی نفس موجود نہ پا کر میں بہ سرعت آگے ب
پھر قریب پہنچ کر بیک ڈور کو کھولنے کی کوشش کی، وہ لاک تھا۔ مجھے ذرا مایوسی ہوئی۔ مگر پھر دوسر
لمحے میں اگلے دروازے کی طرف آیا۔ میں نے بہ آہستگی اسے ذرا کھینچا تو وہ کھل گیا۔ میں پھرتی سے
داخل ہوا۔ دروازہ آہستگی سے بند کیا۔ اس وقت میں نے شیشے کی کھڑکی سے پار کوٹھی کی طرف دیکھ
لوگ اس طرف ہی آ رہے تھے۔ میں فوراً سیٹوں کے درمیان جھکا اور عقبی سیٹوں کی طرف رینگ
پھر ایک سیٹ کے نیچے سکڑ سمٹ کر گھس گیا۔

وہ لوگ باتیں کرتے ہوئے جیپ کے قریب پہنچے۔ میں سانس روکے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں سنائی دیں۔ اگلے ہی لمحے جیپ کا طاقتور انجن رات کے بھرے سناٹے میں گھر گھرا کر جاگ اُٹھا۔ جیپ کے فرش پر مجھے ہلکی سی تھرتھراہٹ کا احساس ہ
دوسرے ہی لمحے وہ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

❄❄❄

میں عقب سیٹ کے نیچے دبکا اس سوچ میں غلطاں تھا کہ مجھے اب فوری طور پر اگلا قدم کیا
چاہئے؟

نگینہ کی زندگی شدید خطرے میں تھی اور ملک سردار خان اس وقت نگینہ کے لئے موت کا فرشتہ
ہوا تھا۔ وہ تنہا تھا۔

پہلا خیال میرے ذہن میں یہ آیا کہ اسے ادھر ہی قابو کرنے کی کوشش کروں۔ بے شک میں ن
اور اس کی جیب میں پستول وغیرہ ہو سکتا تھا۔ لہٰذا ممکن تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر نگینہ کو قتل کرنے کا ارادہ
طور پر بدل دیتا۔ لیکن مجھے شاہ میر اور نظر حیات کی سختی سے دی ہوئی وہ ہدایات یاد تھیں کہ اگر م
حقیقت جاننا تھی تو مجھے کسی بھی صورت یہ ظاہر نہیں کرنا تھا کہ میں ماموں اور ماں کی خونیں سازشو
واقف ہو چکا ہوں۔ چنانچہ مجھے اپنی صوابدید اور اپنے زورِ بازو سے اس نازک ترین صورتِ حال
تھا تا کہ ملک سردار خان، اعظم خان اور ماموں حیدر گل سمیت ماں کے اصل چہرے میرے سا
نقاب ہو جائیں۔

چنانچہ میں دم سادھے وقت اور موقع کا انتظار کرنے لگا۔

جیپ بڑے ہموار انداز میں اور خاصی رفتار کیساتھ دوڑی چلی جا رہی تھی۔ رات اور ویرانی کے
ملک سردار خان جیپ کو اچھی خاصی اسپیڈ سے دوڑا رہا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اس مردود کی منز
تھی جہاں اس نے ماموں اور ماں کے ایماء پر نگینہ کو اغواء کر کے یرغمال بنا رکھا تھا اور اب یہ خبیث
اسے موت کے گھاٹ اُتارنے کا سفاک ارادہ رکھتا تھا۔

میں نے بھی اپنے دل میں تہیہ کر رکھا تھا کہ اگر اس نے میری نگینہ کو ذرا بھی نقصان پہنچانے کی
کی تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مجھے اب رہ رہ کر اس بات پر بھی پچھتاوا ہو رہا تھا کہ کاش میں
اپنا اڑتالیس بور کا "میگارڈ" ہی ساتھ رکھ لیتا۔

تقریباً گھنٹے پون کی تیز رفتار ڈرائیونگ کے بعد اچانک جیپ میں شاید کوئی خرابی پیدا ہونے لگی اور جھٹکے کھاتی ہوئی رک گئی۔

جیپ رکتے ہی ماحول میں ایکا ایکی ہولناک سناٹا طاری ہو گیا۔ ملک سردار خان نے دو تین بار جیپ ٹارٹ کرنے کی کوشش کی، پھر دروازہ کھول کر وہ شاید باہر اترا تھا۔ میری ٹھٹکی ہوئی سماعتیں اس کی کات پر گوش بر آواز تھیں۔

پھر مجھے جیپ کا بونٹ اُٹھنے کا کھٹکا سنائی دیا۔ وہ شاید کوئی خرابی ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ذرا دیر وہ انجن کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتا رہا، اس کے بعد بونٹ کے بند ہونے کی آواز اُبھری۔ میں دم ادھے سیٹ کے نیچے دبکا ہوا تھا۔

وہ دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر اسٹیرنگ سیٹ پر براجمان ہوا اور ایک بار پھر جیپ ٹارٹ کرنے کی کوشش کرنے لگا مگر بے سود۔ جیپ کا انجن ہر سیلف کے بعد کسی غنودہ جانور کی طرح لے سے غرا کر خاموش ہو جاتا۔

"اس کم بخت کو بھی ادھر ہی خراب ہونا تھا۔"

اچانک مجھے اس کی جھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ خود میں بھی ذرا پریشان سا ہو گیا تھا۔ میرا اضطراب ھنے لگا تو مجھے بے چینی نے آ لیا۔ جیپ کا ایسے نازک موقع پر خراب ہونا خود میرے لئے بھی بہتر نہ ا۔ مجھے نگینہ کی طرف سے بری طرح تشویش لاحق تھی۔

اچانک میں بری طرح چونکا۔ میری ٹھٹکی ہوئی ساعتوں میں ملک سردار خان کی آواز اُبھری۔ وہ شاید بائل پر اپنے کسی آدمی سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا۔

"غفورے! میری گاڑی خراب ہو چکی ہے۔ میں شہر سے تقریباً تین کلومیٹر کے فاصلے پر مضافات میں ں۔ تم شکر خان کو کرولا دے کر بھیجو........" "کیا کہا؟........شکر خان نہیں ہے؟ ....کہاں مر گیا ام زادہ عین وقت پر؟"

وہ غصے سے غرا کر بولا۔

"اسے معلوم نہیں ہے کہ ایک یرغمالی ہمارے قبضے میں ہے؟........کیا........گاؤں سے بلاوا آ گیا ا؟ بیوی کی طبیعت خراب ہو گئی تھی........ہوں، تم اب اس لڑکی کے پاس اکیلے ہو؟"

پل بھر سوچنے کے بعد وہ بولا۔

"غفورے! تو ایسا کر، گاڑی تو کھڑی ہے نا ڈیرے پر؟........شکر خان لے گیا........کمینہ، ردود!" وہ دانت پیس کر جھلاہٹ آمیز انداز میں غرایا۔

میں یک ٹک سیٹ کے نیچے سکڑا سمٹا یہ ساری گفتگو سن رہا تھا۔ میرے اندر بری طرح کی پکڑ دھکڑ مچی ئی تھی۔ اس کی آواز پھر سنائی دی۔

"اچھا غفورے! میری ایک بات غور سے سن۔" اس کے اسرار بھرے لہجے پر میرے کان بھی کھڑے گئے۔

"اس لڑکی کا گلا دبوچ کر جان سے مار ڈالو اور لاش دشمنوں تک پہنچا دو۔ سمجھے؟" ملک سردار خان کے ان سفاک الفاظ نے مجھے ایک ثانیے کو سن کر کے رکھ دیا۔ میری جان سے عزیز ہستی نگینہ کو موت کے ھاٹ اتار دینے کا پیغام دیا جا چکا تھا اور میں سیٹ کے نیچے دبکا جیسے اس کی موت کا منتظر تھا۔ نہیں، ایسا یں ہو سکتا۔ ایسا نہیں ہو سکتا........ میرے روم روم میں آگ سی بھڑک اٹھی اور پھر میں جنوں خیز انداز

میں سیٹ کے نیچے سے نکلا اور زخمی شیر کی طرح ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ملک سردار خان کے
سے اُبھرا۔ اسے بھی شاید اپنے عقب میں گڑبڑ کا احساس ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے جیسے ہی چونک ک
گردن موڑنا چاہی، میں نے چیتے کی طرح اس کی گردن اپنے دائیں بازو کے شکنجے میں مضبوطی سے
اور وحشت انگیز لہجے میں بپھر کر غرایا۔

''ذلیل انسان! اسی وقت اپنے کتے غفورے کو فون کر کے اپنا یہ سنگدلانہ حکم واپس لے لے
تجھے جان سے مار ڈالوں گا۔' اس نے خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ مگر میں نے اس کی گرد
گرد اپنے بازو کا آہنی حلقہ مزید تنگ کر لیا۔ حتیٰ کہ اس کے حلق سے خرخراتی ہوئی بے ربط آوازیں
ہونے لگیں۔ تب پھر اس نے ایک لمحاتی موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی قمیض کی سائیڈ پاکٹ سے
نکالنا چاہا تو میں نے اس کی گردن چھوڑ کر پھرتی سے پستول اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا اور اس ک
سے لگا کر دوبارہ اپنے الفاظ دہرائے۔ اس نے گردن موڑ کر پہلے غیر یقینی نظروں سے میری طرف
پھر اور کچھ کہنا چاہا مگر میں نے پستول کا آہنی دستہ اس کی کنپٹی پر دے مارا۔ اس کے حلق سے نک
ڈکراہٹ نکلی اور وہ بری طرح خوف زدہ نظر آنے لگا۔

''وقت ضائع مت کر کتے! ابھی فون کر .... جلدی، ورنہ تیری کھوپڑی میں روشندان بنا
گا۔'' میری قطعیت آمیز سفاکانہ تہدید پر اس نے اپنے لرزیدہ ہاتھوں سے موبائل نکالا اور نمبر پنچ
لگا۔ اس نے ایسا دو تین بار کیا پھر منمناتی آواز میں بولا۔

''مم .... میرے موبائل کی .... بب .... بیٹری ڈاؤن ہو گئی ہے۔ شش .... شاید

اس کا یہ کہنا تھا کہ میرے سلگتے وجود میں ان گنت آتش فشاں پھٹنے لگے۔ میرے جی میں تو آ
اسی وقت اس رذیل کا قصہ پاک کر دوں مگر میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ جیپ خراب ہو چک
موبائل کی بیٹری نے کام چھوڑ دیا تھا۔ میری جان سے عزیز ہستی نگینہ کو موت کا حکم صادر کیا جا چکا
میں تصور میں اپنی پہلی اور آخری محبت نگینہ کی نرم و نازک گردن کی طرف بڑھتے ہوئے دو خوفناک
دیکھ رہا تھا۔ بے بسی کے انتہائی جاں گسل احساس تلے میرا پورا وجود لرزنے لگا۔ میں کسی تماشائی کی
نگینہ کی موت کا انتظار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا میں نے اپنی اُبلتی کھولتی حالتِ جنوں پر قابو پایا اور پھ
سردار کو جیپ کے اندر ہی محبوس کر کے دروازوں کو لاک کیا، پھر بونٹ اٹھا کر جلدی جلدی خرابی
کرنے لگا۔ مجھے اپنی جیپ کا تجربہ تھا۔ فوراً ہی میں نے خرابی تلاش کی۔ فیول ٹینک سے کاربور
پیٹرول پہنچانے والی نلکی نکل گئی تھی۔ میں نے اسے جلدی سے درست کیا اور پھر بہ سرعت ملک سردا
کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''جلدی چلاؤ گاڑی۔ جلدی .... ایک لمحے کی بھی دیر نہیں ہونی چاہئے۔'' میں حلق کے بل غ
ناک آواز میں چلایا اور اس نے فوراً جیپ اسٹارٹ کی۔ رات کے تاریک، چیختے ہوئے سناٹے میں
غرا کر اسٹارٹ ہوا تھا۔ پھر اس نے فوراً گیئر بدلا اور ایک طوفانی جھٹکے سے جیپ آگے بڑھا دی۔

''کتنی دور ہے وہ جگہ؟'' میں نے اپنی جنونی کیفیت پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے اس سے پوچھا

''تھ .... تھوڑی ہی دور ہے۔ تت .... تین چار .... کک .... کلومیٹر۔'' وہ لکن
لہجے میں بولا اور میں ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

جیپ آندھی طوفان کی طرح دوڑ رہی تھی مگر میرے دل و دماغ اس وقت کروڑوں میل فی گ
رفتار سے دوڑ رہے تھے۔ میرے اندر وحشتوں کا طوفانِ بلاخیز سر اُبھار رہا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا

میں اُڑ کر منزل تک پہنچ جاؤں کہ اپنی جان سے عزیز ہستی نگینہ کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن جاؤں۔ اندیشناک لمحوں کا ایک ایک پل متوقع وسوسوں کی بھاری سل کی طرح اس سے میرے دل و جگر کو پیستا گزر رہا تھا۔

سڑک دور دور تک ویران اور قدرے بل کھاتی ہوئی تھی۔ میری چھلنی سماعتوں میں نگینہ کی ہراساں اور گھٹی گھٹی چیخیں اُبھر رہی تھیں۔

''آں .... نادر! مم .... مجھے .... بب .... بچالو۔ یہ .... دو خوفناک ہاتھ .... میری گردن دبوچنے کے لئے بڑھ رہے ہیں۔ نادر! .... تم کہاں ہو؟ .... تمہاری نگینہ ہمیشہ کے لئے تم سے بچھڑنے والی ہے۔ مجھے مرنے سے بچالو .... آہ .... کیا ہماری محبت کی بس اتنی تھوڑی عمر تھی؟ آہ .... ابھی تو ہمارے ارمانوں کے گلاب بھی پوری طرح نہیں کھلے تھے۔ ان پُرشوق آنکھوں نے تو ابھی جشنِ بہاراں کے نظارے دیکھنے تھے۔ ان پیاسے لبوں کو تو ابھی آبِ خیزاں چکھنا تھا۔ کیا .... کیا یہ سب اتنی جلد .... قصرِ فنا کی وحشت ناک گہرائیوں میں گم ہو جائے گا؟''

وحشت ناک سناٹوں سے اُبھرنے والی نگینہ کی یہ یاس زدہ صدائیں مجھے بے حال کئے دے رہی تھیں۔

جیپ دو رویہ بد ہیبت ہیولوں کی طرح ایستادہ چیڑ اور صنوبر کے درختوں کے درمیان بل کھاتی، ویران سڑک پر طوفانی رفتار سے دوڑے جا رہی تھی۔

''جلدی .... اور تیز .... اور تیز .... رفتار بڑھاؤ۔''

میں شدید مضطرب ہو کر چلایا۔ وہ میرے جنوں خیز لہجے پر بری طرح خوف زدہ ہو رہا تھا۔ جیپ ایک گھنے جنگل میں داخل ہو چکی تھی۔ ذرا دور اریب قریب ڈھلوان چھتوں والے چوبی مکانوں کے پُراسرار ہیولے نظر آنے لگے۔ جیپ پکی سڑک سے اب نیم پختہ راستے پر اُتر کر ہچکولے کھاتی دوڑ رہی تھی۔ پھر چند ہی منٹوں میں سامنے ایک قدرے وسیع اراضی پر مجھے وہ چوبی کاٹیج نظر آ گیا۔ آسمان پر دمکتے طباق چاند نے بادلوں کی اوٹ سے روشن ضوفشانی کی تھی۔ جیپ کاٹیج کے قریب پہنچ کر ایک جھٹکے سے رکی۔

میں نے ملک سردار خان کو باہر دھکا دیا اور خود بھی نیچے اُتر آیا۔

وہ پاگلوں کی طرح کاٹیج کی طرف ''غفورے! .... غفورے!'' کہتا ہوا دوڑا چلا گیا اور میں اس کے عقب میں۔

کاٹیج پر وحشت ناک سناٹا طاری تھا۔ جیسے وقت کو موت آ گئی ہو۔ میرا دل اب سینے میں رک رک کر دھڑکنے لگا تھا۔

ملک سردار جیسے ہی کاٹیج کے دروازے پر پہنچا اچانک دروازہ کھلا اور ایک شخص نمودار ہوا۔

''غفورے! .... غفورے! .... وہ لڑکی زن .... زندہ ہے نا؟''

ملک سردار خان نے بدحواسی کے عالم میں اس شخص سے پوچھا جو بلاشبہ غفورا ہی تھا۔ وہ پہلے تو ملک سردار کو یوں اچانک ہی دیکھ کر چونکا تھا۔ پھر اس کی مجھ پر نگاہ پڑی تھی۔ میں نے پستول والا ہاتھ دانستہ اپنی پشت پر کئے رکھا تھا۔ میری نظریں غفورے پر جمی ہوئی تھیں۔ اور میں وحشیانہ انداز میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے کچھ کہنے کا منتظر تھا۔

کاش .... یہ کہہ دے کہ .... اس نے ملک سردار کا حکم ماننے میں دیر کر دی ہے۔ کاش، یہ کہہ

دے کہ اس نے اپنے سفاک ہاتھوں سے نگینہ کا گلا نہیں دبوچا ہے۔

میرے اندر امید و یاس کی گردان ہو رہی تھی۔ ملک صاحب!..........آ..........آپ نے ہی تو حکم تھا کہ اس لڑکی کا گلا دبوچ کر مار ڈالو۔ میں نے اسے ختم کر ڈالا ہے۔"

اس نے اتنا کہا اور میرے آس پاس جیسے خون کی آبشاریں پھوٹ پڑیں۔ میرے دل و دماغ خوفناک آندھیاں چلنے لگیں اور پھر عجیب میکانکی انداز میں میرا پستول والا ہاتھ اٹھا۔ ٹھیک اسی وقت ملک سردار خان نے گھبرا کر اپنی گردن گھماتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ میں نے اس کی پیشانی کا نشانہ کر ٹریگر دبا دیا۔

رات کے بے رحم سناٹے میں میرے پستول نے خوفناک دھماکے سے ایک شعلہ اُگلا جو ملک خان کی پیشانی میں پیوست ہو گیا۔ وہ آواز نکالے بغیر کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین بوس ہوتا چلا گیا۔



غفورے نے خوف اور حیرت کے باعث پھیلی ہوئی آنکھوں سے یہ سب وقوع پذیر ہوتے دیکھا ور پھر دوسرے ہی لمحے "صورت حال" کی خطرناکی کو بھانپتے ہوئے آناً فاناً غائب ہو گیا۔

میں نے ایک نظر ملک سردار خان کے بدہیئت چہرے کو دیکھا جس کی پیشانی سے بہنے والا خون زمین تک پہنچ گیا تھا۔ پھر تیزی سے غفورے کے عقب میں لپکا۔ وحشت اور غیظ کے سبب مجھے یہ بھی دھیان نہیں رہا تھا کہ اس طرح دیوانہ وار کاٹیج کے اندر داخل ہونا خود میری اپنی موت کا سبب بن سکتا تھا۔ میں اس جگہ اجنبی تھا جبکہ میرا دشمن غفورا اسی کاٹیج کا باسی تھا۔ وہ میری وحشت سے فائدہ اٹھا کر مجھے اپنا نشانہ بنا سکتا تھا۔ مگر مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ میں دیوانہ وار اندر داخل ہوتا چلا گیا۔ لیکن میری چھلنی سماعتوں میں تو بس نگینہ کی گھٹی گھٹی چیخیں گونج رہی تھیں اور غفورے کے وہ بے رحم الفاظ .... کہ اس نے نگینہ کا گلا دبوچ کر اسے مار ڈالا تھا، کسی آتشیں بگولے کی مانند میرے دل و دماغ میں گردش کر رہے تھے

میں زخمی شیر کی طرح کاٹیج کے اندر داخل ہوا .... میری آنکھوں کے سامنے سرخ چادر سی تن گئی تھی۔ میں نے شعلہ بار آنکھوں سے دائیں بائیں دیکھا مگر غفورا کہیں نظر نہ آیا۔ میرے دائیں جانب مختصر سی راہداری تھی اور اس کے بعد کسی کمرے کا دروازہ تھا۔ میں طوفانی بگولے کی طرح اسی سمت بڑھا اور دروازے کو ایک لات رسید کر ڈالی۔ دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ میں ملک سردار خان سے چھینا ہوا پستول ہاتھ میں پکڑے اندر داخل ہوا تو اچانک میرے سر پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ بے اختیار میرے حلق سے کربناک چیخ بلند ہوئی اور میری آنکھوں کے سارے مناظر دھندلانے لگے۔ مگر یہ سب ایک لمحے کے لئے ہوا تھا۔ میرے اندر کی آتشِ غیظ نے اس قیامت کی اذیت کو نگل لیا تھا اور دوسرے ہی لمحے میں پلٹا تو غفورا ایک لمبا سا موٹا ڈنڈا اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑے اگلے وار کے لئے پر تول رہا تھا۔ میں نے خود کو اس کے اگلے حملے سے بچانے کی کوشش کی مگر اس بار ڈنڈا میرے سر پر پڑنے کی بجائے میرے پستول والے ہاتھ پر پڑا اور پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس نے مجھ پر تیسرا وار کرنے کے لئے ڈنڈا اٹھایا مگر اب میں اسے موقع دینے والا نہیں تھا۔ میں نے بجلی کی سرعت کے ساتھ اپنی دائیں ٹانگ اس کے پیٹ میں رسید کر دی۔ اُسے اس کی توقع نہیں رہی ہو گی۔ دوسرے یہ بھی کہ میری لات میں غیر معمولی قوت تھی اس لئے میں نے غفورے کو کئی قدم پیچھے لڑکھڑانے پر مجبور کر دیا۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ میرے لئے اتنا موقع کافی تھا۔ میں انگارا آنکھوں سے اسے گھورتا ہوا جھپٹا، اس نے ایک مرتبہ پھر ڈنڈا لہرایا۔ میں رکوع میں جھکا اور اپنا سر اس کے سینے سے ٹکرا دیا اور اسی طرح تیزی سے اس رگیدتا ہوا دیوار تک لے گیا۔ اس دوران میں یقیناً اس کے حواس بھی قدرے بحال ہو چکے تھے۔ لہٰذا دیوار سے پشت لگاتے ہی اس نے پھرتی کے ساتھ اپنے گھٹنے کی ضرب میرے چہرے پر رسید کر دی۔ میری آنکھوں میں پانی اُتر آیا۔ شکر تھا کہ ناک سے خون نہیں خارج ہوا تھا۔ تاہم اسے ایک موقع مل گیا۔

میں نے سر جھٹک کر آنکھوں کے پانی کو صاف کرنے کی کوشش کی اور اس دوران وہ کمرے کے ا دوسرے اندرونی دروازے سے غائب ہو گیا۔ میرے اندر کا کھلاڑی پوری طرح جاگ اُٹھا تھا۔ میرا اشتع ابھی کم نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا میں بھی اس کے عقب میں دوڑا مگر اس مردود غفورے نے شاید میری خوں آ کیفیت اور خطرناک عزائم سے بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اسے کسی قیمت پر بھی زندہ نہیں چھوڑنا چا تھا۔ کیونکہ اس نے اپنی آنکھوں سے مجھے ملک سردار خان کو موت کے گھاٹ اُتارتا دیکھ لیا تھا۔ چنا غفورے نے کمرے سے نکلتے ہی دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈی چڑھا دی تھی۔ میں شاید حالِ اشتعا میں بند دروازے کو ٹھوکریں رسید کرنے لگا۔ پھر اچانک مجھے فرش پر پڑے پستول کا خیال آیا۔ میں لپک کر اسے اٹھا لیا اور اوپر تلے دروازے پر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔

اچانک ایک گھر گھراتی آواز پر میں بری طرح چونکا۔ یہ کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز تھی۔ غفورا دوسری طرف سے باہر نکل کر ملک سردار خان کی جیپ میں فرار ہو رہا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں دوسرے دروازے سے مختصر راہداری کی طرف آیا اور پاگلوں کی طرح دوڑتا ہوا کاٹیج سے باہر آ گیا۔ م خیال درست ثابت ہوا۔ غفورا میری نگینہ کا قاتل، جیپ میں فرار ہو رہا تھا۔ میں جب تک دوڑتا ہوا ہا تک پہنچتا، وہ آندھی طوفان کی طرح جیپ دوڑاتا تاریکی میں گم ہو گیا۔

احساسِ شکست اور بے بسی کے مارے میں دانت پیس کر رہ گیا۔

پھر اچانک مجھے کچھ یاد آیا اور میں بے اختیار دوبارہ کاٹیج کی طرف دوڑا۔ میری آنکھوں کو اب ا ہولناک اور خونی منظر دیکھنا تھا۔ یہ وہ منظر تھا جو میرے لئے دنیا کا انتہائی تکلیف دہ اور اذیت ناک م تھا۔ میں اس کرب ناک منظر کو برداشت کرنے کی اپنے اندر تاب رکھتا بھی تھا یا نہیں مگر مجھے یہ سب د تھا...... میں جلتی آنکھوں اور سوختہ دل کے ساتھ کاٹیج کے ایک ایک کمرے میں گیا اور تب مجھے چھوٹے کمرے میں بیڈ پر بے سدھ پڑا ایک نسوانی وجود نظر آ گیا جسے دیکھتے ہی میں جیسے دروازے پر سن ہو کر کھڑا ہو گیا۔ میرے دہکتے سینے میں غبارِ غم کا ایک گولا سا اُترنے لگا۔ آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اُمڈنے کے قریب تھا۔ دل جیسے رک رک کر دھڑکنے لگا۔ میرے پورے وجود پر رقت طا ہونے لگی۔ ایکا ایکی مجھے اپنے وجود کی ساری طاقت سلب ہوتی محسوس ہوئی۔

کمرے میں فقط ایک دودھیا بلب روشن تھا۔ پھر مجھے ایک جھٹکا لگا اور بے اختیار میرے لرزیدہ د میں امید کی جیسے بجھتی شمع کسی لوئے آخر کی طرح بھڑک اُٹھی۔ میری آنکھوں میں روشنی اُبھرنے لگی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا پستول پھینکا اور بے ساختہ بیڈ کی طرف لپکا۔

میں جیسے سن ہو کر رہ گیا۔ میرے اندر کی بھیانک اور ہولناک آندھیاں یکلخت ماند پڑنے لگی تھیں۔ میری کائنات جیسے بکھرنے سے بچ گئی تھی۔ کیا ایسی انہونیاں بھی ہوتی ہیں؟ کیا جانکاہ صدمات کے ب یوں بھی سرک جاتے ہیں؟

میرے سامنے جس لڑکی کی لاش تھی، وہ نگینہ نہ تھی مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ لڑکی میرے اجنبی تھی۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا، وہ معصوم صورت لڑکی نظر حیات کی بیٹی اور کبیر احمد کی چھوٹی صدف حیات تھی جو نگینہ سے دو تین سال ہی چھوٹی تھی۔ میں نے فوراً اپنے حواس پر قابو پایا اور صدف لاش کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی گردن کے گرد نیل کے ہلکے نشانات سے محسوس ہو رہے تھے۔ اس کی آ کھلی ہوئی تھیں جن میں ایک معصوم التجا کے ساتھ موت کی دہشت ثبت ہو کر رہ گئی تھی۔ اسے سنگ غفورے نے بڑی بے رحمی اور سفاکی کے ساتھ گلا گھونٹ کر قتل کیا تھا اور یہ سب میری ماں شبینہ اور ما

حیدر گل کے ایما پر ہوا تھا۔ ایک بار پھر میرے اندر کی نفرت میں اضافہ ہونے لگا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری ماں اور ماموں حیدر گل اس قدر سفاک بھی ہو سکتے تھے۔ اچانک بجلی کی سرعت کے ساتھ ایک خیال میرے ذہن میں کوندا۔

میرے سامنے صاف کی لاش تھی، تو پھر نگینہ کہاں تھی؟ اسے کن لوگوں نے اغواء کیا تھا؟ یہ وہ سوال تھا جس نے ایک بار پھر مجھے بری طرح بے چین کر ڈالا تھا۔ دفعتہً مجھے اپنے عقب میں کسی کی آہٹ محسوس ہوئی۔ میں چونک کر پلٹا اور بری طرح ٹھٹک گیا۔ دروازے پر میں نے کبیر احمد کو کھڑے پایا جو بڑی کینہ توز نظروں سے مجھے گھورے جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پستول تھا جس کی نال میری طرف اُٹھی ہوئی تھی۔ میں ایک لمحے کو ساکت و صامت کھڑا رہ گیا۔ پھر جیسے ہی اس کی نگاہ بیڈ پر پڑی اور وہ لپک کر بیڈ کے قریب آیا، اپنی بہن کی لاش دیکھ کر ایک لمحے کو اس کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔

''ذلیل...... ! کتے !...... خونی !...... قاتل !...... تت...... تُو نے میری معصوم بہن کو مار ڈالا۔ مم...... میں تجھے زندہ......'' وہ کپکپاتی ہوئی غیظ آلود آواز میں بولا اور مجھ پر اچانک گولی چلا دی۔ میں اسے روکتا رہ گیا۔ کمرے کے پُر ہول سناٹے میں گولی چلنے کا دھماکہ ہوا اور میرے حلق سے بے اختیار ایک کرب ناک چیخ خارج ہو گئی۔ گولی میرے بائیں بازو کے گوشت کو پھاڑتی ہوئی گزر گئی تھی۔ میں چند قدم پیچھے لڑکھڑا گیا۔ کبیر احمد صدمے اور طیش کی شدت سے بری طرح پاگل ہو رہا تھا۔ اسی خونخوار کیفیت میں اس نے اس بار مجھ پر اوپر تلے گولیاں داغ ڈالیں۔ میں چونکہ فوری طور پر اس نازک اور خطرناک صورتِ حال کا ادراک کر چکا تھا کہ کبیر احمد کو اس وقت میری کسی بات پر یقین نہیں آئے گا، اپنی بہن کی لاش کو سامنے پا کر وہ کچھ سننے کو بھی تیار نہ تھا۔ آتشیں ہتھیار اس کے ہاتھ میں تھا اور میں اس کے سامنے۔ چنانچہ جیسے ہی اس نے دوبارہ مجھ پر پستول تانتے ہوئے گولیاں برسائیں تو میں یکدم فرش پر گرا اور گرتے ہی میں نے ''سویپ'' کے انداز میں اپنی دائیں ٹانگ اس کی دونوں ٹانگوں سے ٹکرا دی۔ نتیجتاً اس کے قدم فرش سے اکھڑ گئے اور وہ دھڑام سے نیچے آ رہا۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ میرا بازو شدید زخمی تھا۔ اس میں سے بھل بھل خون بہے جا رہا تھا مگر یہ زخم سہلانے کا وقت نہ تھا۔ وہ شدید مشتعل تھا اور اس کی آنکھوں اور چہرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مجھے بے دردی سے ہلاک کرنے کا ایک بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ فرش پر گرتے ہی اس نے لوٹ لگائی اور کسی زخمی چیتے کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ مجھ پر جھپٹتے ہی اس نے اپنے گھونسے کا پہلا وار میرے زخمی بازو پر کیا تھا۔ زخم در زخم درد کی ایک اذیت ناک لہر میرے پورے وجود میں اترتی چلی گئی اور میں بے حال سا ہونے لگا۔ کبیر احمد پر جنون طاری تھا۔ اس نے پے در پے کئی گھونسے میرے مضروب بازو پر مارے اور پھر میرے سینے پر سوار ہو کر اپنے دونوں ہاتھوں سے میرا گلا دبوچنے لگا۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی مانند دہک رہی تھیں ان میں دیرینہ انتقام کی آگ مجھے صاف سلگتی محسوس ہوئی۔

''میں ...... میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' وہ شدید ابال کی کیفیت میں غرا کر بولا۔ ''تُو نے میری معصوم بہن کا قتل کر ڈالا...... تُو سنپولیا ہے...... بول کتے! نگینہ کہاں ہے؟ ...... ورنہ...... ورنہ......''

شدید غصے اور غیظ و غضب کے عالم میں وہ اپنا جملہ بھی مکمل نہ کر پایا اور ہانپنے لگا۔ مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میرا ایک ہاتھ تو تقریباً بے کار ہی ہو چکا تھا جبکہ محض دوسرے ہاتھ سے میں کبیر احمد کے دونوں ہاتھوں کے شکنجے سے مقدور بھر نبرد آزما تھا۔ لحمہ بہ لحمہ اس کے دونوں ہاتھوں کی گرفت میری گردن پر

اپنا دباؤ بڑھاتی جا رہی تھی۔ مجھے تو اب سانس لینے میں بھی دقت ہونے لگی تھی۔ میری آنکھیں ابلنے قریب ہو گئیں۔ وہ اپنے توانا بدن کی پوری قوت صرف کر رہا تھا اور میں بے سدھ اس کے وجود کے دبا ہوا تھا۔ اس وقت مجھے لگ رہا تھا، جیسے اب مجھے جنونی کبیر کے خونی شکنجے سے کوئی نہیں بچا سکتا لیکن میں ایسی بے بسی کی موت بھی مرنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے بے دم ہوتے وجود کی تمام قوت کو بہ مشکل سمیٹا اور پھر یکدم ایک ذرا پہلو کے بل لوٹ لگانے کی کوشش کی مگر کبیر احمد کسی پہاڑ طرح مضبوطی سے میرے سینے پر جما رہا۔ تب میں نے اپنی دونوں ٹانگیں سکیڑ کر اپنے وجود کو کمان کیا اس کی گردن میری دونوں ٹانگوں کے شکنجے میں پھنس گئی۔ میں اسے ''لیگ لاک'' کر چکا تھا۔ ایک کامیابی ملتے ہی فطری طور پر میرے اندر کا اسپورٹس مین بیدار ہوا اور پھر جوں ہی میں نے اپنی ٹانگوں کو جھٹکا دیا، کبیر احمد کے حلق سے خرخراتی غراہٹیں خارج ہونے لگیں اور میری گردن پر اس کے ہاتھوں کی گرفت کمزور پڑنے لگی۔ حتیٰ کہ اسے میری گردن چھوڑتے ہی بنی۔ میں نے ایک بار پھر اپنی دونوں ٹانگوں کو زوردار جھٹکا دیا اور ساتھ ہی دائیں جانب لوٹ لگائی تو کبیر احمد کا وجود میرے اوپر اکھڑ گیا۔ مگر پہلو کے بل فرش پر گرتے ہی اس نے اپنے گھٹنے کی زوردار ضرب میری ناف کے قدرے نچلے حصے پر رسید کر دی۔ میرے حلق سے کراہ خارج ہو گئی اور وہ گرفت کمزور پڑتے ہی مچھلی کی طرح تڑپ کر میری ٹانگوں کے شکنجے سے اپنی گردن چھڑا گیا۔ پھر وہ دوبارہ فرش پر قریب ہی گرے اپنے پستول کی طرف لپکا۔ میں نے بھی زخمی ہونے کے باوجود نہایت پھرتی کے ساتھ اپنے پستول کی طرف پیش قدمی کی اور جھک کر اسے اٹھا لیا۔ پھر اس سے پہلے کہ کبیر احمد مجھ پر گولی چلاتا، میں نے اپنے پستول کی نال کا رخ اس کی طرف کر دیا اور بلا تاخیر گھوڑا دبا دیا مگر اس میں سے سوائے ٹرچ کی آواز کے کچھ برآمد نہ ہو سکا۔

موت سے پہلے یقینی موت کا تصور بہت جاں گسل ہوتا ہے، جس کا اندازہ اس وقت صرف میں لگا سکتا تھا۔ میری آنکھوں میں تشویش آمیز پریشانی سمٹ آئی۔ جبکہ کبیر احمد شعلہ بار نظروں سے مجھے گھور تھا۔ وہ میری بے بسی دیکھتے ہوئے بڑی قہر آلود مسکراہٹ سے غرا کر بولا۔

''بس......نادر علی! تمہارا کھیل ختم ہوا۔ تم نے میری معصوم بہن کو بے دردی سے قتل کر ڈالا۔ میں تمہیں اب کتے کی موت ماروں گا۔''

''کبیر!......میری بات کا یقین کرو۔ میں نے تمہاری بہن کو مارا ہے اور نہ ہی اسے میں نے اغوا کرایا تھا۔'' بالآخر میں نے اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑتے ہوئے اس سے کہا۔ ''کبیر! اگر میں نے نگینہ کو اغواء کیا ہوتا تو وہ بھی ادھر ہی کہیں ہوتی۔ تم بے شک اس کاٹیج کی تلاشی لے سکتے ہو۔ کیا تم نے باہر کی لاش نہیں دیکھی؟ وہ ملک سردار خان کی لاش تھی، جس نے میری ماں اور ماموں حیدر گل کے ایما تمہاری بہن کو اغوا کیا تھا اور یہاں......''

''میں نے کہا نا......اپنی بکواس بند کرو۔ میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔'' وہ دھاڑ کر بولا۔ ''میں نے باہر کسی کی لاش پڑی ہوئی نہیں دیکھی ہے۔ سمجھے تم!''

میں اس کی بات پر بری طرح ٹھٹکا۔

''تم نے......اپنی ماں اور ماموں حیدر گل کے اشارے پر یہ سب کیا تھا۔ ان دونوں انتقام کے مارے بہن بھائیوں نے تمہیں ہمارے خلاف اژدھا بنا ڈالا ہے اور تم نگینہ کو اپنی محبت کے جال میں پھنسا چکے ہوتا کہ رفتہ رفتہ اس کے ذریعے تم ہمارے گرد بھی اپنی مکروہ سازش کا جال بن سکو۔''

میں اس کی باتیں سن کر ہکا بکا سا کھڑا بے اختیار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔

''چلو اندر......'' معاً اس نے مجھے اپنے کمرے میں چلنے کا حکم دیا۔

میں نے بے اختیار قدرے طمانیت کی سانس لی۔ شاید وہ مجھے فوری طور پر موت سے ہمکنار کرنے کا ارادہ ترک کر چکا تھا۔ میرے لئے یہی کافی تھا۔ چنانچہ میں نے اس کے حکم کی بلا چون و چرا تعمیل کی اور کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے مجھے کمرے میں دھکیلنے کے بعد باہر سے دروازہ لاک کر دیا۔

میں ذرا دیر تک دروازے سے چپکا باہر کی سن گن لیتا رہا۔ مجھے دروازے کے دوسری طرف اب گہری خاموشی محسوس ہوئی۔ مجھے اچنبھا ہونے لگا کہ آخر کبیر احمد کا مجھے یہاں قید کرنا کیا معنی رکھتا تھا؟ تب پھر اچانک ایک لرزہ خیز خیال بجلی کی طرح میرے شل ہوتے ہوئے دل و دماغ میں کوندا۔

''کہیں وہ بدبخت مجھے یہاں بند کر کے پولیس کو تو مطلع کرنے نہیں چلا گیا؟''

یہ روح فرسا خیال آتے ہی میری تشویش میں کئی گنا اضافہ ہونے لگا۔ میں نے بہرحال اپنی زندگی کا پہلا قتل کیا تھا مگر مجھے حیرت تھی کہ بہ قول کبیر احمد کے ملک سردار خان کی لاش اس نے نہیں دیکھی تھی۔ ایسا بھلا کیسے ہو سکتا تھا؟

میں نے فکرمندی سے سوچا۔ میں نے خود ملک سردار خان کی پیشانی پر حالتِ اشتعال میں گولی داغی تھی۔ وہ میرے سامنے تیورا کر گرا تھا اور موقع پر ہی ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ پھر اس کی لاش کہاں گئی؟ یہ وہ سوال تھا جو بار بار میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔

اچانک پھر میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔

''کہیں......کبیر احمد نے مجھ سے جھوٹ تو نہیں بولا تھا؟''

''مگر کیوں؟......اُسے یہ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟''

میں نے خود ہی اپنے سوال کو رد کرتے ہوئے سوچا۔ میں شدید اُلجھن کا شکار ہو گیا تھا۔ بالآخر میں نے ان سارے سوالات کو ذہن سے جھٹکا اور یہاں سے نکلنے کی راہ تلاش کرنے لگا۔

سردست تو مجھے اپنے مفر کی راہ سجائی نہیں دے رہی تھی۔ کمرے میں فقط ایک کھڑکی تھی جس میں آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ چھت کے قریب ایک چوکور روشن دان تھا۔ مضبوط لکڑی سے بنا دروازہ باہر سے بند تھا۔ سامنے بیڈ پر صدف کی لاش پڑی تھی اور ماحول پر عجیب سا پراسرار سناٹا طاری تھا۔

میں نے دروازے کے ساتھ مقدور بھر زور آزمائی کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس کوشش میں ناکامی کے بعد میں نے کسی آہنی شے کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی، جس کی مدد سے میں دروازے کے انٹرلاک کو توڑنے کی کوشش کرتا۔ مگر مجھے ایسی کوئی شے بھی نظر نہ آ سکی۔

ناچار میں تھک ہار کر بیٹھ گیا۔

مجھے اگرچہ اس بات کا پورا یقین تھا کہ وہ بدبخت کبیر پولیس کو اطلاع دینے ہی گیا تھا۔ وہ یقیناً اپنے تئیں مجھے رنگے ہاتھوں گرفتار کروانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن چونکہ مجھے تسلی تھی کہ اس کی بہن صدف حیات کا قتل میں نے نہیں کیا تھا اس لئے مجھے کوئی خوف نہ تھا۔ مگر پریشانی مجھے ملک سردار خان کے قتل پر ہو رہی تھی جسے میں نے نگینہ کو ہلاک کرنے کے حکم پر شدید اشتعال کی حالت میں مار ڈالا تھا۔ اگرچہ وہ ایسی ہی موت کے قابل تھا مگر یہاں تو معاملہ ہی اور نکلا تھا۔ پھر اب بہ قول کبیر احمد کے ملک سردار خان کی لاش اسے باہر کہیں نظر نہ آئی تھی۔ یہ میرے لئے اچنبھے کا باعث تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر کبیر احمد

نے سچ کہا تھا تو یہ بات بھی میرے حق میں ایک طرح سے بہتر ہی ثابت ہو سکتی تھی۔ میں سر دست قا
کے شکنجے سے بچ سکتا تھا۔ کبیر احمد کو گئے، گھنٹے سے زائد کا وقت ہو چکا تھا۔

اچانک میری ٹھٹکی ہوئی سماعتوں میں کسی گاڑی کے انجن کی گڑگڑاہٹ اُبھری۔ میں بری طرح چو
گیا۔ شاید کبیر پولیس والوں کو یہاں لے آیا تھا۔

یہ گویا میرے لئے ایک اور نئی مصیبت کا آغاز تھا۔ پولیس والوں کے ہاتھوں بننے والی اپنی درگ
مجھے بخوبی اندازہ تھا۔ میں نے دروازے کی باریک جھری سے باہر جھانکنے کی کوشش کی مگر سوائے تار
کے مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ میں سیدھا کھڑا ہو کر گویا تن بہ تقدیر ہو گیا۔ میں اب کمرے میں بند دروازے
چند قدم کے فاصلے پر کھڑا اسے یوں ٹھٹکی ہوئی نظروں سے گھورنے لگا جیسے ابھی کوئی ہولناک عفر
دروازے کو توڑتا ہوا اندر داخل ہونے والا تھا۔

اچانک دروازے کے بالکل قریب مجھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میرا دل جیسے رک ر
کر دھڑکنے لگا۔ کچھ دیر بعد دوسری طرف سے انٹرلاک میں ہلکی سی سرسراہٹ اُبھری اور اگلے ہی ل
دروازہ کھل گیا۔ سامنے نگاہ پڑتے ہی میں جیسے سن ہو کر رہ گیا.........!

❋❋❋

پہلے تو مجھے اپنی آنکھو پر بالکل یقین نہ آیا کہ میں جو منظر دیکھ رہا تھا وہ حقیقی تھا یا خواب.........؟

میرے سامنے کبیر کھڑا تھا۔ اس نے ایک بدمعاش ٹائپ کے گنجے شخص کو گن پوائنٹ پر لے رکھا
جو میرے لئے سراسر اجنبی تھا۔ لیکن میرے چونکنے کی اصل وجہ کچھ اور تھی۔ ان کے ہمراہ انتہائی مضطر
الحال انداز میں میری وہ عزیز ترین اور جان جاناں گل بداماں ہستی کھڑی تھی جس کی خاطر میں قتل جی
جرم کا مرتکب ہوا تھا۔ ہاں، وہ نگینہ ہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے پریشانی کے علاوہ اُلجھن آمیز تاثرات
مترشح تھے۔

”دیکھ لو نگینہ! اپنی آنکھوں سے اس سنپولیے کا اصل روپ۔“ معاً کبیر نے میری طرف گھورتے ہوئے
نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر نگینہ سے کہا۔

”وہ دیکھو.........سامنے میری معصوم بہن صدف کی لاش پڑی ہے، جسے اس ظالم اور سفاک انسان
نے بے دردی سے گلا گھونٹ کر مار ڈالا اور اب یہ تمہیں بھی اسی طرح اغوا کرنے کے بعد ہلاک کرنے کا
ناپاک ارادہ رکھتا تھا کہ میں بروقت پہنچ گیا۔“

”یہ کیا بکواس کئے جا رہے ہو تم کبیر؟“ اس کی لغو بیانی پر میں آپے سے باہر ہو گیا اور چلا کر بولا۔

نگینہ نے ایک نگاہ بیڈ پر صدف کی بے سدھ پڑی لاش پر ڈالی مگر وہ خاموش رہی۔ کبیر شاید نگینہ کی
طرف سے میرے لئے نفرت انگیز ردِعمل کی توقع کئے ہوئے تھا مگر اسے گومگوں خاموشی میں پا کر اس
نے دوسرا حربہ آزمایا۔ اس نے اپنے ساتھ آئے گنجے بدمعاش کی کنپٹی پر اپنے پستول کی نال چھوتے
ہوئے غرا کر کہا۔

”تم بتاؤ، اصل حقیقت کیا تھی؟ ورنہ تمہارے سر میں گولی اتار دوں گا۔“

گنجا بدمعاش گھگھیاتے ہوئے بولا۔ ”مم.........میرا کوئی قصور نہیں ہے جی۔ مم.........میں تو حکم کا
غلام تھا۔“

”کس کے حکم کے غلام تھے؟ بولو جلدی.........ورنہ.........“ کبیر نے دوبارہ پھنکارتے ہوئے اس
سے کہا۔ میں حیران پریشان کھڑا اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”وہ.........وہ جی، ان تینوں کے حکم پر میں نے پہلے صدف کو اور پھر نگینہ کو اغوا کیا تھا۔“

”کن تینوں کے حکم پر؟.........نام لو۔“

”یہ.........یہ نادر علی، اس کی سزا یافتہ ماں شبینہ اور اس کے ماموں حیدر گل کے کہنے پر۔“ اس کے
سفید جھوٹ پر میری آنکھوں میں حیرت کے سمندر موجزن ہو گئے۔

”یہ.........یہ جھوٹ بول رہا ہے کمینہ۔“ اس کے پے در پے سفید جھوٹ پر میں پھٹ پڑا۔ ”میں.........
میں تو اسے جانتا تک نہیں۔

”واہ جی واہ!.........نادر میاں! آپ نے ہی تو میرے ساتھ مل کر نگینہ بی بی کو اغوا کیا تھا۔ اور پھر
اس کے بعد صدف کو۔“

”بکواس بند کر کمینے انسان! میں تیرا خون پی جاؤں گا۔“ میں اس کی مسلسل بکواس پر مارے طیش کے
سرخ ہو کر دہاڑا اور چاہتا تھا کہ آگے بڑھ کر اس کی گردن دبوچ لوں کہ کبیر فوراً اپنے پستول کا رخ میری
جانب کرتے ہوئے حلق کے بل گرجا۔

”خبردار نادر!.........اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔ تمہارا پول کھل چکا ہے اور ساتھ ہی یہ حقیقت بھی
کہ تم نے ہم سے برسوں پرانی دشمنی خوب نبھائی۔ مجھے تو اس دن سے ہی تم پر شبہ ہو گیا تھا جب تم
ہمارے ہاں آئے تھے اور نگین کے پاپا شاہ میر اور میرے ڈیڈی (نظر حیات) کو تم نے اپنی لچھے دار باتوں
سے متاثر کیا تھا۔

وہ جانے کون کون سے جنموں کے زہر اُگل رہا تھا۔ جبکہ اس کی رقیبانہ سازشوں کے ایک ایک تار و
پود سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مردود یہ نیا جال مجھ پر پھینک کر مجھے نگینہ کی نگاہوں میں پھر مشتبہ کرنا
چاہتا تھا۔

میری گھورتی ہوئی خوں ناک نظریں کبیر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ وہ بار
بار دزدیدہ نظروں سے قریب کھڑی نگینہ کو بھی دیکھے جا رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ نگینہ کی پیہم اور اسرار بھری
خاموشی اسے بری طرح کھل رہی ہے۔

میں نے نگینہ کے گم صم چہرے کی طرف دیکھا اور دل کی گہرائیوں سے اسے مخاطب کر کے بولا۔

”نگینہ! یہ سازشی انسان اس سے پہلے بھی ہمارے بیچ دراڑ ڈالنے کی ایک مذموم اور ناکام کوشش کر چکا
ہے۔ مجھے اس کے لہجے سے ہی سازش کی بُو آتی ہے۔ میں اپنی صفائی میں محض اتنا ہی کہوں گا کہ میرے
دل میں کسی بھی دشمنی کا کوئی انتقامی جذبہ نہیں ہے اور نہ ہی میں تمہیں اغوا کرنے جیسے ناپاک فعل کا تصور
کر سکتا ہوں۔ صدف کو میں نے قتل نہیں کیا بلکہ میں تو تمہارے دشمنوں کو تلاش کرنے کی کوششوں میں تھا
جس میں مجھے بھرپور کامیابی حاصل ہوئی ہے۔“

”ہمارے دشمن کون ہیں؟“ معاً نگینہ نے مجھ پر نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔

”میری ماں شبینہ اور ماموں حیدر گل۔“ میں نے کہا اور نگینہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر
گیا۔ اس لمحے میں نے اس کے چہرے پر ایک عجیب سی طمانیت کو پھیلتے ہوئے محسوس کیا جیسے وہ کچھ
بھانپنا اور اخذ کرنا چاہ رہی ہو اور اس میں خاطر خواہ کامیاب بھی رہی ہو۔

”نگینہ! اس فریبی اور دغاباز کی باتوں میں مت آؤ۔ یہ خود کو اپنی ماں اور ماموں سے الگ کر کے
تمہاری نظروں کے سامنے اپنے بھیانک جرم پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔“ کبیر نے پھر میرے
خلاف زہر اگلتے ہوئے نگینہ کو مجھ سے متنفر کرنے کی کوشش کی تو نگینہ نے اسے ٹوکتے ہوئے گہری مگر پُرغور

سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"کبیر! اگر نادر ہمارا واقعی دشمن ہوتا تو یہ کبھی بھی اپنی ماں اور ماموں کا نام اپنی زبان پر نہیں لاتا۔"

اس کی بات پر کبیر کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ البتہ نگینہ کی بات سن کر مجھے خوشی ہوئی تھی کہ اس نے جذباتی ہوئے بغیر، ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ بہ غور حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے کبیر سے میری حمایت میں ایک ایسی بات کہہ ڈالی تھی کہ وہ اپنی بغلیں جھانکنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

پھر میں نے بھی نگینہ کو حالاتِ گزشتہ کے بارے میں مختصراً آگاہ کیا کہ کس طرح میں اس کی تلاش میں پاگل ہو رہا تھا اور چونکہ مجھے پہلے ہی اپنی ماں اور ماموں حیدر گل پر شبہ تھا اسی لئے میں اس کی ٹوہ لینے لگا اور یوں میں نے ان کی باتیں سن لیں۔ پھر ملک سردار خان کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا تو مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ یہاں ان کے ایک غفورے نامی ساتھی نے صدف کا گلا گھونٹ کر اسے ہلاک کر ڈالا تھا۔ یہ سب بتاتے ہوئے میں ملک سردار خان کے قتل کا ذکر دانستہ گول کر گیا تھا۔

یہ سب سن کر نگینہ کے چہرے پر ہلکی سی جوش آمیز تمتماہٹ اُبھری تھی پھر اس نے کبیر سے ایک ہی اہم سوال کر ڈالا۔

"کبیر! تم ایک بات یہ بتاؤ، تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں ایک ایسی گمنام جگہ پر مقید ہوں جہاں تم مجھے آزاد کرانے پہنچے تھے؟"

اب تو کبیر کا چہرہ دھواں دھواں ہونے لگا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے اپنے چہرے کے تاثرات پر قابو پاتے ہوئے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ بولا۔

"مم......میں نے اس کے ساتھی کا تعاقب کیا تھا۔"

"کون سے ساتھی کا تعاقب کیا تھا؟" نگینہ نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"یہ جو میرے ساتھ کھڑا ہے۔" کبیر نے گنجے بدمعاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

میں سمجھ چکا تھا کہ کبیر نے مجھے نگینہ کی نگاہوں میں مجرم ثابت کرنے کی ایک اور ناکام سازش کی تھی۔ چنانچہ میں کبیر کی سازش کا تار و پود بھانپتے ہوئے نگینہ سے بولا۔

"نگینہ! حقیقت یہ ہے کہ کبیر نے ہی تمہیں اغوا کیا تھا تاکہ بعد میں تمہیں وہ خود ہی بازیاب کرا کر مجھے تمہاری نگاہوں کے سامنے گرا سکے۔ البتہ میں یہ بات پورے یقین اور ایک چشم دید گواہ کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ کبیر کی بہن صدف حیات کو غفورے نامی شخص نے ہی گلا دبوچ کر ہلاک کیا ہے اور جس کا تعلق میری ماں اور ماموں حیدر گل سے تھا۔ وہ فرار ہو چکا ہے لیکن میں عدالت میں اپنی ماں اور ماموں حیدر گل کے خلاف گواہی دینے کو تیار ہوں۔"

نگینہ میری طرف سے مطمئن ہو چکی تھی۔ میری طرح وہ بھی اتنا سمجھ گئی تھی کہ اسے اغواء کرنے والا کبیر ہی ہو سکتا تھا۔ میں نے اس گفتگو کے دوران بالکل غیر محسوس انداز میں دھیرے دھیرے کبیر کی طرف سرکنا شروع کر دیا تھا۔ میں اب کبیر کی اس سازش کو پوری طرح بے نقاب کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

چنانچہ ایک موقع ملتے ہی میں نے بجلی کی سرعت کے ساتھ کبیر پر چھلانگ لگاتے ہوئے اس کے پستول والے ہاتھ پر جھپٹا مارا۔ وہ اس اچانک حملے کے لئے بالکل تیار نہ تھا۔ نتیجتاً وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور زمین بوس ہو گیا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹا جسے زمین پر گرنے سے پہلے میں نے اچک لیا۔

"خبردار! تم دونوں اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا......ورنہ گولی مار دوں گا۔" میں نے ان دونوں

پر پستول تانتے ہوئے خوف ناک غراہٹ کے ساتھ کہا۔

گنجا بدمعاش حواس باختہ نظر آ رہا تھا۔ جبکہ کبیر کا چہرہ غیظ آلود ہو رہا تھا۔ وہ سنبھلتے ہوئے جارحانہ انداز میں اٹھ کر میری طرف لپکا۔ وہ جانتا تھا کہ میں اس پر گولی نہیں چلا سکتا تھا مگر میں نے اسے روکنے کے لئے دوسرا طریقہ آزمایا اور چلّا کر بولا۔

"کبیر!......تم اگر سچے ہو تو خاموشی سے کھڑے ہو جاؤ اور مجھے اس گنجے بدمعاش سے کچھ پوچھنے دو۔ بہ صورتِ دیگر ہم یہی سمجھیں گے کہ تم حقیقت کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔" میں نے دانستہ "ہم" کا صیغہ استعمال کیا تھا اور یوں نگینہ بھی میرا اشارہ بھانپ کر اس سے میری تائید میں بولی۔

"کبیر! نادر کو حقیقت بے نقاب کرنے کا موقع دو یا پھر اپنا جرم تسلیم کر لو۔"

نگینہ کے سپاٹ اور فیصلہ کن لہجے پر کبیر دانت پیس کر رہ گیا۔ میں نے گنجے بدمعاش کو گدی سے پکڑا اور پستول کی نال اس کی کنپٹی سے لگا کر غراتے ہوئے پوچھا۔

"دیکھو......میرے سامنے سچ اُگل دو......اور خود کو ایک بڑے جنجال میں پھنسنے سے بچا لو۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارا جرم بہت معمولی نوعیت کا ہوگا۔ لیکن اگر تم نے حقیقت چھپانے کی کوشش کی تو پھر یاد رکھو، پولیس خود ہی تم سے اچھی طرح حقیقت اُگلوا لے گی۔ یہ بات تم بھی اچھی طرح سمجھتے ہو۔"

میری بات پر اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ میری عقابی نظروں نے اس ٹائپ کے گلی کوچوں والے بدمعاش کی "کمینگری" بھانپ لی تھی جو پولیس کے دبکا دبکے سے بہ خوبی واقف ہوتے ہیں۔ میں نے دزدیدہ نگاہوں سے کبیر کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ وہ خاصا پریشان اور مضطرب سا نظر آ رہا تھا۔

"وہ جی!......یہ سچ ہے کہ نگینہ بی بی کو کبیر نے میری مدد سے ہی اغوا کیا تھا۔" بالآخر اس نے ٹھوس لہجے میں حقیقت اُگل ہی دی۔ کبیر جیسے پھٹ پڑا۔

"یہ......یہ جھوٹ بول رہا ہے......نگینہ! نادر نے بڑی چالاکی سے اسے پولیس سے خوف زدہ کر کے اپنی مرضی کا بیان اُگلوانے پر مجبور کیا ہے۔" وہ گنجے بدمعاش کو خونی نظروں سے گھورتے ہوئے غرا کر اس سے بولا۔

"میں تیرا خون پی جاؤں گا......تُو نے میرے خلاف جھوٹ بولنے کی جرأت کیسے کی؟"

"کبیر! اس طرح تو تم بھی اسے دھمکی دے کر ڈرانے کی کوشش کر رہے ہو۔" نگینہ نے ناگوار نظروں سے کبیر کی طرف دیکھتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں کہا مگر گنجا بدمعاش کبیر کے رویے سے چنداں خوف زدہ ہوئے بغیر جوش سے بولا۔

"جس پرانے ریسٹ ہاؤس میں تم نے نگینہ بی بی کو یرغمال بنا کر رکھا تھا، وہ تمہاری ملکیت ہے...... ٹھیکے دار عزیز اللہ خان اس بات کا گواہ ہے۔"

اب تو کبیر احمد کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ مگر وہ پھر بھی تلملا کر خود کو بچانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "وہ سرکاری ریسٹ ہاؤس ہے۔ اس پر کوئی بھی اپنی ملکیت نہیں جتا سکتا۔"

میں نے صاف محسوس کیا کہ اس کا لہجہ شکست خوردہ ہونے لگا تھا۔ اس پر گنجے بدمعاش نے میری طرف دیکھ کر جوش بھرے لہجے میں کہا۔

"یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ بعض پرانے ریسٹ ہاؤس حکومت نے نیلام بھی کر دیئے ہیں۔ اس نے نیلام میں ہی وہ خریدا ہے۔ نادر صاحب! میں آپ کو ابھی ٹھیکے دار عزیز اللہ کا پتہ یا اس کا موبائل فون نمبر

دیتا ہوں۔ آپ اس سے خود ہی پوچھ لیں۔''

اس کی بات پر میں نے اور نگینہ نے بیک وقت کبیر کے چہرے کی طرف دیکھا تھا جو دھواں دھواں رہا تھا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اب اس کے اندر مزید اپنی ''ہٹ'' پر قائم رہنے کی سکت نہیں رہی لیکن یہ میری خام خیالی تھی۔

''اب کیا کہتے ہو کبیر؟'' میں نے لحہ بھر کی خاموشی کے بعد طنزیہ لہجے میں اسے مخاطب کر کے نگینہ بھی اب جلتی سلگتی نگاہوں سے اس کے چہرے کی طرف گھورے جا رہی تھی۔

پھر دوسرے ہی لمحے کبیر نے فوراً کینچلی بدلی اور نادم ہو کر نگینہ سے بولا۔ ''نگینہ! م...... معاف کر دو۔ مم...... مگر یہ بھی سچ ہے کہ میں نے ...... میں نے یہ سب اپنی تم سے یک طرفہ محبت سرکشی میں کیا تھا۔ تم خود میری دلی کیفیت کا اندازہ کرو نگینہ! ...... اس شخص نے دوستی کی آڑ میں پیٹھ میں خنجر گھونپا ہے اور تمہیں مجھ سے چھین کر لے گیا ہے۔''

اس کا اشارہ میری طرف تھا۔ میں اس کی مکاری پر تلملا اٹھا مگر میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی نگینہ تلخ لہجے میں اس سے کہا۔

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے کہ نادر نے مجھے تم سے چھین لیا ہے۔ محبت کسی کی ملکیت نہیں ہوتی۔ اور میری تم سے دوستی تھی۔ اس لئے کہ ہمارے والدین بھی ایک دوسرے کے پرانے جاننے والے دوستوں میں سے تھے لیکن یہ ضروری نہیں ہوتا کہ اس دوستی میں دل کا معاملہ بھی شامل ہو۔''

''تم کچھ بھی کہو نگینہ! مگر میں تم سے محبت کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔'' اس بار وہ عجیب سے لہجے بولا تھا۔ نگینہ اسے جلتی نظروں سے گھورنے لگی۔ پھر نفرت آمیز لہجے میں بولی۔

''کیا تم محبت میں زبردستی کے قائل ہو؟''

''ہاں ...... کوئی اگر اس طرح میری محبت کو مجھ سے چھین لے گا تو مجھے بھی اپنی محبت چھیننا ہے۔'' ایکا ایکی کبیر کے لہجے میں جارحانہ خود سری عود کر آئی۔ نگینہ کی آنکھوں میں ایک لمحے کو دبا دبا کا تاثر اُبھرا تھا۔ تاہم میں نے کبیر کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

''کبیر! اگر تم نے نگینہ کو ذرا سا بھی گزند پہنچانے کی کوشش کی تو یہ تمہارے حق میں بہت برا ہوگا۔''

''میں تمہیں بھی دیکھ لوں گا سنپولئے! ...... اچھی طرح سے دیکھ لوں گا۔'' کبیر نے جواب بھرے لہجے میں میری طرف گھورتے ہوئے کہا اور پھر بیڈ کی طرف بڑھ گیا جہاں اس کی بہن م حیات کی لاش پڑی تھی۔ اس نے اسے اپنے کاندھوں پر اٹھایا اور باہر نکلتا چلا گیا۔ میں اور نگینہ دم کھڑے رہ گئے۔

''میں اسے ابھی پولیس کے حوالے کر دوں گا۔'' اس کے جاتے ہی میں دانت پیس کر بڑبڑایا۔

''نہیں نادر! تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔'' معاً نگینہ نے پُرمتانت لہجے میں مجھ سے کہا اور میں چونک اس کا چہرہ تکنے لگا۔ پھر جیسے کچھ سمجھتے ہوئے میں نے گہری سانس لے کر چپ سادھ لی۔

وہ شاید نہیں چاہتی تھی کہ اس کے پپا اور کبیر کے ڈیڈی کے درمیان پرانی دوستی میں کسی قسم کا پڑے۔ اس کے علاوہ یہ بھی تھا کہ نظر حیات پر اس کی بیٹی صدف حیات کے قتل کی صورت میں قیامت بھی ٹوٹ پڑی تھی۔ گنجے بدمعاش نے ڈرتے ڈرتے مجھ سے جانے کی اجازت طلب کی اس کا کوئی فائدہ نہ تھا، تاہم میں نے اسے سرزنش کر کے جانے دیا۔

''چلو نگینہ! میں تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑ دوں۔ انکل شاہ میر تمہاری وجہ سے بہت پریشان

ہوں گے۔'' میں نے دھیرے سے نگینہ کو مخاطب کر کے کہا۔

پھر اس کے بعد ہم دونوں جیپ میں سوار ہوئے اور پنڈی کی طرف روانہ ہو گئے۔

پو پھٹے ہم شاہ میر کی کوٹھی پہنچے تھے۔ نگینہ کو میرے ساتھ زندہ سلامت دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی۔ نگینہ نے ان سے اصل بات چھپاتے ہوئے محض اتنا ہی بتایا تھا کہ اسے چند اوباش غنڈے پکڑ کر لے گئے تھے مگر نادر نے مجھے بروقت ان کی قید سے چھڑا لیا تھا۔ نگینہ کی مرضی یہی تھی اس لئے میں بھی خاموش رہا۔ البتہ نگینہ نے جب انہیں نظر حیات کی بیٹی صدف حیات کے بہیمانہ قتل کے بارے میں بتایا تو بُری طرح چونکے اور پھر میں نے انہیں یہ سنگین اور سفاک حقیقت گوش گزار کی کہ صدف حیات کے قتل میں میری ماں اور ماموں حیدر گل کا ساتھ ہے تو وہ مزید پریشان ہو گئے۔ اب ان کی آنکھوں سے انجانے خوف کی جھلک بھی نمایاں ہونے لگی۔ انہوں نے جلدی سے اپنی بیٹی نگینہ کو گلے لگاتے ہوئے مضطربانہ لہجے میں کہا۔

''خدا کا شکر ہے بیٹی! کہ تم ان دونوں سفاک بہن بھائیوں کے خونی ہاتھوں سے بچ گئیں۔ اب مجھے ان کے خلاف کوئی عملی کارروائی کرنا ہی پڑے گی۔ ٹھہرو، پہلے میں اپنے دوست نظر حیات کو فون کر لوں۔''

ابھی انہوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک قریب دھرے فینسی ٹیلی فون اسٹینڈ پر رکھے فون سیٹ کی گھنٹی بج اٹھی...... انکل شاہ میر نے چونک کر ریسیور اٹھایا۔ میں اور نگینہ دھڑکتے دل کے ساتھ ان کے چہرے کو تکنے لگے۔

''ہیلو...... ہاں، نظر حیات! ...... اوہ، یہ بہت برا ہوا ...... مجھے ابھی ابھی پتہ چلا ہے۔''

دوسری طرف نظر حیات ہی تھے جن سے نگینہ کے پپا مخاطب تھے۔

''صدف میری بھی بیٹی تھی حیات! مجھے بہت ملال ہے، تم حوصلہ رکھو۔ وہ دونوں قاتل بہن بھائی قانون کے ہاتھوں سے نہیں بچ سکیں گے۔ میں فوراً پہنچ رہا ہوں۔'' انہوں نے یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔ پھر بہ عجلت ہم دونوں سے بولے۔

''آؤ...... نظر حیات کی طرف چلتے ہیں۔''

ذرا ہی دیر میں ہم تینوں نظر حیات کے سامنے موجود تھے۔ ان کا چہرہ شدید غم کی عکاسی کر رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلملاہٹ کے ساتھ ایک غیظ آلود جوش کی تپش بھی جھلک رہی تھی۔ ان کی بیگم نڈھال اور اندر کمرے میں تھیں اور عزیز رشتے دار عورتوں نے انہیں سنبھالا دے رکھا تھا۔ جبکہ کبیر بھی اس وقت اپنے چہرے پر سوگواری طاری کئے باپ کے قریب ہی خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ شاید اب تک اس بات کا اندازہ لگا چکا تھا کہ نگینہ نے اپنے اغواء وغیرہ کے سلسلے کو اپنا ذاتی معاملہ قرار دے کر خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔

انکل شاہ میر نے اپنے دوست نظر حیات کو ساری بات سنا ڈالی تھی اور ان کو یہ بھی بتایا کہ نادر یعنی میں اپنی ماں اور ماموں کے خلاف گواہی دینے کے لئے تیار ہوں۔ ایس پی وجاہت قریشی کو بھی فون کر کے بلا لیا گیا تھا اور میں نے انہیں تمام واقعات سے آگاہ کرنے کے بعد غفورے کے متعلق بھی بتا دیا تھا ن نے میری ماں اور ماموں حیدر گل کے کہنے پر یہ سفاک قدم اٹھایا تھا۔ ایس پی وجاہت قریشی نے اسی وقت پولیس پارٹی کو ماں اور ماموں حیدر گل کی گرفتاری کے احکامات جاری کر دیئے تھے اور غفورے کی تلاش کا بھی سختی سے حکم دے دیا گیا تھا۔

صدف حیات کی تجہیز و تدفین کے بعد رات گئے میں، انکل شاہ میر اور نگینہ واپس کوٹھی آ گئے۔ اس

دوران میں ہمیں یہ اطلاع دی جا چکی تھی کہ ایس پی وجاہت قریشی کے حکم کے مطابق ماں اور ماموں حیدر گل کو صدف حیات کے قتل کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا تھا اور اب ان دونوں بہن بھائیوں سے غور کے سلسلے میں پوچھ گچھ جاری تھی۔

کوٹھی پہنچنے کے بعد انکل شاہ میر نے مجھے رات وہیں گزارنے کو کہا مگر میرا اب ''گرین لاج'' پہ ضروری تھا۔ تاہم رخصت ہونے سے پہلے میں نے ان سے کہا۔

''انکل! کیا اب بھی مجھے آپ لوگ اس حقیقت سے آگاہ نہیں کریں گے کہ آخر میری ماں، ماموں حیدر گل کی آپ لوگوں سے دشمنی کی اصل وجہ کیا ہے؟......ان حالات میں میرا یہ سب جاننا اور ضروری ہوگیا ہے۔''

میری بات پر انکل شاہ میر نے ایک گہرا اور پُرسوچ ہنکارا بھرا اور پھر دھیرے سے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ میری دھڑکتی ہوئی نظریں ان کے گمبھیر تاثرات کے حامل چہرے پر مرکوز ہوگئیں۔ نگینہ چونکہ یہ ساری حقیقت معلوم تھی اس لئے وہ خاموشی سے اٹھ کر وہاں سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

ماحول میں ایک ایسا اعصاب شکن سناٹا طاری ہوگیا تھا۔ انکل شاہ میر بالآخر آج مجھے ان سوالوں جوابات دینے کے لئے تیار ہوگئے تھے جن سے میری ماں اور ماموں حیدر گل آج تک پہلو تہی کر آئے تھے۔

''نادر بیٹے!......'' بالآخر انہوں نے کہنا شروع کیا اور میں سرتاپا سماعت بن گیا۔ ''چاہتے تو یہی تھے کہ یہ تلخ اور کریہہ حقیقت تمہیں اپنی ماں اور ماموں کی زبان سے معلوم ہوتی لیکن ان کا سلسلے میں بدستور خاموشی سے تم خود اس بات کا بہ خوبی اندازہ لگا سکتے ہو کہ وہ کیوں خاموش ہیں؟''

انہوں نے چند لمحے کے لئے توقف کیا اور میری بے چینی لحظہ بہ لحظہ فزوں تر ہونے لگی۔ ان کا کے لئے متوقف ہونا بھی مجھے بری طرح کھل رہا تھا۔

''ہمیں یہ حقیقت تمہیں بتانے میں کوئی تامل نہیں تھا۔ لیکن اب شاید صدف حیات والے اندوہنا واقعے کے بعد تمہیں ہماری باتوں پر شبہ نہ رہے......بہرحال سنو۔ یہ آج سے پورے پچیس سال کی بات ہے۔ نظر حیات اور میں تمہارے باپ قادر خان کے پرانے اور گہرے دوستوں میں سے قادر خان کی دوستی پر ہمیں آج بھی فخر ہے۔ وہ ایک دوست نواز اور غیور شخص تھا۔ تمہاری ماں یعنی خان کی بیوی شبینہ، نظر حیات کی طرف ملتفت ہونے لگی لیکن نظر حیات چونکہ ایک شریف انسان تھا لئے وہ دامن بچاتا رہا۔ تمہاری ماں یہی سمجھی کہ نظر حیات، قادر خان سے ڈرتا ہے۔ پھر تمہاری ماں اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرڈالا لیکن قادر خان نے جب اس کی وجہ پوچھنا چاہی تو تمہاری ماں بتائے بغیر اپنی بات پر اڑی رہی۔ لہٰذا قادر خان نے اسے بری طرح سرزنش کی۔ تب پھر ایک تمہاری ماں نے اس بے چارے کا قتل کرڈالا اور پھر وہ سیدھی نظر حیات کے پاس اس کے سر ریسٹ ہاؤس جا پہنچی جہاں وہ تنہا ہی رہتا تھا کیونکہ اس وقت وہ غیر شادی شدہ تھا۔ اس وقت نظر حیا کے ہمراہ میں بھی تھا۔ ان دنوں میں محکمہ جنگلات میں گیم وارڈن (فاریسٹ آفیسر) تھا اور نظر حیا گورنمنٹ کانٹریکٹر۔ جبکہ تمہارا باپ قادر خان ایک بڑے لکڑی کے ٹال کا مالک تھا۔

''بہرطور......جب تمہاری ماں نے نظر حیات کو یہ بتایا کہ اب اسے کسی سے ڈرنے کی ضرو نہیں ہے اور اس نے اپنے شوہر قادر خان کا قتل کرڈالا ہے تو بے چارہ نظر حیات یکدم گھبرا گیا او نے تمہاری قاتل ماں سے شادی کرنے سے صاف صاف انکار کردیا۔ تمہاری ماں نے اسے بھی قتل کر

دھمکی دی تو میں درمیان میں آگیا اور کسی نہ کسی طرح تمہاری ماں کو ریسٹ ہاؤس سے جانے پر مجبور کر یا۔ پھر بعد میں ہم نے پولیس کو مطلع کردیا۔ پولیس شبینہ کو گرفتار کرکے لے گئی۔ آخر کو تمہارا باپ قادر ان ہمارا دوست تھا، ہم اس کا خون کیسے رائیگاں جانے دیتے۔ لہٰذا شبینہ پر مقدمہ چلا اور عدالت نے سے سزائے موت دے دی جو بعد میں سپریم کورٹ میں اپیل دائر کرنے پر عمر قید میں بدل گئی۔''

انکل شاہ میر اتنا بتانے کے بعد خاموش ہوگئے۔

میں پتھر کا بت بنا رہ گیا۔ میری سماعتوں میں انکل شاہ میر کا ایک ایک لفظ پگھلے ہوئے سیسے کی طرح ز رہا تھا۔ میرے پورے وجود کو جیسے تیز، نوکیلی برچھیوں نے چھلنی کرکے رکھ دیا تھا اور میں پھر بھی پتھر کا ت بنا بیٹھا تھا۔ میرے وجود کی عمارت برسوں پرانی جس تلخ کتھا کی گونج سننے کے لئے بے چین تھی، ج وہ ڈھینے لگی تھی مگر میں پھر بھی بت بنا بیٹھا تھا۔ میری چھلنی سماعتوں میں خزاں رسیدہ ہوائیں شائیں ئیں کررہی تھیں۔ جو کچھ میں نے سنا تھا وہ میرے لئے ناقابل یقین تھا مگر میں انکل شاہ میر کے ان ین اور بے رحم الفاظ کو جھٹلانے کی بھلا کیسے ہمت کرسکتا تھا۔ اس کی وجہ میرے پیہم اصرار کے باوجود ری ماں اور ماموں حیدر گل کی اس سلسلے میں اب تک پُراسرار خاموشی تھی جو انہیں لامحالہ مجرم ہی ثابت ے ہوئے تھی اور میرے ان دونوں سے متنفر ہونے کی بھی ٹھوس وجہ یہی تھی۔

''نادر بیٹے! حوصلہ رکھو......تم بہت ہمت والے لڑکے ہو۔ ٹیک اِٹ ایزی، مائی سن!''

مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ کب انکل شاہ میر اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آئے اور ازراہِ تشفی انہوں نے میرے کاندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے شفقت آمیز لہجے میں مجھے مخاطب کیا تھا۔

پھر انہوں نے نگینہ کو آواز دی۔ وہ آئی تو انہوں نے اسے مجھے ایک گلاس پانی دینے کو کہا۔ میں نے نگینہ ہاتھ سے پانی کا گلاس لیا اور اپنے لرزیدہ ہونٹوں سے لگا کر غٹ غٹ سارا پانی پی گیا۔ پانی کی ٹھنڈک ی میرے اندر کی تپش کو کم نہ کرسکی تھی۔ میرے سوکھے حلق میں ببول کا خارزار جنگل بدستور موجود رہا۔

''انکل! اب میں چلوں گا۔'' اچانک میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے اپنے قدموں سے جان نکلتی ی محسوس ہورہی تھی۔

''نادر! تم پپا کی بات مان کیوں نہیں لیتے؟ آج کی رات ادھر ہی ٹھہر جاؤ، ہمارے پاس۔'' نگینہ نے ے بڑے رسان کے ساتھ کہا۔

''نہیں نگینہ! میرا اب گرین لاج پہنچنا ضروری ہے۔ میں پھر آؤں گا۔'' میں نے ہولے سے کہا تو ل شاہ میر نے مجھے مخاطب کرکے کہا۔

''نادر! مجھے تمہیں نصیحت کرنے کا کوئی حق تو نہیں ہے لیکن میں تم سے اتنا ضرور کہوں گا کہ تم کوئی بھی م ہم سے مشورہ کئے بغیر نہیں اٹھاؤ گے۔ کیونکہ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔''

''جی انکل! آپ کو پورا حق حاصل ہے مجھے نصیحت کرنے کا۔'' میں نے ان کی طرف دیکھ کر سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔ لیکن میں اب سب سے ہلا کام یہ کرنا چاہتا ہوں کہ اپنے باپ کی جاگیر، کاروبار کو سنبھالوں تاکہ بعد میں میری ماں اور ماموں س پر اپنا حق نہ جتا سکیں۔ میں انہیں بے دخل کردوں گا۔''

''ہاں، یہ کام تو تمہیں سب سے پہلے کرنا ہوگا۔'' انکل شاہ میر نے فوراً میری تائید کی، اس کے بعد ں واپس لوٹ گیا۔

❋❋❋

میں انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ جیپ دوڑاتا ہوا گرین لاج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مجھے یوں لگ تھا جیسے میری زندگی اب سرخ آندھیوں کی لپیٹ میں آنے والی تھی۔ میری ڈگر بدلنے کو تھی۔ میں تا راستوں کا راہی بننے والا تھا۔ میں وہ بدنصیب شخص تھا جسے اس کی اپنی ماں نے اس وقت یتیم کر دیا جب وہ اس کی کوکھ میں پل رہا تھا۔ میں اس دھرتی کا ایسا بوجھ تھا جس نے میری ماں کے شرمناک کا اس قدر بھاری بوجھ اپنے جلتے ہوئے سینے پر اٹھا رکھا تھا جو مجھے زمین کے اندر گاڑے دے رہا میرے جینے کا بھلا کیا مقصد تھا؟ میری ذات کے سارے حوالے، وہ پہچان جو ایک طرح کا تفاخر کرتے ہیں، اپنوں ہی کے ہاتھوں فنا ہو چکے تھے اور جو باقی بچے تھے وہ میرے لئے باعثِ شرم و ندا تھا۔ مگر نہیں، میرا فخر تو زندہ تھا۔ میں تو......... میں تو ایک غیرت مند باپ کا بیٹا تھا۔ جس نے غیر خاطر جان دی تھی اور مجھے اس کا بدلہ لینا تھا مگر کس سے؟ اپنی ماں سے؟......... یا ماموں حیدر گل سے
انہی شوریدہ سر خیالات کی کشاکش میں بالآخر میں اپنی پہاڑی رہائش گاہ ''گرین لاج'' پہنچا۔
حسبِ توقع میں نے وہاں فضل چاچا کو پریشان اور متفکر پایا۔ ''بیٹا! تت......... تم آ گئے..... ٹھیک تو ہو نا؟'' وہ فوراً میری طرف لپکے۔
''ہاں بابا! .... میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا اور اندر اپنے کمرے میں آ گیا۔ بھی حیران و پریشان میرے پیچھے چلے آئے۔
''بیٹا! وہ......... وہ تمہاری ماں اور ماموں کو پپ......... پولیس گرفتار کر کے لے گئی ہے۔''
انہوں نے اپنے تئیں مجھے چونکا دینے والی اطلاع دی۔ مگر میں نے انتہائی سرد لہجے میں کہا۔
''بابا! مجھے معلوم ہے۔ کیا تم یہ نہیں جانتے کہ پولیس نے ان دونوں کو کیوں گرفتار کیا ہے؟''
''ہاں......... مگر یہ جھوٹ ہے۔ دشمنوں کی سازش ہے۔'' بابا پر یقین لہجے میں بولا۔ مجھے ان کے بے بنیاد یقین پر غصہ آ گیا اور میں پہلی بار ان سے ذرا سخت لہجے میں بولا۔
''بابا! پھر تم کچھ بھی نہیں جانتے......... تم جاؤ، مجھے ذرا دیر کے لئے اکیلا چھوڑ دو۔''
ان کے چہرے پر کرب کی لہر سی اُبھری اور وہ خاموشی سے سر جھکا کے لوٹ گئے۔
میں بیڈ پر دراز ہو گیا۔ میرا سر نیند کی شدت سے پھٹا جا رہا تھا۔ تھکاوٹ بھی غالب آ رہی تھی۔ بیڈ پر لیٹتے ہی سو گیا۔

❊❊❊

انکل نظر حیات نے میری ماں اور ماموں حیدر گل کو اپنی بیٹی صدف کا قاتل نامزد کر دیا تھا۔ نے عدالت سے سات روز کا ریمانڈ لے کر ملزمان سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔
میں نے کاروبار سنبھال لیا تھا اور اب باقاعدگی سے ''ٹال'' جانے لگا تھا۔
فضل چاچا کو دکھ تھا کہ میں ایک بار بھی ماں اور ماموں حیدر گل کی خیر خبر لینے متعلقہ تھانے نہ تھا۔ اب تک البتہ وہ دونوں میاں بیوی ہر روز ان کے لئے کھانا لے کر جایا کرتے تھے۔ فضل اگرچہ میری، ماں اور ماموں کے درمیان سرد جنگ کا علم تھا مگر انہیں اس کا قلق بھی تھا کہ میں تک ماں اور ماموں کو مقدمے سے بچانے کے لئے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ انہوں نے اشاروں میں میری اس طرف توجہ دلانے کی بھی کوشش کی مگر میں نے انہیں اس معاملے میں کسی بھی قسم کی کرنے سے منع کر دیا تھا۔
البتہ ٹال کا وہ تیز طرار منیجر مشتاق گوندل ماموں حیدر گل کی گرفتاری پر کچھ زیادہ ہی بولایا ہوا تھا

یک روز اپنے ایئر کنڈیشنڈ آفس روم میں بیٹھا تھا کہ وہ صورت لٹکائے حاضر ہوا۔
''کیا بات ہے؟'' میں نے خشک نظروں سے اسے گھور کر کہا۔
''وہ جی......... صاحب کے بغیر یہاں کا ماحول سُونا سُونا سا ہو کر رہ گیا ہے۔ بڑے آدمی تھے جی۔ آپ نے ان کے لئے اب تک کوئی وکیل.........''
''منیجر......!'' میں نے اس کی بات کاٹ کر درشت لہجے میں کہا۔
وہ فوراً اٹینشن ہو گیا۔ ''جی......... جی......... سر جی!''
''تم اپنے کام سے کام رکھو۔ اگر تمہیں صاحب (ماموں حیدر گل) کے بغیر یہاں مزہ نہیں آ رہا ہے تو یہاں سے جا سکتے ہو۔''
اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ جلدی سے بولا۔ ''نن......... نہیں جی۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔''
''اور ایک بات کان کھول کر سن لو۔'' میں نے اس کی طرف گھور کر تنبیہ آمیز لہجے میں کہا۔
''کاروباری معاملات کے سوا یہاں اور کوئی بات نہ ہو گی۔ آئندہ ساری ڈیلنگ میں خود کروں گا......... اور ہاں، آج ہی اخبارات میں حیدر گل کی طرف سے ہماری لاتعلقی کا اشتہار بھی دے دو......... سمجھے تم۔''
''جج......... جی......... سمجھ گیا جی۔ آخر کو اب آپ بڑے آدمی ہو۔'' وہ اپنے مخصوص تکیہ کلام سے ز نہ آیا۔
''کل میں اپنی میز پر اخبارات میں یہ اشتہارات دیکھوں گا ورنہ تم خود کو فارغ سمجھو۔ جاؤ اب۔''
وہ فوراً کمرے سے نکل گیا۔ ذرا دیر بعد مردان شاہ اندر داخل ہوا۔ یہ مزدور یونین کا لیڈر تھا اور بہت نتی تھا۔ ماموں حیدر گل کے مقابلے میں یہ میری زیادہ عزت کرتا تھا اور مزدوروں کے دلوں میں بھی برے لئے نسبتاً زیادہ احترام تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ کچھ روز قبل میں نے ان کی تنخواہوں میں اضافہ کر یا تھا۔
''آؤ مردان شاہ! .... بیٹھو۔'' میں نے ہولے سے مسکرا کر اس سے کہا۔
اس کا چہرہ ذرا افسردہ سا لگ رہا تھا۔ وہ میری اجازت کے باوجود کرسی پر بیٹھنے کی بجائے ایسے ہی کھڑا رہا۔
''کیا بات ہے مردان شاہ! کوئی مسئلہ ہے تو بتاؤ۔'' میں نے اس کی بدستور خاموشی پر نرمی سے پوچھا وہ میری طرف افسردہ سی نگاہ ڈال کر بولا۔
''صاحب جی! ہم لوگوں نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ ہمیں بڑے صاحب اور بی بی جی کی گرفتاری پر ہت دکھ ہوا ہے۔ چھوٹا منہ بڑی بات......... مگر صاحب جی! ہمارے دل بڑے ہیں۔ ہمارے سارے زدور ساتھی بھی بے چین اور پریشان ہیں۔ آپ سے کچھ کہتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں لیکن اپنے دل کے تھوں مجبور ہو کر انہوں نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے کیونکہ ہم اتنے خودغرض نہیں ہیں کہ صرف اپنے سئلے حل کرنے کے لئے یکجا ہوں۔ ہم چاہتے ہیں کہ سب مل کر عدالت جائیں اور وہاں بڑے صاحب ر بی بی جی کے حق میں ان کی بے گناہی کی گواہی دیں۔ وہ قاتل نہیں ہو سکتے۔''
وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ ماں اور ماموں حیدر گل کے ذکر پر اگرچہ میرے حلق میں کڑواہٹ سی ھل گئی تھی مگر ان کی طرف سے ان کا پریشان ہونا فطری عمل تھا۔ بہرطور میں نے ایک گہری ہنکاری لی ر پُرمتانت لہجے میں بولا۔
''مردان شاہ! میں تم لوگوں کے خیالات کی قدر کرتا ہوں لیکن جرم بہرحال جرم ہوتا ہے۔ اگر

تمہارے بڑے صاحب اور بی بی جی بے گناہ ہوئے تو عدالت دونوں کو باعزت بری کر دے گی۔"

"لیکن ....صاحب جی! ہم نے تو سنا ہے کہ آپ نے بی بی جی اور بڑے صاحب کے لئے تک کوئی وکیل تک نہیں کیا ہے؟"

"مردان شاہ! میں نے اسے ذرا سخت نظروں سے دیکھ کر کہا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں تلخی عود کر آئی تھی۔ وہ بے چارہ میرے اس طرح پکارنے پر گھبرا سا گیا۔ "تم ....اور کچھ کہنا چاہتے ہو؟" میں نے اسے رخصت کرنے کی غرض سے پوچھا۔

"نن ....نہیں ....صاحب جی!"

"ٹھیک ہے ....تم جا سکتے ہو۔"

وہ واپس جانے کے لئے مڑا مگر پھر ایک لمحے کو رک کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ "صاحب میری بات بری لگی ہو تو معافی چاہتا ہوں۔"

میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور اس کی طرف دیکھ کر ہولے سے مسکراتے ہوئے سر ہلا[یا] وہ چلا گیا۔

ماں اور ماموں حیدر گل کو قرار واقعی سزا دلوانے کے لئے نظر حیات نے ایڑی چوٹی کا زور لگا رکھا [تھا]۔ اس نے شہر کے بہترین وکیل کو بھی "ہائر" کر لیا تھا۔ عدالت میں مقدمہ پیش کیا جا چکا تھا۔ جہاں مجھے ماں اور ماموں کے خلاف گواہی کے لئے پیش کیا جانے والا تھا اور اس سلسلے میں نظر حیات اور انکل شاہ [میر] نے مجھ سے رابطہ بھی کیا تھا بلکہ اس سلسلے میں ایک روز وہ دونوں خود ہی مجھ سے ملنے گرین لاج آ[ئے] تھے۔ ان کے ہمراہ نگینہ بھی تھی۔ وہ صبح کا وقت تھا۔ دور برف پوش پہاڑوں سے سورج پوری طرح [نکل] چکا تھا اور نیچے وادی کے جنگل میں پرندوں کی گونجیلی چہکاریں بلند ہونے لگی تھیں۔

وہ لوگ کار میں آئے تھے۔ اس روز اتوار تھا۔ میں بھی لاج میں ہی موجود تھا۔ آنے سے قبل نگینہ [نے] مجھے فون کر کے آمد کی اطلاع دے دی تھی۔

میں نے فضل چاچا اور ان کی بیوی سکینہ کو "مہمانوں" کی آمد کے بارے میں بتایا، وہ کاموں میں مصروف ہو گئے۔ بالآخر وہ لوگ پہنچ گئے۔

فضل چاچا انکل شاہ میر اور نظر حیات کو پہچانتے تھے۔ ان کے چہرے پر پہلے حیرانی اور پھر بعد [میں] ناگواری کے تاثرات ابھرے تھے۔ تاہم ان کا استقبال میں نے کیا تھا۔

"نادر بیٹے! کل تمہاری گواہ کی حیثیت سے عدالت میں پیشی ہے۔ ہم نے سوچا تمہیں مطلع کر دیں۔" رسمی علیک سلیک کے بعد نظر حیات نے میری طرف دیکھ کر کہا تو میں نے بلاتوقف جواب دیا۔

"آپ بے فکر رہیں ....میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

"شاباش بیٹے! ہمیں پوری امید تھی کہ تم حق کی خاطر ہمارا ساتھ دو گے۔" اس بار انکل شاہ میر نے مجھ سے کہا۔ نگینہ ان کے قریب ہی خاموش بیٹھی تھی۔ "نادر بیٹے! ہمیں کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا ہے کہ تمہیں تمہاری ہی ماں اور ماموں کے خلاف گواہی دینی پڑ رہی ہے۔ لیکن میری معصوم بیٹی صدف کا معاملہ نہ ہوتا تو شاید ...." انکل نظر حیات کچھ کہتے کہتے رک گئے، پھر فوراً ہی بولے۔ "اگر تمہارے دل پر کسی قسم کا بوجھ محسوس ہو تو کوئی بات نہیں، ہم تم پر زبردستی اپنی مرضی مسلط نہیں کرنا چاہتے۔"

"نہیں انکل!" میں فوراً قطعیت سے بولا۔ "اگر میں نے گواہی نہ دی تو اس صورت میں میرے ضمیر پر بوجھ ضرور پڑے گا۔ اور یہ ایک بے گناہ اور معصوم بچی کا قتل ہے۔ اگر آپ مجھ سے نہیں بھی کہتے تو

ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر خود اس کی گواہی دینے عدالت پہنچ جاتا اس لئے آپ اپنے دل پر کسی قسم کا بوجھ نہ لیں۔"

"بیٹا! تم نے واقعی میرے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا۔" میرے لہجے کی سنجیدگی اور قطعیت نے انکل نظر حیات کو بہت متاثر کیا تھا۔

"انکل! پیشی کب ہے؟" میں نے اچانک پوچھا۔

"کل گیارہ بجے۔" اس بار نگینہ کے پپا انکل شاہ میر بولے۔

"ٹھیک ہے ....میں صبح ساڑھے دس بجے عدالت پہنچ جاؤں گا۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"بہت شکریہ بیٹا! اب ہم چلیں گے۔" انکل نظر حیات نے کہا اور اٹھنے لگے تو میں نے انہیں روکنا چاہا لیکن وہ لوگ خاصی عجلت میں نظر آ رہے تھے۔ مجھے فضل چاچا پر غصہ آ رہا تھا کہ انہوں نے ابھی تک مہمانوں کے لئے چائے وغیرہ سرو نہیں کی تھی۔

"بیٹھیں انکل! کچھ کھا پی کر تو جائیں........آخر کو پہلی بار آئے ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے فضل چاچا کو آواز دینا چاہی تو انہوں نے مجھے روک دیا۔

"نہیں بیٹا! اپنا ہی گھر ہے، کیس جیتنے کے بعد ہم باقاعدہ کھانا کھانے آئیں گے۔ سمجھو، ہماری دعوت تم پر اُدھار رہی۔"

اس کے بعد میں انہیں چھوڑنے باہر تک آیا۔ کن انکھیوں سے نگینہ کی طرف دیکھا۔ وہ بھی میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ اس لمحے جانے کیوں مجھے وہ کچھ مضطرب سی نظر آئی۔

ان کے جانے کے بعد میں غصے سے بھرا ہوا اندر آیا اور سامنے فضل چاچا کو کھڑے پایا تو میرا غصہ دو آتشہ ہو گیا۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی سخت ناگوار لہجے میں بولا۔

"بابا! میں تمہاری بہت عزت کرتا ہوں مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اپنی اوقات بھول جاؤ۔" میرے سخت جملوں پر انہوں نے بڑی کرب انگیز نظروں سے میری طرف دیکھا تھا مگر کچھ بولے نہیں۔ مجھے ان کی ڈھٹائی پر مزید غصہ آ گیا۔

"کیا تمہیں اتنی بھی تمیز نہیں رہی ہے کہ کوئی مہمان آتا ہے تو اسے چائے پانی کو پوچھا جاتا ہے؟"

"وہ مہمان نہیں، ہمارے دشمن تھے۔" فضل چاچا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"فضل چاچا!" میں نے بھنا کر کہا۔ "تمہاری جرأت کیسے ہوئی میرے مہمانوں کو دشمن کہنے کی؟"

"نادر بیٹا! اپنے دشمنوں کو پہچاننے کی کوشش کرو۔" وہ بڑے دکھ بھرے لہجے میں بولا۔ "اور یہ کیا، تم نے بڑے صاحب اور بی بی جی کے خلاف کل عدالت میں ان کے کہنے پر گواہی دینے کا بھی فیصلہ کر لیا ہے؟" ان کی بات نے جیسے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

میں انہیں قہر آلود نظروں سے گھور کر درشتی سے بولا۔ "فضل چاچا! تمہیں ہماری باتیں سننے کی جرأت کیسے ہوئی؟ ....اور تم کون ہوتے ہو، میرے معاملے میں ٹانگ اڑانے والے، میری مرضی ....میں کچھ بھی کروں۔"

"نادر بیٹے! تم کسی بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہو۔ خدا کے لئے اپنوں کو اور دشمنوں کو پہچانو۔ میں نے اس گھر کا نمک کھایا ہے۔ میں اسے تباہ و برباد ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔" ان کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

یہ حقیقت تھی کہ فضل چاچا ہمارے بہت پرانے خدمت گار تھے۔ انہوں نے ایک روز مجھے بتایا تھا کہ جب وہ میری عمر کے تھے اور اپنے بیمار بوڑھے والدین کا واحد سہارا تھے تو میرا باپ قادر خان ان کی مدد

کیا کرتا تھا۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فضل چاچا نے ہمیشہ کے لئے اپنی زندگی گویا ''گرین لا
کے مکینوں کی خدمت گزاری کے لئے وقف کر دی تھی۔ میں نے بہ غور فضل چاچا کے چہرے کی ط
دیکھا اور تلخی سے بولا۔

''فضل چاچا! تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے بڑے صاحب اور بی بی جی نے کون سا گھناؤنا جرم کیا ہے

''یہ دشمنوں کی سازش ہے.........''

وہ بولے ہی تھے کہ میں نے درمیان میں استہزائیہ قہقہہ بلند کیا، پھر انہیں ساری بات بتا دی ک
طرح ہم نے ماموں حیدر گل کی وہ بات سن لی تھی جب وہ اپنے خاص دوست ملک سردار خان کو
یرغمال لڑکی (صدف حیات) کو قتل کرنے کی ہدایات دے رہے تھے اور بعد میں، میں یہی سمجھا تھا
یرغمالی لڑکی کہیں نگینہ نہ ہو.........اس لئے جب میں ملک سردار خان کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں پہ
غفورا نامی ایک کارندہ اس لڑکی (صدف) کا گلا دبوچ کر اسے ختم کر چکا تھا۔

میری بات پر فضل چاچا کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''کیوں فضل چاچا! اب کیا کہتے ہو اپنے بڑے صاحب اور بی بی جی کے کالے کرتوتوں کے بار
میں؟.........کیا میں یہ کانوں سنی اور آنکھوں دیکھی حقیقت جھٹلا سکتا ہوں؟.........کبھی نہیں۔''

میں نے ان کے گنگ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔ وہ چند لمحے ساک
سامت کھڑے مجھے دیکھتے رہے۔ ان کی آنکھوں میں ایک مرتبہ پھر نمی اُترنے لگی تھی۔ پھر وہ ہموار
میں بولے۔

''ہاں.........اگر یہ سچ ہے تو بڑے صاحب جی اور بی بی جی کو یہ ہرگز نہیں کرنا چاہئے تھا۔ لیکن
بیٹا! میں بھی بڑے صاحب (ماموں حیدر گل) کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ انہوں نے یقیناً اتنا بڑا
رحمانہ قدم بی بی جی (ماں شبینہ) کے کہنے پر ہی مجبوراً اُٹھایا ہوگا۔''

''فضل چاچا! اب کچھ بھی ہو، وہ دونوں مجرم ہیں اور انہیں ان کے کئے کی سزا ضرور ملنی چاہئے۔''

''نادر بیٹا!.........ایک بات بتاؤ۔ کیا تم نے بھی یہ سوچا تھا کہ تمہاری ماں نے اپنی ساری جوانی
کی سلاخوں کے پیچھے کس جرم میں گزار دی؟'' انہوں نے اچانک عجیب لہجے میں پوچھا۔

''کیوں بابا! کیا تم نہیں جانتے؟.........آخر کو تم ہمارے پرانے نمک خوار ہو۔'' میں نے استہ
لہجے میں کہا۔

''ہاں.........میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہاری ماں نے ایک ناکردہ جرم میں اپنی ساری
جیل میں گزار دی.........اور تم جانتے ہو یہ کس کی سازش تھی؟ تمہاری ماں کو کس نے بے گناہ عمر
سزا میں جھونک دیا تھا۔ تو سنو، وہ یہی دو شیطان نظر حیات اور شاہ میر تھے۔''

فضل چاچا کا خیال تھا کہ میں اس بات پر چونک پڑوں گا۔ مگر مجھے تو اصل حقیقت کا علم تھا اس
میں بدستور سپاٹ نظروں سے ان کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا تھا۔

''مجھے اگرچہ اس راز سے پردہ اٹھانے کی سختی سے ممانعت کی گئی تھی لیکن شاید ہم سے یہیں غلطی
کہ تمہیں اس راز سے لاعلم رکھا گیا۔'' ان کی آواز اب مرتعش ہو رہی تھی۔

''میں سب جانتا ہوں بابا! اور یہ بھی اچھی طرح جانتا ہوں کہ مجھے تم لوگوں نے آج تک اس
راز سے کیوں لاعلم رکھا، تاکہ میں ماں اور ماموں حیدر گل کے کالے کارناموں کی اصل حقیقت
سکوں۔'' میں نے تلخی سے کہا تو فضل چاچا قدرے چونک کر میرا چہرہ تکنے لگے۔ پھر ان کے چہ

یکی سی مسکراہٹ اُبھری اور وہ متاسفانہ لہجے میں بولے۔

''یہی تو غلطی ہوئی تھی تمہارے ماموں سے کہ انہوں نے تمہاری ماں کے اصرار کے باوجود تمہیں اب
اصل حقیقت سے آگاہ نہیں کیا تھا اور بالآخر بی بی جی (ماں شبینہ) کا یہ خیال درست ثابت ہوا کہ
ن کے دشمنوں نے تم سے بڑی مکاری کے ساتھ راہ و رسم استوار کی اور آخر کار تمہارے دل و دماغ میں
بی ماں اور ماموں حیدر گل کے خلاف زہر انڈیلنے میں کامیاب ہو گئے۔''

فضل چاچا کی اب تک کی گفتگو میں یہ بات ایسی تھی جس نے ایک لمحے کو مجھے ذرا چونکنے پر مجبور کر
یا تھا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے مجھے بھی جوش آ گیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے فضل چاچا سے انکل
ناہ میر اور نظر حیات سے سنی ہوئی وہ ساری کریہہ حقیقت گوش گزار کر دی کہ کس طرح میری ماں نے
یرے باپ کا بے گناہ خون کیا تھا۔

میری بات سن کر ان کا چہرہ یکدم سرخ ہو گیا۔ آنکھوں سے شدید کرب کے ساتھ غیظ کی چنگاریاں
لنے لگیں مگر پھر دوسرے ہی لمحے متحمل لہجے میں مجھ سے بولے۔

''تم ایک پڑھے لکھے نوجوان ہو۔ کیا تمہیں یہ زیب دیتا ہے کہ تم اپنی پاک دامن ماں پر لگائے گئے
ان دونوں مردود شیطانوں کے ان گھٹیا الزامات کو سچ مان لو؟ کیا.........کیا تمہاری رگوں میں دوڑتے
ہوئے لہو نے اتنی بھی غیرت نہ کی کہ تم اصل حقیقت کا کھوج لگانے کی جستجو کرتے۔''

''فضل چاچا! کیا تم نہیں جانتے کہ میرے دل و دماغ میں تو بچپن سے ہی یہ سوال گردش کرنے لگے
تھے کہ آخر میری ماں جیل کی سلاخوں کے پیچھے اپنے کس جرم کی سزا بھگت رہی ہے؟ مگر مجھے کسی نے کچھ
بتانے کی کوشش نہیں کی بلکہ میں نے تو تم سے بھی اس سلسلے میں پوچھنا چاہا تھا لیکن تم بھی مجھے کچھ بتانے
سے قاصر ہی رہے تھے۔'' میں نے انہیں یاد دلایا۔

''تمہیں نہ بتانے کی بہت سی وجوہات تھیں۔'' فضل چاچا نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ''اگرچہ تمہاری
ماں یہی چاہتی تھی اور اکثر اپنے بھائی حیدر گل سے اصرار بھی کرتی رہتی تھی کہ تمہیں ماضی کی اس خوں
رنگ داستان سے ضرور آگاہ کر دیا جائے تاکہ تمہاری رگوں میں دوڑتے ہوئے غیرت مند باپ کا لہو جوش
مارے اور کھولتے ہوئے لاوے کی طرح دشمنوں پر آگ اور خون کی بارش کر دو۔ لیکن تمہارے ماموں
حیدر گل نے اپنی بہن کی یہ بات نہ مانی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تمہارا ماموں حیدر گل نہیں چاہتا تھا کہ ماضی
کی اس خونی داستان کے چھینٹے تمہاری زندگی اور تمہارے مستقبل پر پڑیں۔ وہ خود دشمنوں سے اپنی بہن
اور اس کے شوہر (قادر خان) کا انتقام لینا چاہتا تھا اور وہ یہ سب درونِ خانہ کر رہا تھا۔ مجھے اس کا ضرور
اعتراف تھا لیکن نادر بیٹا! یہ بھی حقیقت ہے کہ تمہارا ماموں حیدر گل تم سے بہت محبت کرتا ہے، تمہیں
بالکل اولاد کی طرح چاہتا ہے۔ اس لئے اس نے دشمنوں سے انتقام لینے کا بوجھ تمہارے سر ڈالنے کی
بجائے اپنے سر لے لیا اور ان کی خاموشی کی بھی یہی وجہ تھی کہ وہ تمہیں اس لئے اصل حقیقت سے آگاہ
نہیں کرنا چاہتے تھے تاکہ تم ایک آزاد اور خوشگوار زندگی گزار دو۔''

''اصل حقیقت کیا ہے بابا! اب تم بتاؤ۔'' میں نے سنسناتے ذہن کے ساتھ پوچھا۔

''ہاں.........اب شاید مجھے اپنی بی بی جی اور بڑے صاحب کی نافرمانی کرنا ہی پڑے گی۔ کیونکہ تم
کل عدالت میں ان کے خلاف گواہی دینے کے لئے پیش ہونے والے ہو۔''

فضل چاچا نے عجیب اسرار بھرے لہجے میں کہا اور پھر لمحے بھر کے توقف کے بعد ایک گہری سانس
خارج کرتے ہوئے بولا۔

''نادر بیٹے! یہ آج سے پچیس سال پہلے کی بات ہے، تمہارا باپ قادر خان اور تمہاری ماں شبینہ خوشی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان دنوں تمہارا ماموں حیدر گل جنگل کا چوکیدار تھا اور قادر خان ایک چھ سے ٹال کا مالک۔ انہی دنوں ان دونوں بدخصلت شیطانوں، نظر حیات اور شاہ میر نے قادر خان ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کیے۔ نظر حیات سرکاری ٹھیکے دار تھا۔ وہ جنگلاتی لکڑیوں کے ٹھیکے لیا کر اور شاہ میر گیم وارڈن (فارسٹ آفیسر) تھا۔ یہ دونوں بدخصلت غیر قانونی طور پر درختوں کی کٹائی اسے چور دروازے سے فروخت کرنے کے جرم میں ملوث تھے۔ حیدر گل کو ان کی غیر قانونی سرگرمی کے بارے میں علم تھا اور وہ اشاروں کنایوں میں اپنے بہنوئی قادر خان کو بھی ان دونوں شیطانوں دور رہنے کی نصیحت کرتا رہتا تھا مگر قادر خان ہنس کر ٹال دیا کرتا تھا۔ ایک روز نظر حیات اور شاہ میر پورے سو درختوں کی غیر قانونی کٹائی کا ارادہ کیا مگر اسے فروخت کرنے کے سلسلے میں انہوں نے خان سے اس کا ذکر کیا۔ قادر خان چونکہ ایک شریف اور ایماندار شخص تھا، اسے ان جنگلوں اور مرغزا سے بہت پیار تھا۔ اس نے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ ان دونوں کو بھی سرزنش کی کہ وہ اس خوب صو وادی کو اتنے بیش قیمت درختوں سے محروم نہ کریں۔ مگر وہ دونوں نہ مانے۔ یہ بات قادر خان بھی جا کہ وہ دونوں اپنی اس حرکت سے باز نہیں آئیں گے۔ لہٰذا اس دن سے اس نے ان کے اس ''مت غیر قانونی اقدام سے باخبر رہنے کے لئے ٹوہ لینا شروع کر دی اور بالآخر عین وقت پر اس نے جنگلات کے حکام بالا کو خبر کر دی۔ نظر حیات اور شاہ میر کے خلاف انکوائری ہوگئی مگر انہوں نے کچھ دلا کر معاملہ رفع دفع کرا دیا۔ لیکن انہوں نے قادر خان کو سزا دینے کی ٹھان لی۔ یوں بھی قادر خان ہوتے ہوئے وہ اپنی مجرمانہ سرگرمیاں انجام نہیں دے پا رہے تھے۔ ان دونوں مکاروں نے تمہا باپ قادر خان سے معافی مانگی تاکہ اس سے پھر دوستی استوار ہو سکے۔ قادر خان بھی بے چارہ سادہ انسان تھا۔ وہ ان کی چال میں آ گیا۔

پھر ایک روز ان دونوں نے قادر خان اور شبینہ کو اپنے سرکاری ریسٹ ہاؤس میں دعوت پر بلایا کھانے میں اسے زہر ملا کر دے دیا۔ پھر دونوں شیطانوں نے شبینہ کی عزت لوٹنے کی بھی کوشش کی آفرین ہے شبینہ پر کہ اس نے اپنی عزت پر آنچ تک نہ آنے دی۔ وہ ایک بہادر پہاڑی عورت تھی۔ جانے کس طرح اس کے ہاتھ ایک پھل کاٹنے والی چھری لگ گئی۔ اس نے نظر حیات کے گھونپ کوشش کی مگر ان دونوں شیطانوں نے شبینہ کی کلائی والا ہاتھ مروڑ کر اس کے ہاتھ سے وہ چھری بے پڑے قادر خان کے پیٹ میں گھونپ دی۔ شبینہ اس صدمے کے باعث وہیں بے ہوش ہوگئی اور یوں میں نظر حیات اور شاہ میر نے بڑی چالاکی کے ساتھ شبینہ کو اس کے شوہر قادر خان کے قتل کے جرم پولیس کے ہاتھوں گرفتار کروا دیا اور پولیس کو شاہ میر نے شبینہ کے خلاف شرمناک بیان دیتے گواہی دی کہ شبینہ درحقیقت نظر حیات کی طرف ملتفت تھی اور اسی کی خاطر اس نے اپنے شوہر قادر خا قتل کیا۔ شبینہ بے چاری ایسا شرمناک اور بھیانک الزام سن کر سکتے میں آ گئی اور بعد میں عدالت اسے قرار واقعی سزا سناتے ہوئے پھانسی کی سزا دی جو بعد ازاں عمر قید میں بدل گئی۔''

فضل چاچا اتنا کہہ کر خاموش ہوئے تو ان کی آنکھوں سے مسلسل آنسو جاری تھے۔ وہ پھر لرزیدہ لہجے میں بولے۔

''نادر بیٹا! یہ میرا دل ہی جانتا ہے کہ میں نے کس طرح اپنے سینے پر پتھر رکھ کر یہ خونی داستان تم سنائی ہے۔ مگر آج مجبور ہو کر مجھ کمین کی زبان پر یہ راز آ گیا لیکن میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر

ہوں کہ تمہاری ماں شبینہ ایک شریف، نیک اور شوہر پرست عورت تھی۔ مگر وہ یہ داغ آج تک نہیں بھولی ہے اور اس لرزہ خیز داستان کو مجبوراً زبان پر لانے کا میرا مقصد بھی یہی تھا کہ تمہیں اصل حقیقت کا علم ہو جائے تاکہ جو زہر ان دونوں شیطانوں نظر حیات اور شاہ میر نے تمہارے وجود میں اتارا ہے، اسے تم نکال سکو۔'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔ میں سناٹے میں آ گیا۔ میرے اندر زبردست شکست و ریخت کا طوفان اُمڈ رہا تھا۔ فضل چاچا کی بات میں جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ وہ ہمارے خاندان کا پرانا نمک خوار اور خدمت گزار تھا۔ یہ سب سن کر میری عجیب کیفیت ہوگئی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

میں نے بہ مشکل اپنے اندر کے ابال پر قابو پاتے ہوئے ایک آخری سوال فضل چاچا سے کیا۔

''بابا! کیا ان ساری باتوں کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا ہمارے پاس؟......... کیا قانون اتنا ہی اندھا تھا کہ اس نے ایک بے گناہ عورت کی جوانی کے پچیس سال جیل کی کال کوٹھڑی میں دھکیل دیئے جو پہلے ہی اپنے شوہر کے بہیمانہ قتل کے غم میں ادھ موئی ہو رہی تھی۔''

''نادر بیٹا! قانون اندھا ہوتا ہے۔'' فضل چاچا نے تلخی سے کہا۔ ''وہ صرف شواہد اور گواہوں کی سنتا ہے، مظلوم کی نہیں .... اور یہ شواہد اور گواہ حاصل کرنا نظر حیات اور شاہ میر جیسے دولت مند اور اثر و رسوخ والے شیطانوں کے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ اگرچہ بے چارے حیدر گل نے حقائق سامنے لانے کے لئے اپنی سی جدوجہد کی تھی لیکن نظر حیات اور شاہ میر جیسے درندوں کے سامنے اس بے چارے کی بھلا کیا حیثیت تھی؟ مگر پھر بھی حیدر گل نے کسی طرح تمہارے باپ قادر خان کی لاش کو قبر سے نکال کر اس کا دوبارہ پوسٹ مارٹم کروایا تھا جس سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ قادر خان کی موت پیٹ میں لگنے والے چاقو سے نہیں بلکہ زہر خورانی کی وجہ سے واقع ہوئی تھی۔ آؤ بیٹا! میں تمہیں وہ اصل رپورٹ دکھاؤں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا کہا اور میں گم صم سا ان کے عقب میں ہولیا۔

وہ مجھے ماموں حیدر گل کے کمرے میں لے کر آ گئے۔ پھر انہوں نے اپنی قمیض کی جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا، ایک قد آدم آہنی الماری کو کھولا۔ اس کے اندر ایک چوکور سیف نصب تھا۔ انہوں نے اسے کھولا اور ایک کوٹڈ کاغذ میرے حوالے کر دیا۔

یہ میڈیکل ایگزامینر کی دستخط شدہ پوسٹ مارٹم رپورٹ تھی۔ جس میں آج سے پچیس سال پرانی تاریخ بھی درج تھی۔ اس میں یہی لکھا تھا کہ قادر خان کی موت کی اصل وجہ وہ زہر تھا جو اسے کھانے میں ملا کر دیا گیا تھا اور کیونکہ خوراک میں ملے زہر کی وجہ سے فوراً ہی میرے باپ کی موت واقع ہو چکی تھی اس لئے کچھ عرصہ بعد دوبارہ لاش کو قبر سے نکالنے کے بعد بھی خوراک کے ذرات نظامِ انہضام کے معطل ہونے کی وجہ سے جوں کے توں موجود تھے۔

''بابا! پھر ماموں حیدر گل نے یہ اصل رپورٹ عدالت کے سامنے کیوں نہیں پیش کی؟'' میں نے اُلجھ کر فضل چاچا سے پوچھا۔

''حیدر گل نے ایسا ہی کیا تھا۔'' وہ بولے۔ ''لیکن اس اصل رپورٹ کو جعلی قرار دے کر جھٹلا دیا گیا اور اس کے اگلے ہی روز جس میڈیکل ایگزامینر نے یہ رپورٹ دی تھی، اسے بھی خرید لیا گیا جس نے بعد میں الٹا حیدر گل کے خلاف یہ بیان دیا تھا کہ اس کے جعلی دستخط سے یہ رپورٹ جاری کی گئی ہے۔ الٹا حیدر گل کو بھی عدالت کے ساتھ دھوکا دہی کے جرم میں تین سال قید کی سزا بھگتنا پڑی۔''

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔ میرا ذہن بری طرح سائیں سائیں کر رہا تھا۔ صورتِ حال کی یوں اچانک کایا کلپ نے میرے دماغ کو بھی الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔

فضل چاچا نے آہستگی کے ساتھ میرے ہاتھ سے وہ کوٹڈ کاغذ لے کر دوبارہ سیف میں رکھا، الماری کو بند کر کے وہ خاموش کھڑے ہو گئے۔ مجھے اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں؟ .... میں بہ وقت تمام اپنے وجود کی شکستہ عمارت کو گھسیٹتے ہوئے مسہری کے قریب لایا اور یکدم گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گیا۔

سوچوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ ایک شوریدہ سر طوفان تھا جو میرے اندر اٹھ رہا تھا۔ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس کہانی کو جھٹلاؤں؟ .... اس کہانی کو جو شاہ میر اور نظر حیات نے مجھے سنائی تھی یا پھر فضل چاچا کی کہانی کو جو اس نے پوسٹ مارٹم کی اصل رپورٹ کے ساتھ میرے گوش گزار کی تھی؟

مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں ایک بار پھر فضا میں معلق ہو گیا ہوں۔ جھوٹ اور سچ کے دو بھاری پاٹوں والی چکی میں پس رہا ہوں۔ کون سچا تھا؟ کون جھوٹا تھا؟ .... لیکن چاچا فضل جھوٹ نہیں بول سکتے تھے۔ پھر مجھے ان کی بات ماننے میں تامل کیوں تھا؟ انکل شاہ میر نے جو خونی داستان سنائی تھی، کیا وہ جھوٹی تھی؟ مگر انہوں نے تو مجھ سے خود کہا تھا کہ پہلے میں یہ داستان اپنی ماں شبینہ سے یا ماموں حیدر گل کی زبانی سنوں۔ اگر وہ جھوٹے ہوتے تو پھر کیوں وہ مجھ سے اتنے یقین کے ساتھ ایسا کہتے؟ اگر نظر حیات اور شاہ میر کو میری ماں اور ماموں حیدر گل کے خلاف ورغلانا مقصود ہوتا تو وہ اس روز ہی ایسا کر سکتے تھے جب ان لوگوں کو مجھ پر شک ہوا تھا کہ میں درونِ خانہ ان سے انتقام لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا تھا۔

''کیا سوچنے لگے نادر بیٹا.........؟'' مجھے سوچوں میں غلطاں پا کر اچانک فضل چاچا نے مجھے مخاطب کر کے پوچھا۔

''بابا! اگر یہ بات ہوتی تو پھر شاہ میر اور نظر حیات نے مجھے پہلے یہ سب کیوں نہ بتا دیا؟'' میں نے قدرے اُلجھن آمیز لہجے میں پوچھا تو ان کے چہرے پر ایک تلخ مسکراہٹ عود کر آئی اور پھر وہ اسی لہجے میں بولے۔

''وہ دونوں بہت شاطر اور مکار انسان ہیں بیٹا! وہ پہلے اپنی بات میں اس طرح وزن پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ہو سکتا ہے انہوں نے بعد میں تمہاری باتوں سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی ہو کہ تمہیں واقعی اب تک تمہاری ماں اور ماموں حیدر گل نے ماضی کے اس تلخ راز سے لاعلم رکھا ہے اور تمہارے اصرار کے باوجود جب کچھ بھی نہیں بتایا تو ان دونوں نے اپنا اعتبار قائم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے تمہیں سب سے پہلے یہ خونی راز تمہاری ماں اور ماموں حیدر گل سے ہی پوچھنے پر زور دیا۔ انہوں نے شاید اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ تمہاری ماں اور ماموں حیدر گل کسی مناسب وقت کے انتظار سے قبل تمہارے علم میں یہ خونی راز نہیں لا سکتے تھے۔''

بابا اتنا کہہ کر خاموش ہوئے تو میں نے اپنا سر تھام لیا۔ فضل چاچا نے آہستگی کے ساتھ میرے شانے پر اپنا ہاتھ دھرا اور آزردہ سی آواز میں بولے۔

''نادر بیٹا! کیا تمہیں ابھی تک میری باتوں پر یقین نہیں آیا؟ .... کیا تم نے وہ پوسٹ مارٹم کی اصل رپورٹ نہیں دیکھی؟''

''بابا! میری سمجھ میں اس وقت کچھ نہیں آ رہا۔ خدا کے لئے مجھے ابھی تنہا چھوڑ دو......... تنہا چھوڑ دو مجھے۔'' میں گہرے دکھ اور کرب کے احساس سے مغلوب ہو کر بولا اور فضل چاچا خاموشی سے سر جھکائے کمرے سے باہر نکل گئے۔ میرا دماغ اس قدر جھنجھنا گیا تھا کہ میں کوئی ایک فیصلہ کرنے سے قاصر تھا

شدید ذہنی خلجان سے گزر رہا تھا اور بری طرح اعصاب زدہ ہو رہا تھا۔ میں وہیں مسہری پر ہی دراز ہو گیا اور خود کو پُرسکون کرنے کے لئے اپنی آنکھیں موند لیں۔ اور یوں کئی گھنٹوں تک خالی الذہنی کے عالم میں مسہری پر لیٹا رہا۔

دوپہر کے کھانے پر فضل چاچا نے مجھے جگایا۔ مگر مجھے بھوک بالکل نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ اب میں ایک بار پھر اس کڑے فیصلے کے پل صراط سے گزر رہا تھا کہ مجھے اگلے دن کورٹ میں اپنی ماں اور ماموں حیدر گل کے خلاف گواہی دینی چاہئے یا نہیں؟

بالآخر میں ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

میں کورٹ میں اپنی ماں اور ماموں حیدر گل کے خلاف گواہی دینے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا۔ ہاں، کچھ بھی سہی، ان دونوں نے بہرحال معصوم اور بے گناہ صدف کے قتل کے جرم کا ارتکاب کیا تھا اور مجھے ایک ذمہ دار اور اچھے شہری ہونے کے ناتے اپنا فرض ضرور نبھانا چاہئے تھا۔ لیکن میں ایسا کیوں کرنا چاہ رہا تھا؟......... آخر مجھے فضل چاچا کی اس بات پر کیوں نہیں یقین آ رہا تھا کہ میری ماں نے مجرم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک بے گناہ اور مظلوم کی حیثیت سے اپنے ناکردہ جرم کے پچیس سال جیل کی کال کوٹھڑی میں گزار دیئے تھے۔ کیا اس میں میری خود غرضی شامل نہ تھی؟ .... کیونکہ میں شاہ میر کی اکلوتی بیٹی نگینہ سے محبت کرتا تھا۔ کیا......... کیا نگینہ کی محبت نے میرا خون اس قدر سفید کر دیا تھا کہ میں اپنی ماں اور ماموں کا دشمن بن گیا تھا اور .... اور کیا یہی سبب تھا کہ میں چاچا فضل کی بات ماننے پر تذبذب کا شکار تھا؟ یہ سوچ سوچ کر میرے دماغ کی رگیں پھٹنے کے قریب ہونے لگیں۔ میں نے بہ مشکل اپنی تباہ حال کیفیات پر قابو پاتے ہوئے خود کو تسلی دینا چاہی۔ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ میرے باپ قادر خان کا اصل قاتل کون تھا؟

یہ ایک دوسرا معاملہ تھا۔ مگر انہوں نے بہرحال صدف حیات کا خون ناحق بہایا تھا اور انہیں اس کی سزا ضرور بھگتنا چاہئے تھی۔

''لیکن کیوں.........؟'' اچانک میرے ذہن میں ایک دھماکہ ہوا۔

''انہوں نے ایسا کیوں کیا تھا؟ .... ضرور اس جرم کے پیچھے کوئی انتقامی جذبہ ہی کارفرما تھا۔ نیز یہ کہ ماں کیا واقعی اپنے ناکردہ جرم کا بدلہ نظر حیات اور شاہ میر سے لینا چاہتی تھی؟''

یہ وہ عوامل تھے جو مجھے ایک لمحے کے لئے یہ سوچنے پر مجبور کئے ہوئے تھے کہ فضل چاچا کی بات غلط نہیں ہو سکتی۔ لیکن باوجود اس کے میں اپنے فیصلے سے منحرف نہیں ہوا تھا۔

فضل چاچا جب دودھ کا گلاس میرے لئے لے کر کمرے میں آئے تو انہوں نے بہ غور میرے چہرے کی طرف دیکھا اور بولے۔

''بیٹا! تم نے آخر کیا فیصلہ کیا؟''

میں نے خاموشی سے ان کے چہرے کی طرف دیکھا، پھر دودھ کا گلاس ان کے ہاتھ سے لے کر بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور انہیں سامنے ایک کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔

''بابا! ایک بات بتاؤ، ماں کی بے گناہی اپنی جگہ لیکن کیا انہوں نے ایک معصوم لڑکی کی جان لے کر کیا ایک جرم کا ارتکاب نہیں کیا؟ جس کا میں خود چشم دید گواہ ہوں۔'' ان کے کرسی پر بیٹھتے ہی میں نے بہ غور ان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ان کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا، پھر وہ ہولے سے بولے۔

''بیٹا! تم یہ بھی تو سوچو کہ نظر حیات اور شاہ میر نے تمہارے باپ کا قتل بھی تو کیا تھا۔ اور یہی نہیں،

انہوں نے یہ جرم بڑے شرمناک الزام کے ساتھ تمہاری ماں کے سرتھوپ دیا جس کی وجہ سے اس بےچاری کو دوہرے کرب اور سزا سے گزرنا پڑا۔ جبکہ تمہارے باپ کے وہ دونوں قاتل اب تک زندہ۔ تم ایک الم نصیب عورت کے کرب کا کس طرح اندازہ لگا سکتے ہو، جس نے بے گناہ ہوتے ہوئے دوہری سزا بھگتی۔ اسے جوانی میں بیوہ کر دیا گیا۔ پھر عمر قید کی سزا بھی بھگتنا پڑی۔ اور اس کی زندگی دُکھوں اور آلام کے سپرد کرنے والے شاہانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئے پھر مجھ پر ایک جوش بھری نظر ڈالتے ہوئے پُرتپش لہجے میں بولے

"نادر! تم مجھے ایک بات بتاؤ، اگر تمہیں اس بات کا یقین واثق ہو جائے کہ نظر حیات اور شاہ میر نے تمہارے باپ کا قتل کیا اور بعد میں ایک گھناؤنی سازش کے ذریعے تمہاری ماں کو بھی ساری عمر کے لئے بے گناہ داخل زنداں کر ڈالا اور تم اپنے دشمنوں کے خلاف کوئی قانونی کارروائی بھی نہ کر سکو۔ تمہارے پاس ان کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت بھی نہ ہو تو پھر تم ایسے میں کیا کرو گے؟"

ان کی اس مدلل گفتگو پر میں ایک لمحے کو خاموش ہو کر رہ گیا۔ لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ فضل چاچا کی بات نے میرے سینے میں ایک الاؤ بھڑکا دیا تھا جس کی حدت میرے چہرے سے مترشح ہونے لگی۔ جس کی شدت بھانپ کر فضل چاچا فرطِ غیظ سے دوبارہ بولے۔

"میں جانتا ہوں بیٹا! کہ تمہاری رگوں میں ایک غیرت مند باپ کا خون ہی نہیں بلکہ ایک بہادر ماں کے دودھ کا مان اور فخر بھی گردش کر رہا ہے اور انتقام کی جو آگ تمہاری بہادر اور باہمت ماں کے سوزاں میں بھڑک رہی ہے، اس سے مذیادہ تم اس کی تپش اور جلن محسوس کرو گے۔"

"بس بابا! بس...... خدا کے لئے بس کرو۔" میں اچانک شعلوں کی طرح بھڑکتے لہجے میں تڑپ کر بولا۔ "اگر یہ سچ ثابت ہوا تو یقین کرو بابا! مجھے اپنے غیرت مند باپ کے خون ناحق کی قسم، میں اپنی بد نصیب ماں کے دودھ کا قرض ضرور چکاؤں گا اور میری زندگی کا مقصد ہی دشمنوں کا جینا محال کرنے کے سوا کچھ نہ ہوگا۔"

"یہی تمہارا ماموں حیدر گل نہیں چاہتا تھا۔"

اچانک فضل چاچا نے اسرار بھرے لہجے میں کہا۔ ان کے بشرے پر اب ایک گہری طمانیت تھی۔ میں قدرے چونک کر مستفسرانہ نظروں سے ان کا چہرہ تکنے لگا، وہ بولے۔

"ہاں نادر بیٹا! تمہاری ماں کا قرض ایک غیرت مند بھائی کے ناتے حیدر گل نے ہی اپنے ذمے لیا تھا۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ تمہیں اس انتقام کی اندھی آگ میں جھونک دے۔ اس لئے کہ وہ تمہیں حقیقی اولادوں کی طرح چاہتا ہے۔ وہ خود سارا بوجھ اپنے کاندھے پر رکھ کے تمہیں اس آگ اور خون کی جنگ سے دور رکھنا چاہتا تھا تاکہ تم اپنی امنگوں بھری زندگی میں مگن رہو اور اپنا روشن مستقبل بناؤ۔"

وہ لمحے بھر کو متوقف ہوئے پھر ایک گہری ہنکاری لے کر مزید بولے۔ "شاید ان کی خاموشی کی وجہ بھی یہی ہو۔" وہ اتنا کہہ کر چپ ہوئے تو اچانک میرے ذہن کے پردے پر بچپن سے لے کر اب تک وہ تشنہ سوالات اُبھرنے لگے جو میں ماموں حیدر گل سے ماں کے اور اس کے دردناک ماضی کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا مگر وہ ٹال دیا کرتے تھے اور میرا دھیان اپنی پڑھائی اور اپنا مستقبل بنانے پر زور دیا کرتے تھے۔ حالانکہ جب میں ان کے ساتھ ماں سے ملنے جیل جایا کرتا تھا تو میں ماں کو بھی ان سے یہ کہتے سنا تھا۔

"گل! تمہیں میرے سینے کی آتشِ انتقام سے میرے نادر کو ضرور آگاہ کرنا چاہئے۔"

لیکن مجھے یاد تھا کہ ماموں اس سلسلے میں اپنی بہن کی بات نہیں مانا کرتے تھے۔ ماں مجھے درسِ انتقام دینا چاہتی تھی لیکن ماموں حیدر گل مجھے پڑھنے لکھنے کی طرف متوجہ کئے ہوئے تھے۔ اب مجھے رفتہ رفتہ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرے اندر کی اُلجھنیں سلجھنے لگی تھیں۔ وہ گرہیں جو مجھے اندر سے اب تک بے چین کئے ہوئے تھیں، اب وہ دھیرے دھیرے کھلنے لگی تھیں۔ مجھے میرے سارے سوالوں کے جوابات نئے سرے سے ملنے لگے تھے اور جن کی سچائی اور حقانیت کی گواہی پہلی بار میرا دل بھی دے رہا تھا۔

"نادر بیٹا! سانچ کو آنچ نہیں۔ ایک وقت آئے گا کہ جب تمہیں اصل حقیقت کی سچائی کا ضرور علم ہو گا۔ لیکن میں ڈرتا ہوں بیٹا! کہیں ایسا نہ ہو کہ دیر ہو جائے۔"

فضل چاچا نے عجیب سے لرزیدہ لہجے میں کہا اور آنسو پونچھتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔ ان کے جاتے ہی جانے کیا بات تھی کہ ایکا ایکی میرا پورا وجود جیسے ہلکا پھلکا ہو گیا۔ میرے دل و دماغ سے گرد آلود خیالات کی کثافت جیسے اب خود بہ خود دُھلنے لگی تھی۔ کوئی ان جانا سا بوجھ تھا جو میرے سینے سے سرکتا ہو محسوس ہو رہا تھا۔

میرا دل اور ذہن جو کچھ دیر پہلے زبردست تضادات کا شکار تھے، اب جیسے دونوں یکجا ہونے لگے تھے اور شاید یہی سبب تھا کہ میں خود کو ایکا ایکی ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا لیکن اس کے باوجود میں نے اگلے دن کورٹ میں حاضر ہونے کا ارادہ ملتوی نہیں کیا تھا۔

❄❄❄

دوسری صبح میں جلدی جاگ گیا تھا۔ ہلکا پھلکا ناشتہ وغیرہ کر کے فارغ ہوا اور پونے گیارہ بجے میں کورٹ پہنچ گیا۔

برآمدے میں ہی مجھے شاہ میر، نظر حیات اور ان کا بیٹا کبیر احمد وکیل کے ہمراہ نظر آ گئے۔

❄❄❄

مقدمے کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ مجھے استغاثہ کی جانب سے بہ طور گواہ پیش کیا گیا تھا۔ استغاثہ نے میرے حلف اٹھانے کے بعد پوچھا۔

"نادر علی خان! تم نے وقوعے کی رات کو کیا سنا اور کیا دیکھا تھا؟"

میں نے اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پایا اور جج صاحب کی طرف دیکھ کر لہجے کو متحمل رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"جج صاحب! سامنے ملزموں کے کٹہرے میں کھڑی یہ عورت میری ماں ہے۔ شاید یہ بات آپ سب کو معلوم ہو اور معزز عدالت کے ریکارڈ میں بھی موجود ہو۔ لہٰذا میں کوئی گواہی دینے سے قبل معزز عدالت سے یہ سوال کروں گا کہ آج سے پچیس سال پہلے جب میری ماں کو اس کے شوہر کے قتل کے الزام میں سزائے موت سنائی گئی اور جو بعد میں عمر قید میں بدل دی گئی تھی، کیا وہ فیصلہ انصاف پر مبنی تھا؟"

میرے سوال پر جیسے بھری عدالت کو سانپ سونگھ گیا۔ کمرۂ عدالت میں بیٹھے شاہ میر اور نظر حیات سمیت وکیل استغاثہ کا منہ بھی حیرت سے کھل گیا۔ کیونکہ میرا یہ سوال ان کے لئے ہی نہیں، بلکہ میری ماں، ماموں حیدر گل اور وکیل صفائی کے لئے بھی سراسر غیر متوقع تھا۔

"آج سے پچیس سال پہلے کے اس کیس کا مقتولہ صدف حیات کے قتل سے کیا تعلق ہے؟" وکیل استغاثہ دانت پیس کر مجھ سے بولا۔

"تعلق ہے وکیل صاحب......!" میں نے پُرزور لہجے میں کہا۔

""تو پھر تم معزز عدالت کو بتاؤ کہ مقتولہ صدف حیات کے قتل کے اصل محرکات کیا تھے؟""
""ان محرکات پر بات کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ قادر خان مرڈر کیس پر بھی کچھ بات کی جائے
میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سنجیدگی سے کہا اور وہ تلملا کر رہ گیا۔
""یور آنر!........ میرا خیال ہے کہ گواہ نادر علی خان کا دماغ چل گیا ہے اور وہ اپنی ماں کو ملزم
والے کٹہرے میں دیکھ کر جذباتی ہو گیا ہے .... اور .... انصاف کے تقاضوں کی دھجیاں بکھیر
ہوئے جانبداری برت رہا ہے۔""
جج صاحب نے وکیل استغاثہ کو میرے جواب دینے کا پابند کیا تو وکیل استغاثہ نے اپنی پیشانی
نمودار ہوتی پسینے کی ننھی ننھی سی بوندوں کو رومال سے پونچھتے ہوئے باریک سی آواز میں کہا۔
میرے موکل نظر حیات کی بیٹی مقتولہ صدف حیات کے قتل کا سبب پرانی دشمنی ہے۔""
""میرے فاضل دوست اس پرانی دشمنی کی وضاحت کرنا پسند فرمائیں گے؟"" وکیل صفائی نے ہلکے
کے ساتھ کہا۔ وہ شاید وکیل استغاثہ کے گول مول سے جواب کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ چنانچہ اس کے سوا
پر وہ ناگوار نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر جج صاحب سے قدرے جھنجلا کر بولا۔
""می لارڈ!... وکیل صفائی، معزز عدالت کو اصل بحث سے ہٹا کر قیمتی وقت برباد کرنا چاہ رہے ہیں
""ہرگز نہیں می لارڈ!"" وکیل صفائی نے کہا۔ ""یہی وہ اہم سوال ہے جس کا جواب دینے سے وکیل
استغاثہ دانستہ کترانے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ کیونکہ آگے چل کر وہ اس کا ذکر ضرور کریں گے۔
کیس کا یہی ایک بنیادی سوال ہے جس کے جواب سے معزز عدالت کو بہت کچھ اخذ کرنے میں آ
مدد ملے گی۔ کیونکہ میں اپنی باری پر عدالت کے سامنے ایک اہم گواہ پیش کرنے والا ہوں ....
یقین ہے اس کی گواہی کے بعد بہت کچھ واضح ہو جائے گا۔""
وکیل صفائی کی اس اسرار بھری بات پر میں نے دیکھا کہ وکیل استغاثہ کچھ پریشان سا نظر آنے لگا
""استغاثہ بلا وجہ عدالت کا وقت برباد نہ کرے .... اس سوال کا جواب دے جو ان سے پوچھا
ہے۔"" معاً جج صاحب نے استغاثہ کو سرزنش کرتے ہوئے جواب دینے کا پابند کیا تو مجبوراً استغاثہ
مختصراً بتانا پڑا کہ اس کے موکل نظر حیات کو ملزمہ شبینہ، یعنی میری ماں پر اپنی بیٹی صدف حیات کے قتل
یقین کی حد تک شبہے کی وجہ یہی ہے کہ آج سے پچیس برس قبل بقول ملزمہ کے نظر حیات اور شاہ میر
اس کے شوہر قادر خان (میرے بلپ) کا قتل کرنے کے بعد یہ جرم اس کے سر تھوپ کر عمر قید کی
دلوائی تھی۔ اور یوں اب وہ (میری ماں) اپنے بھائی حیدر گل (ماموں) کے ساتھ ان سے انتقام
رہی ہے۔""
وکیل کے جواب پر میں نے ماں کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی تو وہاں شعلوں کی تپش ایک ممتا
پھوار میں بدل گئی۔ جب کہ شاہ میر اور نظر حیات کے چہرے مسخ ہو چکے تھے۔
ادھر وکیل صفائی نے اجازت لے کر اپنے گواہ کو بلا لیا۔
اس اہم گواہ کو دیکھ کر فریقین بری طرح چونک گئے۔ خود مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا
میری ماں اور ماموں حیدر گل کے حق میں اہم گواہی دینے والی وہ شخصیت نگینہ بنت شاہ میر تھی۔ حلف
اٹھانے کے بعد نگینہ نے جو بیان دیا اس نے کیس کا پانسہ ہی پلٹ دیا۔
""جج صاحب!........ نادر علی خان کو ایک گہری سازش کے ذریعے اس کی ماں کے خلاف ورغلا
اس سے متنفر کیا گیا۔ اس عورت کے دکھ کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے جج صاحب! کہ اس بے چاری کو

جوانی میں نہ صرف بیوہ کر دیا گیا بلکہ ایک جھوٹے الزام میں الٹا اسے اپنی زندگی کے پچیس سال جیل کی
کال کوٹھڑی میں گزارنے پڑے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آج سے پچیس سال پہلے اس عورت کے شوہر کا
بہیمانہ قتل اور بعد میں اس کی عزت لوٹنے کی کوشش کرنے والے دو شیطان ہیں۔ ایک نظر حیات اور دوسرا
شاہ میر جو بدقسمتی سے میرا باپ ہے۔
جج صاحب! میں نے کل رات اتفاق سے اپنے پپا شاہ میر اور ان کے دوست نظر حیات کی گفتگو سن
لی تھی جس سے مجھ پر ساری حقیقت آشکارا ہو گئی کہ انہوں نے اس عورت پر کیسا ظلم ڈھایا تھا۔ وہ صدف
حیات کے خون کا بدلہ لینے کے لئے بے تاب تھے مگر اس بات سے بھی پریشان تھے کہ ان کے پچیس
سال پرانے جرم کی قلعی نہ کھل جائے۔ نادر کی اپنی ماں کے خلاف گواہی دینے کے فیصلے نے انہیں شیر کر
دیا تھا اور وہ اپنی دانست میں یہ منصوبہ بنائے بیٹھے تھے کہ صدف کے قتل کے جرم میں ان بہن بھائیوں کو
پھانسی ہو جائے گی اور نادر کو وہ خود راستے سے ہٹا دیں گے۔""
عدالت میں گہرا سناٹا طاری تھا۔ میری نظریں نگینہ کے چہرے پر اٹک کر رہ گئی تھیں۔ اس کا چہرہ
آنسوؤں سے تر تھا۔ نگینہ نے اپنے باپ شاہ میر اور اس کے دوست نظر حیات کے مکروہ چہرے بے نقاب
کر دیئے تھے اور اس نے میری ماں پر ہی نہیں بلکہ مجھ پر بھی احسانِ عظیم کیا تھا۔ میں اب تذبذب کی
زنجیروں سے آزاد ہو گیا تھا۔ مجھے اپنے پورے وجود میں کچھ ایسا ارتعاش محسوس ہونے لگا تھا جیسے کوئی
آتش فشاں پہاڑ پھٹنے اور لاوا اُگلنے سے پہلے بری طرح لرزیدہ ہوتا ہو........ میری آنکھوں کے سامنے
اب سرخ اندھیروں کے طوفان بلاخیز کی چادر سی تن گئی تھی اور میں شاہ میر اور نظر حیات کے مکروہ چہروں کو
خاکستر کرنے کے لئے بے قرار ہو گیا۔ میری ماں کی نگاہیں میرے چہرے سے میرے اندر برپا ہونے
والے طوفانوں کا خوب اندازہ کر رہی تھیں اور میں نے اس کے لب ترساں پر ایک خنجر آمیز مسکراہٹ
رقصاں ہوتے دیکھی۔
ایسے میں وکیل استغاثہ نے لاکھ کوششیں کیں کہ عدالت صدف حیات کے کیس پر بحث کرے مگر اب
چونکہ بالکل غیر متوقع طور پر صدف حیات مرڈر کیس پچیس سال پہلے والے قادر علی خان مرڈر کیس میں
بدل چکا تھا اس لئے عدالت نے نگینہ کی گواہی کے نتیجے میں فوری طور پر پچیس سال پہلے والے قادر علی
خان مرڈر کیس کی فائل کھولنے کے احکامات جاری کر دیئے اور ساتھ ہی شاہ میر اور نظر حیات کو نظر بند
کرنے کے علاوہ نئے سرے سے قادر علی خان مروجہ کیس کی تفتیش کسی دوسرے پولیس آفیسر، آئی او کو
سونپ دی۔
عدالت کے برخواست ہوتے ہی میں کٹہرے سے نکلا اور سیدھا ماں اور ماموں کی طرف لپکا۔ میں
بے اختیار ماں سے جا کر لپٹ گیا اور اس کے مہربان اور ممتا بھرے سینے پر سر رکھ کر زار و قطار رو دیا۔
""میرے لعل!........ اپنے آنسو اچھی طرح بہا لے۔ کیونکہ اس کے بعد تجھے فولاد میں ڈھلنا ہے۔""
میری مجبور اور چھلنی ساعتوں میں ماں کی پُر جوش آواز اُبھری اور یہ آواز جذبات سے سراسر عاری تھی۔
""ماں!........ مجھے معاف کر دے ماں! کہ میں نا سمجھی میں اپنے دشمنوں
کے بہکاوے میں آ گیا۔"" میں نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ اس کے بعد میں ماموں حیدر گل کے کاندھے
پر سر رکھ کر رو دیا۔ وہ ہولے ہولے میرا کاندھا تھپتھپانے لگے۔
""ٹیک اِٹ ایزی مسٹر نادر علی خان!........ حوصلہ رکھو........ تمہاری حاضر دماغی کے باعث مقدمے
کی نوعیت ہی تبدیل ہو گئی ہے۔""

یہ وکیلِ صفائی تھا۔ اتنے میں پولیس میری ماں اور ماموں کو کمرۂ عدالت سے باہر کھڑی موبائل
طرف لے گئی۔ اسی اثناء میں اعظم خان بھی میرے قریب آ گیا۔ اس کے چہرے پر گہری طمانیت
مسرت کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے بھی میرے لئے توصیفی کلمات ادا کئے تو معاً وکیل صفائی جن کا
مجھے بعد میں ایڈووکیٹ حامد ہمدانی معلوم ہوا تھا، بولے۔

''ارے بھئی .... اصل تعریف کی حق دار تو وہ بہادر لڑکی نگینہ ہے۔ مگر وہ اچانک کہاں چلی گئی
ان کی بات پر میری بے قرار متلاشی نظروں نے نگینہ کو دیکھنا چاہا لیکن وہ کہیں نظر نہ آئی۔ میں پریشان
بے چین سا ہو گیا اور بے اختیار دیوانوں کی طرح نگینہ!......... نگینہ! پکارتا ہوا اسے ہر سمت ڈھونڈنے
مگر وہ مجھے کہیں بھی نظر نہ آئی۔ ایڈووکیٹ حامد ہمدانی نے مجھے اپنا وزیٹنگ کارڈ دیتے ہوئے مجھ
رابطے میں رہنے کی تلقین کی پھر قریب کھڑے اعظم خان سے گفتگو کے بعد وہ وہاں سے رخصت ہو گئے
میں کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔ اعظم خان نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ہولے سے کہا۔

''نادر میاں!......... حوصلہ رکھو۔ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ آؤ میرے ساتھ۔''

''انکل! میری جیپ کھڑی ہے۔'' میں نے ہولے سے کہا۔

''اوکم آن یار!......... وہ کہیں نہیں جائے گی۔ تم چابیاں دو مجھے۔'' وہ بے تکلفی سے بولے اور
نے انہیں اپنی جیپ کی چابیاں پکڑا دیں۔ انہوں نے اپنے ڈرائیور کو مخاطب کیا۔ ''حضور بخش!''

''سر.........!'' وہ مؤدبانہ لہجے میں بولا۔

''یہ چابیاں لو اور نادر میاں کی جیپ سنبھالو۔''

''بہتر......... بہتر.........'' وہ یہ کہہ کر احاطے میں کھڑی میری جیپ کی طرف بڑھ گیا۔ پھر اعظم
مجھے اپنی لمبی چوڑی نئے ماڈل کی چمچماتی کار کی طرف لے گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر اس نے
اپنے برابر والی سیٹ پر بیٹھنے کو کہا۔

میرے سوار ہونے پر ان کے دونوں گن بردار محافظ بھی عقبی سیٹ پر براجمان ہو گئے۔ اعظم خان
کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی اور میں نگینہ کے خیالوں میں کھو گیا۔

❋❋❋

پنڈی کے معروف چاندنی چوک سے گزر کر کار اب مری جانے والی سڑک پر دوڑنے لگی۔ کوئی نو
گھنٹے کی تیز رفتار نان اسٹاپ ڈرائیونگ کے بعد کار مال روڈ پر آ گئی جس کے انتہائی سرے پر ہمارا ''
ہے۔ وہاں سے گزرنے کے بعد اب کار چیڑ اور صنوبر کے درختوں میں گھری ہوئی سڑک پر مضافات
جانب دوڑ رہی تھی۔

یہاں سے لگ بھگ مزید پندرہ بیس منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد کار ایک محل نما بلند و بالا کوٹھی
خوش رنگ پھولوں سے لدے ہوئے احاطے میں داخل ہو گئی۔

کار کے احاطے میں رکتے ہی چار پانچ خدمت گار دوڑتے ہوئے ہماری طرف لپکے۔ دو افراد
انتہائی مؤدبانہ مستعدی کے ساتھ ہماری طرف کے دروازے کھول دیئے۔ میں اور اعظم خان
اترے۔ اس پختہ روش کے دائیں بائیں خوب صورت لان تھا۔ وہاں دو ہینڈسم سے نوعمر لڑکے نیٹ لگا
بیڈمنٹن کھیل رہے تھے۔ انہوں نے اعظم خان کو دیکھ کر دور سے ہی با آواز بلند ''ہائے ڈیڈ!'' کہا اور
اعظم خان نے بھی ہاتھ کے اشارے سے ان کا جواب دیتے ہوئے ایک فضائی بوسہ ان کی طرف اچھال
دیا۔ اس کے بعد وہ مجھے لئے کوٹھی کے وسطی محرابی دروازے سے اندر شاہانہ کمرے میں لے آئے۔

یہاں کی سجاوٹ قابلِ دید تھی۔ کیا کچھ نہ تھا یہاں۔ علاقے کی مناسبت سے یہاں کے لوگ شکار
کے بہت رسیا تھے۔ خال خال بنگلے اور کوٹھیاں ہی ایسی ملیں گی جہاں بھُس بھرے درندوں کے اصل
ایستادہ'' مجسمے، کھالیں اور سر کمروں کے گوشوں اور دیواروں میں نظر نہ آئیں۔ یہاں بھی آرائش کے
لئے اسی طرح کے مجسمے استعمال کئے گئے تھے۔

ہم دبیز قالین پر چلتے ہوئے آمنے سامنے دو صوفوں پر براجمان ہو گئے۔ اسی وقت ایک تیس، پینتیس
سالہ دبنگ سی خاتون نمودار ہوئیں۔ انہوں نے ہلکی جامنی رنگ کی ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی۔ ساڑھی
کے بارڈر اور فال پر سنہرے تاروں سے کڑھائی کی ہوئی تھی اور یہ تار خالص سونے کے تھے۔ اس کا
قریباً آدھا سراپا بیش قیمت جیولری سے لدا ہوا تھا۔ وہ درمیانے قد کی ایک فربہی مائل عورت تھی۔
صورت تو واجبی سی تھی مگر رنگت میدے جیسی صاف اور شفاف۔

وہ شاید ان کی بیگم تھیں۔ میں احتراماً کھڑا ہوا اور دھیرے سے اُنہیں آداب کہا۔ وہ میرے سلام کا
جواب اپنے سر کے ہولے سے اشارے سے دے کر اعظم خان کے قریب بیٹھ گئیں۔

اعظم خان نے ان سے میرا مختصراً تعارف کروایا۔ اس کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''نادر خان! ہم تمہارے ماموں حیدر گل کے بہت پرانے دوست ہیں۔ اس لئے انہوں نے مجھ سے
آج تک کچھ نہیں چھپایا۔ حتیٰ کہ تمہارے سلسلے میں بھی وہ اکثر مجھے بتاتے رہتے تھے۔ وہ بے چارہ تمہاری
غلط فہمی کی وجہ سے بہت پریشان رہتا ہے۔ چلو، شکر ہے آج تمہارا دل بھی اپنی ماں اور ماموں کی طرف
سے صاف ہو گیا۔ بہرحال!'' وہ اتنا کہہ کر ذرا تھمے، پھر پُرخیال لہجے میں مجھ سے دوبارہ گویا ہوئے۔

''نادر میاں! شاہ میر اور نظر حیات بہت زہریلے سانپ ہیں۔ شکر ہے کہ تم ان کے زہر سے بچ گئے۔
لیکن آج کے بعد وہ کھل کر تم تینوں کے خلاف میدان میں پھن کاڑھے اُتر آئیں گے۔ تمہیں اب ان
سے حد درجہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

''جی انکل!......... میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے ہولے سے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ہمیں ایڈووکیٹ حامد ہمدانی صاحب کے ساتھ بھی ایک نشست رکھنی ہو گی۔'' وہ بولے۔ ''اور میرا
تمہیں یہاں لانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ تم ہمارے ساتھ رابطے میں رہ سکو۔''

''انکل! وہ......... کیا اب......... ماں اور ماموں کی صدف حیات مرڈر کیس سے بریت ممکن ہو سکے
گی؟'' میں نے کسی خیال کے تحت اچانک ان سے پوچھا۔ وہ میری بات پر ایک گہری اور پُرسوچ ہنکاری
بھرتے ہوئے پہلو بدل کر بولے۔

''ہاں......... تمہارے باپ کے مرڈر کیس کے اب نئے سرے سے کھلنے اور تفتیش کرنے پر ہو سکتا
ہے نہ صرف تمہاری ماں اور حیدر گل بری ہو جائیں بلکہ شاہ میر اور نظر حیات کو بھی سزا ہو جائے۔''

میں چپ رہا۔ اس دوران ملازمین درمیان میں رکھی ایک شیشے کی ٹاپ والی میز پر اشیائے خورد و نوش
سرو کر چکے تھے۔ میرا کچھ کھانے پینے کو دل نہیں کر رہا تھا لیکن خان صاحب کے اصرار پر میں نے ایک
بسکٹ اور چائے کے کپ پر اکتفا کیا اور پھر جانے کی اجازت چاہی۔ پھر میں اپنی جیپ میں وہاں سے
''گرین لاج'' کی طرف روانہ ہوا۔

دورانِ ڈرائیونگ میں نے موبائل پر نگینہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ شاید اس کے
موبائل کی بیٹری ڈاؤن تھی یا پھر اس نے موبائل آف کر رکھا تھا۔
مگر کیوں؟......... میں نے اُلجھن آمیز حیرت سے سوچا۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ کیا نگینہ نے

ایسا دانستہ کیا تھا؟ .... وہ مجھ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی؟ مگر کیوں؟ .... اس "کیا جواب میرے پاس نہ تھا۔ عدالت نے اس کے پپا شاہ میر اور نظر حیات کو مقدمے کی پیروی تک ن کرنے کے احکامات جاری کر رکھے تھے۔ یوں بھی میرا اب اپنے دشمنوں کے پاس جانے کا کوئی ج بنتا تھا کہ میں کم از کم نگینہ کی ہی خیر خیریت معلوم کر لیتا۔ مجھے یہ بات رہ رہ کر پریشان کر رہی تھی کے اپنے پپا اور کبیر کے ڈیڈی نظر حیات کے خلاف گواہی دینے کے بعد کن جاں گسل حالات سے تھی۔ نگینہ نے سچ کی خاطر اور اپنے ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر بہت بڑا قدم اٹھایا تھا۔

کیا اس میں ہماری محبت کا بھی دخل تھا؟ نیز اب شاہ میر کا اپنی بیٹی سے کیا برتاؤ ہو سکتا تھا؟ والے واقعے کے بعد یقیناً دونوں باپ بیٹی کے درمیان ضرور ایک نفرت کی خلیج حائل ہو چکی ہوگی نگینہ........ وہ کیسی تھی؟ اپنے باپ کے کالے کرتوتوں سے واقف ہونے کے بعد وہ اب کون سے سے دوچار تھی، مجھے اس کا بہ خوبی اندازہ تھا۔ اچانک میں نے نگینہ سے ٹیلی فون پر رابطہ کرنے کا سوچا شاہ میر کی رہائش گاہ کے نمبر پنچ کرنے کے بعد میں نے دھڑکتے دل سے موبائل اپنے کان رکھا تھا۔ میرا ایک ہاتھ اسٹیئرنگ پر تھا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ ہر بیل پر میرا دل یکبارگی زور دھڑکتا۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ فون نگینہ ہی اُٹھاتی۔

"ہیلو........!" معاً ایک بھاری آواز اُبھری۔ جسے سن کر میری رگوں میں ایک لمحے کے لئے غیظ کی سنسناہٹیں اُبھری تھیں۔ یہ شاہ میر کی آواز تھی۔ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کچھ کہے بغیر موبائل آف کر دیا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ میرے موبائل کی رِنگ بج اُٹھی۔ میں ڈسپلے پر نمبر دیکھا اور چونک اُٹھا۔ سی ایل آئی پر نگینہ کے گھر کا نمبر آ رہا تھا۔

'کیا میرے موبائل کا نمبر سی ایل آئی پر دیکھنے کے بعد نگینہ نے مجھ سے رابطہ کرنا چاہا تھا؟' میں سوچا اور پھر دھڑکتے دل کے ساتھ موبائل کان سے لگا کر "ہیلو" کہا۔

"نادر علی خان! تمہاری ذہانت کی داد دینے پر مجبور ہوں میں۔" معاً شاہ میر کی پھنکارتی ہوئی اُبھری اور میرے پورے وجود میں عجیب سی سنسنی دوڑ گئی۔ "تم نے میری ہی چال مجھ پر اُلٹ د میری بیٹی نگینہ کو بھی ہم سے متنفر کر ڈالا۔"

"شاہ میر! تم نے ابھی میری چالیں دیکھی ہی کہاں ہیں؟ حقیقت جاننے کے بعد دیکھنا........ اب تمہارا اور تمہاری شیطانی جوڑی نظر حیات کا کیا حشر کرتا ہوں۔"

"تم ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے........ سنپولئے!"

"مجھے سنپولیا نہیں، اب اژدھا کہو۔" میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "تم نے دیکھ لیا نا شاہ میر سانچ کو آنچ نہیں۔ تم مجھے میری مظلوم ماں اور ماموں حیدر گل کے خلاف ورغلانے کی مذموم کوشش رہے تھے مگر دیکھ لو، کاتبِ تقدیر نے ایک ایک سچ کھول کر رکھ دیا۔ تمہاری اکلوتی بیٹی، تمہارے ما کالے کارنامے سے آگاہ ہو چکی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نے بھری عدالت میں تمہارے اور نظر جیسے شیطان مردود کے مکروہ چہروں کو بھی بے نقاب کر ڈالا۔"

"نگینہ میری اولاد ہے۔ اس نے جو کچھ کیا تمہاری محبت کے جوش میں کیا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ کا نشہ جب اس کے دل و دماغ سے اتر جائے گا تو وہ سب کچھ بھول جائے گی۔"

"کسی خوش فہمی میں مت رہنا شاہ میر!" میں نے دانت بھینچ کر زہریلے طنز سے کہا۔ "ہماری محبت نہیں، ایک جذبہ ہے۔ ایک سچا جذبہ ہے........ اس حقیقت کو تسلیم کر ہی لو اب شاہ میر! کہ تمہاری اپنی

نے تمہارے مکروہ چہرے سے شرافت کا نقاب نوچ ڈالا ہے۔"

"میں تمہیں اچھی طرح دیکھ لوں گا نادر خان!" وہ میرے بہ دستور جچی تلی جوابی گفتگو سے زچ ہو کر غراتے ہوئے بولا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ میرے ہونٹوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

میں گرین لاج پہنچا۔ فضل چاچا وہاں موجود نہیں تھے۔ ان کی بیوی سکینہ سے معلوم ہوا کہ آج صبح سورج نکلتے ہی وہ بھی ایک مسافر ویگن میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے تھے۔ مگر کہاں، شہر یا پنڈی؟ یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ تاہم مجھے ذرا حیرت تو ہوئی لیکن اس وقت میں خود نگینہ کی طرف سے پریشان تھا۔ اس لئے میں سیدھا اپنے کمرے میں آ گیا........ میرا جب تک نگینہ سے رابطہ نہیں ہوتا، مجھے چین نصیب نہیں ہونا تھا۔ یہی سبب تھا کہ لحہ بہ لحہ میری بے چینی اب پریشان کن حد تک فزوں تر ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے اس بات پر شدید پچھتاوا بھی ہونے لگا کہ کاش میں وہیں عدالت ختم ہوتے ہی اس سے جا ملتا، اس کا شکریہ ادا کرتا۔ مگر نگینہ نے مجھے خود سے ملنے کا ایک ذرا بھی تو موقع نہیں دیا تھا۔ میں جب ماں اور ماموں سے گلے مل رہا تھا تو وہ شاید اس دوران وہاں سے اچانک غائب ہو چکی تھی۔ خود مجھے اس کے یوں مجھ سے ملے بغیر اچانک وہاں سے چلے جانے پر حیرت سی ہو رہی تھی۔

'آخر اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ کیا ایسا اس نے دانستہ کیا تھا؟ .... کیا وہ خود ہی مجھ سے ملنا نہیں چاہتی تھی؟ .... مگر کیوں؟ ....' کئی سوالیہ نشان نوکیلے آنکڑوں کی طرح میرے دل و دماغ میں اٹک کر رہ گئے تھے۔

سکینہ نے مجھے دوپہر کے کھانے کا پوچھا۔ میں نے انکار کر دیا۔ میری بھوک بالکل اُڑ چکی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، نگینہ سے ملنے کے سلسلے میں میری بے چینی اور پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ میرا نگینہ سے ملنا اشد ضروری تھا۔ حالات کے اچانک غیر متوقع انداز میں پلٹا کھانے کی وجہ سے نگینہ اور میری ملاقاتوں کا سلسلہ منقطع ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اب پہلے والے حالات نہیں رہے تھے کہ میں جب چاہتا اس سے ملنے پنڈی پہنچ جاتا۔

اچانک مجھے باہر کسی گاڑی کے انجن کی گھر گھراہٹ سنائی دی۔ میں چونک کر اُٹھا۔ معاً مجھے ایک تیز نسوانی چیخ سنائی دی۔ یہ چیخ فضل چاچا کی بیوی سکینہ کی تھی۔ میرا پورا وجود سنسنا اٹھا۔ پھر میں ابھی سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ معاً میرے کمرے کا دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور میں یکدم جیسے سناٹے میں آ گیا۔ وہ تین اسلحہ بدست نقاب پوش تھے۔ ان میں ایک نسبتاً قدرے مضبوط تن و توش کا قد آور شخص تھا۔

"کون ہو تم لوگ؟" دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے درشت لہجے میں پوچھا تو مذکورہ قد آور شخص سیاہ نقاب کے عقب سے مجھے اپنی سرخ انگارا آنکھوں سے گھورتا ہوا میری طرف بڑھا۔ پھر میرے بالکل قریب پہنچ کر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے خوفناک پستول کی سیاہ نال میری پیشانی سے لگا دی اور ساتھ ہی غراتے ہوئے بولا۔

"نگینہ کہاں ہے........؟"

اس کے سوال پر میرے دماغ میں بری طرح سائیں سائیں ہونے لگی۔



"نگینہ .... کہاں ہے؟"

نقاب پوش نے سرسراتی ہوئی آواز میں اپنا سوال دہرایا۔ پستول کے ٹریگر پر اس کی انگلی کا دباؤ بڑھ لگا تھا۔ پستول کے ٹریگر پر رکھی اس کی انگلی سفید ہو رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ ٹریگر دبانے کا ارادہ کر چکا تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اس صورت حال پر کپکپا اُٹھتا۔ مگر میرا دماغ اپنی جگہ پر تھا۔ مجھے تو اس کے غراتے ہوئے سوال نے نہ جانے کن عمیق گہرائیوں میں لا پٹخا تھا کہ مجھے کچھ بھی اور سنائی نہیں دے رہا تھا۔ بس صرف ایک گونج تھی کہ "نگینہ .... کہاں ہے .... کہاں ہے؟" کا سوال میرے روئیں روئیں میں شور مچاتا ہوا گزرتا رہا تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ میری یہ کیفیت کب تک رہی۔ میں تو تب چونکا، جب اس نے غرا کر اپنا دہرایا۔

"مم .... مجھے نہیں معلوم نگینہ کہاں ہے؟" میں نے گویا عالم خود فراموشی میں اسے جواب دیا تھا۔ اس کے ساتھ غیر ارادی طور پر میرے لبوں سے بھی ایک سوال پھسل گیا۔ "مگر تم لوگ کون ہو؟"

اس وقت تک شاید میرے حواس کچھ بجا ہو چکے تھے۔ اس لئے خود بخود میرے لہجے میں عجیب درشتی اُتر آئی تھی۔ وہ میری بدلتی ہوئی کیفیات پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ میں نے دیکھا، نقاب کے پیچھے جھانکتی اس کی سرد آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے بے یقینی سی لہرائی تھی گویا اسے مجھ سے اس جواب کی توقع نہ رہی ہو یا شاید میرا سخت لہجہ اس کے لئے باعث حیرت بنا ہو۔ بہرحال کچھ بھی ہو، اس وقت میں اپنے پورے ہوش و حواس میں واپس آ چکا تھا۔

اس نے مجھے کوئی جواب نہ دیا بلکہ بدستور غیظ اور نفرت بھری نظروں سے مجھے گھورتا رہا۔ پستول لبلبی پر اس کی انگلی کا دباؤ بدستور موجود تھا۔ اس کا مطلب تھا اسے گولی چلانے میں ذرا بھی تامل نہیں تھا۔

"تم دونوں یہاں کی اچھی طرح تلاشی لو۔" وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر غرایا۔ "وہ لڑکی یہیں کہیں ہوگی۔"

اس کا حکم پاتے ہی اس کے دونوں گرگے حرکت میں آ گئے۔ ایک کا رخ ملحقہ کمرے کی طرف جبکہ دوسرے نے کمرے سے باہر نکلنے والے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے تھے۔

مجھے اپنی حالت کا بخوبی ادراک تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ نقاب پوش پستول کا ٹریگر دبانے میں ذرا نہیں ہچکچائے گا۔ اس کے باوجود میں غصے کی شدت کے سبب چلا اُٹھا۔

"آخر تم لوگ ہو کون؟ اور اس تمام کارروائی کا کیا مقصد ہے؟"

"مقصد ...." نقاب پوش استہزائیہ انداز میں بولا۔ "مقصد تو تم اچھی طرح سمجھ گئے ہو۔" بدستور استہزا آمیز تھا۔ تاہم آنکھوں کی سفاکی اور سرد مہری برقرار رہی تھی۔ "رہی یہ بات کہ ہم کون ہیں؟

یہ جاننا تمہارے لئے قطعاً ضروری نہیں۔ اور ہاں، اب تم اپنی چونچ کو بند ہی رکھو تو بہتر ہوگا۔" وہ پُراعتماد دکھائی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

یہ لوگ نظر حیات اور شاہ میر کے مشترکہ "فرستادے" بھی ہو سکتے تھے۔ کیونکہ فی زمانہ یہی دو افراد میرے مقابل تھے۔ جبکہ کبیر "سیلی" میں میرے حصے آیا تھا۔

قرائن سے پتہ چلتا تھا کہ نگینہ نے ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے پپا کے خلاف عدالت میں "بھاری بھرکم" گواہی دینے کے بعد اس کے محل نما آشیانے کے بجائے کہیں اور کا رخ کیا تھا۔ وہ کسی نازک اندام سبک مزاج لڑکی کی بجائے خود میرے دشمنوں کے لئے لوہے کا چنا ثابت ہو رہی تھی۔ جس نے بہرکیف اپنے قاتل باپ کے ہاں رہنا مناسب نہ سمجھا ہو۔ اگر میرا یہ قیاس درست تھا تو نگینہ جہاں بھی تھی، محفوظ تھی۔ مگر اس کا مجھ سے رابطہ نہ تھا .... یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے محبوب کے باپ کے قاتل کی بیٹی کے روپ میں میرے سامنے نہ آنا چاہتی ہو۔

تھوڑی ہی دیر بعد نقاب پوش کے دونوں ساتھی قدرے ہانپتے ہوئے باری باری آ پہنچے اور ہاتھ ملتے ہوئے بولے۔

"ہم نے گھر کا کونا کونا چھان مارا ہے .... مگر لڑکی یہاں نہیں ہے۔"

"ایک کونا رہ گیا۔" میں نے بے اختیار کہا۔

"کون سا کونا؟" نقاب پوش پستول لہرا کر دانت پیستے ہوئے بولا۔ وہ جھنجلاہٹ کے مارے میرا طنز سمجھ نہ پایا تھا۔

"کمرے کا اٹیچ باتھ۔" میں نے کہا۔

تینوں نے غیر ارادی طور پر ملحقہ باتھ روم کی طرف دیکھا۔ ان میں سے دو کا رخ اسی طرف ہو گیا تھا۔ میرے لئے اتنا ہی موقع کافی تھا۔ پستول بردار نقاب پوش کی لمحاتی توجہ ہٹتے ہی میں نے اس کے پستول پر ہاتھ ڈال دیا۔ دوسرے ہی لمحے پستول میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے بغیر کسی نشانے کے اضطراری طور پر ایک فائر کر دیا۔ فائر کی آواز گونجتے ہی جو جہاں تھا، وہیں کھڑا رہ گیا۔ نقاب پوش اپنے نہتا ہونے پر حیران و پریشان کھڑا تھا۔ اس کے دونوں ساتھی ایک ساتھ یوں کھوئے تھے گویا ان کے پیروں میں پہیے لگے ہوں۔ ان کے سان و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ میں اس قدر پھرتی سے ان کی بازی پلٹ دوں گا۔

"چلو شاباش ....! اپنے چہروں سے نقاب اتار دو۔" میں نے پستول کی نال ان کے سامنے لہراتے ہوئے انہیں پچکارا۔ وہ تینوں متذبذب نظر آنے لگے۔

حالات کا تقاضا تھا کہ میں فاسٹ ایکشن کے عمل پر کاربند رہوں۔ میں نے یکے بعد دیگرے تین فائر، ایک گولی فی ران کے حساب سے داغ دیئے۔

وہ تینوں نقاب پوش کریہہ انگیز چیخوں کے ساتھ ڈھیتے چلے گئے۔ اور پھر اپنی زخمی رانوں کو پکڑ کر کراہنے لگے۔

"نہ .... نہ .... رونے چلانے کی ضرورت نہیں۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔" میں نے ان کی پُراذیت "ہائے .... ہائے" پر زہریلے لہجے میں کہا۔

"نقاب اتارتے ہو یا پھر تمہاری دوسری ٹانگوں کا بھی یہی حشر کروں؟" میں نے آخر میں دانت پیس

کرخوں ناک لہجے میں کہا اور ان تینوں نے خوف زدہ انداز میں فوراً ہی اپنے اپنے نقاب اتار دیئے۔

میں نے بہ غور تینوں کے چہروں کو دیکھا اور ہونٹ بھینچ لئے۔ وہ تینوں میرے لئے قطعی اجنبی تھے۔

''تمہارے مکھڑے اتنے خوب صورت تو نہیں ہیں کہ انہیں نقاب سے چھپایا جاتا۔'' میں نے مصنوعی مایوسی سے کہا۔''چلو، اب یہ بھی بتا دو کہ تمہیں کس نے یہاں بھیجا ہے؟ .... نظر حیات نے شاہ میر نے؟ .... یا پھر دونوں نے؟''

وہ پھر متردد نظر آنے لگے۔ میں نے ایک بار پھر فاسٹ ایکشن کے مقولے پر عمل کرنا چاہا اور پھر سے ان کی دوسری ٹانگ کا نشانہ لینے لگا تو وہ تینوں ہی بیک وقت ہاتھ کے کپکپاتے ہوئے اشارے چلا کر بولے۔

''نن .... نہیں .... گگ .... گولی مت چلانا .... مت چلانا گولی۔''

میرے ہونٹوں پر سفاک مسکراہٹ تیر گئی۔ میں نے فلمی اسٹائل میں پستول کی نال کو پھونک مار

''صرف تم میرے سوالوں کا جواب دیتے جاؤ۔ ہاں، اب بولو .... رکنا مت۔'' میں نے گروہ پوش سے دانت پیس کر کہا۔

''بب .... بات دراصل یہ ہے کہ .... مم .... مجھے نگینہ .... بہت اچھی لگتی ہے ...... لل .... لیکن وہ مجھے بالکل گھاس نہیں ڈالتی۔ آج دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر مم ..... میں ا اٹھانے کے لئے یہاں آیا تھا۔'' وہ اتنا کہہ کر چپ ہو گیا۔

میرے حلق سے ایک سنسناتا ہوا ہنکارا خارج ہوا اور اس کے سفید جھوٹ نے میری نس نس میں آ اتار دی۔ وہ اس وقت بھی مکاری دکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے دشمن جتنے خطرناک تھے، اس زیادہ مکار تھے۔ اور ''مکاری'' سے بڑھ کر کوئی خطرناک ہتھیار نہیں ہو سکتا۔

''ذز .... ذز ....'' یکے بعد دیگرے میں نے دو بار ٹریگر دبایا تھا۔

دونوں گولیاں ایک ایک کر کے اس کے بازوؤں میں پیوست ہو گئیں اور وہ دہری تہری تکلیف باعث فرش پر بڑا بری طرح کراہنے لگا۔ میں نے اس کی طرف سے توجہ ہٹا دی۔ مطلب یہ کہ اب اس سے کچھ پوچھنا نہیں چاہتا تھا۔

''تم دونوں نے اپنے گروہ کا حشر دیکھ لیا .... اور یقیناً میرا سوال بھی سن لیا ہوگا۔ تم صحیح جواب گے یا پھر ....''

میں باقی دو نقاب پوشوں سے مخاطب ہو کر غرایا۔ ان دونوں کی آنکھوں میں وحشتیں کروٹیں لے تھیں۔ وہ پہلے ہی اپنے سامنے ایک ایسے چھلاوے کو دیکھے ہوئے تھے جس نے نہ جانے کس طرح صفت انداز میں بازی ہی پلٹ دی تھی۔

''کیا میں اپنا سوال دہراؤں؟'' کوئی جواب نہ پا کر میں حلق کے بل دھاڑا اور پستول کو خطرنا انداز میں حرکت دی۔

''نن .... نہیں۔ ہم .... ابھی بتاتے ہیں۔'' انہوں نے خوف سے گھگیاتے ہوئے بیک آ جواب دیا۔''ہمیں نظر حیات اور اس کے بیٹے کبیر نے یہاں بھیجا تھا۔''

''صرف نظر حیات اینڈ سن نے .... یا اس کی کمپنی .... یعنی شاہ میر بھی اس سازش شریک تھا؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

''یہ حکم تمہیں کب اور کہاں دیا گیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''اپنے بنگلے پر .... آج ہی، لگ بھگ کوئی ایک گھنٹہ پہلے۔'' اس نے جواب دیا۔

''تم تینوں کون ہو؟ .... کیا اس کے پالتو کتے یا کرائے کے ٹٹو؟''

''ہمارا کوئی قصور نہیں ہے جی .... ہم تو حکم کے غلام ہیں۔ آپ حکم کرو تو ہم آپ کا حکم مان لیں گے۔'' ان میں سے ایک نے تکلیف کی شدت اور خوف کی زیادتی کے باعث لرزتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''تو گویا تم تینوں کو کرائے پر حاصل کیا گیا ہے؟ .... میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم تینوں نظر حیات اینڈ شاہ میر کمپنی کے مشترکہ طور پر پالتو کتے ہو؟''

''او نہیں جی۔ اب آپ ہماری جان چھوڑو۔ پہلے ہی اتنے زخمی ہو گئے ہیں۔ اب تو ہمیں کرایہ بھی نہیں ملے گا۔'' پہلے والا مایوسی سے منہ پھلا کر بولا۔

میں نے ایک لمحہ سوچا، پھر انہیں جانے کی اجازت دے دی۔ انہوں نے لڑھکتے پڑتے اپنے تیسرے ساتھی کو سنبھالا جو شاید تکلیف کے باعث نیم بے ہوش ہو چکا تھا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔

سکینہ بے ہوش تھی۔ ذرا دیر بعد فضل چاچا نے آ کر انہیں سنبھال لیا تھا۔ اس وقت تک میں ان تینوں کرائے کے بدمعاش ٹائپ ٹٹوؤں کو روانہ کر چکا تھا۔ فضل چاچا کو میں نے مختصراً سارے واقعے سے آگاہ کر دیا۔

میں نے اسی وقت نظر حیات کا فون نمبر ملایا۔ میری خوش قسمتی کہ فون خود اس نے وصول کیا۔ اس کے نخوت بھرے ''ہیلو'' کہنے سے ہی میں اس کی آواز پہچان چکا تھا لہٰذا ایک ایک لفظ چبا کر گویا انگارے اُگلتے ہوئے اس سے بولا۔

''نظر حیات! ہر گزرتے لمحے کے ساتھ تمہاری ناپاک اور شرم ناک زندگی کا دائرہ حیات تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ یہ دائرہ عنقریب پھندا بن کر تمہاری گردن دبوچنے والا ہے۔''

دوسری طرف چند ثانیے کے لئے سناٹا چھا گیا۔ پھر نظر حیات کی درشت آواز اُبھری۔

''کون ہو تم ....؟'' صاف محسوس ہوتا تھا، تجاہل عارفانہ سے کام لیا گیا ہے۔ کیونکہ آواز سے خفیف کپکپاہٹ واضح طور پر ظاہر ہو رہی تھی۔

''تمہارے لئے یہ بات بہت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے نظر حیات! کہ تم مجھے اب تک پہچان نہیں پائے ہو۔ کیا میرے لہجے کی نفرت آگیں تپش اور آواز میں آتش انتقام کی تمتماہٹ کہیں محسوس نہیں ہو رہی؟ کیا .... کیا تمہیں میرے لہجے کی آگ سے ایک ایسے آشفتہ سر انسان کی دیرینہ تڑپ کا اندازہ نہیں ہو رہا جو اپنے باپ کے قاتلوں اور اپنی ماں کو بے گناہ عمر قید کی سزا دلوانے والوں کو عبرت ناک موت سے ہمکنار کرنے کے لئے بے چین و مضطرب ہے؟''

میرے آتشیں لہجے سے شعلے پھوٹ رہے تھے۔ میرا پورا وجود جلن کا شکار تھا۔ کنپٹیاں سلگ رہی تھیں اور رگوں میں لہو جیسے لاوے کی طرح کھول رہا تھا۔

''او .... آئی سی .... تو گویا ہمارے لئے ایک آتش فشاں تیار ہو چکا ہے۔'' اس بار دوسری جانب سے نظر حیات کی تضحیک آمیز زہریلی آواز اُبھری۔

''میرے سینے میں پورا آتش فشانی جزیرہ آباد ہے کتے! .... بہت جلد تو اور تیرا یار غار شاہ میر اپنے بھیانک انجام کو پہنچنے والے ہیں۔'' میں دانت بھینچ کر غرایا۔

"اپنی بکواس بند کرو .... اور یہ بتاؤ تم نے نگینہ کو کیوں یرغمال بنا رکھا ہے؟" نظر حیات نے کر
آواز میں پوچھا۔

"تمہارے کرائے کے تینوں ٹٹو میرے پاس آئے تھے اور منہ کی کھا کر لوٹ چکے ہیں۔ کسی او
بھیجو۔ یا پھر خود آ جاؤ۔" میں نے بھنا کر کہا تو دوسری طرف نظر حیات کو ایک بھیانک خاموشی نے جی
نگل لیا۔

"کیوں .... سانپ سونگھ گیا اس خوش کن اطلاع پر؟" میں دل ہی دل میں اس کی بے بسی او
خاموشی پر پھنکارا تو نظر حیات نے شاید جل بھن کر رابطہ ہی منقطع کر ڈالا۔

میں نے بھی ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا اور چند ثانیے اپنے اندر کے ابال پر قابو پاتا رہا۔ اسی کوشش کے
دوران مجھے نگینہ کا خیال آیا اور میرے اعصاب فکرمندی کے باعث چٹخنے لگے۔ اس کی گمشدگی میرے لئے
پریشانی کا سبب تھی۔ لمحاتی غور کے بعد میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی شاہ میر کا نمبر ملا لیا۔ گھریلو ملازم نے
فون ریسیو کیا تھا۔

"شاہ میر سے بات کراؤ۔" میں نے گمبھیر آواز میں کہا۔

"آپ کون؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"میں .... نادر علی خان بول رہا ہوں۔" میں نے اپنا نام بتایا تو مجھے ایک منٹ ہولڈ کرنے کو
گیا۔ پھر ذرا ہی دیر بعد شاہ میر کی چنگھاڑتی ہوئی آواز ابھری۔ وہ غراتے ہوئے مجھ سے مخاطب تھا۔

"تم .... تم .... میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا نادر!"

"یہ میرا تم پر ادھار ہے .... اور میں اسے بہت جلد اتارنے کے لئے بے چین ہوں۔" میں نے
بھی اسی لہجے میں ترکی بہ ترکی جواب دیا تو وہ بری طرح بھنا گیا اور دانت پیس کر بولا۔

"تم نے میری بیٹی نگینہ کو اغواء کرنے کی جرأت کیسے کی؟"

"یہی سوال پوچھنے کے لئے میں نے فون کیا تھا .... کیا واقعی نگینہ .... ؟"

اس نے میری بات کاٹ دی اور بولا۔ "انجان بننے کی کوشش فضول ہے .... بہت جلد پولیس تم
تک پہنچنے والی ہے۔ وہ خود ہی میری بیٹی کو برآمد کر لے گی۔" یہ کہہ کر فون بند کر دیا گیا۔

میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔ اس کے بعد میں اپنا میگا ریوالور اور چند فاضل راؤنڈ ساتھ لے
گرین لاج سے نکل گیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں آندھی طوفان کی طرح جیپ دوڑاتا ہوا راولپنڈی کی طرف
بڑھا چلا جا رہا تھا۔

نگینہ کی پراسرار گمشدگی میرے لئے پریشانی کا سبب تھا۔ ہو سکتا تھا کہ اس میں بھی نظر حیات اور شا
میر کی کوئی چال ہو۔ یہ تو طے تھا کہ نگینہ کے منظر سے ہٹنے میں ان کا مفاد پوشیدہ تھا۔ کیونکہ صدف مر
کیس اب حیرت ناک طور پر قادر علی خان مرڈر کیس میں تبدیل ہو چکا تھا اور یہ انہونی محض نگینہ کی ح
گوئی کے باعث ممکن ہو سکی تھی۔ یہی سبب تھا کہ "الٹی ہو گئیں سب تدبیریں" کے مصداق میرے دشم
خود اپنے ہی بچھائے ہوئے جال میں پھنس گئے تھے۔

عدالت نے اگرچہ فوری طور پر نظر حیات اور شاہ میر کو نظر بند کرنے کے احکام جاری کر دیئے مگر م
ان ابلیس صفت بھیڑیوں کی خونخوار اور مکارانہ چالوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ انہوں نے پہلا کام ی
کیا ہو گا کہ نگینہ کو غائب کر کے اس کا الزام میرے سر تھوپ دیا جائے۔ مگر نگینہ کو بازیاب کروانے کی خاط
تین بدمعاشوں کی جارحانہ آمد میرے اس مفروضے کی سراسر نفی کر رہی تھی۔ یعنی اگر نگینہ کی پراسرار

اچانک گمشدگی میں شاہ میر وغیرہ کا ہاتھ تھا تو وہ اس طرح اپنے کرائے کے بدمعاشوں کی خدمات نہ لیتے
بلکہ براہ راست پولیس کو میرے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کرتے۔ لہٰذا میرے ذہن میں ایک ہی
بات آئی تھی کہ نگینہ کی پراسرار گمشدگی خود نگینہ کا اپنا ہی عمل ہو۔ یعنی وہ خود ہی خاموشی کے ساتھ کہیں
روپوش ہو چکی ہو۔ مگر کہاں؟ یہ جاننے کے لئے جتنا میں بے قرار تھا، شاید اس کا باپ بھی نہ ہو گا۔

میرا خیال تھا کہ اس الجھی ہوئی صورت حال پر گفتگو اور مشاورت کے لئے حامد صمدانی ایڈووکیٹ
سے ملنا ضروری تھا۔ لہٰذا میرا رخ انہی کی طرف تھا۔

میں اپنی جیپ آندھی طوفان کی طرح اڑاتا ہوا سیدھا ایڈووکیٹ حامد صمدانی کی رہائش گاہ پر پہنچا۔

"خیریت تو ہے؟ .... کیسے آنا ہوا؟" انہوں نے بغور میرے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

جواباً میں نے ساری صورتِ حال سے انہیں اچھی طرح آگاہ کر دیا جسے سن کر ان کی پیشانی پر بھی تشویش
آمیز سلوٹیں ابھر آئیں۔ چند ثانیوں کی پرسوچ خاموشی کے بعد وہ بولے۔

"میرا خیال تو یہی ہے کہ نگینہ اپنی مرضی سے ہی کسی سہیلی کی طرف چلی گئی ہے۔"

"میں آپ کی رائے سے سو فیصد متفق ہوں۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ان کی تائید کی۔
"لیکن ...." میں کچھ کہتے کہتے رکا تو وہ اپنے ذہن میں ابھرنے والے کسی فوری خیال کے تحت بولے۔

"کیا تمہیں نگینہ کی قریبی سہیلیوں کے بارے میں علم ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس کا تو مجھے کوئی خاص علم نہیں۔ پھر بھی میں کوشش کر کے
کچھ لیتا ہوں۔"

"تم سے ایک فاش غلطی ہو گئی نادر میاں!" وہ اچانک بولے تو میں نے چونک کر پوچھا۔

"کیسی غلطی انکل؟"

"تم نے جب ان تینوں بدمعاشوں پر قابو پا لیا تھا تو انہیں چھوڑنا نہیں تھا بلکہ پولیس کے حوالے کر
دینا تھا۔ اس طرح "قادر علی مرڈر کیس" اور بھی مضبوط ہو سکتا تھا۔"

"یہ بات میرے ذہن میں بھی تھی انکل!" میں نے کہا۔ "مگر اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ کیونکہ وہ تینوں
لٹو کتے نہیں بلکہ کرائے پر "ہائر" کئے گئے تھے جو اپنا بیان بھی بدل سکتے تھے اور لاتعلقی ظاہر کرنے میں
بھی دیر نہ لگاتے۔"

"ہاں .... تمہاری یہ بات تو درست ہے۔" بالآخر انہیں میری بات سے متفق ہونا پڑا۔

"نظر حیات اور شاہ میر نے نگینہ کے اغواء کا الزام میرے سر تھوپ کر میرے خلاف پولیس کارروائی
کی دھمکی بھی دی ہے۔"

"پولیس تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ محض ضابطے کی کارروائی کرے گی اور خالی ہاتھ لوٹ جائے گی۔ مگر
ہاں!........." وہ اتنا کہہ کر ذرا رکے پھر فکرمندی سے بولے۔ "اس سے پہلے کہ نگینہ اپنے قاتل باپ اور
نظر حیات کے ہتھے چڑھ جائے، تمہارا اس تک پہنچنا ضروری ہے۔ کیونکہ جس طرح اس نے اچانک
کورٹ میں اس دن اپنے باپ کے خلاف گواہی دیتے ہوئے ان کے ارادوں اور منصوبوں کو ملیامیٹ کر
دیا تھا، اسی طرح یہ بازی ہمارے ہاتھوں سے نکل بھی سکتی ہے۔"

میں ان کی بات کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ شاہ میر اور نظر حیات آج سے پچیس برس پہلے والے اپنے
سنگین جرم پر پردہ ڈالنے کے لئے نگینہ کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ باپ ہونے کے ناتے اگرچہ شاہ
میر اپنی بیٹی نگینہ کا منہ بند کرنے کے لئے دوسرا طریقہ اپنا سکتا تھا۔ مگر نظر حیات کے سلسلے میں کچھ نہیں کہا

جا سکتا تھا کہ وہ کمینہ خدانخواستہ نگینہ کے خلاف کوئی سفاکانہ قدم بھی اٹھا سکتا تھا۔

میں مزید تھوڑی دیر حامد صمدانی صاحب کے ساتھ تبادلہ خیال کرنے کے بعد وہاں سے چلا آیا۔

اب نگینہ کو میں نے بہرطور تلاش کرنا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنوں کے ہاتھوں ذہنی اور جسمانی اذیتوں کا شکار ہو۔

اچانک میرے موبائل کی بیل گنگنائی۔ میں اس وقت چاندنی چوک کو پیچھے چھوڑتے ہوئے پنڈی آرٹ گیلری کے سامنے والی سڑک سے گزر رہا تھا۔ موبائل کا بزر سنتے ہی میں نے اپنی پینٹ کی بیلٹ سے بندھے چرمی کیس سے موبائل نکال کر کان سے لگالیا۔ دوسری جانب سے منیجر مشتاق گوندل کی گھبرائی ہوئی متوحش اواز اُبھری۔

''سر جی!.........وہ.........آ.........آگ.........ٹال کو آگ لگ گئی ہے۔''

میں سناٹے میں آ گیا۔ ''کیسے آگ لگی؟.........کب؟'' میں نے پوچھا اور جیپ سڑک کے کنارے کھڑی کر دی۔

''وہ بس.........سر جی! دن دیہاڑے اچانک کچھ نقاب پوش لمبی سی وین میں آئے تھے۔'' وہ بوکھلائی ہوئی آواز میں بتانے لگا۔ ''انہوں نے.........اسلحے کے زور پر ہم سب کو باہر نکال دیا۔ پھر اپنے ساتھ لائے ہوئے پٹرول کے گیلن لکڑیوں پر چھڑک کر انہیں دیا سلائی دکھا دی۔ اس کے بعد وہ ہمیں خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے کر لوٹ گئے۔ بڑے آدمی تھے جی وہ بدمعاش۔'' وہ آخر میں اپنا مخصوص تکیہ کلام ادا کئے بنا نہ رہ سکا تھا۔

''تم نے فائر بریگیڈ والوں کو اطلاع دی؟'' میں نے دانت بھینچ کر پوچھا۔

''جی ہاں.........وہ تو میں پہلے ہی دے چکا ہوں۔''

''مردان شاہ کہاں تھا؟''

''وہ اس وقت تو وہیں تھا۔ مگر جب ڈھاٹا پوش اپنا کام کر چکنے کے بعد فرار ہو گئے، تو وہ بھی غائب ہو چکا تھا۔ شاید وہ ڈر کر بھاگ گیا تھا۔ بڑا آدمی تھا جی۔''

''بکواس بند کرو۔ میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے موبائل آف کیا اور جیپ ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

پنڈی سے مری کا فاصلہ 64 کلومیٹر یعنی 40 میل تھا۔ یہ چالیس میل کا فاصلہ میں نے تیز رفتار نان اسٹاپ ڈرائیونگ کرتے ہوئے صرف نصف گھنٹے میں طے کیا تھا۔ کشمیر پوائنٹ سے میں نے جیپ مال روڈ کی طرف موڑی اور مری کی خوب صورت ترین عمارت یعنی سنگ مرمر کے بنے G.P.O کے سامنے سے گزر کر مال روڈ پر ڈال دی۔ پھر ''باغِ شہیداں'' سے شارٹ کٹ لیتا ہوا سیدھا اپنے ٹال کے نزدیک پہنچا تو دور ہی سے آگ اور دھوئیں کے کثیف بادل دکھائی دے گئے۔

وہاں فائر بریگیڈ کا عملہ آگ بجھانے کی سرتوڑ کوشش میں سرگرم نظر آیا۔ اس کے علاوہ دیگر لوگوں کا جم غفیر بھی نظر آ رہا تھا۔ قریب پہنچ کر میں نے بریک لگائے۔ جیپ کے ٹائر زور سے چرچرائے اور ایک جھٹکے سے رک گئی۔ میں جلدی سے نیچے اُترا اور اپنے ٹال سے بلند ہوتے بھیانک شعلوں اور کثیف دھوئیں کو دیکھنے لگا۔

اپنے ٹال کو جلتا دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ میرے دشمنوں نے مجھے مالی طور پر ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ کیونکہ ٹال میں بیش قیمت لکڑی بھاری مقدار میں موجود تھی، جو سب جل کر راکھ

ہو رہی تھی۔ لکڑی جس قدر بیش قیمت ہوتی ہے، آگ بھی اسی قدر جلد پکڑتی ہے۔ اور جب تک آگ اچھی طرح نگل نہ لے، بجھنے کا نام نہیں لیتی۔

آگ بڑے بڑے شہتیروں کو تیزی سے نگل رہی تھی۔ فائر بریگیڈ کا عملہ آگ بجھانے کی مقدور بھر کوششوں میں لگا ہوا تھا۔

میں جیسے سکتے کے عالم میں کھڑا تھا۔ پھر ٹال کے حیران پریشان مزدور مجھے دیکھ کر میری طرف لپکے۔ ان میں منیجر مشتاق گوندل بھی تھا۔ اس کا چہرہ بھی اُترا ہوا تھا۔ بلکہ میں نے اس کی آنکھوں میں نمی بھی محسوس کی تھی۔ اس سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔

''مردان شاہ کدھر ہے؟'' میں نے بہ آواز بلند پوچھا تو کوئی بھی اس کے بارے میں نہ بتا سکا۔ میں نے ہونٹ بھینچ لئے۔

میں نے مزدوروں کو وہیں موجود رہنے کی تاکید کی اور منیجر مشتاق کو لئے سیدھا تھانے پہنچا۔

ایس۔ایچ۔او کی نشست پر ایک موٹا، بھاری توند والا سب انسپکٹر سالم پٹھور کو بھنبھوڑنے میں مصروف تھا۔ میز پر رکھی ایک پلیٹ میں بچی کھچی چچوڑی ہوئی ہڈیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اسے اس حال میں دیکھ کر میری طبیعت ویسے بھی مکدر ہونے لگی تھی۔

''میں رپورٹ لکھوانے آیا ہوں۔'' اس کی مستفسرانہ نظروں کے جواب میں، میں نے کہا۔ پھر خود پر قابو پانے میں ناکامی کے بعد بے اختیار بولا۔ ''انسپکٹر صاحب! براہِ کرم.........ذرا ہڈیاں چبانا بند کریں تو کچھ توجہ ادھر بھی ہو جائے۔''

اس کا ڈیوٹی کے دوران اس کراہت آمیز انداز میں کھانا مجھے ویسے ہی بری طرح کھل گیا تھا۔ تاہم میرے طنزیہ جملوں کی کاٹ نے اس خرانٹ سے سب انسپکٹر کی چولیں ضرور ہلا کر رکھ دی تھیں۔ کیونکہ دوسرے ہی لمحے اس کے ''سپڑ.........سپڑ'' چلتے ہوئے منہ کو بریک لگ گئے تھے۔

''کیا بات ہے.........؟'' انداز لٹھ مار تھا۔

''رپورٹ لکھوانی تھی میں نے.........میرے ٹال کو کسی نے آگ لگا دی ہے۔'' میں نے کہا۔

''باہر برآمدے میں ہی محرر موجود ہے۔ جا کر پہلے این سی کٹوا دو۔'' وہ بے پرواہی سے بولا اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے بچے کھچے پٹھور کو ایک بار پھر بھنبھوڑنے میں مصروف ہو گیا۔ میں غصے سے بل کھانے لگا۔

''بڑے آدمی ہیں جی.........'' میرے ساتھ کھڑے منیجر مشتاق گوندل نے ہولے سے بڑبڑا کر کہا۔ وہ اپنی عادت سے مجبور تھا۔

''میں جانتا ہوں کہ میرے ٹال کو کن لوگوں نے آگ لگائی ہے۔ اس لئے میں سیدھا آپ ہی کے پاس آیا تھا تا کہ آپ ملزموں کے خلاف فوری کارروائی کریں۔'' میں نے تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے مگر قدرے بلند آواز میں کہا تو وہ بھی بھنائے ہوئے لہجے میں بولا

''اچھا.........اچھا، سمجھ گیا.........زیادہ اونچا بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بیٹھو۔'' وہ نہ بھی کہتا تو میں خود بیٹھنے والا تھا۔

اس نے گھنٹی بجا کر اردلی کو ہیڈ محرر کو اندر بھیجنے کا حکم دیا۔ پھر بہ غور میرے چہرے کا جائزہ لینے کے بعد میرے ساتھ بیٹھے منیجر مشتاق کی طرف دیکھا اور پھر میرا نام پوچھا۔

''نادر علی خان۔''

''یہ کون ہے؟''

"یہ میرا منیجر ہے۔ مشتاق گوندل۔"
"تمہیں کس پر شبہ ہے؟"
"مجھے شبہ نہیں، سو فیصد یقین ہے انسپکٹر صاحب! کہ یہ بزدلانہ حرکت کن لوگوں کی ہو سکتی ہے۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔
"ہاں تو بھئی، ان کے نام بھی ہوں گے .... بتاؤ، کون تھے وہ؟"
میں نے اس کے استفسار پر کہا۔ "نظر حیات اور شاہ میر۔"
وہ یہ نام سن کر یوں اچھلا جیسے میز کے نیچے سے اسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔
"ہیں .... یہ کن لوگوں کے نام لے رہے ہو تم؟" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔
"کیوں .... کیا انہیں گرفتار کرنے پر پابندی عائد ہے؟" میرا لہجہ پھر طنزیہ ہونے لگا۔
"ان دونوں کے تو پہلے ہی کورٹ نے نظر بند کرنے کے احکامات جاری کر رکھے ہیں۔" وہ میرے کٹیلے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔
صدف مرڈر اور بعد میں قادر علی خان مرڈر کیس کے حوالے سے میری شہرت محکمہ پولیس میں پہنچ چکی تھی اور چونکہ شہر کے ایک بڑے بیورو کریٹ اعظم خان صاحب کا میری پشت پر ہاتھ تھا اس لئے خرانٹ انسپکٹر نے مجھ سے نہ صرف بات کرنے کی زحمت گوارا کی تھی بلکہ میرے کڑوے کسیلے جملوں کو پی گیا تھا۔
بہرطور میں نے اس کے جواب میں طنزیہ حیرت سے کہا۔ "تو کیا ان دونوں کو اپنی رہائش گاہ محدود کر کے آپ لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ کوئی جرم نہیں کر سکتے؟"
"خیر .... ایسی بات بھی نہیں۔" وہ ہچر مچر کرنے کے سے انداز میں بولا۔ "دیکھئے نادر صاحب میرا مشورہ مانیں، آپ نامعلوم شرپسندوں کے خلاف پرچہ کٹوا دیں .... میں آج سے مجرموں تلاش کا کام شروع کر دیتا ہوں۔ ان کے گرفتار ہوتے ہی آپ کے مطلوبہ مخالفین بھی خود بہ خود دھر جائیں گے۔ یہی اصول اور طریقہ کار بہتر رہے گا۔"
اس نے آخر میں سمجھانے والے انداز میں مجھ سے کہا تو میں نے کچھ سوچ کر سر ہلا دیا۔ تاہم بولا
"ٹھیک ہے .... آپ اپنی ضابطے کی کارروائی نمٹانے کی کوشش کریں۔ میں بھی اپنے طور پر کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔"
نصف گھنٹے بعد میں تھانے کی عمارت سے نکلا اور اپنی جیپ میں آ بیٹھا۔
"سر جی! .... میرا بھی آپ کی طرح سو فیصد یہی خیال ہے کہ یہ کام نظر حیات اور شاہ میر کے آدمیوں نے ہی کیا ہوگا۔" میں نے جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے آگے بڑھائی تو میرے برابر والی نشست پر بیٹھے ہوئے منیجر مشتاق گوندل نے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔
میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور جیپ دوبارہ اپنے ٹال کی طرف موڑ دی۔
فائر بریگیڈ کا عملہ آگ بجھانے میں "کامیاب" ہو چکا تھا۔ کیونکہ سب کچھ جل کر خاکستر ہو جانے کے بعد آگ کا ایندھن جو ختم ہو چکا تھا۔
پورا ٹال شمشان گھاٹ کا منظر پیش کر رہا تھا .... ہر طرف سلگتے اور دھواں اُگلتے کوئلوں کے سوا کچھ نہ تھا۔
میں نے حسرت و یاس سے یہ سارا منظر دیکھا۔ میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ یہ ٹال میرے

مرحوم باپ قادر علی خان کی نشانی تھا، جس نے یقیناً بہت محنت و مشقت کر کے اس کاروبار کو فروغ دیا تھا۔ ان کے بعد ماموں حیدر گل نے اسے سنبھالا تھا۔ ان کے جیل جانے کے بعد اس کی باگ ڈور میرے ہاتھوں میں آ گئی تھی مگر .... افسوس! اپنے دشمن کی زد سے میں اپنے اس اہم ذریعہ معاش کو بھی نہ بچا سکا تھا۔
اچانک مجھے مردان شاہ کا خیال آیا۔ وہ میرا ایک پرانا اور وفادار ملازم تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ یوں ان وقت پر اچانک کہاں غائب ہو گیا تھا۔ جبکہ اس کے باقی سارے ساتھی مزدور میرے شریکِ غم بنے وہاں موجود تھے۔ وہ بھی بہت غمگین اور مضطرب نظر آ رہے تھے۔ یقیناً ٹال کی تباہی کو وہ اپنا نقصان سمجھ اور جان رہے تھے۔
"سر جی! .... اب کیا ہوگا؟ یہ بے چارے مزدور تو بے روزگار ہو جائیں گے۔" میرے قریب کھڑے منیجر مشتاق نے مسکین چہرے کے ساتھ کہا۔ دیگر مزدوروں کی یاس بھری نظریں میرے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں مگر اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، ان میں سے ایک مزدور نے منیجر مشتاق سے کہا۔
"منیجر صاحب! اللہ ہمارے نادر میاں کو زندگی دے۔ آپ ہماری فکر نہ کریں، ہم تو مزدور ہیں۔ کہیں نہیں سے کما کر گزارا کر لیں گے۔"
"منیجر .... !" میں نے مشتاق کو پکارا۔
"جی، سر جی!" وہ ایک دم بولا۔
"ان سارے مزدوروں کا حساب کتاب اسی طرح چلتا رہے گا۔ انہیں تنخواہ کے علاوہ روز کا مزدوری ملنا چاہئے۔ مجھ سے چیک بک پر سائن لے لو۔"
میرے اس فیصلے پر سارے مزدور بہ آواز بلند بولے۔ "ہرگز نہیں چھوٹے مالک! .... ہم اتنے خود غرض نہیں ہیں جو بغیر کام کئے اپنی جیب بھریں۔ ہمیں شرمندہ نہ کریں۔ ہم ہر دکھ اور مشکل وقت میں آپ کے ساتھ ہیں۔"
ان کی بات سن کر مجھ پر جذبات انگیز رقت طاری ہونے لگی۔ پھر میں نے مردان شاہ کا پوچھا تو سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔
"وہ بڑے مزے سے اپنے گھر بیٹھا ہوگا۔ اور کہاں ہو سکتا ہے وہ۔" منیجر مشتاق نے کڑوے لہجے میں کہا تو ایک جوان مزدور نے اس کی تردید کرتے ہوئے پُراعتماد لہجے میں کہا۔
"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے منیجر صاحب! شاہ صاحب اتنے خود غرض نہیں ہیں۔ وہ ضرور ان بدمعاشوں کے تعاقب میں گئے ہوں گے۔" میں اس کی بات پر چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ خیال میرے ذہن میں نہیں آیا تھا مگر مجھے اس کی بات غلط محسوس نہیں ہوئی تھی۔
"ٹھیک ہے .... مردان شاہ تم میں سے کسی کو ملے تو اسے میرے پاس "گرین لاج" بھیج دینا۔" میں نے ان سے کہا۔ پھر منیجر مشتاق سے مخاطب ہو کر بولا۔ "مشتاق! تم کل صبح میرے پاس پہنچ جانا۔"
اس نے فوراً اثبات میں اپنا سر ہلا دیا اور میں دوبارہ جیپ میں سوار ہو گیا۔ میرا ذہن اس وقت مختلف سوچوں اور سمتوں میں بٹا ہوا تھا۔ نگینہ کی پراسرار گمشدگی، ٹال کی تباہی، پھر نگینہ کی طرف سے یہ پریشانی کہ نظر حیات اور کبیر کے علاوہ خود اس کا باپ شاہ میر بھی بڑی شد و مد کے ساتھ اس کی تلاش میں جتے ہوئے تھے۔ یہ امر میرے لئے مزید تشویش کا باعث تھا۔ کیونکہ ان دونوں بلکہ بہ شمول کبیر تینوں کا نگینہ کو ڈھونڈنے کا مقصد نیک نہ تھا۔

میں ''گرین لاج'' کی طرف محوِ سفر تھا کہ معاً موبائل پر مجھ سے فضل چاچا نے رابطہ کیا۔ وہ
پریشان تھے۔ بولے۔

''نادر بیٹا! یہاں گرین لاج میں ابھی تھوڑی دیر پہلے پولیس آئی تھی۔ وہ تمہیں گرفتار کرنا چاہتی تھی

میں اس اطلاع پر چونکے بغیر بولا۔ ''بے فکر رہو بابا! وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ پولیس نے نگ
تلاش کے سلسلے میں گرین لاج کا ضرور چپہ چپہ چھان مارا ہوگا۔''

''بیٹا! انہیں شبہ تو یہی تھا کہ نگینہ ادھر ہی ہوگی۔'' فضل چاچا نے کہا۔ ''مگر نادر بیٹا! بات صرف
یہی نہیں ہے۔'' وہ آخر میں اسرار بھرے لہجے میں بولے اور اس بار میں چونکے بنا نہ رہ سکا۔

''کیا مطلب چاچا؟ پھر اور کیا بات تھی؟'' میں نے پوچھا تو وہ پُرتشویش لہجے میں بولے۔

''پولیس باوجود اس کے تمہیں ہر صورت میں گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ ان کے پاس تمہاری گرفتا
باقاعدہ وارنٹ ہے۔ ویسے تم کہاں سے بول رہے ہو بیٹا؟''

انہوں نے آخر میں پوچھا۔ اور جب میں نے انہیں یہ بتایا کہ میں کچھ ہی دیر میں گرین لاج
والا ہوں تو وہ یکدم متوحش لہجے میں بولے۔

''نن...... نہیں بیٹا! ابھی یہاں مت آنا۔ تت...... تم کہیں دور نکل جاؤ۔ مجھے حالات اچھے
نہیں آرہے۔''

فضل چاچا کے پُرتشویش لہجے پر میں بھی پریشان سا ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جب
پولیس کو ''گرین لاج'' میں نگینہ کا سراغ نہیں مل سکا تھا تو پھر وہ مجھے کیوں گرفتار کرنا چاہتی تھی؟ اس
مطلب تھا کہ بات صرف نگینہ کو بازیاب کرنے کی حد تک ہی محدود نہ تھی، کوئی ایسی بات ضرور تھی جو
سے بھی بڑھ کر اہم تھی اور وہ کیا بات تھی؟ ...... میری چھٹی حس خطرے کا الارم بجانے لگی۔ میں
یکدم جیپ کو بریک لگا دیے۔ ٹائر زور سے چرچرائے اور ویرانے میں جیپ کھڑی ہو گئی۔ میں نے رس
واچ میں وقت دیکھا۔ ساڑھے پانچ کا وقت تھا۔ سڑک کے دو رویہ چیڑ اور صنوبر کے گھنے درختوں پر
کی کجلاہٹ اُترنے لگی تھی۔

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے جانے اور انجانے دشمن مجھ سے زیادہ تیزی کے ساتھ میر
خلاف کوئی جال بننے کی کوشش میں مصروف تھے۔ ایسا جال جو مجھے ہر طرح سے گرفت میں لے کر
بس کر ڈالے۔ نگینہ کا پُراسرار ''غیاب''، ٹال کی تباہی اور اب پولیس کا میری تلاش میں گرین لاج
آنا...... معاملہ میری سوچ سے بھی زیادہ گمبھیر ہونے لگا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں
کدھر جاؤں۔ ''گرین لاج'' کے سوا میرا اور کہیں بھی ٹھکانہ نہ تھا۔

میرے پاس سوچنے کے لئے بہت کم وقت تھا۔

مری کے یہ خواب ناک اور ہرے بھرے جنگل رات ہوتے ہی ہیبت ناک اندھیاروں میں
جاتے تھے۔ چھ بجے کے بعد ٹریفک تقریباً معطل ہو جاتی تھی۔ کوئی اِکا دُکا پرائیویٹ گاڑی کبھی
دیکھنے میں آجاتی تو اور بات تھی۔ ورنہ تو آس پاس کا پورا ماحول خوفناک جنگل میں بدل جاتا تھا۔

بالآخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ سر دست میرا ''گرین لاج'' جانا مناسب نہ تھا۔ مگر پھر کہاں جاؤ
ابھی میں اس ادھیڑ بُن میں مصروف تھا کہ اچانک مجھے اپنے عقب میں کسی گاڑی کی روشنی دکھائی دی
بیک ویو مرر سے نظریں ہٹا کر میں نے ڈرائیونگ سیٹ کی کھڑکی سے سر نکال کر عقب میں دیکھا تو اس
اکلوتی روشنی سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کوئی موٹر بائیک تھی جس کی لحہ بہ لحہ قریب آتی ہوئی مخص

آواز اب واضح سنائی دینے لگی تھی۔ میں اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا۔

بائیک میرے قریب سے گزری۔ اور پھر یکلخت اس کے پچھلے ٹائر کی چرچراہٹ اُبھری۔ میں چونک
گیا اور آنکھیں سکیڑ کر بہ غور بائیک سوار کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ بائیک سوار واپس موڑ کاٹ کر میری
جیپ کی طرف ہی بڑھنے لگا اور پھر جیسے ہی وہ ذرا قریب آیا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ مردان شاہ تھا۔
میں جلدی سے دروازہ کھول کر جیپ سے اُتر آیا۔ وہ بھی مجھے پہچان چکا تھا اور اپنی موٹر سائیکل سے
اُتر کر وہ میری طرف لپکا۔

''سلام صاحب!'' اس نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔

''وعلیکم السلام!'' میں نے مختصر جواب دیا۔ پھر تیزی سے پوچھا۔ ''مردان شاہ! تم ...... خیریت تو
ہے؟...... کہاں جا رہے تھے اس وقت؟''

''میں آپ ہی کی طرف آرہا تھا...... گرین لاج۔'' اس نے بھی تیز لہجے میں جواب دیا۔

''کیوں...... خیریت؟'' میں نے ٹھٹکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

وہ پُرجوش ہونے کے ساتھ ساتھ خاصا مضطرب بھی نظر آرہا تھا۔ ''مجھے آپ کا پیغام ملا تھا۔'' وہ اپنے
مضطربانہ جوش کو دباتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اگر مجھے آپ کا پیغام نہیں ملتا، تب بھی میں آپ کے پاس
ضرور آتا۔ مگر سر!...... آپ...... آپ یہاں، اس ویرانے میں کیوں کھڑے تھے؟''

''پہلے تم بتاؤ۔ کیا بات ہے؟'' میں نے بے چینی سے پوچھا۔

''سر! گرین لاج چلتے ہیں۔ وہاں میں ساری تفصیل آپ کو بتا دوں گا۔''

''نہیں، میرا وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے۔ تم بتاؤ، کوئی خاص بات ہے؟'' میں نے گرین لاج نہ جانے
کی وجہ فی الوقت اسے نہیں بتائی اور اس نے بھی اصرار نہیں کیا۔

''سس...... سر جی! آپ...... آپ کی...... جان کو بہت شدید خطرہ ہے۔'' وہ تیزی سے بولا۔

''بات کیا ہے آخر؟...... کچھ بتاؤ تو۔''

ابھی مردان شاہ نے کوئی جواب دینے کے لئے لب کھولے ہی تھے کہ اچانک ہمارے عقب سے کسی
گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنی نمودار ہوئی۔ وہ کوئی گاڑی تھی جو تیز رفتاری سے اسی طرف آرہی تھی۔ میں
نے دیکھا، مردان شاہ اس روشنی کو دیکھ کر بری طرح ٹھٹکا تھا۔ پھر فوراً گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''سر جی! دشمن آرہے ہیں...... جلدی کریں، نکل چلیں یہاں سے۔''

میں اس کی بات پر بری طرح چونکا۔

''وقت کم ہے سر!...... خدا کے لئے جلدی کریں۔ آ...... آپ کی جان سخت خطرے میں ہے۔''
وہ دوبارہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے ایک لمحہ سوچا، پھر پھرتی سے اپنی جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مردان شاہ تیزی سے
اپنی موٹر سائیکل کی طرف بھاگا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور پوری قوت سے
اسٹیرنگ کو گھماتا چلا گیا۔ ٹائروں کی تیز چرچراہٹ اُبھری اور جیپ نے یوٹرن لے لیا، اس کے ساتھ میں
نے ایکسیلیٹر پر اپنے پیر کا دباؤ بڑھا دیا تھا۔ جیپ کسی زخمی درندے کی طرح اسی سمت بڑھی جس طرف
سے وہ روشنی نمودار ہوئی تھی۔ میرا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ مردان شاہ بھی شاید اپنی بائیک پر میرے
تعاقب میں آرہا تھا۔ اسے میرے سیدھا نکل جانے کی بجائے سامنے سے آنے والی گاڑی کی سمت بڑھنے
پر شدید حیرت ہوئی ہوگی۔

میرے دونوں ہاتھ سختی سے اسٹیئرنگ پر جمے ہوئے تھے۔ نظریں ونڈ اسکرین کے پار سامنے ہوئی گاڑی کی ہیڈ لائٹس پر مرکوز تھیں۔ فاصلہ لحہ بہ لحہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ مردان شاہ نے اپنی بائیک جیپ کی آڑ میں لگا رکھی تھی۔ میرا دل سینے میں بے تحاشا دھڑک رہا تھا اور اعصاب تن گئے تھے۔ لیمپس، ایک انٹرکولر ٹربو کے تھے جس نے ذرا قریب پہنچتے ہی اپنی رفتار ہلکی کر دی تھی۔ وہ جا میرے برابر سے گزر سکتے تھے۔ مگر میری ہلکی ہوتی رفتار کو دیکھ کر اس گاڑی کے ڈرائیور نے بھی اپنی کم کر دی تھی۔ وہ سڑک کے عین درمیان میں تھے۔ یقیناً وہ میری گاڑی کا راستہ روکنا چاہتے تھے۔ یک ٹک گھورتی ہوئی سنسناتی نظروں نے ہیڈ لیمپس کی تیز روشنی میں اس میں سوار مسلح افراد کو دیکھ لی تھی، جن کے تیور مجھے خطرناک ہی نظر آئے تھے۔ ہمارا درمیانی فاصلہ لحہ بہ لحہ کم ہو رہا تھا رک گئے۔ یقیناً وہ گاڑی سے باہر نکل کر مجھ پر فائرنگ کرنا چاہتے ہوں گے۔ اسی لمحے میں نے فیصلہ کیا اور یک لخت اپنی جیپ کی رفتار بڑھاتے ہوئے اسٹیئرنگ کاٹا۔ گاڑی تیزی سے آگے بڑھ زن سے ٹربو انٹرکولر کے برابر سے گزرتی چلی گئی۔ دشمنوں کی جیپ کے سوار ہکا بکا اپنے ہتھیار سنبھا گئے۔ میں تو نکل آیا تھا لیکن مجھے اپنے عقب میں آتے ہوئے مردان شاہ کی فکر لاحق ہوئی۔ م بیک ویو مرر میں دیکھا۔

وہ بڑی جرأت اور مہارت کے ساتھ اپنی بائیک کو تیزی سے دوڑاتا ہوا میری دائیں جانب جیپ کے بالکل متوازی بڑھا چلا آ رہا تھا۔ گویا ہم دونوں دشمنوں کا راستہ کاٹ کر نکل آئے تھے لیکن کے باوجود مجھے مردان شاہ کی طرف سے فکر لاحق تھی۔

اسے راستہ دینے کے لئے میں نے اسے ذرا سی سائیڈ دی اور جیپ کو پوری رفتار سے دوڑا ساتھ ہی میری نظریں عقبی منظر پیش کرنے والے مرر پر بھی متحرک تھیں۔ دشمنوں کی انٹرکولر بھی اب تیز رفتاری کے ساتھ ہمارے تعاقب میں دوڑی آ رہی تھی۔

دفعتہً عقب سے گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ اُبھری۔ بالکل غیر ارادی طور پر میں نے اپنا جھکا لیا۔ جیپ کے عقبی شیشے کے ٹوٹنے کی آواز اُبھری اور کئی گولیاں "زٹا زٹ" کی آواز کے ساتھ جی باڈی میں پیوست ہو گئیں۔ مجھے مردان شاہ کی طرف سے زیادہ تشویش تھی کیونکہ وہ بے چارہ بائیک پر میرے خیال میں اسے سڑک کی بجائے تاریک جنگل میں داخل ہو جانا چاہئے تھا۔ کیونکہ مجھے تھا کہ دشمن اسے نظرانداز کر کے میرے ہی تعاقب میں بدستور لگے رہیں گے۔ لیکن وہ جاں نثار شخص شاید تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ مگر یہ اس کی بے وقوفی تھی۔ میں اسے چلا کر متنبہ بھی تو نہیں کر سکتا کیونکہ ایک تو میری جیپ کی رفتار بہت تیز تھی، دوسرے مجھے اس پر پوری طرح کنٹرول کرنا پڑ رہا سڑک بے شک کشادہ سہی لیکن مجھے موڑ بھی کاٹنے پڑ رہے تھے۔ پھر وہ بائیک پر تھا اور میں جیپ میری حتیٰ الامکان کوشش یہی تھی کہ وہ میری جیپ کے آگے ہی رہے۔ اور یہ اس نے عقل مندی کی تھی۔ مگر باوجود اس کے، ایک بائیک کا انجن میری جیپ کی رفتار کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا تھا۔ یہی وجہ وہ اکثر پیچھے رہ جاتا تھا۔ ایک بار تو میرے جی میں آئی کہ میں رک کر دشمنوں کا مقابلہ کروں لیکن حالا کا تقاضا تھا کہ جوش کی بجائے ہوش سے کام لیا جائے۔ چنانچہ فی الوقت راہِ فرار اختیار کرنا ہی زیادہ تھا۔ عقب سے دشمنوں کی فائرنگ کا سلسلہ وقفے وقفے سے جاری تھا۔ ادھر مردان شاہ کے میرے آ ہو کر آگے پیچھے ہونے کی وجہ سے مجھے اپنی جیپ کو فائرنگ کی زد سے بچانے کی کوشش کرتے دائیں بائیں کرنے میں بھی دشواری پیش آ رہی تھی۔

پھر فوراً ہی شاید مردان شاہ کو اس بات کا احساس ہوا اور اس نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے موڑ پر اپنی بائیک اندھیرے جنگل میں موڑ دی۔ سڑک کا یہ موڑ نسبتاً تنگ ثابت ہوا۔ میں نے جیپ رفتار قدرے کم کرتے ہوئے اسٹیئرنگ موڑا تو جیپ موڑ کاٹنے کے دوران کچے میں اُتر گئی۔ میں نے اسٹیئرنگ گھما کر جیپ کو سڑک پر لانے کی کوشش کی تو وہ بری طرح لہراتے ہوئے میرے قابو سے ہو گئی۔ میں نے پوری قوت سے بریک لگا دیئے۔ جیپ کے ٹائر زور سے چرچرائے اور پھر وہ الٹ مجھے ایک لمحے کو پوری دنیا گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ جیپ دھماکے کے ساتھ لیفٹ سائیڈ پر گری تھی خاصی دور تک چکنی سڑک پر پھسلتی چلی گئی۔ ونڈ اسکرین کے ایک چھناکے سے ٹوٹنے کی آواز کے تھ ہی میرے حواس بھی مختل ہونے لگے۔ شکر تھا کہ انہوں نے میرا ابھی تک ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ میں نے حفاظتی سیٹ بیلٹ باندھ رکھے تھے۔ اسی لئے اُلٹنے پلٹنے سے بچ گیا تھا۔ مگر بہرحال جیپ لٹنے سے مجھے سر میں چوٹیں آئی تھیں۔

جیپ خاصی دور تک گھسٹتے رہنے کے بعد تھم گئی تھی۔ میں نے سر کو دو تین جھٹکے دے کر اپنے مختلف تے حواس کو یکجا کرنے کی کوشش کی اور مقدور بھر پھرتی کے ساتھ سیٹ بیلٹ کھول کر اپنے وجود کو آسمان طرف اٹھے ہوئے دوسرے دروازے کی کھڑکی سے باہر سڑک پر اچھالنے میں بہ مشکل کامیاب ہوا۔ دوران میں نے دیکھا، دشمنوں کی گاڑی بھی سر پر پہنچ کر زوردار چرچراہٹ کے ساتھ رک چکی تھی۔ ممکنہ خطرے کے پیش نظر تیزی سے اپنی الٹی ہوئی جیپ کی آڑ میں رینگ گیا اور پھرتی کے ساتھ اپنا گارڈ نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔

میرے سر میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں اور مجھے اپنے چہرے پر خون کی لکیریں سی رینگتی محسوس ئیں۔ پھر اس سے پہلے کہ مجھے دشمنوں پر فائر کرنے کا موقع ملتا، یک بیک کئی رائفلیں ایک ساتھ جیں۔ گولیوں کا ریلا جیپ کی طرف آیا اور جیپ کو چھلنی کر کے رکھ دیا۔ کسی وقت بھی کوئی بھولی بھٹکی لی فیول ٹینک میں پیوست ہو کر دیسی ساختہ بم کی طرح گاڑی کو اُڑا سکتی تھی۔ اس لئے میرا "برننگ ئٹ" سے فوری طور پر دور ہو جانا اشد ضروری تھا۔ دشمنوں کی اندھا دھند فائرنگ سے صاف ظاہر ہوتا کہ وہ مجھے بہرصورت ہلاک کرنے کا عزم کئے ہوئے تھے۔ میرے عقب میں جنگل تھا۔ میں ٹھکے ئے چیتے کی طرح پلٹا۔ گولیوں کی بوچھاڑ سے بچتا بچاتا، کہنیوں کے بل رینگتا تاریک جنگل میں ل ہو گیا۔ میں نے اب اپنا میگارڈ ہاتھ میں پکڑ لیا تھا اور ایک درخت کی آڑ میں تاریکی کا حصہ بن کر ڑا ہو گیا۔

بالآخر وہی ہوا۔ دفعتہً کسی گولی نے فیول ٹینک کو لیک کر دیا اور چشم زدن میں ایک ساعت شکن ماکے سے آگ بھڑک اُٹھی......... پوری جیپ دھڑا دھڑ شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔ میں نے بہ غور نوں کی طرف دیکھا۔ وہ تعداد میں چار تھے۔

انہوں نے اب فائرنگ کا سلسلہ موقوف کر ڈالا تھا۔ میں نے بہ غور ان کا جائزہ لیا۔ ان میں ایک سا مضبوط اور تنومند شخص بھی تھا جو زیادہ پُرجوش اور سرگرم نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ سیاہ رنگت کا کرخت صورت شخص تھا۔ اپنے دیگر تین ساتھیوں کی لیڈنگ شاید وہی کر رہا تھا۔ لہٰذا اس نے ہاتھ اشارے سے فائرنگ بند کرنے کا حکم دیا۔ پھر وہ چاروں گنیں تانے جلتی سلگتی جیپ کے گرد چکر نے لگے۔

"شکار نکل گیا ہے۔" اسی کرخت صورت شخص نے دانت پیس کر اپنے تینوں ساتھیوں سے کہا۔ میں

چاہتا تو یہاں سے ان پر گولیاں داغ سکتا تھا۔ مگر سر دست میرا اس طرح دم سادھے کھڑے رہنا ہی بہتر تھا۔

"اس طرف سے جنگل میں داخل ہو جاؤ......... وہ اُدھر ہی گیا ہو گا۔" اس نے چلاتے ہوئے غیظ لہجے میں کہا۔ پھر اس کے تینوں ساتھی جنگل کی طرف تیزی سے بڑھے۔ ان کے پاس ... تھیں۔ میری کنپٹیاں سائیں سائیں کر رہی تھیں۔ میں نے ابھی انہیں چھیڑنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ ... یہی سمجھے تھے کہ میں تاریک جنگل میں بہت آگے نکل چکا تھا۔ جب اس کے تینوں ساتھی اندر تاریکی میں غرق ہو گئے تو میں نے سڑک پر چوکس کھڑے کرخت صورت بدمعاش کو دیکھا۔ اس کے بعد میں ... میگارڈ جیب میں ٹھونسا اور قد آدم جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا دوسری جانب سے اُبھر کر یکدم سڑک ... دشمنوں کی انٹرکولر کی آڑ میں آ گیا اور ذرا سر اُبھار کر سامنے دیکھا تو وہ کرخت صورت بدمعاش ... قریب ہی اپنی گن تانے چوکس کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ دوسری طرف تھا اور پشت میری سمت۔ ... اسے چھاپنے کا ارادہ کیا اور انٹرکولر کی آڑ لیتا ہوا دبے پاؤں اس کے عقب میں اُبھرا۔ اس دوران ... میگارڈ نکال کر دوبارہ اپنے ہاتھ میں پکڑ چکا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے عقب میں آ کر میگارڈ ... اس کی گدی سے لگا کر میں سانپ کی طرح پھنکارا۔

"خبردار!......... کوئی حرکت مت کرنا......... ورنہ گولی مار کر بھیجہ اُڑا دوں گا۔"

وہ جیسے یکدم ساکت کھڑا رہ گیا۔

"اپنی گن پھینک دو......... جلدی........." میں نے چنگھاڑتے ہوئے دوسرا حکم صادر کیا۔ اس نے اپنی گن دور سڑک پر اچھالی مگر دوسرے ہی لمحے اس نے جھکائی دے کر اپنے دائیں ہاتھ کی کہنی پوری ... سے میرے پیٹ میں رسید کر دی......... میں تکلیف کی شدت سے دہرا ہو گیا۔ پھر اس نے مجھے ... سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر میرے رکوع کے بل جھکے ہوئے چہرے پر گھٹنا رسید کر دیا۔ میں لڑکھڑا کر ... پیچھے گیا اور ریوالور میرے ہاتھ سے نکلتا چلا گیا۔ وہ وحشی درندے کی طرح غراتا ہوا مجھ پر جھپٹا۔ تاہم ... نے چشم زدن میں خود کو سنبھالا اور اس سے نبرد آزما ہونے کے لئے جھپٹ پڑا۔

ڈیل ڈول اور قد و قامت کے لحاظ سے ہماری برابر کی ٹکر تھی۔ اس کے علاوہ اس کا انداز ظاہر ... تھا کہ وہ لڑائی بھڑائی کے معاملات سے بخوبی واقف تھا۔ اس کے ابتدائی دو حملوں نے مجھے خاصا ... پہنچایا تھا۔ مگر اس تکلیف نے میرے اندر ایک جنوں خیز لہر کو جنم دیا تھا۔ میں نے اسے خالص ... طریقے سے اڑنگا لگا کر سڑک بوس کر ڈالا اور اچھل کر اپنے دونوں گھٹنے سکیڑ کر اس کے پیٹ پر ... دیئے۔ اس کے حلق سے بھینسے کے ڈکرانے جیسی آواز بلند ہوئی تھی۔ میں اب اس کے پیٹ اور ... سوار ہو گیا تھا جبکہ اس کی موٹی گردن میرے دونوں ہاتھوں کے شکنجے میں آ چکی تھی۔ میں اس کا ٹینٹوا ... چلا گیا۔ اسے بھی اندازہ ہو چلا تھا کہ اس کا مقابل ہم پلہ تھا۔ لہٰذا اس نے اپنے دفاع میں ایک جھٹکے ... کروٹ بدلی اور میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ میرے پہلو کے بل گرتے ہی اس نے ایک جھٹکے ... میری گردن پر کمزور پڑتی گرفت کو چھڑا لیا اور ساتھ ہی اپنی داہنی ٹانگ کی بھرپور ضرب میرے ... رسید کرنا چاہی تو میں نے بھی فوراً اپنے پیٹ کو اس کی قیامت خیز ضرب سے بچاتے ہوئے اپنے گھٹنے سکیڑ لئے اور بائیں ہاتھ کا مکا اس کی ناک پر جڑ دیا۔ یہ مکا کسی عام انسان کا نہیں بلکہ ایک اسٹیمنا رکھنے والے اسپورٹس ایتھلیٹ کا تھا۔ نتیجتاً اس کی ناک کا بانسہ ٹوٹ گیا اور اس کی زخمی ناک ... بھل بھل خون بہہ کر اس کے چہرے کو مزید دہشت انگیز بنا رہا تھا۔ یہ ایک بھرپور ضرب تھی جو

... چند ثانیے کے لئے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ دفعتاً میں ایک آواز پر چونکا۔ میں پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر بے اختیار میرے حلق سے ٹھنڈی سانس خارج ہو گئی۔ وہ آواز مردان شاہ کی موٹر بائیک کی تھی۔

وہ جلدی سے اُترا اور بائیک کو چھوڑ کر میری طرف بڑھا۔

"آ......... آپ ٹھیک تو ہیں نا سر؟"

"ہاں......... میں ٹھیک ہوں......... جلدی کرو، اس مردود کو اپنے ساتھ لے چلنا ہے۔ اس کے ساتھی میری تلاش میں جنگل کی طرف جا چکے ہیں۔" میں نے سڑک پر بے سدھ پڑے دشمن کی طرف دیکھ کر اس سے کہا۔

اس کے بعد میں نے اپنا میگارڈ اٹھایا اور مردان شاہ نے دشمن کی گن پر قبضہ جمایا۔ ہم دشمن کی انٹرکولر میں سوار ہوئے۔ چابی اگنیشن سوئچ میں لگی ہوئی تھی۔ مردان شاہ نے دشمن کو ہلتے جلتے دیکھ کر اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گن کے آہنی کندھے سے اس کی کنپٹی پر زوردار ضرب لگا کر اسے دنیا و مافیہا سے بے نیاز کر کے رکھ دیا۔ وہ اپنی بائیک کو بھی انٹرکولر کے عقبی دروازے سے اندر پھینک چکا تھا۔

ڈرائیونگ سیٹ میں نے سنبھالی ہوئی تھی۔ مردان شاہ نے بے ہوش دشمن کی تلاشی لینے کے بعد اس کے وجود کو عقبی نشست پر اچھال دیا تھا اور خود بھی وہیں جم کر براجمان ہو گیا۔

میں نے جیسے ہی گاڑی اسٹارٹ کر کے گیئر بدلا، کلچ چھوڑ کر ایکسیلیٹر دبایا تو اچانک میں نے جنگل سے مضروب دشمن کے تینوں مسلح ساتھیوں کو نمودار ہوتے دیکھا۔ پھر ہم پر نگاہ پڑتے ہی چشم زدن میں انہیں حقیقت حال کا ادراک ہوا۔ انہوں نے پھرتی سے اپنی گنیں ہم پر سیدھی کی ہی تھیں کہ انٹرکولر کا طاقت ور انجن غرایا اور گاڑی ایک جھٹکے سے اچھل کر کمان سے نکلے تیر کی طرح طوفانی رفتار سے آگے بڑھ گئی۔ ان تینوں نے ہم پر بے دریغ گولیاں برسانا شروع کر دی تھیں مگر انٹرکولر کا لاجواب پک اپ موشن پلک جھپکتے ہی ہمیں دشمنوں کی فائرنگ سے بچاتا ہوا دور لے گیا۔

"سر! یہ بہت خطرناک آدمی ہے۔" سکون کی چند گھڑیاں میسر آتے ہی عقب سے مردان شاہ کی آواز اُبھری۔ اس کا اشارہ بے ہوش یرغمالی دشمن کی طرف تھا۔

"مجھے حیرت ہے سر! کہ آپ نے لاہور کے "گجر چوک" کے ایک بدنام زمانہ غنڈے کو کس طرح آسانی سے قابو کر لیا۔" اس کا تبصرہ ابھی باقی تھا۔

میں نے سڑک پر اپنی نظریں مرکوز رکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔ "کون ہے یہ؟......... کیا تم اسے جانتے ہو؟"

"بہت اچھی طرح۔" وہ پُرجوش لہجے میں بولا۔ "یہ ہسٹری شیٹر بدمعاش بلال عرف کالا ناگ ہے۔"

"بلال عرف کالا ناگ.........؟" بے اختیار میرے ہونٹوں سے نکلا۔

"ہاں سر! یہ نہایت سفاک اور خطرناک آدمی ہے بلکہ بہت بڑا گینگسٹر بھی ہے۔ بڑے بڑے پیسے والے لوگ اسے اپنے غیر قانونی ہتھکنڈوں کے لئے "ہائر" کرتے رہتے ہیں۔"

"اب یہ ہمیں بتائے گا کہ اس نے کس کے اشارے پر یہ دھما چوکڑی مچائی ہے؟" میں متاثر ہوئے بغیر دانت بھینچ کر بولا۔

"سر جی! اب آپ کہاں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟" معاً مردان شاہ نے اصل بات کی طرف آتے ہوئے کہا۔

میں نے اسے سب سے پہلے اپنے ''گرین لاج'' نہ جانے کی وجہ بتائی، پھر اس سے پوچھا مجھے کون سی اہم خبر دینا چاہتا تھا؟

''سر جی! پھر ایسا کرتے ہیں، آپ میرے ساتھ ہی غریب خانے پر چلے چلئے۔ وہیں اطمینان باتیں ہوں گی۔''

''مگر وہاں تو تمہارے گھر والے ہوں گے۔ اور ہمیں اس مردار بلال عرف کالا ناگ کا منہ بھی ہوگا۔'' میں نے کسی خیال کے تحت کہا۔

''اس کی آپ فکر نہ کریں۔'' اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''گھر میں میرے بوڑھے باپ ایک بہن کے سوا اور کوئی نہیں۔ رہی بات اس بلال عرف کالا ناگ کا منہ کھلوانے کی تو ضرورت کیونکہ میں سب جانتا ہوں کہ کس کے اشارے پر یہ سب ہو رہا ہے۔''

''کیا ٹال کو آگ لگوانے میں اس کا ہاتھ تھا؟''

''بالکل.........اسی بدبخت نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر گن پوائنٹ پر پہلے ہمیں باہر نکا اس کے بعد ٹال پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی تھی۔'' وہ بتانے لگا۔ ''جب یہ لوگ اپنی کارروائی کر کے واپس لوٹنے لگے تو میں نے ایک دوست کی موٹر سائیکل پر ان کا تعاقب کیا تھا۔ پھر ان کے ٹھکا پہنچ کر میں نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ ان کی آپس میں ہونے والی گفتگو بھی سن لی تھی۔ بلال کالا ناگ آپ کے دشمنوں نظر حیات اور شاہ میر کا مشترکہ غلام ہے اور یہ گل اس بدبخت نے ان کے پر کھلایا تھا۔''

''ہوں.........'' میں نے ہونٹ بھینچ کر طویل پُرسوچ ہنکاری بھری۔

''اور سر!.........'' وہ مزید بتانے لگا۔ ''نظر حیات اور شاہ میر ہی کے اشارے پر اب یہ خبیث عرف کالا ناگ آپ کو بھی ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ یہ ناپاک منصوبہ بنانے کے بعد یہ لوگ آپ کی ''گرین لاج'' روانہ ہوئے تھے۔ مگر میں ان خونی ہرکاروں سے پہلے آپ کے پاس پہنچ کر آپ کو کرنے آ رہا تھا۔''

''ان کا وہ ٹھکانہ بتاؤ جہاں تک تم نے ان کا تعاقب کیا تھا اور ان کی آپس میں ہونے والی بندی کے بارے میں آگاہی حاصل کی تھی۔'' میں نے گمبھیر لہجے میں پوچھا تو اس نے مجھے ان کے ٹھکا کا تفصیلی محل وقوع وغیرہ بتا دیا۔

''یہ ان کا خاص الخاص ٹھکانہ ہے سر جی!'' ٹھکانے سے متعلق تفصیل بتانے کے بعد مردان پُرجوش لہجے میں بولا۔

''تم ایک کام کرو مردان شاہ!'' میں نے گاڑی کی رفتار کم کرتے ہوئے اس سے کہا۔

''جی سر! حکم کریں۔'' وہ جاں نثارانہ مستعدی سے بولا۔

''پولیس مجھے گرفتار کرنے کے لئے تلاش کرتی پھر رہی ہے۔ ورنہ یہ کام میں خود ہی انجام ڈالتا۔ تم ایسا کرو کہ بلال عرف کالا ناگ کو اسی وقت متعلقہ تھانے لے جا کر پولیس کے حوالے کر دو۔ وہاں رپورٹ لکھوا چکا ہوں۔''

''آپ بے فکر ہو جائیں سر! میں اس کتے کو ابھی وہیں لے جاتا ہوں۔ مگر آپ.........؟''

''میری فکر ابھی چھوڑو......... میں تمہیں مذکورہ تھانے کے ذرا قریب ہی چھوڑ دیتا ہوں۔ تمہیں کام بہت ہوشیاری اور چابک دستی سے انجام دینا ہوگا۔''

''سر! کیا اس طرح پولیس ہم سے انصاف کر پائے گی؟ .... میرا مطلب ہے آپ کی غیر موجودگی میں؟'' وہ بولا۔ اس کی بات میں وزن تھا۔ بغیر کسی ثبوت اور میری عدم موجودگی میں یہ سب اتنا آسان نہ تھا۔

''میری مانیں تو سر! اس رذیل کے ہاتھ پاؤں توڑ کر کسی گہری کھائی میں.........'' مردان شاہ نے ...ارے لہجے میں ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک وہ خاموش ہو گیا۔ ''یہ ہوش میں آ رہا ہے سر!'' اچانک مردان شاہ نے مضطرب سی آواز میں کہا۔ میں نے یکدم گاڑی سڑک کے کنارے تاریکی میں روک دی ...پیچھے مڑ کر دیکھا۔

بلال عرف کالا ناگ کے بے سدھ وجود میں حرکت پیدا ہونے لگی تھی۔ مردان شاہ نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گن اس پر تان لی اور میں نے بھی اپنا میگارڈ ہاتھ میں لے لیا۔ انجن میں نے گاڑی روکتے ہی ...بند کر دیا تھا۔

''اسے باہر دھکیلو۔'' یہ کہتے ہوئے میں اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر چاندنی میں اتر گیا۔

بلال عرف کالا ناگ اب پوری طرح ہوش میں آ چکا تھا۔ مردان شاہ نے اسے گن پوائنٹ پر باہر ...دھکیل کر نیچے اُتار دیا۔

شفاف آسمان پر دمکتے چاند کی روشنی میں اس کا خون آلود چہرہ بڑا بھیانک نظر آ رہا تھا۔ خون اس کی ...ٹوٹی ہوئی ناک سے بہتے رہنے کے بعد چہرے پر جم کر خشک ہو چکا تھا۔ وہ سنسناتی ہوئی نظروں سے ہم ...دونوں کو خاموشی سے گھورے جا رہا تھا۔

''بلال عرف کالا ناگ! تم نے میرے ٹال کو آگ لگائی اور پھر مجھے قتل کرنے کے ارادے سے اپنے ساتھیوں سمیت روانہ ہوئے۔ کیوں، غلط کہہ رہا ہوں میں؟'' میں نے غضب آلود لہجے میں اس کی طرف ...دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میرا خیال تھا کہ میری معلومات اس کے لئے حیرت کا باعث ہوں گی۔ مگر اس نے مجھے حیرت سے ...دوچار کر دیا۔ میرا سوال سننے کے بعد بھی وہ مجھے کینہ توز نظروں سے گھورتا رہا پھر بڑی ڈھٹائی سے دانت ...نکوس کر بولا۔

''ہاں.........پھر.........؟''

مجھے اس کی ڈھٹائی اور دیدہ دلیری پر طیش آ گیا۔ میں نے جوشِ غیظ سے مغلوب ہو کر اپنے میگارڈ کی ...نال اس کے بدہیئت دہانے میں حلق تک ٹھونس دی اور سلگتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میں تجھے اچھی طرح جانتا ہوں بلال عرف کالا ناگ!.........اور تُو بھی مجھے اچھی طرح جان لے۔ ...میرا نام نادر علی خان ہے۔ چند ٹکوں کے عوض جن لوگوں نے تجھے میرے پیچھے لگا رکھا ہے، وہ عنقریب ...میرے ہاتھوں عبرت ناک انجام کو پہنچنے والے ہیں۔ بول، اب تیرا کیا حشر کروں؟''

اس کی چندی چندی آنکھوں میں استہزائیہ مگر سفاک چمک لہرائی، جس میں انگاروں کی تپش بھی ...شامل تھی۔

میں نے اسے بولنے کا موقع دینے کے لئے اس کے مکروہ دہانے سے نال واپس کھینچ لی تو وہ نفرت ...سے گردن موڑ کر تھوکنے کے بعد بولا۔

''نادر علی خان! ابھی کالا ناگ اتنا سستا نہیں ہوا کہ کوئی اسے چند ٹکوں کے عوض خریدنے کی جرأت کر سکے اور نہ ہی میرے دشمن اتنے سستے ہوئے ہیں کہ میں انہیں محض موت جیسی معمولی سزا سے دوچار

کرنے کی بے وقوفی کرتا ہوں۔ ہاں، تمہارے اس دم چھلے نے.........'' اس نے گن تانے کر
مردان شاہ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''شاید ہمارا تعاقب کر کے ہماری ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔ لیکن
علی خان! میں تمہیں ہلاک کرنے کی بے وقوفی کی نیت سے تمہارے پاس نہیں آ رہا تھا۔ بلکہ تمہاری
اور بربادی کا نوحہ سنانے کے لئے تم سے ملنا چاہتا تھا۔''
مجھے اس کی بات پر ایک جھٹکا سا لگا۔ مجھے اس کا لہو انگیز لہجہ بناوٹی یا جھوٹا محسوس نہیں ہوا تھا۔
''کیوں؟.........تمہاری مجھ سے بھلا کیا دشمنی ہے؟'' میں نے آنکھیں سکیڑ کر پوچھا۔
''دشمنی نہیں.........خونی دشمنی کہو نادر!'' وہ وحشت زدہ لہجے میں بولا۔ ''کیوں کہ تم نے میرے
ملک سردار خان کا خون کیا تھا۔''
میں اس کے اس چونکا دینے والے سنسنی خیز انکشاف پر ایک لمحے کے لئے سن سا ہو کر رہ گیا تھا
''ملک سردار خان میرا بڑا بھائی تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ تیری ماں شبینہ اور ماموں
گل کا نمک خوار بھی تھا.........مگر تم نے بے دردی سے اس کا خون کر ڈالا۔'' وہ میری کیفیت سے
خبر اپنی رو میں کہے جا رہا تھا۔
''اس نے ایک بے گناہ لڑکی صدف کو قتل کرنے کے احکام جاری کئے تھے۔'' اس بار مجھ سے نہ
رہا گیا۔
''مگر یہ کام اس نے تمہاری ماں اور تمہارے ماموں حیدر گل کے حکم پر ہی کیا تھا۔'' کالا ناگ غرایا
''یہ بہت لمبی کہانی ہے.........تمہارا اس.........''
وہ اچانک میری بات کاٹ کر غیظ آلود لہجے میں بولا۔ ''مجھے کسی لمبی کہانی سے کوئی سروکار نہیں۔
ہاں، تم جتنی اُونچی اُڑان بھرنے کی کوشش کر رہے ہو، عنقریب زخمی چڑیا کی مانند پھڑ پھڑاتے ہوئے
کھائی میں گرنے والے ہو۔ میں یہی تماشا دیکھنے کے لئے بے تاب ہوں۔ اسی لئے اب میں تمہا
دشمنوں سے مل چکا ہوں۔''
اس سفاک گفتگو پر میرا ذہن بری طرح سائیں سائیں کرنے لگا اور سینے میں ہلچل سی مچنے لگی تھی
''سر جی! حکم کریں.........اس کالے ناگ کو اب زندہ چھوڑنا ہمارے مفاد میں نہیں ہو گا۔'' م
شاہ جو اب تک خاموش تھا، دانت پیس کر مجھ سے بولا تو کالا ناگ نے صرف ایک بار سنسناتی نظ
سے اسے گھورا، پھر اس کے بد ہیئت ہونٹوں پر خاموش سی سفاک مسکراہٹ اُبھری۔ میں نے مردا
کی بات کو نسر انداز کرتے ہوئے کالا ناگ سے کہا۔
''میں تمہاری دلیری کی داد دیتا ہوں اور بہادر دشمن کی دل سے قدر کرتا ہوں.........تم نے یہ
کر کے مجھے اس اقدام پر مجبور کر دیا ہے کہ میں تیرا گھمنڈ توڑنے کی خاطر تجھے زندہ چھوڑ دوں تاکہ
دوبارہ تیرا میرا سامنا ہو تو تجھے تیری اصل اوقات پر لا کر بھیانک انجام سے دوچار کروں۔''
''ہا......... ہا......... ہا.........'' میری خونخوار دھمکی پر اس نے ایک بدمست قہقہہ بلند کیا اور بولا۔
تم اپنی خیر مناؤ اور مجھے اپنی تباہی کے خوش کن منظر سے لطف اندوز ہونے دو۔ کیونکہ پولیس نے نہ
میرے سوہنے بھائی ملک سردار خان کی لاش برآمد کر لی ہے بلکہ وہ آلہ قتل بھی اس کے ہاتھ لگ گیا
جس پر تمہارے فنگر پرنٹس موجود ہیں۔ کتنا مزہ آئے گا جب میں ماں بیٹے اور ماموں کو جیل کی سلا
کے پیچھے دیکھوں گا۔ اور ہاں، یاد رکھنا، تم تک تمہاری مرحلہ وار تباہیوں کی خبریں میں خود پہنچاتا رہوں گا
میں اس کے اس لرزا دینے والے انکشاف پر یکدم سناٹے میں آ گیا تھا۔ ''اور ہاں.........''

سنسنی خیز انکشافات کے انداز میں بولا۔ ''بے فکر رہو.........تم تینوں غداروں کی تباہی کے بعد میں
بڑے آرام سے جیل کے اندر ہی سب سے پہلے تمہاری غدار ماں اور ماموں حیدر گل کو خود موت کی نیند
سلا دوں گا۔ اس کے بعد تمہاری باری۔ ہا......... ہا......... ہا.........''
وہ وحشیانہ انداز میں قہقہے لگانے کی کوشش کر رہا تھا مگر ٹوٹی ناک اور زخموں کی شدت کے باعث پوری
طرح کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ تاہم اس کی حالت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہ رہا ہے۔ اس
کے ہلکورے لیتے بدن کا تمسخرانہ انداز مجھے بری طرح سلگا گیا۔ پھر جیسے میں آپے سے باہر ہو گیا۔ میں
نے آگے بڑھ کر اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ شاید دانستہ مردان شاہ کی طرف لڑکھڑا گیا۔ مجھے اس کی اس
لگا دینے والی مکارانہ چال کا دیر سے پتہ چلا کہ وہ گن پوائنٹ پر ہونے کے باوجود کیوں اتنی دلیری دکھا
رہا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی میں نے اشتعال انگیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک ہاتھ سے اس کی گردن
دبوچی تو وہ دانستہ قریب کھڑے مردان شاہ کی طرف لڑکھڑا گیا اور دوسرے ہی لمحے جیسے ایکا ایکی اس کے
مردہ وجود میں پارا دوڑ گیا۔ وہ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پلٹ کر مردان
شاہ پر جھپٹا اور بیک وقت اپنی ایک لات میرے میگارڈ والے ہاتھ پر بھی جڑ دی۔ میگارڈ میرے ہاتھ سے
نکل گیا۔ دوسری طرف اس نے مردان شاہ سے گن جھپٹتے ہی اسے اس کے زور پر دور دھکیل دیا اور میں
نے دیکھا کہ مردان شاہ سے چھینی ہوئی گن کا رخ اس کی طرف کرتے ہی ٹرائیگر دبایا۔ اس کے ٹرائیگر
دبانے سے صرف ایک پل پہلے میں نے اس کی پشت پر لات رسید کر دی تھی۔ اس کی خوفناک گن سے
فائر کی خوفناک آواز اُبھری مگر عین وقت پر میری لات اس کی پشت پر پڑنے کی وجہ سے نہ صرف اس کا
نشانہ خطا ہو گیا بلکہ وہ خود بھی ڈکراتا ہوا مردان شاہ کے اوپر جا پڑا۔
مردان شاہ نے فوراً بیدار مغزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھایا اور اس کی
گن پر دونوں ہاتھ جماتے ہی گھٹنے کی زوردار ضرب اس کی ناف کے نیچے رسید کر دی۔
کالا ناگ کے حلق سے بیل کے ڈکرانے جیسی ہیبت ناک آواز برآمد ہوئی مگر اس نے گن نہ چھوڑی
مردان شاہ اس کی گن پر ہی اپنے دونوں ہاتھ جما کر اچھلا اور اپنی دونوں ٹانگیں اس کے پیٹ پر ٹکا
دیں۔ نتیجتاً کالا ناگ جھلتا چلا گیا۔ مردان شاہ نے عام روایتی سا داؤ بروقت آزمایا تھا لیکن کالا ناگ بھی
ایک کائیاں تھا۔ اس نے مردان شاہ کے بوجھ کا سہارا لیا اور دو تین زوردار پھیریاں لگا کر مردان شاہ کو
جھٹکا دیتے ہوئے دور اچھال دیا۔ گن کالا ناگ کے ہاتھوں میں ہی رہ گئی۔ اس موقع پر میں نے اپنی جگہ
سے حرکت کی اور اسپرنگ کی طرح اچھل کر اس پر جست لگا دی۔ میری دونوں ٹانگیں فلائنگ کک کے
انداز میں اس کے چہرے پر پڑیں اور وہ کئی قدم پیچھے لڑکھڑا کر زمین بوس ہو گیا۔ میں نے تاک کر ایک
لات اس کی گن پر رسید کی تو وہ اس کے ہاتھوں سے نکلتی چلی گئی۔
میں گن اٹھانے کے لئے لپکا۔ اور جیسے ہی گن اٹھا کر اس کی طرف گھوما تو وہ خبیث اپنی گاڑی میں
بیٹھ چکا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ میں نے گن کا رخ گاڑی کی کھڑکی سے نظر
آتے کالا ناگ کی طرف موڑا۔ مگر تب تک وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھا چکا تھا۔
میں نے لبلبی دبا دی۔ گن نے آتشیں قہقہہ اُگلا مگر گولیاں دور ہوتی انٹر کولر کے شیشوں کو توڑنے کے سوا
کچھ نہ کر سکیں۔
میں اس کی بیک ریڈ لائٹ کو دور ہوتے بے بسی سے دیکھنے لگا۔ اس اثنا میں مردان شاہ بھی ہانپتا ہوا
میرے قریب آ گیا۔

''یہ حرام زادہ تو نکل بھاگا سر!'' وہ دانت پیس کر بولا۔

''ہاں.........'' میں نے مختصراً کہا۔

''سر! اب ہم واپس کس طرح چلیں گے؟'' وہ پریشانی سے بولا۔

''پیدل چلنے کے علاوہ اور دوسری کوئی صورت نہیں ہے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھ
جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے کہ شہر یہاں سے دور نہیں ہے۔''

میں نے اپنا میگارد تلاش کر کے اسے اپنے قبضے میں کیا اور بلال عرف کالا ناگ سے چھینی ہو
دور تاریک جنگل میں پھینک دی۔

''تمہاری موٹر بائیک تو گاڑی میں ہی رہ گئی۔'' میں نے چلتے ہوئے اس سے کہا۔

''ہاں .... مگر مجھے پرواہ نہیں اس کی۔ شکر ہے آپ کی جان بچ گئی۔'' وہ بولا۔ پھر ذرا فکر
انداز میں بولا۔ ''سر! اب کیا ہوگا؟ حالات آپ کے لئے تو بہت خطرناک ہوتے جا رہے ہیں۔ او
یہ بدبخت بلال جیسا خطرناک ناگ۔''

''مجھے اس کی پرواہ نہیں۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''مجھے دوسری فکر کھائے جا رہی
میرے دشمنوں نے مجھے قانونی اور غیر قانونی ہتھکنڈوں میں جکڑنا شروع کر دیا ہے۔''

''سر! آپ فکر نہ کریں......... میں ہوں نا آپ کے ساتھ۔'' مردان شاہ فوراً بولا۔ ''آپ
کریں، میرے ساتھ میرے ہی گھر چلے چلیں۔ جب تک حالات موافق نہیں ہو جاتے، آپ کا اب
نکلنا صحیح نہیں۔''

میں اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ اب یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی کہ پولیس نے ''گرین لاج
صرف نگینہ کی تلاش میں چھاپہ نہیں مارا تھا بلکہ وہ مجھے ملک سردار خان کے قتل کے جرم میں گرفتار کر
ارادہ رکھتی تھی۔ مجھے کالا ناگ کے سنسنی خیز انکشافات نے خاصی الجھن میں ڈال دیا تھا۔ اس نے ا
بڑے بھائی ملک سردار خان کی لاش اور آلہ قتل، جس پر یقیناً میرے ہی فنگر پرنٹس ہو سکتے تھے، کے
ہونے کا جو انکشاف کیا تھا، میں اسے جھوٹ بھی نہیں سمجھ سکتا تھا کیونکہ اگر یہ جھوٹ ہوتا تو بھلا کالا نا
کس طرح معلوم ہوتا کہ یہ قتل میں نے ہی کیا تھا؟

میں دماغ پر زور دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ آخر یہ سب کیوں اور کیسے ممکن ہوا تھا؟ میں مرحل
حالات کا جائزہ لے رہا تھا کہ اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ میں چلتے چلتے یکدم رک
مردان شاہ بھی رک گیا تھا۔ تاہم وہ کچھ بولا نہیں۔ شاید اس نے میرے چہرے کے پُرسوچ او
تاثرات سے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اس وقت کہاں گم تھا۔

مجھے یاد آنے لگا کہ جب میں نگینہ کے اغواء اور قتل کے شبہے میں ملک سردار خان کا تعاقب کر
ہوئے (اس دوران میں نے اس پر قابو بھی پا لیا تھا) پرانے ریسٹ ہاؤس میں پہنچا تھا اور ملک سردار
نے موبائل پر اپنے ساتھی غفورے کو ''لڑکی'' کو ٹھکانے لگانے کے احکامات جاری کر دیئے تھے۔ وا
جسے میں نگینہ سمجھے ہوئے تھا، صدف تھی۔ غفورا اس کا گلا دبوچ کر اسے ہلاک کر چکا تھا۔ میں نے سمجھا
تھا کہ اس نے ملک سردار خان کے سفاکانہ حکم کے مطابق نگینہ کا قتل کر ڈالا ہے تو میں اپنے ہوش و ح
میں نہ رہا تھا اور غصے کی شدت سے دیوانہ ہو کر میں نے ملک سردار خان کی پیشانی میں گولی مار دی تھی
پستول وہیں پھینک کر دیوانہ وار غفورے کی خبر لینے دوڑ پڑا تھا۔ مگر وہ خبیث اس وقت وہاں سے
ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کے بعد جب میں کبیر سے نمٹ کر باہر نکلا تو ملک سردار خان کی ا

میرے ہاتھ سے نکلا ہوا پستول وہاں سے غائب ہو چکا تھا۔ ملک کی لاش غائب ہونے پر میں خاصا
پٹایا تھا مگر بعد کے واقعات کے باعث وہ سب میرے ذہن سے اتر گیا تھا۔ تاہم اب کالا ناگ کے
سنسنی خیز انکشاف کے بعد کہ پولیس ملک سردار خان کی لاش آلہ قتل سمیت برآمد کر چکی ہے، مجھے یہ
سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی کہ ملک سردار خان کی لاش کو آلہ قتل سمیت غائب کرنے میں ضرور کبیر
کا ہی ہاتھ ہوگا۔ جس نے اسے میرے خلاف ترپ کا پتا سمجھ کر وہیں کہیں ٹھکانے لگا دیا ہوگا۔ اس کے
بعد اس نے دو کام کئے۔ ایک تو کالا ناگ کو میرے خلاف بھڑکایا، دوسرے پولیس کو لاش سمیت آلہ قتل
فراہم کر کے میرے پیچھے لگا دیا۔

ساری صورت حال مجھ پر واضح ہو گئی تھی اور میرا دماغ سنسنانے لگا۔ میری رگوں میں خون کی بجائے
گردش کرنے لگا تھا۔

''مردان شاہ! حالات واقعی جان لیوا حد تک خطرناک ہو گئے ہیں۔'' ساری صورت حال سمجھ میں
آنے کے بعد میں نے مردان شاہ کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''ارے سر! آپ کیوں فکر کرتے ہیں؟ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ بس آپ اب میرے ساتھ چلیں
میرے گھر۔'' وہ پُرجوش ہو کر بولا۔ میں نے قدم بڑھا دیئے۔

''مردان شاہ! تم نے پہلے ہی میری خاطر اتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری دشمنی
کی آگ تم تک پہنچے.........''

''یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں سر؟'' اس نے بے اختیار میری بات کاٹ ڈالی تھی۔ ''میں نے تو
آپ کا نمک حلال کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ پر کوئی احسان تو نہیں کیا۔ بلکہ آپ نے ہم تمام
مزدوروں پر جو احسانات کئے ہیں، ان کے سامنے میری کوشش کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ نہیں سر! میں
آپ کو اس آڑے وقت میں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔'' وہ جذباتی ہونے لگا تھا۔

میں چند ثانیے خاموشی سے چلتا رہا۔ پھر اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو مردان شاہ! پھر تم مجھے تنہا
سمجھو۔ تم سمجھتے ہو کہ میں حق پر ہوں اور راہِ حق کے مسافروں کی اللہ ضرور مدد کرتا ہے۔ کیا ہوا کہ میرے
دشمنوں نے اپنی مکاری سے مجھے پریشان کر دیا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ بالآخر فتح میری ہی ہوگی۔ تم
تو میرے لئے دعا کرتے رہنا کہ خدا مجھے اس راہ پر قائم رکھے۔''

میں نے دیکھا، میری بات پر اس کی آنکھوں میں نمی سی اترنے لگی تھی۔ چند لمحوں بعد اس نے سر جھکایا
آنکھوں کے گوشوں کو آستین سے صاف کیا۔ تب میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''تم رونے لگے؟'' میں نے آہستگی سے پوچھا۔

''جی سر! یہ غربت کے آنسو ہیں۔ آپ نے واقعی آج مجھے میری اوقات یاد دلا دی کہ نوکر، نوکر ہی
ہوتا ہے۔ اپنے مالک کے دکھ سکھ کا ساتھی نہیں بن سکتا۔'' اس نے عجیب رقت آمیز جذباتی لہجے میں کہا۔

میرا دل پسیج گیا۔ میں نے بے اختیار اسے اپنے گلے سے لگا لیا اور بولا۔

''ارے یار مردان شاہ! یہ تُو کیسی باتیں کر رہا ہے؟......... میں نے تجھے اپنا نوکر کب سمجھا ہے؟ تُو تو
میرا دوست ہے۔ ایک وفادار اور جاں نثار دوست۔''

میری بات پر یکدم اس کا آزردہ چہرہ کھل اُٹھا۔

''بس سر! میرے لئے یہی اعزاز کافی ہے۔ آپ مجھے آزما کر تو دیکھیں، میں آپ کی خاطر جان لڑا
سکتا ہوں۔''

مردان شاہ ایک محنت کش اور شریف النفس نوجوان تھا۔ مگر اس کے اندر وفا اور غیرت بھی کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ تب ہی تو اس نے اپنی جان پر کھیل کر میرے ٹال کو آگ لگانے والوں کا تعاقب کیا تھا۔ راولپنڈی کے بدنام زمانہ غنڈے اور گینگسٹر کالا ناگ سے ٹکر لی تھی۔ مگر میں مردان شاہ کو خطرناک دشمنی کی آگ میں جھونکنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن وہ میرے شانہ بشانہ چلنے پر بضد تھا۔ ... نے بھی چپ سادھ لی۔ بالآخر ہم گرتے پڑتے کشمیر پوائنٹ کے قریب سالار ریسٹ ہاؤس پر پہنچے۔ یہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ''سالار ریسٹ ہاؤس'' کے گرد ایک گول سڑک تھی، یہاں بے شمار ہوٹل اور ... خانے تھے۔ جو اس وقت بند پڑے تھے۔ یہیں سے مال روڈ شروع ہوتا تھا جس کے انتہائی سرے ... ٹال تھا جو اب جل کر محض خاک کا ایک ڈھیر رہ گیا تھا۔ مردان شاہ کا گھر البتہ یہاں سے پیدل ... پر تھا۔

ہم ذرا دیر اس مقام پر سستانے کے لئے رکے اور پھر چل پڑے۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں ... شاہ کے گھر پہنچ گئے۔

مردان شاہ کا گھر چھوٹا مگر پختہ اینٹوں سے بنا ہوا تھا۔ مجھے داخلی دروازے کے ساتھ دیوار کی ... جانب ایک پٹ والا دروازہ بھی دکھائی دیا۔ اس پر باہر سے تالا لگا ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بیٹھک کا دروازہ تھا۔

بیٹھک کے دروازے پر تالا نظر آنے کی وجہ اس وقت سمجھ میں آ گئی جب مردان شاہ نے اپنی ... سے چابی نکال کر اسے کھولا۔ یقیناً رات دیر سے گھر لوٹنے کے خیال سے ہی اس نے یہ تالا لگایا ہوگا۔ دونوں اندر داخل ہوئے۔ بیٹھک بہت مختصر مگر صاف ستھری تھی۔ چند کرسیوں کے علاوہ ایک چھوٹی چارپائی بھی اس کمرے میں موجود تھی۔ اس نے کھٹکا دبایا تو بجلی کا بلب روشن ہو گیا۔

میں ایک کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا تھا۔ اس نے دروازہ بند کیا۔ مجھے ایک چھوٹا دروازہ دکھائی دیا تھا جو غالباً اندر صحن میں کھلتا تھا۔

''سر جی! یہ جگہ آپ کے شایانِ شان نہیں .... مگر.........''

''مردان شاہ!'' میں نے اس کی بات کاٹ کر ہولے سے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''ان باتوں کو چھوڑو۔ میری نظروں کے سامنے کوئی اہمیت نہیں۔ اور ہاں، مجھے ''سر'' بھی مت کہا کرو۔''

''مم .... مگر .... سر!'' اس نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکا۔

''جب خود کو تم میرا دوست سمجھتے ہو تو پھر دوست ہی سمجھو .... صرف نادر خان۔ سمجھے؟ ... اب بیٹھو۔''

''میں آپ کے لئے کھانے پینے کو کچھ لے آؤں۔'' اس نے اندر صحن میں کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا تو میں نے اسے روک دیا۔

''اس کی ضرورت نہیں۔ ہاں، اگر تمہیں آرام کرنا ہے تو تم جا سکتے ہو۔''

''نہیں .... مجھے بھی نیند نہیں آ رہی۔ آپ بھی پریشان ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ پھر ایک پُرجوش سے لہجے میں بولا۔ ''ایسا کرتے ہیں، میں چائے بنا کر لے آتا ہوں .... پھر سر جوڑ کر آئندہ کوئی لائحہ عمل سوچتے ہیں۔''

مجھے اس کی بات معقول لگی۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

مردان شاہ چونکہ صدقِ دل کے ساتھ میرا دست راست بن چکا تھا اس لئے اسے اپنے حالات

کے بارے میں تفصیلاً آگاہ کرنا ضروری تھا۔ لہٰذا چائے پینے کے دوران میں اسے آہستہ آہستہ اب تک کے سارے حالات سے بلا کم و کاست آگاہ کرتا چلا گیا۔ وہ بڑے غور اور توجہ کے ساتھ سنتا رہا۔ کم و بیش پون گھنٹے کے بعد وہ گہری سانس لے کر پُرعزم لہجے میں بولا۔

''میں آپ کے اس اعتماد کی دل سے قدر کروں گا کہ آپ نے مجھے ایک دوست کے ناتے ہی نہیں بلکہ بھائی سمجھتے ہوئے اپنے معاملات سے آگاہ کیا ہے۔ آپ اب بے فکر ہو کر آرام کریں۔ صبح تازہ دم ہو کر سوچیں گے کہ ہمیں سب سے پہلے قدم کون سا اٹھانا ہے۔''

میں نے اس کی بات پر دھیرے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔ پھر وہ ٹرے اور کپ سمیٹے چلا گیا۔ چارپائی پر بستر موجود تھا۔ میں لائٹ آف کر کے اس پر دراز ہو گیا۔

مردان شاہ کے ساتھ نے مجھے ذہنی طور پر کافی سہارا دیا تھا۔ میں اس قدر تھکا ہوا تھا کہ پریشان کن خیالات کے باوجود گہری نیند میں ڈوبتا چلا گیا۔

❋❋❋

مجھے اندازہ نہیں ہے کہ میں کتنی دیر تک سویا۔ اچانک کسی نے مجھے بری طرح جھنجوڑا اور ایک کرخت آواز میری سوتی جاگتی سماعتوں سے ٹکرائی۔

''اُٹھو! .... اُٹھو!''

میں ہڑبڑا کر اٹھا اور اپنے اطراف مستعد پولیس والوں کو دیکھ کر سناٹے میں آ گیا۔ وہ تعداد میں پانچ چھ رہے ہوں گے جن کی قیادت انسپکٹر اعجاز شمس کر رہا تھا۔ یہ وہی انسپکٹر تھا جسے عدالت نے میرے باپ قادر علی خان مرڈر کیس کی نئے سرے سے تفتیش کرنے پر مامور کیا تھا۔ وہ چالیس کے پیٹے میں، گینڈے جیسی جسامت کا ایک خاصا بھاری بھرکم روایتی پولیس آفیسر تھا۔

''نادر علی خان! خود کو پولیس کی حراست میں سمجھو۔ مجھے امید ہے تم قانون شکنی نہیں کرو گے۔'' مجھے جاگتا پا کر وہ پاٹ دار آواز میں بولا اور میں نے خاموشی کے ساتھ گرفتاری دے دی۔

جب مجھے ہتھکڑیاں لگا کر گھر کے باہر کھڑی موبائل میں سوار کیا جا رہا تھا تب میں نے دیکھا کہ ایک ضعیف شخص دونوں ہاتھ جوڑ کر اعجاز شمس کے سامنے گڑگڑا رہا تھا۔ وہ یقیناً مردان شاہ کا بوڑھا باپ ہی ہو گا۔ وہ گڑگڑاتے ہوئے انسپکٹر سے کہہ رہا تھا۔

''انسپکٹر صاحب! مم .... میرا بیٹا بے قصور ہے۔ اسے چھوڑ دو .... وہ مجھ بوڑھے کی لاٹھی ہے اور ایک جوان بہن کا واحد سہارا ہے۔''

اس کی فریاد کا انسپکٹر اعجاز شمس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ البتہ میرا جگر چھلنی ہو گیا۔ موبائل کی طرف اٹھتے میرے قدم رک گئے اور میں انسپکٹر اعجاز سے مخاطب ہو کر سنجیدگی سے بولا۔ ''انسپکٹر صاحب! آپ بے شک مجھے گرفتار کر لیں مگر مردان شاہ کو چھوڑ دیں۔ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ اس کا باپ درست کہہ رہا ہے۔''

میری بات پر اس نے ایک طنزیہ نگاہ میرے چہرے پر ڈالی اور روایتی پولیس والے لہجے میں بولا۔

''ایک مجرم کو پناہ دینے والا بہت بڑا قصور وار ہوتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ڈرائیونگ کیبن کی طرف بڑھ گیا۔ دو پولیس والے مجھے دھکیلتے ہوئے موبائل تک لے گئے اور میں مردان شاہ کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

میری ہتھکڑی کی زنجیریں ایک سپاہی نے اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام رکھی تھیں۔ موبائل ایک جھٹکے سے آگے بڑھی تو عقب میں مردان شاہ کا بوڑھا باپ روتا چلاتا ...نے لگا۔ مردان شاہ کی آنکھیں

اپنے ضعیف باپ کی حالت پر بھیگنے کو تھیں کہ اس نے اپنی آنکھیں بھینچ لیں اور سر نیچے جھکا دیا۔ م
کٹنے لگا۔ اسے میرا ساتھ دینے کی پہلی اور کڑی سزا بھگتنا پڑ رہی تھی۔ ساتھ ہی مجھے اپنی فاش غلطی کا
احساس ہونے لگا تھا۔ ہم یہ بھول گئے تھے کہ کالا ناگ مجھے مردان شاہ کے ساتھ دیکھ چکا تھا اور اس
ہی بعد میں کسی طرح پولیس کو میرے بارے میں مطلع کر دیا ہوگا۔

میرے دشمن ایک مربوط طریقے سے آپس میں نتھی ہو چکے تھے اور بڑے منظم انداز میں ا
دوسرے کے ساتھ روابط استوار کئے مجھ پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ سرگرم
حیات کا بیٹا کبیر تھا جو میرا رقیب بھی تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اسی نے سب سے پہلے کالا ناگ کو اپنے
شامل کیا ہوگا۔ موبائل تیز رفتاری کے ساتھ مال روڈ پر دوڑی جا رہی تھی۔ پھر سالار ریسٹ ہاؤس کے
چوراہے سے وہ پنڈی جانے والی سڑک پر مڑ گئی۔

موبائل اپنا راستہ تیزی سے طے کر رہی تھی اور میری سوچوں کو بھی گویا پر لگ گئے تھے۔ مجھے
اندازہ ہو گیا تھا کہ مردان شاہ کے گھر پر پولیس کی آمد کے پیچھے کبیر اور کالو کی مخبری کارفرما تھی۔ کبیر مجھ
اس وقت سے نظریں رکھے ہوئے تھا جب نگینہ سے میرے ''معاملاتِ دل'' کا آغاز ہوا تھا۔ اسی
باعث اس نے میرے ماضی کو کھنگال ڈالا تھا اور اس کے ذریعے نگینہ کو مجھ سے متنفر کرنے کی کوشش
تھی۔ ایک طرف کبیر تھا، جو نگینہ کی خاطر میرے خلاف میدانِ عمل میں اُترا ہوا تھا۔ دوسری طرف
حیات پھر شاہ میر اور اب کالو......... گویا مجھے اب چاروں طرف سے دشمنوں نے گھیر لیا تھا۔ اب تک
انہیں مسلسل کامیابیاں مل رہی تھیں اور اس کی وجہ ان سب کا بیک وقت میرے خلاف محاذ پر اُتر آنا تھا۔
مجھے اس لمحے یوں محسوس ہوا کہ اگر یہی صورتِ حال رہی تو وہ اپنے مذموم ارادوں میں کامیاب بھی
سکتے تھے۔

ملک سردار خان کا میرے ہاتھوں قتل مری سے تقریباً پچاس کلومیٹر پنڈی کی حدود میں ہوا تھا اور متعلقہ
تھانے کی جو حدود آتی تھی، وہاں انسپکٹر اعجاز شمس کی قانونی عمل داری تھی۔

تھانے پہنچتے ہی مجھے اور مردان شاہ کو فی الفور حوالات میں بند کر دیا گیا۔

''یہ......... اچھا نہیں ہوا نادر صاحب! یہ اچھا نہیں ہوا۔'' مردان شاہ جیل کی سیلن زدہ دیوار
اپنی پشت ٹکا کر ننگے فرش پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''میرے ساتھ تم بھی بے قصور دھر لئے گئے۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے کہا بھی تھا تم سے کہ.........''

''نہیں نادر صاحب! ایسا نہ کہیں۔'' وہ اچانک میری بات کاٹ کر بولا۔ ''مجھے اپنی فکر نہیں ہے۔
تو جلد یا بہ دیر چھوٹ ہی جاؤں گا۔ مگر آپ کا معاملہ مجھ سے زیادہ نازک ہے۔''

''اللہ مالک ہے......... دیکھیں، آگے کیا ہوتا ہے۔''

ذرا دیر گزری تو دو پولیس والے مجھے ہتھکڑیاں ڈالے انسپکٹر اعجاز شمس کے کمرے میں لے آئے
وہاں پہنچ کر میں بری طرح ٹھٹکا۔

''انسپکٹر اعجاز شمس کی میز کے سامنے ان دونوں افراد کو دیکھ کر میری کنپٹیاں سلگ اٹھی تھیں۔ وہ دونوں
کبیر اور کالا ناگ تھے۔

مجھے ہتھکڑیاں لگے دیکھ کر کالا ناگ اور بالخصوص کبیر کے چہرے پر مسرت انگیز لہر اُبھر آئی تھی۔ ا
ایک گہری نگاہ میرے چہرے پر ڈالنے کے بعد بڑی مکاری سے توصیفی لہجے میں بولا۔ اس کا مخاطب
انسپکٹر اعجاز تھا۔

''واہ انسپکٹر صاحب! آپ نے کمال کر دیا۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ لاش اور آلہ قتل برآمد ہو جانے کے
خونی شخص آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ مگر.........''

بعد یہ
اس کی بات قریب بیٹھے اس کے دم چھلے کالا ناگ نے اچک لی۔ وہ ایک نفرت بھری نگاہ میرے
چہرے پر ڈالتے ہوئے خوشامدی لہجے میں بولا۔

''اپنے انسپکٹر شمس صاحب کوئی معمولی انسان نہیں ہیں۔ انہوں نے تو بڑے بڑے مجرموں کا پتہ
صاف کر رکھا تھا کبیر صاحب! مجھے ہی دیکھ لیں، مجھ جیسے کو نکیل ڈال کر آخر شریفانہ زندگی گزارنے پر مجبور
کر ہی دیا ہے۔''

مجھے اس مردود کی آواز زہر لگ رہی تھی۔ میں خاموشی سے یہ سب سنتا رہا۔ البتہ اندر ہی اندر میں بری
طرح سلگ رہا تھا۔ کالا ناگ جیسے خطرناک بدمعاش کو تھانے میں دیکھ کر مجھے قدرے حیرت سی ضرور ہوئی
تھی۔ انسپکٹر اعجاز شمس اور کالو کا معاملہ کچھ عجیب دکھائی دے رہا تھا۔

دونوں کے تبصرے پر انسپکٹر اعجاز شمس کی گھنی مونچھوں تلے ہونٹوں پر ایک پُرغرور اور تفاخر آمیز
مسکراہٹ ابھری۔ پھر وہ میز سے اپنا سیاہ رول (بید) ہاتھ میں لئے اٹھ کھڑا ہوا اور میری طرف چند قدم
بڑھا۔ اس کے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہی کبیر اور کالا ناگ بھی ایک دم سے کھڑے ہو کر میری طرف
رخ کر کے انسپکٹر شمس کے قریب کھڑے ہو گئے۔

اب وہ تینوں برے کی طرح چبھتی ہوئی نظروں سے میرے چہرے کی طرف گھورے جا رہے تھے۔

''نادر علی خان! تم سمجھتے تھے کہ تمہارا بھیانک جرم قانون کی نظروں سے پوشیدہ رہے گا.........'' معا
انسپکٹر شمس نے سیاہ رول کو اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر ہولے ہولے مارتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔
پھر ہنکارا لے کر دوبارہ بولا۔ ''تم اپنے جرم کا اقرار کرو گے یا پھر اس کے لئے ہمیں روایتی تشدد سے کام
لینا ہوگا؟''

اس کے انداز پر جانے کیوں مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔
ایک سوال میں نے بڑی ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

''ملک سردار خان کی لاش تم تک کیسے پہنچی؟''

میرے سوال پر انسپکٹر کے ہونٹوں پر فخریہ مسکراہٹ اُبھری۔ کہنے لگا۔ ''کسی بھلے مانس نے گمنام
اطلاع دی تھی۔''

میں اس کے جواب پر الجھے بغیر جان گیا کہ یا تو وہ کبیر کا نام چھپا رہا تھا یا پھر یہ گمنام اطلاع کسی اور
نے ہی دی تھی۔

''اب کوئی سوال نہیں۔ صرف میری بات کا جواب دو۔'' انسپکٹر شمس مجھے خاموش پا کر اس بار ذرا
کرخت لہجے میں بولا۔

میں کچھ نہیں بولا۔ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ مجھے ہی نہیں بلکہ میری ماں اور ماموں حیدر گل کو بھی
قانونی شکنجے میں پھنسانے کے لئے دشمنوں نے دہری چال چلی تھی۔ اگر میں اپنے جرم کا اعتراف کرتا یا با
الفاظ دیگر میں اپنے دفاع میں قتل کا سبب یہ بتاتا کہ میں نے ملک سردار خان کا قتل اس اشتعال انگیزی
میں کیا تھا کہ اس نے ایک معصوم اور بے گناہ لڑکی (صدف) کے قتل کے احکامات اپنے مفرور ساتھی
غفورے کو جاری کئے تھے تو مجھے لامحالہ یہ بھی بتانا پڑتا کہ ملک سردار خان کو یہ سفاک حکم کس نے دیا تھا۔
یوں میری ماں اور ماموں حیدر گل کا کیس کمزور پڑ جاتا۔ پھر ہم تینوں بھی قانون کے شکنجے میں بری طرح

پھنس جاتے۔ میں نے لمحاتی سوچ بچار کیا، پھر پُر اعتماد انداز میں انسپکٹر کو دیکھ کر بولا۔

”یہ قتل میں نے نہیں کیا۔“

”ہوں.........“ انسپکٹر اعجاز شمس کے حلق سے بے اختیار طویل ہنکارا برآمد ہوا۔

”یہ......... یہ جھوٹ بول رہا ہے انسپکٹر صاحب!“ اچانک کالا ناگ پھٹ پڑا۔ ”یہ میرے بھا قاتل ہے۔ یہ باتوں سے نہیں مانے گا۔“

”تم چپ رہو کالو!“ معاً انسپکٹر اعجاز شمس نے اسے ٹوکا۔ پھر مجھ سے بولا۔ ”تو گویا تم ایسے نہیں گے؟“ اس کے لہجے میں سفاکانہ سرسراہٹ تھی۔

میں نے اپنے دفاع میں کہا۔ ”مجھے حیرت ہے انسپکٹر صاحب! کہ آپ نے محض ایک گمنام کال لاش برآمد تو کر لی مگر آپ کو یہ کیسے علم ہوا کہ یہ قتل میں نے ہی کیا ہے؟“

”آلۂ قتل پر تمہارے فنگر پرنٹس موجود ہیں۔“ وہ دانت پیس کر بولا۔

”کیا اتنی جلدی فنگر اسپیشلسٹ نے رپورٹ بھی دے دی؟“ میرے لہجے میں ہلکا طنز در آیا تھا۔

”زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں نادر!“ وہ کرخت لہجے میں بولا۔ ”تمہارے اس کا ایک چشم دید گواہ بھی یہاں موجود ہے۔“

میں اس کی بات پر بری طرح ٹھٹکا۔

”کبیر صاحب! ذرا بتاؤ اسے کہ تم نے بدھ اور جمعرات کی درمیانی شب کیا دیکھا تھا؟“ وہ قر کھڑے کبیر سے طنزیہ انداز میں مخاطب ہو کر بولا اور میں سناٹے میں آ گیا۔

”میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے ملک سردار خان کی پیشانی پر گولی مارتے دیکھا تھا۔“ کبیر میری طرف گھورتے ہوئے انسپکٹر سے کہا اور میں سفید جھوٹ پر ششدر رہ گیا۔

”تفصیل بتاؤ۔“ انسپکٹر بدستور میرے چہرے پر اپنی چبھتی ہوئی نظریں مرکوز رکھتے ہوئے بولا او تفصیل بتانے لگا۔

”آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ اس کی ماں اور ماموں حیدر گل نے ہم سے جانے کون سی پرانی کے بدلے میری چھوٹی معصوم بہن صدف کو اغواء کروایا تھا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ کام بھی اسی سنگ نے ہی انجام دیا ہو گا۔ چوں کہ میں اس کا دست راست رہ چکا تھا لہٰذا میں اس کے خفیہ ٹھکانوں بخوبی واقف تھا۔ اس رات بھی اس کا تعاقب کرتا ہوا اس پرانے ریسٹ ہاؤس پر پہنچا تو یہ میرے سا ملک سردار خان کی پیشانی پر گولی مار کر فوراً اندر بھاگا تھا۔ تب تک اس کا ساتھی غفورا، جو ابھی تک مف ہے، اس ظالم کے حکم پر میری بہن صدف کا گلا دبا کر معصوم کو ہلاک کر چکا تھا اور......... اور.........“ کہنے کے بعد وہ مگر مچھ کے آنسو بہانے لگا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اپنی بہن کے قتل پر وہ ایکا ایکی غمز گیا ہو۔

”یہ سراسر بکواس کر رہا ہے انسپکٹر صاحب!“ میں چلا کر بولا۔

”خاموش!“ اعجاز شمس نے دھاڑ کر کہا۔

”انسپکٹر! یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے خود محکمہ جنگلات کے کنزرویٹو آفیسر شا کی بیٹی نگینہ کو اغواء کیا تھا......... اور.........“

”بس......... اب تم سچ کو جھوٹ میں بدلنے کی کوشش مت کرو۔“ انسپکٹر میری بات کاٹ کر زہ لہجے میں بولا۔ ”میں آج ہی فنگر پرنٹس کی رپورٹ تیار کروا کر تمہیں دکھائے دیتا ہوں۔ تمہاری ما

ذہانت اور ہٹ دھرمی ناک کے راستے بہہ نکلے گی۔“

”انسپکٹر! آپ صرف اس سے ایک سوال تو پوچھ لیں کہ اگر اس نے ملک سردار خان کا قتل کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا تو پھر اب تک خاموش کیوں رہا؟ .... اسے تو اسی وقت پولیس کو میرے خلاف پر رپورٹ لکھوا دینی چاہیئے تھی۔“ میں نے کبیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انسپکٹر سے پُر جوش لہجے میں کہا تو اس کی بجائے کبیر نے اس کا جواب دیا۔

”تمہارے جیسے سنگ دل انسان کے خلاف میرے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہ تھا......... کیونکہ تم نے ملک سردار خان کا قتل کرنے کے بعد اس کی لاش کہیں چھپا دی تھی اس لئے میں پہلے لاش اور آلہ قتل برآمد کرنا چاہتا تھا اور میں بدستور تمہاری ٹوہ میں رہنے لگا۔ بالآخر میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا اور فوراً پولیس کو مطلع کر دیا۔“

میں خونخوار نظروں سے اسے گھورنے لگا۔ اس نے میری ایک فاش غلطی سے بھرپور فائدہ اٹھایا تھا۔ اس کی یہ بات تو بہر حال مبالغہ نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ میری بدستور ٹوہ لئے ہوئے تھا۔

میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ نگینہ پراسرار طور پر غائب تھی۔ جبکہ صدف مرڈر کیس کا ایک اہم مجرم غفورا ہنوز مفرور تھا۔ میں نے اب تک کبیر اور بلال عرف کالا ناگ کے گٹھ جوڑ سے متعلق جو بھی محتاط اندازے قائم کئے تھے، وہ سب ایک ایک کر کے درست ثابت ہو رہے تھے۔

کبیر اپنا ٹرمپ کارڈ بڑی کامیابی کے ساتھ کھیل چکا تھا۔ اور میں بری طرح سے دشمنوں کے بچھائے ہوئے جال میں گرفتار ہو گیا تھا۔

انسپکٹر اعجاز شمس نے مجھے یہ دھمکی دینے کے بعد کہ فنگر پرنٹ کی رپورٹ کے بعد وہ مجھ سے اچھی طرح نمٹے گا، مجھے دوبارہ حوالات میں بند کر دیا تھا۔

❄❄❄

دشمن نہ صرف مجھے بلکہ میری ماں اور ماموں حیدر گل کو بھی اپنا ٹارگٹ بنا چکے تھے۔ بلکہ میں ان کی ہٹ لسٹ میں ٹاپ پر تھا۔

حالات گنجلک ہو چکے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، کیا ہو گا؟ اور میں کیا کروں؟ نگینہ کی طرف سے مجھے الگ فکر و تشویش لاحق تھی۔ میری گرفتاری کے بعد تو دشمنوں کا راستہ صاف ہو چکا تھا۔ وہ اسے بہ آسانی تلاش کرنے کے بعد اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ سب سے پہلے مجھے عین وقت پر گرفتار کروایا گیا تھا۔ یہ ساری سازش قادر علی خان مرڈر کیس کو اپنے حق میں بدلنے کی تھی جو میرے دشمن بڑی کامیابی اور شاطرانہ ذہنیت کے ساتھ کر رہے تھے۔

حوالات میں، میں نے ساری تفصیل اپنے اندیشوں کے ساتھ مردان شاہ کو بتا دی تھی۔

”میرا آزاد ہونا بہت ضروری ہو گیا ہے نادر صاحب!“ مردان شاہ نے دبے دبے جوش سے کہا۔ میں اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھا تھا۔ وہ پھر بولا۔ ”مگر میں اپنے لئے نہیں، آپ کے لئے رہا ہونا چاہتا ہوں نادر صاحب! میں آپ کے خلاف دشمنوں کی چالوں کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں، کسی طرح نگینہ بہن کے ساتھ غفورے کا بھی سراغ لگاؤں۔“

میں اس کی ذہانت اور زود فہمی پر عش عش کر اٹھا اور جوشِ مسرت سے اس کے کاندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے بولا۔ ”مردان شاہ! تم بالکل درست خطوط پر سوچ رہے ہو۔ یہی دو افراد دشمنوں کی چال الٹنے کا باعث بن سکتے ہیں۔“

"لیکن نادر صاحب! میرا خیال تھا کہ غفورے سے زیادہ نگینہ بہن کا سراغ لگانا ضروری ہوگا۔" پُرخیال لہجے میں بولا۔ "جبکہ غفورا اُلٹا آپ کی والدہ اور ماموں حیدر گل کے لئے مصیبت بھی بن سکتا کیونکہ........" وہ اچانک کچھ کہتے کہتے دانستہ رکا تو میں اس کی ادھوری بات کا مطلب سمجھتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔

"میں تمہاری بات کا مطلب سمجھ رہا ہوں مردان شاہ! تم یہ کہنا چاہ رہے ہو نا کہ غفورے نے تو میری ماں اور ماموں حیدر گل کے ایما پر صدف کا خون کیا تھا مگر ایسا نہیں تھا۔"

وہ خاموش مگر مستفسرانہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"ہاں........ جب میرے دل سے اپنی ماں اور ماموں حیدر گل کی طرف سے یہ غلط فہمی نکل گئی کہ انہوں نے ہی میرے باپ کا خون کیا تھا تو میں نے ایک موقع پر ماموں حیدر گل سے اس المیے کے بارے میں بڑے دکھ کے ساتھ ذکر کیا تھا کہ انہوں نے اپنے دیرینہ انتقام کی آگ میں ایک بے گناہ معصوم لڑکی کو کیوں مروا دیا تو ماموں حیدر گل نے مجھے بتایا تھا کہ وہ میری ماں کو اکثر و بیشتر سمجھاتا رہتا کہ وہ اپنے شوہر (میرے باپ قادر علی خان) کے انتقام کی آگ صرف اس کے اصل قاتلوں (نظر جان اور شاہ میر) تک ہی محدود رکھے۔ کوئی بے گناہ اس کی بھینٹ نہ چڑھے۔ لیکن جب میری ماں نے دیکھا کہ اس کے شوہر کے قاتلوں نے اس کے بیٹے یعنی مجھے بھی اس کی ماں کے خلاف کر دیا ہے تو انہوں نے آتش انتقام میں مغلوب ہو کر یہ انتہائی قدم اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ اور ملک سردار خان کو صدف کا خون کرنے کے احکامات جاری کر دیئے تھے۔ مگر ماموں حیدر گل کے سمجھانے پر وہ اپنے فیصلے پر پشیمان ہوئی تھیں اور انہوں نے یہ احکامات واپس لے لئے تھے مگر افسوس تب تک دیر ہو چکی تھی۔" یہاں تک کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔

وقت انجانے وسوسوں اور اندیشناک لمحات کی خبر دیتا ہوا بھاری سل کی طرح سرک رہا تھا۔

انسپکٹر اعجاز شمس نے اس روز لاش کا پوسٹ مارٹم اور آلہ قتل پر فنگر پرنٹس کی رپورٹ تیار کروالی تھی۔

چونکہ ہمارا کیس پہلے ہی عدالت میں چل رہا تھا، لہٰذا اس معاملے کو بھی صدف اینڈ قادر علی مرڈر کیس کے ساتھ نتھی کر دیا گیا تھا۔

ماں اور ماموں حیدر گل بھی میری طرح جیل کی سلاخوں کے پیچھے مقید تھے۔ میری گرفتاری کی خبر ان تک بھی ضرور پہنچ چکی ہوگی۔ بلکہ صرف ان تک تو بعد میں پہنچی ہوگی، پہلے تو آزاد لوگوں تک پہنچی ہوگی کیونکہ مجھ سے سب سے پہلے ملاقات کے لئے آنے والے اعظم خان تھے۔

"یہ........ یہ سب کیسے ہو گیا نادر بیٹے؟" وہ پریشان ہو کر بولے۔

میں نے مختصراً انہیں ساری روداد بیان کر دی۔ وہ چند ثانیے کے لئے کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

"انکل! آپ میری فکر چھوڑیں اور خدا کے لئے کسی طرح نگینہ کو تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ کہیں اس کی زندگی بھی خطرے سے دوچار ہو سکتی ہے۔"

"نادر بیٹے! معاملہ تمہاری سوچ سے بھی زیادہ گمبھیر ہو چکا ہے۔ سارے شواہد تمہارے خلاف جا رہے ہیں۔ بڑی مشکلوں سے تو کیس کے جیتنے کی اُمید پیدا ہوئی تھی۔ اب اس تازہ صورتِ حال نے سب بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ دشمنوں نے بڑی گہری چال چلی ہے۔ رہی بات نگینہ کو تلاش کرنے کی تو میرا خیال ہے، اب یہی آخری امید بچی ہے کہ اس کا پتہ چل جائے۔"

"جی ہاں انکل!" میں نے جلدی سے کہا۔ "لیکن انکل! آپ کسی طرح مردان شاہ کی ضمانت کا

بندوبست کر دیں۔ یہ رہا ہوتے ہی نگینہ کی تلاش میں لگ جائے گا۔"

"ہاں........ ویسے میں انسپکٹر اعجاز شمس سے مل کر ہی آ رہا ہوں۔ کوشش کرتا ہوں، کم از کم مردان شاہ کو رہا کرا دوں۔" وہ بولے۔ اس کے بعد وہ چلے گئے۔

منیجر مشتاق گوندل بھی آیا تھا۔ اس کے ساتھ مردان شاہ کا بوڑھا باپ اور بہن بھی آئی تھی۔ مجھے ان دونوں پر بے انتہا ترس آ رہا تھا۔ تاہم میں نے انہیں دلاسا دیتے ہوئے کہا تھا کہ مردان شاہ کا جرم زیادہ سنگین نہیں ہے۔ وہ دو ایک روز میں رہا ہو جائے گا۔"

اور پھر واقعی ایسا ہی ہوا۔ اعظم خان صاحب کی اس سلسلے میں کوششیں رنگ لائیں اور مردان شاہ کو شخصی ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ جبکہ میرا عدالت سے سات روز کا ریمانڈ لے کر تفتیش شروع کر دی گئی۔

ایڈووکیٹ حامد ہمدانی صاحب بھی مجھ سے ملنے آئے تھے۔ وہ بھی موجودہ اور اچانک بگڑی ہوئی مخدوش صورت حال پر خاصے متفکر اور پریشان نظر آ رہے تھے۔

تاہم انہوں نے مجھے یہی مشورہ دیا کہ میں ہرگز اقبالِ جرم نہ کروں۔ اس دوران وہ کوئی نکتہ سوچنے کی کوشش کریں گے۔

میں نے انہیں ساری حقیقت سے آگاہ کر دیا تھا۔ لیکن جب انہوں نے بھی اعظم خان صاحب کی یہ بات دہراتے ہوئے اس خدشے کا اظہار کیا کہ میری گرفتاری کے معاملے کو صدف مرڈر کیس یا بالفاظِ دیگر قادر علی خان مرڈر کیس سے نتھی کر کے میری ماں اور ماموں حیدر گل کا کیس کمزور کرنے کی کوشش کی جائے گی تو میں نے ٹھوس لہجے میں ایڈووکیٹ ہمدانی صاحب سے یہ کہہ ڈالا۔

"وکیل صاحب! آپ کوشش کیجئے گا کہ مجھے ماں اور ماموں حیدر گل کے کیس سے الگ ہی رکھتے ہوئے مقدمہ چلایا جائے۔"

وہ میری بات پر حیران و پریشان نظر آنے لگے اور پھر اسی لہجے میں بولے۔ "مگر نادر! اس طرح تو تم بری طرح قانون کی لپیٹ میں آ جاؤ گے۔"

"میرا اللہ مالک ہے وکیل صاحب!" میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "میرا کیس کمزور ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے ماں اور ماموں حیدر گل کا کیس متاثر ہو۔ آپ بس اپنی ساری توجہ میری ماں اور ماموں حیدر گل کو رہا کرانے پر مرکوز رکھئے گا۔ یہ آپ کا مجھ پر احسانِ عظیم ہوگا۔"

میرے حتمی فیصلے پر وہ پریشان ہو کر صرف اتنا بولے۔ "مگر........ تم........!"

"میں اپنی الگ راہ دیکھ لوں گا۔ اللہ میرے ساتھ ہے۔"

ایڈووکیٹ ہمدانی صاحب فکرمند چہرے کے ساتھ مجھے تسلی دے کر واپس لوٹ گئے۔

ادھر عدالت سے سات روز کا ریمانڈ لینے کے بعد انسپکٹر اعجاز شمس کے تیور کچھ خطرناک سے نظر آنے لگے۔ میرا خیال تھا کہ اعظم خان کے درمیان میں آنے سے وہ کچھ خیال کرے گا۔ مگر یہ میری خام خیالی تھی۔ تیسرے روز مجھے اس کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ مگر اس کے کمرے میں نہیں بلکہ عقوبت خانے میں۔ جہاں کا منظر ہی دل پر دہشت طاری کرنے کے لئے کافی تھا۔

دیواروں کا پلستر اُکھڑا ہوا تھا اور سیلن زدہ فرش کی طرف دیکھتے ہوئے کراہت کا احساس ہوتا تھا۔ چھت قدرے بلند تھی۔ جس کے وسط میں لوہے کی فولادی چرخی کے ساتھ موٹا سا رسہ جھول رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ کوئی مذبح خانہ تھا جہاں قصائی بکرے ذبح کر کے اسے چھت سے جھولتے ہوئے رسے سے الٹا لٹکا کر اس کی کھال کھینچتے ہوں۔ روح فرسا اذیت گاہ کو دیکھ کر ایک لمحے کو میں اندر سے لرز اُٹھا تھا۔

کمرے میں انسپکٹر اعجاز شمس کے علاوہ مجھے لانے والے دو سپاہی اور ایک نیم برہنہ سا کالا بھجنگ قصائی صفت جلاد بھی کھڑا مجھے اپنی لال انگارا آنکھوں سے گھورے جا رہا تھا۔

عقوبت گاہ کے گھٹے گھٹے اور سیلن زدہ ماحول سے میرا جی الٹنے لگا۔ ایک عجیب سی ناگوار بدبو سے دماغ پھٹنے کے قریب ہو رہا تھا۔ معاً انسپکٹر اعجاز شمس گونجیلی آواز میں مجھے مخاطب کر کے بولا۔

"نادر! میں آخری موقع دے رہا ہوں تمہیں۔ اپنا جرم سیدھی طرح قبول کر لو۔ بہ صورت دیگر یہ پتھروں کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتا ہے۔" اس کا اشارہ قریب کھڑے قصائی صورت جلاد کی طرف تھا جو مجھے بڑی بے چینی سے خونخوار نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔ میں نے اپنے شل پڑتے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے انسپکٹر شمس سے کہا۔

"انسپکٹر! میں کوئی عادی مجرم نہیں ہوں جو تم میرے ساتھ ایسا انسانیت سوز سلوک کرنا چاہتے ہو۔ میں ایک پڑھا لکھا شہری ہوں۔ ہمارا مقدمہ عدالت میں ...."

"بکواس بند کرو اپنی۔" اچانک ہی وہ میری بات کاٹ کر خونخوار آواز میں دھاڑا۔ "تم نے اپنا شریفانہ موقع بھی گنوا دیا۔ مگر اب بس........" وہ یہ کہتے ہوئے جلاد کو ایک مخصوص اشارہ کر کے غصے میں اپنا پاؤں پٹختے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔

اب وہاں میرے اور جلاد کے علاوہ صرف دو سپاہی موجود تھے۔ انسپکٹر اعجاز شمس کے عقوبت گاہ سے نکلتے ہی جلاد کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک اُبھری اور پھر اس نے پھٹی پھٹی سی، کھردری آواز میں سپاہی سے کہا۔

"اس کی ہتھکڑیاں کھول دو۔"

فوراً میری ہتھکڑیاں کھول دی گئیں۔ گرانڈیل جلاد میری طرف بڑھا اور مجھے اپنے دونوں ہاتھوں سے دبوچ کر چھت سے جھولتے ہوئے رسے کی طرف دھکیلا۔ پھر اس رسے سے اس نے میرے دونوں ہاتھ باندھ دیئے۔ اب میری دونوں ٹانگیں ننگی اینٹوں والے فرش سے تقریباً دو فٹ بلند تھیں۔ میں گویا ہوا میں معلق ہو چکا تھا۔

جلاد نے میری قمیض کو مٹھی میں دبوچ کر ایک جھٹکے سے پھاڑ ڈالا اور پھر ایک دیوار کی میخ سے جھولتے ہوئے ناگ کے چھوٹے پھن سے مشابہہ سیاہ رنگ کے چرمی بیلٹ کو اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

اگلے ہی لمحے دم بہ خود ماحول میں "شڑاپ" کی پھنکارتی ہوئی آواز اُبھری۔ چرمی بیلٹ میری پیٹھ پر پڑی اور اذیت کی ایک قیامت خیز لہر نے مجھے سرتاپا مرغ بسمل کی طرح تڑپا دیا۔ میرے حلق سے جگر پاش چیخ اُبھری تھی۔

میں کبھی ان کڑے حالات سے نہیں گزرا تھا۔ مجھے اپنی پیٹھ کی کھال نچتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ خیال تھا کہ ایک ضرب لگانے کے بعد وہ ذرا ستائے گا۔ مگر دوسرے ہی لمحے جیسے مجھ پر پے در پے تابڑ توڑ ضربات کی بارش کر دی گئی۔ کمرہ میری اذیت ناک چیخوں، چرمی بیلٹ کی مہیب "شڑاپ شڑاپ" اور وحشی جلاد کے ہانپنے کی آواز سے گونجنے لگا۔ میں درد و اذیت کے مارے ادھ موا ہونے لگا۔ میرے حواس ناقابل بیان اذیتوں کو مزید سہنے کی تاب کھونے لگے تھے اور میرا ذہن اندھیاروں میں ڈوبنے لگا۔ مگر اس سے پہلے کہ میں مکمل طور پر اپنے حواس کھو بیٹھتا، میں نے ہمت کر کے اپنے معلق جسم کی ساری توانائی کو دہانے میں سمیٹتے ہوئے چلا کر کہا۔

"بس کرو........ خدا کا واسطہ بس کرو........ انسپکٹر کو بلاؤ........ میں اپنا جرم قبول کرتا ہوں"

جلاد کا ہاتھ چابی ختم ہونے والے کھلونے کی طرح رک گیا۔

لیکن مجھے نیچے نہیں اتارا گیا تھا۔ البتہ ایک سپاہی معنی خیز مسکراہٹ سے جلاد کی طرف دیکھتا ہوا اذیت گاہ سے نکلتا چلا گیا۔ میں ہوا میں جھولتا، ہانپنے لگا۔ تھوڑی دیر گزری تو میری نیم وا آنکھوں نے انسپکٹر اعجاز شمس کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی اور وہ میری طرف دیکھتے ہوئے تضحیک آمیز انداز میں بولا۔

"بس نادر میاں!........ اتنی سی دیر میں سارے کس بل نکل گئے؟"

"انسپکٹر!" میں اپنی جسمانی اذیتوں کو جوش جنون کے پہاڑ تلے دباتے ہوئے لہورنگ لہجے میں بولا۔ "بے شک میں نے ملک سردار خان کا قتل کیا تھا۔ مگر انسپکٹر! یہ کسی بے گناہ کا قتل نہیں تھا۔ بلکہ ایک سفاک انسان کا قتل تھا۔" میں اتنا ہی کہہ سکا۔ اس کے بعد میری قوت برداشت ختم ہو گئی۔ مجھ پر یکایک ہی غشی سی طاری ہونے لگی تھی۔ میرا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا اور مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

❄❄❄

میری دوبارہ آنکھ کھلی تو میں نے خود کو سلاخوں کے پیچھے پایا۔ میں اوندھے منہ فرش پر بے سدھ پڑا تھا۔ حواس بیدار ہوتے ہی مجھے جسمانی ٹیسوں کا بھی احساس ہوا اور بے اختیار میرے حلق سے درد بھری کراہیں خارج ہو گئیں۔ قید خانے کے باہر راہداری میں بلب کی بیمار سی روشنی نظر آ رہی تھی۔

نہ جانے میں کتنی دیر تک بے ہوش رہا تھا۔ میں نے دانتوں تلے اپنی تکلیف کو دبایا، پھر اپنے مضروب جسم کو حرکت دی۔ معاً مجھے دردانگیز ٹیسوں کے ساتھ اپنے زخموں پر ٹھنڈک کا بھی احساس ہوا۔ میں نے بہ مشکل اپنے وجود کو گھسیٹ کر دیوار کے ساتھ ٹکایا اور ایک ہاتھ پشت پر لے جا کر زخم پر لگایا تو مجھے چکناہٹ کا احساس ہوا۔ تب مجھے اندازہ ہوا تھا، انسانیت سوز تشدد کے بعد میرے زخموں پر کوئی مرہم وغیرہ بھی لگا دیا گیا تھا۔

کونے میں پانی کا گھڑا رکھا تھا جس کے اوپر جست کا ایک ٹیڑھا میڑھا گلاس بھی اوندھا دھرا ہوا تھا میں اپنے حواس بحال کرنے کے بعد گھڑے کی طرف بڑھا اور گلاس اندر ڈال کر پانی بھرا اور اپنے لبوں سے لگا دیا۔ چند گھونٹ بھرنے کے بعد مجھے اپنے اندر کڑواہٹ سی محسوس ہوئی اور پھر میں جلدی جلدی دو گلاس غٹ غٹ چڑھا گیا۔

میرا اوپری بدن ابھی تک برہنہ تھا۔ ذرا دیر گزری تو ایک سنتری آیا۔ اس کے ہاتھ میں پرانے کپڑوں کا ایک جوڑا تھا۔ اس نے سلاخوں کے درمیانی خلا سے ہاتھ اندر لے جا کر وہ میری طرف اچھال دیا اور بولا۔ "اسے پہن لے........ ذرا دیر بعد تجھے پھر انسپکٹر صاحب کے سامنے پیش ہونا ہے۔" یہ کہہ کر وہ واپس لوٹ گیا۔

میں لباس تبدیل کر چکا تو دو سنتری مجھے لینے آ گئے۔ میرے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر سیدھا انسپکٹر اعجاز شمس کے کمرے میں لے گئے۔

وہ اپنی میز کے عقب میں دھری بھاری بھرکم کرسی پر بڑے ٹھسے کے ساتھ براجمان تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں میز پر دھری تھیں اور وہ ہاتھ میں سیاہ رنگ کا رول پکڑے ہوئے تھا جس سے وہ ہولے ہولے اپنی بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو "تھپتھپا" رہا تھا۔

اس کی تیز نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ میری نگاہیں میز کے وسط میں پیپر ویٹ کے نیچے دبے ایک اسٹامپ پیپر پر پڑیں جس کے نیچے ایک عدد قلم بھی رکھا ہوا تھا۔

"اس پر اپنے دستخط کر دو۔" وہ بہ دستور اپنی برماتی ہوئی نظریں میرے چہرے پر مرکوز رکھے ہوئے کرکرا کر بولا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ تمہارا اقبالی بیان ہے۔ جس میں تم نے اپنے جرم کا اقرار کیا ہے۔"

میں نے کچھ سوچ کر اس کاغذ پر دستخط کر دیئے۔ انسپکٹر کا چہرہ یکدم کھل اٹھا۔ اس نے فوراً سیدھا ہو کر وہ دستخط شدہ اسٹامپ پیپر اٹھا لیا اور آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ شاید اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

"ہوں .... اب میں تمہیں اڈیالہ جیل پہنچا کر ہی رہوں گا۔" دوسرے ہی لمحے وہ میری طرف گھورتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں بولا۔ مگر مجھ پر اس کے لہجے کی سنسنی خیزی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ مجھے واپس لوٹا دیا گیا۔

***

سات روز بعد میری عدالت میں پیشی ہوئی۔

ماں اور ماموں حیدر گل کو بھی اس دن عدالت میں پیش کر دیا گیا تھا۔ گویا میرے کیس کو بھی قادر علی خان مرڈر کیس کے ساتھ نتھی کرنے کی کوشش کی گئی۔

ماں اور ماموں حیدر گل کے چہروں پر از حد تشویش و پریشانی کے آثار تھے۔ انہیں میری گرفتاری اور وجۂ گرفتاری کا علم ہو چکا تھا۔

سماعت شروع ہوئی تو وکیل صفائی نے اپنے دھواں دھار دلائل کے زور پر میرے معاملے کو، ماں اور ماموں حیدر گل کے کیس سے الگ قرار دلوا دیا۔ یوں قادر علی خان مرڈر کیس کی شنوائی تو اس روز نہ ہو سکی البتہ جب میرے سلسلے میں سماعت شروع ہوئی تو میں نے فوراً پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق صحتِ جرم سے انکار کر دیا۔

چونکہ میں با ضابطہ طور پر ایڈووکیٹ ہمدانی صاحب کو اپنا وکیل صفائی مقرر کر چکا تھا چنانچہ جیسے ہی استغاثہ نے اقرارِ جرم والا دستخط شدہ بیان جج کے سامنے پیش کیا اور مجھ پر جرح کا آغاز ہوا تو میں نے سپاٹ لہجے میں اس بات کا اقرار بھی کر لیا کہ اس اسٹامپ پیپر پر میرے ہی دستخط ہیں تو بھری عدالت کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

"تم پاگل تو نہیں ہو؟" وکیل استغاثہ نے میرے کٹہرے کے قریب آ کر بھناتے ہوئے لہجے میں مجھ سے کہا۔ "ایک طرف تم صحتِ جرم سے انکار کر رہے ہو اور دوسری طرف، اسٹامپ پیپر پر اپنے دستخط کی حلفیہ تصدیق بھی کر رہے ہو، جس میں تمہارا اقرارِ جرم درج ہے۔"

میں نے پُر اعتماد لہجے میں جج صاحب کی طرف دیکھ کر از راہِ احترام کہا۔ "جج صاحب! میں وکیل استغاثہ سے صرف ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا مجھے اس کی اجازت مل سکتی ہے؟"

جج صاحب نے موٹے، سیاہ فریم کے عقب سے میری طرف دیکھ کر گمبھیر لہجے میں مختصراً کہا۔

"اجازت ہے۔"

میں نے طنزیہ نظروں سے اپنے کٹہرے کے سامنے کھڑے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا، پھر بولا۔ "وکیل صاحب! معذرت کے ساتھ .... اگر آپ کو ایک کمرے کی چھت سے جھولتے رسے کے ساتھ باندھ کر لٹکا دیا جائے۔ پھر آپ کی قمیض پھاڑنے کے بعد چمڑے کے لتروں کی قیامت خیز برسات

کر دی جائے تو میرا خیال ہے، آپ اس روح تک بلبلا دینے والے انسانیت سوز تشدد کے آگے مجبور ہو کر ایسے خود ساختہ اقبالِ جرم کے اسٹامپ پیپر پر ضرور اپنے دستخط کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

میرا خیال تھا کہ وکیل استغاثہ میرے کڑوے جملوں پر طیش میں آ جائے گا۔ مگر وہ بھی بڑا کائیاں تھا۔ جانتا تھا کہ غصہ دکھانے یا جوابی تلخ کلامی کرنے سے مجھے ہی فائدہ ہوگا تو وہ مسکرا کر طنزیہ لہجے میں بولا۔

"نادر میاں! میں کوئی عادی مجرم نہیں ہوں جو پولیس میرے ساتھ یہ سلوک کرے گی۔"

اس کی بات پر میں نے فوراً جج صاحب کو مخاطب کر کے اپنی صفائی میں کہا۔ "جج صاحب! وکیل استغاثہ نے میری بات کی سچائی خود ہی تسلیم کر لی کہ اگر کسی شریف انسان پر ایسا بھیانک اور انسانیت سوز تشدد کیا جائے تو وہ مجبور ہو کر بالآخر اپنے ناکردہ جرم کو قبول کرنے میں ذرا بھی نہیں ہچکچائے گا۔ کیا میں کوئی عادی مجرم ہوں؟ .... کیا میرا ریکارڈ کسی تھانے میں موجود ہے؟ .... میری قمیض اتار کر دیکھئے جج صاحب! آپ کو میری پیٹھ پر ہنٹروں کے سرخ نشانات نظر آ جائیں گے۔"

میری بات پر عدالت میں جیسے سانپ سرسرا گیا۔ وکیل استغاثہ پریشان سا نظر آنے لگا۔ وکیل صفائی ہمدانی صاحب نے فوراً میری قمیض اتروانے کی عدالت سے اجازت چاہی۔ میری قمیض اتار کر میری مضروب پیٹھ جج صاحب اور حاضرین عدالت کی طرف موڑ دی گئی۔

کمرۂ عدالت میں بھنبھناہٹ گونجنے لگی تو جج صاحب نے ہتھوڑی مار کر حاضرین عدالت کو خاموشی اختیار کرنے کو کہا۔ قریب کھڑا انسپکٹر اعجاز شمس مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگا۔ جج صاحب نے بہ غور میری پیٹھ پر سرخ لکیروں کو دیکھا، اس کے بعد مجھے قمیض پہنا دی گئی۔ میرے دستخط شدہ بیان کو دائرۂ خارج کر دیا گیا۔ پھر جرح کا اگلا مرحلہ شروع ہوا۔ جس میں آلۂ قتل اور فنگر پرنٹس کی رپورٹ پیش کر دی گئی۔

یہاں وکیل صفائی نے میرے حق میں یہ دلیل پیش کی کہ میری ماں اور میرے دشمن چونکہ مشترکہ ہیں اور جس طرح میری ماں کے ہاتھ میں آلۂ قتل دے کر اس پر اس کے شوہر کو قتل کرنے کا جھوٹا الزام لگایا گیا تھا، بالکل ایسی ہی چال دشمنوں نے اب میرے ساتھ بھی چلنے کی کوشش کی۔

جج نے اگلی پیشی تک کے لئے فیصلہ محفوظ کر لیا اور عدالت برخواست کر دی اور ساتھ ہی عدالت نے انسپکٹر اعجاز شمس کو بھی ایسا انسانیت سوز تشدد کرنے پر سختی کے ساتھ تنبیہہ کر ڈالی۔

"نادر! میں تمہیں اڈیالہ جیل پہنچا کر ہی دم لوں گا۔" حسب توقع جب مجھے انسپکٹر اعجاز شمس کے حکم پر اس کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ مجھ سے دانت پیس کر بولا۔ میں نے خاموشی ہی میں عافیت سمجھی۔ وہ محض ایک دھمکی دے پایا تھا جس سے اس کی بے بسی کا صاف پتہ چلتا تھا۔ شاید اسے میرے پُرزوں کا بہ خوبی اندازہ ہو چکا تھا۔

میں نے لوہے کو لوہے اور زہر کو زہر سے کاٹنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دشمن ہر طرح کے اوچھے ہتھکنڈے آزما رہے تھے۔ میں نے بھی اب انہی کے انداز میں جواب دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ایڈووکیٹ ہمدانی صاحب نے مجھے اب اس بات کی بھرپور تسلی دی تھی کہ میرے خلاف کیس کمزور پڑنے لگا ہے۔ دشمن اگر ہیرا پھیری کرنے کے گُر جانتے تھے تو ہم نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا تھا۔

مجھے مردان شاہ کا بے چینی سے انتظار تھا جسے میں نے ہر صورت میں نگینہ کا سراغ لگانے پر مامور کر رکھا تھا۔ وہ رہا ہونے کے بعد اب تک مجھ سے ملنے نہیں آیا تھا۔

ادھر اگلی دو تین پیشیوں کے بعد مجھے ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ جبکہ میری ماں اور ماموں حیدر گل کے

بارے میں ہمدانی صاحب نے ایک افسوس ناک خبر سنائی تھی کہ دو پیشیوں کے باوجود نگینہ کی پراسرار گمشدگی نے کیس کو کمزور کر ڈالا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ نگینہ کو ذہنی مریضہ قرار دے دیا گیا تھا اور اس کے باپ شاہ میر نے بھی کہا تھا کہ اس کی بیٹی کو پاگل پن کے دورے پڑتے رہتے تھے۔ اکثر وہ گھر بھی چھوڑ کر کئی کئی روز کے لئے غائب ہو جاتی تھی۔

میں گرین لاج آچکا تھا۔ حالات میرے حق میں تو موافق ہو گئے تھے۔ مگر ماں اور ماموں حیدر کے خلاف بد سے بدتر ہونے لگے تھے۔

میں نے رہا ہوتے ہی سب سے پہلے مردان شاہ کے گھر کا رخ کیا۔ اس کے بوڑھے باپ نے مجھے ایک خط دیا جو مردان شاہ نے میرے نام لکھا تھا۔

”وہ خود کہاں ہے بابا؟ اور یہ خط.........؟“ میں کچھ کہتے کہتے رکا۔

وہ بولا۔ ”بیٹا! میں خود اس کی وجہ سے پریشان ہوں۔ نہ جانے وہ اچانک کہاں چلا گیا ہے؟ آج اسے دوسرا دن ہے۔ یہ خط اس نے مجھے تمہیں دینے کے لئے کہا تھا۔“

میری پیشانی پر اُلجھنوں کا جال سا پھیل گیا۔ بہر طور میں نے خط لیا اور وہاں سے چلا آیا۔ پھر راستے میں کھڑے کھڑے میں نے بے چینی کے ساتھ وہ خط نکال کر کھولا اور پڑھنے لگا۔

”نادر صاحب! خدا کرے آپ جلد رہا ہو جائیں۔ یہ خط میں آپ تک پہنچا بھی سکتا تھا مگر آپ پہلے ہی پریشان ہیں۔ لہٰذا میں نے سوچا اگر آپ کی جلد رہائی ممکن ہو گئی تو آپ ضرور میرے گھر آئیں گے اس لئے یہ خط میں نے اپنے بوڑھے باپ کے حوالے کر دیا کہ جب آپ خود آئیں تو وہ اسے آپ کے حوالے کر دیں۔

نادر صاحب! میں نے جیل سے رہا ہوتے ہی فوراً سانپوں کے ٹولے کبیر اور کالا ناگ کی ٹوہ لینا شروع کر دی تھی۔ خدارا نادر صاحب! ذرا حوصلے سے میری بات بہ غور سنئے گا۔ نگینہ بہن ان دونوں خبیثوں کبیر اور کالا ناگ کے ہتھے چڑھ چکی ہے۔ وہ اپنے باپ شاہ میر سے بد دل ہو کر اپنی سہیلی غزالہ کے ہاں رہنے لگی تھی۔ پتہ نہیں وہ ان دونوں خبیثوں کے ہتھے کیسے چڑھ گئی تھی۔ بہر حال ایک روز جب میں کبیر اور کالا ناگ کا تعاقب کرتے ہوئے نتھیا گلی سے باڑیاں گیا جہاں میں گھنے جنگل کے درمیان ایک کاٹیج تک پہنچا، وہاں میں نے سن گن لینے کی بہت کوشش کی مگر مجھے زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔ میں فقط اتنا ہی جان سکا تھا کہ نگینہ بہن کو انہوں نے یہاں پر یرغمالی بنا رکھا تھا اور اب یہ لوگ اسے نہ جانے کس مقصد کے تحت نامعلوم برف پوش وادیوں کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ یہاں ان کے بہت سے مسلح ساتھی بھی موجود تھے۔ بہر طور مجھے جیسے ہی ان کے منصوبے کا علم ہوا تو میں نے اس وقت پولیس کو مطلع کرنے کا سوچا۔ مگر ایک تو میرے پاس وقت کم تھا دوسرے اس طرح نگینہ کی جان کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ کیونکہ یہ لوگ نہایت خطرناک نظر آرہے تھے اور یہ پورا گینگ کالا ناگ کا ہی معلوم ہو رہا تھا۔ ان کی روانگی میں چند گھنٹے تھے۔ میں نے آپ کو مطلع کرنا اس لئے ضروری سمجھا کہ کہیں آپ پریشان نہ ہوں۔ بہر حال جیسے تیسے یہ خط لکھ کر میں اپنے گھر پہنچا اور یہ خط اپنے باپ کو دے کر اسی وقت واپس لوٹ گیا۔ نادر صاحب! حوصلہ رکھئے گا۔ میں انشاء اللہ ضرور کامیاب لوٹوں گا۔“

آپ کا جاں نثار ساتھی.........مردان شاہ

خط پڑھنے کے بعد میرے ذہن میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ دل جیسے پھٹنے کے قریب ہو گیا اور رگوں میں لاوا دوڑنے لگا۔ شدتِ غیظ سے میرا وجود لرزنے لگا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی کیفیات پر قابو پایا۔

اول تو میرے لئے یہ خبر ہی لرزا دینے والی تھی کہ نگینہ کبیر اور کالا ناگ جیسے کمینے اور سفاک درندوں کے ہتھے چڑھ چکی تھی۔ دوسرا یہ کہ آخر یہ لوگ نگینہ کو لئے کس مقصد کی خاطر نامعلوم برف پوش وادیوں کی طرف محوِ سفر تھے۔ صورتِ حال جتنی نازک اور خطرناک تھی، اتنی ہی پراسرار بھی۔ یقیناً مردان شاہ بھی ان کے تعاقب میں روانہ ہوا تھا۔ مجھے اس پر بھروسہ تھا کہ وہ اپنی جان پر بھی کھیل سکتا تھا۔ مگر وہ بہر حال کبیر اور کالا ناگ جیسے خطرناک پیشہ ور ہرکاروں کے مقابلے میں تنہا تھا۔

مگر سوال اب یہ پیدا ہوتا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے تھا؟ ان لوگوں کو باڑیاں سے روانہ ہوئے دو دن بیت چکے تھے مگر میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے کب بیٹھنے والا تھا۔ چنانچہ میں سب سے پہلے گرین لاج پہنچا۔ مختصر تیاری باندھی۔ اس وقت دن کے بارہ بجے کا عمل تھا۔ فضل چاچا باغیچے میں مصروف تھے۔ سب سے پہلے میری سمجھ میں جو راستہ آیا، میں نے وہی اختیار کرنے کا حتمی فیصلہ کیا تھا۔ اس کے لئے سب سے پہلے میں نے باڑیاں پہنچنے کا ارادہ کیا۔ اور ابھی ”گرین لاج“ سے نکلنے ہی والا تھا کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔

نہ جانے کیوں فون کی گھنٹی سن کر مجھے عجیب سی بے چینی کا احساس ہوا تھا۔



ٹرن.........ٹرن.........ٹرن......... ٹیلی فون کی گھنٹی کرخت آواز میں بج رہی تھی۔

میں اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔ میرے بس میں ہوتا کہ میں اُڑ سکتا تو اُڑان بھر کر باڑیاں جا پہنچا میرا ارادہ بھی یہی تھا کہ برق رفتاری سے اس طرف روانہ ہو جاؤں۔ مگر ٹیلی فون کی گھنٹی نے میرے روک دیئے تھے۔ لمحاتی توقف کے بعد میں ایک فیصلے پر پہنچا اور تیزی سے ٹیلی فون سیٹ کی طرف لپکا

''نادر علی.........!'' میری تمام تر حسیات میری سماعتوں میں جمع ہو چکی تھیں۔ ان دو الفاظ ذریعے ہی میں نے ایڈووکیٹ حامد صمدانی صاحب کی آواز کو پہچان کر کہا۔

''جی.........وکیل صاحب!.........خیریت.........؟'' میرے لہجے میں ہیجان تھا۔

''خیریت ہی تو نہیں ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولے۔ میرے پیٹ میں گرہیں پڑنے لگیں۔

''پولیس نے ''صدف مرڈر کیس'' کے ایک اہم مفرور ملزم غفورے کو گرفتار کر لیا ہے۔'' انہوں سنسنی خیز انکشاف کیا۔

میں ایک لمحے کو سن ہو کر رہ گیا، پھر فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''کک.........کب.........کہاں سے.........؟''

''رات دو بجے کے قریب مانسہرہ میں ''بٹ راسی'' کے جنگل کی ایک بستی سے اسے گرفتار کیا ہے۔'' ایڈووکیٹ حامد صمدانی نے مختصراً تفصیل بتائی۔

''کون سی پولیس کا کارنامہ تھا یہ؟'' میں نے پوچھا۔

''پنڈی کے متعلقہ تھانے کی پولیس نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔'' وہ بتانے لگے۔ ''انسپکٹر اعجاز شم مخبر نے یہ اطلاع پہنچائی تھی۔ تم جانتے ہو نا کہ انسپکٹر شمسی ہی کو عدالت نے صدف اینڈ قادر علی خان مشترکہ کیس کا تفتیشی آفیسر مقرر کر رکھا ہے؟''

''جج.........جی ہاں.........مگر.........'' میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''تم محتاط رہنا نادر!'' انہوں نے تنبیہ کی۔ ''غفورے کا بیان تمہاری سمت موڑنے کی پوری کوش جائے گی۔'' چند ثانیوں کی پُرسوچ خاموشی کے بعد وہ متفکر لہجے میں بولے۔ تاہم دوسرے ہی لمحے خ سنبھالا لے کر قدرے مختلف انداز میں بولے۔ ''اب بڑی مشکل پڑ جائے گی۔ خیر......... میں سنبھا کی کوشش کروں گا اس کیس کو۔''

غفورے کا پولیس کے ہاتھ آ جانا......... ماں اور ماموں حیدر گل کے لئے ہی نہیں بلکہ خود میر لئے بھی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ کیونکہ غفورا ملک سردار خان کا آدمی تھا۔ اسی نے ملک سردار خان حکم پر صدف کی جان لی تھی۔ اس وقت میں دشمنوں کے بہکاوے میں آ کر اپنی ماں اور ماموں کا د ہوا تھا جبکہ ملک سردار خان نے انہی دو کی خواہش کی تعمیل میں غفورا کے ہاتھوں معصوم صدف کا قتل

تھا۔ میرا خیال تھا کہ انہوں نے نگینہ کو جان سے مارنے کا حکم دیا ہے اس لئے میں نے ملک سردار کو بھی جہنم واصل کر دیا تھا۔

ایسا لگا تھا کہ اس خونی کھیل میں گیہوں کے ساتھ گھن بھی پستے جا رہا تھا۔ خونی کھیل کی ابتداء میرے باپ کے بے گناہ قتل اور بعد میں میری بدنصیب ماں جس کے قتل کو جھوٹے الزام میں جیل کی کال کوٹھڑی کے پیچھے دھکیلنے والے ان دونوں شیطانوں نظر حیات اور شاہ میر ہی نے کی تھی۔

زلزلے، طوفان اور سیلاب......... انہیں قہرِ خداوندی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پھر کون جانے، بد اعمالوں کے ساتھ نیک لوگ بھی اس کی زد میں آ جاتے ہیں۔ ہمارے دشمن نظر حیات کی بیٹی صدف کا بے گناہ قتل بھی خطا کاروں کے ساتھ بے قصور مارے جانے والا معاملہ ثابت ہوا تھا۔

اگرچہ صدف میرے دشمنوں کی بیٹی تھی، لیکن میں بہرحال اس کے قتل کے حق میں نہ تھا۔ لیکن یہ بھی سچ تھا کہ میری ماں کے ساتھ تو اس سے بھی بڑھ کر ظلم ہوا تھا، اس کا انتقام کی آگ میں اس حد تک آگے بڑھ جانا فطری ردِعمل تھا۔

بے چاری......... اپنے ناکردہ جرم کی پاداش میں اپنی جوانی کے قیمتی سال جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں گزار چکی تھی اور اصل مجرم دندناتے پھر رہے تھے۔ اور پھر یہی نہیں، دشمنوں نے بعد میں اس کے بڑھاپے کے سہارے کو بھی چھیننے کی کوشش کی اور اس کے بیٹے کو اپنی ہی دکھی اور بدنصیب ماں اور ماموں کے خلاف ورغلانا بھی چاہا۔

کون تھا.........؟ جو اس غم زدہ اور دکھوں کی ماری ہوئی ایک ماں کے دل کے زخموں کا احساس کرتا کہ دنیا نے تو اسے اپنے شوہر کا قاتل سمجھا ہی تھا، اس کے بڑھاپے کے سہارے، اس کے بیٹے یعنی میرے دل میں بھی یہ زہر بھر دیا گیا کہ اس کے باپ کی قاتل اس کی ماں ہے۔ ایسے خطرناک اور چال باز دشمنوں کے خلاف میری ماں کے دل کی آتشِ انتقام اس قدر بھڑک اُٹھی کہ اسے اپنے دشمنوں کی موت بھی ایک معمولی سزا محسوس ہونے لگی تھی۔ تو وہ بھی انہیں پہلے اسی طرح ذہنی اذیتوں سے دوچار کرنا چاہتی تھی۔

یہ سارے خیالات لمحوں میں میرے ذہن سے گزرتے چلے گئے۔ میں نے سر جھٹکا اور اپنی موجودہ حالت میں واپس آ گیا۔ مجھے خیال آیا کہ اس واقعے کی اطلاع اعظم خان صاحب کو ضرور دے دینی چاہئے کہ وہی اس کے کیس کو دیکھ رہے تھے۔

''نادر بیٹے!.........تم بالکل فکر نہ کرو۔'' ساری بات سننے کے بعد انہوں نے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔ ''غفورا ہمارا آدمی ہے.........وہ ہمارے خلاف اپنی زبان بند رکھے گا۔''

''مگر.........خان صاحب.........!''

''نہ.........نہ.........خان صاحب نہیں۔'' انہوں نے پُرشفقت لہجے میں مجھے ٹوکا۔

''سوری.........انکل! میں یہ کہہ رہا تھا کہ غفورا انسپکٹر اعجاز شمسی جیسے قصائی کے سامنے اپنی زبان کھولنے پر مجبور ہو سکتا ہے۔'' میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ دوسری طرف چند ثانیے خاموشی چھائی رہی پھر آواز اُبھری۔

''نادر بیٹے! میں نے کہا نا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کیا تم اپنے انکل کو معمولی آدمی سمجھتے ہو؟'' ان کے لہجے کی پراسراریت نے مجھے عجیب سی اُلجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔

''تم دیکھتے جاؤ نادر!.........میں کرتا کیا ہوں۔ دشمن اگر ہمارے ساتھ شاطرانہ کھیل، کھیل سکتا ہے تو

ہم بھی اس کا منہ توڑ جواب اس کے انداز میں دینا جانتے ہیں۔ تم بتاؤ، نگینہ کے بارے میں کچھ پتہ چلا؟"

"میں ابھی ابھی اسی کی تلاش میں جا رہا تھا۔" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"کیا مطلب؟" وہ قدرے چونک کر بولے۔ "کیا نگینہ کا کوئی سراغ مل گیا ہے؟"

ان سے چھپانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ پھر میں نے انہیں مردان شاہ اور اس کے خط کے بارے م تفصیلاً بتا دیا۔ وہ یہ سب سن کر پُرسوچ انداز میں بولے۔ "نگینہ کو تلاش کرنا اشد ضروری ہے۔ یہی ایک ہے .... ہمارے سارے مسائل کا حل.......... جس کی بناء پر نہ صرف دشمنوں کو قانون کے شکنجے جکڑا جا سکتا ہے بلکہ تمہاری ماں اور ماموں بھی جیل سے رہا ہو سکتے ہیں۔ اس لئے میں تمہیں نگینہ کو تلا کرنے کی پُرخطر مہم پر جانے سے نہیں روکوں گا۔ لیکن تمہارا تنہا جانا کسی طور بھی مناسب نہ ہوگا۔ .... میں اپنا ایک آدمی بھیج رہا ہوں .... وہ.........."

"نہیں انکل!" میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے التجائیہ انداز میں کہا۔ "آپ فکرمند نہ ہوں! مجھے اکیلا جانے دیں۔ مجھے یقین ہے کہ اپنے دشمنوں کے لئے میں اکیلا ہی کافی ہوں گا۔"

"پلیز بیٹے! ضد مت کرو۔" انہوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

"انکل! .... آئی ایم سوری .... مجھے جانے دیجئے۔ میرے پاس وقت پہلے ہی بہت کم ہے۔ آپ پلیز غفورے والا معاملہ سنبھالنے کی کوشش کیجئے گا۔" میں نے بڑے اصرار سے کہا۔

"اچھا بیٹا .... خدا تمہاری مدد کرے .... تم بے فکر رہو .... میں غفورے والا معاملہ سنبھالنے کی پوری کوشش کروں گا۔" وہ آخر میں میری ضد کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے بولے اور پھر م نے خدا حافظ کہہ کر ریسیور جلدی سے رکھا اس کے بعد تیزی سے باہر نکلا۔ اپنی جیپ تباہ ہونے کے ب میں نے شوروم سے کرائے پر سیکنڈ ہینڈ جیپ ہائر کر لی تھی۔ چنانچہ ذرا دیر بعد ہی میری جیپ آندھی طوفا کی مانند اڑی چلی جا رہی تھی۔

❊❊❊

تقریباً نصف گھنٹے کی تیز رفتار اور نان اسٹاپ ڈرائیونگ کے بعد میں "کلڈنہ چوک" پر آ گیا۔ دائ طرف "جھیکا گلی" اور چھ کلومیٹر کے بعد "گالف کورس" سے سیدھا راستہ بھوربن کی طرف جاتا تھا۔ روٹ مجھے طویل پڑتا اس لئے میں نے شارٹ کٹ راستہ اپناتے ہوئے جیپ بائیں طرف موڑ لی۔ ب "باڑیاں" پہنچ کر "خیرہ گلی" کی طرف مڑ گیا۔ میرے دائیں بائیں بلند و بالا سبزہ زار پہاڑ تھے۔ سڑ کے اطراف صنوبر کے درختوں کی قطاریں تھیں۔ چار کلومیٹر کے بعد "چھانگلہ گلی" شروع ہو گئی جو 1400 فٹ بلندی پر تھی۔ اس قدر بلندی پر میری جیپ کی رفتار مجھے کسی وقت بھی قصرِ فنا میں دھکیل سکتی تھی۔ لیکن میرے سر پر نگینہ کو کبیر اور کالا ناگ جیسے درندوں کے چنگل سے بچانے کا اس قدر جوش آمیز جنون سوار کہ مجھے کسی بات کی پرواہ نہیں رہی تھی۔

خدا خدا کر کے "گھوڑہ گلی" ختم ہوئی۔ گلیات کا سلسلہ ختم ہوا۔ میں مردان شاہ کے بتائے ہوئے کے مطابق کلوڑی، باگنا کے درختوں والے گھنے جنگل میں داخل ہو گیا۔ اب میری جیپ پختہ سڑک اتر کر ناہموار راستے پر دوڑی چلی جا رہی تھی۔ تقریباً دو اڑھائی کلومیٹر بعد مجھے سامنے ہی ایک اُجلے زار پر دیوار .... کھو کے پیڑوں کے بیچ .... کتھئی رنگ کا چوبی کاٹیج نظر آ گیا۔ میں یہاں پہلے آ چکا تھا۔ میرا کاروبار ہی ایسا تھا کہ مجھے اپنے ٹال کی لکڑیوں کے لئے ان علاقوں کی طرف نکلنا پڑتا یہ کاٹیج درحقیقت کسی دور میں سرکاری ریسٹ ہاؤس رہ چکا تھا۔ بعد میں اسے ایک ریٹائرڈ کنزرویٹو

ے خرید کر سیاحوں کے لئے پرائیویٹ گیسٹ ہاؤس کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اس ت وہ مجھے بالکل اُجاڑ اور ویران نظر آ رہا تھا۔ میں نے جیپ گیٹ کے قریب جا کر روکی۔ چار اطراف تلف النوع پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں جیپ سے نیچے اتر آیا۔

کاٹیج کی حالت بہت خستہ ہو رہی تھی۔ اس کی بوسیدہ حالت سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ پرائیویٹ گیسٹ ہاؤس کے طور پر کامیاب نہیں ہو سکا تھا یا پھر اس کا مالک دنیا میں نہیں رہا تھا۔

گیٹ کا ایک پٹ ٹوٹ کر گر چکا تھا۔ جبکہ دوسرا بھی گرنے کے قریب تھا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ اندر جابجا جنگلی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ سالخوردہ چوبی دیواروں میں جابجا رخنے نظر آ رہے تھے جہاں ابابیلوں اور دیگر پرندوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ متروک احاطے میں اوک، چنار اور سلور خر کی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ میں اپنے اطراف میں نظریں دوڑاتا ہوا مرکزی دروازے کی طرف بڑھا جو بند تھا۔

ابھی میں نے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اچانک وہ کھل گیا۔ میں بری طرح ٹھٹک گیا۔ سامنے ایک خاستری چہرے والا دبلا پتلا شخص کھڑا مجھے اپنی زرد آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ پتہ نہیں اسے شدید قسم کا یرقان تھا یا ویسے ہی اس کی آنکھیں پیلی زرد تھیں۔ البتہ میں اسے دیکھ کر بولا۔

"یہاں .... اور کون رہتا ہے؟"

اس نے ایک نظر سرتاپا مجھے بغور اپنی زرد آنکھوں سے گھورا، پھر اپنی شخصیت سے ہم آہنگ عجیب آواز میں مستفسر ہوا۔

"تم کو کس سے ملنا ہے؟"

"میرے یہاں کچھ دوست ٹھہرے ہوئے ہیں۔ دو روز پہلے کی بات ہے، تم بتا سکتے ہو کہ وہ کہاں ہیں؟" میں نے بلا تامل پوچھا۔

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"ہاں، ابھی تین چار روز پہلے کی بات ہے .... چار پانچ چھڑے چھانٹ لونڈے آئے تھے۔"

"ہاں ...." میں جلدی سے بولا۔ اور پھر اسے کالا ناگ اور کبیر کے حلیے بتا کر پوچھا کہ وہ دونوں بھی ان "لونڈوں" میں شامل تھے؟ اس نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔ میرے اعصاب تن گئے۔

"ان کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہوگی؟" میں نے مضطربانہ انداز میں جلدی سے پوچھا۔ میری بات پر وہ جواباً کچھ یاد کرتے ہوئے بولا۔

"ہاں .... ایک لڑکی تو تھی .... مگر وہ بے ہوش تھی .... اسے اونچے لمبے، کالے شخص نے اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا تھا کہ وہ بیمار ہے۔"

اس کی بات سن کر میرے دماغ میں سائیں سائیں ہونے لگی۔

"وہ .... وہ سب کدھر گئے ہیں؟" میں نے تیز تیز چلتی سانسوں کے ساتھ پوچھا۔

"پتہ نہیں .... مگر ایک روز بعد ہی وہ صبح تڑکے ایک لمبی سی جیپ میں روانہ ہو گئے تھے۔ البتہ میں نے ان کی آپس میں ہونے والی باتیں سنی تھیں۔ وہ کسی "بڈھیار" کے علاقے کا ذکر کر رہے تھے .... میرا خیال ہے وہ وہیں گئے ہوں گے۔"

اس نے بتایا اور پھر رازدارانہ لہجے میں بولا۔

"بابو جی! مجھے وہ کچھ ٹھیک آدمی معلوم نہیں ہو رہے تھے۔ مجھے پورا شک ہے کہ انہوں نے اس بے چاری لڑکی کو ضرور اغواء کیا ہوگا۔"

"ہاں۔ تم صحیح کہہ رہے ہو۔" میں نے کہا۔ اس کا شکریہ ادا کر کے میں اپنی جیپ کی طرف
یہ سارے علاقے نتھیا گلی کے بیرونی علاقے تھے۔

میں جس بھرپور امید کے ساتھ یہاں آیا تھا وہ پوری ہو چکی تھی۔ میں نے جیپ اسٹارٹ کی
جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

"بڈھیار" یہاں سے زیادہ دور نہ تھا مگر راستہ دشوار گزار ہونے کی وجہ سے میں ایک لمبا چکر
بڈھیار کی طرف روانہ ہو گیا۔

شکر تھا کہ موسم خوشگوار تھا۔ ورنہ تو یہ سارا علاقہ بارانی تھا......... مگر میں موسم کی "خوشگوار
سلسلے میں زیادہ دیر تک پُرامید نہیں رہ سکتا تھا۔ کیونکہ یہاں کے موسموں کے تیور بدلنے میں زیادہ
لگتی تھی۔

بہرطور......... میں تنگ اور دشوار گزار راستوں پر اپنی جیپ کو مہارت سے دوڑاتا ہوا بالآخر
کے قریب جا پہنچا۔

"نتھیا گلی" کی طرح یہاں بھی کنڈال اور عباسی اقوام کے لوگ آباد ہیں جو ہندکو اور پہاڑی
کا امتزاج بولتے تھے۔ لیکن میری یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ لوگ نگینہ کو یہاں کس مقصد
لائے ہوں گے؟ میری تشویش میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اگرچہ مجھے کسی حد تک یہ تسلی تو تھی
جاں نثار ملازم دوست مردان شاہ، کبیر اور کالا ناگ کے شیطانی ٹولے کے تعاقب میں ہو گا۔ مگر
اس کے میرے دل کو کسی طور بھی قرار نہیں آ رہا تھا۔ مجھے تھوڑی بہت پہاڑی زبان آتی تھی اور باقی
میں اشاروں کی بین الاقوامی "زبان" سے پوری کر سکتا تھا۔ میں نے "بڈھیار" کا سارا علاقہ چھان
لیکن مجھے کہیں بھی شیطانی ٹولے کا سراغ نہ مل سکا۔

خیرہ گلی کے اس متروکہ کاٹیج کے زرد آنکھوں والے چوکیدار ٹائپ شخص سے میں نے ان کی جیپ
رنگ وغیرہ کے بارے میں بھی پوچھ لیا تھا۔

لہٰذا میں نے یہاں پہنچ کر مقامی لوگوں سے سرمئی کلر کی اولڈ ماڈل لینڈ کروزر جیپ میں سوار
افراد کے بارے میں استفسار کیا تھا......... لیکن کوئی بھی مجھے اس کے متعلق نہیں بتا پایا تھا۔ اب تو
پریشانی بڑھنے لگی تھی۔ نگینہ سے متعلق انجانے وسوسوں اور پُرتشویش اندیشوں کے چیونٹے میرے
بدن پر رینگنے لگے۔

مجھے رہ رہ کر یہی خیال کسی ناگ کی طرح ڈسے جا رہا تھا کہ کہیں کالا ناگ کا یہ شیطانی ٹولا میری
کو کسی قسم کا جانی نقصان نہ پہنچانے کی کوشش کرے۔ اگرچہ کبیر بھی ان کے ہمراہ تھا اور وہ بہرحال
قتل کرنے کے حق میں نہ ہو گا۔ لیکن کالا ناگ سفاک انسان تھا۔ اس سے کچھ بھی بعید نہ تھا کہ مجھے
اذیتوں میں مبتلا کرنے کے لئے خطرناک انتقامی قدم میرے خلاف اٹھا سکتا تھا اور مجھے سب سے
تشویش بھی کبیر کی بجائے کالا ناگ کی طرف سے تھی۔

میں نے سوچا......... کہیں ایسا تو نہ تھا کہ ان کا یہاں آنے کا ارادہ ملتوی ہو گیا ہو اور وہ کہیں
گئے ہوں......... اس خیال نے مجھے مزید پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ میرے اور کالا ناگ کے
ٹولے کے درمیان پورے اڑتالیس گھنٹوں کا فاصلہ تھا......... یہ "فاصلہ" جغرافیائی حدود کا بھی ہو
اور وقت و حالات کا بھی......... میرے دل و دماغ پر بری طرح وحشتیں سوار ہونے لگیں۔

بالآخر میں نے اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ نئے سر

سرے غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ مجھے خیرہ گلی اور بڈھیار کے درمیانی راستے پر واقع پہاڑی بستیوں کو زیادہ باریکی سے کھنگالنا ہو گا۔

چنانچہ یہ فیصلہ کر کے میں نے جیپ واپس موڑ دی۔

سڑک پر دو رویہ سبزہ زار کے درمیان پتلی نہری لکیر کی طرح ترائیوں میں اُتر رہی تھی۔ دائیں بائیں شاہ بلوط درختوں سے بھینی بھینی خوشبوئیں آ رہی تھیں۔ لیکن اس وقت میرے حواس پر نگینہ کی طرف سے تشویش پریشانی سوار تھی۔ آسمان پر تیرتی ہوئی بادلوں کی ٹکڑیاں ابھی برف رنگ کی تھیں مگر وہ کسی بھی لمحے سیاہ گھنگھور گھٹاؤں میں بدل سکتی تھیں۔

میں نے ترائی میں دائیں جانب واقع کھپریل کے چند جھونپڑی نما گھر دیکھ کر جیپ ایک درخت کے قریب روک دی اور نیچے اُتر آیا۔

درخت پر بیٹھا ہوا ایک سرخ سر کا مرغاب بھرا مارتا ہوا اُڑا۔ سیٹی بجا کر ایک نیلے پروں والا Thrust بھی بالکل میرا سر چھوتا ہوا گزر گیا۔ میں نے جیپ کے دروازے وغیرہ لاک کئے اور سڑک کے کنارے واقع کھپریل کے جھونپڑے نما گھروں کی طرف پیدل بڑھا۔ یہاں ایک دو گھروں کے سامنے کچھ جوان لڑکیاں بالیاں جنگلی مٹر اور نیلے پائن توڑ رہی تھیں۔ وہ مقامی لباس میں تھیں۔ میری طرف دیکھ کر وہ آپس میں چہلیں کرنے لگیں اور مسکرا مسکرا کر مجھے دیکھنے لگیں۔ میں ان الھڑ لڑکیوں پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ وہ دوبارہ اپنے کاموں میں مصروف ہو گئیں۔

ایک گھر سے میں نے پچاس پچپن سالہ ایک سرخ و سپید عمر رسیدہ شخص کو نکلتے دیکھا۔ میں فوراً اس کی طرف بڑھا اور اسے سلام کرنے کے بعد پوچھا۔

"بابا!......... کیا تم نے آج سے دو تین روز پہلے یہاں سے کسی لمبی سی سرمئی رنگ کی جیپ کو گزرتے دیکھا تھا؟"

وہ ایک نظر میرے چہرے پر ڈال کر ہلکی مسکراہٹ سے بولا۔ "بابو صیب! یہاں سے روزانہ ہی طرح طرح کی موٹر کاریں گزرتی ہیں۔ کچھ یاد نہیں پڑتا۔"

میں نے اپنے سوال کی ذرا وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "بابا! میرا مطلب تھا کہ آپ نے نہیں تو یہاں کسی اور نے دیکھی ہو وہ جیپ؟"

"اگر دیکھی بھی ہوتی تو ہم کیا بتا سکتے تھے کہ وہ کدھر گئی؟" وہ بولا۔ "ویسے بات کیا ہے آخر؟"

"بابا! دراصل وہ لوگ خطرناک مجرم تھے جو ایک لڑکی کو اغوا کر کے یہاں سے گزرے تھے۔" اسے سچ بتانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

اس کے چہرے پر ذرا چونکنے کے آثار نمودار ہوئے اور وہ ناصحانہ لہجے میں بولا۔ "بیٹا! پھر تو تمہیں پولیس کو اطلاع کرنی چاہئے تھی۔ یہ کام وہ زیادہ اچھے طریقے سے کر سکتی تھی۔"

"میں نے رپورٹ درج کروا رکھی ہے اور پولیس بھی انہیں ڈھونڈ رہی ہے......... لیکن میں اپنے طور پر بھی ان کا کھوج لگانا چاہتا ہوں۔"

"کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ وہ بدبخت بدمعاش ادھر ہی سے گزرے تھے؟" اس نے کچھ سوچتے ہوئے اچانک پوچھا۔

"ہاں بابا! میں باڑیاں اور گلہڑہ گلی سے ان مجرموں کا کھوج لگاتا ہوا یہاں پہنچا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور ان کی آخری منزل "بڈھیار" کا ہی علاقہ تھا۔"

"اچھا........ یہ بات ہے۔" وہ یکدم پُر جوش نظر آنے لگا۔ وہ ایک پہاڑی غیرت مند شخص
فوراً بولا۔

"آؤ کاکا! میرے ساتھ۔ وزیر خان سے پوچھتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ ایک طرف کو چل دیا۔
اس کے ساتھ چلتے ہوئے وزیر خان کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ جنگل کا سرکاری
دار تھا۔ میں اس بھلے مانس کے ساتھ چلتا ہوا سڑک پر آ گیا تو اس کی نظر قریب کھڑی میری جیپ پر

"کیا یہ تمہاری جیپ ہے؟" اس نے ذرا رک کر مجھ سے پوچھا۔ میں نے اثبات میں
ہوئے کہا۔

"جی ہاں........ اگر وزیر خان کا گھر دور ہے تو اس جیپ میں چلتے ہیں۔"

"نہیں........ آگے جیپ کا راستہ نہیں ہے۔ پیدل ہی چلنا ہوگا۔ زیادہ دور بھی نہیں جانا پڑے
آؤ میرے ساتھ۔" وہ بولا اور پھر سڑک پار کر کے دوسری طرف کے جنگل میں داخل ہو گیا اور میں
سے اس کے عقب میں چل پڑا۔

سڑک کے دوسری طرف کا یہ جنگل نسبتاً گھنا اور گنجان تھا۔ یہاں کوئی آبادی نظر نہیں آ رہی تھی
دیودار اور چیڑ کے درختوں کے درمیان کھیت کھلیان ضرور نظر آ رہے تھے۔ کچھ لوگوں کو بھی میں
کرتے دیکھا تھا۔ لگ بھگ چالیس پچاس قدم چلنے کے بعد سامنے ایک خوبصورت چوبی ریسٹ
دکھائی دیا۔ ریسٹ ہاؤس چیڑ اور اخروٹ کے درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ عقب میں بڑا خوبصورت
افزا سبزہ پھیلا ہوا تھا جس کے پار برف پوش پہاڑیوں کے تاج دُھوپ میں چمکتے دکھائی دے رہے
ہم تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ریسٹ ہاؤس کے نزدیک پہنچے۔ ریسٹ ہاؤس پر عجیب سی خاموشی اور
کا راج تھا۔

"اوئے وزیرے!" احاطے پر نصب گیٹ کے قریب پہنچ کر عمر رسیدہ شخص نے آواز دی۔ لیکن
بار کی آوازوں پر بھی جب اندر سے کوئی برآمد نہ ہوا تو وہ بڑبڑایا۔

"جندرا (تالا) بھی نہیں لگا ہوا۔ لگتا ہے یا تو وہ حرام خور اندر سو رہا ہے یا پھر گھر چلا گیا ہے
دیکھتا ہوں اندر جا کر۔"

وہ گیٹ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وزیر خان اندر ہی تھا اور سو رہا تھا۔ وہ عمر رسیدہ شخص ذرا دیر بعد
سے لوٹا تو اس کے ہمراہ ایک درمیانی قامت مگر مضبوط تن و توش کا لمبا شخص بھی تھا۔ اس کی عمر
کے قریب ہوگی۔ اس نے ایک بوسیدہ سا لمبا "چیسٹر" پہن رکھا تھا۔ کسی شہری آفیسر کا انعام نظر
اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ وہ بے چارہ شاید رات بھر پہرے کے بعد دن میں
پوری کر رہا تھا۔

"یہ ہے وزیرا........ اب تم خود ہی پوچھ لو۔" وہ عمر رسیدہ شخص مجھ سے بولا۔ "اور ہاں کاکا
اگر اس نے بھی تمہیں نہیں بتایا تو پھر سمجھو اور کوئی بھی تمہیں نہیں بتا سکتا۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

پھر جب وہ چلا گیا تو میں نے وزیر خان کی طرف دیکھ کر پہلے معذرت خواہانہ انداز اپنایا
سوال دہرا دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ذرا سوچنے کی کوشش کرے گا لیکن میرا سوال سنتے ہی وہ فوراً بولا

"ہاں بابو صیب! .... شاید دو دن پہلے ہی کا ذکر ہے۔ ایک لمبی سی جیپ اس طرف آئی تو

میرے دل کی دھڑکنیں یک لخت بے ترتیب ہونے لگیں اور میں خوش امیدی کے سہارے بے قراری
بولا۔ "ہاں........ ہاں........ وہی۔"

"اس میں چار پانچ افراد بھی سوار تھے۔ ایک لڑکی بھی تھی ان کے ساتھ۔ جو شاید بے ہوش تھی یا پھر
وہ بتانے لگا۔ میرے سینے میں بے طرح ہلچل مچنا شروع ہو گئی۔ میں بے چینی سے اس کے آگے
کا منتظر رہا۔

"وہ لوگ ادھر ہی آئے تھے۔ لیکن وہ رکے نہیں تھے۔" وہ صراحت بیان کرنے لگا۔ "میں اس وقت
باغ میں گوڈی کر رہا تھا۔ میں نے ذرا کھڑے ہو کر احاطے کی دیوار سے باہر جھانکا تھا، وہ سیدھا آگے
نکل گئے تھے۔"

"کہاں؟"

"اس طرف........" اس نے ریسٹ ہاؤس کے عقب میں سبزے سے ڈھکے ہوئے میدان کے بیچ
بیچ سے راستے کی طرف اشارہ کیا۔

میں ہونٹ بھینچ کر چند ثانئے کے لئے کچھ سوچنے کے بعد مستفسر ہوا۔ "کیا تم بتا سکتے ہو کہ آگے کون
سا علاقہ ہے؟"

"میرے خیال میں پچیس، تیس کلومیٹر کے فاصلے تک تو کوئی آبادی نہیں ہے۔ کیونکہ اس میدان کے
پار کائل، پڑتل اور دیودار کے ایک وسیع و عریض اور گھنے جنگل کی حدود شروع ہو جاتی ہے۔ پھر اس کے
بعد برف پوش وادیاں ہیں۔ وہ لوگ اس سے آگے نکل گئے ہوں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" اتنا بتا کر وہ
رخصت ہونے کی نیت سے جماہیاں لیتے ہوئے ساتھ ہی اپنی آنکھیں بھی مسلنے لگا۔ میں نے اس کا
شکریہ ادا کیا اور خود واپس سڑک کی طرف چل پڑا۔

میرے سینے میں زبردست پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی۔ جہاں میں بڑی کامیابی کے ساتھ اب تک کالا ناگ
اور کبیر وغیرہ کا کھوج لگاتے ہوئے یہاں تک پہنچا تھا، وہیں اگرچہ آگے بھی مجھے کامیابی کی امید پیدا
ہونے لگی تھی۔ لیکن میرے اور ان کے درمیان اڑتالیس گھنٹوں کا جو طویل وقفہ تھا اس نے مجھے ہنوز بے
قرار اور پریشان کر رکھا تھا جو وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

وزیر خان نے مجھے ان کی گزرگاہ کا جو راستہ بتایا تھا، وہ ایک قدرتی "ٹریک" تھا جو دشوار گزار بھی ہو
سکتا تھا لیکن چونکہ کالا ناگ بھی اس ٹریک سے گزر چکا تھا لہٰذا میں نے بھی وہی راستہ اختیار کرنے کا
فیصلہ کیا۔

میں نے رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ اس ساری دوڑ دھوپ میں تقریباً پانچ چھ گھنٹے صرف ہو چکے
تھے اور اب سہ پہر کے تین بجے کا عمل تھا۔ میں جلدی سے جیپ پر سوار ہوا اور اسے اسٹارٹ کر کے آگے
بڑھا دیا........ ایک ڈیڑھ کلومیٹر کے بعد میں نے جیپ بائیں جانب جنگل میں موڑ دی۔ پھر ایک لمبا
چکر کاٹ کر میں وزیر خان والے ریسٹ ہاؤس کے قریب سے گزرتا ہوا اس کے بتائے ہوئے ٹریک پر
روانہ ہو گیا۔

میری بھوک پیاس تو کب کی اُڑ چکی تھی۔ چاہتا تو میں بہتے ہوئے قدرتی چشمے سے تھوڑا پانی پی سکتا
تھا لیکن میرے سر پر نگینہ کو تلاش کرنے کی دُھن بری طرح سوار تھی اور میں اس مقصد کے لئے ایک لمحہ
بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

راستہ تنگ تھا اور کہیں کہیں ڈھلوان ہونے کے باعث مجھے جیپ کی رفتار کم کرنا پڑ رہی تھی۔ لیکن

جہاں ذرا بھی راستہ سیدھا ہوتا، میں ٹاپ گیئر پر پورا ایکسیلیٹر دبا دیتا۔ جیپ غراتی ہوئی ایک طوفانی بگ
سے آگے بڑھتی مگر ذرا دور تک تیز رفتاری کے بعد اچانک کوئی نہ کوئی موڑ آ جاتا۔

راستہ مزید دُشوار گزار ہوتا جا رہا تھا۔ ایک طرف ڈھلواں سبز جنگل تھا تو دوسری طرف گہری ترا
اور کھائیاں تھیں۔ کئی ''دھوکا'' دینے والے موڑ بھی آ رہے تھے۔ یعنی ایسے موڑ جو بظاہر دور سے پینتا
ڈگری کے محسوس ہوتے تھے لہٰذا ڈرائیور دھوکا کھا کر گاڑی کی رفتار مطلوبہ حد تک ذرا کم کر کے جیسے ہی
کاٹنے لگتا تو نزدیک پہنچنے پر پتہ چلتا کہ موڑ کے فوراً بعد سڑک تقریباً ''یوٹرن'' لئے ہوئے ہے اور
گاڑی کا کھائی میں گرنا لازمی امر ہوتا۔

میں بھی اس وقت کچھ ایسی ہی خطرناک قسم کی جلد بازی کا شکار تھا اور میرا واسطہ بار بار ایسے خطرنا
موڑ سے پڑ رہا تھا۔ ایک ایسے ہی موڑ پر میں نے جیسے ہی اپنی جیپ موڑی، آگے یک دم کھائی آ
میں نے بریک پر پاؤں رکھ دیا، ایکسیلیٹر چھوڑ دیا۔ نتیجتاً جیپ کھائی میں گرنے سے تو بال بال بچ گئی گر
ناہموار سڑک پر اُلٹی اور پھر خود ہی سیدھی ہو گئی۔

شکر تھا کہ میں نے بیلٹ باندھ رکھی تھی اس لئے سر پر معمولی سی چوٹیں آئی تھیں۔ البتہ ونڈ اسکر
ایک چھناکے سے ٹوٹ چکی تھی۔ لیکن جب میرے حواس بحال ہوئے تو میں نے سامنے دیکھا، جیپ
اگلے دونوں ٹائر سڑک سے اتر کر ہزاروں فٹ گہری کھائی میں جھول رہے تھے اور جیپ نصف کھائی
اور نصف سڑک پر کھڑی ہولے ہولے جھول رہی تھی۔ میں پوری جان سے لرز اٹھا اور اپنی جگہ پر ٹن ہو
بیٹھ رہا۔ حتیٰ کہ میں نے اپنی سانس بھی روک لی۔ جیپ کا توازن ذرا بھی بگڑتا تو وہ ہزاروں فٹ گہ
کھائی میں جا لڑھکتی اور میری ہڈی پسلی ایک ہو جاتی۔ جیپ کا انجن بند ہو چکا تھا۔ میں ایک خوفنا
حادثے سے بال بال بچا تھا۔ چند ثانئے بعد میں نے نہایت دھیرے دھیرے سیٹ بیلٹ کھولی اور آہ
کے ساتھ دروازہ کھول کر نیچے اُتر آیا اور جیپ سے باہر نکلتے ہی میں نے بے اختیار گہرے گہرے سان
لئے۔ اس کے بعد بہ غور جیپ کی اس خطرناک ''SEESAW'' پوزیشن کا جائزہ لینے لگا۔

بہت مشکل صورتِ حال تھی۔ میں جیپ کو ریورس نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے اندر سوار ہونا بھی خطر
سے خالی نہ تھا۔ پھر پتہ نہیں وہ اسٹارٹ ہوتی بھی کہ نہیں۔ اگر اسٹارٹ ہو بھی جاتی تو ریورس گیئر ڈال
اسے پیچھے کرنے کا خطرہ مول لینے کا مطلب خودکشی بھی ہو سکتا تھا۔

میں نے سڑک پر کھڑے کھڑے اپنے چہار اطراف نظریں دوڑائیں۔ مجھے کچھ مقامی آدمیوں
تلاش تھی جو میرے ساتھ جیپ کو پیچھے کی طرف دھکیلنے میں میری مدد کر سکتے۔ لیکن دور دور تک پرندوں
چہکار کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ تاہم نیچے بہت دور ترائیوں میں چند کھپریل کی ڈھلوانی چھتوں کی چمنیوں
دھواں اُٹھتا دکھائی دے رہا تھا۔ میرے عقب میں کوسوں دور ''میراں جانی'' کی برف پوش چوٹی ڈھ
دھوپ میں چمکتی نظر آ رہی تھی۔ میں بے بسی کے باعث جھنجلا گیا اور خود اپنے آپ پر غصہ آنے لگا کہ
جلد بازی کا کیا فائدہ کہ اب میں یوں ویرانے میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے کھڑا تھا۔

رسٹ واچ میں وقت دیکھا، سہ پہر کے چار بج کر پندرہ منٹ ہونے لگے تھے۔ سردیوں کے د
یوں بھی تیزی سے ڈھلتے ہیں اور شمالی برف پوش علاقوں میں تو سرِ شام ہی رات کا گماں ہونے لگتا ہ
مجھے اب یہ بھی فکر کھانے لگی کہ یہ سارا جنگلاتی علاقہ تھا۔ رات ہوتے ہی خطرناک جانوروں کے نکلنے
خطرہ الگ دامن گیر ہو رہا تھا۔ ان علاقوں میں دیگر چھوٹے موٹے جانوروں کے علاوہ جنگلی بھیڑیوں
ریچھوں کے اپنی کمین گاہوں سے نکلنے کا خطرہ بھی تھا۔

میری پریشانی اور بے قراری میں ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اضافہ ہو رہا تھا۔ میرا میگارد جیپ کے
ڈیش بورڈ کے خانے میں موجود تھا۔

چانک میں نے محسوس کیا کہ سبک خرام ہواؤں میں سردی کی لہر بڑھنے لگی تھی۔ میں نے یوں تو موسم
پیشِ نظر زم اُونی سویٹر اور ایک لمبا سا چیسٹر پہن رکھا تھا اور ایک اُونی ٹوپی بھی چیسٹر کی ایک اندرونی
نما جیب میں موجود تھی۔ البتہ دستانوں سے میں محروم تھا۔ چیسٹر کے کالر میں نے کانوں تک کھڑے
لئے تھے۔ دور مغرب میں برف پوش چوٹیوں کے عقب میں سورج جھکنے لگا تھا۔ آسمان پر چھائے
بادلوں کے برف رنگ آوارہ ٹکڑے آپس میں مدغم ہونے لگے تھے۔ ہواؤں کی تیزی میں اضافہ اور
لی کاٹ کو محسوس کرتے ہی مجھے موسم کے تیور خطرناک ہونے کا اندازہ ہونے لگا۔

تب میں نے ایک خطرناک رسک لینے کا فیصلہ کر لیا۔ کیونکہ مجھے دھواں دھار بارش ہونے کا خدشہ
ہونے لگا تھا اور ان علاقوں میں بارشوں کے بعد برف باری کا امکان لازمی ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں
میرے لئے یہ خطرناک رسک لینے کا بھی موقع ہاتھ سے چلا جاتا۔

میں نے جیپ میں سوار ہو کر اسے اسٹارٹ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اب میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ
اسٹارٹ ہونے سے انکار نہ کر دے۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور آہستگی کے ساتھ جیپ کی ڈرائیونگ
پر بیٹھا تو وہ پھر آگے پیچھے ہلنے لگی۔ میرے آگے موت کی صورت میں ہزاروں فٹ گہری کھائی تھی
تب میں زندگی .... مگر اس وقت موت میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ میں نے اگنیشن سوئچ میں
چابی کو گھمایا۔

''چز......زززز.......'' کی آواز اُبھری اور پھر خاموشی چھا گئی۔ میرا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ اس
ڈوبتے سورج کے سامنے کثیف بادلوں کی چادر سی تن گئی جس نے پوری وادی کو اندھیرے میں
لیا۔ میں نے دوبارہ چابی گھمائی مگر دوسری بار بھی انجن محض گھرگھرا کر خاموش ہو گیا۔ میرا اضطراب
جا رہا تھا۔

بارش کے آثار بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ وادی میں گہرا سناٹا چھا گیا تھا۔ چرند پرند بھی دبک گئے
بادل گھنیرے ہونے لگے تھے۔ بس اب کسی بھی لمحے موسلا دھار بارش ہونے والی تھی۔

میں جیپ کا بونٹ اٹھا کر بھی تو خرابی نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ جیپ کا اگلا نصف حصہ تو گہری کھائی
معلق تھا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور تیسری باری چابی گھما دی۔ جیپ کا انجن گھرگھرانے لگا اور دوسرے
لمحے غرا کر بیدار ہو گیا۔ میرے اندر مسرت کی بجلی چمکی۔ اب خطرناک مرحلے کا آغاز ہونا تھا۔ میرے
اعصاب تن گئے تھے۔ کنپٹیاں سنسنا رہی تھیں۔ انجن کے بیدار ہوتے ہی جیپ نے بھی اور زیادہ اوپر
حرکت شروع کر دی تھی۔ اگر جیپ اُنیس بیس کے ذرا سے بھی فرق سے آگے کو جھک جاتی تو اس
آگے کا تصور لرزا دینے والا تھا۔ میں نے کلچ پر پاؤں رکھا اور ریورس گیئر ڈالا۔ اس کے بعد ایکسی لیٹر
ذرا ذرا دباؤ ڈالتے ہوئے کلچ چھوڑنے لگا۔

جیپ کے انجن کی تیز ہوتی گھرگھراہٹ، ہتھوڑے کی طرح میرے سینے پر پڑ رہی تھی۔ جیپ کے
دونوں ٹائر گھومے۔ جیپ نے ایک جھٹکا کھایا اور وہ آگے سے کھائی کی طرف جھکنے لگی۔ میرا رواں
رواں کانپ اٹھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں ہوا میں معلق، سیدھا کھائی میں جانے والا تھا۔ مگر میں نے اپنی
کوشش جاری رکھی اور دوسرے ہی لمحے جیپ نے پیچھے حرکت کی۔ چند انچ پیچھے حرکت کرتے ہی میں نے
ایکسیلیٹر پورا دبا دیا......... جیپ زوردار غراہٹ کے ساتھ سڑک پر آ گئی۔ میں نے فوراً بریک پر پاؤں

رکھ دیا اور جیپ کو نیوٹرل کرنے کے بعد بے اختیار گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ ٹھٹھراتی ہوئی ... باوجود میری پیشانی پر ننھی ننھی بوندیں نمودار ہوگئی تھیں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے بعد گیئر ڈال کر جیپ کا اسٹیئرنگ موڑا اور آگے روانہ ہوگیا۔

***

اچانک آسمانی بجلی زوردار آواز کے ساتھ کڑکی اور موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ وادی میں ... پھیلنے لگا تھا۔ میں نے جیپ کی ہیڈ لائٹس روشن کر دی تھیں۔ اب مجھے پہلے سے بھی زیادہ احتیا... ساتھ ڈرائیونگ کرنا پڑ رہی تھی۔ ونڈ اسکرین ٹوٹنے کے بعد کاٹ دار ہوائیں میرے چہرے سے ٹکرا... تھیں۔ شکر تھا کہ بارش کا زور زیادہ نہ تھا مگر سڑک پر اب پھسلن ہونے لگی تھی۔ میں جیپ کو تیس... کی اسپیڈ سے زیادہ چلانے کا متحمل نہ ہوسکتا تھا۔ چونکہ میں ذرا دیر پہلے ہی ایک انتہائی خطرناک ... سے بچ نکلا تھا اس لئے مجھے اتنا بھی غنیمت ہی محسوس ہو رہا تھا۔ مگر اب میری کارکردگی بارش اور راس... مایوس کن حد تک بہت گھٹا دی تھی۔

میں نہایت مہارت کے ساتھ ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ بارش کا ایک ہموار سلسلہ جاری تھا۔ راستہ ... ناہموار اور کچا ہوتا جا رہا تھا اور بارش کے پانی نے کیچڑ جیسی صورت حال پیدا کر دی تھی۔ ایک بار ... کاٹنے کے دوران میری جیپ پھر گول گھوم گئی۔ میں نے نہایت ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے ... مطلوبہ سمت موڑا۔ اس موڑ کے بعد آگے کا راستہ مجھے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں ذرا سیدھا مگر عمودی نظر ... جب جیپ چڑھائی چڑھنے لگی تو نصف راستے پر پہنچ کر وہ رک گئی۔ ٹائر گول گھوم کر رہ گئے۔ کیچڑ ... سے جیپ دوبارہ نیچے کی طرف سرکنے لگی تھی۔ میں نے فوراً ایکسلیٹر سے پاؤں ہٹا دیا اور بریک ... اب صورت حال یہ تھی کہ میں جیپ آگے بڑھانے کے لئے ایکسلیٹر دباتا تو وہ بجائے چڑھائی ... کے پیچھے ہونے لگتی اور ساتھ ہی اس کا زاویہ بھی بدلنے لگتا۔

میں بری طرح پریشان ہوگیا۔ میری کارکردگی ایک بار پھر صفر پر آ گئی تھی۔ بارش کا سلسلہ جاری ... میں نے بریک پر پاؤں رکھتے ہوئے دھیرے دھیرے جیپ کو ”بیک“ کیا۔ میں نے بریک دبا رکھا ... میں نہ آگے جا سکتا تھا، نہ ہی پیچھے۔

میری پیش قدمی ایک بار پھر رک گئی تھی۔ مگر اس مرتبہ میں پہلے سے زیادہ مشکل کا شکار تھا۔ ... ٹوٹی ہوئی ونڈ اسکرین سے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں بغور سامنے کیچڑ زدہ راستے کا جائزہ لیا تو مجھے ... طرف پہاڑی کے ساتھ ساتھ والا حصہ کم کیچڑ والا محسوس ہوا۔ میں نے اسٹیئرنگ مذکورہ سمت میں ... اور بریک سے پاؤں ہٹا کر کلچ پر رکھ دیا، پھر ایکسلیٹر دباتے ہوئے کلچ چھوڑنے لگا۔

جیپ کا انجن غرانے لگا۔ چاروں پہیے پھسلنے کی حد تک گھومنے لگے۔ جیپ آگے بڑھنے کی ... عقب سے رخ بدلنے لگی اور پھر دوسرے ہی لمحے جیپ ذرا پیچھے کھسکنے کے بعد چند انچ آگے بڑھی ... نے ایکسلیٹر پورا دبا دیا۔ میری فور وہیل ڈرائیو جیپ کے چاروں پہیے تیزی سے گھومنے لگے اور ... دھیرے دھیرے آگے سرکتی ہوئی چڑھائی چڑھنے لگی۔ میں جیپ کو پہاڑی کے بالکل ساتھ ملا کر ... بڑھانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ یہ راستہ نسبتاً کم کیچڑ زدہ ہونے کی وجہ سے میری جیپ نے ... رینگ رینگ کر اپنی مقررہ رفتار پکڑ لی۔ اب چاروں پہیے سوکی اسپیڈ سے کیچڑ میں پھسلتے ہوئے گھو... تھے۔ مگر جیپ تیس، چالیس کی رفتار سے زیادہ نہیں دوڑ پا رہی تھی۔ میرے لئے اتنا ہی کافی تھا۔

اس اعصاب شکن ڈرائیونگ نے مجھے تھکا مارا تھا لیکن جستجو اور جوشِ جنوں نے اس کی پروا...

آخر میں اسی طرح مہارت اور مشاقی سے چڑھائی چڑھنے میں کامیاب ہوگیا۔ اب جیپ پوری طرح کنٹرول میں تھی۔ بارش کے چھینٹے ٹوٹی ہوئی ونڈ اسکرین سے اندر پڑ رہے تھے اور میرا چہرہ بھیگ ... مگر میں کب ہار ماننے والا تھا۔ جیسے تیسے میں نے اپنا سفر جاری رکھا۔

پھر مزید دو گھنٹوں کی اس خطرناک اور اعصاب شکن ڈرائیونگ کے بعد میں ایک قدرے مسطح قطع پر پہنچ گیا۔ سامنے برف پوش پہاڑیاں میرا راستہ روکے ہوئے تھیں۔ اپنے بلند و بالا اور طویل حجم کی وجہ سے وہ دیکھنے میں تو بالکل قریب ہی محسوس ہوتی تھیں مگر میں جانتا تھا کہ ان کا فاصلہ ابھی کئی میلوں کی مسافت پر تھا۔

بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ میں نے جیپ روک دی تھی۔ کالے بادل خوب برسنے کے بعد ٹکڑیوں میں بٹنے لگے تھے۔ نتیجتاً وسطی راتوں کے چاند کا رخِ روشن اوٹ سے نمودار ہونے لگا تھا۔ رات اپنے جوبن پر تھی۔ بھیگی راتوں کے چاند کی روشنی نے خاموش اور تاریک وادی کو منور کر دیا تھا۔

جیپ اسٹارٹ تھی۔ میں قرب و جوار میں نظریں دوڑانے لگا۔ سامنے میلوں دور تک تاریکی کا راج تھا۔ میں نے جیپ دوبارہ آگے بڑھا دی۔ میں یہ سوچ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا تھا کہ آخر نگینہ کو ان برف ویرانوں میں لانے کا کیا مقصد ہوسکتا تھا۔ میرے اُلجھے ہوئے خیالوں میں بار بار یہی سوال اُبھر رہا تھا کہ اگر کبیر اور کالا ناگ نے نگینہ تک رسائی حاصل کر ہی لی تھی تو وہ اسے کہیں بھی یرغمال بنا کر رکھ سکتے تھے۔ بھلا آبادی سے کوسوں دور اسے یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ وہ سوال تھا جس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ابھی بمشکل دو تین کلومیٹر کا فاصلہ ہی طے کیا ہوگا کہ اچانک جیپ کا انجن گھرگھرا کر خاموش ہوگیا۔ میں نے دوبارہ جیپ اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ جب فیول بتانے والی سوئی پر نظر پڑی تو بے اختیار میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ سوئی E یعنی اینڈ کے قریب پہنچ چکی تھی۔

دشوار گزار راستوں کی وجہ سے جیپ کا پٹرول مقررہ وقت سے بہت پہلے ہی کھپ چکا تھا۔ میرے پاس ایک فاضل گیلن تھا۔ میں دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ میرے دائیں جانب گھنا جنگل تھا جبکہ بائیں طرف مختصر سے سبزے سے ڈھکا ہوا میدان تھا اور پار جنگل تھا جس کے عقب میں برفیلی پہاڑیاں تھیں جن کی ڈھلوانوں پر سبزہ بکھرا ہوا تھا۔ چاند کی طلسماتی روشنی میں چہار اطراف بڑا خوبصورت اور اسرار بھرا منظر نظر آ رہا تھا۔

میں نے جیپ کا پچھلا دروازہ کھولا تو یہ دیکھ کر بری طرح ٹھٹک گیا کہ پٹرول کا فاضل گیلن اُلٹ چکا تھا اور جیپ کے اُلٹنے اور پھر سیدھا ہونے کے بعد گیلن کا ڈھکنا بھی غالباً جھٹکوں کی وجہ سے لوز ہو چکا تھا جس میں سے سارا پٹرول رس رس کر ختم ہو چکا تھا۔ میں نے جلدی سے گرا ہوا گیلن اُٹھایا مگر وہ خالی تھا۔ میں نے جھنجلا کر جیپ کا عقبی دروازہ زوردار دھماکے سے بند کر دیا۔

سردی کی کاٹ بڑھنے لگی تھی۔ بارش کے بعد برف باری بھی متوقع تھی۔ مجھ پر جھنجلاہٹ اور بے بسی طاری ہونے لگی تھی۔ اپنی جدوجہد کے رائیگاں جانے کا احساس میرے لئے روح فرسا تھا لیکن میں نے ہر رکاوٹ کو عبور کرنے کا عزم کر رکھا تھا لہٰذا میں نے جیپ کے ڈیش بورڈ سے اپنا میگارڈ نکال کر کوٹ کے اندر رکھا۔ ایک چھوٹی ٹارچ پہلے ہی میری جیب میں موجود تھی جسے میں نے آگے پیدل روانہ ہوتے وقت نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

***

اچانک میں چلتے چلتے ٹھٹک کر رکا۔

میرے سامنے بل کھاتا کیچڑ زدہ راستہ، دُور تاریکی میں گم ہو رہا تھا۔ مجھے درحقیقت اپنے عقب غراہٹوں کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ میں نے یک دم پلٹ کر دیکھا تو بری طرح چونک پڑا۔ میرے عقب میں چند جنگلی بھیڑیوں پر مشتمل ایک غول چلا آ رہا تھا۔ ان کی خونخوار آنکھوں میں گرسنہ چمک تھی۔ رُکتا دیکھ کر وہ بھی رُکے اور اپنے جبڑے کھولے میری طرف دیکھتے ہوئے غرانے لگے۔ چاند کی روشنی ان کے خونخوار ادھ کھلے جبڑوں سے شکاری دانتوں کی وحشیانہ جھلک صاف نظر آ رہی تھی۔ میں نے ابھی اپنا ایک ہاتھ چیسٹر کی اندرونی جیب کی طرف بڑھایا تو بھیڑیوں کے غول نے فوراً حرکت کی اور غراتے ہوئے میری طرف لپکے۔ میں نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے پھرتی سے میگارد نکال لیا اور تاخیر بھوکے بھیڑیوں کے غول پر ایک فائر کر ڈالا۔ رات کے دم بخود اور بھیگے ہوئے سناٹے میں گولی کی دھماکے دار آواز دور تک وادی میں گونجتی چلی گئی۔ ایک بھڑیا گولی کھا کر وہیں ڈھیر ہو گیا جبکہ باقی اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ میں نے دوبارہ قدم آگے بڑھا دیئے مگر جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ بھیڑیوں نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔

وہ خود رو جھاڑیوں اور گھنے چھتنار پیڑوں کی آڑ لئے، بدستور میرے تعاقب میں تھے۔ میرے فاضل راؤنڈ بھی تھے جبکہ میگارد کے چیمبر میں اب سات میں سے چھ گولیاں بچی تھیں مگر میں انہیں ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا چنانچہ میں نے اب تیز تیز قدموں سے چلنا شروع کر دیا تھا۔ جنگلی بھیڑیے اپنے ساتھی کا بھیانک انجام دیکھ کر اب میرے سامنے آنے کی جرأت نہیں کر پا رہے تھے لیکن بھوک نے ”شکار“ کی بُو سے دور جانے بھی نہیں دیا تھا۔ وہ مجھے کسی مقام پر گھیرنے کی کوشش میں تھے اور ہولے ہولے غراتے ہوئے میرے تعاقب میں چلے آ رہے تھے۔ میں بھی محتاط روی کے ساتھ اپنے دائیں بائیں اور عقب میں گردن موڑے، گاہے گاہے ان پر نظر رکھے آگے بڑھ رہا تھا۔

اچانک ایک مقام پر دو بھیڑیوں نے بیک وقت دائیں بائیں جانب سے مجھ پر غراتے ہوئے چھلانگیں ماریں۔ مجھے گولی چلانے کا موقع تو نہ مل سکا البتہ میں پھرتی کے ساتھ ایک دم نیچے بیٹھ گیا۔ دونوں بھیڑیئے فضا میں ہی ایک دوسرے سے ٹکرا گئے اور میں تیزی کے ساتھ پیچھے ہٹ گیا۔ اپنے ساتھیوں کی بے باک جرأت پر باقی بھیڑیئے بھی بے درنگ غراتے ہوئے دائیں بائیں کی جھاڑیوں سے نمودار ہو گئے۔ مجھ پر چھلانگ مارنے والے دونوں بھیڑیئے دوبارہ خوفناک غراہٹوں کے ساتھ میری طرف لپکے۔ بھیڑیوں کے اس غول نے مکاری کے ساتھ مجھے گھیرے میں لے لیا تھا۔ اب فائر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے سب سے پہلے اپنی طرف لپکتے ہوئے ان دونوں بھوکے بھیڑیوں پر اوپر دو فائر کر ڈالے۔ وہ دونوں کریہہ غراہٹوں کے ساتھ ڈھیر ہو گئے۔ باقی بھیڑیئے دوبارہ تتر بتر ہونے لگے تو میں نے طیش میں آ کر ان پر بھی ایک گولی چلا دی۔ چوتھا بھیڑیا بھی خاک چاٹنے لگا۔ مبادا کہ یہ کم بخت میرے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیلنے کی کوشش کریں گے اس لئے میں نے کسی محفوظ ٹھکانے تک جلد سے جلد پہنچنے کے لئے اب تقریباً دوڑنا شروع کر دیا۔

بچے کھچے بھیڑیوں نے خاصی دور تک میرا پیچھا کیا، پھر اس کے بعد وہ یا تو واپس لوٹ گئے یا پھر وہیں دبک کر اپنے ہی مردہ ساتھیوں کو چٹ کرنے کے ارادے سے رُک گئے تھے۔ میرے ریوالور کے چیمبر میں اب صرف تین گولیاں باقی بچی تھیں۔

آگے ڈھلوانی راستہ آ گیا۔ میں نے ذرا ٹھہر کر مدھم چاندنی میں نیچے قدرے ترائی میں دیکھا تو ذرا دور ایک مسطح قطع پر کاٹیج نما گھر کا ہیولا دکھائی دیا۔

اس دور افتادہ اور ویران جنگلی علاقے میں اس کاٹیج کی موجودگی میرے لئے باعث حیرت نہ تھی۔ یہاں وادیوں میں ایسے کئی کاٹیجز اور ریسٹ ہاؤسز دیکھنے میں آتے تھے۔ میں آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا اور ساتھ ہی سامنے کاٹیج پر بھی اپنی نظریں مرکوز رکھی تھیں۔

جب ذرا نزدیک پہنچا تو مجھے یوں لگا جیسے یہ کاٹیج برسوں سے ویران پڑا ہوا ہو۔ یہ خاصا پرانا معلوم ہوتا تھا مگر ابھی درست حالت میں تھا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ یہاں کیچڑ میں چاند کی روشنی میں مجھے کسی گاڑی کے ٹائروں کے تازہ نشانات نظر آئے۔ میں ان نشانوں پر چلتا ہوا سیدھا کاٹیج کے بیرونی احاطے کے گیٹ تک جا پہنچا۔ یہ احاطہ جنگلی اور خاردار جھاڑیوں سے بنایا گیا تھا۔

گیٹ کھلا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہوا اور کاٹیج کے مرکزی دروازے تک جا پہنچا اور بری طرح ٹھٹکا۔ دروازے کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا۔ اندر اندھیرا تھا۔ آس پاس ویرانی مسلط تھی۔ پستول جیب میں رکھ کر میں نے ٹارچ نکال لی اور دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ ٹارچ میرے ہاتھ میں تھی۔ اس کی روشنی کا دائرہ کمرے کی تاریکی کو بڑی حد تک دور کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اس روشنی میں جو کچھ میں نے دیکھا، اس نے مجھے لرزا کر رکھ دیا......... وہ منظر اتنا ہی کراہت آمیز تھا کہ مجھے اپنے اعصاب پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا۔ ٹارچ میرے ہاتھوں سے گرتے گرتے بچی۔

❋ ❋ ❋

یہ خوفناک منظر دیکھ کر ایک لمحے کو میں اپنی جگہ سن کر ہو رہ گیا تھا۔ پھر فوراً ہی میں نے خود پر قابو پایا اور بہ غور لاش کی صورت اوندھے منہ پڑے وجود کو دیکھنے لگا۔ وہ کسی کی لاش ہی تھی اور صاف نظر آتا تھا کہ اسے بے پناہ تشدد کے بعد بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتارا گیا تھا کیونکہ لاش کے اردگرد خون پھیلا ہوا تھا۔

ایک روح فرسا خیال کے تحت میں بے اختیار آگے بڑھا اور اپنے ہاتھوں کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے میں نے جب لاش کا چہرہ دیکھنے کے لئے اسے پشت کے بل سیدھا کیا تو میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا......... وہ میرے جاں نثار ملازم مردان شاہ کی لاش تھی .... غم و غصے سے میرا برا حال ہو گیا تھا۔ میرے دماغ میں گویا آندھیاں سی چلنے لگی تھیں۔ میں نے اپنی ذہنی حالت پر بہ مشکل قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے مردان شاہ کی لاش کا معائنہ کیا۔ اسے بری طرح تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

جسم پر جا بجا زخموں کے نشانات تھے۔ سر اور چہرہ بھی بری طرح ظالمانہ تشدد کا نشانہ بنا تھا۔ غم کے شدید احساس تلے بے اختیار میری آنکھیں نم ناک ہو گئی تھیں۔ بہ غور جائزہ لینے پر مجھے اتنا تو اندازہ ہو چلا تھا کہ یہ ساری وحشیانہ کارروائی چند گھنٹے پہلے ہی کی گئی تھی جو بلاشبہ کالا ناگ کے خونی اور سفاک گروہ ہی کی ہو سکتی تھی۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر اپنے آنسو ضبط کئے۔ گہرے رنج و غم کی اتھاہ گہرائیوں سے اُبھر کر اُٹھ کھڑا ہوا پھر اطراف کا جائزہ لینے لگا۔

اچانک میری نگاہ مردان شاہ کی لاش کے قریب پڑی جہاں اس کا سر تھا۔ وہاں مجھے خون سے لکھے چند آڑے ترچھے لفظ نظر آ رہے تھے۔ میں نے ذرا قریب آ کر جھکتے ہوئے ٹارچ کی روشنی وہاں ڈالی اور بہ غور ان الفاظ کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ لفظ آڑے ترچھے ضرور تھے مگر ذرا سی کوشش کے بعد میں ”ملک پور“ پڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس لفظ کو پڑھنے کے بعد میرے سینے میں ہلچل مچ گئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا دیر نہ لگی کہ یہ لفظ مردان

ساہ نے اپنی اذیت ناک موت سے ذرا دیر پہلے اپنے لہو سے اُنگلی کی مدد سے لکھا ہوگا۔ اسے پورا یقین تھا کہ اس کا خط ملتے ہی میں چین سے ہرگز نہیں بیٹھوں گا اور جلد یا بدیر اس تک ضرور پہنچوں گا۔ وہ جان کی بازی ہارتے ہوئے مردان شاہ کی آخری کوشش تھی بلکہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ اسے بخوبی اندازہ تھا، نگینہ کو کالا ناگ اور اس کے ساتھیوں کے چنگل سے نکالنا آسان نہ تھا۔ اس کے باوجود اس نے اپنی جان پر کھیل کر ان تک رسائی حاصل کر لی تھی جس کے نتیجے میں اس کی جان تک چلی گئی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ مجھے میرے دشمنوں کی آئندہ منزل سے آگاہ کر گیا تھا۔ مجھے مردان شاہ کی دوستی اور اس کی ہمتوں پر رشک ہونے لگا۔ ایسے بے لوث، جری اور دُھن کے پکے لوگ اب بھلا کہاں ملتے ہیں۔

مجھے دشمنوں کے آئندہ ٹھکانے کا علم ہو چکا تھا اور مجھے بلا تاخیر وہاں روانہ ہو جانا چاہئے تھا۔ مگر مردان شاہ کی تشدد زدہ لاش کو یوں بے گور و کفن چھوڑنا بھی مجھے گوارا نہ تھا۔ میں سر جھکائے بیٹھا تھا اچانک میری نظریں مردان شاہ کی مردہ آنکھوں پر پڑیں تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھ سے جلدی کرنے کی التجا کر رہی ہوں۔ ''نادر صاحب! میں تو اپنی جان ہار چکا ہوں اور اب آپ تاخیر کر کے میری قربانی کو رائیگاں نہ جانے دیں۔ آپ فوراً یہاں سے روانہ ہو جائیں۔ نادر صاحب! .... نادر صاحب!......''

مجھے یہ صدا مردان شاہ کے روئیں روئیں سے اُٹھتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

یہ گونج اتنی بڑھی کہ میں بے اختیار اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے مردان شاہ کے جسدِ خاکی پر الوداعی نظر ڈالی اور باہر نکل آیا۔

میرا اندازہ تھا، مکش پور اس مقام سے زیادہ دور نہ تھا۔ میں پیدل چل کر ڈیڑھ دو گھنٹوں میں وہاں پہنچ سکتا تھا۔ جیپ میں اگر پٹرول ہوتا تو یہ فاصلہ شاید چند منٹوں کا رہ جاتا۔ مجھے اپنی حماقت پر غصہ آنے لگا کہ میں نے پٹرول کے گیلن کو مضبوطی سے کیوں نہ باندھ کر رکھا تھا۔

میں نے کاٹیج کا دروازہ بند کر دیا تاکہ جنگلی جانور اندر گھس کر مردان شاہ کی لاش کو نقصان نہ پہنچا دیں۔ پھر میں تیز قدموں سے مکش پور کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہر طرف چٹکی ہوئی چاندنی میں جیپ کے ٹائروں کے نشانات میری راہنمائی کر رہے تھے۔ اس وقت یوں رات گئے ویران جنگلوں کی خاک چھاننے والا، میں کسی دیوانے ہی کی اس وقت تفسیر بنا ہوا تھا۔

میرے اطراف میں شب کا پُراسرار اور پُرسکوت سناٹا چھایا ہوا تھا۔

رات دبے پاؤں آخری پہر میں سرک رہی تھی۔ میں نشانات دیکھتا ہوا قدم بہ قدم آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ معاً میں ایک آواز پر ٹھٹک کر رک گیا، پھر اپنی تمام سماعتوں کی مدد سے شب کے اس سناٹے میں کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر میری سماعت نے وہ آواز سن لی۔ وہ کسی انجن کی مخصوص گھرگھراہٹ تھی۔ چند ثانیے بعد ہی مجھے سامنے روشنی اُبھرتی نظر آئی جسے دیکھتے ہی میں نے دائیں جانب کی قدِ آدم جنگلی جھاڑیوں میں دبک کر روشنی کی سمت نظریں جما دیں۔ کچھ ہی دیر بعد گرے کلر کی اولڈ ماڈل لینڈ کروزر میرے پاس سے اُچھلتی ہوئی گزر گئی۔ میری آنکھوں میں اُلجھن تیرنے لگی۔ مجھے یاد تھا کہ ''دلکشا گل'' والے سرکاری ریسٹ ہاؤس میں زرد آنکھوں والے چوکیدار نے مجھے اسی جیپ کا اشارہ دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میرے دشمن ابھی میرے سامنے بلکہ برابر سے گزرے تھے۔ اس بار ان کی منزل نہ جانے کہاں ہوتی؟

میرے بدن میں جیسے جوش و غضب کسی بجلی کی مانند دوڑ گیا۔ میں جھپٹتا ہوا جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلا اور بے تحاشا جیپ کے تعاقب میں دوڑ پڑا۔

میں جانتا تھا کہ یہ میری بچگانہ کوشش تھی۔ میں جیپ کی رفتار کا مقابلہ محض اپنی ٹانگوں کے زور پر ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اچھی طرح علم تھا کہ بل کھاتے کچے راستے پر جیپ تیز رفتاری سے نہیں دوڑ سکتی تھی لیکن اس کی رفتار اتنی بھی کم نہیں ہوتی کہ میں محض اپنی دو ٹانگوں کی قوت سے اسے پکڑ سکتا یا اس کے ساتھ چل سکتا۔ لمحاتی غور کے بعد مجھے خیال آیا کہ میں راستے کی بجائے براہِ راست درختوں سے ڈھکی ڈھلان پر چل پڑوں تو جیپ سے آگے بھی نکل سکتا ہوں۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ شب کی تاریکی اور اونچا نیچا ڈھلوان۔ چند ہی لمحوں بعد میرا سانس بری طرح پھول گیا تاہم میں اپنی تمام تر طاقت کے ساتھ مسلسل نیچے کی طرف اُترتا رہا۔ میری یہ جدوجہد رائیگاں نہیں گئی اور میں ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا جس طرف سے جیپ آ رہی تھی۔ میں وہیں کھڑا ہو کر گہرے سانس لیتے ہوئے اپنے بے حال نفس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

جلد ہی مجھے جیپ نظر آنے لگی۔ وہ ہچکولے کھاتی میری طرف بڑھتی آ رہی تھی۔ میرے پاس اب جیپ کو رکوانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ سوچ کر میں نے میگارڈ نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ میں نے اس جیپ کا ٹائر برسٹ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے یہ سوچ کر کہ اگر اس میں میرے دشمن سوار ہوئے تو وہ محتاط ہو سکتے تھے۔ کیونکہ نفری اور اسلحے میں وہ مجھ پر بہرحال فوقیت رکھتے تھے اور میرے پاس اسلحے کی صورت میں صرف ایک میگارڈ تھا اور اس میں بھی اب صرف تین گولیاں ہی باقی بچی تھیں۔ میرے پاس وقت کم تھا۔ جلدی فیصلہ کرنا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے ایک بڑا سا نوکیلا پتھر تلاش کر لیا اور اسے ہاتھ میں پکڑ کر میں جھاڑیوں کی اوٹ میں چلا گیا۔ جوں ہی وہ جیپ ذرا قریب پہنچی تو میں نے اوٹ سے ذرا اُٹھ کر پوری قوت سے وہ پتھر جیپ کی ونڈ اسکرین پر دے مارا۔ جیپ کی ونڈ اسکرین ایک دھماکے سے ٹوٹ گئی۔ میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ دوبارہ جھاڑیوں میں دبک گیا۔ جیپ رک چکی تھی۔ میں بہ غور دھڑکتے دل سے جیپ کی طرف گھورے جا رہا تھا۔ پھر میں نے جھاڑیوں کی اوٹ میں حرکت کی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ جیپ کے سوار نیچے اُتر کر ضرور یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ یہ کام کس نے کیا ہوگا؟......... ایسا ہی ہوا۔ میں اب جیپ کے ذرا قریب دائیں جانب کی جھاڑیوں میں سرک آیا تھا۔ میری نظریں جیپ پر مرکوز تھیں۔ جیپ کے دروازے کھلے اور میں نے بیک وقت چار پانچ مسلح افراد کو اترتے دیکھا اور پھر ان میں سے دو افراد کو دیکھ کر میری کنپٹیاں سلگ اُٹھیں اور رگوں میں خون کی گردش یکلخت تیز ہونے لگی۔

وہ کالا ناگ اور کبیر حیات تھے۔ باقی تین یقیناً ان کے ''غلام'' رہے ہوں گے۔ ان کے ہاتھوں میں ٹارچیں بھی تھیں۔

''یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے؟'' معاً کالا ناگ نے غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا۔ ساتھ ہی وہ بڑی خوفناک نظروں سے آس پاس کی جھاڑیوں کا ایکسرے کرنے میں مصروف تھا۔ موت کا کھیل شروع ہونے والا تھا مگر مجھے سب سے زیادہ فکر نگینہ کی تھی۔ جانے یہ بدبخت لوگ اسے کہاں چھوڑ آئے تھے؟

اپنے بدترین اور سفاک دشمنوں کا یقین کر لینے کے بعد اب میں بے دھڑک ان سے ٹکرانے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا۔

''چلو چھوڑو یار! .... جانے دو۔'' معاً کبیر کی بیزار کن آواز اُبھری۔ ''ہوگا کوئی پاگل۔ چلو، دیر ہو رہی ہے۔''

''ہرگز نہیں۔'' کالا ناگ نے پھنکارتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''یہ حرکت کسی پاگل کی نہیں ہو

سکتی۔ بھلا اس ویرانے میں کوئی پاگل کہاں سے آ گیا؟''

''پاگل ان ویرانوں میں ہی تو ہوتے ہیں۔'' کبیر نے ایک قہقہے کے دوران کہا۔

ہاں ...... یہ لوگ نہیں جانتے تھے کہ واقعی ایک پاگل اس وقت ان سب کو جہنم واصل کرنے کے لئے بے قرار ہو رہا تھا۔ میں نے دانت پیس کر سوچا۔

کالا ناگ نے خطرے کی بو سونگھ لی تھی۔ اس نے اپنے تینوں خونی ہرکاروں سے تحکمانہ انداز میں کہا اور پھر وہ تینوں مستعدی کے ساتھ حرکت میں آ گئے۔ ایک تو عقب کی جھاڑیوں میں راستے کی دوسری جانب غائب ہو گیا جبکہ باقی اس طرف بڑھنے لگے جہاں اس وقت میں دبکا ہوا تھا۔

دونوں شکاری نما شکاروں کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر میرے اعصاب تن گئے۔ میں ان کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ دونوں ٹارچوں کی روشنیاں بکھیرتے ہوئے جیسے ہی میرے ذرا قریب پہنچے میں بے آواز، سینے اور کہنیوں کے بل پر رینگتا ہوا ان کے عقب میں آ گیا اور اچانک ہی کھڑا ہو کر میں نے خاموشی سے ایک گردن دبوچ کر اسے زوردار جھٹکا دیا۔ حلق سے ''اوغ'' کی صورت میں آخری ہچکی اُبھری۔ اس کا دوسرا ساتھی جھپٹ کر پلٹا تو میں اس وقت تک مردہ شکار سے گن چھین چکا تھا تاہم میں فائر کرنے کی بے وقوفی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی دوسرا شکاری بدک کر میری طرف متوجہ ہوا میں نے اپنے بازوؤں کے شکنجے میں جھولتے اس کے مردہ ساتھی کو اسی پر دھکیل دیا۔ وہ جب تک اپنی گن کا رخ میری طرف کرتا اس کا ساتھی اس سے جا ٹکرایا۔ مردہ ساتھی کی لاش سے اچانک ٹکراؤ کے نتیجے میں وہ لڑکھڑا گیا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنا توازن سنبھالنے کی کوشش کرتا، میں نے اس کے ساتھی سے چھینی ہوئی گن کو نال سے پکڑ کر لٹھ کی طرح گھمایا اور اس کا سر چٹخ گیا۔ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گرتے ہوئے اس کے حلق سے ایک زوردار مکروہ چیخ اُبھری تھی۔ اسے بے ہوش چھوڑ کر میں دوبارہ گن سنبھالے جھاڑیوں میں دبک گیا۔

میں نے دیکھا، لینڈ کروزر کے قریب کھڑے کالا ناگ اور کبیر چیخ کی آواز پر بری طرح چونکے تھے اور پھر دوسرے ہی لمحے انہوں نے اپنی جیبوں سے نہایت پھرتی کے ساتھ پستول نکال لئے۔ اس کے بعد وہ دونوں جھاڑیوں کی طرف چوکنا نظروں سے گھورنے لگے۔ کالا ناگ کے سیاہ چہرے پر غضب کی وحشت طاری تھی البتہ کبیر خاصا پریشان نظر آ رہا تھا۔

کالا ناگ نے چلا کر اپنے انہی دونوں ہرکاروں کو پکارا جنہیں میں ڈھیر کر چکا تھا مگر جواب نہ پاکر وہ بھی اُلجھن کا شکار ہو گیا۔ غالباً وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ آگے بڑھے یا وہیں کھڑا رہے۔ البتہ چلانے پر اس کا تیسرا ہرکارہ ان کے عقب سے نمودار ہوا۔ پھر کالا ناگ نے کبیر کو وہیں رکے رہنے کا کہا اور اپنے ساتھی ہرکارے کے ساتھ جھاڑیوں کی طرف بڑھا۔ میرا دل اب گویا سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ پہلے میں نے اس سے دو دو ہاتھ کرنے کا فیصلہ کیا مگر پھر کچھ سوچ کر میں نہایت آہستگی سے ایک طرف کو رینگ گیا۔ مجھے پوری تسلی تھی کہ اب یہ لوگ میرے آہنی پنجوں سے بچ کر نہیں جا سکتے تھے۔ لہٰذا میں کالا ناگ اور اس کے اکلوتے ہرکارے کو اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا چھوڑ کر چشم زدن میں دوسری طرف رینگ گیا۔ پھر کچے راستے پر اُبھر کر میں نے فوراً جیپ کے عقب میں آنے کی کوشش کی تو اچانک وہاں کھڑے کبیر کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ اس نے میری جھلک دیکھتے ہی بلا تامل مجھ پر گولی چلا دی۔ مجھے اگر جیپ کی آڑ میں آنے پر ایک لمحے کی بھی دیر ہو جاتی تو گولی مجھے شکار کر سکتی تھی۔ لیکن اب صورتِ حال خطرناک رخ اختیار کرنے والی تھی۔ کبیر میری جھلک پر گولی داغنے کے بعد پھرتی سے

جھاڑیوں کی اوٹ میں چلا گیا تھا۔ میں اس کی چالاکی بھانپ گیا۔

شکار اور شکاری کے درمیان چوہے بلی کا خطرناک کھیل شروع ہو چکا تھا۔ میں نے جیپ کی آڑ لیتے ہوئے دوسری طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ کبیر بنیادی طور پر ایک بزدل مگر لومڑی کی طرح عیار اور مکار شخص تھا۔ جبکہ کالا ناگ دشمن کے مقابلے پر بے دھڑک اُتر آتا تھا۔ لہٰذا یہی سبب تھا کہ کبیر کی چلائی ہوئی گولی کی آواز پر وہ جہاں کہیں بھی تھا، فوراً ہی اپنے ''اکلوتے'' ہرکارے کے ساتھ واپس پلٹا تھا۔ کبیر کی جھلک بھی مجھے نظر آئی تھی۔

اب وہ تینوں جان چکے تھے کہ ان کے مدمقابل کوئی معمولی شخص نہ تھا۔ مردان شاہ کی قربانی کے بعد انہیں اندازہ ہو گا کہ میں کسی بھی وقت ان کے مقابل آ سکتا تھا۔

وہ تینوں مجھے گھیرنے کی کوشش میں تھے۔ میرے پاس ان میں سے ایک کی چھینی ہوئی ایم پی فائیو رائفل تھی۔ یہ ایک زبردست آتشیں ہتھیار تھا، جس کے میگزین کلپ کے ساتھ ایک اور فاضل گولیوں کا کلپ بھی منسلک تھا۔

میں نے شکار کو تاکنے کے لئے اپنی پوزیشن بدلی اور جیپ کے ساتھ لگے حرکت کی تو اچانک مجھے جیپ کے اندر ایک اور وجود کی جھلک دکھائی دی۔ میں نے چونک کر ذرا شیشے سے اندر دیکھا اور پھر جیسے دوسرے ہی لمحے میں سانس لینا بھول گیا۔ اس وقت اعصاب شکن سناٹے کو گولیوں کے ایک برسٹ نے ختم کر دیا۔

میں غیر ارادی طور پر نیچے جھک گیا۔ کھڑکی کے شیشے ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ ہی جیپ کے اندر ایک تیز نسوانی چیخ اُبھری۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ابھی میں نے جیپ کے اندر نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑے نسوانی وجود کو دیکھا تھا، وہ حقیقت تھی یا میرا خواب؟...... لیکن میری جاگتی آنکھیں خواب نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ ہاں ...... وہ میرے وجود کا حصہ نگینہ ہی تھی۔

نگینہ کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہی جیسے میرا پورا وجود جوالامکھی بن کر رہ گیا تھا...... برسٹ فائر ہونے کے فوراً بعد میں نے ایک بار اندر موجود نگینہ کو دیکھا اور یہ تسلی ہونے کے بعد کہ وہ صحیح سلامت تھی، میں نے یکدم زمین پر لیٹ کر جیپ کے نیچے سے سامنے دیکھا تو اچانک ہی مجھے تیزی کے ساتھ کروٹ بدلنا پڑی۔ ایک اور برسٹ نیچے سے مجھ پر داغا گیا تھا۔ شکر تھا بروقت میری نگاہ کالا ناگ کے اس اکلوتے ہرکارے کی پوزیشن پر پڑ گئی تھی جو خود بھی زمین پر سینے کے بل مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ گولیوں کی خوفناک سنسناہٹ مجھے اپنے چہرے کے بالکل قریب سے گزرتی محسوس ہوئی تھی مگر میں نے پھرتی سے کروٹ بدلتے ہی دوبارہ شست باندھی اور مذکورہ ہرکارے پر برسٹ فائر کر دیا۔ وہ ایک کربناک چیخ کے ساتھ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اٹھا تو سامنے ہی مجھے کبیر دکھائی دیا۔ وہ پستول ہاتھ میں تھامے بڑے محتاط انداز میں جیپ کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ جیپ کے سامنے والے حصے کی طرف سرک رہا تھا۔ میری نظروں نے کالا ناگ کو بھی دیکھنے کی کوشش کی مگر وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا تھا۔ کبیر کو جیپ کی طرف بڑھتا دیکھ کر میں اس کا مقصد سمجھ چکا تھا۔ وہ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر سوار ہونے کے لئے بے تاب تھا۔ میں نے اس کی عجلت آمیز بے وقوفی سے فائدہ اٹھایا اور نہایت پھرتی اور ہوشیاری کے ساتھ پلٹا۔ پھر موقع تاک کر میں نے اس کے پستول والے ہاتھ پر گولی چلا دی۔ اس کے حلق سے ایک کربناک چیخ نکلی۔ پستول چھوٹ کر دور جا پڑا اور اس کے ہاتھ سے خون جاری ہو گیا۔ وہ جب تک

سنبھلتا، میں اس کے سر پر پہنچ کر اسے گن پوائنٹ پر لے چکا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اس کے چہرے پر شدید اذیت کے آثار نمایاں تھے۔ وہ ایک ہاتھ سے اپنا زخمی ہاتھ تھامے کھڑا کراہ رہا تھا۔

''کبیر!......... کہاں ہے تمہارا وہ کتا کالا ناگ.........؟'' میں نے اسے لہو رنگ نظروں سے گھورتے ہوئے غرا کر پوچھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میری عقابی نظریں آس پاس گردش کر رہی تھیں۔ کالا ناگ کے پراسرار ''غیاب'' پر میں پریشان ہونے لگا تھا۔ وہ بہت مکار اور شاطر انسان تھا۔ ضرور خطرہ بھانپ کر کہیں خاموشی سے گھات لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ مگر میں اب اس کی تلاش میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کبیر البتہ میرے سوال پر محض لکنت زدہ آواز میں ہکلا کر رہ گیا تھا۔ کالا ناگ کے اچانک چھپ کر وار کرنے کے ممکنہ خطرے کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے فوراً کبیر کو ڈھال بنانے کی خاطر اس پر جھپٹا اور اسے بازو سے دبوچ کر فوراً جیپ کی طرف آگیا اور غرا کر کبیر سے بولا۔

''دروازہ کھولو!......... جلدی۔''

اس نے فوراً اپنے ایک ہاتھ سے دروازہ کھولا تو سب سے پہلے میں جلدی سے جیپ میں سوار ہوا۔ پھر ایک نگاہ عقبی سیٹ پر بے سدھ پڑی نگینہ کو دیکھا۔ وہ ہذیانی چیخ مارنے کے بعد شاید دوبارہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ چونکہ اب کبیر میرے ہتھے چڑھ چکا تھا اور اس کا منہ کھلوانا کافی تھا لہٰذا میں اگنیشن سوئچ میں لگی چابی کو اب گھمانے ہی والا تھا کہ اچانک کھڑکی سے ایک سیاہ نال میری کنپٹی سے آ لگی اور ساتھ ہی ایک پھنکارتی ہوئی آواز ابھری۔

''جیپ سے نیچے اتر آؤ نادر.........!'' یہ کالا ناگ تھا۔ میرے وجود میں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ وہ جانے کس وقت رینگتا ہوا جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ والے دروازے کی طرف آن دھمکا تھا۔ میں نے سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ذرا گردن موڑ کر کالا ناگ کو سنسناتی نظروں سے گھورا۔ اس کے بدہیئت ہونٹوں پر بڑی سفاک مسکراہٹ رقصاں تھی۔ ادھر میرے برابر میں بیٹھے ہوئے کبیر نے دانت پیستے ہوئے میری گن پر قبضہ جما لیا تھا۔ میں دروازہ کھولنے لگا تو کالا ناگ مجھ پر پستول تانے ہوئے یکلخت چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میں خاموشی سے دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا اور بے خوفی سے تن کر اس کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو چند ثانیے خوں ناک نظروں سے گھورتے رہے۔ اس اثناء میں کبیر بھی مجھ سے چھینی ہوئی گن تھامے نیچے اتر آیا تھا اور میری طرف گھورتے ہوئے اس نے کالا ناگ سے مخاطب ہو کر کہا۔

''کالا ناگ!......... میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی گن میرے سینے کی طرف تان لی۔

''کبیر!.........'' اچانک کالا ناگ نے اسے تنبیہ آمیز لہجے میں پکارا۔ ''ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ ابھی تو میں نے اسے لرزہ خیز مناظر کا نظارہ کروانا ہے......... ورنہ تو میں جب چاہوں اسے بڑے آرام سے موت کی نیند سلا سکتا ہوں۔''

''میں اتنا تر نوالہ نہیں ہوں کالا ناگ!'' اس کی خوش فہمی پر میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''بہتر ہے کہ میں اس وقت دشمنی کی جس آگ میں سلگ رہا ہوں، اسے میرے اور میرے دشمنوں تک ہی محدود رہنے دو۔ اس کا دائرہ تم خود تک نہ بڑھاؤ۔ ایسا نہ ہو، پھر مجھے اپنے دشمنوں کے عبرت ناک انجام کی شروعات تم سے کرنا پڑ جائے۔'' میرے لہجے کی گھن گرج اور ارادوں کی تپش کو محسوس کرنے کے باوجود کالا ناگ کے سر سے خوش فہمی کا بھوت نہیں اترا تھا......... وہ مارے طیش کے اپنے دانت پیستا ہوا دو قدم آگے بڑھا اور میرے بالکل سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے پستول کی نال میری پیشانی سے لگا دی۔

مگر میری آنکھوں میں خوف کی ایک ذرا رمق تک نہ ابھری تھی......... اس نے سیفٹی کیچ ہٹایا، ٹرائیگر پر انگلی رکھ دی۔

''اب کیا کہتے ہو؟......... چلاؤں گولی؟'' وہ سرسراتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میرے ساتھی مردان کا قتل کس نے کیا ہے؟'' میں اس کی خوفناک دھمکی سے مرعوب ہوئے بغیر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

میرے استفسار پر اس کے بدہیئت ہونٹوں پر بڑی سفاک مسکراہٹ ابھری تھی۔ ''تمہارا ساتھی ویسے تھا تو بڑا جی دار۔ لیکن افسوس، اس نے مجھ سے ٹکر لینے کی بے وقوفی کی......... اور......... اس نے خود اپنی جان اپنے ہاتھوں میں رکھ کر میرے حوالے کر دی۔''

اس کے منہ سے اپنے جاں نثار ملازم مردان شاہ کی ہلاکت کا یقین ہوتے ہی جیسے میرے پورے وجود میں قہر و غضب کی بجلیاں دوڑ گئیں۔ اب کالا ناگ جیسے سفاک اور سنگ دل درندے کا بھیانک انجام مقدر بن چکا تھا۔

''گولی چلاؤ کالا ناگ!......... اسے یہیں ختم کرو۔ یہ اب ہمارے لئے بہت خطرناک بن چکا ہے۔'' قریب کھڑے کبیر نے ہذیانی انداز میں چلا کر کالا ناگ سے کہا۔

''کاش......... میں تیری کھوپڑی میں سوراخ کر سکتا نادر!......... کاش.........'' وہ غیظ آلود لہجے میں دانت پیس کر بولا اور دوسرے ہی لمحے اس نے پستول میری پیشانی سے ہٹاتے ہوئے اس کا آہنی دستہ میری کنپٹی پر مارنے کی کوشش کی لیکن میں، جو اس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا، اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت میں آیا اور اپنے ایک ہاتھ سے اس کے پستول والے ہاتھ کے وار کو روکتے ہوئے دوسرے ہاتھ کا زور دار گھونسا اس کی ناک پر رسید کر دیا۔ وہ بے اختیار لڑکھڑاتا ہوا کبیر سے جا ٹکرایا۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ کبیر نے سنبھل کر مجھ پر برسٹ فائر کر ڈالا لیکن میں تب تک اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔ اس کی گن سے نکلنے والی گولیوں کی باڑ لینڈ کروزر کی باڈی میں پیوست ہو گئی۔ میں تب تک کبیر کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے دوبارہ اپنی گن کا رخ میری طرف کرنا چاہا مگر اس وقت کالا ناگ درمیان میں آگیا۔ میں بھی ٹھٹک کر اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔

اس کی ناک پر پڑنے والے میرے ایک ہی گھونسے نے اس کی شکل بگاڑ کر رکھ دی تھی۔ خون بھل بھل اس کی ناک سے بہہ رہا تھا، جس نے اس کے کریہہ چہرے کو مزید بھیانک بنا دیا تھا۔ کبیر ششدر رہ گیا۔ کالا ناگ کی وحشت ناک نظریں میرے چہرے میں خنجروں کی طرح پیوست تھیں۔ پھر وہ خرخراتی آواز میں مجھ سے بولا۔

''نادر علی خان! آج میں اپنے زور بازو پر تیرا یہ غرور خاک میں ملا کر رہوں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے کبیر سے کہا۔ ''کبیر! تم گاڑی اور لڑکی کو لے کر روانہ ہو جاؤ......... لیکن خبردار! نادر پر گولی ہرگز مت چلانا۔ کیونکہ یہ میرا شکار ہے۔''

میں اس کی بات پر بے چین ہو گیا۔ پھر کالا ناگ نے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ میں نے اس وحشی درندے کی ٹکر سے خود کو بچانے کے لئے پھرتی سے پینترا بدلنا چاہا لیکن وہ پہلے سے ہی میرے ارادے کو بھانپ گیا اور راہ ہی میں رخ بدل کر مجھ سے ٹکرایا۔ اس نے اپنے کاندھے کی بھرپور ضرب میرے سینے پر رسید کی۔ ضرب میری توقع سے زیادہ ٹھوس اور طاقت ور ثابت ہوئی۔ نتیجتاً میرے قدم زمین سے اکھڑ گئے اور میں جیپ سے جا ٹکرایا۔ ادھر کبیر نے جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر اس میں سوار ہونا

چاہا تو میں کالا ناگ کو چھوڑ کر اس کی طرف لپکا مگر کالا ناگ میری راہ میں آ گیا۔ میں نے اس کے پیٹ پر لات رسید کرنے کی کوشش کی تو وہ خود کو میری لات سے بچانے کی بجائے اپنی جگہ جم کر کھڑا ہو گیا اور پھرتی کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے میری ٹانگ کو پکڑ کر مروڑ ڈالا۔ میں نے ایک ٹانگ پر اچھل کر فضا میں ایک طوفانی انداز کی کروٹ لی اور اس ٹانگ کی بھرپور ضرب کالا ناگ کے جبڑے پر رسید کر دی۔ اس کے حلق سے بیل جیسی ڈکراہٹ اُبھری اور اسے میری ٹانگ چھوڑتے ہی بنی۔ میں نے اپنے قدموں پر سیدھے کھڑے ہوتے ہی اسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اس بار جم کر اچھلتے ہوئے اپنی دونوں ٹانگیں اس کے سینے پر رسید کر دیں۔ وہ غراہٹ سے مشابہہ کراہ خارج کرتا ہوا کئی قدم دور جا گرا۔ میں طوفانی بگولے کی طرح پلٹا اور جیپ میں سوار ہوتے ہوئے کبیر کو کالر سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور گن چھین کر اسے پرے دھکیل دیا۔ گن میرے ہاتھوں میں آتے ہی کبیر کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا جبکہ کالا ناگ اب سنبھل کر کھڑا ہو چکا تھا، میری طرف دیکھتے ہوئے عجیب ٹھہرے ہوئے لہجے میں مجھ سے بولا۔

''نادر علی! .... میں دشمنی بھی اپنے معیار کے لوگوں سے رکھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم میرے اس معیار کو برقرار رکھو گے۔''

میں اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ میں نے گن دور جھاڑیوں میں اچھال دی تو وہ خوشی بھرپور لہجے میں بولا۔ ''واہ نادر! .... تم نے آج کالا ناگ کی دشمنی کی لاج رکھ لی۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں گھور کر زہر بھرے لہجے میں کہا۔

''لیکن .... کالا ناگ! تم میری دشمنی کے معیار کے نہیں ہو۔ ہتھیار میں نے تمہارا قرض چکانے کے لئے پھینکا ہے۔''

لاہور کے معروف ''گجر چوک'' کے بدنام زمانہ بدمعاش کالا ناگ کے سینے میں میرے تضحیک آمیز الفاظ خنجر کی طرح پیوست ہوئے تھے۔

''آج تو تیرا یہ گھمنڈ توڑنا ہی پڑے گا .... کیونکہ تو پہلا شخص ہے جس نے کالا ناگ کو یوں لفظوں کی مار سے ذلیل کرنے کی جرأت کی ہے۔'' وہ غیظ و غضب سے کانپتے ہوئے بولا اور پھر وحشی سانڈ کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ ہم دونوں دست و گریباں ہو گئے تھے۔ پھر ایک دوسرے کو دھکا دے کر چند قدم پیچھے لڑکھڑا گئے۔ تب کالا ناگ نے اپنے دونوں بازوؤں کو پھیلا کر اپنے ہاتھوں کے پنجے کھول دیئے۔ وہ میرے ساتھ شاید حقیقتاً پنجہ آزمائی کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے بھی اس کی ''پنجہ آزمائی'' کی یہ دعوت قبول کر لی اور اپنے دونوں ہاتھوں کے پنجے اس کے پنجوں میں پھنسا دیئے۔

اب ہمارے درمیان خالصتاً جسمانی طاقت کا مقابلہ تھا۔ وہ اگر توانا اور گرانڈیل تھا تو کم میں بھی نہ تھا۔ میں اسے پنجوں کے بل دھکیلتا ہوا چند قدم آگے تک لے گیا تو دوسرے ہی لمحے وہ اپنے جسم کی پوری طاقت کو گویا پنجوں میں منتقل کر کے جواباً مجھے عقب میں دھکیلتا ہوا جیپ تک لے گیا اور میری پشت جیپ سے جا لگی۔ اب وہ میرے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ بلاشبہ وہ طاقت کا پہاڑ تھا۔ مجھے اپنی انگلیاں چٹختی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ میں چاہتا تو اپنی ایک لات کا آزادانہ استعمال اس کے پیٹ پر کر سکتا تھا لیکن میں بھی اسے اسی طرح ''پنجہ آزمائی'' کی صورت میں جواب دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے بھی اپنے وجود کی ساری قوت کو گویا پنجوں میں منتقل کر کے زور آزمائی شروع کی اور وہ بھی پوری قوت صرف کر رہا تھا۔ حتیٰ کہ ہم دونوں کی پیشانیاں ایک دوسرے سے آن ملیں اور لاوا اُگلتی نظریں ایک دوسرے کی آنکھوں میں تیر کی طرح پیوست ہو گئیں۔ بالآخر میں اس کے دونوں ہاتھوں کے پنجوں کو

مروڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے حلق سے وحشیانہ چیخ خارج ہو گئی اور پھر اس نے اپنے سر کی زوردار ٹکر میری ناک پر جڑ دی۔ میرا دماغ جھنجھنا اُٹھا۔ تکلیف کی شدت سے میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔ کالا ناگ نے بجلی کی سی سرعت سے اپنے دونوں پنجوں کو میری آہنی گرفت سے چھڑا لیا اور پھر جب تک میں نے اپنے سر کو دو تین بار جھٹک کر تاریکی کی چادر جھٹکنے کی کوشش کی، کالا ناگ نے دونوں ہاتھوں کی تالی میری دونوں کنپٹیوں پر پیٹ ڈالی۔ میرا دماغ ایک بار پھر جھنجھنا گیا۔ وہ شاید بڑی طاقت اور دیسی ساختہ لڑائی بھڑائی کے انداز اور مہارت سے بخوبی واقف ہو چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کالا ناگ نے ذرا بھی سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر مجھ پر تابڑ توڑ حملے شروع کر دیئے۔ تب میں نے موقع دیکھ کر اس کا اپنے چہرے کی طرف اُٹھتا ہوا گھونسا اپنے ایک ہاتھ پر روکا، پھر اسی ہاتھ سے بہ سرعت اس کی کلائی پکڑ کر مروڑ ڈالی۔ وہ کراہ آمیز چیخ کے ساتھ گھوما تو میں نے گھٹنے کی ضرب اس کی ریڑھ کی ہڈی پر رسید کر دی۔ اس کے حلق سے دلخراش چیخ اُبھری اور وہ پیروں پر بیٹھتا چلا گیا۔ میں نے کراٹے کے انداز کا ایک اور وار اس کی دائیں ہنسلی کی ہڈی پر کیا تو وہ اذیت ناک چیخ کے ساتھ زمین پر اوندھے منہ لیٹ کر ہانپنے لگا۔ کالا ناگ، جسے اپنی طاقت اور دہشت پر بڑا غرور تھا، میں نے اسے بالآخر خاک چاٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔

میں نے کبیر کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ وہ پہلے ہی مجھ سے خائف رہتا تھا۔ اب جو اس نے لاہور کے معروف گجر چوک کے بدنام زمانہ دہشت گرد غنڈے کالا ناگ کو میرے ہاتھوں زمین بوس ہوتے دیکھا تو اس کے چھکے چھوٹ گئے تھے۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے کبھی زمین بوس کالا ناگ کی طرف دیکھتا تو کبھی میری طرف۔

دوسرے ہی لمحے بدحواس ہو کر گھبرائے ہوئے ''جنکارے'' کی طرح جھاڑیوں میں جا گھسا۔ میں جیپ کی طرف پلٹا اور بے تابانہ انداز میں جیپ کی عقبی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ نگینہ کے چہرے پر اتھاہ سناٹے کی سی کیفیت تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ جیسے دنیا و مافیہا سے بے خبر محو خواب نظر آ رہی تھی۔ میرے سینہ سوزاں میں دھڑکتے ہوئے دلِ مجبور نے گواہی دی کہ ہاتف تقدیر نے نگینہ کو میرے نصیب میں لکھ دیا ہے اور اسے اب مجھ سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں چھین سکتی۔ میں نے اس کا تفصیلی معائنہ کیا۔ اس کا تنفس ہموار تھا۔ دل کی دھڑکنیں معمول کے مطابق تھیں۔ میں اس کے گال ہولے ہولے تھپتھپاتے ہوئے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے دو تین بار کسمسا کر آنکھیں کھولنے اور کچھ کہنے کی کوشش کی مگر دوسرے ہی لمحے پھر گہری نیند میں ڈوب گئی۔ مجھے اب اس کی طرف سے تشویش ہونے لگی۔ ایسا نظر آتا تھا کہ جیسے نگینہ کسی گہری نشہ آور دوائی کے زیر اثر ہو۔ اور اگر ایسا تھا تو اسے فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت تھی۔

یہ خیال آتے ہی میں نے کوئی بھی لمحہ ضائع کئے بغیر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور اسے اسٹارٹ کر کے ایک دم ہی جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔

دور مشرق کی سمت پو پھٹنے لگی تھی۔ سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا تھا۔ اطراف میں پھیلے ہوئے جنگل نوع بہ نوع خوش الحان پرندوں کی مدھر چہچہاہٹ سے گونجنے لگے تھے۔

مردان شاہ کی قربانی رائیگاں نہیں گئی تھی۔ یہ لوگ شاید ''مکش پور'' سے واپس لوٹ رہے تھے۔ سارے حالات واضح ہو جانے کے باوجود میرے اندر کی خلش ختم نہیں ہوئی تھی۔ میری سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ آخر یہ لوگ نگینہ کو ''مکش پور'' کس ارادے کے تحت یرغمال بنا کر لے گئے تھے؟

پہلے تو میں یہی سمجھ رہا تھا کہ ان خبیثوں نے کورٹ میں آئندہ ہونے والی ''متوقع'' فیصلہ کن پیشی م
باپ شاہ میر اور نظر حیات کے خلاف گواہی دینے سے معذور رکھنے کے لئے نگینہ کو یرغمال بنایا تھا۔ لیکن
ان کی نگینہ سمیت ''مکش پور'' کے راستے غیر متوقع اور اچانک واپسی نے مجھے سوالات اور سوچ کی ای
پراسرار کھائی میں دھکیل دیا تھا۔ پھر نگینہ کی طویل خواب ناک سی بے ہوشی خاصی پراسرار تھی۔

تقریباً آدھ پون گھنٹے کی دشوار گزار ڈرائیونگ کے بعد مجھے اپنی جیپ کھڑی نظر آ گئی۔ میں ل
کروزر قریب لے جا کر روک دی۔ لینڈ کروزر کے اندر موجود میں نے پٹرول کے دو گیلن دیکھ لئے
پتہ نہیں وہ بھرے ہوئے تھے کہ خالی۔ بہر طور کسی خیال کے تحت میں جیپ سے اُترا اور عقبی درواز
کر دونوں جیری کین اٹھا کر دیکھے تو ان میں ایک بالکل خالی تھا جبکہ دوسرا ذرا وزنی تھا۔ وہ نصف
تھا۔ میں نے اسے ہی کافی جان کر اٹھایا اور اپنی جیپ کے قریب آ کر اسے فیول ٹینک میں انڈیلنے لگا

اس کے بعد میں نے لینڈ کروزر کے اندر سے بے ہوش نگینہ کے وجود کو اٹھایا اور اپنی جیپ کی
سیٹ پر آہستگی سے لٹا دیا اور اپنی لیدر کی نرم جیکٹ اتار کر نگینہ کے اوپر ڈال دی۔ پھر اس کی پیشا
اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ میری کائنات میرے سامنے تھی، مجھ سے قریب تھی، اتنا قریب کہ میں نے ا
پیشانی پر اپنی مہر محبت ثبت کر دی تھی۔ وہ چند لمحے نہایت جاں فزا تھے۔ میں سب کچھ فراموش کر چک
تاہم یہ کیفیت زیادہ دیر برقرار نہیں رہی۔ اس کی مدہوشی نما نیند کا خیال آتے ہی میں عالم فراموش
حقیقت کی تلخ دنیا میں لوٹ آیا۔ مجھے اس کو طبی امداد فراہم کرنے کے لئے جلد ہسپتال پہنچانا تھا۔
بعد میں اپنی جیپ پر واپسی کے سفر پر گامزن تھا۔

❋❋❋

جاڑے کی گلابی دھوپ وادی میں پوری طرح پھیل چکی تھی۔ میں اب پنڈی جانے والی سڑ
رواں تھا۔ نگینہ کو حاصل کرنے کی جہاں مجھے ازحد مسرت ہو رہی تھی، وہیں مردان شاہ کی موت پر
ہو رہا تھا۔

شہر کی حدود شروع ہو چکی تھی۔ میں نگینہ کو سب سے پہلے ہسپتال پہنچانا چاہتا تھا اور میں نے ا
کیا۔ سینٹرل ہسپتال میں ایک ڈاکٹر سے میری واقفیت تھی۔ اس کی مدد سے نگینہ کو فوری طور پر ا
نگہداشت کے شعبے میں داخل کر دیا گیا۔ ڈاکٹر اس کی دیکھ بھال میں مصروف تھے اور میں آئی سی
باہر نہایت بے چینی کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ میں اس کی اطلاع فوری طور پر اعظم خان اور ایڈووکیٹ
صمدانی کو دینا چاہتا تھا۔ مگر اس سے پہلے میں نگینہ کی حالت کے بارے میں جاننے کا خواہش مند ت
دیر بعد آئی سی یو کا دروازہ کھلا اور میرا واقف کار ڈاکٹر منصور پرسوچ چہرے کے ساتھ نمودار ہوا۔
ہی اس کی طرف لپکا۔

''نن .... نگینہ، اب کیسی ہے ڈاکٹر صاحب! آخر اسے ہوا کیا ہے؟ .... وہ ....
ٹھیک تو ہو جائے گی نا؟'' میں اضطرابی کیفیت میں تلے اوپر بے ربط سوال پوچھتا چلا گیا۔ ڈاکٹر منصو
دھیرے سے میرا شانہ تھپتھپایا، پھر تشفی آمیز لہجے میں بولا۔

''کوئی خطرے والی بات تو نہیں ہے مگر .... خیر .... آؤ ....'' وہ بات ادھوری چھوڑ
ایک کمرے میں لے آیا۔ وہاں اور کوئی نہیں تھا۔

''مگر کیا ڈاکٹر صاحب ....؟'' میں نے متفکر بے چینی سے پوچھا۔

وہ اپنی چیئر پر بیٹھ گیا اور مجھے اپنی سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''ویسے تو کوئی خطر

نہیں۔'' میرے نشست سنبھالنے کے بعد اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ ''مگر پیشنٹ کی مسلسل بے ہوشی کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی۔ میں نے طاقت وغیرہ کے انجکشن شروع کر دیئے ہیں۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ ہوش میں آ سکتی ہے۔ بہ صورت دیگر کسی نیورو فزیشن سے رابطہ کرنا پڑے گا۔''

''تو ابھی ان سے کنسلٹ کر لو۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''تم پریشان نہ ہو۔ پیشنٹ کے وائٹل سائنز آلات پر لگا دیئے ہیں اور انہیں مانیٹر کیا جا رہا ہے۔'' وہ ... خاموش ہو گیا۔ تب اس نے بہ غور میرے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا تم یہ بتا سکتے ہو ان کے ساتھ ہوا کیا تھا؟ .... میرا مطلب ہے، کوئی شدید ذہنی صدمہ وغیرہ ....؟''

میں اسے کیا بتاتا۔ تحمل اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ ہو سکتا ہے کوئی ایسی ہی بات ہو۔ پھر میں دوبارہ آنے کا کہہ کر وہاں سے چلا آیا۔ میرا رخ ٹیلی فون بوتھ کی طرف تھا جہاں سے مجھے حامد صمدانی ایڈووکیٹ کو فون کرنا تھا۔

''یہ بہت اچھا ہوا۔'' انہوں نے میری زبانی نگینہ کی بازیابی کا سن کر پُرجوش آواز میں کہا۔ میں نے انہیں مردان شاہ کی موت اور پھر کالو اور کبیر سے ہونے والے مقابلے کی تفصیل نہیں بتائی تھی۔ ''لیکن نادر میاں! نگینہ کا ہوش میں آنا ضروری ہے۔ تم اس وقت کہاں ہو؟ میں بھی وہیں پہنچتا ہوں۔ اور ہاں .... ابھی اس بات کو اپنے تک ہی محدود رکھنا۔''

ان کے استفسار کے جواب میں، میں نے انہیں ہسپتال کا پتہ اور ڈاکٹر منصور کا نام وغیرہ بتا دیا۔

پھر رابطہ منقطع کرنے کے بعد میں نے اعظم خان کے نمبر ملائے۔ انہوں نے سب سے پہلے مجھے اپنے ہاں آنے کی نصیحت کی۔ اعظم خان وہ واحد ہستی تھے جنہیں میں ساری تفصیل سے لفظ بہ لفظ آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں نگینہ کو اس کے ہوش میں آنے سے پہلے تنہا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے انہیں فون پر ہی تفصیل سے آگاہ کرنا شروع کیا تھا کہ انہوں نے میری بات کاٹ دی اور گمبھیر لہجے میں بولے۔

''تم ایسا کرو .... اس کے باپ کو ایک گمنام کال کر کے نگینہ کا بتا دو کہ وہ کون سے ہسپتال میں ہے۔ اور تم خود ادھر آ جاؤ۔'' ان کی بات پر میں نے بتایا کہ میں ایڈووکیٹ حامد صمدانی کو بھی فون کر چکا ہوں اور وہ کسی بھی وقت ہسپتال پہنچنے والے ہیں۔

''ٹھیک ہے .... پھر میں بھی وہیں پہنچتا ہوں .... او کے!''

❋❋❋

میں آئی سی یو کے سامنے چکنے کوریڈور پر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ گاہے گاہے میری نگاہیں دروازے کے شیشے سے دوسری طرف بستر پر لیٹی نگینہ کا طواف کرنے لگی تھیں۔ وہ میرے دل کی دھڑکن تھی۔ میرا سب کچھ تھی وہ۔ جانے اس کے ساتھ ان خبیث شیطانوں کالا ناگ اور کبیر نے کیا سلوک کیا تھا؟

مجھے مردان شاہ کی موت کا خیال آیا تو میرا دل غم سے بھرنے لگا۔ مجھ میں اتنی ہمت ہی نہیں ہو پا رہی تھی کہ میں اس کے بوڑھے باپ کو اس اندوہناک خبر سے آگاہ کر سکتا۔ کالا ناگ نے میرے سامنے اس بات کا اقرار کر کے کہ مردان شاہ کے پُرتشدد قتل میں اس کا ہی ہاتھ تھا، اپنے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی تھی۔ لیکن ساتھ ہی میں نے یہ بھی تہیہ کر لیا تھا کہ اگر کبیر کا بھی مردان شاہ کے قتل میں ہاتھ ہوا تو میں اسے عبرت ناک انجام سے دوچار کر کے ہی رہوں گا۔ بلکہ یہی نہیں، اگر میری نگینہ کے ساتھ ان سے کوئی دل دُکھانے والی بات ظاہر ہوئی تو میں نے ان دونوں کو ہی زندہ نہ چھوڑنے کا پختہ ارادہ

کرلیا تھا۔

ایک گھنٹے کے بعد ایڈووکیٹ حامد صمدانی وہاں آ پہنچے۔ جب ہی ڈاکٹر منصور آئی سی یو میں بُر
معائنہ کر کے باہر نکلا۔ اس نے خوش کن خبر سنائی کہ نگینہ کو ہوش آ چکا ہے اور اب وہ بالکل ٹھیک ہے۔
خوشی سے نہال ہو گیا لیکن جانے کیا بات تھی، میرا دل نامعلوم سی بے چینی میں مبتلا تھا۔

نگینہ کو وی آئی پی روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ میں اور ایڈووکیٹ حامد صمدانی اس کے پاس
اس دوران اعظم خان بھی آ گئے۔ ان کے ہمراہ ایک باڈی گارڈ بھی تھا، اس کا نام شیر دل تھا۔

سب سے پہلے میں نے نگینہ کے سرہانے آ کر اسے پکارا۔

''نگینہ.........!''

وہ پوری طرح ہوش میں تھی لیکن اس کی آنکھوں میں ایک عجیب نامعلوم خوف سمٹا ہوا نظر آ رہا
میرا خیال تھا کہ وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان لے گی مگر اس کے چہرے پر مجھے دیکھ کر ذرا سی بھی شناسائی
رمق نہیں اُبھری تھی۔

وہ ہراساں سے لہجے میں بولی۔ ''مم......... میں......... کہاں ہو؟''

ڈاکٹر منصور وہیں موجود تھا۔ میرے بولنے سے پہلے وہ مسکرا کر نگینہ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''آپ ہسپتال میں ہیں.........اور بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ کا نام.........؟''

''مم.........میرا نام.........نن.........نگینہ.........!''

''آپ اپنے ڈیڈی کا نام بتائیں گی؟'' ڈاکٹر منصور شاید اس کی ذہنی کیفیت جاننے کی غرض سے
سوالات کر رہا تھا۔

''پپ.........پپا!.........وہ کہاں ہیں؟.........مم......... مجھے پپا کے پاس لے چلو۔'' وہ بے قرار
سے بولی۔

''ہاں، ہاں.........آپ کے پپا کو بھی ادھر ہی بلا لیتے ہیں۔ آپ ان کا نام تو بتائیں؟'' ڈاکٹر
نے ملائمت آمیزی سے کہا۔

''ان کا نام.........شاہ میر ہے۔''

نگینہ نے اپنے پپا کا نام بتایا تو ڈاکٹر منصور ایک گہری اور طمانیت بھری سانس لے کر ہم
ہوا۔ ''یہ اب بالکل ٹھیک ہیں۔''

''لل.........لیکن ڈاکٹر صاحب! یہ......... یہ مجھے نہیں پہچان رہی......... کیا اس کی یادداشت
میں نے مضطربانہ پریشانی سے کہا تو ڈاکٹر منصور بولا۔

''ان کی یادداشت بالکل درست ہے۔ البتہ کسی وجہ سے طویل بے ہوشی کے باعث ان کے
دماغ پر ہو سکتا ہے اب تک خوابیدہ اثرات ہوں۔ ذرا دیر بعد جب ان کا ذہن پوری طرح بیدار ہو
گا تو یہ قریبی افراد کے علاوہ دیگر لوگوں کو بھی پہچاننے لگیں گی۔

مجھے ڈاکٹر منصور کی بات پر زبردست ذہنی شاک پہنچا تھا۔

مجھ سے زیادہ قربت نگینہ کی اور کس سے ہو سکتی تھی.........؟ اگر وہ اپنا نام بتا سکتی تھی، اپنے
لے سکتی تھی تو پھر مجھے اب تک کیوں نہ پہچان سکی؟ .... مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہونے لگی
نے ایک بار پھر نگینہ کو مخاطب کیا۔

''نن......... نگینہ!......... مم......... میں تمہارا......... نادر۔ کیا تم مجھے نہیں پہچان رہی ہو؟

تھی، شاید اس بار وہ مجھے پہچان لے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں جہاں کبھی میرے لئے شناسائی کا ایک
امید بھراں ہلکورے لیتا رہتا تھا اور اب وہاں گم نام جزیروں کے سناٹے اترے ہوئے تھے۔
اس کے چہرے پر مجھے دیکھتے ہی بہاریں کھل اُٹھتی تھیں .... لیکن اب وہاں اجنبیت کی خزاؤں
کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

''تت.........تت.........تم کون ہو؟''

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرا دل مٹھی میں لے کر مسل ڈالا ہو۔

''نگینہ!......... مم......... میں کون ہوں؟'' میں نے زخمی لہجے میں اس کا استفسار دہرایا۔ ''نگینہ! تم
مجھے نہیں پہچان رہیں......... میں.........تمہارا نادر۔''

''پلیز، مجھے پپا کے پاس جانے دو......... خدا کے لئے......... ورنہ......... ورنہ میں پاگل ہو
جاؤں گی۔'' نگینہ نے سسک کر ملتجیانہ انداز میں کہا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دل کو شہتیر چیرنے والے آرے کے نیچے رکھ دیا گیا ہو۔

معاً کسی نے عقب سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''ٹیک اِٹ ایزی نادر!.........حوصلہ رکھو۔''
یہ اعظم خان تھے۔

''آ.........انکل!.........نن.........نگینہ......... مجھے پپ.........پہچان نہیں رہی......... بالکل
نہیں پہچان رہی ہے اعظم انکل!'' میں کرب انگیز لہجے میں بولا۔

میری حالت اس وقت ایک ایسے دُکھی بچے کی سی ہو رہی تھی جس کا کوئی قیمتی کھلونا کھو گیا ہو۔

''حوصلہ رکھو نادر میاں!'' قریب موجود ایڈووکیٹ حامد صمدانی نے بھی ازراہِ تشفی کہا۔ ''تم نے ڈاکٹر
منصور کی بات نہیں سنی؟ ....ابھی نگینہ بیٹی کا ذہن پوری طرح بیدار نہیں ہوا۔ آہستہ آہستہ یہ تمہیں بھی
پہچاننے لگے گی۔''

ادھر اعظم خان، نگینہ کے سر پر ازراہِ شفقت ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے تسلی دینے لگے کہ وہ بالکل
پریشان نہ ہو۔ اسے اس کے پپا کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔

پھر وہ میری طرف متوجہ ہو کر دھیمی آواز میں بولے۔ ''میرا خیال ہے، مجھے شاہ میر کو اطلاع دینا
پڑے گی۔''

''مگر.........'' میں کچھ کہتے کہتے رک گیا تو ایڈووکیٹ حامد صمدانی بھی اعظم انکل کی تائید میں مجھ
سے بولے۔

''ہاں نادر!......... یہی زیادہ بہتر رہے گا۔ تم واپس ''گرین لاج'' لوٹ جاؤ......... باقی معاملات
ہم سنبھال لوں گا۔''

''آؤ نادر! میرے ساتھ چلو۔'' اعظم انکل نے ہولے سے میرا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ میں نے
بھرپور نگاہ نگینہ کے چہرے پر ڈالی کہ شاید وہ بے اختیار مجھے پکارے۔ لیکن اس کے چہرے پر شناسائی کی
ایک ذرا رمق بھی نہ اُبھری تھی۔

ناچار میں اپنے دُکھی دل کے ساتھ اعظم انکل کے ہمراہ اس کے کمرے سے نکل گیا۔

اعظم انکل کی کار ہسپتال کے احاطے میں موجود تھی۔ انہوں نے مجھے کار میں بٹھایا اور میری جیپ کی
چابیاں مجھ سے لے کر اپنے ڈرائیور کو دے دیں۔ ڈرائیونگ انہوں نے اپنے گارڈ کے سپرد کی تھی اور خود
میرے ساتھ عقبی نشست پر بیٹھے تھے۔

میں سیٹ کی پشت گاہ سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے خاموش بیٹھا تھا۔

میرے ذہنی خلجان کو محسوس کرتے ہوئے اعظم انکل نے بھی خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔

میرے اندر ایک طوفان کروٹیں لے رہا تھا۔ آندھیوں نے جیسے میرے پورے وجود کو لپیٹ میں رکھا تھا۔ دل و دماغ میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ میں نے بہ مشکل اپنی دگرگوں کیفیات پر قابو پاتے ہوئے حالاتِ گزشتہ کا جائزہ لینا شروع کیا تو ہر بار ایک ہی سوال مجھے شدت سے بے چین اور مضطرب کر رہا تھا کہ نگینہ آخر مجھے کیوں نہیں پہچان پا رہی ہے؟ .... باپ شاہ میر کے بارے میں یہ تو کہ وہ اس کی بیٹی ہے۔ بہ قول ڈاکٹر منصور کہ نگینہ کی یادداشت بالکل درست کام کر رہی ہے۔ تو پھر اس نے مجھے پہچاننے سے کیوں انکار کر دیا تھا؟ .... کوئی ایسی بات تھی، اور کوئی ایسا راز جو کسی ظاہر کر رہا تھا۔ نگینہ کے ساتھ کچھ کیا گیا تھا؟ .... اور یہ بھی اسی دوران ہوا تھا جب کالا ناگ اور کبیر نے نگینہ کو اس کی سہیلی غزالہ کے ہاں یرغمال بنایا تھا اور پھر نگینہ کو اغواء کر کے فوری طور پر ان شیطانوں کے ٹولے کا برف پوش وادی کش پور لے جانا اور پھر وہاں سے نیم بے ہوشی کے عالم میں نگینہ کو واپس لوٹنا کسی پراسرار معاملے کی نشاندہی کر رہا تھا۔

ڈاکٹر منصور کا یہ کہنا کہ چند گھنٹے بعد جب نگینہ کے دل و دماغ سے دھند دھیرے دھیرے چھٹنے لگی تو وہ مجھے خود ہی پہچان لے گی، طفل تسلی کے سوا کچھ معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ تاہم پھر بھی میں نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔

میں نگینہ کو اس کے باپ شاہ میر کے سپرد کرنے کے حق میں نہ تھا لیکن نگینہ کی ذہنی حالت، پھر اس کا خود یہ اصرار کرنا کہ وہ اپنے باپ کے پاس جانا چاہتی ہے، یہ سن کر مجھے مجبوراً اپنا ارادہ بدلنا پڑا تھا اور پھر وہاں ایڈووکیٹ حامد صمدانی اور اعظم انکل کا بھی یہی کہنا تھا۔ اس لئے میں نے بھی چپ سادھ لی۔ بے اختیار ان پریشان کن خیالات کے بھنور سے اُبھر کر اپنے برابر میں براجمان اعظم خان سے کہہ ہی ڈالا۔

"انکل! .... کیا ان حالات میں نگینہ کو باپ شاہ میر کے حوالے کرنا درست تھا؟"

"ہاں۔" انہوں نے بلا تامل جواب دیا۔ "اس صورت میں یہی مناسب تھا۔ تمہارے لئے بھی اور نگینہ کے لئے بھی۔"

"مگر انکل! نگینہ نے بھری عدالت میں اپنے باپ کے خلاف گواہی دی تھی .... اور یہ گواہی دینے کے بعد وہ اپنے باپ سے اس قدر متنفر ہو چکی تھی کہ اپنے گھر جانے کی بجائے وہ خاموشی سے اپنی قریبی سہیلی کے ہاں شفٹ ہو گئی تھی۔ اور پھر وہیں سے اسے کالا ناگ اور کبیر نے اغواء کیا تھا۔" میں نے انہیں یاد دلانے کی غرض سے کہا۔

"میں سب جانتا ہوں۔" وہ ایک گہری اور پُرسوچ ہنکاری خارج کرتے ہوئے بولے۔

"تو پھر آپ کو اب نگینہ کی اس بات پر حیرت نہیں ہوئی کہ آخر اب پھر وہ کیوں اپنے باپ کے پاس جانے پر بضد ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ اس کا ایک فطری ردِعمل ہے۔" وہ بولے۔ "کیونکہ بہ قول تمہارے وہ کسی ایسے سنگین حالات سے گزری ہے جو اس کے دل و دماغ پر بری طرح اثر انداز ہوئے ہیں کہ وہ اپنے باپ کے گھر ہی کو اپنے لئے محفوظ پناہ گاہ سمجھنے پر مجبور ہو گئی ہے۔"

"لیکن انکل! میرا دل اس بات کی نفی کر رہا ہے۔" میں نے اچانک اسرار بھرے انداز میں کہا۔ انہوں نے پہلی بار قدرے چونک کر میری طرف دیکھا اور مختصراً کہا۔

"کیا مطلب؟"

جو بات میرے دل و دماغ میں گردش کر رہی تھی، اسے اعظم انکل کو بتانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اس لئے میں نے یہ موضوع بدلنے کی غرض سے ان کی توجہ ایک اور اہم مسئلے کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"انکل! .... دراصل میرا مطلب یہ تھا کہ نگینہ نے میرے باپ قادر علی خان مرڈر کیس کے سلسلے میں بھری عدالت کے اندر میری ماں کے حق میں اور اپنے باپ کے خلاف گواہی دینے کے بعد کہ آج سے پچیس سال قبل میرے باپ کو میری ماں نے نہیں بلکہ اس کے باپ شاہ میر اور نظر حیات نے قتل کیا تھا۔ تو ایسے میں اب نگینہ کو اس کا باپ شاہ میر کیا ورغلانے کی کوشش نہیں کرے گا کہ وہ اس کے خلاف اپنی گواہی واپس لے لے؟"

"ہاں .... اس کا امکان تو سو فیصد ہے۔" اعظم انکل تائیدی لہجے میں بولے۔ "لیکن میرا خیال نہیں ہے کہ نگینہ اس کی بات مانے۔"

ان کی بات پر میری پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔ اعظم انکل میری پریشانی بھانپ کر بولے۔

"تم بے فکر رہو .... نگینہ کی پہلی گواہی کافی ہے۔ چند دنوں بعد کیس کی پیشی ہے۔ پھر دیکھیں گے کہ کیا ہوگا؟"

اچانک مجھے غفورے کا خیال آیا۔

"انکل! .... غفورے کی گرفتاری کے سلسلے میں آپ نے کیا سوچا؟"

"ہاں .... میں نے اپنے ایک آدمی کے ذریعے اسے پیغام بھیج دیا تھا کہ وہ اپنی آواز بند رکھے جو اس کے لئے بہتر ہوگا۔ بعد میں اسے چھڑانے کی میں نے اسے تسلی بھی دے دی۔" وہ اتنا بتا کر خاموش ہو گئے۔ میں نے بھی چپ سادھ لی۔ لیکن میری اُلجھن تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔

مجھے ماں اور ماموں حیدر گل کا کیس بھی کھٹائی میں پڑتا نظر آ رہا تھا۔ اعظم انکل کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ شاید نظر حیات اور شاہ میر جیسے شاطر اور عیار شیطانوں کی سفاکانہ اور مکارانہ چالوں سے واقف نہ تھے۔

شاہ میر اور نظر حیات اب میری ماں اور ماموں حیدر گل سے اتنے خوف زدہ نہ تھے جتنا کہ انہیں میری طرف سے خوف تھا۔ حالاتِ گزشتہ کی رستا خیزی سے انہیں بہ خوبی اس حقیقت کا اندازہ ہو چکا تھا کہ میں نے اپنے باپ کے قاتلوں اور اپنی مظلوم ماں کو بے گناہ جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں عمر قید کی سزا بھگتنے والے سازشیوں کی سرکوبی کے لئے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ لی تھی اور کفن سر پر باندھ رکھا تھا۔

میری اب تک کی کارکردگی دونوں خبیثوں کے سامنے تھی۔ یہی بہت تھا کہ اس نے اپنے اسی خوف سے اپنی نیندیں حرام کرنے کے متوقع ڈر کی بناء پر انہوں نے میرے خلاف بھی یہ سازش کی تھی کہ مجھے اپنی ماں اور ماموں حیدر گل کے خلاف ایک حد تک ورغلانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ میرے سینے کی تپش اور ارادوں کی مضبوطی کا انہیں بہ خوبی اندازہ تھا اور انہوں نے یہ بھانپتے ہوئے بڑی چالاکی کے ساتھ میرے عزائم اور ارادوں کے بادبانوں کا رخ میری اپنی ماں اور ماموں حیدر گل کی طرف موڑنے کی کوشش کی تھی۔

اچانک میں خیالات سے چونکا۔ کار اعظم انکل کی رہائش گاہ کے سامنے رک گئی تھی۔

❋❋❋

اعظم انکل کی رہائش گاہ میں چند گھنٹے گزارنے کے بعد میں نے واپس ''گرین لاج'' کا قصد کیا۔ اس دوران اعظم خان نے حالات سے آگاہی حاصل کر لی تھی۔

سب ٹھیک ہونے کا اطمینان کر لینے کے بعد ہی انہوں نے مجھے اپنے مکان سے رخصت کرنے کی اجازت دی تھی۔

میں اپنی جیپ میں ''گرین لاج'' کی طرف گامزن تھا۔ میرے دل کو عجیب سی بے چینی لاحق ہونے لگی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہو۔

گرین لاج پہنچا تو چاچا فضل اور سکینہ نے مجھے دیکھ کر اطمینان کی سانس لی۔ میرا ارادہ تھوڑی دیر وہاں قیام کرنے کے بعد مردان شاہ کے باپ کی طرف نکلنے کا تھا۔ اسے مطلع کرنا ضروری تھا ورنہ وہ بے چارہ بیٹے کے نہ ختم ہونے والے انتظار میں گھل گھل کر مر جاتا۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ اسے کس طریقے سے یہ جانکاہ خبر سنانی تھی۔

وہ ایک غریب شخص تھا۔ اپنے بیٹے کے قاتلوں کے خلاف قانونی کارروائی کرنا اس کے بس میں نہ تھا اور نہ میں اسے پوری بات سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ مردان شاہ کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا میں خود عزمِ صمیم کر چکا تھا۔

چنانچہ ذرا دیر بعد میں پھر روانہ ہو گیا۔

مردان شاہ کے گھر پہنچا تو اس غریب کو بیٹے کے انتظار میں ہی پایا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی بوڑھی آنکھوں میں امید کے چراغ جل اُٹھے۔

''مم ......میرا پتر مردان کہاں ہے صیب! ......کک ......کہیں پھر ......اسے پولیس نے تو گرفتار نہیں کر لیا؟''

میں چند ثانئے خاموش کھڑا اس کا چہرہ تکتا رہا۔ بوڑھے کے عقب میں ایک لڑکی کی بھی جھلک نظر آئی۔ وہ دوپٹے کی اوٹ سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی بھائی کا انتظار کر رہی تھیں اور نم ناک سا تاثر پیش کر رہی تھیں۔

''صیب! ......آ ......آپ چپ کیوں ہو؟ ......بتاتے کیوں نہیں؟ ......میرا پتر مردان کہاں ہے؟''

مجھے خاموش پا کر معاً ہی بوڑھے نے دوبارہ تفکر آمیز بے چینی سے پوچھا۔

مجھ میں بالکل ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ ابھی میں انہیں یہ اندوہناک اطلاع دوں۔ میری آواز جیسے گنگ ہو گئی تھی۔ بالآخر میں نے سوچا کہ کیا ضروری تھا انہیں ابھی یہ غم ناک خبر سناؤں کہ وہ جس کے منتظر تھے۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ ان دونوں باپ بیٹی کے غم کا مداوا میں کر سکتا تھا۔ بعد میں مناسب وقت اور حالات کو سامنے رکھتے ہوئے انہیں حقیقت بتانے میں کوئی عار نہ تھی۔

میں نے بوڑھے کے شانے پر ہاتھ رکھا اور راستہ دینے پر میں اندر صحن میں آ گیا۔ پھر اس سے بولا۔

''بابا! مردان کو اچانک ایک ضروری کام سے لاہور جانا پڑ گیا ہے اور بہت جلد لوٹ آئے گا۔''

یہ بات کہہ کر اس سے نظریں چرانے لگا۔

''صیب! ......مردان پتر نے ہمیں نہیں بتایا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔'' بوڑھے نے پریشان ہو کر کہا تو میں نے اسے خط کا حوالہ دیتے ہوئے یاد دلایا کہ مردان نے اس خط میں اس کا ذکر کیا تھا کہ اسے اچانک نکلنا پڑ گیا تھا اور اب میں یہ اطلاع اس کے بوڑھے باپ کو دے آؤں۔

مگر بوڑھے کی پھر بھی تسلی نہ ہوئی تو میں نے اس سے کہا۔

''بابا! میں بھی تمہارے بیٹے کی طرح ہوں۔'' پھر میں نے قریب کھڑی بدنصیب مردان شاہ کی بہن کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے ملائمت سے کہا۔

''بہن! اپنے بابا کو تسلی دو۔ میرے ہوتے ہوئے تم دونوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

میرے لہجے کی اپنائیت پر وہ بولی۔ ''بھائی صاحب! آپ کا بہت بہت شکریہ۔ مگر میرا بھائی کہاں ہے؟ آ......آپ اسے ڈھونڈنے کی کوشش کریں۔ آپ کا احسان ہو گا ہم پر۔''

میں نے دوبارہ محبت آمیز لہجے میں اس سے کہا۔ ''میری بہن! میں نے تجھے صرف منہ سے بہن نہیں کہا ہے بلکہ سمجھا بھی ہے۔ آپ بے فکر رہو ......میں بہت جلد اسے ڈھونڈ لاؤں گا۔ بس حوصلہ رکھو۔''

یہ کہنے کے بعد اب مجھ سے مزید جھوٹ نہیں بولا گیا۔ تاہم میری باتوں سے دونوں باپ بیٹی کو کسی حد تک تسلی ہو گئی۔ پھر میں دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے چلا آیا۔

چند دن بعد ماموں حیدر گل کے مقدمے کی تاریخ تھی۔ مجھے بھی کورٹ میں حاضری کا سمن مل چکا تھا۔ میرے دل و دماغ کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔

مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی۔ وکیلوں کی دھواں دھار جرح کا آغاز ہوا۔ غفورے کو بھی عدالت میں پیش کیا گیا۔ اعظم انکل کے کہنے کے عین مطابق غفورے نے صحت جرم سے انکار کر دیا۔

پھر جب نگینہ کو پھر گواہوں کے کٹہرے میں پیش کیا گیا تھا، میرے دل کی دھڑکنیں یکلخت بے ترتیب ہونے لگیں۔ مگر یہ دیکھ کر میری حالت غیر ہونے لگی تھی کہ اس نے نگاہ بھر کر میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ پھر جب اس سے اس کے باپ شاہ میر کے خلاف پہلے والی گواہی دہرانے کا کہا گیا تو نگینہ نے صاف انکار کر دیا کہ وہ کچھ نہیں جانتی اور نہ ہی اسے اس بات کا علم تھا کہ اس نے اپنے باپ کے خلاف بھری عدالت میں کوئی گواہی دی تھی۔

میں جیسے سکتے میں آ گیا۔ نگینہ کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ میرے اندر بری طرح ہلچل ہونے لگی۔ مگر وکیل صفائی ایڈووکیٹ صمدانی نے عدالت کے ریکارڈ میں موجود نگینہ کی پہلے والی گواہی پر زور دیتے ہوئے دلیل دی کہ نگینہ اب اپنے باپ کے ورغلائے میں آئی ہے اور اس لئے وہ پہلے والی گواہی واپس لینے پر مجبور ہوئی ہے۔

اس کے جواب میں مخالف پارٹی کے وکیل استغاثہ نے نگینہ کو ذہنی مریضہ قرار دے دیا تو وکیل صفائی نے اس کے جواب میں ڈاکٹر منصور سے حاصل کیا ہوا میڈیکل سرٹیفکیٹ جج کے سامنے پیش کر دیا۔

یوں عدالت نے میری ماں اور ماموں حیدر گل کو باعزت بری کر دیا۔

مجھے جہاں ماں اور ماموں حیدر گل کے رہا ہونے کی خوشی تھی، وہاں نگینہ کی اچانک ذہنی کایا کلپ پر دکھ بھی تھا لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ نگینہ کے ساتھ ضرور کوئی پراسرار واقعہ پیش آیا تھا۔ اور اس میں کالا ناگ اور کبیر کی برف پوش وادیوں میں اس پراسرار مہم کا دخل تھا جب وہ نگینہ کو اس کی سہیلی غزالہ کے گھر سے اٹھا کے ''مکش پور'' کی طرف روانہ ہوئے تھے۔

ایڈووکیٹ حامد صمدانی نے بعض مصلحتوں کے پیش نظر کچھ باتیں حذف کر لی تھیں جن کا میں ان سے ذکر کر چکا تھا۔ البتہ نظر حیات اور شاہ میر کی نظر بندی کے احکامات پھر سے عدالت نے واپس لے لئے تھے۔ یوں تفتیشی آفیسر انسپکٹر اعجاز شمسی کے گلے میں ایک بار پھر نئے سرے سے تفتیش کرنے کا طوق ڈال دیا گیا تھا۔ وہ بری طرح جھلایا ہوا تھا۔

قرائن سے یہی نظر آتا تھا کہ کیس کو اب داخل دفتر ہی کیا جانے والا تھا۔

اور میں بھی خود یہی چاہتا تھا کہ میں نے اب اپنی عدالت میں ان دونوں خبیثوں کو کیفرِ کردار پہنچانے کا عزمِ صمیم کرلیا تھا۔

❄❄❄

''گرین لاج'' میں اس وقت جشن کا سماں تھا۔ اعظم خان بھی موجود تھے۔

''گرین لاج'' کی عرصے سے روٹھی ہوئی رونقیں بحال ہوگئی تھیں۔ مگر میرا دل اُداس تھا۔ ماں بار ممتا بھرے انداز میں پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ ماموں حیدر گل بھی خوش تھے میں ماں کی آنکھوں سے آتشِ انتقام کی وہ چنگاریاں بھانپ لی تھیں جو میرے سینے میں بھی بھڑک رہی تھیں۔ غالباً وہ بھی یہی چاہتی تھی کہ سارے معاملات بظاہر درست ہوجائیں اور اس کے بعد اپنے دشمنوں کے خلاف نئے سرے سے کمربستہ ہوں۔ لیکن میری ماں کو شاید اپنے دشمنوں کی ''خطرناکی'' کا پورا اندازہ ہو سکا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ دشمنوں کی خطرناک چال بازیوں اور سازشوں کا جال ہمارے گرد کس قدر مضبوط اور گنجلک ہو چکا ہے۔ اور جب تک میں ان کی سازشوں کو سمجھتا اور اس کا سراغ لگاتا، ہو سکتا تب تک دشمنوں کا خونی شکنجہ ہمارے گرد تنگ ہوجاتا۔

رات کے دس بجے کا وقت تھا۔ ماموں حیدر گل ٹال کے معاملات اور اس کی تعمیر کو۔ نئے سرے ترتیب دینے کی حکمت عملی سے منیجر مشتاق گوندل کو آگاہ کرنے میں مصروف تھے جب کہ ماں، اعظم خا اور میں شاہ میر اور نظر حیات کے خلاف ایک مربوط حکمت عملی جوڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اچانک باہر ایک سے زائد گاڑیوں کے رُکنے کی آوازیں اُبھریں۔ ہم سب چونک گئے۔ پھر ہم سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ اچانک بہت سے دوڑتے ہوئے قدموں کی چاپیں سنائی دیں اور اگلے ہی لمحے ایک دھما سے دروازہ کھلا۔

سامنے کالا ناگ اپنے آٹھ دس مسلح ساتھیوں کے ساتھ نمودار ہوا۔ اسے دیکھتے ہی میرے سار وجود میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔

''خبردار!......کوئی بھی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے......ورنہ گولیوں سے بھون کر رکھ دوں گا۔'' کالا ناگ نے وحشت انگیز لہجے میں دہاڑ کر کہا۔ اور پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گن کا رخ میری جانب کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں حد درجہ سفاکی اور چہرے پر غیظ و غضب کا الاؤ سا بھڑک رہا تھا۔

ہم سب سناٹے کی حالت میں کھڑے رہ گئے تھے۔



کالا ناگ سمیت وہ نو افراد تھے۔ ان کے ہاتھوں میں خوفناک ہتھیار اور آنکھوں میں ہمارے لئے نفرت کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ کالا ناگ کے پستول کی نال کا رخ میری طرف تھا۔ مجھ سمیت سب ہی اس دیدہ دلیری پر حیران تھے۔ مجھے اپنے اطراف کچھ عجیب سا سناٹا محسوس ہو رہا تھا جس میں کالا ناگ اور اس کے ساتھیوں کی پھنکار سے مشابہہ سانس کی آوازیں بری طرح گونجتی سنائی دے رہی تھیں سب دم بخود تھے۔ اس بھیانک سناٹے کو کالا ناگ نے اپنی سرد اور سفاک بلند آواز سے توڑا۔

''خبردار! کوئی بھی اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش نہ کرے۔ کوئی بھی غلط حرکت اس کی آخری حرکت ثابت ہوگی۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے پستول کو خطرناک انداز میں اوپر سے نیچے کی طرف جنبش بھی دی تھی۔

میری نظریں کالا ناگ کے وحشت ناک چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں کی سفاکانہ چمک سے عیاں تھا کہ وہ کسی کو بھی ہلاک کرنے سے دریغ نہیں کرنے والا تھا۔ اس کے سر پر خون سوار تھا۔ ایسے میں اس کے ساتھ ذرا سی بھی جوشیلی گفتگو اسے مزید مشتعل کر سکتی تھی۔ ماں اور ماموں حیدر گل سمیت اعظم خان اسے نہیں جانتے تھے۔ تاہم سب سے پہلے ماموں حیدر گل کو ہی اپنا سکتہ توڑنا پڑا۔ انہوں نے کالا ناگ کو مخاطب کر کے پوچھا۔

''تم لوگ کون ہو؟......اور تمہاری ہم سے کیا دشمنی ہے؟''

''دشمنی!......'' کالا ناگ نے نفرت سے ہونٹ سکیڑتے ہوئے پھنکار کر ماموں حیدر گل سے کہا۔ دشمنی تو بہت چھوٹا لفظ ہے۔ یہ معاملہ تو بہت آگے کا ہے۔ اور یہ سوال کہ میں کون ہوں، یہ تو تمہیں تمہارے اس چہیتے بھانجے نے بتا ہی دیا ہوگا۔ نہیں بتایا تو اب سن لو......کیونکہ تم لوگوں کا اتنا حق تو بنتا ہے کہ مرنے سے پہلے میرے بارے میں جان لو......میرا نام بلال عرف کالا ناگ ہے۔''

کالا ناگ کا نام سن کر ماں اور ماموں دونوں ہی چونک اٹھے تھے۔ کیونکہ میں انہیں اس خبیث کے بارے میں آگاہ کر چکا تھا۔

''میرے نام کے علاوہ یقیناً تمہارے بھانجے نے تمہیں یہ بھی بتایا ہوگا کہ......'' اس نے ایک لمحے کے توقف کے بعد اپنی بک بک جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے وفادار، نمک خوار ملک سردار خان کا بھائی ہوں، جسے اس کی وفاداریوں کا صلہ موت کی صورت میں دیا گیا تھا۔''

اس کی بات ختم ہوئی تو میری ماں نے اثبات میں سر ہلایا اور متانت سے پُر دھیمے لہجے میں بولی۔ ''بے شک وہ سب ہماری غلط فہمی کے سبب ہوا......لیکن اس میں تمہارے بھائی ملک سردار خان کی جلد بازی کا بھی دخل تھا۔

''غلط فہمی......ہونہہ!'' کالا ناگ نے غیظ برساتی نظروں سے ماں کو گھورتے ہوئے خونخوار

غراہٹ سے کہا۔ "یہ غلط فہمی نہیں تھی۔ بلکہ میرے پیارے بھائی کے ساتھ تم لوگوں کی کھلی غدار
دغاباز عورت!"

اپنی ماں کے بارے میں کالا ناگ کے یہ الفاظ میرے لئے ناقابل برداشت تھے۔ میں طیش
لہجے میں کالا ناگ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "کالا ناگ! میری ماں کے بارے میں یہ الفاظ تمہیں
پڑ سکتے ہیں۔"

میری اس مداخلت پر کالا ناگ نے شعلہ بار نظروں سے مجھے گھورا مگر دوسرے ہی لمحے اس
ہیئت ہونٹوں پر بڑی زہریلی اور کینہ پرور مسکراہٹ اُبھر آئی۔ پھر وہ نفرت انگیز لہجے میں بولا۔

"میں اسی موقع کا تو منتظر تھا نادر علی خان! جس کے لئے میں نے تمہاری زندگی کی چند گھڑیاں
دی تھیں۔ مگر آج یہ مہلت سمجھو پوری ہونے والی ہے۔ آج تم اپنی دغاباز ماں اور ماموں کی بر
موت کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھو۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے دائیں طرف کھڑے ایک پستہ قد مگر
جیسے طاقت ور جسم کے مالک ساتھی سے کہا۔ "بشیر چیرا!.........اس عورت کی پیشانی پر میرے
سرخ نشان بنا ڈالو۔"

یہ حکم سنتے ہی بشیر چیرا کی آنکھوں میں سفاکانہ چمک اُبھری اور اس نے اپنے پستول کی نال
ماں کی جانب کیا۔ میں نے ماں کو بچانے کے لئے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت کی مگر چونکہ
حیدر گل ماں کے زیادہ قریب تھے۔ وہ آگے آ گئے۔ گولی چلنے کا دل دہلا دینے والا دھماکا ہوا اور گولی
کی بجائے ماموں حیدر گل کے سینے میں پیوست ہو گئی۔

ماں کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ میں ماموں کو سنبھالنے کے لئے لپکا۔ اس وقت کالا ناگ نے مجھ
پر گولی چلا دی۔ ماں کے حلق سے اُبھرنے والی کرب انگیز چیخ نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ میری آنکھوں
سامنے لاوا اُبلنے لگا۔ میں نے زخمی ماموں حیدر گل کے بے سدھ پڑتے وجود کو چھوڑا اور لپک کر ا
تھام لیا۔ کالا ناگ وحشیانہ قہقہے لگا رہا تھا۔

"نادر!.........میرے بھائی کے قاتل!.........دیکھو یہ منظر.........سنبھالو اپنے پیاروں کی لاش
تاکہ میرے سینے کی آگ ٹھنڈی ہو۔ ہا.........ہا.........ہا........."

"کالا ناگ.........!" میں حلق کے بل اتنی زور سے دہاڑا کہ میری آواز تک پھٹ گئی۔ "میں
زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی کراہتی ہوئی ماں کو فرش پر ڈالا اور کھڑے ہو کر
غضب بھری نظروں سے کالا ناگ اور بشیر چیرا کو گھورنے لگا۔ ان کے باقی مسلح ساتھی گنیں تانے
کھڑے تھے۔

"ہٹ جاؤ آگے سے نادر علی!" کالا ناگ دھاڑ کر بولا۔ "میں تمہاری ماں اور ماموں کی خون
لاشوں کو تڑپتے اور پھڑکتے دیکھنا چاہتا ہوں.........ابھی تمہاری باری نہیں آئی ہے۔ ہٹ جاؤ
لہو رنگ منظر سے انتقام کی آگ بجھانے دو۔" وہ وحشیانہ لہجے میں بولے جا رہا تھا۔ مگر میرا دل
آندھیوں کا مسکن بن چکا تھا۔ جہاں سوائے غضب ناکیوں اور وحشتوں کے کچھ اور نہ تھا۔

"بشیر چیرا! اسے ہٹاؤ آگے سے۔" کالا ناگ نے گرج دار آواز کے ساتھ اپنے ساتھی سے کہا
چیرا اپنے پستول کے زعم میں دانت کچکچاتا ہوا میری طرف بڑھا۔ قریب پہنچ کر اس نے اپنی دائیں
کی ضرب سے مجھے پرے دھکیلنے کی کوشش کی تو میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اس کی ٹانگ پکڑ
دی۔ اس نے جھلا کر غیر ارادی طور پر گولی چلا دی۔ ایک سماعت شکن دھماکا ہوا اور گولی میری

بالکل قریب سے گزر گئی۔ اس کا نشانہ خطا ہو گیا تھا۔

میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید گھبرا کر اس کی ٹانگ چھوڑ دیتا۔ مگر مجھ پر تو کوئی اور کیفیت طاری تھی۔
نت یا تختہ.........انسان جب یہ سوچ لے تو پھر اس کے لئے کچھ بھی عجب اور حیرت ناک نہیں رہتا۔
ڈر، خوف اور سراسیمگی اس سے دور ہو جاتی ہے۔ میں نے بھی بے خوفی سے بشیر چیرا کی ٹانگ پوری قوت
سے مروڑی اور پھر اپنی تمام تر توانائیوں سے اسے کالا ناگ کی طرف دھکیل دیا۔ اس کش مکش نے کالا
ناگ کو ہوشیار کر دیا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ اس لئے وہ اچھل کر ایک
طرف ہٹ گیا اور بلند آواز میں دھاڑا۔

"ان سب کو خون میں نہلا دو۔"

ٹھیک اسی وقت چھرے دار کارتوس چلنے کے دو اوپر تلے گونج دار دھماکے ہوئے اور اس کے باقی مسلح
ساتھیوں میں جیسے کھلبلی مچ گئی۔ ان میں سے کئی گولی چلانے کی حسرت دل میں لئے کریہہ چیخوں کے
ساتھ زمین بوس ہوتے چلے گئے۔ ان کے گرتے ہی عقب میں مجھے چاچا فضل بندوق تھامے کھڑا نظر
آیا۔ وہ بارہ بور کی ڈبل بیرل بندوق میں بڑی پھرتی کے ساتھ کارتوس لوڈ کر رہا تھا۔ جنگلی اور خونخوار
درندوں کو پھاڑ دینے والے "ڈم ڈم" کارتوسوں کے چھروں کے بھیانک اور ہلاکت خیز "پھیلاؤ" نے
گویا کلاشنکوف کے برسٹ کا کام کر دکھایا تھا۔ باقی دو تین ہرکارے جو قریب ہونے کی وجہ سے چھروں
کی زد میں نہیں آ سکے تھے، وہ سنبھلے اور پلٹ کر فضل چاچا پر اپنی گنوں کے منہ کھول دیئے۔ گولیوں کی
بھیانک تڑتڑاہٹ میں فضل چاچا کی دلخراش چیخیں گونجیں اور وہ کئی قدم پیچھے لڑکھڑاتا ہوا زمین پر ڈھے
گیا۔ ادھر کالا ناگ نے سنبھل کر مجھ پر گولی چلا دی۔ میں پہلے ہی اس کی خوفناک جنبش کو بھانپ چکا تھا
لہٰذا تیزی سے جھکائی دیتے ہوئے اپنی لات اس کے پستول والے ہاتھ پر رسید کر دی۔ نتیجتاً پستول اس
کے ہاتھ سے نکلتا چلا گیا۔

ادھر بشیر چیرا نے میرے دیئے ہوئے دھکے سے فوراً سنبھلنے کی کوشش کی تھی اور وحشیانہ غراہٹ کے
ساتھ میری طرف گھوما۔ ٹھیک اسی وقت فضا میں اوپر تلے تین دھماکے ہوئے۔ فضل چاچا پر گولیاں
برسانے والے وہ تینوں خونی ہرکارے مجھ پر بھی فائرنگ کرنے کے لئے پر تول رہے تھے۔ لیکن انکل اعظم
خان نے اس ہڑبونگ سے فائدہ اٹھا کر بڑی پھرتی سے اپنا پستول نکال لیا تھا۔ اچانک اور غیر متوقع افتاد
نے کالا ناگ اور بشیر چیرا کو بوکھلا سا دیا تھا۔ تاہم بشیر چیرا نے مجھے اچانک اپنے پستول کے ذریعے گن
پوائنٹ پر لے لیا اور چلّا کر اعظم انکل کی طرف دیکھ کر بولا۔

"خبردار!.........گولی مت چلانا۔ ورنہ میں اسے بھون ڈالوں گا۔"

میں اپنی جگہ جہاں کا تہاں رہ گیا۔ میرا رواں رواں جوشِ غیظ کے باعث کپکپا رہا تھا۔ میرا بس نہیں
چل رہا تھا کہ میں ان دونوں خونی قاتلوں کی بوٹیاں نوچ لوں۔

بازی ایک بار پھر پلٹ گئی تھی۔ اعظم خان اور بشیر چیرا دونوں ہی ایک دوسرے پر پستولیں تانے
کھڑے تھے جبکہ میں ان دونوں کے درمیان کھڑا تھا۔ میں اپنی جگہ جم کر کھڑا تھا۔ جیسے ہی نہتے کالا ناگ
نے اپنے اکلوتے مسلح ساتھی بشیر چیرا کے قریب سرکنے کی کوشش کی تو اعظم خان نے چلّا کر اس سے کہا۔

"خبردار کالا ناگ!.........اپنی جگہ سے بالکل حرکت مت کرنا۔ تم اس وقت میرے نشانے پر ہو۔"

اعظم خان کی تنبیہہ پر کالا ناگ اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔

"جب تک نادر تمہارے ساتھی کے نشانے پر ہے، تم اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی بے وقوفی نہیں

کرو گے۔"

اب میں بشیر چیرا کے رحم و کرم پر تھا جبکہ کالا ناگ اعظم خان کے پستول کی زد پر تھا۔

"نادر! .... تم اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرو گے۔" معاً بشیر چیرا کی عقابی آنکھوں نے میرے چہرے کے جارحانہ تاثرات سے کسی "متوقع" حرکت کا اندازہ لگاتے ہوئے مجھ سے کہا۔ اب وہ دھیرے دھیرے دروازے کی طرف سرکنے لگے تھے۔ وہ شاید اب راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اس اعصاب شکن ماحول میں ماں کی تکلیف دہ کراہوں کی گونج خاصی بلند تھی۔ وہ دونوں فرار کے لئے پر تول رہے تھے مگر میں انہیں اس کی اجازت دینے والا نہیں تھا۔ اس طرح گویا اعظم خان کی بروقت و برمحل کارگزاری ضائع ہو جاتی۔ ان کی نظریں کالا ناگ پر ٹکی ہوئی تھیں جبکہ بشیر چیرا مجھ پر پستول تانے میری طرف قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے دھیرے دھیرے اُلٹے قدموں سرک رہا تھا۔ ان دونوں کو کھسکتا دیکھ کر مجھ پر اضطراب طاری ہونے لگا تھا۔ مگر شاید اعظم خان کی سوچ مجھ سے مختلف تھی۔ وہ مزید خون خرابے سے بچنے کے لئے ان کے نکل جانے سے متفق نظر آ رہے تھے۔ انہیں زیادہ فکر و پریشانی زخمیوں کی حالت زار پر ہو رہی تھی۔ میں بے بسی سے کھڑا کالا ناگ اور اس کے سفاک ساتھی بشیر چیرا کو دروازے تک پہنچتے دیکھتا رہا۔ پھر جونہی وہ دروازے سے باہر نکلے، میں ماں کی طرف لپکا۔ اعظم خان دروازے کی طرف بڑھے اور پھر ان دونوں کے غائب ہو جانے کا اطمینان کرنے کے بعد زمین پر آڑے ترچھے پڑے کالا ناگ کے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان میں بھی ابھی چند زخمی تھے۔ اعظم خان نے سب سے پہلے ان کی گنوں کو پیر سے ٹھوکر مار کر پرے کیا۔

میں نے ماں کے قریب فرش پر گرنے کے انداز میں بیٹھ کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ کالا ناگ کی چلائی ہوئی گولی ان کے دائیں شانے پر لگی تھی جہاں سے بھل بھل خون جاری تھا۔ ماں کی حالت دیکھ کر میرے وجود میں کرب کی لہر دوڑ گئی اور آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ ماں کے ہونٹ کپکپائے۔

"نن .... نادر بیٹا! گل کی خبر لو۔"

میں تڑپ کر قریب بے سدھ پڑے ماموں حیدر گل کی طرف بڑھا۔ وہ آخری سانسوں پر تھے۔

"مم .... ماموں! .... مم .... میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔" مجھے احساس نہیں تھا کہ فلمی انداز کا یہ جملہ کیونکر میرے لبوں سے ادا ہوا تھا۔ میری آواز سن کر ان کے لبوں پر ارتعاش پیدا ہوا۔

"نن .... نادر بیٹا! مم .... میں تمہیں اس خونی جنگ سے بچانا چاہتا تھا۔ مم .... مگر آہ ..... سب کچھ ختم ہو گیا۔" انہوں نے بہ مشکل یہ آخری جملے ادا کئے تھے اور پھر ان کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ میری سانسیں جیسے سینے میں اٹک کر رہ گئیں۔ دکھ اور کرب کی لہر کسی گولے کی طرح میرے سینے سے حلق میں آ کر ایک لمحے کو اٹک گئی۔ ایک لمحے بعد میرا سارا غم ایک چیخ کی صورت میں میرے لبوں سے برآمد ہوا۔

"ماموں .... !"

میری بلند آواز سن کر ماں اپنی جگہ لرزی اور پھر اس پر بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ میں ماں کی طرف لپکا اور اسے بے سدھ دیکھ کر میرا سینہ جلنے لگا۔ میں یک دم اٹھ کھڑا ہوا اور مجنونانہ انداز میں دروازے کی طرف لپکا۔ اعظم خان میری اچانک اور مجنونانہ پیش قدمی کا مفہوم سمجھتے ہی پکارے۔

"نادر! .... رک جاؤ۔ اب کوئی فائدہ نہیں۔ وہ دونوں خونی دور جا چکے ہوں گے۔ ہمیں

ماں کو فوراً ہسپتال پہنچانا ہو گا۔"

میں رک گیا۔ اعظم خان اپنے سیل پر پولیس سے رابطہ کرنے لگے۔

❋❋❋

ماں کی جان بچ گئی تھی۔ انہیں پنڈی کے ایک بڑے پرائیویٹ ہسپتال میں داخل کر دیا گیا تھا۔ جبکہ ماموں حیدر گل اور فضل چاچا کو سپردِ خاک کر دیا گیا تھا۔ پولیس نے ضابطے کی کارروائی شروع کر دی تھی۔ زندہ بچ جانے والے بدمعاشوں کو تحویل میں لے کر ان سے پوچھ گچھ اور ساتھ ہی کالا ناگ اور اس کے قریبی ساتھی بشیر چیرا کی تلاش بھی جاری تھی۔ میں غم سے بالکل نڈھال ہو چکا تھا۔ ماموں حیدر گل کی موت کا یہ اندوہناک سانحہ معمولی نہ تھا۔ انہوں نے مجھے باپ کی شفقت دی تھی۔ ان کی اگر اپنی اولاد ہوتی تو وہ یقیناً اسے بھی اتنا ہی چاہتے۔ انہوں نے حقیقی معنوں میں مجھے اولاد کی طرح پالا تھا۔ جس کا ایک واضح ثبوت یہ تھا کہ انہوں نے شروع ہی سے مجھے ان خونی اور دیرینہ معاملات سے دور رکھنا چاہا تھا اور خود ہی خاموشی سے میرے باپ کے دشمنوں اور قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لئے کوششیں کرتے رہے تھے۔ البتہ میری ماں کا معاملہ مختلف تھا۔ چونکہ وہ بذاتِ خود ماضی کی اس خوں ناک اور کرب انگیز داستان کا ایک اہم کردار تھیں اس لئے ان کے وجود میں بھڑکتی ہوئی آتشِ انتقام کا اندازہ وہی لگا سکتی تھیں۔ یا پھر میں .... لیکن ماموں حیدر گل کے برعکس، ماں مجھے ایک ایسے جی دار بیٹے کے روپ میں دیکھنا چاہتی تھیں جو ان کے ممتا بھرے دودھ کا حق ادا کرتے ہوئے ان پر ڈھائے گئے ستم کا ظالموں سے حساب لے۔ یہی سبب تھا کہ میری وجہ سے ماموں اور ماں کے درمیان کبھی کبھی تلخی بھی ہو جایا کرتی تھی۔

کیونکہ ماموں حیدر گل نے اپنی مظلوم بہن کا یہ قرض ایک غیرت مند بھائی کی صورت میں اپنے سر پر اٹھا رکھا تھا اور بالخصوص مجھے اس خونیں معاملے سے کوسوں دور رکھنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ماں کا خدشہ درست ثابت ہوا تھا کہ اس طرح مجھے لاعلم رکھنے سے میں اپنی ماں اور ماموں سے بد دل ہو سکتا ہوں۔ اور واقعی، یہی ہوا تھا۔ میں نادانستگی میں اپنے ہی ازلی دشمنوں شاہ میر اور نظر حیات کے ہاتھوں کھلونا بن کر اپنی ہی ماں اور ماموں کا دشمن بن بیٹھا تھا۔ اس کا نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہئے تھا۔ پہلے تو میں اپنے دشمنوں کے ہاتھوں کھلونا بنا اور پھر حالات اتنے بگڑ گئے کہ میرے ماموں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے اور ماں شدید زخمی ہو کر ہسپتال پہنچ گئی تھی۔

کالا ناگ اپنی جگہ کچھ بھی سمجھتا رہے تاہم یہ حقیقت تھی کہ اس کے بھائی ملک سردار خان کا قتل ہماری کسی منصوبہ بندی کا نتیجہ نہیں تھا۔ بلکہ حالات ہی کچھ ایسے بن گئے تھے کہ مجھے اسے قتل کرنا پڑا۔ وہ صدف کا قاتل تھا .... کبیر کی بہن صدف .... اور میں نے یہ سمجھ کر کہ اس نے نگینہ کو مار ڈالا ہے، اسے بھی موقع پر ہی اس کے جرم کی سزا دے دی تھی۔ گویا صدف اور ملک سردار خان کی ہلاکتیں محض گیہوں کے ساتھ گھن کے پسنے والا معاملہ تھا۔

صحیح اور غلط کی بحث سے قطع نظر بہر حال ماموں حیدر گل کی دشمنوں کے خلاف غلط پالیسیوں کا نتیجہ آج ماموں کے بے دردی سے قتل ہونے کی صورت میں نکل چکا تھا اور ماں مرتے مرتے بچی تھی۔

دوسری طرف یہ بھی حقیقت تھی کہ ہمارے چاروں دشمنوں کا ٹولا یکجا ہو چکا تھا۔ شاہ میر، نظر حیات، کبیر اور کالا ناگ۔

کالا ناگ نے اب تک مجھے بہت زک پہنچائی تھی۔ وہ میرا مقروض بن چکا تھا۔ اس خبیث اور بے

رحم انسان نے پہلے میرے جاں نثار دوست مردان شاہ کو کشن پور کے ایک ویران کاٹیج میں بے دردی
ساتھ قتل کیا۔ میری جانِ جاناں نگینہ کو وہ درندہ صفت میرے کینہ پرور رقیب کی ملی بھگت سے
جانے کس گمنام اور پُراسرار مقصد کے لئے لے کر روانہ ہوا تھا۔ پھر جب ایک سنسنی خیز مارا ماری
بعد ان کی کشن پور سے واپسی ہوئی تو نگینہ کی ذہنی رو بڑے ہی عجیب اور پُراسرار طور پر پلٹ چکی تھی
میرے علاوہ سب کو پہچان رہی تھی۔ میں تو اس کے لئے جیسے سراسر اجنبی ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ کیا راز
اور مجھے اس راز سے پردہ اٹھانا تھا۔ جبکہ اس راز سے کبیر اور کالا ناگ ضرور واقف تھے۔ چنانچہ
میں نے کبیر کے منہ سے اگلوانے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔

دوسری بڑی زک مجھے کالا ناگ نے ماموں حیدر گل کا قتل کر کے پہنچائی تھی۔ چنانچہ اب یہ
حقیقت کھل کر سامنے آ چکی تھی کہ دشمن ایک منظم ٹولے کی صورت میدان میں اتر آئے تھے اور اب
بھی ان کا فوری طور پر منہ توڑ جواب دینے کے لئے میدانِ کارزار میں خم ٹھونک کر بے خطر
بصورت دیگر دشمنوں کے حوصلے بلند ہو سکتے تھے۔ جبکہ میری ماں کی جان کو بھی بدستور خطرہ لاحق
وقت کا تقاضا تھا۔ اس کے لئے مجھے سب سے پہلے کالا ناگ اور اس کے دست راست بشیر چیرا
ضروری تھا۔

ماں کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ اعظم خان نے پولیس گارڈز کی خدمات حاصل کر لی تھیں
ماں کی حفاظت کے پیش نظر اپنے ہی چند مسلح آدمیوں کو ہسپتال کے اردگرد تعینات کر دیا تھا۔

یہاں سے بے فکر ہونے کے بعد میں نے فوراً لاہور کا رخ کیا۔ مگر اس سے پہلے میں متعلقہ
کے ریکارڈ کیپر کی مٹھی گرم کر کے اس سے کالا ناگ کے گجر چوک والے اڈے اور ٹھکانے کی
معلومات حاصل کر چکا تھا۔ وہ ہسٹری شیٹر تھا اور کئی مقدمات میں ملوث ہونے کے باوجود ضمانت پر
گھوم رہا تھا۔ شام کے چھ بجے تھے جب میں ایک تیز رفتار اور نان اسٹاپ فلائنگ کوچ کے ذریعے
پہنچا.......... میرے پاس اپنا قابل اعتماد میگارد موجود تھا۔ میں نے گرم شال اس طرح اوڑھ رکھی
اس نے میرا سر اور چہرہ خاصی حد تک ڈھانپ لیا تھا۔ میری حالت کسی فلو کے مریض کی سی تھی۔
وقت میرے اندر لاوا سا پھوٹ رہا تھا۔ سائیں سائیں کرتے کرتے دل و دماغ میں زبردست ہلچل
ہوئی تھی۔ میں کالا ناگ اور بشیر چیرا سے ماموں حیدر گلؒ کی موت کا بدلہ لینے کے لئے بری طرح
رہا تھا اور اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ ہوش میرے عنقا تھے اور جوشِ جنوں فزوں تر۔

ایک رکشے کے ذریعے میں سیدھا ''گجر چوک'' پہنچا۔ میری معلومات کے مطابق ''زمیندارا
کالا ناگ کی مستقل کمین گاہ تھی۔

میں مذکورہ ہوٹل کے قریب پہنچا تو مجھے بادی النظر میں یہ ہوٹل عام سا کوئی چائے خانہ معلوم
عمارت بھی خاصی پرانی ہی نظر آ رہی تھی۔ البتہ اس کا رقبہ وسیع تھا۔ یہ دو منزلہ ہوٹل تھا۔ اوپری
شاید اقامتی کمرے بنے ہوئے تھے جن کی اُکھڑے ہوئے پلستر والی دیواروں کی بالکونیوں
پٹ والے دروازوں کی قطار صاف نظر آ رہی تھی۔

میں نے وہاں گاہکوں کی خاصی تعداد کو دیکھا۔ سب ہی مجھے بے کار، بدمعاش اور بدقماش نظر
تھے۔ ہوٹل میں اندر داخل ہو کر میز سنبھالنے کے بعد مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہاں صرف چائے سرو
تھی۔ کھانے وغیرہ کا کوئی انتظام نہ تھا۔ شاید یہ دوسرے بلکہ تیسرے درجے کا ایک سستا اقامتی
اس لئے یہاں صرف چائے چلتی تھی۔ تاہم مجھے اور بھی کچھ ''چلنے'' کے لوازمات بہ کثرت نظر آئے

میں ایک سالخوردہ سی میز پر جا بیٹھا تھا۔ اوپری منزل تک جانے کے لئے ایک گوشے میں سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ وہاں بھی میں نے کچھ اوباش اور عیاش فطرت افراد کو کچھ عورتوں کے ساتھ اوپر نیچے آتے جاتے دیکھا۔ یہ ''عورتیں'' گھریلو نہیں تھیں، کسی پرائیویٹ اڈے یا محلے سے ''ہائر'' کردہ تھیں۔

''کیا پیش کروں جناب؟'' معاً ایک ویٹر نما شخص جس کی مونچھیں بڑی بڑی تھیں، میری میز کے قریب آ کر بولا۔

''چائے لے آؤ'' میں نے کہا۔ وہ الٹے پاؤں پلٹا اور ذرا ہی دیر بعد سیدھے پیروں چائے کا کپ لئے دوبارہ نازل ہو گیا۔ اس برق رفتار سروس پر مجھے مطلق حیرت نہ ہوئی۔ کیونکہ صرف چائے ملتی تھی اور اس لئے بروقت ملتی تھی۔

''اور کچھ..........؟'' وہ چائے کی پیالی میرے سامنے میز پر دھرتے ہوئے بولا۔ میں نے چائے لے کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی گھنی مونچھوں تلے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

''مثلاً.........؟'' میں نے بھی معنی خیز مسکراہٹ کا تبادلہ کرتے ہوئے پوچھا تو وہ اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی کو اپنی ناک پر دستک دینے لگا۔ عورت کی عیاشی فراہم کرنے کا یہ ایک عام مروجہ اشارہ تھا جو اکثر راہ چلتے عورتوں کے دلال، کسی نئے آنے والے گاہک یا مسافر کو کرتے تھے۔

''اچھا.........'' میں نے ہولے سے کہا۔ پھر بولا۔ ''لیکن مجھے کچھ اور چاہئے۔''

''وہ بھی مل جائے گا.........آپ حکم تو کریں۔'' وہ فدویانہ مستعدی سے بولا۔

''کچھ پینا پلانا تھا.........اور خریدنا بھی۔'' میں نے ٹھیٹ لہجے میں کہا۔

''سب کچھ ملے گا۔ آپ چائے ختم کریں، میں ابھی آتا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ دوسرے گاہکوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مجھے راستہ بنانا تھا اور یہ اوباش ویٹر خود ہی میرا راستہ بنا رہا تھا۔ میں نے چائے کے چند گھونٹ بھرے۔ چائے اچھی تھی۔ ذرا دیر بعد وہ دوبارہ لوٹا اور میرے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کیا چاہئے؟''

''وزنی پانی۔''

''کیسا وزنی پانی؟''

''چرس، افیم ....اگر ہیروئن بھی مل جائے تو کیا بات ہے۔''

''سب کچھ ملے گا.........ویسے آئے کہاں سے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''اندرون سندھ سے آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اوہ.........مال کیسے لے جاؤ گے؟ ایک صوبے سے دوسرے صوبے تک مال لے جانا مشکل ہے۔''

''یہ میرا دردِ سر ہے ....میں تو نتھیں (عورتیں) بھی لے جاتا ہوں۔''

''ان کی اور بات ہے ....وہ تو چلتا پھرتا مال ہے۔ خیر، اگر استاد سے یہ معاہدہ بھی کر لو تو تمہارے دونوں کام آسان ہو جائیں گے۔'' اس نے مشورہ دیا اور ''استاد'' کے ذکر پر فوراً میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں اسے مزید ''ٹرانس'' میں لینے کی غرض سے خوش ہو کر بولا۔

''اچھا.........اگر یہ کام ہو جائے تو سمجھو، تمہارا کمیشن بھی ختم۔ مگر استاد سے کیسے ملا جائے؟'' میں نے اسے لالچ دیتے ہوئے آخر میں مطلب کی بات کی۔

وہ چاروں شانے چت ہو گیا۔ ''ابھی چلو.........مگر میرا کمیشن.........؟''

میں نے سو کے دو نوٹ نکالے۔ اس نے منہ بنا لیا۔ میں نے مزید سو کے دو نوٹ نکالے۔ اس کی آنکھوں میں حریصانہ چمک اُبھری۔ اس نے وہ نوٹ میرے ہاتھ سے لے کر اپنی قمیض کی جیب میں ڈالے، پھر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

''اُٹھو!.........آؤ میرے ساتھ۔''

اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مجھے لئے اوپری منزل کی طرف جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ پیچ دار سیڑھیوں سے اوپر پہنچ کر ہم طویل بالکونی میں آ گئے اور کمروں کے دروازوں کی قطاروں کے سامنے سے گزرتے ہوئے آخری کمرے سے ذرا پہلے بائیں جانب مڑ گئے۔ یہ ایک مختصر راہداری تھی جس کے دائیں بائیں سیلن زدہ سے بدبودار غسل خانے وغیرہ بنے ہوئے تھے۔ اندازاً دس بارہ قدموں کے بعد ایک زینہ نظر آیا۔ میں اس بڑی بڑی مونچھوں والے ویٹر کے عقب میں سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر آ گیا۔ اب ہم ہوٹل ٹاپ (چھت) پر کھلے آسمان تلے کھڑے تھے۔ چھت کے چاروں طرف چھ فٹ اونچی دیوار بھی تھی۔ یہاں ایک ہال کمرے کا دروازہ نظر آیا۔ کچھ اور لوگ بھی دروازے کے باہر کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔

یہ ''خاص'' گاہک تھے۔ اور ''خاص'' شغل کے لئے انہوں نے ان کے بیٹھنے کا یہاں ''ٹاپ'' پر بندوبست کر رکھا تھا۔ میں نے ایک طائرانہ نظر ان پر ڈالی۔

کل چار پانچ میزیں بچھی ہوئی تھیں۔ ہر میز کے گرد چار سے پانچ کرسیاں تھیں۔ شراب بھی چل رہی تھی اور سگریٹوں میں بھری ہوئی چرس کے لمبے لمبے کش بھی لگائے جا رہے تھے۔ ان میں دو ایک لڑکی کے ساتھ ''اس بازار'' کی عورتیں بھی تھیں۔ حالانکہ دیوار پر غالباً کوئلے سے جلی مگر ٹیڑھے میڑھے لفظوں میں لکھا بھی تھا۔ ''عورتوں کا داخلہ ممنوع ہے۔''

یہاں ایک ویٹر بھی ان بدمست گاہکوں کو سرو کرنے میں مصروف تھا۔ وہ مونچھل ویٹر مجھے لئے سیدھا ہال کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے میں نے شال کے اندر اپنے رینگتے ہوئے ہاتھ سے میگارڈ کی موجودگی کا اطمینان کیا اور ہال کمرے میں داخل ہو گیا۔

اس کمرے کو ''ہال'' میں نے اس لئے کہا تھا کہ یہ دوسرے کمروں کی بہ نسبت بڑا تھا۔ ورنہ تو اس میں ''ہال'' والی کوئی بات نہ تھی۔ اٹھارہ بائی بائیس کا لمبا چوڑا کمرہ تھا۔ یہاں دائیں بائیں دو چار پائیاں اور سالخوردہ سے صوفے بھی دھرے تھے۔ سامنے ایک بڑی سی میز تھی اور اس کے پیچھے ایک ریوالونگ چیئر تھی۔ چیئر پر ایک ہٹا کٹا سرخ آنکھوں والا بدمعاش ٹائپ شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے دائیں جانب دیوار سے لگے صوفے پر دو افراد بیٹھے تھے۔

''اوئے......... یہ کون ہے؟'' سرخ آنکھوں والے نے میرے ساتھ آئے ویٹر کو گھورتے ہوئے میرے بارے میں پوچھا۔ جبکہ میں اس کے سامنے والی کرسی پر براجمان ہو گیا۔ اپنے ''شکار'' کو یہاں موجود نہ پا کر مجھے مایوسی ہوئی۔

''استاد!......... یہ بہت بڑا سیٹھ ہے۔ اندرون سندھ سے آیا ہے۔ اسے مال خریدنا ہے۔''

ویٹر نے مؤدبانہ لہجے میں کہا تو سرخ آنکھوں والے نے میری طرف بہ غور برماتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ ''کیا نام ہے تیرا؟''

''لعل خان.........!'' میں نے غلط نام بتایا۔ سرخ آنکھوں والے نے ویٹر کو جانے کا اشارہ کیا۔ پھر مجھ سے دوبارہ مخاطب ہو کر کھرکھراتی آواز میں بولا۔

''کیا چاہئے؟''

''افیم اور چرس چاہئے۔'' میں نے ٹھیٹ لہجے میں کہا۔ ''اگر ہیروئن کی ڈلیوری بہ آسانی ہو سکے تو وہ بھی تھوڑی بہت خرید لوں گا۔''

''تمہیں یہاں کا پتہ کس نے بتایا تھا؟'' وہ شک آمیز نظریں میرے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے بولا۔

''میرا ایک ہندو سیٹھ دوست ہے......... لاہور سے گریزی کا مال سندھ لے جاتا ہے......... اس نے ہی بتایا تھا۔'' میں نے کہا۔

اس نے ایک سگریٹ نکال کر سلگائی اور ایک طویل کش لیا۔ دھوئیں کے کثیف مرغولوں میں چرس کی ناگوار بو تھی۔ ''سندھ سے تو ہمارے بہت سے گاہک آتے ہیں۔'' وہ تفاخر آمیز رعونت سے بولا۔ ''خیر، ہم تمہیں بھی مایوس نہیں کریں گے۔ چرس اور افیم کی ڈلیوری چاہو تو ہم کروا دیں گے......... لیکن ہیروئن سپلائی کروانا مشکل ہے۔ آج کل ایکسائز پولیس نے بہت سختی کر رکھی ہے۔'' اس کا لہجہ دوستانہ ہو گیا۔

میں نے اپنے مقصد کی خاطر بحث کو طول دینے کی غرض سے اپنی سوئی ہیروئن کی ''تسلی بخش'' سپلائی پر اٹکا دی۔ لہٰذا مسکرا کر بولا۔ ''استاد! اگر آپ چرس اور افیون کی سپلائی کر سکتے ہو تو ہیروئن کیوں نہیں کر سکتے؟''

''کر تو سکتے ہیں.........مگر اس میں خرچہ بہت آتا ہے۔ کرائے سے تین گنا زیادہ بھتا دینا پڑ جائے گا۔ ادا کرو گے تم؟''

''مال دو.........ابھی کر دوں گا ادائیگی۔'' میں نے فوراً کہا۔ ''اور ہاں، میں ذرا جلدی میں ہوں۔ کیش ساتھ لایا ہوں۔''

اس کی آنکھوں میں گرسنہ چمک اُبھری۔ پھر اسی وقت اس نے دراز سے ایک سیل فون نکالا اور کسی کا نمبر پنچ کرنے لگا۔ رابطہ ہونے پر وہ انتہائی مؤدبانہ لہجے میں بولا۔

''استاد! اندرونِ سندھ سے ایک گاہک آیا ہے، مال کے ساتھ۔ تسلی بخش ڈلیوری چاہتا ہے۔ خرچہ بھی زیادہ اٹھائے گا۔'' اتنا کہہ کر وہ دوسری طرف سے کچھ سنتا رہا۔ پھر بولا۔

''مگر استاد!.........وہ کہہ رہا ہے کہ میں کیش ساتھ لایا ہوں اور اسے لوٹنے کی ذرا جلدی ہے۔'' وہ دوبارہ بولا۔ ''نہیں استاد! بس ایک بار ہی پولیس آئی تھی۔ اسے میں نے ٹھنڈا ٹھار کر کے واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ دوبارہ چھاپے کا امکان تو نظر نہیں آتا۔ یوں بھی ہماری نمک حلال بھیڑیں تھانوں میں موجود ہیں۔ جیسے ہی کوئی بات ہوتی ہے، وہ ہمیں خبر کر دیتے ہیں۔''

''یہی بہتر رہے گا استاد!.........اب بے غم ہو کر خود ہی آ جائیں تو اچھا ہے.........ٹھیک ہے۔''

اس نے سیل آف کرنے کے بعد مجھ سے کہا۔ ''تمہارا کام ہو گیا۔ استاد خود یہاں پہنچ رہا ہے۔''

میرا دل جیسے یکبارگی کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ جی میں تو آئی کہ ''آنے والے'' استاد کا نام پوچھ لوں۔ لیکن میں کسی عجلت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تاہم چالاکی سے بولا۔ ''کیا یہاں پولیس کے چھاپے بھی پڑتے ہیں؟''

وہ میری بات پر ہنسا۔ ''لگتا ہے تم کچے کھلاڑی ہو۔ یہ چھاپے تو روز کا معمول ہیں۔ ہوتا کچھ بھی نہیں۔ ہم بڑی تیاری رکھتے ہیں۔ فکر نہ فاقہ، عیش کر کاکا۔'' یہ کہہ کر وہ بھونڈے انداز میں ہنسا اور مجھے ایک اور سگریٹ پیش کیا۔ میں نے انکار کر دیا۔ میں اپنی بے چینی کو دباتے ہوئے بولا۔

''کتنی دیر میں پہنچ جائے گا تمہارا استاد؟''

ابھی میں نے اتنا ہی پوچھا تھا کہ اچانک اس کا موبائل فون گنگنایا۔ اس نے لپک کر اپنا سیل فون کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے کسی نے کچھ پوچھا تو وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔

''تمہیں مال کتنا چاہئے؟''

میں چونکا۔ اس وقت میرا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے کچھ سمجھتے ہوئے دانستہ زیادہ مقدار بتائی۔ ''تیس کلو افیم، پچیس کلو چرس اور تین کلو ہیروئن۔''

سرخ آنکھوں والے گماشتے کی آنکھیں پھیل گئیں۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس نے سیل فون پر یہ تعداد دوہرا دی۔ میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''ٹھیک ہے استاد!......... پھر یہی بہتر رہے گا۔ ہم ابھی پہنچتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے سیل فون آف کر دیا۔

''آؤ میرے ساتھ .... استاد کے پاس چل کر معاملات طے کر لیتے ہیں'' اس نے کھڑے ہوتے ہوئے مجھ سے کہا۔ میرا دل جیسے کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ اس نے قریب بیٹھے دو افراد سے کہا۔ ''میں ذرا ڈیڑھ دو گھنٹے میں لوٹتا ہوں .... ٹھیک ہے؟''

دونوں نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے بعد میں اس کے ساتھ چلتا ہوا زینے طے کرتا زمیندارہ ہوٹل سے باہر آ گیا۔

ایک موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ہم روانہ ہو گئے۔

میں نے پوچھا۔ ''کدھر چلے اب؟''

''زیادہ دور نہیں .... استاد کا بنگلہ قریب ہی ہے۔'' اس نے موٹر سائیکل کو مین شاہراہ کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

''مگر استاد تو خود آ رہا تھا .... پھر یہ اچانک ....'' یہ کہتے ہوئے میں نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ بولا۔

''اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے سائیں لوکو! مال کی بنی بنائی کھیپ تمہیں وہیں مل جائے گی۔ اور اس کی سندھ با آسانی سپلائی سے متعلق معاملات بھی وہیں طے ہو جائیں گے۔''

''یہ تو اور اچھی بات ہے .... لیکن دیر تو نہیں ہو جائے گی؟'' میں نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے کہا۔

''او نہیں یار! .... بلکہ استاد نے تمہیں وہیں اپنے بنگلے پر بلوا کر وقت کی بچت کر دی ہے۔ ورنہ اسے یہاں آنا اور مال کی جتنی کھیپ تمہیں چاہئے، اتنی اڈے پر بھی نہیں تھی۔ اور ہمیں یوں بھی پھر استاد کے ساتھ بنگلے میں جانا پڑتا۔''

''کیا بنگلے میں زیادہ مال گودام ہے؟''

''ہاں .... زمین دوز مال گودام۔''

''بڑا ٹھیکے والا ہے تمہارا استاد .... کیا نام ہے اس بہادر شخص کا؟'' بالآخر مجھے اپنے شکار کا پوچھنے کا موقع ہاتھ آ ہی گیا۔

''نام نہ ہی سنو تو بہتر ہے .... خواہ مخواہ ڈر جاؤ گے۔'' اس کے لہجے میں غرور تھا۔

''پھر بھی .... بتاؤ تو .... یہ کہہ کر تو تم نے خواہ مخواہ ہی میرے تجسس کو بڑھا دیا ہے۔'' میں نے پُراشتیاق انداز میں کہا۔

''بلال عرف کالا ناگ۔'' اس نے جیسے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا اور میری رگوں میں خون کی مثل لاوا بھڑکنے لگی۔ اور ساتھ ہی مجھے تسلی بھی ہو گئی کہ میں بالکل ٹھیک جا رہا تھا۔

''کیوں، سونگھ گیا نا سانپ ....!'' وہ میری یکلخت خاموشی پر فخریہ انداز میں بولا۔

''واقعی، تمہارے استاد کا بڑا ہی خوف ناک نام ہے۔'' میں نے اسے مزید بانس پر چڑھاتے ہوئے ''کیا وہ وہاں تنہا رہتا ہے یا بیوی بچے بھی رہتے ہیں ساتھ؟''

''استاد ابھی ان جھنجٹوں میں نہیں پڑا۔ وہاں وہ اپنے گنتی کے چند دوستوں کے ساتھ رہتا ہے۔'' اس بتایا۔ میرے سینے میں جوش غیظ کی آگ مزید بھڑکنے لگی۔

تقریباً نصف گھنٹے بعد ہماری موٹر سائیکل ایک پوش علاقے میں داخل ہو رہی تھی......... یہاں بہت خوب صورت کوٹھیاں اور بنگلے قطار اندر قطار نظر آ رہے تھے۔ ان کے اندر باہر خوب صورت پھلواریاں لگی تھیں۔ صنوبر اور سیلون کے ناریل پیڑ بھی نظر آ رہے تھے۔ بید مشک کی بھی بہتات تھی۔ ایک دو بلاک مڑ کر ہم ہلکے آسمانی رنگ کے ایک بنگلے کے قریب پہنچے۔ میرے اعصاب یک دم تن گئے تھے۔ گرم شال سے میں نے اپنا چہرہ اچھی طرح ڈھانپ لیا تھا۔ میرے پورے وجود میں سنسناہٹ ہونے لگی تھی۔ غیظ و غضب سے میرے دل کی دھڑکنیں سینے کا پنجر توڑے ڈال رہی تھیں۔ گیٹ پر موجود ایک چوکیدار نے ہمیں دیکھتے ہی آہنی گیٹ کا ایک پٹ ذرا وا کر دیا۔ اسے یا تو ہماری متوقع آمد کے بارے میں بتا دیا گیا تھا یا پھر وہ موٹر سائیکل سوار کو جانتا تھا۔ اس نے موٹر سائیکل سیدھا اندر لے جا کر بنگلے کے وسطی محراب دار دروازے کے قریب پختہ روش پر روک دی۔

میں نیچے اتر آیا۔ اس نے موٹر سائیکل سائیڈ اسٹینڈ پر کھڑی کی۔ مجھے پورٹیکو میں گرے کلر کی ایک (سوزوکی) کار کھڑی دکھائی دی۔

میں نے سرسری نگاہ قرب و جوار میں ڈالی اور اس کے ہمراہ چار پانچ قدمچوں والی ماربل چپس کی سیڑھی چڑھتا ہوا مرکزی دروازے پر پہنچا۔

دروازہ کھلا تھا۔ اس نے ذرا دھکا دے کر وا کر دیا اور اندر داخل ہو گیا۔ میں بھی دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ سامنے نشست گاہ کا سنگل پٹ والا دروازہ نظر آیا جس کے اندر مجھے باتوں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ مجھے لئے اندر داخل ہوا۔ سامنے صوفوں پر تین افراد اور دو تیکھے نقوش والی لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ تین مردوں میں سے ایک میرے لئے اجنبی تھا جبکہ دو افراد پر نظر پڑتے ہی میری رگوں میں دوڑتا ہوا خون مثل آتش فشاں لاوا اُگلنے لگا۔ ان میں سے ایک بشیر چیرا تھا جبکہ دوسرا کالا ناگ!

میں نے اپنی گرم شال کے اندر ہی سے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا میگارد نکال لیا۔ پھر جب تک وہ سنبھلتے، میں نے شال الٹ دی۔ کالا ناگ اور بشیر چیرا کی نظر جیسے ہی مجھ پر پڑی وہ یک بیک ساکت ہو گئے۔ ان دونوں خبیثوں نے اسی طرح ہی اپنے مسلح خونی ہرکاروں کے ساتھ ہماری رہائش گاہ زین لاج پر شب خون مارا تھا اور اب میں بھی انہیں اسی طرح جواب دینا چاہتا تھا۔

''کالا ناگ! اب تم بھی اپنوں کو کھوتا دیکھو گے۔''

میں نے جوشِ انتقام سے لرزتی آواز میں کہا تو اس کے دست راست بشیر چیرا نے حرکت کی۔ وہ اپنی جیب سے کوئی ہتھیار نکالنا چاہتا تھا۔ میرے سر پر تو خون سوار تھا۔ میں بھلا اسے اب کب موقع دینے والا تھا۔ میرے میگارد نے ایک شعلہ اُگلا اور اڑتالیس بور کی گولی نے بشیر چیرا کی پیشانی اُڑا دی۔ صوفے پر بیٹھی دونوں لڑکیاں ہراساں ہو کر چیخنے لگیں۔ میرے ساتھ آنے والے زمیندارہ ہوٹل کے استاد نے مجھ

پر جھپٹنے کی کوشش کی مگر میں نے اسے ایک لات رسید کر دی۔ وہ کالا ناگ کے قدموں میں جا گرا۔ صوفے پر بیٹھے اس کے دوسرے ساتھی نے خوف زدہ ہو کر بھاگنے کی کوشش کی تو میں نے اس کی ٹانگ پر گولی چلا دی جو اس کی ران پر لگی۔ وہ کریہہ چیخ کے ساتھ قالین پر گرا اور زخمی ران پکڑے مارے درد کے کراہنے لگا۔ وہ دونوں فیشن ایبل لڑکیاں ہسٹریائی انداز میں چیخے جا رہی تھیں۔

"خاموش ہو جاؤ......... ورنہ تم دونوں کو بھی گولی سے اُڑا دوں گا۔" میں نے ان دونوں کو گھورتے ہوئے غضب ناک لہجے میں کہا۔ "میری تم لوگوں سے دشمنی نہیں۔ لیکن اگر کسی نے میرے آڑے آنے کی کوشش کی تو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

میرے ساتھ آنے والا کالے ناگ کا ساتھی اٹھنے لگا تو میں نے ایک عدد گولی اس پر بھی چلا دی۔ اس کے دائیں بازو پر لگی۔ وہ بری طرح کراہ کر رہ گیا اور پھر اس نے حرکت نہ کی۔ کالا ناگ کے چہرے پر وحشت طاری تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑے بڑی خوفناک نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس اچانک صورت حال نے ایک لمحے کو اسے بھی کسی حد تک اعصاب زدہ کر دیا تھا۔ اسے شاید میری اس اچانک کارروائی نے اچھی طرح باور کرا دیا تھا کہ میں اس وقت جوشِ انتقام سے مغلوب ہو رہا تھا۔ مدمقابل کی ذرا سی جنبش میری آتشِ غیظ کے لئے جلتی پر تیل ثابت ہو سکتی تھی۔ میری اس دہشت نے "گجر چوک" کے سفاک، شاطر بدمعاش کالا ناگ کو اپنی جگہ سمٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"کالا ناگ!" میں اسے لاوا اُگلتی نظروں سے گھورتے ہوئے شعلہ بار لہجے میں بولا۔ "میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میں صرف گولی سے بات کروں گا۔ نگینہ کے ساتھ تم نے کیا، کیا تھا؟......... اسے تم کبیر کش پور کیوں لے کر گئے تھے؟"

میرے سوال پر کالا ناگ کے تنے ہوئے اعصاب جیسے پُرسکون ہوتے چلے گئے۔ اسے غالباً یہ خوش فہمی ہونے لگی تھی کہ میں اسے ابھی ہلاک کرنے کا ارادہ نہ رکھتا تھا۔

یہی سبب تھا کہ وہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی خباثت سے مسکرایا۔ مجھے اس کا یہ انداز بری طرح کھل گیا تھا۔ میں نے میگارڈ کا رخ پہلے ہی اس کی طرف کر رکھا تھا۔ اس کی خوش فہمی دور کرنا لازمی ہو گیا تھا۔ میں اس کے دائیں شانے کا نشانہ لے کر ٹرائیگر دبانا ہی چاہتا تھا کہ اچانک مجھے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا......... میں جیسے ہی پلٹا تو میری نظر ایک لٹھ بردار بدمعاش پر پڑی جو خوفناک ارادوں کے ساتھ میری جانب بڑھ رہا تھا۔ مجھے چونکتے دیکھ کر اس نے اپنے ہاتھوں میں پکڑا ہوا وہ ڈنڈا اچھال کر دے مارا۔ میں نے پھرتی سے جھکائی دی اور اس پر گولی چلا دی۔ اس وقت میں اسے پہچان چکا تھا۔ وہ وہی بدمعاش تھا جس نے ہمارے لئے اس بنگلے کا دروازہ کھولا تھا۔

میرے تباہ کن میگارڈ نے ایک دھماکے سے شعلہ اُگلا۔ مگر اس نے غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے پہلے ہی خود کو جھکائی دے کر دروازے کی طرف اچھال دیا تھا۔ میں اسے چھوڑ کر اپنے اصلی دشمن یعنی کالا ناگ کی طرف جیسے ہی پلٹا، اس نے اس لمحاتی وقفے سے فائدہ اٹھایا۔ بہ سرعت اپنی جگہ سے اٹھ کر مجھ پر چھلانگ لگائی۔ میں اس اچانک حملے کی زد میں آ گیا۔ وہ مجھے رگیدتا ہوا دیوار تک گھسیٹتا چلا گیا۔

میگارڈ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں سنبھلنے کی کوشش کرتا، اس نے غراہٹ کے ساتھ میری کنپٹی پر مکا رسید کر دیا......... میرا دماغ جھنجھنا اُٹھا۔ آنکھوں کے سامنے

جانے لگی۔ وہ بھی ایک کائیاں تھا جو مجھے سنبھلنے کا ذرا بھی موقع دینا نہ چاہتا تھا۔ سنبھل کر اس نے میرے مقابل لیٹے لیٹے اپنی دائیں ٹانگ کا گھٹنا میرے پیٹ پر بھی رسید کر دیا۔ اذیت کی جاں کش لہر نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے میرے اندر کا غیظ جنون میں تبدیل ہو گیا اور میں سب کچھ بھول کر تڑپ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ کالا ناگ نے بھی کھڑے ہونے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہ لگائی تھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میرے اندر کا کھلاڑی پوری شد و مد کے ساتھ بیدار ہو گیا تھا۔ میں غراتا ہوا اس پر جھپٹا۔ بڑی پھرتی سے اپنی دائیں ٹانگ کا اڑنگا لگا کر میں نے اسے دوبارہ زمین بوس کر دیا۔ یہ ایک اسپورٹس فل بیک داؤ تھا۔ میں چونکہ آل راؤنڈر کھلاڑی تھا اور اکثر فٹ بال کھیلنے کے دوران جب مدمقابل ٹیم کا کوئی کھلاڑی فاؤل پلے کرتے ہوئے مجھے اڑنگا لگا کر گرانے کی کوشش کرتا تو میں الٹا یہ داؤ اس پر آزما ڈالتا تھا۔ کالا ناگ جیسے ہی زمین بوس ہوا، میں نے اپنے بوٹ کی ایک زوردار ٹھوکر اس کی کنپٹی پر رسید کر دی۔ اس کے حلق سے بیل جیسی ڈکراہٹ اُبھری۔ پھر تو جیسے مجھ پر جنون سوار ہو گیا اور میں نے اسے لاتوں پر رکھ لیا۔ وہ تابڑ توڑ حملوں سے بری طرح گھبرا گیا اور اس کے حلق سے وحشیانہ غراہٹیں اُمڈنے لگیں۔ پھر اس نے تڑپ کر لوٹ لگائی اور جیسے ہی اٹھ کر کھڑا ہونے کی کوشش کی، میں نے دائیں ہاتھ کا گھونسا اس کی ناک پر جڑ دیا۔ اس کے حلق سے مارے اذیت کے وحشیانہ چیخ اُبھری اور وہ کئی قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا گیا۔ میں نے باؤلنگ کرانے کے انداز میں مختصر سا اسٹارٹ لیا اور دوڑتا ہوا اس کی طرف آیا اور اچھل کر اپنی ایک ٹانگ اس کے سینے پر جڑ دی۔ یہ ضرب زوردار ثابت ہوئی۔ جس نے کالا ناگ جیسے گرانڈیل شخص کو بھی فرش سے چند انچ اُچھل کر عقب میں دیوار سے ٹکرانے پر مجبور کر دیا۔ اور جب دوبارہ اپنے قدموں پر آیا تو اس کے انداز میں واضح طور پر لڑکھڑاہٹ تھی۔ وہ اپنی پشت دیوار سے ٹکا کر ہانپنے لگا۔ اس کے ناک سے بھل بھل خون بہنے لگا تھا جس نے اس کا چہرہ مزید خوفناک، لہو رنگ بنا دیا تھا۔ اچانک میری نگاہ اپنے میگارڈ پر پڑی۔ میں پھرتی سے اسے جھپٹنے کے لئے بڑھا اور پھر جیسے ہی اسے اٹھا کر سیدھا ہوا، میں نے کالا ناگ کو دروازے سے باہر بھاگتے دیکھا۔

میں نے دانت پیستے ہوئے اس پر گولی چلا دی مگر میرا نشانہ خطا ہو گیا۔ وہ نکل بھاگنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ میں بھی اس کی "یقینی" موت بنا اس کے تعاقب میں دوڑ پڑا۔ دفعتاً مجھے گیٹ کے باہر لوگوں کا شور سا سنائی دی۔ اردگرد کے لوگ شاید گولیوں کے دھماکوں کی آوازیں سن کر وہاں آن موجود ہوئے تھے۔ مگر میری جنوں خیز نظریں اپنے درندہ صفت دشمن کالا ناگ پر جمی تھیں جو گیٹ کی طرف دیوانہ وار بھاگا جا رہا تھا۔ مجھ پر بھی جیسے خون سوار تھا۔ میں بھی میگارڈ ہاتھ میں تولے اس کی طرف بھاگا۔ میں نے اس کا نشانہ لیا اور لبلبی دبا دی۔ گولی کا ایک اور دھماکا ہوا اور کالا ناگ اذیت ناک چیخ مار کر پختہ فرش پر گر پڑا۔ گولی اس کی پشت پر لگی تھی۔

اچانک باہر پولیس سائرن کی آواز اُبھری۔ شاید کسی قریبی مکین نے پولیس کو اطلاع کر دی تھی۔ میرا ذہن بری طرح سائیں سائیں کرنے لگا۔ میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو مجھے دائیں جانب وسیع لان کے پار ایک گلیارا نظر آیا، جو بنگلے کی مشرقی دیوار اور باؤنڈری وال کے عین درمیان میں واقع تھا۔ میں نے میگارڈ قمیص کے نیچے کمر کے گرد بندھے ہولسٹر میں اڑسا اور مذکورہ سمت کی طرف دوڑا۔ گلیارے میں داخل ہونے کے ساتھ ہی میں نے سامنے دیکھا۔ یہ مختصر گلیارا ذرا آگے جا کر بائیں جانب بنگلے کی پشت کی سمت میں گھوم رہا تھا۔ میں دوڑتا ہوا اختتام پر پہنچ کر بائیں جانب مڑا تو مجھے سامنے اختتام پر ایک چھوٹا سا ٹوائلٹ روم دکھائی دیا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ یہ سیڑھیوں کا کام دے سکتا تھا۔ میرے ذہن

میں فوراً یہ خیال اُبھرا اور پھر لپک کر میں دروازے کے سہارے اوپر ٹوائلٹ کی چھت پر چڑھ گیا۔ اور نہایت احتیاط سے باؤنڈری وال پر آ کر دوسری طرف باہر کود گیا۔

یہ کوٹھیوں اور بنگلوں کے عقب میں بنی ہوئی گندی گلی (کچرا گلی) تھی۔ کچرے کے ڈھیر پر کود کر میں نے دوڑ لگا دی اور تاریکی کا فائدہ اٹھاتا ہوا دور تک دوڑتا چلا گیا۔ اور پھر ایک طویل چکر کاٹ کر شاہراہ پر آ گیا۔ یہاں آ کر میں نے اپنے حواس پر قابو پایا۔ کچھ دیر بعد میں نے ایک آٹو رکشہ روکا اور بوہڑ چوک چلنے کا کہہ کر اس پر سوار ہو گیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں بوہڑ چوک پر تھا۔ یہاں تیز رفتار بسوں اور ویگنوں کا اڈا تھا جو مختلف چھوٹے بڑے شہروں کی طرف جاتی تھیں۔ مگر میں نے بس کی بجائے پنڈی جانے والی ایک تیز رفتار ہائی ایس ویگن کا انتخاب کیا۔ بیس منٹ بعد اس کی روانگی کا نمبر آیا تو اس نے رینگنا شروع کر دیا۔ میں جلد سے جلد لاہور سے نکل جانا چاہتا تھا۔

سپیدۂ سحر نمودار ہونے تک میں راولپنڈی پہنچ چکا تھا بس اسٹاپ سے میں سیدھا ہسپتال کی طرف گیا جہاں ماں داخل تھی۔

ماں کو اب انتہائی نگہداشت کے وارڈ سے وی آئی پی روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ وہاں نرسیں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ جس وقت میں روم میں داخل ہو رہا تھا تو ایک نرس ہاتھوں میں ٹرے اٹھائے باہر نکل رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔

''آپ کہاں تھے؟......... آپ کی والدہ بار بار آپ کا نام لئے جا رہی تھیں۔''

میں نے مضطربانہ بے چینی سے پوچھا۔ ''سسٹر! خیریت تو ہے نا؟......... ماں کی طبیعت کیسی ہے؟''

''وہ ٹھیک ہیں......... جائیے اندر۔'' وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گئی۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ ماں بیڈ پر دراز تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے کہا۔

''نادر!......... میرے بچے!''

میں لپک کر ان کی طرف بڑھا اور ان کے سرہانے بیٹھ گیا۔ ماں کے پُرنور چہرے پر میرے لئے ممتا کا سمندر موجزن تھا۔ مگر اس کے ساتھ ان کی آنکھوں میں بھائی کی جدائی کا اندوہناک غم بھی نمی کی صورت جھلملا رہا تھا۔ میں نے وفورِ جذبات سے مغلوب ہو کر ماں کی پیشانی کو چوم لیا اور ان کا اٹھا ہوا کپکپاتا ہوا ہاتھ محبت سے تھام لیا۔ اور اپنے حلق میں اُتری ہوئی غم واندوہ کی رقت کو نگلتے ہوئے بولا۔

''ماں! کیسی ہے تُو؟''

''میرے بچے!......... میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مگر تو......... تو اچانک کہاں چلا گیا تھا؟'' انہوں نے نحیف اور کانپتی آواز میں پوچھا۔ ''میں تو تیرے اچانک غائب ہونے پر ڈر رہی تھی کہ کہیں پھر ہمارے دشمنوں نے......... تجھے بھی.........''

اس سے آگے ان میں کچھ کہنے کی سکت نہ رہی اور وہ خاموش ہو گئیں۔

میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''ماں! تو کیا اپنے لختِ جگر کو اتنا کمزور سمجھتی ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے لئے تر نوالہ ثابت ہو سکتا ہے؟''

''نہیں میرے بچے!......... نہیں۔'' ماں نے ایک دم تڑپ کر کہا۔ ''میں جانتی ہوں، تُو نے میرا دودھ پیا ہے......... اور تیری رگوں میں ایک بہادر اور غیرت مند باپ کا خون دوڑ رہا ہے۔ سوچ کے بعد ایک تیرا ہی تو آسرا ہے مجھے کہ تُو اپنے باپ کے قاتلوں کو کبھی چین سے نہیں بیٹھنے دے گا۔ نادر! دشمنوں نے مجھے اب میرے بھائی گل (حیدر گل) کی موت کا زخم دے کر میرے سینے میں

انتقام کی آگ کو مزید سلگا دیا ہے۔''

''ہاں! ماموں حیدر گل کی موت کا زخم بے شک معمولی نہیں۔'' میں نے اپنی تلخی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں نے بھی ماموں کے قاتلوں کو کامیابی کا جشن زیادہ دیر نصیب نہیں ہونے دیا۔ سب کو جہنم واصل کر آیا ہوں۔ میرے لہجے کی پُرتپش گھن گرج نے جیسے ماں کے لئے تریاق کا کام کیا۔ اس کے نحیف و نزار چہرے پر جوشِ مسرت کی بے پایاں سرخی اُبھری اور پھر نہ جانے کس طرح ان کے زخمی ونحیف وجود میں طاقت کی لہر دوڑ گئی کہ انہوں نے بے تابانہ اپنے دونوں ہاتھوں سے میرا سر تھام کر ممتا بھرا بوسہ میری پیشانی پر ثبت کر دیا۔ مگر دائیں شانے کے زخم نے انہیں کراہنے پر بھی مجبور کر دیا۔

میں نے ماں کو تھام لیا اور ان کے دائیں شانے کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں بینڈیج بندھی ہوئی تھی۔

''ماں! تُو آرام کر......... ابھی زخم تازہ ہے۔'' میں نے فکرمندی سے کہا۔

ماں نے ہونٹ بھینچ کر اپنے مضروب شانے کی تکلیف پر قابو پایا اور پھر تکیے پر دوبارہ سر رکھ کر بولی۔

''زخم تو پرانا ہو جائے گا بیٹے! اور ٹھیک بھی۔ لیکن اندر......... دل کے اندر کے زخموں کا کیا کریں نادر؟ کیونکہ وہ دونوں خبیث شیطان اور تیرے باپ کے قاتل......... مجھے جھوٹے الزام میں عمر قید کی سزا دلانے والے وہ ازلی دشمن ابھی زندہ ہیں۔''

''ماں! تُو کیا سمجھتی ہے کہ میں ان دونوں کو بھول گیا ہوں؟'' میں نے جوش بھری تمتماہٹ کے ساتھ کہا۔ ''وقت آنے دو ماں! میں ان دونوں دشمنوں کو تیرے قدموں میں لا کر تیری آنکھوں کے سامنے واصلِ جہنم کروں گا ایک دن۔''

''شاباش میرے شیر!......... تُو نے واقعی آج میرے دودھ کا حق ادا کر دیا۔''

''لیکن ماں! میں سمجھتا ہوں، صرف موت ان دونوں کے لئے ناکافی ہو گی۔'' میں نے سنسناتے ہوئے، کاٹ دار لہجے میں کہا۔ ''میں انہیں پُرسکون موت کی نہیں بلکہ بھیانک زندگی کی سزا دوں گا۔ میں ان کی زندگی کو اس قدر سسکا دوں گا کہ انہیں صرف اور صرف اپنی موت میں پناہ نظر آئے گی۔ اور وہ مجھ سے اپنی زندگی کی نہیں بلکہ موت کی بھیک مانگیں گے۔'' میرے لفظوں سے نفرت وانتقام کے شعلے گویا لپکے پڑ رہے تھے جن کی تپش کی حدت ماں کو جاڑوں کی دھوپ جیسی راحت بخش رہی تھی۔ معاً دروازے پر آہٹ ہوئی۔ میں نے ذرا چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں اعظم خان کھڑے ہم دونوں کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

''کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں ماں بیٹے میں؟'' ہمیں اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

''آئیے انکل!......... تشریف لائیں۔'' میں نے انہیں سلام کیا۔

''یار کاکے! تم کہاں غائب ہو گئے تھے اچانک؟'' انہوں نے قریب آ کر مجھ سے پوچھا۔

انہیں اپنی کارگزاری کے بارے میں بتانا ضروری تھا۔ چنانچہ میں نے انہیں اپنی گزشتہ رات کی کارگزاری سے تفصیلاً آگاہ کر دیا۔ میری بات پر وہ کچھ چپ سے ہو گئے۔

''خان صاحب! کہیں پولیس پھر میرے نادر کو نہ گرفتار کر لے......... آپ کچھ کیجئے۔'' ماں نے فکرمند لہجے میں اعظم خان سے کہا تو وہ تشفی دیتے ہوئے بولے۔

''بہن! تم فکر نہ کرو۔ وہ مفرور بدمعاش تھا۔ میں ابھی متعلقہ تھانے کی پولیس سے رابطہ کر کے انہیں شالامار ہوٹل اور گلبرگ والے کالا ناگ کے بنگلے میں منشیات کے گوداموں کی تفصیل سے بھی آگاہ کر دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے اپنا سیل فون نکالا۔

میں نے کسی خدشے کے تحت ان سے کہا۔ ”انکل! کیا ڈائریکٹ پولیس سے رابطہ کرنا مناسب ہوگا“ میری بات پر وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ ”میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔ بے فکر رہو۔ میں پرسنل سیکرٹری کو اس معاملے میں باؤنڈ کر کے ضروری ہدایات دے رہا ہوں۔ وہ خود مناسب انداز اسے ڈیل کر لے گا۔“

یہ کہہ کر انہوں نے اپنے کسی بہرام نامی سیکرٹری سے سیل فون پر رابطہ کر کے ساری صورتِ حال بارے میں اسے بریف کیا اور چند ضروری ہدایات بھی دیں۔

ابھی وہ اس کام سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ ڈاکٹر صاحب اندر داخل ہوئے۔ ان کے ہمراہ نرس نے وائٹل سائن چیک کیا اور ان کی ریڈنگ بتائی۔ پھر میڈیکل فائل کا مطالعہ کرنے لگے۔ اس بعد انہوں نے اعظم خان سے مخاطب ہو کر کہا۔

”اب ان کی کنڈیشن خاصی حد تک بہتر ہو چکی ہے۔ میں انہیں ڈسچارج کر رہا ہوں۔ البتہ ان کی چوتھے روز بینڈیج ہوتی رہنی چاہئے۔ پندرہویں روز معالجے کے لئے او پی ڈی لا سکتے ہیں۔“

”تھینک یو ڈاکٹر صاحب! ہم آپ کے بہت شکر گزار ہیں۔“ اعظم خان نے ممنونیت بھرے لہجے کہا۔ ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر ماں میرے ساتھ مری واپس آ گئیں۔ اعظم خان بھی ہمارے ساتھ تھے

فضل چاچا کے بہیمانہ قتل کے بعد ان کی بیوی سکینہ بے چاری غم سے نڈھال تھی۔ مگر آفرین تھا عورت پر .... وہ چند روز اپنے گاؤں میں گزار کر ہمیشہ کے لئے ”گرین لاج“ آ گئی تھی۔ اب ماں کی دیکھ بھال پر مامور تھی۔

انکل اعظم خان واقعی ہمارے لئے ایک فرشتہ صفت انسان ثابت ہوئے تھے۔ ماں نے مجھے ان بارے میں تفصیلاً آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ درحقیقت ماموں حیدر گل کے دوست ہی نہیں، بلکہ مرحوم باپ قادر علی خان کے پرانے اور بچپن کے دوست تھے اور بلاشبہ انہوں نے دوستی کا حق ادا کیا بلکہ کر رہے تھے۔

اگرچہ بعض سیاسی حوالوں سے ان کی ذات سے متعلق کچھ مشکوک قسم کی سرگرمیوں کی دبے لفظوں بازگشت سنتا رہتا تھا لیکن میں نے اس حوالے سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں لی تھی اور نہ ہی میں اس کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔ بہرطور ٹال کو آگ لگنے کے بعد جن دو اشخاص نے اس سلسلے میں میرے کاروبار سنبھالا دیا تھا، وہ دو افراد تھے۔ انکل اعظم خان اور دوسرا شخص منیجر مشتاق سیال۔ بلکہ بہ قول انکل خان کے ٹال کی نئے سرے سے تعمیر میں منیجر مشتاق سیال کی شبانہ روز محنت اور توجہ کا دخل زیادہ تھا۔

یہ وہی شخص تھا جس کی احمقانہ گفتگو اور حرکتوں کے باعث میں اکثر جھلا جایا کرتا تھا۔ ایک دن ایسا نہیں گزرا تھا کہ جب وہ مری سے پنڈی ہسپتال میں ماں کی خیریت پوچھنے نہ آیا تھا۔ ٹال کے کے بعد سے میں کچھ ایسے دگرگوں حالات کا شکار رہا تھا کہ اس کی دوبارہ نئے سرے سے تعمیر کا خیال میرے دل و دماغ سے نکل گیا تھا۔ حتیٰ کہ مجھے یہ بھی یاد نہ رہتا تھا کہ کب وہ آ کر مجھ سے ٹال کی مر وتعمیر کے سلسلے میں چیک وغیرہ سائن کروا کر لے جایا کرتا تھا۔

اسی طرح جب اسے میرے اور ماں کے ہسپتال سے ”گرین لاج“ آنے کی خبر ہوئی تو وہ دو آیا اور ٹال کی تعمیر و مرمت کے سلسلے میں ایک ایک پائی کا حساب مجھے دکھایا۔ اس کی دیانت داری سے پاک تھی۔ بعد میں، میں نے بھی اس کے پُرزور اصرار پر ٹال کا معائنہ کیا تو اس کی وفاداری اور شناسی کا دل سے قائل ہو گیا۔

ایک دن جب میں ٹال کے دفتر میں اپنی ریوالونگ چیئر پر براجمان میز پر جھکا کچھ اعداد و شمار کرنے میں تھا تو اچانک مجھے دروازے پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے سیال کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر خوشی اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ جانے کب سے خاموشی کے کھڑا مجھے کام میں مگن دیکھے جا رہا تھا۔

”ارے آؤ چاچا جی! .... کھڑے کیوں ہو؟ بیٹھو!“ میں نے مسکرا کر کہا۔ پھر قدرے چونک کر ”تم رو کیوں رہے ہو؟“ میں نے اب اسے ”منیجر“ کی بجائے ’چاچا جی‘ کہنا شروع کر دیا تھا۔

وہ رجسٹر سینے سے لگائے آگے بڑھا اور میرے سامنے کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے لرزیدہ آواز میں بولا۔ ”چھوٹے صاحب! آپ کو آج دوبارہ اس کرسی پر بیٹھا دیکھ کر مجھے خوشی بھی ہو رہی ہے اور دکھ بھی......... بڑے صاحب (ماموں حیدر گل) بھی یہاں بیٹھا کرتے تھے۔ اللہ انہیں جنت نصیب کرے، بہت آدمی تھے۔ بڑے لوگ تھے جی۔“ وہ اپنا مخصوص تکیہ کلام نہیں بھولا تھا۔ مگر پھر جیسے اسے فوراً یاد آ گیا مجھے اس کے تکیہ کلام سے سخت چڑ تھی۔ لہٰذا فوراً ہی قدرے شرمندہ ہو کر بولا۔ ”معافی چاہتا ہوں چھوٹے صاحب! ....آپ بھی .... بڑے لوگ ہیں۔“

مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی اور میں ملائمت سے بولا۔ ”چاچا جی! ماموں حیدر گل کے بعد واقعی ٹال سونا لگ رہا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ کی وجہ سے میرے دل کو کافی سہارا ہوا ہے۔ ورنہ تو میں اسے بھول ہی گیا تھا۔ آپ نے دن رات اپنی جان مار کر اسے دوبارہ تعمیر کروایا۔ بلکہ مجھے تو ہوش بھی نہ تھا اس پر توجہ دیتا۔“

”چھوٹے صاحب جی! برا تو مجھے بھی لگتا تھا۔ آپ پریشان تھے اور میں بار بار آ کر آپ سے چیکوں پر دستخط کروا کر اپنی راہ لیتا تھا۔ مگر کیا کرتا صاحب! مزدوروں کی بیکاری اور ان کے گھروں میں بھوک و افلاس مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ اللہ بخشے بڑے صاحب کو، ان کے اخلاق و حسن سلوک کی مزدوروں کے دلوں میں بوئی ہوئی عجیب ہی فصل تھی کہ انہوں نے بھی جیسے کہیں دوسری جگہ کام نہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ حالانکہ اکثر بڑے صاحب (ماموں حیدر گل) اور مزدوروں کے درمیان گرما گرمی بھی ہوتی رہتی تھی لیکن باوجود اس کے سارے مزدوروں کو بڑے صاحب سے عقیدت تھی۔ وہ ہر وقت مجھے گھیرے رہتے۔“ وہ اپنی رو میں بہے جا رہا تھا۔

”ہاں! .... تم نے واقعی مجھ پر ہی نہیں، ان مزدوروں پر بھی احسانِ عظیم کیا ہے۔“ میرے لہجے میں احسانمندی بھرا اعتراف تھا۔ وہ بولا۔

”نہیں چھوٹے صاحب! یہ تو میرا فرض تھا۔ رقم تو آپ ہی کی تھی، میں نے کیا، کیا بھلا؟“

”تمہاری محنت تھی چاچا جی! اور تمہاری ماموں سے عقیدت تھی۔ تمہارے دل میں مزدوروں کے لئے ہمدردی تھی .... اور سب سے بڑی بات اس ٹال کی نئے سرے سے تعمیر میں تمہاری دیانت دارانہ کوششیں تھیں۔“

”دراصل چھوٹے صاحب! آپ کو تو معلوم ہی ہے، کاروبار میں مقابلے کی دوڑ پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ ہماری ایک ساکھ بنی ہوئی ہے۔ اگر دیر ہو جاتی تو پارٹیاں ہمیں آرڈرز ہی نہ دیتیں اور ہمیں بھول جاتیں۔ پھر نئے لوگ آتے رہتے ہیں۔ دوبارہ ساکھ بنانا ناممکن حد تک مشکل ہو جاتا۔“

میں بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ پھر جیسے وہ ماحول کے بوجھل پن کو دور کرنے کی خاطر بولا۔ ”چھوٹے صاحب! اب آپ کی وجہ سے اس ٹال کی رونقیں دوبارہ لوٹ آئی ہیں۔ اب انہیں

بحال ہی رہنا چاہئے۔“

”انشاء اللہ.........!“ میں نے زیر لب کہا۔

❋❋❋

حالات کسی حد تک معمول پر آئے۔ دل کو دل سے یارا ہوا تو کوئی پیارا یاد آنے لگا۔ لیکن ”پیارے“ کی یاد نے ہی دلِ بے قرار کو مسوس کے رکھ دیا۔

نگینہ میری پہلی اور آخری چاہت .... میری محبت، میرے دل کا اول و آخری جذبہ۔ نگینہ کی یاد نے میری روح تک کو بھی تڑپا کر رکھ دیا۔ دلِ بے چین کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے فون کیا۔

میں اس وقت اپنے آفس میں موجود تھا۔ باہر گلابی جاڑوں کی خوشگوار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ نگینہ کے گھر کے نمبر پنچ کرنے کے بعد میں دوسری طرف سے کسی کے ریسیور اٹھانے کا منتظر رہا۔ دوسری طرف سے اُبھرنے والی ہر بیل پر میرا دل بے اختیار دھڑک اُٹھتا تھا۔ معاً کسی نے ریسیور اٹھایا۔ میرا دل جیسے رُک گیا۔

”ہیلو.........!“ وہی آواز جو کانوں میں رس گھولتی تھی، دل و دماغ میں الوہی محبت کے ساز بجاتی تھی۔ یہ نگینہ کی مدھر آواز تھی۔

میں نے بہ مشکل ایک گہری ہمکاری خارج کر کے دل کی دھڑکنوں کو بحال کیا اور پھر جیسے میرے لبوں سے آواز اُبھری۔

”نگینہ.........!“

”آپ کون.........؟“ نگینہ کی قدرے چونکتی ہوئی آواز اُبھری اور گویا میرا دل کٹنے لگا۔ یہ کیسی اجنبیت تھی؟ کہاں تو میری ایک آواز پر نگینہ کی آواز میں محبت بھری حلاوت کے گلاب کھل اٹھتے تھے کہ آج تو جیسے اس کی آوازِ بے اعتنا میں لق و دق صحرا آباد تھا۔

”نگینہ! .... تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم .... تم مجھے نہیں پہچان رہی ہو؟ اپنے نادر کو؟“ میں نے زخمی دل کے ساتھ بجھے لہجے میں کہا تو وہ بیزاری سے بولی۔

”اوہو، بھئی آپ آخر کون پاگل ہیں؟ .... بلاوجہ ہی گلے پڑ رہے ہیں۔“

”ہاں .... میں پاگل ہی تو ہوں۔“ میں نے ٹوٹے دل سے کہا۔ ”پلیز نگینہ! مجھے پہچانو۔ آخر تمہارے ساتھ ایسا کیا ہو گیا ہے کہ تم مجھے ....“ میری آواز ادھوری رہ گئی۔ کیونکہ دوسری طرف نگینہ نے شاید ریسیور رکھ دیا تھا۔ رابطہ منقطع ہوتے ہی میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے ریسیور رکھا اور اپنا سر پکڑ لیا۔ میں نے چند گہری گہری سانسیں لے کر خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کرتے ہوئے باریک بینی سے سوچا۔

نگینہ کو آخر کیا ہو گیا تھا؟ .... یہ کیا اسرار تھا؟ .... آخر یہ سب کیا تھا؟ .... اتنا تو مجھے معلوم تھا کہ یہ سب جو کچھ بھی تھا نگینہ کے مکش پور جانے کے بعد ہوا تھا۔ میں نے اسے وہاں سے واپسی پر کبیر کی جیپ میں نیم بے ہوشی کی حالت میں دیکھا تھا۔ آخر ان دونوں خبیث شیطانوں نے اس کے ساتھ ایسا کیا، کیا تھا؟ .... یہ سب کچھ اب مجھے کبیر ہی بتا سکتا تھا اور صرف ایک ہی طرح بتا سکتا تھا۔ یہ سوچتے ہی میں اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں غیظ و غضب کے عالم میں بھینچنے لگا جیسے کبیر کی گردن دبوچ رہا ہوں۔ میں نے فوری طور پر راولپنڈی کا قصد کیا۔

مکش پور والی مہم کے دوران چونکہ جیپ کا انجر پنجر ایک ہو چکا تھا اس لئے میں نے اسے ایک

ورکشاپ میں مرمت کے لئے دے رکھا تھا جہاں سے وہ ٹھیک ٹھاک مرمت کر کے بالکل درست حالت میں مجھے واپس مل چکی تھی۔

سوا پانچ بجے کے قریب میں اپنی جیپ پر پنڈی کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ پنڈی پہنچنے تک سرد رات کی تاریکی چہار اطراف پھیل چکی تھی۔ میرے دائیں طرف راول ڈیم کی بتیاں نظر آ رہی تھیں۔ آرمی میوزیم کے سامنے سے گزرتا ہوا میں ایوب پارک پہنچا اور یہاں ذرا قریب ہی ایک فاسٹ فوڈ سینٹر کے سامنے جیپ روک دی۔ ایک لڑکا میری طرف لپکا۔ میں نے اسے ایک چکن برگر اور کافی کا آرڈر دیا اور جیپ سے پشت لگائے گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

وہ پوش علاقہ جہاں ازلی دشمن نظر حیات کے بیٹے کبیر کی کوٹھی تھی، اس مقام سے زیادہ دور نہ تھا۔ ”پنج بھاٹا چوک“ سے دائیں جانب پوش علاقے کی حدود شروع ہو چکی تھیں۔ کچھ سوچ کر میں نے کھڑکی سے باہر اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو بوفے ریسٹورنٹ کے قریب ایک پبلک فون بوتھ نظر آ گیا۔ میں ابھی دروازہ کھول کر اترنے ہی والا تھا تو وہ نوعمر لڑکا ایک ٹرے میں برگر اور پلاسٹک کے کپ میں کافی اٹھائے میری جیپ کے پاس آن پہنچا۔ میں نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر اسے تھما کر باقی پیسے لینے کا کہا، پھر بولا۔ ”مجھے ایک پے انگ کارڈ لا دو گے؟“

اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا تو میں نے سو روپے کا ایک اور نوٹ اسے تھمایا اور ٹرے اس کے ہاتھ سے لے کر جیپ کے بونٹ پر رکھ دی۔ ذرا دیر بعد وہ لڑکا کالنگ کارڈ لئے آ گیا۔ میں نے دس کا ایک اور نوٹ ”اجرتِ خاص“ کے طور پر اسے تھمایا۔ پھر جلدی جلدی برگر چبانے کے بعد کافی ختم کرنے کا اٹم پری کرنے کے بعد میں ٹیلی فون بوتھ کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ اگرچہ میرے پاس اپنا موبائل فون بھی تھا لیکن میں اسے استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔

بوتھ میں آ کر میں نے نظر حیات کے نمبر پنچ کئے۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ تیسری بیل پر کسی نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا۔ یہ آواز میرے لئے اجنبی تھی۔

”کبیر سے بات کرنی ہے .... میں اس کا دوست بول رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ وہ شاید کوئی گھریلو ملازم تھا، بولا۔

”جی .... چھوٹے صاحب تو اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔ کوئی پیغام ہے تو دے دیں۔ آئیں گے تو انہیں بتا دوں گا۔“

”کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ اس وقت کہاں ہو گا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں جی .... مجھے معلوم نہیں۔“ وہ بولا تو میں نے کسی خیال کے تحت فوراً کہا

”اچھا......... ان کے ڈیڈی گھر پر ہیں؟“

”نہیں جی .... وہ تو اسلام آباد گئے ہوئے ہیں؟“

”کب تک واپس آئیں گے؟“

”کون جی؟ .... بڑے صاحب یا چھوٹے صاحب؟“

”بڑے صاحب کے بارے میں بتاؤ پہلے۔“

”وہ تو جی کل ہی آئیں گے۔ صبح سویرے۔“

”اور چھوٹے صاحب؟“

”وہ تو اپنے کسی دوست کی شادی پر گئے ہیں۔ دیر بھی ہو سکتی ہے۔“

"اچھا ٹھیک ہے .... شکریہ!" یہ کہہ کر میں نے جلدی سے رابطہ منقطع کر کے ریسیور ہک پر لٹکایا اور باہر نکل گیا۔ کبیر پر ہاتھ ڈالنے کا یہ بہت سنہری موقع تھا۔ میں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا سوچا اور اپنی جیپ میں سوار ہو گیا۔ پھر اسے اسٹارٹ کر کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ ٹیچ بھاٹا چوک سے میں دائیں جانب مڑا اور تیزی سے آگے بڑھا۔ چند بلاک چھوڑ کر میں نے جیپ نظر حیات کے وسیع و عریض کوٹھی نما بنگلے کے آہنی گیٹ کے سامنے روک دی جس کے محرابی ستونوں پر دودھیا گلوب کی روشنی کے علاوہ وہاں مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ آس پاس ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ اطراف کے بنگلوں کے چند مکینوں کو میں نے واک کرتے دیکھا۔ میں جیپ سے نیچے اتر آیا اور آگے بڑھ کر کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔ ذرا دیر بعد ایک چمرخ سے شخص نے ذیلی گیٹ کھول کر جھانکا۔ میں نے اس سے پہلے قرب و جوار میں کسی ذی نفس کی غیر موجودگی کا اطمینان کرتے ہی اپنی جیب سے بھاری دستے والا میگارد نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ لہٰذا جیسے ہی اس نے اپنا سر باہر نکال کر مجھے پہچاننے یا دیکھنے کی کوشش کی، میں نے اس کی "صحت" دیکھتے ہوئے ذرا "ہولا" ہاتھ رکھ کر آہنی دستے سے اس کی کنپٹی پر وار کیا اور اس کے حلق سے "اوغ" کی مخصوص آواز نکلی اور وہ اندر پختہ روش پر گرا۔

اس کے اٹھا غفیل ہوتے ہی میں اندر داخل ہو گیا۔ ذیلی دروازہ بند کر دیا۔ ملازم بے سدھ پڑا تھا۔ میں نے عقابی نظروں سے قرب و جوار میں دیکھا۔ پختہ روش کے دو اطراف لان تھا جہاں ذرا ذرا فاصلوں پر الیکٹرک پائپوں کے بنے پول نصب تھے جن پر نصب کچھ گلوب روشن تھے۔ پورٹیکو ویران تھا۔ ملازم کے سوا شاید اور کوئی اندر موجود نہ تھا اور فون ریسیو بھی اس نے ہی کیا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے بے سدھ ملازم کو کاندھے پر ڈالا اور مرکزی دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ ظاہر ہے اندر سے کھلا ہوا تھا۔ میں اسے آہستگی سے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ سامنے شاہانہ طرز کی نشست گاہ تھی۔ بنگلہ ویران تھا۔ میں نے سب سے پہلے بے ہوش ملازم کو ایک صوفے پر ڈالا اور جتنی جلدی مختلف کمروں میں جھانک کر "کسی دوسرے" کی موجودگی کی تسلی کر سکتا تھا، وہ میں نے فوراً کر ڈالی۔ اس کے بعد نائلون کی ایک مضبوط ڈوری نما رسی تلاش کر کے میں نے بے ہوش ملازم کے ہاتھ پاؤں باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس کر اسے ایک تاریک کمرے کے اٹیچ باتھ روم میں لے جا کر بند کر دیا۔ میں ذرا ستانے کے لئے صوفے پر بیٹھا۔ پھر اٹھ کر گیٹ کے قریب آیا۔ گیٹ کے اندرونی ستونوں پر نصب ایک الیکٹرک ریموٹ کنٹرول سسٹم دیکھ کر جان گیا کہ بنگلے کا کوئی بھی مکین (جن کے پاس ریموٹ کنٹرول موجود ہو، باہر سے ہی کار میں بیٹھے بیٹھے گیٹ کھول کر با آسانی اندر داخل ہو سکتا تھا۔ لیکن مجھے بہرحال خود ہاتھوں سے گیٹ کھولنا پڑا۔ پھر اپنی جیپ میں سوار ہو کر میں جیپ اندر لے آیا۔

اندر لا کر میں نے جیپ اس طرح دیوار کی آڑ میں کھڑی کی کہ باہر سے آنے والے کی اس پر فوراً نگاہ نہ پڑ سکے۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں بڑے آرام سے اتر کر دوبارہ اندر نشست گاہ میں آ کر بیٹھ گیا۔

اب میں اپنے "شکار" (کبیر) کا منتظر تھا۔ میرے لئے میدان صاف تھا۔ بہ قول ملازم کے نظر حیات تو اسلام آباد دفعان ہو چکا تھا اور اس کی آمد صبح سے پہلے ممکن نہ تھی۔ جبکہ کبیر اپنے کسی دوست کی شادی اٹینڈ کرنے گیا ہوا تھا۔ نائٹ فنکشن تھا، اس لئے اس کی واپسی دیر سے ہو سکتی تھی۔ میں نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ دس بجنے والے تھے۔ تاہم مجھے اندازہ تھا کہ اس کی واپسی میں ابھی بہت وقت باقی تھا۔ ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ وہ نہ آیا تب مشکل ہو سکتی تھی۔ یہ سنہری موقع

ہاتھ سے نکل جاتا۔ وقت کا بھی زیاں ہوتا۔ ماں الگ میرے لئے پریشان ہو رہی ہوتی۔ ویسے تو میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ میں اپنے کسی دوست کی دعوت پر ہوں اور دیر ہو سکتی ہے، فون کر دوں گا۔ لہٰذا گیارہ بج گئے تو ماں سے سیل پر رابطہ کرنے ہی والا تھا کہ اچانک سیل فون کی بیل گنگنائی۔ ماں نے کیا تھا۔

میں نے سیل کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو ماں! تُو پریشان ہو گی۔"

"ہاں میرے لعل تُو کہاں ہے؟ .... ابھی تک آیا کیوں نہیں؟" ماں کے لہجے سے گہری فکرمندی جھلک رہی تھی۔

"ہاں! میں جہاں بھی ہوں، بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے کہا۔ "تُو میری فکر نہ کر۔ میں اپنے دوست کے پاس ہوں۔ شاید کل ہی آؤں۔"

"ماں سے جھوٹ بولتا ہے .... مجھے تیرے لہجے سے مسرت کی بُو آ رہی ہے جیسے تُو اس وقت دشمنوں کے سینے پر بیٹھا مونگ دل رہا ہو۔" ماں نے عجیب پُرجوش لہجے میں کہا تو مجھے ماں کی زود فہمی پر حیرت ہوئی۔ تاہم میں نے بھی مسکرا کر معنی خیز لہجے میں کہا۔

"ہاں ماں! .... بس ایسا ہی کچھ ہے۔ میں دشمنوں کی نیندیں حرام کرنے میں مگن ہوں۔"

"نادر! میرے لعل! .... اپنا خیال بھی رکھنا۔" ماں نے ممتا بھری حلاوت سے کہا۔

"تُو بے فکر رہ ماں! میں نے ایک بہادر ماں کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ میری تو جائے پیدائش بھی عجائب جگہ رہی ہے، مجھے کچھ نہیں ہو گا۔ اچھا پھر ...."

"ٹھیک ہے میرے بچے! اللہ تیرا حامی و ناصر ہو۔" ماں نے کہا اور میں نے سیل فون آف کر کے جیب میں رکھ لیا۔

جب رات کے بارہ بج گئے تو میری بے چینی میں اضافہ ہونے لگا۔ میں اب مایوس سا ہو گیا تھا۔ کیونکہ میں ابھی جانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے بڑی مشکلوں سے کبیر کے خلاف بڑی کامیابی کے ساتھ جال بچھایا تھا جو رائیگاں جاتا نظر آ رہا تھا۔ جب بارہ بج کر بیس منٹ ہوئے تو اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں بری طرح بدک گیا۔ ٹیلی فون سیٹ میرے دائیں جانب ایک فینسی اسٹینڈ پر دھرا ہوا تھا۔ دوسری بار گنگنائی۔ دم بہ خود سناٹے اور اعصاب شکن خاموشی میں ٹیلی فون کی ہر بار بجنے والی بیل دھماکے کی طرح میرے دل و دماغ میں گونج رہی تھی۔

میں کشمکش و پیچ میں تھا۔ بالآخر میں نے ذرا کھسک کر صوفے پر بیٹھے بیٹھے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی دوسری طرف سے کبیر کی آواز ابھری۔

"شمو! ڈیڈی تو نہیں آئے اب تک؟" میں فوراً سمجھ گیا، وہ ملازم شمو تھا جسے میں نے بے ہوش کرنے کے بعد رسن بستہ حالت میں دوسرے کمرے کے اٹیچ باتھ میں بند کر دیا تھا۔ بہرطور میں نے ...عزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی آواز بدل کر مختصراً کہنے کی کوشش کی۔

"نہیں جی چھوٹے صاحب! وہ تو صبح ہی آئیں گے۔" یہ کہتے ہوئے میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

"تمہاری آواز کو کیا ہو گیا ہے؟" اس نے قدرے چونک کر پوچھا۔ میں نے اپنے وجود کے پُرجوش جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"جی جی! ٹھنڈا گرم پی لیا تھا اس لئے .... آواز ذرا بیٹھ گئی ہے۔"

"اپنی ندیدوں والی عادت نہیں چھوڑو گے۔" وہ بولا۔ "اچھا سنو! تم گیٹ کو آٹو میٹک لاک کر کے

چلے جاؤ۔ مجھے آنے میں ذرا دیر ہو جائے گی۔‘‘

جواباً میں نے جی اچھا کہا تو دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ اس کے فون سے یہی اندازہ ہوتا تھا اس نے دیر سویر ضرور آنا تھا۔ لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس نے شمسو کو چلے جانے کا کیوں کہا تھا؟

میں زیادہ دیر نہیں سوچ سکا اور خود کو پُرسکون کرنے کے لئے میں نے ایک گہری سانس لے کر اپنا سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا اور آنکھیں موند لیں۔

ٹھیک ایک بجے باہر مجھے کسی گاڑی کے انجن کی گھر گھراہٹ سنائی دی۔ میں بری طرح چونکا اور تیزی سے صوفے سے اُترا۔ دروازے کی طرف دوڑا اور باہر نکلنے کی بجائے اس کی متوازی جھری سے اپنی ایک آنکھ چپکا دی۔

میں نے دیکھا، آہنی گیٹ کے دونوں پٹ دھیرے دھیرے خودکار انداز میں وا ہو رہے تھے۔ اور پھر ایک کار میں نے اندر داخل ہوتے دیکھی۔ میرا دل جیسے سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ کار کی اگلی نشست پر مجھے کبیر بیٹھا نظر آیا۔ مگر اس کے ہمراہ ایک خوبرو عورت بھی براجمان تھی۔ ظاہر ہے میرے لئے اجنبی ہی رہی ہوگی۔ میں کبیر کے تنہا آنے کی توقع کئے بیٹھا تھا مگر ایک عورت کو دیکھ کر میں اُلجھ سا گیا۔ میں نے دونوں کو کار سے اترتے دیکھا۔ میں نے عورت کو بہ غور دیکھا۔ وہ مجھے ''آنٹی'' ٹائپ کی عورت نظر آ رہی تھی۔ عمر اس کی پینتیس چالیس کے قریب ہی نظر آتی تھی۔ اس نے بڑی زرق برق سیاہ رنگ کی کامدار ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بغیر آستینوں کا بلاؤز بھی اسی رنگ کا تھا جو اس کے گورے اور بھرے بھرے جسم پر بہت جچ رہا تھا۔ اس نے بیش قیمت جیولری پہن رکھی تھی۔ گھنے بالوں کا جوڑا بنا کر سیاہ مہین جالی میں قرینے سے لپیٹ رکھا تھا۔ پیروں میں اونچی پنسل ہیل والے سینڈل تھے۔ چہرے کے نقش موٹے مگر جاذب نظر تھے۔ اس نے واقعی اپنی سج دھج میں ''ایڑی چوٹی'' کا زور لگا رکھا تھا۔ خاصی فیشن ایبل اور الٹرا ماڈرن نظر آ رہی تھی۔ اس عورت کو دیکھ کر میں سب سے پہلے یہی سمجھا تھا کہ وہ اس کی کوئی دور پرے کی رشتے میں آنٹی لگتی ہوگی۔ لیکن اس وقت میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا، جب کار سے اُترتے ہی وہ نئے نویلے جوش بھرے نوجوان کی طرح ایک دوسرے سے لپٹ کر بوس و کنار میں مصروف ہو گئے۔ وہ کبیر سے پندرہ بیس سال بڑی ہی تھی۔ بلکہ دونوں ماں بیٹا ہی نظر آتے تھے۔

میں نے ان پر لعنت بھیجی۔ وہ آپس میں ذرا دیر کی ''بے قرار'' اٹکھیلیوں کے بعد ایک دوسرے کے ساتھ چپکے ہوئے مرکزی دروازے کی طرف بڑھے تو مجھ پر ایک اور انکشاف ہوا۔ دونوں پیئے ہوئے تھے اور نشے میں بری طرح دھت تھے۔

میں یک دم دروازے سے ہٹ گیا۔ میں چھپنے کے لئے پہلے ہی ایک جگہ منتخب کر چکا تھا۔ چنانچہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ مذکورہ گوشے کی طرف لپکا۔ یہ خفیہ گوشہ لمبے چوڑے ریفریجریٹر اور 41 انچ کے پروجیکشن ٹی وی کے عقب میں تھا۔ یہاں فلاور وال بھی تھی اور مصنوعی پھولوں کے تختے بھی تھے۔ ایک غضب بھرے چنگھاڑتے ہوئے تیندوے کا مجسمہ بھی تھا۔

اب میں وہاں دم سادھے بیٹھ گیا۔ میری ٹھٹکی ہوئی نظریں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ پھر دروازہ کھلا اور دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، بدمست قہقہے لگاتے اندر داخل ہوئے۔ ان دونوں کو باہم پیوست دیکھ کر اچانک میرے ذہن میں ایک خیال اُبھرا۔

اور پھر میں نے نہایت آہستگی کے ساتھ اپنا سیل فون نکال لیا۔ اس میں مووی کیمرا بھی تھا۔ کسی اچانک خیال کے تحت میں نے ان کی مووی بنانا شروع کر دی۔

''میڈم!......... آج تو دل کھول کر پیار کروں گا میں تمہیں۔ بالکل فری اسٹائل!'' کبیر کی لڑکھڑاتی آواز اُبھری۔

''اچھا......... اتنا پیار کرتے ہو مجھ سے؟'' میڈم نما اس عورت نے اٹھلا کر کہا۔

''ہاں میڈم!......... بہت زیادہ......... گھر میں ہمارے سوا کوئی نہیں۔'' کبیر کی ہانپتی ہوئی پُرہوس آواز اُبھری۔ اس نے عورت کو خود سے ذرا پرے دھکیلا مگر اس کی ساڑھی کا پلو پکڑ لیا۔ عورت بھی ترنگ میں تھی۔ وہ کمرے کے وسط میں بچھے قالین پر گول گھومتی چلی گئی اور ساڑھی اس کے بھرے بدن سے کھلتی چلی گئی۔ کبیر اس کے نیم عریاں، بھرے بھرے گداز جسم کو بڑی ہوس ناک نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔ پھر وہ اسے جھپٹنے کے لئے بڑھا۔ مگر وہ عورت کھنکتی ہنسی کے ساتھ اس کی پہنچ سے دور ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرس تھا۔ وہ ہنستی ہوئی بھاگ کر ایک کمرے میں داخل ہو گئی اور دروازہ بند کر دیا۔

''پلیز میڈم! مجھے اتنا مت تڑپاؤ۔ نکلو باہر۔''

کبیر نے دروازہ پیٹتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تو اندر سے عورت کی کھنکتی ہوئی آواز اُبھری۔

''ذرا ٹھہر جاؤ......... میں پوری تیاری کے ساتھ باہر آتی ہوں۔''

میں صرف خاص خاص ''پوز'' کے مناظر قید کرنا چاہتا تھا لہٰذا اس عورت کے باہر نکلنے کا منتظر تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ عورت نکلی تو اسے دیکھ کر میرے دل میں بڑی ہلچل ہونے لگی۔ میں نے ایک بار پھر مووی ریکارڈنگ آن کر دی۔

کبیر نے اسے دبوچ لیا۔ میں دل کڑا کر کے ان کی یہ شرم ناک مووی ریکارڈ کرتا رہا۔ پھر ذرا دیر بعد وہ دونوں ہانپتے ہوئے صوفے پر جا بیٹھے تھے۔ کبیر نے ان کے بالوں کی آوارہ لٹ سے کھیلتے ہوئے کہا۔ ''کہو تو چھوڑ آؤں تمہیں؟'' وہ اب شکم سیر جانور کی طرح نظر آ رہا تھا۔

''کیوں......... اتنی جلدی بیزار ہو گئے؟'' عورت نے تھکے تھکے لہجے میں شکوہ کیا۔

''نہیں تو......... مجھے تمہارے شوہر کی فکر ہو رہی تھی۔'' کبیر نے جیسے بات بنائی۔

''وہ بوڑھا تو اب تک نیند کی گولیاں کھا کر سو چکا ہوگا۔'' عورت نے بیزاری سے کہا۔

''تو کیا صبح جانے کا ارادہ ہے؟''

''ہاں......... پو پھٹے چلی جاؤں گی۔''

''ارے نہیں بابا! صبح تو ڈیڈی آن دھمکیں گے......... اور ملازم بھی آ جائیں گے۔ چلو، میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔''

''ہاں......... ذرا تھکن اتار لوں۔'' عورت نے کہا پھر ذرا ستانے کے بعد وہ اپنی ساڑھی پہننے لگی۔

''اس لڑکی کا کیا بنا جس سے تم شادی کرنا چاہتے تھے؟......... کیا نام بتایا تھا......... ہاں، یاد آیا، نگینہ۔'' وہ عورت ساڑھی پہننے کے دوران کبیر سے بولی۔ نگینہ کے ذکر پر میرے کان یکدم کھڑے ہو گئے۔ کبیر جواباً مسکرا کر بولا۔

''ہاں......... ہماری عنقریب منگنی ہونے والی ہے اور جلد شادی بھی متوقع ہے۔''

کبیر کی بات پر میرے اندر زلزلے سے اُبھرنے لگے۔

''مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ وہ مان کے ہی نہیں دے رہی تھی۔'' اس نے آخر میں ساڑھی کا پلو درست

کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں .... پہلے تو یہ بیل منڈھے نہیں چڑھ رہی تھی۔'' وہ بتانے لگا اور میں سائیں سائیں کرتی سماعتوں کے ساتھ ہمہ تن گوش رہا۔

''مگر پھر میں نے .... ایک ایسا چکر چلایا کہ .... وہ بے چاری اپنے عاشق نامراد کو ہی دل سے نکال بیٹھی۔''

''اچھا .... ایسا کیا چکر چلایا تم نے؟'' عورت ساڑھی پہننے کے بعد اس کے قریب صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

کبیر بھی ہنوز نشے کی حالت میں تھا، بتانے لگا۔ ''میں اسے اپنے ایک دوست کے ساتھ مکش پور لے گیا تھا۔ وہاں ایک عاروب نامی عامل رہتا تھا جو درحقیقت وادی کیلاش سے تعلق رکھتا ہے .... وہ خود کو کیلاشیوں کا روحانی پیشوا بتاتا ہے۔ مکش پور میں وہ ایک طویل ریاضت کے سلسلے میں رہتا تھا۔ نگینہ کا اس نے میرے ایما پر ایک خاص عمل کے ذریعے برین واش کر ڈالا۔ یوں وہ اپنے محبوب نادر علی کو بالکل فراموش کر بیٹھی۔''

''مگر .... اس طرح تو نگینہ پھر کسی کو بھی نہیں پہچان پا رہی ہوگی؟ مثلاً اپنے مما، پپا وغیرہ کو؟'' عورت نے پوچھا۔

''نہیں .... عاروب نامی اس کیلاشی روحانی پیشوا نے اپنے ایک عمل کے ذریعے اس کا Partially برین واش کیا تھا۔ یعنی اس کے دل و دماغ سے صرف اس کے محبوب کی یاد محو کر دی تھی۔ جبکہ وہ اپنے پپا اور دیگر لوگوں کو اچھی طرح پہچانتی ہے۔''

''اوہ ....'' اس نے مصنوعی تاسف کے اظہار میں سر ہلایا اور بولی۔ ''یہ تو تم نے اس کے عاشق اور اپنے رقیب کے ساتھ بہت ستھرا کام کیا ہے .... بلکہ اگر یہ کہوں کہ دونوں کے ساتھ ہی کیا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ ویسے یہ کیا کوئی جادو ہے؟''

''ارے نہیں ....'' کبیر نے لڑکھڑاتی آواز میں جواب دیا۔ ''یہ جادو نہیں بلکہ سائنس ہے۔ تحلیل نفسی یا پھر Suggestion کا کھیل بلکہ کارستانی ہے۔'' آخر میں اس کا لہجہ قدرے فخریہ ہو گیا تھا۔

وہ عورت کچھ نہیں بولی۔ محض اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔ چند لمحے خاموش رہی۔ پھر یکایک کبیر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا رخ ایک کمرے کی طرف تھا۔

''کہاں چلے؟'' اس کی ساتھی نے بھویں اچکا کر اسے دیکھا۔

جواب میں کبیر نے سیدھے ہاتھ کی چھوٹی انگلی فضا میں بلند کر کے فحش اشارہ کیا اور دروازے کے اندر غائب ہو گیا۔ چند منٹ کے بعد وہ لوٹا تو اس کا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔ وہ شاید پانی کے چھینٹے چہرے پر مار کر آیا تھا۔

''چلو .... اب میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔'' اس نے عورت کو مخاطب کیا تو وہ بھی فوراً صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا نشہ ابھی باقی تھا۔ اس لئے اس کے قدموں میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی۔ جبکہ کبیر مستحکم قدموں کے ساتھ چل رہا تھا۔ میں ان دونوں کو جاتا دیکھتا رہا۔ میرا مقصد بغیر ہنگامہ آرائی کے پورا ہو گیا تھا۔ نگینہ کی کیفیت کی وجہ مجھے معلوم ہو گئی تھی۔ نگینہ کے ساتھ ہونے والے عمل کے بارے میں سوچتے ہوئے میرے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔ آنکھوں کے آگے جیسے شرارے پھوٹنے لگے تھے۔ وہ دونوں باہر نکل چکے تھے۔ میں نے اپنے منتشر حواس پر بہ مشکل قابو پایا۔ اگرچہ میرا جی تو چاہ رہا

تھا اسی وقت بشیر چیرا اور کالا ناگ کی طرح کبیر کو بھی سفر آخرت پر روانہ کر دوں۔ لیکن کچھ سوچ کر میں نے اس ارادے کو عملی جامہ نہیں پہنایا۔

وہ دونوں باہر نکلے تو میرے ذہن میں ان کے تعاقب کا خیال آیا۔ میں نے اس پر عمل درآمد کا ارادہ کر لیا۔ لہٰذا جونہی بیرونی دروازہ ان کے عقب میں بند ہوا، میں تیزی سے ان کے پیچھے لپکا۔ دروازے کی جھری سے میں نے دونوں کو کار میں بیٹھے دیکھا اور پھر فوراً ہی وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ان کی کار جیسے ہی گیٹ سے باہر نکلی اور پھر گیٹ سرکتا ہوا دوبارہ بند ہونے لگا، میں ایک زقند لگاتا ہوا باہر نکل آیا۔ میرا رخ اپنی جیپ کی طرف تھا۔ چند لمحوں بعد میں اسے اسٹارٹ کر کے مرکزی گیٹ تک لے آیا تھا۔ میں نے اتر کر گیٹ کھولا اور جیپ سے باہر نکل کر دوبارہ اندر آیا۔ دروازے کے سسٹم کو آٹو پر کر کے میں باہر آیا اور جیپ میں سوار ہو کر بہت دور کار کی سرخ بتی کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔ لہٰذا مجھے بھی تیز رفتاری کا مظاہرہ کرنا پڑا۔ سڑک سنسان تھی اس لئے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ دس منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد اس کی منزل آ گئی۔ میں نے وہ مقام اور علاقہ ذہن نشین کر لیا۔ وہ وہاں اس عورت کو چھوڑنے آیا تھا جس کے بعد وہ واپس ہو گیا۔ اب اس کے تعاقب میں جانا فضول تھا۔ لہٰذا میں مری کی طرف روانہ ہو گیا۔



سپیدۂ سحر نمودار ہونے سے پہلے ہی میں گرین لاج پہنچ چکا تھا۔ میں تھکن اتارنے کی غرض سے اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ چند لمحوں میں ہی میں گہری نیند میں ڈوب چکا تھا۔ صبح میں دیر سے سو کر اٹھا۔ ناشتہ کر کے میں نے ماں کی خیریت معلوم کی۔ وہ مجھ سے گزشتہ رات کی بابت جاننا چاہتی تھیں مگر میں کبیر کی عیاشی کی داستان کس طرح سنا سکتا تھا اس لئے اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے باہر نکل آیا۔ میرا رخ ٹال کی طرف تھا۔

منیجر مشتاق سیال نے ٹال کے سارے معاملات بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ سنبھال رکھے تھے۔ میں نے اسے کمرے میں بلا کر چند کاروباری معاملات پر گفت و شنید شروع کر دی۔ باتوں کے دوران اس نے کہا۔ ''صاحب جی! ایک بات کہنی تھی آپ سے۔''

''ہاں کہو .... لیکن یار! مجھے یہ صاحب جی، چھوٹے مالک نہ کہا کرو۔''

''بڑے لوگ .... کہہ دیا کروں جی؟'' وہ ذرا جھجک کر بولا۔

''اس کی بھی ضرورت نہیں .... صرف نادر۔ ہاں اب بولو۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا تو وہ بولا۔

''نادر میاں! میں ٹال کی رکھوالی کے حوالے سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔''

''ہاں کہو۔'' میں نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔ ''ویسے اس وقت دو چوکیدار تو اپنا کام کر رہے ہیں نا۔''

''وہ دونوں بڑے آدمی ہیں جی۔'' اس کی بات پر میں نے اسے گھورا۔ ''مم .... میرا مطلب ہے کہ وہ چھوٹے آدمی ہیں .... بب .... بلکہ اصل بات یہ ہے جی کہ وہ تھوڑے آدمی ہیں جی۔ میں چاہتا ہوں .... دو گن مین اور رکھ لیں۔''

اس کی بات پر میں ذرا سوچ میں پڑ گیا۔ مجھے خاموش پا کر وہ بولا۔ ''دیکھیں نا، نادر میاں! پہلے بھی ہم ایک حادثے سے گزر ہی چکے ہیں۔ دشمنی ہماری ختم نہیں ہوئی۔ ٹال میں لوہے کا سامان تو ہے نہیں، تمام لکڑی ہے .... ایک جلتی ہوئی تیلی پر ایندھن بن سکتی ہے۔ دو چوکیداروں کے ساتھ مسلح افراد کا

بھی موجود ہونا ضروری ہے۔"
"اچھا ٹھیک ہے .... مگر اس کے علاوہ بھی حفاظتی انتظامات پر نظر رکھو۔" میں نے کہا۔
"بہت بہتر جی۔" وہ بولا۔
"اچھا سنو .... میں ذرا جا رہا ہوں کہیں۔ دیر بھی ہو سکتی ہے مجھے۔ اور کوئی کام تو نہیں؟" م نے آخر میں پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ذرا دیر بعد میں اپنی جیپ میں پنڈی کی طرف روانہ ہو رہا تھا۔

پنڈی پہنچ کر میں نے براہِ راست اس عورت کے بنگلے کی طرف رخ کیا جس کے ساتھ گزشتہ رات کبیر رنگ رلیاں مناتا رہا تھا اور جس کی ساری مووی میرے موبائل فون میں محفوظ تھی۔ میں نے مذکو بنگلے کے قریب سے گزرتے ہوئے دانستہ جیپ آہستہ کی اور گردن موڑ کر نیم پلیٹ پڑھنے لگا۔

نیم پلیٹ پر "جواد احمد" کے الفاظ کندہ تھے۔ "تو گویا یہ عورت .... جواد احمد کی بیوی تھی۔" میں نے ہونٹ بھینچ کر سوچا۔ اس کے بعد جیپ تیزی سے آگے لے گیا اور سڑک کے کنارے جیپ روک کر اگنیشن سوئچ آف کر دیا۔ اس کے بعد اپنا سیل فون نکال کر نظر حیات کے نمبر پنچ کرنے لگا۔ مجھے یقین کہ اب تک کبیر احمد نے اپنے ملازم کو کمرے کے اٹیچڈ باتھ سے برآمد کر لیا ہوگا۔

دوسری طرف سے کبیر نے ہی ریسیور اٹھایا تھا۔ "ہیلو!"

"ہیلو .... کبیر! میرے رقیب! .... پہچانا مجھے؟" اس کی آواز پہچانتے ہی میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا تو دوسری طرف جیسے اسے چپ سی لگ گئی۔

"اتنی جلدی سانپ سونگھ گیا تمہیں؟ ابھی تو بہت سا حساب بے باق ہونا ہے۔" میں نے اس کی خاموشی سے گویا لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

اس کا سکتہ ابھی تک نہیں ٹوٹ سکا تھا۔ میں نے غیظ آلود لہجے میں کہا۔ "تم نے اپنے دو کتوں بجو چیرا اور گجر چوک کے کالا ناگ کا انجام دیکھ ہی لیا ہوگا۔ اور ہاں .... تم نے اپنے بیڈ روم کے اٹیچڈ باتھ سے اپنے ملازم کو برآمد بھی کر ہی لیا ہوگا۔ بے چارہ .... کل رات سے بند تھا، جب تم اپنی رسیدہ محبوبہ کے ساتھ "فری اسٹائل" رنگ رلیاں منا رہے تھے۔" میں نے دانستہ رات کا ذکر کیا تھا۔ اس انکشاف نے بھی اس کے اعصاب کو بھرپور جھٹکا دیا۔ یہی سبب تھا کہ جب وہ بولا تو اس کی آواز میں ہلکی سی ہکلاہٹ ابھر آئی تھی۔

"تت .... تو .... وہ .... تم تھے؟"

"ہاں .... میں ہی تھا وہ، جو تمہارے ملازم کو اٹیچڈ باتھ روم میں بند کرنے کے بعد بڑے آرام سے تمہاری اور تمہاری چہیتی محبوبہ .... آں .... نہیں، بلکہ مسز جواد کی رنگین و سنگین کارگزاری کی تصویریں اتارتا رہا تھا۔"

"یہ .... تم .... کک .... کیا کہہ رہے ہو؟" اس کی بوکھلائی ہوئی آواز سن کر میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"نہیں .... میں تو یونہی تم سے مذاق کر رہا ہوں۔ میں نے تو وہ بھی نہیں سنا جو تم نشے کی جھونک میں اپنی چہیتی میڈم کو کیلاشی عامل عاروب کے بارے میں بتا رہے تھے، جس سے تم نے نگینہ کی برین واشنگ کا مکروہ اور گھناؤنا کام کرایا تھا۔" میں نے تاؤ دلانے والے انداز میں کہا اور تصور ہی میں اسے اپنے سر کے بال نوچتے ہوئے دیکھنے لگا۔ میں بھی جیسے اسے شاک پر شاک پہنچانے پر تلا

لہٰذا مزید بولا۔

"یار! میرے رقیب! معاف کرنا .... میں نے تمہارے میڈم کے ساتھ گزارے ہوئے خوب لمحوں کی عکاس تصویریں بھی تیار کرا لی ہیں۔ اب ان کا مصرف سوچ رہا ہوں۔ ایک خیال تو یہ ہے انہیں ایسی تصویریں چھاپنے والے بدنام اخبارات کو دے دوں جو انہیں شاندار انداز میں شائع کریں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تصویریں نگینہ اور اس کے باپ کو بھجوا دوں تا کہ وہ تمہارے کرتوت اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں .... ایک خیال یہ بھی ہے کہ انہیں جواد کو بھجوا دوں۔ وہ اپنی بے وفا، رنگین مزاج بیوی کے ساتھ تمہیں بھی جہنم واصل کر دے گا۔"

"تت .... تم .... کیا چاہتے ہو؟" میرا جملہ مکمل ہوتے ہی اس کی لرزیدہ آواز ریسیور میں ابھری۔ وہ اگر ہارٹ کا مریض ہوتا تو یقیناً ان باتوں سے اسے زبردست اٹیک ہو چکا ہوتا اب وہ میرے کام کی بات اپنی زبان پر لایا تو میں نے خونخوار غراہٹ سے کہا۔

"صرف دو باتیں .... نگینہ کی مجبوری سے کھیلنے کا خیال بھی اپنے دل میں لانے کی جرأت نہ کرنا۔ نمبر دو .... اب تم مجھے یہ بتاؤ گے کہ نگینہ کی یادداشت کی بحالی کس طرح ممکن ہو سکے گی؟" میں اتنا کہہ کر خاموش ہوا۔

دوسری جانب چند لمحے گہری اور پُرسوچ خاموشی طاری رہی۔ پھر اس کے بعد ایک گہری ہمکاری کی آواز ابھری اور وہ بولا۔

"نادر علی! .... شاید تم نے میدان مار لیا۔"

اس کی آواز میں اگرچہ شکست خوردگی تھی لیکن مجھے اس میں کینچلی بدلنے والے سانپ کی سی مکاری کی بو آنے لگی جو شکار کو نگلنے کے لئے دم سادھے پھن سکیڑ کر مٹی میں منہ رکھ دیتا ہے۔

"کام کی بات کرو .... ابھی ایسے بہت میدان کھلے پڑے ہیں۔" میں نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

"ہاں .... مجھے منظور ہے۔" اس کی آواز میں واضح طور پر لرزش تھی۔ کہاں تو وہ میری آواز سنتے کسی خارش زدہ کتے کی طرح بھونکنا شروع کر دیتا تھا اور آج اس کے لبوں سے آواز تک نہیں نکل پا تھی۔

"اب آئے ہو تم پہاڑ کے نیچے۔" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ پھر لہجہ بدل کر گہری سنجیدگی سے "میں ان سب میں سے کچھ بھی نہیں کروں گا۔ تم صرف نگینہ کی جان چھوڑو اور اس پر کئے گئے اپنے عمل کو ہٹانے کا بندوبست کرو۔"

"مم .... میں .... " اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ "اچھا .... اچھا ٹھیک ہے۔" شاید اسے یاد گیا تھا کہ اس کی آنا کانی اس کے لئے کس قدر بھیانک ثابت ہو سکتی تھی۔ "مم .... مگر مجھے اس کے نگینہ کو وادی کیلاش لے جانا پڑے گا۔ کیونکہ وہ عامل وہیں رہتا ہے۔ وہی اس کا علاج کر سکے گا۔"

"کیوں .... وادی کیلاش کیوں؟" میں نے غرا کر کہا۔ "اس کی ذہنی حالت تباہ کرنے کے لئے تم عمل پورے کر گئے تھے۔ اب اس کی بحالی کے لئے تم مجھے وادی کیلاش کی کہانی سنا رہے ہو؟"

"تم یقین کرو، میں سچ بول رہا ہوں۔" میری غراہٹ کے جواب میں اس کی گھگیائی ہوئی آواز عامل عاروب اپنی طویل ریاضت کے بعد واپس کیلاش جا چکا ہے۔ اب اس سے وہیں ملاقات یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لئے چپ ہوا، پھر ذرا ہچکچاتے ہوئے دوبارہ بولا۔ "نگینہ چونکہ تمہیں پہچان پا رہی ہے اس لئے میرے کہنے پر وہ گھومنے پھرنے کے بہانے تیار ہو سکتی ہے۔ پھر وہاں

پہنچ کر ہم اس کیلاشی عامل عاروب سے ملاقات کریں گے۔ وہ نگینہ کی ذہنی رو بحال کر دے گا۔"

میرے پاس اس کی بات کا یقین کرنے کے علاوہ دوسرا راستہ نہیں تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے کہا۔ "رائٹ! .... مجھے بتاؤ کہ یہ سفر کس طرح اختیار کرنا ہو گا؟"

"بائی ایئر۔" وہ بولا۔ "یہاں سے ہمیں پہلے بائی ایئر پشاور سے چترال جانا پڑے گا۔ وہاں ایک چھوٹے سے چترالی قصبے "ایون" سے گزر کر کیلاش جانا پڑے گا۔ وہاں سے پیدل دو گھنٹے لگ سکتے ہیں۔ اگر کرائے کی جیپ وغیرہ مل جائے تو یہ سفر آدھے گھنٹے میں بھی طے ہو سکتا ہے۔"

"کیا کیلاش کی وادی، ایون سے اتنی ہی نزدیک ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں .... ایون کو وادی کیلاش کا دروازہ بھی کہتے ہیں۔"

"اچھا، اچھا ٹھیک ہے ...." میں اس کی معلومات سے مرعوب ہوئے بغیر بولا۔ "عاروب کیلاش میں کون سی بستی یا قصبے میں ملے گا؟"

"کلاش آگرم میں۔"

"تو تم نگینہ کو لے کر فوری طور پر کب روانہ ہو سکتے ہو؟" میں نے فوراً مطلب کی بات کی۔

"پندرہ بیس دنوں بعد .... پروگرام ...."

"کیا .... پندرہ بیس دن؟" میں اس کی بات کاٹ کر چلّایا۔ "تمہارے پاس صرف چوبیس گھنٹے ہیں" میں نے وحشت آمیز لہجے میں کہا۔ "پچیسویں گھنٹے کے شروع ہوتے ہی تمہاری بربادیوں کے سلسلے کا آغاز ہو جائے گا۔ ان چوبیس گھنٹوں میں تمہیں یہاں سے روانہ ہو جانا ہے، سمجھے!"

میرے سرد اور حتمی انداز نے اسے پریشان کر دیا۔ "اتنے لمبے اور دشوار گزار سفر کے لئے صرف چوبیس گھنٹے .... یہ بہت کم ہیں۔"

"تو پھر ایسا کرو، میرے ٹال پر آ جاؤ۔ اب باقی باتیں وہیں ہوں گی۔"

"ٹھہرو .... ٹھہرو ...." وہ چلّایا۔ "کم از کم .... دو دن تو دے دو، میں نے تو ابھی تیاری کرنی ہے اور نگینہ کو بھی رضامند کرنا ہو گا۔"

"کیوں .... نگینہ کو رضامند کرنے میں کیا مشکل ہے؟" میں نے زہریلے طنز سے کہا۔ "وہ تو اب تمہاری منگیتر ہی بننے والی ہے۔ جس کے بعد پٹ سے شادی ہونے والی ہے۔"

"پھر بھی۔ اس قدر جلدی وہ کیسے تیار ہو سکے گی؟ .... مجھے اس کو رضامند کرنے کے لئے کچھ بنیادی کام کرنا ہو گا۔" اس نے منت آمیز انداز میں کہا۔

ایک لمحے کے لئے میں نے سوچا، اس کی بات مان کر وقت کو دُگنا کر دوں مگر دوسرے ہی لمحے میں نے دباؤ برقرار رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

"یہ تمہارا مسئلہ ہے .... میں نے تم سے اس کی برین واشنگ کرانے کے لئے نہیں کہا تھا۔ تمہارا کیا دھرا ہے۔ اسے تم خود ہی بھگتو گے۔" یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ سنپولیا کوئی چال بھی چل سکتا تھا۔ اس لئے میں اسے کم سے کم وقت دینا چاہتا تھا۔

اس کے بعد متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا آہستہ روی سے ڈرائیو کرنے لگا۔ جلد ہی ایک بارونق شاپنگ مال نظر آ گیا۔ اس کے باہر گاڑیوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ میں نے جیپ پارک کی اور دونوں ہاتھ جیب میں ڈال کر ٹہلنے کے انداز میں واپس روانہ ہو گیا۔ میرا رخ جواد احمد کے گھر کی طرف تھا۔

میں اپنی جیپ وہاں نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ میں بے فکروں کے سے انداز میں ٹہلتا ہوا جواد احمد کے بنگلے کے سامنے پہنچ کر ذرا رکا۔ پھر انٹرکام سسٹم پر نصب کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ میرا خیال تھا کہ اندر سے کوئی ملازم یا چوکیدار وغیرہ باہر نکلے گا۔ ذرا ہی دیر بعد انٹرکام کے اسپیکر سے ایک نسوانی آواز اُبھری۔

"کون ہے؟"

میں نے اس آواز کو پہچاننے کی کوشش کی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ گزشتہ شب والی عورت کی آواز تھی۔

"مجھے مسز جواد احمد سے ملنا ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھ سے ملنا ہے؟ .... کس سلسلے میں؟ کون ہو تم؟" اس نے یہ کہہ کر میری تسلی کر دی تھی کہ وہی مسز جواد تھی اور میں اب اس کی آواز بھی اچھی طرح پہچان چکا تھا۔ وہ وہی تھی جس کے ساتھ کبیر رنگ رلیاں مناتا رہا تھا۔

"جی .... میڈم! مجھے آپ ہی سے ملنا ہے .... مگر آپ مجھے جانتی نہیں ہیں اور نہ ہی میں آپ کو اپنا نام بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"کیا .... آخر تم ہو کون؟ میں کسی اجنبی سے نہیں مل سکتی۔" اُس نے اُلجھن آمیز انداز میں کہا۔ یقیناً میرے تعارف نہ کرانے کی بات نے اسے چونکا دیا تھا۔ اس نے انکار کیا تو میں نے بھی کوئی اصرار کئے بغیر بے پرواہانہ انداز میں کہا۔

"کوئی بات نہیں .... آپ نہیں ملنا چاہتیں تو آپ کی مرضی .... میں تو آپ کے فائدے کی بات کرنے آیا تھا۔ بہرحال گڈ ...."

"ٹھہرو .... ٹھہرو ...." انٹرکام کے اسپیکر سے وہ عورت بولی۔ "آخر تم مجھ سے کیا بات کرنا چاہتے ہو؟"

"معاف کیجئے گا میڈم! .... یہ گفتگو اس طرح انٹرکام پر نہیں ہو سکتی۔ یہ خود آپ کے لئے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ بس اتنے اشارے کو کافی سمجھیں کہ میں آپ کے دوست کبیر سے متعلق کوئی اہم بات کرنا چاہتا ہوں۔"

کبیر کے نام نے اس پر کچھ اثر کیا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے کہا۔ "اچھا ٹھیک ہے، میں گیٹ کھلواتی ہوں۔"

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ خود بخود ہی میرے ہونٹوں پر عجیب مسکراہٹ اُبھر آئی تھی۔

چند لمحے بعد ذیلی گیٹ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر مگر صحت مند سی ملازمہ نے اندر کھڑے کھڑے ذرا جھک کر مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اندر آ جائیں۔"

میں نے اندر قدم رکھ دیا۔ ماربل چپس کی پختہ روش کے دائیں جانب لان میں مسز جواد نظر آئی۔ وہ وہاں موجود بید کی کرسیوں میں سے ایک پر پُرنخوت انداز میں بیٹھی تھی۔ یقیناً مجھے اندر بلانے کے بعد وہ وہاں آ کر بیٹھی ہو گی۔ میں نے اس کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

جاڑوں کی خوشگوار دھوپ لان میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بڑے غور سے میری طرف تکے جا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اضطراب اور اُلجھن صاف نظر آ رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس وقت اس کا شوہر گھر پر موجود نہیں تھا۔ ورنہ کبیر کا حوالہ سن کر مجھے وہ فوری طور پر اندر نہ بلاتی۔ بلکہ کوئی اور وقت یا مقام طے کرتی۔ اس نے نفیس مگر سادہ گھریلو لباس زیبِ تن کیا ہوا تھا۔ عمر رسیدہ ہونے کے باوجود اس کا

فکر نہایت پُرکشش تھا۔
"بیٹھو........" میرے قریب پہنچنے پر اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ اس کی تیز نظریں میرے چہ پر جمی ہوئی تھیں۔
"ہاں .... اب کہو، کیا کہنا چاہتے تھے مجھ سے؟" میرے نشست سنبھالتے ہی اس نے راست گفتگو کا آغاز کرنا چاہا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس وقت وہ ملازمہ ہمارے قریب کھڑی تھی جو صدر دروازے سے لے کر اس تک لائی تھی۔ میرے اندازے سے وہ ملازمہ کم اور مسز جواد کی را سہیلی زیادہ دکھائی دے رہی تھی۔ یہ لمحاتی تجزیہ تھا جو میں نے بیٹھتے بیٹھتے کر لیا تھا۔ اس کے باوجو اس کی موجودگی میں مطلب کی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ملازمہ کی طرف دیکھا اور مسز جواد نگاہوں کا مفہوم بھانپ گئی۔ اس نے سر کی خفیف حرکت سے ملازمہ کو وہاں سے ہٹ جانے کا اشارہ کیا وہ مؤدبانہ انداز میں روانہ ہو گئی۔
میں نے ہولے سے کھنکھار کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور بولا۔ "آپ کے شوہر کیا کر ہیں؟ .... اور وہ اس وقت کہاں ہیں؟"
وہ پہلے ہی میری طرف سے ایک اضطراب آمیز پریشانی میں مبتلا تھی۔ میرے اس سوال نے ا مزید کھولا دیا۔ وہ چڑ کر بولی۔ "تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے۔"
"مگر مجھے اس سے غرض ہے .... کیونکہ میں دیکھنا چاہتا ہوں، آخر کبیر جیسے امیر کبیر باپ ک بیٹے نے آپ کو بلیک میل کرنے کا کیوں سوچا؟ .... شاید وہ آپ کو موٹی آسامی سمجھتا ہے اس لئے" میں پراسرار انداز میں دھیرے دھیرے بولا تو وہ بری طرح چونک اٹھی۔
"بلیک میل؟ .... اور وہ بھی کبیر مجھے کرنا چاہتا ہے؟"
"جی ہاں ...." میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور نہایت رازدارانہ لہجے میں مزید بولا
"اس نے آپ کی غیر اخلاقی اور شرمناک تصاویر تیار کرائی ہیں۔"
میرے الفاظ نے گویا بم دھماکا کیا۔ وہ اپنی نشست پر اچھل پڑی تھی۔ ایک لمحے کو اس کے چہر پر زردی نظر آئی۔ دوسرے ہی لمحے وہاں برہمی کی سرخی نظر آنے لگی۔
"کیا بکواس ہے؟ .... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"
میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی سے مسکراتی نظر سے اسے دیکھنے لگا۔ کوئی جواب نہ پا کر شاید مزید جھلا گئی مگر اس کا دوسرا سوال نہایت معقول تھا۔
"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" اس سوال نے بتا دیا کہ وہ اس معاملے میں پوری طرح دلچسپی لے رہی تھی
"اس نے مجھے خود بتایا ہے۔" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا تو اس کے چہرے پر بے یقینی چھا گئی۔ "آپ یقیناً گزشتہ شب اس کے ساتھ تھیں، تب اس نے خفیہ کیمرے کی مدد سے عریاں تصاویر بند کی ہیں۔ میں اس کا گہرا دوست ہوں اس لئے اس نے اس کارنامے سے نہایت فخریہ انداز میں مجھے آگاہ کر کے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ ان کی مدد سے آپ کو بلیک میل کرے گا۔"
"میں ابھی اس سے بات کر کے کنفرم کرتی ہوں۔" اس نے منمناتی ہوئی آواز میں کہا اور قریب دوسری کرسی پر موجود اپنے موبائل کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔
"اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ وہ تمام تصویریں مع نگیٹو میرے پاس ہیں۔ میں نے دوست کی پیٹ میں چھرا گھونپ کر یہ کام کر لیا ہے۔"

اس کا بڑھتا ہوا ہاتھ رک گیا۔ میری بات ختم ہوئی تو وہ نفرت انگیز نظر سے مجھے گھورنے لگی۔
"تو گویا اب تم مجھے بلیک میل کرو گے؟"
"ہرگز نہیں محترمہ!" میں نے ٹھوس لہجے میں اس کے پریشان حال چہرے پر نظریں مرکوز کرتے ئے کہا۔ "مجھے کبیر کی یہ حرکت انتہائی غیر اخلاقی اور مکروہ محسوس ہوئی تھی اسی لئے میرے ضمیر نے گوارا کیا کہ وہ ان سے کوئی فائدہ اٹھائے۔ اور ویسے اگر مجھے آپ کو بلیک میل کرنا مقصود ہوتا تو میں آپ کو یہ بتانے کی بجائے آپ سے موٹی رقم کا مطالبہ کر رہا ہوتا۔"
میری اس بات پر مسز جواد کے چہرے پر ایک تاثر اُبھرا۔ اپنی عریاں تصاویر کے ذکر پر بھی اس کا چہرہ م سے سرخ ہو رہا تھا۔
"لاؤ پھر .... وہ نگیٹو اور تصاویر میرے حوالے کر دو۔" اس نے میری طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔
"بالکل۔ میں وہ آپ کے حوالے کر دوں گا۔ لیکن ایک شرط پر۔" میں نے اس کے اب سرخ پڑتے رے پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے کہا۔
"کیسی شرط ....؟" اس کی نگاہوں میں شک کی پرچھائیاں لہرانے لگیں۔
"آپ کے چہرے پر جو شرم کی سرخی ہے، اس سے بڑھ کر ایک مشرقی عورت کا کوئی زیور نہیں ہوتا۔ پ اپنی اس شرم کی قسم کھا کر وعدہ کریں کہ آئندہ آپ اپنے نفس پر کنٹرول رکھیں گی۔ اپنے شوہر سے بے وفائی کی مرتکب نہیں ہوں گی۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اور اپنی گفتگو کا اثر دیکھنے لئے اس کے چہرے پر نگاہوں کو مرکوز رکھتے ہوئے کہا۔
وہ شاید سمجھی تھی کہ میرا وعدہ میرے کسی ذاتی لالچ پر مبنی ہو گا۔ مگر میری اس فرمائش پر وہ ہکا بکا رہ گئی۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں میرے لئے تشکر اور احترام کی جھلک اُبھری۔ لمحاتی توقف کے بعد وہ ب انداز میں بولی۔
"آپ کو میرے وعدے پر کس طرح یقین آئے گا؟" یہ کہتے ہوئے اس کے لبوں پر پہلی بار ہلکی سی مسکراہٹ اُبھری تھی۔ "ممکن ہے کہ آپ سے نگیٹو اور تصاویر لینے کے بعد میں پھر اسی روش پر چل نکلوں۔"
"سورج کہاں سے طلوع ہوتا ہے؟" میں نے اچانک اس سے پوچھا۔
"مشرق سے۔" اس کی آنکھوں میں دلچسپی کی جھلک اُبھری۔
"پورا یقین ہے آپ کو؟"
"ہاں۔"
"بس .... تو سمجھیں مجھے بھی آپ کے وعدے پر اتنا ہی کامل یقین ہو گا۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ عدہ آپ نہیں، آپ کے اندر کی عورت کرے گی، جو اس وقت احساسِ ندامت کی سرخی بن کر آپ کے ے سے عیاں ہو رہی ہے۔"
میری اس بات پر اچانک ہی مسز جواد کی آنکھیں چھلک پڑیں۔
"میں نے کہا نا .... آپ کے اندر کی عورت ابھی زندہ ہے۔ پلیز، اسے زندہ رہنے دیں۔"
اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر رخساروں پر بہنے لگے تھے۔ اس نے کاٹ لیا۔ پھر کچھ دیر بعد بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔
"آپ نیک دل انسان معلوم ہوتے ہیں۔ تاہم میں آپ کی خواہش شاید پوری نہ کر سکوں گی۔" اس ب لہجے میں کہا اور میں ہکا بکا اس کی صورت تکنے لگا۔ "کبیر کی حد تک تو میں آپ کی بات مان لیتی

ہوں، کیونکہ اس نے نہایت گھٹیا پن کا ثبوت دیا ہے .... مگر ....'' وہ چپ ہوگئی۔

میں اس کے بولنے کا منتظر رہا۔ کئی لمحے گزر گئے اور اس کی خاموشی نہ ٹوٹی تو میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''مگر کیا.........؟'' میرے لہجے میں خود بخود ہی ہلکی سی تلخی در آئی تھی۔

''اس کا جواب آپ کو ابھی مل جائے گا۔'' یہ کہتے ہی وہ یک لخت اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بے اختیاری طور پر میں نے بھی نشست چھوڑ دی۔ اس نے ایک لفظ کہے بغیر اندرونی عمارت کی طرف قدم بڑھا دیئے تھے۔ مجھ پر نہ جانے کون سی رو آئی تھی کہ میں بھی اس کے نقش قدم پر پاؤں آگے بڑھاتا چلا گیا۔ وہ گویا کسی ٹرانس میں تھی اور میں اس کے انداز کے ٹرانس میں آیا ہوا تھا۔ اس نے پختہ روش عبور کی اور پھر چند سیڑھیاں چڑھ کر اندرونی دروازے تک پہنچ گئی۔ دروازہ کھول کر ہم دونوں اندر داخل ہوئے۔ کوریڈور سے گزر کر وہ ایک کمرے میں داخل ہوگئی۔ میں اس کے عقب میں تھا۔ وہ کمرا ایک بیڈ روم تھا جس کے جہازی سائز بیڈ پر ایک تختی الوجود گہری نیند میں لیٹا نظر آ رہا تھا۔ بیڈ کے ساتھ ہی ایک چیئر رکھی ہوئی تھی۔

وہاں پہنچ کر وہ مڑی اور عجیب لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''اس سوئے ہوئے شخص کا نام جواد احمد ہے .... معذور اور بے مصرف جواد احمد.........!'' اس کے لہجے میں استہزا کے ساتھ ہلکی سی تلخی بھی تھی۔ میرے سان و گمان میں بھی یہ صورت نہیں آ سکتی تھی۔ میں دم بخود اپنی جگہ کھڑا تھا۔ چند لمحے اسی طرح گزرے۔ پھر گویا میں کسی ٹرانس سے باہر نکل آیا۔

''اسے کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ اس کے کرتوتوں کا انجام ہے۔'' اس نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ ''یہ جب تک ٹھیک تھا، گردن تک عیاشیوں میں غرق رہتا تھا۔ مجھ پر اس کی توجہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ میں اس کی رفاقت کو ترستی تھی مگر اس کی تمام تر توجہات وہ خوب صورت مگر بد سیرت تتلیاں ہوتیں جو مردوں کو رجھانے اور انہیں نچوڑنے کا فن اچھی طرح جانتی ہیں۔''

میں نے دیکھا، اس کی نظریں فضا میں کسی غیر مرئی نقطے پر جمی ہوئی تھیں۔

''میں سمجھاتی، بلکتی، اس کی خوشامدیں کرتی مگر اس کی روش نہ بدل سکی۔ پھر اچانک اسے گردن توڑ بخار ہوا جو جاتے جاتے اس کا یہ حال کر گیا کہ اب یہ محض زندہ لاش بن کر رہ گیا ہے۔ جبکہ میں خواہشوں اور جوان امنگوں کا چلتا پھرتا، سانس لیتا بھرپور بدن رکھتی ہوں .... اس لئے میں کبیر سے تو دوستی اختیار کر لوں مگر.........'' اس نے سر جھکا اور زہر بھرے لہجے میں دوبارہ بولی۔ ''یہ میرا اس خبیث سے انتقام بھی ہے۔'' اس کا اشارہ اپنے شوہر کی طرف تھا۔

اس کی باتوں سے میرے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگی تھیں۔ وہ ہمارے معاشرے کے ایک کریہہ رخ کی عکاس تھی۔

''آپ اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''پہلے میرا یہی ارادہ تھا۔ مگر پھر مجھے اس پر ترس آ گیا.........''

''شاید اس کی دولت آڑے آ گئی ہوگی؟'' میں نے اس کی بات مکمل ہونے کا انتظار کئے بغیر طنزیہ انداز میں کہا۔

''آپ کو یہ بے ہودہ خیال کیوں آیا؟'' اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔ ''اس کی جب مجھ سے شادی ہوئی، یہ اس وقت سڑک چھاپ تھا۔ میں اس کی نہ معلوم کس ادا پر فدا ہوئی کہ اسے اپنا شوہر بنا لیا۔

ساری دولت میری ہے جو میرا باپ میرے لئے چھوڑ کر مرا تھا۔'' اس کے چہرے کی سرخی کا سبب میری سمجھ میں آ گیا۔ وہ غصے کی سرخی تھی۔

''بہر حال.........'' میں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ''یہ آپ کا ذاتی مسئلہ ہے۔ میری خواہش تھی کہ آپ محض اپنے نفس کی غلام نہ بنیں۔ لیکن شاید.........'' میں کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا۔

''شاید اسی میں عقل مندی ہے۔'' اس نے میری تائید کی۔ ''البتہ میں آپ کی خواہش کے احترام میں کبیر سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گی۔ اور مجھے یہ بھی توقع ہے کہ آپ وہ تصاویر میرے خلاف استعمال نہیں کریں گے۔''

''ہرگز نہیں۔'' میں نے اسے یقین دلانے کے انداز میں جواب دیا۔ ''میں وہ تمام چیزیں آپ کو دے دوں گا۔''

''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بولی۔ ''آپ انہیں خود ہی ضائع کر دیں۔ مجھے آپ پر اعتبار ہونے لگا ہے۔''

''میں اس اعتماد پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔'' میں نے کہا اور واپسی کے لئے مڑ گیا۔ ''میرا خیال ہے مجھے اب چلنا چاہئے۔''

''آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔'' یکا یک اسے یاد آیا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' میں نے بے پرواہی سے کہا۔ ''آپ اتنا سمجھ لیں کہ پہلے میں کبیر کا دوست تھا مگر اب اس کا دشمن ہوں .... خدا حافظ!'' میں نے کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر واپسی کے لئے قدم بڑھا دیئے تھے۔

* * *

میرے پاس دو دن تھے۔ اگر چہ کبیر کو میں نے چوبیس گھنٹوں کی مہلت دی تھی مگر میں جانتا تھا کہ اس مدت میں اس کے لئے روانگی خاصی مشکل تھی اس لئے اپنے طور پر میں نے اسے دو دن کا وقت دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ میں اس امر سے بھی بہ خوبی واقف تھا کہ وہ میرا دشمن تھا اور دشمن کی کسی بات پر اعتبار کرنا کبھی عقلمندی نہیں ہوتی۔ وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر کوئی بھی چال چل سکتا تھا۔ مجھے اس کی طرف سے حد درجہ محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ میرا خیال تھا کہ مسز جواد کے ساتھ بنی ہوئی اس کی تصویریں اسے کسی حماقت سے باز رکھنے میں خاصی مددگار ثابت ہوں گی۔

ایک طرف یہ معاملہ تھا، دوسری طرف مجھے یہ بھی فکر تھی کہ میں اپنی اس آئندہ مہم کے بارے میں ماں کو کس طرح آگاہ کروں۔ کیونکہ یہ تو طے تھا کہ میں نگینہ کو صرف کبیر کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ مجھے اس کے ساتھ وادی کیلاش کا سفر ضرور کرنا تھا۔

ماں اگر چہ تیزی سے صحت یاب ہو رہی تھیں تا ہم ابھی ایسی حالت میں بھی نہیں تھیں کہ میں انہیں تنہا چھوڑ کر کسی نامعلوم سفر پر روانہ ہو سکتا۔ میں اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ ماں کو اس بارے میں آگاہ کروں یا نہ کروں۔ مگر اس رات کھانا کھانے پر انہوں نے خود ہی نگینہ کا ذکر چھیڑ کر مجھے موقع فراہم کر دیا۔

''بیٹا! تم نے دیکھ لیا نا .... سانپ کی اولاد سانپ ہی ہوتی ہے۔ نگینہ نے پہلے تو تمہاری محبت کے جوش میں آ کر بھری عدالت میں اپنے باپ کے خلاف گواہی دے کر کیس ہی پلٹ دیا تھا لیکن بعد

میں وہ صاف مکر گئی۔'' ان کے لہجے میں نگینہ کے لئے نفرت ہی نفرت تھی۔

چونکہ انہیں نگینہ کے حالات سے مکمل طور پر آگاہی نہ تھی اس لئے ان کی سوچ کو بے جا نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں نے نگینہ کی صفائی میں صرف اتنا کہا۔

''نہیں ماں! یہ بات نہیں ہے۔ نگینہ واقعی ایک اچھی، نیک فطرت کی لڑکی ہے۔ اس نے عدالت میں اپنے باپ شاہ میر کے خلاف میری محبت کے جوش میں گواہی نہیں دی تھی بلکہ وہ بذاتِ خود سچ کو سامنے لانے کا عزم کئے ہوئے تھی۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو نادر؟'' ماں نے میری طرف چونک کر دیکھا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں ماں!'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''نگینہ کے ساتھ درحقیقت ایک بہت بڑی اور پراسرار ٹریجڈی ہوئی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے انہیں ساری حقیقت بتا دی۔ میرا خیال تھا کہ ماں یہ سن کر نگینہ سے متعلق اپنی غلط فہمی ترک کر دیں گی۔ مگر وہ اٹل لہجے میں گہری متانت سے بولیں۔

''نادر!......... کچھ بھی سہی، نگینہ ہمارے دشمن کی بیٹی ہے۔ تم کیا یہ چاہتے ہو کہ میں دشمن کی بیٹی اپنے شوہر کے قاتل شاہ میر کی بیٹی کو اپنی بہو بنا لوں گی؟ .... ہرگز نہیں۔ اگر تمہارے دل میں ایسا کوئی خیال ہے تو اسے کھرچ کر نکال ڈالو۔''

ماں کی اس بات پر میں گنگ رہ گیا۔ میرے تو یہ تصور میں بھی نہ تھا کہ ماں اپنے بیٹے کی خوشی کو اپنے انتقام کی بھینٹ چڑھانے میں بھی دریغ نہیں کریں گی۔

''ماں!......... یہ......... یہ تُو کیا کہہ رہی ہے؟'' بے اختیار میرے ہونٹوں سے نکل گیا۔ میرے یہ الفاظ گہرا کرب لئے ہوئے تھے۔ مگر ماں اسے خاطر میں لائے بغیر سرد اور سپاٹ لہجے میں بولیں۔

''ہاں نادر!......... میں جو کہہ رہی ہوں، بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ مجھے تو حیرت ہے، آخر تُو نے اپنے باپ کے قاتل اور اپنی ماں کو بے گناہ داخل زنداں کرانے والے بے رحم و سفاک دشمن کی بیٹی سے محبت کی پینگیں کیسے بڑھائیں؟ .... کیا تُو بھول گیا کہ صرف شاہ میر کی وجہ سے تُو نے جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے جنم لیا تھا .... وہی ان سارے مصائب کا ذمہ دار ہے۔ اور ہاں، ابھی تیرے ماموں کی جان بھی اسی وجہ سے گئی ہے۔''

ماں کے لہجے میں جوشِ غیظ کی گھن گرج تھی۔ چہرہ آتشِ انتقام سے تمتما رہا تھا۔

''ماں! یہ سب بھلا میں فراموش کر سکتا ہوں.........؟'' میں نے رسان سے کہا۔ ''ماں! میری تو زندگی کا مقصد ہی اپنے باپ کے قاتلوں اور تمہارے ساتھ زیادتی کرنے والوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانا ہے۔ لیکن ماں!......... ذرا سوچو تو، اس میں نگینہ کا کیا قصور ہے؟''

''اس کا یہ قصور کیا کم ہے کہ وہ میرے شوہر کے قاتل کی بیٹی ہے؟'' ماں نے تیز نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ تو کوئی قصور نہ ہوا۔'' میں نے کہا۔

ماں چند ثانیے میرے چہرے کو بہ غور، پُرسوچ نظروں سے تکتی رہیں۔ پھر جیسے اندر ہی اندر کسی حتمی فیصلے پر پہنچ کر فیصلہ کن لہجے میں بولیں۔ ''نگینہ جب تمہاری زندگی کا حصہ بن جائے گی تو پھر تمہارے سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ پر اوس پڑ جائے گی اور جس طرح آج تم دشمن کی بیٹی کی وکالت کر رہے ہو، پھر تم اس کے باپ کی وکالت بھی کرنے لگو گے۔''

''ایسا ہرگز نہیں ہوگا ماں!'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''ایسا ہوگا نادر!......... اور ضرور ہوگا۔''

''لیکن ماں.........!''

''بس نادر!......... تمہیں آج ہی اور اسی وقت ایک فیصلہ کرنا ہوگا۔'' ماں نے میری بات کاٹ کر دم بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تمہیں اب ہم دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا......... کا......... یا ماں کا۔''

''ماں! نگینہ میری زندگی ہے۔'' میں تڑپ کر بولا۔

''یہ زندگی تجھے چھوڑنا ہوگی۔'' ماں نے سپاٹ لہجے میں کہا اور نشست چھوڑ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس انداز میں اس قدر سرد مہری تھی کہ مجھے اپنے دل کی دھڑکن رُکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔



چند قدم چل کر وہ ٹھہری اور کچھ سوچتی رہی۔ مجھے اس کی آنکھوں میں مختلف متضاد کیفیات کا عکس جھلکتا نظر آیا تھا۔ وہ یقیناً میری کیفیات سے اور وارداتِ قلبی سے بخوبی واقف تھی۔ مائیں تو اولاد کی خوشی کو ہر شے پر مقدم رکھتی ہیں، انہیں ہر حال میں ان کی خوشی عزیز ہوتی ہے۔ مگر میری ماں میری خوشیوں کی راہ میں حائل تھی۔ شاید اس میں کچھ قصور میرا بھی تھا کہ میں نے اپنے دشمن کی بیٹی سے دل لگا لیا تھا۔ ایک طرف میری ماں کے لئے میری محبت تھی جس کا تقاضا تھا کہ وہ میری پسند کو اپنی پسند سمجھے۔ دوسری طرف وہ نفرت تھی جو نگینہ کے باپ کے کرتوتوں کے باعث اس کے وجود میں پیہم موجزن تھی۔

وہ چند لمحے وہیں خاموش کھڑی رہی۔ پھر گویا کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے گویا ہوئی۔ ''نادر! مجھے پوری امید ہے کہ تم میرے حکم سے روگردانی کا خیال بھی اپنے دل میں نہیں لاؤ گے۔'' اس کے لہجے میں چٹانوں جیسی سختی اور برف جیسی سرد کاٹ تھی۔ ''میں اپنے دشمن کی بیٹی کو اپنی نگاہوں کے سامنے چہلیں کرتے ہرگز نہیں دیکھنا چاہتی۔''

''مگر ماں!.........'' میں نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے تو اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے روک دیا اور بولی۔ ''اس معاملے میں کسی ''اگر مگر'' کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔''

''ماں! مجھے اتنی بڑی آزمائش میں نہ ڈال۔'' میں نے التجا بھرے انداز میں کہا۔ ''میں تیرا بیٹا ہوں۔'' میری آواز میں رقت اُترنے لگی۔

''ہاں.........تُو میرا بیٹا ہے۔ اس لئے تجھے یاد دلا رہی ہوں کہ تُو اپنی ماں کے دشمنوں کو نہ بھول۔ یاد رکھ کہ تیرے باپ کے قاتل بھی وہی ہیں جنہوں نے تیری ماں کو زندہ درگور کر دیا تھا۔'' اس کے لہجے میں اس قدر سنسناہٹ تھی کہ میں لرز کر رہ گیا۔ ''غور سے میری بات سن اور ہمیشہ دھیان میں رکھ۔ اگر تُو نے میرا کہنا نہ مانا تو میں سمجھوں گی کہ تُو قادر خان کی اولاد نہیں ہے۔''

''ماں.........!'' شدتِ کرب سے میری آواز پھٹنے لگی تھی۔ ''مجھے اتنی بڑی گالی تو نہ دے۔''

''یہ گالی تیرے لئے ہی نہیں میرے لئے بھی ہے۔'' اس نے میرے انداز پر کوئی توجہ دیئے بغیر جواب دیا۔ ''غیرت اور حمیت کا تقاضا یہی ہے کہ تُو اپنے باپ کے قاتلوں سے انتقام کی منصوبہ بندی کرے کہ.........'' وہ نہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی مگر خاموش ہو گئی۔ میں اپنی جگہ لرزتا، کانپتا رہا۔

''اب تُو کل تک مجھے فیصلہ کر کے بتا دے کہ تُو کیا چاہتا ہے.........اپنی محبت یا پھر باپ اور ماں کا انتقام؟'' اس نے گمبھیر سنجیدگی سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

میں بے دم سا ہو کر صوفے پر گر پڑا۔ ماں کے تیر و نشتر جملوں اور تند رویے نے مجھے بے حال سا کر کے رکھ دیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ماں اولاد کے معاملے میں اس قدر کٹھور پن اور بے اعتنائی کا مظاہرہ بھی کر سکتی ہے۔

مجھے ماں سے بے اندازہ محبت تھی۔ مجھے اس بات کا قلق ہو رہا تھا کہ ماں نے مجھے غلط سمجھا تھا۔ شاید حالات نے ماں کے دل کو سخت بنا دیا ہے۔ اس میں ان کا بھی تو قصور نہیں تھا۔ لیکن بہرحال انہیں اپنے بیٹے پر، مجھ پر بھروسہ کرنا چاہئے تھا۔ ایسے میں مجھے اب ماموں حیدر گل بہت یاد آنے لگے۔ وہ ہوتے تو آج شاید ماں کو میری طرف سے سمجھانے کی کوشش کرتے۔

انتقام نے ماں کو اس قدر اندھا کر دیا تھا کہ اسے اپنے بیٹے پر بھی شبہ ہونے لگا تھا۔ ماں نے نگینہ کا اس انداز میں تذکرہ چھیڑ کر مجھے سخت آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ اور یہی نہیں، ماں نے تو مجھے کل تک کا الٹی میٹم بھی دے دیا تھا کہ میں انہیں ایک فیصلہ کر کے بتا دوں کہ مجھے دونوں میں سے کس کا انتخاب کرنا تھا؟......... نگینہ میری زندگی تھی۔ اسے بھلانے کا تو میں تصور نہیں کر سکتا تھا۔ جبکہ ماں تو ماں تھی۔ میں اس کا دل بھی نہیں توڑنا چاہتا تھا۔

آج مجھے ماموں حیدر گل کی بات کی اہمیت کا اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کیوں بار بار میری ماں سے التجا کرتے تھے کہ مجھے اس جنگ سے دور رکھا جائے۔ یہی وہ اہم موضوع تھا جس پر دونوں بہن بھائی (ماں اور ماموں) کے درمیان اکثر تلخ کلامی بھی ہوتی رہی تھی۔ میرے دل و دماغ بری طرح جھنجلا رہے تھے۔

ماں نے مجھے کل تک سوچنے کی مہلت دی تھی۔ جبکہ یہ کٹھن اور ناممکن حد تک مشکل فیصلہ تو مجھ سے صدیوں کی مہلت ملنے پر بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ سوچ سوچ کر میرا دماغ پاگل ہو رہا تھا۔ یہ بہت کٹھن لمحات تھے، جنہوں نے مجھے بری طرح اعصاب زدہ کر دیا تھا۔

ادھر کبیر کو دی ہوئی مہلت کا ایک دن گزر چکا تھا اور کل صبح ہم نے نگینہ کو لے کر چترال اور پھر وادی کیلاش روانہ ہونا تھا۔ مگر اس نئی اور غیر متوقع صورتِ حال نے مجھے پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ ماں کو میں نے نگینہ کی طرف سے بہت قائل کرنے کی کوشش کی تھی، جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا تھا کہ ماں نے مزید اس سلسلے میں کوئی بات کرنا گوارا ہی نہیں کیا تھا۔ نگینہ کے ساتھ بڑی گھناؤنی سازش کی گئی تھی۔ اس کا برین واش کر کے مجھے اس سے دور کر دیا گیا تھا اور یہی نہیں بلکہ اب کبیر اس کے ساتھ چٹ منگنی پٹ بیاہ کا بھیانک منصوبہ بنا چکا تھا۔ لیکن میری بروقت حکمتِ عملی نے اس کے گھناؤنے منصوبے پر کسی حد تک پانی پھیر کر رکھ دیا تھا۔ چنانچہ مجھ پر یہ لازم تھا کہ میں اپنی نگینہ کی ہر ممکن مدد کروں۔ وہ بے چاری کچھ نہیں جانتی تھی کہ اس کے ساتھ کیا بھیانک کھیل کھیلا جا چکا تھا اور کھیلا جانے والا تھا۔

میں اگلے دن ناشتہ کئے بغیر سیدھا ٹال پہنچا۔ ایک تو ویسے ہی میرا ناشتہ کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا، دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ میں ماں کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔ ٹال میں اپنے آفس میں آنے کے ذرا دیر بعد میں نے کبیر سے بات کرنے کے لئے نظر حیات کی رہائش گاہ کے نمبر پنچ کئے تو دوسری جانب سے کسی ملازمہ نے ریسیور اٹھا لیا تھا۔ اس سے پتہ چلا کہ کبیر کہیں باہر نکل چکا تھا۔ میں نے غصے سے دانت بھینچ لئے۔

کبیر کو دی ہوئی مہلت کا صرف ایک دن باقی تھا۔ میں نے سوچا، ہو سکتا ہے وہ نگینہ کو تیار کرنے کے لئے گیا ہو؟

ایک بجے کے قریب میں نے دوبارہ اسے فون کرنا چاہا تو میز پر رکھے ٹیلی فون سیٹ کی بیل گنگنانے لگی۔ میں نے فوراً ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا۔

''نادر علی خان؟'' دوسری طرف سے استفہامیہ کہا گیا۔ یہ کبیر احمد تھا۔

"ہاں بول رہا ہوں میں ....کل تیار ہو نا پھر؟" میں نے پوچھا۔

"میں تو تیار ہوں لیکن نگینہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" وہ بولا تو طیش کی ایک لہر میرے وجود میں سرایت کر گئی۔

"بکواس بند کرو اپنی۔ تم مجھے بلف کرنا چاہ رہے ہو۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" وہ بولا۔ "اگر میری بات پر بھروسہ نہیں ہے تو خود جا کر نگینہ سے مل کر دیکھ لو۔"

"بکواس نہ کرو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو، میں نگینہ سے نہیں مل سکتا۔ آخر ہوا کیا ہے اسے؟" میں نے دانت پیس کر کہا۔

"کچھ خاص نہیں۔ موسمی بخار ہے اسے۔ تین چار روز میں ٹھیک ہو جائے گی۔" وہ بولا۔

"یہ معمولی بات ہے........تم اسے راضی کرو۔ وہ مان جائے گی۔"

میں نے اصرار کیا تو وہ بولا۔ "وہ بہت نازک مزاج ہے۔ ایسے میں تو اس کے پیا بھی سفر کی اجازت نہیں دیں گے۔"

میں نے محسوس کیا کہ کل کے مقابلے میں آج اس کے لہجے میں ڈر، خوف یا پریشانی نہ تھی۔ وہ بہت بے خوفی سے اور بے پرواہانہ انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کی بوٹیاں نوچ ڈالوں۔ جی تو چاہا کہ اسے ٹیلی فون پر ہی خطرناک نتائج کی دھمکیاں دوں ....لیکن پھر یہ سوچ کر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا کہ ہو سکتا ہے، یہ خبیث اور ابنِ شیطان ٹیلی فون پر میری گفتگو ریکارڈ کر رہا ہو۔ تاہم پھر بھی میں نے اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے اس سے کہا۔

"کبیر! میری ایک بات یاد رکھنا۔ اگر تم نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تو یہ مت بھولنا کہ تمہاری دکھتی رگ میرے ہاتھوں میں ہے۔"

دوسری طرف چند لمحے اسرار بھری پُرسوچ خاموشی چھائی رہی۔ پھر اچانک ہی اس نے کچھ کہے بنا رابطہ منقطع کر دیا۔ مجھے اس کی دیدہ دلیری پر پہلے تو سخت طیش آیا، پھر حیرت آمیز اُلجھن بھی ہوئی۔ آخر اسے کس بات کی تسلی ہو چکی تھی کہ میں مسز جواد کے ساتھ بنائی گئی اس کی شرمناک تصاویر سے کوئی فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔

تب پھر اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ کہیں ایسا تو نہ تھا کہ کبیر، مسز جواد سے ملا ہو۔ اگرچہ میں مسز جواد کو آخر میں تاکید کر آیا تھا کہ اس بات کا ذکر کبیر سے ہرگز نہ کرے اور نہ ہی غصے کا اظہار کرے۔ بس غیر محسوس طریقے سے اس کے ساتھ قطع تعلق کر لے۔ ہو سکتا ہے اس نے کبیر سے میری ملاقات کا ذکر کر دیا ہو؟ مگر مجھے اس کا خدشہ کم ہی تھا۔ کیونکہ مسز جواد یہ حقیقت اسے بتا کر اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی نہیں مار سکتی تھی۔

تو پھر آخر کبیر کے لہجے میں آج اتنی بے خوفی اور طمانیت کیوں در آئی تھی؟ ایسا کیا ہوا تھا آخر؟ آخر اس کا لہجہ کل کے مقابلے میں اتنا بدلا بدلا کیوں تھا؟ کل تو جیسے اس کی جان نکلی جا رہی تھی۔ مگر آج ایسا نہ تھا۔ کیوں؟ ....اور اس کیوں کا جواب میری سمجھ میں یہی آ رہا تھا کہ خود کبیر سے جا کر ایک ملاقات کروں یا پھر ایک خیال یہ بھی میرے ذہن میں اُبھرا تھا کہ میں تھوڑے دن مزید انتظار کر کے دیکھ لوں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت تھی کہ میں ان تصاویر کو بہر حال دنیا کے سامنے نہیں لانا چاہتا تھا۔ یہ ارادہ میں نے مسز جواد سے ملاقات کرنے کے بعد کیا تھا۔ کیونکہ مسز جواد بہر حال کوئی پیشہ ور عورت یا طوائف زادی نہیں تھی۔ تلخ حالات اور مجبوری نے اسے غلط راہ پر ڈال دیا تھا اور میرا مسز جواد سے ملنے کا مقصد بھی یہ

تھا کہ میں اسے بھی ان شرم ناک تصاویر کو طشت ازبام کرنے کی دھمکی دیتے ہوئے راہ راست پر لانے کی کوشش کروں۔ اور شاید کسی حد تک میں کامیاب بھی ہوا تھا۔ چنانچہ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ شرم ناک ایشو منظر عام پر آئے۔ میں نے تو محض کبیر کو دھمکانے کے لئے ایسا کہا تھا۔

تو کیا پھر ....کبیر کو بھی اس بات کا احساس ہو گیا تھا؟ ایک خیال یہ بھی میرے ذہن میں اُبھرا تھا۔ لیکن کیسے؟ اُسے بھلا اس بات کا کیونکر اندازہ ہو سکتا تھا؟ جب تک کہ اسے مسز جواد اپنی اور میری ملاقات کے بارے میں نہ بتاتی۔

"تو کیا پھر مجھے مسز جواد سے کنفرمیشن کرنی چاہئے تھی؟" میں نے سوچا اور یہ خیال آتے ہی مسز جواد کا نمبر ملانے لگا۔ رابطہ ہونے پر اس کی ملازمہ نے فون اٹھایا۔

"مسز جواد تشریف رکھتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جی نہیں........وہ تو دفتر گئی ہوئی ہیں۔"

"دفتر کا نمبر........؟"

"جی مجھے معلوم ہے۔" وہ بولی اور اس نے مجھے مسز جواد کے دفتر کا نمبر بتا دیا۔ میں نے اسی وقت وہ نمبر ملایا۔

"میڈم سے بات کروا دیں۔"

"آپ کون........؟"

"آپ پلیز ان فضول باتوں کو چھوڑیں، مجھے ان سے فوراً ضروری بات کرنا ہے۔ میری ان سے فوراً بات کرائیں۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"وہ میٹنگ میں مصروف ہیں۔" اس بار لڑکی نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

"دیکھیں، میں ان کا قریبی عزیز ہوں۔"

"کمال ہے۔ آپ ان کے قریبی عزیز ہیں اور آپ کے پاس میڈم کا سیل نمبر بھی نہیں ہے۔ اور نہ ہی ان کے آفس چیمبر کا ذاتی فون نمبر ہے۔"

لڑکی نے طنزیہ لہجے میں کہا اور میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ مگر اس کا بھی دوش نہ تھا اور پھر غلطی میری بھی تھی۔ میں نے مسز جواد کو اب تک اپنا نام ہی نہیں بتایا تھا۔ میں کیا پیغام دیتا۔ چنانچہ میں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور گہری سوچ میں غلطاں ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اگلا قدم کون سا اٹھایا جائے۔ کبیر مجھے ڈاج دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ اب یہ تو وقت ہی بتاتا کہ اس کی نیت میں کیا فتور تھا۔ مجھے نگینہ کے اس پراسرار معاملے کے سلسلے میں جلد از جلد اگلا اسٹیپ اٹھانا تھا۔ اس گمبھیر معاملے میں ذرا سی بھی تاخیر نگینہ اور میرے لئے نقصان دہ ہوتی۔

ایک خیال یہ بھی میرے دل میں آیا کہ نگینہ کو اغواء کر کے وادی کیلاش کا رخ کروں۔ اگرچہ یہ ایک خطرناک اور دشوار کام تھا۔ لیکن میں نگینہ کی بھلائی کی خاطر یہ مشکل کام بھی کرنے کی ٹھان سکتا تھا۔ لیکن اس کام میں سب سے بڑی قباحت کیلاشی عامل عاروب کی تلاش اور اسے پہچاننے کی تھی۔ یوں تو وہ بقول اس کے خود کو کیلاشیوں کے ایک مخصوص گروہ کا روحانی پیشوا اور مربی بتاتا تھا اور ایسی معروف شخصیت کو تلاش کرنا بھی مشکل نہ تھا۔ مگر پھر اسے اس کام پر رضامند کرنا اور نگینہ کو دوبارہ اصل حالت میں لانے کے لئے اقدام کرنا، یہ ایک اور مشکل کام تھا۔ البتہ کبیر کی موجودگی میں یہ کام آسان ہو سکتا تھا۔

یوں تو میں شام پانچ بجے ہی گھر کی طرف روانہ ہوتا تھا۔ کبھی موڈ ہوتا تو "کلڈانہ چوک" پر کشمیری

چائے پیتا ورنہ بائیں طرف نتھیا گلی جانے والے راستے ہو لیتا تھا۔ مگر آج میں تین بجے ہی ٹال سے اٹھنے کے لئے تیار ہوا اور جیسے ہی دفتر سے باہر ٹال کے احاطے میں کھڑی اپنی جیپ کی طرف بڑھا۔ ایک رنگ کی مرگلہ اندر داخل ہوئی۔ میں ذرا چونک کر رک گیا۔ یہ کار اعظم خان کی تھی۔ وہ ڈرائیور کی برابر اگلی نشست پر براجمان تھے اور عقبی سیٹ پر ایک گن مین بھی موجود تھا۔ کار رکتے ہی ڈرائیور اترا۔ مگر اعظم خان خود ہی دروازہ کھول کر نیچے اتر آئے۔ ان کا باڈی گارڈ بھی پیچھے اتر آیا تھا۔

''انکل! .... آپ .... آئیں، اندر تشریف لائیے۔'' میں نے مسکرا کر ان کی طرف بڑھتے ہوئے کہا اور مصافحہ کیا۔

''ہاں نادر بیٹا! اچھا ہوا تم مل گئے۔'' وہ بولے۔ ''ورنہ مجھے گرین لاج جانا پڑتا۔ آؤ، میں نے کچھ ضروری بات کہنی ہے تم سے۔''

ہم اندر آفس روم میں آ گئے۔ میں نے انہیں ریوالونگ چیئر پر بیٹھنے کا کہا۔

''نہیں بیٹا! میں یہیں ٹھیک ہوں۔ بیٹھو تم۔'' وہ سامنے ایک کرسی سنبھال کر براجمان ہو گئے تو میں جواباً چیئر پر بیٹھ گیا۔

''نادر بیٹے! آج صبح ایس پی وجاہت قریشی اور کمشنر صاحب مجھ سے ملنے آئے تھے۔'' انہوں نے کہنا شروع کیا۔ میری نظریں ان کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ بولے۔ ''وہ امنِ عامہ کے حوالے سے گفتگو کرنے آئے تھے۔ انہیں یہ حقیقت اچھی طرح معلوم ہو چکی ہے کہ ہماری شاہ میر اور نظر حیات سے پرانی رنجش چلی آ رہی ہے۔ انہوں نے مجھ سے دوستانہ درخواست کی تھی کہ میں ان کی تادیب سے تمہیں بالخصوص بھابی شبینہ کو آگاہ کر دوں کہ اگر شاہ میر یا نظر حیات کو خوف زدہ کرنے کی کوئی گمنام کوشش کی گئی یا لاء اینڈ آرڈر کی چویشن پیدا کی گئی تو تم سے اور بھابی شبینہ سے جواب طلب کیا جا سکتا ہے۔''

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوئے تو میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ کھنچ گئی اور میں اعظم خان سے بولا۔

''انکل! کیا یہ تادیب آمیز دھمکی صرف ہم ماں بیٹے کے لئے تھی یا.........؟'' میں نے طنزیہ انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ میری طرف دیکھ کر خلیقانہ لہجے میں مسکرا کر بولے۔

''کسی غلط فہمی میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ وہ کسی کے کہنے پر نہیں بلکہ بالکل غیر جانبدارانہ طور پر آئے تھے اور اس سے پہلے وہ یہی تادیب شاہ میر اور نظر حیات کو بھی کر چکے ہیں۔ تم گھر جا کر یہ بات بھابی شبینہ سے بھی کہہ دینا۔ میں بھی کسی وقت آؤں گا۔ اوکے، اب میں چلتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

''ارے انکل! یہ کیا......... آپ بیٹھئے تو سہی۔''

''نہیں بیٹا! میں جلدی میں ہوں .... پھر کبھی سہی۔'' انہوں نے کہا اور واپس لوٹ گئے۔ میں چند ثانیے احاطے میں اپنی جیپ کے قریب آ کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

''بڑے آدمی ہیں جی.........'' اچانک منیجر مشتاق سیال نے کھنکھارنے والے انداز میں کہا۔

میں خیالات سے یکدم چونک کر اس کی طرف پلٹا۔ وہ گھبرا سا گیا۔ ''وہ......... مم......... میرا مطلب تھا جی، خان صاحب چائے شائے پیئے بنا ہی چلے گئے۔''

''ہاں .... انہیں جلدی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''اچھا سنو......... میں جا رہا ہوں۔ کوئی بات ہو تو فون پر بتا دینا۔''

''او جی، میرے ہوتے ہوئے آپ فکر ہی نہ کریں۔ کوئی گل بات ہوئی تو میں سنبھال لوں گا۔

کڑا کے۔'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

''کیا؟ ....اب نیا تکیہ کلام اپنا لیا ہے تم نے؟ .... بڑے لوگ چھوڑ دیا؟'' میں نے ازراہِ تفنن کہا۔

وہ جھینپتے ہوئے بولا۔ ''آہو جی......... سال نیا، کلام نیا تو تکیہ بھی نیا۔''

''اچھا، اچھا......... اپنے پاس رکھو یہ تکیہ بھی اور کلام بھی۔ میں چلتا ہوں۔'' میں نے کہا اور جیپ کا دروازہ کھول کر اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔

گرین لاج پہنچ کر میں نے ماں کو انکل اعظم خان کا پیغام دے دیا۔ ان کا بھی وہی ردِ عمل تھا جو میرا سن کر ہوا تھا۔ وہ نفرت خیز لہجے میں بولیں۔

''ایس پی وجاہت قریشی اور کمشنر نے ہمارے ٹال میں لگنے والی آگ کے بارے میں اب تک کیا تفتیش کی ہے، جو یوں ڈھکے چھپے انداز میں دھمکیاں پہنچا دیں ہم ماں بیٹے کو؟''

جواباً میں خاموش رہا۔

''نادر! کل صبح ہم دونوں ایس پی وجاہت قریشی سے ملیں گے۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔'' میں نے نظریں نیچی کرتے ہوئے کہا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں ماں رات والی گفتگو نہ چھیڑ دیں۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ ہم نے خاموشی سے اکٹھے کھانا کھایا اور پھر آرام کرنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

اگلے دن علی الصباح ماں تیار ہوئیں۔ انہوں نے ہلکے آسمانی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا جس کے اوپر موسم کی مناسبت سے فر کا کوٹ لے رکھا تھا۔ ان کی شخصیت اس عمر میں بھی جاذبِ نظر اور پُر وقار تھی۔ ہلکا براؤن فر کوٹ ان کی شہابی رنگت پر بہت جچ رہا تھا۔ پہاڑی عورتوں کی طرح ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں بلا کی پُر جوش چمک اور چہرے پر رعب و دبدبہ تھا۔ کھڑی ناک اور تیکھے چتونوں پر پُر اعتماد سی تمتماہٹ تھی۔ اس وقت وہ بڑی دبنگ اور بھاری بھرکم خاتون نظر آ رہی تھیں۔ میں نے گرین لاج سے روانہ ہوتے وقت انہیں اپنے فر کے کوٹ کے اندر کمر سے بندھے ہولسٹر میں ایک اڑتیس بور کا جرمن ریوالور بھی اڑستے ہوئے دیکھا تھا۔

گرین لاج سے باہر آ کر انہوں نے مجھ سے جیپ کی چابیاں لیں اور پھر بڑے غصے کے ساتھ جیپ کا دروازہ کھول کر اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔

میں ان کے برابر والی سیٹ کا دروازہ کھول کر براجمان ہو گیا۔ انہوں نے جیپ اسٹارٹ کی اور گیئر بدل کر ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ دور ترائیوں میں پھیلے مرغزاروں پر برف کے بادل سے تیر رہے تھے۔ نیچے صنوبر اور چیڑ کے دو رویہ درختوں کے بیچ سانپ کی طرح بل کھاتی سڑک کے کنارے رات بھر ہونے والی ہلکی برف باری کے آثار دودھیا پٹی کی صورت میں نظر آ رہے تھے۔ موسم خاصا خوش گوار تھا۔

ماں خاصی تیز رفتاری مگر بڑی مہارت سے جیپ دوڑائے جا رہی تھیں۔ کلڈانہ چوک پر آ کر فیول بھروایا اور پنڈی کی طرف جانے والی سڑک پر جیپ ڈال دی۔

یوں ہیڈ کوارٹر پہنچ کر ہم دونوں ماں بیٹے نیچے اترے۔ ایس پی وجاہت قریشی اپنے کمرے میں موجود تھے۔ ان کے اردلی کے ہاتھ پیغام پہنچایا تو انہوں نے فوراً ہمیں اندر بلا لیا۔

ایس پی وجاہت قریشی پچاس پچپن کے پیٹے میں تھے۔ وہ درمیانی قد و قامت مگر اچھی صحت کے مالک تھے۔ ماں کو دیکھتے ہی وہ احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے ان سے ہاتھ ملایا۔ انہوں نے ہمیں

اپنے سامنے رکھی دو کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"ایس پی صاحب! اعظم خان کے ہاتھوں آپ کا اور کمشنر صاحب کا پیغام مجھے موصول ہوا تھا۔" ماں نے ان سے مخاطب ہو کر گہری متانت سے کہا۔

"مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے ہمارے دوستانہ پیغام کا نوٹس لیا اور یہاں آنے کی زحمت کی۔" ایس پی وجاہت قریشی نے ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔

"تو اس کا مطلب اگر شاہ میر اور نظر حیات کے ساتھ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آتا ہے تو لامحالہ ہم ہی زیر عتاب لایا جائے گا۔"

میرا خیال تھا کہ ماں کی بات پر ایس پی صاحب مروتاً کچھ بولیں گے۔ مگر انہوں نے بھی یک دم سنجیدہ ہو کر صاف گوئی سے کہا۔ "ہاں! .... پوچھ گچھ اور تفتیش کے سلسلے میں ہم بھی سخت قدم اٹھانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ کیونکہ آپ دونوں کی چپقلش کسی سے ڈھکی چھپی نہیں رہی۔ یہ آن دی ریکارڈ ہے۔"

"تو پھر آپ کے علم میں یہ بات بھی ہو گی کہ کچھ عرصہ پہلے ہمارے ٹال کو آگ لگا دی گئی تھی اور پولیس نے یہ واقعہ 'نامعلوم شر پسندوں' کے روایتی عنوان کے کھاتے میں ڈال کر تفتیش شروع کر دی تھی۔ تو کیا شاہ میر اور نظر حیات کو آپ کی تفتیش یا پوچھ گچھ کے عمل سے گزرنا پڑا یا نہیں؟" ماں کے ان جچے تلے جملوں نے ایس پی صاحب کو ذرا جز بز تو کیا تھا مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ بولے۔

"ہاں .... متعلقہ تھانے کے انچارج انسپکٹر اعجاز شمس تفتیش کر رہے ہیں۔"

"آپ نے شاید میرے سوال پر غور نہیں کیا ایس پی صاحب!" ماں نے دبنگ لہجے میں ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میں آپ کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔ لیکن شاہ میر اور نظر حیات کے خلاف شواہد نہیں ملے۔" وہ جواباً بولے۔

"ہوں........" ماں نے ایک اسرار بھری ہنکاری بھری، "اگر یہی آگ شاہ میر اور نظر حیات کی رہائش گاہ کو نگل لے تو.........؟"

"آخر آپ کہنا کیا چاہتی ہیں محترمہ شبینہ؟" ایس پی صاحب نے بہ غور ماں کے چہرے پر اپنی نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

"میں یہ پوچھنا چاہتی تھی کہ جو دھمکی آمیز پیغام آپ نے اعظم صاحب کے ہاتھوں ماں بیٹے تک پہنچایا تھا، کیا وہ نظر حیات اور شاہ میر تک بھی پہنچایا گیا تھا؟" ماں نے پوچھا تو جواب میں ایس پی صاحب لمحاتی خاموشی کے بعد مختصراً بولے۔

"ان دونوں تک بھی ہمارا پیغام عنقریب پہنچا دیا جائے گا۔"

ان کی بات پر ماں نے قدرے چونک کر میری طرف دیکھا اور گویا ہوئیں۔ "نادر! تم تو کہہ رہے تھے اعظم صاحب نے بتایا تھا کہ ہم سے پہلے ان تک یہ پیغام پہنچایا گیا تھا۔"

ماں کی بات پر میں نے ایس پی صاحب کی طرف دیکھ کر کہا۔ "جی ہاں ایس پی صاحب! خان صاحب نے یہی بتایا تھا۔ کیا یہ بات درست نہیں؟"

"میں نے یہ نہیں کہا تھا ان سے۔ البتہ ہو سکتا ہے، کمشنر صاحب نے یہ سوچ کر اعظم صاحب سے کہہ دیا ہو کہ آپ لوگوں تک پیغام پہنچانے کے بعد شاہ میر اور نظر حیات تک بھی فوراً یہ پیغام پہنچا دیا جائے گا۔"

"اور وہ 'فوراً' اب تک نہیں آئی .... اور شاید آئے بھی نہ۔" ماں نے استہزائیہ کہا تو میں نے دیکھا، ایس پی صاحب کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے تھے۔

"دیکھئے خاتون! ہم نے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں، یہ ہم بہتر جانتے ہیں۔ آپ کو اس قسم کے ریمارکس نہیں دینے چاہئیں۔"

"چاہے آپ لوگ جانبداری برتتے ہوئے مظلوم کو ظالم ثابت کرنے پر تل جائیں؟"

"شبینہ خاتون! .... آپ حد سے بڑھ رہی ہیں۔" ایس پی کو بھی غصہ آ گیا۔ تب میں نے بھی لب کشائی کی۔

"ایس پی صاحب! آپ اخلاقی اور قانونی دونوں اعتبار سے غلط بات کر رہے ہیں۔ ہمارا ٹال نذرِ آتش کر دیا گیا، پولیس کچھ نہ کر سکی۔ اس کے بعد ہماری رہائش گاہ پر شب خون مارا گیا۔ میری ماں بال بال بچی اور میرے ماموں اور ہمارے ایک پرانے ملازم (فضل چاچا) کو قتل کر دیا گیا۔ انتظامیہ نے کیا، کیا اب تک؟......... اُلٹا ہمیں ہی بلیک میل کیا جا رہا ہے؟"

"مسٹر نادر علی خان! تم ماں بیٹا کیا سمجھتے ہو کہ ہم نے تم لوگوں کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں؟" ایس پی وجاہت قریشی نے میری طرف گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "لاہور کے گجر چوک کے زمیندارہ ہوٹل اور گلبرگ کے بنگلے میں جو خون ریزی کی گئی، ہم اس سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔ ہمیں بتایا بھی گیا کہ یہ خون ریزی کس نے پھیلائی ہے۔ لیکن ہم نے تم ماں بیٹے سے کوئی پوچھ تاچھ نہ کی۔"

مجھے ایس پی وجاہت کی بات پر ایک جھٹکا سا لگا مگر پھر دوسرے ہی لمحے میں نے پوچھا۔

"کیا آپ بتا سکتے ہیں، آپ کو یہ اطلاع دینے والے کون تھے؟ .... اور انہوں نے اس خون ریزی کا ذمے دار کس کو ٹھہرایا تھا؟"

"یہ ہمارا سیکرٹ ہے .... جسے ہم اپنی نظروں میں رکھ کر کسی بھی وقت خفیہ کارروائی کر سکتے تھے۔" انہوں نے جواب دیا۔

"یہ سیکرٹ نہیں ہے ایس پی صاحب! بلکہ چشم پوشی ہے۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "کیونکہ آپ جان گئے ہوں گے کہ جن لوگوں نے آپ کو خون ریزی کی اطلاع بہم پہنچائی، ان کو سب سے پہلے آپ کے سامنے جواب دہ ہونا پڑتا کہ آخر انہیں اتنا یقین کیوں ہے کہ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ کیونکہ پولیس، انتظامیہ اور اخباری اطلاعات کے مطابق اس خون ریزی کا شکار ہونے والے انتہائی خطرناک مجرم تھے جو پولیس کو مطلوب تھے۔ پھر تو یقیناً آپ کو خفیہ ذرائع سے اطلاع دینے والوں کا کوئی نہ کوئی تعلق، ان خطرناک مقتول مجرموں سے بنتا تھا۔"

میں نے دانستہ اخبارات کی خبروں کا حوالہ دیا تھا۔ حالانکہ میری نظروں سے شاید یہ خبر گزرنے سے رہ گئی تھی۔ میری بات پر ایس پی وجاہت قریشی نے چند لمحے سنسناتی نظروں سے میری طرف دیکھا اور لہجے میں بولے۔

"جس کسی نے بھی یہ خوں ریزی پھیلائی ہے، اسے ہرگز اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے کہ پولیس انتظامیہ محض یہ سمجھ کر کہ اس خوں ریزی کی زد میں آنے والے انتہائی مطلوب اور خطرناک مجرم تھے، اس کیس کو داخل دفتر کر دے گی۔" یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے پھر جھک کر اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں میز پر بچھاتے ہوئے اپنا چہرہ بالکل میرے چہرے کے قریب لا کر سرسراتے

لہجے میں گویا اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولے۔ ''کیونکہ ....ان میں سے ایک مجرم کالا ناگ زندہ بچ گیا ہے۔''

ایس پی وجاہت قریشی کے اس انکشاف نے میرے وجود میں سنسنی دوڑا دی۔ اور ایک لہر سی ریڑھ کی ہڈی میں کن کھجورے کی طرح رینگتی محسوس ہوئی۔ یہ لہر اس خوف کی نہ تھی کہ کالا ناگ زندہ بچ جانے کے بعد میرے خلاف پولیس کو بیان دے گا۔ بلکہ یہ ایک جوش کی لہر تھی کہ کالا ناگ میری گولی لگنے کے باوجود زندہ بچ گیا تھا۔

''کالا ناگ کو کہاں رکھا گیا ہے؟'' میں نے گمبھیر لہجے میں اپنے اوپر جھکے ہوئے ایس پی وجاہت قریشی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''بس تم ماں بیٹے کے لئے یہی کافی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ دوبارہ اپنی چیئر پر براجمان ہو گئے۔

میں نے ماں کی طرف دیکھا۔ کالا ناگ کے زندہ بچ جانے کا سن کر ماں کی بھی کم و بیش میرے جیسی کیفیت ہو رہی تھی۔ ماں نے خاموشی سے میری طرف دیکھا۔ اس کے بعد ہم پولیس ہیڈ کوارٹر سے واپس لوٹ گئے۔

میں اور ماں سارے راستے خاموش رہے تھے۔ پھر جب کلڈانہ چوک سے ہم نتھیا گلی اور ڈونگا گلی تک جانے کے لئے جھیکا گلی کا شارٹ کٹ اختیار کرنے لگے تو ماں نے میری طرف دیکھے بغیر مجھ سے کہا۔

''کالا ناگ کیسے بچ گیا تھا؟ ....تم نے تو کہا تھا کہ بشیر چیرا کے ساتھ وہ بھی ہلاک ہو چکا ہے؟''

ماں کے لہجے میں مجھے استفسار کم، تادیب زیادہ محسوس ہوئی تھی۔

''میں خود حیران ہو رہا ہوں ماں!'' میں نے الجھ کر کہا۔ ''میں نے خود اپنی آنکھوں سے کالا ناگ کو پشت میں گولی کھا کر گرتے دیکھا تھا۔ شاید ڈاکٹروں نے بروقت طبی امداد دے کر اسے بچا لیا ہے۔''

''تم نے ایس پی وجاہت قریشی کا رویہ دیکھا۔ مجھے اس میں جانب داری کی بو آ رہی تھی۔'' ماں نے جیسے میری رائے لینا چاہی۔

''میرا خیال ہے ماں! وہ اپنی جگہ درست کہہ رہے تھے۔'' میں نے پُر متانت لہجے میں کہا۔

ماں نے ذرا گردن موڑ کر قدرے چونکتے ہوئے میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ انہیں شاید مجھ سے ایسی تردید کی امید نہ تھی۔

''تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟'' ماں نے دوبارہ سامنے نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو پورا یقین ہے کہ تمہاری اس خونریز کارروائی کے بعد شاہ میر اور نظر حیات ہم سے بری طرح خوف زدہ ہو چکے ہیں اور وہ یہ جان گئے ہیں کہ اب ان دونوں کی باری ہے۔ اس لئے انہوں نے بڑی مکاری سے کام لیتے ہوئے ایس پی وجاہت قریشی اور کمشنر کو واشگاف لفظوں میں اپنے اس خدشے کے بارے میں آگاہ کر دیا ہے تاکہ انتظامیہ کے ذریعے ہم پر دباؤ ڈال سکیں۔''

''آپ کی یہ بات کسی حد تک درست ہو سکتی ہے۔'' میں نے بہ دستور سنجیدگی سے مختصراً کہا۔ ''لیکن ماں! ....ہمیں بہرحال دشمنوں کے خلاف سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہو گا۔''

''سوچنا کیا ہے؟ ....'' ماں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''اب سب سے پہلے شاہ میر کی باری آئے گی۔ میں پولیس انتظامیہ کی بلیک میلنگ سے خوف زدہ نہیں ہوں۔''

''لیکن باوجود اس کے ہمیں احتیاط کا دامن تھامے رکھنا ہو گا۔'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ ہماری جوابی کارروائی نے انہیں اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ ہم بھی ان کی زبان میں جواب دینا جانتے ہیں۔ اس لئے

وہ اب شاطرانہ چال پر اتر آئے ہیں۔''

''کیا تم نہیں چاہتے کہ نگینہ یتیم ہو.........؟'' ماں نے قدرے تلخی سے کہا۔ ان کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔

''یہ بات نہیں ہے ماں!'' میں نے برا منائے بغیر کہا۔ اور پھر ماں کی توجہ ایک اہم بات کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کرتے ہوئے مزید بولا۔ ''آپ یہ کیوں بھول رہی ہیں کہ کالا ناگ زندہ بچ چکا ہے اور وہ اس وقت پولیس کسٹڈی میں ہے اور یقیناً اس پہلو کو ہمارے دشمن ہمارے خلاف ٹارگٹ بناتے ہوئے پولیس پر کالا ناگ سے پوچھ گچھ کرنے کے لئے دباؤ ڈال سکتے ہیں اس لئے سب سے پہلے ہمیں کالا ناگ کا خاتمہ کرنا ہو گا۔ ورنہ ایک بار پھر ہمیں لمبی چوڑی قانونی کارروائی میں پھنسا دیا جائے گا۔''

میں اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ میری بات کا ماں پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ کیونکہ وہ خاموش ہو کر سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔

میں نے کن انکھیوں سے ان کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ ان کی سرخ و سپید فراخ پیشانی پر اُلجھن اور تشویش کا جال سا بُن گیا تھا۔ تب وہ بولی۔

''یہ کیسے معلوم ہو گا کہ کالا ناگ کو کہاں رکھا گیا ہے؟''

''اسے یقیناً پولیس کے پہرے میں لاہور کے کسی ہسپتال میں ایڈمٹ کیا گیا ہو گا۔ میں آج ہی لاہور کی طرف روانہ ہونا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے.........مجھے گرین لاج چھوڑ کر تم جیپ لے جاؤ۔'' ماں نے کہا۔ میں نے خاموشی سے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔ گرین لاج پہنچے تو ایک چونکا دینے والی خبر ہماری منتظر تھی۔

ٹال سے چند مزدور آئے تھے اور ہمارے انتظار میں بیٹھے تھے۔ پھر ہمارے وہاں پہنچتے ہی انہوں نے چونکا دینے والی اطلاع ہمیں دی کہ آج صبح پولیس نے ٹال کو سیل کر ڈالا ہے اور منیجر مشتاق سیال کو گرفتار کر کے لے گئی ہے۔ وجہ یہ تھی کہ ہمارے ٹال پر فاریسٹ کنزرویٹو آفیسر شاہ میر نے پولیس نفری کے ساتھ چھاپہ مارا تھا اور وہاں موجود عمارتی لکڑیوں اور شہتیروں کو غیر قانونی جنگل کی کٹائی سے چوری کا قرار دیا تھا۔

یہ سن کر میں نے غصے سے اپنے دانت بھینچ لئے۔ دشمن اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا تھا۔

''آخر بغیر ثبوت کے انہوں نے کیسے اتنی بڑی کارروائی کر ڈالی؟'' میں غصے میں بڑبڑایا تو ماں نے زہرخند کے ساتھ طنزیہ کہا۔

''یہ سب تمہاری خوش فہمی کی وجہ سے ہوا ہے۔ تم سمجھ رہے تھے، دشمن خوف زدہ ہو چکا ہے۔ یہ سب ان کو ڈھیل دینے کی وجہ سے ہوا ہے نادر بیٹے!''

ماں کے ریمارکس نے مجھے مزید جھلا دیا۔ تاہم میں نے کہا۔ ''ماں! پریشان نہ ہو۔ میں ابھی جا کر دیکھتا ہوں، اصل معاملہ کیا ہے۔'' یہ کہہ کر میں اسی وقت مزدوروں کے ساتھ اپنی جیپ میں مری کی طرف روانہ ہو گیا۔

❋❋❋

میں سب سے پہلے ٹال پہنچا۔ ٹال کے دیوہیکل چوبی گیٹ کو بند کر کے تالا لٹکا دیا گیا تھا۔ تالے پر سرخ رنگ کی سیل پگھلا کر چپکا دی گئی تھی۔

باہر سارے مزدور حیران و پریشان اور سوگوار کھڑے تھے۔ میں نے انہیں تسلی دی اور سیدھا متعلقہ

تھانے پہنچا۔

یہاں کا انچارج انسپکٹر شمس تھا۔ یہ وہی جلاد صفت شخص تھا جس نے مجھ پر ایک روز اس تھانے میں انسانیت سوز تشدد کیا تھا۔ نیز مجھے اڈیالہ جیل پہنچانے کا عزم بھی کیا تھا۔ مگر اس کا یہ خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا تھا۔

میں سیدھا اس کے کمرے میں پہنچا۔ وہ میز پر اپنی دونوں ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر چونکا، پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اب اس کی گھنی مونچھوں تلے زہریلی مسکراہٹ رقصاں ہو گئی۔

''آؤ نادر علی! .... بروقت آئے تم۔'' مجھے اس کے تیور کچھ اچھے نظر نہیں آ رہے تھے۔

''آپ نے میرا ٹال کیوں سیل کیا ہے؟ اور ہمارے منیجر مشتاق کو بھی لاک اپ کر دیا ہے۔ آخر کیوں؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور میرے قریب آ کر دانت پیس کر بولا۔

''تمہارے ٹال پر کنزرویٹو آفیسر شاہ میر کے ایما پر چھاپہ مارا گیا۔ کیونکہ تمہارے ٹال میں چوری کی لکڑی تھی۔''

''اس کا کوئی ثبوت ہے؟'' میں نے اپنے اندر کے اُبال پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے اسے پوچھا۔

''کیا کنزرویٹو آفیسر سے بڑا کوئی ثبوت ہو سکتا ہے؟'' وہ بولا۔

''آخر اس کے پاس بھی تو کوئی ثبوت ہو گا انسپکٹر!'' میں نے کہا۔

''ہاں .... تم نے ٹھیکے دار رمضان احمد سے جو خام مال لیا تھا اور اسے چیرنے کاٹنے کے بعد شہتیروں میں بدل دیا تھا، وہ جنگل کی غیر قانونی کٹائی سے حاصل کردہ تھا اور متعلقہ فاریسٹ آفیسر نے اس کی رپورٹ کنزرویٹو آفیسر شاہ میر کو دے دی تھی۔'' اس نے تفصیل سے جواب دیا تھا۔

میں ذرا سوچ میں پڑ گیا۔ اس حد تک تو یہ بات درست تھی کہ ہم نے کچھ روز قبل رمضان احمد ٹھیکے دار سے خام مال کے دو راکٹ ٹرک خریدے تھے مگر احتیاط کے پیش نظر میرا اصول تھا جو اس سے قبل ماموں کا تھا کہ پے منٹ یکمشت مگر تیسرے دن کی جاتی تھی۔ تو اس کا مطلب تھا کہ رمضان احمد نے ہمیں چوری کی لکڑی فراہم کی تھی۔

''ہو سکتا ہے آپ درست کہہ رہے ہوں۔'' میں نے معاملہ سمجھتے ہوئے معتدل لہجے میں کہا۔ ''ہم اسی لئے پے منٹ تین دنوں کے بعد کرتے ہیں۔ میں نے پے منٹ نہیں دی۔ دوسری بات یہ کہ رمضان احمد سے ہمارے معاملات برسوں پرانے ہیں۔ آج تک اس نے ہمیں چوری کا مال فروخت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے ساتھ بھی کوئی دھوکا ہوا ہو گا۔''

انسپکٹر شمس نے اس بات پر زہریلی مسکراہٹ سے میرے چہرے کا جائزہ لیا اور بولا۔ ''انسان کے ضمیر کو پلٹا کھانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے نادر علی خان! .... تحقیقات کی جا رہی ہیں۔ متعلقہ محکمے (محکمہ جنگلات) سے انکوائری رپورٹ آنے تک مزید گرفتاریاں بھی عمل میں آ سکتی ہیں۔''

''ٹھیک ہے .... میں تیار ہوں .... لیکن آپ پلیز! ہمارے منیجر کو تو رہا کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی میں آپ سے ٹال کی سیل کھولنے کی بھی درخواست کروں گا۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔

''بہت مشکل ہے .... حتمی رپورٹ آنے تک کسی کو رہا نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ٹھیکے دار رمضان احمد کو بھی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ شکر کرو کہ تمہیں ہتھکڑیاں نہیں لگائی گئیں۔'' وہ سرسراتے لہجے میں بولا۔

میں نے فوراً کینچلی بدلتے ہوئے نرم گفتاری سے کہا۔ ''آپ کی مہربانی .... لیکن آپ ہمارے

ہر کو تو رہا کر دیں۔ ٹال بے شک سیلڈ رہے۔''

''ٹھیک ہے .... پھر تم اپنے منیجر مشتاق کی جگہ سنبھال لو۔ اسے ہم باہر کر دیتے ہیں۔'' وہ طنزیہ ج میں بولا۔ میرے اندر دوبارہ طیش کی لہر اُبھری۔ مگر میری گرم مزاجی سے حالات بگڑ سکتے تھے۔ انسپکٹر شمس کے بارے میں مجھے پورا یقین تھا کہ وہ ہمارے دشمنوں سے مل چکا تھا۔ میرا اتنا خیر خواہ یا ہمدرد تھا کہ اب تک اس نے مجھے ہتھکڑیاں نہیں پہنائی تھیں۔

کیونکہ ابھی جرم ثابت نہ ہوا تھا اور تحقیق جاری تھی۔ چھاپے کے بعد جو گرما گرمی ہونا تھی، وہ ہو چکی نی۔ بہر طور میں نے اس سے منیجر مشتاق سے ملاقات کرنے کی اجازت چاہی، جو اس نے دے دی۔

میں لاک اپ کی طرف آیا۔ منیجر مشتاق سلاخوں کے عقب میں چپکا کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ےکسی کے ڈونگرے برس رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ داد و فریاد کے انداز میں بولا۔

''چھوٹے صاحب جی! یہ کیا ہو رہا ہے؟ .... میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

''میری سمجھ میں آ رہا ہے۔'' میں پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ''تم بالکل پریشان مت ہونا۔ میں تمہیں آج ں باہر نکال دوں گا۔''

''اچھا جی، کیا آپ مجھے گردن سے پکڑ کر سلاخوں کے بیچ سے ریشمی تھان کی طرح باہر نکالیں گے؟''

''نہیں بے وقوف! میں تمہاری ضمانت کی کوشش کروں گا۔'' میں نے کہا۔

''چھوٹے صاحب! ضمانتیں شمانتیں تو عادی مجرموں کی ہوتی ہیں .... میں تو ایک سیدھا سادھا اور ریف بندہ ہوں۔''

''تم فکر نہ کرو، میں کچھ کرتا ہوں۔'' میں نے اسے تسلی دی اور تھانے کی عمارت سے باہر آ گیا۔ پھر ہی جیپ کے قریب آ کر اپنے سیل پر اعظم خان سے رابطہ کرنے لگا، انہوں نے مجھے تسلی دی کہ سر دست منیجر کی ضمانت ہی کروا سکتے ہیں .... باقی معاملات بعد میں طے ہوتے رہیں گے۔ میرے لئے یہی ہت تھا۔

پھر میں نے گرین لاج میں ماں سے بھی رابطہ کر کے انہیں بھی آگاہ کر دیا۔

دشمنوں نے ہمیں اب ایک نئی پریشانی میں ڈال دیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا، شاہ میر اور نظر حیات دونوں ی بھگت سے ہمارے خلاف ایک ایسی سازش کے تانے بانے بننے میں مصروف ہو چکے ہیں جس سے وہ دونوں مردود ہمیں، معاشی طور پر بالکل تنگ دست کر سکیں۔ گویا وہ ہمیں اقتصادی اور معاشی طور پر کمزور کرنے کے ٹاسک پر کام کر رہے تھے۔ پہلے ٹال کی آتشزدگی عمل میں لائی گئی جس سے ہمیں لاکھوں کا نقصان ہوا تھا، پھر ٹال کی نئے سرے سے تیاری ہوئی اور اب ٹال پر چھاپا پڑوا کر اسے سیل کر دیا گیا تھا۔ تھوڑا بہت بینک بیلنس تھا، وہ ٹال کی نئے سرے سے تعمیر میں خرچ ہو چکا تھا۔

اب روز کی آمدنی سے کچھ رہی ہوئی ادائیگیاں آہستہ آہستہ کر کے عمل میں لائی جا رہی تھیں۔ اگر ٹال ی طرح کچھ عرصہ مزید سیل رہتا تو ٹھیکے دار پارٹیاں ہمیں مال سپلائی کرنا تو بند کر ہی دیتیں، ساتھ ہی پے نٹ وغیرہ کی ادائیگی کے سلسلے میں بھی ان کا دباؤ بڑھتا جاتا۔

ادھر کالا ناگ کے زندہ بچ جانے اور اس کے پولیس کی کسٹڈی میں علاج و معالجے کی اطلاع نے ے پریشان کر رکھا تھا۔ اور یہی نہیں .... بلکہ ایس پی وجاہت قریشی نے بھی اشاروں کنایوں میں ے تہدید بھی کر دی تھی، جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ جیسے ہی کالا ناگ بیان دینے کے قابل ہوا، مجھے بھی فتار کیا جا سکتا تھا۔ علاوہ ازیں میرا اپنی ماں سے نگینہ کے سلسلے میں الگ اختلاف چل رہا تھا۔ ان پے

در پے پریشانیوں اور اُلجھن آمیز سوچوں نے مجھے بری طرح اعصاب زدہ کر کے رکھ دیا تھا۔

نگینہ سے متعلق وادی کیلاش کی دشوار گزار مہم بھی اب مجھے التوا کا شکار نظر آنے لگی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے میں شاہ میر اور نظر حیات کی برق رفتار دشمنی کا خاطر خواہ طریقے سے مقابلہ نہ کر پا رہا ہوں۔ اس کی وجہ کیا تھی؟........ ماں سے میرا نگینہ کے متعلق اختلاف، میری تساہل پسندی پھر........ نگینہ!

بہر طور میں واپس گرین لاج آ گیا۔

سکینہ (فضل چاچا کی بیوہ) نے مجھے بتایا کہ ماں اپنے کمرے میں ہیں اور مجھے بلایا ہے۔

میں ڈرائنگ روم سے ہو کر ماں کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا تھا کہ اچانک قریب رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں ذرا چونک کر رکا۔ پھر ٹیلی فون کی طرف بڑھا اور ریسیور کان سے لگا کر ہیلو کہا تو دوسری طرف سے نگینہ کی آواز اُبھری۔

''نادر صاحب........!'' اس کی آواز سنتے ہوئے مجھے اپنی سماعتوں پر دھوکا ہونے لگا۔ میرا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ تاہم دوسرے ہی لمحے میں نے کہا۔

''نگینہ! میں نادر بات کر رہا ہوں۔ کک........ کیا تم نے مجھے پہچان لیا؟''

میرے مجبور لہجے میں بچوں کی سی امید تھی۔ دوسری طرف سے نگینہ کی سپاٹ آواز اُبھری۔

''مسٹر نادر! تم مجھے اغواء کرنا چاہتے ہو؟'' اس کی بات پر جیسے کسی نے میرا دل مٹھی میں بھینچ لیا۔ دکھ کے ساتھ مجھے حیرت کا شدید جھٹکا بھی لگا۔ میں نے بہ مشکل کہا۔

''یہ........ یہ تم سے کس نے کہہ دیا؟''

''مجھے بہلانے کی کوشش مت کرو مسٹر!'' نگینہ نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''میری بات کان کھول کر سن لو، میں تمہارے گھناؤنے عزائم کے بارے میں آگاہ ہو چکی ہوں۔ اگر تم نے دوبارہ مجھ سے بات کرنے کی یا میرے سامنے آنے کی ذرا بھی کوشش کی تو میں فوراً پولیس کو مطلع کر دوں گی۔ سمجھے تم؟'' انتہائی نفرت انگیز اور غصیلے لہجے میں اس نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

میں پاگل دیوانوں کی طرح ''ہیلو!........ ہیلو!'' کرتا رہ گیا لیکن دوسری جانب مسلسل ٹون کی بے رحم اور سپاٹ آواز پر بالآخر میں نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ میرے دل و دماغ کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔

نگینہ کے سرد اور غصے بھرے لفظوں کی چبھن برچھیوں کی طرح میرے اندر کو گھائل کیے دے رہی تھی۔ میں نے بہ مشکل خود پر قابو پایا اور غیر جذباتی ہو کر ٹھنڈے دل و دماغ سے حالات اور نگینہ کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ صاف ظاہر تھا کہ اسے بدخصلت کبیر نے یہ بات بتا دی تھی کہ میں اسے اپنے ساتھ کہاں لے جانا چاہتا تھا۔ مگر اس انداز میں کہ نگینہ اسے اپنی بھلائی کی بجائے اغواء پر محمول کرنے لگی تھی۔

اس کا مطلب تھا کہ کبیر والا مہرہ بھی میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نے یہ گمبھیر معاملہ مزید بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ میرا یہ خدشہ درست نکلا تھا کہ اسے اب میری بلیک میلنگ کی چنداں پروا نہیں رہی تھی۔ وہ جان چکا تھا کہ میں اس کے شرم ناک کرتوت کسی کے سامنے نہیں لانا چاہتا۔ یقیناً یہ احمقانہ حرکت مسز جواد سے ہوئی ہو گی۔ اس نے میرے منع کرنے کے باوجود شاید اس سے ذکر کر دیا تھا۔ مجھے یہ بھی یقین ہونے لگا کہ اس نے یہ بات بھی کبیر سے کہہ دی ہو گی کہ میں یہ راز محض ایک شریف اور معذور شوہر کی بیوی کو راہ راست پر لانے کے لئے آشکارا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

صورتِ حال کچھ اُلجھ سی گئی تھی۔ ماں کا نگینہ سے متعلق الٹی میٹم، ٹال پر چھاپہ اور منیجر مشتاق سیال کی

گرفتاری، ایس پی وجاہت قریشی کی پراسرار دھمکیاں، کالا ناگ کا زندہ بچ جانا اور اس کا پولیس کسٹڈی میں ہونا، نگینہ کا گمبھیر مسئلہ اور اب نگینہ کا مجھے سخت لفظوں میں فون کرنا........ یہ تمام واقعات صورتِ حال پیچیدہ سے پیچیدہ تر کیے جا رہے تھے۔ حالات کی پیچیدگی نے میرے اعصاب پر برا اثر ڈالا تھا۔ دباؤ بڑھنے لگا تھا۔

اس دباؤ سے چھٹکارا پانے کے لئے میں نے ایک گلاس پانی پیا۔ اپنے اعصاب کو پُرسکون کرنے کی غرض سے بیڈ پر دراز ہو گیا۔ سب سے پہلے یہ تجزیہ کیا کہ ان میں جو سب سے اہم مسئلہ تھا اس پر توجہ دینی چاہئے اور وہ اہم مسئلہ نگینہ کا تھا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں حیرت انگیز طور پر خود کو پُرسکون محسوس کرنے لگا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ دیگر معاملات اعظم صاحب کے سپرد کر کے میں خود کسی نہ کسی طرح نگینہ کو ساتھ لے کر وادی کیلاش کی طرف نکل جاؤں۔ اس کیلاشی عامل عاروب کا مجھے کبیر کی زبانی علم ہو چکا تھا کہ وہ وادی کیلاش کے ایک مخصوص گروہ کا روحانی پیشوا تھا جو کلاشی آگرم میں آباد تھا۔ چونکہ وہ مشہور شخصیت تھا اس لئے اسے وہاں تلاش کرنا چنداں مشکل نہ ہوتا۔

''نادر........!'' اچانک میری سماعتوں سے ماں کی سپاٹ آواز ٹکرائی۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ ماں دروازے پر کھڑی تھیں۔ میں احتراماً اٹھ کھڑا ہوا۔ نگینہ کے اچانک اور غیر متوقع فون پر میں بھول ہی گیا تھا کہ ذرا دیر پہلے سکینہ نے مجھ سے کہا تھا کہ ماں نے مجھے بلایا تھا۔

''میں نے تمہیں بلایا تھا........'' ماں نے اس طرح سپاٹ لہجے میں دوبارہ مجھ سے کہا تو میں شرمندہ ہو کر بولا۔

''معافی چاہتا ہوں ماں! دراصل وہ اچانک ایک فون آ گیا تھا۔''

''کس کا فون تھا؟'' ماں نے بہ غور میرے چہرے پر نظریں جما کر پوچھا۔ میں بری طرح سٹپٹا گیا مگر پھر فوراً ہی بولا۔

''نگینہ کا۔''

''اوہ........'' ماں نے ہولے سے کہا۔ ان کی مختصر سی ''اوہ'' میں طنز کی گہری کاٹ تھی۔ ''ظاہر ہے، پھر تو تم نے اپنی ماں کو بھلانا ہی تھا۔'' ماں کے اس کاٹ دار جملے نے مجھے چیر کر رکھ دیا۔

''نہیں ماں! ایسی بات نہیں تھی۔ دراصل وہ........'' میں نے کہنا چاہا مگر ماں نے میری بات کاٹ کر کہا۔

''چھوڑو یہ فضول تاویلیں........ تم یہ بتاؤ کہ منیجر مشتاق سیال کی ضمانت کے سلسلے میں تم نے کچھ کیا........؟''

میں ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''میں نے تھانے جا کر انسپکٹر اعجاز شمس سے ملاقات کی تھی۔''

''تمہیں اس کے پاس جانے کی کیا ضرورت تھی؟'' ماں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تمہیں تو فوراً حامد ہمدانی سے ملاقات کرنی چاہئے تھی۔ لیکن تم تو کہیں اور ہی الجھے ہوئے ہو۔ دشمن کی بیٹی نے تمہارے دل و دماغ حتیٰ کہ تمہاری غیرت کو بھی زنگ لگا دیا ہے۔ تمہارے دل سے اپنوں کی بھلائی، باپ کا بے گناہ خون سب کچھ مٹا کر رکھ دیا ہے۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ تمہارے جیسا گبھرو بیٹا، جس پر مجھے ہمیشہ فخر تھا، دشمنوں کی اس حسین مگر گھناؤنی چال میں آ چکا ہے۔'' ماں کے ان بے رحم فقروں نے مجھے چھلنی کر ڈالا تھا۔ وہ حقیقت نہیں جانتی تھیں اور نہ ہی سننا چاہتی تھیں۔

میں نے تڑپ کر کہا۔ ''ماں! ایسا مت کہو........ میں کچھ نہیں بھولا ہوں۔ نگینہ دشمنوں کی گہری

سازش کا شکار ہوئی ہے۔ انہوں نے اس کا برین واش کرا دیا ہے۔''

''ہونہہ......... برین واش۔'' ماں نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔ پھر چند قدم چل کر میرے قریب پہنچ کر مجھے عجیب مسکراتی نظروں سے دیکھنے لگیں۔ لمحاتی توقف کے بعد انہوں نے لب کشائی کی اور سنجیدگی سے بولیں۔ ''نادر بیٹے! میں نے اپنی زندگی کے پچیس سال جیل کی سلاخوں کے پیچھے ادھڑے ہوئے پلستر کی سیلن زدہ دیواروں کو گھورتے ہوئے یا ننگی اینٹوں کے غلیظ فرش پر بیٹھ کر ہی نہیں گزارے۔ بلکہ مصائب و آلام کی دھوپ میں جلتی سلگتی رہی ہوں۔ اپنے بہادر اور غیرت مند شوہر کی بیوہ ہونے پر بھی مجھے آج بھی فخر ہے، اس بے گناہ کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لئے میں نے خود کو حالات کی بھٹی میں کھولا کر فولاد میں ڈھالا ہے۔ اس لئے اپنے سینہ سوزاں میں بھڑکتی ہوئی آتش انتقام کا احساس بھی صرف میں ہی کر سکتی ہوں نادر! مجھے یہ خوش فہمی تھی کہ میری انگارا کوکھ میں پلنے والا تخم بہادر نے گوشت پوست کی کوکھ سے نہیں بلکہ کھولتے ہوئے لاوے سے جنم لیا ہے۔ اور مجھ سے زیادہ اس کے اندر انتقام کی آگ اور جوش غیرت کا سمندر موجزن ہوگا۔ لیکن افسوس......... صد افسوس.........'' ماں نے تاسف سے سر ہلاتے ہوئے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ مگر مجھے اس کے مفہوم تک پہنچنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ اپنی ماں کی حالت نے مجھے بھی سسکا دیا تھا۔ میرے لبوں سے بھی سسکتی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔

''ماں!.........بس کر۔''

''میں کیا بس کروں نادر!......... تمہیں تو دشمن کی بیٹی نے محبت کی چوڑیاں پہنا کر نامرد کر ڈالا ہے۔'' الفاظ نہیں تھے گویا پگھلا ہوا سیسہ تھا جو ماں نے میرے کانوں میں انڈیلا تھا۔

میں پھر چلایا۔ ''ماں!.........اب بس کر دے۔''

''ہاں.........واقعی مجھے بس کر دینا چاہئے۔ تم تو اب کسی اور دنیا کے باسی ہو چکے ہو۔ جہاں تمہاری ماں کا کوئی گزر نہیں ہے۔ بیٹا! کچھ بھی ہو جائے، مگر تُو میرا لختِ جگر ہی رہے گا۔ ٹھیک ہے، تجھے اپنی دنیا مبارک ہو۔ ابھی میرے حوصلے جوان ہیں۔ میرا جوشِ انتقام ابھی سرد نہیں ہوا ہے۔ میں تیرے باپ کے قاتلوں سے اپنے بل بوتے پر نمٹنا جانتی ہوں۔ اور یقیناً ان سے اس کا انتقام لے ہی لوں گی۔''

ماں نے اس بار قدرے متحمل لہجے میں کہا۔ پھر خاموشی سے لوٹ گئیں۔

میں اپنی جگہ جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔ میری آنکھوں میں جھلملاہٹ ابھر آئی تھی۔ دل مغموم ہو گیا تھا۔ ماں کے جلتے سلگتے الفاظ نے میرے دماغ کی نسوں تک کو گویا چیر ڈالا تھا۔ میرے جی میں آئی کہ ماں کو اپنی غیرت اور بہادری دکھا دوں اور شاہ میر اور نظر حیات کو ابھی جا کر گولیوں سے بھون ڈالوں۔ لیکن میں ماں کو کیسے سمجھاتا کہ ایسے انتقام سے کیا فائدہ کہ سانپ بھی نہ مرے اور لاٹھی بھی ٹوٹ جائے۔ جبکہ دشمنوں نے تو ہماری لاٹھی پہلے ہی توڑ رکھی تھی۔ انتقام کا مزہ تو تب آتا کہ لاٹھی بھی نہ ٹوٹے اور سانپ بھی مر جائے۔ اگرچہ میرے نزدیک دشمنوں کے لئے موت کی سزا بھی معمولی تھی۔ میں انہیں موت سے پہلے موت کے عذاب میں مبتلا کرنا چاہتا تھا۔ ان کی شاہانہ زندگی کو سسکانا چاہتا تھا نہ کہ موت کی نیند سلا کر انہیں سسکتی بلکتی زندگی سے چھٹکارا دلاتا۔ لیکن ماں کو نگینہ کے حوالے سے غلط فہمی ہوگئی تھی۔ میں اسے کیا بتاتا کہ اس نے جیل کی سلاخوں کے پیچھے سیلن زدہ فرش پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ایک تخم بہادر کو ہی جنم دیا ہے۔ کسی مردک کو نہیں۔ نگینہ کے بارے میں ماں کا یہ خیال تھا کہ یہ دشمن کے خلاف میرے سینے میں بھڑکتی ہوئی آتش انتقام کو سرد کرنے کی حسین چال تھی اور یہ غلط فہمی ماں کے دل میں اس وقت پروان

چڑھی تھی جب نگینہ نے اپنے باپ شاہ میر کے خلاف گواہی واپس لے لی تھی اور اس کے پاس رہنا قبول کر لیا تھا، نیز مجھ سے بھی منہ موڑ لیا تھا۔

مگر یہ اذیت ناک حقیقت صرف اور صرف میں ہی جانتا تھا کہ نگینہ کا اس طرح اچانک ہمارے خلاف پلٹا کھانے کی اصل اور بنیادی وجہ کیا تھی؟

میں مسہری پر گر سا گیا۔ باریک بینی سے حالات کا تجزیہ کیا اور یہی فیصلہ کیا کہ مجھے جوش کی بجائے ہوش سے کام لینا چاہئے۔ میں نے ماں کے دل سے نگینہ کے متعلق غلط فہمی نکالنے کا تہیہ کیا۔ میں نے ایک لائحہ عمل ترتیب دے دیا تھا۔ میں اب اس پر عمل پیرا ہونا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ نگینہ اصل حالت میں لوٹنے کے بعد اپنے قاتل باپ کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرے گی اور سیدھی میرے پاس چلی آئے گی۔ لہٰذا یہی بہتر تھا کہ میں فی الوقت تمام باتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے صرف اور صرف نگینہ کے پراسرار معاملے پر اپنی توجہ مرکوز کر دوں۔

کبیر والا مہرہ ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اب جو کچھ کرنا تھا، مجھے ہی کرنا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں اعظم صاحب سے ملاقات کرنا ضروری سمجھا۔ وہی ایک واحد شخصیت تھے جو میرا دکھ سمجھتے تھے اور میرے حالات کا ادراک رکھتے تھے۔ انہیں میرے اور ماں کے بیچ حائل ہونے والی ان دیکھی خلیج کا بھی علم ہو چکا تھا۔ میں نے ان کی رہائش گاہ پر جا کر پورے دو گھنٹے تفصیلی ملاقات کی۔ تمام حالات سے واقف ہونے کے بعد انہوں نے میرے لائحہ عمل کی تائید کی۔

''نادر بیٹے! تم بے غم ہو کر سب سے پہلے نگینہ والا معاملہ حل کرنے پر توجہ دو......... باقی معاملات میں سنبھال لوں گا۔ اور شبینہ کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔'' انہوں نے مربیانہ لہجے میں مجھے تشفی دیتے ہوئے کہا۔ ان کی حوصلہ افزائی نے میرے ارادوں کو مہمیز دی اور میں ان کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے روانہ ہو گیا۔

میں اب ایک لمحے کی بھی دیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسلام آباد کے بکنگ آفس سے چترال کے لئے دو ٹکٹ لئے۔ بکنگ میں نے دو دن بعد کی کروائی تھی۔ اب مسئلہ نگینہ کو ساتھ لے جانے کا تھا۔ اس کا حل میں نے سوچ رکھا تھا۔ پھر جس روز صبح میری اسلام آباد ایئرپورٹ سے روانگی تھی، اسی شب میں نے پنڈی کا رخ کیا۔ میں بذریعہ ہائی ایس مسافر ویگن پر شام چھ بجے پنڈی پہنچا تھا۔

تین چار گھنٹے میں نے مٹرگشت کرتے ہوئے اِدھر اُدھر گزارے۔ پھر رات نو بجے میں نے ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں کمرہ لیا اور ایک بار پھر اپنے منصوبے پر غور کرنے لگا۔ میرے پاس بھرا ہوا بیگارڈ پستول تھا۔ میرا منصوبہ بہت خطرناک تھا۔ مگر میں نے اپنے طور سے کسی چھوٹے سے سقم کو نظرانداز نہیں کیا تھا۔

رات کے تقریباً دو بجے میں ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ پورا شہر سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ میرا رخ شاہ میر کی کوٹھی کی طرف تھا۔ کوئی سواری نہ تھی لیکن میں نے ابتداء ہی سے یہ دانش مندی کی تھی کہ ایسے ہوٹل میں کمرہ لیا تھا جو شاہ میر کی کوٹھی سے پیدل کے فاصلے پر تھا۔

بہرطور میں چلتا ہوا اس پوش علاقے تک پہنچا جہاں شاہ میر کی کوٹھی تھی۔ چند بلاک چھوڑ کر جب میں مطلوبہ کوٹھی کے قریب پہنچا تو ٹھٹکے بغیر نہ رہ سکا۔ کوٹھی کے باہر دو مسلح گارڈز چوکس کھڑے تھے۔ میں نے اپنے دانت بھینچ لئے۔ کبیر یقیناً میری حکمت عملی کا اندازہ لگا چکا تھا اسی لئے اس نے شاہ میر اور نگینہ کو اس خطرے سے آگاہ کر دیا ہوگا۔ (اگرچہ اس نے اصل بات سے انہیں آگاہ نہیں کیا ہوگا)

میں نے اس پر ماتم کرنے کی بجائے صورتِ حال پر قابو پانے کا سوچا۔ میرے پاس اپنا آزمودہ میگارڈ موجود تھا جس پر میں نے سائلنسر چڑھا رکھا تھا۔ لیکن میں ان حالات میں ذرا سی بھی خون ریزی کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ سب کام مجھے انتہائی خاموشی، ہوشیاری اور رازداری کے ساتھ نمٹانا تھے۔ شاہ میر کی کوٹھی پر تعینات ان دونوں مسلح گارڈز پر شور شرابے کے بغیر پابو پانا ضروری تھا۔ ایک قریبی تاریک گوشے میں سمٹ کر میں نے اپنے اطراف کا بہ غور جائزہ لیا۔ ان دونوں گارڈز پر نظریں جما دیں۔

اسٹریٹ لیمپس روشن تھے جس سے آس پاس کا ماحول خاصی حد تک روشن تھا۔ تاہم ان دونوں کے علاوہ دور تک کوئی ذی نفس نظر نہ آتا تھا۔ ان کا پہرہ دینے کا انداز بڑا منظم تھا۔ اپنے منجھے ہوئے انداز و اطوار سے ظاہر ہوتا تھا کہ دونوں کسی پرائیویٹ سکیورٹی ایجنسی کے باقاعدہ تربیت یافتہ گارڈز تھے۔ ان کے جسموں پر چست خاکی وردی تھی اور پیروں میں لانگ بوٹ۔ سر پر پی کیپ تھی اور کاندھوں پر حد نظر تک مار کرنے والی ایم پی فائیو رائفلیں تھیں۔ ان دونوں میں سے ایک گیٹ کے سامنے کھڑا ہوتا جبکہ دوسرا کوٹھی کے سامنے تقریباً بیس قدم دائیں اور پھر بیس قدم بائیں گشت لگاتا۔ اس دوران اس کی عقابی نگاہیں چہار اطراف میں گردش کرتی رہتیں۔ جبکہ اس کا دوسرا ساتھی گارڈ گیٹ کے سامنے کھڑا اپنے ساتھی کو ٹریس کر رہا ہوتا۔ اس طرح پھر دوسرے کی باری آتی۔ مجھے اب بیک وقت دونوں پر قابو پانا تھا۔ میں نے بہ غور شاہ میر کی کوٹھی کی آخری حد کا جائزہ لیا۔ تب میں نے دیکھا، جہاں گشت لگانے والے گارڈ کی حد ختم ہوتی تھی، اس سے محض چند قدم کے فاصلے پر کوٹھی کی بیرونی دیوار کے قریب ایک تنگ سا گلیارا تھا۔ کچھ سوچ کر میں واپس پلٹا اور عقب سے ہوتا ہوا اس تنگ گلیارے میں آ گیا اور دیوار سے چپکا چپکا اگلے سرے تک جا پہنچا۔ پھر ذرا سر ابھار کر دیوار کی آڑ سے دیکھا تو وہ گارڈ اپنا مختصر سا گشت پورا کر کے لوٹ رہا تھا۔ میں نے دیکھا، وہ گیٹ پر جا کھڑا ہوا۔ دونوں گارڈ تھوڑی دیر تک وہاں بچھی دو فولڈنگ چیئرز پر بیٹھے سگریٹ پیتے رہے پھر اس کے بعد دوسرا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے پہلے بائیں طرف کا گشت پورا کیا، پھر گیٹ کے سامنے سے چلتا ہوا میری سمت آنے لگا۔ میں نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پایا اور ایک پتھر اٹھا لیا۔ پھر جیسے وہ گارڈ اپنا دائیں طرف کا گشت پورا کر کے واپس لوٹنے لگا تو میں نے وہ پتھر اس کی طرف اچھال دیا۔ وہ ٹھٹک کر مڑا، پھر اس گلیارے کی طرف دیکھتا ہوا محتاط انداز میں قریب آنے لگا۔ میں مزید اندر کی طرف تاریکی میں ہو گیا۔ اور پھر جیسے ہی وہ گلیارے کے سامنے پہنچ کر رکا اور اندر کی نیم تاریکی میں کچھ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا، میں نے اپنے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکالنا شروع کر دیں۔ وہ اپنی آنکھیں سکیڑتا ہوا مزید قریب آیا تو میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اس کی گردن ناپ لی اور اپنے میگارد پستول کا فولادی دستہ اس کی کنپٹی پر بجا دیا۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی کراہ خارج ہوگئی اور وہ تیورا کر گرا۔ اس دوران اس کا دوسرا ساتھی اسے پکارتا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے شاید خطرہ محسوس کر لیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس نے اب اپنے کاندھے سے گن اتار کر اپنے ہاتھوں میں پکڑ لی تھی۔

میں اب اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ ''کون ہے یہاں؟ باہر نکلو، ورنہ گولی چلا دوں گا۔'' وہ رائفل کی نال ہلاتے ہوئے دبنگ لہجے میں للکارا۔ مگر میں خاموشی سے تاریکی میں دیوار سے چپکا کھڑا رہا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ابھی اندھیرے میں گولی نہیں چلا سکتا تھا۔ میں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

''ادھر آؤ .... مجھے سس .... سانپ نے ڈس لیا ہے۔'' میں نے دانستہ ایسی آواز میں کہا کہ وہ شبہ نہ کر سکے۔ کیونکہ ایک تو اس نے مجھے ابھی تک نہ دیکھا تھا، پھر دوسرے یہ کہ اس سمت میں اس کا ساتھی داخل ہو کر اس کی نظروں سے اوجھل ہوا تھا۔ وہ یہی سمجھا کہ ضرور اسکا اپنا ہی ساتھی کسی تکلیف میں

ہو گیا ہے۔ یوں وہ میرے اندھیرے میں چلائے ہوئے تیر کا شکار ہو گیا اور تیزی کے ساتھ گلیارے اندر داخل ہوا تو میں نے اس کے ساتھ بھی پہلے والے جیسا سلوک کیا۔ دونوں کو زیر کرنے کے بعد تیزی سے آگے بڑھا۔ گیٹ کا ذیلی دروازہ کھلا تھا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ پختہ روش کے دائیں بائیں لان تھا جہاں ذرا ذرا فاصلے پر چند آہنی پایوں پر دودھیا گلوب روشن تھے۔ میں یہاں پہلے بھی آ چکا اس لئے مجھ سے کوٹھی کا اندرونی محل وقوع پوشیدہ نہ تھا۔ میں گھنے پودوں اور بیلوں کی آڑ لیتا ہوا آگے بڑھنے لگا تو اچانک مجھے اپنی دائیں جانب ایک ہولناک غراہٹ سنائی دی۔ میں بری طرح ٹھٹک کر رک گیا اور آواز کی سمت دیکھا تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میرے سامنے صرف چند قدموں کے فاصلے پر ایک دیو ہیکل جسیم کتا کھڑا میری طرف خوفناک چمکتی ہوئی نظروں سے گھور رہا تھا۔ یہ السیشن کتا تھا۔ اسے بھونکنے کی عادت سے زیادہ اپنے شکار پر جھپٹنے کی عادت تھی۔ اس کی خونخوار تھوتھنی سے شکاری دانتوں کی خوفناک قطار نمایاں تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا، اس نے دوسری بار غرا کر مجھ پر جست لگا دی۔ میں نے اپنے حواس بحال رکھے اور غیر ارادی طور پر دفاع کے لئے اٹھنے والے میرے دونوں ہاتھوں کا شکنجہ اس کی گردن پر کس گیا۔ اگرچہ میں اس کے اچانک جھپٹنے سے گھاس پر پشت کے بل گر گیا تھا مگر میں نے اس کی گردن پر اپنے دونوں ہاتھوں کے شکنجے کی گرفت ڈھیلی نہ کی تھی۔ وہ میرا نرخرہ بھنبھوڑنے کے چکر میں تھا اور میں جانتا تھا کہ اگر ایک بار میرا نرخرہ اس کے لمبے لمبے شکاری دانتوں میں آ گیا تو اسے ادھیڑنے میں مطلق دیر نہیں لگائے گا۔ نیز وہ اپنے اگلے دو پنجوں سے میرے سینے کو بھی ادھیڑنے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے لمبے لمبے، نوکیلے ناخنوں نے میرے سینے کو چھیل کر رکھ دیا تھا۔ پھر جیسے مجھ پر جنون سوار ہو گیا۔ میں غضب کی پھرتی کے ساتھ اپنے دائیں بازو کو اس کی گردن کے گرد حمائل کر کے ہاتھ کا زور دائیں بازو میں متوازن کرتے ہوئے پہلو کے بل ہو گیا اور اس کی گردن اپنے ''آرم'' کے زور پر دباتا چلا گیا۔ اس کے حلق سے اُبلنے والی کریہہ غراہٹیں یکلخت معدوم ہونے لگیں۔ اور ذرا ہی دیر بعد وہ ڈھیلا پڑ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ میں نے ایک گہرا سانس خارج کر کے اسے گھنے پودوں کی طرف اچھال دیا۔ میری شرٹ پھٹ گئی تھی اور سینے میں خراشوں کے سبب جلن سی ہو رہی تھی۔ چند ثانیے لمبے سانس لینے کے بعد میں آگے بڑھا۔

کوٹھی کا وسطی محرابی دروازہ بند تھا۔ البتہ بالکونی کے قریب نیچے کھڑی انٹرکولر چھت پر آ کر میں بالکونی پھلانگ گیا۔ اندر مختصر سے تاریک کوریڈور میں کھلنے والے دروازے کے ذریعے داخل ہو کر میں نے باری باری کمروں میں جھانکنا شروع کر دیا۔ پہلے دو کمرے خالی تھے۔ البتہ یہ خواب گاہیں تھیں۔ اسی دوران مجھے خیال آیا کہ میری شرٹ تار تار ہو چکی ہے۔ ہوٹل واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں خاموشی سے ایک کمرے میں داخل ہوا اور الماری میں خوش قسمتی سے مجھے ایک شرٹ مل گئی۔ تیسرے روم میں مجھے زیرو پاور کے بلب کی نیلگوں روشنی میں نگینہ اپنے بیڈ پر گہری نیند سوئی نظر آ گئی۔ نگینہ کو بے خبر سویا پا کر میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ مجھے اس کے سکون میں خلل ڈالنے پر دکھ بھی ہوا۔ لیکن پھر میں نے خود کو تسلی دی کہ میں یہ سب اسی کی بھلائی کی خاطر کر رہا ہوں۔ وہ محبت کو، مجھے بھلا چکی تھی۔ کبیر جیسا شیطان صفت سنپولیا اس سے عنقریب منگنی کی تیاریاں کر رہا تھا۔ نگینہ اور میرے ساتھ بہت گھناؤنا فریب تھا اور میں نگینہ کو، اپنی محبت کو بچانا چاہتا تھا، ہر ممکن طریقے سے۔ میرے پاس وقت کم تھا۔ میں نے جی کڑا کر کے اپنا سائلنسر لگا میگارد نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور آگے بڑھا۔ مجھے اپنا دل مضبوط کرنا تھا۔ ذرا بھی جذباتی لڑکھڑاہٹ کھیل بگاڑ سکتی تھی۔ اس کے قریب

پہنچ کر میں نے اسے زور سے جھنجھوڑا۔ میرا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ اور پھر وہ جیسے ہی ہڑبڑا کر اٹھی میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا کہ کہیں وہ مجھے دیکھ کر غیر ارادی چیخ نہ مار بیٹھے۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ ان سرمگیں اور مدھ بھری آنکھوں میں میرے لئے محبت کا سمندر موجزن ہوتا تھا مگر آج وہ محبت جیسے عنقا ہو گئی تھی۔ بہرطور میں نے دل پر جبر کر کے اسے خونچکاں نظروں سے گھورا اور غرا کر بولا۔

''خاموش!......... آواز نہ نکالنا۔ ورنہ یہ پستول دیکھ رہی ہو، اس میں سے خاموش گولی نکل کر تمہاری کھوپڑی میں پیوست ہو جائے گی۔ میں ہاتھ ہٹا رہا ہوں، اوکے۔''

اس کی آنکھوں میں سراسیمگی اُتر آئی تھی۔ پھر اس نے ہولے سے اپنا سر ہلایا تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ اس کے دہن سے اپنا ہاتھ ہٹایا تو وہ گھٹی گھٹی سی، خوف زدہ آواز میں بولی۔

''تت.........تت.........تم کک.........کیا چاہتے ہو؟''

میں نے اسے مزید خوف زدہ کرنے کی خاطر جبراً اپنے ہونٹوں پر خونخوار مسکراہٹ سموتے ہوئے کہا۔

''مجھے رقم چاہئے۔''

''تت.........تمہیں.........جو کچھ چاہئے.........وہ.........وہ لے لو۔ پلیز! مم.........مجھے چھوڑ دو۔'' وہ سراسیمہ لہجے میں بولی۔

میں نے زہریلی مسکراہٹ سے کہا۔ ''مجھے معمولی رقم نہیں، پورے پینتیس لاکھ درکار ہیں۔ جو تمہارا باپ تاوان کی صورت میں مجھے دے گا۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ اٹھو، میرے پاس وقت بہت کم ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے اسے بازو سے پکڑ کر بیڈ سے اٹھا دیا۔

''تت.........تم مجھے کک.........کہاں لے جانا چاہتے ہو؟'' وہ لکنت زدہ لہجے میں بولی۔

''جہاں تمہیں لے جانا چاہتا ہوں، وہاں بہت جلد تمہارا باپ نوٹوں سے بھرے ہوئے بریف کیس سمیت پہنچ جائے گا۔ چلو میرے ساتھ۔'' پھر میں نے کہا۔ ''میں تمہیں ذرا بھی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ مجھے صرف اور صرف دولت سے غرض ہے۔ لیکن اگر تم نے ذرا سی بھی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو یہ پستول دیکھ رہی ہو، اس پر سائلنسر لگا ہوا ہے۔ فائر کی ذرا سی بھی آواز نہیں اُبھرے گی اور تم اگلے جہان میں پہنچ جاؤ گی۔ چلو اب۔'' وہ بری طرح خوف زدہ ہو گئی تھی اور یہی میں چاہتا تھا۔

بہرطور میں اسے لے کر جلدی سے باہر آ گیا۔ ہر طرف سناٹے کا راج تھا۔ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا تیز تیز قدموں سے ایک طرف چل پڑا۔ فی الوقت میں نگینہ پر اپنا یہی تاثر قائم کرنا چاہتا تھا کہ میں تاوان کی صورت میں اس کے باپ شاہ میر سے ایک خطیر رقم اینٹھنے کے لئے ہی اسے یرغمال بنانا چاہتا تھا تاکہ وہ بھی خود کو ذہنی طور پر اس کے لئے تیار کر لے اور بلا چوں چرا میرا کہا مانتی رہے۔ یہ ضروری تھا۔

دور مشرقی سمت اب پوہ پھٹنے لگی تھی۔ نماز فجر کی اذانوں کی روح پرور آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ میں اسے لے کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا مسافر ویگنوں کے اڈے تک پہنچا۔ یہاں سے ٹیکسیاں بھی ملتی تھیں۔ لیکن اس وقت نہ کوئی ٹیکسی نظر آ رہی تھی اور نہ ہی کوئی مسافر ویگن۔ ایک کونے میں رکنے کے بعد ہم نے اپنی سانسیں بحال کیں۔ میں نے میگارد اپنی جیب میں ڈال لیا تھا۔ نگینہ کی حالت اب بھی غیر تھی۔ میں نے اسے ایک بار پھر دھمکاتے ہوئے کہا۔

''سنو! میں جانتا ہوں کہ تمہارا باپ بہت دولت مند ہے اور اثر و رسوخ بھی رکھتا ہے۔ مگر یاد رکھو

ں نے بھی سر سے کفن باندھ لیا ہے۔ مجھے تم سے کوئی مطلب نہیں۔ مجھے صرف پینتیس لاکھ کی اشد ضرورت ہے تاکہ میں اپنی بیمار اور محبوب بیوی کا بیرون ملک علاج کروا سکوں۔ کیونکہ میں اس سے شدید محبت کرتا ہوں۔ اس کے بغیر میری زندگی موت سے بھی بدتر ہے۔ وہ ایک موذی مرض کا شکار ہو چکی ہے، جس کا علاج صرف بیرون ملک میں ممکن ہے۔ یہ سب میں تمہیں اس لئے بتا رہا ہوں تاکہ تم میرے عزائم سے پوری طرح واقفیت حاصل کر لو اور میرے ساتھ تب تک تعاون کرتی رہو جب تک تمہارا باپ رقم میرے پاس نہیں لے کر پہنچ جاتا۔'' میں نے دانستہ دروغ گوئی سے کام لیا تھا۔ میں نگینہ کے قریب رہ چکا تھا، اس کی فطرت سے خوب واقف تھا۔ وہ اپنے اندر دردمند دل بھی رکھتی تھی۔ تاہم وہ متجسس طبیعت کی مالک بھی تھی۔ جب اسے اچھی طرح میرے عزائم اور میری مجبوری کے بارے میں اندازہ ہو گیا تو اس نے خود کو فوراً سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

''لیکن ....تم تو مجھے فون کر کے عجیب و غریب باتیں کرتے تھے؟ تم میری نگینہ ہو، مجھے پہچاننے کی کوشش کرو.........پھر وہ سب کیا ڈراما تھا؟''

مجھے پورا یقین تھا کہ یہ سوال وہ ضرور پوچھے گی۔ لہٰذا میں نے جواب دیا۔ ''میں تمہیں اپنی جھوٹی محبت کے جال میں پھنسانا چاہتا تھا تاکہ تمہیں بہلا پھسلا کر آسانی سے یرغمال بنا سکوں۔ مگر مجھے اب دوسرا یہ طریقہ آزمانا پڑا۔''

اس اثناء میں ایک مسافر ویگن آ کر رکی۔ میں اب جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

میں نے نگینہ کو آخری بار جان سے مارنے کی دھمکی دی۔ اسے یہ سب بتانے کا میرا مقصد یہی تھا کہ وہ اچھی طرح سمجھ لے کہ میں اسے اس کی کسی غلط حرکت پر جان سے مارنے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔ اس طرح وہ پوری طرح سے میرے ''قابو'' میں آ گئی تھی۔

میں اسے ویگن میں لے کر سوار ہو گیا۔ ذرا دیر بعد ویگن اسلام آباد کی طرف روانہ ہو گئی۔ نگینہ میرے ساتھ خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ خود میرا بھی دل انجانے اندیشوں سے بے طرح دھڑک رہا تھا کہ کہیں یہ شور کر کے میرا بھانڈا نہ پھوڑ ڈالے۔ مگر خیریت گزری کہ اس نے ایسی کوئی حرکت نہ کی۔ اسلام آباد پہنچ کر ہم ویگن سے اترے تو میں نے اس سے کہا۔

''میری بات غور سے سنو.........اب ہم یہاں سے سیدھا بائی ایئر چترال کی طرف روانہ ہوں گے۔ سمجھ گئیں تم؟''

وہ میری توقع کے عین مطابق پریشان ہو گئی اور بولی۔ ''آخر تم مجھے اتنی دور کیوں لے جانا چاہتے ہو؟ میرے پاپا تمہیں رقم یہاں بھی پہنچا سکتے ہیں۔''

''میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔'' میں نے زہریلی مسکراہٹ سے کہا۔ ''یہاں تمہارے باپ کا زور چلتا ہے۔ وہ یہاں کی پولیس انتظامیہ کو اپنے ساتھ ملا کر میرے خلاف کارروائی کرا سکتا ہے۔ لیکن چترال جیسے دور دراز علاقے میں وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس لئے کہ میرا اصل ٹھکانا بھی وہیں ہے۔ علاوہ ازیں وہ میرے خلاف کوئی جال نہیں بچھا سکتا۔''

''مجھے تمہاری یہ منطق سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔'' نگینہ نے جھنجلا کر کہا۔ میں دل میں مسکرایا مگر سنگدلی سے غرا کر بولا۔

''تمہیں اس سب سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہئے۔ میں اپنے تحفظ کے لئے وہی کروں گا جو بہتر سمجھوں گا۔ تم اپنی چونچ بند رکھو۔''

میں نے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا، فلائٹ کی روانگی میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ میں نے ٹیکسی کروائی، نگینہ کے ساتھ عقبی سیٹ پر بیٹھا اور ٹیکسی والے کو ایئر پورٹ چلنے کا کہا۔ ٹیکسی روانہ ہوگئی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، میرے اندر کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی میں دزدیدہ نظروں سے نگینہ کے چہرے کے تاثرات کو بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے چہرے سے اگرچہ اب ہراس کی کیفیت کم ہونے لگی تھی لیکن اب اس کی جگہ ایک اُلجھن آمیز پریشانی ظاہر ہونے لگی تھی۔ اسے غالباً چترال لے جانے والی بات نے اُلجھن میں ڈالا ہوا تھا۔

مجھے ڈر تھا کہ کہیں یہ عین طیارے میں سوار ہوتے وقت کوئی گل نہ کھلا دے۔ اگرچہ میں نے اسے خوف زدہ تو کر رکھا تھا مگر میں نے طیارے میں سوار ہونے سے قبل بھی دھمکی کی ایک ''ڈوز'' دینا ضروری سمجھا تھا۔ پھر جیسے ہی ہماری ٹیکسی ایئر پورٹ کے ذرا قریب پہنچی تو میں بری طرح چونک پڑا۔ وہاں مجھے پولیس کی کئی گاڑیاں کھڑی نظر آئیں۔ مجھے یکایک خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے فوراً ٹیکسی والے کو رکنے کا حکم دیا۔ کم بخت ٹیکسی والے نے بحث شروع کر دی۔

''او جی! ایئر پورٹ تک تو پہنچنے دیں۔''

میں نے فوراً میگارد نکال کر اس کی کنپٹی پر رکھ دیا اور غرا کر اسے ٹیکسی روکنے کا کہا۔ ٹیکسی کی رفتار تیز تھی۔ کچھ وہ بھی شاید سامنے پولیس کی گاڑیوں کو کھڑا دیکھ کر شک میں مبتلا ہو گیا تھا۔ بہرطور، وہ پستول اور میرا جارحانہ انداز، اس نے خوف زدگی کے عالم میں یکدم بریک لگا دیئے۔ ٹیکسی کے ٹائر سڑک پر جام ہو کر زور سے چرچرائے۔ پولیس والے یکدم ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ یہ سنگین وقت غیر ارادی طور پر ہونے والی غلطی پر ماتم کرنے کا نہ تھا۔ میں نے ڈرائیور کو ٹیکسی سے باہر دھکا دیا۔ پولیس کی گاڑیوں کے قریب کھڑے اہلکاروں نے کچھ بھانپ لیا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی ٹیکسی ایک یوٹرن لے کر بڑھا دی۔ آناً فاناً پولیس کی دو جیپیں اور ایک موبائل میرے پیچھے سائرن بجاتی ہوئی لگ گئیں۔ کھیل بگڑ گیا تھا۔

نگینہ بھی پریشان ہوگئی تھی۔ میں نے غرا کر اسے اگلی نشست پر آنے کا کہا۔ وہ اُچھل کر میرے برابر کی سیٹ پر آ بیٹھی۔ میں ٹیکسی کو اب آندھی طوفان کی طرح اُڑائے لے جا رہا تھا۔ کچھ ایسا لگتا تھا کہ شاہ میر نے اپنی بیٹی کے اچانک اور پراسرار غیاب پر پنڈی سے لے کر اسلام آباد تک کی پولیس انتظامیہ کو میرے پیچھے لگا دیا تھا۔ چونکہ کبیر میرے منصوبے اور میرے عجیب وغریب ایڈونچر سے واقف تھا اس لئے باقی ہدایات دینے کی کسر اس نے پوری کر دی ہوگی۔ یہ میری فاش غلطی تھی۔ میں اس حقیقت کو بھلا بیٹھا تھا کہ کبیر نگینہ کو چترال لے جانے والی بات سے آگاہ تھا۔ پولیس نے سب سے پہلے ایئر پورٹ کی نگرانی شروع کر دی تھی۔ کیونکہ کبیر جانتا تھا کہ ایک تو نگینہ کو اغواء کرنے والا میرے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا دوسرے میں اسے اغواء کر کے کہاں لے جانا چاہتا تھا؟ ایک خیال یہ بھی آیا کہ ہو سکتا ہے، پولیس کسی اور ہی وجہ سے وہاں موجود ہو اور پھر ٹیکسی کو مشتبہ انداز میں اچانک بریک لگا کر پلٹتے ہوئے دیکھ کر میرے پیچھے لگ گئی ہو۔ بہرطور اب میں اس بگڑی ہوئی صورتِ حال پر قابو پانے کے لئے ٹیکسی کو خاصی رفتار سے اُڑائے جا رہا تھا۔ پولیس کی گاڑیاں مخصوص سائرن بجاتی میرے تعاقب میں تھیں۔ انہیں ڈاج دینا لازمی تھا۔ اس لئے میرا شہر کی مصروف شاہراہوں کی بھول بھلیوں میں جانا ضروری تھا۔ میں اس وقت انتظامی سیکٹر کی شاہراہ پر تھا۔ یہاں رش کم تھا اور سڑک بھی سیدھی تھی۔ مجھے تیز رفتاری کے ساتھ ٹیکسی دوڑاتے ہوئے اس پر کنٹرول بھی قائم رکھنا تھا۔ ورنہ کسی قسم کا خطرناک حادثہ نگینہ اور میری جان لے سکتا تھا۔

میں نے ایک موڑ کاٹا۔ نیشنل پارک سے بڑا خطرناک راؤنڈ اباؤٹ ٹرن لیا تو کار دو پہیوں پر آ گئی۔ کے حلق سے چیخ نکلی اور وہ میرے اوپر آ گئی۔ میں نے اسے ایک ہاتھ سے فوراً پرے کیا۔ راؤنڈ بینہ سے گھومتے ہی میں شہر کے وسط میں آ گیا۔ یہاں سے نیشنل اسمبلی کی عمارت نظر آ رہی تھی۔ اس ذرا ہی پہلے ایک تنگ سا ذیلی یا اضافی موڑ دائیں جانب مڑتا تھا۔ میں نے ٹیکسی کی رفتار کم کر کے اس موڑا۔ پھر سپریم کورٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے راول جھیل کی طرف جانے کی بجائے میں ٹیکسی ایمبیسی روڈ کی طرف موڑ دی۔ یہاں کئی ایمبیسیز کے دفاتر تھے۔ اس کے بعد ایک طویل رہائشی شروع ہوتا تھا۔ یہاں کئی موڑ تھے۔ میں نے فوری طور پر دو تین موڑ کاٹے۔ میں پولیس گاڑیوں کو ج دینے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔ لیکن پھر جیسے ہی میں نے مین شاہراہ کی طرف نکلنے والے ایک تنگ شارٹ راستے کا انتخاب کیا تو اچانک پولیس کی ایک جیپ سائرن بجاتی ہوئی سامنے آ گئی۔........

تصادم یقینی تھا۔ وہاں اتنی جگہ نہیں تھی کہ میں ٹیکسی واپس گھما سکتا۔ اس کا مطلب تھا کہ مجھے پولیس ٹکرا کر ہی اپنی راہ نکالنی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ پولیس والے مجھ پر فائرنگ نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ وں نے میرے ساتھ نگینہ کی جھلک دیکھ لی تھی۔ البتہ جیسے ہی انہوں نے میری ٹیکسی کو رُکے بغیر مزید رپکڑتے دیکھا تو جیپ کو یکدم بریک لگا کر پولیس والے بدحواس ہو کر جیپ سے باہر کودنے لگے۔ ے دونوں ہاتھ مضبوطی کے ساتھ اسٹیئرنگ پر جمے ہوئے تھے۔ نگینہ حواس باختہ سی دم بخود بیٹھی تھی۔ نے خود کو تقدیر کے سپرد کر دیا تھا۔

میری ٹیکسی جیپ کے بونٹ سے ٹکرائی۔ پولیس اہلکار چھلانگیں لگا کر پرے ہٹ گئے۔ ایک دھماکا ٹیکسی پولیس جیپ کو دھکیلتی اپنے نکلنے کا راستہ بناتی مین شاہراہ پر آ گئی۔ میں نے جلدی سے گاڑی کو ں جانب موڑا تو اچانک عقب سے سائرن کی آواز اُبھری۔ میں نے بیک ویو مرر پر نظر ڈالی۔ وہ ں موبائل تھی۔ میں نے ہونٹ بھینچ لئے۔ اچانک سامنے ایک مسافر کوچ آ گئی۔ میں نے فوراً بریک پاؤں رکھ دیا۔ ٹائر زور سے چرچرائے۔ کوچ کے ڈرائیور نے فوراً اسٹیئرنگ گھمایا۔ میں رانگ سائیڈ پر ۔ مجھے یہ خوش فہمی تھی کہ میں پولیس کی تینوں گاڑیوں کو ڈاج دے چکا ہوں۔ لیکن پولیس مجھے گھیرنے چکروں میں تھی۔

بہرطور مسافر کوچ نے جیسے ہی مجھے راستہ دیا، میں نے بریک پر سے پاؤں ہٹا دیئے۔ بائیں جانب ل ڈیم کی ریلنگ تھی۔ نیچے جھاگ اُڑاتا پانی تھا اور جگہ تنگ تھی۔ میری ٹیکسی ریلنگ توڑ کر کئی فٹ نیچے ے جھاگ اُڑاتے پانیوں میں گر سکتی تھی۔ کیونکہ بھاری بھرکم کوچ نے مجھے بہت تنگ راستہ دیا تھا۔ میری ٹیکسی ریلنگ کو چھوتی ہوئی نکل گئی۔ دفعتہً مجھے عقب میں ساعت شکن دھماکا سنائی دیا۔ میں نے ارادی طور پر بیک ویو مرر میں دیکھا، کوچ پولیس موبائل سے ٹکرا گئی تھی۔ نگینہ نے اب چلانا شروع کر تھا۔

''روکو........روکو.........گاڑی!''

میں پریشان ہو گیا۔ تاہم میں نے غرا کر کہا۔ ''چپ چاپ بیٹھی رہو!''

میں اب ویران سڑک پر آ گیا۔ عقب میں اچانک مجھے برسٹ چلنے کی خوفناک تڑتڑاہٹ سنائی دی۔ ر کے حلق سے ہسٹریائی چیخیں بلند ہوگئیں۔ میں نے گھبرا کر بیک ویو مرر میں دیکھا، پولیس کی تیسری میرے تعاقب میں تھی اور وہ اب میری کار کے ٹائر برسٹ کرنے کے چکروں میں تھے۔ کھلی اور نسبتاً شاہراہ پر آنے کی وجہ سے انہوں نے یہ ہمت کر ڈالی تھی۔ میں ٹیکسی کو زگ زیگ انداز میں

دوڑانے لگا۔ لیکن اس طرح مجھے رفتار کم کرنا پڑ رہی تھی۔ بہ صورت دیگر ٹیکسی کے اُلٹنے کا احتمال تھا۔ میں نے زگ زیگ انداز ترک کرتے ہوئے ٹیکسی کی رفتار بڑھا دی۔ اچانک میرے موبائل کی بیل گنگنانے لگی۔ میرے پاس سر کھجانے کا وقت نہ تھا، موبائل پر ہونے والی کال کہاں سن سکتا تھا۔ آگے ایک موڑ آ رہا تھا۔ میں نے فوری طور پر ایک خطرناک فیصلہ کیا اور دائیں ہاتھ میں میگا رد نکال کر پکڑ لیا۔

موڑ پر ٹیکسی کی رفتار کم کرتے ہوئے میں نے کھڑکی سے ہاتھ نکال کر پولیس جیپ کی ونڈ اسکرین کا نشانہ لے کر لبلبی دبا دی۔ جیپ کی ونڈ اسکرین ٹوٹنے کا چھناکا ہر طرف پھیلتا چلا گیا۔ میرے میگا رد کی خاموش گولی نے اپنا کام کر دکھایا تھا۔ پولیس جیپ کا کیا حشر ہوا؟ مجھے نہیں معلوم۔ البتہ اتنا ضرور ہوا تھا کہ اب وہ میرے تعاقب میں نہ تھی۔ میری ٹیکسی اب شہر کے مضافات میں آندھی طوفان کی طرح دوڑے جا رہی تھی۔ میں شہر کی گنجلک بھول بھلیوں سے دور نکل آیا تھا۔ راستہ صاف تھا۔ میں نے ایک نگاہ اپنے برابر میں ڈری سہمی بیٹھی نگینہ پر ڈالی۔ وہ جیسے سکتے کے عالم میں بیٹھی مجھے اس طرح تکے جا رہی تھی گویا اسے میرے انسان ہونے پر بھی شبہ ہونے لگا ہو۔

''دیکھ لیا تم نے .... مس نگینہ! میں نے سر سے کفن باندھ رکھا ہے۔ تمہیں خوب اندازہ ہو رہا ہوگا کہ مجھے اپنی بیمار اور موت کی گھڑیاں گنتی ہوئی بیوی سے کس قدر شدید محبت ہے۔ میں اس کی خاطر جان کی بازی بھی لگا سکتا ہوں.........اور تمہیں تمہاری ذرا سی لغزش پر موت کے گھاٹ بھی اتار سکتا ہوں۔''

آخری الفاظ پر میں نے دل ہی دل میں ''اللہ نہ کرے'' کہا تھا۔ لیکن یہ ضروری تھا۔ میں خوف زدہ کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ کسی قسم کی غلط حرکت کر کے مجھے مشکل میں نہ ڈال دے۔

میں نے دیکھا، نگینہ کے چہرے پر اب عجیب سے تاثرات اُبھرے تھے۔ میری نظریں ونڈ اسکرین کے پار چمکتی سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ تاہم میں گاہے گاہے دزدیدہ نظروں سے اس کے چہرے کو بھی دیکھ لیتا تھا۔

''تم اپنی بیوی سے واقعی اتنی شدید محبت کرتے ہو؟'' دفعتاً اس نے عجیب سے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ میں قدرے چونکا، پھر ٹیکسی کی رفتار ذرا کم کر کے ایک گہری ہمکاری لے کر بولا۔

''ہاں .... بہت زیادہ۔'' میں نے کوشش کی تھی کہ میرے یہ الفاظ دل کی گہرائیوں سے نکلیں۔

''بہت خوش قسمت ہے وہ .... کیا نام ہے اس کا؟'' نگینہ نے پوچھا تو میرا دل عجیب سے انداز میں دھڑکنے لگا۔ مجھے اداکاری کا یہ تاثر قائم رکھنا ضروری تھا۔ لہٰذا بولا۔

''نگہت۔''

''اسے کون سی بیماری ہے؟'' اس نے پوچھا۔ اسے اپنے معاملے میں دلچسپی لیتا دیکھ کر مجھے تعجب نہیں ہوا بلکہ خوشی ہوئی تھی۔ کیونکہ میں اس کے دردمند دل سے اچھی طرح واقف تھا۔ لہٰذا ایک بار پھر دروغ گوئی سے کام لے کر آواز کو حد درجہ مغموم بنا کر کہا۔

''اسے برین ٹیومر ہے۔''

''اوہ .... ویری سیڈ۔'' بے اختیار نگینہ کے لبوں سے نکلا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہیں دکھ ہوا یہ سن کر؟''

''ظاہر ہے، میں بھی انسان ہوں۔'' وہ بولی۔

''لیکن میں تو تمہاری جان کا دشمن ہوں؟'' میں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا۔

''تمہاری ایک مجبوری ہے۔'' وہ بے پرواہی سے بولی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کا فطری لاابالی پن لوٹ آیا ہو۔ تاہم میں نے کہا۔

''کچھ بھی سہی .... میں ایک انسان کی زندگی بچانے کے لئے دوسرے کی زندگی کو داؤ پر لگائے ہوں .... یہ بہرحال غلط ہے۔''

وہ میرا اشارہ سمجھ کر بولی۔ ''محبت میں سب جائز ہے۔ تمہیں کم از کم اپنی غلطی کا احساس تو ہے نا۔''

اس کی بات سے اچانک مجھ پر ایک عجیب سا سحر طاری ہونے لگا۔ وہ شاید میری فرضی اور من گھڑت ...ی سے متاثر ہو گئی تھی۔ میں نے کار کی رفتار مزید کم کر دی۔ سڑک دور تک ویران تھی۔ کوئی اِکا دُکا ...ی یا مسافر لگژری کوچ گزر جاتیں۔ دائیں بائیں دیودار اور چیڑ کے پیڑوں کا گھنا سلسلہ سڑک کے دو ...دور تک پھیلا نظر آتا تھا۔

دن کی روشنی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ فضا میں گل بوٹوں کی خوشگوار مہک رچی ہوئی تھی۔

''تو کیا میں جو کچھ کر رہا ہوں، وہ تمہاری نظروں میں درست ہے؟'' میں نے اس کی سرمگیں آنکھوں ...اپنی مفروضہ کہانی کی 'اثر پذیری' بھانپنے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''ہاں.........'' اس نے ہولے سے کہا تو مجھے چنداں تعجب نہ ہوا۔ وہ ایسی ہی فطرت کی مالک تھی۔

میں نے اسے اپنی کہانی کے اثر میں آتے دیکھا تو اچانک میرے دماغ میں ایک بہت ہی عجیب و ...منصوبہ تشکیل پانے لگا۔ چنانچہ میں بولا۔

''لیکن میں جانتا ہوں، یہ طریقہ بہرحال غلط ہے۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ مم .... مگر میں کیا کروں مس نگینہ! میں اپنی محبوبہ بیوی نگہت کو مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا.........نہیں دیکھ سکتا۔''

...غم انگیز تاثر کو حقیقی بنانے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے اپنے اندر نگینہ کا غم سمو لیا۔ میں نے ٹیکسی ...دی۔ وہ حیرت سے میرا چہرہ تکنے لگی۔

ماحول میں آزردہ سی خاموشی طاری تھی۔ میری آنکھیں نگینہ کے غم میں بھیگنے لگی تھیں۔ میں نے آبدیدہ ...ں سے نگینہ کی طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''مس نگینہ! ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔ اور پلیز، کوئی ایسی حرکت نہ کرنا کہ میں کوئی غلط قدم اٹھا ...ں، جو میرے ضمیر پر تمام عمر کا بوجھ بن جائے۔ مس نگینہ! تم اسی طرح میرے ساتھ تعاون کرتی رہیں ...تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔ تمہارا دل سے احترام کروں گا۔ رقم مل جانے کے بعد جب میں نگہت ...لاج کروا لوں گا تو میرا وعدہ ہے کہ میں تمہارے پاس آ کر اپنا سر جھکا دوں گا۔ پھر چاہے تم اور ...ے پپا مجھے جو چاہے سزا دیں، مجھے قبول ہوگی.........میری نگہت کو دوبارہ زندگی مل جائے، مجھے اور ...چاہئے۔''

میں نے دیکھا، نگینہ کے چہرے پر کچھ عجیب سا ارتعاش ابھرا۔ وہ یک ٹک میرا چہرہ تکے جا رہی تھی۔ پھر ایک گہری سانس لے کر متاثر کن لہجے میں بولی۔

''مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم واقعی اپنی بیوی نگہت سے سچی محبت کرتے ہو۔ وہ واقعی بہت خوش قسمت ...اسے ہرگز نہیں مرنا چاہئے۔ لیکن نادر! تم نے یہ خطرناک قدم اٹھا کر پولیس کو اپنے پیچھے لگا لیا ہے۔ ...طرح تو تم نے خود کو بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے۔ تم میرے پپا کو نہیں جانتے۔ وہ بہت اثر و رسوخ کے مالک ہیں۔''

''تم نے میرے دکھ کا اندازہ کر کے ثابت کر دیا کہ تم واقعی ایک دردمند اور رحم دل لڑکی ہو۔ اب تو

شاید میں واقعی تمہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ بلکہ حقیقت یہی ہے کہ میں تمہیں صرف خوف زدہ کرنا چاہتا تھا تاکہ تم بلا چوں چرا میرا حکم مانتی چلی جاؤ۔ نگینہ! تمہیں کار چلانی آتی ہے؟" میں نے اپنے ایک جذباتی قسم کے نئے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"ہاں ......" وہ بولی تو میں نے کہا۔

"تم جا سکتی ہو۔"

اس کی آنکھوں میں شدید حیرت اُبھری۔ اِدھر میں دروازہ کھول کر باہر اتر گیا اور ایک طرف اداس اور مغموم سا چل پڑا اور درخت کے تنے سے اپنی پیشانی ٹکائے رو پڑا۔ درحقیقت میرے اندر نگینہ سے جذباتی طور پر دوری کا غم جاگ اٹھا تھا۔ وہ میرے ساتھ تھی لیکن میری نہیں تھی۔ ایک گھناؤنی اور پراسرار سازش کے تحت اس کی لوحِ دل سے میری محبت، میرا نام، میرا اعتبار اور میری دیوانہ وار چاہت کو بڑی بے رحمی سے مٹا دیا گیا تھا کہ آج مجھے اس نقشِ محبت کو اور اس درسِ محبت کے متن کو دوبارہ رقم کرنے کے لئے یہ خطرناک قدم اٹھانا پڑا تھا۔ میں واقعی اور سچ مچ دل گرفتہ ہو کر رو رہا تھا۔ جبکہ ٹیکسی میں بیٹھی ہوئی نگینہ یہ سمجھ رہی تھی مجھے اپنی فرضی بیوی نگہت کا غم کھائے جا رہا تھا۔

تب پھر اچانک میرے کاندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ میں قدرے چونک کر پلٹا۔ میری آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلملاہٹ تھی اور اس جھلملاہٹ میں مجھے نگینہ کا رخ روشن دکھائی دیا۔ میرا دلِ وحشی یکبارگی دھڑکا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ میں نے نگینہ کی نازک طبع اور رحم دلانہ فطرت کا جو بھرپور اندازہ لگایا تھا، وہ غلط ثابت نہیں ہوا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ میں یہ سب کچھ اسی کی خاطر تو کر رہا تھا۔

"تم ..... گئی نہیں نگینہ......؟" میں نے جلدی سے اپنے گرم سویٹر کی آستین سے آنسو پونچھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"نہیں......" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی تھی۔ لیکن میں نے اس کے لہجے کی مضبوطی کا بھی احساس کیا تھا۔

"کیوں......؟" میں نے پوچھا۔

"کیا تم اپنی محبوب بیوی کا علاج نہیں کراؤ گے؟" وہ عجیب لہجے میں بولی۔ اس کے نرم و گداز ہونٹوں پر پراسرار مسکراہٹ لہرا رہی تھی۔

"للل ...... لیکن ...... تم ......؟"

"میری فکر چھوڑو۔ سچ پوچھو تو میں تمہاری دکھ بھری کہانی سے اس قدر امپریس ہو گئی ہوں کہ مجھے تمہارا ساتھ دیتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ ایک بالکل ہی الگ تھلگ اور عجیب و غریب ایڈونچر ہے یہ میرے لئے۔" وہ پہلی بار کھل کر مسکراتے ہوئے بولی۔ "تمہاری دکھ بھری بپتا سن کر میرے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ میں پپا سے خود ہی کسی طرح رقم کا بندوبست کر کے تمہارے حوالے کر دوں گی۔ لیکن میں اپنے پپا کی فطرت سے واقف ہوں۔ اوّل تو اتنی بڑی رقم شاید کبھی نہیں دیں گے۔ اگر دے بھی دیں تو یقیناً وہ مجھ سے سب سے پہلے یہ ضرور پوچھیں گے کہ میں اتنی بڑی رقم کس لئے لینا چاہتی ہوں؟ اور میں شاید اس سلسلے میں اُنہیں مطمئن نہ کر سکوں۔ اس لئے تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ تم وہی کرو، جو کر رہے ہو۔"

اس کی بات سن کر میرا دل مسرت سے بلیوں اُچھلنے لگا۔ تاہم میں نے ذرا چپ ہی سادھے رکھی۔ وہ پھر کھلنڈرے پن سے بولی۔ "اب کیا ہوا؟...... اب تو تمہارے لئے کوئی مسئلہ نہیں رہا؟"

"تم ...... بہت عظیم ہو ...... میں ...... میں تمہارا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھلا سکتا۔"

ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کی خاطر میں اس کے قدموں کی طرف جھکنے لگا تو وہ بے اختیار ہو بولی۔

"ارے ...... رے ...... رے ...... یہ کیا کر رہے ہو؟" اس نے میرے کاندھے کو تھامتے ہوئے ملامت سے کہا۔ "چلو آؤ۔ دیر ہو رہی ہے۔" وہ بولی اور پھر ہم دونوں ٹیکسی میں آ بیٹھے۔

بالکل غیر متوقع طور پر حالات نے اچانک اور بڑے ہی عجیب و غریب انداز میں جذباتی طور پر پلٹا کھایا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے اور نگینہ کے بیچ "گم گشتہ" تعلق خاطر کی ڈرامائی "تجدید" ہو رہی ہے۔ یہ جس قدر جذباتی صورتِ حال تھی اس سے زیادہ دلچسپ اور انوکھی تھی۔ اب میرا کام مزید آسان ہو گیا تھا۔ گویا "میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی" والی بات تھی۔ میں بہ ظاہر نگینہ کو فریب دے رہا تھا۔ لیکن میرے اس فریب میں ہم دونوں کی بھلائی مضمر تھی۔

اس نے میری "مشکل" کو مزید آسان کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ ہم دونوں سب سے پہلے کسی دور کے شہر کا رخ کریں اور پھر وہاں سے بذریعہ ٹرین پشاور کی طرف نکل جائیں۔ کیونکہ ایئرپورٹ اب ہمارے لئے "فلیش پوائنٹ" اختیار کر چکا تھا۔ وہاں سختی کے ساتھ چیکنگ ہو سکتی تھی۔ اس کا مشورہ ایسا تھا جس پر عمل کرنے میں کوئی برائی نہیں تھی۔

اب نگینہ میری رہنمائی کر رہی تھی۔ اس نے مجھے بتایا "جنڈ" نامی اسٹیشن سے ایک ایکسپریس ٹرین جاتی ہے۔ اس کے ذریعے ہی پشاور تک کا سفر ٹھیک رہے گا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کچھ افراتفری کا عالم رہا تھا کہ ہمارے پاس کھانے پینے کے لئے کچھ نہ تھا۔ تقریباً بیس پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر آنے والے پٹرول پمپ سے میں نے ٹینکی فل کروائی۔ منرل واٹر کی بوتلیں اور کچھ جوس، بسکٹ اور وغیرہ کے پیکٹ لئے۔ مجھے جنڈ کا راستہ معلوم تھا۔ کار چلاتے ہوئے میں نے نگینہ سے کہا۔

"نگینہ! آپ سے ایک سوال پوچھوں؟"

"ہاں پوچھو۔" اس نے میری جانب دیکھ کر کہا۔

"آپ جس طرح دو محبت کرنے والوں کی مدد کر رہی ہیں، ضرور آپ کے دل میں بھی کسی نے اس کی قدر و قیمت بٹھائی ہو گی۔ کیا آپ نے بھی کسی سے محبت کی ہے؟" یہ کہتے ہوئے میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگی تھیں۔ میرے سوال پر اسے ایک پراسرار چپ لگ گئی تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھی جیسے اپنے اندر کو کھنگالنے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر گو مگو سے لہجے میں بولی۔

"شاید نہیں۔"

"کیا مطلب؟...... شاید کہنے سے آپ کا جواب اثبات میں ہی محسوس ہوتا ہے۔" میں نے فوراً کہا۔

"ہاں ...... کچھ ایسا ہی لگتا ہے جیسے ...... جیسے میں بھی کسی سے بہت شدید محبت کرتی تھی ...... وہ محبت کہیں کھو گئی ہو۔" اس کی آواز میں جتنی دوری تھی، اتنی ہی گہرائی بھی تھی۔ میرا دل یکبارگی دھڑکا۔ میں نے فوراً کہا۔

"محبت کھو گئی ہے؟ ...... تو کیا آپ کے ساتھ کسی نے بے وفائی کی ہے؟"

میری بات پر وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔ "نہیں ...... شاید ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ بس کچھ ایسا لگتا ہے میرا کچھ کھو گیا ہو۔ کبھی کبھی میرے اندر سے ایک ہوک اُٹھتی ہے۔ میرے دماغ میں، میرے

خانہ دل میں کسی کی یاد تھی، جس پر دھند چھائی ہوئی ہے۔ میں نے بہت یاد کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔" وہ اتنا بتا کر خاموش سی ہوگئی۔ جبکہ اس کی بات پر میری رگوں میں خون کی گردش یکلخت تیز ہوگئی۔ میرے جی میں آئی کہ اسے چیخ چیخ کر بتاؤں "نگینہ! میری جان جاناں! تمہاری محبت کھوئی نہیں ہے، وہ تمہارے سامنے ہے۔ میں........ نادر علی خان تمہاری پہلی اور آخری محبت جس نے اس سوئی ہوئی محبت کو دوبارہ جگانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی ہے۔" لیکن میں ابھی اس سے یہ کہنا نہیں چاہتا تھا تاہم میں نے کہا۔

"مس نگینہ! کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کے ساتھ کوئی ایسا حادثہ پیش آیا ہو جس نے آپ کی یادداشت میرا مطلب ہے........ محبت والی یادداشت کا خانہ محو کر دیا ہو؟"

میری بات پر اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں جیسے کوئی چمک پیدا ہوئی تھی۔ پھر وہ ایک گہری ہنکاری بھرتے ہوئے اپنے سر کو پُرسوچ انداز میں تفہیمی جنبش دیتے ہوئے بولی۔

"ہاں........ کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔"

اس کے جواب نے میرے شوق کو بڑھاوا دیا۔ میں نے فوراً دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"لیکن آپ جس سے محبت کرتی تھیں، اس کے ساتھ تو ظاہر ہے کوئی حادثہ پیش نہ آیا ہوگا۔ پھر........ پھر اس نے تو یقیناً آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی ہوگی اور........ اور آپ کو اپنی اس محبت کی یاد دلانے کی بھی کوشش کی ہوگی؟"

"پتہ نہیں........" اس نے مختصراً کہا اور میری امیدوں پر اوس پڑنے لگی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ذرا میری باتوں کا ذکر کرے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کے دل و دماغ کو میری طرف سے اس قدر گہرا کے ساتھ HYPNOTIC SLEEP کر کے MESMERIZE کر دیا گیا تھا کہ اسے مجھ سے متعلق "پیش آمدہ" اور موجودہ کے بارے میں کچھ یاد نہ رہا تھا۔ بہرطور میں نے دل کو مضبوط کر لیا، تقدیر میرا یہاں تک ساتھ دیا تھا۔ انشاء اللہ آئندہ بھی مجھے کامیابی ہی بخشے گی۔

سفر خاموشی سے جاری تھا۔ میں نے اب موجودہ حالات پر غور کرنا شروع کیا۔ مجھے بہت جلد ٹیکسی سے جان چھڑا لینی تھی۔ گھنٹے بھر بعد ہم جنڈ کے ریلوے اسٹیشن کے قریب پہنچے۔ ٹیکسی میں نے ذرا دور ویرانے میں چھوڑی اور نگینہ کے ساتھ اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوا۔ یہ بہت مختصر سا اسٹیشن تھا۔ ایک ٹرین روانگی کے لئے تیار کھڑی تھی۔

بکنگ آفس سے علم ہوا، یہی ٹرین پشاور جانے والی ہے۔ میں نے جلدی جلدی دو ٹکٹ خریدے جیسے ہی ایک بوگی میں سوار ہوا، ٹرین نے رینگنا شروع کر دیا۔ بوگی میں مسافروں کا رش کم تھا۔ میں اور نگینہ آمنے سامنے کی دو سیٹوں پر براجمان ہو گئے۔

راولپنڈی (اسلام آباد) سے پشاور 172 کلومیٹر یعنی 107 میل مغرب میں تھا۔ بذریعہ جہاز جنڈ سے پشاور بہ مشکل نصف گھنٹہ لگتا تھا۔ جب ٹرین نے رفتار پکڑی تو مجھے ٹھیک ٹھاک اندازہ ہوا کہ یہ ٹرین تین ساڑھے تین گھنٹوں میں ہمیں پشاور پہنچا سکتی تھی۔ نگینہ میرے سامنے کی سیٹ پر خاموش بیٹھی کھڑکی سے باہر کے بھاگتے ہوئے مناظر دیکھتی رہی، پھر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے بھی اس کے چہرے سے اپنی پیاسی اور مجبور نظریں نہیں ہٹائی تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ میرے اندر کہیں دور جھانکنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اور تب میں نے دیکھا، اس کی آنکھوں سے دکھ کا تاثر آنسو بن کر ٹپکا۔ اپنی محبت، اپنی جان جاناں........ اپنی نگینہ کو روتا دیکھ کر میرا اندر چھلنی ہو گیا۔ میں نے تڑپ کر بے تابی سے پوچھا۔

"آ........ آپ........ رو رہی ہیں........ مس نگینہ!"

اس نے اپنے آنسو پونچھنے کی بھی کوشش نہ کی، ایسے ہی بولی۔ "ہاں........ مجھے لگتا ہے، میرے اندر کوئی خوشی نہیں۔ بس ایک اتھاہ خاموشی ہے، گمبھیر سناٹا ہے۔ میرے دل و دماغ میں کبھی کبھی اپنے اندر کچھ کھونے کا احساس ہوک بن کر اس قدر شدت کے ساتھ اٹھتا ہے کہ........ میرے آنسو اُمڈ پڑتے ہیں۔" اس کے غم و اندوہ سے لبریز الفاظ نے میرے دل کو پارہ پارہ کر ڈالا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ اپنے تئیں کسی نا معلوم غم کا شکار ہے۔ ایسے میں بے اختیار میرا جی چاہا کہ اس کے غموں سے چور وجود کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لوں اور اس کا آنسو بن جاؤں۔

یاالٰہی! یہ کیا امتحان تھا؟ یہ کیسی عجیب و غریب اور بے چین کر دینے والی صورت حال تھی۔ میں نے کبھی ایسی صورت کا سوچا بھی نہ تھا۔ اس قدر بے بسی میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھی جس کا مجھے اس وقت سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

پھر اپنے حلق میں اترنے والی رقت پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے اس سے بولا۔ "نگینہ صاحبہ! آپ کو کسی انجانے اور نہ معلوم دکھ میں پا کر خود میں بھی پریشان اور غم زدہ سا ہو رہا ہوں۔ پلیز! اگر آپ کا اب میرے ساتھ جانے کو دل نہیں چاہ رہا ہے تو میں آپ کو آپ کے پیا کے پاس چھوڑ آتا ہوں۔"

میرے نرم اور التجائیہ لہجے پر وہ مسکرائی اور بولی۔

"پھر........ پھر تم اپنی محبوب بیوی کا کس طرح علاج کراؤ گے؟"

میں دانستہ لاجواب ہو کر خاموش ہو رہا۔ مجھے چپکا پا کر وہ پھر بولی۔

"دیکھو نادر! جانے کیوں اب میرا دل بھی تمہاری مدد کرنے کو چاہ رہا ہے۔ اسے تم کچھ بھی معنی دو، مگر میں بہرحال نہیں چاہتی کہ تمہاری محبوب بیوی تم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو۔ لیکن مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں تم خود کو کسی مشکل میں نہ پھنسا لو اور سب کیا کرایا دھرا رہ جائے، برباد ہو جائے۔"

میں نے اس کی بات پر کہا۔ "نگینہ صاحبہ! میں آپ کے جذبہ ہمدردی کی قدر کرتا ہوں۔ یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ آپ کو معلوم نہیں ہے کہ میں نے شادی سے پہلے نگہت سے بہت طوفانی قسم کا عشق کیا تھا۔"

میں اتنا بتا کر ذرا رکا اور کن انکھیوں سے اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے ایک بات محسوس کی تھی کہ وہ میری فرضی محبوب بیوی سے محبت کے متعلق باتوں کو بڑی غیر معمولی دلچسپی سے سنتی تھی۔

"آگے کہو نا........ تم رک کیوں گئے؟" میری دانستہ ذرا طول پکڑتی خاموشی پر وہ عجیب سی بے تابی سے بولی۔ اس کے اشتیاق کو بھانپتے ہوئے میں نے اثر پذیرانہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"میرا آبائی گاؤں چترال میں ہے۔ نگہت دوسرے قبیلے سے تعلق رکھنے والی لڑکی ہے۔ میں نے اسے بہت ٹوٹ کر چاہا تھا۔ مگر اس کے قبیلے سے ہماری بڑی پرانی دشمنی چلی آ رہی تھی۔ ہمارا ایک ہونا ناممکن بن چکا تھا۔ لیکن ہم دونوں کی محبت نے اسے بالآخر ممکن کر دکھایا اور ہم نے شادی کر لی۔ اب دونوں طرف کے قبیلے ہماری جانوں کے دشمن ہو گئے۔ ہم ان سے بچتے رہے اور اس دوران بڑے کٹھن حالات و مصائب سے گزرے۔ مگر ہم نے ہمت نہ ہاری۔ بالآخر ہمارے قبیلے کے لوگوں نے تھک ہار کر ہماری تلاش ترک کر دی اور ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیا۔ البتہ ہم دونوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قبیلے سے ہی نہیں بلکہ علاقے سے بھی بے دخل کر دیا۔ میں نے محنت مزدوری شروع کر دی۔ اور اب جب ذرا سکھ کے دن آئے تو........ تو وہ بے چاری اس موذی اور جان لیوا مرض کا شکار ہو گئی۔" میں نے آخر میں دانستہ اپنے لہجے میں رقت سمو لی تھی اور یونہی آنسو پونچھنے لگا۔ اچانک نگینہ نے میرے

کاندھے پر آہستگی سے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے قدرے چونک کر مغموم سی نظروں سے اسے دیکھا۔ مجھے اس کے چہرے پر ایک عزم کی سی چمک محسوس ہوئی۔ وہ بولی۔

"نادر صاحب! ....آپ واقعی بہت بہادر اور حوصلہ مند انسان ہیں۔ اگرچہ تقدیر کے آگے کس کا بس چلتا ہے لیکن آپ نے تو اپنی تقدیر بھی پلٹ کر رکھ دی۔ میں آپ کی اپنی محبوب بیوی سے اس قدر بے لوث اور گہری محبت کی دل سے قدر کرتی ہوں۔ آپ بہت عظیم ہیں۔"

"نہیں نگینہ صاحبہ! .... میں ایک خودغرض اور بے ضمیر انسان ہوں۔" میں نے کہا۔ "اپنی غرض کی خاطر میں نے آپ کی زندگی کو بھی داؤ پر لگا دیا۔ اگر میری نگہت کو یہ سب معلوم ہو جائے تو مجھے پورا یقین ہے کہ وہ مجھ سے ناراض ہو جائے گی۔"

"ارے، وہ کیوں؟ اب تو میری اپنی بھی مرضی شامل ہوگئی ہے کہ تمہاری مدد کروں۔" وہ بولی۔

میں نے بھیگی مسکراہٹ سے کہا۔ "کچھ بھی سہی نگینہ صاحبہ! یہ غلط ہے۔ کسی کی محنت کی کمائی پر اس طرح ڈاکہ ڈالنا کہاں کا انصاف ہے؟"

میری بات پر نگینہ بولی۔ "پینتیس لاکھ کی رقم میرے پپا کے لئے بہت معمولی رقم ہے۔ اگر تم ان سے ایک کروڑ کا تاوان بھی لو تو میری خاطر وہ تمہیں بڑی آسانی سے دے دیں گے۔ کم از کم اس طرح ایک انسان کی جان تو بچ جائے گی۔"

میں نے اپنی گفتگو کو مزید اثر انگیز بناتے ہوئے اس سے کہا۔ "نگینہ صاحبہ! مجھے ایک کروڑ کی نہیں، صرف پینتیس لاکھ کی ضرورت ہے۔ اور میں آپ سے یہ وعدہ بھی کرتا ہوں کہ زندگی رہی تو میں یہ رقم آپ کے پپا کو واپس لوٹانے کی بھی کوشش کروں گا جو مجھ پر ایک قرض ہوگی۔"

"اچھا........." وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "تم بھلا اتنی بڑی رقم کیسے لوٹا سکتے ہو؟"

"خود کو بیچ کر۔" میں نے کہا۔

"خود کو بیچ کر؟" اس نے چونک کر دہرایا۔

"ہاں نگینہ صاحبہ! .... میں نے سنا ہے کہ بڑے بڑے امیر کبیر لوگ جن کے گردے خراب ہوتے ہیں، وہ بڑے مہنگے داموں مجھ سے ایک گردہ تو خرید ہی لیں گے منہ مانگے داموں پر۔" میں نے درد بھرے لہجے میں کہا تو نگینہ نے اچانک میرے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اس کی نرم و نازک مخروطی انگلیوں کا لمس مجھے سرشار کر گیا۔ اگرچہ میں اس "محبوب" لمس سے واقف تھا مگر اس لمحے مجھے وہ لمس نہایت اجنبی اجنبی سا لگا۔ مجھے محسوس ہوا وہ اُدھار میں ملنے والا لمس تھا۔ پھر وہ میرے ہونٹوں سے اپنا ہاتھ ہٹا کر بولی۔

"ایسا مت کہو۔ بس اب تم وہی کرتے جاؤ جو تم کرنا چاہتے ہو۔"

میں خاموش ہو گیا۔

ایکسپریس ٹرین دوپہر دو بجے تک پشاور پہنچ گئی۔ اسٹیشن کے اریب قریب بھی کئی اچھے ہوٹلز تھے لیکن میں کسی متوقع خطرے کے پیش نظر ریلوے اسٹیشن کے قریب والے ہوٹل میں کمرہ نہیں لینا چاہتا تھا۔ یوں تو میرا ہوٹل میں باقاعدہ ٹھہرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ میں تو محض نگینہ کی خاطر تھوڑی دیر کے لئے کسی آرام دہ جگہ پر ذرا ستانا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس کے بعد ہمیں فوراً چترال اور پھر وہاں کے قصبے "ایون" سے گزر کر وادی کیلاش میں داخل ہونا تھا۔ یہ ایک دشوار گزار مہم تھی۔ وہاں کلاشی آگرم نامی بستی میں اس کلاشی عامل عاروب کو تلاش کرنا مشکل نہ ہوتا۔ میں نے چترال اور وادی کیلاش سے متعلق خاصی تفصیلی معلومات

ہی حاصل کر رکھی تھیں۔ میرا ارادہ پشاور سے چترال بذریعہ جہاز جانے کا تھا جو محض پچاس منٹ کی ...از پر تھا۔ میں نے اس بارے میں نگینہ کو آگاہ کیا تو اس نے کہا کہ ہمیں یہ سفر بائی روڈ کرنا چاہئے۔ ...رچہ یہ سفر نہایت تکلیف دہ اور تھکا دینے والا ہوتا۔ اسے شاید فضائی سفر مہنگا لگ رہا تھا۔ جبکہ میرے ...خطیر رقم موجود تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ عاروب نامی عامل نگینہ کے علاج کے لئے کوئی بھی مطالبہ کر سکتا ...نگینہ کے ڈرامائی تعاون سے مہم کا پہلا مرحلہ کامیابی سے طے ہوا تھا۔ اس لئے مجھے اس کی طرف سے ...ئی فکر نہ تھی اور اسی لئے میری خواہش تھی کہ ہم جلد از جلد چترال روانہ ہو جائیں۔ اور اس مقصد کے ...لئے فضائی سفر سب سے زیادہ مناسب تھا۔

ہم دونوں اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکلے۔ مسافروں کا خاصا ہجوم نظر آ رہا تھا۔ عمارت کے باہر خاصی ...ہل پہل تھی۔ میں نگینہ کا ہاتھ تھامے اپنے اطراف کا چوکنا نظروں سے جائزہ لیتا ہوا ایک ٹیکسی کی طرف ...ھا اور ٹیکسی ڈرائیور سے یادگار چوک چلنے کا کہا۔ میرے اور نگینہ کے پسنجر سیٹ پر بیٹھتے ہی ٹیکسی چل ...ی۔ پشاور بڑا پُر رونق شہر ہے۔ ٹیکسی گورنمنٹ ہاؤس، کمپنی باغ سے گزرنے لگی۔ میرے لئے پشاور میں ...ی خطرہ تھا بلکہ ہر جگہ اور ہر علاقے میں پولیس، انتظامیہ اور دشمنوں کا خطرہ بدستور لٹکتی تلوار کی طرح ...جود تھا۔ کیونکہ شاہ میر کوئی معمولی شخص نہ تھا۔ وہ اثر و رسوخ کا مالک تھا۔ پھر سب سے اہم خطرہ کبیر کا ...ا جو میرے عزائم اور میری آئندہ کی "مہم" سے بخوبی واقف تھا۔ اس لئے مجھے ہر لمحہ بے حد محتاط رہنے ...ی ضرورت تھی۔

ہماری ٹیکسی جوں ہی قصہ خوانی بازار کی طرف جانے والی سڑک سے مسجد مہابت خان کی طرف ...ڑنے لگی تو اچانک مجھے تعاقب کا احساس ہوا۔ کیونکہ جیسے ہی ٹیکسی نے ایک موڑ کاٹا تو مجھے اپنے عقب ...یں ایک گہرے سبز رنگ کی ہائی روف مڑتی نظر آئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی مجھے یاد آ گیا تھا کہ میں اسے ...اصی دیر سے اپنے پیچھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے ان میں سوار افراد کو دیکھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ تب ...یں اپنے تعاقب کا یقین کرنے کی خاطر ٹیکسی ڈرائیور کو دانستہ مختلف شاہراہوں پر گھماتا رہا اور پھر ایک پُر ...رونق دکان کے سامنے اسے رکنے کا کہا۔ اس نے ٹیکسی روک دی۔ میں نے عقب میں گردن گھما کر ...دیکھا، سبز رنگ کی وہ ہائی روف غائب تھی۔ میں نے ایک طویل سانس کھینچی اور اتر کر سٹور میں داخل ہو ...گیا۔ نگینہ ٹیکسی میں بیٹھی رہی۔ میں نے جلدی جلدی نگینہ کے ناپ کے چند سوٹ خریدے اور باہر نکل ...آیا۔ ہائی روف کے غائب ہونے سے مجھے خاصا اطمینان ہو گیا تھا۔ وہ یقیناً میرا وہم رہا ہوگا۔

یادگار چوک اتر کر ہم نے ایک ہوٹل میں کمرہ لیا۔ ٹیکسی سے اترتے وقت میں نے ایک بار پھر ...اطراف کا جائزہ لیا مگر وہ سبز رنگ کی ہائی روف مجھے پھر دکھائی نہ دی۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے اسے ...تازہ دم ہونے کو کہا اور وہ ملحقہ غسل خانے میں داخل ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے باہر سڑک ...کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے جھانکا تو میری سانسیں سینے میں اٹکنے لگیں۔ مجھے سبز رنگ کی وہی ہائی روف ...کھڑی نظر آ گئی۔ پھر میں نے اس میں سے دو افراد کو نیچے اترتے دیکھا تو جیسے میں دوسرا سانس لینا بھول ...گیا۔ دل جیسے یکبارگی میری سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ میں ان دو افراد کو ایک جھلک ...دیکھ کر ہی پہچان گیا تھا۔ وہ کبیر اور کالا ناگ تھے بلکہ کالا ناگ کو دیکھ کر تو جیسے میری رگوں میں ایکا ایکی لہو ...کی جگہ لاوا اُچھلنے لگا۔ انہوں نے بڑی چالاکی سے مجھے ڈاج دیا تھا۔ انہیں شاید بروقت یہ احساس ہو گیا ...تھا کہ مجھے اپنے تعاقب کا ادراک ہو چکا ہے۔ یوں انہوں نے عارضی طور پر خود کو میری نظروں سے ...اوجھل کر دیا تھا۔ لیکن میں اب بہ غور ان پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ کبیر نے فوراً

اپنے یار غار کالا ناگ سے رابطہ کیا تھا اور شاید ان دونوں نے ہی میرا راستہ کھوٹا کرنے کی کوشش کی تھی۔ کالا ناگ لاہور کے گجر چوک کا معروف بدمعاش تھا۔ جبکہ کبیر میرے عزائم سے پوری طرح واقف تھا۔ یہی سبب تھا کہ دونوں کا یہاں پایا جانا اچنبھے کی بات نہ تھی۔

میں ابھی یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کرتے کیا ہیں؟ اس وقت وہ دونوں ہائی روف کے باہر کھڑے تھے اور کالا ناگ کان سے موبائل لگائے کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ میرے اندر زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی۔ مجھے تشویش ہو رہی تھی کہ یہ دونوں ابھی تک ہوٹل کی عمارت کے اندر کیوں نہیں داخل ہوئے۔ تب ذرا دیر بعد کالا ناگ نے موبائل آف کر کے جیب میں رکھا۔ پھر وہ کبیر سے باتیں کرنے لگا۔ میں کسی قدر فاصلے کے باوجود واضح طور پر دیکھ رہا تھا کہ دونوں کے چہرے جوش سے تمتما رہے تھے۔ میں بھی اپنی جگہ سے ہلے بغیر ان پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ دونوں ہوٹل سے باہر کیوں کھڑے تھے؟ انہیں تو اندر آ کر مجھ سے حساب کتاب نمٹانے کی کوشش کرنی چاہئے تھی۔ اچانک میرے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کالا ناگ مقامی پولیس کو ہمارے بارے میں آگاہ کر رہا ہو؟.........

ابھی میں نے اتنا ہی سوچا تھا کہ اسی وقت ایک کار تیزی کے ساتھ ان کے قریب پہنچ کر ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ رکی۔ میں ٹھٹکا۔ میری نظریں اسی طرف جمی ہوئی تھیں۔ کار میں سے چار لحیم شحیم اور تنومند افراد برآمد ہوئے۔ اپنی سرخ و سفید رنگت کے باعث وہ مقامی دکھائی دے رہے تھے۔ کار سے اتر کر وہ کالا ناگ کی طرف بڑھ گئے۔ کالا ناگ انہیں ہوٹل کے اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ بتانے لگا۔ ان چاروں کے مؤدبانہ انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ لوگ کالا ناگ سے بخوبی واقف تھے اور یقیناً کسی مقامی بدمعاش کی ہدایت پر گجر چوک کے نامی گرامی کالا ناگ کی مدد کرنے یہاں پہنچے تھے۔

ان چاروں نے ڈھیلے ڈھالے شلوار قمیض پہن رکھے تھے اور پیروں میں پشاوری چپلیں تھیں۔ ان کے درمیان کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں۔ اس دوران کبیر خاموشی سے کھڑا ہوٹل کی سمت دیکھتا رہا تھا۔ اس کے بعد وہ چاروں مؤدبانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے ایک طرف ہو گئے جبکہ کالا ناگ اور کبیر نے ہوٹل کے دروازے کی طرف پیش قدمی شروع کر دی تھی۔ خون جیسے لاوے کی طرح میری رگوں میں سنسنا رہا تھا۔ میرے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ میں نے ملحق غسل خانے کی طرف نگاہ ڈالی۔ پانی گرنے کی ہلکی سی آواز اس کی مصروفیت کا پتہ دے رہی تھی۔ اس کے سان و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ باہر کیا واقعات پیش آ رہے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ جانے کس کیفیت میں، میں پلٹا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ یہ خاصا معیاری ہوٹل تھا۔ قدرے طویل کوریڈور میں چند وردی پوش ملازمین کے سوا مجھے کوئی ذی روح دکھائی نہ دیا۔ میں نے قمیض کے نیچے میگارد کی موجودگی کو محسوس کیا اور برق رفتاری سے زینوں کی طرف بڑھا۔ ہمارا کمرہ پہلی منزل پر تھا اور زینوں کا اختتام ہوٹل کی ریسپشن پر ہوتا تھا۔

میں بہ صد احتیاط زینے تک پہنچا اور ذرا نیچے اُتر کر میں ٹھٹک کر ریلنگ سے چپکا کھڑا رہ گیا۔ میں نے دیکھا کالا ناگ اور کبیر ریسپشن پر موجود تھے اور ریسپشنسٹ سے کچھ پوچھ رہے تھے۔ وہ یقیناً ہمارے بارے میں ہی اس سے استفسار کر رہے تھے۔ اچانک میرے دل میں خیال اُبھرا اور پھر یکدم واپس پلٹا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے دروازہ بند کیا مگر اندر سے چٹخنی نہیں چڑھائی۔ نگینہ اس دوران میں غسل وغیرہ سے فارغ ہو چکی تھی۔ نئے لباس میں اب وہ خاصی نکھری نکھری نظر آ رہی تھی۔ تاہم مجھے پریشان پا کر وہ بھی چونک گئی۔ میں نے اسے مختصر الفاظ میں پیش آمدہ خطرے سے آگاہ کیا تو وہ متوحش سی نظر آنے لگی۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"نگینہ صاحبہ! آپ بے فکر رہیں۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ کبیر ایک نامی گرامی غنڈے کالا ناگ کے ساتھ یہاں آن پہنچا ہے اور باہر اس کے چار مقامی بدمعاش بھی موجود ہیں۔" یہ کہہ کر میں جلدی سے کھڑکی کی طرف لایا اور نیچے موجود ان چاروں مقامی لحیم شحیم افراد کی جھلک دکھائی۔

"میں نے تو تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ یہاں رکنے کے بجائے آگے نکل جاتے ہیں۔ مگر تم نہیں ...۔" وہ بولی۔

تاہم میں نے اسے تسلی دی۔ "میں ان پر قابو پا لوں گا۔ آپ اتنا کریں کہ باتھ روم میں چلی جائیں۔ ...تم ہے۔"

وہ حیران پریشان سی باتھ روم میں داخل ہو گئی۔ اسی وقت مجھے بیرونی کوریڈور میں قدموں کی آہٹ ...دی۔ میں کسی زخمی چیتے کی طرح دروازے کے قریب لپکا اور سانس روک کر دائیں جانب دیوار سے ...کر کھڑا ہو گیا۔ ٹھیک اسی وقت دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور کالا ناگ دھڑ سے اندر داخل ہوا۔ ...کا خیال تھا کہ دروازہ اندر سے بند ہو گا اس لئے اس نے غالباً دروازے کو لات مارنے میں پوری ...صرف کر دی تھی۔ مگر دروازہ کھلا ہونے کے باعث وہ اپنی جھونک میں اندر گھستا چلا آیا۔ میں نے ...سے اس کی پشت پر ایک زوردار لات رسید کر دی جس کی وجہ سے وہ دیوار سے جا ٹکرایا۔ کبیر نے ...جھپٹنے کی کوشش کی تو میں نے اسے بھی اندر رگید لیا۔

میری پوزیشن چونکہ ایک اغواء کنندہ مجرم کی سی تھی اس لئے مجھے بہرحال یہ سب خاموشی سے نمٹانا تھا۔ ...ن کے اندر داخل ہوتے ہی میں نے دروازہ بند کر دیا۔

اب کمرے کا یہ محدود ماحول اکھاڑا بن سکتا تھا۔ کبیر اور کالا ناگ میری طرف بڑی کینہ توز نظروں سے گھور رہے تھے۔ میں نے اپنا سائلنسر لگا میگارد نکال لیا۔ کبیر تو میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا جبکہ کالا ناگ کے چہرے پر کسی تشویش کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ بہ دستور شعلے برساتی ...نی نظروں سے مجھے گھورے جا رہا تھا۔ پھر دانت پیس کر نفرت انگیز لہجے میں بولا۔

"نادر! اس کھلونے کو جیب میں رکھ لو۔ تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے۔" اسے بھی شاید میری پوزیشن کا اندازہ تھا کہ میں اس وقت مجرم تھا اور پولیس سے چھپتا پھر رہا تھا۔

میں نے اس کی یہ خوش فہمی رفع کرنے کی غرض سے غرا کر کہا۔ "کسی بھول میں نہ رہنا کالا ناگ! تمہاری موت تمہیں یہاں کھینچ کر لائی ہے۔ میں اپنے ماموں کے قاتل کو معاف نہیں کر سکتا۔" یہ کہتے ہوئے میں پستول والا ہاتھ اٹھا کر اس کی مکروہ سیاہ پیشانی کا نشانہ لے کر ٹرائیگر دبانا چاہتا تھا کہ اس نے استہزائیہ مسکراہٹ سے جیسے مجھے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

"نادر! مت بھولو کہ میرا تم پر جاں بخشی کا قرض ہے۔ تم تو دشمنی میں بھی ایک معیار کے قائل ہو۔ ...ول گئے میری بات۔ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ ہماری دشمنی خالصتاً اپنے زورِ بازو پر ہو گی، اس آتشیں ہتھیار سے تو کوئی گیدڑ صفت بزدل بھی شیر جیسے بہادر کو باآسانی ہلاک کر سکتا ہے۔"

اس کی بات نے مجھے لحہ بھر کو دم بہ خود کر دیا تھا۔ میں اس کی یہ بات جھٹلا نہیں سکتا تھا کہ اس نے ...والی مہم کے دوران جب میں اس کے پستول کی گولی کے رحم و کرم پر تھا، مجھے چھوڑ دیا تھا۔ مگر ساتھ ہی ...دھمکی بھی دی تھی کہ وہ میرے اپنوں کی لاشوں کا منظر مجھے دکھانے کے بعد ہلاک کرے گا۔ یہ ایک ...طرح سے اس کی ایک قسم تھی۔ تاہم میں نے کہا۔

"کالا ناگ! ٹھیک ہے، آج میں تمہارا وہ قرض بھی اتارے دیتا ہوں۔ لیکن یہ بھی اب کان کھول کر

"سن لو، آج کے بعد میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

یہ کہہ کر میں نے اپنا میگارڈ واپس اڑس لیا۔ ٹھیک اسی وقت کالا ناگ نے پھرتی کے ساتھ اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میں اس کی خباثت سے اچھی طرح واقف تھا اس لئے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ اس نے جوں ہی اپنا پستول باہر نکالا، اس سے پہلے ہی میں نے میگارد سے اس کے پستول والے ہاتھ پر فائر کر دیا۔ میرے "خاموش" پستول سے گولی نکلی اور کالا ناگ کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر پرے جا گرا۔

"میں اب تمہارا قرض اتار چکا ہوں۔" میں نے خونچکاں غراہٹ سے کہا۔ "اور ہاں .... اگر تمہیں شیر بننے کا اتنا ہی شوق ہے تو کتوں کے ساتھ میرے مقابلے پر نہ آنا۔ میں ان کے ساتھ تمہارا بھی برا حشر کروں گا۔ گجر چوک والے اڈے میں تمہیں بشیر چیرا کا انجام یاد ہوگا۔ اب تم ہوٹل کے باہر موجود ان چاروں کتوں کو لے کر دفعان ہو جاؤ۔"

"بس .... اب تم اپنی بکواس بند کرو۔" یکایک کبیر کی سرد آواز ابھری۔ میں کالا ناگ سے الجھ کر اسے یکسر فراموش کر بیٹھا تھا۔ میں اس کی طرف پلٹا اور اپنی جگہ تھم کر رہ گیا۔ اس کے ہاتھ میں لمبی نال والا پستول نظر آ رہا تھا۔

"مجھے نگینہ ملے یا نہ ملے .... مگر تم آج زندہ نہیں بچو گے۔" اس نے سفاک لہجے میں کہا اور ٹرائیگر دبا دیا۔



کبیر کے تیور خطرناک تھے۔ مجھے اس کی آنکھوں میں وہی وحشیانہ چمک دکھائی دے رہی تھی جو شکار کو دیکھ کر درندوں کی آنکھوں میں اتر آتی ہے۔ اس نے بلا توقف اپنے پستول کا ٹرائیگر دبا دیا تھا۔ اس کا یہ عمل اس قدر غیر متوقع تھا کہ میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ کمرے کی فضا میں کھٹکے کی آواز گونجی مگر کچھ بھی نہ ہو سکا۔ وہ اپنے اناڑی پن اور غیر معمولی جوش کے باعث پستول کا سیفٹی کیچ ہٹانا بھی بھول گیا تھا۔

میرے لئے بس اتنا ہی موقع کافی تھا۔ میں زخمی درندے کی طرح اس کی طرف بڑھا اور وحشیانہ انداز میں اسے رگیدتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کے سر کے عقبی حصے پر دیوار سے ٹکراؤ کے باعث لگنے والی ایک ہی شدید ضرب نے اسے نڈھال کر دیا۔ اس کے ساتھ میرے برستے مکوں اور لاتوں نے اس کا رہا سہا دم خم بھی نکال دیا۔ کبیر سے معرکہ آرائی کے دوران میں گجر چوک کے بدنام ہسٹری شیٹر کالا ناگ سے بھی غافل نہیں تھا۔ تاہم حیرت انگیز طور پر اس نے کوئی حرکت نہیں کی۔ وہ آنکھیں پھاڑے ہم دونوں کو باہم دست و گریبان دیکھتا رہ گیا۔ جوں ہی میں نے محسوس کیا، کبیر کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے ہیں، میں پیچھے ہٹا اور ایک ہی جست میں کالا ناگ کے ہاتھ سے نکلے پستول پر جا گرا۔ کبیر کے پستول کی مجھے کوئی پرواہ نہیں تھی کیونکہ وہ مجھے رگیدنے کے دوران اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور ایک کونے میں جا گرا تھا جہاں تک ان دونوں کے لئے رسائی حاصل کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

وہ دونوں نہتے اور مکمل طور پر میرے رحم و کرم پر تھے۔ میں نے اپنے میگارد کی نال کا رخ ان کی طرف کیا اور کہا۔

"دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر دیوار کی طرف گھوم جاؤ۔"

میں نے کالا ناگ کی آنکھوں سے غیظ کے شعلے نکلتے محسوس کئے تاہم اس نے میرے حکم کی تعمیل میں اپنا رخ موڑا تھا۔ کبیر بھی بری طرح کراہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مجھے اس کی ٹانگوں کی لرزش صاف طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ میری بے رحمانہ ضربوں نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ وہ دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا تاہم اس کے ہاتھ سر تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے دیوار کا سہارا لیا ہوا تھا ورنہ شاید وہ کھڑا بھی نہ ہو سکتا۔

میرے دل میں آئی، ان دونوں کے ہاتھ پاؤں باندھ دوں۔ مگر فوری طور پر اپنے قریب مجھے ایسی کوئی شے نظر نہ آ سکی جسے اس مقصد کے لئے استعمال کیا جا سکتا۔ وہ دونوں دیوار کی طرف منہ کئے کھڑے تھے۔ اس لئے میری نگاہ غسل خانے کے دروازے کی طرف گئی۔ وہ بے آواز کھل گیا تھا اور وہاں کنیز حیران نظروں سے کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کی ہدایت کی اور اشارے سے بلایا۔ وہ دبے قدموں چلتی ہوئی میرے پاس آئی۔ میں نے کوئی لفظ ادا کئے بغیر اس کا ہاتھ تھاما اور دروازے کی طرف بڑھا۔ میں ایک لمحہ وہاں رکنا نہیں چاہتا تھا۔ اس وقت تک

یقیناً نگینہ کی نگاہ کبیر پر نہیں پڑی تھی ورنہ وہ اسے پہچان کر میری مدد سے بھی دستبردار ہو سکتی تھی۔ ویسے بھی کبیر ایک طرح سے اس کا عامل تھا، وہ اس کی بات کو رد کر ہی نہیں سکتی تھی۔

نگینہ کی آنکھوں میں خوف کے ساتھ بے شمار سوال تھے مگر وہ خاموش رہی۔ کمرے سے باہر نکل کر میں نے دروازہ بند کر دیا اور نگینہ کو لئے عقبی زینے کی طرف دوڑا۔ مجھے معلوم تھا کہ کالا ناگ فوراً موبائل پر نیچے موجود اپنے ساتھیوں کو خبردار کر سکتا تھا اس لئے میں گراؤنڈ فلور پر پہنچتے ہی بیرونی دروازے کی بجائے عقبی سمت کی ایک راہداری میں بڑھ گیا اور ہوٹل کے پچھلے حصے کی طرف آ گیا۔ یہ انڈر گراؤنڈ کار پارکنگ تھی۔ میں نگینہ کو لئے عقب کی ایک ذیلی سڑک پر آ گیا اور دائیں بائیں ٹیکسی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ ٹیکسی کہیں دکھائی نہ دی۔ میں ایک طرف دوڑ پڑا۔ دفعتہً مجھے اپنے پیچھے دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے دوڑتے دوڑتے گردن گھما کر دیکھا۔ کالا ناگ کے دو بدمعاش ہاتھوں میں پستول تھامے ہماری طرف دوڑے آ رہے تھے۔

”رُک جاؤ .... ورنہ گولی مار دی جائے گی۔“ ایک نے چلا کر مجھے دھمکی دی۔ جواب میں، میں نے دیوار کی آڑ لے کر میگارد سے ان پر فائر جھونک دیا۔ میرے میگارد نے خاموش گولی اُگلی۔ میں نے اس کی ٹانگ کا نشانہ لیا تھا۔ وہ تیورا کر گرا۔ اسی اثناء میں اس کے دوسرے ساتھی نے فائر کر دیا۔ گولی میرے چہرے کے قریب سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ میں نے شست باندھی اور اس کی طرف بھی خاموش گولی ارسال کر دی۔ اس کے بعد ایک لمحہ ضائع کئے بغیر نگینہ کو ساتھ لے کر دوڑتا چلا گیا۔

فوراً ہی ایک ٹیکسی کھڑی ہوئی نظر آئی۔ ٹیکسی ڈرائیور اس کی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور نگینہ کو اندر دھکیلنے کے بعد خود بھی عقبی نشست پر سوار ہو گیا۔ میگارد میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے بلا توقف اسے ٹیکسی ڈرائیور کی گردن پر رکھ دیا۔

”ٹیکسی دوڑاؤ .... جلدی کرو۔“ میں نے غرا کر کہا۔ وہ بھی کوئی ضدی پٹھان تھا۔ اس نے ٹیکسی آگے بڑھانے کی بجائے غصیلے لہجے میں کہا۔

”یہ کھلونا جیب میں رکھ لو۔ کرایہ دو گے تو میں تمہیں دنیا کے آخری کنارے پر لے جاؤں گا۔“

میں نے اس کی نفسیات سمجھتے ہوئے اس کی فطرت کے مطابق نرمی سے کہا۔ ”اچھا، اچھا خان صاحب! آپ کی مہربانی، ہمارے پیچھے دشمن لگے ہوئے ہیں۔ آپ کو اللہ کی قسم، یہاں سے فوراً نکل چلیں۔ میں آپ کو پورا کرایہ دوں گا۔“

”یہ ہوا نا بات خوچہ!“ اس نے مسرت انگیز انداز میں کہا۔ ”اب تم ہمارا کمال دیکھنا......... ہمارا ٹیکسی دیکھنا......... اس کا رفتار دیکھنا.........“ وہ تو جانے کیا کیا دکھانے پر آمادہ تھا مگر میں نے ہلکی سی تھپکی دی تو اس نے زبان کے جوہر دکھانا بند کر کے گیئر لگایا اور جھٹکے سے کلچ چھوڑ دیا۔ اس دوران میں وہ ایکسیلیٹر کو خاصا سے کچھ زیادہ دبا چکا تھا۔ نتیجتاً ایک تیز چرچراہٹ کے ساتھ ٹیکسی آگے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

”کیا کوئی عشک مشک (عشق مشق) کا چکر ہے؟“ ذرا آگے بڑھنے کے بعد اس نے گردن گھما کر ہم دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے انداز میں مجھے کھلنڈرے پن کی جھلک محسوس ہوئی۔

”ہاں لالہ!......... ایسا ہی سمجھ لو۔“ میں نے اس کی جرح سے بچنے کے لئے اس کی تائید کرنا ضروری سمجھا۔

”خوچہ......... فکر ماکوا (فکر نہ کرو) ام تمارے ساتھ ہے۔ ام نے بی گل بدن سے ایسا ہی مارا ماری

عشق کیا تھا۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

میں اس کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے توصیفی انداز میں بولا۔ ”پھر تو لالہ! تم ضرور کامیاب ہوا ہو گا اپنے ق میں۔ اس لئے ہم پر یہ مہربانی کر رہے ہو۔“

”ہاں ....ہاں۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ گل بدن شاید اس کی کوئی محبوبہ تھی جو اب ا کی بیوی بن چکی تھی۔ وہ ٹیکسی دوڑانے لگا۔ میں بار بار عقب میں دیکھے جا رہا تھا۔ تب پھر اچانک میں نے اسی سبز رنگ کی ہائی روف کو تعاقب میں آتے دیکھا۔ میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔ پھر خان رائیور سے کہا۔

”لالہ! دشمن ہمارے پیچھے آ رہے ہیں۔ سبز رنگ کی گاڑی میں۔“

”خوچہ! سبز رنگ کیا ہوتا ہے؟“ اس نے اُلجھ کر پوچھا۔

”نسواری رنگ کا گاڑی بابا!“

”او ....اچھا، اچھا۔ ایسا بولو نا .... پر تم بے فکر رہو، امارا سائے تک بی نہیں پہنچے گا۔“ اس نے کہا اور ٹیکسی کی رفتار بڑھائی۔ اب وہ بھی گاہے گاہے بیک ویو مرر میں دیکھتے ہوئے ٹیکسی دوڑائے جا ا تھا۔

”لالہ! تم بہت بہادر اور خدا ترس آدمی نظر آتے ہو۔ ہمارے دشمن بہت خطرناک اور چالاک ہیں۔ یا تم انہیں چکر دے سکو گے؟“ میں نے کسی خیال کے تحت اس سے کہا۔ بصورتِ دیگر خود میرا ارادہ رائیونگ سیٹ سنبھالنے کا تھا۔ اس کی رگ پھر پھڑک اُٹھی۔

”او خدائی خوار! تم ام کو بالکل ہی پھٹیچر سمجھتا ہے۔ ام نے تمہیں بتایا نہیں کہ ام بھی گل بدن کے اتھ ایسا ہی مارا ماری والے حالات سے گزر چکا ہے۔“

”اچھا، اچھا لالہ! تمہاری مہربانی۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ ٹیکسی ہی نہ روک ے۔ اچانک عقب سے گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ اُبھری۔ ٹیکسی اس وقت مین شاہراہ کی طرف موڑ رہی تھی۔ ایک کان پھاڑ دھماکا ہوا اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ٹیکسی کا ٹائر برسٹ ہو گیا تھا۔ ٹیکسی قابو ہو کر سڑک کے کنارے بنے اوپن ایئر ہوٹل کے احاطے میں داخل ہو گئی۔ یہاں لوگ میزوں کے ب کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ وہ فائرنگ اور ٹائر برسٹ کے دھماکوں پر ہماری طرف متوجہ ہوئے، پھر ٹیکسی ے قابو اپنی طرف آتے دیکھ کر اٹھ دوڑے۔ شکر تھا کہ خر دماغ ڈرائیور نے فوراً اسٹیئرنگ پر قابو پاتے ئے ٹیکسی روک دی۔ میں نگینہ کا ہاتھ پکڑے بے پھرتی کے ساتھ دروازہ کھول کر باہر لپکا۔ گولیوں کی اک بوچھاڑ نے ہمارا ناکام تعاقب کیا تھا۔ میں جھکا جھکا دوڑتا ہوا ہوٹل کے احاطے سے دوسری طرف گیا۔ ہمارے آس پاس راہ گیروں کی چیخ پکار پھیل گئی تھی۔ بڑی زبردست ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ میں تھا کہ دشمن نگینہ کی بجائے صرف مجھے ہی نشانہ بنانا چاہتے تھے۔ میں اندرون شہر مصروف بازار کی طرف یا۔ یہ ”یادگار چوک“ کا بہت معروف اور مصروف بازار تھا۔ دوپہر میں بھی یہاں خاصا رش نظر آتا تھا۔

میں ایک دکان میں گھس کر دوسری طرف نکل آیا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے مجھے ٹھٹک کر رکنا پڑا۔ نے سے کالا ناگ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ دوڑتا ہوا دکھائی دیا۔ ان کا رخ میری ہی طرف تھا۔ ان ہاتھ خالی تھے۔ مجھے تو ہتھیار بند کالا ناگ اور کبیر سے بھی خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ اس وقت تو وہ نہتا نظر آ رہا تھا لہٰذا میرا حوصلہ کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ تاہم میں اس موقع پر اس سے براہِ راست ٹکراؤ نا چاہتا تھا۔ اس کی وجہ نگینہ کا میرے ساتھ ہونا تھا۔ میں نے اسے غچا دینے کے لئے اطراف میں

دیکھا۔ ایک موٹر سائیکل سوار شخص موٹر سائیکل سے اتر کر اسے اسٹینڈ کرنے والا تھا۔ میں لپک کر اس کے پاس پہنچا اور اسے طوفانی دھکا دیا۔ اس اچانک افتاد نے اس کے اوسان خطا کر دیئے اور وہ بے خبری کے عالم میں زمین پر لڑھکنیاں کھانے لگا۔ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر میں نے کک لگائی۔ موٹر سائیکل اسٹارٹ ہو گئی۔ اس وقت تک نگینہ میرے پیچھے بیٹھ گئی تھی۔ میں نے ایک جھٹکے سے بائیک آگے بڑھا دی۔

راہ گیروں کو راہ سے ہٹانے کی غرض سے میں مسلسل ہارن بجا رہا تھا۔ اس کے علاوہ کلچ لیور اور ایکسلیٹر کے ماہرانہ استعمال کے باعث موٹر سائیکل کے انجن کی تیز، کرخت اور بھیانک آواز بھی وہاں موجود لوگوں کو دہلا رہی تھی۔ وہ گھبرا کر دائیں بائیں ہوتے جا رہے تھے۔ میں تیزی کے ساتھ مین شاہراہ پر آ گیا تو سامنے سے سبز رنگ کی ہائی روف کو آتے دیکھا۔ ڈرائیونگ کالا ناگ اور کبیر کے گرگے کے ہاتھوں میں تھی جبکہ پسنجر سیٹ پر کبیر بیٹھا ہوا تھا۔

میں نے چلا کر نگینہ کو مضبوطی سے سیٹ پر جمے رہنے کی تاکید کی اور ایک پاؤں سڑک پر رکھ کر بائیک کے بریک پر پاؤں رکھ دیا۔ بائیک کا پچھلا پہیہ جام ہوا اور وہ تیزی سے گھوم گئی۔ میں نے دوبارہ ایکسلیٹر کو گھمایا اور بائیک پچھلے ٹائر پر الٹ ہوگئی مگر میں نے مضبوطی سے ہینڈل پر قابو پائے رکھا۔ بائیک گرجتی ہوئی آگے کو دوڑی۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں سن ہو کر رہ گیا۔ سڑک کے عین بیچوں بیچ مردود کالا ناگ اپنے لمبے چوڑے وجود کے ساتھ ٹانگیں مضبوطی سے سڑک پر جمائے ہاتھوں میں پستول تھامے کھڑا تھا۔ پستول کی نال کا رخ میری طرف تھا۔ بدہیئت ہونٹوں پر بڑی سفاک مسکراہٹ تھی۔ لیکن میں نے بھی اپنی بائیک کی رفتار کم نہ کی۔ میرے ارادے دیکھ کر اس پر بدحواسی طاری ہوگئی تھی۔ اسی گھبراہٹ میں اس نے گولی چلا دی۔ ایک دھماکا ہوا اور مجھے اپنے دائیں شانے میں دہکتی ہوئی سلاخ پیوست ہوتی محسوس ہوئی۔ میرے حلق سے غیر ارادی کراہ خارج ہوگئی۔ میرے عقب میں بیٹھی ہوئی نگینہ نے بھی ہراساں ہو کر چیخ ماری تھی۔ میں نے اپنے اوسان بحال رکھے اور کالا ناگ کے قریب سے ''زن'' سے گزر گیا۔ میرا دایاں شانہ زخمی ہو چکا تھا۔ اس میں گولی پیوست تھی۔ تکلیف کی شدت سے دائیں بازو کی طاقت سلب ہونے لگی تھی لیکن میں نے بائیک کی رفتار کم نہ کی۔ میرے زخمی شانے سے خون بہہ رہا تھا مگر مجھے اس کی پرواہ نہ تھی۔ میں تو صرف نگینہ کو لے کر اس ''ڈینجر اسپاٹ'' سے نکل جانا چاہتا تھا۔

''نادر! ......تم ......تم بہت زخمی ہو۔'' اچانک نگینہ نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔ اس نے مجھے مضبوطی سے تھامے رکھا تھا اس لئے اسے بھی خون کی چپچپاہٹ محسوس ہوگئی تھی۔ ویسے بھی اس نے گولی چلنے اور میری کراہ کی آواز سن لی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی۔

بائیک اب مین شاہراہ سے نکل کر بیرون شہر نکلنے والی جی ٹی روڈ پر آ گئی تھی۔

''نادر! ......تم ......بہت زخمی ہو۔ پلیز اپنے بارے میں کچھ سوچو۔'' نگینہ نے دوبارہ کہا۔ اس کے لہجے میں پریشانی اور حد درجے کی تشویش تھی۔ اسے اپنے بارے میں اس قدر متفکر پا کر جیسے میرے مضروب شانے کی اذیت کا احساس ہوا ہو چلا تھا۔ تاہم اسے سمجھانا ضروری تھا، لہٰذا بولا۔

''نگینہ صاحبہ! آپ میری فکر نہ کریں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ کبیر نے پولیس کا سہارا لینے کی بجائے ایک بدنام زمانہ گینگسٹر کالا ناگ اور اس کے گرگوں کا سہارا لیا تھا۔ یہ لوگ بہت خطرناک ہیں۔ میں ان کا مقابلہ کر سکتا ہوں مگر میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میری نگہت بستر علالت پر زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہی ہے اور میں اس کی اس مختصر ہوتی زندگی کی ان گھڑیوں کو ہر ممکن طریقے سے طویل کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے مت روکیں نگینہ صاحبہ! اس وقت میرے سر پر صرف اور صرف

محبوب بیوی کی زندگی بچانے کی دُھن سوار ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں آپ کو بھی نہیں بھولا۔ پ کی حفاظت بھی میرا اولین فرض ہے۔ میں اپنی ذاتی غرض کی خاطر آپ پر ذرا بھی کوئی آنچ نہیں نے دوں گا۔ نگینہ صاحبہ! میری نظروں میں آپ کی حیثیت ایک عظیم محسن کی سی ہے۔ اگر ......اگر انخواستہ آپ کو ذرا بھی کچھ ہوا تو میں ساری زندگی خود کو معاف نہیں کر پاؤں گا۔'' میں اتنا کہہ کر وش ہو گیا۔ مجھے اپنے عقب میں بیٹھی نگینہ کی رقت آمیز سسکاری سنائی دی۔

''کیا ہوا؟ ......کیا آپ رو رہی ہیں؟'' میں نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔ اس نے کوئی اب نہ دیا۔ اچانک نگینہ نے چلا کر مجھے خبردار کیا۔

''نادر! دشمن کی گاڑی تعاقب میں آ رہی ہے۔''

میں سناٹے میں آ گیا اور موٹر سائیکل کے عقب نما میں دیکھا۔ سبز رنگ کی ہائی روف فل اسپیڈ سے وڑی چلی آ رہی تھی۔ میں نے بھی بائیک کی رفتار بڑھا دی۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے ازہ لگایا کہ ہائی روف میں اس وقت صرف تین ہی افراد ہو سکتے تھے۔ کالا ناگ، کبیر اور ان کا ایک رگا۔

ہائی وے مضافات کی طرف جا رہی تھی۔ دشمنوں سے پیچھا چھڑانا لازمی تھا۔ سڑک کے دائیں بائیں اڑی سلسلہ تھا۔ آگے ٹول پلازہ تھا۔ مگر اس سے ذرا پہلے ہی سڑک کے پہلو سے ایک تنگ سی بل کھاتی سڑک پہاڑی سلسلے کی طرف جاتی دکھائی دی۔ میں نے فوراً اسی ذیلی سڑک کی طرف بائیک موڑ دی۔

میں نہیں جانتا تھا کہ بائیک میں کتنا فیول باقی تھا۔ مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ میری بائیک ان کی فور ل کی رفتار کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ وسط شہر کی بات کچھ اور تھی۔ چنانچہ میں نے ایک خطرناک فیصلہ کیا۔ روف میں کبیر کی متوقع موجودگی سے مجھے اس بات کی مطلق تشویش نہ تھی کہ یہ لوگ ہم پر فائرنگ کریں ے۔ البتہ دوسری حقیقت کا انہیں بھی بہ خوبی اندازہ ہوگا کہ اب اس طویل اور ویران سڑک پر یہ مجھے کسی ن بھی ''چھاپ'' سکتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ میں نے اب ان سے دو دو ہاتھ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

لمبا تنگ موڑ کاٹتے ہی میں نے بائیک روک دی اور نگینہ کو لئے ایک چٹان کی آڑ میں آ گیا اور اس ے بولا۔ ''نگینہ صاحبہ! آپ ادھر ہی موجود رہیں۔ میں دیکھتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے اپنے اور کالا ے چھینے ہوئے پستول کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ ہائی روف غراتی ہوئی تیزی سے قریب آنے ۔ میرے شانے سے بہتا ہوا خون جمنے لگا تھا۔ میں نے سنگی آڑ سے نزدیک ہوتی ہوئی ہائی روف کی سکرین کے پار دیکھا، ڈرائیونگ سیٹ پر ان کا گرگا تھا۔ برابر میں کالا ناگ اور پچھلی نشست پر مجھے ر کی بھی جھلک دکھائی دے گئی۔ ہائی روف نے موڑ کاٹا اور ''زن'' سے آگے نکل گئی۔ میں نے بے ر ایک ٹھنڈی سانس خارج کی۔ پھر دوسرے ہی لمحے پلٹا، نگینہ کے پاس آیا اور اس کا ہاتھ پکڑے ی پہاڑی سلسلے کے تنگ دروں کی طرف بڑھ گیا۔ پھر ایک ویران گپھا دیکھ کر میں فوراً اس میں ہو گیا۔ گپھا اندر سے زیادہ گہری نہیں تھی۔ میں اندر جا کر بے دم سا ہو کر پتھریلی زمین پر گر گیا۔ کی تکلیف اور جریانِ خون نے مجھ پر نقاہت طاری کر دی تھی۔ میں پشت کے بل لیٹ گیا اور لمبے سانس لینے لگا۔ مجھے نگینہ کی طرف سے یہ ڈر بھی پیدا ہونے لگا کہ کہیں وہ ان حالات کی کشاکش سے ر واپسی کا فیصلہ نہ کر لے۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس کی زیادہ سے زیادہ ''ہمدردی'' حاصل کرنا چاہتا کہ اب یہی ایک طریقہ تھا اسے رام رکھنے کا۔ اس کی نگاہوں میں رشک تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ سب اسی کی وجہ سے تو کر رہا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ میں اپنی محبت کو بچانے کے لئے یوں

جان کی بازی لگائے بیٹھا تھا۔

دشمنوں کا خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ ذرا آگے جا کر انہیں جب میری بائیک کی آواز سنائی نہ دے گی تو وہ فوراً گاڑی روک کر بھوکے کتوں کی طرح میری تلاش میں پیدل ہی نکل پڑیں گے۔ مجھے شانے کی تکلیف نے نڈھال سا کر دیا تھا۔ دفعتہً مجھے اپنی پیشانی پر نرم و گداز ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ ہاتھ کیا تھا، کیا جاں فزا احساس تھا۔ وہ میرے درد اور دردِ دل کی دوا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ نگینہ نے اپنا ہاتھ میری پیشانی پر رکھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں کسی دور ویران جنگل کے تالاب کی سطح پر اُبھرتے اُداس چاند کا سا عکس جھلملاتا محسوس ہوا۔ چہرے پر ایک نامعلوم جذباتی سا ارتعاش تھا اور نرم و گداز لبوں پر بن کہے لفظوں کی موہوم سی تھرتھراہٹ۔

''نادر......!'' بے اختیار اس نے مجھے پکارا۔ ''تمہارا زخم......''

''میرا زخم بہت گہرا ہے نگینہ صاحبہ!'' میں نے مضروب شانے کی اذیت کو اندر ہی اندر پیتے ہوئے ہولے سے کہا۔ جانے کیوں اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

''آ......آپ......آپ رو کیوں رہی ہیں نگینہ صاحبہ؟'' میں نے بے اختیار تڑپ کر پوچھا۔

وہ گویا زخم پر جیسے اپنے ہاتھ کی ملائمت آمیزی کا تریاق رکھتے ہوئے رقت آمیز لہجے میں بولی۔ ''تم بہت زخمی ہو۔ پلیز، لوٹ چلو۔ میں تمہاری بیمار بیوی کے لئے کچھ کرنے کی کوشش کروں گی۔''

اس کی بات پر میرے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ اُبھر آئی۔ ''نہیں نگینہ صاحبہ! محبت کرنے والے آگے ہی آگے جاتے ہیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھیں گے تو پتھر کے بن جائیں گے۔''

''مگر یہ دیوانگی ہے۔'' نگینہ نے کہا۔

''محبت کا دوسرا نام دیوانگی ہی تو ہے نن......نگینہ صاحبہ!'' میری آواز ڈوبنے لگی تھی۔

''لل......لیکن یہ بھی تو سوچو کہ تم زندہ نہیں رہے تو تمہاری بیمار بیوی کا کیا ہوگا؟......وہ تو بے چاری پھر زندہ بھی نہ رہ پائے گی۔'' نگینہ سسکتے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''کوئی غم نہیں نگینہ صاحبہ! اگلے جہاں میں تو ہم دونوں مل جائیں گے نا۔ اور پھر میں اپنی نگہت کے سامنے سرخرو تو رہوں گا، میں اس کی جان بچانے کی خاطر کسی بھی مشکل سے پیچھے نہیں ہٹا۔''

اب تو نگینہ کی آنکھیں بھی چھلک پڑیں۔ میں چاہتا بھی یہی تھا کہ اسے اس حد تک متاثر کروں کہ وہ میرا ساتھ نہ چھوڑے۔ پھر یہی وہ لمحہ تھا، جب نگینہ کی یاسیت زدہ اور غم آگیں کیفیات کو بھانپتے ہوئے میرے ذہن میں یکبارگی ایک نہایت عجیب اور بالکل انوکھا خیال اُبھرا تھا اور یہ عجیب اور انوکھا خیال اس لئے میرے دل میں اُبھرا تھا کہ میں نے اب تک محسوس کیا تھا کہ نگینہ جب بھی میری فرضی کہانی کے ٹرانس میں آتی تو اداس سی ہو جاتی تھی۔ وہ کھو جاتی تھی۔ اس کے چہرے سے یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ اپنے دل و دماغ کو کریدنے کے عمل سے گزرتی تھی۔ کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ کیا جذبہ محبت میں اتنی بھی قوت نہیں ہے کہ وہ اپنی سوئی ہوئی محبت کو نہ جگا سکے؟......کیا محبت کا جذبہ اتنا کمزور بھی ہو سکتا ہے کہ اسے ایک خاص عمل کے ذریعے سلا دیا جائے جیسا کہ اس مردود و ملعون شیطان کیلاشی عامل عاروب نے نگینہ کے ساتھ کیا تھا۔ جبکہ یہ الوہی جذبہ تو خود ایک مسمریزم ہے، ایک عمل ہے، ایک سحر ہے۔ جس طرح لوہا لوہے کو کاٹتا ہے، عین اسی طرح سحر سے سحر کو کاٹا جا سکتا ہے۔ اس مردود کیلاشی عامل نے یقیناً نگینہ پر اسی طرح کی ہپناٹک تکنیک آزمائی تھی۔ مجھے مسمریزم یا ہپناٹزم کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات تو نہیں تھیں تاہم جہاں تک مجھے علم تھا، اس کے مطابق کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ بھلا

کوئی آخر کب تک اس عمل کے فریب میں رہ سکتا ہے؟ مجھے محبت کی قوت سے اس سحر کو توڑنے کی پیہم کوشش کرنا ہوگی۔ اس خیال نے مجھے اس لئے مہمیز کیا تھا کہ نگینہ خود بھی اپنی کچھ گم گشتہ یادوں کو اپنے ذہن میں لانے کی کوشش کرتی تھی۔ مجھے اس طرح اس کی خود کو کریدتی ہوئی سوچوں کو مزید تحریک دینا چاہئے تھی۔ بہ صورت دیگر مجھے ایک طویل اور کٹھن آزمائش سے گزرنا پڑتا۔ یہاں تک تو مسئلہ خود ہی حل ہو چکا تھا کہ نگینہ میری فرضی کہانی سے متاثر ہو کر جذبہ ہمدردی سے میرا ساتھ دینے پر مجبور ہوگئی تھی مگر اس سے آگے اہم مرحلہ ابھی باقی تھا یعنی کیلاش وادی میں داخل ہو کر اس کیلاشی عامل عاروب کا پتہ لگانا، پھر اسے اس پر مجبور کرنا کہ وہ نگینہ پر دوبارہ عمل کر کے اس کے دل و دماغ میں سوئی ہوئی ''میرے حصے'' کی یاد کو دوبارہ تازہ کر ڈالے۔ یہ کوئی آسان کام تو نہ تھا۔ چنانچہ میں نے اس لمحے یہ اٹل اور مستحکم فیصلہ کر لیا کہ میں خود بھی نگینہ کو SUGEST کرنے کی کوشش کروں گا۔ کیا معلوم اس کیلاشی عامل کا سحر ٹوٹ جائے گا اور نگینہ مجھے، میری دیوانہ وار چاہت کو پہچان لے۔ ایک امید تھی اور شاید کسی معجزے کا آسرا تھا۔

بہرطور میں نے اسے اپنی فرضی داستانِ غم کے اس قدر ٹرانس میں لے لیا تھا کہ میں جب بھی اس کا ذکر کرتا یا وہ پوچھتی ایسا ہی ہوتا تھا تاہم میں نے اسے آبدیدہ پا کر اس سے کچھ نہ کہا۔ میرے شانے کی تکلیف بڑھنے لگی تھی۔

ذرا ٹھہراؤ آیا تو زخم نے سرد ہو کر درد کرنا شروع کر دیا تھا۔ مجھ پر نقاہت کے باعث غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔ مگر اس وقت میری جان بلکہ میری محبت سولی پر لٹکی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی قوتِ ارادی کے بل پر تکلیف اور کمزوری کے بڑھتے ہوئے غلبے کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیا تھا۔ میری آنکھیں شدید نقاہت سے بوجھل ہو رہی تھیں مگر میں نے انہیں بند نہیں ہونے دیا۔ میں ڈھیلا پڑ کر خود کو بے ہوشی کی بھیانک وادیوں میں اترنے سے بچانے کی خاطر خود کو مصروف کرنا چاہتا تھا۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر اپنی قمیض اُتاری اور زخم کا جائزہ لیا۔ دائیں شانے پر ہنسلی کی ہڈی کے ذرا نیچے گوشت میں گولی پیوست تھی اور وہاں سرخ گاڑھا نشان موجود تھا۔ ایک قدرتی پروسس کے تحت خون بہہ بہہ کر جم چکا تھا جس کی وجہ سے خون بہنا از خود بند ہو گیا تھا۔ نگینہ نے میرا زخم دیکھ کر سسکاری لی تھی۔ پھر یکدم اپنے دوپٹے کو اتار کر اسے میرے زخم پر باندھنے کے لئے جھکی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر وہ دوپٹہ اسے اوڑھاتے ہوئے بولا۔

''نہیں نگینہ صاحبہ!......اس کی جگہ یہاں نہیں ہے۔ یہ زخم سوکھ چکا ہے۔ اسے باندھنے کی ضرورت نہیں۔''

''مگر......'' وہ یک دم بولی تو میں نے اس کی بات کاٹی۔

''اس پر اگر اب پٹی باندھوں گا تو زخم پھر سے رسنا شروع کر دے گا۔ کوئی موقع دیکھ کر میں اس کی باقاعدہ مرہم پٹی کرواؤں گا۔ ابھی میں دشمنوں کے گھیرے میں ہوں۔'' میں نے اپنی بات پوری کی ہی تھی کہ اچانک ایک آواز پر میں بری طرح چونک اٹھا۔ یہ بہت ہلکی آواز تھی۔ نگینہ نے شاید نہیں سنی تھی تاہم میرے چہرے پر چونکنے کے آثار دیکھ کر اس نے پوچھا۔

''کیا ہوا......؟''

میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اپنے ہاتھ میں کالا ناگ کا پستول پکڑ لیا۔ اس کے پستول میں ابھی کافی گولیاں تھیں۔ میرے میگارد میں دو تین ہی گولیاں باقی بچی تھیں جبکہ میرے کلیپر کے پستول کے فاضل راؤنڈز میرے پاس موجود تھے۔

میں نے قمیض پہن لی اور کالا ناگ سے چھینا ہوا پستول دائیں ہاتھ میں پکڑا۔ اس کے بعد نگینہ کو اپنی

جگہ پر رہنے کی تاکید کر کے گپھاہ سے باہر نکلنے کے لئے قدم آگے بڑھائے تھے کہ اچانک وہ آواز دوبارہ اُبھری۔ اسی وقت میرے زخم میں بھی شدید ٹیس اُبھری جس نے مجھے اندر تک بلبلا کر رکھ دیا۔ میں ایک بار پھر وہیں پتھریلی زمین پر بے سدھ سا لڑھک گیا۔ میری قوتِ ارادی جواب دینے لگی۔ نقاہت نے اس بار شدت سے حملہ کیا تھا۔ نگینہ میری طرف بڑھی۔ میرا دل و دماغ ماؤف ہونے لگا۔ میں بے ہوش نہیں ہونا چاہتا تھا۔ دشمن آس پاس منڈلا رہے تھے۔ میں نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے چبا ڈالے مگر بے سود۔ مجھ پر شدید غنودگی کا حملہ ہو چکا تھا۔ پہلے میرے ہاتھ سے پستول لڑھکا تھا، اس کے بعد شاید سر بھی ایک جانب ڈھلک گیا تھا۔ میں شاید بے ہوش ہو چکا تھا۔

❄ ❄ ❄

بے ہوش ہونے سے ایک لمحہ قبل مجھے یوں لگا تھا جیسے اب میری آنکھ عالمِ بالا میں ہی کھلے گی۔ کیونکہ کبیر اور کالا ناگ میرے لہو کی بُو سونگھتے پھر رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بے ہوشی کے عالم میں گولی مار کر ہلاک کر سکتے تھے۔ لیکن نہیں، مارنے والے سے تو بچانے والا زیادہ طاقت ور ہے۔ اسے ابھی میری زندگی عزیز تھی۔ اس نے ابھی مجھے انسان دشمن بھیڑیوں کے لئے موت بنانا تھا۔ اسے ابھی میری پاکباز محبت کی تکمیل منظور تھی۔

میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنے گرد نیم تاریکی محسوس کی۔ مجھے گھٹن کا بھی احساس ہونے لگا۔ چند ثانیے تک تو میرا دماغ سوچنے سمجھنے سے عاری ہی رہا لیکن پھر دوسرے ہی لمحے یکلخت میرے نیم غنودہ ذہن کی اسکرین پر ایک جھماکا ہوا اور گزرے واقعات کی پوری فلم "فاسٹ فارورڈ" کی طرح گھوم گئی۔ میں نے سب سے پہلے نگینہ کو پکارا۔ وہ میرے سرہانے ہی موجود تھی۔

"اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" اس کی تشویش زدہ مگر مدھر آواز نے جیسے مجھے سرشار کر دیا۔ طمانیت کی لہر سی میرے پارہ پارہ وجود میں دوڑ گئی۔ میں نے اسے دیکھا اور مضطربانہ بے چینی سے کہا۔

"نن......... نگینہ صاحبہ! آ......... آپ خیریت سے تو ہیں نا؟ .... یہ کون سی جگہ ہے؟" میں آنکھیں پھاڑے نیم تاریکی میں گھورنے لگا۔

مجھے اپنے زخم میں بھی اب جلن کی بجائے ٹھنڈک کا احساس ہونے لگا۔ تب میں نے دیکھا کہ میرا اُوپری جسم برہنہ تھا اور میرے دائیں شانے کے زخم پر کوئی عجیب و غریب مرہم لگایا گیا تھا۔ یہ شاید کوئی دیسی طریقہ تھا۔

ہم دونوں ایک پھونس کے جھونپڑے میں تھے۔ جس کے وسط میں چھت کو سہارا دیتے بدنما بانس سے مدھم لو کی حامل لالٹین جھول رہی تھی۔ دروازے پر بوسیدہ سا ٹاٹ جھول رہا تھا۔ باہر شام جھک آئی تھی۔ جھونپڑی کے محدود ماحول میں سردی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی، یہ سب کیا تھا......... ہم کہاں تھے؟

تاہم مجھے نگینہ نے بتایا کہ میرے بے ہوش ہوتے ہی وہ بری طرح پریشان ہو گئی تھی۔ وہ میرے دشمنوں کے ڈر سے باہر کسی مدد وغیرہ کی تلاش میں بھی گپھاہ سے نہیں نکل سکتی تھی۔ لیکن پھر جب اس نے دیکھا کہ میرے زخم کا منہ ایک بار پھر کھل گیا تھا اور اس میں سے خون رسنے لگا تو اسے مدد کے لئے باہر نکلنے کا رسک لینا پڑا۔ تب اسے اتفاق سے ایک خانہ بدوشوں کا مختصر سا قافلہ جاتا دکھائی دیا اور نگینہ نے ان سے مدد کی درخواست کر ڈالی۔ پھر وہ لوگ مجھے اٹھا کر یہاں لے آئے اور ایک بوڑھے طبیب نے دیسی نسخے کے تحت میرے زخم کی مرہم پٹی کر دی۔ نگینہ نے بحالت مجبوری انہیں یہی بتایا کہ ہم دونوں

ں بیوی تھے اور اپنے دشمنوں سے جان بچانے اس علاقے میں آئے تھے اور اس تگ و دو میں مجھے ی بھی لگی تھی۔ بوڑھے طبیب نے اپنی مہارت سے گولی نکال دی تھی اور اب ہم اس کے مہمان تھے۔
ں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر اپنی پتلون کی جیبوں میں رقم کی موجودگی کی تسلی کرنے کے بعد نگینہ
بولا۔ "میرا خیال ہے، میرے دشمن بھٹک گئے ہیں۔ ہمیں فوراً نکل جانا چاہئے۔"

میری بات پر نگینہ قدرے پریشانی سے بولی۔ "ابھی ہمارا نکلنا خطرے سے خالی نہ ہوگا۔ تمہارا زخم بار پھر تازہ ہو سکتا ہے۔ اور پھر کیا خبر باہر پہاڑی وادی کی بھول بھلیوں میں دشمن گھات لگائے بیٹھے ں۔ اب تو اندھیرا ابھی پھیلنے لگا ہے۔"

"ہمیں اسی اندھیرے سے فائدہ اٹھانا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"لیکن نادر! .... میں ابھی باہر نکلنے کے حق میں نہیں ہوں۔ صبح تو ہو لینے دو کم از کم۔ ہم تو اب بارہ شہر بھی نہیں جا سکتے۔" وہ بولی۔ پھر باہر کسی کے ہولے سے کھانسنے کی آواز اُبھری۔ اس کے بعد ٹ ہٹا، ایک تنومند شخص اندر داخل ہوا۔ وہ ایک نوجوان لڑکا تھا۔ نگینہ نے مجھے سرگوشی میں بتایا کہ یہ بیب کا بیٹا زوار تھا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ بہ غور عجیب نظروں سے میرے رہانے بیٹھی نگینہ کو چند ثانیے گھورتا رہا۔ مجھے اس کا یہ انداز انتہائی ناگوار گزرا۔ پھر میرے ذرا قریب آ کر بے تاثر مسکراہٹ سے بولا۔ "اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" لہجہ مقامی اور خاصا اکھڑ سا تھا۔ تاہم اس نے اردو میں ہی بات کی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں اب .... تم لوگوں کا بہت بہت شکریہ۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں تمہارے بابا کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں، جنہوں نے میرا علاج کیا۔ وہ کہاں ہیں؟"

میری بات پر اس نے ایک بار پھر معنی خیز نظروں سے نگینہ کو گھورا، پھر مجھ سے بولا۔

"شکریے کی کیا بات ہے؟ یہ ہمارا فرض تھا۔ بابا اس وقت سو رہا ہے۔ مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری خیریت معلوم کرتا رہوں۔"

وہ ذرا رُکا تو میں نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری مہربانی۔ کیا تم ہماری ایک اور مدد کر سکتے ہو؟"

"ہاں .... بولو۔"

"ہم یہاں سے نکل جانا چاہتے ہیں۔"

"اس وقت کہاں جاؤ گے؟" وہ بے تاثر لہجے میں بولا۔ اس نے ایک بار پھر نگینہ کی طرف دیکھا۔ مجھے اس کا یوں بار بار نگینہ کو گھورتے رہنا بہت ناگوار گزر رہا تھا۔ تاہم میں نے کہا۔

"تم کسی سواری کا بندوبست کر دو۔ ہم کسی ایسے قصبے کی طرف نکل جانا چاہتے ہیں جہاں سے ہمیں ...ال سکے۔"

وہ کچھ سوچنے کے انداز میں مستفسر ہوا۔ "تمہارا منزل کون سا ہے؟"

"چترال۔" بے اختیار میں نے کہا۔ "ہم چترال کی طرف روانہ ہونا چاہتے ہیں۔"

"اچھا........." وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ "اچھا ٹھیک ہے، ابھی تم آرام کرو۔ میں صبح منہ اندھیرے ...ہاں آؤں گا۔ ایک خچر گاڑی بھی ساتھ لاؤں گا۔ یہاں سے پندرہ سولہ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا ...بہ ہے۔ وہاں سے تم کو بس تو نہیں البتہ کوئی جیپ مل جائے گی، جو تمہیں اس علاقے سے نکال کر وادی ...رال تک پہنچا دے گی۔"

"تمہاری بہت مہربانی۔" میں نے ممنون لہجے میں کہا۔ پھر اس نے نگینہ کی طرف ایک عجیب سی نگاہ ڈالی۔ اس کے بعد وہ نگینہ کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے دوبارہ بولا۔ "اگر تمہاری یہ زنانی چاہے تو میری بیوی کے پاس سو سکتی ہے۔"

"نہیں .... اس کی ضرورت نہیں۔ میں ادھر ہی ٹھیک ہوں۔" اس کی بات پر نگینہ نے فوراً اس سے سپاٹ لہجے میں کہا۔

وہ جانے کے لئے پلٹا۔ پھر جیسے اچانک اسے کچھ یاد آیا۔ وہ رک گیا۔ پھر اس مرتبہ میری بجائے نگینہ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"تم لوگوں کا کن سے دشمنی چل رہا ہے؟"

نگینہ اس کے سوال پر ذرا گڑبڑا سی گئی مگر میں نے جواباً کہا۔ "ہمارا اپنا قبیلہ ہی ہماری جان کا دشمن بن گیا ہے۔"

"اوہ .... اچھا۔ ویسے بابا نے مجھے بتایا تھا کہ اس وادی میں تمہارا دشمن تم دونوں کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔" اس نے آخر میں عجیب سے لہجے میں کہا۔ "لیکن تم فکر نہ کرو۔ تمہارے دشمن یہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔" یہ کہہ کر وہ خاموشی سے لوٹ گیا۔

"مجھے اس کے ارادے کچھ ٹھیک نظر نہیں آتے۔" اس کے جانے کے بعد نگینہ نے سرگوشی میں مجھ سے کہا۔ میں اس کی بات جھٹلا کے اسے دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اسے محتاط رہنے کی خاطر تائیداً کہا۔

"ہاں .... مجھے بھی اس خانہ بدوش کی آنکھوں میں خباثت محسوس ہوئی ہے۔ لیکن نگینہ صاحبہ! آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ میں اس سے ایک پل کے لئے بھی غافل نہیں رہوں گا۔ اگر اس نے آپ کے ساتھ غلط حرکت کرنے کی ذرا سی بھی کوشش کی تو اس کا بہت برا حشر کروں گا۔"

میرے جوشِ غیظ سے لبریز لہجے پر نگینہ عجیب سی نگاہوں سے مجھے تکنے لگی۔ پھر اس کے گداز لبوں پر موہوم سی مسکراہٹ اُبھری اور بولی۔

"پھر تمہارا کیا خیال ہے؟ اس پر بھروسہ کیا جائے کہ کل صبح منہ اندھیرے یہ ہمیں ایک خچر گاڑی میں کسی مطلوبہ قصبے تک چھوڑ دے گا؟"

"دیکھتے ہیں .... صبح تو ہو لینے دیں۔" میں نے کہا۔ پھر اس کی آنکھوں میں تھکن اور نیند کے تاثرات بھانپ کر بولا۔ "آپ ایسا کریں، تھوڑا سا آرام کر لیں۔ میری تو شاید طویل بے ہوشی میں نیند پوری ہو گئی ہے۔"

اسے شاید سردی لگ رہی تھی۔ میں نے گرم سویٹر پہن رکھا تھا، وہ میں نے اسے پہنا دیا۔ سوکھی پیال پر ایک ہی بستر تھا جس پر میں بیٹھا ہوا تھا اس لئے میں نے نگینہ کو اس پر آ جانے کا کہا اور اسے ڈھانپنے کے لئے چادر تھما دی۔ وہ جھجک رہی تھی۔ میں نے اس کے دائیں کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے مضبوط اور مستحکم لہجے میں اس سے کہا۔

"نگینہ صاحبہ! آپ بے فکر ہو کر سو جائیں۔ بس اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہوں گا۔" یہ کہہ کر میں جھونپڑی سے باہر آ گیا اور دروازے کے قریب سکڑ سمٹ کر بیٹھ گیا۔ دور پہاڑیوں پر سرد شام اتر رہی تھی اور وادی میں سناٹا چھانے لگا تھا۔ مجھے چند اور جھونپڑیاں بھی دکھائی دی تھیں مگر وہ ہماری جھونپڑی سے خاصے فاصلے پر تھیں۔ یہ جھونپڑی الگ تھلگ مقام پر ایک ہموار قطع پر تھی۔ آسمان صاف تھا۔ وقت گزرتا

رہا۔ نگینہ اندر گہری نیند سو رہی تھی۔

سرد شام اب ٹھٹھرتی رات کی تاریکی میں بدل گئی تھی۔ شفاف آسمان پر ننھے منے تارے ٹمٹمانے لگے تھے۔ میرے عین سامنے ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر دمکتا چاند کسی پہاڑی دوشیزہ کے کنوارے اور نوخیز مکھڑے کی طرح جھانکتا نظر آ رہا تھا۔ دور کہیں وادی میں پہاڑی پرندے "بو بو" کی سوگوار سی "ہنکار" ہوک بن کر اُبھری۔ رات دبے پاؤں سرک رہی تھی۔ بھاری سِل کی طرح گزرنے والا ہر پل ٹھٹکے ہوئے دل و دماغ پر آنے والے وقت کے اندیشوں کی اسرار بھری دھمک دیتا ہوا گزر رہا تھا۔

اچانک مجھے کہیں قریب ہی آہٹ سنائی دی۔ میں نے چونک کر آہٹ کی سمت دیکھنے کی کوشش کی۔ چٹکی ہوئی چاندنی میں مجھے ایک سایہ نظر آیا۔ میرے اعصاب تن گئے اور میں نے بلا تاخیر اپنا پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ غالباً اس پراسرار سائے نے بھی مجھے ٹھٹکتے دیکھ لیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ یکدم ایک طرف چھپنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اسے آواز دی۔ "کون ہے.........؟"

وہ رک گیا۔ اس نے گرم اور موٹی چادر کی بکل ماری ہوئی تھی۔ میرے پکارنے پر وہ میری طرف بڑھا۔ میں نے پستول والا ہاتھ اس کی طرف کر دیا۔ وہ قریب آیا تو میں اسے پہچان گیا۔

وہ خانہ بدوش طبیب کا بیٹا زوار ہی تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت ہلکورے لے رہی تھی۔

تب پھر اچانک میں نے اپنے قدموں کے سامنے پتھریلی زمین پر چاند کی روشنی میں ایک اور سایہ متحرک ہوتے دیکھا۔

'کوئی میرے عقب میں تھا' میرے اندر کوئی چیخا۔ میں یک لخت پلٹا مگر مجھ پر چھلانگ لگا دی گئی۔ سب سے پہلے مجھے میرے پستول سے محروم کر دیا گیا اور ایک زوردار ٹھوکر میرے پیٹ پر رسید کر دی گئی۔ میں اس اچانک حملے پر بلبلا کر رہ گیا۔ وہ دو ضخیم شحیم افراد تھے جن کا تعلق یقینی طور پر انہی خانہ بدوشوں سے تھا۔ مجھے یہ بھی سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ زوار خان اپنی کسی ناپاک سازش کے تحت ہی دو ساتھیوں کے ہمراہ یہاں آیا تھا۔ بہرطور پیٹ پر پڑنے والی ٹھوکر کی شدید تکلیف کو دانتوں تلے دباتے ہوئے میں نے سنبھلنے کی کوشش کی اور رکوع کے بل جھک کر ٹھوکر مارنے والے کے پیٹ پر سر کی زوردار ٹکر رسید کر دی۔ وہ تنومند ہونے کے باوجود پیٹ پر پڑنے والی میری سر کی ٹھوکر پر "اوغ" کی آواز نکالتا ہوا کئی قدم پیچھے جا پڑا۔ ادھر زوار خان اور اس کے دوسرے ساتھیوں نے بیک وقت مجھ پر چھلانگیں لگا دیں۔ شانے کی تکلیف کے باوجود میں نے پھرتی کا مظاہرہ کیا اور ایک طرف ہٹ گیا۔ میرے پاس میرا میگارڈ موجود تھا۔ وہ دونوں جیسے اپنی ہی جھونک میں آگے نکلے۔ میں نے پھرتی سے جیب میں ہاتھ ڈال کر میگارڈ نکال لیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میرے حلق سے تیز کراہ سی خارج ہو گئی۔ پہلے والے نے، جسے سر کی ٹکر میں نے ماری تھی، اس نے ایک نوکیلا پہاڑی پتھر میرے پستول والے ہاتھ پر دے مارا تھا۔ نتیجتاً میرے ہاتھ سے میگارڈ بھی نکل گیا۔

اچانک مجھے نگینہ کی چیخ سنائی دی۔ میں نے جھونپڑی کی طرف دیکھا۔ چاند کی روشنی میں مجھے وہ جھونپڑی کے باہر کھڑی نظر آئی۔ اس ہنگامے سے وہ جاگ گئی تھی لیکن اس نے باہر نکلنے کی سخت بے وقوفی کی تھی۔ زوار خان اور اس کا دوسرا ساتھی نگینہ کی طرف جھپٹے۔ میں اپنے دونوں پستولوں سے محروم ہو چکا تھا۔ چاند کی روشنی میں ناہموار پتھریلی زمین پر پستول تلاش کرنا وقت طلب کام تھا۔

تب پھر اچانک میں نے زوار خان اور اس کے ساتھی کو نگینہ کی طرف جھپٹتے دیکھا۔ نگینہ نے خوف زدہ ہو کر چیخنے کے لئے منہ کھولا تو زوار خان نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میرے سر پر جیسے خون سوار ہو

گیا۔ نگینہ کو خبیث زوار خان اور اس کے بدخصلت ساتھی کے قبضے میں بے بس چڑیا کی طرح پھڑپھڑاتا دیکھ کر میرے رگ وپے میں آتش غیظ وجنوں کی نفرت انگیز سنسناہٹیں دوڑ گئیں۔

"کتے! .... کمینے!" میں حلق کے بل چیخا اور جیسے ہی قدم بڑھائے تھے کہ دوسرے ساتھی نے میرا راستہ روک کر میرے چہرے پر ایک گھونسہ جڑ دیا۔ اس کے بھاری بھرکم مکے کی زوردار ضرب سے مجھے اپنا جبڑا ہلتا محسوس ہوا۔ ایک لمحے کو میرا دماغ جھنجھنا اُٹھا۔ پھر میرے کانوں سے زوار خان کی پُرغیظ آواز ٹکرائی۔ وہ میرے مقابل سے بولا۔

"شودلک! اسے سنبھالو اور ختم کر کے کسی گہری کھائی میں پھینک کر آ جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ ہراساں نگینہ کو گھسیٹتے ہوئے ایک طرف لے جانے لگا۔ میرے اندر کا آتش فشاں غضب ناک لاوا اگلنے لگا تھا اور نگینہ سے کہے ہوئے اپنے الفاظ میرے دل و دماغ میں گونجنے لگے۔ "نگینہ صاحبہ! آپ بے فکر رہیں۔ میں آپ پر آنچ تک نہیں آنے دوں گا۔"

بس تو پھر جیسے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ مجھے اپنے ان الفاظ کی لاج رکھنا تھی، اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر۔ میں زوار خان اور اس کے بدخصلت ساتھی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ شاید مجھے تر نوالہ سمجھے ہوئے تھے۔ چنانچہ اس کا حکم پاتے ہی وہ جوں ہی میری جانب بڑھا تو میں نے اچھل کر زوردار فلائنگ کک اس کے سینے کی بجائے چہرے پر جڑ دی۔ اس فلائنگ کک میں وہ غیر معمولی قوت تھی کہ وہ کئی قدم دور جا کر پتھریلی زمین پر چاروں شانے چت ہو گیا۔ میں اب کہاں رکنے والا تھا۔ میں نے فوراً ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ اس کا سر پھٹ گیا۔ وہ آواز نکالے بغیر وہیں ساکت ہو گیا۔ اس کے بعد میں وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ زوار خان اور اس کے ساتھی کی طرف لپکا۔ اس کے دوسرے ساتھی نے فوراً اپنی قمیض کے اندر سے ایک قرولی نکال لی۔ زوار خان نگینہ کو دبوچے کھڑا ہو گیا۔ نگینہ اس کے مضبوط بازوؤں کے شکنجے میں چڑیا کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔ اس کے ساتھی نے قرولی اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ لی اور اپنے چاروں ہاتھ پاؤں پھیلا کر میرے حملے کا انتظار کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک تھی۔ میں نے بھی یہی انداز اختیار کر لیا تھا۔ ادھر زوار خان دوبارہ نگینہ کو دبوچے ایک طرف کھسکنا شروع ہوا تو میں نے قرولی بدست کو چھوڑ کر زوار خان کی طرف دوڑ لگائی۔ وہ میرے اس ڈاج میں آ گیا۔ چنانچہ جیسے ہی وہ میرا راستہ روکنے کے لئے میری طرف حملے کی پہل کرتے ہوئے جھپٹا، میں نے نہایت پھرتی کے ساتھ راستہ کاٹتے ہوئے جھکائی دی اور اس کے قرولی والے ہاتھ کی کلائی کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ کر دائیں ٹانگ کا گھٹنا اس کے پیٹ میں رسید کر دیا۔ وہ دبی دبی کراہ کے ساتھ جیسے ہی رکوع کی حالت میں جھکا، میں نے اس کی جھکی ہوئی ناک پر کہنی کی زوردار ضرب رسید کر دی اور اس کا ہاتھ مروڑ کر زمین پر پٹخ دیا۔ وہ پہاڑی جوان تھا تو میری پرورش بھی انہی علاقوں میں ہوئی تھی۔ قد و قامت اور ڈیل ڈول میں کسی طرح بھی ان سے کم نہ تھا۔ میرے مد مقابل کی کلائی والی ہڈی ٹوٹنے کا کڑاکا اُبھرا تھا۔ میں نے جیسے ہی قرولی چھین کر اپنے قبضے میں کی تو زوار خان نگینہ کو چھوڑ کر مجھ پر جھپٹا، اس کی یہ حرکت میرے لئے اچانک اور بالکل غیر متوقع تھی۔ یہی سبب تھا، وہ میرے زخم پر گھونسا رسید کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مارے اذیت کے میرے حلق سے چیخ خارج ہو گئی۔ اس نے میرا قرولی والا ہاتھ دبوچ لیا۔ میرا زخم کھل گیا تھا اور اس میں سے خون بہنے لگا تھا۔ ظالم نے بڑی نازک جگہ پر وار کر کے مجھے نڈھال کر دیا تھا۔ اس نے قرولی میرے ہاتھ سے چھین لی اور بڑی نفرت خیز غراہٹ کے ساتھ میرے پیٹ میں گھونپنا چاہی تو نگینہ کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ میں نے بروقت ایک طرف ہونے کی

کوشش کی مگر میں زخم کھلنے کی وجہ سے کچھ زیادہ پھرتی کا مظاہرہ نہ کر پایا اور قرولی کے ظالم وار نے میرے پہلو میں جاں کشیدہ چرکا لگا ہی دیا۔ میرے حلق سے کرب انگیز کراہ خارج ہو گئی۔ میرا دایاں پہلو اُدھڑ سا گیا تھا۔ اس نے سنبھل کر دوبارہ مجھ پر قرولی سے وار کرنا چاہا۔ مگر اب مجھے نگینہ اور اس کی عزت کی حفاظت کے سوا کچھ یاد نہ رہا تھا۔ میں نے بائیں ہاتھ سے اس کے قرولی والے ہاتھ کو دبوچتے ہی دائیں ہاتھ کا گھونسہ اس کی ناک پر جڑ دیا۔ وہ چند ثانیے کے لئے جھنجھنا کر رہ گیا تھا۔ اس کی زخمی ناک سے بھل بھل خون بہنے لگا تھا۔ میں نے اس لمحاتی موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور قرولی پر اس کے ہاتھ کی گرفت کمزور پڑتے ہی میں نے قرولی اس کے ہاتھ سے چھینی اور اس کے پیٹ میں گھونپ دی۔ وہ کریہہ چیخ مار کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ نگینہ میری طرف لپکی۔

"چلو نگینہ! .... یہاں سے فوراً نکلنا ہو گا۔" میں نے زخموں سے چور ہانپتی آواز میں اس سے کہا۔

"لل .... لیکن نادر! تت .... تم بہت زخمی ہو گئے ہو۔" وہ آنسو بھری آنکھوں اور درد سے لبریز لہجے میں بولی۔

"میں ٹھیک ہوں .... چلو .... جلدی۔"

"ٹھہرو .... میں ابھی آئی۔" اچانک جیسے اسے کچھ یاد آ گیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ استفسار کرتا، وہ دوڑتی ہوئی جھونپڑی کے اندر داخل ہو گئی۔ میں اُلجھ کر رہ گیا تھا۔ نہ جانے وہ جھونپڑی کے اندر سے کیا لینے گئی تھی۔ پھر چند ہی سیکنڈ بعد وہ پلٹی تو میں نے اس کے ہاتھ میں کوئی شے پکڑی ہوئی دیکھی، وہ تیزی سے دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی۔ میں اپنے ہتھیاروں سے محروم ہو چکا تھا، جنہیں تلاش کرنا بے حد ضروری تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میرا میگارڈ مجھے نظر آ گیا جسے میں نے لپک کر اٹھا لیا۔ میرے دشمنوں کی کراہیں بدستور گونج رہی تھیں۔ قبیلے والے جاگ جاتے تو معاملہ سنگین ہو سکتا تھا۔ میں اور نگینہ ہر طرف پھیلی چاندنی میں نامعلوم سمت کی طرف بڑھ گئے۔

نگینہ نے مجھے بتایا تھا کہ بوڑھے طبیب نے مرہم کی بقیہ مقدار وہیں جھونپڑی میں رہنے دی تھی۔ وہ وہی اٹھانے کے لئے لپکی تھی۔ تھوڑی دور نکل آنے کے بعد ہم ایک تنگ درے سے نکلے اور ایک قدرتی طور پر بنے چٹانی چھجے تلے بیٹھ گئے۔

میں پتھریلی دیوار سے پشت ٹکائے بیٹھ گیا اور ہانپنے لگا۔ نگینہ جلدی جلدی مرہم کی پوٹلی کھولنے لگی۔ میں نے اس سے کہا۔ "نن .... نگینہ صاحبہ! .... آ .... آپ ٹھیک تو ہیں نا؟"

میری بات پر اس کے پوٹلی کو کھولتے ہوئے ہاتھ تھم گئے۔ وہ کسک زدہ نگاہوں سے مجھے تکنے لگی۔ پھر چھلنی لہجے میں بولی۔

"تم .... تم کس مٹی کے بنے ہوئے ہو؟ تمہاری جان پر بنی ہوئی ہے اور تم بار بار میری خیریت پوچھتے رہتے ہو۔ تم زندہ رہو گے تو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرو گے نا۔"

"لیکن نگینہ صاحبہ! میرے ذمے آپ کی بھی حفاظت فرض ہے۔"

"میری فکر نہ کرو .... صرف اپنے مقصد اور مفاد کی فکر کرو۔" وہ بولی تو بے اختیار میرے لبوں سے بھی نکل گیا۔

"میرا مقصد اور میرا مفاد صرف تم ہو۔"

"میں .... ؟" وہ چونک کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی اور مجھے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے جلدی سے بات بناتے ہوئے کہا۔

"بے شک، ایک طرح سے میرا مفاد آپ کی زندگی سے وابستہ ہے۔ تا کہ میں آپ کے باپ سے تاوان کے طور پر ایک خطیر رقم حاصل کر سکوں۔ مگر مجھ پر یہ بھی تو لازم ہے کہ میں آپ کا بال بھی بیکا نہ ہونے دوں۔ کیونکہ میں یہ تو جانتا تھا کہ وہ کمینہ زوار خان اور اس کے دونوں بدخصلت ساتھی آپ کو جان سے مارنا تو نہیں چاہتے تھے لیکن آپ کی عزت پر بھی میں ذرا آنچ نہیں آنے دوں گا۔"

"کیوں؟.........تمہیں میری عزت سے کیا لینا دینا؟" وہ چلا کر بولی۔ "اگر وہ تمہیں ہلاک کر دیتے تو.........تمہاری بیوی کا علاج کس طرح ممکن ہوتا؟ وہ تو بستر مرگ پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتی۔ اگر وہ بدخصلت زوار خان میری عزت سے کھیل کر مجھے چھوڑ دیتا تو کیا برا تھا۔ میں زندہ تو رہتی نا۔ مگر تم نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر........." ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ میں نے ایک زوردار تھپڑ اس کے گال پر رسید کر دیا۔ رات کے سکتے ہوئے سناٹے میں "چٹاخ" کی آواز اُبھری اور نگینہ دم بخود میرا چہرہ تکنے لگی۔

"تت.........تم نے ایسا کیوں کہا؟" میں اسے گھورتے ہوئے فرطِ جوش سے سرخ ہو کر بولا۔ "مجھے تمہاری عزت اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ کیوں کہا تم نے ایسا؟......... جواب دو مجھے نگینہ! تم نے میری محبت کو اتنا لاوارث کیوں سمجھا؟"

مجھ پر گویا پاگل پن کا دورہ پڑ گیا تھا۔ اور نگینہ.........وہ مارے حیرت کے پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے تکے جا رہی تھی۔ اچانک مجھے کچھ احساس ہوا، میں نے فوراً اپنی جلتی سلگتی کیفیات پر قابو پایا اور اپنا سر چٹانی چھجے کی پتھریلی ناہموار دیوار سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ پھر میں چند گہری گہری سانسیں لے کر اپنے وجود میں دہکتے اُبال پر قابو پاتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"نگینہ صاحبہ! مم......... مجھے معاف کر دینا۔ مجھے آپ پر ہاتھ اٹھانے کا کوئی حق نہ تھا۔ کوئی حق نہ تھا مجھے۔" یہ کہہ کر میں اپنے دائیں ہاتھ کا مکا بنا کر چٹانی چھجے کی سنگی دیوار پر مارنے لگا۔ یہاں تک کہ اس میں خراشیں پڑ گئیں۔ مگر نگینہ نے فوراً اپنے دونوں ہاتھوں سے میرا ہاتھ تھام لیا اور بولی۔

"یہ کیا پاگل پن ہے؟ ....تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھا کر کوئی غلطی نہیں کی۔ چلو چھوڑو۔ اپنی قمیض اتارو۔ میں یہ مرہم لگا دوں۔"

پھر اس نے قمیض اتارنے میں میری مدد کی۔ میرا اوپری مضبوط جسم برہنہ ہو چکا تھا اور نگینہ چند ثانیے میرے کشادہ سینے کو گھورتی رہی۔ پھر جیسے میرا دل بہلانے کی غرض سے مسکرا کر بولی۔

"تم خاصے ہینڈسم اور خوبرو ہو۔ تمہاری بیوی نگہت یقیناً بہت خوش قسمت ہے کہ اسے تم جیسا جری، غیرت مند، بہادر اور مضبوط شوہر ملا۔" نگینہ کی تعریف نے میرا سیروں خون بڑھا دیا اور میرے جی میں آئی کہ میں اسے کہہ دوں۔ "نگینہ! میری جانِ جاناں! پنجاب کی زرخیز زمین کا یہ پہاڑی نوجوان، تمہاری ہی تو ملکیت ہے۔ خدارا اسے پہچانو۔ اپنی محبت کو پہچانو۔" مگر میں ابھی یہ اس سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ ابھی تک یہی سمجھ رہی تھی کہ میں اسے چترال اپنے ٹھکانے پر لے جاؤں گا اور بعد میں اس کے باپ سے تاوان طلب کروں گا۔

اس نے مرہم نکالا۔ جبکہ میرا مرہم تو وہ تھی۔ اس نے میرے زخموں پر آہستہ آہستہ مرہم لگانا شروع کر دیا۔ مجھے اپنے زخموں کی ٹیسوں پر ٹھنڈک سی اُترتی محسوس ہونے لگی۔ مرہم لگانے کے بعد مجھے ذرا سکون ملا تو دبی ہوئی بھوک اور پیاس کا احساس ہوا۔ نگینہ نے تو شاید کچھ کھا پی لیا ہو گا مگر میں نے طویل بے ہوشی کی وجہ سے کچھ نہیں کھایا پیا تھا۔

"تمہیں بھوک اور پیاس تو لگی ہوگی۔" اچانک اس نے مجھ سے پوچھا۔ "مجھے تو ان لوگوں نے دودھ وغیرہ پلا دیا تھا مگر تم.........؟" اس نے جیسے بھانپتے ہوئے کہا۔

"نہیں........." میں نے جھوٹ بولا۔ پھر موضوع بدلنے کی غرض سے مزید کہا۔ "میرا خیال ہے ہمیں چلنا چاہئے۔ خانہ بدوشوں کے تین آدمی میرے ہاتھوں بری طرح زخمی ہو چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے ان میں سے کوئی ایک آدھ مر بھی گیا ہو۔ ایسا نہ ہو اب ان کی بھی دشمنی بھگتنا پڑے۔"

نگینہ کے چہرے پر پھر تشویش کے آثار اُبھرے۔ تاہم وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

"کون سی بات؟"

"کبیر اور اس کے ساتھیوں نے پولیس کی مدد کیوں نہیں لی؟"

میں اسے کیا بتاتا کہ کبیر اور کالا ناگ میری جان کے دشمن تھے۔ پولیس کو شامل کر کے وہ میرا تحفظ کیوں چاہتے۔ یوں تو میں بیک وقت دو محاذوں پر برسرِ پیکار تھا۔ ایک طرف دشمن میرے خون کی بُو سونگھتے پھر رہے تھے اور دوسری طرف پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ کبیر اور کالا ناگ جیسے مکار اور خطرناک دشمنوں سے کوئی بعید نہ تھا کہ وہ وقت پڑنے پر پولیس کو بھی میرے پیچھے لگا سکتے ہیں۔ لیکن میں نگینہ کو اصل بات ابھی نہیں بتانا چاہتا تھا۔ لہٰذا بولا۔

"شاید وہ خود سرخرو ہونا چاہتے ہیں۔"

معاً رات کے پہر اور دم بخود سناٹے میں کہیں قریب ریل کی مخصوص "چھکا چھک......... چھکا چھک" سنائی دی۔ میں چونک پڑا۔ گویا ریلوے لائن کہیں قریب ہی تھی۔ میں دیوار کا سہارا لے کر اٹھا۔ نگینہ کو لے کر آواز کی سمت بڑھ گیا۔ سنگلاخ پہاڑی سلسلے کا یہ وسطی علاقہ نہ ہونے کی وجہ سے شاید یہاں کھائیاں کم تھیں۔ تاہم میں نگینہ کو لئے پہاڑی دروں اور تنگ دراڑوں سے ہوتا ہوا دوسری سمت نکلا تو مجھے سامنے ٹھنڈی چاندنی میں قوس کی صورت چمکتی ہوئی ریلوے لائن دکھائی دی۔ جو بل کھا کر ایک طرف سنگلاخ اور تاریک سرنگ میں داخل ہو رہی تھی۔ پھر دوسرے ہی لمحے سرنگ کے اندر روشنی ہونے لگی۔

میں رکا نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد ریل کا دخانی سیاہ انجن اپنی چمنی سے گاڑھا سیاہ دھواں فضا میں اُگلتا ہوا سرنگ سے باہر آتا دکھائی دیا۔ اس کے اوپر تیز سرچ لائٹ نما بلب روشن تھا۔ رفتار سست تھی۔ وہ مال گاڑی تھی اور خاصی طویل بھی۔ اس کا رخ مضافات کی طرف تھا۔ مال گاڑیاں یوں بھی سست رفتار سے ہی چلتی تھیں۔ لیکن میں نے دیکھا کہ اس کی رفتار بتدریج کم ہونے لگی تھی۔ شاید سگنل کلیئر نہ تھا۔ بالآخر وہ رُک گئی۔ رات کے پہر سناٹے میں انجنوں کی مخصوص گھر......... گھر......... عجیب سی لگ رہی تھی۔ میرے ذہن میں اچانک ایک خیال اُبھرا۔ میں نے نگینہ کو ساتھ لیا اور ذرا تیز تیز قدموں سے سرنگ کی طرف بڑھنے لگا۔ انجن سرنگ کی حدود سے کافی دور نکل آیا تھا جبکہ بوگیاں ابھی سرنگ کے اندر تک ہی تھیں۔ مال گاڑیاں یوں بھی طویل ہوتی ہیں۔

میں نگینہ کے ساتھ سرنگ کے قریب پہنچا۔ میرا ارادہ مال گاڑی کی کسی بوگی میں سوار ہونے کا تھا۔ لیکن جہاں تک میں دیکھ سکتا تھا، بوگیوں کے دروازے بند اور سیل تھے۔ مگر میں نے ہمت نہ ہاری اور پٹڑی کے ساتھ ساتھ بوگیاں دیکھتا آگے بڑھنے لگا۔ اچانک ایک بوگی پر مجھے سیل نظر نہ آئی مگر بوگی کے دروازے کو آہنی کنڈا چڑھا ہوا تھا۔ میں آگے بڑھا اور کنڈا کھول دیا۔ ٹھیک اس وقت گاڑی نے رینگنا شروع کر دیا۔ میں دروازہ کھول چکا تھا اور جلدی سے آگے بڑھ کر نگینہ کے نرم و نازک وجود کو بازوؤں

میں اٹھا کر بوگی کے اندر داخل کیا اور پھر خود بھی سوار ہو گیا۔

بوگی میں اناج کی بوریاں لدی ہوئی تھیں۔ ایک خالی جگہ پر میں اور نگینہ سکڑ سمٹ کر بیٹھ گئے۔ گاڑی نے معمول کی رفتار پکڑ لی تھی۔

میری پہلی منزل چترال تھی جو انتہائی شمالی کنارے پر تھی۔ اس کے بعد کیلاش وادی، چترال شہر سے کوئی 40 کلومیٹر (25 میل) کے فاصلے پر تھی۔ لیکن اس سست رفتار مال گاڑی پر چترال تک کا سفر محال اور عبث تھا۔ تاہم اتنا ضرور تھا کہ یہ کم از کم مجھے یہاں دشمنوں کے نادیدہ ٹھکانوں سے کوسوں دور لے جاسکتی تھی۔

خانہ بدوشوں کے بوڑھے طبیب کا مرہم جادو اثر ثابت ہوا تھا۔ نگینہ نے بھی میرے زخموں پر سارے ہی مرہم کا لیپ کر دیا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے زخم تھے ہی نہیں۔ ٹیسوں کی بجائے اب ٹھنڈک سی پڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ میری توقع کے برخلاف مال گاڑی معمول سے زیادہ رفتار سے دوڑی چلی جا رہی تھی۔ بوگی کا دروازہ میں نے ذرا کھلا رہنے دیا تھا۔ چاند کی مدھم روشنی اندر کی تاریکی کو کسی قدر دور کر رہی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ مال گاڑی کہاں جا رہی تھی۔ تاہم اتنی تسلی تھی کہ یہ مجھے کسی نہ کسی بڑے اسٹیشن پر تو اُتار ہی سکتی تھی۔

مال گاڑی کا سفر جاری تھا۔ وہ اس وقت وسطی پہاڑی سلسلے، گہری کھائیوں، تاریک سرنگوں میں تیزی سے گامزن تھی۔ ایک دو اسٹیشن بھی آئے۔ میں نے دروازہ بند کر کے جھری بنا کر جھانکا بھی کہ شاید کسی بڑے اسٹیشن پر رکے تو میں نگینہ کو لے کر اتر جاؤں۔ بالآخر پو پھٹے ٹرین ''کلپلانہ'' کے اسٹیشن پر رکی۔ مال گاڑیوں کو عموماً پلیٹ فارم کی بجائے ''لوپ لائن'' پر روکا جاتا تھا۔ میں نے یہاں پوچھ گچھ کرنا ضروری سمجھا اور نگینہ کو اپنی جگہ بیٹھے رہنے کی تاکید کر کے احتیاط سے نیچے اُترا۔ ہماری ''مال بوگی'' اسٹیشن سے ذرا دور تھی۔ میں نے بوگی کا نمبر ذہن نشین کیا اور تیز تیز قدموں سے پلیٹ فارم پر پہنچا۔ وہاں ایک پسنجر ٹرین موجود تھی۔ پتہ چلا کہ یہ پسنجر ٹرین مردان اور درگئی تک جاتی ہے۔ درگئی اس کا ٹرمنس (آخری اسٹیشن) تھا۔ مال گاڑی جانے کتنی دیر یہاں کھڑی ہوتی، اس لئے میں جلدی سے واپس لوٹا اور نگینہ کو اتار کر مذکورہ ایکسپریس ٹرین کا ٹکٹ لے کر اس میں سوار ہو گیا۔

درگئی پہنچ کر ہم اتر گئے۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ بذریعہ ٹرین چترال کا سفر ناممکن اور مشکل تھا۔ البتہ تیز رفتار لگژری مسافر کوچز چلتی تھیں جو ضلع ''دیر'' کے علاقہ ''چلارہ'' سے ہوتی ہوئی مین سٹی ''دیر'' تک جاتی تھی۔ وہاں سے ہمیں دوسری کوچ چترال کی مل سکتی تھی۔ میں نے کوچ کے دو ٹکٹ لئے اور اس میں سوار ہو گیا۔ ہم دونوں پہلے ہی مشکلات کے ستائے ہوئے تھے۔ اس لئے کوچ کی آرام دہ سیٹوں اور پُرسکون ماحول نے کافی اطمینان بخشا۔ سفر شروع ہو گیا۔ ناشتہ وغیرہ ہم نے درگئی میں کر لیا تھا۔

''دیر'' اترنے کے بعد وہاں سے ہم چترال کی کوچ میں سوار ہو گئے۔ سہ پہر تک ہم چترال پہنچ چکے تھے۔ یہاں ہم نے ایک اچھے سے ہوٹل میں لنچ کیا۔ نگینہ نے مجھے بتایا کہ مجھے اپنے لئے کچھ پین کلر اینٹی انفلامیٹری میڈیسن اور اینٹی بائیوٹک لے لینی چاہئیں۔ میں ڈاکٹروں کے مشورے کے بغیر سیلف میڈیکیشن کا استعمال اچھا نہیں سمجھتا تھا مگر مجبوری تھی۔ ورنہ لمبے چوڑے کھٹ راگ میں پڑ سکتا تھا۔

ہلکی پھلکی روزمرہ کی ادویات مجھے یاد تھیں۔ اس کے توجہ دلانے پر میں نے ایک میڈیکل اسٹور سے ادویات خریدیں۔ چونکہ ''ماشاء اللہ'' ہمارے ملک میں سیلف میڈیکیشن کا چلن عام ہے اور بالخصوص میڈیکل سٹورز کے حضرات اس ''کارِ خیر'' میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں چنانچہ میڈیکل سٹور والے نے

مجھے اپنی تجویز کردہ ادویات دے دیں۔ جب میں نے قیام کے لئے ہوٹل کا رخ کیا تو نگینہ نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا اس ہوٹل میں رہتے ہوئے تمہیں تاوان درکار ہے؟''

اسے اب قائل کرنا ضروری تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''دیکھیں نگینہ صاحبہ! آپ کے پپا اور کبیر برے سب ٹھکانوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ بہرحال اب ہماری منزل زیادہ دور نہیں ہے۔''

وہ اُلجھ سی گئی۔ اس کے حلق میں ایک بار پھر یہ بات شاید اٹکنے لگی تھی کہ آخر مجھے تاوان کی رقم حاصل کرنے کے لئے اتنے لمبے چوڑے کھٹ راگ میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی اور میں اسے قائل کرنے کی بھی کوشش کرتا رہا تھا۔ مگر اب چترال سے بھی آگے نکلنے پر وہ ایک بار پھر اُلجھن کا شکار ہونے لگی تھی۔

تب میں نے اسے ایک اور جواب گھڑ کر بتایا کہ وہ صرف میرا علاقہ تھا۔ وہاں میں اسے (نگینہ کو) اپنوں میں چھوڑ کر اس کے باپ سے تاوان کی خطیر رقم حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ حالات کچھ ایسے گزرے تھے کہ نگینہ کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ اصل ماجرا کیا تھا۔ تاہم جیسے جیسے یہ معاملہ طول پکڑتا جا رہا تھا، نگینہ کو شبہ ہونے لگا تھا کہ معاملہ کچھ اور ہی تھا اور اب اس نے کھل کر اس کا اظہار کر دیا تھا۔

''نادر صاحب! .... مجھے تو یہ کچھ اور ہی چکر نظر آتا ہے۔ کوئی ایسا پراسرار اور گہرا چکر جو مجھ سے چھپایا جا رہا ہو۔''

میں چونک سا گیا۔ ایکا ایکی مجھے یوں لگا جیسے اب میں زیادہ دیر تک اسے اپنی فرضی کہانی سے بہلا نہ پاؤں گا۔ تاہم ہنس کر بولا۔ ''آپ تو پتہ نہیں کیا سوچنے لگیں؟''

''میری طرف دیکھو........!'' اس نے اچانک عجیب سے لہجے میں مجھ سے کہا اور میں اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ وہ بھی بغور میری آنکھوں کی گہرائیوں کے راستے دلِ مہجور کی عمیق گہرائیوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

''پتہ نہیں کیوں نادر! مجھے یوں لگتا ہے جیسے تم یہ سب تکلیفیں، مصائب و آلام اور کٹھنائیاں اپنی بیمار بیوی کی خاطر نہیں بلکہ میری خاطر برداشت کر رہے ہو۔''

میرے اندر جھماکا ہوا مگر میں کچھ بولے اور بغیر پلک جھپکائے اسے تکتا رہا۔ اسے بولنے کا موقع دیتا رہا۔ وہ جیسے اپنی رو میں کہے جا رہی تھی۔ ''ہاں نادر! تمہارا میرا احترام کرنے کا انداز ایک عجیب سا والہانہ سا لگتا ہے۔ ان چند دنوں کے دوران تم خود کس قدر تکلیف میں رہے لیکن .... لیکن تم نے مجھ پر آنچ تک نہ آنے دی۔ ان کٹھنائیوں اور جاں گسل حالات میں تم نے پل پل میرا اتنا خیال رکھا۔ اور پھر جب میری عزت پر حرف آنے لگا تو اس وقت بھی تم بالکل مختلف نظر آنے لگے۔ تمہارے چہرے اور آنکھوں میں جوش آمیز جنون کا جو لاوا اُمڈنے لگا، اس کی تپش مجھے اپنے سینے میں چھپائی ہوئی کسی پراسراری دھند کو صاف کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ پھر تمہارا اس بدخصلت زوار خان پر جھپٹنا .... یہ سب کیا تھا نادر؟ یہ سب کیا ہے؟ .... مم .... مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ تم یہ ساری صعوبتیں، یہ تکلیفیں، یہ خون ریز مرحلے اپنی بیمار بیوی نگہت کو بچانے کی خاطر نہیں بلکہ .... بلکہ میری خاطر کر رہے ہو۔ مجھے جواب دو .... میرے دل و دماغ تمہاری طرف اتنا بے اختیار کیوں کھنچنے لگتے ہیں؟ مجھے ایسا آخر کیوں لگتا ہے تمہاری ذات سے میری ذات کا کوئی گہرا، صدیوں پرانا تعلق ہے؟ پلیز! مجھے حقیقت بتاؤ نادر! یہ سب کیا ہے؟''

وہ اتنا کہہ کر ہانپنے لگی۔ فرطِ جذبات سے اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ آنکھوں سے نمی ایک ازلی پیاس

کی صورت جھلملانے لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے اب وقت آ گیا تھا کہ میں اسے حقیقت بتا دوں۔ کیونکہ اب وہ خود ذہنی طور پر یہ پراسرار حقیقت جاننے پر مائل ہے۔ شاید اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی دھند سے مجھے دیکھ کر "اپنے پن" کی صدائے غیب اُبھرنے لگی تھی۔ ایسے میں مجھے برمحل شعر یاد آ گیا۔ تب میں نے اس بار اسے "نگینہ صاحبہ" کے لاحقے سے پکارنے کی بجائے اس کے نام سے پکارتے ہوئے کہا۔

"نگینہ! میں تمہیں پہلے ایک شعر سناؤں .... یہ شعر شاید میرے دل کی، میرے حصول مقصد کی، میری پیہم کوششوں کی ترجمانی کر دے۔ یہ جتنا سادہ اور آسان شعر ہے، اتنی ہی اپنے اندر گہری معنویت بھی رکھتا ہے۔"

"ہاں .... سناؤ۔" اس کی آواز مرتعش لبوں سے نہیں، جیسے دل کی گہرائیوں سے اُبھری تھی۔

تب میں اسے وہ چند شعر سنانے لگا جو موجودہ حالات کے عین مطابق اور برمحل تھے۔

"نئی طرح سے نبھانے کی دل نے ٹھانی ہے
وگرنہ اس سے محبت بہت پرانی ہے
خدا وہ دن نہ دکھائے کہ میں کسی سے سنوں
کہ تُو نے بھی غمِ دنیا سے ہار مانی ہے
میں کتنی دیر اسے سوچتا ہوں محسن
کہ جیسے اس کا بدلنا کوئی کہانی ہے"

مجھے یہی چند اشعار یاد تھے۔ میں خاموش ہو گیا۔ وہ یک ٹک میرا چہرہ تکنے لگی۔ وہ درونِ خانہ ایک زبردست کشاکش سے گزر رہی تھی۔ ان برمحل اشعار نے جیسے اس کے اندر ہلچل سی مچا دی تھی۔ اس کے چہرے پر ارتعاش کی سی کیفیت طاری تھی۔ پھر اس کے لب متحرک ہوئے اور اس کی لرزیدہ آواز اُبھری۔

"نادر! تم .... تم کس کرب سے گزر رہے ہو؟ مجھ سے مت چھپاؤ۔ میں ان اشعار کا مطلب سمجھ گئی ہوں۔ مجھے بتاؤ، آخر تم کون سی جستجو میں ہو؟ .... تم جب بھی میری طرف دیکھتے ہو تو مجھے تمہاری آنکھوں سے ایک گہرا کرب چھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ایک غمِ نہاں کی کیفیت تمہارے چہرے سے مترشح سی نظر آتی ہے۔"

پھر جیسے میں اپنے آپ میں نہ رہا۔ میرے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ میرے اندر کا درد، ان کہا دکھ خس و خاشاک کی طرح اس روانی سے مجھے بہا لے گیا کہ میں نے اسے حقیقت بتا دی۔ وہ جیسے پتھر کی مورت بن گئی۔ کئی سوچتی، دھڑکتی ساعتیں خاموشی سے گزر گئیں۔ کئی دم بہ خود لمحات کسی اپنے پن کی تشنہ آرزو کے ساتھ پیاس بن کر بیت چلے۔ میری پُرامید نظریں نگینہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں آس و یاس کی دھڑکتی کیفیات سے گزر رہا تھا۔ نگینہ کو حقیقت بتانے پر یہ دھڑکا بھی تھا کہ وہ میری من گھڑت کہانی (بیمار بیوی والی کہانی) کا بھانڈا پھوٹتے دیکھ کر مجھ سے پہلے کی طرح بدظن نہ ہو جائے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ اس نے میرے ساتھ جو لمحات گزارے تھے، کم از کم ان کی سچائیوں کو وہ جھٹلا نہیں سکتی تھی۔ اور پھر بقول اس کے خود اس کے اپنے دل نے بھی "اپنے پن" کی گواہی دی تھی اور اس نے خود مجھ سے حقیقت بتانے کی درخواست کی تھی۔ پھر اس کے لبوں پر کپکپاہٹ ابھری۔

"ن .... نادر! کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟"

"ہاں نگینہ! ہاں .... یہ سچ ہے۔ یہی سچ ہے کہ میری یہ ساری جستجو اور تگ و تاز صرف اور صرف تمہارے لئے اور تمہاری وجہ سے ہے۔" میں نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔ "نگینہ! میری بات کا یقی

رو۔ میں .... میں تمہیں اپنی بے لوث محبت کو قصرِ فنا میں گرنے سے بچانا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں حقیقت کیلاش وادی لے جانا چاہتا ہوں تاکہ اس بدبخت کیلاشی عامل عاروب کے ذریعے تمہارے اندر کی دھند کو صاف کر سکوں جو مجھے .... مجھے تم سے ذہنی اور دلی طور سے دور کرنے کی ایک گھناؤنی سازش کے تحت تمہارے اندر پھیلا دی گئی ہے۔ ہاں نگینہ! اس بدبخت کیلاشی عامل عاروب کے ذریعے پیر اور کالا ناگ نے تم پر یہ خاص عمل کروایا ہے۔ وہ عامل مجھے ٹیلی پیتھی کا ماہر معلوم ہوتا ہے۔ اب شاید وہی تمہارے دل و دماغ سے میری گم گشتہ یادوں کو دوبارہ تازہ کر سکتا ہے۔"

"حیرت انگیز! .... مجھے یقین نہیں آ رہا۔ کیا وہ عامل پراسرار علوم کا ماہر ہے؟" نگینہ نے حیرت سے پوچھا۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"نہیں .... وہ پراسرار علوم کا ماہر نہیں ہے مگر لگتا ہے وہ ٹیلی پیتھی کی خاصی سوجھ بوجھ رکھتا ہے۔ اس نے تمہارا Partialy برین واش کر دیا ہے۔ یعنی تمہارے خانہ دل و دماغ سے صرف اور صرف مجھ سے متعلق یادداشت کو صاف کر ڈالا ہے۔ جبکہ تم اپنے پپا اور دیگر عزیزوں کو پہچان سکتی ہو۔"

"لیکن تم اب آخر کس طرح اس کیلاشی عامل عاروب کو مجبور کرو گے کہ وہ مجھ پر عمل کر کے میرے اندر تمہارے جیسے کی یادوں کو دوبارہ ابھار سکے؟" نگینہ نے مضطربانہ لہجے میں پوچھا تو میں نے زہریلی مسکراہٹ سے کہا۔

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو نگینہ! میں اسے مجبور کر کے ہی رہوں گا۔ چاہے اس کے لئے مجھے اس کی جان کیوں نہ لینی پڑے۔" میرے مضبوط اور مستحکم لہجے نے اسے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

میں بغور اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ عجیب سی کشمکش سے دوچار نظر آ رہی تھی۔ شاید اسے میری بات ماننے میں تامل تھا۔

پھر وہ میری طرف دیکھنے لگی اور ہولے سے مسکرائی۔ میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ کیونکہ میں نے اس کے چہرے پر ایک خاص اور معنی خیز چمک دیکھی۔

"نادر! اگر یہ سچ ہے تو یقیناً میرے لئے ایک حیرت انگیز ٹریجڈی ہے۔ جو ناقابل یقین بھی ہے۔"

"یہ سچ ہے نگینہ! یہ سچ ہے۔" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ وہ عجیب کشمکش میں مبتلا نظر آتی تھی۔ میں نے ہولے سے پوچھا۔ "کیا بات ہے نگینہ؟"

"نادر! میں سوچ رہی تھی کہ اگر یہ سچ ہے تو .... تو کیوں نہ ہم واپس اپنے گھروں کو لوٹ چلیں۔ لیکن پھر میں سوچتی ہوں کہ تمہاری یادوں کا، تمہاری باتوں کا سرمایہ میرے دل و دماغ میں یقیناً کسی خزانے، کسی سرمایہ حیات سے کم تو نہ ہو گا۔ تب اپنے واپس جانے کا ارادہ یہ سوچ کر ترک کر لیتی ہوں کہ اس بدبخت کیلاشی عامل نے مجھ سے اپنی چھینی ہوئی متاعِ یادِ دلداری واپس لینی چاہئے۔"

"ایسا ہو گا نگینہ! .... یقیناً ایک دن ایسا ہو گا۔ تم مجھ پر بھروسہ کرو اور میرے ساتھ اسی طرح تعاون کرتی رہو۔" میں جوشِ مسرت سے بولا۔

"ہاں نادر! اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے تمہاری شرافت، بہادری اور بردباری نے بہت متاثر کیا ہے وہ جیسے "ابھی" سے "کم" "کبھی" میں کھوتے ہوئے بولی۔ میں اس مژدۂ جانفزا پر خوشی سے جھوم اٹھا۔

نگینہ اب ذہنی طور پر میرا بھرپور ساتھ دینے پر تیار ہو گئی تھی۔ اسے بھی اب یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کی کوئی قیمتی شے کھو گئی ہے جو اسے ہر وقت اُداس، رنجور اور کسی نامعلوم سے "غمِ دروں" میں مبتلا رکھتی ہے۔

اس کا خیال تھا کہ پشاور کی طرح یہاں چترال میں بھی ہمیں دشمنوں سے خطرہ تھا بلکہ جیسے جیسے ہم اپنی منزل سے قریب ہوتے جارہے تھے، یہ خطرہ مزید بڑھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ابھی شام ہونے لگی تھی۔ نگینہ کا خیال تھا کہ ہمیں یہ مہنگا ہوٹل چھوڑ کر کسی اوسط درجے کے بلکہ کسی سستے ہوٹل میں یہ رات گزارنی چاہئے تھی۔ کیونکہ پشاور کی طرح یہاں کے ہر اچھے اور اوسط درجے کے ہوٹل ہمارے دشمنوں کا ٹارگٹ بن سکتے تھے۔ میں نے اس کی تجویز پر صاد کیا اور ذرا ستانے کے بعد ریسپشن پر ایک دن کا کرایہ ایڈوانس چھوڑ کر ہم وہاں سے نکل پڑے۔

ملک کا انتہائی شمالی حصہ ہونے کی وجہ سے یہاں زیادہ زیادہ سردی پڑ رہی تھی۔ اور پھر اگلے دن علی الصباح ہم نے وادی کیلاش کی طرف روانہ ہونا تھا اس لئے ہم نے بازار میں گرم کپڑوں کی ہلکی پھلکی شاپنگ کی اور ایک سستا سا ہوٹل تلاش کر کے اس میں ڈبل بیڈ کا کمرہ لے لیا۔ نگینہ کو بصد اصرار میں نے بیڈ پر لٹا دیا اور خود رات زمین پر بیڈ کے قریب ٹیک لگائے گزار دی۔

صبح ہم نے ناشتہ کیا اور کوچ کے اڈے پر جا پہنچے۔ مجھے ہر پل دشمنوں کا خطرہ تھا۔ تاہم گرم شالوں نے ہمارے چہرے چھپانے کا کام مؤثر انداز میں کیا تھا۔

اگرچہ وادی کیلاش سے متعلق میری معلومات خاصی محدود تھیں لیکن میں نے چترال کے کچھ مقامی سلجھے ہوئے لوگوں سے تھوڑی بہت معلومات حاصل کر لی تھیں جس کے مطابق چترال سے جیپ کے ذریعے کسی بھی کیلاشی وادی میں جانے کے لئے دو سے تین گھنٹے لگتے ہیں۔ جیپ فی سواری کرایہ کے حساب سے بھی ملتی ہے۔ لیکن عموماً جیپ کی بکنگ کروانی پڑتی ہے اور کرایہ طے کرنے کے لئے خاصی تگ و دو بھی کرنی پڑتی ہے۔ عموماً آٹھ سو سے ایک ہزار ہی ڈرائیور حضرات طلب کر لیتے ہیں۔

چترال سے وادی کیلاش تک کا راستہ خاصا پیچیدہ اور دشوار گزار ہے اس لئے اگر آپ اپنی گاڑی پر جانا چاہیں تو صرف فور وہیل ڈرائیو ہی مناسب رہے گی۔ لیکن اب تیز رفتار فلائنگ کوچز بھی چلنے لگی ہیں۔

وادی کیلاش تین دیہات ''ریمبور، بمبریت اور بریر'' پر مشتمل ہے۔ اگر چترال پاکستان کے انتہائی شمال میں واقع ہے تو وادی کیلاش چترال کے جنوب مغربی سمت میں ہے جس کو چاروں طرف سے ہندوکش کے عظیم پہاڑی سلسلے نے گھیر رکھا ہے۔ وادی کیلاش کے ان مذکورہ تین دیہاتوں میں صرف بمبریت میں رہائش اختیار کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ یہاں ہر معیار کے ہوٹل مل جاتے ہیں۔ تین سو روپے سے لے کر ہزار روپے تک۔ بلکہ سیزن میں بسا اوقات اس سے بھی زیادہ کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ بمبریت میں پختون اور بعض چترالی لوگوں کے آنے کی وجہ سے وہاں حقیقی کیلاشی کلچر میں کچھ کمی دکھائی دیتی ہے لیکن دوسرے دونوں کیلاشی دیہات ریمبور اور بریر نسبتاً زیادہ نمایاں کیلاشی کلچر کی تصویر پیش کرتے ہیں مگر وہاں ہوٹل کم ہیں اور زیادہ اچھی رہائش نہیں ملتی۔

کوہ ہندوکش میں موجود یہ پہاڑی قبیلہ قریباً تین سے چار ہزار کیلاشیوں پر مشتمل ہے جو عظیم فاتح سکندر اعظم کی یاد دلاتا ہے۔ کیلاشی کھوور (KHOWER) اور کالاور (KALAHWAR) زبانیں بولتے ہیں۔ ان زبانوں کا کوئی رسم الخط نہیں۔ کیلاشیوں کا مذہب کچھ خاص حدود و قیود کا پابند نہیں ہے۔ لیکن ان کے ہاں دیوی اور دیوتا کی پرستش کا تصور بڑا نمایاں ہے۔ ڈی زاؤ (DE ZAO) سب کا خالق دیوتا، ساجیگور (SAJIGOR) چوپایوں اور مال مویشی کا دیوتا، ماہن ڈوئی (MAHAN DOE) شہد کی مکھی کا دیوتا، جیستک (JASTAK) گھر اور خاندان کا دیوتا ہے۔ ان کی اپنی داستانیں، رسم و رواج، مختلف نغمے تہوار کی مناسبت سے پہناوے اور ان کے اپنے نام ہیں۔ کیلاشیوں کے تہواروں میں (CHAOMAS

موس'' کا تہوار سب سے بڑا تہوار ہے۔ اس کو (BALOMAIN) دیوتا کے حوالے سے منایا جاتا
مقامی زبان میں کیلاشی کالے کپڑے پہننے والوں کو کہا جاتا ہے۔ ان کی عبادت گاہ یا کمیونٹی ہال کو
بتک'' کہتے ہیں۔

بہرطور میں اور نگینہ فلائنگ کوچ میں بیٹھے اور تقریباً اڑھائی گھنٹوں کے بعد بمبریت پہنچے۔ یہاں بڑی
لے کی سردی تھی۔ ہم نے ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں قیام کیا۔ یہاں کی اکثر مقامی عورتوں کو
نے ہمیشہ کالے رنگ کے روایتی کپڑوں میں ملفوف دیکھا۔ جن پر سیپیوں، گھونگھوں، سکوں اور بٹنوں
کو انتہائی مہارت اور خوبصورتی کے ساتھ ٹانک کر دلفریب بنایا گیا تھا۔ ان وادیوں میں جہاں گھنے
ات کے ساتھ ساتھ مکئی اور گندم کے سرسبز کھیت دکھائی دیتے ہیں، وہاں سیب، خوبانی، ناشپاتی اور
ٹ کے جھنڈ بھی نظر آتے ہیں۔ میں اور نگینہ باوجود دگرگوں حالات کے اس حسین و طلسماتی وادی کے
میں کھو سے گئے تھے۔ نگینہ نے مجھے ایک گائیڈ رکھنے کی تجویز دی تھی۔

میں نے تگ و دو کی تو ایک نوجوان چترالی لڑکا داور خان مجھے مل گیا۔ داور خان کی عمر بمشکل اٹھارہ
سال تھی۔ وہ ایک یتیم، بے سہارا لڑکا تھا۔ اس کا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ مگر اسے یہاں کے بارے میں
انگیز معلومات حاصل تھیں۔ میں نے اسے مستقل طور پر ساتھ رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ بھی خوش ہو گیا۔
اب مسئلہ اس کیلاشی عامل عاروب کو تلاش کرنے کا تھا جسے بہرحال راز رکھنا تھا۔ میں نے داور خان
کہا کہ ہم دونوں میاں بیوی (میں اور نگینہ) ایک اخبار سے تعلق رکھتے ہیں اور کیلاشی وادی کی سیر بھی
چاہتے ہیں اور سیر حاصل معلومات بھی۔

وہ بڑی مستعدی اور جوش سے بولا۔ ''صیب جی! میں آپ کو پوری کیلاشی وادی کی سیر کراؤں گا۔ آپ
بے غم ہو جاؤ۔'' ....'بے غم ہو جاؤ' اس کا تکیہ کلام تھا جسے وہ بار بار استعمال کر رہا تھا۔ ''کیونکہ
ی پیدا ہی ادھر ہوا ہوں۔ چلو پھر میں سب سے پہلے آپ لوگوں کو بمبریت کی سیر کراتا ہوں، اس
بعد ریمبور اور بریر لے چلوں گا۔''

میں نے کہا۔ ''بھئی ہم بمبریت تو گھوم ہی چکے ہیں۔ تم ایسا کرو ہمیں ریمبور لے چلو۔ وہاں رہائش
کا انتظام تو ہو گا نا؟''

''ہاں، ہاں صیب جی! کیوں نہیں........ مگر........'' وہ اچانک کچھ کہتے کہتے رکا تو میں نے پوچھا۔
''مگر کیا........؟''

''صیب جی! ریمبور اور بریر اس وادی کے اندرونی دیہات ہیں۔ وہاں رہائش کے لئے اچھے ہوٹل تو
ہیں۔ لیکن رات پڑ گئی تو آپ لوگوں کو کسی ''مڑھی'' میں رہائش اختیار کرنا ہو گی۔''

''مڑھی؟........ یہ کیا ہوتی ہے؟''

''صیب جی! مڑھی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں کو کہتے ہیں۔'' وہ مسکرا کر بولا۔ ''باہر سے آنے والے
لوں کو وہاں کے مقامی لوگ رات بسر کرنے کے لئے کرائے پر دیتے ہیں۔''

''اچھا، اچھا........ ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں۔ ہم کون سا ہمیشہ کے لئے رہنے آئے ہیں۔ اپنا کام
کرنے کے بعد دو ایک روز میں لوٹ ہی جائیں گے۔ تم چلو۔'' میں نے کہا۔

ہم بمبریت سے روانہ ہوئے۔ اس وقت دن کے گیارہ بجے کا عمل تھا۔ ہم ایک خچر گاڑی میں بیٹھ کر
پہنچے۔ راستے میں داور خان نے بتایا کہ آج کل ''چاموس'' کا خاص تہوار منانے کی تیاریاں کی جا
تھا اور اس موقع پر خصوصاً عورتوں نے مخصوص سیاہ لبادے پہن رکھے ہوتے ہیں جسے مقامی زبان

میں ''چھیٹو'' کہا جاتا ہے۔ بالوں کی چوٹیاں بناتی ہیں۔ گلے میں ڈھیروں مالائیں پہنتی ہیں اور سر پر ''کوپاس'' لیا جاتا ہے۔ یہ کوپاس اون کے کپڑے، موتیوں، پھولوں، گھنٹیوں وغیرہ سے بنایا جاتا ہے۔

خچر گاڑی سے اترے تو میں نے دانستہ داور سے مذہبی عبادت گاہوں کی سیر کرنے کا کہا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ مردود کیلاشی عامل عاروب ایک مخصوص گروہ کا روحانی پیشوا بھی تھا۔ میں باتوں باتوں میں داور کے ذریعے اس کا کھوج لگانا چاہتا تھا۔ داور ہمیں عبادت گاہیں دکھانے چل پڑا۔ ان میں ڈی زاؤ، ساجی گور، ماہن ڈوئی، جیستک کے نام قابل ذکر تھے۔ مگر مجھے عاروب نامی وہ کیلاشی عامل کہیں دکھائی نہ دیا۔ اگرچہ میں اسے پہچانتا تو نہیں تھا مگر میں نے ابھی سوائے ان دیوتاؤں کے کسی روحانی پیشوا کا تذکرہ نہیں سنا تھا۔ تب میں نے خود ہی داور خان سے پوچھا۔ ''ان لوگوں کا آخر کوئی روحانی پیشوا تو ہوگا؟''

''بہت کم۔'' داور بولا۔

''تمہیں ان سے واقفیت ہے؟''

''اگر آپ کو ان سے ملنا ہے تو ان کے جشن میں شامل ہونا پڑے گا۔'' وہ بولا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تہوار کے پہلے دن کی ابتداء ہو چکی تھی جو ''شیشاوسچک'' کہلاتا تھا۔ اس کے بعد جشن چلم جیش منایا جاتا۔ اب یہ اتفاق تھا یا ہماری خوش قسمتی کہ یہ دسمبر کا ہی مہینہ تھا اور ان کے تہوار اسی مہینے میں منائے جاتے تھے۔

ہمارے نوعمر گائیڈ داور کے کہنے کے مطابق یوں تو اپریل سے لے کر ستمبر وادی کیلاش میں رہنے کے لئے بہترین ہیں۔ البتہ ونٹر ٹریکنگ کے شائقین کی الگ بات ہے۔

ذرا شام ہوئی تو تہوار عروج پر پہنچ گیا۔ ایک تہوار کی تقریب ''کالاشی آگرم'' میں ہو رہی تھی۔ یہ ذہن ٹھنک گیا۔ مجھے یاد آیا کہ عاروب اس وادی کے ایک مخصوص گروہ کا روحانی پیشوا تھا۔ ہم وہاں پہنچ گئے تھے۔ کالاشی آگرم سب سے اونچا گاؤں تھا اور دریا کے ساتھ تھا۔ دورانِ تہوار مرد کھلی آگ پر ''شیشاؤ'' بناتے ہیں۔ یہ ایک مخصوص انداز کی روٹی ہوتی ہے۔ وہاں کوئی عورت نہیں ہوتی۔

نگینہ سحر زدہ سی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ میری طرح اسے بھی یہ بالکل ایک الگ تھلگ دنیا محسوس ہو رہی تھی۔ میں بہ غور ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس دوران عورتیں اور لڑکیاں مخصوص گیت گاتی وہاں آ گئیں۔ تب میں نے ایک عمر رسیدہ کیلاشی کو دیکھا۔ وہ قبیلے کا بزرگ تھا۔ وہ ایک مخصوص لکڑی سے عورت کے سر کو تین بار چھوتا۔ چیڑ کی مشعلیں روشن تھیں۔ علاوہ ازیں بہت بڑا الاؤ بھی روشن تھا۔ میری نظریں اس عمر رسیدہ کیلاشی پر جمی ہوئی تھیں۔ اب خواتین کے ہاتھوں پر پانی ڈالا جا رہا تھا اور مرد انہیں اپنی پکی ہوئی روٹیاں دے رہے تھے۔ وہ عمر رسیدہ چھڑی چھوتے ہوئے بار بار ایک مخصوص لفظ ''سودا'' ادا کرتا جا رہا تھا۔ اس رات عورتوں نے بھی ایک مخصوص روٹی پکائی جسے ''جھاؤ'' کہا جاتا تھا۔ اس مخصوص روٹی میں پنیر اور کچلے ہوئے اخروٹ وغیرہ بھرے جاتے تھے۔ میں نے جب اس عمر رسیدہ آدمی کا پوچھا تو مجھے مایوسی ہوئی۔ اس کا نام عاروب نہ تھا۔

اگلا روز مردوں کے نہانے اور بالومین کے لئے تیاری کا تھا۔ داور خان کے کہنے پر ہم واپس ہو اور ایک مڑھی کرائے پر لے لی۔

اگلا دن بھی ان کا تہوار دیکھتے ہوئے گزرا۔ میں اب ''کالاشی آگرم'' سے دور نہیں جانا چاہتا تھا۔ وقت ''چماجن رات'' کی تقریب تھی۔ یہ رات مشعل بردار جلوس کی شکل میں تھی۔

ان کا روحانی پیشوا نظر آتا ہو۔ ایک کیلاشی عورت نے نگینہ سے مسکرا کر کہا۔

''ایش سپھے بابا! یور لیتا تازہ۔'' نگینہ اس کی زبان نہ سمجھ پائی تو داور خان نے مسکرا کر اس کا ترجمہ کرتے ہوئے نگینہ سے کہا۔

''میڈم! یہ آپ سے پوچھ رہی ہیں کہ پیاری بہن! کیا حال ہیں؟''

تب نگینہ نے مسکرا کر اشاروں کی بین الاقوامی زبان میں اسے بتایا کہ وہ ٹھیک ہے۔ داور خان نے ہمیں بتایا کہ یہ لوگ آپ کو مخاطب کرنے کے لئے ''بابا'' یا ''بھایا'' کہیں گے۔

بہرطور وہ دن بھی یونہی ناکام گزر گیا۔

تیسرے دن جونہی سورج بلند ہوا، داور خان ہمیں ''جیستک'' عبادت گاہ لے گیا۔ کالاشی روایت کے مطابق جیستک، گھر اور خاندان کی دیوی ہے۔ یہ عبادت بالنگورہ میں ہوتی ہے۔ ہم وہاں جا پہنچے۔ یہاں داور نے مجھے ایک کام کی بات بتائی۔

اس نے جلوس میں موجود ایک گروہ کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ یہ لوگ یہاں کے ایک مخصوص گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا اپنا اندازِ عبادت اور دیوتا ہوتا ہے۔ ان کا ایک روحانی پیشوا بھی ہے۔

میرا ذہن بری طرح ٹھٹکا۔ کبیر نے مجھے عاروب کے بارے میں بتایا تھا کہ عاروب نے وہاں کیلاشیوں کا ایک الگ تھلگ مخصوص گروہ بنایا ہوا ہے۔ میں نے اضطراب، جوش و بے چینی سے پوچھا۔ ''ان کے روحانی پیشوا کا نام..........؟''

''میں نہیں جانتا۔'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ مگر میں ناامید نہ ہوا۔ داور خان بولا۔

''صیب جی! ویسے یہ گروہ بہت پراسرار سرگرمیوں کا حامل گروہ ہے۔ اگر آپ ان کا انداز دیکھنا چاہتے ہیں تو ابھی تھوڑی دیر بعد یہ لوگ الگ ہو کر اپنی عبادت گاہ لوٹ جائیں گے۔ وہیں ان کا روحانی پیشوا بھی ہوگا۔''

''چلو، پھر میں تیار ہوں۔'' میں نے فوراً کہا۔

پھر ذرا دیر بعد یہ مخصوص گروہ ان سے الگ ہو گیا۔ ہم ان کے ساتھ ساتھ چل پڑے۔ بیرونی دنیا سے یہاں آنے والے سیاحوں کا یہ معمول تھا۔ اس لئے کسی نے ہم پر خاص توجہ نہ دی تھی۔ ہم جس مخصوص گروہ کے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے، ان لوگوں نے اپنے ہاتھوں میں ٹوکریاں اٹھا رکھی تھیں جن میں اخروٹ، خشک میوہ جات اور پھل وغیرہ تھے۔ ہم ان کی عبادت گاہ میں پہنچے جو آبادی سے ذرا ہٹ کر تھی۔ میرے دل میں جانے کیوں بے چینی سی پیدا ہونے لگی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کچھ ہونے والا تھا۔ میری چھٹی حس بار بار خطرے کا الارم بجا رہی تھی۔

بہرطور ہم ان لوگوں کے ساتھ ان کی عبادت گاہ پہنچے۔ میں نے ان کے روحانی پیشوا کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ بار بار داور خان سے اس کے بارے میں استفسار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اب میں ہر بات اس سے پوچھنا نہیں چاہتا تھا۔

اس عبادت گاہ میں آگ جلانے کا خصوصی انتظام کیا گیا تھا۔ لوگ باگ اپنے ساتھ لائی ہوئی خوراک کا ایک حصہ ایک بہت بڑی اجتماعی باسکٹ میں ڈال رہے تھے۔ اس بارے میں ان کا خیال تھا کہ ان کے آباؤ اجداد کی روحیں آ کر اسے قبول کر لیں گی۔ یہ عمل عبادت گاہ کے باہر ہوتا تھا۔

عبادت گاہ سے باہر مردوں نے چیڑ کی لکڑی سے ایک اہرام سا بنایا تھا جسے ''کوٹک'' کہا جا رہا تھا۔ شام گہری ہوئی تو وہ لوگ عبادت گاہ میں داخل ہونے لگے۔ میں نے بھی اندر جانا چاہا تو داور گھبرا کر

بولا۔ ''صیب جی! یہ بہت پراسرار اور جادو ٹونا کرنے والے لوگ ہیں۔ مجھے ان سے ڈر لگتا ہے۔''

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا یہ لوگ ہمیں اندر داخل ہونے نہیں دیں گے؟''

''نہیں۔ یہ لوگ تو خوش ہوتے ہیں کہ کوئی اجنبی ان کے ساتھ اندر داخل ہو۔'' وہ بولا۔ ''اس سلسلے میں ان کے روحانی پیشوا کا کہنا ہے کہ اس طرح ان کا گروہ بڑھے گا۔''

میں نے دل ہی دل میں لعنت بھیجی۔ میں ان کے رنگ میں رنگنے نہیں آیا تھا۔ میرا مقصد تو کچھ اور تھا۔ لہٰذا داور تو اندر نہیں گیا، میں اور نگینہ اندر داخل ہو گئے۔

میں نے احتیاط کے پیش نظر بالخصوص نگینہ کا چہرہ ایک گرم شال میں چھپا رکھا تھا کہ اگر واقعی یہاں عاروب سے ٹکراؤ ہو جائے تو وہ نگینہ کو دیکھ کر ہماری طرف سے ٹھٹک نہ جائے۔ میں اور نگینہ دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہو گئے۔ داور خان البتہ باہر حیران و پریشان کھڑا رہ گیا تھا۔

جب سب اندر داخل ہو گئے تو عبادت گاہ کے دروازے پر موٹا سا پردہ ڈال دیا گیا جسے دو آدمیوں نے پکڑ رکھا تھا۔ سامنے ایک چبوترا تھا۔ چیڑ کی مشعلوں سے اندر کی فضا گرم تھی۔ ہمیں گرم کپڑوں میں اب گرمی سی محسوس ہونے لگی۔ میرے لئے یہ حیرت کی بات تھی کہ کسی نے بھی ہم پر توجہ نہ دی تھی۔

یہ مخروطی چھت والی بڑی ہی عجیب وضع کی عبادت گاہ تھی۔ سامنے ایک اونچا چبوترا تھا جدھر ایک بڑی سی مورتی تھی۔ مورتی کی صورت بڑی خوف ناک تھی۔ عجیب طلسماتی اور دلوں پر نا معلوم سا خوف پیدا کر دینے والا ماحول تھا۔ نگینہ نے گرمی کے مارے شال اتار دی تھی۔

تھوڑی دیر بعد چبوترے پر ایک کبڑا، ادھیڑ عمر شخص نمودار ہوا۔ اس نے سیاہ رنگ کا لمبا سا چغہ پہن رکھا تھا۔ سر گنجا تھا۔ ناک طوطے کی چونچ کی طرح مڑی ہوئی تھی۔ چہرہ سیاہ اور آنکھوں میں ایک عجیب کی مقناطیسی کشش تھی۔ بدہیئت، سیاہ چہرے سے خباثت ٹپک رہی تھی۔ شاید یہی ان کا روحانی پیشوا تھا۔ اس کے سنگی چبوترے پر آتے ہی وہاں موجود اس کے پیروکاروں نے اپنے سر جھکا دیئے اور با آواز بلند اجنبی زبان میں کچھ پڑھنے لگے۔ میں اور نگینہ جوں کے توں کھڑے تھے۔ اس کبڑے، عمر رسیدہ شخص کی مقناطیسی نظریں ہم پر پڑیں اور پھر نگینہ پر اس کی نظریں جم گئیں۔ اب سب لوگ سر جھکائے بالکل خاموش کھڑے تھے۔ ماحول کو جیسے ایکا ایکی سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ پراسرار کبڑا بدستور اب نگینہ کو ہی اپنی مقناطیسی نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔

میں نے نگینہ کو دیکھا تو چونک گیا۔ وہ بھی یک ٹک اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اچانک میں نے دیکھا کہ نگینہ نے آپوں آپ چبوترے کی طرف قدم بڑھانے شروع کر دیئے۔ اس کا انداز تنویمی عمل کے زیر اثر کسی معمول کا سا تھا۔ میں جیسے سناٹے میں آ گیا۔

نگینہ کا یوں میکانکی انداز میں چبوترے کی طرف دھیرے دھیرے بڑھنا میرے لئے سخت حیرت کا باعث تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں تذبذب کا شکار تھا۔ ہال میں موجود سب لوگ دست بستہ خاموش اور سر جھکائے کھڑے تھے۔ ماحول میں پراسرار سناٹا طاری تھا۔ چیڑ کی مشعلوں سے بلند ہوتے شعلے عجیب ہلکی ہلکی چرچراہٹ کی آواز بلند کر رہے تھے۔ میں کبھی دم بہ خود چبوترے کی طرف کشاں کشاں بڑھتی نگینہ کو دیکھنے لگتا تو کبھی چبوترے پر موجود اس سیاہ پوش کبڑے روبوٹ کو جس کی مقناطیسی آنکھیں مسلسل نگینہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کا گنجا سر مشعلوں کی روشنی میں تپتا ہوا نظر آ رہا تھا اور طوطے کی چونچ جیسی مڑی ہوئی ناک کے نیچے بدہیئت ہونٹوں پر اسرار بھری مسکراہٹ رقصاں تھی جس میں خباثت کا عنصر غالب تھا۔

میں نے بہ مشکل خود پر قابو پا رکھا تھا۔ مجھے کچھ کچھ اندازہ ہو چلا تھا کہ مخصوص اور پراسرار گروہ کا یہ کبڑا روحانی پیشوا یقیناً وہی کیلاشی عاروب تھا جس نے کبیر اور کالا ناگ کے ایما پر میری نگینہ کی ذہنی رو پلٹ کر میری دنیا کو تہ و بالا کر ڈالا تھا۔ آج میں طویل مسافت کے بعد بڑی شوریدہ سری کے عالم میں نگینہ کو لے کر یہاں اپنی دل کی دنیا کو بچانے کے عزم کے ساتھ آیا تھا۔

میں نے دیکھا، نگینہ چبوترے کے قریب پہنچ کر رک چکی تھی۔ پھر دوسرے ہی لمحے اس کبڑے گنجے نے نہایت دھیمی مگر پُر تاثر آواز میں اسے مخاطب کر کے کچھ کہا جسے میں نہ سن سکا۔ میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ یہ جملہ سننے کے بعد نگینہ کے ٹھہرے ہوئے قدم دوبارہ حرکت میں آ گئے تھے۔ وہ اسی طرح دھیمی رفتار سے چلتی ہوئی چبوترے کی سیڑھیوں تک پہنچی اور ایک ایک سیڑھی چڑھ کر چبوترے کے اوپر پہنچ کر اس پیشوا کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

صاف ظاہر ہوتا تھا کہ نگینہ اس کے ٹرانس میں تھی اور یقیناً یہی میرا مطلوبہ شخص کیلاشی عامل عاروب ہی تھا۔ اب یہ نگینہ سے کیا بات کرنا چاہتا تھا، یہ سننے کے لئے میں نے بھی خاموش کھڑے مجمع کے درمیان دھیرے دھیرے چبوترے کی طرف قدم بڑھانا شروع کر دیئے تھے۔ اور پھر قدرے قریب پہنچ کر میں خاموش کھڑا ہو گیا۔ سینے میں میرا دل اس وقت کسی اور ہی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ میری نظریں جھکی ہوئی تھیں مگر کان پوری طرح عامل کی طرف لگے ہوئے تھے۔ شاید اس لئے میں نے وہ منمناتی ہوئی آواز سن لی۔

''مجھے پورا یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن تم ضرور آؤ گی۔ ہماری روحانی طاقت تمہیں ہمارے گروہ میں شامل ہونے پر مجبور کرتی رہے گی۔ میں نے غلط تو نہیں کہا......... نگینہ؟'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوا۔ اس کی زبان پر نگینہ کے نام نے میرے گمان کو حق الیقین میں تبدیل کر دیا۔ اس کی گفتگو سن کر میری رگوں میں خون کی گردش کھولتے ہوئے لاوے میں بدل گئی۔ تب مجھے نگینہ کی جیسے کہیں دور سے آتی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ اس کیلاشی عامل عاروب سے کہہ رہی تھی۔

''ہاں!......... مجھے واقعی کوئی ان دیکھی طاقت یہاں کھینچ لائی ہے......... تمہارے پاس......... میں اب یہاں سے نہیں جانا چاہتی۔''

نگینہ کی آواز سن کر میں نے چہرہ اوپر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ اس کی بات پر کیلاشی عامل کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ایک مخصوص چمک اُبھری۔ پھر اس کے بدہیئت ہونٹ باچھوں تک پھیلے اس کے بعد اس خبیث نے مجمع پر نظر ڈالی اور اس کی متلاشی نظریں میرے چہرے پر گڑ کر رہ گئیں۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ نگینہ کی جوابی گفتگو نے مجھے پہلے ہی ہولا کر رکھ دیا تھا۔ اب جو کیلاشی عامل کی نظریں مجھ پر جم گئیں تو مجھے یہ خدشہ ہوا کہ کہیں یہ بدبخت مجھے بھی اپنے ٹرانس میں نہ لانا چاہتا ہو۔ لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ میں پورے اعتماد کے ساتھ کھڑا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس گھورے جا رہا تھا۔ اگرچہ مجھے اس کی مسلسل گھورتی ہوئی مقناطیسی نظروں میں ایک کھنچاؤ کی سی کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن میں اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔ معاً میں نے محسوس کیا کہ اس کیلاشی عامل کی آنکھیں ایکا ایکی بے تاثر ہو چکی تھیں۔ جیسے اس کا جادو مجھ پر نہ چل سکا ہو۔ اس خیال نے مجھے یک گونہ تفاخر آمیز تسکین بخشی تھی۔ تب اس کیلاشی عامل نے میرے چہرے سے نظریں ہٹا دیں اور اپنے روبرو کھڑی نگینہ کو تکتے ہوئے اس سے میرے بارے میں پوچھا۔

''تمہارے ساتھ آنے والا یہ شخص کون ہے؟''

''میں اسے نہیں جانتی .... میں اس معبد کے باہر کسی شخص کو نہیں جانتی۔ میں .... میں صرف اپنے عامل یعنی تمہیں جانتی ہوں ....اور بس۔'' نگینہ نے جواباً خوابیدہ کیفیت میں کہا اور ایک بار پھر اس کیلاشی عامل کے بدہیئت ہونٹوں پر اسرار بھری مسکراہٹ اُبھری تھی۔

اب میرے لئے یوں خاموش تماشائی بنے کھڑے رہنا قطعاً ناممکن ہو چکا تھا۔ میں اپنی نگینہ کو ذہنی طور پر پانے کی خاطر مصائب و آلام جھیلتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا اور اس بدبخت خبیث عامل عاروب نے میری نگینہ کو جیسے ایک بار پھر مجھ سے چھین لیا تھا۔ یہ کیا ہو گیا تھا؟......... یہ مجھ سے کیسی بھیانک غلطی ہو گئی تھی؟......... ایک انتہائی کرب انگیز خیال، پچھتاوے کے خنجر کی صورت میرے سینۂ سوزاں میں پیوست ہو کر رہ گیا اور پھر جیسے میرے پورے وجود میں غیظ وغضب کی بجلیاں سی دوڑ گئیں۔

میں نے تیزی سے حرکت کی اور آسمانی بجلی کی طرح چبوترے کی طرف لپکا۔ ٹھیک اسی وقت عامل عاروب نے میرے جارحانہ تیور بھانپ کر وہاں ہال میں موجود چیڑ کی مشعلیں تھامے اپنے تنومند خدام کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ بیک وقت غیر معمولی پھرتی سے حرکت میں آئے۔ میں ابھی چبوترے کی سیڑھیوں تک پہنچا ہی تھا کہ دائیں بائیں اُبھرنے والے چار عدد تنومند خدام نے مجھے دبوچ لیا۔ جبکہ مزید دو خدام نے ماؤزر نکال کر ان کی مہیب نالوں کا رخ میرے چہرے کی طرف کر دیا۔

مجمع سے چند لوگوں نے مختصری ہونے والی کھڑ پڑ کی آواز پر سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ میں نے حلق کے بل چیخ کر نگینہ کو پکارا۔

''نگینہ! ....'' مگر جیسے نگینہ نے میری بات سنی ہی نہیں تھی۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ اچانک کیلاشی عامل عاروب کی تحکمانہ آواز ہال میں گونجی۔

''اسے باہر کا راستہ دکھا دو۔ اگر یہ نہ مانے تو اسے گولی مار دینا۔''

عاروب کے یہ مسلح پیروکار مجھے کھینچتے ہوئے ہال سے باہر لے آئے۔ پھر مجھے درشت لہجے میں وہاں سے چلے جانے کا کہا۔ میں نے سردست ہوش وحواس سے کام لینے کا سوچا اور پھر بہ ظاہر خاموشی کے ساتھ سر جھکائے ان کی عبادت گاہ سے دور چلا گیا۔

یہ تو شکر تھا کہ انہوں نے مجھے چھوڑ دیا تھا ورنہ یہ مجھے قید بھی کر سکتے تھے۔ اب کم از کم میں آزاد تو تھا۔ میرے دل میں عجیب عجیب سے ہول اُٹھ رہے تھے۔ نگینہ ایک بار پھر اس کے ٹرانس میں آ چکی تھی لیکن میں نے یہ بات محسوس کی کہ عاروب نے شاید مجھے بھی اپنے ٹرانس میں لینے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے جرأت اور خوداعتمادی کا مظاہرہ کر کے اسے شکست دے ڈالی تھی۔ جبکہ نگینہ کا اس کے ٹرانس میں آنا سمجھ میں آتا تھا۔ کیونکہ وہ ایک طرح سے پہلے ہی اس کے ٹرانس میں تھی۔ اگرچہ میں زور محبت سے کسی حد تک نگینہ کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو چکا تھا کہ وہ کن پر اسرار حالات و کیفیات کا شکار ہے مگر اب مجھے ان ساری کوششوں پر پانی پھرتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔

میں نے اپنے منتشر ہوتے حواس پر قابو پایا اور ٹھنڈے دل و دماغ سے حالات کی اس اچانک اور غیر متوقع کایا پلٹ کے بارے میں سوچ بچار کرنے لگا۔ اپنی آزادی کو غنیمت جاننے کے بعد میں نے ایک مربوط لائحہ عمل تیار کیا۔ میں اب ان کی عبادت گاہ سے ذرا دور جا کر ایک چٹان کی آڑ میں بیٹھ گیا تھا۔

میرا دوبارہ دیکھ لیا جانا، نہ صرف میرے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا بلکہ میرے مقصد میں رکاوٹ کا سبب بھی بن سکتا تھا۔ اس لئے میرا سب سے پہلے حلیہ بدلنا لازم تھا۔ لیکن میں ان کی نظروں میں آئے بغیر پہلے اس مردود کیلاشی عامل عاروب کے ٹھکانے سے واقف ہونا چاہتا تھا، اس کے بعد ہی میں کوئی عملی

ہم اٹھانے کا متحمل ہو سکتا تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ میرے اندر کی تشویش آمیز بے چینی عروج پر پہنچنے لگی۔ پتہ نہیں اب مردود عامل روب نگینہ کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا تھا؟

آسمان پر بادل چھائے تھے جس کے باعث سہ پہر ہونے کے باوجود شام کا گمان ہو رہا تھا۔ مزید ڈیڑھ گھنٹے بعد میں نے چٹانی آڑ سے ذرا سا سر ابھار کر عبادت گاہ کی طرف دیکھا اور ٹھٹک گیا۔ ل عاروب کے مخصوص گروہ کے افراد اب باہر نکل رہے تھے۔ جب وہ سب کے سب اپنے اپنے نوں پر ہو لئے تو میں نے دو خدام کو عبادت گاہ کے دروازے پر چوکنا کھڑے ہوئے دیکھا۔ تب نک میرے دل میں ایک خیال ابھرا کہ اس خبیث عامل عاروب کی کمین گاہ بھی اسی عبادت گاہ کے کسی شے میں ہو سکتی تھی۔

میں نے اندر داخل ہونے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ میں عبادت گاہ کا طواف کر کے اس کے محل وقوع کا تنقیدی جائزہ لے لوں مگر دن کے وقت یہ ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ درحقیقت میں اب ری بار عامل عاروب کے گرگوں کی نظر میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ اس طرح وہ میری طرف سے محتاط ہو تے تھے۔ ابھی وہ میری طرف سے بہ زعم خود غافل اور بے پرواہ تھے، اس کا سبب یہی تھا کہ انہیں ابھی ری اصلیت کا علم نہیں ہوا تھا۔ وہ مجھے کوئی عام سا شخص سمجھے ہوئے تھے اور میں ان کی اس غفلت سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں ذرا شام گہری ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

جب ٹھٹھرتی شام کی کجلاہٹ فضا میں گھلنے لگی اور اریب قریب گہرا سناٹا چھا گیا تو میں چٹان کی آڑ ے نکل آیا۔ مطلع ہنوز ابر آلود تھا۔ میں انتہائی محتاط روی کے ساتھ عبادت گاہ کے ذرا قریب بڑھنے لگا۔

عبادت گاہ کی مخروطی عمارت کے آس پاس سناٹا اور ویرانی تھی۔ کوئی ذی نفس نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اندھیرے اور ویرانی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عبادت گاہ کا مکمل طواف کر ڈالا اور اس کے محل وقوع ے اچھی طرح آگاہی حاصل کرنے کے بعد ایک جگہ ذرا ٹھہر گیا۔

یہ عبادت گاہ کی شمالی دیوار کا حصہ تھا۔ یہاں اوک اور کنڈ باوری کی جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ میں نے عبادت گاہ کے اس حصے کا انتخاب کر کے یہاں ٹھہرا تھا۔ کیونکہ یہاں مجھے ایک چھوٹا سا دروازہ نظر آ تھا۔ یہ سنگل پٹ کا دروازہ تھا اور قرائن سے پتہ چلتا تھا کہ یہ یقیناً کسی تنگ زینے پر کھلتا تھا جو عبادت کی اوپری منزل کی طرف جاتا تھا۔ کیونکہ اس جانب ایسا ہی ابھار تھا جو کسی گردشی زینے کو ظاہر کرتا تھا ن تین تین فٹ کے فاصلے سے ایک دوسرے کے اوپر دریچے بنے ہوئے تھے۔ کچھ ایسا اندازہ ہوتا تھا کہ خبیث عامل عاروب کا حجرہ نما ٹھکانہ اوپری منزل ہی کی طرف تھا اور اس کا ایک دروازہ اندر بھی کھلتا ا لیکن عبادت گاہ کے باہر کھلنے والے اس مختصر سے سنگل پٹ والے دروازے کا مقصد مجھے سمجھ میں نہ ۔ لیکن ذہن طباع نے اسے ہی آزمانے کا طریقہ سوچ لیا تھا۔

فضا خاموش تھی۔ ماحول میں دھڑکتا ہوا سناٹا طاری تھا۔ دور کہیں برف پوش پہاڑیوں سے جانوروں بولنے کی آوازیں کبھی کبھی گونجتی سنائی دیتی تھیں اور پھر وہی آسیبی سناٹا منحوس گدھ کی طرح پنجے گاڑ تا تھا۔ سردی بھی زوروں پر تھی۔ میں نے گرم اونی شال اوڑھ رکھی تھی۔ میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا ڑکتے دل کے ساتھ مذکورہ دروازے کی طرف دبے پاؤں مگر تیز تیز قدموں سے بڑھنا شروع کیا۔ ے کے قریب پہنچ کر میں رکا اور دیوار سے پشت کے بل چپک کر دم سادھے کھڑا ہو گیا۔ چند ثانیے قف میں جائزہ لینے کے بعد میں نے سنگل پٹ والے دروازے کا جائزہ لیا۔ باہر سرے سے کنڈی

ہی غائب تھی۔ میں نے ہولے سے اسے اندر باہر دھکیلنے کی کوشش کی مگر عبث۔ وہ اندر سے بند تھا۔ لیکن ذرا ہلانے جلانے سے مجھے اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ سن رسیدگی کے باعث تختے کا پٹ کچھ کمزور ہو چلا تھا۔ میں نے ایک بار پھر ایک نظر گرد و پیش پر ڈالی، اس کے بعد مذکورہ کمزور تختے کو ہلا جلا کر دیکھنے لگا۔ میرے ہلانے سے تختے کی مختصری چوبی چوکھٹ کے درمیان خاصی موٹی درز بن گئی۔ میں نے جھک کر فوراً اپنی آنکھ چپکا دی۔ اندر مدھم سی روشنی ہو رہی تھی۔ روشنی میں مجھے اندر ایک سنگی گردشی زینہ دکھائی دیا جو اوپر کی طرف جا رہا تھا۔ لیکن مدھم روشنی زینے کے سامنے والی دیوار کے بغیر دروازے والی کھلی چوکھٹ سے آ رہی تھی جہاں سے ہال کا وہ چبوترا نظر آ رہا تھا جدھر کافی دیر قبل عاروب اور نگینہ کھڑے تھے۔ مگر اب وہاں اس خوف ناک صورت والی مورتی کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

عاروب اور نگینہ کو اب وہاں نہ پا کر مجھے ایک محتاط سا اندازہ ہونے لگا کہ وہ دونوں یقیناً اس گردشی زینے سے اوپری منزل پر جا چکے تھے۔

میں سیدھا کھڑا ہو گیا۔ ایک بار پھر اپنے عقب اور گرد و پیش میں نگاہ دوڑائی۔ پھر تختے کی موٹی درز کے اندر اپنی دو انگلیاں گھسیڑ کر تختے کو کھینچنے لگا۔ میری کوشش رنگ لائی اور دو تین بار زور لگانے کے بعد تختہ اُکھڑ گیا۔ اب سنگل پٹ والے دروازے میں اتنا خلا ہو گیا تھا کہ جس سے ایک آدمی اندر داخل ہو سکے۔ لیکن میں نے کسی خیال کے تحت اپنا پورا بازو اس مختصری چوبی چوکھٹ کے اندر ڈال کر کنڈی تلاش کی۔ میرا دل یکبارگی مسرت سے دھڑکا۔ کنڈی تک میرا ہاتھ با آسانی پہنچ چکا تھا اور اس پر تالا بھی نہیں لگا ہوا تھا۔ میں نے جلدی مگر آہستگی سے کنڈی کھولی اور دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔ پھر دوبارہ دروازہ بند کر کے اُکھڑا ہوا تختہ دوبارہ جما دیا تاکہ بعد میں کسی کو شبہ نہ ہو سکے۔ میں نے زینے پر کھڑے ہو کر ایک نظر ہال میں ڈالی۔ چند مشعلیں روشن تھیں۔ اس کے علاوہ کوئی نظر نہ آیا۔ اس کے بعد میں نے سر اٹھا کر گردشی زینے کی طرف دیکھا۔ اپنے نیفے میں اڑسے ہوئے میگارد کی موجودگی کی تسلی کی۔ میں نے میگارد کا چیمبر چیک کیا۔ چار گولیاں تھیں۔ میں نے مزید تین ڈال کر ساتوں کی تعداد مکمل کی اور پھر دھیرے دھیرے زینے طے کرنے لگا۔

زینے کی پتھریلی دیوار کے ساتھ ہر چکر پر چھوٹا سا محرابی دریچہ تھا جس سے باہر کا منظر نظر آتا تھا۔ میں اوپر چڑھنے لگا۔ اندازاً آٹھویں چکر پر مجھے سامنے دائیں جانب قدرے چوڑے تختوں والا دروازہ نظر آیا جو چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ میں نے میگارد نکال کر اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ لیا۔ دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے میں ذرا مزید آگے کھسکا اور دیوار سے چپکا ہوا آگے بڑھ کر اندر جھانکا تو جیسے میری کنپٹیاں سنسنا اُٹھیں۔ دس بائی بارہ کے کمرے کے بالکل وسط میں زمین پر بچھے دبیز قالین پر مجھے نگینہ دو زانو بیٹھی نظر آئی۔ اس کے سامنے عاروب بیٹھا تھا۔ دونوں کے وسط میں دستر خوان بچھا ہوا تھا۔ وہ کھانے میں مصروف تھے۔ اندر چیڑ کی مشعلوں سے خاصی روشنی ہو رہی تھی۔ دو خدمت گار بھی موجود تھے۔

نگینہ کے چہرے پر اب اُلجھن آمیز پریشانی کے تاثرات تھے۔ صاف لگتا تھا جیسے اب وہ عامل عاروب کے ٹرانس سے باہر آ چکی تھی۔ وہ مخصوص تنویمی کیفیت جو پہلے نگینہ پر طاری تھی، اب عنقا ہو چکی تھی۔ شاید اس کی پریشانی کی وجہ بھی یہی تھی۔

''مم .... مجھے بتاتے کیوں نہیں .... مم .... میرا وہ ساتھی کہاں گیا؟'' معاً نگینہ نے اس عامل عاروب سے ہراساں لہجے میں کہا۔ اس کے لہجے میں ایک تڑپ تھی، ایک التجا تھی۔ وہ میرے بارے میں اس خبیث سے پوچھ رہی تھی۔

''وہ تمہارا کیا لگتا تھا؟'' عاروب نے بھویں سکیڑ کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''پتہ نہیں، وہ میرا کیا لگتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میں کون ہوں، کہاں ہوں؟ .... مجھے ایسا ہے جیسے میرے ذہن کی اسکرین رفتہ رفتہ صاف ہوتی جا رہی ہے۔ میرے دل و دماغ بالکل کورے ہوتے جا رہے ہیں۔ میں کون ہوں؟ .... کیا ہوں؟ .... آہ!'' نگینہ جیسے بے خودی میں کہتی جا رہی تھی اور اس کی اس حالت پر میرا جگر چھلنی ہونے لگا۔ میں خود پر بہ مشکل قابو پائے دم سادھے دیوار کی آڑ میں کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔

''لڑکی! .... اب تمہیں اس دنیا سے کچھ نہیں لینا دینا۔ تم اب یہیں رہو گی ہمیشہ کے لئے۔ ساری عمر میری کنیز بن کر۔ میری باندی بن کر۔'' عامل عاروب نے کھرکھراتی اور بارعب آواز میں کہا جس میں تحکمانہ عنصر بھی غالب تھا۔ مجھے اس خبیث کے نگینہ کے متعلق مکروہ عزائم جان کر طیش چڑھ گیا۔ میرے جی میں آئی کہ اسی وقت اپنے میگارد کی ساتوں گولیاں اس مردود کبڑے کے ناپاک وجود میں اُتار دوں۔

''نہیں .... میں یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ میں اپنی دنیا میں واپس جانا چاہتی ہوں۔ مجھے جانے دو'' نگینہ نے یکدم تڑپ کر کہا تو میں نے دیکھا، عامل عاروب نے اپنا دایاں ہاتھ فضا میں بلند کیا اور بلند تحکمانہ لہجے میں اس سے کہا۔

''میری طرف دیکھو ....'' نگینہ نے آبدیدہ نگاہیں اس کے چہرے پر ڈال دیں۔ عامل عاروب بغیر پلک جھپکائے گھورتا رہا۔ میرے دماغ میں جیسے آتش فشاں چنگھاڑنے لگا اور میں غیظ و غضب سے پاگل ہو گیا۔ پھر جیسے ہی میں نے درانہ اندر داخل ہونے کا ارادہ کیا، اچانک میرے سر پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی اور میرے حلق سے ایک کرب انگیز کراہ خارج ہوئی۔ اس کے بعد میں ہوش و حواس کی دنیا سے بیگانہ ہو چکا تھا۔

* * *

آنکھ کھلی تو اندھیرے کے سوا مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے سر کو دو تین بار جھٹکا تو تاریکی کا پردہ چاک ہوا اور میں کچھ دیکھنے کے قابل ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے سر کے پچھلے حصے میں ایک اذیت ناک ٹیس کا بھی احساس ہوا اور میرے حلق سے کراہ سی خارج ہو گئی۔

میں ایک خستہ حال، ننگے فرش پر رسن بستہ حالت میں پڑا ہوا تھا۔ کمرہ چھوٹا اور میرے سوا ہر شے سے خالی تھا۔ دیواریں پتھریلی تھیں۔ چھت البتہ خاصی بلند اور ڈھلوان تھی۔ کمرے میں روشنی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ البتہ ایک دریچے سے باہر پھیلی ہوئی چاندنی کے باعث کچھ اُجالا ہو رہا تھا۔ باہر شاید مطلع صاف ہو چکا تھا اور کہیں دور برف پوش پہاڑیوں سے چاند سر اُبھار رہا تھا۔ میری دونوں ٹانگوں کو نائلون کی مضبوط رسیوں سے جکڑا ہوا تھا اور دونوں ہاتھ پشت کی سمت موڑ کر اسی طرح بندھے ہوئے تھے۔ شکر ہے میرا ذہن اچھی طرح کام کر رہا تھا۔

میں نگینہ اور عاروب کی باتوں میں کھو کر اپنے گرد و پیش سے بے خبر اور بے پرواہ ہو گیا تھا اور یہی سب سے بڑی اور فاش غلطی تھی۔ کسی خادم نے اچانک کسی کند شے سے میرے سر پر وار کر کے دنیا و مافیہا سے بیگانہ کر دیا تھا۔ یہ میری بدقسمتی تھی۔ ایک غلطی تھی۔ میری یہ انتہائی کوشش بری طرح ناکام ہو گئی تھی کہ میں دوبارہ عامل عاروب اور اس کے کارپرداز کی نظروں میں نہ آؤں۔ میں ان کا ہدف بن چکا تھا اور ان کی نظروں میں آ چکا تھا۔ مجھ سے عجلت آمیزی میں بہت بڑی غلطی ہو گئی۔ نگینہ کو بھی شاید پا کر پھر کھو چکا تھا اور خود کو بھی اب جیسے کھونے لگا تھا۔ صورتِ حال نازک اور گمبھیر ہو گئی اور خطرناک

بھی۔ مگر ہمت ہارنا میں نے بھی نہیں سیکھا تھا۔

میں نے پریشان کن خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور لکیر پیٹنے کی بجائے آگے کے حالات پر غور کرنے لگا۔ یقیناً مجھے میرے مرغوب ہتھیار میگارد سے بھی محروم کر دیا گیا ہوگا۔

بہرطور میں نے اپنے ہاتھوں پیروں کے گرد بندھی رسّی پر زور آزمائی شروع کر دی لیکن نائیلون کی باریک اور مضبوط رسّی کیا ٹوٹنی تھی، الٹا میرے ہاتھ پاؤں چھل گئے۔ اس لاحاصل کوشش سے میں ہانپ کر رہ گیا۔ بے بسی، پچھتاوے اور جھنجلاہٹ کے مارے میرا دماغ الٹنے لگا اور کسی جال میں پھنسے وحشی درندے کے مانند میرے منہ سے غراہٹیں بھی برآمد ہوئیں۔

کافی دیر اس بے بسی کے عالم میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے گزر گئے۔ میں یونہی رسن بستہ گٹھری کی مانند ننگے فرش پر پڑا رہا۔ وقت گزرتا رہا۔ میں نے چیخنا چلاّنا شروع کر دیا۔ لیکن کوئی نہ آیا۔ میری آواز بیٹھ گئی۔ گلا دُکھنے لگا۔ ہونٹ خشک ہو گئے۔ ناچار میں نے اپنی تنی ہوئی گردن ڈھیلی چھوڑ دی اور ننگی اینٹوں والے فرش پر سر رکھ دیا۔

کسی نے سچ ہی کہا، نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ میری بھی آنکھ لگ گئی۔

اچانک کسی نے میرے منہ پر پانی پھینکا تو میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ میرے سامنے دو خدام کھڑے تھے۔ لانبے تڑنگے، تنومند۔ جن کے بائیں کانوں میں بڑے بڑے بالے جھول رہے تھے اور آنکھوں میں وحشیانہ چمک ہلکورے لے رہی تھی۔ ان کے ہاتھوں میں ماؤزر تھے۔ جبکہ ایک کے دوسرے ہاتھ میں پانی کی بالٹی تھی جسے میرے ہوش میں آنے کے بعد اس نے ایک کونے میں پھینک دیا۔ ذرا ہی دیر گزری تو دروازے پر مجھے دنیا کا منحوس و ملعون ترین شخص نظر آیا۔

لمبے سیاہ چغے میں ملبوس کبڑا شیطان، عامل عاروب میرے سامنے تھا۔ اس کی چندی چندی آنکھوں میں بلا کی خباثت تیر رہی تھی اور پتلے پتلے سیاہ رو بدہیئت ہونٹوں پر مکروہ اور اسرار بھری مسکراہٹ۔

”لگتا ہے تم ہی اس لڑکی کے وہ عاشق بے مراد ہو جسے وہ بھلا بیٹھی ہے۔“ وہ تخم خنزیر میری طرف چند قدم بڑھاتے ہوئے مکروہ لہجے میں بولا۔

میں اسے خوں ناک نظروں سے گھور کر دانت پیستے ہوئے بولا۔ ”ہاں......... شیطان کی اولاد! میں ہی وہ تیری موت ہوں جس کے خلاف تُو نے میرے دشمنوں کے کہنے پر اس معصوم لڑکی کی ذہنی رو پلٹ دی ہے۔“

”اوہ......... چچ، چچ......... تمہارے ساتھ میں نے بڑا ظلم کر دیا۔“ وہ جیسے میری بے بسی سے حظ اٹھاتے ہوئے پچکار کر بولا۔ پھر جیسے ایکا ایکی اس کی چھچھوندر جیسی آنکھوں میں معاندانہ چمک اُبھری اور اسی لہجے میں غرا کر بولا۔ ”مگر اب تمہیں اس لڑکی کو ہمیشہ کے لئے بھلانا پڑے گا۔“

یہ کہہ کر اس نے قریب کھڑے اپنے مسلح کارپردازوں سے تحکمانہ کہا۔ ”اسے اسی حالت میں لے جا کر کسی گہری کھائی میں پھینک دو۔“ یہ بے رحمانہ حکم صادر کر کے وہ واپس لوٹ گیا۔ میرے منہ سے اس کے لئے مغلظات کا طوفان اُمڈ پڑا۔

اس کے دونوں کارپردازوں نے مجھے بوری کی طرح اٹھا لیا اور زینے طے کرتے ہوئے نیچے پہنچے۔ پھر اس کے بعد مجھے ایک خچر گاڑی میں ڈال کر دور برف پوش پہاڑیوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں خچر گاڑی کے چوبی تختے پر بری طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔ مجھے اپنی موت صاف نظر آ رہی تھی۔ میں ایسی بے بسی کی موت نہیں مرنا چاہتا تھا۔ لیکن اب تن بہ تقدیر ہونے کے سوا چارہ ہی کیا تھا میرے پاس؟

اگر میرے ہاتھ پاؤں آزاد ہوتے تو اور بات تھی۔ بندشوں میں جکڑا میں ہاتھ ہلانے تک سے بھی ہر تھا۔ سفر......... گویا موت کا سفر جاری رہا۔

موسم کے تیور پھر بدلنے لگے تھے۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ انتہائی شمالی علاقہ ہونے کی ہ سے یہاں بارش اور پل کے پل برف باری میں کہاں دیر لگتی تھی۔ خچر گاڑی ایک دشوار گزار کھائی کے یب آ کر رک گئی۔

میرا دل کانپنے لگا۔ موت کے تصور سے نہیں، اس ہولناک تصور سے کہ میرے بعد نگینہ کا کیا بنے گا؟ یا وہ ساری عمر اس مردود و ملعون عامل عاروب کی باندی بن کر زندگی گزارے گی؟......... کیا وہ ھیروں میں گم ہو جائے گی؟......... ”نہیں نادر علی! نہیں......... تم نے آج تک دلیری اور بہادری ے ان کڑے اور نامساعد حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ کچھ کرو......... کچھ کرو۔ بہادروں کی زندگی ہروں کے لئے ہوتی ہے۔ نگینہ کو اس شیطان سے بچالو۔“ میرے ذہن نے اب تیزی سے بقا کی جنگ روع کر دی۔

خچر گاڑی ایک جگہ رک گئی۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ بوندا باندی سے میں شرابور ہو چکا تھا۔ ں نے اپنے دونوں پشت کی طرف بندھے ہوئے ہاتھوں کو تیزی سے جنبش دینا شروع کر دی۔ بارش ے پانی سے رسّی ذرا پھسلواں ہونا شروع ہو گئی تھی مگر ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ میں نے خچر گاڑی ے چوبی تختے پر لیٹے لیٹے زور آزمائی شروع کر دی مگر عبث۔ مجھے فوراً ان دونوں کارپردازوں نے کھینچ ر اٹھا لیا۔ نیچے گہری برف سے ڈھکی کھائی تھی۔ چشم زدن میں انہوں نے مجھے نیچے لڑھکا دیا......... بے تیار میرے حلق سے چیخ خارج ہو گئی۔ میں کسی گیند کی طرح برفیلی ڈھلان پر لڑھکتا چلا گیا۔ میرا ذہن ریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ پھر اچانک میرا سر کسی نوکیلی برفیلی چٹان سے ٹکرایا اور میں ہوش و خرد سے بیگانہ تا چلا گیا۔

ہوش آیا تو برف باری شروع ہو چکی تھی۔ میں جیسے برف کے گولے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ میں نے سر دو تین بار جھٹکے دیئے۔ چہرے سے برف جھٹکی اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ میں بہت گہرائی میں جا را تھا۔ شاید برف سے ڈھکی ہوئی کھائی کی وجہ سے مجھے کچھ زیادہ چوٹیں نہیں آئی تھیں۔ البتہ چہرے اور م کے دوسرے حصوں میں خراشیں ضرور پڑ گئی تھیں۔ میں نے زندگی بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کیا۔ مگر ا یہاں ادھ موئی حالت میں پڑا رہا۔ میرا جسم بری طرح دُکھنے لگا تھا۔ میں نے اطراف کا جائزہ لیا تو ل گیا۔ یہ کھائی کا کوئی مسطح قطعہ تھا۔ ایک بالکل کم رقبے والا گوشہ۔ ورنہ تو اب بھی دائیں بائیں اس سے دہ اور بھی کھائیاں تھیں۔ یعنی میں ابھی کم گہرائی میں گرا تھا اور یہ بھی خوش قسمتی کہ برفیلی کھائی کے وانی چھجے پر پڑا تھا۔ میں نے اپنی تگ و دو تیز کر دی۔ اچانک مجھے اپنی پشت پر ایک تیز چبھن کا اس ہوا۔ میں نے بہ مشکل اپنے رسن بستہ وجود کا زاویہ بدلا اور مڑ کر دیکھا تو ایک نوکیلا اور کند چٹانی ار تھا جسے دیکھ کر میرے ذہن میں فوراً ایک خیال اُبھرا۔ اگر میں دونوں ہاتھوں کی رسّی کو نوکیلے پتھریلے ار پر مسلسل رگڑتا تو میری یہ پیہم کوشش رنگ لا سکتی تھی۔ میں نے ذرا سرک کر پشت کو اس نوکیلے ابھار طرف کیا اور پھر ہاتھوں کی رسّی کو اس پر زور زور سے رگڑنے لگا۔ پہلے پہل تو مجھے یہ سہل کام محسوس تھا لیکن کچھ دیر بعد مجھے دانتوں پسینہ آ گیا۔ مگر میں نے بھی کوشش ترک نہ کی اور تھوڑے قے سے یہی عمل پیہم دہراتا رہا۔ حتیٰ کہ رسّی ادھیڑ ڈالی اور پھر میں نے دونوں رسن بستہ ہاتھوں کو اور زور ے جھٹکے دینا شروع کر دیئے۔ بالآخر رسّی ٹوٹ گئی۔ دونوں ہاتھ آزاد ہوتے ہی میں نے بے اختیار آسودہ

سی گہری سانس خارج کی۔ اپنی کلائیوں پر پڑے نیل کا جائزہ لیا اور پھر دونوں پیروں کی رسّی کھول ڈالی۔

اب میرا دوسرا مسئلہ کھائی سے باہر نکلنا تھا۔ میں نے برفیلی بلندیوں کی سمت سر اٹھا کر دیکھا، پھر اطراف کا ایک بار پھر اچھی طرح گہری نظروں سے جائزہ لیا تو مجھے ایک ڈھلوان پر درز سی نظر آئی۔ میں آگے بڑھ گیا۔ درز زیادہ چوڑی نہیں تھی اور قدرے عمودی تھی۔ یعنی اوپر سے نیچے آرہی تھی۔

چونکہ درز بہت تنگ تھی اور میرے لئے یہی سود مند تھا لہٰذا میں نے اس کی دونوں دیواروں پر ہاتھ پھنسائے دھیرے دھیرے اوپر کی طرف چڑھنا شروع کر دیا۔

بوندا باندی اگرچہ بند ہو گئی تھی لیکن برف باری اور بوندا باندی سے پھسلن سی ہو گئی تھی۔ مگر میں نے اپنی کوشش ترک نہ کی۔ تھوڑی ہی اونچائی پر پہنچا تھا کہ میری سانس بری طرح پھول گئی۔ میں نے چند ثانیے رک کر پھولی ہوئی سانسیں درست کیں اور پھر اوپر چڑھنا شروع کیا۔ کم و بیش مجھے اوپر تک آنے کے لئے ایک گھنٹے سے زائد کا عرصہ لگا تھا۔

کھائی سے زندہ سلامت باہر آنے کے بعد میں پتھریلی زمین پر بے سدھ ہو کر گر پڑا اور گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ جب حواس اور جسمانی تکان قدرے دور ہوئی تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہاں سے نکلا اور آبادی کی طرف بڑھ گیا۔

اب میں جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے سب سے پہلے اپنی مڑھی میں آیا۔ وہاں میرا نوجوان گائیڈ داور موجود نہ تھا۔ وہ شاید چلا گیا تھا۔ البتہ مڑھی کے مالک سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ مجھ سے کرایہ مانگنے لگا۔ شکر تھا کہ میں نے تھوڑے بہت پیسے اپنے مختصر سے سامان میں چھپا رکھے تھے۔ میں نے اسے تین دنوں کا پیشگی کرایہ ادا کر دیا۔ مجھے ریمبور (کالاش آگرم) میں آج کم و بیش چوتھا روز تھا۔ میں اپنے ہدف تک پہنچ تو گیا تھا اور اس بدبخت عامل عاروب سے بھی میرا ٹکراؤ ہو چکا تھا مگر کامیابی سے ابھی دور تھا۔

عامل عاروب نے نگینہ کو اب ایک طرح سے یرغمال بنا لیا تھا۔ بے شک وہ پہلے اس کے ٹرانس میں آ کر اس کی طرف از خود کھنچی چلی گئی تھی لیکن بعد میں جب میں نے اس کے کمرے میں نقب لگا کر دونوں کی باتیں سنی تھیں تو نگینہ اس کے ٹرانس سے نکل چکی تھی۔ لیکن عاروب کی باتوں سے اس کے مکروہ عزائم کا اندازہ بھی ہو چکا تھا۔ وہ رذیل اور تخم خنزیر شخص اب اس کے دل و دماغ کو ہمیشہ کے لئے گم گشتہ کر دینا چاہتا تھا اور اسے اپنی کنیز بنانے کی گھناؤنی سازش کر رہا تھا۔

یہ سب سوچ سوچ کر میرا دماغ جلنے لگا۔ دماغ کی شریانوں میں مجھے خون کا شدید دباؤ محسوس ہونے لگا۔ میں اسے حالات کی ستم ظریفی ہی کہوں گا کہ نگینہ کو میں بڑی مشکلوں اور بڑے کٹھن حالات میں یہاں تک لایا تھا کہ اس کیلاشی عامل عاروب کے ٹرانس سے اسے نجات دلاؤں گا۔ مگر یہاں پہنچ کر حالات اس کے برعکس ہو چکے تھے۔

میں نگینہ کے معاملے میں اب پولیس وغیرہ سے بھی مدد نہیں لے سکتا تھا کہ وہ خود میری تلاش میں تھی۔ کیونکہ میرے ازلی رقیب کبیر نے نگینہ کے اچانک غیاب پر اس کے باپ شاہ میر وغیرہ کو یہی بتایا ہو گا کہ نگینہ کو میں نے ہی اغواء کیا تھا۔ لیکن بہرحال اس نے انہیں یہ بتانے سے احتراز ہی برتا ہو گا کہ میں نگینہ کو درحقیقت کیلاش وادی میں لے جانا چاہتا تھا کیونکہ یہ بات صرف وہ اور اس کا یار غار کالا ناگ ہی جانتے تھے اس لئے ان دونوں نے اپنے گماشتوں کے ساتھ میرے تعاقب کی راہ اختیار کی تھی جس کی ایک مثال پشاور کے ہوٹل میں سامنے آ چکی تھی۔

گویا اب کسی وقت بھی میرا ان سے ٹکراؤ ہونے والا تھا۔ ابھی میں اس ادھیڑ بن میں تھا کہ اچانک ہی مڑھی میں داور خان داخل ہوا۔ میں اسے دیکھ کر ذرا چونک سا گیا۔

"ارے داور!.........تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا کر پوچھا تو وہ اُدھر دیکھنے کے بعد بولا۔

"صیب جی! آپ کے ساتھ وہ لڑکی تھی۔ کہاں چلی گئی وہ؟" اس کے نگینہ کے بارے میں استفسار کو فطری تجسس سمجھا تھا لہٰذا میں نے دروغ گوئی سے کام لیا اور کہا۔

"وہ بھی ادھر ہی ہے۔ تم بتاؤ.........کیسے آنا ہوا؟"

اس کے چہرے پر کچھ عجیب سے تاثرات اُبھرے۔ پھر وہ بولا۔

"صیب! مجھے کچھ لوگ ڈھونڈ رہے ہیں۔"

"تمہیں؟.........مگر کیوں؟" میں نے قدرے چونک کر پوچھا۔

"صیب! کسی نے انہیں بتایا کہ پشاور سے آنے والے ایک مرد اور عورت کے لئے گائیڈ کی خدمات نے پیش کی ہیں۔ پھر وہ مجھے تلاش کرتے ہوئے یہاں آن پہنچے۔ میں واپس چترال نہیں گیا تھا، ادھر نے دور پار کے عزیزوں کے ہاں مقیم تھا۔ پھر وہ لوگ مجھے تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آن پہنچے۔ مگر ب! درحقیقت وہ آپ کو ڈھونڈ رہے تھے۔" اس نے آخر میں جیسے ایک دھماکا کیا اور میں اس کی بات پر طرح ٹھٹکا۔ تب پھر اچانک مڑھی کا ٹاٹ ہٹا کر یکدم دو افراد اندر داخل ہو گئے......... میں انہیں کر جیسے سکتے میں آ گیا۔

وہ دونوں میرے ازلی اور خون کے پیاسے دشمن کبیر اور کالا ناگ تھے۔ مگر دونوں غیر مسلح تھے اور ی طرف خونخوار نظروں سے گھور رہے تھے۔ وہ بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر مجھ سے آ ٹکرائے ے جبکہ وہ چترالی لڑکا داور خان گھبرا کر وہاں سے کھسک چکا تھا۔

"کوئی غلط حرکت مت کرنا نادر!" کالا ناگ نے درشت لہجے میں مجھے متنبہ کرتے ہوئے کہا۔

"نگینہ کہاں ہے؟" اس بار کبیر نے کرخت لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

میں نے فوراً خود کو سنبھالا اور پھر ایک گہری سانس خارج کر کے خوف زدہ ہوئے بغیر دانت پیس کر لا۔ "وہ تمہارا کیا بھگت رہی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اسے ساری بات بتا دی جسے سن کر چند لمحوں کے لئے اس کے چہرے پر بھی گہری تشویش آمیز اُلجھن کے تاثرات عیاں ہونے لگے۔

"تمہیں اسے یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی؟.........وہ بھی زبردستی۔ جواب دو؟" معاً کبیر نے غیض لہجے میں کہا۔

میں بھی اس سے مرعوب ہوئے بغیر درشت لہجے میں بولا۔ "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ مجھے نگینہ کو ہاں کیوں لانا پڑا۔ البتہ اب یہ فضول سوال بار بار مجھ سے مت پوچھنا۔" میری بے خوفی نے کبیر کے اتھ کھڑے میرے ماموں حیدر گل کے قاتل کالا ناگ کو بری طرح تلملا کر رکھ دیا اور وہ باؤلے کتے کی رح خونخوار لہجے میں بولا۔

"زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں، سمجھے تم۔ اور تم نے جو بکواس کی ہے، ہمیں اس پر ل بھروسہ نہیں ہے۔"

میں نے اسے لہو رنگ نظروں سے گھورا اور پھر اسی لہجے میں بولا۔ "کالا ناگ! میں تجھ جیسے رذیل لوگوں کے معاملے میں کبھی خوش فہمی کا شکار نہیں رہتا۔ جو سیدھی اور دوٹوک بات تھی، وہ میں نے بتا دی۔"

تم لوگوں میں اگر ہمت ہے تو جا کر اس خنزیر صفت عامل عاروب سے مل لو۔ آخر کو وہ تم دونوں کا دوست ہے۔ ہوسکتا ہے وہ نگینہ کو تمہارے حوالے کر دے۔''

''زبان سنبھال کر بات کر نادر!......... میں چاہوں تو اسی وقت تیرا قصہ نمٹا سکتا ہوں۔'' میری جوابی کارروائی نے اسے مزید مشتعل کر دیا تھا۔

''خاطر جمع رکھو۔ ابھی تو تم نے میرا قرض چکانا ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو کبیر یکدم جھنجلا کر کالا ناگ سے بولا۔

''یار! بس اب تم اپنی بحث چھوڑو۔ مجھے تو نگینہ کی فکر ہو رہی ہے۔ نادر جھوٹ نہیں کہہ رہا۔ ورنہ نگینہ اس وقت یہاں ہوتی۔''

''ٹھیک ہے پھر۔ میں اس کا ابھی خاتمہ کئے دیتا ہوں۔'' کالا ناگ نے نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر کہا اور پھر پھرتی کے ساتھ اپنی جیب سے پستول نکال لیا۔ کبیر نے فوراً اس کے ہاتھ سے پستول جھپٹ لیا۔

''یہ کیا بے وقوفی کر رہے ہو؟......... اب ہم تینوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ تم نے نادر کی بات نہیں سنی؟ وہ حرام زادہ عامل عاروب نگینہ کو اپنے ٹرانس میں لے کر زبردستی اپنی باندی بنانا چاہتا ہے۔''

''یہ جھوٹ بول رہا ہے کبیر!'' کالا ناگ نے غرا کر کہا۔ ''مجھے اس کا قصہ نمٹانے دو۔ یہ میرے بھائی کا قاتل ہے۔ مجھے دو پستول۔''

''خود پر قابو رکھو کالا ناگ! یہ وقت آپس کے قضئے نمٹانے کا نہیں ہے۔'' کبیر نے اسے ذرا تیز لہجے میں سرزنش کی۔ ''نادر علی نگینہ کے معاملے میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔'' یہ کہہ کر وہ گہری متانت کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''نادر! اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو یہ نگینہ کے ساتھ یقیناً اچھا نہیں ہوا ہے۔ اگر اس بدبخت عامل عاروب نے نگینہ کا مکمل برین واش کر ڈالا تو یہ ہم سب کے لئے بہت برا ثابت ہوگا۔ اور خود نگینہ کے لئے بھی۔''

''میں نگینہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کبیر! کہ میں نے جو کہا، سچ کہا ہے۔'' کبیر کا رویہ چاہے مصلحتاً ہی سہی، بدلتا دیکھ کر میں نے معقول مگر مستحکم لہجے میں کہا تو کبیر کے چہرے کی تشویش مزید گہری ہوگئی۔ میں نے مزید کہا۔ ''کبیر! عاروب پر ہمیں بہت سوچ سمجھ کر ہاتھ ڈالنا ہوگا۔ یہاں اس کے پیروکاروں کی کمی نہیں۔ علاوہ ازیں اس نے اپنے مسلح غنڈے بھی پال رکھے ہیں۔ ہمیں نگینہ کی خاطر ہی سہی، آپس کا جھگڑا فراموش کر کے اسے عاروب کے شیطانی پنجے سے بچانا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔ پھر یہ اہم کام ہمیں مل جل کر کرنا ہوگا۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' کالا ناگ نے فوراً درشت لہجے میں کہا جو پہلے ہی کبیر کے میرے ساتھ مصلحت آمیز رویے پر اندر ہی اندر تلملا رہا تھا۔ ''یہ میرا جانی دشمن ہے۔ دھوکے سے ہمیں ہلاک بھی کر سکتا ہے۔''

''ہمیں ایک معاہدہ کرنا ہوگا۔'' کبیر نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

''کیسا معاہدہ؟'' کالا ناگ بولا تو کبیر اس سے مخاطب ہونے کی بجائے مجھ سے بولا۔

''نادر! میں سمجھتا ہوں کہ اب ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ ہم مل کر نگینہ کو اس عامل عاروب کی قید سے چھڑاتے ہیں تو تمہیں نگینہ کی آزادی اور سلامتی تک یہ لڑائی بھولنی ہوگی۔ کیا تمہیں یہ معاہدہ قبول ہے؟''

میں نے ایک نظر کالا ناگ کی طرف دیکھا پھر کبیر سے بولا۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن تم اپنے

اس پلے کو یہ سمجھا دو۔ اگر اس نے مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو میں معاہدہ فراموش کر ڈالوں گا۔''

''اس کی تم فکر نہ کرو۔'' کبیر نے جلدی سے کہا۔ ''یہ میرے حکم سے انحراف نہیں کر سکتا۔ تم اپنی بات کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم ہم دونوں کو ہی دھوکا دینے کی کوشش کرو۔''

''میری طرف سے تم بے فکر رہو۔ میں خود یہی چاہتا ہوں کہ ہمیں مل کر نگینہ سے متعلق یہ نازک معاملہ حل کرنا چاہئے۔'' میں نے کہا تو کبیر کالا ناگ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''کالا ناگ! تم نے سن لیا......... اب ہم کام کی بات کریں؟''

''ٹھیک ہے .... تمہیں منظور ہے تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں۔ چاہے عارضی طور پر ہی سہی، مجھے اسے برداشت کرنا پڑے گا۔'' وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ لیکن مجھے اس کے لہجے سے منافقت اور جھوٹ کی بُو صاف محسوس ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں بھی وحشیانہ تناؤ اور بغض کی چمک صاف عیاں تھی۔ میں بھی اس سے غافل ہو کر نہیں رہنا چاہتا تھا۔

''چلو .... اب آرام سے کہیں بیٹھ کر کوئی لائحہ عمل طے کرتے ہیں۔'' کبیر نے کہا تو میں بولا۔

''میں عاروب کے غنڈوں کی نظروں میں آ چکا ہوں۔ پھر وہ تم دونوں کو بھی اچھی طرح پہچانتا ہے۔ وہ ہمارے خلاف کوئی خطرناک قدم اٹھا سکتا ہے۔ اس لئے ہمیں ادھر ہی بیٹھ کر کوئی منصوبہ بندی کرنا ہوگی۔''

''چلو ٹھیک ہے .... بیٹھو!'' وہ رضامند ہوتے ہوئے بولا۔ پھر فرش پر بچھی دری پر پالتھی مار کر بیٹھ گیا۔ کالا ناگ بھی ناک بھوں چڑھاتے وہیں براجمان ہو گیا۔ میں بھی ان کے سامنے دری پر بیٹھا تو اچانک ایک لڑکا ہاتھوں میں ایک چھوٹی سی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوا۔ ٹرے پر تین چھوٹی چھوٹی گرما گرم قہوے کی دھواں اُگلتی پیالیاں دھری تھیں۔

یہ مڑھی کے مالک کا بیٹا تھا اور یہ مہمان نوازی اسی نے کی تھی۔ بہرطور میں نے شکریہ کہہ کر لڑکے سے ٹرے لے لی اور وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔ ہم قہوے کی پیالی تھامے ہلکی ہلکی چسکی لینے لگے۔

یہ صورت حال جتنی عجیب تھی، اتنی ہی دلچسپ بھی۔ ہم تینوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے مگر ایک مشترکہ مفاد نے ہمیں ایک دوسرے کے قریب کر دیا تھا۔ تاہم مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ میں ایک حد تک ہی ان کے ساتھ تھا۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی جانتا تھا کہ کبیر اور کالا ناگ نگینہ کو قبضے میں کرتے ہی میرا کام تمام کرنے میں لمحہ بھر کی تاخیر نہیں کریں گے۔

یہ سب سوچتے ہوئے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ ایک عجیب سی مسکراہٹ!



ہم ایک دوسرے سے محتاط تھے۔ میرا ان سے مصالحت کرنے کا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا کہ مجھے نگینہ کے سلسلے میں کبیر یا کالا ناگ کی مدد درکار تھی، تاہم یہ بھی درست تھا کہ میں نے محض نگینہ کی بھلائی کی خاطر ان وحشیوں سے مصالحت کی تھی۔ البتہ حقیقت یہ بھی تھی کہ نگینہ اس وقت واقعتاً نہایت خطرناک صورتِ حال سے دوچار تھی اور میں اپنی تمام تر توجہ اسے صرف اور صرف اس کبڑے عامل عاروب کے شیطانی چنگل سے چھڑانے پر ہی مرکوز کرنا چاہتا تھا۔ کبیر اور کالا ناگ سے ٹکراؤ کی صورت میں میری توجہ بٹ جاتی جس کا فائدہ یقیناً شیطان عاروب کو ہوتا۔ اس میں ہم دونوں کا ہی نقصان تھا۔

جہاں تک ہمارے مشترکہ مفاد کا تعلق تھا تو وہ صرف میرے اور کبیر کے درمیان تھا۔ کالا ناگ اس سے مستثنیٰ تھا۔ اس کا صرف ایک ہی مقصد تھا، مجھ سے انتقام۔ اور یہی سبب تھا کہ اسے میری اور کبیر کی یہ "وقتی مصالحت" ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ میں جانتا تھا کہ کالا ناگ کبیر اور اس کے باپ نظر حیات کا ایک زرخرید کتا بن چکا تھا اور وہ یہ "کڑوا گھونٹ" پینے پر مجبور تھا۔ لیکن اس میں ایک پیچیدگی بھی تھی۔ یہ تو طے ہو چکا تھا کہ نگینہ کو اپنی عبادت گاہ میں دیکھنے کے بعد اس کبڑے عامل عاروب کی نیت اچانک بدل گئی۔ وہ اب اس کا مکمل برین واش کر کے سب کی طرف سے بالکل کورا کر دینا چاہتا تھا جبکہ میں چاہتا تھا کہ نگینہ اس کے ساتھ اس کے عمل سے بھی چھٹکارا حاصل کر کے ٹرانس سے آؤٹ ہو جائے۔ جبکہ یہ بات کبیر کے مفاد میں ہرگز نہیں تھی۔ وہ کبھی نہیں چاہتا تھا کہ نگینہ پر کیا گیا عمل ختم ہو اور وہ میری طرف ملتفت ہو جائے۔ تاہم نگینہ کا کلی برین واش اس کے لئے بھی نقصان دہ تھا۔ میں یہی سب کچھ سوچ کر الجھنے کے باوجود قسمت کی ستم ظریفی پر مسکرا رہا تھا کہ کس طرح ہم دو جانی دشمن ایک مفاد کی خاطر ایک دوسرے کے دوست بن گئے تھے۔

"کیا سوچنے لگے؟" کبیر کی آواز نے مجھے خیالات کے بھنور سے واپس کھینچ لیا۔ وہ دونوں اپنی قہوے کی پیالیاں ختم کر چکے تھے جبکہ میری پیالی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے ایک ہی گھونٹ میں وہ خوش ذائقہ اور تروتازہ کر دینے والا نفیس قہوہ ختم کرنے کے بعد پیالی سامنے دری پر رکھ دی، پھر کبیر سے بولا۔

"میرے ذہن میں ایک لائحہ عمل آ رہا ہے۔" کبیر غور سے میری بات سننے لگا۔ جبکہ کالا ناگ کے انداز و اطوار سے بیزاری اور بے اعتنائی جھلک رہی تھی۔

"ہمارا مقصد صرف نگینہ کو ہی عامل عاروب کے چنگل سے چھڑانا نہیں ہے۔ بلکہ ہمیں عامل عاروب کو یرغمال بھی بنانا ہوگا۔ کیونکہ نگینہ یقیناً اب تک اس کے کلی ٹرانس میں آ چکی ہوگی اور اس کے اس ٹیلی پیتھک عمل کو صرف عاروب ہی ختم کر سکتا ہے۔"

"لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ خبیث ہمیں بھی اپنے شیطانی ٹرانس میں لے لے۔" کبیر نے اپنی دانست میں زوردار نکتہ نکالا تھا مگر میرے پاس اس کا جواب موجود تھا۔

"وہ ہمارے قابو میں ہوگا۔ لہٰذا اس بات کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اور ویسے بھی مجھے تجربہ ہو چکا ہے۔ پہلی بار جب میرا، اس کا سامنا ہوا تھا تو اس نے مجھے بھی ٹرانس میں لانے کی کوشش کی تھی مگر میں نے فوراً اس کے

چہرے سے اپنی نظریں ہٹالی تھیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے، اس کا ٹیلی پیتھی یا ٹرانس میں لانے کا عمل قوتِ ارادی سے کمزور بنایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اگر اس نے ہمارے ساتھ اس قسم کی کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تو ہم اسے باآسانی ناکام بنا دیں گے۔"

"لیکن یہ بھی تو سوچو کہ ہم اسے نگینہ کے بارے میں کیسے مجبور کریں گے؟.........وہ اگر اس پر اپنا عمل کرنے پر رضامند نہ ہوا تو پھر؟" کبیر نے پُرتفکر لہجے میں کہا۔

"اس کے لئے ہمیں اس پر جبر کرنا ہوگا۔ ویسے بھی وہ ہمارے قبضے میں ہوگا اور اسے بتا دیا جائے گا کہ ہم سے اس کی جان صرف اسی صورت میں چھوٹ سکے گی اگر وہ نگینہ کی یادداشت بحال کر دے ورنہ.........!" میں نے اس کے خدشے کا جواب دیا۔

"ٹھیک ہے.........سب سے پہلے نگینہ کو اس عامل عاروب سمیت اپنے قبضے میں لینا ہوگا۔ اس کے بعد........." کبیر نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک کالا ناگ نے درمیان میں مداخلت کی۔ وہ اب تک خاموشی سے ہماری گفتگو سنتا رہا تھا۔

"تم لوگ نہ جانے کن چکروں میں ہو۔ میرے پاس اس مسئلے کا آسان حل موجود ہے۔"

اس کی مداخلت پر ہم دونوں نے چونک کر اسے دیکھا اور اس کا جملہ ختم ہوتے ہی کبیر نے بے ساختہ پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

"عاروب کو گولی سے اُڑا دیا جائے۔ سارا قصہ خود ہی نمٹ جائے گا۔" ہم دونوں اس کی بات پر مزید چونک اٹھے۔ یہ ایسی بات تھی جس کا کبیر تو کیا، خود مجھے بھی خیال نہ آیا تھا۔

"کیا ایسا ممکن ہو سکتا ہے؟" کبیر نے مجھ سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں پُرجوش ارتعاش تھا۔

"یقیناً ایسا ہی ہونا چاہئے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اگر خدانخواستہ معاملہ اس کے برعکس ہو گیا تو ہم ساری عمر کے لئے نگینہ کو کھو دیں گے۔"

"نہیں.........پھر ہمیں یہ رسک نہیں لینا چاہئے۔" کبیر نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"ہرگز نہیں۔" میں نے سر ہلا کر اس کی تائید کی۔ "ہم نگینہ کے معاملے میں کسی قسم کا رسک نہیں لے سکتے۔" درحقیقت خود مجھے بھی عاروب کے اس پراسرار عمل کی نوعیت کا ٹھیک طرح سے علم نہ تھا۔ کیا خبر اس کے مرنے کے بعد نگینہ ساری عمر کے لئے ہم سے بیگانہ ہو جاتی۔ آخر کسی حادثاتی واقعے میں بھی تو انسان اپنی یادداشت گنوا دیتا ہے اور کسی کو نہیں پہچان پاتا۔ عین ممکن تھا کہ نگینہ کے لئے عاروب کا وہ عمل سائنسی نوعیت کا کوئی ایسا ہی حادثہ بن جاتا۔ چنانچہ ہم دونوں نے ہی کالا ناگ کے خیال کو رد کر دیا۔

"یہ کام ہمیں نہایت ہوشیاری سے کرنا ہوگا۔ ورنہ اس کے بدمعاش حواری اور پیروکار ہماری جانوں کے دشمن بن جائیں گے۔" میں نے کہا تو کبیر تفہیمی انداز میں اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے بولا۔

"تو پھر یہ کام ہمیں رات کی تاریکی میں ہی انجام دینا ہوگا۔"

"یہ مناسب رہے گا۔" میں نے تائید کی۔

ان لوگوں کے ساتھ چار مسلح ساتھی بھی تھے جو یقیناً کالا ناگ کے گروہ کے ارکان ہوں گے۔ میرا دل جانے کیوں کالا ناگ کی طرف سے عجیب سی بے چینی کا شکار تھا۔ اس کے گم صم سے انداز سے عیاں تھا کہ وہ میرے خلاف کوئی گل کھلانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ میری سوچ غلط ہوتی مگر موجودہ صورتِ حال میں میرا اس طرح سوچنا فطری تھا۔ اگرچہ حقیقت یہی نہیں تھی کہ مجھے نہ صرف کالا ناگ بلکہ کبیر دونوں سے ہی محتاط اور چوکنا رہنے کی ضرورت تھی۔ کالا ناگ کی طرح کبیر بھی میرا ہرگز خیر خواہ نہیں تھا۔ میں

اس کے باپ کا جانی دشمن تھا اور وہ میرا مسلمہ رقیب تھا۔

رات ہونے میں ابھی کئی گھنٹے باقی تھے۔ سارے معاملات طے ہو چکے تھے اور اب ہمیں کارروائی کے وقت کا انتظار تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ کالا ناگ کافی دیر سے خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے سے صاف عیاں تھا کہ وہ کسی زبردست ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اس کی یہ کیفیت کبیر کی نظروں سے بھی چھپی نہ رہ سکی۔ تاہم ہم دونوں نے اسے مخاطب کئے بغیر پیش آمدہ مہم پر اپنی گفتگو جاری رکھی۔ ہم نے بمشکل ایک گھنٹہ گزارا ہوگا کہ اچانک کالا ناگ اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم دونوں چونکے۔ میں نے دیکھا، اس کے چہرے پر اسرار بھرے سناٹے اترے ہوئے تھے۔ وہ میری جانب ہی سنسناتی نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ خاصی دیر کی اپنی اندرونی کشمکش کے بعد اچانک ہی کسی نتیجے پر پہنچ گیا ہو۔ یہ محسوس کرتے ہی میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ کبیر نے بے اختیار اس سے پوچھا۔

''کیا ہوا؟''

''کبیر! میں تم لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔'' معاً کالا ناگ نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ .... یہ اچانک بیٹھے بٹھائے تمہیں کیا ہوگیا؟'' کبیر کے لہجے میں پریشانی اور حیرت تھی۔ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ میں بھی انجانا خطرہ محسوس کر کے کھڑا ہوگیا تھا۔

''بس مجھے اس مہم میں دشمن کا ساتھ پسند نہیں۔'' وہ سپاٹ لہجے میں کبیر سے بولا اور میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ ''کبیر! میں تمہیں بھی یہی مشورہ دوں گا، نادر علی سے الگ ہو جاؤ۔ ہم خود ہی یہ مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ .... اس وقت ہم آپس کے جھگڑوں میں پڑ کر اپنا ہی نقصان کر بیٹھیں گے اور یہ حقیقت نادر بھی اچھی طرح جانتا ہے۔'' کبیر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''تم مجھے پہلے ایک بات کا جواب دو کبیر!'' کالا ناگ جس بات پر کافی دیر سے اندرونی کشمکش میں مبتلا تھا، بالآخر اس کا اظہار کرتے ہوئے کبیر سے بولا۔ ''بالفرض ہم نگینہ کو عامل عاروب کے چنگل سے چھڑا لیتے ہیں تو یہ فیصلہ کون کرے گا کہ نگینہ کس کی ملکیت ہوگی؟ .... تمہاری یا نادر کی؟''

اس کی بات پر کبیر کچھ سوچنے پر مجبور ہوگیا۔ میری سوچ کے مطابق کالا ناگ واقعی کالا ناگ تھا۔ زہر کو زہر ہی جانتا تھا۔ وہ میرا جانی دشمن تھا اور وہ مجھ سے نباہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ کبیر کی بات دوسری تھی۔ دشمن وہ بھی تھا لیکن چونکہ ہمارے بیچ نگینہ بھی تھی اس لئے وہ مجھ سے مفاہمت کرنے پر مجبور ہوا تھا۔

کبیر کو سوچ میں ڈوبا دیکھ کر کالا ناگ نے گویا گرم لوہے پر ایک اور چوٹ لگائی۔

''کبیر! نادر علی ہمارے ساتھ بہت بڑی چال چل رہا ہے۔ ہمارے کاندھوں پر بندوق رکھ کر اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تم خود سوچو، عاروب کے عمل سے نجات پاتے ہی نگینہ اس کی طرف ملتفت ہو جائے گی۔ تمہارے ساتھ ہرگز جانا نہیں چاہے گی۔''

اس کی بات پر میں نے بھی لب کشائی کرنا ضروری سمجھا۔

''مجھے کسی کی مدد کی پرواہ ہے نہ ضرورت۔ رہی بات نگینہ کے میری طرف ملتفت ہونے کی تو اب تک وہ اس خبیث عامل عاروب کے ٹرانس میں آ کر ہم سب کو ہی فراموش کر چکی ہوگی۔''

میری بات پر کالا ناگ کے بدہیئت سیاہ ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ کھنچ گئی اور وہ براہِ راست مجھ سے مخاطب ہو کر زہرخند سے بولا۔

''نادر علی! تم بات کو گھما پھرا کر اُلجھانے کی کوشش نہ کرو۔ یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ ہمارا

مقصد صرف نگینہ کو عاروب کے چنگل سے چھڑانا نہیں ہے بلکہ اس کے ٹرانس سے اسے ذہنی طور پر آزاد بھی کرنا ہے۔ چلو، ہم کسی طرح عاروب کو گن پوائنٹ پر مجبور کر کے یہ کام کرا لیں گے۔ لیکن پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟ ظاہر ہے، نگینہ عاروب کے ٹرانس سے نکلنے کے بعد خود بخود تمہاری طرف ملتفت ہو جائے گی۔'' پھر وہ کبیر کی طرف مڑا۔ ''اب تم خود ہی سوچو کبیر! کہ سارے کھٹ راگ میں کس کا فائدہ ہوا؟ تمہارا یا نادر علی کا؟''

کالا ناگ کو آج تک میں نے صرف دھواں دھار گولیاں برسانے والا، سفاک دشمن ہی جانا تھا۔ مگر آج مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ حد درجہ زود فہم اور مکار انسان تھا۔ اس نے دور اندیشی سے کام لے کر موجودہ صورتِ حال کا انتہائی باریک بینی سے تجزیہ کیا تھا۔ کبیر اُلجھ کر رہ گیا تھا، تاہم وہ بولا۔

''ہم عاروب کو مجبور کریں گے کہ وہ اسی حالت میں نگینہ کو ہمارے ساتھ کر دے۔''

''اب تم میری بات سمجھے ہو۔'' کالا ناگ نے پُرجوش مکاری سے کہا۔ ''یہ یقیناً نادر علی کے مفاد میں نہ ہوگا اور عین وقت پر یہ کوئی اڑچن پیدا کر دے گا۔ تو کیوں نہ ہم اسے ادھر ہی جہنم واصل کر کے خود ہی یہ مہم سر کر لیں؟'' اس کی سفاکانہ دلیل پر میری رگوں میں خون کی گردش یکدم تیز ہوگئی۔ صورتِ حال کی اچانک تبدیلی نے مجھے یکلخت محتاط کر دیا تھا۔ اس کے ارادے کو بھانپتے ہی میں نے اپنا وفادار میگارد باہر نکال لیا۔ کالا ناگ اور اس کے چاروں ساتھیوں نے اپنی گنیں مجھ پر تان لیں۔ میری کنپٹیوں میں بری طرح سائیں سائیں ہونے لگی۔ مڑھی کی محدود فضا یکدم ہی کشیدہ ہوگئی تھی۔

''کالا ناگ! .... رک جاؤ۔ یہ کیا بے وقوفی کر رہے ہو؟ .... ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔'' کبیر نے اسے روکتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ ''خود کو سنبھالو کالا ناگ! ہم اس وقت بہت ہی حساس مقام پر موجود ہیں۔ اس طرح سب کی نظروں میں آ جائیں گے۔''

''تو پھر اس سے حساب کس طرح بے باق کیا جائے؟'' کالا ناگ نے بدستور پُرغیظ نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے کبیر سے کہا۔

''کر لیں گے اس سے حساب اپنا بے باق۔ یہ ابھی ادھر ہی ہے۔ مجھے کچھ سوچنے کا موقع دو۔'' کبیر نے بالآخر جھلا کر کہا۔ چند لمحے تک کچھ سوچنے کے بعد وہ ایک لمبی ہمکاری کرتے ہوئے کالا ناگ سے بولا۔ ''تمہاری اگر یہی مرضی ہے تو ٹھیک ہے۔ ہم نادر کو اپنے ساتھ اس مہم میں شامل نہیں کریں گے۔ یہ اپنی کوشش کرے گا اور ہم اپنی۔'' یہ کہنے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''نادر! ہمارے درمیان طے پانے والا معاہدہ اسی لمحے منسوخ سمجھو۔ لیکن اتنا ضرور یاد رکھنا کہ اس مہم کے دوران اگر ہمارا ٹکراؤ ہوا، جو لازماً ہوگا تو تمہاری زندگی کی ضمانت ختم ہو جائے گی۔''

''ٹھیک ہے .... پھر میں بھی تم لوگوں سے کوئی رعایت نہیں برتوں گا۔'' میں نے بھی سرد لہجے میں کہا۔ کالا ناگ کی آنکھوں میں خونخوار چمک مزید گہری ہوگئی۔

اس کے بعد وہ دونوں اپنے چاروں ساتھیوں کے ساتھ مڑھی سے نکل گئے۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد میں بھی مڑھی سے باہر نکل آیا اور انہیں وہاں سے جاتا ہوا دیکھنے لگا۔ وادی میں شام کی کجلاہٹ دھیرے دھیرے اُترنے لگی تھی۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو میں واپس مڑھی کے اندر آ گیا۔

بدبخت کالا ناگ کے اچانک رائے بدلنے سے سارا کھیل بگڑ گیا تھا جس سے صورتِ احوال مخدوش بلکہ مزید گمبھیر ہو گئی تھی۔ میں نے کبیر سے یہ عارضی مفاہمت صرف نگینہ کے لئے مجبور ہو کر کی تھی اور کبیر کو بھی ایسا ہی کرنا چاہئے تھا۔ لیکن وہ کالا ناگ کی باتوں میں آ گیا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ دو مخالف گروپوں کی صورت میں ہمارا عامل عاروب سے ٹکرانا خود نگینہ کے لئے ازحد خطرناک ہو سکتا تھا۔ یہ بہت خطرناک

صورتِ حال تھی اور مجھے اس پر قابو پاتے ہی نگینہ کے لئے کچھ کرنا تھا اوران مردودوں کا بھی سامنا کرنا تھا۔ گویا میرے لئے یک نہ شد دو شد والی بات تھی۔ میں خاصی دیر تک اسی پریشانی میں بیٹھا رہا۔ پھر ارادہ کر کے اٹھا اور عامل عاروب کی عبادت گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

مذکورہ عبادت گاہ آبادی کے جنوبی مضافات میں تھی۔ یہ علاقہ خاصا ویران اور سنسان تھا۔ میں اپنی دُھن میں مگن جا رہا تھا کہ اچانک مجھے اپنے تعاقب کا احساس ہوا۔ چند مقامی لوگوں کے درمیان مجھے دو ایسے افراد کی جھلک اس وقت نظر آئی تھی جب میں نے یونہی غیر ارادی طور پر اپنے عقب میں مڑ کر دیکھا۔ میں نے بھی بروقت حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بظاہر یونہی اِدھر اُدھر سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد سیدھا چلنا شروع کر دیا تھا۔ ان دونوں کو میں بہرحال پہچان چکا تھا۔ وہ دونوں کالا ناگ کے ان چار ساتھیوں میں سے تھے۔

میرے ذہن میں فوراً ہی ایک منصوبے نے سر اُبھارا۔ میں بظاہر بے پرواہانہ انداز میں اپنی ہی دُھن میں مگن تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتا رہا۔ آبادی سے قدرے دور نکل آنے کے بعد میں اپنے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے اچانک ہی ایک طرف مڑا اور فوراً ہی چٹان کی آڑ لیتے ہوئے گھات لگا کر دم سادھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ دونوں اس وقت میرے تعاقب میں آ رہے ہوں گے۔ یہ طے تھا کہ ان دونوں کو میرے پیچھے لگا کر کالا ناگ خود کبیر اور ان دونوں ساتھیوں کے ہمراہ آگے بڑھ گیا ہوگا۔ کچھ دیر بعد میں نے تھوڑا سا سر اُبھارا تو چونک گیا۔ وہاں کوئی ذی نفس نہ تھا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ وہ دونوں میرے پیچھے آتے آتے کدھر نکل گئے تھے؟......... میں اسی اُلجھن میں تھا کہ مجھے اپنے عقب میں آہٹ سنائی دی۔ میں بجلی کی سی تیزی سے پلٹا اور مجھے ان کی جھلک دکھائی دی۔ وہ دونوں مجھ پر بیک وقت پل پڑے تھے اور مجھے زمین پر رگید ڈالا۔ میں نے خود کو ان کی گرفت سے ایک جھٹکے سے آزاد کیا اور ایک حملہ آور کی ٹھوڑی پر بھرپور مُکا رسید کر دیا۔ وہ گھٹی گھٹی کراہ کے ساتھ اُلٹ گیا۔

دوسرے نے اپنی جیب سے پستول نکالنا چاہا مگر اس کے پیٹ پر پڑنے والی میری لات نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔ وہ ڈکراتا ہوا چٹان سے ٹکرایا اور وہیں بیٹھ گیا۔ اس اثناء میں پہلا والا اپنی جیب سے پستول نکالنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے بلا توقف مجھ پر گولی چلا دی مگر میں اس سے پہلے جھکائی دے چکا تھا۔ عین اسی وقت دوسرے ساتھی نے ایک بے وقوفانہ حرکت کر ڈالی۔ وہ یقیناً پیٹ پر لگنے والی ضرب کے نتیجے میں بری طرح بوکھلا چکا تھا اس لئے وہ ذرا سا سنبھالا لے کر بری طرح مجھ پر جھپٹ پڑا۔ میں تو گویا اس کے لئے تیار تھا۔ میں نے پھرتی سے اسے دبوچا اور دھکیلتا ہوا دوسرے ساتھی سے ٹکرا گیا۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں ہم تینوں ہی گر پڑے۔ میں نے گرتے گرتے بھی پہلے والے کے ہاتھ سے پستول جھپٹ لیا۔ یہ سب کچھ آناً فاناً ہو گیا۔ میں نے زمین پر گرتے ہی لوٹ لگائی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''خبردار!......... کوئی حرکت مت کرنا۔ ورنہ گولی سے اُڑا دوں گا۔'' میں نے کرخت آواز میں کہا۔ وہ دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور کینہ توز نظروں سے مجھے گھورنے لگے۔

''تم دونوں اپنے ہاتھ بلند کر لو۔ جلدی .... میرے پاس وقت کم ہے۔'' میں نے درشت لہجے میں تحکمانہ انداز میں کہا تو دونوں نے اپنے ہاتھ سر سے بلند کر لئے۔ میں نے انہیں دوسری طرف منہ پھیرنے کو کہا۔ اس کے بعد دونوں کی جیبوں کی تلاشی لی تو مزید ایک ایک خنجر اور کچھ فاضل راؤنڈ برآمد ہوئے۔ میں نے یہ ساری چیزیں قبضے میں لے کر ان دونوں کی ایک ایک ٹانگ پر باری باری گولی چلا دی۔ گولیوں کے دھماکوں کی آواز وادی میں دور تک گونجتی چلی گئی۔ وہ کرب انگیز کراہ کے ساتھ زمین بوس ہوتے گئے اور میں بڑے آرام سے آگے بڑھ گیا۔ ان کے دہانوں سے برآمد ہونے والی مغلظات کی بازگشت مجھے دور تک سنائی

دیتی رہی تھی۔ میں عبادت گاہ کے علاقے کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ اب کسی بھی وقت میرا عامل عاروب اور کالا ناگ وغیرہ سے ٹکراؤ ہو سکتا تھا۔

وادی میں شام گہری ہونے لگی تھی جو بتدریج رات کی تاریکی میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے رہ رہ کر نگینہ کا خیال پریشان کر رہا تھا۔ جانے کس حال میں ہوگی۔ خود سے بیگانی ہوگی یا پھر اپنے نصیبوں پر رو رہی ہوگی۔ اس کے ساتھ بڑی ٹریجڈی ہوئی تھی۔ وہ بڑے دردناک اور عذاب ناک لمحات سے گزر رہی تھی۔ اسے یاد کر کے میرے دل میں آرے سے چل رہے تھے۔ سینے کی ہلچل طوفانوں میں بدلنے لگی تھی۔ میں آگے بڑھتا رہا۔ اچانک میری نگاہ مشعل بردار جلوس پر پڑی جو مشرقی سمت سے آ رہا تھا۔ اس کا رخ عامل عاروب کی عبادت گاہ کی طرف تھا۔ ان سب نے سیاہ لانبے چغے پہن رکھے تھے حتیٰ کہ سر اور چہرے بھی ڈھانپے ہوئے تھے۔ یہ یقیناً عاروب کے گروہ سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ مگر یہ اس کے اور پیروکاروں سے وضع قطع میں ذرا مختلف نظر آ رہے تھے۔ شاید یہ کوئی دوسرا گروپ تھا۔ کوئی خاص ٹولہ۔ ان کے ایک ہاتھ میں چیڑ کی مشعلیں تھیں تو دوسرے ہاتھ سے ایک ہڈی تھامی ہوئی تھی۔ یہ ہڈی خاصی بڑی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی بڑے جانور کی ران اور پیڑو کی ہڈی تھی۔ یہ ٹولہ میرے محتاط اندازے کے مطابق بیس پچیس افراد پر مشتمل تھا۔ وہ لوگ فی الوقت عبادت گاہ سے ذرا دور تھے۔ میرے ذہن میں فوراً یہ خیال اُبھرا اور میں چھپتا چھپاتا ان کے راستے پر آ کر ایک آڑ لے کر کھڑا ہو گیا۔ اب یہ ٹولہ ادھر سے گزرنے والا تھا۔ پھر جب وہ میرے بالکل قریب سے گزرنے لگا تو میں ہوشیار ہو گیا۔ پھر جیسے ہی ٹولے کا آخری فرد میرے قریب سے گزرنے لگا، میں چیتے کی سی مستعدی اور خاموشی سے عقب میں اُبھرا اور اسے گردن سے جھپٹ کر یکدم آڑ میں کھینچ لایا۔ اس نے تلملا کر عجیب وضع کی ہی سے مجھ پر وار کرنا چاہا مگر میں نے اپنے دونوں بازوؤں کے مخصوص شکنجے میں اس کی گردن جکڑ کر جھٹک دیا۔ کڑاکے کی آواز اُبھری اور گردن کی ہڈی ٹوٹنے پر اس نے اپنے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ میں نے جلدی جلدی اس کا سیاہ چغہ اُتارا اور خود پہن لیا۔ پھر زمین پر گری جلتی ہوئی مشعل اور وہ عجیب وضع کی ہڈی ہاتھوں میں اٹھا کر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتے ہوئے اس سیاہ پوش ٹولے میں شامل ہو گیا۔ اب میرا چہرہ سیاہ چغے کے ''گھونگھٹ'' میں چھپ گیا تھا۔ ذرا دیر بعد میں ٹولے سمیت عامل عاروب کی مخروطی چھت والی عبادت گاہ کے اندر داخل ہو چکا تھا۔ میرے سینے میں بڑی پکڑ دھکڑ مچی ہوئی تھی۔ قسمت سے عاروب کی شہ رگ تک پہنچنے کے لئے جو راستہ ملا تھا، میں اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ عبادت گاہ میں داخل ہونے کے بعد یہ مخصوص ٹولہ چبوترے کے سامنے قطار اندر قطار مؤدبانہ کھڑا ہو گیا۔ میں درمیانی صف میں کھڑا تھا۔ چغے کے گھونگھٹ سے سامنے چبوترے پر میری نظریں جمی ہوئی تھیں جہاں اسی عجیب وغریب اور بدوضع مورتی کے قریب منحوس عاروب کھڑا تھا۔ نگینہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ البتہ عاروب کے چھ لحیم شحیم خوفناک صورتوں والے خاص محافظ مستعدی کے ساتھ اس کے دائیں بائیں موجود تھے۔ معاً عاروب نے ایک نظر اس مخصوص سیاہ پوش ٹولے پر ڈالی اور اپنا دایاں ہاتھ بلند کر کے گونج دار آواز میں کہا۔

''مقدس ''دابولا مینزی'' کے پجاریو! مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ تم لوگوں کی خاص توجہ اور محنت سے ہمارے پیروکاروں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن ابھی ہماری منزل بہت دور ہے۔ جب تک پوری وادی کیلاش کے لوگ مقدس دابولا مینزی کے دائرے میں نہیں آ جاتے، ہمارا مشن جاری رہے گا۔ ہم جانتے ہیں، کیلاش وادی کا سردار آگرموشی ہماری راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اور اس نے ہمیں اس وادی سے بے دخل کرنے کی خاطر ہر قسم کی کوششیں کر کے دیکھ ڈالیں مگر مقدس دابولا مینزی نے اس کی ہر سازش ناکام بنا دی ہے۔ اس لئے تم ذرا بھی نہ گھبرانا اور اسی طرح پوری وادی کے لوگوں کو مقدس دیوتا دابولا مینزی کے بارے

میں آگاہ کرتے رہنا کہ وہ جلد از جلد اس کے پیروکار بن جائیں۔ ورنہ بہت جلد پوری وادی پر عذاب نازل ہونے والا ہے۔ اس عذاب سے صرف مقدس دابولامینزی کے پیروکار ہی بچ پائیں گے۔ جو اس کے حلقہ اثر سے باہر ہوگا، وہ فنا ہو جائے گا۔ کیونکہ اس سرزمین پر صرف اور صرف مقدس دابولامینزی ہی کی حکمرانی ہے، جو طاقت کا دیوتا ہے۔''

وہ اپنی بکواس ختم کر کے خاموش ہوا تو مخصوص سیاہ پوش ٹولے میں سب سے اگلی قطار میں کھڑے ایک سیاہ پوش نے مؤدبانہ لہجے میں عامل عاروب سے کہا۔ ''کیلاشی سردار آگرموشی کی ہمارے خلاف چیرہ دستیاں روز بہ روز بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس نے اب باقاعدہ کچھ لوگ مخصوص کر دیئے ہیں جو کیلاشی وادی کے لوگوں کو ہمارے خلاف بھڑکانے کا کام سرانجام دے رہے ہیں۔ پہلے کے مقابلے میں اب ہماری کوششیں اگرچہ تیزی اختیار کر چکی ہیں لیکن افسوس کہ کیلاشی سردار آگرموشی کے مخصوص افراد نے ہماری ان کوششوں اور کاوشوں پر پانی پھیر دیا ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ میں بہ غور ان کی باتیں سن رہا تھا۔ عامل عاروب نے غور سے اپنے پیروکار کی بات سنی، اس کے بعد وہ بلند آواز سے بولا۔

''ٹھیک ہے.........ہم آج مقدس دابولامینزی کے آگے ایک بھینٹ چڑھائیں گے اور اس سے کیلاشی سردار آگرموشی کو نیست و نابود کرنے کی التجا کریں گے۔''

''ہم بھینٹ دینے کو تیار ہیں اے مقدس دابولامینزی کے پیروکار! ہم تیار ہیں۔'' سیاہ پوش مخصوص ٹولے نے بیک زبان ہو کر بلند آواز سے کہا تھا۔

''نہیں۔'' عامل عاروب نے اچانک گونج دار آواز میں کہا۔ ''مقدس دابولامینزی ہماری بھلائی، کامیابی اور ہماری زندگیوں کے تحفظ کی خاطر تو ہماری اپنی قربانی یا بھینٹ قبول کرتا ہے لیکن کسی دشمن کو نیست و نابود کرنے کے لئے اسے کسی باہر کے آدمی کی بھینٹ چڑھانا ہوگی۔''

''اے مقدس دابولامینزی کے پیروکار! ہمیں حکم کرو۔ ہم وادی سے باہر کا کوئی آدمی پکڑ لاتے ہیں۔'' اگلی صف میں کھڑے اسی سیاہ پوش پیروکار نے عاروب سے مؤدبانہ کہا۔

''نہیں.........یہ بھینٹ ایک خوبصورت اور جوان دوشیزہ کی ہوگی جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہے۔'' عامل عاروب نے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا اور میری کنپٹیاں بری طرح سنسنانے لگیں۔ میرا خیال فوراً نگینہ کی طرف چلا گیا تھا۔ معاً اس مردود عاروب کی دوبارہ آواز ابھری۔

''اور یہ بھینٹ ابھی اور اسی وقت چڑھائی جائے گی۔'' یہ کہہ کر اس نے تالی بجائی۔ اس کے گرد کھڑے مستعد محافظوں میں سے دو فوراً حرکت میں آئے اور اوپری منزل تک جانے والے گردشی زینے کی چوکھٹ کی طرف بڑھ گئے۔ میرے اندر زبردست ہلچل مچنا شروع ہو گئی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ دونوں خبیث یقیناً نگینہ کو لینے کے لئے ہی گئے تھے۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ ذرا ہی دیر بعد وہ نگینہ کو دبوچے چبوترے پر لے آئے۔ نگینہ کو دیکھتے ہی میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہونے لگی تھی۔

وہ بری طرح ہراساں نظر آ رہی تھی۔ مجھے ایک تسلی تو ہوئی تھی کہ وہ مکمل طور پر عاروب کے ٹرانس میں نہیں آئی تھی۔ میری نظریں چبوترے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے دیکھا، عامل عاروب یک ٹک نگینہ کے چہرے کو گھورے جا رہا تھا۔ اس کے انداز پر ایک پُراندیشہ خیال سے میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ کہیں یہ خبیث مکمل طور پر تو نگینہ کو اپنے ٹرانس میں نہیں لے رہا؟ تاکہ وہ بہ رضا و رغبت اپنی بھینٹ اس دابولامینزی کی مورتی کو دینے کے لئے تیار ہو جائے۔

یہ خیال آتے ہی میں نے درانہ وار حملہ کرنے کا سوچا۔ میں اپنے میگارد اور کالا ناگ کے ان دونوں

ہرکاروں سے چھینے ہوئے پستولوں سے پوری طرح مسلح تھا۔ فاضل راؤنڈز بھی میرے پاس موجود تھے۔ چنانچہ میں نے اپنے ارتعاش پر قابو پایا اور دائیں ہاتھ سے پستول نکال لیا۔ ابھی پستول والا ہاتھ میرے سیاہ چغے کے اندر ہی موجود تھا اور پھر اس سے پہلے کہ میں کوئی حرکت کرتا، اچانک ہال میں نگینہ کی تیز چیخ ابھری اور وہ کھڑے کھڑے وہیں چبوترے پر گر پڑی۔ میں پوری جان سے لرز اٹھا۔ نگینہ کو یوں اچانک بے سدھ ہو کر چبوترے پر گرتا دیکھتے ہی میرے اندر ہولناک طوفان سر اٹھانے لگے تھے۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ میرے اندر کوئی چیخ چیخ کر مجھے مزاحمت کرنے سے روک رہا تھا۔ اسی وقت عامل عاروب کی آواز ابھری۔

''اس خوب صورت دوشیزہ کی قربانی مقدس دابولامینزی نے قبول کر لی ہے.........ہم نے اسے اپنے عمل کی ہر گرفت سے آزاد کر دیا تھا تاکہ یہ مکمل طور پر ایک عام اور معصوم دوشیزہ کی طرح قربان ہونے کے لئے تیار ہو جائے۔'' مجھے اس کی بات پر ایک زبردست جھٹکا لگا۔ اس کا یہ کہنا کہ 'ہم نے اب اسے اپنے عمل کی ہر گرفت سے آزاد کر دیا تھا' مجھے بری طرح چونکا گیا تھا۔ 'کیا اس مردود نے مجھ پر نادانستگی میں یہ احسان کر دیا تھا کہ نگینہ.........میری نگینہ اب اس کے جزوی ٹرانس کے عمل سے بھی آزاد ہو چکی تھی؟ یعنی یعنی کیا نگینہ۔ کے دل و دماغ میں اب میری حکومت دوبارہ قائم ہو چکی ہے؟ اور.........اور کیا اب میری گم گشتہ دنیائے محبت مجھے مل گئی ہے؟'

ایسے کئی مسرت انگیز خیالوں اور خوش امیدیوں نے میرے اندر ہلچل مچا دی۔ نگینہ شاید اس کے جزوی ٹرانس کے عمل سے آزاد ہونے کے ردعمل میں بے ہوش ہو گئی تھی۔

میں دم بہ خود کھڑا سامنے چبوترے پر بے سدھ پڑی نگینہ کو تکے جا رہا تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ نگینہ کے وجود نے ہلکی سی جنبش کی تھی۔ میرا دل یکبارگی دھڑکا۔ مجھے یوں لگا جیسے اب آج سے کروڑوں سال پہلے والا ''بگ بینگ'' ہوگا اور میری کائنات، میری دنیا ''وفائے کُن'' سے وجود میں آ جائے گی۔ اور پھر یہی ہوا۔

نگینہ نے ہوش میں آتے ہی سب سے پہلے جو لفظ ادا کیا، وہ میرا نام تھا۔

''نادر!.........نادر!.........تت.........تم کہاں ہو؟'' وہ ہولے ہولے بڑبڑائے جا رہی تھی۔ اس خوب صورت پکار نے میرے وجود کی گہرائیوں تک کو اک عجیب مسرت سے معمور کر دیا تھا۔ سرشاری، خوشی اور مسرت کے احساس نے جیسے میرے پورے وجود پر قبضہ جما لیا تھا۔ اس کیفیت نے میرے اندر کے ابلتے جوش کو بھی ہوش کی راہ دکھلا دی تھی۔ اب مجھے سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہئے۔ اگرچہ حالات ''اب نہیں تو کبھی نہیں'' کے مصداق تھے مگر اس کے باوجود میں ہوش و خرد سے کام لینا چاہتا تھا۔ نگینہ نے ہوش میں آتے ہی بے اختیار دل سے مجبور ہو کر مجھے پکارنا شروع کر دیا تھا۔ عامل عاروب کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ ابھری۔ ادھر نگینہ یکدم اٹھ کھڑی ہوئی تھی مگر اس کے قدم ڈگمگائے جا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ برسوں کی نیند سے جاگی ہو۔ عامل عاروب نے اپنے دو گرگوں کو خفیف سا اشارہ کیا۔ دونوں نے حرکت کی اور نگینہ کو ایک بار پھر بازوؤں سے پکڑ کر دبوچ لیا۔ نگینہ چیخنے چلانے لگی اور ہراساں نگاہوں سے اس ماحول کو تکنے لگی۔ اس کی نگاہ بدوضع مورتی پر پڑی۔

''میں کہاں ہوں؟.........تت.........تم لوگ کون ہو؟ مجھے بتاؤ۔ خدا کے لئے مجھے بتاؤ۔'' نگینہ ہسٹریائی انداز میں چلائی تو عامل عاروب سنگدلانہ نظروں سے اسے گھور کر بولا۔

''خاموش ہو جاؤ لڑکی! تمہیں اب مقدس دیوتا دابولامینزی پر قربان کیا جانے والا ہے۔ تم بہت خوش قسمت ہو کہ مقدس دابولامینزی نے تمہاری قربانی قبول کر لی ہے۔''

نگینہ نے جو یہ سنا تو خوف و دہشت سے کانپ کر رہ گئی۔

”یہ.........یہ سب کیا ہے؟.........مم.........میں پاگل ہو جاؤں گی۔ تم اللہ کے واسطے مجھے چھوڑ دو۔ مجھے جانے دو.........آہ.........نادر!.........تم کہاں ہو؟“ وہ پھر ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگی۔

’نادر علی! تم کب تک خاموش تماشائی بنے کھڑے رہو گے؟.........تمہاری نگینہ، تمہاری محبت تمہیں پکار رہی ہے۔ جاؤ، اپنی نگینہ کو ان منحوس و مردود شیطانوں سے بچالو۔ بڑھو اور.........‘میرے اندر کوئی چیخنے لگا۔

”اسے مقدس دابولامینزی کے قدموں میں لے آؤ اور زنجیروں سے جکڑ دو۔“ عاروب نے حکم دیا۔

وہ دونوں گرگے نگینہ کو مورتی کی طرف گھسیٹنے لگے۔ میں غیر محسوس انداز سے دھیرے دھیرے چبوترے کی طرف کھسکنے لگا۔ آخری سرے پر پہنچ کر میں رک گیا۔ وہاں سے چبوترہ نزدیک تھا۔ چبوترے پر میرے عین مقابل عاروب کھڑا تھا۔ میں نے ایک لمحہ سوچا اور پھر اسے ہی تختۂ مشق بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ دابولامینزی کے پیروکاروں کے روحانی پیشوا کو گن پوائنٹ پر لینا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ ایک بہت بڑا اور جان لیوا حد تک خطرناک رِسک تھا۔ مگر میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راہ نہ تھی۔ میں جست لگا کر باآسانی چبوترے پر چڑھ کر عامل عاروب کو گن پوائنٹ پر لے سکتا تھا۔ پھر میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر چغہ اتار پھینکا اور چبوترے پر چھلانگ لگا کر عامل عاروب پر جھپٹا۔ کبڑا ہونے کے باعث اس کی گردن پہلے ہی جھکی ہوئی تھی اس لئے میں نے باآسانی اپنے بائیں بازو کے شکنجے میں اس کی گردن جکڑ کر پستول کی نال اس کی کنپٹی پر لگا دی۔ یہ کام میں نے پل کے پل نمٹا دیا تھا۔ جواب میں کئی وحشیانہ چیخیں اُبھریں۔ چبوترے پر موجود عاروب کے مستعد محافظ اپنی جگہ ساکت ہو کر رہ گئے۔ میں نے دھاڑ کر کہا۔

”خبردار!.........کوئی بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا۔ ورنہ میں اسے گولی مار دوں گا۔“ یہ کہہ کر میں نے عاروب کی کنپٹی پر پستول کی نال کا دباؤ ڈالتے ہوئے اس سے کہا کہ وہ محافظوں کو نگینہ کو چھوڑنے کا حکم دے۔ ادھر نگینہ مجھے دیکھ کر گویا کھل سی اُٹھی تھی۔ عاروب کو میرے خونخوار ارادے کی خطرناکی کا احساس ہو گیا تھا۔ لہٰذا اس نے پھنسی پھنسی آواز میں ان دونوں گرگوں کو حکم دیا کہ نگینہ کو چھوڑ دیا جائے۔ انہوں نے فوراً نگینہ کو چھوڑ دیا۔

نگینہ مسرت سے چیختی ہوئی میری جانب بڑھی۔ ”نادر.........!“ وہ میرے ساتھ آن لگی۔ ہال میں موجود عاروب کے پیروکاروں کے چہرے طیش اور غیظ و غضب سے سرخ ہو رہے تھے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ میرے اس ناقابل معافی جرم پر میری تکا بوٹی کر ڈالیں۔ لیکن اس وقت ان کے روحانی پیشوا کی جان خطرے میں تھی، جس نے انہیں اپنی جگہ کھڑے رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”اپنے اس روحانی پیشوا کی زندگی چاہتے ہو تو سب لوگ ایک دیوار سے لگ کر منہ دوسری طرف پھیر کر کھڑے ہو جاؤ اور ہاتھ سر سے بلند کرلو۔ میں باہر نکلتے ہی تمہارے اس روحانی پیشوا کو چھوڑ دوں گا۔ لیکن اگر کسی نے ذرا سی بھی چالاکی دکھائی تو پھر اس کی موت کے ذمے دار تم خود ہو گے۔“ میں نے گرج دار آواز کے ساتھ کہا اور ساتھ ہی عاروب کی مرغی کی طرح دبوچی ہوئی گردن کو بھی ہولے سے جھٹکا دیا۔ درد کی شدت سے بے اختیار اس کے حلق سے ایک کراہ خارج ہو گئی تھی۔ اس کے بعد اس نے پھٹی پھٹی آواز کے ساتھ اپنے پیروکاروں کے سامنے لفظ بہ لفظ میرا حکم دہرا دیا۔ وہ لوگ اندر ہی اندر بری طرح کھول رہے تھے مگر عاروب کی وجہ سے بے بس تھے۔ ناچار انہیں یہ حکم ماننا پڑا۔ ابھی میں نے نگینہ اور عاروب کو ساتھ لئے قدم بڑھائے ہی تھے کہ اچانک ایک خونخوار اور دھاڑتی ہوئی آواز ہال میں گونجی۔

”خبردار نادر!.........اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔ ورنہ گولیوں سے بھون دیئے جاؤ گے۔“

یہ دھاڑتی ہوئی آواز ہال کے بیرونی دروازے سے اُبھری تھی۔ میں نے ٹھٹک کر آواز کی سمت دیکھا۔

میرے ساتھ ڈری سہمی کھڑی نگینہ کے حلق سے بے ساختہ دبی دبی سی چیخ اُبھری۔ ہال کے دروازے پر کالا ناگ اور کبیر کھڑے تھے۔ ان کے دونوں گرگے بھی ساتھ کھڑے تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے جن کی نالوں کا رخ میری جانب تھا۔

میں نے اپنے حواس پر قابو پایا اور چلا کر کہا۔ ”نگینہ کی جان خطرے میں ہے۔ یہ لوگ اسے اپنے دیوتا کی بھینٹ چڑھانا چاہتے تھے۔ تمہاری کوئی بھی حماقت نگینہ کے لئے نہیں بلکہ ہم سب کے لئے خطرناک ثابت ہو گی۔ کیونکہ ان کے پیروکار پل بھر میں ہماری تکا بوٹی کر ڈالیں گے۔“

میری بات پر کالا ناگ اور کبیر وغیرہ نے قدم آگے بڑھائے۔ پھر ذرا قریب پہنچ کر کالا ناگ نے زہر خند کے ساتھ مجھ سے کہا۔ ”تم نے ہمارا کام آسان کر دیا۔ نگینہ کو ہمارے حوالے کر دو اور خود جاؤ جہنم میں۔“

مردود کالا ناگ کی بات پر میں دانت پیس کر رہ گیا۔ اس سے خیر کی توقع فضول تھی۔ وہ انتقام کی آگ میں اندھا ہو رہا تھا۔ میں نے کبیر سے مخاطب ہو کر اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”کبیر!.........اپنے زر خرید کتے کو سمجھاؤ۔ اس وقت ہم سب کی جانیں خطرے میں ہیں۔ ہمارا پہلا مسئلہ یہاں سے نگینہ کو باحفاظت لے کر نکلنا ہے۔ ورنہ یہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

میرا خیال تھا کہ کبیر صورتِ حال کو سمجھتے ہوئے میری بات مان لے گا۔ لیکن وہ بھلا اپنے دشمن کی بات کیونکر مان سکتا تھا۔

”نادر! زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو.........تم اچھی طرح جانتے ہو کہ نگینہ ہمارے پاس بھی محفوظ ہی رہے گی۔ رہی بات تمہاری تو تم نگینہ کو ہمارے حوالے کر دینے کے بعد بھی کبڑے کو ڈھال بنا سکتے ہو۔“

میں بے بسی اور غصے کے مارے تلملا کر رہ گیا۔ تب نگینہ نے ہمت کی اور چلا کر کبیر سے بولی۔

”کبیر! ہوش کے ناخن لو۔ تمہاری نادر سے دشمنی میرے دل میں تمہاری نفرت میں اضافے ہی کا باعث بنے گی۔ تم نے اور اس بدمعاش کالا ناگ نے ہی مجھے آج اس مقام تک پہنچایا ہے۔ میرے نادر کو کچھ ہوا تو میں تمہیں ساری عمر معاف نہیں کروں گی۔“ نگینہ کے منہ سے یہ الفاظ سن کر کبیر ہکا بکا رہ گیا۔

”اوہ.........تو یہ بات ہے۔ تم نے بالآخر اپنی منزل پا ہی لی۔“

”کبیر! اب نگینہ تو گئی تمہارے ہاتھ سے۔ کیوں نہ اس پریمی جوڑے کا ادھر ہی قصہ پاک کر دیں۔“ اچانک کالا ناگ نے انتہائی سفاک لہجے میں کبیر سے کہا۔ اس کے لہجے کی سنسناہٹ پر مجھے اپنے وجود میں لاتعداد چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ میں ایک لمحے کے لئے اندر سے لرز سا گیا۔ وہ مردود مجھ پر بری طرح ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ لیکن اب مجھے دیکھنا یہ تھا کہ کبیر کیا فیصلہ کرتا ہے؟

ہال میں اعصاب شکن سناٹا طاری تھا۔ عاروب کے پیروکار اور مسلح محافظ بدستور دیوار کی طرف منہ کئے خاموش کھڑے تھے۔ وہ اتنا تو سمجھ ہی گئے تھے کہ دو مخالف گروپوں کے درمیان بری طرح ٹھن چکی ہے۔ اب خاموشی سے فیصلے کے منتظر تھے۔ تاہم میں ان کی طرف سے غافل نہیں تھا۔

”کالا ناگ.........!“ اچانک کبیر کی عجیب سی آواز اُبھری۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہاں سرد مہری اور سفاکی کے سوا کچھ نہ تھا۔ ”تم صحیح کہتے ہو۔ نگینہ اگر میری نہیں بنی تو کسی کی بھی نہیں ہو سکتی۔ اُڑا دو گولیوں سے ان دونوں کو۔“

بد بخت اور کینہ پرور کبیر نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایکا ایکی ہال میں گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ اُبھری۔

❄❄❄

زندگی اسی کا نام ہے۔ کبھی موت کی لپک اور کبھی زندگی کی جھپک۔ لیکن طاقت اور برتری کے دعوے دار

یہ بھول جاتے ہیں کہ مارنے والے سے بچانے والا زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ کالا ناگ نے بڑے سفاکانہ لہجے میں اپنے جوڑی دار کبیر کو بھیانک رائے دی تھی۔ فیصلہ کبیر کے ہاتھ میں تھا جو یقیناً ہمارے حق میں نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اب نگینہ کو وہ کبھی حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس نے جیسے ہی کالا ناگ کے فیصلے پر صاد کیا، میں اپنے پستول کا رخ کالا ناگ اور کبیر وغیرہ کی طرف کر کے ٹرائیگر دباتا چلا گیا۔

ہال میں ابھرنے والی گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ میرے ہی پستول کی نال سے برآمد ہوئی تھی۔ پہلی گولی کالا ناگ کی عین پیشانی پر لگی اور وہ آواز نکالے بغیر ہی پل کے پل واصل جہنم ہو گیا۔ جبکہ دوسری گولی کبیر کو لگی۔ وہ کرب ناک چیخ کے ساتھ تیورا کر گرا تھا۔ باقی دونوں گرگے بھی زخمی ہو کر لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے گئے تھے۔ میں نے خالی پستول پھینک کر دوسرا ابھرا ہوا پستول نکال لیا۔ ہال میں لوگوں کی وحشت ناک چیخیں اُبھر رہی تھیں۔ ان لوگوں کو اپنے روحانی پیشوا عاروب کی جان کی فکر تھی۔ وہ خیریت جاننے کے لئے میری طرف مڑے تھے، مجھ پر اس وقت بری طرح خون سوار تھا۔ میں نے گرج دار آواز کے ساتھ انہیں دوبارہ دیوار سے چپکے رہنے کا حکم دیا۔ نگینہ کے حلق سے بھی ہذیانی چیخ اُبھری تھی۔ اب بظاہر میرے سامنے میدان صاف تھا۔ کیونکہ کالا ناگ کے دونوں گماشتے زخمی ہو کر فرار ہونے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ میں نے نگینہ کو ساتھ لیا اور عاروب کو ڈھال بنائے دروازے کی طرف پیش قدمی کا ارادہ کیا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے مجھے چبوترے کے زینے والے اس سنگل پٹ کے دروازے کا خیال آیا جو میرے بائیں ہاتھ کے بالکل قریب تھا۔ ہو سکتا تھا ہال کے بیرونی دروازے کے باہر کالا ناگ کے وہ دونوں زخمی گماشتے میری گھات میں بیٹھے ہوں اور میرے بیرونی دروازے سے باہر نکلتے ہی مجھ پر حملہ کر دیں۔ یہ سوچ کر میں نے زینے والے دروازے کا رخ کیا اور باہر نکل آیا۔

"نادر!.........ہوشیار۔" اچانک نگینہ چلائی اور مجھے دھکا دیا۔ گولی چلنے کی آواز اُبھری اور اس کے ساتھ ہی کبڑے اروب کے حلق سے کرب ناک چیخ نکلی۔ نگینہ کے دھکا دینے سے نامعلوم سمت سے چلنے والی گولی کبڑے عاروب کے بدن میں اتر گئی۔ میں نے سنبھلتے ہی آواز کی سمت دیکھا۔ وہ کالا ناگ کے ان دو زخمی گرگوں میں سے ایک تھا جس نے شاید کالا ناگ کا کچھ زیادہ نمک کھا لیا تھا اس لئے اسے حلال کرنا چاہتا تھا۔ وہ تو شکر تھا کہ بروقت نگینہ کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ وہ عبادت گاہ کی جنوبی سمت کی دیوار کی آڑ سے اچانک ہی اُبھرا تھا۔ میں نے زمین پر لوٹ لگاتے ہی اس کے دوسری بار گولی چلانے سے پہلے اس کا نشانہ لیتے ہوئے ٹرائیگر دبا دیا۔ وہ کریہہ چیخ کے ساتھ گرا تھا۔ کبڑا عاروب گولی کھا کر بری طرح تڑپ رہا تھا۔ میرے اوسان خطا ہو گئے۔

"بھاگو نگینہ!" میں زور سے چلایا اور اس کا ہاتھ پکڑے دور تاریکی میں دوڑتا چلا گیا۔ ترپ کا پتہ جو ہماری زندگیوں کی ضمانت تھا، وہ میرے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ یوں بھی میرا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ مگر ہم ابھی خطرے میں بری طرح گھرے ہوئے تھے۔

میں اور نگینہ بے تحاشا دوڑے جا رہے تھے۔ ابھی ہم ذرا ہی دور گئے ہوں گے کہ ہمارے عقب میں ماؤزر کے دھماکے اُبھرے۔ میں نگینہ کو لے کر فوراً ایک چٹان کی آڑ میں آ گیا۔ ہمارے سانس بری طرح پھولے ہوئے تھے۔ میں نے ذرا رک کر سر اُبھارا اور عقب میں دیکھا تو دھک سے رہ گیا۔ مشعل بردار افراد کا پورا جلوس ہمارے تعاقب میں دوڑا چلا آ رہا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کالا ناگ کے اس "نمک حلال" کی چلائی ہوئی گولی نے کبڑے عاروب کا کیا بگاڑا تھا؟ وہ زندہ بھی تھا یا جہنم رسید ہو چکا تھا؟ لیکن بہرحال اسے گولی لگی تھی۔ اس کے پیروکار مسلح محافظ ہماری تکا بوٹی کر ڈالنے کے لئے سخت مشتعل اور بے تاب تھے۔

تاریک آسمان پر بادل چھائے ہونے کی وجہ سے آس پاس گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ یہ اندھیرا ہمیں تحفظ بھی فراہم کر سکتا تھا اور قضا کے گھاٹ بھی اتار سکتا تھا۔ کیونکہ یہاں آس پاس اندھی کھائیوں کی کمی نہ تھی۔ میں نے نگینہ کا ہاتھ پکڑا اور سنبھل سنبھل کر آگے بڑھنے لگا۔ کئی بار میرا اور نگینہ کا پاؤں پھسلا مگر ہم نے خود کو سنبھال لیا۔ بلکہ ایک بار تو میں گرنے سے خود کو بچا ہی نہ پایا اور نیچے گرتا چلا گیا۔ وہ تو شکر تھا، کھائی کم گہری تھی اس لئے بچ گیا۔

بہرطور میں اور نگینہ تاریکی کا حصہ بنے سنبھل سنبھل کر آگے بڑھتے رہے۔ نگینہ کو پا لینے کے بعد جیسے اب میرے حوصلوں کے بادبان آسمان تک بلند ہو چکے تھے۔ میں اس کا نرم و گداز ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔ ہم ایک دوسرے سے کھل کر اور تفصیلاً گفتگو کرنے کو بے تاب تھے مگر ہمیں ابھی تک اس کا موقع ہی نہیں مل پایا تھا۔

شور کی آوازیں بتدریج قریب آتی جا رہی تھیں۔ مجھے اب تشویش ہونے لگی۔ میرا جرم معمولی نہ تھا۔ ان کے ہتھے چڑھنے کا مطلب یقینی موت تھا۔ تشویش مجھے اس بات کی تھی کہ یہ لوگ اس گنجلک اور پُرپیچ وادی کے چپے چپے سے واقف تھے۔ وہ آنکھیں بند کر کے بھی تاریکی میں ہمیں ڈھونڈ سکتے تھے۔ جبکہ ہم کھلی آنکھوں سے راستہ تک نہیں دیکھ پا رہے تھے۔ لیکن میں نے ہمت ہارنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ اور پھر اب تو میری نگینہ میرے ساتھ تھی۔ وہ میرا سب کچھ تھی۔ میرا حوصلہ، میری دلیری، میرا عزم، سبھی کچھ۔ اور میں ہمت اور حوصلے کے ساتھ اپنی اور نگینہ کی بقاء کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ دن کا اجالا شاید ہمارے لئے سودمند ثابت ہو سکتا تھا۔

کالا ناگ کا میرے ہاتھوں عبرت ناک انجام حسب توقع تھا۔ وہ روز بہ روز میرے اور نگینہ کے لئے زہریلا بنتا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ ماموں حیدر گل کا ایک طرح سے قاتل بھی تھا۔ میری ماں بھی اسی کے ہاتھوں مرتے مرتے بچی تھی۔ کبیر بھی کم خطرناک نہ تھا۔ کالا ناگ کے ساتھ رہتے رہتے اس میں بھی زہر چڑھنے لگا تھا۔ یہی سبب تھا کہ آخری لمحات میں جب اس نے دیکھا کہ نگینہ مکمل طور پر اس کبڑے عامل عاروب کے ٹرانس سے نکل کر مجھے پہچاننے لگی ہے تو اس نے ہم دونوں کا ہی قصہ پاک کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ مگر میرے جارحانہ اقدام نے اس کے گھناؤنے ارادوں کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیا تھا۔ کالا ناگ تو یقیناً جہنم واصل ہو چکا تھا کیونکہ میرے پستول سے نکلی ہوئی گولی نے اس کا بھیجہ اُڑا دیا تھا۔ جبکہ کبیر کے بارے میں حتمی طور پر میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ تاہم وہ میری گولی سے زخمی ضرور ہوا تھا۔ یہی حال کبڑے عاروب کا تھا جو کالا ناگ کے ایک نمک خوار کی گولی کی زد میں آ گیا تھا۔

"نادر!.........وہ لوگ ہمارے قریب پہنچنے والے ہیں۔" اچانک نگینہ کی ہراساں آواز مجھے خیالوں سے باہر نکال لائی۔ "اوہ.........اب آگے بڑھنے کی بجائے ہمیں کہیں چھپنا ہوگا۔"

"یہ خیال میرے ذہن میں بھی آیا تھا۔" میں نے اپنی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے اس سے کہا۔ "مگر اس طرح ہم دھر لئے جائیں گے۔ کیونکہ وہ لوگ تو اس علاقے کے چپے چپے سے واقف ہیں۔ پھر ان کے پاس مشعلیں بھی ہیں اور ہم انجان ہیں۔ تم ہمت کرو، ہمارا چلتے رہنا ہی زیادہ سودمند ہے۔"

وہ میری بات پر چپ ہو گئی۔ پھر لمحے بھر بعد دوبارہ بولی۔ "نادر! آخر یہ سب کیا ہے؟.........یہ کون سی جگہ ہے اور ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟.........میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"

"نگینہ! اب میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں تمہیں سب بتا دوں گا۔ فی الوقت تو ہمیں ان سفاک لوگوں سے خود کو بچانا ہے۔"

"آہ........." اچانک نگینہ کے حلق سے بے اختیار کراہ خارج ہو گئی۔ اس کے نرم و نازک وجود کو ایک جھٹکا لگا۔ وہ کسی اندھی کھائی میں گرنے ہی والی تھی۔ مگر چونکہ میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا اس

لئے فوراً اسے گرنے سے بچاتے ہوئے غیر ارادی طور پر اپنے سینے سے لگا لیا۔

ان نامساعد حالات میں اس کے نرم گرم جسمانی قرب نے میرے اندر عجیب سی سرشاری گھول دی۔

''نادر! مجھے چھوڑنا مت۔'' یہ جملہ بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔

''پاگل! بھلا اپنی روح اور اپنی زندگی کو بھی کوئی چھوڑتا ہے؟'' میں نے محبت پاش لہجے میں کہا۔ اپنے عقب میں آوازوں کا شور بہت قریب سے سنائی دینے لگا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا، روشنی کا سیلاب سا امڈ پڑا تھا۔ وہ لوگ یقیناً ہم سے بہت قریب آ گئے تھے۔ ان کی نظریں ہم پر پڑ گئی تھیں۔ اسی وقت وادی کا سکوت ماؤزر کی گرج دار آواز سے ٹوٹ گیا اور میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ خود کو نگینہ سمیت نیچے گرا دیا اور پھر جیسے ہم دونوں کسی گہری کھائی کی ڈھلان پر لڑھکتے چلے گئے۔ نگینہ کے حلق سے اضطراری انداز میں ہسٹریائی چیخیں بلند ہوئیں۔ میں نے لڑھکنے کے دوران خود پر قابو پانے کی کوشش کی، لیکن جلد ہی مجھے محسوس ہو گیا کہ ڈھلان زیادہ عمودی نہیں تھی بلکہ خاصی حد تک اُفقی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ایک جھاڑی میرے ہاتھ میں آ گئی۔ میں نے اسے ایک ہاتھ سے دبوچ لیا۔ نگینہ میرے سر پر لڑھکتی چلی آ رہی تھی۔ میں نے اس کے وجود کو دوسرے ہاتھ سے روک لیا۔ وہ بری طرح ہانپنے لگی۔ میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

''نگینہ! ہمت مت ہارنا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ یہ کھائی زیادہ خطرناک نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہمارے لئے پناہ گاہ ثابت ہو سکتی ہے۔''

نگینہ نے میری بات پر ہولے سے سر ہلا دیا۔ میں نے ذرا اوپر سر اٹھا کر دیکھا۔ ہم خاصی گہرائی میں لڑھک آئے تھے۔ نیچے اتھاہ گہرائیاں ہولناک تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ یہ کھائی بہت وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ معاً مجھے بلندی پر شور سنائی دیا۔ میں اور نگینہ ڈھلان سے چپک گئے۔ میں نے دیکھا، کھائی کے سرے پر ان مشعل بردار افراد کے ہیولے متحرک تھے۔ ان میں کئی نیچے جھک کر مشعل کی روشنی ڈالنے لگے۔

میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ میں نے نگینہ سے کہا۔ ''نگینہ! اسی طرح چپکی پڑی رہو۔ حرکت مت کرنا۔ وہ لوگ بلندی سے جھانک رہے ہیں۔'' وہ خاموش رہی۔ تاہم اس نے میری بات سن لی تھی۔ کئی لمحے ہم یونہی بے حس و حرکت گچھے دار جھاڑیاں اپنے ہاتھوں کی مٹھی میں پکڑے دم سادھے چپ رہے۔ تاہم میری نظریں بلندی پر کھائی کے سرے پر جمی ہوئی تھیں۔

پھر معاً وہی ہوا، جس کا مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ میں نے چار عدد مشعل برداروں کو ڈھلان میں اترتے دیکھا۔ وہ شاید ہمارے نیچے گرنے کی اچھی طرح تسلی کرنا چاہتے تھے۔ اب ہمارا اس مقام پر جمے رہنا مناسب نہ تھا۔ میرے پاس اگرچہ دو پستول تھے اور فاضل راؤنڈز بھی تھے مگر بہرحال ان کی تعداد محدود تھی جبکہ دشمنوں کی تعداد خاصی کثیر تھی۔ میں ان پر فائرنگ کر کے انہیں اپنے پیچھے نہیں لگانا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے نگینہ سے کہا۔

''نگینہ! دشمنوں کے چند آدمی نیچے آ رہے ہیں۔ ہمیں مزید گہرائی میں اُترنا ہو گا۔ تم ایسا کرو، اپنے دونوں پاؤں میرے کاندھوں پر ٹکا دو۔ ہاتھوں کی مدد سے میرے ساتھ ساتھ نیچے اُترنے کی کوشش کرو۔''

''لل......لیکن نادر!......تم......''

''نگینہ! یہ وقت بحث کا نہیں ہے۔ جیسا میں کہہ رہا ہوں، ویسا کرو۔ جلدی۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''وہ ابھی دور ہیں۔ ہم ان سے پہلے نیچے پہنچ جائیں گے۔''

نگینہ نے ایسا ہی کیا۔ اس نے ڈھلان سے چپکے چپکے اپنے جسم کا زاویہ بدلا اور اپنے پاؤں میرے کاندھوں پر ٹکا دیئے۔ پھر میں نے ڈھلان کا سہارا لیتے ہوئے دھیرے دھیرے نیچے سرکنا شروع کر دیا۔

ڈھلان کی سطح ناہموار تھی۔ میں اس کے رخنوں اور کہیں کہیں اُبھرے نوکیلے پتھروں پر اپنے پاؤں ٹکائے نیچے اتر رہا تھا۔ نگینہ بھی اپنے تئیں بڑی چابک دستی اور ہوشیاری کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ میں اگر اسپورٹس مین تھا تو وہ بھی اسپورٹس ویمن تھی۔ اسے بھی حالات کے مطابق خود کو ڈھالنا آتا تھا۔

نگینہ کو سہارا دینے کا مقصد ہی میرا یہ تھا کہ کہیں خوف و ہراس میں اپنا توازن ہی نہ بگاڑ لے اور خدانخواستہ نیچے ہی نہ لڑھک جائے۔

میں اب اوپر بلندی کی طرف نہیں دیکھ سکتا تھا۔ تاہم میں نے ہلکی آواز میں نگینہ سے پوچھا کہ وہ ذرا اوپر دیکھ کر مجھے بتائے کہ ہمارے تعاقب میں نیچے اترنے والے ہم سے کتنی دوری پر ہیں۔ اس نے اوپر دیکھ کر مجھے بتا دیا۔ اگرچہ وہ ہم سے خاصے دور تھے لیکن ان کے نیچے آنے کی رفتار ہم سے کہیں زیادہ تیز تھی۔ میں پریشان ہو گیا۔ تاہم میں نے ہمت نہ ہاری اور اپنے نیچے سرکنے کی رفتار تیز کر دی۔ اس کوشش میں دو تین مرتبہ میرا توازن بگڑنے بھی لگا تھا لیکن میں نے چابک دستی سے خود کو سنبھال لیا۔ یہ نہایت خطرناک صورت حال تھی۔ نیچے کھائی میں گرنے کا خدشہ الگ تھا تو اوپر ان چاروں دشمنوں کی آمد کا دھڑکا الگ۔

ٹھٹھرا دینے والی سردی کے ساتھ اب تو لہو کو رگوں میں جما دینے والی کاٹ دار ہوائیں بھی چلنا شروع ہو گئی تھیں۔ اس جاں گسل کوشش میں میرے ہاتھ پاؤں شل ہو چکے تھے اور زخمی بھی۔ میرے چہرے اور جسم پر خراشیں پڑ گئی تھیں۔ میرا سانس بری طرح پھول گیا تھا۔ اچانک میرے دونوں پاؤں خلا میں جھول گئے......میری روح فنا ہو گئی۔ میں اپنے دونوں پاؤں اب دوبارہ سکیڑ نہیں سکتا تھا۔ پیروں سے ڈھلان کی سطح نکلتے ہی مجھے اپنا وجود ہوا میں معلق سا محسوس ہونے لگا جس کی وجہ سے بوجھ کا احساس بڑھنے لگا۔ میری پیش قدمی رک گئی تھی۔

''کیا ہوا نادر؟......تم رک کیوں گئے؟......دشمن قریب آ رہے ہیں۔'' مجھے رکتا محسوس کر کے نگینہ نے ہراساں لہجے میں کہا۔ میں نے اسے صورتِ حال کی نزاکت بتائی

''نگینہ تم ذرا میرے کاندھوں سے اپنے پاؤں ہٹا کر ڈھلان سے لگ جاؤ۔ میں ذرا اپنا زاویہ بدل کر دوسرا راستہ دیکھتا ہوں۔''

''نادر! اپنا خیال رکھنا......کہیں تم نیچے......'' اس نے اپنا جملہ دانستہ ادھورا چھوڑا تو میں نے کہا۔

''اللہ سے دعا کرو......وہ ہمارے ساتھ ہے۔'' یہ کہہ کر میں اور ذرا نیچے سرکا کہ اچانک میرا دل خوشی کے احساس سے بلیوں اُچھل پڑا۔ میرے دونوں پاؤں ڈھلانی سطح سے ٹکرائے تھے۔ تب مجھے ایک خوش آئند احساس ہوا کہ میرے پیر وہاں کسی غار کے دہانے میں تھے۔ میں ذرا سا مزید سرکا۔ میرے دونوں پیر اب ٹک چکے تھے۔ وہ واقعی کوئی اندھیری گپھا تھی۔ میں نے نگینہ کو ہولے سے آواز دے کر نیچے سرکنے کا کہا۔ وہ نیچے اترنے لگی۔ میں نے دونوں ہاتھ بلند کر لئے۔ پھر جیسے ہی اس کی دونوں ٹانگیں فضا میں جھولنے لگیں، میں نے انہیں تھام لیا اور پھر دھیرے دھیرے نگینہ نے اپنا وجود میرے بازو پر ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے آہستگی سے اسے خلا میں اتارا اور اندھیری گپھا ٹٹول کر معائنہ کرنے لگا۔ گپھا زیادہ گہری نہیں تھی۔ اس کا دہانہ اگرچہ قدرے وسیع تھا مگر اندر سے چھ سات فٹ سے زیادہ گہرائی نہ تھی۔ میں نے نگینہ کو اندر ایک کونے میں آرام سے بٹھا دیا اور خود گپھا کے سرے پر آ کر اوپر بلندی کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ چاروں مشعل بردار دشمن پہاڑی مکڑوں کی طرح تیزی سے نیچے آ رہے تھے۔ ان کا رخ بھی ہماری گپھا کی طرف تھا۔ میرا ذہن اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے تیزی سے کام کر رہا تھا۔ تب یکبارگی میرے ذہن میں ایک خیال اُبھرا اور میں چوکنا ہو کر گپھا کے سرے میں کھڑا ہو گیا۔

روشنی قریب آتی جارہی تھی۔ اچانک پھر وہی ہوا جس کا میں منتظر تھا، گپھاہ کے خلا میں اوپر سے دو ٹانگیں نیچے جھولتی نظر آئیں۔ میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ ان دونوں ٹانگوں کو پکڑ کر ایک زوردار جھٹکے سے نیچے اس طرح کھینچا کہ دشمن چیختا چلاتا ہوا نیچے گہری تاریکی میں گرتا چلا گیا۔ باقی تینوں دشمنوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ وہ اپنی جگہ پر رک گئے تھے۔ میں نے یہ کام اس قدر ہوشیاری اور چابکدستی سے کیا تھا کہ وہ اُلجھ کر ہی رہ گئے تھے کہ آخر ان کے ساتھی کے ساتھ ہوا کیا تھا۔ پھر جیسے وہ اسے ایک اتفاقی حادثے پر محمول کر کے پھر نیچے سرکنے لگے۔

دو دشمن گپھاہ سے دور تھے جبکہ ایک گپھاہ کی بلندی کے سرے پر تھا۔ پھر جیسے ہی اس کی جھولتی ہوئی ایک ٹانگ نظر آئی، میں نے بہ سرعت اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کی ٹانگ پکڑ کر اسے زوردار جھٹکا دیا۔ اس کا بھی وہی حشر ہوا۔ وہ چیختا چلاتا ہوا نیچے تاریکی میں جا گرا۔ مگر اس بار کی میری حرکت چھپی نہ رہ سکی۔ گپھاہ کی داہنی جانب نیچے سرکنے والے دو مشعل بردار دشمنوں کو فوراً احساس ہوا کہ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا بلکہ دال میں کچھ کالا تھا۔ وہ ان دشوار گزار راستوں کے عادی تھے اور پُر پیچ گزرگاہوں سے آگاہی بھی رکھتے تھے۔ انہیں جیسے ہی میری سمت کا اندازہ ہوا، انہوں نے گپھاہ کی جانب پیش قدمی شروع کر دی۔ میں اب محتاط ہو گیا تھا اور ان سے دوسرے طریقے سے نمٹنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے فوراً پستول نکال کر اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ لیا اور گپھاہ کے دائیں سمت والی پتھریلی دیوار کی آڑ سے جا لگا۔ پھر ذرا سر ابھار کر دیکھا تو یکدم میں نے اپنا سر اندر کر لیا۔ میں نے ایک دشمن کو اپنی مشعل گپھاہ کی طرف پھینکتے دیکھا تھا۔ پہلے تو میں اس کی اس حرکت کا مطلب نہیں جان سکا۔ مشعل جب گپھاہ کے عین سرے پر گری اور پوری گپھاہ اندر تک روشنی میں نہا گئی تو میں اس کی چالاکی بھانپ کر سن ہو گیا۔ یقیناً ان کی نگاہوں میں ڈھلوانی گپھاہ آ چکی تھی۔ میں نے مشعل کی روشنی میں مڑ کر نگینہ کی طرف دیکھا۔ وہ ایک کونے میں سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ میں نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں خاموش پڑے رہنے کا اشارہ کیا اور پھر پستول پکڑے دم سادھے دیوار کی آڑ سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ دفعتہً ماؤزر چلنے کی گرج دار آواز اُبھری۔ میں بری طرح دہل کر رہ گیا۔ گولیوں کے شیل گپھاہ کی سامنے والی دیوار سے ٹکرا کر اِدھر اُدھر گرے۔ نگینہ اضطراری انداز میں چلائی۔

اچانک سناٹا چھا گیا۔ میرا دل جیسے یکبارگی کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ پھر معاً ہی ایک پُرغیظ، جوش بھری آواز میری ٹھٹکی ہوئی سماعتوں سے ٹکرائی۔

”وہ دونوں اس گپھاہ میں موجود ہیں ....تم دوسری سمت سے آگے بڑھو۔“ ایک دشمن نے اپنے دوسرے ساتھی سے کہا تھا۔

میری رگوں میں خون کی گردش تیز تر ہو گئی۔ وہ دونوں اطراف سے اب گپھاہ کے اندر داخل ہونے کا منصوبہ بنائے ہوئے تھے۔ ممکن تھا کہ وہ اس طرف پیش قدمی بھی شروع کر چکے ہوں۔ یہ سوچتے ہی میں پہلے سے زیادہ چوکنا ہو گیا۔ ایک دشمن کی پھینکی ہوئی مشعل گپھاہ کے سرے پر گری تھی اور محدود ماحول کو روشن کئے ہوئے تھی۔ اب میں دیوار کی آڑ سے سر ابھار کر دشمنوں کی حرکات و سکنات کو بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کیونکہ اس طرح گپھاہ میں ہونے والی روشنی کی وجہ سے میں تو انہیں دیکھنے سے قاصر تھا جبکہ وہ میری ذرا سی بھی جھلک واضح طور پر دیکھ سکتے تھے۔ میں بری طرح محبوس ہو کر رہ گیا تھا۔ ایکا ایکی مجھے یوں لگا جیسے یہ گپھاہ ہمارے لئے چوہے دان بن گئی ہو۔ میں نے جلدی سے نگینہ کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر میرے قریب آ گئی۔ مجھ سے چمٹ گئی۔ خطرے کو محسوس کرتے ہی اس کا نرم و نازک جسم خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپنے لگا تھا۔ میں نے اسے حوصلہ دیا اور اپنے عقب میں کر لیا۔ میں گپھاہ کے سرے پر رکھی جلتی ہوئی مشعل کو بھی اٹھا کر نہیں پھینک سکتا تھا۔ اس طرح مجھے کھلے حصے کی طرف آنا پڑتا اور کوئی بعید نہیں، دشمن نے اسے اپنا ٹارگٹ بنا رکھا ہو۔ بہرطور ....اب میں گپھاہ کے ایک سرے پر کھڑا تھا اور دوسرے سرے پر بھی نظریں جما رکھی تھیں۔ اب مجھے دشمن کی طرف سے یہ خطرہ تھا کہ اگر وہ بیک وقت گپھاہ کے دونوں سروں پر ابھرے تو صورت حال ہمارے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ پھر بھی میں اپنے طور پر پوری طرح محتاط اور مستعد کھڑا تھا۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا۔ پھر اچانک مجھے سامنے والے سرے پر کسی کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے سانس روک لی۔ ایسی ہی آہٹ مجھے اپنے ساتھ والی آڑ سے بھی سنائی دی۔ میرا دم خشک ہونے لگا۔ دونوں دشمن بہت مکاری اور چالاکی سے ہمیں گھیر کر گولیوں سے بھون ڈالنے کو بے تاب تھے۔ میں نے بھی ہونٹ بھینچ کر خود کو ان سے مقابلہ کرنے کے لئے پوری طرح سے تیار کر لیا تھا۔

میں نگینہ سمیت چند قدم ذرا پیچھے کو سرک گیا تھا۔ اب اگرچہ میں دونوں دشمنوں کے ٹارگٹ پر آ گیا تھا مگر اس طرح میں نے بیک وقت گپھاہ کے دونوں سروں پر اپنی نظریں بھی جما رکھی تھیں۔

پھر اچانک ہی مجھے سامنے والے سرے پر ماؤزر کی بھیانک نال نظر آئی۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور مہیب نال کا نشانہ لے کر ٹرائیگر دبا دیا.........گولی چلنے کا دھماکا اُبھرا اور میں نے ماؤزر کو تاریکی میں اُڑتے دیکھا۔

ٹھیک اسی وقت میرے ساتھ والی آڑ سے دشمن کا دوسرا مسلح ساتھی درانہ وار آگے بڑھا۔ نگینہ کی خوف سے چیخ نکل گئی۔ وہ جوشِ غیظ میں آ کر میرے سامنے آ گیا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر گولی چلاتا، میں نے ٹرائیگر دبا دیا۔ گولی اس کے سینے میں پیوست ہو گئی اور وہ مکروہ چیخ کے ساتھ وادی کی تاریک گہرائیوں میں گرتا چلا گیا۔ دوسرا دشمن نہتا تھا۔ میں جلدی سے دوسرے سرے کی طرف بڑھا اور ذرا اُبھر کر دوسرے دشمن کو دیکھنا چاہا۔ اچانک میرے پستول والے ہاتھ پر زور سے ایک پتھر لگا۔ مارے تکلیف کے میرے حلق سے کراہ خارج ہو گئی اور پستول نیچے کھائی میں جا گرا۔ پتھر یقیناً گھات میں بیٹھے ہوئے میرے دشمن نے ہی اچھالا تھا۔ اس نے بھی مجھے نہتا کر دیا تھا۔ میں نے اپنے میگارڈ کو نکالنے کی کوشش کی مگر اس سے پہلے ہی میرا دشمن اچھل کر میرے سامنے آ گیا اور مجھے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ وہ مجھے پھاڑ کھانے والی نظروں سے گھورے جا رہا تھا اور میں اسے جارحانہ نظروں کے حصار میں لئے ہوئے تھا۔ وہ دانت کچکچا رہا تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ مجھ پر جھپٹا۔ میں نے فوراً جھکائی دی۔ وہ اپنی جھونک میں آگے نکل گیا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر پھرتی سے اٹھا کر گپھاہ کی پتھریلی زمین پر پٹخ دیا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی چیخ خاصی بلند تھی۔ وہ وحشی انسان تھا۔ ضرور طاقت رکھتا تھا۔ مگر اس کا استعمال اسے نہیں آتا تھا۔ لہٰذا وہ میری چال سمجھے بغیر ایک بار پھر غراتا ہوا میری طرف لپکا۔ گپھاہ کا یہ حصہ اتنا زیادہ کشادہ نہ تھا کہ میں پینترے بدلتا۔ مختصر حصے میں رہتے ہوئے ہی مجھے اس وحشی انسان پر قابو پانا تھا۔ یہ کبڑے عاروب کے مقربین خاص میں سے ایک تھا۔ مگر لگتا تھا کہ یہ لوگ صرف اسلحہ ہی چلانا جانتے تھے۔ دوبدو کبھی کسی کے ساتھ پنجہ آزمائی نہ کی تھی۔ یہی سبب تھا کہ ایک بار مار کھانے کے باوجود دوبارہ اندھا دھند میری طرف لپکا تھا۔ اس بار میں نے فیصلہ کن قدم اٹھانے کا ارادہ کیا۔ پھر جیسے ہی وہ میرے قریب آیا، میں اس سے بھڑ گیا اور سر کی زوردار ضرب اس کی ناک پر رسید کر دی اور ساتھ ہی دائیں ٹانگ کا گھٹنا اس کے پیٹ پر رسید کر دیا۔ وہ اوغ کی غراہٹ سے مشابہہ آواز کے ساتھ رکوع کے بل جھکا۔ اور میں نے وہی گھٹنا دوبارہ اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔ پھر اس کی گردن اپنے بازوؤں کے شکنجے میں جکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ کڑاکے کی آواز اُبھری اور اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ جوں ہی اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے، میں نے بھی اس کی گردن چھوڑ دی۔ وہ دھب کی آواز سے گرا۔

میں جلدی سے گپھاہ کے سرے پر آیا اور بلندی کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ مشعلوں کی روشنیاں ہنوز نظر آ رہی تھیں۔ پھر مجھے تشویش نے آن گھیرا۔ وہ شاید اپنے ان چاروں ساتھیوں کے منتظر تھے جو میرے ہاتھوں جہنم رسید ہو چکے تھے۔ اب گپھاہ میں ہمارا زیادہ دیر موجود رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ چنانچہ میں نے مشعل اٹھا کر نیچے گہرائی میں جھانکا۔ گپھاہ کے نیچے کی ڈھلان خاصی سپاٹ تھی۔ میں نے نگینہ کو لیا اور ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر دوبارہ پہلے کی طرح ہم دونوں دھیرے دھیرے نیچے گہرائی میں سرکنے لگے۔ میں جانتا تھا کہ بلندی پر موجود کبڑے عاروب کے مشتعل پیروکار جب اپنے چاروں ساتھیوں کی واپسی سے مایوس ہو جائیں گے تو ضرور ان میں کوئی نیچے پیش قدمی کرے گا۔ بلکہ کوئی بعید نہ تھا کہ وہ سارے ہی نیچے کو آنے لگتے۔

میں نے جلتی ہوئی مشعل نیچے پھینک دی۔ پھر اسے بہ غور نیچے لڑھکتے دیکھتا رہا۔ وہ محض ستر اسی فٹ کی گہرائی کے بعد کھائی کی پتھریلی ناہموار زمین سے ٹکرائی تو مجھے کھائی کی کم گہرائی کا اندازہ ہوا۔ نیچے خودرو جھاڑیوں کی خاصی بہتات تھی۔ جلتی ہوئی مشعل سے جھاڑیوں نے آگ پکڑ لی۔ اب کھائی کا اندرونی حصہ خاصا منور ہو گیا تھا۔ میں نے اور نگینہ نے اب تیزی سے نیچے سرکنا شروع کر دیا۔ خاصی دیر بعد ہم کھائی کی ناہموار پتھریلی زمین تک پہنچ گئے۔ ہم دونوں ہی ہانپ رہے تھے۔

میں نے مشعل اٹھائی اور گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔ کھائی خاصی طویل، کسی گہری نہر کی مانند آگے سے بل کھاتی جا رہی تھی۔ میں نے نگینہ کا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھ گیا۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے تک کبھی چلنے اور کبھی ستانے کے بعد بالآخر مجھے ایک دراڑ سی نظر آ گئی۔ یہ ایک ''آدم گزار'' دراڑ تھی۔ خاصی چوڑی تھی۔ ایسی دراڑیں عموماً زلزلوں یا جغرافیائی فطری تغیر کا نتیجہ ہوتی ہیں جس سے از خود تنگ و تاریک گزرگاہیں بن جایا کرتی تھیں۔

یہ بھی ایک پہاڑی علاقہ تھا جس کا بیشتر حصہ برف سے ڈھکا رہتا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ یہ دراڑ ہمیں کہاں پہنچاتی ہے؟......... ایک خیال یہ بھی آتا تھا کہ دراڑ آگے سے بند بھی ہو سکتی تھی۔

اچانک نگینہ نے ہراساں آواز میں کہا۔ ''نادر! وہ......... وہ دیکھو، وہ لوگ نیچے آ رہے ہیں۔'' اس کا اشارہ بلندی کی طرف تھا۔ میں نے اشارے کی سمت سر اٹھا کر دیکھا اور بری طرح ٹھٹکا۔ بلندی پر موجود مشعل برداروں کا پورا جلوس نیچے کھائی میں اتر رہا تھا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، نگینہ کا ہاتھ پکڑا اور دراڑ کی طرف بڑھ گیا۔

''یہ تو قبر کی طرح تاریک ہے نادر!......... اس میں کیسے داخل ہوں گے ہم؟'' نگینہ نے میرے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے گویا میرا ارادہ بھانپ کر کہا۔

''نگینہ! اس وقت یہی قبر ہمیں پناہ دے سکتی ہے۔ ورنہ یہ ہمارا برا حشر کر کے رکھ دیں گے۔ آؤ چلو۔'' میں نے کہا اور ہم دونوں دراڑ میں داخل ہو گئے۔ ذرا دور تک تو دراڑ سیدھی رہی، مگر پھر وہ ترچھی ہو گئی۔ بلکہ کہیں کہیں سے اس قدر تنگ ہو گئی کہ بہ مشکل میں اور نگینہ ایک ایک کر کے گزر پاتے۔ لگ بھگ کوئی نصف گھنٹے بعد ہم دوسری جانب اُبھرے اور میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔

سامنے بڑا دلفریب منظر تھا۔ وسیع و عریض رقبے پر پھیلی ہوئی پیالہ نما وادی تھی جو برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ آسمان صاف ہو چکا تھا جس پر ٹکے مکمل چاند کی روشنی نے پوری برف پوش وادی کو منور کر رکھا تھا۔ ہر سُو طلسماتی چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ ہم وادی کے اندر موجود تھے۔ نگینہ بری طرح تھک کر چور ہو رہی تھی۔ خود مجھے بھی کافی تھکن محسوس ہونے لگی تھی۔

ہمیں اپنی منزل کا کچھ علم نہ تھا۔ بس ایک دُھن سر پر سوار تھی کہ کبڑے عاروب کے خون آشام

ودکاروں کی پہنچ سے جس قدر ممکن ہو سکے، دور نکل جائیں۔

''نگینہ! پلیز، تھوڑی اور ہمت کر لو۔ ہمیں اس وادی سے نکلنا ہوگا۔'' میں نے نگینہ کے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیرتے ہوئے محبت پاش لہجے میں کہا۔

''نادر! تم نے میری خاطر بہت صعوبتیں اٹھائی ہیں۔ لیکن پلیز! مجھے یہ تو بتا دو کہ آخر یہ سارا کیا بھید ہے؟'' اس نے بڑے رسان سے ملتجیانہ لہجے میں کہا تو میں نے ایک گہری ہمکاری بھر کر اسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ سحر زدہ سی یہ ساری کہانی سنتی رہی، پھر ایکا ایکی اس کے چہرے سے ساری تکان اور کٹھن مسافتوں کی صعوبتیں غائب ہو گئیں اور اس کی جگہ فطری شوخی اور زندہ دلی عود کر آئی۔

''ناقابل یقین......... حیرت انگیز.........'' وہ تحیر خیز لہجے میں بولی۔ ''نادر! تم نے واقعی محبت کی لاج رکھ لی۔ اگر......... اگر تم آج میری خاطر یہ سب نہ کرتے تو میں......... میں شاید ہمیشہ کے لئے اندھیروں میں گم ہو جاتی۔ آہ، نادر!......... میں کس قدر خوش قسمت ہوں۔ میں......... میں دنیا کی خوش نصیب ترین لڑکی ہوں کہ مجھے تم جیسے سچی محبت کرنے والے شخص کا ساتھ میسر آیا۔'' وہ جیسے عالم سرشاری میں یہ کہتے ہوئے میرے سینے سے لپٹ گئی۔

میں نے بھی جیسے اسے وفورِ جذبات سے بھینچ لیا۔

''نادر! آئی لو یو......... آئی لو یو ٹو مچ۔'' وہ جیسے میرے اندر جذب ہو کر عالم بے خودی میں بولی۔

''آئی لو یو ٹو نگینہ!......... آئی لو یو ٹو۔'' میں اس کے ریشمی گھنیرے بالوں پر اپنے لب ترساں رگڑتے ہوئے دل و جان کی گہرائی سے بولا۔ گہرائی سے نکلتے ہوئے الفاظ گہرائی میں ہی اترے تھے۔ اور یہی سبب تھا کہ ہم دونوں خاصی دیر تک وہیں پتھریلی زمین پر باہم پیوست کافی دیر تک بیٹھے رہے۔ نگینہ کی فطری بے باکی پوری شد و مد کے ساتھ لوٹ آئی تھی۔ اس نے بے اختیار میرے ہونٹوں پر بوسہ دے ڈالا۔ میں اس کی یہ بات دیکھ کر ہولے سے مسکرا دیا، پھر دھیرے سے بولا۔

''چلو اُٹھو!......... آگے بڑھتے ہیں۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے مڑ کر دراڑ کی طرف نظر ڈالی۔ کچھ ایسا لگتا تھا جیسے ہم اس بار دشمن کو جُل دینے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ لیکن باوجود اس کے میں اس جگہ سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ مجھے امید تھی کہ حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے اس برف زار میں کوئی نہ کوئی آبادی مل ہی جائے گی اور میں وہاں سے کسی راستے سوات یا پشاور کی طرف نکلنے کی کوشش کروں گا۔ اگرچہ میرے پاس اب برائے نام ہی رقم رہ گئی تھی لیکن یہ بعد کا تھا۔ کیونکہ اس کے بارے میں بھی میں نے کچھ سوچ رکھا تھا۔ خاصی دیر ستانے کے بعد ہماری توانائی لوٹ آئی تھی اور ہم دونوں تیز تیز قدموں سے ذرا سنبھل کر آگے بڑھے چلے جا رہے تھے۔

حدِ نگاہ تک برف پھیلی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں روئیدگی اور خودرو جھاڑیاں بھی تھیں۔ سردی بھی کافی پڑ رہی تھی مگر اس میں کاٹ نہیں تھی، ایک خوشگواری تھی۔ میں اور نگینہ اسی طرح چلتے رہے۔ تنگ گھاٹیاں، گہری کھائیاں، چٹانی دروں اور دشوار گزار راستوں اور گزرگاہوں سے ہوتے ہوئے اس پیالہ نما وادی کو بھی پار کر گئے۔ اب ہمارے اطراف میں سر بفلک برف پوش پہاڑیاں تھیں۔ دشمنوں کی حدود سے نکل آنے کی تسلی تھی مگر مجھے اب ایک نئی تشویش نے آن گھیرا تھا۔ ہمیں جلد از جلد اس ویران اور سرد جہنم سے نکلنا تھا جہاں نہ خوراک کا آسرا نظر آ رہا تھا اور نہ ہی پانی کا کوئی وسیلہ۔ کیونکہ اس برفیلے موسم میں چشمے اور جھرنے بھی برف بن جاتے تھے۔

کافی دور نکل آنے کے بعد ہم پھر ایک جگہ پر بیٹھ گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نگینہ کو بری طرح نیند نے ستایا

ہوا تھا۔ رات بھی اپنے آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ چاند بھی کہیں جھک چکا تھا۔ آسمان پر البتہ چمکتے تاروں کی فوج ظفر موج نظر آتی تھی جس سے کسی حد تک اردگرد کا منظر واضح ہوتا تھا۔ میں ایک گھنی خودرو جھاڑیوں کا سلسلہ دیکھ کر وہاں رک گیا۔

یہ پہاڑی کے ساتھ والا ایک مختصر مسطح قطعہ اراضی تھا جہاں خودرو جھاڑیوں اور جنگلی پودوں کی بہتات تھی۔ میں پہاڑی سے پشت ٹکا کر بیٹھ گیا تھا اور نگینہ کا سر اپنی گود میں رکھ کر اسے سلا دیا تھا۔ ہر سُو ٹھٹھرا دینے والی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اطراف کا منظر پراسراری ویرانی اور سناٹے میں بہت ہولناک نظر آ رہا تھا۔ نگینہ میری گود میں اپنا سر رکھتے ہی سو گئی تھی۔ میں نے بھی اپنا سر چٹانی دیوار سے ٹکا کر ذرا دیر کو آنکھیں موند لی تھیں اور پھر اسی طرح پڑے پڑے مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ کب میری آنکھ لگ گئی۔

❄❄❄

اچانک میری آنکھ ایک عجیب سی خرخراتی آواز پر کھلی اور نظریں ایک بھاری بارکم یاک (YALK) پر پڑیں جو ہمارے قریب ہی جھاڑیوں پر اپنا تھوتھنا دیئے بڑے مزے سے چر رہا تھا۔ میں اسی طرح اپنی جگہ پر بے حس و حرکت پڑا رہا۔ صبح ہو چکی تھی۔ بلکہ خاصا دن نکل آیا تھا۔ تھکن اور بے آرامی کی وجہ سے شاید ہم کافی دیر تک سوئے رہے تھے۔ نگینہ بھی ابھی اسی طرح میرے زانو پر سر رکھے گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ دھوپ چاروں طرف اس برف زار میں پھیل چکی تھی۔

اپنے قریب ہی اس بھاری بھر کم یاک کو بے فکری سے چرتا ہوا دیکھ کر میرے ذہنِ طباع میں اچانک ایک خیال اُبھرا تھا۔ اس دشوار گزار وادی میں یہ ہمارے لئے بہترین ''سواری'' کا کام کر سکتا تھا۔ چنانچہ یہ سوچ کر میں نے بہت آہستگی سے نگینہ کا سر اپنے زانو سے اٹھا کر زمین پر ٹکایا، پھر ایک ہاتھ سے جھاڑیوں اور جنگلی پودوں کا گچھا توڑ کر اس کا موٹھ بنایا اور یاک کی طرف کر کے اسے دھیرے سے پچکارا۔

میرے پچکارنے کی آواز سے وہ تھوڑا سا بدکا اور پھر ڈر کر ذرا دُور کھسک گیا۔ مجھے مایوسی ہوئی مگر پھر اسے ذرا دُور ٹھٹک کر دوبارہ کھڑے ہوئے دیکھ کر میرے اندر پھر اُمید جاگی۔ وہ شاید ابھی شکم سیر نہیں ہوا تھا۔ وہ گہرے سرمئی رنگ کا تھا اور اس کا بھاری بھر کم جسم گھنے لانبے بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ پاؤں (کھر) اس کے بہت پتلے پتلے تھے۔ وہ اپنی موٹی موٹی اُبھرواں ڈیلوں والی آنکھوں سے میری جانب یک ٹک تکے جا رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے ذرا حرکت کی اور پھر اپنے موٹے موٹے نتھنوں سے خرخرلی آوازیں نکالتا ہوا دھیرے دھیرے میری جانب بڑھنے لگا۔ میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ میرے قریب آ کر اس نے اپنا خرخراتا ہوا تھوتھنا بڑھا دیا اور میرے ہاتھ میں پکڑی موٹھ پر منہ مارنے لگا۔ میں نے بھی ذرا جسارت کی اور اس کے تھوتھنے کو پیار سے سہلانے لگا اور کھڑا ہو گیا اور اسے جنگلی پتے اور جھاڑیاں توڑ توڑ کر کھلاتا رہا۔ اب میں اس کے بالوں سے ڈھکی ہوئی پشت کو بھی سہلانے لگا۔ وہ میری طرف سے اب بالکل ہی بے فکر ہو کر چرنے لگا۔ میں نے ہولے سے نگینہ کو آواز دی۔ وہ بھی اس کھڑ پٹر سے جاگ سی گئی۔ پھر مجھ پر نگاہ پڑی تو میں نے اسے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد میں نے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ ڈرتے ڈرتے میرے قریب آئی۔ میں نے اسے سرگوشی میں اپنا مقصد سمجھایا، پھر اسے اٹھا کر بھاری بھر کم یاک کی پشت پر لاد دیا اور خود بھی اچھل کر اس پر سوار ہو گیا۔ وہ یاک تھوڑا سا کسمسایا تھا پھر میں نے اسے گردن پر ہلکی سی تھپکی دی تو وہ از خود ایک طرف چل دیا۔

ماموں حیدر گل (مرحوم) کے ساتھ میں بارہا جنگل اور ایسے علاقوں میں شکار وغیرہ کے لئے جایا کرتا تھا اس لئے مجھے جنگلی جانوروں کی فطرت سے واقفیت تھی اور مجھے انہیں ''سدھارنا'' بھی آتا تھا۔ اس لئے مجھے یاک کو سدھارنے میں چنداں دیر نہیں لگی۔ وہ بڑے آرام سے ہمیں اپنی پشت پر بٹھائے ایک راستے پر چلا جا رہا تھا۔

''نادر! مجھے پیاس لگ رہی ہے۔'' معاً نگینہ نے مجھ سے کہا۔ اسے یقیناً بھوک بھی لگی ہوگی۔ لیکن پیاس کی شدت نے شاید اسے زیادہ پریشان کر دیا تھا۔ میں نے ملائمت سے کہا۔

''ذرا برداشت کر لو.........شاید کوئی چشمہ یا ندی دکھائی دے جائے۔''

''نادر! مجھے تو اس جانور سے بھی ڈر لگ رہا ہے۔ اگر اس نے بدک کر ہمیں گرا دیا تو؟'' نگینہ نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ میں نے مسکرا کر اسے تسلی دی۔

''حوصلہ رکھو۔ ایسا نہیں ہوگا۔ یہ بہت امن پسند اور انسان دوست جانور ہے۔''

وہ میری تشفی پر چپ ہو گئی۔ میں یاک کی گردن کے لمبے لمبے بال پکڑے ہوئے اسے اپنی مرضی سے ایک راستے پر لئے جا رہا تھا۔ عموماً یہ جانور خاصی بلندی پر ہوتے ہیں۔ لیکن شاید بھوک اور رات بھر ہونے والی برف باری، خوراک کی کمیابی کا باعث بنی تھی جس نے اسے نیچے ترائیوں میں آنے پر مجبور کر ڈالا تھا۔

ہمارا یاک پر سفر جاری تھا۔ ساتھ ہی ساتھ میں اپنے اطراف میں بھی نظریں دوڑائے جا رہا تھا کہ کوئی ندی نظر آ جائے۔ یا پھر کسی آبادی کے آثار ہی دکھائی دے جائیں۔ مگر ہنوز کوئی امید بر نہ آئی۔ حتیٰ کہ ہمیں یاک پر سفر کرتے کرتے ایک گھنٹے سے بھی زیادہ وقت بیت گیا۔ لیکن ان برف زاروں میں مجھے کسی بھی آبادی کے آثار تک نظر نہ آئے۔ میں ایک اندازے کے تحت یاک کو ہنکاتے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ پھر مزید ایک گھنٹہ اور بیت گیا۔ اب تو ہمارے جسم بھی یاک کی پشت پر بیٹھے بیٹھے شدید اکڑن کا شکار ہونے لگے تھے۔ بیزاری، کوفت اور مایوسی نے ہم پر شدت کے ساتھ حملہ کیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ہم کب تک یونہی مرتے ویرانوں میں دربدر پھرتے رہیں گے۔ یہ سرد جہنم تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ سورج ہمارے سروں پر چمک رہا تھا اور پہاڑوں سے برف رفتہ رفتہ پگھلنے لگی تھی۔ پانی کا مسئلہ حل ہوتا نظر آیا تو میں نے یاک کو روک دیا۔

ایک جانب بہتے جھرنے کا جلترنگ سا شور سنائی دیا۔ میں اور نگینہ یاک کی پشت سے اتر گئے۔ اچانک یاک نے زور زور سے خرخرانا شروع کر دیا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، وہ بھی بری طرح بے چین ہو رہا تھا۔ میرا دل ایک لرزہ خیز خیال سے کانپ اٹھا۔ پھر دفعتہً مجھے آس پاس کئی خونخوار غراہٹوں کی آواز سنائی دی۔ خوفناک غراہٹوں کی آواز قریب سے ہی سنائی دی تھی۔ اور شاید یاک کی بے چینی کی وجہ بھی یہی تھی۔ میں نے مذکورہ سمت دیکھا، آوازیں میرے دائیں جانب سے آتی محسوس ہوئی تھیں۔ مذکورہ سمت ٹنڈ منڈ جھاڑیوں کی اوٹ سے مجھے دو قد آور بھیڑیئے نظر آئے، جو اپنے خوفناک جبڑے کھولے ہماری طرف دیکھتے ہوئے غرا رہے تھے۔ ان کے بڑے بڑے دونو کیلے شکاری دانتوں کی جھلک صاف نمایاں تھی۔ وہ یوں چوکنا ہوئے تھے جیسے کسی پل بھی ہم پر حملہ آور ہونے والے ہوں۔ نگینہ کے حلق سے متوحش چیخ سی خارج ہو گئی۔ میں نے نگینہ کو دھیمی سرگوشی میں خاموش رہنے کا کہا۔ میری شکاری حسیات یکدم بیدار ہو گئی تھیں۔ یاک اپنی جگہ اسی مقام پر کھڑا کا کھڑا رہ گیا تھا۔ میں اور نگینہ بدستور اس کی پشت پر سوار تھے۔ ان دونوں بھیڑیوں کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا تھا کہ یہ دونوں نر، مادہ تھے اور غالباً ہماری ''دخل در نامعقولات'' نے انہیں ''ڈسٹرب'' کر ڈالا تھا۔ میں نے یاک کی پشت پر بیٹھے بیٹھے ہولے سے ہاتھ پھیرا اور اس کا راستہ بدل کر دوسری سمت ہو لیا۔ میں نے اب ان دونوں بھیڑیوں کی طرف سے دانستہ نظریں ہٹا لی تھیں۔ تاہم میری سماعتیں ان کی غراہٹوں پر لگی ہوئی تھیں جو اب ہمیں سمت بدل کر جاتا دیکھ کر معدوم ہونے لگی تھیں۔

جب خاصی دور نکل آئے تو نگینہ نے بے اختیار جیسے اپنے سینے میں اٹکی ہوئی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''شکر ہے.........میں تو ڈر ہی گئی تھی۔''

''ہاں.........یہ بات ڈرنے کی تھی مگر خوف زدہ ہونے کی نہیں۔'' میں نے کہا۔

''اچھا، اب یہ عجیب وغریب اور فلسفیانہ گفتگو چھوڑو اور آگے کی سوچو.........آخر کدھر جا رہے ہیں ہم؟'' وہ بولی تو میں نے اپنے چہار اطراف نظریں دوڑائیں۔ مجھے برف زار کے سوا کچھ نظر نہ آیا تاہم میں نے نگینہ کو تسلی دینے کی غرض سے کہا۔

''کہیں نہ کہیں آبادی نظر آ ہی جائے گی۔ وہاں کسی سے چترال کا راستہ پوچھ کر آگے نکل جائیں گے۔''

وہ خاموش ہو گئی۔ یاک اپنی مستانی چال سے چلا جا رہا تھا۔ ہم نے ایک درے کو پار کیا تو ''اورے، رے.........رے'' کی آواز گونجی۔ یہ کسی جانور کو ''ہشکارا'' دینے کی آواز دی۔ یہی سبب تھا کہ یاک چلتے چلتے رک گیا۔ میں نے ہشکارے والی آواز کی سمت دیکھا، وہ ایک نوعمر لڑکا تھا۔ اس نے سمور پہن رکھا تھا۔ یاک نے اپنے حلق سے خرخر کی آواز نکالی اور نوعمر لڑکے کی طرف دوڑ پڑا۔ لڑکے کے قریب پہنچ کر یاک رک گیا۔ لڑکے کی رنگت سرخ وسپید تھی اور وہ حیران حیران اور اپنی موٹی کالی آنکھوں سے ہماری طرف تکے جا رہا تھا۔ میں یاک کی پشت سے اُترا اور پھر اس لڑکے کی طرف بڑھا۔ لڑکے کے چہرے پر اب حیرانی کی جگہ غصے نے لے لی تھی۔ وہ نگینہ کی طرف دیکھ کر تیز لہجے میں بولا۔

''اُترو نیچے.........اُترو میرے پولترو کی کمر سے۔''

میں سمجھ گیا کہ اس کا یہ ''پولترو'' یاک پالتو تھا۔ میں نے نگینہ کو نیچے اترنے کا کہا۔ وہ خاموشی سے نیچے اتر گئی۔ لڑکا آگے بڑھ کر اپنے ''پولترو'' کے بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگا۔ میں نے لڑکے کے ذرا قریب ہو کر پیار سے مسکراتے ہوئے پہلے معذرت کی، پھر پوچھا۔

''تمہارا یہ پولترو بہت اچھا ہے۔ بالکل تمہاری طرح۔ جیسے اس نے ہماری مدد کی ہے، یقیناً تم بھی ہماری مدد کرو گے۔''

لڑکا اپنی اور اپنے ''پولترو'' کی تعریف پر خاموش ہو گیا اور بولا۔ ''تم کون ہو؟''

''بیٹا! ہم مسافر ہیں۔ راستہ بھول کر ادھر نکل آئے ہیں۔ چترال جانا چاہتے ہیں۔ کیا تم ہماری مدد کر سکتے ہو؟'' میری بات پر وہ چند ثانیے کچھ سوچتا رہنے کے بعد بولا۔

''آؤ میرے ساتھ۔''

میں اور نگینہ اس کے ساتھ چل پڑے۔ وہ تو خود اپنے ''پولترو'' پر سوار ہو گیا اور ہم دونوں پیدل اس کے عقب میں چل پڑے۔ جانے وہ ہمیں کہاں لے جا رہا تھا؟ لیکن ذرا ہی دیر بعد وہ ہمیں ایک ڈھلانی آبادی میں لے آیا۔ یہاں گوپے اور مڑھیوں کی طرز کے مخروطی چھپر نما جھونپڑے بنے ہوئے تھے۔ وہاں عورتیں، بچے اور بوڑھے مرد دکھائی دیئے جنہوں نے فقط سمور پہن رکھے تھے۔

میرا خیال تھا کہ وہ پہلے ہمیں اپنے کسی جھونپڑے میں لے جائے گا اور ہماری خاطر مدارات کرے گا لیکن وہ ہمیں آبادی کے بیچوں بیچ سے نکال لے گیا.........آگے چند فرلانگ کے بعد خچر گاڑیاں کھڑی آئیں۔ لڑکے نے ایک بوڑھے خچربان کے پاس ہمیں پہنچایا۔ جو ایک خچر کی پشت پر ''کھرکھرا'' پھیر رہا تھا۔ لڑکے نے اس خچربان سے کچھ کہنے کی بجائے مجھ سے کہا۔ ''یہ تمہیں چترال جانے والی بسوں کے اڈے تک پہنچا دے گا۔'' یہ کہہ کر اس لڑکے نے ایک طرف کی راہ لی۔ لڑکا بڑا ہی خشک مزاج معلوم ہوتا تھا۔ بہرطور اس کی یہی مہربانی کیا کم تھی کہ وہ ہمیں یہاں تک تو لے آیا تھا۔ بوڑھا خچربان ہماری طرف

دیئے بغیر کھرکھرا پھیرنے میں مگن تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے پہلے سلام کیا۔ اس نے میرے سلام کا جواب تو نہ دیا البتہ اپنے خچر کی پشت پر کھرکھرا پھیرنا بند کر دیا اور میری طرف سپاٹ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''تم ہمیں چترال جانے والی بس تک پہنچا سکتے ہو؟'' میں نے کہا تو اس نے کوئی جواب دینے کی بجائے ایک طرف اشارہ کر دیا۔ میں نے میکانکی انداز میں اپنی گردن اشارے کی سمت موڑ دی تو مجھے ایک اور خچربان نظر آیا جو اپنے خچر کی لگام درست کرتے ہوئے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نگینہ کو لے کر اس کی طرف بڑھ گیا۔

''عجیب خشک مزاج لوگ ہیں یہاں کے۔'' نگینہ نے بڑبڑاتے ہوئے تبصرہ کیا۔

''ہاں.........لیکن میرا خیال ہے، ان کا مزاج ہی ایسا ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ خچربان مجھے ضرورت مند لگا۔ میں نے اس سے وہی سوال کیا تو وہ بولا۔ ''پانچ سو روپے لوں گا۔''

میرے پچاس ہزار روپوں میں سے تیس ہزار کے لگ بھگ ختم ہو چکے تھے۔ باقی پندرہ بیس ہزار کے قریب رقم بچی تھی جو میں نے کیلاش والی جھونپڑی سے روانہ ہوتے وقت اپنی شلوار کے نیفے میں اڑس لی تھی۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ خوش ہو گیا۔ میں اور نگینہ اس پر سوار ہو گئے۔ خچربان نے ایک چوبی تختے پر لٹکتے ہی لگامیں سنبھالیں اور اپنے خچر کو ٹخ ٹخا دیا۔ خچر گاڑی نے چوں چک، چوں چک کی آواز کے ساتھ رینگنا شروع کر دیا۔

''کتنی دور جانا پڑے گا بابا ہمیں؟'' میں نے خچربان سے پوچھا۔

''صرف پندرہ کلومیٹر۔'' وہ بولا تو میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''کیا کیلاش وادی کی طرف سے چلو گے؟''

میری بات پر اس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا وہاں تمہیں کوئی کام ہے؟''

''نہیں.........ایسے ہی میں نے پوچھ لیا تھا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ کیلاش وادی سے ہو کر نہ گزرے۔ کیونکہ مجھے وہاں اس مردود عامل عاروب کے خونخوار پیروکاروں سے مڈبھیڑ کا خدشہ تھا۔ تاہم خچربان بولا۔

''وہاں سے اگر ہم چلیں گے تو پورے پچاس کلومیٹر کا راستہ طے کرنا پڑے گا۔ میں اس وادی سے ہٹ کر چلوں گا تاکہ راستہ قریب پڑے۔''

''ٹھیک ہے.........ٹھیک ہے بابا! یہی بہتر رہے گا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ پھر چند ثانیے بعد اس سے یونہی پوچھا۔ ''ویسے بابا! یہ کون سا علاقہ ہے؟ کیا یہ کیلاش وادی کا علاقہ نہیں ہے؟''

''ہاں، یہ کیلاش وادی کا ہی علاقہ ہے۔ مگر نورستان کی سرحد کے قریب ہے اور کیلاش وادی سے دور۔''

''نورستان؟'' میں استفساریہ انداز میں بڑبڑایا۔

''ہاں.........نورستان۔ درحقیقت یہ افغانستان کا ایک سرحدی علاقہ ہے۔'' اس نے مختصراً بتایا۔

''اچھا.........'' میں نے ہولے سے کہا۔

سفر جاری رہا۔ تنگ برفیلی گھاٹیوں، گہری کھائیوں اور گنجلک دروں سے گزرتے، راستہ پاٹتے ہوئے، بقول اس بوڑھے کے ہم ریمبور کے قریب قریب سے ہوتے ہوئے اس اڈے تک جا پہنچے۔ یہاں مقامی لوگوں کی خاصی چہل پہل نظر آتی تھی۔ میں اور نگینہ نیچے اتر آئے۔

اس سپاٹ اور تختہ دار جیسی خچر گاڑی میں ہمارے جسم کی چولیں تک ہل کر رہ گئی تھیں۔ ہم نیچے اتر آئے۔ میں نے پانچ سو کا نوٹ خچربان کو دے کر اسے فارغ کیا۔ پھر سب سے پہلے ہم نے ایک چھپر ہوٹل میں

چوبی بینچوں پر بیٹھ کر تھوڑا بہت کھایا پیا، اس کے بعد ہم دونوں چترال جانے والی بس میں سوار ہو گئے۔

نصف گھنٹے بعد بس نے رینگنا شروع کر دیا۔ مگر روڈ پر پہنچتے ہی اس نے رفتار پکڑ لی۔ بظاہر کالا ناگ والا قصہ اس کے میرے ہاتھوں جہنم واصل ہونے کے بعد نمٹ چکا تھا۔ رہا کبیر تو وہ اس مردود عاروب کی خانقاہ میں میرے ہاتھوں زخمی ہو گیا تھا۔ مجھے اس کی پرواہ نہ تھی۔ وہ گرتا پڑتا واپس آ سکتا تھا۔ میرا خیال تو یہی تھا کہ اب اس کے دستِ راست کالا ناگ کی ہلاکت کے بعد اس کے سارے کس بل نکل جانے چاہئے تھے اور اب وہ (کبیر) میرا دوبارہ راستہ کھوٹا کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔

کیلاش وادی سے چترال تک چالیس کلومیٹر (پچیس میل) کی دوری کا یہ سفر ڈیڑھ دو گھنٹے میں طے ہوا تھا۔ حالانکہ آتے ہوئے ایک گھنٹہ لگا تھا۔

بہر طور چترال سے ہم ایک تیز رفتار، نان اسٹاپ لگژری مسافر کوچ میں سوار ہو گئے جو پشاور روانہ ہونے والی تھی۔ ہم چترال سے تقریباً دو بجے رختِ سفر ہو کر تقریباً چار بجے سے پہلے پشاور پہنچ گئے تھے۔ کیلاش اور چترال سے جاتے وقت نہ جانے کیوں ڈیڑھ گھنٹے کے فرق سے تاخیر ہوئی تھی۔ حالانکہ قدرے نشیبی سفر تھا۔

بہر طور یہاں سے دوبارہ کسی لگژری مسافر کوچ میں سفر کی نگینہ میں ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے بذریعہ ہوائی جہاز سفر کو ترجیح دیتے ہوئے ایک ایئر لائن کے قریبی بکنگ آفس سے اسلام آباد کی فلائٹ کا پتہ کیا۔ چھ بجے کی فلائٹ کی ساری سیٹیں بک تھیں۔ ساڑھے آٹھ بجے کی فلائٹ میں دو سیٹیں کنفرم ہوئیں۔ ابھی ہمارے پاس ڈھائی گھنٹے باقی تھے اور ایئرپورٹ زیادہ دور بھی نہ تھا۔ تھوڑا سستانا ضروری تھا۔ میں نے ایک ٹیکسی کو ہاتھ دے کر روکا اور جیسے ہی ہم اس میں سوار ہوئے، اچانک میرے کانوں سے پولیس سائرن کی سمع خراش آواز ٹکرائی۔ ہم اس وقت تک ٹیکسی میں سوار ہو چکے تھے اور ٹیکسی آگے بڑھ چکی تھی۔ تاہم پولیس سائرن کی آواز سے نہ صرف میں اور نگینہ بلکہ ٹیکسی ڈرائیور بھی چونک گیا تھا۔ میں نے مڑ کر اپنے عقب میں دیکھا تو ایک پولیس جیپ ہمارے تعاقب میں دوڑی چلی آ رہی تھی۔ میں بے چین اور مضطرب سا ہو گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے دانستہ رفتار ہلکی کر لی۔ پولیس جیپ ہمیں کراس کر کے ذرا آگے جا کر ہمارا راستہ روکے کھڑی ہو گئی تو ٹیکسی ڈرائیور نے بھی گھبرا کر جلدی سے بریک لگا دیئے۔ میرا دل جیسے کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا تھا۔

''نادر! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اب آگے میرا کام ہے۔ میں حالات کو سنبھال لوں گی۔'' نگینہ نے گہری متانت سے کہا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں گھبراہٹ یا پریشانی کا شائبہ تک نہ تھا بلکہ اس کی جگہ مجھے ایک جوش آمیز تمتماہٹ محسوس ہوئی تھی۔

ٹیکسی ڈرائیور البتہ پریشان ہو گیا تھا۔ پولیس جیپ سے چند پولیس والے بڑی پھرتی کے ساتھ نیچے اترے اور ہماری ٹیکسی کی طرف بڑھے۔ ان میں ایک اپنی وردی سے انسپکٹر ظاہر ہو رہا تھا۔ اس کے سینے پر آویزاں نیم پلیٹ پر عارف علی بنگش کے الفاظ کندہ تھے۔ اس نے ٹیکسی کے قریب پہنچ کر ہمیں نیچے اترنے کا کہا۔ میں اور نگینہ خاموشی کے ساتھ نیچے اتر آئے۔

انسپکٹر نے جیب سے پوسٹ کارڈ سائز کی دو تصاویر نکالیں اور ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ سموئے ہم سے نام پوچھے۔ ہم نے باری باری اپنے نام بتائے اور نگینہ نے اپنے باپ شاہ میر کا بھی نام بتایا۔ انسپکٹر نے میرے چہرے کی طرف تیز چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور پھر کرخت لہجے میں بولا۔

''نادر علی خان! تمہیں نگینہ کو اغواء کرنے کے جرم میں گرفتار کیا جاتا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے ساتھ کھڑے سپاہیوں کو حکم دیا۔ ''اسے ہتھکڑیاں پہنا دو۔''

''ٹھہریئے انسپکٹر صاحب!'' اچانک نگینہ نے درشت لہجے میں اس سے کہا۔ ''یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ مجھے کسی نے اغواء نہیں کیا۔ میں تو اپنی مرضی سے نادر کے ساتھ گھومنے کے لئے نکلی تھی۔''

اس کی بات پر انسپکٹر کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے تذبذب کے تاثرات اُبھرے مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ نگینہ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''بی بی! آپ کے والد شاہ میر نے نادر علی کے خلاف ایف آئی آر درج کروائی ہے۔ وہ خود بھی اس وقت یہاں ریسٹ ہاؤس میں مقیم ہیں۔ آپ کو تو ہمارے ساتھ تھانے چلنا ہی پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے......... ہم تیار ہیں۔ لیکن اگر نادر صاحب کو کسی نے ہتھکڑیاں لگانے کی کوشش کی تو میں ایک انچ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلوں گی۔'' نگینہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو انسپکٹر کی آنکھوں میں اُلجھن سی تیر گئی۔ پھر چند ثانیوں کی پُرسوچ خاموشی کے بعد وہ ایک گہری ہمکاری لے کر بولا۔

''ٹھیک ہے......... تم لوگوں کو ہماری جیپ پر سوار ہونا پڑے گا۔''

یوں چند سپاہی تو ٹیکسی میں سوار ہو گئے جبکہ تین مسلح سپاہیوں کے ساتھ مجھے اور نگینہ کو پولیس جیپ میں سوار کر دیا گیا۔

تھانے پہنچ کر ٹیکسی والے کو میں نے ہی کرایہ دے کر فارغ کیا۔ ہمیں ایک شاہانہ طرز کے آفس روم میں بٹھا دیا گیا۔ ذرا دیر بعد شاہ میر کو بھی ریسٹ ہاؤس میں مطلع کر کے وہاں بلا لیا گیا۔

شاہ میر اپنی بیٹی نگینہ کو بہ خیریت، زندہ سلامت پا کر بے تابانہ اس کی طرف بڑھا۔ ''نگی!......... نگی بیٹا! تت......... تم ٹھیک تو ہو نا؟''

نگینہ باپ کے گلے لگ کر ملی۔ میں نے کن انکھیوں سے نگینہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ صاف لگتا تھا وہ اپنے آنسو ضبط کئے ہوئے ہے۔

''گرفتار کر لو اس مردود کو انسپکٹر! اس نے میری بیٹی کو اغواء کرنے کا ناقابل معافی جرم کیا ہے۔ یہی نادر علی خان ہے۔'' بیٹی کو خود سے علیحدہ کرنے کے بعد شاہ میر نے مجھے غصیلی نظروں سے گھورتے ہوئے انسپکٹر عارف علی بنگش سے کہا تو نگینہ نے باپ کو سنجیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں پپا! نادر نے مجھے اغواء نہیں کیا۔ میں اپنی مرضی سے اس کے ساتھ گئی تھی۔''

بیٹی کی بات سن کر شاہ میر کا دماغ بھک سے اُڑ گیا اور وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے بیٹی کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''یہ......... یہ تم کیا کہہ رہی ہو بیٹی؟''

''میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں پپا!......... مجھے کسی نے اغواء نہیں کیا۔'' نگینہ نے بدستور سپاٹ متانت کے ساتھ اپنے باپ سے کہا۔

''انسپکٹر صاحب! آپ اب تک چپ کیوں ہیں؟ اس بدبخت نادر نے میری بیٹی کو ورغلایا ہے۔ آپ فوراً اسے گرفتار کر لیں۔'' شاہ میر نے دوبارہ انسپکٹر عارف علی بنگش سے کہا تو نگینہ نے چلّا کر اپنے باپ سے کہا۔

''پپا! اگر نادر کو گرفتار کیا گیا تو میں بھی اس کے بغیر یہاں سے نہیں ہلوں گی۔''

انسپکٹر عارف علی بنگش کے ہونٹوں پر بڑی دلچسپ سی مسکراہٹ اُبھری۔ گویا وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ معاملہ اغواء کا نہیں بلکہ دل کا تھا۔ لہٰذا وہ مسکرا کر شاہ میر سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''جناب! آپ ذرا تشریف رکھیں۔ اب یہ معاملہ اغواء کا نہیں رہا۔''

اس کی بات پر شاہ میر اپنے ہونٹ بھینچے میری طرف خوں ناک نظروں سے گھورتے ہوئے ایک کرسی سنبھالے براجمان ہو گیا۔ پھر اس کے بعد انسپکٹر عارف علی نے نگینہ کی طرف دیکھ کر تصدیق طلب لہجے میں پوچھا۔

''مس نگینہ!......... آر یو شیور کہ نادر علی نے تمہیں اغواء نہیں کیا ہے؟''

"بالکل انسپکٹر صاحب!" نگینہ نے بلاتردّد کہا۔ "ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ میرے پپا کو نادر علی سے جانے کیا پرخاش ہے، یہ ان کے خلاف سازشیں اور........"

"نگینہ!" میں نے جواب تک دانستہ خاموشی اختیار کئے ہوئے تھا، اچانک نگینہ کی بات کاٹ کر اس سے کہا۔ "پلیز نگینہ! میرا مشورہ تمہیں یہی ہے کہ تم ابھی اپنے پپا کے ساتھ چلی جاؤ۔"

نگینہ نے قدرے چونک کر میری طرف دیکھا، پھر جیسے میری بات کا مطلب سمجھ کر وہ چپ ہو رہی۔

انسپکٹر عارف علی بنگش ایک سمجھ دار اور فرض شناس پولیس آفیسر تھا۔ وہ ایک لمحے میں اصل معاملہ بلکہ "معاملہ دل" کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ وہ شاہ میر کو مخاطب کر کے مشورہ دینے والے انداز میں بولا۔

"شاہ میر صاحب! میں سردست اتنا کر سکتا ہوں کہ پنڈی پولیس انتظامیہ کو مطلع کر کے یہ معاملہ دوبارہ انہی کے سپرد کر دوں۔ ہمارا کام ختم ہوا۔ آپ لوگ وہیں مقیم ہیں۔"

اس کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "اور نادر میاں! مجھے امید ہے تم وہاں بھی قانون سے پورا تعاون کرو گے۔ کیونکہ وہاں تمہاری وجہ سے نقصِ امن کا مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ تم مزید کوئی غیر قانونی حرکت کر کے اپنے جرم کو زیادہ سنگین بنانے کی کوشش نہیں کرو گے۔ اسے تم نہ صرف میری نصیحت سمجھو بلکہ ایک نہایت مخلصانہ مشورہ بھی۔"

"تھینک یو انسپکٹر صاحب!........ آپ بے فکر رہیں۔ میں آپ کی بات کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"گڈ!"

شاہ میر جو کرسی پر بیٹھا بری طرح تلملا رہا تھا، بے چینی کے ساتھ پہلو بدلتے ہوئے انسپکٹر سے بولا۔

"آپ کمال کرتے ہیں۔ اس نے میری بیٹی کو ورغلایا اور آپ اسے گرفتار کرنے کی بجائے اپنے مخلصانہ مشورے سے نواز رہے ہیں؟"

انسپکٹر عارف علی بنگش نے سنجیدہ نظروں سے شاہ میر کو گھورا اور بولا۔ "شاہ میر صاحب! آپ نے اپنی بیٹی نگینہ کا بیان سن لیا ہے۔ میں آپ کو بھی یہی مشورہ دوں گا کہ آپ نے نادر کے خلاف جو بھی قانونی کارروائی کرنی ہے، وہ اپنے علاقے کے متعلقہ تھانے اور عدالت میں ہی کریں۔ یہی آپ کے لئے مناسب بھی ہوگا۔"

"ٹھیک ہے........ میں دیکھ لوں گا اسے بھی۔" اس کی بات پر شاہ میر نے میری طرف گھورتے ہوئے غضب ناک لہجے میں کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "چلو نگینہ بیٹی!"

"پپا! آپ جائیں۔ میں نادر کے ساتھ ابھی ساڑھے آٹھ بجے کی فلائٹ سے اسلام آباد پہنچ رہی ہوں۔ ہماری سیٹیں کنفرم ہو چکی ہیں۔"

"خوب بیٹا!........ تم نے اپنے باپ کے دشمن کے سامنے میری خوب عزت کی۔ لیکن بیٹا! میں بھی تمہارا باپ ہوں اور تم میری لختِ جگر۔ تم مجھے پھر بھی قبول ہو۔ میں تمہارا گھر پر انتظار کروں گا۔" جواباً شاہ میر نے اپنے لہجے میں پدرانہ رقت سموتے ہوئے کہا اور پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اور نگینہ نے انسپکٹر عارف علی بنگش کا شکریہ ادا کیا اور پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔

میں اور نگینہ تھانے کی عمارت سے باہر آ گئے۔ میں آج پہلی بار خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ آج میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ نگینہ بھی خود کو کافی فریش محسوس کر رہی تھی۔

مقررہ وقت پر ہم ایئرپورٹ پہنچے اور مطلوبہ فلائٹ کے ذریعے اسلام آباد پہنچ گئے۔ اس وقت رات کے دس بجے کا عمل تھا۔ میں اور نگینہ اسلام آباد ایئرپورٹ پر اُترے اور پھر وہاں سے ایک مسافر ویگن کے ذریعے

ے ہی پنڈی پہنچے، پولیس ہمارے استقبال کے لئے پہلے ہی سے موجود تھی۔ ان میں انسپکٹر اعجاز شمس کو دیکھ کر ری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ مجھے فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ نگینہ نے چلّا چلّا کر میری بے گناہی کا ن دیا مگر مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ شاہ میر نے اسے ٹیلی فون کے ذریعے اپنی بیٹی نگینہ کے بیان سے متعلق گاہ کرتے ہوئے بریف کر دیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ انسپکٹر اعجاز شمس نے بڑی مکاری کے ساتھ میری گرفتاری ی وجہ کو نگینہ کے اغواء سے نتھی نہیں کیا تھا بلکہ "نقصِ امن" کا جواز بنایا تھا۔ میں نے اس "نقصِ امن" لے اشارے سے ہی یہ اندازہ لگایا تھا کہ یقیناً شاہ میر نے ہی اس بنیاد پر زور دیتے ہوئے انسپکٹر اعجاز شمس ی یہ راہ سجھائی ہو گی۔ بہر طور میں نے نگینہ کو تسلی دی اور پھر پولیس جیپ میں سوار ہو گیا۔



مجھے ایک بار پھر سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا تھا۔

انسپکٹر اعجاز شمس سے میرا پہلے بھی سامنا ہو چکا تھا۔ وہ بہت کمینہ اور بغض رکھنے والا شخص تھا اور میرے لاف ہر قسم کے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرنے کی جستجو میں لگا رہتا تھا۔ اس نے اس سے پہلے مجھ پر کئی ملین جرائم عائد کئے تھے، جو بعد میں جھوٹے ثابت ہوئے تھے۔ مگر اس بار ایسا کوئی سنگین جرم اس کے ہاتھ ہ آیا تھا البتہ نقصِ امن کے سلسلے میں مجھے تھوڑی بہت تشویش تھی۔

میں نے نگینہ کے "اغواء" سے لے کر اب تک کے پیش آمدہ حالات پر باریک بینی سے غور کرنا شروع کیا ا کہ اپنا دفاع کر سکوں۔

نگینہ کو اغواء کرنے کی نیت سے میں نے پہلا قدم جو اٹھایا تھا، وہ یہ تھا کہ اس رات چوری چھپے شاہ میر کی وٹھی میں داخل ہوا تھا جہاں دو گارڈ متعین تھے۔ انہیں اس سے پہلے میں چابک دستی کے ساتھ بے ہوش کر کا تھا۔ وہاں میں نے کوئی ثبوت چھوڑا تھا اور نہ ہی مجھے مسلح گارڈز نے دیکھا تھا۔

رہی بات نگینہ کو زبردستی وہاں سے ٹیکسی میں نکال لے جانے کی، اس دوران انسپکٹر اعجاز شمس نے پولیس گاڑی میں میرا تعاقب کیا تھا اور اس سے ذرا ماراماری بھی ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انسپکٹر اعجاز شمس اس بات کو جواز بنا کر میرے خلاف کوئی قانونی کارروائی عمل میں لا سکتا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا، اس کے باوجود انسپکٹر اعجاز شمس میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا کیونکہ اب یہ معاملہ "میاں بیوی راضی........" والا بن چکا تھا۔ میں نے بس اہم مقصد کی خاطر اس خطرناک مہم کا آغاز کیا تھا اس کا انجام کامیابی پر ہی منتج ہوا تھا۔ دیکھنا اب یہ تھا کہ انسپکٹر اعجاز شمس جیسا بدطینت آدمی اس وقت میرے خلاف کس نوعیت کا جال بُن سکتا تھا۔ نگینہ کو یقیناً اس کے اپ شاہ میر کے ہاں روانہ کر دیا گیا ہو گا۔

ذرا دیر بعد مجھے انسپکٹر اعجاز شمس کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

وہ کرسی پر بیٹھا معاندانہ نظروں سے میری طرف گھورے جا رہا تھا۔ اس کے بعد وہ اٹھا اور میرے قریب آ کر دانت پیستے ہوئے بولا۔ "نادر! تم نے جس چالاکی اور عیاری سے نگینہ کو ورغلایا ہے، وہ قابلِ داد ہے اور یقیناً تم اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گے کہ اب قانون تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ لیکن نادر! یہ خوش فہمی اپنے ذہن سے نکال پھینکو۔"

وہ خاموش ہوا، پھر پلٹ کر چند قدم پیچھے مڑا اور دوبارہ میری طرف گھوما۔ "ہو سکتا ہے نگینہ کے اغواء والا معاملہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ لیکن میں تم پر غفورے کو پولیس کی حراست سے فرار کروانے کا جرم ثابت کر سکتا ہوں۔"

میں جواب تک انسپکٹر اعجاز شمس کی بے بسی پر اندر ہی اندر حظ اٹھا رہا تھا، غفورے کی پولیس حراست سے

فرار پر بری طرح چونک اٹھا۔ غفورا صدف مرڈر کیس اور ملک سردار خان مرڈر کیس کا ایک اہم مطلوبہ شخص تھا۔ غفورے کے ذکر پر کچھ عرصہ پہلے کا وہ اندوہناک منظر میری چشم تصور میں کسی ''ری وائنڈ'' کی ہوئی فلم کی طرح چلنے ہوا۔ اس رات جب میں نگینہ کے مغالطے میں ملک سردار خان کو اس شک پر کہ اس نے ہی نگینہ کو اغواء کیا تھا، اسے گن پوائنٹ پر لے کر مری کے دور افتادہ ویران کاٹیج تک پہنچا تھا لیکن بعد میں پتہ چلا کہ وہ مغویہ نگینہ نہیں بلکہ صدف تھی جسے ملک سردار خان کے ایماء پر اس غفورے نامی شخص نے گلا گھونٹ کر قتل کر دیا تھا۔ میں نے مغلوب الغضب ہو کر ملک سردار خان کی پیشانی پر گولی پیوست کر دی تھی۔ مجھے قتل کرتے ہوئے غفورے نے دیکھا تھا جو بعد میں راہِ فرار اختیار کر گیا تھا۔

پولیس غفورے کی تلاش میں سرتوڑ کوشش کر رہی تھی۔ کیونکہ ان کے خیال میں غفورا ہی وہ واحد شخص تھا جس کی گرفتاری کے بعد اس دہرے قتل کی واردات کا قضیہ نمٹ سکتا تھا۔

بالآخر پولیس نے اسے کچھ روز قبل تلاش کر کے گرفتار بھی کر لیا تھا۔ بہر حال ہم تینوں یعنی میرے، ماں اور اعظم خان کے حق میں اچھا نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ غفورا، اعظم خان کا ہی آدمی تھا جو بعد میں جانے کیوں اس سے متنفر ہو گیا تھا۔ یہ خبر مجھے ہمارے ایڈووکیٹ حامد صمدانی صاحب نے دی تھی اور ہم بری طرح پریشان ہو گئے تھے۔

لیکن آج .... اور ابھی یہاں انسپکٹر اعجاز شمسی کی زبانی یہ سن کر کہ غفورا پولیس کی حراست سے فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا اور بہ قول اس کے اس میں میرا ہی ہاتھ تھا، اس بات سے قطع نظر مجھے غفورے کے فرار نے ایک یک گونہ مسرت اور دلی سکون بخشا تھا۔

''کیا سوچنے لگے نادر! .... کہ مجھے اس کا کیوں کر علم ہوا؟'' میری طول پکڑتی پُر سوچ خاموشی کو جانے کس بات پر محمول کر کے انسپکٹر اعجاز شمسی نے احساسِ تفاخر سے اکڑ کر کہا تو میں نے کسی خیال کے تحت اس سے پوچھا۔

''انسپکٹر! غفورا کب فرار ہوا تھا؟''

''یہ سوال کر کے تم کیا مجھ پر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہو کہ میں یہ سمجھ لوں گا، تم نے اس کا فرار نہیں کروایا؟'' وہ زہر خند مسکراہٹ سے بولا تو میں نے کہا۔

''حقیقت یہی ہے کہ میں نے غفورے کو فرار نہیں کروایا بلکہ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اسے گرفتار کرنے کے بعد کہاں رکھا گیا تھا؟ .... اور دوسری بات یہ کہ میں پچھلے کئی روز سے پنڈی یا مری میں تھا ہی نہیں۔''

''اوہ .... تو اب تم مجھ سے یہ چالاکی چلو گے۔ تمہارے پاس اپنی غیر موجودگی کا کوئی ثبوت بھی ہے؟'' وہ زہریلے لہجے میں بولا تو میں نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ترکی بہ ترکی کہا۔

''میں تو ثبوت پیش کر دوں گا انسپکٹر! مگر تمہارے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ میں نے ہی غفورے کو پولیس کی حراست سے فرار کروایا؟''

میری اس جچی تلی جوابی کارروائی پر انسپکٹر اعجاز شمس کے چہرے پر جوشِ غیظ کی تند لہر ابھری مگر وہ اسے گویا اپنے دانتوں تلے پیس کر بولا۔ ''غفورا بذاتِ خود ثبوت ہے، تمہارے اور تمہاری ماں کے گھناؤنے جرائم کا۔''

مجھے صاف محسوس ہو گیا کہ وہ میرے سوال پر آئیں بائیں شائیں کر گیا تھا۔

بہر طور میں نے بھی اسی لہجے میں کہا۔ ''تو ٹھیک ہے پھر .... غفورے کو آپ ڈھونڈ کر میرے خلاف ثبوت کے طور پر پیش کر دیں۔''

''زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرنا نادر علی خان!'' میری بات پر وہ کھول کر رہ گیا تھا۔ درحقیقت وہ بے بس تھا اور کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ غالباً اسے مجھ پر کوئی قانونی شق لگانے کا کوئی موقع نہیں مل رہا تھا۔ یہ سب نگینہ کے میرے حق میں بیان دینے کی وجہ سے ہوا تھا اور نگینہ کا میرے حق میں اچانک بیان دینا انسپکٹر اعجاز شمس کے لئے ہی نہیں بلکہ نگینہ کے باپ شاہ میر کے لئے بھی غیر متوقع تھا۔ کیونکہ اس سے پہلے نگینہ مجھے پہچاننے تک سے قاصر تھی۔ اب دونوں کو (شاہ میر اور انسپکٹر اعجاز شمس کو) کیا معلوم تھا کہ میں نے کس طرح اپنی جان جوکھم میں ڈال کر ایک پُر خطر اور دشوار گزار مہم جوئی کے بعد نگینہ کی یادداشت اپنے حق میں لوٹانے میں کامیاب ہوا تھا۔

نگینہ نے بعد میں میری ماں کو اس تازہ صورتِ حال سے مطلع کر دیا تھا اور میری ماں نے فوراً ایڈووکیٹ حامد صمدانی اور اعظم خان کو اطلاع کر دی۔ وہ تینوں پنڈی کے اس تھانے آ گئے۔ یوں میری گلو خلاصی ہوئی۔ ایڈووکیٹ حامد صمدانی نے تو اپنی راہ لی جبکہ میں، ماں اور اعظم خان کے ساتھ واپس مری گرین لاج آ گیا۔

ماں کے چہرے پر عجیب سی گمبھیر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے ناراض لگ رہی تھیں۔ تاہم اب میرے پاس ماں کو قائل کرنے کا جواز موجود تھا۔ لیکن اعظم خان صاحب کی موجودگی میں ماں نے نگینہ سے متعلق بحث نہیں چھیڑی تھی۔ سر دست ہماری گفتگو کا روئے سخن غفورے کا پولیس کی حراست سے فرار تھا۔

''خان صاحب! غفورے کا پولیس کی حراست سے فرار ہونا ہمارے حق میں اچھا ہی ہوا۔ ورنہ تو میری نیندیں حرام ہو گئی تھیں۔ کیونکہ یہی وہ واحد شخص تھا جو میرے ازلی دشمنوں شاہ میر اور نظر حیات کی میرے خلاف سازش کے تابوت کی آخری کیل ثابت ہو سکتا تھا۔

ماں نے کسی قدر خوش ہو کر اعظم خان سے کہا تو وہ ہولے سے کھنکھار کر معنی خیز مسکراہٹ سے پہلو بدلتے ہوئے بولے۔

''ہاں .... اگر میں ایسا نہ کرتا تو یقیناً میں اور آپ جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوتے۔''

''میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ یہ شرارت آپ ہی کی ہوگی۔'' ماں نے تفاخر آمیز مسکراہٹ سے کہا تو میں نے بھی پہلی بار لب کشائی کرتے ہوئے اعظم خان سے کہا۔

''لیکن انکل! اس کے باوجود غفورے کی تلوار خطرے کی صورت میں ہمارے سر پر لٹکی ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے اسے آپ کسی طرح دور بھیج دیں یا پھر اس کی موت کا ڈرامہ رچانے کے بعد اسے کسی اور ملک کی طرف ہمیشہ کے لئے نکال دیں۔''

''نادر! تمہیں غفورے کی طرف سے جتنا خطرہ ہے، اس سے زیادہ مجھے نگینہ سے ہے۔'' دفعتاً ماں نے میری طرف دیکھ کر قدرے تلخ لہجے میں کہا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولیں۔

''دشمن کا یہ نیا اور اوچھا ہتھکنڈا غفورے سے زیادہ ہمارے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ کیونکہ غفورے کو تو ہم ٹھکانے بھی لگا سکتے ہیں .... مگر نگینہ ....''

''ماں! نگینہ بھلا ہمارے لئے کیا خطرہ بن سکتی ہے؟'' ماں نے جب یہ موضوع چھیڑ ہی دیا تھا تو میں بھی پیچھے ہٹنے والا نہ تھا۔ میں مزید بھی ماں سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ماں نے اچانک درمیان میں یہ کہہ کر مجھے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا کہ اس موضوع پر بعد میں گفتگو ہوگی۔ چنانچہ وہ ایک بار پھر اپنا روئے سخن غفورے کی طرف موڑتے ہوئے خان صاحب سے بولیں۔

''خان صاحب! غفورے کے موضوع پر پھر بھی بات نہیں ہوگی۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ بات آؤٹ نہ ہو جائے۔ کیونکہ دشمن بڑے خوب صورت طریقے سے گرین لاج کی دیواروں میں نقب لگا چکا ہے۔''

آخری جملہ ماں نے میری طرف طنزیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ میں بھی سمجھ گیا تھا، ماں کا اشارہ نگینہ کی طرف تھا۔ ماں کے دل میں اب بھی یہی غلط فہمی بیٹھی ہوئی تھی کہ شاہ میر اور نظر حیات کی ملی بھگت سے نگینہ کو دانستہ ایک ''خوب صورت'' ہتھیار کے طور پر ہمارے خلاف استعمال کیا جا رہا تھا۔ جبکہ یہ بات سرے سے غلط تھی۔ لیکن میرے دعوے کا ماں کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ بالآخر اعظم خان ماں کی بات کا ''اشارہ'' سمجھتے ہوئے غفورے سے متعلق مزید کوئی بحث کئے بغیر اٹھ کر چلے گئے تو ماں بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میں ماں کو اٹھتا دیکھ کر بے چین سا ہو گیا اور بے اختیار میرے لبوں سے نکلا۔ ''ماں! میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''ابھی تم آرام کرو اور ٹال کے معاملات سنبھالو، تاکہ میں دوسری طرف بھی یکسوئی سے توجہ دے سکوں۔'' ماں نے ذرا رک کر میری طرف دیکھے بغیر سپاٹ، سرد لہجے میں کہا اور پھر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

ماں کی اس مسلسل سرد مزاجی نے میرا دل بری طرح مسوس کر رکھ دیا تھا۔ پھر جب میں بھی آرام کرنے کی غرض سے اپنے کمرے کی طرف اٹھ کر جانے لگا کہ اچانک قریب دھرے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے آگے بڑھ کر ریسیور سے کان لگایا اور ہیلو کہا۔

''نادر! تمہیں رہائی مل گئی .... شکر ہے خدا کا۔'' دوسری جانب سے نگینہ کی پُرمسرت آواز اُبھری۔

نگینہ کی مترنم آواز پر میرا دل یکبارگی دھڑکا اور پھر میں نے کہا۔

''نگینہ! کیا تم نے میری گرفتاری سے متعلق ماں کو مطلع کیا تھا؟''

''ظاہر ہے .... اور کسے انفارم کرنی میں؟'' نگینہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

''تم سے ماں نے اور کوئی بات کی تھی؟'' ایک اچانک خیال کے تحت میں نے پوچھا۔

''نہیں۔ انہوں نے بس مجھ سے شکریہ ہی کہا تھا اور فون رکھ دیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''نادر! ایک بات تو بتاؤ۔'' دفعتہً نگینہ نے دوبارہ کہا۔

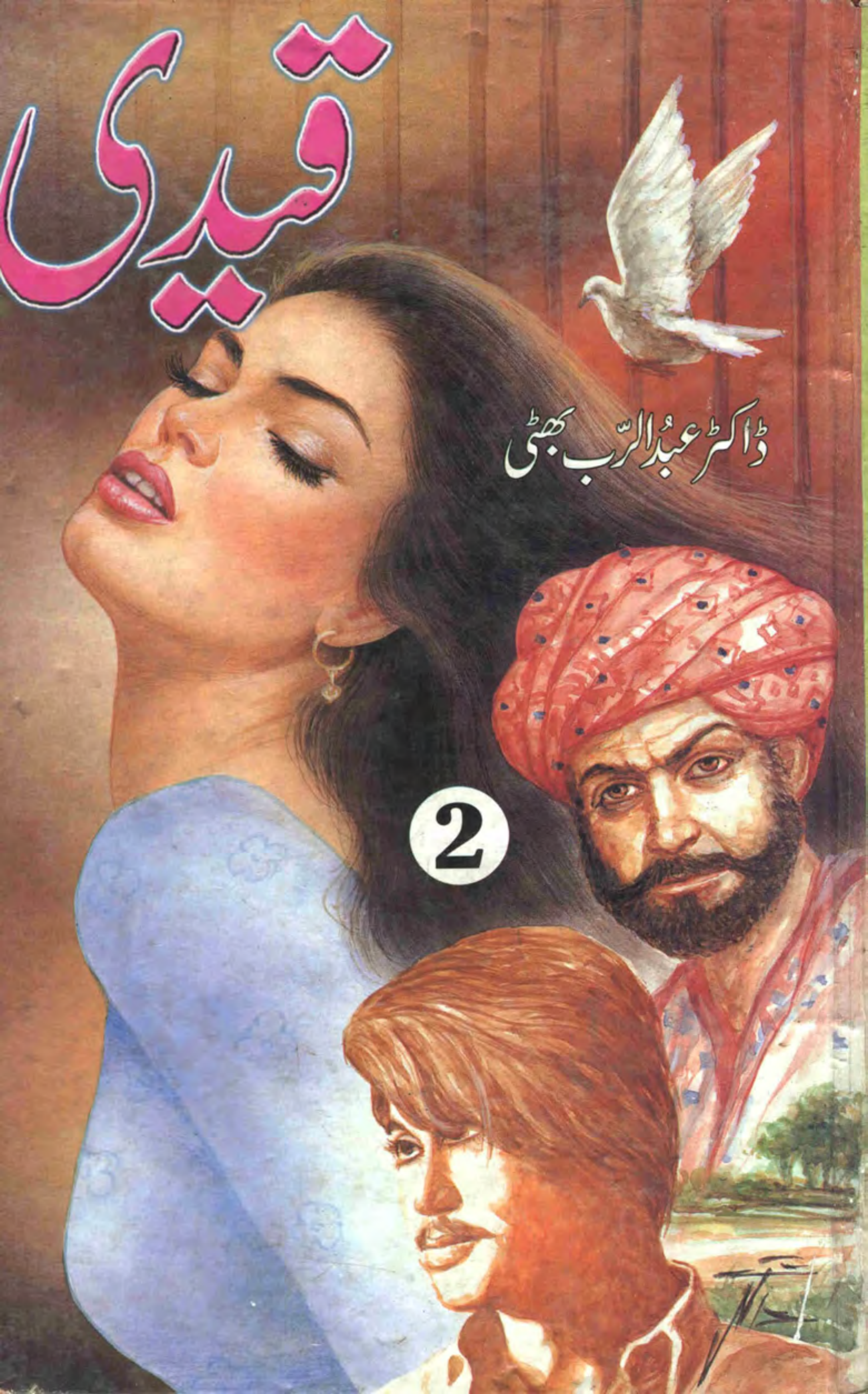
''ہاں .... کہو۔''

''آنٹی کا لہجہ جانے کیوں مجھ سے بات کرتے وقت بہت اُکھڑا اُکھڑا سا تھا۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ وہ مجھ سے لمبی چوڑی اور پیار بھری باتیں کریں گی۔''

اس کی بات پر میں نے ایک گہری ہمکاری خارج کی اور بولا۔ ''شاید وہ میری وجہ سے بہت پریشان ہوں گی۔ اس لئے فون بند کر کے انہوں نے مجھے تھانے سے رہائی دلانے کے لئے بھاگ دوڑ شروع کر دی تھی۔'' میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔ دراصل میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے میری اور ماں کے درمیان کچھ عرصے سے ہونے والی سرد جنگ کے متعلق بتاؤں۔ وہ بے چاری دُکھی ہو سکتی تھی۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ میری ماں کے دل میں اس کے لئے کیا جذبات تھے۔ میں نے اسے عامل عاروب کے شکنجے سے تو چھڑا لیا تھا مگر اب اپنی ماں کو قائل کرنا مجھے قطعاً ناممکن لگ رہا تھا۔ میری قریب آتی منزل ایک مرتبہ پھر دور ہو رہی تھی۔



یہ ایڈونچرس داستان ابھی جاری ہے
مزید واقعات کے لئے جلد دوئم کا مطالعہ کیجئے


قیدی
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
2

نگینہ میری محبت تھی۔ اس کی خاطر میں دنیا کی ہر قوت سے ٹکرا سکتا تھا۔ لیکن اپنی ماں سے ٹکرانا، اس کے حکم سے روگردانی کرنا......... میں خود کو چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پستا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ محبت کا تقاضا مجھے ماں سے بغاوت پر اُکسا رہا تھا۔ مگر ایسا کرنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ دوسری طرف نگینہ کو چھوڑ دینا، اسے بھول جانا بھی میرے اختیار سے باہر تھا۔

میں ان خیالات میں ڈوبا ہوا تھا اور دوسری طرف سے نگینہ اپنی جاں فزا آواز میں ''ہیلو......... ہیلو!'' کر رہی تھی۔ میری خاموشی کا وقفہ طویل ہو رہا تھا۔

''تم ٹھیک تو ہو؟'' اس کے لہجے کی تشویش نے مجھے خیالات کی دنیا سے باہر کھینچ لیا۔

''آں......... ہاں۔'' میں نے بے خیالی میں کہا۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''ٹھیک کہاں ہو؟'' اس کے انداز میں شکوہ اترنے لگا تھا۔ ''تم کہاں کھو گئے تھے؟''

''اوہ......... کہیں نہیں۔ بس ذرا اپنے ملازم کو اشارے سے کچھ سمجھا رہا تھا۔'' میں نے اپنی خاموشی کا بھونڈا جواز پیش کیا۔ ''خیر، تم بتاؤ......... کبیر کا کچھ پتہ چلا؟ وہ کیلاش سے واپس لوٹ آیا ہے یا.........؟''

''وہ ابھی لوٹا تو نہیں ہے۔ تاہم اس کی خیریت کا فون آیا تھا۔'' نگینہ نے بتایا تو میں نے بے چینی سے پوچھا۔

''کب آیا تھا؟......... اور کس کے پاس آیا تھا؟''

''انکل نظر حیات آئے تھے ہمارے ہاں۔'' وہ بتانے لگی۔ ''انہوں نے ہی پپا کو بتایا تھا کہ کبیر کا پشاور سے فون آیا تھا اور اس نے اپنی خیر خیریت سے اپنے باپ کو مطلع کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ بہت جلد اور کسی بھی وقت بائی ایئر پنڈی پہنچنے والا ہے۔ اور نادر! مجھے اس کی آمد سے جانے کیوں ایک ڈر سا لگ رہا ہے۔'' وہ آخر میں شاید فکر مند ہو گئی تھی۔

میں اس کی بات کا اصل مطلب سمجھے بغیر اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ''نگینہ! تمہیں اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اب تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

''مجھے اپنا کوئی ڈر نہیں ہے۔'' وہ مضطربانہ انداز میں بولی۔ ''ڈر تو مجھے اس بات کا ہے کہ کہیں وہ بدخصلت شخص تمہارے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہ کر ڈالے۔ پہلے ہی پپا، انکل نظر حیات اور انسپکٹر اعجاز شمس تم پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔''

اس کی بات معقول تھی، جس نے ایک لمحے کے لئے مجھے بھی سوچ میں ڈال دیا تھا۔ کیونکہ وادی کیلاش کی مہم میں اس مردود عامل عاروب کے ساتھ اعصاب شکن جنگ کے دوران کبیر کا دستِ راست کالا ناگ میرے ہاتھوں جہنم واصل ہو گیا تھا جبکہ خود کبیر میری ہی گولی سے زخمی ہوا تھا۔ اب اس کی واپسی کے بعد عین ممکن تھا کہ دونوں باپ بیٹے (نظر حیات اور کبیر) میرے خلاف کوئی نیا فساد کھڑا کر

دیتے جس میں نگینہ کا باپ شاہ میر پیش پیش ہوتا۔ جب تک میں اور ماں زندہ تھے، ان تینوں خبیث شیطانوں کی نظروں میں کھٹکتے ہی رہتے۔ کیونکہ وہ میرے اور ماں کے منتقمانہ عزائم سے اچھی طرح واقف تھے۔ میں نے یہ سب سوچا تھا تاہم اس کا اظہار کئے بغیر نگینہ کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔

''نگینہ! تم اس کی فکر مت کرو۔ آنے دو اسے۔ میں یہاں بھی اس سے نمٹ سکتا ہوں۔''

دوسری جانب چند ثانیے خاموشی طاری رہی۔ اس کے بعد نگینہ نے کہا۔

''نادر! میرا بہت دل کرتا ہے آنٹی سے ملنے کو۔ کبھی ملاؤ نا ماں سے۔ سچ نادر! میں تو بچپن میں ہی ماں کے پیار سے محروم ہو گئی تھی۔ میں کتنی خوش قسمت ہوں نادر! کہ مجھے تمہاری صورت میں اپنے محبوب کے پیار کے ساتھ ماں کی ٹھنڈی چھاؤں بھی میسر آنے والی ہے۔'' وہ جیسے خواب ناک سے لہجے میں بولے جا رہی تھی۔

میری ماں سے اس کی محبت کا یہ جذبہ یقیناً اس کے اندر ممتا سے محرومی کے خلا کو پُر کرنے کی دیرینہ خواہش کا ہی باعث تھا۔ مگر میں اسے کیا بتاتا کہ ماں کو اس سے کس قدر نفرت ہے۔ وہ اسے دشمن کی بیٹی سمجھے ہوئے تھیں۔ حالانکہ ایسا نہ تھا۔ لیکن یہ سب نگینہ کی میری طرف سے ذہنی کایا کلپ کے بعد سے ہوا تھا۔ جس نے ماں کے دل میں اس کی طرف سے غلط فہمی پیدا کر دی تھی کہ نگینہ نے اپنے باپ شاہ میر کے کہنے پر ہی مجھ سے منہ موڑا تھا جس کے باعث نگینہ نے اپنے باپ کے خلاف عدالت میں جو بیان دیا تھا، وہ واپس لے لیا تھا۔ ماں کو تب سے ہی نگینہ سے نفرت ہو گئی اور ساتھ ہی یہ یقین بھی ہو گیا تھا کہ نگینہ نے یہ سب اپنے باپ کے ایماء پر اور اسی کے سمجھانے بجھانے اور اشاروں پر ہی کیا تھا۔ لیکن اصل حقیقت تو میں ہی جانتا تھا کہ نگینہ کے ساتھ کس قسم کی پراسرار ٹریجڈی ہوئی تھی۔

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا نادر! پھر کب ملوا رہے ہو ماں سے؟'' میری طول پکڑتی خاموشی پر نگینہ نے مجھ سے کہا تو میں اسے ذرا ٹالنے کے انداز میں بولا۔

''ہاں....... ہاں، کیوں نہیں۔ میں تمہیں ضرور ملواؤں گا ماں سے۔ لیکن بس، تھوڑے دن ٹھہر جاؤ۔ ذرا حالات کو معمول پر آنے دو۔'' پھر موضوع بدل کر بولا۔ ''اچھا تم بتاؤ، تمہارے پپا کا تمہارے ساتھ کیا رویہ ہے؟''

''ہوں، ٹھیک ہے۔ بس کچھ خفا خفا سے رہتے ہیں۔'' وہ مسکراتے لہجے میں بولی۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے گہری متانت سے بولی۔ ''لیکن نادر! انہوں نے تمہاری ماں کے ساتھ انکل نظر حیات سے مل کر جو ظلم کیا تھا، میں انہیں کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ اس لئے تو میں کہتی ہوں کہ مجھے تم ماں سے ایک بار ملوا دو۔ میں ان کے قدموں میں گر کر اپنے ڈیڈی کی طرف سے رو رو کر ان سے معافی مانگوں گی۔ مجھے یقین ہے نادر! وہ ہمیں معاف کر دیں گی۔''

نگینہ کی اس معافی والی بات پر مجھے ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ کیا واقعی ماں نگینہ کے باپ کا اتنا بڑا جرم معاف کر دیں گی؟....... پھر یہی سوال میں نے خود سے بھی کیا مگر کوئی جواب ذہن میں نہیں آیا۔

''تم خاموش کیوں ہو نادر؟'' اس نے مجھے خاموش پا کر دوبارہ کہا تو میں نے اسے یہ تلخ حقیقت بتا دینا ہی ضروری سمجھا اور سنجیدگی سے بولا۔

''نگینہ! میرا خیال ہے کہ تمہارے پپا اور نظر حیات کا جرم اس قدر گھناؤنا اور ناقابل تلافی ہے کہ وہ اب معافی تلافی سے کوسوں دور ہو چکا ہے۔ تمہاری یہ کوشش فضول ہی ثابت ہو سکتی ہے۔''

''نادر! تم مجھے ایک بات بتاؤ۔''

''ہاں....... پوچھو۔''

''کیا تم میرے پپا کو معاف کر سکتے ہو؟''

مجھے اس کی بات پر ایک اور جھٹکا لگا تاہم صاف گوئی سے بولا۔ ''شاید نہیں....... لیکن کیا تم خود بھی یہی چاہتی ہو کہ تمہارے باپ نے میری ماں کے ساتھ جو بھیانک جرم کیا ہے، اس کی سزا تمہارے باپ کو نہ ملے؟''

چند ثانیے کی اسرار بھری خاموشی کے بعد نگینہ نے کہا۔ ''انہیں قانونی سزا ملنی چاہئے۔ لیکن شاید اب اس کا وقت بھی گزر چکا ہے۔''

''ہاں نگینہ! مگر یہ تم نے کیا بحث چھیڑ دی ہے؟ یہ بتاؤ، فون کس لئے کیا تھا؟'' میں نے اُسے اس گمبھیر موضوع سے ہٹاتے ہوئے کہا تو وہ مترنم ہنسی کے ساتھ بولی۔

''میں ماں جی سے ملنا چاہتی ہوں۔ مجھے وقت دے دو۔ کیا کل صبح میں آ جاؤں؟''

میں اس کی بات پر یکدم گھبرا کر بولا۔ ''نن....... نن....... نہیں، ابھی نہیں آنا۔''

''کیوں بھئی، آخر کیا بات ہے؟ بس....... یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ میں اس معاملے کو ختم کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ قطعیت سے بولی۔

''کون سا معاملہ؟''

''میں کل گرین لاج آ کر ہی بتاؤں گی۔ بائی بائی!'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ میں اپنے ہاتھ میں ریسیور پکڑے جانے کتنی دیر تک ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ اس کے بعد ایک گہری سانس لے کر میں نے ریسیور رکھ دیا۔

اگلے دن صبح بیدار ہو کر ماں کی ہدایت کے مطابق میں سیدھا ٹال پہنچا۔

میں صبح نو بجے ٹال پہنچا تھا۔ منیجر مشتاق مجھے دیکھ کر خوش ہو گیا۔

میری غیر موجودگی میں اس نے ہی یہاں کے کاروباری امور سنبھالے ہوئے تھے۔ ماں بھی وقتاً فوقتاً وہاں آتی رہتی تھیں۔

گیارہ بجے تک میں شدید اضطراب میں مبتلا رہا۔ نگینہ نے آج پنڈی سے مری گرین لاج آنا تھا۔ میرے لئے پریشانی کی کئی وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ نہ جانے ماں نگینہ کو دیکھتے ہی اس کے ساتھ کیا سلوک کریں؟ دوم یہ کہ میں نگینہ پر ابھی ماں کی اس کے بارے میں غلط فہمی اور ناراضگی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ گرین لاج فون کر کے ذرا پتہ تو کروں۔ لہٰذا یہ سوچ کر جیسے ہی میں نے ساگوان کی میز پر دھرے ٹیلی فون سیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا، یکدم اس کی بیل گونج اُٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

''ہیلو!''

''ہیلو نادر!....... میں نگینہ بول رہی ہوں۔'' دوسری طرف سے اس کی آواز اُبھری تو میں یکدم لکنت زدہ لہجے میں بولا۔

''نن....... نگینہ!....... تت....... تم کہاں سے بول رہی ہو؟''

''کیوں؟....... تم پریشان کیوں ہو گئے بھئی؟'' وہ بولی۔ ''ویسے میں گرین لاج سے بول رہی ہوں۔''

اس کی بات پر میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ ''تت...... تم...... کک...... کب آئیں؟...... ماں کہاں ہیں؟'' میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''میں یہاں آئی تو ماں جی نہیں تھیں۔ سکینہ نے بتایا تھا کہ وہ کہیں باہر گئی ہوئی ہیں اور تم ٹال پر ہو۔''

''میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔'' میں نے جلدی سے یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔ اس کے بعد میجر مشتاق سے کہا۔ ''میں ابھی آتا ہوں۔''

یہ کہہ کر میں اپنی نئی جیپ میں آ بیٹھا اور گرین لاج کی طرف روانہ ہو گیا۔ گرین لاج پہنچا تو ایک ناقابل یقین منظر میرا منتظر تھا۔ نگینہ اکیلی گرین لاج نہیں آئی تھی، اس کے ہمراہ شاہ میر بھی تھی۔ اس کا باپ...... اور میرے باپ کا قاتل شاہ میر۔ اسے اپنے گھر میں دیکھ کر میری رگوں میں خون کی گردش تیز تر ہو گئی۔ کنپٹیاں جیسے بری طرح سلگنے لگیں۔

وہ دونوں باپ بیٹی صوفے پر ایک ساتھ براجمان تھے۔ مجھے دیکھتے ہی نگینہ ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''آؤ نادر!...... دیکھو میں ساتھ کسے لائی ہوں؟''

''اسے کیوں لائی ہو تم؟''

میں نے سامنے صوفے پر براجمان شاہ میر کو غضب ناک نظروں سے گھورتے ہوئے نگینہ سے کہا تو وہ مجھ سے بولی۔

''نادر! تمہیں ایک زبردست خوشخبری سنانے آئی ہوں۔''

جواباً میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''اس شخص کی موجودگی میں مجھے کون سی خوشخبری سنا سکتی ہو نگینہ!...... تم نے اسے یہاں لا کر بہت غلطی کی ہے۔ تمہیں معلوم نہیں کہ مجھے اس مردود سے کس قدر شدید نفرت ہے۔ اور ماں...... اگر میری ماں نے اسے یہاں اپنی چھت کے نیچے دیکھا تو وہ اسے گولی مارنے سے دریغ نہیں کرے گی۔''

''نادر! پہلے میری بات تو سن لو...... میں......'' نگینہ نے مجھ سے کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے اس کی بات کاٹ کر اٹل لہجے میں کہا۔

''نگینہ! پلیز، میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس شخص کو میری نظروں سے دور لے جاؤ۔''

''نادر! تمہیں میری بات سننا ہو گی۔'' دفعتہً نگینہ نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ پھر دوسرے ہی لمحے نرم اور ملتجیانہ لہجے میں بولی۔ ''نادر! پپا یہاں تم سے اور تمہاری ماں سے اپنے جرم کی معافی مانگنے آئے ہیں۔ وہ اس جنگ کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اب تو بتاؤ، ہے نا کتنی بڑی خوشی کی بات۔''

نگینہ کا خیال تھا کہ میرے چہرے اور میرے لہجے کی برف پگھل جائے گی۔ مگر وہاں بدستور ایک گلیشیر تھا۔ میں نے کہا۔

''نگینہ! میں نے تم سے کل ہی فون پر کہہ دیا تھا کہ اب یہ معاملہ معافی تلافی سے کوسوں دور جا چکا ہے۔ واپسی اور معافی کے تمام در بند ہو چکے ہیں۔''

''ایسا مت کہو نادر!...... کم از کم تم تو ایسا مت کہو۔'' نگینہ یکدم روہانسی ہو گئی۔ ''میں تو...... میں تو تمہیں بہت فراخ دل سمجھتی تھی۔ تم ایک پڑھے لکھے اور سلجھے ہوئے انسان ہو۔ میری خاطر ہی پپا کو معاف کر دو۔ معاف تو خدا بھی کر دیتا ہے۔''

نگینہ کی بات پر میں اپنے اندر کے کھولتے ہوئے اُبال پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر نگینہ کو دوسرے طریقے سے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''نگینہ! بات صرف میرے معاف کرنے کی نہیں ہے۔ اس شخص نے میری ماں کو جو زخم دیا ہے، اس کا ازالہ کرنا ناممکن ہے۔ اور ماں کے لئے اپنے شوہر کے قاتل اور بیوگی کے زخم کے بعد بے گناہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیلے جانے کے ذمہ داروں کو معاف کرنا ناممکن ہی ہو گا۔''

اس بار شاہ میر نے مداخلت کی اور وہ صوفے سے اٹھ کر چند قدم چلتا ہوا میری طرف آیا۔ پھر نادم سے لہجے میں مجھ سے بولا۔ ''میں تم سے اتنا کہوں گا نادر! کہ کیا تمہارے بس میں مجھے معاف کرنا نہیں ہے؟''

''ہرگز نہیں......'' میں نے بلا تردّد اور انتہائی سرد مہری سے کہا تو وہ اپنی بیٹی سے مخاطب ہو کر دھیرے سے بولا۔

''نگی بیٹا! ہمیں پھر یہاں سے چلنا چاہئے۔ بلاوجہ یہاں بدمزگی نہ ہو جائے۔ تمہیں پہلے نادر علی کو اعتماد میں لے کر قائل کرنا چاہئے تھا۔ آؤ چلو۔''

مجھے اس کے شاطر لہجے میں مکارانہ طنز کی جھلک صاف محسوس ہوئی۔ نگینہ نے اپنی گھنیری سیاہ پلکوں کی چلمن اٹھا کر درد بھری نگاہ میرے چہرے پر ڈالی۔ اس کے بعد وہ ہولے سے اپنے باپ کو مخاطب کر کے بولی۔

''پپا! آپ باہر جا کر گاڑی میں بیٹھیں، میں ابھی چند منٹ میں آتی ہوں۔''

''اوکے بیٹا!'' شاہ میر نے ہولے سے کہا اور پھر خاموشی کے ساتھ باہر نکل گیا۔

''نادر!...... نادر! ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہمارے اندر کسی نادم شخص کو معاف کرنے کا، عفو و درگزر کا جذبہ کیوں نہیں ہوتا؟ اگر کسی کو اپنی غلطی کا اعتراف ہے تو اسے...... اسے آخر کیوں معاف نہیں کیا جاتا؟ کیا...... کیا دشمنی کا جذبہ اسی قدر طاقت ور ہوتا ہے یا ہماری تنگ نظری اور تنگ ذہنیت اسے طاقت ور بناتی ہے؟''

باپ کے باہر جانے کے بعد نگینہ نے آزردہ لہجے میں مجھ سے کہا اور پھر سسکیاں بھرتی ہوئی باہر چلی گئی۔ اس وقت چاچا فضل مرحوم کی بیوہ سکینہ بھی وہاں موجود تھی۔ ذرا دیر بعد باہر گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز اُبھری۔ میں نے بے اختیار سکون کی سانس لی اور باہر آ کر اپنی جیپ میں آ بیٹھا اور دوبارہ ٹال کی طرف روانہ ہو گیا۔

ٹال سے میں دو بجے بعد دوپہر واپس گھر لوٹا تو ماں کو بڑی بے چینی کے عالم میں کمرے کے وسط میں ٹہلتے دیکھا۔ ان کے شاداب چہرے پر غصے اور طیش کی سرخیاں مترشح تھیں۔ جبکہ بڑی بڑی کالی آنکھوں سے نفرت وغیظ کی چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں۔

انہوں نے سیاہ پھول دار سوٹ کے اوپر لمبا ''چیسٹر'' چڑھا رکھا تھا جو ان کے دراز قد و قامت والی شخصیت کو مزید پُر وقار بنا رہا تھا۔ پیروں میں لانگ بوٹ تھے اور گھنیرے مہندی رنگ کے ریشمی بال، جن میں چاندی کا اکا دکا تار بھی جھلک رہا تھا، شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ ایسے میں ایک بھرپور پہاڑی عورت نظر آ رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ رک گئیں اور برماتی ہوئی نگاہوں سے مجھے گھور کر گویا دانت پیستے ہوئے بولیں۔

''نادر! میں جو پوچھوں، مجھے صرف اس کا جواب چاہئے۔''

میں خاموشی سے ماں کا چہرہ تکنے لگا۔

''شاہ میر یہاں آیا تھا؟''

''ہاں ماں!''

''نگینہ بھی اس کے ساتھ تھی؟''

''ہاں ماں!''

''اور تم نے اپنے باپ کے قاتل کو یہاں سے جانے دیا؟ تم نے اس کے سینے میں گولی کیوں نہ ا دی؟ محض اس لئے کہ وہ نگینہ کے ساتھ یہاں آیا تھا؟''

''ماں! یہ بات نہیں ہے۔ وہ یہاں معافی مانگنے آیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''معافی......... یہ کون سا لفظ ہے؟ میں تو اس لفظ سے واقف ہی نہیں ہوں۔ کیا تمہاری لغت میں دشمن کو معاف کرنے کا لفظ ہے؟ اگر ہے تو مجھے بھی بتا دو۔''

ماں نے جھٹکے دار لہجے میں مجھ سے کہا۔

''ماں! وہ مجھ سے بھی معافی مانگ رہا تھا لیکن مجھ سے وہ مایوس ہو کر یہاں سے گیا ہے۔''

''ہونہہ......... مایوس ہو کر.........'' ماں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ پھر ناگن کی طرح پھنکار بولی۔ ''نادر! اس کی صرف یہاں سے لاش جانی چاہئے تھی اور وہ بھی اس حرافہ نگینہ کے کاندھوں پر......... سمجھے تم؟''

''ماں! میں نے شاہ میر کو معاف نہیں کیا ہے۔ میں نے کہا نا، وہ یہاں سے بری طرح مایوس ہو کر گ ہے۔'' میں نے پُرزور لہجے میں کہا تو ماں اپنے لانبے قد پر جھولتے ہوئے براؤن ''چیسٹر'' کی جیبوں می دونوں ہاتھ ڈال کر چند قدم چلتی ہوئی میرے قریب آئی۔ وہ میرے اتنے قریب آ گئی تھی کہ اس پھنکارتی ہوئی، جلتی سلگتی سانسوں کی تپش مجھے چہرے پر محسوس ہونے لگی۔ پھر جیسے ایک ایک لفظ چبا مجھ سے بولی۔

''نادر! حقیقت یہ ہے کہ تم نے اسے معاف کر دیا ہے۔''

''نہیں ماں! نہیں......... میں نے اسے ہرگز معاف نہیں کیا ہے۔'' میں بھی ماں کے جلتے سلگتے چہرے پر نظریں گاڑ کر بولا۔

میں نے دیکھا، ماں کے ہونٹوں پر بڑی اسرار بھری مسکراہٹ اُبھری۔ جانے کیا ہوا، انہوں نے مجھے فوراً اپنے سینے سے لگا لیا۔ بے اختیار میں نے بھی ماں کو اپنے ساتھ بھینچ کر لپٹا لیا۔ ماں نے میری پیشا کو چوما اور میں نے اس کے گال کو بوسہ دیا۔

ماں کے ممتا بھرے وجود کی قربت نے مجھے مسحور کر دیا تھا۔

وہ مجھ سے الگ ہوئیں اور اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے میرے چہرے کا بڑے والہانہ انداز میں جائزہ لیتے ہوئے بولیں۔ ''بیٹا! تم اپنے بہادر باپ قادر علی خان کا دوسرا روپ ہو۔ وہ مجھ سے ہمیشہ سچ بولتا تھا۔ مجھے بھی تم پر بھروسہ ہے کہ تم اپنی ماں سے ہرگز جھوٹ نہیں بولو گے۔ بے فکر رہو، مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ تم بھی مجھ سے جھوٹ نہیں بولو گے۔ اور شاہ میر یقیناً تم سے مایوس ہو کر ہی یہاں سے لوٹا ہوگا۔ لیکن میں تمہاری زبان سے اس کے علاوہ ایک اور سچ بھی سننا چاہتی ہوں۔''

ماں کے اس غیر معمولی رویے میں پیار بھری لچک کو محسوس کرتے ہی میرا پورا وجود مسرت سے سرشار ہو گیا اور میں جوش بھرے تیقن کے ساتھ ماں سے بولا۔

''ماں! اپنے بیٹے پر بھروسہ کرو۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے، آپ کا یہ بیٹا کبھی دشمنوں کو معاف نہیں کرے گا اور نہ ہی ان سے کسی قسم کی مفاہمت کرے گا۔''

ماں نے مجھے تفاخر آمیز مسکراہٹ سے دیکھا اور اسی لہجے میں بولی۔ ''نادر بیٹے! مجھے تم پر فخر ہے اور

پورا بھروسہ بھی۔ پر تو ایک بات بتا، کیا واقعی تجھے نگینہ اچھی لگتی ہے؟''

ماں کا اس طرح نگینہ سے متعلق میرا عندیہ لینا، میرے لئے عجیب بھی تھا اور خوشی کی بات بھی۔ لہٰذا میں نے بھی ماں سے کچھ نہیں چھپایا اور صاف گوئی سے دل کی گہرائیوں سے بولا۔ ''ہاں ماں! نگینہ مجھے اچھی لگتی ہے۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ میں شادی کرنا چاہتا ہوں اس سے۔''

میری بات پر ماں کے چہرے پر چند ثانیے پُرسوچ خاموشی کے آثار طاری رہے اس کے بعد وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔

''نادر بیٹے! باوجود اس کے کہ وہ ہمارے دشمن کی بیٹی ہے، وہ تم سے نباہ کر لے گی؟''

''ہاں ماں! کیونکہ وہ بھی واقعی اپنے باپ کو ہمارا مجرم سمجھتی ہے۔''

''مگر بیٹا! وہ اپنے باپ کی محبت سے مجبور ہو کر، تمہارا کسی وقت ساتھ تو نہیں چھوڑ دے گی؟''

''نہیں ماں! میں نگینہ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ایسا ہرگز نہیں کرے گی۔''

''تب بیٹا! پھر وہ یہ آس لے کر ہمارے پاس کیوں آئی تھی کہ ہم اس کے باپ شاہ میر کو معاف کر دیں گے؟''

''ماں! نگینہ فطرتاً ایک نرم خو اور صلح جو طبیعت کی لڑکی ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ اگر ہم اس کے باپ کو معاف کر دیں گے تو زیادہ اچھی اور خوشی کی بات ہوگی۔ مگر اب وہ مایوس ہو گئی ہے ہم سے۔''

''میں تم سے یہی پوچھنا چاہتی تھی نادر بیٹے! کہ اب مجھ سے اور بالخصوص تم سے مایوس ہونے کے بعد نگینہ کیا واقعی تمہارے ساتھ شادی پر آمادہ ہو جائے گی؟'' ماں نے گہرے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں ماں! مجھے پورا یقین ہے کہ وہ اس سب کے باوجود مجھ سے منہ نہیں موڑے گی۔'' میں نے پورے اعتماد سے کہا۔

''کیا تمہاری اور نگینہ کی شادی میں اس کے باپ شاہ میر کی مرضی بھی شامل ہوگی؟''

''شاید نہیں۔'' میں نے گومگو سے لہجے میں کہا اور مزید بولا۔ ''لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔ نگینہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور وہ اپنے مجرم باپ کی مرضی کے خلاف میرے ساتھ ضرور شادی پر رضامند ہو جائے گی۔''

''تو ٹھیک ہے پھر۔'' دفعتاً ماں نے گمبھیر لہجے میں انتہائی متانت سے کہا۔ ''تم نگینہ سے فوراً اس سلسلے میں حتمی بات کر لو۔ تم دونوں کی شادی پر مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔'' ماں نے اتنا کہا اور پھر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

میں ہکا بکا سا کھڑا رہ گیا۔ ماں کے رویے میں نگینہ سے متعلق اچانک نرمی جہاں میرے لئے خوشی کی بات تھی تو وہیں مجھے ایک عجیب سی اُلجھن آمیز حیرت بھی ہو رہی تھی۔

میں اس سارے معاملے پر گہرائی سے سوچنے لگا۔ جانے کیوں مجھے یوں لگا جیسے ماں کچھ اخذ کرنا چاہ رہی ہو، نگینہ کو آزمانا چاہتی ہو کہ وہ واقعی باپ سے متنفر تھی یا پھر اس کے اشاروں پر ہم ماں بیٹے کو بے وقوف بنا رہی تھی۔ یقیناً اب نگینہ کا میرے ساتھ شادی کے لئے ''ہاں'' یا ''نہ'' کہنا بہت اہم ہو گیا تھا۔

بہر طور کچھ بھی تھا، مجھے پورا یقین تھا کہ نگینہ کبھی مجھ سے شادی سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ ماں نے مجھے ایک موقع دیا تھا۔ وہ یا تو اپنے تئیں نگینہ کا اصل چہرہ میرے سامنے بے نقاب کرنا چاہتی تھی یا پھر کوئی اور بات تھی۔ بہرحال کچھ بھی سہی، اگر ماں کے دل میں یہی کرید یا کسی قسم کی

تشکیک تھی تو یہی سہی۔ مجھے ماں نے ایک موقع دیا تھا۔ کیا خبر، اپنے اکلوتے بیٹے کی خوشی نے اسے پگھلا دیا ہو۔

بہرطور ماں کا رضامند ہونا میرے لئے کم خوشی کی بات نہ تھی اور میں یہ خوش خبری جلد سے جلد نگینہ کو بھی سنانا چاہتا تھا۔ گویا اب میں اپنی محبت کو نگینہ کی شادی کی صورت میں پانے کا حتمی فیصلہ کر چکا تھا۔

میں نگینہ سے فون پر بات کرنا چاہتا تھا مگر پہلے مجھے اس کے فون کا انتظار تھا۔ اگلے روز میں ٹال پہنچا۔ معمولات کے کام نمٹائے اور بارہ بجے تک قدرے فارغ ہو کر بیٹھ گیا۔ اچانک میری نظر آفس کیبن کے شیشے والے دروازے سے باہر ٹال کے وسیع و عریض احاطے پر پڑی۔ ایک سیاہ رنگ کی ٹویوٹا پراڈ تیزی سے اندر داخل ہوئی اور ایک جھٹکے سے میرے آفس کیبن کے سامنے رک گئی۔

میں قدرے چونک سا گیا۔ پھر جس شخص کو میں نے تیزی کے ساتھ کار سے اترتے دیکھا، وہ نظر حیات تھا۔ اسے دیکھ کر میری کنپٹیاں سلگ اُٹھیں۔ اس کے ہمراہ دو افراد بھی تھے۔ نظر حیات نے گرے کلر کا سفاری سوٹ پہن رکھا تھا۔

''یہ مردود یہاں کیا لینے آیا ہے؟''

میں ہولے سے زیرلب بڑبڑایا۔ تاہم سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ اپنے دونوں آدمیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر پریشانی، غیظ اور تفکرات کا جال سا پھیلا ہوا تھا۔

''نادر! میرا بیٹا کبیر کہاں ہے؟'' اندر داخل ہوتے ہی مجھے گھورتے ہوئے غیظ آلود لہجے میں بولا۔ اس اثناء میں میرے دو مسلح گارڈز جو باہر چوبی گیٹ میں متعین تھے، ایک کار کو رکے بغیر تیزی سے اندر داخل ہوتے دیکھ کر فوراً وہاں آن پہنچے تھے اور ساتھ ہی چند مزدور بھی۔ برابر والے کمرے سے منیجر مشتاق بھی دوڑا چلا آیا تھا۔ میں نے اپنے مسلح گارڈز اور منیجر مشتاق کو تو وہیں کھڑے رہنے دیا البتہ مزدوروں کو واپس جانے کا حکم دیا۔

''تم نے یہاں آنے کی جرأت کس طرح کی ہے نظر حیات!'' اس کے سوال کو سر بہ سر نظر انداز کرتے ہوئے میں نے بھی خونخوار غراہٹ سے مشابہہ آواز میں اس سے کہا۔

''ابھی میں نے اپنی جرأت تمہیں دکھائی کب ہے نادر!'' وہ دانت پیس کر غصیلے لہجے میں بولا۔ اس دوران میرے مسلح گارڈز نے اس کی بدتمیزی اور درانہ وار اندر داخلے پر نظر حیات سے کچھ جاننا چاہا تھا مگر میں نے اشارے سے انہیں خاموش کھڑے رہنے کو کہا۔

''نادر! اگر تمہاری ماں اسی طرح کی بزدلانہ حرکتیں کرے گی تو وہ بھی ایسی ہی حرکت کا نشانہ بن سکتی ہے۔ وہ شاید بھول رہی ہے کہ وہ میری طرح خود بھی ایک جوان اور اکلوتے بیٹے کی ماں ہے۔''

اگرچہ کبیر کے سلسلے میں مجھے تھوڑی بہت اس کی بات کی بے چینی تو تھی کہ نہ جانے عامل عاروب کی خانقاہ میں میرے ہاتھوں زخمی ہونے کے بعد اس کا کیا حشر ہوا تھا؟ تاہم نظر حیات کی اس تہدید پر میرا خون جیسے کنپٹیوں تک اچھال مارنے لگا۔ مگر میں بھی سرِدست زبانی کلامی ہی اسے دق کرنا چاہتا تھا۔ سو اسے گھور کر بولا۔

''نظر حیات! مجرم باپ کی اولاد کے سلسلے میں یہ تو کہا جا سکتا ہے، اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلنے والے بیٹے کا بھیانک انجام اپنے باپ سے مختلف نہیں ہو سکتا۔ جبکہ ایک مظلوم مگر بہادر ماں کے بیٹے سے ایسی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔''

''کسی خوش فہمی میں مت رہنا تم دونوں ماں بیٹا۔ سمجھے تم۔'' نظر حیات نے غیظ و غضب سے لرزیدہ

لہجے میں کہا۔ ''مجھے صرف اپنے سوال کا جواب چاہئے۔ میرا بیٹا کہاں ہے؟''

''میں تمہاری کسی بات کا جواب نہیں دوں گا رذیل کتے! دفع ہو جاؤ میری نظروں سے۔'' میرے اندر کا اُبال عروج پر پہنچ گیا اور میں اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

نظر حیات کا چہرہ احساسِ ذلت اور طیش کے مارے مزید سرخ ہو گیا۔ اس کے ساتھ کھڑے دو کرخت رو آدمیوں کی آنکھوں میں مجھے گھورتے ہوئے عجیب سی چمک اُبھری جو یکلخت معدوم بھی ہو گئی۔ اس کے بعد نظر حیات اپنے دانتوں تلے ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولا۔

''نادر! ایک بات یاد رکھو۔ اگر میرے بیٹے کا ذرا بھی بال بیکا ہوا یا وہ مجھے اگلے چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر نہ ملا تو میں اس کی ذمے داری تمہارے سر سمجھوں گا۔'' تہدیدی انداز میں یہ کہہ کر وہ واپسی کے لئے مڑ گیا۔

میں دوبارہ اپنی ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گیا۔ دونوں گارڈز کو میں نے واپس جانے کا اشارہ کیا البتہ منیجر مشتاق مسمسی سی صورت بنا کر مجھ سے تفکیر بھرے لہجے میں بولا۔

''سر جی! یہ تو اتنا ہنگامہ کر گیا ہے۔ ہمارے ٹال کو پھر سرخ سیل نہ لگوا دے، جی کڑا کے۔''

''اب اگر ایسا ہوا تو میں اس کے خلاف اختیارات سے متجاوز ہونے کی محکمہ جاتی کارروائی کر ڈالوں گا۔''

''بالکل......... بالکل۔'' وہ اپنا سر دھننے لگا۔

میں نے اسے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم بھی ذرا مال کی خرید و فروخت میں احتیاط برتنا، خیال سے۔ کوئی ٹھیکے دار ہمیں چوری کا مال پیلنے کی کوشش نہ کرے۔ بالخصوص نئے ٹھیکیداروں کے سلسلے میں احتیاط کرنا۔''

''ٹھیک ہے سر جی! میں اس بات کا خیال رکھوں گا، جی کڑا کے۔''

''کیا مطلب جی کڑا کے؟......... کیا تمہارا کام کرنا دوبھر ہو گا؟'' میں نے دانستہ اس کے نئے تکیہ کلام پر مصنوعی غصے سے گھور کر پوچھا۔ وہ گھبرا کر بولا۔

''اونن......... نہیں جی......... سر جی! میرا مطلب تھا کہ میں زیادہ اچھے طریقے سے خیال رکھوں گا۔ جی کڑا کے.........'' وہ اچانک چپ ہو گیا۔

''اچھا ٹھیک ہے......... تم جا سکتے ہو۔'' میں نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔ میں ریوالونگ چیئر کی پشت گاہ سے سر ٹکا کر کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا۔

ہمارے ازلی دشمن شاہ میر اور نظر حیات کو میں جب بھی کسی پریشانی یا مصیبت میں تلملاتا ہوا دیکھتا تھا تو مجھے بڑی ذہنی آسودگی ملتی تھی۔ اس طرح نظر حیات کا اپنے نقشِ قدم پر چلنے والے بیٹے کی گمشدگی پر پریشان اور متفکر ہونا میرے لئے باعث مسرت تھا۔

اگرچہ وہ اس کی گمشدگی کا الزام میرے سر پر تھوپ کر مجھے دھمکی بھی دے کر گیا تھا لیکن مجھے اس کی گیدڑ بھبکیوں کی چنداں پرواہ نہ تھی۔ میں تو فقط کبیر کے بارے میں یہ سوچ رہا تھا کہ زخمی ہونے کے بعد اس کا کیا حشر ہوا تھا؟ اور وہ کہاں تھا؟ عین وقت پر جہنم واصل کالا ناگ کی ترغیب پر اس نے عامل عاروب کے پیروکاروں کے سامنے مجھ پر بے دریغ گولیاں چلا دی تھیں اس لئے اس کا تو یقین تھا کہ عامل عاروب کے پیروکاروں کو بہ خوبی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ کبیر بہرحال ان کا دشمن نہ تھا۔ تاہم میرے اندازے کے مطابق اسے اب تک یہاں پہنچ جانا چاہئے تھا۔ تو پھر آخر وہ گیا کہاں؟ ایک خیال یہ بھی

میرے ذہن میں آتا تھا کہ کہیں ایسا تو نہ تھا کہ عامل عاروب کے پیروکاروں نے اپنے روحانی پیشوا (عاروب) کی ہلاکت یا زخمی ہونے کے بعد مشتعل ہو کر کبیر کو بھی زندہ نہ چھوڑا ہو۔ کیونکہ بہرحال عین وقت پر کالا ناگ اور کبیر نے ہی بھری خانقاہ میں مجھ پر فائرنگ کی تھی اور اس ''تڑابڑی'' میں عامل عاروب بھی زخمی یا ہلاک ہو گیا تھا۔

بہرطور وہ دن خیریت سے گزرا۔ مجھے بھوک نہیں تھی اس لئے میں نے کھانا ہی نہیں کھایا تھا اور شام پانچ بجے تک ٹال میں بیٹھا رہا۔

ٹھیک ساڑھے پانچ بجے میں ٹال سے گھر رخصت ہونے کے لئے اٹھا۔ باہر آ کر اپنی جیپ میں بیٹھا اور جیسے ہی ٹال کے احاطے والے بڑے سے چوبی گیٹ سے باہر نکلا، اچانک ایک انگوری رنگ کی ایف ایکس کار بالکل میری جیپ کے سامنے رکی۔ میں نے بھی بریک لگا دیئے۔ میں نے کار سوار کو دیکھا جو تنہا تھا بلکہ تھی۔ وہ ایک فیشن طراز عورت تھی۔ میں اسے پہچان کر بری طرح چونکا۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ وہ مسز جواد تھی جس کے کبھی کبیر کے ساتھ خفیہ تعلقات تھے مگر بعد میں میری اس سے ''ون ٹو ون'' ملاقات کے بعد بالکل منقطع ہو گئے تھے۔

وہ مجھے جیپ میں سوار دیکھتے ہی فوراً اپنی کار کا دروازہ کھول کر نیچے اتری اور بڑی بے تابانہ انداز میں جیپ کی طرف بڑھی۔ ناچار مجھے بھی نیچے اترنا پڑا۔ مجھے اس کا چہرہ مضطرب سا محسوس ہوا۔ بہرطور وہ میرے قریب آ کر ملتجی لہجے میں بولی۔

''نادر صاحب! مجھے یقیناً آپ نے پہچان لیا ہوگا؟'' میں نے دھیرے سے محض سر اثبات میں ہلانے پر اکتفا کیا تو وہ مزید بولی۔ ''مم........ مجھے آپ کی مدد کی سخت ضرورت ہے۔ پلیز! آپ ذرا دیر کے لئے میرے ساتھ چل سکتے ہیں؟'' وہ پنڈی میں رہتی تھی۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''خیریت تو ہے؟........ کیا آپ ابھی سیدھا پنڈی سے آ رہی ہیں؟''

''ہاں........ میں بہت مشکل میں ہوں نادر صاحب! پلیز میری مدد کریں۔ اس مشکل وقت میں مجھے یقین ہے کہ آپ ہی میری مدد کر سکتے ہیں۔''

''آخر بات کیا ہے محترمہ! کچھ تو بتائیں۔'' میں نے بالآخر پوچھا۔

''پلیز، آپ کو میرے ساتھ میرے بنگلے پر چلنا ہوگا۔''

میں پریشان ہو گیا۔ ''کیا اس وقت؟''

''ہاں........ اسی وقت۔ اور وہ بات ایسی ہے کہ میں یہاں آپ کو نہیں بتا سکتی۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ ہی کوئی اتنی زیادہ واقفیت تھی۔ وہ بہرحال میرے لئے ایک طرح سے مانوس اجنبی ہی تھی۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''دیکھئے خاتون........''

''میرا نام غزالہ ہے۔'' اس نے میری بات کاٹ کر اپنا نام بتایا۔

''ہاں........ لیکن میں آپ کے ساتھ کیسے چل سکتا ہوں؟ اگر آپ کسی پریشانی میں مبتلا ہیں تو آپ کو وہیں، متعلقہ تھانے کی پولیس سے مدد لینی چاہئے تھی۔''

میری مسلسل بے اعتنائی اور بے رخی پر اس کے چہرے پر ایک لمحے کو مایوسی کی رمق اُبھری، پھر دوسرے ہی لمحے اس کی جگہ ایک التجا نے لے لی۔

''پلیز!........ پلیز نادر صاحب! میں........ میں آپ کے پاس بڑی امید لے کر آئی ہوں۔ م

ت پولیس کو بھی بتانے کی نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں، میری آپ کے ساتھ کوئی زیادہ پرانی شناسائی نہیں ہے۔ مگر مختصر شناسائی سے مجھے آپ کے اچھے اور ہمدرد انسان ہونے کا اندازہ ہو چکا ہے........ اور نہ سہی تو انسانی ہمدردی کے ناتے ہی سہی۔ پلیز! میں اس وقت بہت مجبور ہوں۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔

اس غزالہ نامی عورت نے مجھے عجیب سی اُلجھن آمیز پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں نے دیکھا، اس لی آنکھوں سے آنسو ڈھلک آئے تھے۔ مجھے ایسے میں اس پر بڑا ترس آیا۔ میں یوں بھی نرم خو اور ہمدرد بیعت کا مالک تھا اور خدائی فوجداری کا جذبہ تو جیسے میرے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا لیکن اس وقت نام گہری ہونے لگی تھی۔

یوں بھی سردیوں کی شام کو رات کی تاریکی میں بدلتے ہوئے دیر ہی کتنی لگتی ہے؟ مری سے پنڈی کا اصلہ 64 کلومیٹر یعنی 40 میل کے لگ بھگ تھا۔ بل کھاتے اندھیرے جنگلوں کے درمیان بنی سڑک پر قدور بھر تیز رفتاری کے ساتھ بھی پہنچتے پہنچتے دو گھنٹے لگ سکتے تھے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ لگ سکتے تھے۔ کویا رات آٹھ بجے ہم وہاں پہنچتے۔ اور پھر میری واپسی کا مسئلہ بھی تھا۔ وہاں نہ جانے کیا حالات تھے۔ لیا بات تھی؟ یہ ساری باتیں سوچنے کے بعد میں نے غزالہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''دیکھئے محترمہ! گھر میں میری والدہ میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ وہ پریشان ہو جائیں گی۔''

''آ........ آپ اپنی والدہ صاحبہ کو انفارم کر سکتے ہیں۔'' وہ بولی۔

''کیا کہوں انہیں........ کہ میں رات گئے ایک اجنبی عورت کے ساتھ پنڈی جا رہا ہوں۔ اور کیوں ہار رہا ہوں، یہ میں بھی نہیں جانتا۔''

''آپ کوئی بہانہ بنا سکتے ہیں۔ کسی دوست کی شادی میں شرکت وغیرہ کا یا کسی اور مجبوری کا۔''

گویا وہ مجھے ہر قیمت پر آج ہی اور اسی وقت اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھی اور میرے لئے یہ ہرحال مشکل تھا۔ میں اگر ماں سے کہتا بھی تو کس طرح؟ میں تو اس سے مصلحتاً بھی جھوٹ نہیں بول سکتا نا۔ یہ میری مجبوری تھی۔ نہ جانے وہ کیا سمجھتیں؟ مگر باوجود ان ساری باتوں کے میرا دل نہیں چاہ رہا تھا لہ اس عورت کی مدد سے انکار کروں۔ جانے یہ بے چاری کس مصیبت کا شکار تھی۔ عجیب مشکل میں پھنس لیا تھا میں۔

یوں تو مجھے مسز جواد سے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہ تھا اور نہ ہی میری اس سے کسی قسم کی کوئی دشمنی تھی۔

تب میرے ذہن میں ایک خیال اُبھرا اور میں اس سے بولا۔ ''آپ ایسا کریں، اگر آپ کی جان کو ل وقت فوری طور پر کوئی خطرہ ہے تو میرے ساتھ گھر چلیں۔ وہاں میری والدہ ہیں۔ میں ان سے کوئی نہ وئی بہانہ کر لوں گا۔ پھر اگلے روز صبح سویرے پنڈی کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ سردست یہی ایک ثویز میرے ذہن میں آئی ہے۔''

میری بات پر اس کا چہرہ مزید تاریک ہو گیا۔ پھر وہ بڑی آزردہ سی سانس خارج کر کے غم زدہ سی سکراہٹ سے بولی۔ ''نادر صاحب! اگر ہمیں صبح چلنا ہوتا تو میں اس وقت بھلا آپ کے پاس کیوں آتی؟ ر کوئی بات نہیں، میں آپ کی لگتی ہی کیا ہوں؟ بس ایک ملاقات میں آپ نے مجھے متاثر کیا تھا کہ آپ پنے اندر انسانیت کا درد رکھتے ہیں۔ سو اسی امید کے سہارے چلی آئی تھی۔ آپ کا شکریہ! مجھے آپ سے دئی گلہ نہیں۔''

وہ یہ کہہ کر مایوسانہ انداز میں واپس پلٹی۔ مجھے بے اختیار اس پر ترس آ گیا۔ وہ جب اپنی کار کا دازہ کھولنے لگی تو میں نے بے اختیار اسے آواز دی۔

''ٹھہریئے ذرا........'' میری بات سن کر وہ پلٹ کر امید بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگ
میں نے کہا۔ ''آپ اپنی کار میں بیٹھیں، میں اپنی جیپ میں آتا ہوں۔''

میری بات سن کر وہ خوشی سے نہال ہوگئی اور اگلے لمحے ہی وہ اپنی کار میں سوار ہوگئی اور میں نے جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

ذرا دیر بعد ہی ہم دونوں پنڈی کی طرف رواں تھے۔ بالآخر میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ پہلے پ تو پہنچوں، صورتِ حال کیا ہے؟ اس کے بعد ضرورت پڑی تو ماں کو وہیں سے فون کر کے کوئی نہ کوئی کرنا پڑے گا۔ بلکہ بہانہ کیا، حقیقت ہی بتا تا کہ اس طرح کوئی مصیبت کا مارا دوست ملا تھا اور میں ا ہمدردی سے مجبور ہو کر اس کے ساتھ ہولیا۔ سوا آٹھ بجے رات ہم پنڈی پہنچے۔

بنگلے کے سامنے پہنچ کر ہم نے اپنی گاڑیاں روک دیں اور نیچے اُتر آئے۔ بنگلے پر ویرانی اور عجیب پراسرار خاموشی کا راج تھا۔ غزالہ نے جلدی سے آہنی گیٹ کا تالا کھولا اور مجھے اندر داخل ہونے کو کہا۔

پھر میرے بعد وہ بھی اندر آ گئی۔

ہم مرکزی دروازے سے اندر کمرے میں پہنچے اور ایکا ایکی میری چھٹی حس نے خطرے کا الارم بج لیکن میں نے کوئی توجہ نہ تھی۔ وجہ یہی تھی کہ میری غزالہ سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اس نے مسکرا کر ایک صوبے پر بیٹھنے کا کہا۔

میں خاموشی سے بیٹھ گیا۔ ذرا دیر میں آنے کا کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

اچانک ایک سرد نال میری گردن سے آن لگی۔

''خبردار! کوئی حرکت مت کرنا۔ ورنہ اس خاموش پستول کی گولی گردن سے پار ہو جائے گی۔''

ایک سرسراتی ہوئی یکسر اجنبی، سفاک آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔ میں اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا۔ دل جیسے یکدم سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا تھا۔

جب اس نامعلوم شخص کو یہ تسلی ہوگئی کہ میں کسی مزاحمت کے موڈ میں نہیں تو اس نے مجھے دوسرا دیا۔ ''اب پیچھے دیکھے بغیر اٹھ کر آگے بڑھو۔''

میں تعمیل حکم میں ہونٹ بھینچ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مجھے سامنے والے کمرے کے درواز طرف بڑھنے کو کہا۔ میں نے قدم آگے بڑھا دیئے۔ مجھے خطرے کی بو محسوس ہونے لگی تھی۔ غزالہ عورت نے مجھے دھوکا دیا تھا۔ مگر کیوں؟........اس کا جواب سوچنے کا یہ موقع نہ تھا۔ مجھے سردست گلوخلاصی کے بارے میں سوچنا تھا۔ حالات سے اندازہ ہوتا تھا کہ مجھے کسی خطرناک جال میں پھنسا کی کوشش کی جارہی تھی۔ جبکہ مجھے پھنسنے سے پہلے ہی یہ جال توڑنا تھا۔

مجھے یہ تو بخوبی اندازہ ہو چلا تھا کہ مجھے حکم دینے والے شخص کا کوئی ساتھی نہیں تھا۔ وہ وہاں اکیلا لہٰذا میں مذکورہ کمرے کے بند دروازے تک پہنچ کر دانستہ رکا تو حسب توقع اس نے عقب سے غرا کر

''دروازہ اندر دھکیلو۔''

میں نے فوراً آگے بڑھ کر دروازے کے ''لٹو'' پر ہاتھ رکھا اور اسے گھما کر دانستہ یوں جھک دروازے کو دھکیلا کہ میری گدی سے پستول کی سرد نال ہٹ گئی۔ گن پوائنٹ سے ''آؤٹ'' ہوتے میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ جھکائی دی۔ میری توقع کے عین مطابق اس نے غیر ارادی طور پر ا خاموش، سائلنسر لگے پستول کا ٹرائیگر دبا دیا۔ ''ٹھک'' کی آواز سے گولی چلی لیکن میں جھکائی دے چ اور ساتھ ہی اپنے دائیں بازو کی کہنی کا زوردار وار اس کے پہلو پر کیا۔ ضرب کی شدت نے اسے

کراہنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے حلق سے اوغ کی آواز نکلی۔ یقیناً میری کہنی نے اس کے حواس بگاڑ کر رکھ دیئے تھے۔ میرے لئے یہ لمحاتی وقفہ ہی کافی تھا۔ میں بجلی کی طرح پلٹا اور ایک مُکا اس کے پستول والے ہاتھ کی کلائی پر رسید کر دیا۔ نتیجتاً پستول ہاتھوں کے طوطے کی طرح اُڑ کر اس کے ہاتھ سے نکلتا چلا گیا۔ اس نے نقاب چڑھا رکھا تھا۔

میں نے دوسرا گھونسا اس کے درباری انداز میں جھکے ہوئے چہرے پر رسید کرنا چاہا مگر شاید اسے میرا زیادہ پھیلنا پسند نہیں آیا تھا، لہٰذا اس نے جوابی کارروائی کرتے ہوئے اپنے جھکے ہوئے سر سے میرے پیٹ میں ٹکر رسید کر دی۔ وہ خاصا تنومند شخص تھا۔ ڈیل ڈول میں مجھ سے زیادہ تھا مگر قد و قامت میں نہیں۔ اس لئے اپنی اور میری کمزوری کو ایڈجسٹ کرتے ہوئے اس نے اپنے فٹ بال نما سر سے ہی کام لیا تھا جسے میرے پیٹ پر رسید کرتے ہی وہ مجھے کمرے کے اندر تک دھکیلتا چلا گیا۔ پیٹ پر زوردار ٹکر اور پھر اچانک دھکیلے جانے پر میرے قدم غیر ارادی طور پر پیچھے لڑکھڑاتے چلے گئے۔ اور بالآخر میں بیڈ پر جا پڑا۔ بیڈ پر کمر کے بل گرتے ہی مجھے اپنے نیچے ایک انسانی وجود کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میرا خیال تھا کہ میرے اس طرح اس پر سوار ہونے سے اس کی حالت خراب ہوگئی ہوگی تاہم وہ وقت ایسا نہیں تھا کہ میں اس کی حالت کی فکر کرتا۔ مجھے تو اپنی فکر کرنی تھی۔ میرا دشمن میری جان کے درپے تھا۔ لہٰذا اس نے جیسے ہی مجھے بیڈ پر دھکیلا تو گویا اس نے مجھے دوبارہ وار کرنے کا ایک سنہری موقع پلیٹ میں سجا کر پیش کر دیا۔ میری دونوں ٹانگیں بیک وقت حرکت میں آئیں اور پوری قوت سے اس کے سینے پر ضرب لگانے میں کامیاب ہوگئیں۔ وہ غالباً زمین سے چند انچ اُڑتا ہوا اپنے عقب میں دیوار سے جا ٹکرایا۔ میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ خود کو بیڈ پر سے اسپرنگ کی طرح اچھالا اور سیدھا اس نقاب پوش پر جھپٹا۔ اس نے دیوار سے اپنی پشت ٹکاتے ہوئے مجھ پر لات رسید کرنی چاہی اور پھر تو جیسے مجھے اس پر کاری وار کرنے کا موقع مل گیا۔

میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی ٹانگ پکڑ لی اور اپنی دوسری ٹانگ زمین پر ٹکی اس کی اکلوتی ٹانگ پر سویپ کے انداز میں رسید کر دی۔ مگر اس کی پہلی ٹانگ میں نے مضبوطی سے اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑے رکھی۔ نتیجتاً جیسے ہی وہ زمین بوس ہوا، میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی ٹانگ مروڑ کر اسے اوندھا کر دیا۔ پھر اس کی دونوں ٹانگوں کو اس کے کولہوں کی طرف فطری انداز میں موڑ کر اس پر اپنے پورے وزن کے ساتھ بیٹھ گیا۔

اس کے حلق سے بیل کے ڈکرانے جیسی آواز خارج ہوئی۔ میں نے زوردار مُکا اس کی ریڑھ کی ہڈی کے آخری مہرے پر رسید کیا تو وہ اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ چکا تھا۔ وہ ہوش میں تھا مگر اس کا نچلا دھڑ بے کار ہو چکا تھا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اپنے دونوں بازوؤں کی مدد سے سنبھلنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی لمحے میری نظر غیر ارادی طور پر سامنے بیڈ پر پڑی اور میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ بیڈ پر ایک انسانی وجود پشت کے بل لیٹا ہوا تھا مگر اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر دستے تک خنجر پیوست تھا۔

بیڈ پر خون پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا جو کافی حد تک اس کے میٹرس میں جذب ہو چکا تھا۔ میں اس شخص کو پہچان چکا تھا جو اب یا جانے کب کا مردہ ہو چکا تھا۔ وہ غزالہ کا معذور شوہر جواد احمد تھا جو اب لاش میں تبدیل ہو چکا تھا۔

اچانک خواب گاہ کے دروازے پر غزالہ نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں سائلنسر لگا وہی پستول دبا ہوا

تھا جو نقاب پوش کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا تھا۔ اس نے جو سامنے بیڈ پر اپنے شوہر کی خون آلود لا
دیکھی تو ایک زوردار چیخ ماری۔ مجھے اس کی چیخ کا مطلب و مقصد سمجھ میں نہ آ سکا۔ پھر دوسرے ہی
میں نے دیکھا، وہ زمین بوس پڑے اس نقاب پوش کو غضب ناک نظروں سے گھورتے ہوئے ہذیانی ان
میں چلّا کر بولی۔

''ذلیل!......خونی!......تت......تُو نے......تُو نے میرے شوہر کو مار ڈالا۔'' یہ کہہ کر اس
اپنے پستول کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ میں غزالہ کو روکنے کی کوشش کے بارے میں ابھی غور ہی کر رہا
کہ اس نے تلے اوپر دو تین بار ٹرائیگر دبا کر اسے ہلاک کر ڈالا۔

اس کے بعد پستول ایک جانب پھینک کر وہ بیڈ کی طرف لپکی اور اپنے شوہر کی لاش سے لپٹ
رونے لگی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا تھا اور کیوں تھا؟

میرے جی میں تو آئی کہ میں اس سارے نہ سمجھ میں آنے والے پراسرار خونی کھیل پر لعنت بھیج
اور جل تُو جلال تُو، صاحبِ کمال تُو، آئی بلا کو ٹال تُو کا ورد کرتے ہوئے فوراً یہاں سے نکل جاؤں۔ لی
میں غزالہ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آخر اسے مجھ سے کس بات کی دشمنی تھی؟ یا کیا اس نے میرے ا
احسان کا بدلہ چکایا تھا کہ میں نے اسے کبیر جیسے کمینے اور کینہ پرور شخص کے شیطانی چنگل سے بچایا تھا۔

مگر میں خود حیران تھا کہ اگر یہ سارا کیا دھرا مسز جواد کا ہی تھا تو پھر وہ تو پہلے ہی یہاں موجود تھ
اس کا اپنے معذور شوہر کی لاش سے لپٹ کر رونے کا کیا مطلب تھا؟

بالآخر میں نے ذرا قریب آ کر اس سے استہزائیہ لہجے میں پوچھا۔ ''یہ سب کیا ڈرامہ ہے محترمہ!
آپ اس خونی ڈرامے میں میرا کردار بھی شامل کرنا چاہتی تھیں؟''

اس نے بین کرنا بند کیا، پھر سیدھی کھڑی ہو کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لب
تھیں۔ چہرہ نہایت آزردہ نظر آ رہا تھا مگر مجھے یہ سب مصنوعی لگا تھا۔ اس کے آنسو مگر مچھ کی یاد دلا ر
تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنی صفائی میں بڑا خوبصورت اور رُلا دینے والا جھوٹ بولے گی۔ مگر اس
چہرے پر ایسے ملتجیانہ تاثرات نہیں تھے۔

''نادر صاحب!......آ......آپ یہاں سے چلے جائیں۔'' میں اس کے ان اکھنڈ سنجیدہ جملو
پر ششدر رہ گیا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے اسے گھور کر درشت لہجے میں بولا۔

''نہیں......تمہیں مجھے بتانا پڑے گا، یہ سب کیا تھا؟ آخر تم میرے ساتھ کون سی دشمنی نکالنا چا
ہو؟''

''آپ کا کام ختم ہو گیا۔ آپ جائیں۔ اس میں ہی آپ کی بھلائی ہے۔ ورنہ اس چکر میں آپ
گناہ پھنس کر رہ جائیں گے۔''

وہ کافی حد تک خود کو سنبھال چکی تھی۔ آنسو بھی خود بخود اس کے خشک ہونے لگے تھے۔

''کون سا کام لیا ہے تم نے مجھ سے؟'' میں نے اپنی آنکھیں سکیڑ کر اس سے پوچھا۔

''جو کام میں آپ سے لینا چاہتی تھی، وہ میں نے لے لیا ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''
شاید مجھے دیر ہو گئی۔ کاش میں پہلے ہی یہ کام کر دیتی۔''

مجھے اس کی عجیب و غریب باتوں پر حیرت ہوتی جا رہی تھی۔ مگر میں بھی اڑ گیا تھا۔ ''میں ایسے نہ
جاؤں گا۔ پہلے تمہیں مجھے بتانا پڑے گا۔ آخر تم مجھے یہاں خود ضد کر کے لائی تھیں اور مزید کہ یہاں
لاشیں بھی موجود ہیں۔ ایک تمہارے شوہر کی، دوسری اس نقاب پوش کی جسے تم نے ہلاک کر ڈالا ہے

میرے لہجے میں خود بہ خود تندی اور درشتی آ گئی تھی۔

''نادر صاحب!......پلیز، ضد نہ کریں۔ ابھی آپ جائیں۔ بعد میں آپ کو ساری حقیقت بتا دوں گی۔ مجھے ان دونوں لاشوں کے بارے میں بھی سوچنا ہے۔''

''یہ کوئی مشکل کام نہیں تمہارے لئے۔'' میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ''تم با آسانی پولیس میں یہ بیان دے دو گی کہ اس شخص نے تمہارے شوہر کو خنجر مار کر قتل کر ڈالا ہے، تم نے اپنے دفاع میں اس کے پستول سے اسے مار ڈالا۔ لیکن میں یہاں پر موجود ہوں، عینی گواہ کی صورت میں۔ پولیس میرے بیان کو زیادہ اہمیت دے گی۔'' میں نے اسے دوسرے طریقے سے دھمکی دی۔ میری توقع کے برخلاف وہ زہریلی مسکراہٹ سے بولی۔

''پولیس کے سامنے آپ کے نہیں بلکہ میرے بیان کی زیادہ اہمیت ہو گی نادر صاحب! کیونکہ اس وقت آپ میری چھت کے نیچے موجود ہیں۔ آپ اس نقاب پوش کے ساتھ بھی ہو سکتے ہیں۔''

اسے ڈرانے کی بجائے الٹا میں ڈر گیا۔ کسی نے درست ہی کہا، عورت واقعی چالباز ہوتی ہے۔ اپنے چلتر پر اتر آئے تو اچھے اچھوں کو تگنی کا ناچ نچا دیتی ہے۔ مگر میں بھی اس کی دھمکی سے مرعوب ہونے والا نہیں تھا۔ میں نے اسے سیدھا کرنے کے لئے ٹیڑھی انگلی سے کام لیا اور جھپٹ کر اس کی نرم و نازک گردن دبوچ لی، وہ کراہ کے رہ گئی۔

''مجھے سیدھی طرح سے بتاؤ، یہ سب کیا چکر تھا؟......ورنہ میں تمہارا ابھی برا حشر کر کے رکھ دوں گا۔'' یہ کہہ کر میں نے اس کی گردن ذرا ڈھیلی چھوڑی تو اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

''آپ کو اجازت ہے۔ میرا جو حشر چاہے کریں۔ کیونکہ میں جانتی ہوں آپ ایسا نہیں کر سکتے۔''

میں بھنا کر رہ گیا۔ ''لعنت ہے تجھ پر۔'' میں نے دانت پیس کر کہا اور ایک جھٹکے سے اس کی گردن چھوڑ دی۔ پھر نقاب پوش کی لاش کی طرف بڑھا۔ جھک کر میں نے اس کے چہرے سے نقاب نوچ لیا۔ اس کا چہرہ میرے لئے اجنبی تھا۔

پھر میں نے ایک غصیلی نظر جواد کی بیوہ پر ڈالی۔ اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ میرے وجود میں جانے کیوں پھریری سی اترنے لگی۔ میں نے پھر واقعی اس سارے پراسرار معاملے پر ایک عدد لعنت بھیجی اور باہر نکل آیا۔ اپنی جیپ میں بیٹھا اور واپس ہو لیا۔

رات کے آخری اور دم توڑتے پہر میں، میں ''گرین لاج'' پہنچا۔

مجھے اس بات کی حیرت تھی کہ ابھی تک ماں نے میرے ٹال سے گھر نہ پہنچنے پر مجھ سے موبائل پر رابطہ کیوں نہیں کیا تھا؟ بہرطور میں جیپ سے اترا اور دروازے کی طرف بڑھا تو بری طرح ٹھٹک گیا۔ میں نے دروازہ تھوڑا کھلا ہوا پایا۔ خطرے کی بُو محسوس کرتے ہی میں ادھ کھلے دروازے کو زور سے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا تو مجھے در و دیوار سے چمٹے وحشتوں بھرے سناٹے چیختے محسوس ہوئے۔

''ماں!......ماں!'' میں پکارتا ہوا ماں کے کمرے کی طرف بڑھا مگر وہ مجھے کہیں نظر نہ آئیں۔ پھر میں سکینہ کو پکارنے لگا۔ اپنے شوہر (فضل چاچا) کے مرنے کے بعد وہ مستقل یہیں رہتی تھی۔ کبھی کبھار وہ اپنے عزیزوں سے ملنے نیچے وادی میں چلی جاتی تھی۔ میں باہر آیا اور چوکیدار کو آواز دی مگر وہ بھی موجود نہیں تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا اور دل جیسے کنپٹیوں پر بے تحاشا دھڑکنے لگا۔ میں واپس پلٹا اور اندر آیا تو اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو!'' میں نے لپک کر ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے ایک اجنبی اور کھرکھراتی ہوئی آواز اُبھری۔

''مسٹر نادر!'' لہجے میں استفسار تھا۔
''ہاں.........بول رہا ہوں۔تم کون ہو؟''
''تمہاری ماں کا یار۔'' دوسری طرف سے انتہائی زہریلے لہجے میں کہا گیا اور اس لغو گوئی پر جیـ میرے سارے وجود کا لہو آنکھوں میں سمٹ آیا۔
''.........کی اولاد!.........تُو بھول رہا ہے، تیری ماں کا یار تو میں ہوں۔تُو ہے کون کمینے انسا'' جوشِ غیظ میں مجھے مجبوراً اس کی سطح تک اترنا پڑا۔
''ہا.........ہا.........ہا.........میری تو ماں ہی نہیں ہے۔خیر چھوڑو، تمہاری تو ہے نا۔'' دوسری جا سے قہقہہ لگا کر کہا۔ ''اچھا سنو، پولیس کو بالکل خبر نہ ہونے پائے کہ تمہاری خوبصورت اور حسین، پُرشبا مگر پکی عمر کی ماں ہمارے قبضے میں ہے۔سمجھے۔''
''ذلیل!.........کتے!.........کمینے! مجھے اپنا نام بتا۔ تجھے پولیس نہیں، میں سبق سکھاؤں گا۔''
اس کی یہ دستور لغو بیانی اور گھٹیا گفتگو پر میرے اندر آتش فشاں ابلنے لگا۔
''ہاں، ہاں.........بتاتے ہیں۔لیکن بس ہمارا ایک چھوٹا سا کام کر دو۔غفورے کو چھوڑ دو۔'' دوسـ طرف سے کہا گیا۔
''مجھے نہیں معلوم غفورا کہاں ہے؟''
''اپنی ماں کا تو معلوم ہے نا کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟'' وہ پھر کمینے پن پر اترنے لگا۔
مجھے یوں لگا جیسے میرے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی۔تاہم میں نے اپنی خوں ناک کیفیات پر قا پاتے ہوئے کہا۔
''وہ پولیس کی قید سے فرار ہو چکا ہے۔اس سے پہلے وہ پولیس کی قید میں ہی تھا۔''
''مجھے بہلانے کی کوشش مت کرو نادر علی خان!'' دوسری طرف سے اس نے دانت پیس کر غرا ہوئے کہا۔ ''میں اچھی طرح جانتا ہوں، غفورے کو کس نے اور کیوں پولیس کی حراست سے فرار کر ہے۔اور یہ حقیقت تم بھی جانتے ہو اور تمہاری ماں بھی، کیا بتاؤں نام؟'' دوسری طرف سے طنزیہ کہا گیـ جواباً میں نے دانستہ خاموشی اختیار کی تو وہ دوبارہ بولا۔ ''اعظم خان نام ہے اس شخص کا۔ویسے میں اسے بھی فون کر کے ہوشیار کر دیا ہے۔''
''یہ جھوٹ ہے۔'' میں نے کہا۔
''فضول باتوں میں وقت ضائع کرو گے تو غفورے کی جان خطرے میں پڑ سکتی ہے۔کیونکہ میں اچـ طرح جانتا ہوں کہ غفورے کی موت تم تینوں کے لئے کس قدر اہمیت رکھتی ہے۔اگر غفورے کو کچھ ہو گیا سمجھو، میں تمہاری ماں کا وہ حشر کروں گا کہ اسے خود اپنے خوبصورت سے وجود سے گھن آنے لگے گی۔''
''کتے!.........بکواس بند کر اپنی۔تُو نہیں جانتا کہ تُو نے کس کی ماں کو اغواء کرنے کی جراَت ہے۔اگر تُو نے.........''
''بس، بس۔گیدڑ بھبکیاں دینے سے بہتر ہے کہ کام کی بات کرو یا پھر میں فون بند کر رہا ہوں۔''
''بولو.........کیا چاہتے ہو؟'' بالآخر میں نے دانت بھینچ کر مجبوراً ذرا معقولیت کا مظاہرہ کیا۔
''غفورے کی واپسی۔زندہ اور صحیح سلامت۔''
میں جانتا تھا کہ اب اس سے جھوٹ بولنا بے کار ہے۔کیونکہ وہ اپنی معلومات کا رعب مجھ پر ڈال تھا۔اس سے بحث کرنے کا مطلب اپنی ماں کو مزید ذہنی کرب میں مبتلا کرنے کے مترادف تھا۔اور

مجھے اس خبیث اور نطفہ خنزیر کا پتہ بھی تو چلانا تھا، لہٰذا بولا۔
''غفورا تم کو مل جائے گا۔مگر میری ماں.........''
''یہ ہوئی نا کام کی بات۔'' دوسری طرف سے تاؤ دلانے والی مسرت سے کہا گیا۔ ''اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے والا معاملہ ہو گا۔''
''کب اور کہاں؟''
''یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔پہلے تم اعظم خان سے بات کر لو۔اور جب میں دوبارہ فون کروں تو غفورے کی آواز سنوں گا۔او کے، بائی!'' یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔
میرا پورا وجود غصے کی آگ میں بری طرح پھنکنے لگا۔میں نے اپنی جلتی سلگتی کیفیات پر بہ مشکل قابو پایا، کریڈل دبا کر خان صاحب کے نمبر پنچ کرنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک میرے موبائل کی بیل گنگنائی۔میں نے ریسیور رکھا۔جیب سے اپنا موبائل نکال لیا۔اسکرین پر اعظم خان کا نمبر اُبھرا ہوا تھا۔میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ موبائل کان سے لگا کر کہا۔
''ہیلو انکل!'' میں نے دانستہ اتنا ہی کہا تو دوسری طرف سے ان کی مضطربانہ آواز اُبھری۔
''نادر بیٹے! تمہارے پاس.........کسی کا فون آیا تھا؟''
''ہاں.........ابھی تھوڑی دیر پہلے آیا تھا۔'' میں نے کہا۔
''کون تھا وہ؟.........کیا کہہ رہا تھا؟''
میں نے جواباً انہیں ساری بات بتا دی۔
''تم ابھی گرین لاج میں ہی ہو نا؟''
''جی۔''
''میں آ رہا ہوں۔''
''کیا غفورے کو لے کر؟''
''نہیں، میں اکیلا آ رہا ہوں۔''
''نہیں انکل! اب غفورے کو ساتھ لانا ہو گا۔میں نے اسی طریقے سے نمٹنے کا فیصلہ کیا ہے۔'' میں نے غضب ناک انداز میں کہا۔
''بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔میں آ رہا ہوں۔'' انہوں نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔
نصف گھنٹے بعد وہ میرے سامنے تھے۔
''انکل! اس نے کہا تھا کہ ذرا دیر بعد دوبارہ فون کروں گا اور.........اب میں صرف غفورے کی آواز سننا چاہتا ہوں۔'' میرے لہجے میں تشویش تھی۔
''آنے دو اس کا فون۔میں خود بات کروں گا۔'' خان صاحب بولے۔
''انکل! وہ بڑا خبیث آدمی ہے۔بڑے نازیبا الفاظ استعمال کر رہا تھا ماں کے بارے میں۔''
''ہوں.........'' اعظم خان نے ایک پُرسوچ ہنکارا بھرا مگر بولے کچھ نہیں۔
''انکل! ویسے غفورا زندہ تو ہے نا.........؟'' میں نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے ایک اندیشے کے تحت پوچھا۔
''بے فکر رہو۔وہ زندہ ہے۔دراصل میں اس سے ایک ''کمٹ منٹ'' کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''
وہ پُرسوچ لہجے میں خود کلامی کے انداز میں بولے۔

''ویسے وہ ہے کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''اسے میں نے جہاں یرغمال بنا کر رکھا ہے، وہ جگہ یہاں سے بہت دور ہے۔''

''انکل! ایک بات بتائیں۔'' میں نے کسی خیال کے تحت ان سے کہا۔

''کہو!'' وہ استفسار طلب لہجے میں بولے۔

''آفٹر آل، غفورا آپ ہی کا آدمی تھا۔ کیا آپ اس کے دوسرے ساتھیوں کو یا اس کے ٹھکانے کو نہیں جانتے؟'' میں نے اپنے تئیں ایک اہم سوال پوچھا۔

وہ جواباً بولے۔ ''نادر بیٹے! غفورا میرا ہی آدمی تھا۔ وہ درحقیقت ایک فلم مافیا سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نے کسی معروف اداکارہ کو بھی قتل کیا تھا مگر اس کے خلاف ٹھوس ثبوت نہ ہونے کے باعث وہ رہا کر دیا گیا تھا۔ اگرچہ اس میں میری کوششوں کا بھی دخل تھا۔ اس اداکارہ کا نام سپنا تھا۔ رہی بات اس کے دیگر ساتھیوں اور اس کے ٹھکانے کی تو میں صرف اسے فلم پروڈیوسر اشفاق شاہین کے ساتھ ہی دیکھا کرتا تھا۔ لیکن میرا انہیں خیال تھا کہ یہ حرکت اس فلم پروڈیوسر اشفاق شاہین کی ہو سکتی ہے۔''

وہ اتنی ہی صراحت کرنے کے بعد خاموش ہوئے تو میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔ ''کیا اس فلم پروڈیوسر اشفاق شاہین کا تعلق بھی فلم مافیا سے ہے؟''

''شاید.........'' وہ بولے۔ مگر پھر جیسے میرے سوال کا مطلب سمجھ کر دوبارہ بولے۔ ''ویسے یہ عین ممکن ہے کہ اس کا تعلق فلم مافیا سے بھی ہو۔''

میں جیسے اس جواب کا منتظر تھا، لہٰذا فوراً ہی بول اٹھا۔ ''انکل! پھر تو مجھے سو فیصدی یقین ہے کہ یہ حرکت غفورے کے اس گرو گھنٹال پروڈیوسر اشفاق شاہین کی ہی ہو سکتی ہے۔ ہمیں اسے ٹریس کر کے ٹریپ کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔''

میری تجویز پر وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ لیکن پھر فوراً میں نے خود اپنی ہی تجویز رد کر دی اور خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ ''لیکن نہیں......... اس طرح تو وقت ضائع ہو گا اور یہ بات بھی حتمی نہیں کہ ماں اس کی قید میں ہو سکتی ہے۔ یہ بات اغواء کنندگان کو طیش دلانے کے مترادف ہو گی۔''

یہ کہہ کر میں نے اپنے ذہن میں پہلے پہل اُبھرنے والے منصوبے کے بارے میں غور کیا جس کا ابھی میں نے ان سے ذکر بھی کیا تھا

''انکل! ان نامعلوم اغواء کنندگان سے نمٹنے کا ایک یہی طریقہ کارگر ہو سکتا ہے کہ سرِدست ان کی بات مان لی جائے۔ پہلے غفورے سے ان کی بات کرا دی جائے، اس کے بعد سیدھے سیدھے ان سے اس ہاتھ لے اور اس ہاتھ دے والا سودا کریں۔ اس دوران وہ جو کوئی بھی ہو گا، ہمارے سامنے آ جائے گا اور پھر اس پر میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش بھی کروں گا۔''

''مگر نادر بیٹے! اس میں خطرہ بہت زیادہ ہو گا۔ تم اس سے نمٹو گے یا اپنی ماں شبینہ کو بچاؤ گے؟ اور پھر ہماری ناکامی کی صورت میں غفورا بھی ہاتھ سے نکل جائے گا اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اگر غفورا ہاتھ سے نکل گیا تو.........''

''انکل! مجھے اس وقت اپنی ماں کی جان پیاری ہے اور بس......... میں کسی اگر مگر میں نہیں پڑ سکتا۔'' میں نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔ ''ماں جس کمینے کی قید میں ہے، اس کے خباثت بھرے لہجے اور کمینگی نے مجھے اندر سے لرزا کر رکھ دیا ہے۔ آپ بے فکر ہو کر غفورے کو میرے حوالے کر دیں، میں خود ان لوگوں سے نمٹوں گا۔''

''مجھے تم، تمہارے حوصلے اور بہادری پر پورا یقین ہے۔'' وہ میری طرف دیکھ کر بولے۔ ''لیکن یہ دھیان رہے کہ تمہاری کوشش یہی ہو کہ غفورا بھی ہاتھ سے جانے نہ پائے۔''

''آپ کو آخر اس کی فکر کیوں کھائے جا رہی ہے انکل! جاتا ہے تو جائے جہنم میں۔ ہمیں اس سے کیا لینا دینا؟''

میری بات پر انکل اعظم خان یوں حیرت سے میرا چہرہ تکنے لگے جیسے میں نے کوئی بچگانہ بات کہہ ڈالی ہو۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو نادر بیٹے!'' وہ حیرت سے بولے۔ ''تم تو اچھی طرح جانتے ہو، وہ آزاد ہوتے ہی پولیس کی گرفت میں بھی جا سکتا ہے اور اس کا پولیس کی گرفت میں جانے کا مطلب اپنے دیرینہ دشمنوں شاہ میر اور نظر حیات کو اپنے خلاف ہتھیار دینا ہو گا۔ مجھے اپنی فکر تو نہیں لیکن تمہاری ماں شبینہ اور تمہارے لئے اچھا نہ ہو گا۔''

''انکل! یہ بعد کی باتیں ہیں......... غفورا اتنا تر نوالہ نہیں ثابت ہو سکتا۔'' میں نے ان سے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ خود ایک بہت بڑا گینگسٹر ہے۔ پولیس کے ہتھے اتنی آسانی سے نہیں چڑھ سکتا۔''

میری بات پر انکل اعظم نے ایک طویل سانس خارج کی، پھر اٹھتے ہوئے بولے۔ ''ٹھیک ہے پھر۔ میں کسی طرح غفورے کو یہاں لانے کی کوشش کرتا ہوں۔''

میں بھی اٹھ کھڑا ہوا مگر جواباً خاموش ہی رہا۔ انکل اعظم خان رخصت ہو گئے۔

میرا دل بری طرح بے چین تھا۔ نامساعد حالات کے تھپیڑے اس تواتر کے ساتھ مجھے اپنی زد میں لئے ہوئے تھے کہ میرا دل و دماغ گنجلک ہو کر رہ گیا تھا۔

کہاں تو میں نگینہ کو یہ خوشخبری سنانے کے لئے بے چین ہو رہا تھا کہ ماں ہم دونوں کی شادی پر رضامند ہو چکی ہے، ماں کے اندر کی برف پگھلنے لگی تھی۔ یہ تقدیر کی طرفہ کاری ہی تھی کہ حالات مجھے ایک جگہ ٹکنے نہیں دے رہے تھے۔ میں اس نامعلوم شخص کے فون کا منتظر تھا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ اتنی دیر میں انکل اعظم خان غفورے کو یہاں لے آئیں۔

پھر وہ تو نہ آئے البتہ ذرا ہی دیر میں ان کا فون آ گیا۔ ''نادر بیٹے! میرا غفورے کو لانا مناسب نہیں ہے۔ تم ایسا کرو، اس نامعلوم شخص کا فون آئے تو اسے میرا موبائل نمبر دے دینا۔ میں غفورے سے اس کی بات کرا دوں گا اور معاملہ بھی طے کر کے تمہیں بتا دوں گا۔ مجھے پولیس کے مخبروں کا خدشہ ہے۔''

مجھے ان کی بات مناسب لگی۔ میں فون کا انتظار کرتا رہا لیکن فون نہ آیا۔ میں اونگھتا، سر جھٹکتا ہوا بالآخر سو گیا۔

دن چڑھے میری آنکھ کھلی۔ میں ڈرائنگ روم میں ہی صوفے پر سو گیا تھا۔ مجھے بعد میں سکینہ نے جگایا تھا۔ بقول اس کے وہ کل شام اپنے کسی بیمار عزیز کی مزاج پرسی کرنے نیچے وادی میں گئی تھی بلکہ چوکیدار بابا نے صبح ہی سے چھٹی لے رکھی تھی۔ میں نے انہیں ماں کے اغواء کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

میں نے ان سے کسی کے فون وغیرہ کے آنے کا دریافت کیا تھا مگر ان کا جواب نفی میں تھا۔ میں نے ناشتہ وغیرہ کیا اور ٹال فون کر کے منیجر مشتاق سے بات کی۔

''میں آج ٹال نہیں آ سکوں گا۔ تم سنبھال لینا۔''

''آپ بے فکر رہیں۔ میں ہوں نا......... جی کڑا کے۔'' اس کی مخصوص آواز ابھری۔ اس سے پہلے کہ وہ طویل گفتگو کرے، میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میں اس وقت ماں کی وجہ سے سخت پریشان ہو رہا تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ ماں ایک کمینے شخص ک
میں تھی۔ اچانک میرے موبائل کی بیل گنگنائی۔ یہ نگینہ کی کال تھی۔

''ہیلو نادر! کیسے ہو؟'' اس کی مترنم آواز اُبھری۔ میرے دل میں یاس زدہ ہوک اُٹھی۔ کاش
اسے خوشخبری سنا سکتا۔ تاہم بولا۔

''خیریت نہیں ہے نگینہ!''

''کیوں؟.........کیا ہوا؟.........تم.........ٹھیک.........تو ہو نا؟'' اس کے لہجے میں ایکا
پریشانی در آئی۔

''ماں کو چند نامعلوم افراد نے اغواء کرلیا ہے۔'' بالآخر میں نے بتایا۔

''اوہ گاڈ.........کب؟.........کیسے؟'' وہ بری طرح پریشان ہو گئی۔

''یہ ابھی میں نہیں جانتا۔ شاید کوئی اغواء برائے تاوان کا معاملہ ہوگا۔'' میں نے اصل حقیقت چھ
بات بنائی تو اس نے پوچھا۔

''کیا انہوں نے اب تک رابطہ نہیں کیا؟''

''کیا تھا۔''

''کیا کہا پھر.........کوئی مطالبہ پیش کیا؟''

''نہیں، ابھی اطلاع دی ہے اور دوسرے فون کا انتظار کرنے کو کہا۔''

دوسری طرف چند ثانیے پُرسوچ خاموشی چھائی رہی، پھر نگینہ کی آواز اُبھری۔ ''نادر! ایک بات کہ
برا تو نہیں مناؤ گے؟''

''نہیں.........بھلا میں تمہاری بات کا برا کیسے منا سکتا ہوں؟'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''اگر تم کہو تو میں پپا سے اس سلسلے میں مدد لوں؟'' اس نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا۔ مجھے واقعی
کی یہ بات انتہائی ناگوار گزری۔ تاہم میں نے ہموار لہجہ اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں نگینہ! یہ تم نے کیسے سوچ لیا کہ میں اپنے باپ کے قاتل اور اپنے دیرینہ دشمن سے مدد کی
مانگوں گا؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی میرے معتدل لہجے میں زہر کی کاٹ اُبھر آئی تھی۔

''اچھا.........جیسے تمہاری مرضی۔''

''اپنے باپ سے بھول کر بھی اس کا ذکر نہ کرنا۔'' میں نے لحہ بھر توقف کے بعد اسے تنبیہہ کی۔

''اچھا ٹھیک ہے.........مگر کم از کم.........پولیس سے ہی مدد لے لو۔'' وہ بولی۔

''اس سے معاملہ مزید خراب ہو جائے گا اور ماں کی جان کو الگ خطرہ لاحق ہو گا۔'' میں نے
''میں خود اس معاملے سے نمٹوں گا۔''

''اللہ کرے ماں جی خیریت سے ہوں۔'' وہ دعائیہ لہجے میں بولی۔ مجھے اس کا یہ انداز پسند آیا۔
توقف کے بعد وہ دوبارہ بولی۔ ''تم سے ایک بات کہنا تھی۔ مگر تم خود ہی پریشان ہو۔''

''نہیں.........کہو، کیا بات ہے؟ یہ پریشانیاں تو اب شاید ہم ماں بیٹے کا مقدر بن چکی ہیں۔''
نے کہا۔

''نادر! نظر حیات اپنے بیٹے کبیر کے سلسلے میں ہمارے ہاں آتے رہتے ہیں۔ وہ مجھ سے کبیر
بارے میں پوچھتے ہیں۔ میں انہیں کیا جواب دوں؟''

مجھے نگینہ کے یوں مشورہ لینے کا انداز پسند آیا تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ وہ میری مرضی کے خلاف کوئی

نہیں اٹھاتی تھی۔

''تم نے اب تک انہیں کیا بتایا؟'' جواب دینے کے بجائے الٹا میں نے اس سے سوال کیا۔

''یہی.........کہ.........میں کچھ نہیں جانتی۔''

''گڈ! تم اس بیان پر قائم رہنا۔''

''لیکن.........نادر! نظر حیات کو اس بات کا بھی پورا یقین ہے کہ میں کبیر کے متعلق جانتی ہوں کہ
وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔'' وہ بولی۔

اچانک میرے ذہن میں اپنے دونوں مہا دشمنوں کو آپس میں لڑانے کا شاطرانہ منصوبہ اُبھرا، لہٰذا
بولا۔ ''تم یہ بتاؤ کہ کیا تم نے اپنے باپ کو اب تک ساری حقیقت بتائی ہے؟''

''نہیں۔''

''پھر تم ایک کام کرو۔'' میں نے کہا۔ ''اپنے باپ شاہ میر کو ان کے یار نظر حیات کے بیٹے کے
بارے میں صاف صاف بتا دو کہ اس نے کس طرح کالا ناگ کے ساتھ مل کر تمہارے خلاف سازش کی
تھی، جس میں تمہاری جان کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔''

''نہیں.........ابھی تو میں نے انہیں یہ بات نہیں بتائی۔'' وہ بولی۔

''یہ تمہاری بھیانک غلطی ہے۔ تمہیں اپنے باپ کو کبیر کی تمہارے خلاف سازشوں کے بارے میں
آگاہ کر دینا چاہیے۔''

''لیکن نادر! یہ بھی تو سوچو، اس طرح کیلاش والی مہم آشکار ہو جائے گی اور انہیں کبیر کے بارے میں
بھی علم ہو جائے گا کہ وہ کہاں ہے؟''

''یہ ساری باتیں تم اپنے باپ کو اعتماد میں لے کر بتا سکتی ہو۔'' میں نے کہا۔

''میں نے کہا نا، کہ انہیں بتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' وہ اپنی پہلی بات دہراتے ہوئے بولی۔ ''پپا
میری بات کا بالکل اعتبار نہیں کریں گے نادر! میرے ساتھ تمہارے جیسا معاملہ ہے۔ جس طرح ماں جی کو
میرے حوالے سے تم پر بعض باتوں کا یقین نہیں آتا، اس طرح میرے پپا بھی اپنے دوست نظر حیات
کے بیٹے کبیر کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہیں کرتے۔ تم نہیں جانتے ہو نادر! کہ پپا اور نظر حیات کے
درمیان کس قدر گہری اور پرانی دوستی ہے۔ بلکہ پپا تو اس دوستی کو مزید مضبوط بنانے کے خواب دیکھ رہے
ہیں اور اشاروں کنایوں میں مجھے یہ باور کرانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ میں کبیر کے ساتھ خوش رہ
سکتی ہوں۔ آگے تم سمجھ جاؤ۔ مگر وہ مجھ پر کسی قسم کا دباؤ اب نہیں ڈال سکتے۔ کیونکہ درمیان میں تمہاری
پوزیشن اور ان کے گھناؤنے جرم نے انہیں مجھ سے کافی حد تک خفیف کر رکھا ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر خاموش
ہو گئی۔ اسی وقت ٹیلی فون کی بیل چیخ اُٹھی۔ میں چونکا اور نگینہ سے لہٰذا

''ایک فون آیا ہے، میں تم سے بات کرتا ہوں۔ ٹھیک ہے۔''

''اوکے، خدا حافظ!'' نگینہ نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

میں نے موبائل فون آف کر کے جلدی سے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ یہ اس اغواء
کنندہ کا فون ہوگا۔ مگر دوسری جانب سے انکل اعظم خان کی آواز پر میں چونک اٹھا۔

''نادر بیٹے! اس کا فون تو نہیں آیا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''نہیں انکل! میں خود بے چینی سے فون کا منتظر ہوں۔''

''مجھے فون کیا تھا اس نے۔''

''پھر.........کیا کہا اس کمینے نے؟'' میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''میں نے غفورے سے اس کی بات کرادی تھی۔ وہ مطمئن ہوگیا تھا۔ باقی معاملات میں نے طے کر لئے ہیں۔ اب ہمیں غفورے کو ساتھ لینا ہوگا۔'' وہ تفصیل بتانے لگے۔ میں نے بے چینی سے درمیان میں کہا۔

''انکل! انہوں نے کب اور کہاں آنے کا کہا؟''

''لالہ زار سنگم پر پرانے ریسٹ ہاؤس کا پتہ بتا دیا ہے۔'' لالہ زار کے علاقے سے میں واقف تھا۔ یہ ڈونگا گلی اور نتھیا گلی کے درمیان میں واقع تھا۔ جبکہ یہاں سے لالہ زار کا جنگلاتی علاقہ بہ مشکل اڑھائی کلومیٹر فاصلے پر تھا۔ ''انہوں نے آج رات ایک اور ڈیڑھ بجے کے درمیان کا وقت دیا ہے۔'' انکل اعظم خان نے وقت بتایا۔

''ٹھیک ہے انکل! آپ نے ان سے ڈن کرلیا؟'' میں نے فرطِ جوش سے تیز ہوتی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں.........لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی۔'' وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولے۔

''کون سی بات؟''

''وہ بضد ہیں کہ غفورے کو تم ہی لے کر آؤ۔ حالانکہ میں نے خود یہ قدم اٹھانے کا سوچ رکھا تھا۔''

''نہیں انکل! آپ کا غفورے جیسے اشتہاری مجرم کے ساتھ جا کر یہ ڈیل کرنا یوں بھی مناسب نہ ہو گا۔ انہوں نے میرا انتخاب کر کے گویا اپنی موت کا انتخاب خود کیا ہے۔'' میں آخر میں دانت پیس کر بولا۔

''تو ٹھیک ہے.........تم آج شام ہی آجاؤ میرے پاس۔'' وہ بولے اور رابطہ منقطع کر دیا۔ میری کنپٹیاں جوشِ غیظ سے سنسنانے لگیں۔ شام اور پھر رات تک کا انتظار مجھ سے نہیں ہو پا رہا تھا۔

غفورے اور اغواء کنندگان کا یہ معاملہ ایسا تھا کہ اس میں مجھے اپنے دونوں دیرینہ دشمنوں شاہ میر اور نظر حیات کی شمولیت کا شبہ نہیں ہو رہا تھا۔ یہ ساری کارروائی غفورے کے اپنے ساتھیوں کی تھی۔ کیونکہ اس سے پہلے غفورا یقیناً طویل عرصے تک اپنے انہی ساتھیوں کے پاس پناہ گزین رہا ہوگا۔

وقت گزاری کے لئے میں اخبار منگوا کر اس کا مطالعہ کرنے لگا تو اچانک ایک خبر پر میں بری طرح ٹھٹکا۔ یہ خبر مسٹر جواد کے بارے میں تھی۔ میری سانسیں تیز تیز چلنے لگیں۔

اخبار میں رات والے واقعے کی تفصیلی خبر شائع ہوئی تھی، جب میں بھی وہاں موجود تھا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ بہ غور اس سنسنی خیز خبر کی تفصیلات پڑھنے میں منہمک ہوگیا۔ تفصیل پڑھنے کے بعد میں بے اختیار ایک گہری ہنکاری بھر کر رہ گیا تھا۔

سب کچھ ویسے ہی ہوا تھا جو مسز غزالہ نے کہا تھا۔ اس نے پولیس کو یہی روایتی سا بیان دیا تھا کہ وہ نامعلوم نقاب پوش چوری کی غرض سے ان کے بنگلے میں داخل ہوا لیکن مقتول جواد کی عین موقع پر آنکھ کھل گئی۔ وہ معذور تھا مگر اپنے تکیے کے نیچے پستول رکھتا تھا۔ اس نے پستول نکالنے کی کوشش کی مگر بدقسمتی سے قاتل کو اس پر خنجر سے وار کرنے کا موقع مل گیا۔ پھر اس نے میدان صاف پا کر غزالہ کی عزت پر بھی حملہ کرنے کی کوشش کی تو مزاحمت کے دوران کسی طرح اس نقاب پوش کا پستول غزالہ کے ہاتھ لگ گیا اور یوں اس نے اپنے دفاع میں اسے بھی ہلاک کر ڈالا۔ تاہم پولیس کی تفتیش جاری تھی اور ابھی بہت سے سوالات جواب طلب تھے اور پولیس نے مسز جواد کو گرفتار کرلیا، وغیرہ۔

میں نے اس عجیب وغریب اور پراسرار معاملے پر ایک اور لعنت بھیج کر اخبار ایک طرف پھینک دیا۔

میں اس وقت اپنے مسئلے کی طرف الجھا ہوا تھا۔ اس لئے میں نے زیادہ توجہ نہ دی۔

شام ہوئی تو میں جیپ میں انکل اعظم خان کی طرف روانہ ہوگیا۔ پندرہ منٹ بعد میں ان کے پاس تھا۔ انکل خان میرے ہی منتظر تھے۔

انکل خان بھی میرے ساتھ جانا چاہتے تھے مگر میں نے منع کر دیا۔

''انکل! آپ صرف یہاں بیٹھ کر میری کامیابی کے لئے دعا کریں اور وزیر خان کو میرے ساتھ بھیج دیں۔ میں وہاں سے غفورے کو اپنی جیپ میں لے کر اغواء کنندگان کے پاس جاؤں گا، تنہا۔ وزیر خان کو راستے سے لوٹا دوں گا۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''تمہارا اکیلے جانا مناسب نہ ہوگا۔ میں بھی ساتھ چلوں گا۔'' انکل خان بولے۔

''نہیں انکل! آپ کا جانا مناسب نہ ہوگا۔ میں خود ان سے نمٹ لوں گا۔'' میں نے قطعیت سے کہا۔

''وزیر خان کو ہی لے جاؤ۔''

''اس کی بھی ضرورت نہیں۔ میں تن تنہا یہ کام بہ حسن وخوبی انجام دوں گا۔ یہ معاملہ نازک ہے، زیادہ چھیڑ بھاڑ مناسب نہ ہوگی۔''

''کیا تم غفورے کو ان کے حوالے کرنا چاہتے ہو؟'' انہوں نے بہ غور میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''یہ حالات پر منحصر ہے۔ ماں کی جان کو خطرہ ہوا تو مجھے غفورے کو ان کے حوالے کرنا پڑے گا۔'' میں نے گہری متانت سے کہا۔ وہ چند ثانیے کی پُرسوچ خاموشی کے بعد بولے۔ ''ٹھیک ہے.........جیسے تم مناسب سمجھو۔ مگر اپنا خیال رکھنا بیٹا! میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔''

اغواء کنندگان نے مجھے آج رات غفورے کو لے کر لالہ زار سنگم پر ایک اور ڈیڑھ بجے کے درمیان آنے کی تاکید کی۔

رات ساڑھے بارہ بجے کے قریب میں وزیر خان کے ساتھ جیپ میں انکل خان کی رہائش سے نکلا۔ غفورے کو یہاں سے دور جس جگہ یرغمال بنا کر رکھا تھا، وہ آٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ وزیر خان کی رہنمائی پر ہم وہاں پہنچے۔

یہ ایک چھوٹا سا خوب صورت کاٹیج تھا۔ بلکہ اریب قریب میں ایسے کئی کاٹیجز بنے ہوئے تھے، جن کا مقصد سیاحوں کو اس پُرفضا مقام پر آرام اور پُرسکون رہائش فراہم کرنا تھا۔

میں نے مذکورہ کاٹیج کے سامنے جیپ روک دی۔ جب ہم دونوں نیچے اتر آئے، کاٹیج میں ملازموں کے عقب میں دو عدد مسلح افراد موجود تھے۔

وزیر خان نے ان سے کچھ کہا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیئے۔ غالباً انکل خان بھی انہیں میری یہاں آمد کے مقصد سے آگاہ کر چکے تھے۔ غفورے کو رسن بستہ میرے سامنے پیش کیا گیا۔ میں نے بہ غور آنکھیں سکیڑ کر غفورے کا جائزہ لیا۔ وہ دنبے کی طرح پلا ہوا نظر آرہا تھا۔ چہرے پر ذرا بھی پریشانی یا خوف کا شائبہ تک نہ تھا۔

اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے البتہ دونوں ٹانگیں آزاد تھیں۔ وہ بھی میری طرف گھورے جا رہا تھا۔ میں نے رسٹ واچ پر وقت دیکھا۔

میرے پاس آدھا گھنٹہ باقی بچا تھا۔ میں نے وقت ضائع کئے بغیر غفورے کو ساتھ لیا اور فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر اسے سوار کرایا۔ اس کے بعد خود بھی جلدی سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہو گیا۔

ذرا دیر بعد میری جیپ طوفانی رفتار سے لالہ زار سنگم کی طرف دوڑی جا رہی تھی۔

***

اغواء کنندگان نے جس دھڑلے سے مجھے ''اس ہاتھ لے، اس ہاتھ دے'' کی ڈیل کے لئے بلا اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ غفورے کا پولیس کے نرغے میں جانا ہم دونوں کے لئے ہی مناسب نہ بہر طور، میں مقدور بھر کیل کانٹوں سے لیس محوِ سفر تھا۔

میری جیپ نتھیا گلی اور ڈونگا گلی کے درمیان سے گزرنے والی سڑک پر خاصی تیز رفتاری کے دوڑی چلی جا رہی تھی۔ ہر سُو سناٹے اور تاریکی کا راج تھا۔ سڑک کے دو رویہ دیودار کے درختو قطاریں تھیں۔ دن کی روشنی میں یہ علاقہ بہت زیادہ خوب صورت اور سرسبز تھا۔ یہاں سرسبز ڈھلوانو ہزاروں رنگ برنگے جنگلی پھول اپنی بہار دکھا رہے ہوتے ہیں۔

دو کلومیٹر تک سفر کے بعد سوا ایک بجے میری جیپ لالہ زار کی حدود میں داخل ہو گئی۔ غفورا خا کے ساتھ میری برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔

لالہ زار کے دائیں بائیں بیس بیس گز کے فاصلے پر لگے لیمپ پوسٹ کی روشنی میں سبزہ زار و چوبی بنچیں اور لوہے کے سائبان، تنہائی کے طلب گار سیاحوں کے لئے مخصوص نظر آ رہے تھے۔

انکل خان کی زبانی اغواء کنندگان نے مجھے جس پرانے ریسٹ ہاؤس پر پہنچنے کی تاکید کی تھی، و سبزہ زار کی ایک ذیلی سڑک کے ساتھ واقع تھا۔

انکل خان نے مجھے اس کا پتہ تفصیلی سمجھا دیا تھا۔ یوں بھی یہ سارا علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ ا میرے موبائل کی بیل گنگنائی۔ میں نے جیپ آہستہ کر لی۔ موبائل کی اسکرین پر کوئی اجنبی نمبر اُ تھا۔

''ہیلو......!'' میں نے کہا تو دوسری طرف سے اسی کمینے شخص کی آواز اُبھری۔

''تم پہنچ گئے......گڈ! جیپ فوراً روک دو اور اپنے دائیں جانب جو سائبان نظر آ رہا ہے غفورے کو لے کر خاموشی سے بینچ پر بیٹھ جاؤ۔''

اس کی آواز سن کر جوشِ غیظ سے میری سانسیں تیز تیز چلنے لگیں۔ اس کی گفتگو سے میں اندازہ لگا لیا کہ وہ کہیں قریب ہی اپنے ساتھیوں کے ساتھ گھات لگائے چھپا بیٹھا تھا۔ میں نے ا میں جواب دے کر جیپ سبزہ زار پر چڑھا دی۔

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا تھا۔ جیپ روکنے کے بعد میں نے اپنی جیب سے میگار لیا۔ ایک عدد شکاری خنجر بھی میرے دائیں ہاتھ کی آستین کے اندر پوشیدہ تھا۔ میں نے میگارد کی مہ غفورے کی کنپٹی سے لگا دی اور اسے لے کر جیپ سے نیچے اُتر گیا اور چند ثانیے رک کر جیپ کی آ گرد و پیش میں نظریں دوڑانے لگا۔ اس کے بعد ایک چوبی بینچ کا انتخاب کر کے اس پر براجمان ہو

میرے آس پاس لیمپ پوسٹ کی دودھیا لائٹیں، پھیلی ہوئی تھیں۔ میرے وہاں بیٹھنے کی د اچانک میرے دائیں بائیں جانب سے پانچ چھ کے قریب مسلح افراد نمودار ہوئے۔ ان سب کے ہا سیاہ رنگ کے پستول چمک رہے تھے۔ میں بغور ایک ایک کا جائزہ لے رہا تھا۔

یہ سب تیسرے درجے کے چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آتے تھے جنہیں عرفِ عام میں ''کھڑ تال کہا جاتا تھا۔ ان میں جو نسبتاً چھریری قامت اور دراز قد کا گورا چٹا مگر لمبوترے چہرے والا شخص مجھے ان کا گروپ لیڈر محسوس ہوا تھا۔

اس کے ہونٹ بھی پتلے پتلے اور عجیب وضع کے تھے۔ اس کی زردی مائل آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے تھے۔ گلے میں چین جھول رہی تھی۔ اپنے دُبلے پتلے مگر دراز جسم پر سستا سا چیسٹر چڑھا رکھا تھا۔ اس کے باقی ساتھی تنومند تھے۔ وہ چست ٹی شرٹ اور پینٹ پر سیاہ اور براؤن رنگ کی لیدر جیکٹ پہنے ہوئے تھے۔ ان سب کی خونخوار نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ان کا انداز کسی پرانی گھسی پٹی پنجابی فلم کے بدمعاشوں کا سا تھا۔

''غفورے کو چھوڑ دو۔'' اس چھریری قامت اور زردی مائل گورے چٹے شخص نے چند ثانیے مجھے استہزائیہ نظروں سے گھورتے رہنے کے بعد درشت لہجے میں حکم دیا اور اس کی آواز پہچان کر میرا وجود ایک زبردست جوار بھاٹے کی زد میں آنے لگا۔ یہ وہی کمینہ شخص تھا جس نے فون پر مجھ سے رابطہ کرتے ہوئے میری ماں کے بارے میں نازیبا الفاظ استعمال کئے تھے اور غفورے کو یہاں لانے کا حکم دیا تھا۔

اب میری نظریں اس چھپکلی نما شخص پر خنجر کی طرح پیوست ہو گئی تھیں۔ میں نے بہ مشکل اپنے اندر کے اُبال پر قابو پایا اور بدستور اسے غضب ناک نظروں سے گھورتا ہوا بولا۔

''میری ماں کہاں ہے؟''

میرے سوال پر اس چھپکلی نما شخص کے باریک ہونٹوں پر بڑی کمینی مسکراہٹ اُبھری اور وہ بولا۔

''بے فکر رہو۔ وہ خوب صورت عورت.........''

''حرامی کی اولاد! اپنی زبان کو لگام دے اور مطلب کی بات کر۔'' ایک تھرڈ ڈگری کے بدمعاش گروپ لیڈر کے منہ سے اپنی ماں کے بارے میں لغو بیانی نے ایکا ایکی میرے لہجے کو آتش فشاں بنا دیا تھا۔

میرے گالی دینے پر وہ سنسناتی ہوئی نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ میں نے غفورے کی گردن کے گرد اپنے بازو کا شکنجہ کس رکھا تھا۔ اسے اپنی ڈھال بناتے ہوئے اس کی کنپٹی سے میگارد کی نال لگا رکھی تھی اور ساتھ ہی ان پانچوں کو اپنی نظروں کے ٹارگٹ پر رکھنے کی غرض سے اپنی پوزیشن بھی بدل لی تھی۔

اس چھپکلی نما شخص نے چند قدم میری جانب بڑھائے۔ اس کی یک ٹک گھورتی ہوئی نظریں میرے چہرے پر جیسے ثبت ہو کر رہ گئیں۔ وہ رک کر سرسراتے لہجے میں بولا۔

''تمہاری ماں ادھر ہی ہے۔ پہلے غفورے کو ہمارے حوالے کر دو۔''

''نہیں......... پہلے میری ماں کو میرے سامنے پیش کرو۔'' میں نے بھی اسے گھورتے ہوئے درشت لہجے میں کہا تو وہ بولا۔

''پہلے ہمیں یہ تسلی ہو جائے کہ تم اپنے ساتھ کسی اور کو نہیں لائے ہو تو ہم تمہاری ماں کو تمہارے حوالے کر دیں گے۔''

''تم تسلی کر سکتے ہو۔ میں تنہا ہی آیا ہوں۔'' اس کے معتدل لہجے پر میں نے بھی ہموار لہجے میں کہا تو اس نے چند ثانیے پُرسوچ خاموشی کے بعد اپنے دو ساتھیوں کو ایک مخصوص اشارہ کیا۔ وہ دونوں الٹے قدموں واپس پلٹ گئے۔ باقی دو اس کے ساتھ کھڑے رہ گئے۔ وہ ان سے تحکمانہ لہجے میں بولا۔

''تم دونوں آس پاس کا جائزہ لے کر آؤ۔ کہیں یہ اپنے ساتھ کسی اور کو نہ لایا ہو۔'' اس کے حکم پر باقی دونوں بھی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

اب وہ تنہا کھڑا تھا۔ سیاہ پستول ہنوز اس کے دائیں ہاتھ میں چمک رہا تھا اور وہ جھکا ہوا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ پل کے پل میں اندازہ لگا چکا تھا کہ میں تھوڑی سی محنت کے بعد اس ''کھڑ تال'' گروپ پر قابو پا سکتا ہوں۔ لیکن ابھی مجھے ماں کے سامنے آنے کا شدید بے چینی سے انتظار

تھا۔ ماحول پر گہرا سکوت طاری تھا۔ ذرا دیر بعد اس کے پہلے والے ساتھی نمودار ہوئے۔ انہوں نے میرا ماں کو دونوں بازوؤں سے دبوچ رکھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ سامنے کی طرف بندھے ہوئے تھے مگر چہرے سے پریشانی کا ذرا بھی اظہار نہ ہوتا تھا۔ البتہ اس کی جگہ غصے اور طیش کی سرخی پھیلی ہوئی تھی۔

ماں کو دیکھ کر میرے جوشِ غیظ میں مزید اضافہ ہو گیا۔ میرا جی چاہا ان سب کو اسی وقت گولیوں سے بھون کر رکھ دوں۔ مگر اس وقت ان تیسرے درجے کے بدمعاشوں کی مثال ایسے گیدڑوں کی سی تھی جو ایک شیر کو غول کی صورت میں گھیر لیتے ہیں۔ میں نے ایک بات محسوس کی تھی کہ جن دو بدمعاشوں نے ماں کو دونوں بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا، ان کے ہاتھوں میں اب پستول نظر نہیں آ رہے تھے۔ جبکہ باقی ساتھی ہنوز اپنے چھپکلی مارکہ گروپ لیڈر کے حکم پر آس پاس کا جائزہ لینے گئے ہوئے تھے۔ میں نے ا تہیہ کر لیا تھا کہ غفورے کو ان کے ساتھ نہیں جانے دوں گا۔

''تم غفورے کے ہاتھوں کی رسّی کھولو گے اور میں تمہاری ماں کو رسیوں سے آزاد کروں گا۔'' چھپکلی مارکہ بدمعاش بولا۔ ''دونوں ایک ساتھ آگے بڑھیں گے۔''

''ٹھیک ہے......... مجھے منظور ہے۔'' میں نے کہا۔ پھر ہم دونوں اپنے اپنے یرغمالیوں کے ہاتھوں کی رسیاں کھولنے لگے۔ اس کے بعد انہیں آزاد کر دیا گیا۔ ادھر غفورے نے اپنے ساتھیوں کی جانب ایک قدم بڑھایا اور ادھر ماں نے بھی میری طرف ایک قدم اٹھایا۔

میرے پستول کی نال اپنے ساتھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے غفورے کی پشت کی سمت اُٹھی تھی۔ ا طرح چھپکلی مارکہ بدمعاش نے ماں پر پستول تان رکھا تھا۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہونے لگی۔

پھر جب غفورا اور ماں دھیرے دھیرے ایک ایک قدم اٹھاتے ہوئے درمیان میں پہنچ کر ایک دوسرے کے بالکل قریب سے گزرنے لگے تو اچانک دم بہ خود سناٹے میں کہیں قریب ہی گولی چلنے آواز اُبھری۔ گولی چلنے کی یہ آواز اس سمت سے آئی تھی جس طرف چھپکلی مارکہ بدمعاش کے وہ دونو ساتھی غائب ہوئے تھے۔ ہم بری طرح ٹھٹک گئے۔ غفورا اور ماں کے بڑھتے ہوئے قدم یکلخت رک گئے۔ چھپکلی مارکہ بدمعاش اور اس کے دونوں نہتے ساتھیوں نے چونک کر غیر ارادی طور پر مذکورہ سمت طرف دیکھا تو میں نے بیدار مغزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چھپکلی مارکہ بدمعاش پر گولی چلا دی جو اس گردن کے آر پار ہو گئی۔ وہ گھٹی گھٹی کراہ آمیز چیخ کے ساتھ سبزے پر گرا۔ وہاں موجود اس کے دونو ساتھیوں نے پھرتی سے اپنے پستول نکالنے کی کوشش کرنی چاہی تو میں اپنی پستول کا رخ ان کی طرف کے حلق کے بل دھاڑا۔

''خبردار!......... کوئی حرکت مت کرنا۔ اپنے دونوں ہاتھ بلند کر لو......... جلدی۔'' یہی درشت میں نے غفورے کو بھی دیا تھا۔ وہ وہیں جم گیا اور اپنے دونوں ہاتھ بلند کر دیئے۔ ماں نے لپک کر ز بوس چھپکلی مارکہ بدمعاش کے گھاس پر گرے پستول کو اٹھا لیا۔

اسی وقت مجھے اپنے داہنی جانب دو گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔

''ماں بھاگو۔'' کسی انجانے اور ممکنہ خطرے کی بُو محسوس کر کے میں زور سے چلّایا۔ اور پھر ہم دونو ماں بیٹا ایک جانب تیزی کے ساتھ دوڑتے چلے گئے۔ بھاری بھرکم گاڑیوں کے انجن کی مخصوص گھر گھراہ لمحہ بہ لمحہ ہمارے قریب آتی آتی جا رہی تھی۔ اچانک بدلتی ہوئی انجانی خطرناک صورتِ حال میں ہم غفورے کا بھی خیال نہ رہا تھا۔

میں اور ماں اب دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے تاریکی میں پراسرار ہیولوں کی طرح اپنے درختوں کے درمیان بے تحاشا دوڑ رہے تھے۔

دونوں گاڑیاں غراتی ہوئی ہمارے تعاقب میں دوڑی چلی آ رہی تھیں۔ ہم دونوں ماں بیٹا گاڑیوں کی تیز روشنی کی زد میں تھے۔ اچانک عقب میں گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ اُبھری۔

گولیوں کی بوچھاڑ جاری تھی۔ میں نے ماں کا ہاتھ تھاما اور سوچے سمجھے بغیر دائیں جانب مڑ گیا۔ اس میں پھرتی کا کوئی دخل نہ تھا۔ ہمیں یا تو اتفاقاً کوئی گولی نہیں لگی تھی یا پھر وہ فائرنگ جیسے محض ہمیں خوف زدہ کرنے کے لئے کی جا رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ دوسری صورت زیادہ قرینِ قیاس تھی۔ کیونکہ بیک وقت اتنی ساری گولیوں کے چلنے پر ہمارا زد میں نہ آنا ''اتفاق'' نہیں ہو سکتا تھا۔

میں ماں کا ہاتھ پکڑے جس سمت کو مڑا تھا، وہاں چیڑ کے درختوں کی بہتات تھی۔ لیکن بیک وقت دو گاڑیوں کے تعاقب سے ہم کب تک خود کو بچا سکتے تھے؟ اس کی امید کم ہی تھی۔ یہی سبب تھا کہ دونوں گاڑیاں لمحوں میں دندناتی ہوئی ہمارے بالکل قریب پہنچ گئیں۔ ہمارے قدم جیسے زمین نے پکڑ لئے۔ میں نے دیکھا، وہ ایک سنگل ڈور پجیرو تھی اور دوسری سرخ رنگ کی انٹرکولر تھی۔ وہ دونوں ہمارے دائیں بائیں گویا عین سر پر پہنچ کر رک گئی تھیں اور ان میں سے چار پانچ مسلح افراد چھلانگیں لگاتے ہوئے نیچے اُتر آئے تھے۔ میری اور ماں کی سانسیں بری طرح پھولی ہوئی تھیں۔ ہمارے ساتھ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والا معاملہ تھا۔ پھر دفعتہً میری آنکھوں نے چونکا دینے والا منظر دیکھا۔

شاہ میر اور نظر حیات، میرے باپ قادر خان کے قاتل اور میری ماں کو دربدر کرنے والا خطرناک ناگوں کا ٹولا وہاں موجود تھا۔

''خبردار! حرکت کرنے کی کوشش نہ کرنا نادر علی خان!'' نظر حیات نے مجھے چوکنا نظروں سے گھورتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ ''ہمارے ساتھی ذرا بدلحاظ واقع ہوئے ہیں۔ کیوں شاہ میر؟'' اس نے آخر میں اپنے حلیف شاہ میر سے بھی تائید چاہی تھی۔

''بالکل نادر علی خان! بالکل۔ نظر حیات ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' جواباً شاہ میر نے بھی اپنے ساتھی کی تائید میں گویا لطف اندوز ہوتے ہوئے زہریلی مسکراہٹ سے کہا۔

دونوں کے ہاتھوں میں ریوالور نظر آ رہے تھے۔ ان کے پانچ چھ کے قریب مسلح ساتھی اپنی گنوں کا رخ ہماری جانب کئے خونخوار نظروں سے کھڑے ہمیں گھورے جا رہے تھے۔

میرے اندر بری طرح ہلچل مچی ہوئی تھی اور میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ بدمعاشوں کے اس ٹولے کو آخر کس نے ہماری مخبری کر دی؟......... کیا نگینہ نے؟......... نہیں تو پھر؟......... اس ''پھر'' کا جواب میرے پاس نہ تھا۔ ماں کی آنکھوں میں خوف کا شائبہ تک نہ تھا بلکہ اس کے برعکس اس کی بڑی بڑی دہکتی آنکھوں میں ایکا ایکی نفرت کا الاؤ بھڑک اُٹھا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے ماں کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ اپنے دیرینہ دشمنوں کو دیکھ کر بری طرح تپ رہا تھا اور وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں کو جنوں خیز انداز میں یوں بار بار بھینچے جا رہی تھیں جیسے شاہ میر اور نظر حیات کی گردنیں دبوچنے کے لئے بے چین ہوں۔ پھر دوسرے ہی لمحے میرے کچھ بولنے سے قبل ہی منتقم ناگن کی طرح ان دونوں کو وحشت بھری لہو رنگ نظروں سے گھورتے ہوئے پھنکار کر بولی۔

''شاید تقدیر کو ابھی تمہاری زندگیاں مقصود ہیں......... لیکن میں تقدیر سے زیادہ بے رحم ہوں تم دونوں کے لئے۔''

''ہا......... ہا......... رسّی جل گئی مگر بل نہیں گئے شبینہ بیگم!'' نظر حیات نے ماں کی شعلے برساتی

آواز پر استہزائیہ انداز میں ایک قہقہہ اگلتے ہوئے ماں سے کہا تو ماں نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گویا اپنے انتقام کا سارا زہر ان میں انڈیلتے ہوئے ترکی بہ ترکی کہا۔

''ہاں، نظر حیات! ہاں......... رسی تو واقعی جل گئی ہے مگر اس کی راکھ میں دبی چنگاری اب ایک آتش فشاں کا روپ دھار چکی ہے جس کی جھلک تم دونوں دیکھ ہی چکے ہو۔ مگر افسوس .... خوش فہمی میں پڑ کر تم دونوں اپنے بھیانک انجام کو اور قریب کر رہے ہو۔''

''واہ......... واہ شبینہ بیگم! واہ......... موت کے سامنے اچھے اچھوں کے حواس ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ تمہاری اس دیدہ دلیری کی داد دینی چاہئے۔'' یہ شاہ میر تھا۔ وہ ڈرامائی انداز میں تالیاں بجاتا چند قدم چلتا ہوا ماں کے قریب آیا۔ اپنا ریوالور اس نے جیب میں ڈال لیا تھا۔ میں اس وقت جلتی سلگتی کیفیات میں مبتلا دونوں شیطانوں کو گھورے جا رہا تھا۔

شاہ میر ہمارے قریب پہنچ کر رکا اور پھر اپنی جیب سے دوبارہ پستول نکال کر اس کی نال کا رخ میری طرف کر دیا اور دھاڑ کر غضب ناک لہجے میں ماں سے دوبارہ مخاطب ہو کر بولا۔

''شبینہ! تمہیں اپنے اس لاڈلے پر فخر ہے نا؟......... میں آج اسے زندہ نہیں رہنے دوں گا۔'' یکایک میری ٹھٹکی ہوئی نظریں شاہ میر کے پستول والے ہاتھ پر جم گئیں۔

''نہیں شاہ میر! نہیں۔ میرے دلیر سپوت کو اتنا کمزور مت سمجھنا کہ وہ تیرے جیسے گیدڑ کے ہاتھوں یوں آسانی سے ڈھے جائے گا۔'' ماں کے لہجے میں عجیب طرح کا تیقن تھا کہ جس نے میرے وجود کو فولاد میں ڈھال دیا تھا۔

دفعتاً ایک جانب سے مزید دو مسلح افراد دوڑتے، ہانپتے ہوئے وہاں آن پہنچے۔ میں پہلے یہی سمجھا کہ شاید یہ اس چھپکلی مارکہ زرد رو بدمعاش کے ساتھی تھے مگر جب میں نے انہیں نظر حیات اور شاہ میر سے مؤدبانہ مخاطب ہوتے دیکھا تو بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

ایک نے کہا۔ ''جناب! غفورا بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔''

نظر حیات نے دانت بھینچ کر ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔

''حرام زادو! تم سے ایک آدمی نہیں پکڑا گیا۔ کہاں گیا آخر وہ؟'' نظر حیات نے باؤلے کتے کی طرح غرا کر کہا۔

وہ دونوں خاموش رہے۔ انہیں ڈر تھا کہ اگر اپنی ناکامی کی داستان کا ایک لفظ بھی مزید کہا تو دوسرا تھپڑ بھی کھانا پڑے گا۔

''لگتا ہے ہمیں خود تلاش کرنا پڑے گا۔'' بالآخر نظر حیات نے غصیلے لہجے میں بڑبڑاتے ہوئے کہا شاہ میر نے میری طرف اٹھا ہوا پستول والا ہاتھ نیچے گرا دیا۔ نظر حیات کی طرف مڑ کر بولا۔

''کوئی فائدہ نہیں نظر حیات! یہ بتاؤ، اب ان دونوں کو ادھر ہی ختم کر کے کسی اندھیری کھائی میں پھینک دیں یا.........''

اس نے آخر میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تھا۔

نظر حیات بولا۔ ''نہیں شاہ میر! ان دونوں کو اپنے ساتھ لے جانا ہوگا۔ اتنی آسان موت ان کا مقدر نہیں ہے۔ ابھی تو مجھے اس سنپولئے سے اپنے بیٹے کبیر کے بارے میں اُگلوانا ہے۔'' اس کا اشارہ میری جانب تھا۔

''تو یہیں اُگلوا لو نظر حیات! انہیں اپنے ساتھ لے جانے کی زحمت کیوں اٹھاتے ہو؟......... م

اس ناگن اور اس کے سنپولیے کا قصہ یہیں پاک کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے میری اور میری بیٹی نگینہ کی زندگی میں زہر گھولا ہے۔'' شاہ میر نے ہم دونوں ماں بیٹے کو غضب ناک نظروں سے گھورتے ہوئے نظر حیات سے کہا۔

''کہتے تو تم ٹھیک ہی ہو شاہ میر! میں بھی اب ان دونوں کا قصہ جلد نمٹانا چاہتا ہوں۔'' جواباً نظر حیات نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد میری جانب غضب ناک نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ ''نادر! میں صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔ بتاؤ میرا بیٹا کبیر کہاں ہے؟''

ماں اس وقت مارے طیش اور جوشِ غضب کے اپنے آپے میں نہیں تھی۔ اس کی وجہ اپنے دشمن دیرینہ کی موجودگی تھی۔ مگر میں اس نازک صورتِ حال میں سوچ سمجھ کر ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لینا چاہتا تھا۔ لہٰذا نظر حیات کے سوال کے جواب میں معتدل لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تم اپنے بیٹے کبیر کی گمشدگی کی وجہ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرو نادر!'' نظر حیات غرا کر بولا۔ ''جب تم نگینہ کو اغواء کر کے دھوکے سے اسے پشاور اور پھر چترال کی طرف لے گئے تھے تو میرا بہادر بیٹا نگینہ کو تمہارے خونی پنجے سے چھڑانے کے لئے تمہارے تعاقب میں گیا تھا۔ پھر تم نے نگینہ کو ورغلا کر اپنا ہم خیال بنا لیا اور اس کے ساتھ واپس لوٹ آئے۔ مگر کبیر اب تک کیوں نہیں لوٹا؟''

''کیا خبر وہ ابھی تک یہی سمجھ رہا ہو کہ ہم واپس نہیں لوٹے ہیں۔ اور وہ وہیں ہمیں تلاش کرتا پھر رہا ہو۔'' میں نے جھوٹ بول کر اسے الجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ بھی ایک کائیاں تھا، فوراً بولا۔

''بکواس بند کرو اپنی۔ میرا بیٹا اتنا بے وقوف نہیں ہے کہ وہ یونہی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرے۔ تم نے ہی اسے کہیں غائب کیا ہے۔''

پھر اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی جواب دیتا، ماں نے یکدم اس سے کہا۔ ''یہ سوال تم میرے بیٹے سے ہی کیوں پوچھ رہے ہو؟ جبکہ تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو کہ نگینہ بھی میرے بیٹے کے ساتھ تھی۔ تو وہ بھی اچھی طرح یہ بات جانتی ہوگی کہ کبیر کہاں ہے۔''

ماں کا یہ سوال ایسا تھا جس نے مجھے دھڑکا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے اب تک اس اہم بات کی طرف توجہ نہ دی تھی یا پھر شاید ضرورت ہی نہیں محسوس کی تھی۔ تاہم مجھے پورا یقین تھا کہ نگینہ نے میری ہدایات کے مطابق کبیر کے سلسلے میں نظر حیات کو اور شاہ میر کو کچھ نہیں بتایا ہوگا۔ چنانچہ نظر حیات کے جواب دینے کی بجائے شاہ میر ماں سے غرا کر بولا۔

''میں نے سب سے پہلے اپنی بیٹی نگینہ سے ہی کبیر کے بارے میں پوچھا تھا......... وہ اس بارے میں لاعلم ہے۔''

ماں کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ نمودار ہوگئی اور وہ اسی لہجے میں اس سے بولی۔

''اچھا......... کیا تمہاری بیٹی نگینہ اندھی تھی؟''

''بکواس بند کرو اپنی۔ ورنہ ادھر ہی گولی مار دوں گا تجھے۔'' جواباً شاہ میر غضب ناک لہجے میں بولا۔

ماں سے اس کے طرزِ تخاطب پر مجھے غصہ تو بہت آیا تھا مگر ابھی میں اپنے اندر کا لاوا نہیں اُگلنا چاہتا تھا بلکہ خاموشی سے ماں کی اس چال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیونکہ میں نے ماں کی مداخلت کے بعد نظر حیات کے چہرے پر پُرسوچ اور اُلجھن کے تاثرات بھانپ لئے تھے۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا

''نظر حیات! کیا تم اتنے ہی بے وقوف ہو کہ اتنی بڑی اور اہم بات کو یکسر فراموش کر بیٹھے؟'' ماں

نے شاہ میر کی پرواہ کئے بغیر نظر حیات سے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''حیرت ہے نظر حیات! تم نے کیا یہ بات اس لئے فراموش کر ڈالی کہ نگینہ تمہارے دوست کی بیٹی ہے۔ کیا تمہارے بیٹے کی اہمیت تمہاری نظروں میں نہیں؟''

''میں کہتا ہوں اپنی بکواس بند کر ذلیل کتیا!'' شاہ میر آپے سے باہر ہو گیا اور اس کے منہ سے ماں کے لئے گالی کے الفاظ نے میرے آتش فشاں کو جیسے بھڑکا کر رکھ دیا۔ میں کسی غضب ناک شیر کی طرح دھاڑ کر اس پر جھپٹا۔ وہ اپنا پستول والا ہاتھ اٹھانے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اسے دبوچ لیا اور پستول بھی اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ دوسرے ہی لمحے پستول کی نال میں اس کی کنپٹی سے لگا چکا تھا۔

''کمینے!.........ذلیل! دل تو میرا یہی چاہتا ہے کہ اپنی ماں کو گالی دینے کی گستاخی پر تیری کھوپڑی میں ابھی سوراخ کر دوں۔'' میں دانت پیس کر خون رنگ لہجے میں بولا۔ ''لیکن اگر تو اپنی زندگی چاہتا ہے تو اسی وقت اپنے کتوں کو ہتھیار پھینکنے کا حکم صادر کر۔ ورنہ تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' یہ سب اتنا اچانک اور غیر متوقع طور پر ہوا تھا کہ وہاں موجود نظر حیات اور اس کے چیلے ہکا بکا رہ گئے تھے۔

''نادر!.........شاہ میر کو چھوڑ دو۔'' نظر حیات نے کمزور سی آواز میں کہا۔ جبکہ شاہ میر کے حلق سے گھٹی گھٹی آوازیں برآمد ہو رہی تھیں۔ وجہ یہی تھی کہ میرے دائیں بازو کا شکنجہ مضبوطی سے اس کی گردن کے گرد جکڑا ہوا تھا جبکہ بائیں ہاتھ میں پستول تھا جس کی نال میں نے اس کی کنپٹی کے ساتھ لگا رکھی تھی۔

پھر میں نے اسے بولنے کا موقع دیتے ہوئے اس کی گردن کو ذرا ڈھیلا چھوڑا تو وہ پھنسی پھنسی آواز میں نظر حیات سے بولا۔

''نن.........نظر حیات! ان.........ان دونوں کو جانے دو۔ خ.........خدا کے لئے.........ان دونوں کو جانے دو۔''

میں نے کن انکھیوں سے نظر حیات کی طرف دیکھا۔ وہ بری طرح شش و پنج میں مبتلا تھا۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے ساتھیوں کو ایک مخصوص اشارہ کیا۔ انہوں نے ایک طرف قطار بنا لی۔ میں نے ماں سے چلا کر اسے گاڑی کی طرف بڑھنے کو کہا۔ ماں نے فوراً ایسا ہی کیا۔

میں نے بھی شاہ میر کو ڈھال بنائے اپنے ساتھ گاڑی کی طرف کھینچا۔ ماں ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر سوار ہو چکی تھی۔ چابی اگنیشن سوئچ میں موجود تھی جسے ماں نے فوراً ہی گھما دیا۔ گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔ یہ شاہ میر ہی کی سنگل ڈور چیروکی تھی۔ پھر میں نے پستول والے ہاتھ سے اپنی طرف کا دروازہ کھولا تو اچانک شاہ میر نے میرے پیٹ میں کہنی رسید کر ڈالی۔ یہ حملہ اچانک تھا۔ میرے حلق سے بے اختیار اوغ کی آواز نکلی۔ اس کی گردن پر میرے بازو کی گرفت ازخود ڈھیلی پڑ گئی تو اس نے ایک وار میرے پستول والی کلائی پر رسید کیا۔ پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا تو میں نے خود کو سنبھال لیا اور اسے دھکیل کر صورت حال کی خطرناکی کو بھانپتے ہی گاڑی میں سوار ہو گیا۔ ماں نے فوراً گیئر بدلا، جیپ کو تیزی سے یوٹرن دیا۔ نتیجے میں شاہ میر سامنے آ گیا۔ اس کے عقب سے گولیوں کی تڑتڑاہٹ اُبھری۔ کئی گولیاں ٹھک ٹھک کی آواز سے جیپ کی باڈی میں پیوست ہو گئیں اور کھڑکی کے شیشوں پر بھی لگیں جو چھناکے کی آواز سے ٹوٹ گئے۔ ہم دونوں ماں بیٹے نے فوراً سر جھکا دیئے تھے مگر ماں نے ایکسیلیٹر سے پاؤں نہیں ہٹایا تھا۔

اس لمحے شاہ میر میری جیپ کے بونٹ سے ٹکرایا اور اچھل کر دور جا گرا۔ ماں نے دوبارہ سر اُبھارا اور

جیپ کو طوفانی رفتار سے دوڑاتی ہوئی ایک طرف تاریکی کے بطن میں گھس گئی۔

جیپ کے بونٹ سے ٹکرانے کے بعد شاہ میر کا کیا حشر ہوا تھا، یہ میں نہیں جانتا تھا مگر مجھے اس کی پرواہ بھی نہیں تھی۔

ماں جیپ کو بدستور دوڑائے چلی جا رہی تھی اور میرے اندر آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر شاہ میر اور نظر حیات کو کس طرح یہ پتہ چلا تھا کہ لالہ زار کے مقام پر اغواء کنندگان کے ساتھ غفورے کے بدلے ماں کی رہائی کی ''ڈیلنگ'' ہو رہی ہے؟.........ایک گمبھیر سوالیہ نشان تھا جو آنکڑے کی طرح میرے حلق میں اٹک گیا تھا۔



تقدیر کا بے رحم کھیل جاری تھا۔ میں اور میری ماں دشمنوں کے لگائے اس پھندے سے تو نک
آئے تھے مگر وہ سوال ابھی تک اہم تھا، ہماری اس ڈیلنگ کا شاہ میر اینڈ کمپنی کو کیسے علم ہوا تھا۔ گھوم
کر ایک ہی شخصیت میرے ذہن کے پردے پر اُبھر رہی تھی۔ عقل اس کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔
دل.........دل بھلا ایسی بات کیوں کر مانتا؟.........عقل کا کہنا تھا، یہ کام نگینہ نے کیا اور دل کا فرما
تھا، ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ وہ میری محبت ہے اور یہ محبت یک طرفہ نہیں، دو طرفہ ہے۔ اگر میں اس
چاہت میں ہوش وخرد سے بیگانہ ہوں تو وہ بھی میری خاطر پہاڑوں سے ٹکرانے کا عزم رکھتی ہے۔ مح
کے مہکتے شگوفوں نے میری جان کے مساموں کو اپنی دلفریب خوشبو سے مہکا رکھا ہے تو یہی محبت اس
کے رگ و پے میں حیات کا پیغام بن کر دوڑ رہی ہے۔ اسی لئے یہ بات تسلیم ہی نہیں کی جا سکتی تھی
نگینہ میرے خلاف اپنے باپ سے مخبری کر سکتی ہے۔ میری سوچیں گاڑی کی رفتار کے ساتھ دوڑ ر
تھیں۔ اچانک ماں کھانسی اور میں خیالات کی دنیا سے حقیقی دنیا میں آ گیا۔ ہم نے اپنے دشمنوں
خلاف ایک معرکہ جیت لیا تھا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ ہم دونوں ماں بیٹے نے شاہ میر اور نظر حیات جیسے دیرینہ دشمنوں کے روبرو
آزمائی کی تھی۔ مجھے خوشی تھی کہ فتح ہمارے حصے میں ہی آئی تھی۔ لیکن ماں تو اس سے بھی مطمئن نہ تھیں
وہ تو ایسے موقعوں کی تاک میں رہتی تھیں۔ جبکہ اغواء کنندگان کے مقابلے میں بھی مجھے فتح حاصل تو ہ
تھی مگر نصف۔ یعنی میں ماں کو حاصل کر چکا تھا لیکن غفورا فرار ہو چکا تھا۔ اگرچہ میں نے غفور
چھاپ رکھا تھا مگر شاہ میر اور نظر حیات کے اچانک ٹپک پڑنے کی وجہ سے غفورا ہاتھ سے نکل گیا تھ
بہرطور مجھے اس کی پرواہ نہ تھی۔ ماں کو میں آزاد کرانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میرے لئے یہی بہت تھ

اچانک مجھے احساس ہوا کہ جیپ کا رخ بتدریج بدل رہا ہے۔ یہ کوئی چونکنے والی بات نہ تھی۔ مگر
ٹھنکا اس وقت جب ماں نے پکی سڑک چھوڑ کر کچے میں جیپ اتار لی اور اسے بریک لگا دیئے اور سو
آف کر دیا۔

''کیا ہوا ماں.........؟'' میں نے قدرے چونک کر ماں سے پوچھا۔ ماں کے چہرے پر جوشِ غیظ
سرخی مترشح تھی۔ پھر وہ پُرتپش لہجے میں بولیں۔

''نادر! وہ ضرور اس سڑک سے گزریں گے۔''

میں ماں کی بات کا مطلب سمجھ کر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ دوبارہ بولی۔ ''دشمنوں سے نمٹنے کا یہ سنہ
موقع میں ضائع نہیں جانے دوں گی۔''

''ماں ماں!.........ہم نہتے ہیں اور وہ.........''

ماں نے یکدم میری بات کاٹ کر کہا۔ ''تم کب سے کھلونوں کے محتاج ہو گئے ہو نادر بیٹے! ہمار

پاس عزم و حوصلے کا ہتھیار ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے ماں! مگر ہمیں.........''

''تم جا سکتے ہو۔'' ماں نے روکھے لہجے میں یہ کہتے ہوئے میری بات کاٹی اور میرا وجود کٹنے لگا۔

''ماں! میں بھلا تمہیں تنہا چھوڑ سکتا ہوں؟''

''بس تو پھر تیار رہو۔'' ابھی ماں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک بائیں جانب عقب سے کسی گاڑی کی
تیز روشنی نظر آئی۔ ماں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''وہ آ رہے ہیں۔''

میرے اعصاب تن گئے۔ میں نے ماں سے کہا۔ ''ماں! تو گاڑی سے نیچے اتر جا۔ میں دشمنوں کا
راستہ روکوں گا۔''

''نہیں.........میں کچھ اور کرنا چاہتی ہوں۔ تم بس ذرا محتاط ہو کر بیٹھے رہو۔''

ماں نے کہا اور پھر اس نے اگنیشن سوئچ میں چابی گھمائی۔ رات کے دم بخود سکوت میں جیپ کا
انجن ہولے سے غرا کر اسٹارٹ ہو گیا۔ ماں نے ہیڈ لیمپس گل کر دیئے تھے۔ پتہ نہیں ماں کیا کرنا چاہتی
تھیں؟ مگر میں اب ان کی ہدایات کے مطابق محتاط ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

گاڑی لحہ بہ لحہ قریب آتی جا رہی تھی۔ وہ نظر حیات کی سرخ انٹر کولر ہی تھی۔ پکی سڑک بل کھاتی ہوئی
تھی اس لئے ایک محتاط اندازے کے تحت انٹر کولر کی رفتار ساٹھ ستر سے زیادہ نہ تھی۔ مگر اس بل کھاتی
سڑک پر یہ رفتار بہت تیز تھی۔ پھر جیسے ہی وہ ہمارے ذرا قریب پہنچی، ماں نے گیئر بدلا اور ایکسیلیٹر پر
پاؤں رکھ دیا۔ ہماری جیپ کا انجن وحشی درندے کی مانند غرایا اور جیپ ایک جھٹکے سے پختہ سڑک کی طرف
دوڑی۔ ماں کا اندازہ نہایت درست ثابت ہوا تھا۔ یہی سبب تھا کہ جیسے ہی وہ انٹر کولر نزدیک پہنچ کر
ہمارے قریب سے گزرنے لگی، ہماری جیپ دھاڑتے ہوئے درندے کی طرح اچھل کر پختہ سڑک کی
طرف بڑھی اور سامنے سے گزرتی ہوئی انٹر کولر کے عقبی حصے کے ساتھ زوردار دھماکے سے ٹکرائی۔ شیشے
ٹوٹنے کی چھناکے دار آواز گونجی۔ ہمیں ایک زوردار جھٹکا لگا۔ انٹر کولر کے عقبی حصے سے ہماری جیپ ٹکرانے
کے نتیجے میں انٹر کولر کا توازن بگڑ گیا۔ اس کا عقبی حصہ پختہ سڑک پر گھوما تو انٹر کولر بے قابو ہو گئی۔ اس کے
ڈرائیور نے بدحواسی میں اپنی ڈولتی انٹر کولر کے بریک لگا دیئے۔ نتیجتاً انٹر کولر الٹ کر ایک دھماکے سے پختہ
سڑک پر گر کر دور تک گھسٹتی چلی گئی اور کچے میں جا اتری۔

''ماں!.........نیچے اُترو.........جلدی۔'' میں نے ماں سے کہا اور پھر ہم دونوں نہایت پھرتی کے
ساتھ نیچے اتر آئے۔ انٹر کولر خاصی دور جا کر سڑک کے کنارے الٹ کر قدرے نشیبی کچے میں جا گری تھی۔
میں اور ماں چیڑ اور صنوبر کے درختوں کی آڑ لیتے ہوئے احتیاط سے مذکورہ سمت کی طرف تیز تیز قدموں
سے بڑھ رہے تھے۔

صاف اور روشن آسمان کی وجہ سے ہمیں ذرا دور اُلٹی ہوئی انٹر کولر صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ بالکل الٹ
چکی تھی۔ ہم دونوں ماں بیٹا تیز تیز قدموں اور پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ ذرا ہی قریب پہنچے تھے کہ
انٹر کولر ایک ساعت شکن دھماکے سے شعلوں کی زد میں آ گئی۔ میں نے اور ماں نے خود کو غیر اختیاری طور
پر زمین پر گرا دیا۔ انٹر کولر دھڑا دھڑ جل رہی تھی۔ آگ کے شعلے اسے نگل رہے تھے۔ شاید فیول ٹینک نے
آگ پکڑ لی تھی۔ شعلوں کی تپش ہم تک پہنچ رہی تھی۔

''ماں! واپس پلٹو۔'' میں نے ماں سے کہا اور وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر ہم دونوں جلتی سلگتی انٹر کولر
سے ذرا دور جا کر کھڑے ہو گئے۔ ''ماں! یہاں سے نکل چلو۔ ورنہ آبادی کے لوگ ادھر کا رخ کریں گے

اور ہم ان کی نظروں میں آ جائیں گے۔'' میں نے ماں سے دوبارہ کہا۔

شعلوں کی آتشی دہک میں اس کا چہرہ آسودہ نظر آ رہا تھا۔ کچھ ایسا ہی لگتا تھا کہ نظر حیات اور شاہ میر (جس کے بارے میں ہم دونوں ماں بیٹے کا یہی خیال تھا کہ زخمی ہونے کے بعد نظر حیات نے اسے ہسپتال پہنچانے کے لئے اپنی انٹر کولر میں ہی سوار کرا دیا ہوگا بشرطیکہ وہ زندہ ہو) بھی جل مرے تھے۔

ہم دونوں دوڑتے ہوئے اُس جگہ پہنچے جہاں ہماری (شاہ میر کی) جیپ پختہ سڑک پر ترچھی کھڑی تھی۔ انٹر کولر کے عقبی حصے کو ٹکر مارنے کے بعد اس کے بونٹ کی حالت قدرے خستہ ہو رہی تھی۔ پتہ نہیں اب وہ اسٹارٹ بھی ہوتی کہ نہیں۔ تاہم قریب پہنچ کر ہم دونوں اس میں سوار ہو گئے۔

ڈرائیونگ سیٹ اس بار میں نے سنبھالی۔ میں نے اگنیشن سوئچ میں چابی گھما دی مگر انجن ہولے۔ گھرگھرا کر خاموش ہو گیا۔ دو ایک بار مزید کوشش کر کے دیکھ لی مگر بے سود۔

''نہیں ہو رہی اسٹارٹ؟'' ماں نے استفسار کیا۔

''اتر کر دیکھنا پڑے گا۔'' میں نے کہا اور دروازہ کھول کر نیچے اُترا۔ بونٹ کی طرف بڑھا مگر بونٹ اس طرح چپک کر ٹائٹ ہو چکا تھا کہ پوری کوشش اور طاقت کے باوجود اوپر نہ اٹھا۔ میں پریشان سا ہو گیا۔ دور انٹر کولر سے ہنوز شعلے بلند ہو رہے تھے۔ مجھے قریب کی آبادی سے لوگوں کی ''ہنگامی آمد'' کا خدشہ لاحق تھا۔ ماں بھی نیچے اتر آئی تھی۔

''ماں! ہمیں پیدل ہی نکلنا پڑے گا۔ ورنہ ہم مقامی لوگوں کی نظروں میں آ جائیں گے۔''

''لیکن نادر!......... پیدل ہم کہاں تک چلیں گے؟'' ماں نے کہا۔ ان کے لہجے میں پریشانی کا شائبہ تک نہ تھا۔

''لالہ زار تک تو جانا ہی پڑے گا۔ وہاں ہماری جیپ یقیناً موجود ہوگی۔ کیونکہ میں غفورے کو اس میں بٹھا کر وہاں تک پہنچا تھا۔''

میری بات پر ماں نے سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

وہ مقام وہاں سے تین چار کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ ہم دونوں ماں بیٹے جیسے تیسے، گرتے پڑتے لالہ زار کے مقام پر پہنچے۔

وہاں چھپکلی مارکہ بدمعاش کے ساتھیوں کی لاشیں بے گور و کفن پڑی تھیں۔ میں نے سب سے پہلے اپنا میگارڈ تلاش کیا۔ اس کے بعد مجھے قریب ہی اپنی جیپ کھڑی نظر آ گئی۔

تقدیر ہم ماں بیٹے کا ساتھ دے رہی تھی۔ ہم اس میں سوار ہو گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ میں نے سنبھال لی۔ ذرا ہی دیر بعد ہم گرین لاج کی طرف گامزن ہو گئے۔

گرین لاج پہنچتے ہی ماں نے مجھ سے کہا کہ میں اعظم خان کو موجودہ صورتِ حال سے آگاہ کر ڈالوں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ پھر ماں نے بھی ان سے تفصیلی گفتگو کی۔

اعظم خان نے غفورے کے فرار پر تشویش کا اظہار کیا تھا۔ اس کے جواب میں، میں نے اپنی پرانی بات کو دہراتے ہوئے کہا۔

''انکل! میرا خیال ہے کہ غفورا ہمارا کام خود ہی آسان کر ڈالے گا۔ کیونکہ وہ پولس کو انتہائی مطلوب مجرم کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور وہ ہمارے خلاف پولیس کے پاس ہرگز نہیں جائے گا۔ بلکہ وہ پولیس سے دور رہنے کی ہی کوشش کرے گا۔''

''لیکن نادر بیٹے! تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ ہمارے دشمن اس کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں اور وہ

اسے تم دونوں ماں بیٹے کے خلاف ہتھیار کی صورت میں استعمال کر سکتے ہیں۔''

اعظم خان کی بات پر مجھے سخت اچنبھا ہوا۔ میں نے کہا۔ ''انکل! ہمارے دشمن کون ہیں؟ میرا نہیں خیال کہ نظر حیات اور شاہ میر زندہ بچے ہوں؟''

''ہاں......... ٹھیک ہے۔ لیکن ابھی اس کی تصدیق تو نہیں ہوئی۔'' وہ بولے۔ ''بہرحال، تم ماں بیٹا اپنے معمولات پر توجہ دو اور خفیہ طور پر نظر حیات اور شاہ میر کی سن گن بھی لیتے رہو کہ آخر ان کا کیا بنا؟ کیا وہ واقعی ہلاک ہو چکے ہیں یا پھر.........''

انہوں نے آخر میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا اور پھر لمحہ بھر کے توقف کے بعد دوبارہ بولے۔ ''تم دونوں ماں بیٹا محتاط رہو۔ ابھی پولیس کارروائی ہوگی اور پولیس کا شبہ لامحالہ تم دونوں پر ہی ہوگا۔ ویسے تم نے اپنی موجودگی کا جائے وقوع پر کوئی ثبوت تو نہیں چھوڑا ہے نا؟''

''نہیں انکل.........!'' میں نے مختصراً کہا۔ اس کے بعد انہوں نے ماں سے بھی چند باتیں کیں اور رابطہ منقطع کر دیا۔

* * *

ہم ماں بیٹے کی زندگی کا گزشتہ شب والا واقعہ اہم ترین تھا۔ میں نے آج زندگی میں پہلی بار ماں کے چہرے پر ایک انوکھا اور خاص رنگ دیکھا تھا۔ ایسا رنگ اور ایسا انوکھا پن جو آج تک میں نے نہیں دیکھا تھا۔ ماں کو خوش دیکھ کر میں بھی یک گونہ خوشی محسوس کر رہا تھا۔ لیکن جانے کیوں میرے دل کو وہ خوشی، وہ مسرت نہیں مل رہی تھی جو ماں کی طرح ہونی چاہئے تھی۔ میری خوشی اور مسرت کے آگے کوئی ان دیکھی رکاوٹ تھی جو ایک تشنگی سی پیدا کر رہی تھی۔ کھل کر خوش ہونے کا موقع نہیں دے رہی تھی۔ ایک سوچ تھی، ایک اُلجھن تھی، کوئی پھانس تھی۔

'کیا اس کی وجہ......... نگینہ تھی؟' اچانک میں نے خود سے سوال کیا۔ 'نہ......... نہ......... نہیں۔ بھہ......... بھلا نگینہ اس کی وجہ کیسے ہو سکتی ہے؟' میں گھبرا سا گیا۔

'ہاں نادر!......... اگر شاہ میر واقعی مر گیا تو نگینہ کا رویہ تمہارے ساتھ کیا ہوگا؟' میرے اندر کوئی سرد مہری سے بولا۔

'کیا نگینہ کو دکھ نہ ہوگا؟ وہ یتیم ہو جائے گی۔ اس کا باپ کے سوا کون ہے؟' دوسرے ہی لمحے میرے دل نے توجیہہ پیش کی۔

'نگینہ اپنے باپ کے کالے کرتوت سے واقف ہے۔ وہ اسے اپنے باپ کے منطقی انجام پر محمول کرتے ہوئے خاموش ہو جائے گی۔ اور پھر وہ اکیلی کب ہے؟ میں اس کے ساتھ ہوں......... اُس کا نادر۔ اس کی پہلی اور آخری محبت!'

'ہونہہ.........' دماغ نے استہزائیہ کہا۔ 'اچھا بہانہ ہے۔ لیکن نادر میاں! یہ کیوں بھول رہے ہو کہ نگینہ نے تم سے ایک عاجزانہ درخواست بھی کی تھی۔ انتہائی عاجزانہ درخواست......... کہ اس کے باپ کو معاف کر دیا جائے۔'

دل بھلا دماغ کو خاطر میں لاتا ہے۔ فوراً ہی جواب آیا۔ 'لیکن معافی کا اختیار تمہیں کب تھا نادر؟ تم کون ہو اپنی ماں کے شوہر کے قاتل کو معاف کرنے والے؟ تم اپنے باپ کے قاتل کو معاف کر سکتے ہو لیکن تمہیں ستم گزیدہ عورت کے شوہر کے قاتل کو معاف کرنے کا بہرحال کوئی اختیار نہ تھا۔'

'بے شک.........' دماغ نے حسب معمول غیر جذباتی انداز میں کہا۔ 'مگر تم نے اپنی منتقم مزاج ماں کا

بہر حال ساتھ دیا۔

'میں اس کا بیٹا ہوں.........' میں چیخ پڑا۔

'تم نگینہ کی محبت بھی تو ہو۔' دماغ چلایا۔

دل و دماغ کی اس تکرار نے مجھے بری طرح تہہ تیغ کر کے رکھ دیا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے آزمائش کی ایک کٹھن گھڑی میری منتظر تھی۔ میں نگینہ اور ماں کے بیچ معلق ہو گیا تھا۔

میں ''محبت'' اور ''ممتا'' کے درمیان گویا پل صراط پر کھڑا تھا۔ ایک طرف نگینہ کی محبت تھی تو دوسری طرف ماں کی ممتا.........ایک طرف محبت کی پاسداری تو دوسری طرف ممتا کی قرض داری۔

ایک طرف فرض تھا تو دوسری جانب قرض تھا.........اور میں درمیان میں ایک لاعلاج مریض کی طرح معلق تھا۔

یہ کشمکش نہ جانے کب تک جاری رہنے والی تھی۔ اور مجھے کوئی اندازہ نہ تھا، فتح کس کی ہو گی۔ محبت کی یا فرض کی۔

میں نے سر جھٹکا اور اپنی توجہ دوسرے معاملات کی طرف مبذول کرنے کی کوشش کی۔ دوسرے ہی لمحے میرے تصور میں جلتی ہوئی انٹرکولر کا منظر روشن ہو گیا۔ بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے انٹرکولر کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھے۔ عموماً ایسی صورت میں کسی کا زندہ بچ جانا ممکن نہیں ہوتا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا، شاہ میر اور نظر حیات اس تصادم کے بعد بھی بچ گئے تھے۔ میرے پاس اپنے اس خیال کی کوئی دلیل نہیں تھی مگر کہیں اندر سے کچھ ایسی ہی صدا اٹھ رہی تھی۔ تیرے دشمن ابھی اس دھرتی پر سانس لے رہے ہیں۔

میں ان سوچوں میں تھا۔ پھر میرے تصور میں اپنی ماں کا ہشاش بشاش اور شگفتہ چہرہ جگمگایا۔ رات والے واقعے کے بعد سے اس کی پژمردگی اور افسردگی دور ہو گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا گویا اس نے اپنے دونوں دشمنوں کی موت کا یقین کر لیا ہو۔

'مگر میں کیوں بے چین ہوں؟' میں نے خود سے سوال کیا۔ 'جب کہ ماں مطمئن ہے۔ میرے چہرے پر بھی اس خوشی و مسرت کا رنگ جھلکنا چاہئے تھا۔ میں ان دونوں کی موت پر خوش ہونے کی بجائے بے چین اور افسردہ کیوں ہوں؟.........کیوں ہوں؟' میں نے کئی بار اپنے آپ سے یہ سوال کیا اور پھر اچانک نگینہ کی صورت میں مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔

'ہاں.........شاید اس لئے کہ وہ نگینہ کا باپ تھا۔'

کیا میں نہیں چاہتا تھا کہ نگینہ یتیم ہو؟.........کیا میں شاہ میر کی متوقع موت سے بے چین تھا؟ کیا نگینہ کی محبت نے مجھے اتنا ہی خود غرض بنا دیا تھا کہ میں اپنے دوست کے قاتل کی موت نہیں چاہتا تھا؟ کیا میں اس ستم گزیدہ ماں کے دکھوں کو فراموش کر چکا تھا جسے عین جوانی میں بیوگی کا داغ سہنا پڑا تھا اور جس نے.........جس نے اپنی جوانی جھوٹے الزام کی پاداش میں خشت زنداں ہو کر گزار دی تھی۔ میں اس کے شوہر کے قاتل کی متوقع موت پر بے چین تھا.........مجھے تو خوش ہونا چاہئے تھا۔ پھر ایسا کیوں تھا میرے لہو کی آگ کیوں بجھنے لگی تھی؟

شاید اس کی وجہ چند روز پہلے نگینہ کی مجھ سے وہ پُرسوز التجا تھی جس نے بڑی حسرت و یاس کے ساتھ مجھ سے معافی کی درخواست کی تھی.........معاف تو خدا بھی کر دیا کرتا ہے۔ بھلا اسے بڑھ کر اور انتقام ہو سکتا ہے؟ لیکن میں نے نگینہ سے یہ بھی کہا تھا کہ میری معافی تو بعد کا معاملہ ہے، کیا میری ماں

اس کے باپ کو معاف کرے گی؟

پھر نگینہ نے اپنے باپ کو بھی منا لیا تھا اور نہ صرف یہ بلکہ اسے گرین لاج بھی لے آئی تھی۔ شاہ میر اپنی بیٹی کے ساتھ خود چل کر مجھ سے اور ماں سے معافی مانگنے آیا تھا۔ ماں اس وقت گرین لاج میں نہ تھی مگر شاہ میر اور نگینہ کو گرین لاج سے مایوس ہو کر لوٹنا پڑا تھا۔

بعد میں ماں کو نگینہ اور شاہ میر کی اس طرح اچانک گرین لاج میں آمد پر خاصا طیش آیا تھا اور میرے تشفی دینے کے باوجود کہ ان دونوں باپ بیٹی کو مایوس لوٹنا پڑا تھا، ماں مجھ پر برہم ہوئی تھیں کہ میرے ہوتے ہوئے شاہ میر گرین لاج سے زندہ کیوں واپس لوٹا تھا؟

رات دھیرے دھیرے سرکتی جا رہی تھی۔ ہر لمحہ آئندہ آنے والے روشن دن سے قریب کر رہا تھا۔

میں ڈرائنگ روم میں ہی صوفے پر لیٹ گیا کہ ماں اپنے ہاتھوں میں کافی کے دو مگ لئے اندر داخل ہوئیں۔

''ماں! آپ نے کیوں زحمت کی؟ کافی میں بنا لیتا۔'' میں نے کھڑے ہو کر احتراماً کہا مگر ماں نے میری بات کو یکسر نظر انداز کر دیا اور ایک مگ میری جانب بڑھاتے ہوئے متانت سے بولیں۔

''نادر! تمہیں پورا یقین ہے کہ وہ دونوں خبیث جل مرے ہوں گے؟''

''آں.........ہاں.........شاید نہیں۔'' ماں کے اس اچانک سوال پر میں ذرا گڑبڑا کر بولا۔

''ہمیں اس وقت وہاں ٹھہر کر یہ اطمینان کر لینا چاہئے تھا۔'' ماں نے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ کافی کا مگ انہوں نے اپنے ہونٹوں سے لگایا۔ کافی کے مگ سے اٹھنے والی بھاپ کے عقب سے ان کی آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''اگر ہم وہاں مزید تھوڑی دیر ٹھہرتے تو مقامی لوگوں کی نظروں میں آ سکتے تھے۔'' میں نے ہولے سے کہا اور کافی کا ایک گھونٹ لیا اور مزید بولا۔ ''کل صبح تک معلوم ہو جائے گا۔''

''تمہیں شاہ میر کی اس موت پر دکھ تو نہیں؟'' ماں نے گمبھیر لہجے میں اچانک مجھ سے پوچھا۔

میرے اور ماں کے درمیان جاری غیر محسوس جنگ میں یہ سوال نہایت خطرناک تھا۔ مگر مجھے اس کی توقع تھی۔ مزید یہ کہ اس ضمن میں میری انا کافی اس سرد جنگ کو طول دے سکتی تھی۔ اس لئے میں نے ایک گہری ہنکاری بھر کر صاف گوئی سے کہا۔

''ماں!.........دکھ کی بات نہیں ہے.........''

''تو پھر خوشی کی ہو گی۔'' ماں نے یکدم میری بات کاٹ ڈالی۔ مجھے ان کا لہجہ طنزیہ لگا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی۔

''ماں! اگر ایک شخص کو اپنے گھناؤنے جرم کا احساس ہو جائے اور وہ خود چل کر ہمارے دروازے پر معافی کے لئے آئے تو ہمیں کیا کرنا چاہئے؟'' میں نے گیند ماں کے کورٹ میں پھینکی۔ مجھے پورا یقین تھا، ماں طیش میں آ جائیں گی۔ مگر وہ خلافِ توقع بے تاثر مسکراہٹ سے بولیں۔

''میں اپنے شوہر کے قاتل کو معاف نہیں کر سکتی۔ اگر تم اپنے باپ کے قاتل اور ماں کے مجرم کو معاف کر سکتے ہو تو یہ تمہارا اپنا فعل ہو گا۔''

''ماں! معاف تو خدا بھی کر دیا کرتا ہے۔'' میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''تم پہلے خود سے پوچھو نادر! کیا تم اپنے باپ کے قاتلوں کو معاف کر سکتے ہو؟''

''ماں! میں صرف شاہ میر کی بات کر رہا ہوں۔'' میں نے ہولے سے کہا۔

’’اس لئے ....کہ وہ نگینہ کا باپ ہے؟‘‘
’’یہ بات نہیں.......رہا سوال آپ کے پہلے سوال کا، میری معافی آپ ہی کی مرضی پر
کرتی ہے۔‘‘
’’میں تمہیں شاہ میر کو معاف کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔‘‘ ماں نے حتمی لہجے میں کہا۔ پھر م
چہرے پر اپنی نگاہیں جماتے ہوئے مستفسر ہوئیں۔ ’’کیا تم نے ہی نگینہ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنے
شاہ میر کو مجھ سے معافی طلب کرنے کے لئے مجبور کرے اور وہ اپنی بیٹی کی خوشی کی خاطر یہاں چلا آ
تمہارے ہوتے ہوئے وہ اپنے پیروں پر واپس چلا گیا۔‘‘
’’نہیں ماں! میں نے نگینہ سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔‘‘ میں نے جواب دیا۔
چند ثانیے اعصاب شکن توقف کے بعد ماں نے کہا۔ ’’نادر! شاہ میر بڑی مکاری کے ساتھ اپ
نگینہ کو ہمارے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔ تم اس کی یہ چال سمجھنے کی کوشش کرو
سازش میں نگینہ برابر کی شریک ہے۔ اس کا ثبوت شاہ میر اور نظر حیات کا عین اس وقت لالہ زار پہنچ
جب تم غفورے کے بدلے مجھے اغواء کنندگان سے حاصل کرنے والے تھے۔‘‘
’’ہاں ماں! اس بات پر مجھے بھی تعجب ہے۔‘‘ میں نے جواب دیا۔
’’تعجب نہیں کہو نادر بیٹا! یقین کر لو، نگینہ نے تم سے اگلوا لیا تھا کہ ہمارے درمیان اغواء کنندگان
کب اور کہاں ’’ڈیل‘‘ ہونے والی ہے اور یوں دونوں نے ایک پنتھ دو کاج کے مصداق غفورے ک
کرنا چاہا۔‘‘ ماں نے جیسے خود ہی خود بے لاگ تجزیہ کر ڈالا۔
’’یہ غلط ہے ماں! میں نے تو نگینہ سے اس سلسلے میں کوئی تفصیلی گفتگو نہیں کی تھی۔‘‘ میں نے کہا۔
’’تم نے نگینہ سے میرے اغواء کا ذکر تو کیا ہوگا؟‘‘ ماں نے اچانک دوسرا سوال کیا اور میں ایک
سانس لے کر رہ گیا۔ پھر جواباً بولا۔
’’ہاں ماں! صرف اتنا کہ ماں کو چند نامعلوم افراد نے اغواء کر لیا ہے اور میں.........‘‘
’’بس ....اتنی اہم بات کو تم معمولی سمجھ رہے ہو۔‘‘ ماں نے طنز آمیز حیرت سے کہا۔
’’لیکن ماں! میں نے اسے یہ تو نہیں بتایا تھا کہ ان نامعلوم اغواء کنندگان نے غفورے کے عوض
اور کہاں ہم سے ڈیل کرنی ہے؟‘‘
’’تم آدھا سچ اور آدھا جھوٹ بول کر مجھے چکر نہیں دے سکتے نادر بیٹا! میں تمہاری ماں ہوں اور
سمجھتی ہوں۔ اس لئے مجھ سے بحث نہ کرو اور اپنی دنیا میں مگن رہو۔‘‘ ماں کے زہریلے جملوں نے
جگر چھلنی کر دیا۔
’’ماں! میری بات کا یقین کریں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔‘‘ میں نے تڑپ کر کہا۔
’’سچ ثابت ہو چکا ہے۔‘‘ ماں نے سرد مہری سے کہا اور خالی مگ تپائی پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں
کے بعد چند ثانیے مجھے عجیب اور پُرسوچ نگاہوں سے تکتی رہیں۔ پھر جب بولیں تو مجھے ان کا لہجہ
نہیں بلکہ ایک منتقم عورت کا محسوس ہوا۔
’’نادر! ایک بات میری دھیان میں رکھنا......... میں اگر ایک ماں ہوں تو ایک زخم کھائی
عورت بھی ہوں اور مجھے اپنا زخمی عورت والا روپ زیادہ عزیز ہے اور رہے گا۔ میرے شاطر اور
شمنوں نے پہلے میرے شوہر کا بے دردی سے قتل کیا اور پھر مجھے جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل د
ان کی چیرہ دستیوں میں کمی نہ آئی۔ اور اب انہوں نے میرے خلاف ایک اور گھناؤنی سازش

ہوئے ماں بیٹے کے درمیان بھی دراڑ ڈال دی۔ ٹھیک ہے، اگر دشمنوں کے ظلم کا یہ حال ہے تو میرا حوصلہ بھی کمال ہے۔ اس لئے میں اپنی ممتا کا گلا گھونٹ سکتی ہوں۔ مگر اس زخمی عورت کو نہیں مار سکتی کہ مجھے اپنے اس روپ پر تا عمر فخر رہے گا۔ مجھے اب تمہارے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ کوئی حتمی اور سخت فیصلہ کرنا ہوگا۔ اس لئے کہ دشمن بڑی مکاری کے ساتھ ایک خوب صورت ہتھیار کے ذریعے میری ممتا پر سیندھ لگا چکا ہے۔ مگر ہمیشہ کی طرح انہیں اس بار بھی ناکامی ہوگی۔‘‘ یہ کہہ کر ماں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

میں اپنی جگہ سکتے کی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ ماں کے لہجے کی گھن گرج ابھی تک میری سماعتوں میں گونج رہی تھی۔ میرا پورا وجود گویا آندھیوں کی زد پر تھا۔ میرے اندر کوئی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر رہا تھا۔ میں.........نادر علی خان، جس نے آج تک نامساعد حالات کی تیز و تند آندھیوں کا ڈٹ کر اور ثابت قدمی سے مقابلہ کیا تھا اور بڑے بڑے نامی گرامی بدمعاش میرے سامنے ریت کی دیوار بن کر ڈھیر ہو چکے تھے، آج ماں کے ان بے رحم جملوں سے خود ٹوٹ کر ڈھیر بن رہا تھا۔ مجھ پر آج یہ ہولناک انکشاف ہوا تھا کہ ماں ....میری پیاری ماں مجھ سے بدظن ہو چکی تھی۔ وہ مجھے دشمنوں کا آلہ کار سمجھ رہی تھی۔

نگینہ کے حوالے کو وہ دشمنوں کی خوب صورت سازش اور ہتھیار سمجھ رہی تھی۔ میں ماں کے دل و دماغ سے یہ کریہہ غلط فہمی دور کرنے کی جس قدر سر توڑ کوشش کر رہا تھا، حالات کی طرفہ کاری ہم ماں بیٹے کے درمیان اتنی ہی تیزی سے خلیج وسیع کر رہی تھی۔

ماں کے آخری الفاظ کہ ’’مجھے اب تمہارے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ کوئی سخت اور اٹل فیصلہ کرنا ہوگا‘‘ نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

ماں میرے بارے میں کون سا سخت فیصلہ صادر کرنے والی تھی؟ یہ میں نہیں جانتا تھا۔ تاہم مجھے حالات کی ہولناکی کا کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا تھا۔

کیا میرے اور ماں کے درمیان سرد جنگ کا خاتمہ کسی تکلیف دہ فیصلے پر منتج ہونے والا تھا؟ یہ سوچ سوچ کر میرے دماغ کی نسیں پھٹنے لگیں۔

میرے جی میں تو آئی کہ اسی وقت ماں کے سامنے جا کر اس کے قدموں میں سر رکھ دوں اور رو رو کر اسے یقین دلاؤں کہ میں اپنے باپ کے قاتلوں کو بھولا ہوں اور نہ ہی میں نادانستگی میں ان کا آلہ کار بن چکا ہوں۔

لیکن ماں نے میرے لئے بولنے، کچھ کہنے کی گنجائش ہی کہاں چھوڑی تھی۔ گزشتہ شب والے واقعے کے دوران شاہ میر اور نظر حیات کا عین وقت پر نازل ہو جانا، ماں کے شبہے کو تقویت دینے کا باعث بنا تھا۔ اس پر میرا نگینہ سے ماں کے اغواء کا ذکر کرنا بھی ماں کی غلط فہمی میں اضافے کا سبب بنا تھا۔ حالانکہ بات وہ نہیں تھی جو ماں سمجھ رہی تھی کیونکہ نگینہ کو جب میں نے پوری بات سے آگاہ ہی نہیں کیا تھا اور کر بھی دیتا تو مجھے پورا یقین تھا کہ وہ میری ہدایت کے بعد اپنے باپ شاہ میر سے ہرگز اس کا ذکر نہیں کرتی۔

تو پھر.........آخر شاہ میر اور نظر حیات کو کیسے پتہ چلا اس بات کا؟ یہی ایک پھانس تھی جو مجھے بے چینی میں مبتلا کئے ہوئے تھی۔

’کیا مجھے اس سلسلے میں نگینہ سے استفسار کرنا چاہئے؟‘......... میں نے خود سے پوچھا۔ جواب اثبات میں تھا۔ مگر امید مجھے پھر بھی نہ تھی۔ اس نے میرے منع کرنے کے باوجود اپنے باپ سے ماں کے اغواء کا

مختصراً بھی ذکر کیا ہو۔ اور کیا بھی ہوتا (جس کا مجھے بہرحال یقین نہ تھا) تو انہیں بھلا کیسے معلوم ہوا کہ ماں بیٹا انہیں مری اور نتھیا گلی کے اس لالہ زار سنگم پر ملیں گے۔ یہ بات الجھن آمیز تھی۔

بہرطور اس وقت تو یہ دیکھنا تھا کہ طلوعِ سحر اپنے ساتھ کون سے رمز آشکار کرنا چاہتی تھی۔

میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ کوشش کے باوجود بیڈ پر دراز ہونے کے بعد نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ایک خیال میرے ذہن میں یہ بھی اُبھرا تھا کہ کیا مجھے اس وقت نگینہ سے رابطہ کرنا چ تھا؟ میں نے بے اختیار دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا۔ پانچ بجنے والے تھے۔ میں اٹھا، موبائل نکا بہ قول نگینہ کے اس کا موبائل خراب تھا اس لئے جب میں اس کے رہائشی ٹیلی فون نمبرز پنچ کرنے کچھ سوچ کر رک گیا۔

میرے اندر کسی نے چلّا کر پوچھا۔ ’نادر! تم نگینہ کو طلوعِ سحر سے پہلے کون سی خوش خبری سنانا ہو؟ اپنے اور اپنی ماں کے کارنامے کی؟ .... یا پھر......... اس کے باپ کے انجام کی؟‘

میں نمبر ملاتے ملاتے رک گیا۔

ابھی شاید نگینہ سے رابطہ کرنا قبل از وقت تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ شاہ میر اور نظر حیات کا کیا ہوا تھا؟ کاش دونوں ہی جہنم واصل ہو چکے ہوں۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے یکلخت ایک لرزا دینے تشویش ناک خیال نے مجھے بری طرح ہلا کر رکھ دیا تھا۔

ماں نے مجھے جس امتحان میں ڈالا تھا، ابھی اس کا نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔ اور اگر شاہ میر اور نظر ہلاک ہو چکے تھے تو پھر ساری عمر میں ماں کے دل سے یہ غلط فہمی دور نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے کہ ذریعہ ہی نہ بچتا غلط فہمی دور کرنے کا۔ شاہ میر اور نظر حیات کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی ایک نظروں کے سامنے اس کا بیٹا بھی جیتے جی مر جاتا اور میں ساری عمر شاید ماں کے دل سے یہ غلط کرنے میں ناکام ہی رہتا کہ وہ جو میرے بارے میں سوچ رہی تھی، وہ سراسر غلط اور ایک ہولناک کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک پھانس ماں کے دل و دماغ میں میری طرف سے اٹک کر رہ جاتی جو مج درگور کر کے رکھ دیتی۔

بے اختیار میرا دل دشمنوں کی زندگی کے لئے دعائیں مانگنے لگا۔

❋❋❋

میں نے وہ رات آنکھوں کے بجائے سُولی پر کاٹی۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ میں بیڈ سے اتر کمرے سے نکلا۔ ماں شاید سو رہی تھیں۔ بڑھ کر ریسیور میں نے ہی اٹھایا۔

”ہیلو! کون؟“ میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”نادر! .... تم نے آخر پپا سے انتقام لے ہی لیا نا.........“ دوسری طرف سے نگینہ اُبھری۔ گلوگیر اور جانکاہ آواز۔ جس میں شکایت بھی تھی اور خفگی بھی۔ محبت کی پاسداری کا درد بھی التجا کو ٹھکرا دینے کا کرب بھی۔ میری بے ترتیب سانسیں سینے میں ہی اٹک کر رہ گئیں۔ پھر بڑی سے میں نے اپنے شکستہ وجود کی طاقت کو زبان پر سمیٹا اور اتنا ہی بول سکا۔

”کک......... کیا ہوا؟“

”اوہ......... کیا ہوا؟ جیسے تم جانتے ہی نہیں۔“ نگینہ کے غم ناک لہجے میں طنز کی بڑی زہر تھی۔ پھر جیسے وہ حقیقت جان لینے کے انداز میں دوبارہ بولی۔ ”کل رات .... تم نے اور تمہا نے .... پپا پر قاتلانہ حملہ کیا تھا؟“

اس سوال پر میں نے خود کو فوراً سنبھالنے کی کوشش کی اور بولا۔ ”ہاں......... مگر یہ حملہ براہِ راست نہ تھا۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اسے گزشتہ شب کے خونی معرکے سے مختصراً آگاہ کر دیا اور آخر میں بولا۔ ”تمہارے پپا اور نظر حیات نے اچانک وہاں پہنچ کر ہم پر حملے میں پہل کی تھی۔“

”اور تم ماں بیٹے نے اپنے دل کی بھڑاس نکال لی؟“ نگینہ نے تلخ لہجے میں گویا اپنے تئیں بات مکمل کر دی۔

میں نے بھی سپاٹ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”پھر تمہارا کیا مطلب تھا کہ ہم دونوں ماں بیٹا تمہارے پپا اور نظر حیات کے مسلح آدمیوں کی گولیوں کا نشانہ بن جاتے؟“

میرے اس جچے تلے جواب پر نگینہ کو ایک لاجواب سی چپ لگ گئی۔ دوسرے ہی لمحے مجھے دوسری طرف سے نگینہ کے بے اختیار سسک کر رونے کی آواز سنائی دی۔ میں پریشان ہو گیا اور بے اختیار بولا۔

”نگینہ! کیا ہوا؟ .... تت .... تم رو رہی ہو؟“

”ہاں نادر! میں رو رہی ہوں......... کہ اب رونا ہی تو میرے مقدر میں لکھا ہے۔“ اس کی گلوگیر آواز اُبھری اور میری پریشانی بڑھ گئی۔

”نادر! میں......... میں آخر کب تک دو پاٹوں کے درمیان پستی رہوں گی؟ میں......... میں آخر کب تک باپ اور محبوب کی سُولی پر جھولتی رہوں گی؟ .... سُولی پر چڑھنے والوں کو تو ایک ہی جھٹکے سے موت آ جاتی ہے۔ پھر......... پھر مجھے موت کیوں نہیں.........“

”خدا نہ کرے نگینہ! یہ......... یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟“ میں چیخ پڑا۔ ”آخر ہوا کیا ہے؟......... کچھ تو بتاؤ۔“

”نادر! مم......... میں اور پپا......... خود چل کر......... تم سے اور تمہاری ماں سے معافی مانگنے آئے تھے نا؟“ اس کا لہجہ ٹوٹ رہا تھا اور میں بکھر رہا تھا۔

”ہاں، ہاں۔“ بے اختیار میرے لرزیدہ لبوں سے نکلا۔

”اور......... اور پپا کو بھی......... اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا......... ہے نا......... وہ......... وہ مجھ سے یہ بھی کہہ رہے تھے کہ......... اگر تم اور تمہاری ماں انہیں اپنے ہاتھوں سے سزا دینا چاہیں بھی تو خود کو تم دونوں کے سامنے سر جھکا کر حاضر کر دوں گا۔“

”یہ میں نہیں جانتا۔“ میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

”مگر میں جانتی ہوں نادر!“ نگینہ ہسٹریائی لہجے میں چلّائی تو میں نے بھی تلخی سے کہا۔

”تو پھر اس رات انہوں نے ہم ماں بیٹے پر کیوں قاتلانہ حملہ کیا تھا؟ اس لئے کہ تمہارا باپ شاہ میر کو تمہاری نگاہوں میں مجرم ثابت کر کے صبح کا بھولا بن جانا چاہتا تھا۔ تاکہ......... تاکہ ہم دونوں کی ت میں دراڑ ڈال سکے۔ میرے اور میری ماں کے بیچ تو دراڑ پڑ ہی چکی ہے۔“

”خدا نہ کرے نادر! کہ ہمارے پیار میں کوئی خلیج حائل ہو۔“ دفعتہً نگینہ نے یہ جملہ کہا اور جیسے میرا پورا وجود سرشار ہو گیا۔

”نگینہ! آخر تم بتاتی کیوں نہیں کہ.........“

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ نگینہ میری بات کاٹ کر سسکتے ہوئے بولی۔ ”نادر! پپا کا شمار نہ زندوں میں ہے نہ مُردوں میں۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے اٹکی ہوئی سانس تلے پوچھا۔

''وہ کوما میں جا چکے ہیں۔''

اس نے دل گرفتہ لہجے میں بتایا اور میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ وہ مزید بتانے لگی۔ ''پپا کو انتہ
نازک حالت میں کچھ مقامی لوگوں نے ہسپتال تک پہنچایا تھا۔ ڈاکٹروں کی پوری ٹیم انہیں بچانے کی کوش
کر رہی ہے۔ مگر ان کا کہنا ہے کہ پپا کے بچنے کی امید کم ہے۔'' وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بتا رہی تھ
اور میں اسے غم زدہ محسوس کر کے اندر سے پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ کیسی عجیب گھڑی تھی، کیا عجیب امتحان ت
اسے غم زدہ کرنے کا سبب بھی میں ہی تھا۔ مگر اس کے پسِ پردہ جو حقیقت تھی اس سے نہ صرف میں
نگینہ بھی واقف تھی اور سب کچھ جاننے کے باوجود وہ مجھ سے متنفر نہ تھی۔ یہ اس کا بڑا پن تھا۔ وہ اس
اور عجیب وغریب معاملے میں مجھ سے شیئر کر رہی تھی۔ غالباً اس کی وجہ یہی تھی کہ میں نے اسے یہ با
بھی بتا دی تھی کہ اس کے باپ شاہ میر اور نظر حیات نے ہی ہم ماں بیٹے پر قاتلانہ حملے میں پہل کی
وجہ وہی پرانی دشمنی تھی۔

''نظر حیات کا کیا بنا؟'' میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''ان کی حالت قدرے بہتر ہے۔'' نگینہ نے جیسے مجھے مژدہ جانفزا سنایا۔ کیونکہ ماں نے مجھے
دہرے تہرے کڑے امتحان میں ڈالا تھا۔ نظر حیات کی زندگی بچ جانے کی خوشخبری نے میرے اس
میں کامیابی کی نئی امید جگا دی تھی جس کا میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ نظر حیات پر زندگی کا عرصہ اب
خود تنگ کروں گا تاکہ ماں کے دل میں میرے بارے میں جو غلط فہمی لاحق ہے، وہ دور ہو سکے۔ اگ
اس میں اہم فرد شاہ میر تھا جو نگینہ کا باپ تھا۔ اس کی زندگی بچ جانے کے لئے بھی میں اس حوالے
دعا گو تھا۔

''ہوں........'' میں نے ایک پُرسوچ ہنکاری لی اور نگینہ سے بولا۔ ''نگینہ! ہم دونوں کے ساتھ
بڑا المیہ ہے کہ ادھر تم بیٹی اور محبوب کی سولی پر لٹکی ہوئی ہو، بالکل اسی طرح میں بھی محبت اور ممتا
درمیان معلق ہوں۔''

''لیکن نادر! میں اس مشترکہ دکھ سے اب خوف زدہ رہنے لگی ہوں۔ کک........ کہیں ہم دونو
بھی کسی دردناک المیے کا شکار نہ ہو جائیں۔ نن........ نادر! ہماری محبت کہیں خود بڑے المیے کا شکار
جائے۔'' وہ دل شکستہ لہجے میں بولی تو میں نے اسے تسلی دینے کی غرض سے کہا۔

''نگینہ! تم حوصلہ رکھو۔ ہم دونوں مل کر اس بحران کا کوئی نہ کوئی حل نکالیں گے۔''

اس نے فون بند کر دیا۔

''اب کون سا بھید دے رہے تھے نگینہ کو؟'' اچانک عقب سے ایک سنسناتی آواز میری سماعتو
ٹکرائی۔ میں نے قدرے چونک کر گردن موڑی۔ عقب میں ماں کھڑی تھیں۔ چہرے پر طنز کی گہری
لئے ہوئے۔ میں نے ریسیور رکھا اور ماں کی طرف مڑ کر بولا۔

''ماں! نگینہ کا فون تھا۔''

''وہ تو میں بھی جان گئی ہوں۔''

''وہ کہہ رہی تھی کہ........ اس کے باپ کا شمار نہ زندوں میں ہے نہ مُردوں میں۔ اپنی زند
آخری سانسیں گن رہا ہے وہ۔''

میری بات پر ماں کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔ چہرہ بے پایاں احساسِ مسرت سے کھل اُٹھا۔
جیسے ان کے اندر جلتے کھولتے لاوے پر سمندروں کا پانی الٹ گیا ہو۔ دوسرے ہی لمحے ماں نے خ

پوچھا۔

''اور........ نظر حیات........؟''

''وہ زندہ ہے اور بالکل ٹھیک ٹھاک۔'' میں نے بتایا۔

''ہوں........'' ماں نے ایک طویل اور پُرسوچ ہنکاری لی۔ پھر غضب ناک لہجے میں بڑبڑائی۔
نقریب وہ بھی اپنے بھیانک انجام کو پہنچ جائے گا۔'' یہ کہہ کر ماں واپس اپنے کمرے کی طرف مڑ گئی۔

میرا دل نگینہ سے ملنے کو میں بھی بے چین ہو رہا تھا۔ میں تصور میں اسے اپنے باپ کی زندہ لاش کے
بیٹھا آنسو بہاتے دیکھ رہا تھا اور بے چینی سے سوچ رہا تھا کہ اس وقت ان کے پاس کون ہوگا جو
سہارا دے سکے؟ اس کی دل جوئی کر سکے؟ کیا مجھے جانا چاہئے؟

''نہیں........ یہ مناسب نہ ہوگا۔'' دوسرے ہی لمحے میں نے سوچا۔ ''نگینہ کو یہ تلخ گھونٹ اکیلے ہی پینا
ا''

اب دیکھنا یہ تھا کہ پولیس کیا کرتی ہے۔ اور نظر حیات انہیں کیا بیان دیتا ہے؟ غالب امکان تو یہی تھا
وہ ہمارے خلاف ہی پولیس کو بیان دے گا۔ مجھے اور ماں کو اس سلسلے میں پہلے سے محتاط رہنا ہوگا۔
میں نے ماں سے ڈسکشن کی تو انہوں نے مجھے تیار ہو کر ٹال جانے کی نصیحت کرتے ہوئے یہ بھی
ت دیں کہ میں رات والے واقعے کا کسی سے بھی کوئی ذکر نہ کروں۔

چنانچہ میں نے غسل وغیرہ کر کے جیسے تیسے ناشتہ زہر مار کیا اور جیپ میں سوار ہو کر ٹال کی طرف
ہو گیا۔ ٹال پہنچا تو منیجر مشتاق سے پہلے ملاقات ہوئی۔ اس کے ساتھ ذرا گھوم پھر کر مزدوروں اور
ئروں کی کارکردگی کا جائزہ لیا، اس کے بعد آرا مشین کے ہال کا جائزہ لیا اور اپنے آفس روم کی
ونگ چیئر پر آ کر دھنس گیا۔

مشتاق میرے سامنے والی کرسی پر براجمان ہو گیا۔ اس کی پیشانی پر کچھ اُلجھن آمیز شکنیں محسوس کر
یں نے خود ہی پوچھ لیا۔

''کیا بات ہے؟........ تم کچھ پریشان ہو؟''

''او جی، پریشانی کیسی جی کڑا کے۔'' میرے جیسے پوچھنے کی دیر تھی اور اس کے بولنے کی۔ ''رضوی
ب اصرار کر رہے ہیں کہ اعلیٰ درجے کے شیشم اور شاہ بلوط کے دو ٹرک درکار ہیں۔''

''تو پھر کیا مسئلہ ہے؟'' میں نے اس کے اول جلول چہرے پر نظر مرکوز رکھتے ہوئے گہری سنجیدگی
پوچھا تاکہ وہ پٹڑی سے نہ اترنے پائے۔

''دو مسئلے ہیں جی........ جی کڑا کے........'' وہ بولا۔ ''پہلا تو یہ ہے کہ شاہ بلوط کی دوسری اور
کھیپ ٹھیکے دار رب نواز نے ابھی تک نہیں بھیجی ہے۔ جبکہ وہ کم بخت پے منٹ بھی لے چکا ہے۔
اہم بات یہ ہے جی کڑا کے کہ........ رضوی صاحب نے اس کی سپلائی خالصتاً ہمارے ذمے لگا
ہے۔'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

ٹھیک ہے........ بھتہ اور اخراجات کی مد میں جو رقم بنتی ہو، وہ اس سے پیشگی لے لو اور مال سپلائی
''

''لیکن سر جی! ٹھیکے دار رب نواز نے ابھی تک وعدے کے مطابق شاہ بلوط کی آخری کھیپ نہیں بھیجی
جی کڑا کے۔''

''کب تک بھیجنی تھی اس نے لکڑی؟'' میں نے دریافت کیا۔

''او جی دو دن پہلے کا وعدہ تھا۔ آج چوتھا دن جا رہا ہے۔ ادھر رضوی صاحب نے بھی مقرر
مال نہ ملنے پر سودا منسوخ کرنے کی دھمکی دے ڈالی ہے، جی کڑا کے۔''

''تو اس نے آخری تاریخ کون سی مقرر کی ہے اب؟''

''پرسوں دوپہر تک کی مہلت دی ہے۔''

''تو کل کا دن ہے ہمارے پاس......... ٹھیک ہے، میں کل ٹھیکے دار رب نواز سے بات کروا

''اونہیں جی سر! اس سے آج ہی رابطہ کرنا پڑے گا۔ پورا ایک دن تو کٹائی اور شہتیر بنانے
جائے گا۔ پھر دو ٹرکوں میں لوڈ بھی کرانا ہے جی کڑا کے۔''

''تم ایسا کرو جی کڑا کے .... اونہہ.........'' میرے منہ سے بے اختیار اس کا تکیہ کلام
گیا۔ کمبخت بار بار جو اس لفظ کی گردان کر رہا تھا۔

''تم ایسا کرو کہ اسی وقت ٹھیکے دار رب نواز سے میری بات کراؤ۔ اس کے بعد رضوی سے
کروانے کا کرایہ وغیرہ تم خود طے کر لینا۔''

''بہت بہتر جی۔'' وہ ٹیلی فون سیٹ کی طرف ہاتھ بڑھانے لگا۔

''موبائل نمبر نہیں ہے تمہارے پاس؟''

''ہے جی......... مگر.........''

''اگر مگر چھوڑو......... مجھے اس کا نمبر بتاؤ۔ میں بات کرتا ہوں۔'' میں نے اس کی بات کا
اور ساتھ ہی اپنی جیب سے موبائل بھی نکال لیا۔ پھر منیجر مشتاق نے مجھے ٹھیکیدار رب نواز کا نمبر
موبائل پر پنچ کرنے کے بعد میں نے اپنا موبائل کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف رنگ جا رہی تھی
اس کے بعد خلافِ توقع ایک کھنکتی ہوئی زنانہ آواز اُبھری۔

''ہیلو!.........کون؟''

میں ذرا گڑبڑا سا گیا اور گھور کر سامنے بیٹھے منیجر مشتاق کو دیکھا۔ اس کمبخت نے شاید غلط نمبر

''کیا چپ شاہ کا روزہ رکھ لیا ہے یا پھر میری آواز کے سحر میں کھو گئے ہو؟......... بولتے کیو
کون ہیں آپ؟'' مجھے خاموش پا کر دوسری طرف پُر شوخ آواز مگر تند لہجے میں پوچھا گیا تو
بات کرنا پڑی۔

''میں دراصل ٹھیکے دار رب نواز صاحب سے بات کرنا چاہتا تھا مگر.........'' میں نے دانستہ
ادھورا چھوڑا تو دوسری طرف کھلکھلاتی ہوئی ہنسی کی آواز اُبھری۔

''اوہ......... آئی سی۔ شاید رانگ نمبر مل گیا ہے۔ لیکن کہیں آپ مجھ سے ڈر کر تو نہیں
ہیں؟'' آواز میں تازگی اور لہجے میں پُر شوخ اُٹھان تھی۔ تاہم میں اب گفتگو کو طول دینے کے
تھا اور اول جلول منیجر مشتاق کی خبر لینے کی غرض سے بات ختم کرتے ہوئے اس طرح دار، د
والی لڑکی سے بولا۔

''آئی ایم سوری.........'' یہ کہہ کر میں نے رابطہ منقطع کر دیا اور منیجر مشتاق کی طرف گھو

''بے وقوف!''

''کیا فون پر ہے، جی کڑا کے؟'' منیجر مشتاق نے اُلوؤں کی طرح دیدے پھاڑ کر مجھ سے

''فون کے بچے! تم نے غلط نمبر دے دیا تھا۔ دوبارہ چیک کرو۔'' میں نے گھورتے ہو
جھڑکا۔ وہ بوکھلا گیا اور جلدی سے گڑبڑا کر بولا۔

''اونہیں جی! یہی نمبر ہے۔ میں نے خود دو مرتبہ بات کی تھی ٹھیکے دار رب نواز سے۔ لو جی، میں ابھی کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے وہی نمبر اپنے موبائل سے ملایا اور کان سے لگا لیا۔

''ہیلو جی! ٹھیکے دار رب نواز صاحب......... جی کڑا کے.........او جی نہیں، یہ میرا تکیہ کلام ہے۔ لیں جی، نادر صاحب سے بات کریں۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنا موبائل میری طرف بڑھا دیا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے موبائل اپنے کان سے لگا دیا اور ہیلو کہا تو دوسری جانب سے وہی نسوانی اور پُرشوخ آواز اُبھری۔

''اوہ ....تو گویا آپ کو میری آواز پسند آ گئی ہے جو اب کسی اور موبائل کے ذریعے مجھ سے دوبارہ رابطہ کیا ہے۔ ویسے میری آواز کے ساتھ میرے سینڈل بھی پیارے ہیں۔ اس کا نمبر بتاؤں؟''

میں نے بری طرح بوکھلا کر فوراً ہی رابطہ منقطع کر دیا۔ پھر منیجر مشتاق سے دھاڑ کر بولا۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے منیجر! اس عمر میں تمہیں یہ شوخیاں زیب نہیں دیتیں۔'' منیجر مشتاق کی حالت دیدنی ہو گئی۔ وہ واقعی جی کڑا کے لرزتی آواز میں بولا۔

''جی.........جی کڑا کے.........سر جی! وہ.........وہ.........''

''کیا وہ، وہ.........تم ہر بار وہی رانگ نمبر ملا رہے ہو۔'' میں نے آنکھیں نکال کر غصے سے سرخ ہو کر کہا۔

''اونہیں جی! ابھی ابھی ٹھیکے دار رب نواز نے مجھ سے اپنی بھاری اور مردانہ آواز میں بات کی تھی، جی کڑا کے.........لائیے، میں دیکھتا ہوں دوبارہ۔''

میں نے اسے گھورتے ہوئے موبائل اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ دوبارہ نمبر ملانے لگا۔ پھر رابطہ ہوتے ہی دوسری طرف سے غالباً مطلوبہ آواز سن کر بولا۔

''یہ کیا مذاق کر رہے ہیں آپ ٹھیکے دار جی! آپ بات کیوں نہیں کرتے نادر صاحب سے؟......... یہ لیں جی۔'' منیجر مشتاق نے ڈرتے ڈرتے اپنا موبائل پھر میری جانب بڑھایا اور میں نے موبائل اپنے کان سے لگاتے ہی ہیلو کہا۔

''بتائے دیتی ہوں۔ میری سینڈل کا نمبر نو ہے اور بہت تیزی سے سر گنجا کر کے رکھ دیتی ہے۔'' دوسری جانب سے پھر وہی پُر شوخ نسوانی آواز ابھری اور میں نے غصے سے چراغ پا ہو کر موبائل منیجر مشتاق کو کھینچ مارا۔ وہ بے چارہ پہلے ہی ڈرا ہوا تھا لہٰذا موبائل باؤنسر کی طرح اس کی ناک پر لگا۔ اس کی آنکھوں میں پانی اتر آیا۔

''نان سنس!......... دفع ہو جاؤ یہاں سے، گدھے!......... اُلو!'' میں چراغ پا ہو کر دھاڑا۔ منیجر مشتاق کی حالت دیکھنے والی ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی گود میں گرے ہوئے موبائل کو اٹھایا۔ حیران پریشان سا اٹھ کر جانے لگا تو میں نے اسے آواز دی۔

''سنو.........!''

وہ رک گیا۔

''ٹھیکے دار رب نواز کے دفتر یا رہائش گاہ کا کوئی ٹیلی فون نمبر ہو گا تمہارے پاس؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بے چارہ ڈرتے ڈرتے منمناتی آواز میں بولا۔ ''ہے تو سہی ....مم.........مگر.........'' وہ کہتے کہتے رک گیا اور میں اس کی ادھوری بات کا مطلب سمجھتے ہوئے بے اختیار ہنس دیا۔

''مجھے نمبر بتاؤ۔''

اس نے نمبر بتایا۔ نمبر دفتر کا تھا۔ میں نے اپنے سامنے میز پر دھرے ٹیلی فون سیٹ سے نمبر ملایا۔ وا
وہیں موجود تھا۔

"ہیلو......!" اس کی بھاری آواز اُبھری۔

"ٹھیکے دار رب نواز صاحب؟" میں نے استفسار طلب لہجے میں کہا۔

"ہاں، ہاں...... بات کر رہا ہوں۔ آپ کون؟" گمبھیر آواز میں کہا گیا۔

"مری ٹال سے نادر علی خان بات کر رہا ہوں۔"

"ہاں، بولیں۔ کیا بات ہے؟" رکھائی سے پوچھا گیا۔

میں نے بھی سپاٹ لہجہ اختیار کیا اور جواباً اسی رعونت سے بولا۔ "میرا منیجر بتا رہا تھا کہ آپ نے
منٹ لینے کے باوجود ابھی تک شاہ بلوط کی دوسری کھیپ نہیں بھیجی ہے؟"

دوسری طرف چند ثانیے پُرسوچ خاموشی طاری رہی اور پھر ٹھیکے دار رب نواز کی آواز اُبھری۔

"ہاں...... بھیج دیں گے...... دو تین روز میں...... دراصل......"

میں نے اس کی بات کاٹ کر قدرے تلخی سے کہا۔ "رب نواز صاحب! ہمیں مال آج ہی چاہئے
ہمارا ایک پارٹی سے سودا ڈن ہو چکا ہے۔ آپ کو یہ مال وعدے کے مطابق تین روز پہلے ہی بھیج د
چاہئے تھا۔ اب تاخیر ممکن نہیں رہی۔ ہمیں لاکھوں کا نقصان ہوگا۔"

"میں آپ کی مجبوری سمجھ رہا ہوں۔" دوسری طرف رب نواز کی آواز اُبھری۔ "دراصل ہم نے خود
لکڑی ہزارہ سے منگوائی تھی...... بارشوں کی وجہ سے ٹرک پھنس کر رہ گئے ہیں۔ اب آپ ہی بتائ
میں کیا کروں؟"

"کون سے علاقے میں ٹرک پھنسے ہیں آپ کے؟" میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

اس نے فوری جواب نہ دیا۔ چند ثانیے کی پُرسوچ خاموشی کے بعد بولا۔ "حویلیاں سے آتے ہو
طوفانی بارشوں سے ایک پُل ڈھے گیا تھا۔"

"تو گویا ٹرک وہیں کھڑے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یقیناً۔"

"آپ نے ٹرک نکلوانے کے لئے کیا انتظامات کروائے ہیں؟"

"ظاہر ہے، اب ہاتھ پر ہاتھ دھرے تو ہم نہیں بیٹھے ہیں۔ کچھ نہ کچھ تو کر ہی رہے ہیں۔" وہ
ہو کر بولا۔

میں اب کیا کہہ سکتا تھا۔ ناچار رابطہ منقطع کر دیا۔ اس کے بعد رضوی صاحب سے بات کی
معذرت خواہانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا۔

"جناب! معافی چاہتے ہیں...... بات دراصل یہ ہے کہ......"

میں نے اسے مجبوری بتائی۔ میرا خیال تھا وہ ناک بھوں چڑھائے گا۔ مگر وہ خوش اخلاقی سے ب

"تم نادر علی خان!...... مرحوم حیدر گل کے بھانجے تو نہیں؟"

"جی ہاں۔" میں نے کہا۔

"اللہ بخشے حیدر گل کو۔ بڑا ہی نفیس اور بھلا مانس تھا۔ میرے اس سے محض کاروباری روابط ہی ن
بلکہ برادرانہ تعلقات بھی تھے۔ کوئی بات نہیں...... دراصل مجھے مال جلدی چاہئے تھا اور میں پہ
تھا اس لئے میں نے غصے میں آ کر تمہارے منیجر کو سودا منسوخ کرنے کی دھمکی دے ڈالی تھی۔

ن روز کی تاخیر قابلِ برداشت ہو سکتی ہے۔"

مجھے وہ بڑا ہی نفیس انسان لگا۔ چنانچہ میں نے بھی انکسار سے کہا۔ "نہیں جی رضوی صاحب! یہ آپ
کا بڑا پن ہے۔ درحقیقت قصور ہمارا بھی نہیں ہے۔ جس ٹھیکے دار نے ہمیں لکڑی سپلائی کرنا تھی، اس کے
ک حویلیاں میں تیز طوفانی بارشوں کے باعث پُل ٹوٹنے سے وہیں پھنس کر رہ گئے ہیں۔"

"اوہ، اچھا...... ویسے کون سے ٹھیکے دار سے منگوائی ہے لکڑی؟" رضوی صاحب نے پوچھا۔

"رب نواز سے۔" میں نے بتایا۔

"رب نواز......" رضوی صاحب نے عجیب لہجے میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "یہ تو ایک نمبر کا چیٹر
دی ہے۔ تمہارے ماموں حیدر گل نے تو اس سے سودے بازی ہی منسوخ کر رکھی تھی۔ تمہیں شاید نہیں
علوم، اس نے تمہارے ماموں کو ایک دفعہ دیمک زدہ لکڑی فراہم کر دی تھی اور صاف مکر گیا تھا۔"

"کیا......؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا تھا۔

"ہاں۔ تمہارے منیجر مشتاق کو بھی اچھی طرح علم ہوگا۔ پورے ساٹھ لاکھ تمہارے ماموں سے وصول
کرنے کے باوجود انہیں دیمک زدہ لکڑی دے ڈالی تھی۔ تمہارے ماموں بے چارے امن پسند آدمی تھے،
س بات کو کڑوا گھونٹ سمجھ کر پی گئے۔ کیونکہ رب نواز کچھ اچھی شہرت کا آدمی نہیں ہے۔ اس نے تو
نڈے بھی پال رکھے ہیں۔ خیر، تم ڈرنا مت بیٹا!"

رضوی صاحب نے کہا اور میں اپنی جگہ سُن ہو کر رہ گیا۔ پھر گم صم سے لہجے میں ان کا شکریہ ادا کر
کے ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے سامنے بیٹھے منیجر مشتاق کو گھورنے لگا۔ وہ اٹھ کر کھسکنے لگا۔

"بیٹھو!" میں اسے گھورتے ہوئے تیز لہجے میں بولا۔ "رضوی صاحب بتا رہے تھے کہ اس مردود ٹھیکے
دار رب نواز نے ہمیں کچھ عرصہ پہلے ساٹھ لاکھ کے عوض دیمک زدہ لکڑی دے دی تھی؟"

"نن...... نہیں...... جی کُڑا کے۔" وہ منمناتی آواز میں بولا تو میں غصے سے چلّا کر بولا۔

"بھاڑ میں گیا تمہارا، جی کُڑا کے...... ہاں یا نہ میں جواب دو۔"

"وہ...... وہ...... جی، یہ...... بہت پرانی بات ہوگئی۔ آپ کے ماموں حیدر گل نے معاملہ
طے کر دیا تھا۔" وہ جواباً ڈرتے ڈرتے بولا۔

میں نے اس کے چہرے سے صاف محسوس کیا تھا کہ وہ کچھ چھپا رہا تھا۔ لہٰذا گھورتے ہوئے اس سے
پوچھا۔ "کس طرح معاملہ طے کیا تھا ماموں نے؟"

"چھوڑیں سر جی! مٹی ڈالیں۔ یہ بات بہت پرانی ہو چکی ہے۔" وہ بولا تو میں نے دانت کچکچا کر
سے گھورتے ہوئے کہا۔

"میں مٹی تمہاری قبر پر ڈالوں گا منیجر! اور وہ بھی زندہ تمہیں زمین میں گاڑ کر۔" میری بات پر اس کے
ونق سے چہرے پر ایسے تاثرات اُبھرے جیسے اسے پرانی قبض کی تکلیف ہو۔

"جب تمہیں معلوم تھا کہ رب نواز نے پہلے بھی ہم سے دھوکا کیا تھا تو پھر تم نے اس سے دوبارہ
کیوں کاروباری مراسم استوار رکھے؟...... اور ٹھیکے دار مر گئے تھے؟"

"سر جی! شاہ بلوط اور شیشم جیسی قیمتی لکڑی کی سپلائی کا واحد ٹھیکے دار رب نوز ہی ہے۔ اور پھر فوری
طور پر یہی ہمیں مال دے سکتا تھا۔" وہ منمناتی آواز میں بولا۔

"بے وقوف!" میں دانت پیس کر بولا۔ "اچھا اب مجھے یہ بتاؤ کہ ماموں حیدر گل نے ٹھیکے دار رب
واز سے رقم واپس لی تھی یا نہیں؟"

وہ سمجھ گیا کہ بات اب میرے کان میں پڑ چکی تھی لہٰذا بولا۔ ''نہیں جی! وہ حرام کا جنا سارے ہڑپ کر گیا تھا، جی کڑا کے۔''

''جی کڑا کے نہیں، بغیر ڈکار لئے۔'' میں نے دانت پیس کر گویا تصحیح کی۔

وہ مزید گھبرا گیا۔ ''آپ کے ماموں نے اس کے خلاف قانونی کارروائی بھی کی تھی۔ مگر سوائے پیشیاں بھگتنے کے انہیں کچھ نہ ملا۔''

''تو اور ہماری عدالتوں میں کیا ہوتا ہے؟......... فریادی کو ہی جائز و ناجائز کیس بھگتنا پڑتا ہے'' میں تلخی سے بڑبڑایا۔ ''خیر......... اس کے دستاویزی ثبوت یا کوئی تفصیلات؟''

''جی ہاں۔'' اس نے سر ہلایا تو میں نے تحکمانہ کہا۔

''کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر میری ٹیبل پر پیش کرو۔''

میری بات پر وہ ذرا جھجکتے ہوئے بولا۔ ''سس......... سر جی! وہ......... وہ رب نواز بڑا ڈ خطرناک آدمی.........''

''تم اپنی کھال میں رہو۔ ورنہ مجھ سے اتروالو۔'' میں پُرطیش لہجے میں دھاڑا۔

''جی......... جی اچھا......... ابھی لایا۔'' وہ یکدم گھبرا کر اُٹھا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

میں غصے کے مارے بری طرح پھنک رہا تھا۔ ٹھیکے دار رب نواز نے ماموں حیدر گل کے ساتھ لاکھ کا دھوکا کیا تھا اور انہوں نے مجھے بتایا تک نہیں تھا۔ درحقیقت اس میں ماموں حیدر گل کی بد دخل نہ تھا۔ وہ اپنے تئیں دغاباز رب نواز سے نمٹنے کی کوشش کرتے بھی رہے ہوں گے۔ مگر انہوں گمبھیر معاملہ اپنے تک ہی محدود رکھا تھا۔ جس طرح شاہ میر اور نظر حیات کے سنگین معاملے سے مجھے رکھنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ مجھے اب پورا یقین تھا کہ ٹھیکے دار رب نواز اس بار مجھ سے بھی فرا چاہتا تھا اور اس نے یقیناً مجھ سے جھوٹ بولا ہوگا کہ اس کے ٹرک حویلیاں کے مضافات میں پھنس گئے ہیں۔

میں سوچنے لگا کہ مجھے نہ صرف اس بات کی تصدیق کے لئے کوئی عملی قدم اٹھانا پڑے گا بلکہ لاکھ کی رقم بھی اس کے حلق میں ہاتھ ڈال کر نکلوانا پڑے گی۔ اچانک میرے موبائل کی بیل گنگنائی۔ نگینہ کی تھی۔ میں نے دھڑکتے دل سے کہا۔

''ہاں نگینہ! کہو، خیریت تو ہے؟'' خیریت کہاں تھی، یہ تو روا روی میں میرے منہ سے نکل گیا تھا۔

اُس کی پژمردہ آواز اُبھری۔ ''نادر! ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ مجھے پپا کو لے کر ا جانے کا مشورہ دیا ہے۔ ان کا (SPINAL CORD) حرام مغز متاثر ہوا ہے۔'' وہ غمزدہ لہجے میں میں پریشان ہو گیا۔

''تت......... تو پھر......... تم کیا کرو گی؟'' میں نے مرتعش لہجے میں پوچھا۔

''نادر! تم جانتے ہو کہ پپا کے سوا میرا اس دنیا میں اور کون ہے......... میں نے سیٹیں کنفرم ہیں۔ آج شام کی فلائٹ سے میں اسٹیٹس روانہ ہو رہی ہوں۔''

میں جامد ہو کر رہ گیا۔ نگینہ کی غمناک آواز میرے دل و جگر پر آرے چلا رہی تھی۔ پھر اپنے ا رقت آمیز کیفیت پر قابو پا کر میں اس سے بولا تو مجھے اپنی آواز دل کے عمیق گوشوں سے اُبھرتی ہوئی۔ اس میں شکست خوردگی بھی تھی، ندامت بھی اور درد آگیں کسک بھی۔

''نگینہ! میں بری طرح پس رہا ہوں۔ میں تم سے محبت کا بھی دعوے دار ہوں اور تمہیں زخمی زخم

کر رہا ہوں۔ نن......... نگینہ! یہ......... یہ کیسا امتحان ہے؟......... یہ کیسی آزمائش ہے؟ کیا......... کیا ہمیں ایک دوسرے کے دشمنوں کے گھر میں ہی پیدا ہونا تھا؟ کاش......... کاش نگینہ! ہم ترائیوں میں آباد کسی غریب کی جھونپڑی میں پیدا ہوتے۔'' میری آواز رندھ گئی۔ لہجہ لرزش زدہ تھا۔ ''نگینہ! مم......... مجھے معاف کر دو گی؟......... مم......... مجھے معاف کر دو گی نا؟'' میں رو پڑا۔

''نادر! میں سمجھتی ہوں، تمہارا بھی کوئی دوش نہیں۔'' نگینہ کی مہین آواز اُبھری۔ ''مجھے تمہاری آزمائش، تمہاری پوزیشن کا احساس ہے اور شاید تمہاری مجبوری سمجھنے کے لئے ہی تقدیر مجھے ایسی آزمائش سے گزار رہی ہے۔ جہاں تم ایک ماں کے بیٹے ہو تو وہاں میں بھی ایک باپ کی بیٹی ہوں مگر......... میرا باپ تمہارا اور تمہاری ماں کا مجرم ہے۔ یہ میں بھی سمجھتی ہوں۔ مگر......... مگر نادر! کبھی کبھی بس مجھے یہ بات اندر سے بے چین کر دیتی ہے کہ ہم لوگوں کے رویوں میں لچک، ایک دوسرے انسان کے لئے کیوں نہیں آتی؟ ہم ایک دوسرے کو معاف کرنے کا حوصلہ کیوں نہیں رکھتے؟''

''نگینہ! تم صحیح کہہ رہی ہو۔'' میں نے ماں کی طرف سے اس کا اشارہ سمجھ کر اعترافاً کہا۔ ''مگر نگینہ! معافی بھی تو درپردہ اعتماد اور بھروسے پر مشروط ہوتی ہے۔ اگر تمہارا باپ شاہ میر سچے دل اور سچی نیت سے اس روز تمہارے ساتھ ہم ماں بیٹے سے معافی مانگنے آیا تھا تو پھر اس نے نظر حیات جیسے کمینے کے ساتھ مل کر ہم ماں بیٹے پر اس رات شب خون کیوں مارنے کی کوشش کی تھی؟''

میری اس بات پر نگینہ نے پہلے کی طرح خاموشی اختیار کر لی اور پھر جیسے موضوع بدل کر بولی۔

''نادر! میں پپا کو لے کر امریکہ جا رہی ہوں......... کیا میں تم سے اپنے پپا کی صحت یابی کے لئے دعا کی درخواست کر سکتی ہوں؟''

میں اس کی بات پر خاموش رہا تو نگینہ نے ہی شاید میری خاموشی بھانپ کر کہا۔ ''نادر! میری محبت کی قسم، جو مجھے تم سے ہے اور تا ابد رہے گی کہ خدا تم دونوں ماں بیٹے کو لمبی عمر دے کہ شاید میرے سچے دل سے نکلی ہوئی دعا پلٹ جائے۔ اچھا، خدا حافظ!''

''نگینہ! خدا تمہارا حامی و ناصر ہو......... خدا حافظ!'' میں نے بھی کپکپاتے لہجے میں کہا۔ اچانک نگینہ نے پوچھا۔

''تم مجھے سی آف کرنے آؤ گے؟''

''تم کیا کہتی ہو؟''

''تمہاری مرضی۔''

''تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو نگینہ؟''

''ہرگز نہیں......... کیونکہ ہم نے عہد کر رکھا ہے کہ کڑی آزمائش کے پل صراط سے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر گزریں گے۔''

''اوہ، نگینہ!......... آئی لو یو......... ایکسٹریملی آئی لو یو ٹو مچ۔'' میں نے مسرت آگیں لہجے کی گہرائیوں سے کہا۔

''آئی لو یو ٹو۔'' نگینہ نے بھی ایسے ہی لہجے میں کہا۔ اس کے بعد رابطہ منقطع ہو گیا۔

ریسیور رکھ کر میں نے تھکے تھکے انداز میں ریوالونگ چیئر کی چوڑی پشت گاہ سے کمر ٹکا دی اور آنکھیں موند لیں۔

''سر جی!......... یہ فائل۔'' منیجر مشتاق کی آواز پر میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

وہ فائل میرے سامنے لئے کھڑا تھا۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تو اس نے فائل میری طرف بڑھا
میں نے ایک گہری سانس لی۔ نگینہ سے گفتگو کے بعد میرے دل و دماغ پر قنوطیت سی چھانے لگی۔ امریکہ جانا مجھے گہرے تفکر میں مبتلا کئے ہوئے تھا۔ لیکن میں اسے روک بھی تو نہیں سکتا تھا۔ وہ اپ کے علاج کی غرض سے جا رہی تھی۔ اس لئے میری طبیعت بوجھل سی ہو رہی تھی۔ میں نے فائل کھولے بغیر میز پر رکھ دی اور مینیجر مشتاق سے چائے کا کہا۔

اس نے فوراً چائے منگوالی۔ ایک کپ میری جانب بڑھایا۔ میں نے ایک چسکی بھری اور ایک ہمکاری لی۔ مینیجر مشتاق بہ غور میرے چہرے کو تکے جا رہا تھا۔ میرے چہرے کے تھکے تھکے، فکر مند تا کی وجہ کو اپنے تئیں بھانپ کر بولا۔

''سر جی! اس مسئلے کی وجہ سے اللہ بخشے آپ کے ماموں مرحوم بھی بڑے پریشان رہتے تھے... پیسہ تو ہاتھ کا میل ہے جی، دفع کریں اس پرانے مسئلے کو۔ کیوں گڑے مُردے اُکھاڑ کر مزید پریشا رہے ہیں؟''

میں نے اسے گھور کر دیکھا اور جھڑک کر بولا۔ ''تم اپنی چونچ بند رکھو۔''

میری بات پر اس نے یکدم ایک ہاتھ سے اپنے ہونٹوں کو چھوا۔ گویا اسے ڈر ہو کہ کہیں واقعی چونچ تو نہیں اُبھر آئی۔ مجھے اُس کی اس حرکت پر ہنسی تو آئی۔ تاہم میں نے ضبط کرتے ہوئے فا جانب ہاتھ بڑھایا۔

اس میں چند کاغذات نتھی تھے۔ میں بہ غور ان کا جائزہ لینے لگا۔ مجھے حیرت تھی کہ ٹھیکے دار رب کی ماموں حیدر گل سے دغا بازی والا معاملہ زیادہ پرانا نہ تھا، ان کی موت سے صرف دو ایک ماہ پہ کی بات تھی۔ اور عدالت سے بھی رجوع کیا گیا تھا مگر ٹھوس ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے کیس داخل د چکا تھا یا پھر خارج کر کے رب نواز کے حق میں فیصلہ ہو گیا تھا۔ ایک کاغذ میں ٹھیکے دار رب نواز کی ر گاہ اور دفتر کے فون نمبرز بھی درج تھے۔ موبائل نمبر بھی تھا اور مکمل ایڈریس بھی۔ میں نے یہ سب نشین کئے تو موبائل نمبر پر میں چونکا۔ یہ واقعی درست تھا، جو مینیجر مشتاق نے مجھے دیا تھا۔ مگر میرے ما پر ہر بار اس شوخ لڑکی کا رانگ نمبر مل جاتا تھا۔

میری پیشانی پر شکنیں نمودار ہو گئیں۔ ''نمبر تو وہی ہے......... پھر کیوں رانگ نمبر لگ رہا تھا؟'' گومگو انداز میں بڑبڑایا تو مینیجر مشتاق میرے بڑبڑانے کا مطلب سمجھتے ہوئے بہ یک جنبش بولا۔

''دیکھا سر جی! آپ بلاوجہ مجھے ڈانٹ رہے تھے۔ یہی رب نواز کا موبائل نمبر تھا۔''

''ہاں، ہے تو یہی۔'' میں پُر سوچ لہجے میں تائیداً بولا۔ ''تو پھر......... ہر بار لڑکی کی کیوں آ رہی تھی؟ حالانکہ بہ قول تمہارے، تم نے رب نواز کی آواز بھی سنی تھی اور دوبارہ موبائل میری جانب بڑ تو پھر اس لڑکی کی آواز مجھے سنائی دی تھی۔

''میں خود پریشان ہوں سر جی!'' وہ بولا۔ ''سر جی! مجھے تو لگتا ہے رب نواز ہی آپ کو ٹالنے کی لڑکی کی آواز میں بول رہا ہو گا۔''

''نہیں......... یہ کوئی اور معاملہ ہے۔ خیر، بھاڑ میں ڈالو'' میں نے بیزار ہو کر کہا پھر اس معاملے کی ساری تفصیل پوچھنے لگا۔ اس کے بعد میں نے ایک لائحہ عمل تیار کیا۔ فوری طور پر، سب پہلے بہ قول رب نواز کے اس کے تین ٹرک حویلیاں کے قریب اچانک پل ٹوٹ جانے کی وجہ سے رہ گئے تھے، میں اس کی تصدیق کر کے یہ معاملہ حل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد ساٹھ لاکھ والے دھوکا

کے مسئلے پر توجہ دینے کا ارادہ کیا۔

اس کے بعد میں اپنی جیپ میں بیٹھ کر اسی وقت ٹھیکے دار رب نواز کے دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔ مینیجر مشتاق سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق اس دغا باز ٹھیکے دار رب نواز کا دفتر نتھیا گلی کی طرف جاتے ہوئے کلڈانہ چوک کے دائیں ''جھیکا گلی'' کی طرف تھا۔

چنانچہ کلڈانہ چوک پر پہنچ کر میں بغیر رکے دائیں جانب جھیکا گلی کو مڑ گیا۔ اب میں شاہ بلوط، صنوبر اور چیڑ کے گھنے اور خوب صورت درختوں کے بیچ بل کھاتی پختہ سڑک سے گزر رہا تھا۔

تقریباً چھ سات کلومیٹر تک خوبصورت ہوٹلوں کی قطار میں ایک عدد گالف کورس اور دیدہ زیب پارک سے گزرتا ہوا جب میں ''بھوربن'' جانے والے راستے پر آیا تو دائیں جانب مجھے ایک خاصے وسیع و عریض سرسبز مسطح قطعہ اراضی پر سفید رنگ کی عمارتی لکڑی کے دفاتر نظر آئے۔

میں اپنے مطلوبہ دفتر کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ جیپ سے اتر کر میں احاطے پر بنے گیٹ پر پہنچا تو ایک چوکیدار نے مجھے بتایا کہ رب نواز اپنے گھر جا چکا تھا۔

میں نے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ ابھی دن کے گیارہ ہی بجے تھے۔ پھر چوکیدار کی طرف دیکھ کر حیرت سے بولا۔ ''تمہارے صاحب اتنی جلدی گھر چلے گئے؟''

''جی ہاں......... آج انہیں گھر پر ضروری کام تھا۔'' چوکیدار نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

مجھے رب نواز کی رہائش گاہ کا پتہ معلوم تھا۔ میں واپس لوٹ کر اپنی جیپ میں آ بیٹھا۔ چند ثانیے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔ مجھے آج ہر حالت میں اس دغا باز ٹھیکے دار سے ملنا تھا۔ چنانچہ میں نے اس کے گھر پر ہی ملاقات کرنے کی ٹھانی اور جیپ اسٹارٹ کر کے ریورس لے گیا۔ اس کی رہائش گاہ باڑیاں سے خیرہ گلی میں چار کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔

میں جیپ دوڑاتا ہوا خیرہ گلی جا پہنچا۔

ٹھیکے دار رب نواز کی کوٹھی دیکھ کر میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ وہ نسبتاً بلند اور آبادی سے ہٹ کر ایک وسیع قطعہ اراضی پر واقع تھی۔ کوٹھی اگرچہ ایک منزل پر ہی مشتمل تھی مگر اس کا رقبہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔

مجھے دور سے ہی کوٹھی کی پیشانی پر درج جلی حروف میں ''کاشانہ پیلس'' نظر آ گیا تھا۔ میں ابھی جیپ میں بیٹھا تھا اور وہیں بیٹھے بیٹھے تفصیلی جائزہ لے رہا تھا اور دانت پیس کر دغا باز ٹھیکے دار رب نواز کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ضرور اس مردود اور دھوکے باز انسان نے اپنی زندگی ہیرا پھیری کے سہارے ہی گزاری ہے۔ ورنہ میں نے کسی لکڑی کے ٹھیکے دار کو یوں طمطراق اور شاہانہ زندگی بسر کرتے ہوئے آج تک نہیں دیکھا تھا۔

میں نے گیٹ پر پہنچ کر جیپ روک دی۔ وہاں دو گن مین چوکس کھڑے نظر آئے۔ میں نے ایک سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''میرا نام نادر علی خان ہے۔ اور میں رب نواز صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔''

دونوں دراز قامت تھے اور ہلکے نیلے رنگ کی مخصوص وردی میں ملبوس تھے۔

''کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہو؟'' اس نے جواباً پوچھا۔

''مجھے ان سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ میں ان کے دفتر بھی گیا تھا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ وہ آج جلد ہی اپنے گھر جا چکے ہیں۔'' میں نے کہا۔

دونوں نے بہ غور میرا جائزہ لیا۔ پھر دوسرے نے کہا۔ ''صاحب کی آج طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ آرام کر رہے ہیں۔ آپ کسی اور وقت آ جانا۔''

میں سمجھ گیا کہ دونوں ہی جھوٹے تھے، اپنے صاحب کی طرح۔ یعنی دفتر کا چوکیدار اور گھر کا چوکیدا
اُس نے مجھ سے کہا کہ رب نواز کو گھر پر ضروری کام تھا اور یہ کہہ رہے تھے کہ اس کی طبیعت خراب تھ
میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''دیکھیں .... میں مری سے آیا ہوں اور ان سے ضروری بات کرنی ہے۔ اس بہانے ان
مزاج پرسی بھی کرلوں گا۔ میرے ان سے کاروباری روابط کے علاوہ دوستانہ تعلقات بھی ہیں۔''

دونوں کچھ سوچنے لگے۔ پھر ایک نے کہا۔ ''آپ کے پاس ان کا موبائل نمبر تو ہوگا ہی۔ کیا آ
نے ان سے رابطہ نہیں کیا تھا؟''

''ان کا موبائل شاید آف ہے۔'' میں نے جھوٹ بولا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ایک نے مجھ سے کہا۔ ''پھر تو آپ کا ان سے ملنا مشکل ہ
آپ ایسا کریں، پھر کل ان سے دفتر میں ہی ملاقات کر لیجئے گا۔ ہم مجبور ہیں۔''

میں ہونٹ بھینچے چند ثانیے کچھ سوچتا رہا۔ پھر میں نے رب نواز سے موبائل پر رابطہ کرنے کا ارادہ
اور ابھی میں اپنی جیب سے موبائل نکالنے ہی لگا تھا کہ اچانک عقب سے کسی گاڑی کے ہارن کی آو
اُبھری اور ساتھ ہی ایک چوکیدار نے مجھ سے کہا۔

''آپ ذرا ایک طرف ہو جائیں۔ چھوٹی بی بی کی گاڑی آرہی ہے۔''

میں ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ ایک نئے ماڈل کی چمچماتی کرولا رینگتی ہوئی آرہی تھی۔ چوکیداروں
گیٹ کھول دیا تھا اور دائیں بائیں دست بستہ مؤدبانہ کھڑے ہو گئے۔

میری نظریں کار پر پڑیں۔ ایک خوش جمال، پری وش چہرہ نظر آیا۔ رنگت گوری تھی، بال بوائے ک
تھے، آنکھوں پر ''رے بن'' چشمہ تھا۔ خاصی الٹرا ماڈرن اور جوان لڑکی نظر آتی تھی۔ بالوں کا رنگ
براؤن تھا یا پھر ڈائی کئے ہوئے تھے۔

اس نے میری طرف دیکھا تھا، پھر کار اندر لے جانے کی بجائے اس نے گیٹ پر ہی روک دی تھی
ایک چوکیدار چابی بھرے کھلونے کی طرح حرکت میں آیا اور گولی کی طرح اس کی طرف بڑھا۔

''کون ہے یہ؟'' لڑکی نے چوکیدار سے بڑی سریلی آواز میں پوچھا۔ مگر میں اس مترنم آواز پر بر
طرح چونکا تھا۔ یہ وہی کھنکتی اور شوخ و شنگ آواز تھی۔ مجھے یاد آیا تھا، جب میں رب نواز سے موبائل
رابطہ کرنے کی کوشش کرتا تو رانگ نمبرل جاتا اور یہی کھنکتی ہوئی آواز میرا استقبال کرتی۔ مجھے شدید حیر
ہوئی۔ میں قریب ہی کھڑا تھا۔ چوکیدار جواباً مؤدبانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

''بی بی جی! وہ .... وہ دراصل صاحب سے ملنا چاہتے تھے۔''

لڑکی نے پھر میری طرف دیکھا اور عینک اوپر کر دی۔ اس کی آنکھیں پُرکشش اور ہلکی نیلاہٹ مائل
تھیں۔ اچھی طرح مجھے بغور دیکھنے کے بعد وہ اسی با ادب کھڑے چوکیدار سے بولی۔

''مگر رب نواز تو گھر پر نہیں ہے۔ یہ یہاں کیوں آئے ہیں؟''

اس کے اندازِ تخاطب پر مجھے حیرت ہوئی۔ میں اسے رب نواز کی بیٹی سمجھا تھا۔ مگر یہ اس کا یوں نا
لے رہی تھی جیسے وہ کوئی معمولی ملازم ہو۔ پھر میں نے آگے بڑھ کر اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''میرا نام نادر علی خان ہے .... اور میں ٹھیکے دار رب نواز سے ملنے پہلے دفتر ہی گیا تھا۔ مگر وہاں
چوکیدار نے مجھے بتایا کہ وہ گھر جا چکے ہیں اس لئے میں یہاں آیا تو یہ دونوں حضرات فرما رہے ہیں کہ و
اندر موجود ہیں مگر ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' میں نے دانستہ لب کشائی کی تھی تا کہ میری طرح وہ بھی

میری ''رانگ نمبر'' والی آواز پہچان جائے۔ اور وہی ہوا، وہ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے پہلے تو اپنا
خوب صورت لب والا دہانہ کھولے، دلکش نیلی آنکھیں پھاڑے مجھے تکتی رہی، پھر دوسرے ہی لمحے اس کے
چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ اُبھری۔

اس نے اُڑی اُڑی رنگ کی انتہائی ٹائٹ جینز اور اس پر چست ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ پیروں میں
کورٹ شوز تھے۔ وہ اب کار سے اتر کر جیسے گھورنے کی حد تک میرا تفصیلی جائزہ لینے لگی۔ میں نے اپنے
لمبے چوڑے وجود پر لفافہ ٹائپ براؤن جینز اور اوپر ہاف دھاری دار شرٹ پہن رکھی تھی۔ بال میرے
ہمیشہ ہی سولجر کٹ کے رہتے تھے۔ میں پورے قد کے ساتھ سامنے چیڑ کے درخت کی طرح کھڑا تھا اور
وہ بیری کے پیڑ کی طرح اپنے پورے نشیب و فراز کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ازحد دلچسپی
اور ہونٹوں پر شرارت بھری مسکراہٹ ہلکورے لے رہی تھی۔

''ہائے، میرا نام کاشانہ ہے۔'' اس نے مترنم آواز میں کہا اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے
بھی ہولے سے مسکرا کر مصافحے کے انداز میں اس کا نرم و گداز ہاتھ تھاما اور ایک بار پھر اپنا نام بتایا۔

''کاشانہ'' کے نام پر بے اختیار میری نگاہوں کے سامنے کوٹھی کا نام ''کاشانہ پیلس'' رقصاں ہو گیا اور
ایک بار پھر ایک اندازے کے تحت میں اُلجھن میں مبتلا ہو گیا کہ یہ کوٹھی اس کے نام سے منسوب تھی۔ ہو
سکتا تھا، یہ رب نواز کی دختر نیک اختر ہی ہو۔ اگرچہ تھوڑی دیر پہلے اس نے عجیب انداز میں اپنے باپ کا
نام لیا تھا۔

''آپ کو کس سلسلے میں رب نواز سے ملنا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''ایک کاروباری سلسلے میں ان سے بات کرنا تھی۔ موبائل پر غالباً.........'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا
چھوڑا تو وہ شرارت بھری مسکراہٹ سے بولی۔

''سوری! وہ میری ہی شرارت تھی۔ رانگ نمبر نہیں تھا۔''

''اچھا......... پھر تو آپ نے میرے منیجر مشتاق بے چارے کو اچھی خاصی جھاڑ پلوا دی مجھ سے۔
میں یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ بار بار رانگ نمبر ملا رہا تھا۔''

''آپ اندر تشریف لائیں......... پلیز!'' وہ اچانک بولی۔ اس کے ''پلیز'' کہنے میں بے تابانہ اشتیاق
جھلکتا تھا۔

''میں اپنی جیپ اندر لے آؤں؟'' میں نے اپنی جیپ کی طرف اشارہ کر کے اس سے کہا۔ پھر اس
کے بعد دونوں گاڑیاں آگے پیچھے اندر داخل ہو گئیں۔ اندر ایک جانب ڈبل کیبن پک اپ بھی کھڑی تھی۔
ہم وہیں لان میں بچھی کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔

''آپ کیا لیں گے؟'' یہ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کی چین کے کسی بٹن کو پش کیا تو
اندر کوٹھی کے کسی گوشے میں کوئل کی آواز اُبھری۔ یہ ریموٹ کنٹرول بیل تھی، کسی ملازم کو متوجہ کرنے کے
لئے۔ نتیجے میں ایک سانولی سی، پکی عمر کی عورت نمودار ہوئی۔

''کافی پلا دیں۔'' میں نے بلا تکلف کہا۔

''کافی لے آؤ۔'' کاشانہ نے اس سے کہا۔ ملازمہ خاموشی سے لوٹ گئی۔

''ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''جی.........؟'' وہ بھرپور معنی خیز مسکراہٹ سے میری طرف دیکھ کر بولی۔

''رانگ نمبر والی بات پر میں ابھی تک الجھا ہوا ہوں۔ جب میرا منیجر نمبر ملا رہا تھا تو رب نواز صاحب

بول رہے تھے اور جب وہ میری طرف موبائل بڑھاتا تو آپ کی آواز آتی تھی۔ کیا شرارت میں آ
پپا بھی شامل تھے؟''

''پپا؟......... کس کے پپا؟.......کون سے پپا؟'' وہ مصنوعی حیرت سے بولی۔ اس کی ا
کرنے کا انداز بھی نرالا تھا۔

''کیا رب نواز صاحب آپ کے پپا نہیں ہیں؟''

''وہ میری مما کے شوہر ہیں، میرے پپا نہیں۔'' اس نے کسی قدر تلخی سے کہا۔

''اوہ...... میں سمجھ گیا۔ غالباً وہ آپ کے اسٹیپ فادر یعنی سوتیلے باپ ہیں۔''

''چھوڑیں اس بات کو۔ آپ شرارت والی بات پوچھ رہے تھے؟'' اس نے یاد دلایا۔

''جی۔'' میں نے ہولے سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''درحقیقت میں رب نواز کو تنگ کرنے اور دق کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے د
اکثر ان کے موبائل کی ''سم'' چرا لیتی ہوں اور اپنے موبائل میں لگا کر ان کے کسٹمرز کو تنگ کرتی ہو

''لیکن......... میرے مینیجر کو رب نواز کی بھی آواز سنائی دی تھی۔ مگر جب اس نے میر
موبائل بڑھایا تو ایک دم آپ کی آواز ابھری۔ یہ کیا معاملہ تھا؟'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔

''ابھی بتاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے اپنی لچکیلی کمر کو قیامت خیز خم دیا او
قیمت موبائل سیٹ نکال کر ایک بٹن پش کیا۔ موبائل سے رب نواز کی ریکارڈ شدہ آوازوں کے
نشر ہو رہے تھے۔ مثلاً........ ہاں، میں رب نواز بات کر رہا ہوں۔......... ''آئی ایم سوری!
کر دو......... جہاں یہ کہہ رہے ہیں وہاں مال پہنچا دو، وغیرہ۔

اس نے بٹن آف کر دیا۔ میں ہنس پڑا۔ ''آپ تو اس طرح خاصی تنگ کرتی ہوں گی رب
میں نے جیسے اسے شہ دیتے ہوئے کہا۔

دراصل ان دونوں کے سوتیلے پن والی حقیقت میرے لئے سود مند ثابت ہو سکتی تھی۔ بالخصوص
کے ان چند (TYPICAL) انداز کے جملوں نے میرے ذہن رسا کو دور تک سوچنے کی راہ بجھائی
میں اب کاشانہ کی شخصیت میں اس حوالے سے اس غیر معمولی دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا تھا
اس فریبی اور دھوکے باز ٹھیکے دار رب نواز کے گھر کی میرے لئے ایک ایسی بھیدی ثابت ہو سکتی تھ
کی لنکا ڈھا سکتا تھا۔

''چلیں، یہ تو مذاق ہوا۔ کیا آپ بتائیں گی کہ رب نواز کہاں ہوگا اس وقت؟'' بالآخر میں
موضوع کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔

''وہ نہ دفتر میں ہیں نہ گھر پر۔ اپنے کسی دوست سے ملنے گئے ہیں۔ ابھی آتے ہی ہوں
جواباً بولی، پھر آخر میں مستفسر ہوئی۔ ''آپ کو کس سلسلے میں ملنا تھا ان سے؟''

اس کی بات پر میں نے پہلے ایک گہری سانس لی۔ میں نے اسے اس کے سوتیلے باپ کے
سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔ مگر پہلے مال کی دوسری کھیپ وقت مقررہ پر نہ پہنچانے کی شکا
ہوئے ساری بات بتا دی۔

''ایک نمبر کا فراڈیا اور چیٹر ہے یہ رب نواز......... اس نے بہت سے لوگوں کے ساتھ دھو
کی ہے۔ خیر......'' وہ رک کر بولی۔ ''رب نواز جھوٹ بولتا ہے، اس کے کوئی ٹرک حویلیاں
پر نہیں پھنسے ہیں۔ جس وقت آپ نے ان کے دفتر فون کیا تھا، میں بھی وہاں موجود تھی۔ اس

سے سفید جھوٹ بولا تھا۔ درحقیقت وہ تینوں ٹرک کہیں نہیں پھنسے ہیں۔ وہ سارے گودام میں ہی کھڑے ہیں۔ کسی پارٹی نے منہ مانگے داموں ان کا سودا کیا تھا، وہ وہیں سپلائی کرنے والا تھا۔ بلکہ آج دوپہر تک وہیں پہنچا دیئے جائیں گے۔''

مجھے اس کی بات سن کر رب نواز کے جھوٹ، فریب پر بری طرح طیش آیا۔

''لیکن......... ان پر ہمارا حق پہلے بنتا ہے۔ میں اس کی پے منٹ کر چکا ہوں۔ اگلی پارٹی سے میرا سودا منسوخ ہو جائے گا اور ہمیں لاکھوں کا نقصان ہو جائے گا۔'' میں نے کاشانہ سے کہا۔

''آپ کیوں فکر مند ہوتے ہیں؟ میں جو بیٹھی ہوں، رب نواز کے سینے پر مونگ دلنے کے لئے۔ ابھی دیکھو تماشا۔'' اس نے یہ کہہ کر اپنے سیل فون پر کسی کے نمبر پنچ کئے اور پھر جیسے ہی دوسری جانب سے کسی کی آواز اُبھری، کاشانہ نے فوراً اپنا دوسرا موبائل نکال کر اپنے سوتیلے باپ کا ایک ریکارڈ شدہ جملہ منتخب کیا اور پہلے والے موبائل کے بالکل قریب کرتے ہوئے ایک بٹن پش کر دیا۔

''گگل خان! گودام نمبر تین اے میں جو ٹرک کھڑے ہیں، وہ مری ٹال والوں کو اسی وقت روانہ کر دو۔ ہاں، ہاں .... وہیں حیدر گل والے ٹال میں۔'' اس کے بعد کاشانہ نے دونوں موبائل آف کر دیئے۔ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''بھلا یہ جملہ تم نے کب اور کیسے فیڈ کر لیا تھا؟'' میں نے بے یقینی کے انداز میں پوچھا۔

اس کے لبوں پر اسرار بھری شاطرانہ مسکراہٹ اُبھری اور پھر الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔ ''یہ وہی ٹال ہے نا، جہاں حیدر گل ہوتا تھا؟''

''ہاں......... وہ میرے ماموں تھے۔ مگر اب اس دنیا میں نہیں رہے۔''

''اوہ......... وری سیڈ!'' وہ متاسفانہ لہجے میں بولی۔ پھر بتانے لگی کہ یہ جملہ اس نے اس وقت اپنے موبائل پر ریکارڈ کیا تھا جب وہ میرے ماموں حیدر گل کے ساتھ لاکھ ہڑپ کرنے کے بعد ان کی طرف دیمک زدہ لکڑی کا ٹرک روانہ کرنے کے لئے اپنے گودام کیپر گگل خان کو حکم دے رہا تھا۔ اس کے بعد وہ ایک گہری ہنکاری خارج کر کے مجھ سے بولی۔

''تو گویا آپ حیدر گل کے بھانجے ہیں۔ میں سمجھتی تھی آپ وہاں کام کرتے ہیں۔ خیر، اب آپ کے مطلوبہ ٹرک آپ کے ٹال تک پہنچ جائیں گے۔''

''میں آپ کا شکر گزار ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے کیا آپ بھی .... اپنے پپا......... میرا مطلب ہے رب نواز کے دفتر...''

''ہاں، میں بھی دفتر میں بیٹھتی ہوں۔ بلکہ وہ میرے باپ کا ہی کاروبار ہے، جس پر رب نواز نے قبضہ جما رکھا ہے۔'' وہ میری بات کاٹ کر زہریلے لہجے میں بولی۔

میں نے پھر بھی اس سے ذرا شرمندہ سے لہجے میں کہا۔ ''کاشانہ صاحبہ! ویسے میرا دل تو نہیں مان رہا اس طرح کی حرکت کرنے کو لیکن.........''

''نادر صاحب! آپ کس دنیا میں رہتے ہو؟ اس سادگی کی وجہ سے تو آپ کے ماموں مرحوم نے رب نواز سے دھوکا کھایا تھا۔'' وہ بولی۔ ''زہر کو زہر ہی کاٹتا ہے۔ آپ کا کام ہو گیا۔ یہ آپ کا حق ہے۔ چاہے جس طریقے سے ہو۔''

''میں ایک بار پھر آپ کی غیر معمولی ذہانت کا اعتراف کرتے ہوئے شکریہ ادا کرتا ہوں۔'' میں نے تہہ دل سے اس ذہین وفطین پری وش کا شکریہ ادا کیا۔

اس دوران ملازمہ ایک ٹرے میں کافی لے آئی تھی۔ ہم دونوں خاموشی سے کافی پینے لگے۔
کاشانہ نے میرا مسئلہ چٹکی بجاتے ہی حل کر ڈالا تھا۔ میں نے اسی وقت اپنے منیجر مشتاق سے م
پر رابطہ کر کے اسے چند ضروری ہدایات دے ڈالیں۔
کاشانہ ایک جینئس لڑکی ثابت ہوئی۔ بلکہ خطرناک حد تک جینئس۔ اس کی غیر معمولی ذہانت م
لئے جتنی حیران کن تھی، اتنی ہی عجیب و غریب بھی۔ شکر تھا کہ وہ اپنی خطرناک ذہانت کو مثبت اندا
استعمال کر رہی تھی۔
کافی پینے کے دوران میں نے محسوس کیا کہ کاشانہ یک ٹک اور بڑے غور سے میرے چہرے کو
رہی تھی۔ اس کا یہ انداز بڑا بے باکانہ تھا جبکہ مجھے اس سے بار بار نظریں چرانا پڑ رہی تھیں۔
''آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیں گے؟ میرا مطلب ہے، آپ رہتے کہاں ہیں؟'' معاً اس
سے پوچھا۔ میں نے کافی کا آخری گھونٹ لینے کے بعد کپ میز پر رکھا اور مختصراً اپنے بارے میں بتا
''گویا ہماری طرح آپ کی بھی فیملی مختصر ہے۔'' وہ بولی تو میں نے اس سے رخصت چاہی۔ م
ہو گیا تھا۔ رب نواز سے ملنے کا اب کوئی فائدہ نہ تھا۔ البتہ دوبارہ بہت جلد ملاقات کا متمنی ضرور تھا۔
میں نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہونے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔
''میں اب چلوں گا۔ آپ سے دوبارہ ملاقات اب دفتر میں ہو گی۔''
وہ بھی کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''کون سے دفتر میں؟''
''ظاہر ہے، آپ ہی کے دفتر میں ہو گی۔ ساٹھ لاکھ والا معاملہ بھی تو حل کرنا ہے مجھے۔ اس سل
رب نواز سے دو تین روز میں ملنے والا ہوں۔ ویسے........'' میں اچانک کچھ کہتے کہتے رکا، پھر
کر بولا۔ ''اس گمبھیر معاملے کے سلسلے میں بھی شاید مجھے آپ کے مشورے کے مطابق ہی کوئی قد
چاہئے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟''
میری بات پر وہ دلنشین نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ کے پاس اس مع
تھوڑی بہت دستاویزی تفصیل تو ہو گی جو آپ کے ماموں حیدر گل اور رب نواز کے درمیان طے پا
''جی ہاں........ بالکل ہے۔'' میں نے برجستہ کہا۔
''میرا خیال ہے میں کبھی آپ کے دفتر کا چکر لگاؤں۔ اور پھر وہیں ایک نشست میں کوئی ا
طے کر لیں گے۔''
میں اس کی فراخ دلانہ پیشکش پر مسرور ہو گیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ رب نواز جیسے دھوکے
فریبی انسان سے نمٹنے کے لئے اتفاقاً ہی کاشانہ کی صورت میں ایک فوری اور سود مند شارٹ کٹ
اور میں اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا میں نے انتہائی خلوص سے کہا۔
''کاشانہ صاحبہ! میں آپ کا پہلے ہی نہایت شکر گزار ہوں۔ تاہم مجھے بے حد خوشی ہو گی
میرے غریب خانے پر تشریف لائیں تاکہ میں بھی آپ کو وہ تفصیلات دکھا کر مطمئن کر سکوں کہ آ
مسئلہ بھی جائز لگے۔''
''میں سب جانتی ہوں اور میں نے آپ کے ماموں حیدر گل سے بھی ان دنوں رابطہ کیا
بولی۔ ''میں نے انہیں بھی یہی مشورہ........''
وہ اچانک رکی۔ شاید اسے کچھ یاد آ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مضطربانہ رمق ابھری او
کا۔ وہ بولی۔ ''چلیں ٹھیک ہے، میں وہیں آ کر آپ سے تفصیلی گفتگو کر لوں گی۔ اس وقت اگر

آ گیا تو آپ کو یہاں پا کر بہت کچھ سمجھنے کی کوشش کرے گا۔ پھر شاید میں بھی اسے ڈاج نہ دے سکوں۔''
میں اس کی بات کا اشارہ سمجھ گیا اور واپس لوٹ آیا۔

❋ ❋ ❋

میں اپنے ٹال پہنچا تو منیجر مشتاق کی باچھیں خوشی کے مارے کانوں کی لوؤں تک کھچی ہوئی تھیں۔
''آپ........آپ نے تو کمال کر دیا سر جی! ادھر آپ گئے، اُدھر مال آ گیا۔ میں نے تو چیرنے کے لئے بھی بھیج دیا، جی کڑا کے۔'' مجھے دیکھتے ہی وہ اپنے مخصوص تکیہ کلام کے ساتھ خوشی سے بولا۔
''جی کڑا کے، کیوں؟ خوشی سے کیوں نہیں؟'' میں بھی ذرا موڈ میں آ گیا۔
''او جی، خوشی سے ہی۔ یہ تو ایسے ہی تکیہ کلام ہے۔'' وہ جھینپی ہوئی مسکراہٹ سے بولا۔ وہ بغیر قدغن کے اپنا تکیہ کلام فٹ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔
''ویسے سر جی! کیا رب نواز اتنا ہی تھڑ دِلا ثابت ہوا تھا کہ آپ کو دیکھتے ہی اس پر ایسی دہشت سوار ہو گئی کہ فوراً مال بھیج دیا۔'' وہ حیرت سے بولا۔
میں اپنے آفس روم میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے تحیر آمیز استفسار پر میرے ہونٹوں پر اسرار بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں اسے کیا بتاتا کہ یہ اس کے رانگ نمبر کا کمال تھا یا پھر حُسنِ اتفاق۔ مگر وہ ذرا احمق سا شخص تھا اس لئے ابھی میں اس سے رب نواز کی سوتیلی بیٹی کاشانہ کے سلسلے میں ذکر کرنا نہیں چاہتا تھا۔
میں نے اسے ہدایت کی کہ وہ فوراً خام مال چِروا کر رضوی صاحب کو روانہ کر دے۔ نیز آئندہ وہ کبھی بھی رب نواز جیسے دھوکے باز شخص سے کوئی کاروباری ڈیل نہ کرے، وغیرہ۔
مجھے رب نواز کے اس جھوٹ پر شدید غصہ آ رہا تھا کہ اس کے ٹرک ہزارہ سے آتے ہوئے حویلیاں میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ جبکہ بہ قول کاشانہ کے یہ اس نے میرے ساتھ جھوٹ بولا تھا۔ مجھ سے کئے گئے شاہ بلوط کی لکڑی کے طے شدہ سودے کا مال وہ کسی اور پارٹی کو دینا چاہتا تھا۔
اب میں سنجیدگی کے ساتھ اپنی ساٹھ لاکھ کی خطیر رقم رب نواز کے حلق سے نکلوانا چاہتا تھا جو خاصا شکل کام تھا مگر ناممکن نہیں۔ اور پھر کاشانہ کے اچانک درمیان میں آنے سے مجھے ایک راہ سجھائی دی تھی۔ کاشانہ سے مل کر میں نے اس کے بارے میں اندازہ قائم کیا تھا کہ وہی اس گمبھیر معاملے میں میری ردکر سکتی تھی۔ کیونکہ رب نواز اور کاشانہ کے درمیان نفرت کی جو فطری خلیج حائل تھی، مجھے اس سے فائدہ ہنچ سکتا تھا۔ وہ میرے لئے دھوکے باز رب نواز کے گھر کا بھیدی ثابت ہو رہی تھی۔ اور میں اس کے ریعے رب نواز کی لنکا ڈھا دینا چاہتا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہ تھا کہ میرا مقصد ناجائز تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ کاشانہ بھی اپنے سوتیلے باپ کی دھوکا دہی والی قبیح فطرت سے آگاہ تھی اور میرے سئلے کو جائز سمجھتی تھی۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ بہ قول اس کے وہ اپنے سوتیلے باپ کے سینے پر مونگ ل رہی تھی اور اسے زچ کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہتی تھی۔ اس میں ممکن تھا اس کا ہی کوئی اپنا ذاتی مفاد شامل ہو جو یقیناً گھریلو نوعیت کے جھگڑوں کا ہی نتیجہ تھا۔
بہر طور میرا فوری طور پر ایک مسئلہ تو حل ہو چکا تھا۔ میں اب نگینہ کے متعلق سوچنے لگا۔ میں نے اس کا نمبر ملایا۔
''ہیلو نگینہ!........ کیا صورت حال ہے؟''
''سب کچھ ویسا ہی ہے........ میں پیکنگ کر رہی ہوں۔'' اس کی پژمردہ آواز اُبھری۔
''نگینہ! امریکہ میں تمہارا کوئی جاننے والا نہیں؟........ میرا مطلب کوئی دور پرے کا عزیز، رشتے دار

دوئم

وغیرہ؟'' میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''ایسا کوئی قریبی رشتے دار تو نہیں۔ مگر پپا کے ایک دور کے رشتے کی خالہ زاد بہن وہاں ورجی (واشنگٹن) میں رہتی ہیں۔''

''تم نے رابطہ کیا ہے ان سے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں......وہی ہمیں ریسیو کرنے آئیں گی۔''

''میں تمہیں سی آف کرنے آؤں ایئرپورٹ پر؟'' میں نے ہولے سے پوچھا۔

''نہیں نادر! بس مجھے روانہ ہونے دو...... میں شدید ذہنی پریشانی کا شکار ہوں۔ ویسے انکل نا حیات ہوں گے میرے ساتھ۔'' وہ ٹوٹے ٹوٹے لہجے میں بولی۔ اس کی بات پر میرے دل کی حالت خراب ہونے لگی اور بالآخر رابطہ منقطع کر دیا۔

اچانک میری نگاہ شیشے کے دروازے سے پار، جہاں سے ٹال کے وسیع احاطے کا منظر صاف نظر تھا، پڑی تو میں ذرا چونکا۔ وہ ایک سنگل ڈور بجیرو تھی، جو تیزی سے اندر داخل ہوئی تھی اور یکدم بریک کرا سے روکا گیا تھا۔ پھر میں نے ایک لمبے تڑنگے شخص کو دروازہ کھول کر گویا چھلانگ لگا کر برآمد ہو دیکھا اور اس کے ہمراہ تین مزید افراد بھی تھے۔ چاروں اپنی وضع قطع سے چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آ تھے۔ جبکہ لمبا تڑنگا شخص کچھ زیادہ کرخت چہرہ تھا۔ ان لوگوں نے ٹائٹ جینز اور ہاف سلیو چست ٹی شر پہن رکھی تھیں۔ لمبے تڑنگے شخص کے چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی بھی تھی۔ دور سے ہی میں نے اس کرخت چہرے سے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ ہتھ چھوڑ اور مغرور طبیعت کا مالک تھا۔ اس وقت ان کے بشر سے جارحانہ عزائم کا اندازہ ہوتا تھا۔

ان کے جارحانہ تیوروں کو محسوس کر کے میری رگوں میں خون کی گردش یکلخت تیز ہوگئی۔ وہ میر دفتر کی طرف لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ میں نے خود کو اسی طرح ہی آرام برجمان رہنے دیا۔ دروازہ کھلا اور سب سے پہلے وہ لمبا تڑنگا شخص اندر داخل ہوا۔ اس کے بعد باقی بھی اندر آ گئے۔

''تمہارا نام نادر علی خان ہے......؟'' لمبے تڑنگے نے مجھے گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر جھ لہجے میں پوچھا۔

''جی ہاں...... آپ کی تعریف؟'' میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

''میرا نام گگل خان ہے اور مجھے ٹھیکے دار رب نواز نے بھیجا ہے۔'' اس نے بتایا تو میں پل کے سمجھ گیا کہ معاملہ کیا تھا؟

''جی...... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟ تشریف رکھیں۔'' میں نے بدستور بے نیازی مگر اخلاقاً کہا۔

''آج صبح جو ٹرک آئے، ان کا مال ہمیں واپس چاہئے۔'' گگل خان میرے چہرے پر نظریں کرتے ہوئے خرانٹ لہجے میں بولا۔

''لیکن کیوں؟...... وہ مال تو میرا ہے۔ رب نواز نے خود بھیجا تھا۔ میں اس کی پے منٹ......

''بکواس بند کرو۔ ہمارے ساتھ دھوکا کیا تھا تم نے۔''

گگل خان نے غرا کر مجھے گھورتے ہوئے کہا اور یکدم ہی میرے اندر کا جنگجو نادر علی خان

جو بعد میں گولی کی طرح میرے ہاتھ سے نکل کر گگل خان کی ناک پر لگا۔ اس کے حلق سے کریہہ خارج ہوئی اور بھل بھل خون بہنے لگا۔ اس کے باقی گرگے ایک لمحے کو پھیلی ہوئی آنکھوں سے میری یہ اور غیر متوقع حرکت کو دیکھتے رہ گئے۔

پھر ان میں سے ایک نے زخمی گگل خان کو سہارا دیا جو تکلیف کی شدت سے بری طرح کراہ رہا تھا باقی دو گماشتے جارحانہ تیوروں کے ساتھ میری طرف لپکے۔ میں ریوالونگ چیئر سے پشت ٹکائے ان کی سمت تھوڑا سا گھوما اور سب سے پہلے اپنی طرف بڑھنے والے گماشتے کے پیٹ میں لات کر دی۔ وہ چند قدم پیچھے لڑکھڑا گیا۔ دوسرا وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ مجھ پر اُچھلا۔ میں نے دوبارہ ور ریوالونگ چیئر پر بیٹھے بیٹھے اسے گھمایا، وہ اچھل کر میری بھاری بھرکم ریوالونگ چیئر کی لمبی چوڑی گاہ سے ٹکرایا۔ میں نے تیسری بار بیٹھے بیٹھے ہی ریوالونگ چیئر گھمائی اور اپنے دائیں ہاتھ کی کہنی اس پہلو پر رسید کر دی۔ ضرب کا زوردار ہونا ضروری تھا۔ ورنہ وہ سنبھلتے ہی اتنے قریب سے بہ آسانی کے سے میرے چہرے کی تواضع کر سکتا تھا۔ میری کہنی کی ضرب نے اسے ذرا دیر کے لئے بے بس دیا تو پہلا والا لات گزیدہ بدمعاش مجھ پر جھپٹا۔ میں نے بجلی کی سی پھرتی سے کرسی چھوڑی اور وہ کرسی پڑا۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، ٹال کے مزدور شیشے کے پار سے اس دھینگا مشتی کی جھلک دیکھ کر اں، ڈنڈے لئے اندر گھستے چلے آئے۔ میں ایک کونے میں بڑے آرام سے جا کھڑا ہوا تھا۔ پھر اس پہلے کہ مزدور ان کا مار مار کر بھرکس نکال دیتے، میں نے باآواز بلند ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے ان کہا۔

''ابھی رک جاؤ۔ اگر ان کا دماغ پھر بھی ٹھکانے نہیں لگے تو ان کا مار مار کر قیمہ کر دینا۔''

وہ چاروں قہر وغضب کی تصویر بنے ہانپ رہے تھے اور مجھے غضب ناک نظروں سے گھورے جا رہے ۔ میں نے مزدوروں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے ان چاروں کو میرے آفس سے باہر دھکیل دیا۔ وہ ں خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیتے ہوئے اپنی جیپ میں جا بیٹھے اور منہ کی کھا کر واپس لوٹ گئے۔

میں نے گگل خان اور اس کے تینوں ساتھیوں کو مزہ چکھا دیا تھا مگر میں جانتا تھا کہ وہ بے غیرت ۔ چلو بھر پانی میں ڈوب مرنے کی بجائے محاذ بنا کر اپنی ذلت کا بدلہ لینے دوبارہ ضرور آتے۔ میں زرخرید کتوں کو لاتوں کے ذریعے خوش آمدید کہا کرتا تھا۔

میں نے منیجر مشتاق کو بلا کر ٹال کی چوکیداری کے انتظامات سخت کرنے کی ہدایات دیں۔ اگرچہ اس پہلے ہی ٹال میں آگ لگنے کے واقعے کے بعد سے دو چوکیداروں کے علاوہ میں نے دو عدد لائسنس گن بردار بھی متعین کر رکھے تھے۔ کام معمول کے مطابق چل رہا تھا جو شام تک جاری رہا۔ رضوی ب کو مال روانہ کر دیا گیا تھا۔ اب میں اسلام آباد ایئرپورٹ کی طرف نکلنا چاہتا تھا۔

میں نے رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ شام کے سات بج چکے تھے۔ نگینہ کی فلائٹ رات گیارہ بجے ی۔ میرے پاس وہاں تک پہنچنے کے لئے دو گھنٹے تھے۔ خاصی دیر کی ذہنی کشمکش کے بعد میں نے ر نگینہ کو سی آف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

نگینہ کو سی آف کرنے کے بعد لامحالہ گرین لاج پہنچتے پہنچتے کافی دیر ہو جاتی۔ ماں دیر سے آنے کا دریافت کر سکتی تھی۔ میں ماں سے مصلحتاً بھی اب جھوٹ بولنے کا روادار نہ رہا تھا۔ اس لئے میں نے کا جواب بھی سوچ لیا تھا۔ چنانچہ میں ابھی نکلنے ہی لگا تھا کہ میرے موبائل کی بیل گنگنائی۔ یہ کاشانہ

کی کال تھی۔
''فینٹاسٹک نادر صاحب!........ واہ، آپ تو بڑے زبردست فائٹر ہیں۔'' میرے موبائل کا
لگاتے ہی اس کی پٹاخے دار آواز ابھری۔
''ایسا کیا کر دیا میں نے؟'' یہ کہتے ہوئے میں نے موبائل کان سے لگائے لگائے جیپ کی
قدم بڑھا دیئے۔ میں تاخیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔
''ارے واہ........ جیسے آپ کو معلوم ہی نہیں۔'' اس کی کھنکتی ہوئی پُر شوخ آواز میری سماع
ٹکرائی۔ ''آپ نے رب نواز کے خاص چیلے گگل خان کی ناک توڑ کر رکھ دی ہے اور اس کے
ساتھیوں کو پیٹا، یہ کیا کم کارنامہ ہے اس کا غرور توڑنے کے لئے؟''
''ہاں........ وہ میرے آفس میں آ کر بدمعاشی دکھانے کی کوشش کر رہے تھے۔'' میں نے بتا
تو اچھا ہوا، ان چاروں کی جنگ مجھ اکیلے تک محدود رہی۔ بہ صورت دیگر میرے مزدور اگر ذرا دیر
جاتے تو ان چاروں کا بھرکس نکال دیتے۔''
''ہاں .... میں اس وقت دفتر میں ہی تھی جب وہ چاروں رب نواز کو اپنی ذلت بھری ک
رہے تھے اور اس وقت رب نواز بری طرح جھلا کر گگل خان سے کہہ رہا تھا کہ اسے چوڑیاں پ
چاہئیں۔ یہ پہلا موقع ہے نادر صاحب! کہ رب نواز کے خاص الخاص چیلے گگل خان کا کسی نے یو
بگاڑا ہے۔''
اس کی بات پر میں نے کہا۔ ''اگر انہوں نے دوبارہ میرے سامنے آنے کی جرأت کی تو میں
پورا جغرافیہ بھی بگاڑنے کی طاقت رکھتا ہوں۔''
''ایکسیلنٹ........!'' وہ چہکنے لگی۔ ''آپ مردانہ وجاہت کے حامل ہی نہیں بلکہ اچھے خاصے ا
ہیں۔ اب تو آپ کے ساتھ دوستی کرنے میں بڑا مزہ آئے گا۔ کرو گے نا مجھ سے دوستی؟'' اس ب
میں بڑے اشتیاق سے پوچھا۔
اس کی بات پر میں ذرا گڑبڑا گیا۔ لیکن میں اسے مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اب مجھے رب نو
حلق سے ساٹھ لاکھ روپے کی رقم نکلوانی تھی، لہٰذا اسے بناتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے، آپ
کی ابتداء تو اسی روز سے ملنے والے رانگ نمبر سے ہو چکی ہے۔''
''اوہ........ ویری نائس!........ تو پھر ڈن؟'' وہ خوش ہو کر بولی۔
''ڈن!'' میں نے بھی جواباً کہا۔
''میں آپ کے پاس کل آ رہی ہوں........ او کے، بائی!'' اس نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر د
نے موبائل آف کر کے جیب میں رکھا اور جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

❄❄❄

میں جیپ کو خاصی تیز رفتاری کے ساتھ دوڑا رہا تھا۔ میں اب اس تذبذب میں مبتلا تھا کہ ماں
تاخیر سے گھر آنے کی اطلاع کروں یا نہیں۔ اگر اطلاع کرتا تو لامحالہ وہ مجھ سے وجہ پوچھ سکتی تھیں
بہرطور میں نے سردست یہی سوچا کہ خود سے اطلاع نہ دوں۔ اگر انہوں نے خود مجھ سے رابطہ
بتا دوں گا۔
سوا گھنٹے کی تیز رفتار، نان اسٹاپ ڈرائیونگ کے بعد میں اسلام آباد کی حدود میں داخل ہو
یہاں سے میں نے لال مسجد کی طرف جیپ موڑ لی۔ فیصل مسجد کے مقابلے میں یہاں سے کسی

شارٹ کٹ پڑتا تھا۔ مزید پندرہ بیس منٹ بعد میں ایئرپورٹ کے قریب پہنچ کر رک گیا۔
میں جیپ کو پارک کرنے کے بعد نیچے اتر آیا۔ اسلام آباد کا موسم معتدل تھا۔ ایئرپورٹ جگمگاتی
روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ میں گیٹ کی طرف بڑھنے ہی لگا تھا کہ اچانک ایک سیاہ رنگ کی کار میرے
بالکل قریب راستہ روک کر کھڑی ہوگئی۔
میں ٹھٹک کر رک گیا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے میں کار کو پہچان چکا تھا۔ یہ انکل اعظم خان کی کار تھی
ڈرائیونگ سیٹ پر وہ خود موجود تھے۔ جبکہ ان کے برابر ان کا باڈی گارڈ وزیر خان بیٹھا تھا۔ لیکن جب
عقبی سیٹ کا دروازہ کھلا تو میں ایک خاتون کو گرم کشمیری شال اوڑھے نکلتے دیکھ کر بری طرح ٹھٹک گیا۔ وہ
میری ماں تھیں۔ ان کا چہرہ غصے اور طیش کے مارے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔
''تم نگینہ کو سی آف کرنے آئے تھے نا؟'' ماں نے مجھے زندگی میں پہلی بار اس قدر نفرت آمیز نظروں
سے گھورا تھا۔ اس دوران انکل اعظم خان بھی نیچے اتر آئے تھے اور وزیر خان بھی۔
''ہاں، ماں........!'' میں نے اپنے اندر کی کیفیات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ پھر گہری متانت سے
کہا۔ ''مگر شاہ میر کو نہیں........ صرف نگینہ کو۔''
''میں تمہاری ماں ہوں۔ تم مجھے اب زیادہ دیر نہیں بہلا سکتے۔'' ماں نے ہونٹ چبائے۔
''میں نے پہلے کب آپ کو بہلایا ہے ماں!'' میں نے دکھ سے کہا تو اچانک انکل اعظم خان نے
مداخلت کرتے ہوئے ماں سے کہا۔
''شبینہ! مجھے بات کرنے دو۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بڑے رسان سے بولے۔ ''نادر بیٹا! تم
خود کو آخر کیوں دو پاٹوں کے بیچ پیس رہے ہو؟........ تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ کیونکہ میری دور اندیش
نظریں دیکھ رہی ہیں، اگر تمہارے اور ماں کے بیچ یہی حالات رہے تو مجھے ڈر ہے کہ تم نہ ادھر کے رہو
گے نہ ادھر کے۔''
''انکل! میرا کیا قصور ہے؟ میں نے دشمنوں کے سلسلے میں ماں کا کب ساتھ نہیں دیا ہے؟'' میں نے
کہا۔ ''شاہ میر آج مُردوں سے بدتر ہو چکا ہے۔ نظر حیات بھی رات والے حملے کے بعد مرتے مرتے بچا
ہے۔ اور میں کیا کروں؟ رہی نگینہ کی بات تو اس کا کیا قصور ہے؟''
''اس کا یہ قصور کیا کم ہے کہ وہ دشمن کی بیٹی ہے؟'' ماں نے قہرناک لہجے میں کہا۔
''یہ کوئی قصور نہیں ہوا ماں!'' میں نے کہا۔ ''یہ اس کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی
ل نے مجھ سے ناتا توڑا ہے اور نہ ہی اب تک پولیس میں کوئی رپورٹ درج کروائی ہے۔ اور وہ بے
پاری کیا کرے؟''
''ہونہہ........ بے چاری........''
ماں نے حقارت سے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ایک ایمبولینس سائرن بجاتی ہوئی نمودار ہوئی۔
ل کا رخ گیٹ کی طرف تھا۔ ہم سب ذرا چونکے۔ ایمبولینس ہمارے قریب پہنچ کر ایک جھٹکے سے رک
ئی۔ اس کے عقب میں ایک پراڈو کار بھی تھی۔ وہ بھی رک چکی تھی۔
ایمبولینس کا سائرن بند کر دیا گیا تھا۔ پھر میں نے ایمبولینس کا عقبی سلائیڈنگ ڈور کھلتے دیکھا۔ اس
ل سے نگینہ برآمد ہوئی۔ اسے دیکھ کر میں چونکا تھا۔ یقیناً ایمبولینس میں زندہ لاش کی صورت شاہ میر
ٹریچر پر پڑا ہوگا۔ جبکہ پراڈو کار کے بھی دروازے وا ہوئے تھے اور میں نے نظر حیات کو اترتے دیکھا۔
ل کے ہمراہ دو آدمی بھی تھے۔

دوئم

فلائٹ روانگی میں ابھی دو، سوا دو گھنٹے باقی تھے۔ نظر حیات بھی نگینہ کو سی آف کرنے آیا تھا۔ مگر ہ شاید نظر پڑتے ہی یہ لوگ نیچے اتر پڑے تھے۔

ماحول یکایک ہی بدل گیا تھا۔ ایئر پورٹ کی رونقیں مجھے ماند ہوتی دکھائی دے رہی تھیں۔

آج سے پچیس سال پہلے والی لرزہ خیز کہانی کے متضاد کرداروں کا ایک جگہ اکٹھے ہونا، ایک نئی ہولناک داستان کو جنم دے سکتا تھا۔ ماں کی غضب ناک نگاہیں نگینہ کے چہرے سے ہٹ کر نظر حیات جم گئی تھیں اور نظر حیات نگینہ سمیت دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا ہماری طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا جہاں مجھے غیظ و غضب اور نفرت کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔



نگینہ اور نظر حیات، دونوں شانہ بشانہ چلتے ہوئے ہم ماں بیٹے سے چند قدم دور آ کر رک گئے۔ کو نظر حیات کے ساتھ دیکھ کر میرے اندر نفرت کی لہر چلنے لگی تھی۔ دونوں کا ساتھ نظر آنا ماں کے دل پہلے سے پیدا شدہ نگینہ کے خلاف غلط فہمی کو مزید تقویت دینے کا سبب بن سکتا تھا۔

نگینہ نے دھیرے سے ماں کو سلام کیا مگر ماں نے نہایت متکبرانہ نفرت کے ساتھ اسے نظر انداز کر دیا ظر حیات کو گھورنے لگی۔ جبکہ نظر حیات نے ایک اچٹتی سی نگاہ میرے چہرے پر ڈالنے کے بعد ماں کو رتے ہوئے کہا۔

''شبینہ! تمہاری اس وقت یہاں آمد کو میں کیا سمجھوں؟''

''مجھے اس دھرتی پر ہر جگہ تم صرف اپنی موت ہی سمجھو نظر حیات! مطلب کیا پوچھتے ہو؟'' ماں نے ریلے لہجے میں نظر حیات کو جواباً گھورتے ہوئے کہا۔

''اوہ........ بہت آگ ہے تمہارے سینے میں۔'' نظر حیات نے استہزائیہ لہجے میں ماں سے کہا۔ یکن شبینہ بیگم! اس آگ میں آخر ایک دن تم خود جل کر خاکستر ہو جاؤ گی۔''

میں نے دیکھا، ماں کے چہرے پر بڑی اسرار بھری مسکرہٹ اُبھری۔ ایسی مسکراہٹ جس میں نفرت چنگاریاں اور جوشِ غیظ بھی تھا تو اپنے بدترین دشمن کو زیر دست کرنے کی بھرپور خود اعتمادی بھی۔ میں ستہ خاموش رہا۔ شاید میں ایسے مواقع پر ماں کے دشمن کے ساتھ جوابی گفتگو میں تسکین حاصل کرتا تھا۔

''نظر حیات! جن کے سینوں میں پورا آتش فشاں دہک رہا ہو، انہیں یہ آگ کیا خاکستر کرے گی؟'' ں کے لہجے میں شعلوں کی لپک تھی۔ ''شاہ میر کا حشر تو تم دیکھ ہی رہے ہو نظر حیات! عنقریب تم اسے اپنا ندھا بھی دو گے۔ اس کے بعد تمہاری باری آئے گی۔''

ٹھیک اس وقت نگینہ نے ماں سے روہانسے لہجے میں تڑپ کر کہا۔ ''آنٹی! پلیز........ میرے پپا رگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ ہمیں جانے دیں۔''

نگینہ کے ملتجی لہجے میں تڑپا دینے والی لاچاری تھی جس نے مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ مگر میں ماں کے منے کچھ بولنے کی جرأت نہ کر سکا۔ اب ماں نے نگینہ کی طرف سنسناتی نظروں سے دیکھا اور پھر جانے بوں اچانک میرے چہرے پر نظریں گاڑ دیں اور میں جیسے یہ خاموش راہ پاتے ہی بہ زبانِ خاموشی ماں ے نگینہ کے لئے سرتا پا التجا بن گیا۔

''ہم دشمنی کرتے ہیں تو اس کا وقار بھی قائم رکھتے ہیں۔ تم جا سکتی ہو۔ لیکن اس سے پہلے........'' لینہ مستفسرانہ انداز میں ماں کا چہرہ تکنے لگی۔ میں بھی ایک طرف کھڑا تھا۔ فوری طور پر میں سمجھ نہ سکا تھا لہ ماں نگینہ سے کون سا سوال کرنا چاہتی ہے۔ میرا خیال تھا، ماں نگینہ سے ہی سوال پوچھے گی۔ لیکن ماں نے اس کی بجائے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"نادر! اس سے پوچھو کہ اس روز سبزہ زار پر غفورے کے بدلے میں جو ڈیلنگ ہو رہی تھی، اس کے باپ شاہ میر کو کس طرح ہوا تھا؟"

میں چونکا، گیا اور جیسے یہ سوال نگینہ کو منتقل کرنے کی ضرورت نہ پڑی۔ وہ بھی سن رہی تھی، ماں بولی۔ "میں نے اس روز اتفاقاً نادر سے فون پر رابطہ کیا تھا۔ مجھے اس کے لہجے سے پریشانی محسوس پھر میرے اصرار پر اس نے مجھے ساری بات بتا دی تھی۔ لیکن بعد میں مجھے پتہ چلا کہ پپا نے ٹیلی سیٹ ریکارڈنگ پر کر رکھا تھا۔ یوں انہیں اصل بات کا علم ہوا۔ کاش، وہ یہ گفتگو ٹیپ نہ کرتے اور آپ لوگوں کا اور پپا کا تصادم ہوتا۔"

یہ بتاتے ہوئے نگینہ کی آنکھوں میں مزید نمی اتر آئی۔ میرا خیال تھا کہ نگینہ کی صاف گوئی سے ضرور متاثر ہو گی۔ مگر اس کے برعکس وہ، نگینہ کے غمناک چہرے کو گھور کر استہزائیہ لہجے میں بولی۔

"خوب!........ اپنے جھوٹے آنسوؤں اور جذباتی گفتگو سے تم نادر کو تو بے وقوف بنا سکتی ہو مجھے نہیں۔ بس........ بات صاف ہو گئی۔ وہ گفتگو ٹیپ شدہ نہیں تھی بلکہ تم نے اپنے باپ کو آگاہ کیا چلو، اس سے یہ بات تو ظاہر ہوئی کہ مجھے یرغمال بنانے والوں کا تعلق تمہارے باپ کے زرخرید کتوں نہ تھا۔ تم جا سکتی ہو۔" ماں کے سرد اور کاٹ دار لہجے نے نگینہ کے کرب میں مزید اضافہ کر دیا۔ خود میں ماں کی اس غلط فہمی پر اپنا دل مسوس کر رہ گیا۔

نگینہ نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا مگر ماں نے انتہائی سرد لہجے میں اسے جانے کو کہہ دیا۔ نگینہ ایک بھیگی ہوئی شکوہ کناں نگاہ میرے چہرے پر ڈالی۔ اور پھر اپنے ساتھ کھڑے نظر حیات سے مخاطب کر دھیرے سے بولی۔

"انکل! آیئے پلیز۔ فلائٹ کا وقت ہونے والا ہے۔"

نظر حیات نے ماں اور مجھ پر ایک آخری برساتی ہوئی معاندانہ نگاہِ خار ڈالی اور نگینہ کے ساتھ ماں خاموش کھڑی رہیں۔ میں نے ذرا ہمت کر کے ماں سے کہا۔

"ماں! نگینہ جھوٹ نہیں کہہ رہی ہے۔"

ماں نے میری طرف سرد نگاہوں سے دیکھا اور پھر کچھ کہے بغیر کار کی طرف بڑھ گئی۔ انکل اعظم میرے قریب آئے اور ہولے سے میرا شانہ تھپتھپا کر ازراہِ تشفی بولے۔

"حوصلہ رکھو نادر میاں!........ ایک دن انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ بھی اپنی کار کی طرف بڑھ گئے۔ کار روانہ ہو گئی۔ میں تنہائی میں کھڑا رہ گیا۔ میرے پیش میں جیسے سناٹا چھا گیا تھا۔ ایسا سناٹا جو میری روح کے اندر اترتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

ہلکی ہلکی خنک ہوا کے جھونکے چل رہے تھے۔ میرے اندر اُداسی اور سرد شام اُتری ہوئی تھی۔

کتنی دیر میں اس طرح وہاں کھڑا رہا۔ میں اس وقت چونکا جب ایک تیز رفتار کار نے شاید کسی سے بچنے کے لئے بریک لگائے اور ان کی چرچراہٹ سے وہاں کی فضا گونج سی گئی۔ بے اختیار میری ناک نظریں آسمان کی طرف اُٹھ گئیں۔ اسی آسمان پر کچھ دیر بعد نگینہ کو لے جانے والا طیارہ ہونے والا تھا۔

میرے دل میں ایک ہوک سی اُٹھی جو آنسو بن کر میری آنکھوں میں جھلملانے لگی۔ میں اس طرح ناک آنکھوں کے ساتھ اُداس سا کھڑا چشم تصور سے طیارے کو جیسے اپنے وجود کا ساتھ چھوڑتی ہوئی روح کو پرواز کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ کیا خبر جہاز کی کھڑکی کے قریب بیٹھی نگینہ کی مجبور نگاہیں

رت وپاس سے تکے جا رہی ہوں۔ پھر بے اختیار میرا دایاں ہاتھ الوداعی انداز میں اٹھا اور میرے دل عمیق گہرائیوں سے نگینہ کے لئے دعائیہ کلمات اُبھرے۔

"نگینہ!........ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔ تم خیریت سے اور بہت جلد واپس لوٹو گی۔" اس کے بعد اپنی جیپ کی طرف بڑھ گیا۔ میرے سینے میں اُداسی کی لہر چھائی ہوئی تھی۔ بہت بوجھل ہو رہا تھا میں وقت۔ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی میں نے اسے اسٹارٹ کیا اور آگے بڑھ گیا۔

میرا رخ مری (نتھیا گلی) کی جانب تھا۔

میں اس وقت بری طرح اعصاب گزیدگی کا شکار ہو رہا تھا۔ ماں کے سرد اور بے رحم رویے کی برف کو نے کی میں جس قدر سعی کر رہا تھا وہ اتنی ہی زیادہ دبیز ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس پر نگینہ کی ان گوں حالات میں امریکہ روانگی نے میرے اعصاب کو مزید توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ نگینہ کا خود سے، اپنے سے ہزاروں میل دور دیارِ غیر میں جانا اور وہ بھی اپنے باپ کے علاج کے سلسلے میں بہت پریشان کن تشویش زدہ صورت حال تھی میرے لئے۔ میں سوچ سوچ کر ہی پریشان ہو رہا تھا کہ آخر نگینہ تن تنہا ن دیس میں کیا کر سکے گی؟ میرے پوچھنے پر وہ مجھے بتا چکی تھی کہ وہاں ورجینیا (واشنگٹن) میں اس باپ کی کوئی خالہ زاد بہن رہتی تھی۔

معاملہ دشمنی اور ماں کی غلط فہمی کا نہ ہوتا تو میں کبھی اس طرح نگینہ کو تنہا امریکہ نہ جانے دیتا بلکہ میں اس کے ساتھ جاتا۔

نگینہ نے ماں کے سوال کے جواب میں جو بتایا تھا، مجھے اس پر پورا یقین تھا کہ ایسا ہی ہوا ہو گا۔ نکہ شاہ میر اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھا کہ میرے اور نگینہ کے بیچ بات چیت ہوتی رہتی ہے۔ ی بعید نہ تھا کہ اس نے فون ریکارڈنگ پر کر رکھا ہو۔ مگر ماں کو اس کی سچائی پر یقین نہیں تھا۔ وہ وہی ہ سمجھ رہی تھیں، جواب تک بہ دستور سمجھتی آ رہی تھیں۔ یعنی باپ بیٹی کا گٹھ جوڑ........ بہرطور یہ بات تو ح ہو گئی تھی کہ ماں کو اغواء کرنے والوں کا تعلق بہرحال شاہ میر اور نظر حیات والوں سے نہیں تھا۔ پھر ا بات ذہن میں آتی تھی کہ وہ چھپکلی مارکہ لیڈر کا ٹولا یقیناً غفورے سے ہی تعلق رکھتا تھا جس نے اپنی ن کی قربانی دے کر غفورے کو فرار ہونے کا موقع دیا تھا۔

جیپ تاریک اور گھنے جنگل کے بیچ بل کھاتی چمکتی سڑک پر دوڑے جا رہی تھی۔ میرے دونوں ہاتھ رنگ پر جمے ہوئے تھے اور نظریں اسکرین کے پار ٹکی ہوئی تھیں۔

نگینہ کی جدائی کا تصور ہی میرے لئے سوہانِ جان تھا۔

اچانک میرے موبائل کی بیل گنگنائی۔ میں نے ڈیش بورڈ پر رکھا موبائل اٹھایا۔ "ہیلو!"

"ہیلو نادر!........ میں........ نگینہ........" دوسری جانب سے نگینہ کی آواز اُبھری۔

"نگینہ!........ مم........ میں........" وفورِ جذبات کے باعث مجھ سے جملہ پورا نہ ہو سکا۔

"نادر! تمہیں دل مضبوط کرنا ہو گا۔ یہ جدائی برداشت کرنا ہو گی۔ جیسے........ جیسے میں کر رہی ہوں۔" ن کی آواز میں درد تھا۔

"نگینہ!........ میں نے تمہارے لئے صدقِ دل سے دعا مانگی ہے۔ تم خیریت کے ساتھ اور بہت لوٹو گی۔" میں نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔

"ہاں نادر!........ بس دعا کرتے رہو۔ مجھے اس وقت دعا ہی کی ضرورت ہے۔" وہ جیسے ایک گہری ں لے کر بولی۔ "اچھا نادر!........ خدا حافظ۔"

"سنو!........سنو!" میں جلدی سے بولا۔ "تم نے اپنی آنٹی کو امریکہ آمد کے بارے میں خ دی ہے؟"

"ہاں........" نگینہ نے کہا۔ "وہی ایئر پورٹ پر مجھے ریسیو کرنے آئیں گی۔"

"نگینہ! تم حوصلہ رکھنا۔ تم بہت ہمت والی لڑکی ہو۔ کاش، میں بھی تمہارے ساتھ چلتا۔ تم جتنا وہاں رہو گی، میرا سارا دھیان تمہاری طرف ہی لگا رہے گا۔ کم از کم مجھے اپنی آنٹی کا تو پتہ دے د" میں نے آخر میں کہا تو وہ جواباً بولی۔

"ہاں........ میں امریکہ پہنچتے ہی آنٹی رخسانہ کا پتہ SMS کر دوں گی تمہیں۔ اچھا........ خدا بورڈنگ شروع ہو چکی ہے۔ پپا کو اٹینڈنٹ لے جا چکا ہے۔ میں بھی طیارے کی طرف بڑھ رہی میرے لئے دعا کرنا۔ ایک مرتبہ پھر خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" میں نے موبائل کو دوبارہ ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔

جیپ خاصی تیز رفتاری کے ساتھ دوڑ رہی تھی۔ اچانک ایک تاریک اور تنگ موڑ کاٹتے ہوئے اپنے تعاقب کا احساس ہوا۔ میری اچانک ہی بیک ویو مرر پر نظریں پڑی تھیں۔ عقب میں آنے وا گاڑی کی ہیڈ لائٹ نظر آ گئی تھی۔ میں اسے تعاقب تو نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ عقب میں سڑک ویران ضروری نہ تھا کہ میرا ہی تعاقب ہو رہا ہو۔ کوئی اور بھی ہو سکتا تھا۔ تاہم، جانے کیوں میری چھ خطرے کا الارم بجا رہی تھی۔

میں نے اپنے اس شبہے کو دور کرنے کی غرض سے اپنی جیپ کی رفتار دانستہ دھیمی کر دی۔ اب گاہے گاہے عقبی منظر پیش کرنے والے آئینے میں عقب سے آتی گاڑی کو دیکھنے لگا۔ وہ اپنی رفتا ساتھ بدستور دوڑی آ رہی تھی اور لمحہ بہ لمحہ اس کا فاصلہ میری جیپ سے کم ہوتا جا رہا تھا۔ میرے اع تن گئے۔ حالات ہی ایسے تھے کہ مجھے اپنے سائے تک سے بھی محتاط رہنا پڑتا تھا۔ چنانچہ جیسے گاڑی میرے قریب سے گزرنے لگی تو میں نے ڈرائیور کے برابر میں بیٹھے دوسرے فرد کو بھانپ نظروں سے دیکھا اور میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ وہ ایک پرانے ماڈل کی ڈبل کیبن پراڈو جیپ کے اندر صرف دو ہی افراد موجود تھے۔ جیپ آگے نکل گئی۔ غیر ارادی طور پر میں نے بھی اپنی پوٹھ رفتار بڑھا دی۔

میرے اندر زبردست ہلچل ہو رہی تھی۔ مجھے وہ دونوں چہرے شناسا سا معلوم ہوئے تھے۔ لیکن فو ر یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں نے دونوں کو کب اور کہاں دیکھا تھا۔ لیکن چونکہ میرے ذہن میں شنا سگنل بدستور جل بجھ رہا تھا اس لئے فوراً ہی مجھے لالہ زار کی وہ شب ہنگامہ یاد آ گئی جب غفور بدلے مال کی واپسی کا معاہدہ طے پا رہا تھا۔ یہ دونوں چہرے اس چھپکلی مارکہ بدمعاش کھڑتالی ٹو شامل تھے جو اپنے لیڈر کے میرے ہاتھوں جہنم واصل ہوتے ہی غفورے سمیت فرار ہونے میں کا ہو گئے تھے۔

اب ذہن کا سگنل پوری طرح روشن ہو گیا تھا اور ساتھ ہی میری رگوں میں خون کی گردش بھی منت ہونے لگی۔ چنانچہ میں ان کے تعاقب میں لگ گیا۔ یہ لوگ بھی شاید میری طرح اسلام آباد سے نکا رہے تھے۔ میں نے تعاقب کو شک و شبہے سے بچانے کی خاطر پراڈو سے اپنی پوٹھوہار کا درمیانی خاصا بڑھا رکھا تھا۔

میں نے اب ان کے تعاقب کا حتمی فیصلہ کر لیا تھا اور جاننا چاہتا تھا کہ یہ لوگ کس کے آدمی

اگرچہ یہ لوگ غفورے کے ہی ساتھی تھے مگر کھڑتالی گروپ کے ان دونوں بدمعاشوں کی پشت پناہی آخر کون کر رہا تھا؟ اور کچھ بعید نہیں تھا کہ غفورا انہی میں شامل ہو۔

کافی دور جا کر پراڈو جیپ پنڈی روڈ سے لاہور جانے والی سڑک پر گامزن ہو گئی۔ اب میرا ماتھا ٹھنکا۔ میری جیپ میں بہت کم فیول رہ گیا تھا۔ اگر یہ لوگ واقعی لاہور جانے کا قصد کئے ہوئے تھے تو میں ان کا اس قدر طویل تعاقب نہیں کر پاتا۔ چنانچہ میں نے بالآخر ان سے بھڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ سوچ کر میں نے اپنی جیپ کی رفتار بتدریج بڑھا دی۔ سڑک دور تک تاریک اور سنسان تھی۔

اب ان کا چونک جانا لازمی امر تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ انہوں نے میری پالیسی اپنائی اور اپنے تعاقب کی تصدیق کی خاطر اپنی جیپ کی رفتار ذرا گھٹا دی۔ میں جانتا تھا کہ اب چونکہ ان دونوں کی توجہ میری طرف ہے، اس لئے ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے لالہ زار والی اس ہنگامہ خیز رات کے حوالے سے پہچان لیتے۔ اور وہی ہوا۔

جیسے ہی میری پوٹھوہار ان کی پراڈو کو کراس کرنے لگی میں نے ان دونوں کو گردنیں گھما کر اپنی طرف دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے پایا۔ اور پھر جیسے انہوں نے بھی مجھے پہچان لیا۔ انہوں نے یک لخت ہی اپنی جیپ کی رفتار تیز کر دی۔

اب کھلی اور تاریکی میں چمکتی ہوئی سڑک پر دونوں جیپیں غراتی ہوئی دوڑ رہی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنی جیپ روک کر میرا دوبدو مقابلہ کریں گے۔ مگر یہ دونوں ہی تھڑدلے ثابت ہوئے تھے۔ یا پھر شاید لالہ زار کی اس رات میں انہوں نے اپنے چھپکلی مارکہ لیڈر کی میرے ہاتھوں عبرت ناک موت نے دہشت بٹھا رکھی تھی۔ شیر کے لئے بزدل دشمن خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

یہ دونوں مجھے پہچان کر اب نکل جانا چاہتے تھے اور میں جانتا تھا کہ وہ اس کوشش میں کامیاب بھی ہو سکتے تھے۔ کیونکہ میری گاڑی کا فیول بتانے والی سوئی "E" کے قریب تھی۔ میں انہیں نکلنے نہیں دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ ایکسیلیٹر سے میں نے بھی اپنا پاؤں نہیں ہٹایا تھا۔

دونوں جیپیں ریس لگانے کے انداز میں اندھا دھند دوڑ رہی تھیں۔ میرے اعصاب بری طرح تنے ہوئے تھے اور چہرہ جوشِ جنوں کی غمازی کر رہا تھا۔ رات کی تاریکی میں ایسی خطرناک ڈرائیونگ کسی خوفناک حادثے کا پیش خیمہ بن سکتی تھی۔ مگر میں بھی ہاتھ آئے شکار کو "چھاپنے" کا عزم کر چکا تھا۔

اسٹیرنگ پر میرے دونوں ہاتھ مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔ دفعتاً پراڈو نے میری جیپ کو سائیڈ ماری۔ میری جیپ کو جھٹکا لگا، اس کا توازن ذرا بگڑا مگر میری مہارت نے اسے بے قابو نہیں ہونے دیا۔ میں نے فوراً ہی اس پر قابو پا لیا۔ مگر اس لمحاتی کوشش میں پراڈو آگے نکل گئی۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے ایک قدرے تنگ موڑ دکھائی دے گیا۔ میں نے دوبارہ اسپیڈ بڑھا دی۔ موڑ نزدیک آتا جا رہا تھا۔ چنانچہ دونوں گاڑیوں کی رفتار بتدریج کم ہونے لگی۔

موڑ پینتالیس ڈگری سے زیادہ کا تھا جسے کاٹنے کے لئے گاڑی کے اسپیڈومیٹر کی سوئی کو نوے اور سو کے درمیان سے نیچے چالیس کے قریب لانا ضروری تھا۔

موڑ قریب آتا جا رہا تھا۔ دونوں جیپوں کی رفتار بھی بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے ایک لمحہ رفتار، فاصلے اور وقت کی پیمائش کرتے ہوئے اپنی جیپ کی رفتار کو فوراً ہی گھٹا دیا اور پراڈو کو پہلے کاٹنے کا موقع دیا۔ پھر جیسے ہی وہ موڑ پر گھومی، میں نے اپنی جیپ کا ایکسیلیٹر پوری قوت سے دبا دیا۔ میری ہلکی پھلکی جیپ غرا کر آگے بڑھی اور موڑ کاٹتی ہوئی پراڈو سے ٹکرائی۔ نتیجتاً پراڈو، کچے میں اتر گئی اور

الٹتے الٹتے بچی۔ اس کا انجن بند ہو گیا۔ میرے لئے اتنا وقت کافی تھا۔ میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اترا تو اچانک میں نے غفورے کے دوسرے ساتھی کے ہاتھ میں پستول کی جھلک دیکھی۔ وہ درواز کر نیچے اتر آیا۔ میں نے کھڑکی کی آڑ لیتے ہوئے سب سے پہلے نہایت پھرتی کے ساتھ ڈرائیور کی طاقت ور گھونسا جڑ دیا۔

اس کے منہ سے ''اوغ'' کی ہلکی سی آواز خارج ہوئی اور پھر وہ گردن ایک طرف ڈال کر بے ہو گیا۔ عین اسی وقت اس کے ساتھی نے مجھ پر پستول سے فائر کر دیا۔ ایک دھماکا ہوا مگر میں یکدم ہٹ کر جیپ کے بونٹ کی آڑ میں ہو گیا۔ میگارد ہر وقت میرے ساتھ ہوتا تھا۔ میں نے فوراً ہی نکال کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ غفورے کے ساتھی نے ابھی میرے ہاتھ میں پستول کی جھلک نہیں دیکھی مگر وہ مجھ سے بہر حال محتاط تھا اور شاید مجھے نہتا سمجھ کر جما ہوا تھا ورنہ وہ کب کا لالہ زار والی رات کی بھاگ چکا ہوتا۔

میں نے جھکے جھکے بونٹ کی آڑ لیتے ہوئے آگے بڑھنا شروع کیا اور ساتھ ہی ذرا سر اُبھار کر میں نے دشمن کو غائب پایا۔ ایکا ایکی میرے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح ایک خدشہ اُبھرا اور ہی میں اسپرنگ کی طرح اچھل کر بونٹ پر چڑھ گیا۔ ٹھیک اسی وقت پراڈو کے نیچے گولی چلنے کی اُبھری۔ میرا خدشہ درست ثابت ہوا تھا۔ دشمن نے نیچے جھک کر میرے پیروں پر گولی چلانے کی کوشش تھی۔ ناکامی کی صورت اور بونٹ پر میرے اچھل کر چڑھنے کی دھمک نے اسے جیسے ہی غیر ارادی سیدھا کھڑے ہونے پر مجبور کیا تو میں نے اس پر اپنے میگارد سے گولی چلانے کی بجائے اس کے پر اپنے بوٹ کی ایک زوردار ضرب رسید کر دی۔ وہ بھیانک انداز کی کراہ آمیز چیخ کے ساتھ کئی قدم میں لڑکھڑا کر جھاڑیوں میں جا گرا۔ پستول بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا تھا۔ میں بھلا اب کہاں موقع دینے والا تھا۔

میں ایک ایتھلیٹ تو تھا ہی۔ چنانچہ میں نے وہیں سے ایک 'لانگ جمپ' لگائی اور فضا میں سیدھا دشمن پر جا پڑا۔ میری دونوں ٹانگیں اس کے سینے پر جم کر پڑتیں تو یقیناً اس کے سینے کے پسلیاں ٹوٹ کر اس کے پھیپھڑوں میں پیوست ہو جاتیں مگر اس نے اپنے بچاؤ کی صرف اس کوشش کی کہ اپنے وجود کو سکیڑ لیا۔ میں اس پر گرا۔ وہ کراہ آمیز انداز میں چیخا۔ میں نے ہانپتے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی۔ اسی وقت میری سماعتوں سے جیپ کے اسٹارٹ کی مخصوص آواز اُبھری۔

ایک لمحے کے لئے میری توجہ بٹ گئی۔ میں نے گردن موڑ کر غیر ارادی طور پر عقب میں دیکھا۔ والا دشمن ہوش میں آتے ہی جیپ اسٹارٹ کر کے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ توجہ بٹتے ہی می دوسرے زیر دست دشمن کو مجھ پر وار کرنے کا موقع مل گیا۔ اس نے جما کر اپنے ایک ہاتھ کا گھونسا می جبڑے پر رسید کر دیا۔ ضرب کی شدت نے میرے دماغ کو جھنجنا دیا۔ پہلے والے دشمن کی جیپ اسٹا کرنے کی کوشش جاری تھی۔ مجھے زیر دست دشمن کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ مجھے گھونسا رسید کر کے گو نے میرے وجود کی آتشِ جنوں بھڑکا دی تھی۔ میں نے ایک ہی زوردار پنچ مار کر اسے لمبا کر ڈالا اسی وقت مجھے ایک تیز اور ہسٹریائی انداز کی نسوانی چیخ سنائی دی۔

یہ آواز جیپ کے اندر سے اُبھری تھی۔ میرے پاس حیرت میں پڑ کر وقت ضائع کرنے کا کوئی نہ تھا۔ میں غراتا ہوا جیپ کی طرف بڑھا۔ اس اثناء میں جیپ اسٹارٹ ہوتے ہی ایک جھٹکے سے آ

بڑھ چکی تھی۔ جیپ کے اندر سے نسوانی چیخیں ابھی تک بلند ہو رہی تھیں جس نے میرے اُلجھن آمیز تجسس کو مزید بڑھا دیا تھا۔ میں نے جیب میں ٹھونسا ہوا میگارد نکال کر جیپ کے ٹائر کا نشانہ لیا اور لبلبی دبا دی۔ تاریکی کے باوجود میرا نشانہ حیرت انگیز طور پر کامیاب ثابت ہوا۔ ساعت شکن دھماکے سے جیپ کا ٹائر برسٹ ہوا اور وہ ایک طرف جھک گئی۔

میں تیزی سے آگے بڑھا۔ جیپ رک چکی تھی۔ اس کے اندر سے دشمن دروازہ کھول کر آناً فاناً قریب کی تاریک جھاڑیوں میں گم ہو گیا۔ میں نے دو تین مزید فائر جھونک مارے لیکن وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ میں دوڑ کر پراڈو کے پاس پہنچا اور کھڑکی سے اندر جھانکا۔ پراڈو جیپ کے اندر مدھم روشنی میں ایک جوان العمر عورت کو دیکھ کر میں بری طرح چونکا تھا۔

وہ رسن بستہ حالت میں جیپ کے فرش پر پشت کے بل پڑی ہوئی تھی۔ مگر میرے چونکنے کی وجہ اس کی مجھ سے شناسائی تھی۔ یہ غزالہ تھی۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر چونک اُٹھی تھی۔ دفعتہً مجھے اپنے عقب میں آہٹ سنائی دی۔ میں فوراً پلٹا لیکن مجھے دیر ہو چکی تھی۔ کسی نے اچانک ہی عقب سے میری کھوپڑی پر کسی ٹھوس شے سے وار کیا تھا۔ مجھے اپنا ذہن تاریکی میں ڈوبتا محسوس ہونے لگا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

* * *

یہ دس بائی بارہ کا کمرہ تھا جس کے محدود ماحول میں ہوش آنے کے بعد میری آنکھ کھلی تھی۔ کمرے میں ٹیوب لائٹ روشن تھی جبکہ کمرہ ہم دونوں کے علاوہ ہر شے سے عاری تھا۔ یعنی میرے علاوہ سپاٹ کمرے کے ننگے فرش پر غزالہ بھی موجود تھی۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر مقتول جواد احمد کی بیوی غزالہ کو غفورے کے ساتھیوں نے کیوں اغواء کیا تھا۔ یہ لوگ یقیناً اسے اسلام آباد سے اغواء کر کے کہیں لے جا رہے تھے۔ مگر غزالہ پنڈی میں رہتی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ وہ اس رات والے عجیب و غریب واقعے اور اپنے بدنصیب شوہر جواد احمد کے قتل کے بعد اسلام آباد میں کہیں مقیم ہو اور یہ لوگ کھوجی کتوں کی طرح اس کی بُو سونگھتے ہوئے وہاں تک جا پہنچے ہوں۔ مگر کیوں؟......غزالہ کی غفورے کے ٹولے کے ساتھ کیا دشمنی تھی؟ اب مجھے یہ غزالہ ہی بتا سکتی تھی۔

اس رات جب غزالہ پراسرار طور پر مجھے مدد کی غرض سے بصد اصرار اپنی رہائش گاہ میں لے گئی تھی، آج شاید اس پراسرار ڈرامے کا پردہ گرنے والا تھا۔ بہر طور شکر تھا کہ مجھے رسن بستہ نہیں کیا گیا تھا جبکہ غزالہ بھی اب جکڑ بندیوں سے آزاد میری طرح ننگے فرش پر بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔ اسے بھی اب ہوش آنے لگا تھا۔

مجھے اپنے سر کے پچھلے حصے میں ٹیس سی اُٹھتی محسوس ہوئی۔ میں نے ہاتھ رکھ کر چوٹ کو سہلایا تو وہاں ایک گومڑ کا ابھار محسوس ہوا۔ مجھے وہاں خون کی چپچپاہٹ بھی محسوس ہوئی تھی۔

میں نے اس معمولی چوٹ کو خیر باد کہا اور غزالہ کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ ''ملک روز'' رنگ کے مہین سلیپنگ گاؤن میں ملبوس تھی اور اس کے پُرشباب جسمانی خطوط توبہ شکن انداز میں اپنی قیامت خیز جھلک دکھا رہے تھے۔

''یہ سب کیا گورکھ دھندا ہے؟'' میں نے سرسری نظروں سے کمرے کا جائزہ لینے کے بعد پوری طرح ہوش میں آتی ہوئی غزالہ سے پوچھا۔ وہ خود دہشت زدہ نظر آ رہی تھی۔ یکدم فرش پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ

خاصی ہراساں نظر آ رہی تھی مگر میں نے فوراً ہی محسوس کیا کہ میری موجودگی پر وہ متحیر ہونے کے ساتھ ساتھ قدرے مطمئن بھی نظر آنے لگی تھی۔

''تت........تم........تمہاری ان لوگوں کے ساتھ کیسے مڈبھیڑ ہوگئی؟'' وہ اپنے بے ترتیب سلیپنگ گاؤن کو درست کئے بغیر مجھ سے بولی۔

''پہلے میرے سوال کا جواب دو۔'' میں نے سردمہری سے کہا تو وہ جواباً بولی۔

''یہ لوگ مجھے اسلام آباد سے اغواء کر کے لے جا رہے تھے۔ اوہ گاڈ!........کک........کہیں انہیں پتہ تو نہیں چل گیا کہ اس رات تم بھی وہاں میری پنڈی والی رہائش گاہ میں موجود تھے، جب میرے شوہر کو شوکی نے قتل کر ڈالا تھا اور بعد میں وہ میرے ہاتھوں مارا گیا تھا؟'' یہ کہتے ہوئے وہ مزید ہراساں نظر آنے لگی۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کا ہراس میری جان مصیبت میں پڑنے کی وجہ سے تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کون سی ہولناک رات کا حوالہ دے رہی تھی۔ مجھے اس پراسرار اور ہولناک رات کا منظر اچھی طرح یاد تھا جب میں اپنے ٹال سے نکل رہا تھا تو غزالہ اچانک اپنی کار میں پنڈی سے مری میرے پاس ٹال پر پہنچی تھی اور مجھے کچھ بتائے بغیر اپنی مدد کی خاطر اپنے ساتھ اپنی پنڈی والی رہائش گاہ تک لے جانا چاہتی تھی۔ وہاں پہنچ کر ایک مسلح نقاب پوش سے مڈبھیڑ ہوئی تو مجھے یہ غلط فہمی ہوئی تھی کہ یہ سارا چکر غزالہ نے مجھے پھنسانے کے لئے چلایا تھا۔ مگر پھر جب میں نے اس کے شوہر کی خواب گاہ میں معذور جواد احمد کے سینے میں خنجر اترا ہوا دیکھا تو دہل کر رہ گیا تھا۔ غزالہ نے بھی اپنے شوہر جواد احمد کو بیڈ پر مُردہ حالت میں پایا ہسٹریائی انداز میں چلائی تھی۔ میں یہی سمجھا تھا کہ وہ مجھے پھنسانے کے لئے ڈرامہ کر رہی تھی۔ مگر جب اس نے میرے اس نقاب پوش کے ساتھ مارا ماری کے دوران ہاتھ سے چھوٹ کر گر جانے والے پستول سے نقاب پوش پر فائر کر کے اسے ہلاک کر ڈالا، تب مجھے احساس ہوا کہ معاملہ میری سوچ سے بھی بڑھ کر پُراسرار اور گمبھیر تھا۔ مگر پھر غزالہ نے مجھے کچھ بتائے بغیر واپس جانے پر اصرار کیا تھا۔ یوں میں بھی اس گھن چکر پر ایک عدد لعنت بھیج کر لوٹ آیا تھا۔ آج شاید اس پراسرار واقعے کے بارے میں پردہ اٹھنے والا تھا۔

غزالہ نے ابھی تھوڑی دیر پہلے کسی شوکی کا نام لیا تھا، جس نے غزالہ کے معذور شوہر جواد احمد کا قتل کیا تھا اور بعد میں خود بھی غزالہ کے پستول کی گولیوں کا نشانہ بن گیا تھا۔ چنانچہ جب غزالہ نے مجھ سے ہراساں لہجے میں کہا کہ کہیں ان لوگوں کو اس بات کا علم تو نہیں ہو گیا کہ اس رات میں بھی وہیں تھا تو میں ساری بات سمجھ گیا کہ یہ لوگ شوکی کے ہی ساتھی تھے اور غزالہ کو اس جرم میں اغواء کر کے لے جا رہے تھے کہ اتفاق سے راستے میں مجھ سے بھی مڈبھیڑ ہوئی۔

میں نے اس کی آگہی کے لئے یہ بتایا کہ یہ لوگ میرے ایک دشمن جو درحقیقت ہمارا شکار تھا، غفورے کے ساتھی تھے تو غزالہ نے میری مختصر صراحت سننے کے بعد ایک گہری ہمکاری لے کر اپنا تفصیلی حال سناتے ہوئے ایک چونکا دینے والا انکشاف بھی کیا۔

وہ نقاب پوش، شوکت عرف شوکی درحقیقت غفورے اور اشفاق شاہین کا ہی ساتھی تھا۔ نیز شکورا نامی شخص غفورے کا سگا بھائی تھا اور شکورا وہی چھپکلی مارکہ بدمعاش تھا جس نے میری ماں کو اغواء کیا تھا جسے بعد میں، میں نے لالہ زار میں ماں اور غفورے کے تبادلے کی ڈیلنگ کے دوران واصل جہنم کر ڈالا تھا۔

میں اس انکشاف کے علاوہ اشفاق شاہین کے ذکر پر بھی بری طرح چونکا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا

کہ اس دوران جب میں نے انکل اعظم خان سے یونہی غفورے کے متعلق پوچھا تھا تو انہوں نے مجھے یہ بات بتائی تھی کہ غفورا درحقیقت پروڈیوسر اشفاق شاہین کا ہی گرگا اور خاص گماشتہ تھا۔ جبکہ خود پروڈیوسر اشفاق شاہین انڈر ورلڈ فلم مافیا کا ایک ''ڈان'' تھا جس نے کچھ عرصہ پہلے ہی ایک معروف فلمی اداکارہ ''سپنا'' کو غفورے کے ہاتھوں قتل کروایا تھا۔

''کیا سوچنے لگے؟'' مجھے سوچتا پا کر اچانک غزالہ نے پوچھا تو میں نے کہا۔

''کچھ نہیں........تم اپنی بات ختم کرو اور مجھے بتاؤ کہ وہ رات والا آخر معاملہ کیا تھا؟ نیز تمہارے شوہر جواد احمد کو کیوں قتل کیا گیا تھا؟''

میری بات پر غزالہ نے دوبارہ اپنی داستان کا سلسلہ جوڑا۔ ان غیر یقینی حالات میں ہم دونوں کا پہلے ہی ان باتوں سے آگاہ ہونا اشد ضروری تھا۔ کیونکہ غفورے اور غزالہ کے ڈانڈے مجھ سے آن ملے تھے۔

''اشفاق شاہین ایک بہت سنگ دل اور سفاک انسان ہے........اس نے میری بہن سپنا کا قتل کروایا تھا۔''

''کیا........اداکارہ سپنا تمہاری بہن تھی؟'' میں بری طرح چونکا۔

''ہاں........'' وہ رقت آمیز لہجے میں بولی۔ ''میں اپنی بہن کے قاتل سے نمٹنا چاہتی تھی۔ اس کے لئے مجھے اشفاق شاہین کے ہاتھوں کھلونا بھی بننا پڑا مگر میں اپنی عزت گنوانے کے باوجود اس رذیل انسان سے اپنی بے گناہ بہن ''سپنا'' کے خون کا انتقام نہ لے پائی اور الٹا اسے اپنا دشمن بنا لیا۔ میں اس سے دور ہوگئی۔ اس سے دور ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہ درحقیقت ایک شیطان تھا۔ مخرب الاخلاق فلم بنانے والی ایک بین الاقوامی فلم کمپنی سے اس کے خفیہ تعلقات تھے۔ وہ مجھے اس میں کام کر کے دولت مند بنانے کا لالچ دینے لگا۔ میں نے انکار کیا تو مجھ پر دباؤ ڈالنے لگا۔ میں اس سے دور ہوگئی۔ پھر اس رات، جب میں تم سے مدد لینے راتوں رات پنڈی سے مری آئی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس رات اشفاق شاہین نے اپنے ایک ساتھی شوکی کو مجھے گن پوائنٹ پر لینے کے لئے بھیجا تھا۔ میں نے کسی طرح شوکی کو بے وقوف بنا کر اسے ایک کمرے میں محبوس کر دیا۔ پریشانی کے عالم میں مجھے یہی طریقہ سوجھا تھا۔ اور جب میں تمہیں لے کر واپس اپنے گھر پہنچی تو وہ بدبخت شوکی جانے کس طرح آزاد ہو کر میرے شوہر کو قتل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ بعد میں، میں نے بھی تمہاری آنکھوں کے سامنے مغلوب الغضب ہو کر اسے قتل کر ڈالا۔ میں سمجھ گئی تھی، یہ پلاننگ ہی ساری اس خبیث اور ابلیس صفت شخص اشفاق شاہین کی تھی۔ یعنی میرے شوہر کو قتل کر کے مجھے تنہا کرنا۔ کیونکہ وہ یہی سمجھتا تھا کہ میں اپنے شوہر کی وجہ سے اس گھناؤنے منصوبے کی تکمیل سے انکاری ہوں۔ اس کے بعد میں اپنی پنڈی والی رہائش گاہ کو فروخت کر کے اسلام آباد میں ایک کرائے کا اپارٹمنٹ لے کر رہنے لگی۔ مگر اشفاق شاہین نے میرا یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔'' وہ اتنا بتا کر خاموش ہوگئی۔

میرے سینے میں بری طرح ہلچل ہونے لگی۔ غفورا کس قدر خطرناک لوگوں کے گروہ سے تعلق رکھتا تھا، مجھے اس کا ہرگز اندازہ نہ تھا۔ اس کریہہ حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ جس کا تذکرہ کرنا بھی شاید معیوب بات ہو۔ لیکن ''فحاشی'' اور ''معیوب'' کا نام دے کر بھلا کب تک بعض کڑوی حقیقتوں سے چشم پوشی کی جا سکتی ہے۔ مخرب الاخلاق فلموں کی ترسیل و فروخت ایک طویل عرصے سے جاری ہے جو نئی نسل کے اخلاق و کردار کو تیزی سے برباد کر رہی ہے۔ اس قسم کی فلموں کو ''تھری ایکس'' کی مخصوص اصطلاح کا نام دیا گیا تھا۔ یہ تو خیر ایک پرانا مسئلہ تھا ہی اور اس گندی وبا پر قابو نہ پانے کی وجہ سے آج نوبت یہاں

تک آ پہنچی ہے جو شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اب انڈر ورلڈ فلم مافیا نے زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی خاطر اپنے وطن عزیز میں بھی ایسی بلیو فلمیں خفیہ طور پر بنانا شروع کر دی تھیں، جن کے باقاعدہ کاروباری مراسم امریکہ کی ریاست کیلی فورنیا کی معروف بلیو فلم کمپنی سے استوار ہو چکے تھے اور انہی کے تعاون سے ان کی ڈسٹری بیوشن پورے ملک میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں ہو رہی تھی۔ باہر کا گند باہر والے جانیں مگر ہمیں اپنے ملک سے تو کم از کم اس برائی کو ختم کرنا چاہئے۔ یہاں یہ مذموم اور شرم ناک کاروبار شروع ہو چکا تھا۔ اب مجھے غزالہ بتا رہی تھی کہ یہاں اس کا چیف اشفاق شاہین تھا اور غفورا اس کا دست راست تھا۔

''کیا سوچنے لگے نادر؟''

معاً مجھے دوبارہ سوچ میں ڈوبا ہوا دیکھ کر غزالہ نے الفاظ کو ٹہوکا دیا تو میں چونک کر خیالات کے بھنور سے اُبھر کر پھر ایک گہری ہمکاری لے کر بولا۔

''اس کا مطلب ہے، ہم دونوں ہی اس وقت بہت خطرناک قسم کے کرمنل اور انڈر ورلڈ کے ایک بہت بڑے گینگسٹر کے ہتھے چڑھ چکے ہیں۔''

''ہاں نادر!......... مجھے بھی سب سے زیادہ یہی پریشانی ہو رہی ہے۔'' میری پُرتشویش بڑبڑاہٹ سن کر وہ بھی متوحش لہجے میں بولی۔

''خیر، کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔'' میں نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''میں ذرا کمرے کا جائزہ لے لوں۔'' یہ کہہ کر میں اٹھا۔

یہ کمرہ ہم دونوں کے علاوہ ہر شے سے عاری تھا۔ حتیٰ کہ اس کی چہار دیواری میں کوئی کھڑکی تک نہ تھی سوائے چھوٹے سے چوکور روشندان کے، جو کمرے کی جنوبی سمت کی دیوار پر خاصی بلندی پر تھا اور اس کے چوکھٹے پر موٹی موٹی آہنی سلاخیں نصب تھیں۔ میں کچھ سوچ کر دروازے کی طرف بڑھا۔

حسب توقع اس میں ایک ذرا سی بھی جھری تک نہ تھی۔ روشندان سے مقدور بھر نظر آنے والے تاریک آسمان سے ظاہر ہوتا تھا کہ ابھی رات اپنے پچھلے پہر پر ہی تھی۔ میں نے غزالہ کی جانب پلٹ کر اس سے دھیمی آواز میں پوچھا۔ ''کیا تمہیں اندازہ ہے کہ ہم اس وقت اس خبیث اور ابلیس صفت شخص اشفاق شاہین ہی کی قید میں ہیں؟''

''مجھے سو فیصد یقین ہے۔'' وہ مستحکم لہجے میں جواباً بولی۔ ''کیونکہ جو لوگ ہمیں یہاں لائے ہیں، میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ یہ لوگ اشفاق شاہین کے ہی گماشتے ہیں۔''

مجھے اب اس بات پر ایک نئی تشویش نے آن گھیرا تھا۔ اگر یہ لوگ اشفاق شاہین جیسے خطرناک انڈر ورلڈ گینگسٹر کے آدمی تھے تو یقیناً غفورا سمیت چھپکلی مارکہ زرد رو بدمعاش لیڈر بھی اشفاق شاہین کا ہی خاص آدمی ہوگا جس نے میری ماں کو یرغمال بنایا تھا اور اس کی رہائی کے بدلے لالہ زار میں غفورے کی رہائی کی ڈیلنگ کے دوران وہ میرے ہاتھوں جہنم واصل ہو چکا تھا۔ اس کے نتیجے میں غفورا فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ گویا اب اشفاق شاہین کی توپوں کا رخ میری جانب ہو سکتا تھا۔

میں نے غزالہ کو اس چھپکلی مارکہ بدمعاش کے حلیے سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا تو وہ مزید ہراساں ہو گئی اور خوف زدہ نگاہوں سے میری جانب تکتے ہوئے لرزیدہ لہجے میں بولی۔ ''کک......... کیا تم نے شش......... شکورے کو قتل کر ڈالا؟''

''اس کا میرے ہاتھوں یہی انجام ہونا تھا۔ اس نے میری ماں کو اغواء کرنے کا ناقابل معافی جرم کیا تھا۔ اب مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ میری ماں کو اغواء کرنے کے بعد فون پر مجھ سے اس قدر لچر اور حیاسوز گفتگو کیوں کر رہا تھا؟ اس لئے کہ وہ اشفاق شاہین جیسے مکروہ شخص کا ساتھی تھا۔'' میں دانت پیس کر بولا تو غزالہ کی حالت مزید تشویش ناک ہو گئی۔ وہ اب بہت زیادہ خوف زدہ اور ہراساں نظر آنے لگی تھی۔ پھر کپکپاتے لہجے میں بولی۔

''تت......... تم نہیں جانتے نادر! کہ تم نے نادانستگی میں کیسے خطرناک لوگوں سے ٹکر لے لی ہے۔ شکورا اور غفورا دونوں سگے بھائی ہیں اور اشفاق شاہین کے مقرب الخاص بھی۔ اوہ خدایا!......... مجھے امید نہ تھی کہ یہ معاملہ اس قدر سنگین صورت اختیار کر لے گا۔''

اس بات پر مجھے بھی اگرچہ ایک جھٹکا لگا تھا تاہم میں نے اس کے ہراساں چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے استہزائیہ مسکراہٹ سے کہا۔

''حیرت ہے......... تم اپنی بہن سپنا کا اشفاق شاہین جیسے ایک بڑے انڈر ورلڈ گینگسٹر سے انتقام لینا چاہتی تھیں اور اب اس سے خوف بھی محسوس کر رہی ہو؟''

میرے طنز پر وہ برا منائے بغیر بولی۔

''میں علی الاعلان اس سے ٹکرانے کی بے وقوفی ہرگز نہیں کر سکتی تھی۔ میں پہلے اس کے قریب آنا چاہتی تھی مگر قریب آنے کے بعد ہی مجھے اس حقیقت کا احساس بھی ہو گیا کہ اسے ہلاک کرنا اتنا آسان نہ تھا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ شاید میں اتنی بہادر نہ تھی۔ تاہم یہی بات میرے الٹا گلے پڑ گئی۔ میں نے اپنی عزت تو اس کے ہاتھوں گنوا دی تھی مگر جان گنوانے کا مجھ میں حوصلہ نہ ہو پایا تھا۔ تاہم میں موقع کی منتظر ضرور تھی۔ لیکن جب الٹی آنتیں گلے پڑنے کے مصداق اس مردود نے مجھ پر فحش فلم بندی کا دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تو میں آہستہ آہستہ اس سے دور ہونے لگی۔ مگر جلد ہی مجھے معلوم ہوا کہ وہ مجھے اپنے شیطانی چنگل میں جکڑنے والا تھا۔ میں نے اس سے جان چھڑانے کے لئے بہانہ کر دیا تھا کہ میں ایک شادی شدہ عورت ہوں۔ بس یہی میرے شوہر جواد احمد کی موت کا سبب بنی۔ یوں اس رات اشفاق شاہین نے شوکت عرف شوکی کو میرے شوہر کے قتل اور مجھے لانے کے لئے بھیجا تھا۔ اب اشفاق شاہین مجھ سے اس بارے میں کڑی باز پرس کرے گا۔ مگر تم یہ بات ہرگز اس سے مت کرنا کہ تم بھی اس رات.........''

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک دروازے پر آہٹ ہوئی۔ میں نے سوچا کہ کمرے کی اکلوتی ٹیوب لائٹ بجھا دوں۔ مگر میں ایسا نہ کر پایا۔ دروازہ دھڑاکے سے کھلا اور تین افراد ہاتھوں میں گنیں سیدھی کئے اندر داخل ہوئے۔ ان میں ایک شخص کو پہچان کر میری کنپٹیاں سنسانے لگیں۔ وہ غفورا تھا جو مجھے شعلہ بار نظروں سے گھور رہا تھا۔ اُس کا دُنبے کی طرح پلا ہوا وجود غیظ و غضب کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ اس کی کھولتی اُبلتی کیفیات سے میں واقف تھا۔ کیونکہ بہ قول غزالہ کے میرے ہاتھوں جہنم واصل ہونے والا وہ چھپکلی مارکہ بدمعاش شکورا اس کا سگا بھائی تھا۔

''دل تو میرا یہی چاہتا ہے کہ اسی وقت تجھے گولیوں سے بھون ڈالوں......... لیکن.........''

مجھے غضب ناک نظروں سے گھورتے ہوئے وہ دانت کچکچا کر بولا اور دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ یہ میری سرشت تھی کہ ایسے نازک مواقع پر میں جوش کو خیر باد کہہ کر ہوش سے کام لیتا تھا۔ لہٰذا بولا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ تمہارا بھائی تھا۔ لیکن اس نے بھی میری ماں کو اغواء کرنے کا گھناؤنا اور ناقابل معافی جرم کیا تھا۔''

''یرغمال تو تم نے مجھے بھی بنا رکھا تھا، بلا کسی سبب کے......... کیوں؟'' وہ بدستور غضب ناک لہجے میں بولا۔ میں نے بھی بلا تامل کہا۔

''ہم تمہیں پولیس سے تحفظ دینا چاہتے تھے۔ کیونکہ ایس پی ظہیر قریشی اور ڈپٹی رانا مشتاق تمہاری تلاش میں چھاپے مار رہے تھے۔ تمہارا پولیس کے ہاتھ آ جانا، ہمارے دشمنوں کے مفاد میں تھا۔

''جھوٹ مت بولو نادر علی خان!'' وہ زخمی درندے کی طرح غرایا۔ ''حقیقت یہ تھی کہ تمہارا وہ نام نہاد انکل اعظم اور تمہاری ناگن صفت ماں مجھے قتل کر ڈالنا چاہتے تھے تاکہ ملک سردار خان کے قتل کا کیس ہمیشہ کے لئے داخل دفتر ہو جائے۔ میری نمک حلالی کا یہ صلہ ملا ہے؟''

''اس میں تمہاری جلد بازی کا دخل تھا۔'' میں نے لہجے کو پُرسکون رکھتے ہوئے کہا۔

''بکواس بند کرو.........اب اپنی بھیانک موت کے لئے تیار ہو جاؤ نادر علی خان!'' وہ غضب ناک لہجے میں غرایا۔ اس کے خطرناک تیوروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مجھے اسی وقت گولیوں سے بھون دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میرے وجود میں سنسنی پھیل گئی۔ اس کے باقی دونوں مسلح ساتھی میری جانب اپنی گنوں کا رخ کئے نہایت مستعد کھڑے تھے جبکہ غزالہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔ میری عقابی نظریں بظاہر غفورے کے طیش آور چہرے پر جمی ہوئی تھیں لیکن ساتھ ہی ٹرائیگر پر اس کی انگلی کا بھی جائزہ لے رہی تھیں۔ اب کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

''نہیں.........ٹھہرو.........پلیز ٹھہرو۔'' اچانک غزالہ میرے عقب سے چلائی اور پھر میری ڈھال بن کر غفورے سے ملتجیانہ لہجے میں بولی۔ ''مجھے چیف صاحب سے ملواؤ۔ ان سے فیصلہ کروا لیتے ہیں۔''

اس کی بات پر غفورے کے گینڈے جیسے بدصورت چہرے پر اسرار بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''لگتا ہے، نیا یار پال لیا ہے۔ چلو.........ہم تم دونوں کو اپنے ساتھ لے جانے آئے ہیں۔'' دوسرے ہی لمحے وہ درشت لہجے میں بولا۔

میں نے بے اختیار طویل سانس لی۔ وہ ہمیں شاید اپنے چیف اشفاق شاہین کے پاس لے جانے کے لئے آیا تھا۔ ہم دونوں نے ان کی رائفلوں کے اشارے پر حرکت کی اور کمرے سے باہر آ گئے۔ ایک روشن راہداری سے چلتے ہوئے نشست گاہ کی طرز کے کمرے میں آ گئے۔ اس دوران میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا تھا۔ یہ کسی شاہانہ طرز کی کوٹھی کا اندرونی حصہ تھا۔

میری نظر سامنے پڑی، ایک لگژری طرز کے فیملی صوفے پر وہ بھاری بھرکم شخص اپنا دایاں بازو صوفے کی پشت گاہ پر پھیلائے بڑے شاہانہ کروفر کے ساتھ بیٹھا تھا۔

پینتالیس، پچاس کے درمیان میں اس کی عمر کا اندازہ ہوتا تھا۔ جسم بھاری بھرکم ضرور تھا مگر تنومند تھا۔ سر کے بال بہت لمبے، گھنے تھے۔ چہرہ کلین شیو تھا۔ قلمیں لانبی لانبی تھیں۔ اس کی آنکھیں چندی چندی تھیں جن میں خباثت بھری چمک تھی۔ اس نے عام سی ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ یہ شاید اس کا شب خوابی کا لباس تھا۔ تاہم مجھے حیرت تھی کہ رات کے اس آخری پہر میں اسے ہماری ''پیشی'' کرانے کی اتنی جلدی کیا پڑ گئی تھی۔

اس نے غزالہ پر تو ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی تھی جبکہ میرے چہرے پر اس کی تیز سرسراتی ہوئی نظریں کر رہ گئی تھیں۔

''بیٹھو!'' اس نے کھردرے لہجے میں کہا۔

ہم دونوں اس کے سامنے کے صوفے پر براجمان ہو گئے۔ میری نظریں ابھی تک اس کے چہرے

جائزہ لے رہی تھیں۔ مجموعی طور پر اس کی شخصیت کسی ولن ہی جیسی نظر آتی تھی۔

''تمہارا نام کیا ہے.........؟'' اس نے بدستور اپنی تیز بھانپتی ہوئی نظریں میرے وجود پر مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔

''نادر علی خان۔''

''غزالہ سے تمہاری کب سے دوستی ہے؟'' اس نے اگلا سوال پوچھا۔ لہجہ خشک تھا۔

''میری اس سے دوستی نہیں ہے۔''

''تم اسے جانتے بھی نہیں؟''

''نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''ہوں.........'' اس نے ایک گمبھیر سی اسرار بھری ہمکاری خارج کی۔ ''یہ سچ کہہ رہا ہے غزالہ؟'' اس نے اس بار غزالہ کو مخاطب کر کے پوچھا۔ اس کے لہجے میں تحکم تھا۔ جبکہ ادھر میں بھی اس کے بارے میں ''یقینی'' اندازہ لگا چکا تھا کہ یہی اشفاق شاہین تھا۔ انڈر ورلڈ فلم مافیا کا ڈان اور ایک خطرناک گینگسٹر۔

جواباً غزالہ نے مرتعش سی آواز میں اس سے کہا۔ ''ہاں.........یہ صحیح کہہ رہا ہے۔''

اس کے بعد اشفاق شاہین نے غفورے کے ساتھ کھڑے اپنے دو ساتھیوں سے کہا۔ ''اسے یہاں سے لے جاؤ۔''

اشارہ غزالہ ہی کی طرف تھا۔ مگر اچانک غفورے نے مداخلت کرتے ہوئے اشفاق شاہین سے ...دبانہ کہا۔ ''یہ جھوٹ بول رہی ہے، چیف!''

میں اور غزالہ سناٹے میں آ گئے۔ اشفاق شاہین خاموشی سے غفورے کا چہرہ تکنے لگا۔ وہ اپنے چیف کی ...موشی مگر مستفسرانہ نظروں کا مطلب بھانپتے ہی مزید بولا۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے نادر کی ڈھال بن کر اس کی مجھ سے جان بخشی کی سفارش کی تھی۔''

غفورے کی اس بات پر اشفاق شاہین نے تیز اور سنسناتی نظروں سے غزالہ کو گھورا۔

''مجھ سے جھوٹ بولنے کا انجام جانتی ہو؟''

''میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔'' جواباً غزالہ نے ہراساں ہونے کے باوجود قدرے سکون سے ...اب دیا وہ شاید خود کو کسی حد تک سنبھال چکی تھی۔ ''غفورے نے ایک دم ہی اس پر اپنی گن تان لی تھی۔ ...اسے ہلاک کرنے کے درپے ہو گیا تھا۔ یہ خون ریزی میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔'' غزالہ نے جواب دیا۔

''لے جاؤ اسے۔'' اشفاق شاہین نے کھرکھراتے لہجے میں کہا۔

...دونوں ساتھی، چابی بھرے کھلونوں کی طرح حرکت میں آئے اور غزالہ کو اپنے ساتھ لے گئے۔ اب ...رے میں ہم تین افراد رہ گئے تھے۔

''تم بیٹھو!'' اشفاق نے غفورے سے کہا۔ وہ خاموشی سے ایک طرف صوفے پر براجمان ہو گیا۔

''تم نے ہمارے ایک اہم آدمی، شکورے کا قتل کیا ہے۔ اس کی سزا تم خود تجویز کرو گے۔'' معا ...اق نے میری طرف گھور کر سرسراتے لہجے میں کہا تو میں نے بھی اسے وہی جواب دے ڈالا جو ذرا دیر ...میں غفورے کو دے چکا تھا۔ مگر اشفاق شاہین میرے اس جواب سے متفق نہ ہوا۔ اس کی عجیب ...یت تھی، بیک وقت وہ سرد مزاج اور سفاک انسان بھی محسوس ہوتا تھا اور متحمل بھی۔ اس نے غفورے کو ...لب کر کے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''یہ تمہارا مجرم ہے۔ اس نے تمہارے بھائی کو ہلاک کیا ہے۔ اس کی سزا بھی تم خود بخود تجویز کر لو۔

چاہو تو چھوڑ بھی سکتے ہو اسے۔'' وہ یہ کہہ کر اٹھا اور کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ اب میں اور غفورا وہاں رہ گئے۔

''میں ایک شرط پر تمہاری جان بخشی کر سکتا ہوں۔'' اشفاق شاہین کے جانے کے بعد غفورے نے مجھ سے کہا۔

''کون سی شرط؟'' میں نے پوچھا۔

''تم میرا پیچھا چھوڑ دو۔''

''میں کب تمہارے پیچھے ہوں؟'' میں نے بھی حالات سنبھلتے ہی مفاہمانہ رویہ اختیار کیا۔ کیونکہ حقیقت تھی کہ میرے اور اس کے درمیان کوئی دشمنی نہ تھی۔

''تم، تمہاری ماں اور اعظم خان مجھے ہر قیمت پر قتل کر چاہتے ہیں۔'' وہ بولا۔

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔'' میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ ''درحقیقت ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم ہمارے ہتھے نہ چڑھو اور بس۔''

''میں تمہاری بات کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔'' وہ پہلی بار ہموار لہجے میں بولا۔ ''تم چیف کو نہیں جانتے۔ یہ ان کی تم پر ایک بہت بڑی مہربانی ہے۔ انہوں نے تمہارے سلسلے میں کوئی کڑا فیصلہ نہ کیا بلکہ یہ فیصلہ میرے سپرد کر دیا۔''

''ہاں...... تمہارے چیف ایک سمجھ دار انسان ہیں۔ وہ سمجھ گئے ہیں کہ یہ سب محض غلط فہمی کے سبب ہوا۔'' میں نے چالاکی سے کہا۔ ''اور تم اب جان گئے ہو کہ ہماری براہِ راست تم سے یا تمہارے چیف سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔''

''تو پھر ڈن!'' وہ گفتگو کو سمیٹتے ہوئے بولا۔

''ڈن!'' میں نے دانستہ اپنے ہونٹوں پر ہلکی سی دوستانہ مسکراہٹ سموتے ہوئے کہا۔

''تم جا سکتے ہو۔'' وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

میں بھی اٹھ کھڑا ہوا مگر جانے سے پہلے اس سے بولا۔ ''پولیس کے علاوہ تمہیں نظر حیات وغیرہ سے بھی محتاط رہنا ہوگا۔ تمہیں تو نظر حیات اور ہمارے درمیان دشمنی کا علم ہوگا ہی۔ اس لئے وہ تمہیں ہر صورت میں گرفتار کروانا چاہتے ہیں تاکہ ہمارے خلاف تمہیں وعدہ معاف گواہ کا جھانسا دے کر......

''میں اتنا احمق نہیں ہوں۔'' وہ میری بات کاٹ کر تلخ مسکراہٹ سے بولا۔ ''بس، اب تم جاؤ۔ میرے حصے کا کام مجھ تک رہنے دو۔ باہر تمہاری جیپ موجود ہے۔''

میں اس کا شکریہ ادا کر کے اس کی رہنمائی میں کوٹھی سے باہر آ گیا۔ یہ بڑی عالیشان اور وسیع و عریض کوٹھی تھی۔

خنک سی فضا میں گل بوٹوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔ میں کن انکھیوں سے گرد و پیش کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ یہ مجھے گلبرگ کا پوش علاقہ ہی محسوس ہوتا تھا۔ دائیں بائیں وسیع لان تھا جہاں ذرا فاصلے پر چھوٹے کھمبوں میں برقی گلوب روشن تھے۔

وسیع چکنے احاطے میں دو مزید بھاری بھرکم چمچماتی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میری جیپ الگ تھلگ نظر آ گئی۔ میں خاموشی سے اپنی جیپ میں سوار ہو گیا۔ اگنیشن سوئچ میں چابی لگی ہوئی تھی۔ گیٹ پر ایک گن بردار محافظ نے مجھے جیپ میں سوار ہو کر اسے اسٹارٹ کرتے دیکھ کر ہی گیٹ کھول دیا تھا۔

جیپ کو ... روش پر دھیمے ... سے چلاتا ہوا باہر آ گیا۔ عقب میں گیٹ بند ہو گیا۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ یہ لاہور کا پوش علاقہ، گلبرگ ہی تھا۔ میں نے جیپ آگے بڑھا دی۔ ہر سو سناٹے اور گہری تاریکی کا راج تھا۔ میں مین شاہراہ پر آ گیا تھا۔

اب تک میرا جن خطرناک لوگوں اور خونی گروہوں سے سامنا ہوا تھا، یہ لوگ ان سے قطعی طور پر مختلف اور عجیب ہی نکلے تھے۔ یا پھر میری سوچ سے بڑھ کر شاطر اور دور اندیش تھے۔ غزالہ نے انڈر ورلڈ فلم مافیا کے گینگسٹر اشفاق شاہین کا میری نظروں کے سامنے جو نقشہ کھینچا تھا، یہ ان سے مختلف ہی محسوس ہوئے تھے۔ اپنے ساتھی کی میرے ہاتھوں ہلاکت کا پتہ چل جانے کے باوجود اشفاق شاہین نے ہی نہیں بلکہ غفورے نے بھی مجھے چھوڑ دیا تھا۔

شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ ٹھنڈی پالیسی اور گہری سوجھ بوجھ کے مالک تھے۔ خواہ مخواہ کسی سے پنگے بازی نہیں کرتے تھے۔ شکورے کی میرے ہاتھوں ہلاکت کی درست نوعیت کو سمجھتے ہوئے ان لوگوں نے مجھے چھوڑ دیا تھا اور یہ بھی کہ اس میں کسی قسم کی ذاتی یا پرانی دشمنی کا دخل نہ تھا۔ تو پھر کیوں کر معاملے کو طول دیا جائے؟ تاہم میرا دل یہی کہتا تھا کہ ایسے خاموش لوگ، ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح ہوتے ہیں جو اپنے اندر بڑے بڑے طوفان چھپائے ہوئے ہوتے ہیں اور لومڑی کی سی چالاکی اور اونٹ کا کینہ رکھتے ہیں۔

بہرطور...... مجھے غزالہ کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑنے کا افسوس ضرور تھا۔ وہ بہرحال مظلوم عورت تھی اور اشفاق شاہین ایک سفاک اور خبیث انسان۔ میں غزالہ کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اس کا معاملہ تھا اور وہی اسے بہتر طور پر ہینڈل کر سکتی تھی۔

مین شاہراہ پر آ کر میں نے جیپ آگے بڑھا دی۔ اچانک میرے پاؤں غیر اختیاری طور پر بریک پیڈل پر پڑے۔ رات کے سناٹے میں جیپ کے ٹائر سماعت شکن آواز سے چرچرائے اور جیپ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ غزالہ کا غمگین اور مظلوم چہرہ میری نظروں کے سامنے رقصاں ہو گیا۔ بقول غزالہ کے، اشفاق شاہین جو گھناؤنا کاروبار کرتا تھا، وہ غزالہ کو بھی اس کی بھینٹ چڑھانا چاہتا تھا۔ یہ درست تھا کہ وہ کوئی باکردار عورت نہ تھی، کبیر سے اس کے رنگین اور سنگین تعلقات کا تو میں خود عینی گواہ تھا۔ مگر کسی کی عریاں فلم بنا کر اسے کمائی کا ذریعہ بنانا...... پہلے اس کی بہن سپنا کو بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا گیا، پھر اس کے معذور شوہر کو ہلاک کر ڈالا۔ اب وہی سفاک اور ابلیس صفت لوگ اسے اپنے کالے دھندے کی بھینٹ چڑھانا چاہتے تھے۔

غزالہ کے لئے پہلی بار اپنے اندر ترحم آمیز نرم جذبات پروان چڑھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جب غفورے نے مجھ پر بڑے جارحانہ انداز میں اپنی گن تان لی تھی تو یہ غزالہ ہی تھی جو اپنے خوف و ہراس کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اچانک میری ڈھال بن گئی اور غفورے کو مجھ پر گولی چلانے سے منع کرنے کی عاجزانہ التجا بھی کی تھی۔ اگرچہ غفورے کا مجھے قتل کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا مگر بہرحال اپنے تئیں میری جان بچانے کے لئے غزالہ کا یہ ایک قابل قدر عمل تھا۔ پھر میرا ضمیر کیسے گوارا کرتا کہ اسے میں ان خبیث اور ننگ انسانیت لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا۔ تب پھر ایکا ایکی مجھے یوں لگا جیسے اب تک اپنے دشمنوں سے نبرد آزما رہنے والے نادر خان میں ایک دوسرا روپ بھی انگڑائی لے کر بیدار ہونے لگا...... یہ روپ حقوقِ انسانیت کی علمبرداری کے لئے تھا۔ اپنے وطن کو، اپنی دھرتی کو اشفاق شاہین جیسے شیطان سے پاک کرنے کا عزم۔ اب تک میں نے اپنی ذاتی غرض کے لئے ہی تو سب کچھ کیا تھا۔ مگر کوئی کام ضمیر کی طمانیت کے لئے بھی تو کرنا چاہئے تھا۔

یہ سب سوچتے ہی میں نے غزالہ کو ان شیطانوں کے ٹولے سے رہا کرانے کا حتمی ارادہ باندھا اور جیپ کو ویران اور سنسان سڑک پر تیزی سے یوٹرن دیا۔ چند ثانیے بعد ہی میں، خدائی فوجدار کی طرح اشفاق شاہین کی کوٹھی کی طرف تیزی سے اپنی جیپ دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ میں گلبرگ سے زیادہ دور نہ گیا تھا۔ وہاں سے بہ مشکل چند کلومیٹر تک کا ہی تو فاصلہ طے کیا تھا۔

تاہم گلبرگ کے علاقے میں داخل ہوتے ہی میں نے ایک بلاک پہلے ہی اپنی جیپ کسی تاریک گوشے میں کھڑی کر دی اور خود نیچے اتر آیا۔ میں نے براؤن جینز اور ہاف آستین کی سفید شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس پر لیدر کی سیاہ جیکٹ تھی۔ میگارد میری جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھا تھا۔

میں قدرے تیز تیز قدموں سے اشفاق شاہین کی کوٹھی کی طرف چلا جا رہا تھا۔ میرے دونوں طرف کوٹھیوں اور بنگلوں میں ویرانی مسلط تھی۔ ہلکی ہلکی روشنی بھی ان کے وسیع احاطوں سے پھوٹتی نظر آ رہی تھی۔ تقریباً ہر پُرشکوہ کوٹھی کے آہنی گیٹ پر لگے ستونوں پر سفید گلوب روشن تھے۔ اشفاق شاہین کی کوٹھی میرے دائیں ہاتھ کی قطار میں تین کوٹھیوں کے بعد آتی تھی۔

میں دبے پاؤں چل رہا تھا۔ مگر پھر جانے کیسے کوٹھی کے اندر احاطے میں چھوڑے ہوئے کسی اعلیٰ نسل کے کتے نے میری باہر موجودگی کو محسوس کرتے ہی زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا۔ میں ذرا ٹھٹکا اور پھر تیز تیز قدموں سے آگے نکل گیا۔ پھر اپنی مطلوبہ کوٹھی کے سامنے سے گزرنے لگا۔ کوٹھی میں ویرانی مسلط تھی۔ یہاں زیادہ تر کوٹھیاں ایک منزلہ ہی تھیں۔ میں اپنی مطلوبہ کوٹھی سے آگے نکلتا چلا گیا۔ یہ کارنر پر واقع تھی۔ دائیں جانب ایک چوڑا گلی نما راستہ تھا جو غالباً آگے جا کر مین شاہراہ سے لگتا تھا۔ یوں میں مطلوبہ کوٹھی کی جنوبی دیوار کے ساتھ ہی اس راستے پر مڑ گیا اور ذرا ٹھہر کر گرد و پیش پر نظر ڈالنے کے بعد دیوار کی بلندی کا جائزہ لینے لگا۔ دیوار نو فٹ سے زیادہ بلند نہ تھی۔ مگر اس کے سرے پر تقریباً چھ چھ فٹ کے فاصلے پر آہنی بریکٹوں پر تین رویہ خاردار آہنی باڑ منسلک تھی۔ ان میں برقی رو موجود ہو سکتی تھی۔ میں آگے بڑھا اور اس طرح کوٹھی کی جنوبی دیوار کے ساتھ عقبی دیوار کی طرف آ گیا۔ اس حصے کے سامنے ایک چوڑا راستہ اور پھر وسیع میدان تھا۔ میں وہاں کھڑا ہو کر عقبی حصے کا ذرا تفصیلی جائزہ لینے لگا۔ یہاں بھی وہی صورتِ حال تھی۔ یعنی دیوار کے اوپری سرے پر آئرن بریکٹوں سے خاردار آہنی تاروں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ گویا نقب لگانے کی راہیں مسدود ہی دکھائی دے رہی تھیں۔

اچانک میری نگاہ اپنی بائیں جانب ایک دبلے پتلے پول پر پڑی۔ یہ ٹیلی فون کا کھمبا تھا اور مذکورہ کوٹھی کی عقبی دیوار کے کسی قدر قریب بھی۔ میرے ذہن میں قریب ترین کھمبے کو استعمال کرنے کا خیال اُبھرا۔ کھمبے کے سرے پر ڈی پی باکس نصب تھا اور یہ دیوار سے کافی اونچا تھا۔ ابھی میں نے اس کھمبے کی طرف بڑھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اچانک کہیں قریب سے تیز سیٹی کی آواز اُبھری اور ساتھ ہی کسی نے بلند آواز میں چلا کر کہا۔

”ہوشیار......خبردار...... جاگتے رہنا۔“

یہ آواز کسی گشتی چوکیدار کی تھی۔ جو ہر طرف پھیلے سناٹے کو دور تک چیرتی چلی گئی۔ میں سمجھا شاید اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی ہے۔ میں نے بے اختیار آواز کی سمت دیکھا۔ یہ میرے دائیں جانب سے اُبھری تھی۔ پھر مجھے ایک ہیولا نظر آیا جس کے ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں لاٹھی تھی۔ میں فوراً دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا۔ دائیں جانب سے آتا ہوا شبینہ چوکیدار جب اندر کی ایک گلی میں مڑ گیا تو میں نے سکون کی سانس لی۔

پھر جب اس کی آواز دور چلی گئی تو میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور دوبارہ کھمبے کی طرف بڑھا۔ اس کھمبے پر چڑھنا بھی آسان نہ تھا۔ یہ بالکل گول تھا۔

میں اس سے لپٹ کر اپنے دونوں ہاتھوں پیروں کی مدد سے دھیرے دھیرے اوپر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ بہت مشکل اور مشقت طلب کام تھا۔ ابھی میں نصف کھمبے تک ہی چڑھ پایا تھا کہ بری طرح ہانپنے لگا۔ رکنا بھی کارِ محال تھا۔ تقاضا یہی تھا کہ کارِ مسلسل جاری رکھا جائے ورنہ کھمبا میرے ہاتھوں پیروں سے پھسل جاتا اور میں نیچے آ رہتا۔ میں نے ہمت مجتمع کی، پھر کوشش شروع کر دی اور بالآخر سرے تک جا پہنچا۔ سرے پر اتنا ضرور تھا کہ دو عدد آہنی راڈ منسلک تھے تاکہ ان پر بہ آسانی ٹک کر ڈی پی باکس میں کام کیا جا سکتا تھا۔ جبکہ میرا ”کام“ دوسرا تھا۔ میں نے اندر کوٹھی میں جھانکا۔ یہ کوٹھی کی اصل عمارت کے عقبی احاطے کی دیوار تھی۔ درمیان میں خلا تھا۔ اندر تاریکی تھی۔ کسی گمنام گوشے سے روشنی کا جگنو پھیلا ہوا تھا۔ اب میں مخمصے کا شکار تھا۔ ٹیسٹر تو تھا نہیں کہ تاروں میں برقی رو کی موجودگی کو چیک کر سکتا۔ دوسری بات یہ تھی کہ میں آہنی پول پر تھا۔ آہنی باڑ پر اگر کم واٹ کی برقی رو دوڑ رہی تھی تو وہ میرے آہنی پول پر ہونے کی وجہ سے مجھے ڈبل شاک پہنچا سکتی تھی۔ اور خود میں ”ٹیسٹر“ بننے کا رسک بہرحال نہیں لے سکتا تھا۔

اچانک مجھے ایک خیال سوجھا۔ میں نے فون کے کھمبے پر نصب آہنی راڈ کو ہلا جلا کر دیکھا۔ وہ ڈھیلی تھی۔ اس کے ”نٹ“ آدھے باہر نکلے ہوئے تھے جبکہ بولٹ غائب تھے۔ میں نے انگلیوں کی مدد سے ڈھیلے پڑے ہوئے نٹ کھول کر نیچے پارسل کئے اور آہنی راڈ نکال لی۔ اس کے بعد میں نے اس طرح کمال مہارت سے آہنی راڈ کو دو رویہ آہنی باڑ پر اچھالا کہ وہ دونوں سے ٹکرائے اور اندر گرنے کی بجائے باہر ہی گرتے۔

ایسا ہی ہوا۔ راڈ دونوں سے ٹکرائی اور نیچے گر گئی مگر کوئی چنگاری نہ چھوٹی۔ تسلی ہوتے ہی میں نے سب سے پہلے ہاتھ بڑھا کر ایک فولادی بریکٹ کو پکڑا اور پھر اچھل کر دیوار کی منڈیر پر آ گیا۔ اب میرا زیادہ دیر بلندی پر ٹکے رہنا خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ میں کسی کی نظروں میں بھی آ سکتا تھا۔ میں نے خود کو خاردار باڑ میں اُلجھنے سے بچایا۔ اندر کی طرف نیچے جھانکا۔ اس جانب دیوار پر بلندی میں واٹر ٹینک تھا۔ یہاں سے مسلسل اوور فلو ہونے کے باعث کوٹھی کے اس عقبی حصے میں خاصی سیلن تھی اور کائی زدہ جھاڑیاں سی نیچے اُگی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ میں احتیاط سے نیچے کود گیا۔ نیچے سیلن زدہ کائی میں جمع شدہ پانی میں چھپاکے سے گرا اور پھر وہیں جم کر سن گن لینے کی کوشش کرتا رہا۔

خیر خیریت ہی رہی۔ میں نے آگے قدم بڑھا دیئے۔ اب اندر داخل ہونے کا مسئلہ تھا مگر مجھے امید تھی کہ اس مسئلے کے حل کے لئے کوئی دروازہ کھلا مل ہی جائے گا۔ میں نے جیسے ہی مدھم روشنی میں آگے قدم بڑھائے، اچانک مجھے ہلکی سی غراہٹ کی آواز سنائی دی۔ یہ عقب سے آئی تھی۔ میں سناٹے میں آ گیا۔ عقب میں مڑ کر دیکھا تو سکتے میں آ گیا۔ ایک قد آور، اعلیٰ نسل کا السیشن کتا مجھے اس دخل در معقولات پر خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ میں ایسے پالتو کتوں کی سرشت سے واقف تھا۔ یہ بھونکتے کم تھے اور شکار پر جھپٹ کر اسے بری طرح بھنبھوڑ دینے کے عادی ضرور تھے۔ اس کے ادھ کھلے بھیانک جبڑوں سے دو نوکیلے شکاری دانت خونخوار سی جھلک دکھا رہے تھے۔

پھر دوسرے ہی لمحے اس نے ایک خونخوار غراہٹ کے ساتھ مجھ پر جست لگا دی۔ دوبدو حیوانی مقابلے کا اس سے پہلے تجربہ ہو چکا تھا۔ ماموں حیدر گل کے ساتھ ایک بار شکار پر میں گیا تھا اور واسطہ ایک

بھورے خونخوار بھیڑیے سے پڑا تھا۔ ماموں حیدر گل آگے نکل چکے تھے۔ میں پیچھے رہ گیا تھا۔ بھ
نے اچانک عقب سے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ بندوق میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی تھی۔ پھر مجھے خونخو
جسیم بھیڑیے سے دوبدو بزور بازو مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ ''مکش پور'' کی مہم کے دوران بھی میں ایک
سے گزر چکا تھا۔ اس کے علاوہ شاہ میر کی کوٹھی پر بھی ایسے حالات سے واسطہ پڑ چکا تھا۔

چنانچہ جیسے ہی اس خونخوار السیشن کتے نے خوفناک غراہٹ کے ساتھ مجھ پر جست لگائی
''ڈسک'' پھینکنے کے ماہرانہ ایتھلیٹ انداز میں ایک ٹانگ پر گھوما اور میری دوسری ٹانگ کتے کی تھو
پڑی۔ ضرب زوردار ثابت ہوئی۔ کتے کے حلق سے ''کوں'' کی آواز ابھری اور اس کا قد آور وجو
زدہ دیوار سے جا ٹکرایا۔ ہلکی سی ''دھپ'' کے ساتھ وہ کائی زدہ جھاڑیوں میں گرا اور چند ثانیے ہڑبڑ
کے انداز میں ہلنے جلنے کے بعد دوبارہ سنبھلا۔ مگر مجھے اب فوراً اس کا تیا پانچا کرنا تھا۔ لہٰذا جیسے
سنبھل کر دوبارہ مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش کرنے لگا، میں نے جھپٹ کر اپنے دائیں ہاتھ کا
لاک'' اس کی گردن پر فٹ کرتے ہی زوردار جھٹکا دیا۔ وہ کوئی آواز نکالے بغیر ٹھنڈا پڑ گیا۔

میں نے کتے کی لاش کو جھاڑیوں میں پھینک دیا اور پھر سامنے کے رخ پر آگے بڑھنے کا ارادہ
کر کے عقب میں بڑھا۔ دائیں جانب ایک گلی تھی، یہاں کاٹھ کباڑ بکھرا ہوا تھا۔ میں آواز پیدا کیے
آگے بڑھنے لگا۔ پھر بیرونی دروازے والے حصے کی دیوار سے ذرا اُبھر کر اطراف کا جائزہ لیا۔
خاموشی اور ویرانی کے سوا کچھ نہ تھا۔

میں نے کوٹھی کے بیرونی محرابی دروازے کی طرف قدم بڑھائے مگر اسے بند پایا۔ پھر مجھے
منزل کی بالکونی نظر آئی جس کے نیچے ایک ہائی روف کھڑی تھی۔ مگر یہ بالکونی گیٹ کے رخ پر تھ
وہاں مجھے کسی چوکیدار کے ہونے کا شبہ تھا۔ میں سب سے پہلے دبے پاؤں آگے بڑھ کر وہاں کسی کی
موجودگی کی تسلی کرنے کے بعد بہ آہستگی و احتیاط ہائی روف کی چھت پر چڑھ گیا۔ پھر فینسی ٹائپ ر
کی جانب ہاتھ بڑھا کر جھول گیا اور پھر اپنے نچلے دھڑ کو جمناسٹک کے انداز میں سکیڑ کر اوپر چڑھ گیا۔

بالکونی کے سامنے مجھے ساگوان کی خوب صورت محرابی چوکھٹ نظر آئی جس پر کوئی دروازہ نہ تھا۔
نے دبے پاؤں جھک کر آگے بڑھنا شروع کیا اور ہال میں آ گیا۔ ہال خالی تھا۔ یہ مجھے ٹی وی لاؤ
محسوس ہوا۔ یہاں زیرو پاور کے دو سبز بلب روشن تھے۔ اب کسی ممکنہ خطرے کے پیش نظر میرا دل
پسلیوں کی بجائے میرے حلق میں دھڑک رہا تھا۔

میں کسی کی نظروں میں آ سکتا تھا۔ تاہم مجھے اپنی مہم جوئی پر بھروسہ تھا۔ میں اسی احتیاط کے ساتھ
پیش کا جائزہ لیتا ہوا زینے کو دیکھتے ہی اس جانب بڑھا اور پھر دھیرے دھیرے زینے طے کرتا ہوا
آیا۔ یہاں سے مجھے اس حد تک محلِ وقوع کی شناسائی ہوئی کہ جس کمرے میں مجھے اور غزالہ کو مقید
تھا، وہ بائیں جانب کی مختصر راہداری کے آخری سرے پر تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اب بھی اسے وہیں رکھا
ہوگا۔

میں دبے پاؤں مذکورہ راہداری میں آ گیا۔ یہاں دیوار گیر فینسی لیمپ کے اندر کم واٹ کا بلب
روشن تھا۔ جلد ہی میں مطلوبہ کمرے کے دروازے کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے باہر سے کنڈا لگا
تھا۔ قفل لگانے کی ضرورت نہ ہونے کی وجہ ظاہر تھی۔ لہٰذا میں نے سانس روک کر کنڈے کو دھیرے
گھما کر کھولا اور پھر دور سے ہی لمحے دروازے کو اندر کی جانب آہستگی سے دھکیلا۔ سامنے نگاہ پڑی
میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔

سامنے حیران و پریشان غزالہ کھڑی تھی۔ وہ کھٹر پٹر کی آواز پر شاید اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''تت.........تم.........!'' اس کی لکنت زدہ آواز میں تحیر تھا۔

''شش.........!'' میں نے اپنے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر سرگوشی میں کہا۔ ''آ جاؤ.........جلدی۔''

میرے کہنے کی دیر تھی، وہ بلاتوقف حرکت میں آ گئی۔ کمرے سے باہر آتے ہی میں نے آہستگی کے ساتھ دروازہ بند کر کے کنڈا لگا دیا۔

''نن.........نادر!.........تم یہاں کیسے؟'' وہ میرے ساتھ ساتھ دبے پاؤں مختصر راہداری میں چلتے ہوئے مجھ سے بولی۔

''یہاں سے نکلنے کی کرو.........پھر باتیں کر لیں گے۔'' میرے لہجے میں ہدایت تھی۔

اب ہمارا بیرونی گیٹ سے نکلنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ سردست میں نے باہر تک واپسی کے لئے وہی زینہ اور بالکونی والا راستہ اپنایا۔ بالکونی کی ریلنگ سے میں نے پہلے غزالہ کو سنبھالا دیتے ہوئے نیچے کھڑی ہائی روف وین کی چھت پر اتارا اور اس کے بعد خود بھی اتر گیا۔ پھر ہم ہائی روف کی پھسلواں چھت سے پھسل کر نیچے اتر گئے۔

غزالہ اب بھی متوحش ہی نظر آ رہی تھی۔ تاہم آزادی کی امید نے اسے کسی قدر حوصلہ ضرور بخش دیا تھا۔ میں نے یہاں لمحے بھر کو کھڑے ہو کر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ غزالہ کو اپنے عقب میں آنے کا اشارہ کرتے ہوئے بیرونی گیٹ کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ ایسا لگتا تھا کہ اشفاق شاہین کے گرگوں کی تعداد یہاں کچھ کم ہی تھی۔ جتنے بھی تھے، وہ سب نرم اور آرام دہ بستروں پر خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ ممکن ہے اس کے بیوی بچے بھی یہیں ہوں۔

گیٹ کے قریب مجھے ایک مختصر سا بنکر نما گارڈ کیبن نظر آیا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر تاریکی تھی۔ غالباً محافظ چوکیدار بھی اندر مست الست پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ گیٹ کے قریب پہنچے تو میں نے اندر سے اسے مقفل پایا۔ اب گیٹ کے آہنی دروازے پر ہی طبع آزمائی کر کے اوپر سے باہر چھلانگیں لگانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ تاہم اچانک میرے ذہن میں ایک سہل راہ اُبھری۔

اگر میں گارڈ کیبن کے اندر داخل ہو کر چوکیدار پر قابو پانے کی کوشش کرتا تو یقیناً اس کے پاس سے چابی برآمد ہو سکتی تھی۔ بصورتِ دیگر آہنی گیٹ کو چڑھ کر پار کرنا بھی پُرخطر اور محال تھا۔

چنانچہ یہ سوچ کر میں نے غزالہ کو پہلے قریب ہی دو رویہ بڑے بڑے گملوں کے چھتنار سے پودوں کی آڑ میں کھڑے ہونے کا کہا اور خود دبے پاؤں کیبن کی طرف بڑھا۔ اندر اندھیرا تھا۔ کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا کہ آیا اندر کتنے افراد تھے؟ ایک سے زائد محافظ ہوتے تو میری اب تک کی یہ ساری مہم اکارت چلی جاتی۔

میرے پاس موبائل میں لگی ٹارچ تھی۔ چنانچہ میں نے کیبن کی چوکھٹ پر پہنچ کر اپنی جیب سے موبائل نکالا اور اس کے سر پر لگے بلب کو دھڑکتے دل کے ساتھ روشن کر دیا۔ روشنی ہوتے ہی میں نے چانک ایک قد آور اور بھاری بھرکم شخص کو خود پر دو نالی بندوق تانے کھڑے گھورتے پایا۔ موبائل میرے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔ اندر تاریکی اور باہر مدھم روشنی کے باعث وہ مجھے تو دیکھ سکتا تھا اور جانے کب سے میری حرکات و سکنات کو دیکھ رہا تھا۔ جبکہ میں اندر دیکھنے سے قاصر تھا۔

''دونوں ہاتھ اوپر کر لو۔ ورنہ کارتوس فائر کر کے تمہارا جسم چھلنی کر دوں گا۔''

وہ خوف ناک لہجے میں غرا کر مجھ سے بولا۔ اس کی بڑی بڑی گھنی مونچھوں میں غضب کا تناؤ محسوس

ہو رہا تھا۔ ایک موٹا سا کالا مسّہ اس کے دائیں گال پر آنکھ کے قریب، اس کی صورت کو مزید خونخوار بنا
تھا۔ ناچار میں نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر دیئے۔ وہ میرے سینے پر دونالی بندوق ٹکائے دھکیلتا ہوا
کیبن سے باہر نکل آیا۔ میرا ذہن اچانک خطرناک بڑتی سچویشن پر تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ایک تو یہ
تھی کہ یہ اکیلا ہی اندر تھا۔ دوسرا ساتھی ہوتا تو اسے قابو کرنا مشکل ہی ہوتا۔

''کدھر ہے وہ لڑکی جو ابھی تھوڑی دیر پہلے تمہارے ساتھ کھڑی تھی؟'' اس نے اطراف میں متلا
نظریں ڈالتے ہوئے درشت لہجے میں مجھ سے کہا اور مجھے واقعی حیرت ہوئی کہ آخر غزالہ اچانک کہا
غائب ہوگئی تھی۔ کیونکہ میرے اندازے کے مطابق اسے اب تک نظر آ جانا چاہئے تھا۔ اس کی بات
میں نے غیر ارادی طور پر لگے چھتنار پودوں والے گملوں کی طرف دیکھا تو مجھے وہ وہاں نظر نہ آئی۔

''پتہ نہیں۔ ابھی تو ادھر ہی تھی۔'' میں نے کہا تو اچانک مجھے اس کرخت رو چہرے والے گارڈ
عقب سے غزالہ نمودار ہوتی نظر آئی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ایک بڑا سا گملا تھا۔ میرے وجود میں
سنسنی پھیل گئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے گارڈ نے بھی میری نظروں کی سمت اور آنکھوں میں اُبھرنے والی چمک
کو بھانپتے ہی غیر ارادی طور پر اپنے عقب میں گردن موڑ کر دیکھنا چاہا تھا۔ مگر تب تک غزالہ وہ بھاری
گملا اٹھائے اس کے بالکل قریب پہنچ چکی تھی۔

تنومند اور خرانٹ صورت گارڈ کو خود پر زیادہ ہی زعم تھا۔ میرے سینے پر بندوق کی نال ٹکا کر سمجھا
کہ مجھے وہ بے بس کر چکا تھا۔ اس لئے جیسے ہی اس نے اپنے عقب میں دیکھا تو میں بہ آسانی اس لمحا
موقعے سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ مگر پہلے منتظر تھا غزالہ کے گملے کی کارگزاری کا۔ چنانچہ میری مطمئن نظروں
نے دیکھا، جیسے ہی موچھیل محافظ کو اپنے عقب میں خطرہ محسوس ہوا اور اس نے گردن کو نصف دائرے میں
کسی روبوٹ کے سر کی طرح گھمایا، غزالہ نے بھی عین وقت پر اسے محتاط ہوتا دیکھتے ہی غیر معمولی پھرتی
کا مظاہرہ کرتے ہوئے گملا اس کے سر پر دے مارا۔

گارڈ کے حلق سے ایک عدد خزاں رسیدہ کراہ خارج ہوئی اور ادھر میں نے اس ڈر سے کہ کہیں ا
کمبخت کی انگلی لبلبی پر غیر ارادی طور پر نہ دب جائے، ایک ہاتھ سے بندوق کی نال پکڑ کر اوپر کر دی۔ گملا
نیچے گر کر زوردار آواز کے ساتھ پاش پاش ہو گیا۔ محافظ ضرب کی شدت سے کھڑے کھڑے لہرا گیا تھا
کمبخت سخت جان ثابت ہوا تھا۔ باقی کی کسر میں نے پوری کر دی تھی کہ اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی
پڑتے ہی بندوق میں نے کھینچ کر جھپٹ لی اور اسے نال سے پکڑ کر لٹھ کی طرح گھمانے کے انداز میں اس
کے سر پر رسید کرنا چاہی مگر اس سے پہلے ہی وہ زمین پر جا گرا۔

میں نے لپک کر اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ میری توقع کے عین مطابق چابی اس کے پاس تھی۔ میں
پھرتی سے اٹھا۔ ایک ٹھٹکی ہوئی نگاہ کوٹھی کے مرکزی دروازے پر ڈالی۔ گملا ٹوٹنے کی آواز سے کوئی نہیں
جاگا تھا۔ پھر میں تیزی سے گیٹ کی جانب بڑھا اور قفل کھول دیا۔ پھر آہستگی سے دروازے کا ایک پٹ
کر کے ہم دونوں باہر آ گئے۔

''میری جیپ وہاں کھڑی ہے، بھاگو!'' میں نے باہر تاریکی میں آتے ہی غزالہ سے کہا اور پھر
دونوں دوڑ پڑے۔

جیپ کے نزدیک پہنچ کر میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور پھر اسے جب تک اسٹارٹ کیا تو غزالہ
بھی لپک کر میرے برابر والی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر براجمان ہو چکی تھی۔ اسٹارٹ ہوتے ہی میں
نے گیئر بدل کر ایک جھٹکے سے جیپ آگے بڑھا دی۔

میں نے فیول بتانے والی سُوئی پر نظر ڈالی۔ فیول ختم ہونے کے قریب تھا۔ یقیناً ان لوگوں نے اس
میں فیول ڈلوا دیا ہوگا۔ کیونکہ میری جیپ میں فیول تھوڑا ہی رہ گیا تھا۔ ان لوگوں نے اپنی پراڈو کا ٹائر
برسٹ ہونے کے بعد یقیناً میری پوٹھوہار کو استعمال کیا تھا۔

بہرطور میری مہم کامیابی سے دوچار ہوئی۔ میں جیپ کو ویران شاہراہ پر دوڑائے جا رہا تھا۔ غزالہ
میرے برابر کی سیٹ پر خاموش بیٹھی تھی۔ مجھے ماں کی طرف سے فکر ہو رہی تھی کہ وہ میرے ابھی تک ایئر
پورٹ سے گرین لاج نہ پہنچنے پر کس قدر پریشان ہو رہی ہوں گی۔ اگرچہ انہوں نے ابھی تک موبائل پر
مجھ سے رابطہ نہ کیا تھا مگر میں نے بھی سردست رابطہ نہ کیا۔ اب ویسے بھی میں گرین لاج ہی تو جا رہا تھا۔
فیول بھروانا ضروری تھا۔ ایک پمپ اسٹیشن سے میں نے یہ کمی پوری کی اور پھر موٹر وے کا رخ کیا۔

غزالہ کی مسلسل اسرار بھری چپ مجھے مخمصے میں ڈال رہی تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے اس کی طرف
دیکھا، پھر بولا۔ ''تمہیں آزادی ملنے پر خوشی نہیں ہوئی؟''

وہ جیسے اپنے اندر کے پُرسوچ بھنور سے ابھر کر قدرے چونکتے ہوئے بولی۔ ''آں........ ہاں........
شاید........'' مجھے اس کے عجیب سے جواب پر حیرت ہوئی۔

''شاید........کیا مطلب؟''

''تم نے یہ سب اچھا نہیں کیا نادر!'' وہ اسکرین پر اپنی نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے بولی۔ ''تم نے
بلاوجہ اشفاق شاہین جیسے شیطان سے ٹکر لے لی۔''

مجھے اس کی بات پر غصہ تو آیا مگر تحمل سے بولا۔ ''وہ خبیث تمہارا جانے کیا حشر کرتا۔ میرے ضمیر نے
یہ گوارا ہی نہیں کیا کہ تمہیں ان شیطانوں کے بیچ چھوڑ جاؤں۔ میں نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر تمہیں
آزادی دلائی اور تم ہو کہ........'' میں نے آخر میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میری بات پر غزالہ
نے ذرا گردن موڑ کر میری جانب دیکھا مگر میں نے اپنی نگاہیں سامنے اسکرین کے پار ہی مرکوز رہنے
دیں۔ پھر وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔

''مجھے غلط مت سمجھو نادر!........ میں نہیں چاہتی تھی، تم جیسا شریف انسان ان خبیث لوگوں کے
ساتھ اُلجھے۔ رہی میری بات تو میں کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کو فیس کر ہی لیتی۔''

''اگر مجھ سے ان لوگوں نے الجھنے کی کوشش کی تو میں انہیں منہ توڑ جواب دوں گا۔'' میں نے دانت
پیس کر کہا۔ ''ویسے تو ان خبیثوں کے کالے کرتوت سے واقف ہونے کے بعد اب میں خود بھی سنجیدگی کے
ساتھ ان لوگوں کے خلاف کارروائی کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ میرا تو خیال تھا کہ تم بہادری
کے ساتھ میرا ساتھ دو گی۔ مگر تم تو خود ہی ان کے سامنے اپنے آپ کو بے بس سمجھے ہوئے ہو۔''

میری بات پر غزالہ نے قدرے چونکنے کے انداز میں میری طرف دیکھا تھا۔ پھر بے اختیار میرے
کاندھے پر اپنا نرم و گداز ہاتھ رکھتے ہوئے جوش و خوشی سے لرزتی آواز میں بولی۔

''کک........ کیا واقعی........ سچ کہہ رہے ہو؟''

''ہاں........'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''ان خبیث لوگوں نے جانے اب تک کتنی معصوم لڑکیوں
کو ان کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر پامال کیا ہوگا۔ ایسے لوگ ہمارے سماج میں زہر گھول رہے ہیں،
ہماری آنے والی نسلوں کو بے راہ روی کے کنوئیں میں دھکیل کر انہیں مفلوج بنا رہے ہیں۔''

''نادر! کہیں ایسا تو نہیں کہ انہوں نے تمہیں بآسانی چھوڑ دیا اور تم انہیں کمزور سمجھ رہے ہو۔''

''میں دشمن کو کمزور سمجھنے کی غلطی کبھی نہیں کرتا غزالہ! اور یہی میری عادت مجھے اب تک دشمنوں پر

زبردست کئے ہوئے ہے۔'' میں نے مستحکم لہجے میں کہا تو وہ پُرجوش لہجے میں بولی۔
''اگر یہ بات ہے تو نادر! میں تمہارے ساتھ بھرپور تعاون کروں گی۔''
''ٹھیک ہے.........مگر سب سے پہلے تمہیں اپنا ٹھکانا بدلنا ہوگا۔'' میں نے مشورہ دیا۔
''اس کا کوئی فائدہ نہیں۔'' وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولی۔ ''اور ہاں.........اتنا تو میں کر سکتی ہوں کہ احتیاط کے پیش نظر اپنی حفاظت کا مکمل بندوبست کر رکھوں۔''
''لیکن سردست تمہیں اپنا اسلام آباد والا اپارٹمنٹ تو کم از کم ضرور بدل لینا چاہئے۔''
''خیر.........یہ میرا دردِ سر ہے، وہ میں کرلوں گی۔ تم مجھ سے رابطے میں رہنا۔ میں کچھ نہ کچھ ضرور کروں گی۔''
میں خاموش رہا۔ دور مشرق کی سمت پو پھٹنے لگی تھی۔ میں نے اسے اسلام آباد اس کے اپارٹمنٹ پہ چھوڑا اور پھر خود مری روانہ ہو گیا۔
گرین لاج پہنچا تو سکینہ نے بتایا کہ ماں اپنے کمرے میں سو رہی تھیں۔ میرے دل کو گھونسہ لگا۔ کہاں تو میرے غیاب پر ماں کو نیند تک نہ آتی تھی، جب تک میں صحیح سلامت گرین لاج نہ پہنچ جاتا۔ پھر وہ بار بار مجھ سے اپنے موبائل پر رابطہ کر کے میری خیر خیریت معلوم کرتی رہتی تھیں۔
کیا ماں کا دل مجھ سے اس قدر ہی خراب ہو چکا تھا؟.........کیا آتش انتقام نے واقعی میری ماں کی ممتا کو خاکستر کر ڈالا تھا؟ اور یہ قول اس کے اسے اپنا دوسرا، زخمی عورت والا روپ زیادہ عزیز تھا؟
بہرطور میں اپنے کمرے میں آ کر سو گیا۔ ہنگامہ خیز رات کی اعصاب شکن مہم جوئی کے بعد میں اس قدر تھکا ہوا تھا کہ بستر پر گرتے ہی ایسی گہری نیند سویا کہ دن چڑھے ہی میری آنکھ کھلی اور وہ بھی سکینہ ہی نے مجھے آ کر جگایا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ ماں میرا کھانے کی میز پر انتظار کر رہی تھیں۔
مجھے بھوک نہیں تھی تاہم میں غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر کھانے کی میز پر پہنچا تو ماں کو اپنا منتظر پایا۔ میں نے انہیں ہولے سے سلام کیا۔
''تم رات بھر گھر نہیں آئے.........کدھر رہ گئے تھے؟''
میں جواباً بولا۔ ''واپس لوٹتے وقت میرا غفورے کے آدمیوں سے ٹکراؤ ہو گیا تھا۔'' اس کے بعد میں نے انہیں ساری بات بتا دی اور یہ بھی کہ غفورے سے میرا معاہدہ بھی ہو چکا تھا۔
''غفورے کا زندہ رہنا ہمارے دشمنوں کے مفاد میں ہوگا۔ تمہیں اسے فوراً گولی مار دینی چاہئے تھی۔'' ماں نے زہریلے لہجے میں کہا۔
''لیکن ماں! غفورا کوئی معمولی شخص نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ ایک بہت بڑے انڈر ورلڈ مافیا کے چیف اشفاق شاہین کا خاص کارندہ ہے۔ پولیس اب اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تو پھر کیا فائدہ خون خرابے کا۔ کیونکہ اس صورت میں اشفاق شاہین کا پورا گروہ ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ جائے گا اور ہم اپنے اصل دشمنوں کی بجائے فضول الجھ جائیں گے۔''
ماں کو میری بات سمجھ میں آ گئی۔ لیکن اس کے باوجود بولیں۔ ''ٹھیک ہے پھر.........میں اعظم خان سے اس سلسلے میں بات کرتی ہوں۔ تم کھانا شروع کرو۔'' یہ کہہ کر وہ کھانے میں مشغول ہو گئیں۔ میں بے دلی سے کھانا زہر مار کرنے لگا۔ میں نے اب تک ماں سے رب نواز اور اس کے دھوکا دینے کی بات کا ذکر نہیں کیا تھا اور نہ ہی مناسب سمجھتا تھا۔ کیونکہ میں اس مسئلے کو بالا ہی بالا حل کر دینا چاہتا تھا۔
کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ماں نے اسی وقت انکل اعظم خان سے فون پر رابطہ کیا۔ غفورے کا

ذکر انہوں نے اشاروں میں کرتے ہوئے ان سے ملاقات چاہی۔ پھر رابطہ منقطع کر کے مجھ سے بولیں۔
''تم ذرا ٹال کا چکر لگا آؤ۔ منیجر مشتاق کا دو تین بار فون آ چکا ہے۔ تمہارا پوچھ رہا تھا۔ میں ذرا اعظم خان سے غفورے کے سلسلے میں بات چیت کر کے آتی ہوں۔''
ماں کی بات پر میں فکرمند سا ہونے لگا۔ رب نواز کے غنڈے اور اس کے ساتھیوں کو میں نے خوب مزہ چکھایا تھا اور میرا ٹال میں رہنا لازمی تھا جبکہ ادھر ماں کو تنہا اعظم خان کے ہاں جانے دینے کو بھی میرا دل نہیں مان رہا تھا۔ لہٰذا بولا۔
''ماں! آپ کا یوں تنہا باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں۔ میں آپ کو انکل اعظم خان کے پاس چھوڑتا ہوا ٹال کی طرف نکل جاؤں گا۔''
ماں خاموش رہیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ماں نے میری بات سے اختلاف نہیں کیا تھا۔ ذرا دیر بعد ہم جیپ میں سوار ہو کر ''گرین لاج'' سے روانہ ہو گئے۔

❄❄❄

ماں کو انکل اعظم خان کے ہاں چھوڑ کر میں ٹال کی طرف نکل گیا۔ راستے میں مجھے منیجر مشتاق کی کال اپنے موبائل پر موصول ہوئی۔
''سر جی! آپ کدھر ہیں؟.........طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی، جی کڑا کے.........آئے نہیں آج آپ؟''
''میں وہیں آ رہا ہوں۔ خیریت تو ہے نا؟.........رب نواز کے غنڈے دوبارہ تو نہیں آئے؟'' میں نے آخر میں پوچھا۔
''نہیں جی۔ وہ تو نہیں آئے۔ البتہ کوئی خاتون ہیں۔ پتہ نہیں، شاید شانہ بہ شانہ قسم کا نام بتا رہی تھیں جی کڑا کے۔ اس وقت آپ ہی کے انتظار میں گھنٹے بھر سے بیٹھی ہیں۔''
خاتون کے ذکر پر میں ذرا چونکا۔ پر شانہ بہ شانہ کے الفاظ سے مجھے یاد آیا اور بولا۔ ''خاتون کا نام کاشانہ تو نہیں؟''
''جی.........جی سر جی!.........یہی نام ہے ان کا، جی کڑا کے۔''
''اچھا ٹھیک ہے۔ اسے میری آمد کا بتاؤ۔ میں ابھی چند منٹوں میں پہنچ رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے موبائل بند کر دیا۔
میں نے لالہ زار چوراہے سے جیسے ہی اپنی جیپ مال روڈ کی طرف موڑی تو اچانک مجھے اپنے تعاقب کا احساس ہوا۔ ہلکے گرے رنگ کی کار کو میں نے لالہ زار چوراہے سے موڑ کاٹتے دیکھا اور اس کی ہموار رفتار سے مجھے فوراً شبہ ہوا تھا کہ یہ میرے تعاقب میں ہے۔ یہ شاہراہ خاصی معروف تھی لیکن باوجود اس کے میں چونکہ اپنے سائے سے بھی محتاط رہنے کا عادی ہو چکا تھا اس لئے میں نے اپنے تعاقب کو بھانپ لیا تھا۔ تاہم میں نے ان پر اپنے محتاط ہونے کو ظاہر نہیں ہونے دیا اور ٹال تک بدستور سفر جاری رکھا۔
ٹال یہاں سے زیادہ دور نہ تھا۔ وہاں پہنچ کر میں جیپ کو بڑے سے چوبی گیٹ سے اندر لے گیا۔ اندر مجھے سیاہ رنگ کی چمچماتی ہنڈا اکارڈ کھڑی نظر آ گئی۔ میں کاشانہ کی کار کو پہچان گیا تھا مگر اس وقت میری ساری توجہ متعاقب کار پر تھی۔ میں پھرتی سے نیچے اترا اور پھر کھڑا ہو کر کھلے گیٹ کی طرف اپنی عقابی نظریں جما دیں۔

چند ثانیے بعد ہی میں نے اس گرے کلر کی کار کو گیٹ کے سامنے رکتے دیکھا۔ اس میں دو افراد تھے۔ دونوں ہی گردنیں موڑے اندر دیکھ رہے تھے۔ میں نے گیٹ پر متعین اپنے دو گن بردار محافظ میں سے ایک کو کار کی طرف بڑھتے دیکھا۔ وہ شاید ان سے یہاں رکنے کا مقصد پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے دیکھا کہ محافظ کے کار تک پہنچنے سے پہلے ہی کار اچانک تیزی کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

میں ان کی اس مشکوک حرکت پر ٹھٹکا اور تقریباً دوڑتا ہوا گیٹ سے باہر آ گیا اور دور ہوتی اس گرے کلر کی کار کو جاتے دیکھتا رہا۔ رفتار غیر معمولی تیز تھی۔ محافظ مجھے دیکھ کر ذرا خفیف ہوا۔ میں نے پوچھا۔

''کتنے افراد تھے؟''

''جناب! دو ہی تھے۔'' وہ مؤدبانہ بولا۔ اس اثناء میں میرا منیجر مشتاق بھی اپنی طوطے جیسی ناک پھنگی پر اُلوؤں کے دیدوں جیسی گول گول عدسوں والی عینک ٹکائے وہاں آن پہنچا تھا۔

''کوئی بات کی انہوں نے؟''

''نہیں جی۔''

''کیسے لگتے تھے؟''

''مقامی تو ہرگز نہیں لگتے تھے جی، یہ تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں۔'' محافظ نے بڑے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔

''کیا ہوا سر جی؟'' معاً منیجر مشتاق نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کر کے محافظ سے کہا۔

''تم محتاط رہو۔ ہو سکتا ہے، یہ لوگ دوبارہ یہاں سے گزریں۔''

''ٹھیک ہے جناب! آپ بے فکر رہیں۔''

''سر جی! وہ شانہ...... بہ شانہ...... اوہ میرا مطلب ہے جی کڑا کے......'' منیجر مشتاق نے دوبارہ لقمہ دیا اور میں اس کے ہمراہ واپس اپنے گلاس کیبن آفس کی طرف بڑھ گیا۔

اندر کاشانہ بے چینی سے میری منتظر تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے گداز لبوں پر دلکش مسکراہٹ اُبھر آئی۔

''ہیلو...... کاشانہ! کیسی ہیں آپ؟ معافی چاہتا ہوں، آپ کو میرا بہت انتظار کرنا پڑا۔'' میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ اس نے حسب عادت فوراً مصافحے کے لئے اپنا نرم و نازک ہاتھ بڑھا دیا۔ طوعاً و کرہاً مجھے اس کا ہاتھ تھامنا پڑا۔ ایک طرف بوتل کے جن کی طرح کھڑا منیجر مشتاق اُلوؤں کے دیدے گھماتا ہوا ہولے سے بڑبڑایا۔

''جی کڑا کے......'' شاید کاشانہ کے مجھ سے بے باکانہ انداز میں ہاتھ ملانے پر اس کی طبیعت منغض سی ہو گئی تھی۔

''جی...... آپ نے کچھ کہا؟'' معاً کاشانہ نے اپنی گردن ذرا موڑ کر پاس کھڑے منیجر مشتاق سے پوچھا۔

''نہیں جی، شاخسانہ صاحب! میں نے بھلا کیا کہا، جی کڑا کے۔'' وہ منہ بسور کر بولا تو میں نے ایک نظر اسے گھورا پھر کاشانہ سے مسکرا کر بولا۔

''یہ اس کا تکیہ کلام ہے۔ یوں ہی اونگی بونگی مارتا رہتا ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے منیجر مشتاق سے کہا۔

''آپ جائیں یہاں سے۔''

''چلا تو جاؤں میں، جی کڑا کے سر جی!...... مگر ایک ضروری بات کرنا تھی آپ سے۔'' منیجر مشتاق نے منہ بسور کر کہا۔ کاشانہ مسکرا کر رہ گئی۔

''کون سی بات؟'' میں نے قدرے چونک کر مشتاق سے پوچھا۔

''رب نواز کا فون آیا تھا۔ دھمکی دے رہا تھا۔ کہہ رہا تھا، اپنے نادر میاں سے کہنا، وہ میری بیٹی کے کاندھے پر بندوق رکھ کر چلانے کی بزدلانہ حرکت نہ کرے، جی کڑا کے۔''

''کب آیا تھا فون؟'' میں نے دانت پیس کر پوچھا۔

''دو گھنٹے پہلے آیا تھا، جی کڑا کے۔''

''تم نے کیا جواب دیا؟''

''میں نے کیا جواب دینا تھا سر جی! جی کڑا کے۔'' منیجر مشتاق منہ پھلا کر بولا۔ ''میں نے تو صرف یہ کہا کہ نادر صاحب آ جائیں تو یہ بات آپ ہی ان سے کہہ دیجئے گا، جی کڑا کے۔''

''ہوں...... ٹھیک ہے، تم جاؤ۔'' میں نے کہا۔ وہ چلا گیا۔ میں نے کاشانہ کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کر دیں۔ اس نے جینز کے اوپر ڈھیلی ڈھالی شرٹ پہن رکھی تھی۔ بوائے کٹ بالوں میں سپرے کر رکھا تھا۔ منیجر مشتاق کی بات اس نے بھی سن لی تھی اور اس کا دلکش چہرہ ایک دم ہی غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ میں نے یونہی ازراہِ تفنن کاشانہ سے کہا۔

''سن لیا آپ نے اپنے ابا حضور کا دھمکی آمیز فرمان؟''

میری بات پر وہ بے اختیار ہنسی اور اس کا غصہ چٹکی بجاتے ہی کافور ہو گیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔ ''میں آپ سے کہہ چکی ہوں، وہ میرا باپ بننے کے لائق نہیں ہے۔ اور نہ ہی بن سکتا ہے۔ وہ صرف میری مما کا شوہر ہے اور بس۔''

''خیر چھوڑیں، میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا۔ رب نواز کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچ رہا ہے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا، آخر اسے یہ بات کیسے معلوم ہوئی کہ شاہ بلوط کی دوسری کھیپ کی واپسی آپ کی مرہونِ منت ہو سکی تھی؟''

''میں سمجھ گئی۔'' وہ یکدم کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''ضرور میرا وہ موبائل اس کے ہاتھ لگ چکا ہو گا جس کے اندر میں نے رب نواز کے چند ''کارآمد'' اور ٹیکنیکل جملے ریکارڈ کر رکھے ہیں۔''

''آپ کو کیسے معلوم ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا موبائل دو دن پہلے کھو گیا تھا۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بتانے لگی۔ ''مجھے یاد تھا، جب میں اپنے ...ر میں تھی تو میں نے اپنے دونوں موبائل دراز میں رکھے تھے۔ بعد میں مجھے ان میں سے ایک پڑا ہوا ملا، دوسرا گم تھا۔ آج وہ جب مجھے دوبارہ وہیں پڑا ملا تو میں نے ریکارڈ شدہ جملے سننے چاہے تو پتہ چلا اس کی میموری Delete ہو چکی تھی۔ اب میرے شبہے کی تصدیق ہو گئی کہ یہ اس کمینے گگل خان کی ہی حرکت ہو سکتی ہے۔''

''خیر چھوڑیں اس بات کو۔ آپ سنائیں، کیسے آنا ہوا'' میں نے کہا۔ پھر جیسے کچھ یاد آیا۔ ''ارے، میں بھول ہی گیا، آپ کیا پئیں گی؟''

''اچھی سی چائے پلوا دیں۔'' وہ بے تکلفی سے مسکرا کر بولی۔

میں نے انٹرکام پر منیجر مشتاق کو چائے بھجوانے کا کہا تو اس نے عادت کے مطابق یکدم لقمہ دیا۔ ''سر یہ کون خرابہ ہے؟ اس سے جان چھڑائیں۔ کچھ ٹھیک کردار کی لڑکی نہیں لگتی، جی کڑا کے۔''

''تم خود آ کر کہہ دو۔'' میں دانت پیس کر بولا۔

''مم.......... میں چائے بھجواتا ہوں، جی کڑا کے۔'' وہ یک دم سٹپٹا کر بولا اور میں نے مسکرا انٹرکام کا ریسیور رکھ دیا۔

''نادر صاحب! وہی بات ہوئی جس کا ڈر تھا۔'' وہ گہری متانت سے بولی۔ ''اب آپ کا ساٹھ ا والا معاملہ کھٹائی میں پڑ سکتا ہے۔ خیر، آپ فکر نہ کریں۔ میں کچھ تحریری ثبوت اکٹھے کر رہی ہوں اور آپ دکھانے کے لئے اپنے ساتھ لائی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے خوب صورت سے ہینڈ بیگ کو میز اٹھا کر اپنی گود میں رکھا اور پھر اس کی زپ کھولنے کے بعد اندر سے چند کاغذ نکال کر میری طر بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''یہ سودے کی تفصیل ہے جو آپ کے مرحوم ماموں حیدر گل اور رب نواز درمیان طے پایا تھا اور دیگر خطوط بھی ہیں۔''

میں نے کاغذات کا وہ مختصر پلندا اس کے ہاتھوں سے لیا اور بہ غور جائزہ لینے لگا۔ ان میں سودے تفصیل کے علاوہ ماموں حیدر گل کی طرف سے احتجاجی خطوط بھی تھے جس میں ساٹھ لاکھ کی مالیت دیمک زدہ لکڑی بھیجنے پر احتجاج کیا گیا تھا۔ نیز اس میں عدالتی سمن نامے بھی تھے جو سرکاری بیلف ذریعے رب نواز کو ارسال کئے گئے تھے مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی تھی۔

''یہ ناکافی ثبوت ہیں۔'' میں نے ان کا سرسری جائزہ لینے کے بعد انہیں ایک طرف رکھتے ہو بے دلی سے کہا۔ ''تاہم آپ کے تعاون کے لئے میں شکرگزار رہوں گا۔''

میری بات پر وہ ہولے سے مسکرا کر مجھے دیکھنے لگی۔ جانے کیوں مجھے اس کی نگاہوں کی چلمن عجیب سی گہرائی محسوس ہونے لگی۔ پھر وہ اسی گہرے پن سے بھیدوں بھری مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''نادر صاحب! اس میں شکریے کی کون سی بات ہے؟ آپ کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے اور آ آپ کا حق ملنا چاہئے۔ لیکن شاید آپ یہ سمجھیں کہ میں رب نواز کے ساتھ اپنی ذاتی مخاصمت کی وجہ ایسا کر رہی ہوں تو یہ بھی غلط ہے۔ ٹھیک ہے، میں اسے ناپسند کرتی ہوں لیکن وہ میری مما کا شوہر میری مما نے اپنی مرضی سے اس کے ساتھ شادی کی ہے۔ دیکھا جائے تو سارا قصور میری مما کا ہی مگر نادر صاحب! میں اپنے پپا کے بہت قریب تھی۔ وہ میرے پپا بھی تھے، میرے دوست بھی۔ ا وفات کے بعد میں خود کو تنہا محسوس کرنے لگی تھی۔ میرے اندر ایک خلا آباد ہو گیا تھا۔ میری مما کو چا کہ وہ اپنی ممتا کے ذریعے یہ خلا پُر کرنے کی کوشش کرتیں لیکن وہ اپنی زندگی میں مگن رہتی تھیں۔ پھر انہوں نے بیوہ ہونے کے بعد رب نواز سے شادی کی تو میرے اندر کا خلا اور وسیع ہو گیا۔ میرے احساسِ محرومی مزید گہرا ہو گیا۔ بالآخر میں اس قدر دل برداشتہ ہوئی کہ پورے ایک سال تک دنیا پر نکل گئی۔ جب میں نے دنیا دیکھی تو پتہ چلا کہ زندگی کس قدر حسین ہے۔ اور جتنی حسین، اتنی ہی بھی۔ مگر یہ سنگینی بھی خود انسان ہی اپنے اوپر طاری کر لیتا ہے۔ اصل زندگی، جس میں ایک الوہی راز پنہاں ہوتا ہے، وہ محض دوسروں کے کام آنے میں ہی ہے۔ دوسروں کے کام آنا، دوسروں کے بھلائی کرنا، دل و جان کو کس قدر تسکین پہنچاتا ہے۔ بس نادر صاحب! میں اس تسکین کی بھوکی ہوں آپ کی مدد کرنے کے پیچھے درحقیقت میرا یہی جذبہ کارفرما ہے۔''

وہ اپنی رو میں جانے کہاں سے کہاں چلی گئی۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس کی باتیں سچی تھیں۔ ایک آزمائش اور پختہ تجربے کا نچوڑ تھیں۔ وہ اس وقت واقعی ایک عجیب لڑکی کے روپ میں نظر آ رہی تھی کے بیک وقت دو روپ تھے۔ ایک جذباتی و سنجیدہ جبکہ دوسرا کھلنڈرا اور لاابالی۔

''ارے.......... یہ میں کیا اول فول بک گئی۔'' وہ اچانک منفعل سی ہو کر بولی۔ ''میں آپ کو بہت جلد وہ اہم ثبوت بھی لا دوں گی جن کی بنا پر آپ رب نواز کے خلاف..........''

''کاشانہ صاحبہ!'' میں نے اچانک اس کی بات کاٹی اور گہری متانت سے بولا۔ ''آپ کے والد..... سوری، میرا مطلب ہے رب نواز کی اس دھمکی کے بعد یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ آپ اس سلسلے میں میرے ساتھ تعاون کر رہی ہیں۔ میں اس کی دھمکی کو اوّل تو درخورِ اعتنا سمجھتا ہی نہیں ہوں لیکن اب میرا ضمیر یہ گوارا نہیں کرے گا کہ میں سوتیلے باپ بیٹی کے ذاتی عناد سے فائدہ اٹھا کر اپنا اُلّو سیدھا کرنے کی کوشش کروں۔ لہٰذا میں اب آپ سے گزارش کروں گا کہ آپ اس معاملے سے الگ ہو جائیں۔ میں اب خود رب نواز کے حلق میں ہاتھ ڈال کر ساٹھ لاکھ کی رقم وصول کروں گا۔''

میں نے دیکھا، میری اس بات پر کاشانہ کے دلکش چہرے پر غیر مرئی سا رنگ آ کر گزر گیا۔ اس کی بڑی بڑی کجراری آنکھوں کی جھیل میں اُداس چاند کا عکس جھلملانے لگا تھا۔ اسی اثناء میں ایک ملازم چائے اور بسکٹ لے آیا۔

ہم دونوں خاموشی سے چائے پینے لگے۔

''آپ نے میری بات کا برا تو نہیں منایا کاشانہ صاحبہ؟'' میں نے معاً اس کے خاموش اور پھیکے پڑتے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا تو وہ بے تاثر مسکراہٹ سے بولی۔

''نہیں نادر صاحب! میں آپ کی بات کا مطلب سمجھ گئی ہوں اس لئے اب اصرار بھی نہیں کر سکتی۔ بہرحال کبھی ضرورت پڑے تو مجھے یاد کر لیجئے گا۔ کیونکہ ایک انسان ہی دوسرے انسان کے کام آتا ہے۔ میں اب چلوں گی۔''

وہ یہ کہہ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میں بھی احتراماً اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو میں اسے باہر اس کی کار تک چھوڑنے آیا۔ پھر جب وہ جانے لگی تو بڑی گہری نگاہوں سے میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے عمیق لہجے میں بولی۔

''نادر صاحب! میں دعویٰ تو نہیں کرتی مگر میں نے ایک دنیا دیکھ رکھی ہے جس کا ماخذ یہی ملا کہ زندگی فقط انجوائے منٹ کا نام ہے۔ مجھے آپ کی آنکھوں میں اَن کہے درد کی کسک محسوس ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے آپ کے اندر ایک طوفان چھپا ہوا ہے۔ آپ ایسا کریں، کبھی میرے ہاں تشریف لائیں۔ دنیا کے آزاروں سے ہٹ کر ہم تھوڑا مل بیٹھ کر اچھا وقت گزاریں گے۔ پھر دیکھئے گا، آپ خود کو حالات کے سامنے نئے سرے سے تازہ اور پُرعزم محسوس کریں گے۔ کیونکہ ایک دوسرے سے گفتگو کرنے سے دل و دماغ کا بوجھ بھی تو ہلکا ہو جاتا ہے.......... اچھا، اب میں چلتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی کار کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہو گئی۔

اس کی باتوں میں مجھے انوکھا اور عجیب سا سحر محسوس ہوا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے مجھے ہپناٹائز کر دیا ہو۔ اس کی باتوں میں کچھ ایسا ضرور تھا، جس نے مجھے چند ثانیے کے لئے مبہوت کر کے رکھ دیا تھا۔

''سر جی! آپ تو گئے کام سے، جی کڑا کے۔''

کاشانہ کے کار ریورس کر کے لے جانے کے بعد میں وہیں کھڑا رہا تو اچانک نہ جانے کب منیجر شتاق میرے قریب آ کر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ میں ذرا چونکا، پھر اس کی طرف گھوم کر ''شٹ اپ'' کہا اور اپنے آفس کی طرف بڑھ گیا۔ وہ بھی میرے پیچھے پیچھے میرے آفس میں چلا آیا۔

''ویسے سر جی! یہ تھی کون، جی کڑا کے؟'' میرے چیئر پر براجمان ہوتے ہی وہ بھی سامنے کی کرسی بیٹھتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''یہ ٹھیکے دار رب نواز کی سوتیلی بیٹی کاشانہ تھی۔'' میں نے ہلکی مسکراہٹ سے کہا اور منیجر مشتاق کا م اس کی آنکھوں کی طرح کھلا رہ گیا۔ پھر اس کے بعد کسی مشین میں اٹکنے والی گراری دار آواز میں بولا۔

''س س......... سر جی! آپ سچ کہہ رہے ہیں، جی کڑا کے؟''

''بغیر جی کڑا کے سچ کہہ رہا ہوں، تمہیں شبہ ہے میری بات پر؟'' میں نے اسے گھورا۔

''ن ن......... نہیں، میں تو اس لئے پوچھ رہا تھا جی کڑا کے کہ وہ تو آپ سے یوں باتیں کر رہی تھ جیسے آپ دونوں میں بہت پرانی اور گہری شناسائی ہو، جی کڑا کے۔''

''ہاں......... مگر وہ اپنے سوتیلے باپ سے بالکل مختلف ہے۔''

''سر جی! کب سے آپ دونوں کے بیچ یہ سلسلہ چل رہا ہے؟'' اس نے تفتیشی انداز میں پوچھا۔

میں نے گھور کر اسے دیکھا۔ ''کیا مطلب؟''

''ج ج......... جی......... کچھ نہیں۔ بس ویسے ہی زبان پھسل گئی، جی کڑا کے۔'' وہ میرے تیور دیکھ بوکھلا گیا تھا۔

''تم مجھے ایک بات ذرا سوچ کر بتاؤ۔''

''جی سر جی! پوچھیں۔''

''جس روز رب نواز نے دیمک زدہ لکڑی بھیجی تھی، کون یہ مال لایا تھا؟''

''یہی گنگل خان لایا تھا ٹرک بھروا کر۔ اس وقت میں بھی موجود تھا۔''

''ماموں حیدر گل نے اسی وقت مال چیک کیا تھا یا بعد میں پتہ چلا تھا؟''

''او سر جی! آپ کے ماموں حیدر گل تو آنکھیں بند کر کے سب پر بھروسہ کر لیتے تھے۔ لیکن ان غیر موجودگی میں مال میں نے ہی اُتروایا تھا۔ اللہ جنت نصیب کرے مردان شاہ کو، اس نے تو اسی و چند شہتیر دیکھ کر ہی کہہ دیا تھا کہ یہ دیمک زدہ ہیں لیکن.........'' وہ کہتے کہتے رک گیا اور اس کا ندامت سے سرخ ہو گیا۔ میں نے سرسراتے لہجے میں اسے گھور کر کہا۔

''مشتاق! تم جھوٹ نہیں بولتے ہو اور میں سچ سننا چاہتا ہوں۔''

''ج ج......... جی سر جی! غلطی میری ہی تھی کہ میں نے اس وقت بے چارے مردان شاہ کی بات توجہ نہیں دی تھی اور سارا مال اُتروالیا تھا۔'' وہ منفعل ہو کر بولا۔

مجھے اس پر غصہ تو آیا لیکن اب کیا فائدہ؟ منیجر مشتاق ہمارا پرانا آدمی تھا اور بہت مخلص اور دیانت بھی۔ اس میں یقیناً اس کی بدنیتی کا دخل نہ تھا۔ تاہم وہ بے پرواہی کا ضرور مرتکب ہوا تھا۔ البتہ مردان شاہ کے ذکر پر مغموم ضرور ہوا تھا لیکن میں نے اس کے قاتل کالا ناگ کو بھی جہنم واصل کر مردان شاہ کے خون کا حساب برابر کر دیا تھا۔

چونکہ مردان شاہ نے میری خاطر اپنی جان کی قربانی دی تھی اور وہ اپنے بوڑھے باپ اور ایک بہ واحد سہارا تھا۔ اس لئے میں اس کی قربانی کے بعد اس کے باپ اور بہن کو ہر مہینے اتنی معقول رقم بھیج کرتا تھا جس سے ان دونوں باپ بیٹی کی گزر اوقات اچھی طرح ہونے لگی تھی۔ یہی نہیں، میں نے مر شاہ کی جوان بہن کی شادی کا بندوبست اور اس مد میں ہونے والے متوقع اخراجات کا ذمہ بھی اپ لے رکھا تھا۔

یہ سارے انتظامات میں نے منیجر مشتاق کے سپرد کر رکھے تھے۔ میرے اس فعل سے ٹال کے دیگر ردوں پر بہت اچھا اثر پڑا تھا اور وہ مجھے اپنا ہی سمجھنے لگے تھے۔

بہرطور میں نے منیجر مشتاق کو رخصت کیا اور اس گرے کار والوں کے متعلق سوچنے لگا جنہوں نے اں تک میرا تعاقب کیا تھا۔ نہ جانے یہ کون لوگ تھے؟ اور ان کا میرے کس دشمن سے تعلق تھا؟......... ٹل گیٹ پر موجود میرے گن بردار گارڈ کے مطابق وہ مقامی ہرگز نہیں لگتے تھے۔ میں نے سوچا، کہیں سا تو نہ تھا کہ اپنے جوڑی دار شاہ میر کا عبرت ناک انجام دیکھنے کے بعد نظر حیات نے کسی اور علاقے لوگوں کو میرے پیچھے لگا رکھا ہو۔ ایک خیال اشفاق شاہین کی طرف بھی جا رہا تھا۔ مگر مجھے اس کی ب سے یوں فوری ردعمل کی توقع نہ تھی۔ تو پھر یہ کون لوگ تھے؟......... اچانک میرے ذہن میں جھماکا ہوا۔ کیلاش وادی کی پُرخطر اور جاں گسل مہم کا خیال اُبھرا اور عامل عاروب کی مکروہ صورت ری نگاہوں میں گھوم گئی جسے میں نے گولی مار دی تھی مگر مجھے اب تک یہ معلوم نہ تھا کہ وہ زندہ تھا یا عدم د مرسل ہو چکا تھا۔

میں نے رسٹ واچ میں وقت دیکھا، شام کے پانچ بجنے والے تھے۔ میں نگینہ کو ایک پل کے لئے نہیں بھولا تھا۔ میں نے امریکہ اور پاکستان کے وقت کا اندازہ کیا اور نگینہ سے موبائل پر رابطہ کرنے کی ش کرنے لگا لیکن رابطہ ممکن نہ ہو سکا۔ کبھی ٹون بگڑ رہی تھی تو کبھی نیٹ ورک کام نہیں کر رہا تھا۔ میں ان اور متفکر ہو گیا۔ ساتھ ہی مجھے یہ پچھتاوا بھی ہونے لگا تھا کہ کاش میں اس کی ورجینیا (واشنگٹن) آنٹی کی رہائش گاہ کا فون نمبر ہی لے لیتا۔ میں نے چند گھنٹوں بعد ٹرائی کرنے کا سوچ کر موبائل اپنی میں ڈالا اور پھر جیپ میں بیٹھ کر ٹال سے روانہ ہو گیا۔

ٹال سے گرین لاج کی طرف روانہ ہوتے وقت میرا دل و دماغ نگینہ کی طرف اُلجھا ہوا تھا۔ شام ری ہونے لگی تو مال روڈ سے میں نتھیا گلی کی طرف مڑا اور بتدریج جیپ کی رفتار بڑھا دی۔

مجھے گرین لاج پہنچنے سے پہلے ماں کو انکل اعظم خان کے گھر سے لینا تھا اس لئے میرا رخ انہی کی ش گاہ کی طرف تھا۔ وہاں پہنچا تو مجھے پتہ چلا کہ ماں مجھ سے پہلے ہی گرین لاج جا چکی تھیں۔ مجھے ت تو ہوئی۔ اعظم خان بھی گھر پر نہ تھے۔ ان کے ملازم سے معلوم ہوا کہ وہی ماں کو ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے کار میں گرین لاج چھوڑنے گئے تھے اور پھر واپس نہیں لوٹے تھے۔

میں واپس پلٹا۔ اب میرا رخ گرین لاج کی طرف تھا۔ سڑک دور تک ویران تھی۔ میں خاصی تیز ری سے جیپ دوڑائے جا رہا تھا۔ اطراف کے پیڑوں پر کجراری شام اُترنے لگی تھی۔ فضا میں سرد بھی اُتر آئی تھی۔ میں نے کھڑکیوں کے شیشے چڑھا رکھے تھے۔ البتہ اندر ہیٹر جلانے کی ضرورت ں نہیں کی تھی۔

موڑ کاٹتے ہی اچانک مجھے بریک پیڈل پر پاؤں رکھنا پڑا۔ اگر میں موڑ کاٹتے ہی بروقت بریک نہ تو میری جیپ کا سامنے سڑک پر ترچھی کھڑی اس کار سے تصادم ہونا لازمی تھا۔ جیپ کے ٹائر زوردار سے چرچرائے اور وہ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ میں نے سامنے راستہ روکے ترچھی کار پر اپنی نظریں یں۔ کار کو دیکھ کر میری رگوں میں خون کی گردش یکلخت تیز ہو گئی۔ یہ وہی گرے کلر کی کار تھی جس نے عاقب کیا تھا۔ مگر مجھے اس کے اندر کوئی دکھائی نہیں دیا۔ ایکا ایکی مجھے خطرے کی بو محسوس ہوئی......... لمحے کو ذہن میں خیال اُبھرا کہ ایکسیلیٹر دبا کر اور کار کے عقبی حصے کو کھدیڑتا ہوا نکل جاؤں مگر میں یسا نہیں کیا اور پھرتی کے ساتھ اپنی جیب سے میگا زنکال کر ہاتھ میں پکڑا اور دروازہ کھول کر باہر اُتر

آیا۔ چہار سُو دھڑکتی ہوئی اسرار بھری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ دفعتہً ایک ٹھوس شے میرے پستول
ہاتھ سے ٹکرائی اور میگارد میرے ہاتھ سے چھوٹ کر سڑک پر جا گرا۔ میں نے ابھی سنبھلنے کی کوشش
تھی کہ معاً دو افراد دائیں بائیں کی تاریک جھاڑیوں سے نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں
ہوئے پستول نظر آ رہے تھے۔ میرے ہاتھ پر لگنے والا پتھر سڑک پر پڑا تھا جو یقیناً انہی دو میں
شناخسانہ ہو سکتا تھا۔

''خبردار!.........کوئی حرکت مت کرنا۔ ورنہ گولیوں سے بھون کر رکھ دیا جائے گا۔'' ان دو
ایک نے کرخت آواز میں کہا۔ میں بہ غور ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ یہ دونوں درمیانے قد کے مگر مض
تنومند نظر آتے تھے۔ یہ مجھے کہیں سے بھی مقامی محسوس نہیں ہوئے۔ ان کی رنگت سرخ و سپید تھی
دھنسی ہوئی آنکھوں میں غضب کا کینہ بھرا ہوا تھا جن میں حد درجہ خونخواری کی چمک ہلکورے لے
انہوں نے شلوکے دار شلوار قمیضیں پہن رکھی تھیں۔

''کون ہو تم لوگ؟'' میں نے ایک سے درشت لہجے میں پوچھا۔

''سوال کرنے کا کوئی حق نہیں تمہیں۔'' دوسرے نے خونخوار لہجے میں غرا کر کہا۔ ''چلو.........
بیٹھو۔''

''ٹھیک ہے......... میں تمہاری بات مان لیتا ہوں۔'' میں نے چالاکی سے نرم پڑتے ہو
''مگر کم از کم مجھے اتنا تو بتا دو کہ تمہاری مجھ سے آخر کیا دشمنی ہے؟ ہو سکتا ہے، تم لوگوں کو میرے
میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہو؟''

میری بات پر پہلے والے نے دانت پیس کر انتہائی زہریلے لہجے میں کہا۔ ''ہم دشمنوں کو پہچان
معاملے میں کبھی غلطی نہیں کرتے ہیں۔ کاش ہمیں تمہیں دیکھتے ہی گولی مار دینے کا حکم ہوتا تو آج
سانس نہیں لے پاتے......... چلو اب۔'' مجھے یہ سن کر تسلی ہوگئی کہ کم از کم ان کا مجھے فوری طور
کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ میں نے ذرا ہمت کر کے دوبارہ کہا۔ ''لیکن تم نے ابھی تک میرے
جواب نہیں دیا۔''

''ہیتو!......... یہ ایسے نہیں مانے گا۔'' دوسرے نے دانت پیس کر اپنے ساتھی سے کہا اور ا
سے ہتھکڑی نما حلقے دار زنجیر نکال لی۔ مجھے دونوں ہاتھ پشت پر کرنے کا درشتی سے حکم دیا جبکہ پہلے
سے دس بارہ قدموں کے فاصلے پر اپنا پستول تانے چوکس کھڑا تھا جس کا نام ہیتو تھا۔ یہ نام بھی
صورتوں کی طرح غیر مقامی محسوس ہوا تھا۔

''ہیتو! اگر یہ ذرا سی بھی چالاکی کرے تو اس کی ٹانگ پر گولی چلا دینا۔'' ہتھکڑی بہ دست
پستول بردار ساتھی سے کہا۔ یہ دونوں میری سوچ سے بڑھ کر چالاک اور محتاط تھے۔ میں نے نا
دونوں ہاتھ پشت کی طرف کر دیئے۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ پھر جیسے ہی وہ شخص ہتھ
میری پشت کی جانب بڑھا اور مجھے ہتھکڑی پہنانے لگا تو میں نے پل کے پل دونوں کی پوز
اندازہ کیا۔ اور پھر جیسے ہی میرے عقب والے نے مجھے ہتھکڑیاں پہنانے کے لئے میرے ہاتھ
میں نے اپنے دائیں ہاتھ کی پوری قوت کے ساتھ اس کا ہاتھ پکڑ کر بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ ا
کر اپنی ڈھال بنا لیا۔ ہیتو نے گولی چلا دی۔ مجھے چونکہ ''ٹارگٹ'' کا پیشگی علم تھا اس لئے میں
ہی اپنی دونوں ٹانگیں پھیلا دی تھیں۔ نتیجتاً گولی ہتھکڑی والے کی ٹانگ پر پیوست ہو گئی۔ اس
سے چیخ خارج ہوئی مگر میں نے اسے بدستور ڈھال بنائے رکھا۔ ہیتو نامی وہ شخص مارے طیش

پستول مجھ پر تانے میری جانب بڑھا۔ مگر میں نے اس کے دوسرے ساتھی کی گردن کے گرد اپنے دائیں
بازو کا آہنی شکنجہ کس لیا تھا۔

''رک جاؤ......... ورنہ تمہارے اس ساتھی کی گردن توڑ ڈالوں گا۔'' میں نے وحشت ناک لہجے میں
ہیتو کو گھورتے ہوئے کہا اور وہ ہکا بکا سا وہیں کھڑا رہ گیا۔ پھر دوسرے ہی لمحے میری گدی سے ایک سرد
نال آ لگی اور ساتھ ہی سرسراتے لہجے میں کسی نے عقب سے مجھے مخاطب کر کے کہا۔

''نادر!.........اس کو چھوڑ دو۔ ورنہ آج میں تمہارا قصہ پاک کر کے ہی رہوں گا۔''

یہ آواز میری شناسا تھی۔ جسے سن کر میرے اندر مہیب سناٹے چیخنے لگے.........!



یہ آواز کبیر کی تھی......... وہی کبیر، جو میرا زبردست رقیب بھی تھا اور جانی دشمن بھی۔ اس کی اچانک اور بالکل ہی غیر متوقع موجودگی پر ایک لمحے کو میں ساکت ہو کر رہ گیا تھا۔

''شاید میری آواز پہچان گئے ہو؟'' عقب سے اور بالکل قریب ہی اس کی استہزائیہ آواز اُبھری۔ میں نے ہیتو نامی شخص کے اس ساتھی کی گردن چھوڑ دی، جس کی ٹانگ پر اس کے اپنے ہی ساتھی کے پستول کی گولی لگی تھی۔ چنانچہ میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنے دائیں پاؤں کی ایڑھی پر گھو اپنے بائیں بازو کی کہنی پوری قوت سے کبیر کے بائیں پہلو میں رسید کر ڈالی۔ اس کے لئے یقیناً اچانک ثابت ہوا تھا۔ نتیجتاً وہ اپنے حلق سے بھیانک کراہ خارج کرتے ہوئے بے اختیار دُہرا تکلیف کی شدت کی وجہ سے اس کے ہاتھ سے پستول بھی چھوٹ کر گر پڑا تھا۔

میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر ہی ایک زوردار گھونسا اس کے جھکے ہوئے چہرے پر بھی دیا۔ ادھر ہیتو نے چلاّ کر اپنے زخمی ساتھی کو میرے سامنے سے ہٹ جانے کا کہا۔ اس کے ہاتھ میں تک پستول دبا ہوا تھا۔ اگر اس کا زخمی ساتھی میرے آگے سے ہٹ جاتا تو ہیتو یقیناً بلا تاخیر مجھ پر ف دیتا۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں، میں نے صورتِ حال کا تجزیہ کیا اور دوبارہ بجلی کی سی تیزی کے حرکت میں آ گیا۔

میں نے اس کے زخمی ساتھی کو نہ صرف دوبارہ دبوچ لیا بلکہ اسے اپنی ڈھال بنائے بنائے قر سڑک پر پڑے کبیر کے پستول پر گرا اور بہ سرعت پستول اچک کر لیٹے لیٹے بلا توقف ہیتو پر گولی چ وہ کراہت انگیز چیخ کے ساتھ سڑک پر گرا۔ میں اپنے میگارد کی طرف لپکا۔ میں ہیتو کو کوئی موقع نہ چاہتا تھا۔ وہ زخمی ہونے کے باوجود اپنے ہاتھ میں موجود پستول سے میرا نشانہ لینا چاہتا تھا۔ مگر بدن میں گویا برقی رو دوڑ رہی تھی اور میں خود بھی برق کی مانند حرکت میں تھا۔ اس سے پہلے کہ باندھتا، میں دوڑتا ہوا عین سر پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے اس کے پستول والے ہاتھ پر پاؤں کی ٹھوکر دی۔ پستول سڑک پر پھسلتا ہوا کچے میں اُگی خودرو تاریک جھاڑیوں میں جا پڑا۔

اب میرے دونوں ہاتھوں میں پستول تھے۔ دائیں ہاتھ میں میرا میگارد تھا جسے میں نے فوراً جیب میں اڑس لیا تھا اور کبیر والا پستول ان پر تان لیا۔ ہیتو کو میں ''خبردار'' کر چکا تھا جبکہ کبیر دوسرا ساتھی سنبھلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے انہیں ساکت ہو جانے کا حکم دیا۔

ہیتو ابھی تک سڑک پر اوندھے منہ پڑا کراہ رہا تھا۔ میری چلائی ہوئی گولی اس کے بائیں پیوست ہو گئی جہاں سے خون کا اخراج جاری تھا۔ جبکہ کبیر کی ناک سے بہنے والا خون اس کے مزید بھیانک بنائے دے رہا تھا جسے وہ اپنے رومال سے روکنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ باوجود ان دونوں کی قہرناک نگاہیں میری جانب مرکوز تھیں۔ میرا اور ان دونوں کا فاصلہ زیادہ طو محض ... کا ہی فاصلہ تھا۔ چنانچہ میں نے کبیر کو شعلہ بار نظروں سے گھورتے ہوئے کہا

میں پوچھا۔

''کبیر! یہ دونوں کون ہیں؟ اور مجھے یہ یرغمال کیوں بنانا چاہتے تھے؟''

''میں نہیں جانتا.........'' کبیر نے نہایت غصیلے انداز میں جواب دیا اور اس کے پستول کی لبلبی پر میری انگلی نے یکدم جنبش کی۔ رات کے تاریک اور دم بہ خود سناٹے میں گولی کی دھماکے دار آواز اُبھری اور وہ کبیر کے پیروں کے بالکل قریب سڑک پر چنگاری چھوڑتی ہوئی اچٹ گئی۔ کبیر بے اختیار خوف زدہ ہو کر اچھل پڑا۔

''جھوٹ نہیں چلے گا کبیر!'' میں غصے سے دانت پیس کر دھاڑا۔ ''تمہیں میرے ہاتھوں کالا ناگ کا انجام تو یاد ہے نا.........مگر اب میں تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' میرے لہجے کی خوف ناک گھن گرج نے اس پر خاطر خواہ اثر کیا اور وہ بولا۔

''ان دونوں کا تعلق کیلاشی عامل عاروب سے ہے اور یہ لوگ اس کا انتقام لینے کے لئے تمہیں یرغمال بنا کر کیلاش وادی لے جانا چاہتے تھے۔''

اس کی بات پر مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ میں نے پوچھا۔ ''مگر وہ تو مر چکا تھا؟''

''نہیں.........'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

''تو گویا ان لوگوں سے اپنی جاں بخشی کا معاہدہ کرتے ہوئے تم نے مجھے یرغمال بنانے کے سلسلے میں ان کی مدد کی ہے اور یہاں تک ان کی رہنمائی بھی کی۔'' میں نے زہریلے لہجے میں اس سے کہا تو وہ نہایت ڈھٹائی آمیز صاف گوئی سے بولا۔

''ظاہر ہے۔ اور میں کیا کرتا؟.........جب تم نے ان کی خانقاہ میں خون ریزی پھیلائی تھی اور کالا ناگ کو ہلاک اور عامل عاروب کو زخمی کر کے نگینہ کے ساتھ فرار ہو گئے تھے تو مجھے ان لوگوں نے پکڑ لیا تھا۔ یہ تو شکر رہا کہ مشتعل ہو کر عاروب کے پیروکاروں نے مجھے ہلاک نہیں کیا۔ کیونکہ وہ میرے ذریعے تم اور نگینہ تک پہنچنا چاہتے تھے۔''

''نگینہ.........'' میں زیرِ لب سوالیہ انداز میں بڑبڑایا۔ ''نگینہ سے بھلا ان کی کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟'' میں نے کسی قدر اُلجھن آمیز پریشانی سے کہا۔

''اس لئے کہ عامل عاروب کے پیروکار اسے اپنے مقدس دیوتا دابولامینزی پر قربان کرنے کا پختہ عزم کر چکے ہیں۔'' اس نے بتایا اور یہ بتاتے ہوئے اس کے لہجے سے مجھے غضب کا کینہ ٹپکتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

''ہوں.........''

میں نے ایک گمبھیر اور پُرسوچ ہنکاری لی۔ اب میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میرے جی میں تو آئی کہ ان تینوں کو اسی وقت جہنم واصل کر ڈالوں۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور کبیر سے بولا۔

''کبیر!.........میں تمہیں اس بار چھوڑ رہا ہوں۔ لیکن اگر تم نے دوبارہ میرے راستے میں آنے کی کوشش کی یا نگینہ کے سلسلے میں ان خبیثوں کی مدد کرنا چاہی تو یاد رکھنا، مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔'' یہ کہہ کر میں ہیتو کے زخمی ساتھی سے غضب ناک غراہٹ کے ساتھ بولا۔

''اور تم.........اپنے اس کتے عامل عاروب کو جا کر بتا دینا، اگر اس نے نگینہ کا بال بھی بیکا کرنے کی کوشش کی تو میں اسے وہیں آ کر کتے کی موت ماروں گا۔ اب تم اپنے ساتھی کو اٹھاؤ اور میرا پیغام لے کر اسی وقت کیلاش دفع ہو جاؤ۔ دوبارہ نظر آئے تو میں کوئی رعایت نہیں برتوں گا۔''

میرے انداز اور دوٹوک رویے پر وہ دونوں مجھے خونخوار نظروں سے گھورنے لگے تھے۔ ان کا بس چل رہا تھا کہ وہ مجھے کچا چبا جاتے۔ اپنی بات مکمل کر کے میں نے کبیر کے پستول سے گولیاں نکال کر طرف تاریک جھاڑیوں میں اچھال دیں اور پستول سڑک پر پھینک کر اپنی جیپ کی طرف بڑھ گیا۔

ذرا دیر بعد ہی میں گرین لاج کی طرف روانہ ہو رہا تھا۔

***

گرین لاج پہنچا تو میں نے سکینہ سے پہلے ماں کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ بی بی کھانا کھا کر اپنے کمرے میں سو رہی ہیں۔ میرے دل کو گھونسہ لگا۔ کیونکہ اس سے پہلے کبھی ماں میرے بغیر کھانا نہیں کھایا تھا۔

''آپ کے لئے کھانا لگا دوں چھوٹے صاحب؟'' سکینہ نے مؤدبانہ انداز میں پوچھا۔

''نہیں......... مجھے بھوک نہیں ہے۔''

میں نے کہا اور اپنے کمرے میں آ کر بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ ماں کے روز بروز بڑھتے ہوئے رویے نے مجھے خاصا اعصاب زدہ کر دیا تھا۔ میں موجودہ حالاتِ دگرگوں کی کشاکش سے اس قدر متاثر ہوا تھا جتنا ماں کی طرف سے مجھے پریشانی اور تشویش لاحق تھی۔ میرا دل و دماغ گونا گوں آماجگاہ بنا تھا۔ نگینہ کی طرف سے الگ مجھے فکر تھی۔ وہ جانے کس حال میں ہو گی؟

اُدھر نظر حیات بھی دانت نکوسے ہوئے تھا۔ بد دیانت ٹھیکے دار رب نواز سے الگ میری چپقلش شروع ہو چکی تھی۔ جبکہ انڈر ورلڈ گینگسٹر اشفاق شاہین کو بھی میں نے اب غزالہ والے واقعے کے بعد اپنے پیچھے لگایا تھا اور اب کبیر اور کیلاشی عامل والا دیرینہ معاملہ اُبھر کر سامنے آ گیا تھا۔ پھر کبیر کی زبانی سنسنی خیز انکشاف کہ کیلاشی عامل عاروب اور اس کے پیروکار نہ صرف میری جان کے دشمن بن چکے بلکہ انہوں نے اپنے خود ساختہ دیوتا، داہولا مینزی کے آگے اب نگینہ کی قربانی دینے کا پختہ عزم کر لیا نگینہ کی طرف سے سردست مجھے اس حد تک تو اطمینان تھا کہ ابھی ان خبیث لوگوں کے ناپاک ہاتھ تک نہیں پہنچ سکتے۔ تھے کیونکہ وہ امریکہ جا چکی تھی۔

پریشان خیالات کا ایک جمگھٹا تھا، جس نے میرے دل و دماغ کو جھنجوڑ ڈالا تھا۔ حالات نے چومکھی جنگ میں دھکیل کر رکھ دیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پہلے کون سے معاملے میں ہاتھ ڈالوں، موخر کروں؟ جبکہ میرے ارد گرد دیدہ و نادیدہ دشمنوں کا ایک جال سا پھیلا ہوا تھا۔ ہر کوئی میری گھات تھا اور وار کرنے کا منتظر۔ ایک جنگ تھی جس کا کوئی بظاہر اختتام دکھائی نہیں دیتا تھا۔ سوچتے سوچتے میرے دماغ کی نسیں دُکھنے لگیں تو میں یکدم سارے پریشان کن خیالات ذہن سے جھٹک کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر نیند تھی جیسے میری آنکھوں کا راستہ ہی بھولے ہوئے تھی۔ میں بھی اس طرح بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور بالآخر اس طرح میں نے وہ رات گزار دی۔

صبح غسل وغیرہ کے بعد میں ناشتے کی میز پر پہنچا تو ماں بھی موجود تھیں۔ ماں نے مجھے ناشتے کا بھی نہیں بھیجا تھا۔ تاہم میں نے ماں کو ہولے سے سلام کیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر شاید شب گزشتہ تھکن اور بیداری کی جھلک میری نیم غنودہ آنکھوں سے محسوس کر کے ماں نے ہولے سے پوچھا۔

''نادر بیٹا! کیا ساری رات جاگتے ہی گزاری تھی؟''

''ہاں ماں!......... نیند نہیں آئی تھی۔'' میں نے بے خیالی میں کہہ ڈالا اور فلاسک سے اپنے ایک خالی کپ میں چائے انڈیلنے لگا۔

''کیا نگینہ یاد آ رہی تھی؟''

''ماں!......... کیا ہم کسی اور موضوع پر بات نہیں کر سکتے؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی بے اختیار میرے منہ سے ایسے چبھتے ہوئے الفاظ برآمد ہوئے تھے یا پھر شاید یہ شب بیداری کا چڑچڑا پن تھا۔

''بہت تلخ ہوتے جا رہے ہو تم۔ کیا اب مجھ سے بھی بات کرنا تمہیں برا محسوس ہونے لگا ہے؟'' ماں کے لہجے میں بھی چبھن تھی۔ میں نے چائے کا ایک گھونٹ بھر کر ماں کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر جیسے اچانک مجھے کچھ یاد آیا اور میں نے کہا۔

''ماں! ایک بات پوچھوں آپ سے؟''

''ہاں......... پوچھو!'' ماں نے بھی میرے چہرے پر اپنی نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے کہا۔

''ماں! آپ کو یاد ہو گا کہ ایک دن آپ نے مجھے بڑے ممتا بھرے پیار سے میری پیشانی پر بوسہ دے کر پوچھا تھا کہ نگینہ مجھے اچھی لگتی ہے اور میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو میں نے اس کا جواب اثبات میں دیا تھا اور آپ نے مجھ سے یہ خوش خبری نگینہ کو سنانے کے لئے بھی کہا تھا کہ آپ کو میری اور نگینہ کی شادی پر کوئی اعتراض نہ ہو گا بشرطیکہ نگینہ اپنے باپ شاہ میر کو بھی منائے؟''

''ہاں......... مجھے یاد ہے، اچھی طرح۔ اور آج بھی میں اپنی اس بات پر قائم ہوں۔'' میری بات مکمل ہوتے ہی ماں نے بغیر کسی تذبذب یا تردد کے کہا۔

''تو پھر ماں!......... یہ سب کیا ہے؟'' میں نے کرب ناک لہجے میں ان سے پوچھا۔

''کیا......... کیا ہے؟'' ماں نے تجاہل عارفانہ کا مظاہرہ کیا۔

''آپ کا دل ابھی تک نگینہ کی طرف سے صاف کیوں نہیں ہوا؟ اُلٹا آپ مجھ سے بھی بدظن ہونے لگی ہیں۔'' میں نے تکلیف زدہ لہجے میں کہا تو ماں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''نادر بیٹے! نگینہ کی طرف سے میرا دل کبھی صاف نہیں ہو سکتا۔ لیکن تمہاری اور نگینہ کی شادی پر میں معترض نہیں ہو سکتی اس لئے کہ مجھے تمہاری خوشی عزیز ہے۔ میں ان روایتی ماؤں میں سے نہیں ہوں جو اولاد کی خوشیوں کو اپنی ذاتی انا کی بھینٹ چڑھا دیتی ہیں اور پھر یہاں تو کسی انا کا سوال ہی نہیں۔ یہ تو ایک جنگ ہے......... حق اور انصاف کی جنگ......... جرم اور قصاص کی جنگ۔ ہاتھ کے بدلے ہاتھ اور جان کے بدلے جان.........'' ماں نے تھوڑا توقف کیا پھر دوبارہ بولیں۔ ''رہی یہ بات کہ میں تم سے بدظن ہوں تو یہ سراسر غلط ہے۔ بھلا ماں بھی اولاد سے ناراض یا بدظن ہو سکتی ہے؟ میں نے تو تم سے صاف اور سیدھی بات کی تھی جسے میں اب بار بار دہرانا نہیں چاہتی۔ ناشتہ کرو، ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ ہاں، تم آج ٹال پر نہ جانا چاہو تو کوئی بات نہیں، آرام کر لو۔''

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئیں۔

''ماں! ایک اور بات پوچھوں؟'' میں نے آخر میں کہا۔

''ہاں، پوچھو۔''

ماں نے اپنے لئے توس پر مکھن لگاتے ہوئے بظاہر سرسری لہجے میں کہا۔

''آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ میرے بارے میں آپ کوئی سخت فیصلہ کرنا چاہتی ہیں۔''

میری بات پر ماں کے توس پر مکھن لگاتے ہوئے ہاتھ ایک لمحے کو رک گئے۔ ان کی تیکھی نظریں میری جانب اُٹھیں۔ ہونٹوں کے گوشے کچھ بولنے کو کپکپائے۔ میں سرتاپا ان کا حکم سننے کو بے چین تھا۔ انہوں نے بولنے کے لئے لب کھولے مگر دوسرے ہی لمحے سختی سے بھینچ لئے۔ ایک لمحے بعد پُرسکون انداز

میں گویا ہوئیں۔

''ہاں......... مجھے یہ بھی یاد ہے مگر......... نگینہ کی امریکہ سے آمد تک میں نے اپنا یہ فیصلہ محفوظ کر دیا ہے۔''

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں ماں! کہ وہ کڑا فیصلہ کیا ہوسکتا ہے؟'' میں نے بھی پوچھ ہی لیا۔

''ابھی میں بتانے کی ضرورت نہیں سمجھتی۔''

یہ کہہ کر انہوں نے سکینہ کو آواز دی اور اسے چائے گرم کرنے کا کہا۔ پھر توس کھانے کے دوران اخبار کا مطالعہ کرنے لگیں۔ اس کے بعد پورے ناشتے کے دوران ہمارے درمیان خاموشی رہی۔ ناشتے کے بعد میں اٹھا۔ تب بھی ماں کچھ نہ بولیں۔

میں نے جیپ کی چابیاں اٹھائیں اور جیپ میں بیٹھ کر ٹال کی طرف نکل گیا۔ ٹال پہنچا تو ایک سیاہ رنگ کی ہنڈا سٹی کار کو کھڑے پایا۔ میں نے جیپ احاطے میں روکی اور نیچے اتر آیا۔ اسی وقت دفعتہً بوتل کے جن کی طرح منیجر مشتاق نازل ہوگیا۔ اس کے چہرے پر بارہ بج رہے تھے اور وہ خاصا گھبرایا ہوا نظر آتا تھا۔ میرے قریب پہنچتے ہی وہ بوکھلائی ہوئی آواز میں بولا۔

''سس......... سر جی! وہ......... وہ آیا ہے......... جی کڑا کے......... ٹھیکے دار رب نواز۔ اس کے ہمراہ وہی دو غنڈے بھی ہیں جو پہلے.........''

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا، میں اس کی بات کو نظر انداز کرتا اپنے آفس میں داخل ہوا۔ میرے عقب میں میرے دو مسلح محافظ اور چھ سات مزدور بھی کسی متوقع بدمزگی کے پیش نظر چلے آئے تھے۔ مگر میں نے انہیں وہیں سے واپس لوٹا دیا۔

اندر ایک کرسی پر ٹھگنے قد کا بدوضع شخص سیاہ کوٹ پینٹ میں ملبوس براجمان تھا۔ اس کے برابر والی کرسی پر گگل خان بھی بیٹھا تھا۔ جبکہ اس کے دونوں ساتھی ان کے عقب میں کھڑے تھے۔ یہ تینوں وہی بدمعاش تھے جو ایک دو روز پہلے مجھے دھمکانے آئے تھے اور منہ کی کھا کر واپس لوٹنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ جبکہ بہ قول منیجر مشتاق کے سوٹڈ بوٹڈ بدوضع سا شخص ٹھیکے دار رب نواز ہی تھا۔ مگر میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر اس کے قریب بیٹھے گگل خان کو گھورتے ہوئے پُرطیش لہجے میں کہا۔

''تم نے یہاں آنے کی جرأت کیسے کی؟ گیٹ آؤٹ......... گیٹ لاسٹ۔''

اس کا چہرہ غصے سے بگڑ گیا مگر رب نواز نے فوراً مداخلت کرتے ہوئے گمبھیر لہجے میں مجھ سے کہا۔

''نادر علی! آرام سے بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔ تم بیٹھو۔''

''میں کہتا ہوں تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ میں کوئی بات نہیں کروں گا۔'' میں نے پھر ٹھیکے دار رب نواز کو نظر انداز کرتے ہوئے گگل خان کو مخاطب کرتے ہوئے بلند لہجے میں کہا تو ٹھیکے دار رب نواز نے بالآخر تینوں کو وہاں سے باہر نکل جانے کا اشارہ کیا۔

گگل خان مجھے جلتی سلگتی نظروں سے گھورتا ہوا اپنے دونوں ساتھیوں سمیت میرے آفس سے باہر نکلتا چلا گیا۔ اس کے بعد میں تضحیک آمیز ہنکارا بھرتے ہوئے اپنی بھاری بھر کم چیئر پر بیٹھنے کے بعد سامنے بیٹھے ٹھیکے دار رب نواز سے دانستہ سرد لہجے میں بولا۔

''آپ کی تعریف؟''

''میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم میرے آدمی گگل خان کو دیکھ کر سمجھ چکے ہو گے......... خیر، بتائے دیتا ہوں۔ میرا نام رب نواز ہے۔ ٹھیکے دار رب نواز۔ جس کے شیشم اور شاہ بلوط کے ٹرک تم نے دھوکے سے

ہتھیا لئے ہیں۔''

''میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا۔'' میں نے پُرسکون انداز میں جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی میری کوشش تھی کہ میرے تاثرات سے اُلجھن کا اظہار بھی ہو۔ پتہ نہیں میں اس میں کامیاب رہا یا نہیں۔ جواباً وہ ایک زہریلی مسکراہٹ سے بولا۔

''اتنے انجان نہ بنو میاں نادر!''

میں نے بھی سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''وہ چاروں ٹرک تمہارے یہ تینوں کتے لے کر خود آئے تھے جو ابھی باہر گئے ہیں۔'' میرا اشارہ گگل خان اور اس کے دو ساتھیوں کی طرف تھا۔

''وہ دھوکے سے یہاں لے آئے تھے۔'' وہ بولا۔

''تم نے بھی مجھے جھوٹ بول کر دھوکا دینے کی کوشش کی تھی کہ وہ ٹرک حویلیاں کے ٹوٹے ہوئے پل کے قریب پھنس چکے ہیں۔ اور ہاں......... میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ جب تمہیں ہم نے پیشگی پے منٹ کر دی تھی تو ان ٹرکوں پر ہمارا ہی حق بنتا تھا۔ پھر تمہیں آخر اتنی پریشانی کیوں ہو رہی ہے؟''

میری بات پر وہ لاجواب سا نظر آنے لگا مگر دوسرے ہی لمحے ڈھٹائی سے بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ مگر تمہارے والے ٹرک میں کچھ دنوں بعد پہنچا دیتا۔ لیکن تم سے پہلے جس پارٹی نے مجھے پیشگی رقم دی تھی، انہیں.........''

''دیکھو رب نواز! مجھے تمہارے لہجے سے بددیانتی کی بُو آ رہی ہے۔ تم نے ہمیں مقررہ وقت پر مال دینے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ ہم نے بھی تو آخر دوسری پارٹی کو بروقت مال پہنچانا تھا۔''

وہ میری دوٹوک گفتگو پر جزبز ہوئے بغیر بولا۔ ''ٹھیک ہے، میں اپنا قصور مانتا ہوں۔ اب ایسا کرو مجھے ان دونوں ٹرکوں کا مال واپس لوٹا دو۔ میں چند دنوں کے اندر اندر تمہیں تمہارا مال پہنچا دوں گا۔''

مجھے اس کی بات پر بری طرح طیش آ گیا اور طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''جس طرح تم نے میرے ماموں حیدر گل کو مال پہنچایا تھا......... دیمک زدہ؟''

''ان کی بات چھوڑو۔ وہ پرانی بات ہوگئی۔''

''وہی پرانی بات اب نئی ہوگئی ہے ٹھیکے دار رب نواز!'' میں نے اسے گھورتے ہوئے دانت پیس کر کہا۔ ''اچھا ہوا تم آ گئے۔ ورنہ میں خود تمہارے پاس ساٹھ لاکھ کے مال کے سلسلے میں آ رہا تھا جو تم نے آج سے کچھ مہینے پہلے میرے ماموں مرحوم حیدر گل کو دیمک زدہ لکڑی کی صورت میں پہنچایا تھا۔''

میری بات نے اس کے چہرے کے تاثرات کو مزید بگاڑ دیا تھا۔

''نادر میاں! اس معاملے کو بھول.........''

''نہیں بھولوں گا ٹھیکے دار رب نواز! تمہیں ہر قیمت پر وہ ساٹھ لاکھ مجھے ادا کرنے ہوں گے۔'' میں اس کی بات کاٹ کر ٹھوس لہجے میں بولا۔

''میں تمہارے پاس اپنے دو ٹرکوں کی واپسی کے سلسلے میں آیا ہوں۔''

''انہیں بھول جاؤ اور میرے ساٹھ لاکھ دینے کی بات کرو۔''

وہ میرے مسئلے کو خاطر میں نہیں لا رہا تھا اور میں اس کے مسئلے کو۔ اور حق بجانب تو بہرحال میں ہی تھا۔ وہ دانت کچکچا کر بھناتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میں اچھی طرح جانتا ہوں، تم کس کے بل بوتے پر اتنا اکڑ رہے ہو؟......... نگر کاشانہ ایک بے وقوف اور غیر سنجیدہ لڑکی ہے۔ اس کے کہنے پر چلو گے تو کسی دن منہ کی کھاؤ گے۔''

میرے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ اُبھر آئی۔ اور پھر میں اسی لہجے میں اسے برماتی ہوئی نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

"رب نواز! جنگ اور محبت میں سب جائز ہے۔ تم نے بڑی مکاری سے میرے ماموں حیدر ساٹھ لاکھ کا دھوکا دیا اور اب پینتیس لاکھ کے قریب مجھ سے بھی ہتھیانا چاہتے تھے۔ میں اب ساٹھ لاکھ تمہارے حلق سے برآمد کرنے والا ہوں۔"

میری چبھتی گفتگو پر وہ چند ثانیے اپنی آنکھیں سکیڑے سنسنی خیز نظروں سے میری طرف گھورتا رہا۔ ایک سرسراتی ہوئی ہمکاری خارج کرتے ہوئے مجھ سے بولا۔

"نادر میاں! تو گویا تم میرا مال واپس نہیں کرو گے؟"

"بالکل نہیں......... بلکہ اب تم میرے ساٹھ لاکھ دینے کی بات کرو۔" میں نے بھی سرسراتے میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"تمہارا ٹال اپنے بطن میں ایندھن سموئے ہوئے ہے۔ جسے آگ پکڑنے میں ایک لمحے کی بھی نہیں لگے گی۔" وہ بالآخر دھمکیوں پر اُتر آیا۔ مجھے طیش تو آیا مگر میں ضبط سے کام لے کر استہزائیہ ساتھ بولا۔

"ہاں .... یہ بالکل ممکن ہے۔ تم نے اچھا کیا، مجھے پہلے سے بتا دیا تاکہ اپنے ٹال میں لگنے کے بعد میں اِدھر اُدھر بھٹک کر وقت ضائع کرنے کی بجائے تمہارے نتھیا گلی والے دفتر سمیت تمہارے عالی شان محل نما کوٹھی کی طرف اپنی ٹال کی آگ کا رخ موڑ سکوں۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔ اب تم جا ہو۔ لیکن میرے ساٹھ لاکھ روپے ذہن میں رکھنا۔" میری بے نیازی اور دھمکی کے جواب میں دھمکی کے وہ مزید بھنایا ہوا نظر آنے لگا تھا۔

"میں تم سے نمٹ لوں گا۔" وہ دانت پیس کر اُٹھتے ہوئے بولا۔

"شیور!" میں نے قہقہہ مار کر کہا۔ "میں منتظر ہوں۔"

وہ غصے سے پاؤں پٹختا ہوا میرے دفتر سے نکلتا چلا گیا۔ اس کے روانہ ہوتے ہی منیجر مشتاق داخل ہوا اور اپنی عرق آلود پیشانی صاف کرتے ہوئے مجھ سے اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

"شکر ہے سر جی! یہ بلا ٹلی۔ ورنہ تو آج یہاں اکھاڑا ہی لگ گیا تھا۔"

"خاطر جمع رکھو منیجر! .... یہ بلا ٹلی نہیں ہے۔ اب تو یہ نازل ہوتی رہے گی۔" میں نے زہر مسکراہٹ سے کہا۔

"اچھا سر جی!" وہ کچھ نہ سمجھنے کے سے انداز میں اپنے دیدے گھماتے ہوئے بولا۔

میں نے کرسی سے پشت ٹکا لی اور ان ساٹھ لاکھ کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں اسے مزید تاؤ دلا چاہتا تھا۔ اچانک مجھے کاشانہ کا خیال آ گیا۔ اگرچہ میں نے اس سلسلے میں کسی قسم کی مدد لینے سے انکا دیا تھا اور میں اپنی بات پر قائم بھی تھا۔ مگر اتنا تو میرا حق بنتا ہی تھا کہ میں رب نواز جیسے دھوکے باز فریبی انسان کے سینے پر مونگ دل سکوں۔ کاشانہ گزشتہ دن ہی مجھ سے دفتر میں مل کر گئی تھی۔ بڑی عجیب وغریب گفتگو کے بعد مجھے اپنے ہاں آنے کی دعوت بھی دی تھی......... مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ اس کی باتیں مجھے جتنی عجیب لگتی تھیں، اتنی ہی پُرکیف بھی محسوس ہوتی تھیں جو میرے درماندہ دل کو تسکین تھیں۔ میں نے اپنی جیب سے موبائل نکالا اور کاشانہ کا نمبر پنچ کرنے سے پہلے منیجر مشتاق کو وہاں جانے کا اشارہ کیا۔

"ہیلو کاشانہ! میں نادر بات کر رہا ہوں۔" رابطہ ملتے ہی میں نے ٹیلی فون کے مائیکروفون میں کہا۔

میری آواز سنتے ہی دوسری طرف سے کاشانہ کی پُرمسرت آواز اُبھری۔

"ہیلو نادر صاحب! آپ نے مجھے فون کرنے کی زحمت گوارا کر ہی لی بالآخر۔ بہت بہت شکریہ! کیسے ہیں آپ؟"

"بالکل ٹھیک......... آپ سنائیں۔" میں نے قدرے بے تکلفی سے کہا۔

"میں بھی ٹھیک ہوں۔ آپ کب تشریف لا رہے ہیں میرے غریب خانے پر؟"

"غریب خانہ کہاں......... آپ کا گھر تو پورا محل ہے۔ ویسے آپ اس وقت اپنے گھر پر ہی ہیں؟" میں نے آخر میں پوچھا۔

"ہاں......... اور آپ؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"میں اپنے ٹال پر ہی ہوں اس وقت۔ آپ سے ملاقات کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔"

"زہے نصیب۔ مجھے یقین نہیں آ رہا، میری آنکھیں آپ کے انتظار میں فرشِ راہ ہیں۔ پھر آ رہے ہیں آپ؟" وہ مسرت سے لبریز لہجے میں بولی۔

"یس......... ابھی نکل رہا ہوں۔"

"تشریف لے آئیں......... میں سراپا آپ کی منتظر ہوں۔" اس نے بے تابی ظاہر کی اور میں نے گفتگو کا اختتام کر دیا۔

موبائل آف کر کے میں نے اپنی جیب میں رکھا اور جیب کی چابیاں سنبھالیں۔ اپنے آفس سے جیسے ہی باہر نکلا، اچانک ایک نیلے رنگ کی آٹو میٹک گیئر والی بی ایم ڈبلیو تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ میں ٹھٹک کر وہیں رک گیا۔ کار میں ڈرائیونگ سیٹ پر صرف ایک ہی شخص موجود تھا۔ وہ تیزی سے دروازہ کھول کر کار سے نیچے اُترا تو اسے پہچان کر ایکا ایکی میرے پورے وجود میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔

وہ اشفاق شاہین تھا۔ انڈر ورلڈ مافیا کا ڈان......... مجھے اسے غیر متوقع طور پر اپنے سامنے دیکھ کر دو باتوں پر حیرت ہوئی۔ پہلی تو یہ تھی کہ وہ بالکل تنہا تھا۔ دوسری یہ کہ لاہور سے ہی آ رہا تھا۔ کیونکہ اس کی رہائش گاہ لاہور گلبرگ کے علاقے میں تھی۔

اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور سیدھا میری طرف آیا۔ میں نے اپنی اندرونی مضطربانہ کیفیات پر قابو پاتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر دوستانہ مسکراہٹ سجا کر اس کا پُرتپاک استقبال کیا اور فوراً ہی مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

"یہ تمہارا دفتر ہے؟" مجھ سے گویا طوعاً و کرہاً ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے سامنے میرے آفس کیبن کی طرف اشارہ کر کے سرد لہجے میں کہا۔

"آں......... آؤ، خیریت تو ہے؟ ویسے مجھے خوشی ہوئی۔" میں نے مکاری سے کہا۔ میں جانتا تھا کہ کہاں اور کب مکاری سے کام لینا چاہئے۔

میں اسے لے کر اپنے دفتر میں پہنچا۔ میں جانتا تھا کہ وہ میرے پاس کیوں آیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ میرے چہرے کو بھانپتی ہوئی نظروں میں لئے ہوئے تھا۔

"بیٹھو......... پہلے مجھے یہ بتاؤ، تم کیا پیو گے؟" میں نے خوش دلی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ میں نے پل کے پل اشفاق شاہین کے سلسلے میں ایک مربوط حکمت عملی "پلین" کر لی تھی کہ مجھے اس کے ساتھ کس طرح پیش آنا تھا اور کس طرح اس غلیظ انسان کی بیخ کنی کرنی تھی۔

"تم نے کل رات میری رہائش گاہ پر نقب لگائی اور غزالہ کو لے اُڑے۔" کرسی پر براجمان ہوتے ہی اس نے خشک لہجے میں مجھ سے دریافت کرنا چاہا تو میں نے ذرا ڈرپوک انسان کا رول پلے کرتے ہوئے اپنے لہجے میں حیرت آمیز پریشانی سمو کر اس سے کہا۔

"کیا؟......... یہ......... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟......... میں تو تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے اس رات سمجھ داری کا ثبوت دیتے ہوئے مجھے جانے کی اجازت دی تھی۔ اور ساتھ ہی غفورے کا بھی کہ اس نے مجھ سے معاہدہ کرلیا کہ آئندہ ہم دونوں میں سے کوئی کسی کا راستہ کھوٹا کرنے کی کوشش نہیں کرے گا اور پھر بھلا مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں غزالہ کی خاطر ایسی خطرناک مہم جوئی کرتا پھروں۔"

میں نے کسی خوف زدہ انسان کے سے انداز میں ایک ہی سانس میں اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے اس سے کہا اور اپنی اداکاری کی اثر پذیری کے نتیجے میں اس کے چہرے کی سرد مہری کو اُلجھن آمیز تاثر میں تبدیل ہوتے دیکھا اور مجھے بھی کچھ حوصلہ ہوا۔

"ہوں...... تم سچ کہہ رہے ہو؟" وہ میرے چہرے کی طرف کھوجتی نظروں سے گھورتے ہوئے بولا

"اس میں جھوٹ کی گنجائش ہی نہیں ہے اشفاق صاحب!" میں نے پہلے سے بھی زیادہ اپنے جھوٹے لہجے کو پُر اعتماد بناتے ہوئے مکاری سے کہا۔ "تم خود سوچو، بھلا مجھ جیسا عام کاروباری اور امن پسند آدمی ایک انڈر ورلڈ فلم مافیا کے ڈان کے ساتھ ایسی بے وقوفانہ قسم کی غلطی کر سکتا ہے؟"

میرے انداز اور تبصرے پر اس کی آنکھوں میں ایک تیز چمک اُبھری۔ یہ ایک حیرانی کی چمک تھی اور میں جو چال اشفاق شاہین جیسے خطرناک گینگسٹر کے ساتھ چلنا چاہ رہا تھا، اس کا یہ تقاضا تھا کہ میں بعض ایسی باتوں کو اس کے سامنے کھل کر بیان کرڈالوں کہ ایک تو مجھے اس پر ذرہ برابر شبہ نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ مجھے "شوقین مزاج" آوارہ نوجوان سمجھے۔

"میرے بارے میں تمہیں کیسے پتہ چلا؟" اس نے معاً اپنی آنکھیں سکیڑ کر مجھے دیکھتے ہوئے استفسار بھرے لہجے میں کہا۔

"ارے چھوڑیں جی۔ مجھے تو یہ بھی معلوم ہے، آپ خفیہ قسم کی بڑی مسالے دار فلمیں بھی بناتے ہیں اور میں خود ایسی فلموں کا جنون کی حد تک کریز رکھتا ہوں۔" میں نے اوباشانہ لہجے میں ایک آنکھ معنی خیز انداز میں میچ کر کہا تو اس کے چہرے پر ویرانی سی پھیلنے لگی۔

"تت...... تمہیں...... یہ...... یہ کیسے پتہ چلا؟"

"اور کون بتائے گا؟...... اس چھنال، غزالہ نے ہی بتایا تھا۔ مگر یقین کریں اشفاق صاحب! میں تو یہ سن کر حیران رہ گیا تھا کہ یہاں بھی ایسی زبردست اور گرما گرم فلمیں بنتی ہیں۔ میں تو اس سلسلے میں خود آپ سے رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ پلیز...... کبھی مجھے ایسی فلمیں بناتے ہوئے نظارے تو کرائیں۔ اب تک میں نے صرف ٹی وی اسکرین پر ہی دیکھا ہے۔ ذرا حقیقی طور پر بنتے ہوئے بھی تو دیکھوں۔ اس کا لطف ہی الگ ہوگا۔"

میں بدستور اس کے لئے حیرت کا سامان مہیا کئے جا رہا تھا۔ میری اپنی بھی کوشش یہی تھی کہ اشفاق شاہین جیسے خبیث ہاتھی کو چیونٹی بن کر اس کی سونڈ میں گھس کر مارنا چاہئے تھا اور اس کے لئے ضروری تھا کہ میں اس کے سامنے خود کو زیادہ سے زیادہ شوقین مزاج ظاہر کروں۔ یہی سبب تھا کہ میں نے اس لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی حیرت کے دوران ہی اس پر مزید رعب ڈالنے کی غرض سے کہا۔

"میں تو اب اپنے کمپیوٹر پر بھی ایسی مخصوص ویب سائٹس پر دھاکہ قسم کے ٹوٹے دیکھتا رہتا ہوں

آپ کو شاید یقین نہیں آئے گا۔ اس شوق میں، میں اس قدر آگے جا چکا ہوں کہ میں نے انٹرنیٹ پر ہی امریکہ کی ایسی تھری ایکس بلیو فلمیں بنانے والی کمپنیوں کے پروڈیوسروں اور ڈائریکٹروں سے رابطے بھی کر رکھے ہیں۔ وہ تو مجھ سے کہتے ہیں کہ اگر میں ان کی کمپنی میں کام کروں تو وہ خود اپنے خرچ پر مجھے امریکہ بلوائیں گے اور ہزاروں ڈالر منافع بھی دیں گے۔ یہی نہیں، نیٹ ٹو فون اور ویڈیو کیمرہ کے سامنے مذکورہ ڈائریکٹر اپنی کمپنیوں کی گوری چمڑی والی عورتوں اور جوان لڑکیوں سے بھی میری باتیں کرواتے ہیں۔"

میں کہتا جا رہا تھا اور وہ حیرت سے منہ پھاڑے مجھے دیکھتا جا رہا تھا۔ وہ مجھے یوں حیرت بھری نظروں سے تکے جا رہا تھا جیسے اس کے سامنے اس کا بھی باپ بیٹھا ہو۔ مجھے یہ ساری معلومات غزالہ کے ذریعے معلوم ہوئی تھیں اور آج میں اس کا فائدہ اٹھا رہا تھا۔

"آپ کیا پئیں گے اشفاق صاحب؟...... بلکہ ٹھہریں، میں آپ کے لئے دہی بھلے منگواتا ہوں، گلاب جامن ڈلوا کے۔"

"نن...... نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ بس چائے منگوالو۔" اشفاق شاہین نے جلدی سے کہا۔

اس کا ابال اب جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ لوہا گرم دیکھ کر میں نے اپنی چوٹیں لگانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ "واہ...... واہ اشفاق شاہین صاحب! یہ سالی انگریز عورتیں بھی کیا شے ہیں...... بالکل فری سٹائل محبت کرتی ہیں۔ ارے میں تو بھول ہی گیا......" میں نے آخر میں دانستہ خود کو بے وقوف ظاہر کرنا چاہا تھا۔ پھر بیل بجا دی۔ ذرا دیر بعد ایک ملازم اندر داخل ہوا۔ میں نے اسے چائے اور کیک پیسٹریوں کا آرڈر دیا۔ وہ واپس چلا گیا۔

"ہاں تو اشفاق صاحب! میں کہہ رہا تھا کہ......" میں پھر شروع ہونے لگا تو وہ بول پڑا۔

"نادر صاحب! آپ کے ساتھ خوب جمے گی۔ اچھا، آپ یہ بتائیں آپ شادی شدہ ہیں؟"

"نہیں جی...... ابھی تو نہیں کی۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ پھر خوش امید مسکراہٹ سے بولا۔ "اشفاق صاحب! تو پھر میں آپ کے دولت کدے پر کب حاضر ہو جاؤں؟ اور...... اور کیا آپ مجھے اپنی اس فلم میں کام کرنے کا چانس......" میں نے جھینپی جھینپی مسکراہٹ کے ساتھ اپنا جملہ دانستہ ادھورا چھوڑا تو وہ ہولے سے کھنکھار کر بولا۔

"مگر تم کس طرح ایسی فلم میں کام کر سکتے ہو؟...... ہمارے پاس تو ایسی فلموں میں کام کرنے کے لئے مخصوص پیشہ ور آدمی ہوتے ہیں جو گمنام ہوتے ہیں۔ جبکہ تم کو یقیناً بہت سے جاننے والے لوگ ہیں۔ ہم ان لوگوں کو منظر عام پر کبھی نہیں لاتے۔ بلکہ وہ گمنامی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔"

"جی ہاں...... آپ کی یہ بات تو درست ہے۔" میں نے اس کے متوقع جواب پر بڑی چالاکی سے بات کو دوسری طرف موڑتے ہوئے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔ "لیکن آپ کسی اور طریقے سے ہی سہی، بس مجھے اپنے کاروبار میں کسی طرح شریک کار بنا لیں۔ یہ بڑا رنگین اور دلچسپ کاروبار ہے۔ لیکن سب سے بڑی بات یہ کہ اس میں منافع اور دولت کمانے کے بے حساب مواقع ہیں۔ میں کسی وقت حاضر ہو جاؤں گا آپ کے دولت خانے پر۔ یوں تو میں آپ کے ہاں ایک بار غزالہ والے حوالے سے آ تو چکا ہوں لیکن...... پھر بھی ذرا تفصیلی پتہ اور اپنا کنٹیکٹ نمبر دے دیتے تو اچھا تھا۔"

میری بات پر اس نے جیب سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر میری طرف بڑھا دیا اور بولا۔ "اس میں میری گلبرگ والی جگہ کا پتہ موجود ہے اور میرا فون نمبر درج ہے۔ آنے سے پہلے مجھے فون ضرور کر دینا۔"

اپنی چالاکی پر میرا دل خوشی سے بلیوں اُچھلنے لگا۔ میں نے کارڈ اس شیطان کے ہاتھ سے لے کر اس پر ایک نظر ڈالی پھر آخر میں پوچھا۔ ”کیا آپ ایسی فلمیں وہیں اپنی رہائش گاہ میں بنواتے یا.........؟“ میں نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا۔

”یہ باتیں اب وہیں ہوں گی۔“ اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔

”چلیں ٹھیک ہے.........ویسے آپ مجھے اپنے اس منافع بخش کاروبار میں شامل تو کریں گے نا!“

”ہاں.........اسی لئے تو بلا رہا ہوں۔ سوچنا پڑے گا کہ تمہیں کیسا کام دیا جائے۔“ وہ بولا۔

اسی دوران ملازم چائے وغیرہ لے آیا۔ ہمارے درمیان ادھر اُدھر کی گفتگو ہوتی رہی۔ پھر میں اچانک غزالہ کا ذکر چھیڑ دیا۔ ”اشفاق صاحب! غزالہ کا کیا معاملہ ہے؟.........کیا وہ بھی ایسی کسی فلم کام کر چکی ہے یا پھر اپنا معاوضہ بڑھانا چاہتی ہے؟“

میری بات پر اس نے ایک پوری پیسٹری نگلنے اور چائے کے چند بڑے بڑے گھونٹ بھرنے کے کہا۔ ”وہ ذرا ٹیڑھی لڑکی ہے۔ حالانکہ وہ ہماری ہی قبیل سے تعلق رکھتی ہے۔ مگر پھر جانے کیا ہو وہ.........مگر یہ تو بتاؤ، تم اسے کیسے جانتے ہو؟“ اس نے اچانک پوچھا۔

”میں تو اسے ہرگز نہیں جانتا۔ یہ تو میں آپ کو وہیں بتا چکا تھا، آپ کی رہائش گاہ پر۔“ میں جواب دیا۔

”ہوں.........“ اس نے ایک گہری ہمکاری لی اور چپ ہو گیا۔ دراصل اس موضوع پر میر اشفاق شاہین کے درمیان گفتگو ہو چکی تھی۔ اس وقت غفورا بھی وہیں موجود تھا۔ مگر میں نے بڑی صورتی اور چالاکی کے ساتھ اپنی بات ان دونوں غنڈوں کے پہچان لئے جانے پر موڑ دی تھی جنہیں کر میں چونکا تھا۔ ان دونوں کا تعلق جہنم واصل چھپکلی مارکہ کھڑتال گروپ لیڈر سے تھا جو میرے ہا اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچا تھا۔ جو حقیقت میں غفورے کے ساتھی نکلے تھے اور یوں غزالہ کے حو سے بات آئی گئی ہو گئی۔

”مگر اس نے تمہیں میرے اور میرے اس خفیہ کاروبار کے بارے میں جو تفصیل بتا ڈالی ہے ا مجھے حیرت ہو رہی ہے۔ وہ اب ہمارے لئے خطرناک ہو سکتی ہے اور ہمارے پیچھے کسی خفیہ سرکاری ا کو لگا سکتی ہے۔“ وہ چائے کا کپ خالی کر کے میز پر رکھتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولا اور پھر اچانک سے پوچھا۔ ”اس نے ہمارے متعلق اور بھی کچھ تمہیں بتایا تھا؟“

”نہیں تو.........بس اتنی ہی باتیں بتائی تھیں۔“ میں نے کہا اور فوراً ہی کچھ سوچتے ہوئے اس رنگ آمیزی کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ تو جی، اس حادثاتی ملاقات کے دوران میری اچھی خاصی دوست گئی تھی اور مجھے اپنے گھر بھی آنے کی دعوت دی تھی۔ تاہم وہ آپ لوگوں سے بہت خوف زدہ بھی ہے اور آپ سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہے تاکہ اپنی الگ تھلگ پُرسکون زندگی بسر کر سکے۔ میں تو کہتا جناب! اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ اگر اسے چھیڑنے کی کوشش کی تو و کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔“

یہ ساری باتیں بتاتے وقت میں نے یہ بھی ضرور کہا تھا کہ غزالہ نے مجھے یہ ساری باتیں اس وقت بتائی تھیں جب ہم دونوں کو اشفاق شاہین نے اپنی گلبرگ والی رہائش گاہ کے کمرے میں مقید کر رکھا لہٰذا آخر میں، میں نے یہ کہنا ضروری سمجھا۔

”اشفاق صاحب! یہ بات تو میری بھی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ آخر غزالہ کو کس نے آپ کی فل

فرار ہونے میں مدد دی ہے؟ بلکہ اگر آپ ناراض نہ ہوں تو میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں، یہ کام آپ ہی کے کسی غدار کا لگتا ہے۔“

”ہاں.........اب تم سے ملنے کے بعد میرا بھی یہی خیال ہے۔“ وہ پُرسوچ لہجے میں اپنے سر کو ہولے سے اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ میں دل ہی دل میں اپنی شاطرانہ چال پر خوش ہونے لگا کہ میں نے آدھے سچ اور آدھے جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے اسے اپنی طرف سے بھٹکانے پر کامیابی حاصل کر لی تھی۔ تاہم ابھی مجھے یہ دیکھنا تھا کہ وہ غزالہ کے سلسلے میں کون سا لائحہ عمل ترتیب دینا چاہتا ہے؟ یہی وجہ تھا کہ میں اپنی بات کہنے کے بعد مستفسرانہ نظروں سے اس کا چہرہ تکنے لگا تھا۔ مگر وہ میری بات کا تسلی بخش جواب دیئے بغیر رخصت ہونے کے لئے کھڑا ہوا تو میں نے بھی اپنی سیٹ چھوڑ دی۔ وہ مجھ سے دوستانہ انداز میں مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

”میں تمہاری آمد کا منتظر رہوں گا۔ اب میں چلتا ہوں۔“

میں نے بھی دوستانہ گرم جوشی دکھاتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا اور پھر باہر احاطے میں کھڑی اس کی کار تک اسے چھوڑنے آیا۔ ذرا دیر بعد وہ واپس چلا گیا تو میں اپنی جیپ میں بیٹھ کر ”کاشانہ پیلس“ کی طرف روانہ ہو گیا۔

اشفاق شاہین جیسے بڑے گینگسٹر کو اتنی آسانی سے اُلّو بنانا میری ایک غیر متوقع اور اچانک کامیابی تھی۔ اپنی اس چومکھی جنگ میں اپنے ایک حریف کو میں پھندا ڈال چکا تھا۔ جب کہ رب نواز اور کبیر سمیت کیلاشی عامل عاروب کے کارپردازوں کا مسئلہ نمٹانا تھا۔ بالخصوص میں نگینہ کی امریکہ سے واپسی سے قبل عامل عاروب والا معاملہ نمٹانا چاہتا تھا۔ کیونکہ کبیر اور کیلاشی عامل عاروب کے دو کارپردازوں سے ٹکرانے کے بعد مجھے یہ معاملہ زیادہ سنگین محسوس ہونے لگا تھا۔ مجھے اس بات کا ذرا بھی خوف نہ تھا کہ میں عامل عاروب کو زخمی کرنے کا باعث بنا تھا اور اب اس کے پیروکار مجھ سے انتقام لینا چاہتے تھے۔ بلکہ سنگین پہلو یہ تھا کہ ان کا اصل ٹارگٹ نگینہ تھی۔ وہ ہر قیمت پر اپنے خود ساختہ دیوتا دابولا مینزی پر نگینہ کی جان کی بھینٹ چڑھانا چاہتے تھے اور کبیر اس سلسلے میں ان کی پوری رہنمائی کر رہا تھا۔ عامل عاروب کے جن پیروکاروں سے میرا ٹکراؤ ہوا تھا ان میں سے ایک کے پیٹ میں گولی مار چکا تھا جو پتہ نہیں اب زندہ بھی تھا یا نہیں؟ تاہم دوسرے ساتھی کا نام مجھے معلوم نہ تھا۔ اگرچہ اس کی ٹانگ میں بھی گولی لگی تھی، غالب خیال یہی تھا کہ دونوں یا کوئی ایک میرے ہاتھوں منہ کی کھانے کے بعد واپس کیلاش وادی لوٹ گیا ہو۔

”کاشانہ پیلس“ پہنچ کر میں نے اپنی جیپ جیسے ہی وسیع وعریض احاطے کے گیٹ کے سامنے روکی، مسلح محافظوں نے فوراً گیٹ کھول دیا۔ غالباً کاشانہ نے انہیں میری متوقع آمد کے بارے میں پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ مگر پھر جیسے ہی میں نے اپنی جیپ اندر سبزہ زار کے احاطے میں داخل کی تو مجھے ایک جانب چند قدموں کے فاصلے پر کاشانہ چہل قدمی کرتی نظر آئی۔ تاہم میری جیپ دیکھتے ہی وہ فوراً میری جانب بڑھی۔ میں جب تک اگنیشن سوئچ آف کر کے اور دروازہ کھول کر جیپ سے نیچے اترا۔ کاشانہ بھی تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی میرے قریب آ گئی۔ اس نے اسکن ٹائٹ جینز پہن رکھی تھی جس کے پائنچے اس کی گوری گوری اور گداز بھری بھری پنڈلیوں کو جیسے دبوچے ہوئے تھے۔ نیچے سیاہ رنگ کے دیدہ زیب سینڈل تھے۔ اس بار اس نے جو ہاف آستین کی شرٹ پہن رکھی تھی، اس کے کالر مردانہ تھے۔ شرٹ پینٹ کے اندر اڑسی ہوئی تھی جس کے باعث اس کے مدور نشیب وفراز ہیجان خیز منظر پیش کر رہے تھے۔ اپنے

بوائے کٹ بالوں کو اس نے ڈائی کیا ہوا تھا۔ گداز بھرے ہوئے ہونٹوں پر پُرکشش، دعوت ا
مسکراہٹ تھی۔ اس نے ہلکا میک اپ بھی کر رکھا تھا۔ جب وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی تو بائیں گال پر خفی
سا ڈمپل اُبھرا۔ آج میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کی نشیلی آنکھوں پر سایہ کی ہوئی سیاہ پلکیں غیر مع
طور پر لمبی تھیں۔

''زہے نصیب!.........نادر صاحب! مجھے یقین نہیں آ رہا کہ آپ واقعی مجھ سے ملنے دوسری بار آ
ہیں۔'' وہ مترنم لہجے میں بولی۔

''نہیں.........آپ سے ملنے تو پہلی بار ہی آیا ہوں۔'' میں نے بھی جواباً مسکرا کر کہا۔

''وہ کس طرح؟''

''پہلی ملاقات میں آپ کے پپا.........میرا مطلب ہے رب نواز سے ہی کرنے آیا تھا مگر آپ
ہوگئی۔ اس بار تو بالخصوص آپ سے ہی ملنے آیا ہوں۔''

میری بات پر وہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنس دی۔

''آپ بھی بس.........'' وہ کہتے کہتے رک گئی، پھر بولی۔ ''چلیں، اندر تشریف لائیں۔'' وہ بے
سے میرا ہاتھ اپنے نرم و گداز ہاتھوں میں پکڑتے ہوئے بولی۔

میں اس کے ہمراہ سبزہ زار کے درمیان بنی خوب صورت روش پر چلتا ہوا بیرونی دروازے کی طر
بڑھ گیا۔ وہ مجھے اندر ایک شاہانہ طرز کے کمرے میں لے آئی۔ یہ ایک کشادہ ڈرائنگ روم تھا۔ پر
بیش قیمت جدید آرائشی اشیاء سے آراستہ و پیراستہ۔ اس نے مجھے ایک صوفے پر بیٹھنے کا کہا اور خود م
سامنے والے صوفے پر براجمان ہوگئی۔

میں نے اردگرد یونہی نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔ ''لگتا ہے گھر میں اس وقت آپ اکیلی ہیں۔''

''ہاں.........مما، رب نواز کے ساتھ کہیں دعوت پر گئی ہیں۔ رات بارہ بجے سے پہلے ان کی وا
ممکن نہیں۔'' وہ بولی۔

''تو آپ اتنا طویل وقت یونہی بیٹھے گزار دیتی ہیں؟.........میرا مطلب ہے آپ بھی ذرا آؤٹنگ
نکل جایا کریں۔ اکیلی تو آپ بور ہو جاتی ہوں گی۔''

میری بات پر وہ ایک گہری سانس خارج کر کے بولی تو مجھے اس کی آواز کہیں دور سے آتی
محسوس ہوئی۔ ''نادر صاحب! پتہ نہیں، کیا بات ہے۔ پپا کے انتقال کے بعد میں جیسے اپنے ہی خول
بند ہو کر رہ گئی ہوں۔ کسی چیز میں دل ہی نہیں لگتا۔''

''اوہ.........لگتا ہے، آپ اپنے پپا سے بہت قریب تھیں۔''

''ہاں......... بہت قریب۔ مما سے بھی نہیں، جتنا مجھے اپنے پپا سے محبت تھی۔ وہ میرے د
تھے۔ میرے خیالات، میرے افکار غرضیکہ مجھ سے وہ ہر چیز شیئر کرتے تھے۔''

''اور مما سے؟''

''مما کو اپنی سوشل لائف سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی۔'' اس نے تلخی سے کہا۔ ''انہوں نے مجھ
لائف میں بہت نظر انداز کیا۔ اب تو جیسے وہ مجھ سے دور ہی ہو کر رہ گئی ہیں۔ بہت دور چلی گئی ہی
ان کی طرف دیکھتی ہوں تو مجھے مزید تنہائی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اور پپا کی یاد بھی اتنی شدت
ساتھ آتی ہے۔ درحقیقت نادر صاحب! پپا کی موت کا غم مجھ سے بھلائے نہیں بھولتا۔ اس کی وجہ
تھی کیونکہ ان کی موت بالکل اچانک اور غیر متوقع ہوئی تھی۔ دو سال کا عرصہ ہوتا ہی کتنا ہے۔ مگر آ

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پپا اچانک نمودار ہوں گے اور مجھے بالکل ایک ننھی منی بچی کی طرح اپنی گود میں بھر لیں گے۔'' وہ اپنی رو میں کہتی جا رہی تھی۔ میری نظریں اس کے غم ناک چہرے پر مرکوز تھیں۔ اس کی لانبی پلکیں بھیگی بھیگی سی محسوس ہو رہی تھیں۔ اچانک جیسے وہ حسرت و اندوہ کے بھنور سے اُبھر کر قدرے چونکتے ہوئے بولی۔

''ارے......... یہ میں کیا باتیں لے کر بیٹھ گئی۔ میں نے تو آپ کو کچھ کھانے پینے کا ہی نہیں پوچھا۔'' پھر تھوڑے توقف کے بعد بولی۔ ''آپ لنچ کر کے ہی جائیں گے۔ میں پہلے آپ کے لئے کولڈ ڈرنک منگواتی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے کسی ملازمہ کو آواز دی تو ایک ادھیڑ عمر کی عورت اندر داخل ہوئی۔ کاشانہ نے اسے کولڈ ڈرنک لانے کا کہا۔ وہ چلی گئی تو میں نے ذرا کھنکھار کر کاشانہ سے کہا۔

''آپ لنچ کا بکھیڑا رہنے دیں۔ کولڈ ڈرنک ہی بہتر رہے گا۔''

''جی نہیں......... ہر وقت آپ کی مرضی نہیں چلے گی۔'' وہ جیسے یکدم اپنی کھلنڈری خو میں آتے ہوئے بولی۔ ''میں نے آپ کے لئے اسپیشلی بکرے کی ران کا تنوری چرغہ اور جنجر چکن تیار کروایا ہے اور بلوچی تنور والے سے بڑے بڑے نان.........اور سویٹ ڈش میں ٹرائفل کسٹرڈ.........مزہ آ جائے گا۔''

''واہ.........آپ تو کھانے پینے کا بڑا شوق رکھتی ہیں.........حالانکہ آپ کی عمر کی لڑکیاں تو کھانے پینے سے دور بھاگتی ہیں کہ کہیں موٹی نہ ہو جائیں۔'' میں نے ازراہ تفنن کہا تو وہ بے اختیار چلبلے انداز میں ہنس پڑی۔

''میں ایسے کسی احمقانہ کریز میں مبتلا نہیں ہوتی۔ جو کرنا ہے وہ کرنا ہے۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ انسان کو کوئی حسرت دل میں نہیں رکھنی چاہئے۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور دھیمے دھیمے مسرت انگیز لمحات جہاں اور جیسے میسر ہوں، انہیں کشید کر لینا چاہئے۔''

اس کی باتوں میں عجیب سا سحر تھا۔ میٹھی میٹھی آنچ تھی۔ میں خاموش رہا۔ پھر بولا۔ ''رب نواز آیا تھا میرے پاس۔''

''وہاٹ؟.........کب؟''

''آج۔''

''کیا کہہ رہا تھا وہ؟''

''یہی کہ میں نے اس کے ساتھ دھوکا کیا ہے اور اب مجھے میرا مال واپس لوٹا دو۔ یہی کہہ رہا تھا۔''

''تو پھر.........آپ نے کیا کہا؟''

''میں نے کہہ دیا تھا کہ اس مال پر میرا حق بنتا تھا، جس کی پے منٹ میں اسے کر چکا تھا۔ لہٰذا اب وہ میرے ساتھ لاکھ روپے دینے کی بات کرے۔''

''ویری نائس.........پھر کیا کہا اُس نے؟'' وہ پُراشتیاق لہجے میں بولی۔

''آپ کے حوالے سے بات کر رہا تھا کہ میں یہ سب کس کے بل بوتے پر کر رہا ہوں۔''

''مائف فٹ۔'' وہ نفرت خیز لہجے میں دانت پیس کر بولی۔ ''آپ نے کہہ دینا تھا پھر کہ تم جیسے بد دیانت شخص کے ساتھ ہر طرح کا حربہ جائز ہے۔''

''میں نے اس سے ملتا جلتا جواب ہی دیا تھا اسے۔''

''نادر صاحب! آج کل اینٹی کرپشن کے ایک سرکل آفیسر بابر وڑائچ کے ساتھ جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ اگر آپ اس سے ایک ملاقات کریں اور اپنا مسئلہ بیان کریں تو آپ کا کام بن سکتا ہے۔'' اس نے

مجھے صائب مشورہ دیا۔

''اچھا......... معاملہ کیا ہے؟'' میں نے دوبارہ پوچھا تو وہ تلخی سے بولی۔

''کیا معاملہ ہونا ہے، سوائے فراڈ کے۔ جس طرح انہوں نے آپ کے ماموں حیدر گل سے فراڈ کیا تھا، اسی طرح رب نواز نے کسی اسماعیل گوندل کے ساتھ بھی یہی دھوکا کیا تھا۔ تمہارے ماموں بے چارے تو خاموش ہو گئے تھے مگر اسماعیل گوندل رب نواز کے گلے پڑ گیا۔ کیونکہ وہ اینٹی کرپشن کے ر... آفیسر بابر وڑائچ کا چچیرا نکلا۔ اب تو اس نے اپنی رقم کے علاوہ نقصانات کا کلیم بھی کر دیا ہے۔ رب نواز بہت پریشان ہو گیا ہے۔''

''بابر وڑائچ رہتا کہاں ہے؟'' میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''میں آپ کو ان کا تفصیلی ایڈریس لے دوں گی۔'' وہ بولی اور اس اثناء میں ملازمہ ایک ٹرے پر کولڈ ڈرنک اٹھا لائی۔ ہم دونوں خاموشی سے کولڈ ڈرنک پینے لگے۔

کولڈ ڈرنک ختم کرنے کے بعد کاشانہ نے صوفے سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے مجھ سے کہا

''آیئے نادر صاحب! میں آپ کو اپنا کمرہ دکھاؤں اور پپا کی البم بھی۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مجھے لے کر ایک کشادہ اور آرام دہ کمرے میں آ گئی۔ یہاں ایک طرف بیڈ بچھا ہوا تھا۔ ایک ایزی چیئر بھی تھی۔ دوسرے کونے میں ایک ٹیبل پر کمپیوٹر رکھا ہوا تھا۔ کاشانہ نے مجھے بیڈ پر بیٹھنے کا کہا اور پھر بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز سے نیلے رنگ کی البم نکالی اور میرے بالکل قریب بیڈ پر بیٹھ گئی اس کے پُر شباب وجود سے بڑی مسحور کن خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اس نے البم کھول کر میرے زانو پر رکھ دی اس طرح اسے تھوڑا میرے چہرے کے قریب جھکنا پڑا تو اس کی سانسوں کی تپش مجھے اپنے چہرے پر صاف محسوس ہونے لگی۔

البم میں کاشانہ کی اپنے باپ کے ساتھ بچپن سے لے کر جوانی تک ساری ہی تصاویر موجود تھیں۔ ان تصاویر میں سیر گاہیں اور تفریحی مقامات بھی تھے۔ مجھے باپ بیٹی کے سوا اور کوئی نظر نہ آیا تھا۔ یعنی اس کی ماں کی کہیں ایک بھی تصویر نہیں تھی۔

''یہ البم میں اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر ہی سوتی ہوں اور ہر روز رات کو سونے سے پہلے اسے ضرور دیکھتی ہوں۔ ان سے باتیں کرتی ہوں۔'' وہ پھر اپنی رو میں بہکنے لگی۔

میں نے کہا۔ ''مس کاشانہ! اس میں شک نہیں کہ بعض دکھ انسان کو ادھ موا کر کے رکھ دیتے ہیں لیکن انسان کے آگے بڑی زندگی ہے۔ اگر وہ دکھ کو اپنے گلے سے لگا لے تو نہ صرف ساری زندگی اس انسان کے اس ایک دکھ کو سینے سے لگائے گزر جاتی ہے بلکہ اس طرح مرے ہوؤں کی روح کو بھی تکلیف پہنچتی ہے۔ آپ خوش رہا کریں......... بلکہ میں تو آپ کو یہ مشورہ دوں گا کہ کسی اچھے لڑکے کا انتخاب کر کے اسے اپنی زندگی کا ساتھی بنا لیں۔ آپ کی زندگی کے اس دکھ کا بدل اسی خوشی میں ہے اور اس طرح آپ کے پپا کی روح کو بھی یقیناً سکون ملے گا۔'' میں نے اسے نیک نیتی سے دوستانہ مشورہ دیا تو اس نے بے اختیار ایک گہری ہنکاری بھری پھر مجھ سے البم لے کر دراز میں ڈال دیا۔ اس کے بعد وہ میرے چہرے کی طرف دیکھ کر بولی۔

''مجھے آج تک اس کا موقع ہی نہیں ملا۔''

میں نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''آپ اپنے خول سے نکلیں۔ مواقع مل جائیں گے۔''

''ہاں......... شاید آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔'' وہ گومگو سے مگر گہرے لہجے میں بولی۔ اس کے بعد

گداز اور دلکش لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ سموتے ہوئے بولی۔ ''اگر یہی سوال میں آپ سے کروں تو؟''

''کک......... کیا سوال؟'' میں نے ذرا گڑبڑا کر کہا۔

''یہی کہ آپ نے اب تک اپنی زندگی کا کوئی ساتھی منتخب کیا؟''

''ہاں......'' مجھ سے جھوٹ نہ بولا گیا۔ اس نے قدرے چونک کر میری جانب دیکھا پھر ہولے سے بولی۔

''پوچھ سکتی ہوں وہ کون خوش نصیب ہے؟''

''ہاں......... وہ بھی آپ ہی کی طرح من موہنی صورت والی لڑکی ہے۔ بالکل آپ جیسی۔''

میری بات پر کاشانہ کی گھنی پلکوں والی آنکھوں میں جگنو سے چمکنے لگے۔ کشمیری سیبوں جیسے گالوں پر دھنک رنگ قوسِ قزح کی جھلک اُبھری۔

''نام بتائیں گے آپ اس کا؟''

''نگینہ۔'' میں نے بتایا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا پھر بولی۔

''بہت خوب صورت نام ہے......... کیا آپ اس سے بہت محبت کرتے ہیں؟''

''ہاں......... بہت......... وہی میری پہلی اور آخری محبت ہے۔ میں نے جیسے نگینہ کی خوشبو کو اپنی سانسوں کے ذریعے اندر سینے میں اتارتے ہوئے کہا۔

''وہ بھی یقیناً آپ سے بہت محبت کرتی ہوں گی؟''

''ہاں......... بلکہ ہم دونوں کو ہی یہ دعویٰ ہے کہ وہ دوسرے سے زیادہ محبت کرتا ہے۔''

''ویری فنٹاسٹک اینڈ ویری نائس ٹرو لو اسٹوری.........''

وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ پھر جیسے بہ غور میری آنکھوں، میرے چہرے کو بھانپتی ہوئی نگاہوں سے تکتے ہوئے کہا۔ ''مگر نادر صاحب! محبت کرنے والوں کی آنکھوں میں تو الوہی مسرتوں کے چراغ سے جلتے بجھتے رہتے ہیں ہر سے۔ ان کے چہرے نو دمیدہ کلی کی طرح کھلنے کے لئے بے چین سے رہتے ہیں۔ ان کی باتوں سے محبت بھرے پھولوں کی خوشبوئیں سی اُڑتی رہتی ہیں۔ مگر نادر صاحب! آپ کی آنکھیں تو کسی اور ہی غیر مرئی منظر پر مرکوز رہتی محسوس ہوتی ہیں مجھے۔ ایسا منظر جہاں اندیشوں کی آگ سلگ رہی ہو اور آپ کا چہرہ جیسے بے رحم وقت کی شورش زدگی کا شکار ہو اور......... اور آپ کا لہجہ جیسے آتش خوں رنگ کی جھلک دیتا محسوس ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے آپ کے اندر کی محبت کی آگ سے زیادہ کسی اور ہی جذبہ خوں رنگ کی تپش سلگ رہی ہو۔ آپ بیک وقت دو متضاد آتشیں حالات کا شکار ہوں۔ کیا میں صحیح کہہ رہی ہوں نادر صاحب؟''

میں اس کی غضب کی قیافہ شناسی پر ہکا بکا رہ گیا۔ کاشانہ کی انہی باتوں نے ہی تو مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی کشاں کشاں اس کی ''سنگت'' پر مجبور کیا تھا۔ اس کی عمر بہ مشکل اٹھارہ اُنیس برس ہی تھی مگر اس کی باتوں میں برسوں کے تجربے کی جھلک محسوس ہوتی تھی۔ بظاہر لاابالی اور کھلنڈری طبیعت کی نظر آنے والی اس لڑکی میں ایسی گہرائی میرے لئے حیرت ہی کا باعث تھی۔ مجھے کسی گہری اور پُرسوچ خاموشی میں پا کر اس نے دھیرے سے کہا۔

''آپ کی خاموشی میرے اندازے کی درستگی کو ظاہر کر رہی ہے نادر صاحب!......... دیکھیں، دوستی ایک نہایت اعلیٰ وارفع جذبہ ہوتا ہے۔ اس ناتے سہی، مجھ سے اپنے اندر کی کیفیت شیئر کریں۔ میں نے بھی تو آپ کو اپنا ایک اچھا اور سچا دوست سمجھ کر اپنے دکھ سے آگاہ کیا اور یقین جانیں، مجھے اپنے دل کا

بوجھ کم ہوتا محسوس ہو رہا ہے۔ پلیز نادر صاحب! کیا آپ مجھے اس بارے میں کھل کر نہیں بتائیں گے آپ کی اور نگینہ کی محبت کن نادیدہ جکڑ بندیوں کی زد میں ہے؟......... اگر ایسا ہے تو مجھے آپ کے کا کر بے پایاں خوشی ہو گی۔"

میں نے اس کی بات پر ایک گہری سانس خارج کی اور دل کی اتھاہ گہرائیوں سے بولا۔ "ہاں کاشا کچھ ایسی ہی بات ہے۔ میری اور نگینہ کی محبت واقعی ایک پل صراط سے گزر رہی ہے۔ اس کا انجام کیا گا، میں نہیں جانتا۔" پھر میں نے اسے ماں اور نگینہ کے حوالے سے ساری کتھا سنا ڈالی۔

میری ساری بپتا کی صراحت کے بعد کاشانہ خاصی دیر تک پُرسوچ اور گہری خاموشی کا شکار رہی اس کے بعد بولی۔ "نادر صاحب! مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے مجھے کسی لائق جان کر اپنے بارے میں حقیقت بیان کر دی۔ مگر نادر صاحب! ایک بات میں آپ کو پورے یقین سے بتائے دیتی ہوں کہ کی سچی اور بے لوث راہ پر چلنے والوں کو مشکلات کا سامنا ضرور رہتا ہے۔ لیکن یہ سب وقت گزرنے ساتھ عارضی ثابت ہوتی ہیں۔ اچھا یہ بتائیں، نگینہ کے امریکہ جانے کے بعد اس نے یا آپ نے فونک رابطہ کیا؟" اس نے آخر میں پوچھا۔

"میں نے ایک بار کوشش کی تھی مگر یہ ممکن نہ ہو سکا۔" میں نے مختصراً کہا تو وہ دوبارہ مستفسر ہوئی۔

"وہ ورجینیا میں اپنی جس آنٹی کے ہاں مقیم ہیں، ان کا ٹیلی فون نمبر وغیرہ؟"

میں نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔ "نہیں......... نہ اسے دینے کا موقع ملا اور نہ ہی میں لے سکا۔"

"یہ تو بڑی عجیب اور پریشانی والی بات ہو جائے گی نادر صاحب! آپ کے لئے۔" کاشانہ فکرمند سے بولی۔ "اب دیکھئے نا، نگینہ کہاں اور کس حال میں ہو گی، اس کا آپ کو علم کس طرح ہو گا؟"

"اس کے پاس میری رہائش گاہ "گرین لاج" کا پی ٹی سی ایل نمبر موجود ہے۔ مجھے امید ہے تھوڑے دنوں میں وہ مجھ سے رابطہ کرے گی۔" میں نے کہا۔

"نادر صاحب! میں سمجھتی ہوں آپ کی سب سے اہم جنگ محبت کی جنگ ہے۔ رہا آپ کی ا مسئلہ تو وہ بھی اپنی جگہ غیر اہم نہیں۔ آپ ان دونوں کے درمیان ایک توازن قائم رکھنے کی کوشش کر اور میرا خیال ہے جیسا آپ نے مجھے بتایا ہے، آپ ایسا ہی کر رہے ہیں۔ لیکن آپ کی امی کے دل آپ کی طرف سے غلط فہمی پیدا ہونا، میں سمجھتی ہوں ایک فطری ردِعمل ہے۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے آخر آپ کی امی کا مسئلہ کیسے حل ہو؟" کاشانہ نے پُرخیال لہجے میں کہا تو میں بولا۔

"امی والا مسئلہ میرا ہی ہے اور اس کا ایک ہی حل ہے اور وہ ہے نظر حیات کی موت۔"

"یہ قانونی جنگ کے ذریعے ہی ممکن ہو سکتا ہے۔"

"مگر قانونی جنگ ہم ہار چکے ہیں۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"تو پھر اب کیا ہو سکتا ہے، بجز اس کے کہ آپ بھی نظر حیات کا وہی حشر کریں جو آپ کی ماں شاہ میر کا کیا ہے۔"

"ہاں......... اب یہی ہو سکتا ہے۔"

"ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے۔"

"کون سی؟"

"بہ قول آپ کے نگینہ نے معافی تلافی کروانے کی کوشش کی تھی۔ اگر وہ اپنے انکل نظر حیا بھی........."

"اب یہ بھی ممکن نہیں رہا۔" میں اس کی بات کا مطلب سمجھ کر فوراً بولا۔

"میرے ذہن میں ایک تجویز آئی ہے۔" کاشانہ چند ثانیے کی پُرسوچ خاموشی کے بعد بولی۔ "اگر آپ کسی طرح نظر حیات کو یہ ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیں تو سارے حالات خود بہ خود ٹھیک ہو جائیں گے۔" کاشانہ کی یہ بات میرے دل کو کسی حد تک قابل قبول لگی تھی۔

"مگر کیسے؟" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"بہت آسان طریقہ ہے اس کا۔ آپ اسے واشگاف الفاظ میں یہ دھمکی دے ڈالیں کہ اگر اسے اپنی زندگی پیاری ہے تو یہ ملک چھوڑ کر خاموشی سے چلا جائے۔ اگر وہ نہیں مانتا تو آپ اسے ذہنی طور پر اتنا ٹارچر کر دیں کہ وہ خود ہی یہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔"

اس کی بات پر میں ایک لمحے کو حیران رہ گیا۔ وہ جس طرح میرے اور نگینہ اور ماں کے مسئلے کو پورے خلوص دل کے ساتھ شیئر کر رہی تھی، ایسا کوئی اپنا ہی کر سکتا تھا۔ جب کہ کاشانہ میری کیا لگتی تھی؟ صرف ایک اچھی دوست......... اور اس دوستی کو بھی چند ہی دن بیتے ہوں گے۔ اگرچہ میں اس کی آنکھوں میں اپنے لئے جلتے ہوئے جگنو وغیرہ محسوس طریقے سے بھانپ چکا تھا۔ تاہم وہ بڑی صدق نیت کے ساتھ مشاورت کر رہی تھی۔

عام حالات میں ایسا نہیں ہوتا۔ کوئی لڑکی کسی کو پسند کرتی ہے تو وہ رقابت کے فطری جذبے سے مجبور ومغلوب ہو کر دوسرے کا راستہ کاٹنے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن کاشانہ اس معاملے میں ایک باوقار اور اعلیٰ ظرف لڑکی ثابت ہو رہی تھی۔ وہ مجھ پر اپنے دل کا حال ظاہر کئے بغیر میرا بھرپور ساتھ دینے کے لئے کوشاں تھی۔ میں نے پہلی بار گہری نظروں سے کاشانہ کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں مجھے بے لوث جذبات کی تہہ میں ایک ان کہا کرب سا جھلکتا صاف محسوس ہو رہا تھا۔ اور اس نامعلوم کرب کی پرچھائیں مجھے اس سے پہلے محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس سے پہلے وہ نگینہ سے واقف نہیں تھی۔ یا یہ کہ نگینہ کا ذکر اس کے سامنے نہیں ہوا تھا۔ مجھے واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا، وہ کچھ ٹوٹ سی گئی ہے۔ اس نے شاید مجھ سے کچھ توقعات وابستہ کر لی تھیں۔ مگر میں بھلا اس کی توقعات وخواہشات کے سامنے کیوں کر سرنگوں ہو سکتا تھا۔ میں تو نگینہ کے درِ حُسن والتفات کا سوالی تھا۔ وہی نگینہ جو میری جان تھی، میری آرزوؤں اور تمناؤں کا محور تھی۔

"کیا سوچنے لگے نادر صاحب؟" میری طویل اور پُرسوچ خاموشی پر معاً کاشانہ نے اپنی مترنم آواز کا ٹہوکا دیا تو میں خیالات کی دنیا سے حقیقی دنیا میں واپس لوٹ کر بولا۔

"آں......... نن......... نہیں، کچھ نہیں۔ بس آپ کی اس معقول تجویز پر غور کر رہا تھا۔" میں نے اپنی اصل سوچ کو خود تک محدود رکھتے ہوئے اسے جواب دیا۔

"چلیں......... کھانا تیار ہو گیا ہو گا، پلیز.........!" وہ اٹھتے ہوئے خوش دلی سے مسکرا کر بولی تو میں نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی۔

کھانا واقعی بہت پُرتکلف اور لذیذ تھا جسے کاشانہ کی قربت نے گویا دو آتشہ کر دیا تھا۔

کھانے کے بعد میں نے روانگی کا ارادہ کیا۔ وہ مجھے باہر تک چھوڑنے آئی تھی۔

"پھر کب ملاقات ہو گی؟" اس نے میرے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کے بعد پوچھا۔

"اب آپ زحمت کریں۔" میں نے جواب دیا۔ "میرے گھر پر۔ میں آپ کو اپنی ماں سے ملواؤں گا۔"

"ہاں......... مجھے بھی آپ کی ممی سے ملنے کا شوق ہو رہا ہے۔" اس نے پُراشتیاق لہجے میں جواب

دیا۔ ''چلیں، پھر میں فون پر بتا دوں گی۔ اور ہاں، نگینہ کا فون آئے تو مجھے ضرور بتایئے گا۔ اب تو اچھے اور سچے دوستوں کی طرح اپنے معاملات مجھ سے شیئر کرنے لگے ہیں نا۔'' اس کا لہجہ کھلنڈرا تھا اس کی آنکھوں میں نا معلوم کرب کی پرچھائیاں صاف طور پر محسوس ہو رہی تھیں۔ میں نے ان آنکھوں میں جھانکا اور بولا۔

''ضرور......'' اس کے بعد میں نے جیپ اسٹارٹ کی اور اسے ریورس کرتا ہوا گیٹ سے با گیا۔ تب تک کاشانہ بھی تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی گیٹ تک آن پہنچی تھی۔ اس نے مسکرا کر ا سے مجھے الوداعی اشارہ کیا۔ میں نے بھی جواباً مسکرا کر ہاتھ لہرا دیا اور پھر جیسے ہی میں نے جیپ میں ڈال کر آگے بڑھایا تو اچانک میری نگاہ بائیں جانب درختوں کے جھنڈ پر پڑی۔ مجھے وہاں حرکت کرتا نظر آیا مگر پھر اچانک ہی جھنڈ میں غائب ہو گیا۔ میں نے فوراً بریک لگا دیئے اور جلدی جیپ سے اتر کر مذکورہ سمت دوڑا اور درانہ وار جھنڈ میں داخل ہو گیا۔ دوسری جانب ذیلی سڑک تھی جو کنارے کنارے کوٹھیوں اور بنگلوں کی قطاریں تھیں۔ میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں مگر مجھے دکھائی نہ دیا۔ میں جیسے ہی واپس پلٹا تو میں اچانک کسی سے ٹکرایا۔ وہ کاشانہ تھی۔

''اوہ......سوری!'' میں قدرے گڑبڑا گیا۔ میں اس سے ایسے ٹکراؤ کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتا تھا۔

''کیا ہوا نادر صاحب!......آپ اچانک جیپ سے کیوں اتر آئے تھے؟'' اس نے قدرے چو کر پوچھا۔

''کچھ نہیں......بس ایسے ہی، مجھے ذرا وہم ہوا تھا کہ ذرا دیر پہلے کوئی میری گھات میں بیٹھا تھا۔'' میں نے کہا۔

''اوہ......!'' اُس نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ''کوئی گڑبڑ ہے۔''

''نہیں۔'' میں نے بے پرواہانہ انداز میں کہا۔ ''آپ اندر چلیں۔ میں روانہ ہو رہا ہوں۔ میرا دور ہو گیا ہے۔''

''اگر کوئی مسئلہ ہے تو میں اپنا گارڈ آپ کے ساتھ کر دیتی ہوں۔'' اس نے محبت آمیز انداز پیش کش کی۔

''ارے نہیں......آپ خواہ مخواہ فکر مند ہو رہی ہیں۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ '' ٹھیک ہوں۔''

''او کے، ٹیک کیئر یور سیلف!'' اس نے گویا میری بات پر سر تسلیم خم کرتے ہوئے مجھے اجازت د دی۔ میں نے اپنی جیپ اسٹارٹ کی اور روانہ ہو گیا۔

گرین لاج کی طرف بڑھتے ہوئے میرے ذہن میں کاشانہ کی باتیں گردش کر رہی تھیں۔ اس ماں اور نگینہ والے مسئلے سمیت نظر حیات کے سلسلے میں مجھے جو تجویز دی تھی، میں اس پر غور کر رہا تھا نے درست ہی کہا ہے کہ صلاح مشورے کے سلسلے میں کسی اچھے اور بے لوث دوست کی مشاورت شامل ہو تو یہ سود مند رہتا ہے۔ ورنہ تو انسان اپنی ہی جھونک میں ایک ہی لکیر پر سوچتا رہتا ہے۔ کا نے مجھے جو راہ سجھائی تھی، اس سے پہلے میرے ذہن میں یہ نہیں آ سکی تھی۔ چنانچہ اب میں اس پ کرنے کے لئے سنجیدگی سے غور کرنے لگا تھا۔ انہی خیالات میں غلطاں جب میں گرین لاج پہنچا چونک پڑا۔ مجھے گیٹ پر چار مسلح گن مین دکھائی دیئے۔ میں نے جیپ روکی اور اتر آیا۔ ان چاروں

مؤدبانہ انداز میں مجھے سلام کیا۔

''کون ہو تم لوگ؟ اور یہاں کیا کر رہے ہو؟'' میں نے سنجیدہ لہجے میں ایک کو مخاطب کر کے پوچھا۔

''ہمیں یہاں اعظم صاحب نے تعینات کیا ہے، بیگم صاحبہ اور آپ کی حفاظت کی غرض سے۔'' میرے مخاطب نے نہایت ادب سے کہا اور میں چند ثانیے کھڑا کچھ سوچتا رہا، پھر اندر بڑھ گیا۔

سکینہ نے مجھ سے کہا۔ ''چھوٹے صاحب! کھانا لگا دوں؟''

''نہیں، میں کھا کر آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اچھا چھوٹے صاحب! میں پھر بیگم صاحبہ کو بتا دوں گی۔ وہ آپ ہی کا انتظار کر رہی تھیں۔''

''کیا انہوں نے کھانا نہیں کھایا ابھی تک؟'' میں نے پوچھا۔

''جی نہیں چھوٹے صاحب! وہ آپ کا انتظار کر رہی تھیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ پھر انہیں بتا دو، کھانا کھا لیں وہ۔'' یہ کہہ کر میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

میں رات سے بے آرام تھا اس لئے بستر پر گرتے ہی سو گیا۔

شام چھ بجے کے قریب میری آنکھ کھلی تو سکینہ نے مجھے ماں کا پیغام دیا کہ وہ چائے پر میرا انتظار کر رہی تھیں۔ میں ذرا دیر بعد ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ اس روز غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ ایک کونے میں آتش دان دہک رہا تھا۔ وہیں قریب ہی دو تین کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک پر ماں بیٹھی تھیں۔ درمیان میں ایک چھوٹی سی میز پر چائے کے برتن تھے۔ میں بھی ایک کرسی پر ماں کو آداب کہتا ہوا بیٹھ گیا اور اپنے لئے چائے بنانے لگا۔ ماں نے سیاہ رنگ کی گولڈن وائر کی گرم شال اوڑھ رکھی تھی۔ چائے کا کپ ان کے ہاتھ میں تھا۔

''اچھا ہوا......ٹال سے جلدی آ کر تم نے نیند پوری کر لی۔'' ماں نے مجھ سے کہا۔

''جی امی! بے آرامی کی وجہ سے نیند نے طبیعت بے چین کر رکھی تھی۔'' میں نے ہولے سے کہا اور چائے کا ایک گھونٹ لیا تو ماں نے میرے چہرے پر اپنی نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔

''امریکہ روانگی کے بعد نگینہ نے تم سے رابطہ کیا؟''

ماں کا یہ اچانک سوال میرے لئے غیر متوقع نہ تھا۔

''نہیں......ابھی تک تو نہیں کیا۔'' میں نے جواب دیا۔

''حیرت ہے۔'' ماں نے کہا۔ مجھے ان کے لہجے سے ہلکا سا طنز محسوس ہوا۔ ''پھر تم نے تو اس سے ضرور رابطہ کیا ہوگا۔''

''سیل فون پر کوشش کی تھی مگر نہیں ہو سکا۔'' میں نے جواباً کہا۔ آتش دان کے شعلے دھیمے پڑنے لگے تو ان سے دھواں اٹھنے لگا۔ ماں نے دست پناہ سے آتش دان کی ادھ جلی لکڑیوں کو آگ پر اکٹھا کیا تو کمرے کے ماحول میں بھڑکتے شعلوں کی چرچراہٹ اُبھری۔ حالانکہ گیس ہیٹر بھی تھا مگر ماں کو آتش دان کی آگ زیادہ پسند تھی۔

''تمہیں تو نگینہ نے بتایا ہوگا کہ امریکہ میں وہ کس کے ہاں ٹھہرے گی؟'' دست پناہ کو دوبارہ اپنی کرسی کے ساتھ ٹکا کر ماں نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے ماں کے چہرے کی طرف دیکھا۔ آتش دان کے بھڑکتے شعلوں کی پرتپش روشنی میں مجھے ماں کا چہرہ بھی بھڑکتا محسوس ہوا۔ میں نے جواباً کہا۔

''ورجینیا میں اس کی کوئی آنٹی رہتی ہیں۔ نگینہ انہی کے پاس ٹھہرے گی۔''

"ان کا کوئی ٹیلی فون نمبر نہیں دیا تھا نگینہ نے تمہیں؟"

"نہیں۔"

"تو پھر اب یہ کیسے معلوم ہو کہ شاہ میر زندہ ہے یا مر چکا ہے؟" ماں کے لہجے میں ایکا ایکی شعلوں تپش عود کر آئی۔ میں نے چائے کا آخری گھونٹ بھر کر خالی کپ تپائی پر رکھا اور بولا۔

"میں دوبارہ موبائل پر نگینہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ بہ صورت دیگر اب نگینہ خود ہی سے رابطہ........" ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

"فون دیکھو۔" ماں نے مجھ سے گمبھیر لہجے میں کہا مگر میں پہلے ہی اٹھ چکا تھا۔ میں سیدھا فون طرف بڑھا اور ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور ہیلو کہا۔

"ہیلو نادر!........ میں نگینہ بول رہی ہوں۔" دوسری جانب سے نگینہ کی مدھر آواز نے میرے مسرتوں کی بجلیاں دوڑا دیں۔

"ہاں........ ہاں نگینہ! میں........ میں نادر بات کر رہا ہوں۔ تت........ تم کیسی ہو؟ میں سے موبائل پر بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر........"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ابھی موبائل پر انٹرنیشنل رومنگ نہیں کھلی ہے اس لئے اس پر رابطہ نہیں سکے گا۔" وہ میری بات کاٹ کر بولی۔ "میں اپنی آنٹی فرحت کے ہاں سے بول رہی ہوں۔ پپا کو یہاں سینٹ جان ہسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے۔ علاج ہو رہا ہے۔ نیورو سرجنز نے کچھ امید تو دلائی ہے دیکھیں کیا بنتا ہے۔ تم سناؤ، کیسے ہو؟........ آنٹی کیسی ہیں؟ میرا ان سے سلام کہنا۔"

"ہاں........ وہ بھی بالکل ٹھیک ہیں۔" میں اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پر بہ مشکل قابو پا ہوئے بولا۔ "خدا کا شکر ہے تم خیریت سے ہو۔ میں تو پریشان ہو گیا تھا۔ اچھا یہ بتاؤ، کتنے روز لگیں تمہیں وہاں؟" میں نے آخر میں پوچھا۔

"ابھی تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "بس تم اپنا خیال رکھنا نادر! میری فکر نہ کرو۔"

"ہاں........" میں نے مختصراً کہا۔ ماں کی موجودگی کے باعث میں اس سے زیادہ کھل کر گفتگو نہ کر پا رہا تھا اور شاید نگینہ نے بھی یہ بات میرے لہجے اور میری بے تابانہ گفتگو کی بے ربطی سے محسوس کر تھی، بولی۔

"کیا آنٹی تمہارے آس پاس ہیں؟"

"ہاں۔" میں نے پھر مختصراً جواب دیا اور اچانک اس سے بولا۔ "نگینہ! تم اپنی آنٹی فرحت کا ٹیلی فون نمبر مجھے دے دو۔ میں اسی نمبر پر بات کر لیا کروں گا۔"

"میں گھر پر تو کم ہی ہوتی ہوں۔ زیادہ تر ہسپتال میں پپا کے پاس ہوتی ہوں۔ خیر، میں آنٹی کے کے ساتھ ہسپتال کا نمبر بھی دے دیتی ہوں۔" اس نے کہا اور پھر نمبر بتانے لگی۔ میں نے اپنے موبائل دونوں نمبر نوٹ کر لئے۔ اس کے بعد نگینہ نے خدا حافظ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔ میں چند ثانیے گم صم کھڑا رہا۔ نگینہ کی مدھر آواز میرے دل و دماغ میں کئی لمحات تک گونجتی رہی۔ اس کے بعد اچانک پھر ماں کی یہاں موجودگی کا خیال آیا اور پھر میں ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے ریسیور رکھ کر ماں پاس رکھی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔

ماں کی سپاٹ مگر سرایت کرتی ہوئی نگاہیں میرے چہرے پر جیسے گڑ کر رہ گئی تھیں۔

"کیا کہہ رہی تھی نگینہ؟" معاً ماں نے پوچھا۔ میں نے مختصراً ان کے کام کی بات بتا دی۔ وہ چند ثانیے کسی گہری سوچ میں ڈوبی رہنے کے بعد جیسے مجھے "ہدایات" دیتے ہوئے بولیں۔

"نگینہ سے رابطے میں رہنا۔ تاکہ ہمیں یہ معلوم ہوتا رہے کہ شاہ میر زندگی سے کتنا دور اور موت سے کس قدر قریب ہے؟"

"اچھا ماں!" میں نے مختصراً کہا۔ آتش دان میں شعلے چیخ رہے تھے۔ پھر چند ثانیوں کی دم بہ خود خاموشی کے بعد ماں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

"نادر بیٹا! ہمیں اپنے دشمن نظر حیات پر بہت جلد ایک اور فیصلہ کن وار کرنے کا سنہری موقع ملا ہے۔" ماں کے لہجے سے جوش غیظ کی تپش مترشح تھی۔ ماں کی طرف سے اچانک موضوع بدلتے ہی میں ان کی گفتگو میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا تھا اور نظر حیات کے ذکر پر ماں کی زبانی کسی سنہری موقع کا سنتے ہی ایکا ایکی میری رگوں میں خون کی گردش تیز تر ہو گئی۔ "وہ مردود پرسوں دوپہر میں کسی وقت پنڈی سے یہاں نتھیا گلی میں مقیم اپنے ایک ٹھیکے دار دوست کے ہاں پہنچنے والا ہے۔ وہ دونوں برفانی لومڑیوں کے شکار کی غرض سے بٹ راس اور کمال بن کے گھنے جنگلات جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"ماں! یہ تو بہت اہم خبر ملی آپ کو۔" میں نے بے اختیار جوشِ مسرت سے کہا۔ "لیکن ماں! یہ اہم اطلاع آپ کو کس نے دی ہے؟"

ماں نے اچانک میری بات کاٹ کر کہا۔ "اعظم خان کے آدمی وزیر خان نے۔"

"اسے اتنی اہم خبر کیسے ملی؟"

"اتفاق سے نظر حیات کے ٹھیکے دار دوست کے ایک آدمی سے باتوں باتوں میں اسے اس بات کا علم بس اتفاقاً ہی ہوا تھا اور اس نے فوراً ہی یہ خبر اعظم خان تک پہنچا دی۔"

"نظر حیات کے ٹھیکے دار دوست کا نام؟" میں نے کسی دھڑکتے خیال کے تحت پوچھا۔

"رب نواز۔"

"کیا........؟" میں اس نام پر بری طرح چونکا۔

"کیا تم اسے جانتے ہو؟" میرے ردِعمل پر ماں نے بھی قدرے چونک کر پوچھا تو میں نے زیادہ تفصیل میں جانے کی بجائے صرف اس قدر ہی بتانا مناسب سمجھا کہ اس سے میرے بھی کاروباری روابط رہ چکے تھے، وغیرہ۔

"کیا تمہیں اس کی رہائش گاہ کا علم ہے؟" ماں نے پوچھا تو میں نے جواباً اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

"ہاں ماں!"

"تو بس ٹھیک ہے پھر۔" ماں نے اچانک پُرجوش قطعیت سے کہا۔ "ہمیں پرسوں صبح ہی سے ٹھیکے دار رب نواز کی رہائش گاہ کا محاصرہ کرنا ہو گا۔ اور جیسے ہی وہ دونوں روانہ ہوں، ہمیں ان کا تعاقب کر کے راستے میں ہی نظر حیات کو جہنم واصل کرنا ہو گا۔"

"میرے ذہن میں ایک اور طریقہ بھی آتا ہے ماں!" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تو ماں مستفسرانہ نگاہوں سے میرا چہرہ تکنے لگیں۔

"نظر حیات جیسے خطرناک دشمن کو ہلاک کرنے کے لئے ہمیں تعاقب کا رسک لئے بغیر پہلے سے جال بچھا کر گھات لگانا زیادہ بہتر ہو گا۔" میں نے کہا۔ "اگر ہم پہلے سے بٹ راس یا کمال بن کے جنگل

میں کسی محفوظ مقام پر پہنچ کر گھات لگائیں تو ہمیں شکار کو پھانسنے میں زیادہ آسانی ہو گی۔"

میری بات پر ماں کچھ سوچ میں پڑ گئیں۔ اس کے بعد بولیں۔

"یہ ہمارا ایک غیر تسلی بخش عمل ہو گا۔ گھات لگانے سے پہلے یہ تسلی کرنا زیادہ ضروری ہے کہ وہ کس وقت اور کہاں کا رخ کرنے والا ہے۔ اس لئے بہتر طریقہ تعاقب کے سوا مجھے نظر نہیں آتا۔"

"لیکن ماں! یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ اگر یہ کام مکمل طور پر میری صوابدید پر چھوڑ دیں تو میں ... اور بہت جلد اس اہم کام کو نمٹا لوں گا۔"

"نہیں، شاہ میر کا اپنے ہاتھوں حشر خراب کر کے میرے سینے کی آگ کو جو تسکین حاصل ہوئی ... اب وہی تسکین میں خود اپنے ہاتھوں سے نظر حیات کی جان لے کر دوبارہ حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ ... کے لہجے میں شعلوں کی لپک تھی جسے محسوس کر کے میں نے ہولے سے اثبات میں سر کو جنبش دی اور ...

"ٹھیک ہے ماں! جیسے آپ کی مرضی۔ میں تیار ہوں۔"

"میں نے اعظم خان کو اپنے لائحہ عمل سے آگاہ کر دیا ہے۔ وہ اپنے کچھ آدمی بھی میری مدد ... چاہتے تھے مگر میں نے صاف انکار کر کے ان سے کہہ دیا تھا کہ اپنے دشمن کو ٹھکانے لگانے کے لئے ... اور میرا بیٹا نادر ہی کافی ہے۔"

ماں کی اس بات پر میرا رواں رواں مسرت سے جھوم اٹھا۔

"آپ نے بالکل ٹھیک کہا انکل اعظم خان سے۔ بلکہ میں تو اکیلا ہی کافی تھا۔ مگر آپ......" ... نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو ماں مسکراہٹ بھرے لہجے میں بولی۔

"میں جانتی ہوں نادر بیٹا! کم از کم نظر حیات کے معاملے میں تم مجھ سے بد دیانتی نہیں کر سکتے۔"

ماں کی اس بات پر اچانک میرے دل پر ایک گھونسہ لگا۔ انہوں نے یہ بات شاید اس لئے کہی تھی کہ ... وہ نگینہ کا باپ نہیں تھا۔ میں بدمزگی بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ ماں کی بات سے مجھے دکھ تو ہوا تھا مگر میں ... خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ ماں نے بھی مزید کوئی بات نہ کی تھی۔ پھر ہم دونوں خاصی دیر بیٹھے ... کی صورتِ حال پر غور کرتے رہے۔

اگلے دن صبح تک ہم ماں بیٹا ایک مضبوط اور مربوط لائحہ عمل ترتیب دے چکے تھے۔ مگر میں نے ... منصوبے کو مزید سرعت کے ساتھ انجام دینے کی غرض سے ماں کے علم میں لائے بغیر تھوڑی ترمیم کر ... ذرا اپنے انداز سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے فوری طور پر ایک منصوبہ بنایا۔

ناشتہ وغیرہ کرنے کے بعد میں جیپ لے کر گرین لاج سے ٹال کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے ... جیپ کی رفتار میں نے ذرا ہلکی کرتے ہوئے اپنی جیب سے موبائل نکالا اور کاشانہ سے رابطہ کیا۔

"ہیلو نادر! خیریت؟" دوسری طرف سے اس کی دل موہ لینے والی خوب صورت آواز ابھری ... کے لہجے میں ہلکی سی حیرت تھی۔ شاید اسے میرے اتنی جلدی دوبارہ رابطہ کرنے کی توقع نہ تھی یا پھر ... سمجھی تھی کہ نگینہ کا فون آیا ہو گا اور اب میں اس کو مطلع کرنا چاہتا تھا۔ اگرچہ یہ کسی حد تک درست بھی ... تاہم میں نے کہا۔ "ہاں! خیریت ہی ہے۔ تم سے ایک بات کرنا تھی۔ بہت ضروری۔"

"ہاں، ہاں......کہو۔ کیا نگینہ کا فون آیا تھا امریکہ سے؟" حسب توقع اس نے میری اچانک ... کا یہی مطلب لیا تھا۔ تاہم میں نے اسے نگینہ کے فون کے بارے میں مختصراً آگاہ کرنے کے بعد ...

"مگر میں نے تم سے کسی اور سلسلے میں بات کرنا تھی۔ پہلے یہ بتاؤ، اس وقت تم ہو کہاں؟ میرا مطلب ... گھر پر ہو یا کہیں باہر؟"

"میں گھر پر ہی ہوں۔"

"تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"آ جاؤ......یا پھر میں آ جاتی ہوں تمہارے ٹال پر۔"

"نہیں، تم ایسا کرو، مری پارک میں آ جاؤ۔"

"ٹھیک ہے......آ جاتی ہوں۔" اس نے بلاتوقف آمادگی ظاہر کی۔

"پھر ابھی نکل رہی ہو؟"

"ہاں۔" اس نے گویا یقین دلانے کی کوشش کی۔

"ٹھیک ہے......میں بھی وہیں پہنچ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے رابطہ منقطع کر کے جیپ کی رفتار بڑھا دی۔ مری پارک زیادہ دور نہ تھا۔ مال روڈ پر ہی تھا۔ پہلے یہ "باغ شہیداں" کے نام سے موسوم تھا۔ مگر یہ بہت اجاڑ اور خود رو جھاڑیوں کا منظر پیش کرتا تھا۔ لیکن یہ بہت پہلے کی بات تھی۔ اب اسے نئے سرے سے بنایا گیا تھا اور عام مقامی لوگ اسے باغِ شہیداں کی بجائے مری باغ ہی کہنے لگے تھے۔ بہرطور میں سیدھا وہاں پہنچا تو تھوڑی دیر بعد ہی کاشانہ بھی اپنی کار میں وہاں آ پہنچی۔

"خیریت تو ہے نادر! کیا بات ہے؟" کار سے اترنے کے بعد کاشانہ نے مجھ سے پوچھا۔ اس نے اپنی کار میری جیپ کے قریب ہی کھڑی کر دی تھی۔ ہم باغ میں چہل قدمی کرنے لگے۔ میں نے جواباً اسے ماں کو ملنے والی اطلاع کے بارے میں بتا دیا جسے سن کر اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔

"یہ تو بڑا ہی حیرت انگیز اور سنگین اتفاق ہے۔" وہ حیرت بھرے لہجے میں بولی۔ "خیر......رب نواز ان دنوں معمول کے مطابق لومڑیوں کے شکار پر جاتا تو ہے لیکن مجھے یہ علم نہ تھا کہ اس کا پرسوں ہی جانے کا پروگرام ہے اور وہ بھی نظر حیات کے ساتھ۔ چلو، یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ دونوں سے ایک ساتھ ہی نمٹنے کا تمہیں موقع مل جائے گا......لیکن......"

اتنا کہنے کے بعد وہ خاموش ہو گئی تو میں نے پوچھا۔ "لیکن کیا؟"

"میرا خیال ہے نظر حیات کو ہلاک کرنے کی بجائے تمہیں میرے ہی مشورے کے مطابق اسے خوف زدہ کرنا چاہئے۔"

"لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا۔ کیونکہ یہ ماں کا منصوبہ ہے۔ اور سب سے پہلے اسے ہی یہ بات معلوم ہوئی ہے۔ میں ان کی مدد تو کر سکتا ہوں لیکن ان کے منصوبے میں کسی قسم کی "ترمیم" کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں، ٹھیک ہے۔ مگر رب نواز کا کیا کرو گے؟" اس نے پوچھا تو میں کہنے لگا۔

"وہ بھی زد میں آ سکتا ہے۔ لیکن ہمارا اصل شکار نظر حیات ہی ہو گا۔"

"نادر! نظر حیات کی موت سے تم ماں بیٹا مشکل میں بھی پھنس سکتے ہو۔ پولیس کا شک سیدھا تم ماں بیٹے کی طرف ہی جائے گا۔ ابھی شاہ میر والا مسئلہ بھی تازہ ہے۔ بے شک اس سلسلے میں حریف کی طرف سے کوئی قانونی کارروائی عمل میں نہیں لائی گئی مگر اب بقول تمہارے نظر حیات کا بیٹا کبیر بھی واپس آ چکا ہے۔ لہٰذا گڑبڑ کا امکان سو فیصد ہے۔"

"کوئی ثبوت چھوڑیں گے تو پکڑے جائیں گے نا۔" میں نے کہا۔

"کچھ بھی سہی، کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی معمولی سی غلطی یا بھول چوک ہو ہی جاتی ہے۔" وہ مدبرانہ انداز میں بولی۔

’’لیکن اب کیا، کیا جا سکتا ہے؟ ماں کو سمجھانے بجھانے کی پوزیشن میں تو ویسے میں نہیں ہوں۔ یہ بات
بھی انہوں نے جانے کیسے مجھے بتا دی ہے۔ ورنہ تو نگینہ والے معاملے کے بعد سے ماں نے تو اشاروں
کنایوں میں مجھے شاہ میر اور نظر حیات والے معاملے سے ہی الگ کر دینے کی دھمکی دے ڈالی تھی۔ اب
اگر میں نے کوئی ذراسی بھی آنا کانی کی یا بحث کرنے کی کوشش کی تو ماں کے دل میں میرے خلاف غلط
مزید تقویت حاصل کر لے گی۔ لہٰذا اب میرے لئے بھی ماں کے دل سے اپنے خلاف غلط فہمی دور کرنے
ایک سنہری موقع ہے جسے میں ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا۔ بلکہ ماں نے تو یہ بات مجھے بتاتے ہوئے
اور مجھے اس مہم میں شامل کرتے ہوئے طنزیہ انداز میں یہ بھی کہا تھا کہ ’’نادر بیٹے! مجھے یقین ہے کہ تم
از کم نظر حیات والے معاملے میں مجھ سے بد دیانتی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ نگینہ کا باپ نہیں ہے۔‘‘

’’ہوں.........تمہاری بات درست ہے۔ بہر حال مجھے بتاؤ، میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد کر
ہوں؟‘‘ اس نے استفساریہ نظروں سے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

’’تم فقط اتنا کرنا کہ نظر حیات کی آمد پر مجھے بروقت اطلاع کر دینا اور ان دونوں شیطانوں
پروگرام پر ذرا نظر رکھنے کی کوشش کرنا تا کہ یہ بات کنفرم ہو جائے کہ ان لوگوں کا شکار پر جانے کا پر
پرسوں کا پکا ہی ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے.........اتنا تو میں کر ہی سکتی ہوں۔‘‘ کاشانہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

ہم دونوں ذرا دیر باغ میں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے چہل قدمی کرتے رہے۔ میرے اور نگینہ وا
معاملے کے سلسلے میں اس کی دلچسپی اور درپردہ مشاورت و گفتگو نے مجھے اس کی ہمراہی میں رہنے پر
کر دیا تھا۔ ہم نے کافی پی۔ اس کے بعد ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ کر لوٹنے لگے۔ کاشانہ دوسرے
سے کار نکال لے گئی۔ اور میں جیپ کی طرف پلٹنے لگا تو اچانک مجھے محض چند قدموں کے فاصلے پر کبیر
تیز قدموں سے ایک طرف جاتا دکھائی دیا۔

اسے دیکھ کر میرے ذہن میں کل سہ پہر کا واقعہ تازہ ہو گیا جب میں لنچ کرنے کے بعد کاشانہ کی
رہائش گاہ سے نکل رہا تھا اور مجھے کوئی شخص تیزی کے ساتھ سامنے کی گھنی جھاڑیوں میں گھستا نظر آیا
اب اس وقت کبیر کو یوں اچانک جاتا دیکھ کر یونہی میرا خیال اس طرف چلا گیا تھا اور مجھے لگا کہ اس کا
اس سے کچھ نہ کچھ تعلق تھا۔ کیا خبر یہ وہی ہو۔ تیز تیز چلنے کے انداز سے صاف لگ رہا تھا کہ تھوڑی
پہلے وہ یہاں موجود تھا اور میری اور کاشانہ کی حرکات و سکنات کو نظروں میں لئے ہوئے تھا۔ اتنا تو
یقین تھا کہ وہ میری اور کاشانہ کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ایک لفظ بھی نہیں سن سکا ہوگا۔ تاہم
اس مقام پر موجودگی خالی از علت نہیں ہو سکتی تھی۔ دل میں تو آئی کہ اسے آواز دوں۔ مگر پھر یہ سوچا
سکتا ہے وہ میرا وہم ہو اور کبیر اپنے ہی کسی کام سے یہاں آیا ہو۔ وہ گیٹ سے نکل کر باہر غائب
تھا۔ میرا ذہن الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔ بہرطور میں نے اپنی جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور ٹال کی
طرف روانہ ہو گیا۔ ٹال پہنچا تو سارے مزدور ایک جگہ اکٹھے مجمع کی صورت کھڑے تھے۔ منیجر مشتاق
ان کے درمیان موجود تھا۔ اس کے چہرے سے ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں جیسے ہی جیپ سے
ہانپتا کانپتا میری جانب بڑھا۔

’’دسس.........سر جی! وہ غضب ہو گیا، جی کڑاکے!‘‘ میرے قریب آ کر اس نے ہانپتی ہوئی
آواز میں کہا۔

’’کیا ہوا؟.........جلدی بتاؤ۔‘‘ میں نے اپنے دل کی بڑھتی ہوئی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہو

تیز لہجے میں پوچھا۔

’’سر جی! ہمارا لاکھوں کا مال چوری ہو گیا۔‘‘ اس نے کپکپاتے لہجے میں کہا۔

’’کس طرح؟.........کون سا مال؟‘‘ میں جیسے ایک جھٹکے سے سنبھلتے ہوئے بولا۔

’’سر جی! ہم نے آج صبح ہی صبح تڑکے ’’دیدہ زیب فرنیچر مارٹ‘‘ والوں کو شیشم اور شاہ بلوط کے جو
تین ٹرک روانہ کئے تھے، وہ راستے میں ہی اڑا لئے گئے۔‘‘

’’کیا؟.........تت.........تمہیں کیسے پتہ چلا؟.........پھر تو چوری نہ ہوئی، ڈکیتی کی واردات
ہوئی۔‘‘ میرے جیسے اوسان خطا ہو گئے۔ کیونکہ ان ٹرکوں میں پورے نوے لاکھ مالیت کے شہتیر لدے
ہوئے تھے اور آج صبح چھ بجے وہ ٹال سے لاہور کے لئے روانہ کئے گئے تھے۔

’’سر جی! اندر آئیں۔ ایک ڈرائیور ہانپتا کانپتا یہاں پہنچا تھا۔ وہ خاصا زخمی ہے۔ میں نے اسے آپ
کے آفس میں.........‘‘ منیجر نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ میں گولی کی طرح اپنے آفس کی طرف لپکا۔ وہ
ڈرائیور لمبی سی سیٹی پر دراز کراہ رہا تھا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور ایک بازو میں کھپچیاں باندھ کر
گلے سے جھولتی بینڈیج کی پٹی سے سپورٹ دے رکھی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

’’کیا ہوا لال خان! یہ سب کیسے اور کب ہوا؟‘‘ میں نے اس سے پوچھا۔ وہ اکثر ہمارا مال لاتا، لے
جاتا رہتا تھا۔

’’صاحب جی! ہم جیسے ہی روانہ ہوئے تو بیس پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر دس بارہ مسلح نقاب پوشوں
نے ہمارے تینوں ٹرک روک لئے اور ہمیں گن پوائنٹ پر نیچے اتار دیا.........ہم نے مزاحمت کرنے کی
کوشش کی تو ہمیں بری طرح زخمی کر دیا گیا۔ میں خود بڑی مشکلوں سے جان بچا کر کسی سے لفٹ لے کر
یہاں تک پہنچا اور سب سے پہلے ایک قریبی کلینک میں مرہم پٹی کروائی تا کہ خون بہنا بند ہو۔ اور پھر
یہاں آ گیا۔‘‘

میں نے بہ غور اس کی بات سنی اور پھر قریب کھڑے منیجر مشتاق سے کہا۔ ’’تم اسے لے کر سیدھا
تھانے چلے جاؤ۔ میں دیکھتا ہوں، یہ کس کی حرکت ہے۔‘‘

یہ کہہ کر میں جیپ میں سوار ہو کر آندھی طوفان کی طرح روانہ ہو گیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ یہ حرکت
ٹھیکے دار رب نواز اور اس کے غنڈے گگل خان کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ میرا رخ رب نواز کے آفس کی طرف تھا۔ میں آندھی طوفان کی طرح جیپ اڑاتا ہوا نواز ووڈ
مرچنٹ کے دفتر پہنچا تو وہاں چوکیدار اور ایک چپڑاسی کے سوا کوئی نہیں ملا۔ میں نے چپڑاسی سے پہلے
گگل خان کے بارے میں دریافت کیا۔ پھر چالاکی کے ساتھ اس کے گوداموں کا جائزہ لیا مگر مجھے اپنے
مال کی ذرا بھی جھلک نہ دکھائی دی۔

وہاں سے میں جیپ میں سوار ہوا اور سیدھا ڈرائیور لال خان کے بتائے ہوئے پتے کی طرف روانہ
ہو گیا۔ راستے میں اچانک مجھے کاشانہ کا خیال آیا۔ وہ ٹھیکے دار رب نواز کے گھر کی بھیدی تھی۔ رب نواز
نے میری پیٹھ میں خنجر گھونپا تھا اور میں اسے اچھی طرح سبق سکھانا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے جیپ کی رفتار
دھیمی کر کے موبائل پر کاشانہ سے رابطہ کر کے اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ میری بات سن کر ایک
لمحے کو تو وہ جیسے سن ہو کر رہ گئی تھی۔ پھر مضطرب لہجے میں بولی۔

’’نادر! تم جوش میں آ کر ابھی کوئی ایسا ویسا قدم مت اٹھانا۔ مجھے کچھ سوچنے دو۔ ویسے تمہاری طرح
مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ یہ حرکت رب نواز اور گگل خان ہی کی ہو سکتی ہے۔‘‘ اتنا کہہ کر چند

دوئم

ثانیے تک کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔ ''تم مجھے تھوڑا سا وقت دو، میں کچھ کرتی ہوں۔ پھر تمہیں کال کر دوں گی کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ تم میری کال کا انتظار کرنا۔''

اس کے بعد اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ میں سیدھا ڈرائیور لعل خان کے بتائے ہوئے اس مقام پر پہنچا جہاں یہ واردات ہوئی تھی۔ وہاں چہار اطراف ویرانے کے سوا کچھ نہ تھا۔

البتہ ایک جگہ مجھے سڑک کے دائیں جانب ذرا دور اونچا سا ''ٹبہ'' نظر آیا جس پر سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ قریب ہی دھواں اُگلتی چمنی بھی نظر آئی۔ یہ اینٹوں کا بھٹا تھا۔ میں جیپ لے کر فوراً کچے میں اترا اور سیدھا اینٹوں کے بھٹے پر پہنچا۔ وہاں سے میں نے مزدوروں سے معلوم کیا کہ انہوں نے تین ٹرکوں کو کہیں نیچے کی طرف جاتے دیکھا تھا؟

''ہاں صاحب! ابھی دو ڈھائی گھنٹے پہلے ہی کی بات ہے۔'' ایک مدقوق سے مزدور نے پُرجوش لہجے میں بتایا۔ ''وہاں سامنے سڑک پر تین ٹرک تھوڑی دیر تک تو رکے رہے، پھر سڑک کی دوسری طرف کچے علاقے میں اتر گئے تھے۔''

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور تیزی سے جیپ میں سوار ہو کر واپس سڑک کی طرف پلٹا اور اس کے بتائے ہوئے مقام پر مجھے ایک خاصا چوڑا مگر کچا اور بل کھاتا راستہ ترائی میں جاتا نظر آیا۔ میں اس راستے پر ہولیا۔ میرے دائیں بائیں چیڑ، صنوبر اور دوسری اقسام کے درخت ایستادہ تھے۔ ذرا نیچے جانے کے بعد میں رک گیا اور جیپ سے اتر کر کچے میں رکوع کے بل جھک کر کچھ دیکھنے لگا۔ میری کنپٹیاں سنسنانے لگیں۔ یہاں ٹرک کے چوڑے ٹائروں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے۔ میں فوراً دوبارہ جیپ میں سوار ہوا اور آگے روانہ ہو گیا۔

میں نیچے ترائی میں اتر گیا تھا۔ یہ کچا راستہ شیطان کی آنت کی طرح طویل ہوتا جا رہا تھا جو جنگلوں کے درمیان سے بل کھاتا ہوا دور تک جاتا نظر آ رہا تھا۔ راستہ کچا اور بھربھری مٹی والا ہونے کے باعث ٹرک کے ٹائروں کے نشانات بہت واضح نظر آ رہے تھے۔ نصف گھنٹے بعد برف پوش پہاڑوں کی وادی بہت قریب محسوس ہونے لگی۔ ایک مقام پر مجھے آبادی کے آثار نظر آئے۔ میں نے جیپ کی رفتار مزید بڑھا دی۔

کاشانہ نے ابھی تک وعدے کے مطابق مجھ سے دوبارہ سیل فون پر رابطہ نہیں کیا تھا۔ جب لکڑی کی ڈھلوانی چھتوں والے گھروں کے جابجا بکھرے ہوئے سلسلے قریب آنے لگے تو میں نے ایک ہوٹل نما چائے خانے کے قریب جیپ لے جا کر روک دی اور وہاں موجود چند گاہکوں کو چھوڑ کر ہوٹل والے سے تین ٹرکوں کے بارے میں دریافت کیا تو ایک نوعمر بیرے نے بتایا کہ تین ٹرک یہاں سے گزرے تھے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور آگے روانہ ہو گیا۔

خاصی دور جا کر کچا راستہ قوس کی صورت میں بائیں جانب گھوم رہا تھا۔ میں نے جیسے ہی جیپ اس جانب موڑی تو اچانک مجھے اس راستے سے لمبا اور کچا راستہ بائیں جانب جاتا دکھائی دیا۔ میں تصدیق کی خاطر جیپ روک کر نیچے اتر گیا اور جھک کر ٹائروں کے نشانات دیکھنے لگا تو یہ نشانات مجھے سیدھے راستے پر آگے جانے کی بجائے مذکورہ بائیں جانب دوسرے راستے پر گھومتے دکھائی دیئے۔ یہ راستہ تنگ تھا مگر ٹرک یہاں سے جا سکتا تھا۔ البتہ سامنے سے آنے والی کسی دوسری گاڑی کو راستہ نہیں دے سکتا تھا۔

بہرطور میں اس راستے پر ہولیا۔ قریباً کوئی پندرہ سولہ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک جانب سرسبز میدان نظر آیا۔ اگرچہ یہاں بھی صنوبر، چیڑ کے درخت ایستادہ تھے مگر ان کی تعداد

دوئم

یکایک ہی مجھے اپنی داہنی طرف ذرا دور ایک طرف بڑی سی ڈھلوانی چھت والی مستطیل چوبی عمارت نظر آئی اور سب سے اہم بات جس نے بے اختیار میری رگوں میں خون کی گردش تیز کر دی تھی، وہ یہ تھی کہ ٹرک کے ٹائروں کے نشانات اسی سمت مڑ رہے تھے۔ میں نے کچھ سوچ کر جیپ وہیں جھاڑیوں کے جھنڈ میں روک دی اور نیچے اتر آیا۔ میرا میگارد حسب معمول میرے پاس موجود تھا مگر فاضل راؤنڈ میرے پاس نہیں تھے۔ سردست میرے لئے یہی کافی تھا۔

میں جیپ سے اتر کر درختوں اور اوک اور سلور فر کی جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا مذکورہ عمارت کی طرف بڑھنے لگا۔ ذرا قریب پہنچا تو یکلخت میری کنپٹیوں پر خون اچھال مارنے لگا۔ عمارت کے باہر سرمائی دھوپ میں چار پانچ افراد کرسیوں پر بیٹھے چائے پیتے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ان میں لمبے چوڑے وجود والا جسیم، گگل خان بھی تھا۔ میری عقابی نظریں اوک کی گھنی جھاڑیوں کے عقب میں عمارت کا جائزہ لینے لگیں مگر میرے دل و دماغ میں یکایک ہونے والی ہلچل کی اصل وجہ عمارت کے سامنے کھڑے وہ تین ٹرک (چھ ٹائروں والے) تھے جن میں سے مسروقہ مال اتارا جا رہا تھا۔ مجھے یہ عمارت گودام ٹائپ نظر آ رہی تھی جس میں مجھے تین بڑے بڑے دیوہیکل گیٹ نظر آ رہے تھے۔ پندرہ سولہ مزدور میرے چوری شدہ ٹرکوں سے بڑے بڑے شہتیر اٹھا کر اندر گودام میں لے جا رہے تھے۔

اس دیدہ دلیری پر میرا پورا وجود قہر و غضب کے مارے جلنے لگا۔ اب تو مجھے پورا یقین ہو چلا تھا کہ مردود گگل خان نے اپنے گرو رب نواز کے ہی ایما پر اپنے چاروں ساتھیوں کی مدد سے میرے تین ٹرک چوری کر کے یہاں تک پہنچائے تھے۔

گودام کی پیشانی پر سیاہ رنگ کے بڑے بڑے حروف سے ''نواز ووڈ مرچنٹ ائز'' لکھا ہوا تھا۔ میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ فوراً ہی اپنی جیب سے زوم لینس کیمرے والا موبائل سیٹ نکالا اور تقریباً نصف گھنٹے تک وہیں جھاڑیوں میں دبکا ان کی مووی بناتا رہا۔ میں نے وہاں موجود گگل خان سمیت اس کے پانچوں قریبی ساتھیوں اور مزدوروں کے چہروں کو اور اپنے ٹرکوں، ان کی نمبر پلیٹس کے علاوہ گودام کی پیشانی پر لگے ''نواز ووڈ مرچنٹ ائز'' کے حروف کو بھی اچھی طرح فوکس کرنے کے بعد مووی کو محفوظ کر ڈالا۔ میرا ذہن اب تیزی سے کام کر رہا تھا۔

اس دوران میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ کاشانہ کی کسی وقت بھی کال آ سکتی ہے اور مجھے پہلے ہی سے احتیاطاً اپنے موبائل کی ٹون آف کر کے وائبریٹنگ الرٹ پر سیٹ کر دینی چاہئے تھی۔ مگر اس کا وقت نکل چکا تھا اور میرا فون گنگنا رہا تھا۔ گودام سے میرا فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ یہی سبب تھا کہ میرے موبائل کی رنگ ٹون اس خاموش ماحول میں بم دھماکے کی طرح گونجی۔ گگل خان اور اس کے پانچوں ساتھی اس آواز پر یوں اچھلے جیسے انہیں بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ میں نے موبائل آف کر دیا اور اپنی جیب سے میگارد نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور تیزی کے ساتھ جھاڑیوں میں دائیں جانب رینگتا چلا گیا۔

ادھر گگل خان نے بھی فوراً پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا اور اپنے پانچوں ساتھیوں سمیت دوڑتا ہوا اس سمت بڑھا جہاں ذرا دیر پہلے میں چھپا بیٹھا تھا۔ ان پر اس وقت خون سوار تھا۔ یہ لوگ کیونکہ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تھے، اس لئے ممکن تھا کہ وہ مجھے دیکھتے ہی گولی مار دیں۔ میں دشمنوں کو گھیرنے کی خاطر مزید گھنی جھاڑیوں کی طرف چلا گیا۔ وہ لوگ بھی جھاڑیوں میں گھسنے لگے۔ گگل خان نے تو اب خونخوار اور پھٹی پھٹی وحشیانہ آواز میں دھاڑنا بھی شروع کر دیا تھا۔

''کون ہے؟........ باہر نکل آؤ........ ورنہ گولیوں سے بھون کر رکھ دوں گا۔''

مگر میں ایک جگہ گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ گگل خان کے پانچوں ساتھی اس کی ہدایت پر دو اطراف پر پھیل کر آگے بڑھ رہے تھے۔ مگر میں سب سے پہلے گگل خان پر قابو پانا چاہتا تھا۔ اور پھر جیسے ہی وہ ذرا قریب آیا، میں چیتے کی طرح اس پر جھپٹا۔ سب سے پہلے میں نے اپنی لات اس کے پستول والے ہاتھ پر رسید کر ڈالی۔ پستول اس کے ہاتھ سے طوطے کی طرح اُڑ گیا۔

پھر جب تک وہ سنبھلتا، میں نے اس پر اپنا میگارد تان لیا اور غرا کر بولا۔ ''خبردار! کوئی حرکت مت کرنا۔ ورنہ.........'' ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک میری کمر پر کسی نے زوردار لات رسید کر دی۔ یہ اچانک اور پشت پر حملہ تھا۔ میں مار کھا گیا اور جھاڑیوں میں گرا۔ پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ گرتے ہی میں نے سنبھلنے کی کوشش کی تو گگل خان اور اس کے دو ساتھی مجھ پر بیک وقت پل پڑے اور مجھے قابو کر لیا۔ گگل خان نے اپنا اور میرا پستول تلاش کر کے اپنے قبضے میں کر لیا اور میری طرف کینہ توز نظروں سے گھورنے لگا.........اُس کے بدہیئت ہونٹوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ رقصاں تھی۔



''لے چلو اسے۔'' اس نے اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا۔ تب تک اس کے باقی تین ساتھی بھی یہاں آن دھمکے تھے۔ مجھے جھاڑیوں سے نکال کر باہر گودام کے سامنے والی کھلی جگہ پر لایا گیا۔ باقی مزدور بھی اپنا کام چھوڑ کر ہماری طرف ہی متوجہ تھے۔

''تم لوگ اپنا کام کرو، جلدی۔'' گگل خان نے مزدوروں کو جھڑکا۔ یہ بھی انہی کے زرخرید کتے لگتے تھے۔ وہ فوراً اپنے کام میں جت گئے۔ گگل خان نے اپنے تین آدمیوں کو وہیں مزدوروں سے مال اتروانے پر کھڑا رہنے کی ہدایت کی اور پھر باقی دو ساتھیوں کو لئے گودام کے اندر نسبتاً کشادہ ہال کمرے میں لے آیا۔

یہاں دو تین کھری چارپائیاں اور لکڑی کی تین بینچوں کے علاوہ چند کرسیاں بھی دھری ہوئی تھیں۔

''گگل خان! تم نے میرے ٹرک چوری کرنے کی جرأت کیسے کی؟'' میں نے مفتوح ہونے کے باوجود سامنے کھڑے گگل خان سے گرج دار آواز میں کہا۔ مگر وہ میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے دونوں ساتھیوں سے تحکمانہ انداز میں بولا۔

''اس کی تلاشی لو .... اور جو بھی شے برآمد ہو اسے اپنے قبضے میں کر لو۔'' اس کی بات پر میں پریشان ہو گیا۔ تلاشی لینے کی صورت میں میری جیب سے مووی کیمرے والا موبائل برآمد ہو سکتا تھا اور گگل خان جیسا گھاگ انسان کھٹک سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے ایک بار پھر جارحانہ مزاحمت کے لئے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا۔ گگل خان کے ہاتھ میں اس کا اپنا پسول تھا۔ جبکہ میرا میگارد اس کی جیب میں منتقل ہو چکا تھا۔ باقی وہاں موجود اس کے دو آدمی نہتے تھے اور وہی دونوں میری تلاشی لینے کو آگے بڑھے۔

''اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔'' گگل خان نے اچانک ہی مجھے درشتی سے حکم دیا اور میں اسے جلتی سلگتی نظروں سے گھورتا ہوا دوسری طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا اور اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے لمحے کے ہزارویں حصے میں اس خطرناک سچویشن کا اندازہ لگایا اور پھر جیسے ہی وہ دونوں میری تلاشی لینے کے لئے بڑھے، میں کسی طوفانی بگولے کی مانند حرکت میں آیا اور بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ ایک کے پیٹ میں لات رسید کرتے ہی، دوسرے کو دھوبی پٹڑے کے انداز میں قریب ہی کھڑے گگل خان کی طرف دھکیل دیا کہ وہ مجھ پر فوری طور پر گولی بھی نہ چلا سکے......... وہی ہوا۔ وہ اپنے ساتھی کے ساتھ اُلجھ کر رہ گیا۔ پھر جب تک دونوں سنبھلتے، میں نے وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ گگل خان پر جست لگا دی اور اسے رگیدتا ہوا گودام کے پکے فرش پر آ رہا۔ اس کا سر سیمنٹ کے پختہ بلاک سے ٹکرایا۔ اس کے حلق سے زخمی بیل جیسی ڈکراہٹ اُبھری۔ میں نے آناً فاناً اس کے پستول پر قبضہ جمایا مگر دوسرے ہی لمحے اس کے دونوں ساتھی مجھ پر بیک وقت پل پڑے۔ مگر اب میں ان کے قابو میں آنے والا کہاں تھا۔ جیسے ہی ایک نے مجھے عقب سے دبوچنا چاہا اور دوسرے نے میرے پستول والی کلائی کو تھاما، میں نے بائیں بازو کی کہنی سب سے پہلے خو

کو پشت سے دبوچنے والے دشمن کے پیٹ میں رسید کی۔ وہ اپنے حلق سے ''اوغ'' کی بھیانک کراہ چیخ خارج کر کے پیچھے لڑھک گیا۔ پستول پر قبضہ کرنے کی کوشش کرنے والے کو میں نے سوئپ کے ا میں ٹانگ جڑ دی جو اس کی گردن پر لگی۔ وہ بھی پرے لڑھک گیا۔ جبکہ پستول ذرا پرے سرک گیا۔ اٹھ کر اسے اٹھانے کے لئے لپکا تو نیچے پڑے گگل خان نے میری ٹانگ پکڑ لی۔ میں منہ کے بل گر آ رہا مگر فوراً ہی اپنا چہرہ یا پیشانی فرش کی ٹکر سے بچانے کی غرض سے میں نے دونوں ہاتھ فرش پر دیئے اور یک بیک فرش سے اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے ٹانگ گگل خان کے منہ پر جڑ دی۔ وہ ایک پھر بھیانک ڈکراہٹ کے ساتھ دور جا گرا۔ میں نے لپک کر اس کا پستول اٹھا لیا اور سیدھا کھڑا ہو کر پر تان لیا۔ مگر اس اثناء میں گگل خان بھی غیر متوقع پھرتی کے ساتھ کام لیتے ہوئے جیب سے پستول نکال کر مجھ پر تان چکا تھا۔ یہ میرا ہی چھینا ہوا میگارڈ تھا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ اس کے پاس میرا اور میرے پاس اس کا پستول تھا اور ہم دونوں وقت ایک دوسرے پر پستول تانے کھڑے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھا جانے نظروں سے ایک دوسرے کو گھورے جا رہے تھے۔ اس کے دونوں ساتھی بھی اس کے دائیں بائیں کھڑے ہانپ رہے تھے۔

''میری نظریں تمہارے پستول کے ٹرائیگر پر جمی انگلی کی ذرا سی جنبش پر ہیں گگل خان!'' میں گھورتے ہوئے بولا۔ مگر اس بدبخت نے فوراً ایک جانب جست بھر کے گولی چلا دی۔ مگر میں بھی نہیں تھا میرے حواس پوری طرح چوکنے بلکہ بھڑ کے ہوئے تھے لہٰذا جیسے ہی گگل خان نے جست مجھ پر گولی چلائی، میں پہلے ہی بائیں جانب چھلانگ لگا چکا تھا۔ نتیجتاً اس کا نشانہ تو خطا چلا گیا مگر مجھے کرنے کا بعد میں اور بروقت موقع ملا گولی ٹھیک گگل خان کے پستول والے ہاتھ پر لگی اور پستول کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ میری چلائی ہوئی گولی اس کا ہاتھ چھیدتی ہوئی نکل گئی تھی اور زخمی ہاتھ پکڑے بری طرح کراہنے لگا۔ اس کے دوسرے ساتھی کو پستول کی جانب حرکت کرنے کی نہ ہو سکی اور میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اپنا میگارڈ اٹھا لیا اس اثناء میں اس کے دیگر تین سا اندر داخل ہو گئے تھے۔

''کوئی حرکت نہیں کرے گا........ ورنہ سب کو بھون ڈالوں گا'' میں نے دونوں پستول ان پر ہوئے وحشیانہ غراہٹ سے کہا۔ پھر ان سب کو ایک کونے میں گگل خان سمیت اکٹھا کر کے کھڑا کر خود تیزی سے باہر نکلا اور جلدی سے دروازہ بند کر کے گودام کے الگ تھلگ ہال کمرے سے باہر مزدوروں نے جو مجھے اس حالت میں دیکھا تو وہ شہتیر ڈھوتے ہوئے یوں رک گئے جیسے چابی کھلونے چابی ختم ہونے پر رک جاتے ہیں۔ میں نے ان سے چلّا کر کہا۔

''یہ چوری کا مال ہے۔ تم لوگوں کے لئے یہی بہتر ہے کہ جتنا سامان اتارا ہے اسے فوراً واپس ر جلدی۔''

وہ لوگ ڈر گئے۔ لہٰذا فوراً انہوں نے میری ہدایت پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ میں نے اس وقت کھڑے موبائل پر کاشانہ سے رابطہ کر کے اسے ساری حقیقت بیان کر ڈالی۔ پھر اعظم خان اور ما رابطہ کر کے ساری صورت حال سے آگاہ کیا اور یہاں کا اتہ پتہ بھی سمجھا دیا۔

سب سے پہلے انکل اعظم خان نے متعلقہ تھانے فون کر کے فوری طور پر میری مدد کے لئے پو نفری روانہ کروا دی جنہوں نے آتے ہی گگل خان اور اس کے پانچوں ساتھیوں کو گرفتار کر لیا

ایک گھنٹے کے اندر اندر اعظم خان اور ماں بھی وہاں کار میں آن پہنچے۔ ان کے ہمراہ بھی پولیس کی اچھی خاصی نفری تھی۔ اس پولیس کا تعلق میرے مری ٹال والے تھانے سے تھا جہاں متاثرہ ڈرائیور لال خان نے منیجر مشتاق کے ساتھ میری ہدایت پر تھانے جا کر تینوں ٹرک چھینے جانے کی رپورٹ درج کروائی۔ مزید اگلے ڈیڑھ گھنٹوں کے اندر اندر ساری ضابطے کی کارروائی نمٹا دی گئی اور ٹھیکے دار رب نواز کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے گئے۔ ماں نے بڑے فخر کے ساتھ مجھے اپنے گلے سے لگا کر میری پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔ ماں کی آنکھوں اور چہرے پر اپنے لئے بے پناہ فخر و انبساط کے تاثرات دیکھ کر میرا دل خوشی سے لبریز ہو گیا۔

''مگر بیٹا! ہمیں ایک نقصان ضرور ہو گیا'' ماں نے اچانک گہری اور الجھن آمیز سنجیدگی سے کہا۔ ہم اس وقت گرین لاج میں ہی تھے۔ میں ماں کی اس پُرتشویش بات کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ یعنی اس واقعے اور ٹھیکے دار رب نواز کے وارنٹ گرفتاری جاری ہونے کے بعد نظر حیات اور ان کا ''بٹ راس'' اور ''کمال بن'' جا کر برفانی لومڑیوں کا شکار کرنے کا پروگرام ملتوی ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے ماں کو تسلی دیتے ہوئے بڑے رسان سے کہا۔

''ماں! آپ اس کا غم نہ کریں۔ میری نظریں اصل شکار پر مرکوز ہیں۔ نظر حیات کب تک بچے گا۔ یہ درست ہے کہ اب شاید اس کا لومڑیوں کے شکار پر جانے کا پروگرام ملتوی ہو جائے۔ لیکن........''

''لیکن........ یہ بھی تو ہو سکتا ہے، وہ خود اکیلا ہی نکل جائے۔'' ماں نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ''میری معلومات کے مطابق سال میں ایک بار لومڑیوں کے سالانہ شکار پر نظر حیات کا جانا محض شوق یا مشغلہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کا کاروبار بھی ہے۔ برفانی لومڑیوں کی کھالوں کی بہت مانگ ہے اور نظر حیات اپنی ٹیم کے ساتھ ہر سال باقاعدگی سے جاتا ہے اور ڈھیروں لومڑیوں کا شکار کرتا ہے پتہ نہیں اس بار وہ ٹھیکے دار رب نواز کو کیوں اپنی مہم میں شامل کرنا چاہ رہا تھا۔ خیر، تم بھی نظر رکھو اور ہم بھی نظر رکھے ہوئے ہیں۔ پرسوں کے پروگرام کو آج والے واقعے کی وجہ سے منسوخ نہ سمجھو۔''

''ٹھیک ہے ماں! میں سمجھ گیا۔'' میں نے پُرخیال لہجے میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ پھر موضوع کا روئے سخن نظر حیات سے ہٹا کر رب نواز کی طرف موڑتے ہوئے ماں سے بولا۔ ''ماں! آج والے واقعے کا ہمیں اب دہرا فائدہ ہو سکتا ہے۔ ہمیں بس وکیل کوئی اچھا کرنا ہو گا۔'' یہ بتاتے ہوئے میں نے ماں کو اس ساٹھ لاکھ کے حوالے سے بھی ساری کہانی سنا ڈالی کہ اب یہ بہترین موقع تھا، اس پرانے کیس کو کھولنے کا۔ ماں نے اس سلسلے میں فوراً ہی انکل اعظم خان سے مل کر یہ کیس لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

ابھی میں اور ماں گفتگو کر ہی رہے تھے کہ اچانک میرے موبائل کی بیل گنگنائی۔ کال کاشانہ کی تھی۔

''واؤ........ فنٹاسٹک، نادر علی خان! تم واقعی نہ صرف ایک جینئس انسان ہو بلکہ دلیر اور بہادر بھی۔'' دوسری طرف سے کاشانہ کی چہکتی ہوئی آواز اُبھری۔

''ہاں کاشانہ!........ تم یہ بتاؤ، رب نواز پر کیا بیت رہی ہے اس وقت؟'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔ ماں کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''اس کا خیال ہے کہ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے اور میں نے گھر کا بھیدی بن کر اس کی لنکا ڈھائی ہے۔''

''اچھا........ تو تم نے کیا جواب دیا؟''

"میں نے یہی کہا کہ کاش! یہ کام واقعی میری وجہ سے ہوا ہوتا۔"

"اوہ........ پھر تو وہ بری طرح سے تپ گیا ہوگا؟" میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

"کوئی ایسا ویسا........" اس کی خوشی سے معمور آواز اُبھری۔ "اس نے تو مما کو بھی میرے خلاف آگ بگولا کر ڈالا تھا۔ دونوں ہی پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئے تھے۔ رب نواز سے تو مجھے کمینگی کی توقع تھی ہی، مگر نادر! مما بھی اس کے ساتھ مل چکی ہیں۔ مما نے مجھ پر بہت غصہ کیا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مجھے کاٹ کر رکھ دیں۔" اس کی تھوڑی دیر پہلے چہکتی ہوئی آواز بھرانے لگی۔ اس میں دکھ کی رمق بھرنے لگی تھی۔

"نادر!........ مما نے مجھے بہت لتاڑا۔ مجھے تو وہ میری مما محسوس ہی نہیں ہو رہی تھیں۔ ایسا کیوں کیا مما نے میرے ساتھ؟........ میں رب نواز کی بیٹی نہیں، مگر مما کی تو سگی اولاد تھی۔ ان کی کوکھ سے جنم لیا تھا میں نے........ پھر........ پھر مما اس قدر مجھ پر غصہ کیوں ہوئیں؟ اور تو اور بعد میں سوری بھی نہیں کیا مجھ سے کہ میرا غم تو ہلکا ہو جاتا۔ ایسے میں نادر صاحب! مم........ مجھے اپنے پپا بہت یاد آئے........ بہت یاد آئے۔" یہ کہتے کہتے وہ بے چاری باقاعدہ رو پڑی۔ مجھے خود بھی دکھ ہوا۔ میں اسے حوصلہ دیتے ہوئے بولا۔

"کاشانہ! خود کو سنبھالو........ تم تو خود مجھے حوصلہ دیتی ہو، اب خود ہمت ہار رہی ہو۔ شاباش! ٹیک اِٹ ایزی۔ بہت باحوصلہ لڑکی ہو تم۔"

میرے سمجھانے بجھانے پر فوراً ہی اس نے خود کو سنبھالا تاہم جب وہ بولی تو گہرے دکھ سے اس کا لہجہ اب بھی کپکپا رہا تھا۔

"نادر صاحب! جب قریبی رشتے کے لوگ ایسا رویہ اختیار کریں تو دکھ تو ہوتا ہی ہے۔ خیر........ میں خوش ہوں، رب نواز اپنی ضمانت قبل از گرفتاری کے لئے اِدھر اُدھر دوڑ دھوپ کر رہا ہے۔"

"اچھا........ تم ایک بات بتاؤ کاشانہ!" میں نے آخر میں اچانک کسی خیال کے تحت کہا۔ "تمہیں کوئی خطرہ تو نہیں ہے نا رب نواز سے یا پھر اپنی مما سے؟"

لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد کاشانہ بولی۔ "نہیں........ وہ بھلا میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟ آپ کو نہیں معلوم، پپا میرے تحفظ کے لئے کیا کچھ کر کے گئے ہیں۔"

"او کے، او کے........ اچھا، بعد میں تفصیل سے گفتگو ہوگی۔ او کے، خدا حافظ!"

"خدا حافظ!"

"یہ کاشانہ کون ہے؟........ کیا رب نواز کی بیٹی ہے؟" ماں نے پوچھا تو میں نے موبائل جیب میں رکھتے ہوئے ہولے سے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔

"ہاں ماں! مگر سوتیلی۔ اس کا باپ مر چکا ہے۔ اس کی ماں نے دوسری شادی کر لی تھی۔ لیکن اس نے کبھی رب نواز کو اپنا باپ تسلیم نہیں کیا ہے۔ بلکہ اب تو اسے اپنی ماں سے بھی نفرت ہونے لگی ہے۔"

"کیا کاشانہ تمہاری اچھی خاصی دوست بن چکی ہے؟"

"ہاں........ بس اتفاقاً ہی دوستی ہوگئی تھی اس سے۔" میں نے کہا۔

"دوستی اتفاقاً ہو ہی جاتی ہے۔" ماں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "کبھی یہاں لے کر آؤ اسے بھی تو دیکھوں اپنے بیٹے کی چوائس۔" ماں نے آخر میں میرے قریب آ کر میرے گال پر پیار لیتے ہوئے کہا۔ ماں کو خوش اور شوخ ہوتا دیکھ کر میں بھی کھل کر مسکرایا اور بے اختیار محبت سے لبریز

ہو کر میں نے ماں کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ ماں کی محبت بھری ممتا میرے رگ و پے میں جوش اور مسرت کی بجلیاں دوڑا رہی تھی۔ مجھے یک گونہ سکون اور قرار پہنچا رہی تھی۔ ماں نے بہت دکھ جھیلے تھے، بہت عذاب سہے تھے، بہت تکلیفیں اٹھائی تھیں۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ چاہے ہم دونوں ماں بیٹے کے درمیان نگینہ والے معاملے کی وجہ سے لاکھ بدمزگی ہوتی رہی ہو مگر ہم ماں بیٹے کی محبت میں کمی نہیں آئی تھی۔ ماں کے وجود سے مجھے بڑی روحانی خوشبو اٹھتی محسوس ہو رہی تھی۔ ماں نے بھی اپنے دونوں بازوؤں کی سختی کو میرے پہاڑ جیسے وجود میں بڑھاتے ہوئے مرتعش آواز میں کہا۔

"نادر! میرے بچے! میں نے بہت تھوڑی خوشیاں دیکھی ہیں۔ تمہیں پتہ ہے، تمہارے بہادر باپ قادر خان نے میرے ساتھ طوفانی محبت کی۔ ہم دونوں کی محبت کی شادی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پا کر بہت خوش تھے۔ بہت نازاں و فرحاں۔ مگر ہماری اس محبت کی شادی کو صرف چھ سات ماہ ہی گزرے تھے اور تم اس دنیا میں آنکھ کھولنے والے تھے مگر تقدیر کی ستم ظریفی نے ہماری خوشیوں پر ایسا شب خون مارا کہ میں بیوہ ہوگئی اور اس پر بھی یہ ستم کہ مجھے شاہ میر اور نظر حیات جیسے زہریلے سانپوں نے میرے ہی شوہر کے قتل کے جھوٹے الزام میں جیل پہنچا دیا اور وہاں میں نے اپنی نوخیز جوانی کے تئیس سال گزار دیئے اور تمہیں بھی میں نے جیل کے سیلن زدہ ماحول اور ننگی اینٹوں والے فرش پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جنم دیا۔ پھر میں نے تمہاری آس پر دشمنوں سے بھیانک انتقام لینے کی تپش میں جینا سیکھا۔ تم ہی میری پہلی اور آخری آس تھے۔ پھر جب میں نے تمہیں کڑیل جوان کے روپ میں دیکھا تو مجھے تمہاری صورت میں تمہارے بہادر باپ کی جھلک نظر آنے لگی۔ میرے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں لگنے دینا میرے بچے!........ کبھی نہیں........ ورنہ........ ورنہ میں جیتے جی مر جاؤں گی۔"

ماں میرے کاندھے پر سر رکھے بے اختیار رو دیں۔ آج پہلی بار میں نے ماں کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے اور میرا دل بری طرح بھینچ رہا تھا۔ ماں کے آنسو میرے سینے سے بھڑکتی ہوئی آتش انتقام پر تیل چھڑکنے کا باعث بن رہے تھے۔ میں نے ماں کو آہستگی سے علیحدہ کیا اور ان کے آنسو سے لبریز مگر پُرتپش اور غم زدہ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے جوش اور عزم سے معمور آواز میں بولا۔

"ماں! میں تیرا مان گھٹنے نہیں دوں گا۔ میں تیری خوشیوں کو غم میں بدلنے والوں سے بھرپور انتقام لوں گا۔ وہ وقت اب دور نہیں رہا ہے۔ بس تُو اپنے خون پر بھروسہ رکھ۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں دشمنوں کی نیندیں حرام کر کے رکھ دوں گا۔"

ماں نے اپنے آنسو پونچھے اور ہولے سے مسکرا کر بولیں۔ "تو پھر کاشانہ کو مجھ سے کب ملا رہے ہو؟"

"اسے بلانے کی دیر ہے، وہ کسی وقت بھی آ جائے گی۔" میں نے ہلکی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ تاہم مجھے ماں کا کاشانہ کو گھر بلانے کا اصرار عجیب ہی محسوس ہو رہا تھا۔

میں سوچنے لگا کہ نگینہ کی غیر موجودگی سے ماں خوش اور مطمئن نظر آ رہی تھیں۔ شاید آج ماں کا رویہ میرے ساتھ اسی امر کا ہی رہینِ منت تھا۔

❋❋❋

اگلے دن کا سورج اہم خبر کے ساتھ طلوع ہوا۔ ٹھیکے دار رب نواز کی ضمانت قبل از گرفتاری کی کوششیں ناکام ہوئی تھیں اور وہ گرفتاری سے بچنے کے لئے روپوش ہوگیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کا کیس کمزور پڑنے لگا۔

ادھر نظر حیات کی طرف سے تازہ خبر انکل اعظم خان نے یہ دی تھی کہ اس کا کل کا شکار پر جا پروگرام منسوخ تو نہیں ہوا تھا البتہ رب نواز کے مسئلے کی وجہ سے موخر ہو گیا تھا۔ تاہم میں بھی اپنی سے اس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ نظر رکھنے سے مراد میری یہ نہ تھی کہ میں اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ پنڈی رہتا تھا اور میں یہاں مری میں لیکن میں نے اس کا دوسرا طریقہ نکالا تھا۔ میں نے مختلف ناموں سے چار موبائل کنکشن کی ''سم'' خرید رکھی تھیں اور میں اصل موبائل سم نمبر کی بجائے جعلی اور اجنبی نمبروں نظر حیات کے گھر اور دفتر پر فون کرتا رہتا تھا۔ کبھی پی سی او سے جا کر رانگ نمبر کے بہانے، کبھی کسی دوست کے بہانے۔ اس طرح مجھے پتہ لگتا رہتا تھا کہ وہ ابھی تک پنڈی میں ہی تھا۔ اس کے علاوہ احتیاط کے پیش نظر میں نے اپنے ٹال کا ایک قابل اعتماد اور ہوشیار آدمی بھی نظر حیات کے پیچھے لگا کہ کہیں بھی اچانک اس کا شکار پر جانے کا پروگرام بن جائے تو وہ مجھے فوراً اطلاع کر دے۔

میں اگلے دن ٹال پر پہنچا تو غزالہ کا فون آیا۔

''نادر! یہ تم کون سی خرافات میں پڑنے والے ہو؟'' اس نے جیسے چھوٹتے ہی کہا۔

''کیا ہوا غزالہ؟........ ایسا کیا کر دیا میں نے؟'' میں نے قدرے چونک کر اس سے کہا تو وہ مضطربانہ سی متوحش آواز میں بولی۔

''وہ شیطان، اشفاق شاہین تم سے ملنے ٹال پر آیا تھا اور تم نے........ اوہ گاڈ! اب آگے بھی تمہیں بتانے کی گنجائش باقی ہے؟''

اس کی بات پر میں نے بے اختیار گہری سانس خارج کی مگر دوسرے ہی لمحے قدرے چونک کر

''مگر تمہیں یہ سب کیسے پتہ چلا؟''

''اس شیطان کے دو ایک چیلوں کو میں نے بھی اپنے ساتھ ملا رکھا ہے۔ انہی کی زبانی مجھے علم تھا۔'' وہ جواباً بولی۔

''میں اس طرح اسے زیادہ آسانی سے نابود کر سکوں گا۔ میں اس کے خلاف ثبوت اکٹھے کر رنگے ہاتھوں اسے گرفتار........''

''تم اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے نادر علی!'' غزالہ اچانک میری بات کاٹ کر بولی۔ ''مجھے بھی خوش فہمی لے ڈوبی۔ اپنی بہن سپنا کے قتل کے بعد میں نے بھی تمہاری طرح یہی چال چلنے کی کوشش کی مگر الٹا اس کے شیطانی جال میں پھنستے پھنستے بچی تھی۔ اب تو شاید وہ مجھ سے بالکل ہی مایوس خاموش بیٹھ رہا ہے۔ لیکن نادر!........ تم........''

''تمہاری بات اور تھی۔'' میں اس کا اشارہ سمجھ کر قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ''تم عورت تھیں مرد ہوں۔ مجھ سے بھلا وہ شیطان کیا زبردستی کر سکتا ہے؟ میں اس کے درمیان میں رہ کر اس کی کروں گا۔ تم بس خاموشی سے ایک طرف بیٹھی تماشا دیکھتی جاؤ۔''

''پلیز نادر! باز آ جاؤ........ تم اشفاق شاہین کو نہیں جانتے۔ وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔'' اپنی بات پر اصرار جاری رکھا۔ تھوڑے توقف کے بعد میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''تم خیریت سے ہو نا؟........ تم بتا رہی تھیں ابھی کہ اشفاق شاہین تم سے مایوس ہو کر بیٹھ رہا ہے۔''

''ہاں۔'' اس نے کہا۔

''تمہیں کیسے علم ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''اشفاق شاہین کا ایک آلۂ کار میرا قریبی دوست اور رازدار بن چکا ہے........ اس نے بتایا

اشفاق شاہین اور اس کے مقرب خاص غفورے کے درمیان میرے سلسلے میں ایک اہم میٹنگ ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے ڈیلنگ کرنا چاہتے ہیں اس معاملے میں۔'' میں نے بتایا۔

''کیسی ڈیلنگ؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی کہ غفورا مجھ سے ملنا چاہتا ہے تا کہ مجھ سے معاہدہ کر سکے کہ میں ان کے بارے میں منہ نہیں کھولوں گی۔'' اس نے بتایا۔ اس کے لہجے میں مسرت آمیز طمانیت تھی۔ مگر میں اس کی بات سن کر کھٹک گیا اور دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''تو پھر تم سے غفورے نے رابطہ کیا؟''

''نہیں........ وہ مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔''

''غزالہ! میری بات ذرا توجہ سے سنو۔ تمہاری جان خطرے میں ہے۔'' میں نے اچانک سرسراتے لہجے میں کہا اور دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔

''ہیلو........ غزالہ! تم سن رہی ہو؟'' میں نے جلدی سے کہا۔

''ہاں، ہاں........ سن رہی ہوں۔ تمہاری بات نے مجھے گنگ کر کے رکھ دیا تھا۔'' وہ بولی۔ اس کی آواز میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ ''مم........ مگر تمہیں کیسے اندازہ ہوا؟''

''اس لئے کہ تم میرے سامنے اشفاق شاہین کی اصلیت کے بارے میں منہ کھول چکی ہو اور یہ بات اسے میرے ذریعے سے ہی معلوم ہو چکی ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تو تھا........''

''مگر تمہاری بات اور ہے۔ وہ تو اب تمہیں بھی اپنا ساتھی سمجھنے لگے ہیں۔ اس اہم نشست میں اشفاق شاہین اور غفورے کے درمیان تمہارے سلسلے میں بھی گفتگو ہوئی تھی۔ انہیں تم سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

''غزالہ! بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم ان کی رازداں ہو۔ تمہیں بہرحال ان سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یا پھر تم ایسا کرو کہ یہ شہر چھوڑ کر چلی جاؤ۔'' میں نے اسے مشورہ دیتے ہوئے کہا تو وہ گہرے لہجے میں بولی۔

''نادر! میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ اشفاق شاہین کا ایک اہم آلہ کار میرا رازدار بن چکا ہے جو غفورے کا بھی قریبی ساتھی ہے۔ اگر میرے سلسلے میں کوئی ایسی بات ہوئی تو وہ مجھے ضرور بتاتا۔''

''اچھا........ یہ بتاؤ، تم اسلام آباد میں کہاں مقیم ہو؟'' میں نے آخر میں کسی خیال کے تحت پوچھا تو اس نے مجھے اپنی رہائش گاہ کا پتہ بتا دیا۔ یہ مکان اس نے کرائے پر لے رکھا تھا۔

''میں اور طارق بہت جلد یہ شہر ہی نہیں بلکہ یہ ملک بھی چھوڑ دینا چاہتے ہیں۔ طارق مجھ سے سچی محبت کرتا ہے۔ وہ مجھ سے بہت متاثر ہے۔ بہت اچھا انسان ہے۔''

''کیا یہ وہی طارق ہے جو تمہارا رازدار اور اشفاق وغیرہ کا ساتھی ہے؟''

''ہاں۔''

''اچھا ٹھیک ہے........ مگر بہرحال تم محتاط رہنا۔''

''ہاں........ تم بے فکر رہو۔ طارق پر مجھے پورا بھروسہ ہے۔ وہ آج کل اشفاق شاہین اور غفورے کے ساتھ سائے کی طرح لگا رہتا ہے تا کہ میرے سلسلے میں ذرا سی بھی کوئی خطرناک بات محسوس کرے تو مجھے فوراً خطرے سے آگاہ کر دے۔'' اس نے پورے یقین اور فخر سے بتایا۔ اس کے بعد میں نے خدا حافظ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا اور موجودہ صورت حال پر غور کرنے لگا۔

میرا مسروقہ مال برآمد ہو چکا تھا اور اب رب نواز بری طرح قانون کی نظروں میں آ چکا تھا۔ کیونکہ

میں نے نہ صرف پورا مال برآمد کرا لیا تھا بلکہ مجرموں کو بھی گرفتار کروا لیا تھا۔ ان میں گل خان اور اس کے پانچ ساتھی اہم تھے۔ باقی مزدوروں کو وعدہ معاف گواہ بنا لیا گیا تھا۔ کیس بہت مضبوط اور آسان تھا اس لئے جلد فیصلے کی توقع تھی۔ ٹھیکے دار رب نواز کو میں نے بری طرح گرفت میں لے رکھا تھا۔

اچانک میرے آفس کے ٹیلی فون سیٹ پر گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف ماں کی آواز پر میں ذرا چونک پڑا۔

"نادر بیٹا! تم مصروف تو نہیں ہو؟" ماں نے پوچھا۔

"نہیں ماں! کچھ ایسا خاص مصروف نہیں ہوں۔ کیوں، خیریت؟"

"ہاں، خیریت ہی ہے۔ تم ذرا آ جاؤ۔"

"آ جاتا ہوں......... ویسے کیا بات ہے؟"

"بس آ جاؤ۔ تمہارے لئے ایک زبردست سرپرائز ہے۔" ماں نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

مجھے ذرا حیرت سی ہوئی کہ ماں آخر مجھے کون سا سرپرائز دینا چاہتی ہیں؟ تاہم میں نے ریسیور رکھا اور منیجر مشتاق کو چند ہدایات دینے کے بعد اپنی جیپ میں سوار ہو کر سیدھا گرین لاج پہنچا تو وسیع و عریض احاطے میں مجھے ایک شناسا لمبی سی چمچماتی کار کھڑی نظر آئی جسے دیکھ کر ہی خود بخود میری آنکھوں کی روشنی میں اضافہ ہو گیا۔

یہ کاشانہ کی کار تھی۔ میں سمجھ گیا کہ ماں مجھے کون سا "سرپرائز" دینا چاہتی تھیں۔ مجھے کاشانہ کے اچانک گرین لاج آنے پر حیرت ہی ہوئی ورنہ وہ مجھ سے ٹیلی فونک رابطہ کرتی تھی یا پھر ٹال پر ہی آجاتی تھی۔ میں اسی الجھن میں اندر داخل ہوا تو ڈرائنگ روم میں مجھے ایک سے زیادہ خواتین کی آپس میں گفتگو کی آوازیں آتی سنائی دیں۔ میری ماں کی بھی آواز ان میں شامل تھی۔

میں اندر داخل ہوا تو ذرا چونک پڑا۔ کاشانہ کے ساتھ ہی صوفے پر میں نے ایک فربہی مائل اور گوری چٹی عورت کو بیش قیمت ساڑھی، میک اپ اور زیورات سے لدے پھندے دیکھا۔ اس کی عمر چالیس کے قریب کی لگتی تھی۔ مجھے اس کی صورت میں کاشانہ کی شباہت صاف محسوس ہوئی۔ میں سمجھ گیا، وہ اس کی ماں تھی۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور تفکر کے تاثرات نمایاں تھے۔ اخلاقاً خاتون کو سلام کیا اور کاشانہ سے بھی ہیلو ہائے ہوئی۔ پھر میں ماں کے قریب ہی صوفے پر براجمان ہو گیا۔ کاشانہ مجھے دلچسپ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"بیٹا! یہ مسز رب نواز ہیں......... کاشانہ کی امی۔ تم سے بات کرنے آئی تھیں۔" ماں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ میں کسی حد تک مسز رب نواز کی آمد کا مدعا بغیر سنے سمجھنے لگا۔

"جی......... فرمائیے؟" میں نے ان کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا تو وہ فوراً مجھ سے ملتجیانہ لہجے میں بولی۔

"میں اپنے شوہر کی طرف سے معافی مانگنے آئی ہوں۔ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ آپ پلیز انہیں معاف کر دیں۔"

"مگر اب کیا ہو سکتا ہے؟ یہ معاملہ تو اب عدالت میں جا چکا ہے۔" میں نے بدستور خشک لہجے میں کہا۔ اس دوران میں نے کاشانہ کو دانستہ نظر انداز کر رکھا تھا۔

"نادر صاحب! کیس ختم بھی تو ہو سکتا ہے۔" وہ جلدی سے امید بھرے لہجے میں بولی تو ماں نے اس سے گویا اس کی بات کی تصحیح کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! صلح کرنا چاہتی ہیں اور ہمارا نقصان بھی پورا کرنا چاہتی ہیں۔"

میں فوراً بات کی تہہ تک پہنچ گیا اور سمجھ گیا کہ یہاں اس وقت درحقیقت یہ خاتون اپنے شوہر رب نواز کے ایما پر آئی ہو گی۔ اور مزید یہ کہ رب نواز متوقع طویل قید سے بچنے کے لئے مجھ سے معاہدہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ایک لمحہ سوچا کہ یہ ایک سنہری موقع تھا۔ تاہم میں نے محتاط انداز میں مسز رب نواز سے کہا۔

"رب نواز نے میرے ماموں مرحوم کے ساتھ ساٹھ لاکھ کا دھوکا کیا تھا۔ اس نے اسی پر بس نہیں کیا اور مجھے بھی دھوکا دینے کی کوشش کی۔"

"نادر صاحب! ہم آپ کے ساٹھ لاکھ روپے دینے کو تیار ہیں۔" وہ یکدم بولی۔

میں نے بے تاثر لہجے میں کہا۔ "وہ تو یوں بھی ہمیں ملنے ہی والے ہیں۔ کم از کم رب نواز کو اس کی دھوکے بازی کی سزا تو ملنی ہی چاہئے۔" آخر میں دانستہ میں نے اپنا لہجہ تلخ بنا لیا۔

"بہن! تم ہی اپنے بیٹے کو سمجھاؤ، ہمیں معاف کر دے۔" مسز رب نواز نے ماں سے ملتجیانہ کہا اور ساتھ ہی اس نے اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی کاشانہ کو بھی ہولے سے ٹہوکا دیا۔

میں نے پہلی بار بغور مسز رب نواز کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں التجا کے پیچھے چھپی نفرت کی پرچھائیاں صاف محسوس ہوتی تھیں۔ چہرے پر بھی عجز و انکساری کی ملمع کاری نظر آتی تھی۔ وہ سراپا تازہ بدلی ہوئی کینچلی والی ایسی ناگن نظر آتی تھی، جس کا زہر نکالا جا چکا ہو۔

ماں نے مجھ سے مخاطب ہونے کی بجائے مسز رب نواز سے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ "بہن! آپ کے شوہر نے بھی ہمارے ساتھ کچھ کم برا نہیں کیا۔ اس نے چوری بھی کی اور سینہ زوری بھی کرنی چاہی۔ مگر........." ماں ذرا رکیں، پھر کاشانہ کی طرف ایک نگاہ ڈالی اور معنی خیز لہجے میں اسے مخاطب کر کے بولیں۔ "کاشانہ بٹی! تمہارا کیا خیال ہے، اگر ہم صلح کر لیتے ہیں تو کیا آئندہ پھر بھی رب نواز ہم سے دھوکا کرنے کی کوشش کرے گا؟"

مسز رب نواز کے ساتھ ماں کا نرم رویہ اور پھر آخر میں کاشانہ سے استفسار کرنا میرے لئے حیرت کا باعث تھا۔ تاہم میں سردست خاموش ہی رہا۔ البتہ کاشانہ نے ماں کے سوال پر جواباً کہا۔

"آنٹی! میرے خیال میں تو رب نواز کو دوبارہ ایسا سوچنے کی بھی جرأت نہیں کرنی چاہئے۔ مگر اس کا آسان حل یہی ہے کہ آپ لوگ آئندہ کے لئے اس کے ساتھ ہر قسم کے کاروباری روابط ہمیشہ کے لئے منقطع کر دیں۔ پھر دھوکے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

کاشانہ کے اس محتاط جواب پر میں نے دیکھا، ماں کے لبوں پر ہلکی سی مگر اسرار بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ تب وہ مجھ سے مخاطب ہو کر گویا دونوں ماں بیٹی کی سفارش کرتے ہوئے بولیں۔

"نادر بیٹے! میرا خیال ہے، اتنا سبق کافی ہے۔ جب یہ ہمارا نقصان پورا کر ہی رہے ہیں تو ہمیں بھی صلح کر لینی چاہئے۔ اور پھر یہ بھی تو دیکھو کہ کاشانہ تمہاری اچھی دوست بھی ہے۔"

ماں نے کاشانہ کا حوالہ جانے کیوں دیا تھا؟ تاہم میں چند ثانیے کی خاموشی کے بعد ماں سے بولا۔

"ٹھیک ہے ماں! جیسے آپ کی مرضی۔ مگر صلح نامے سے پہلے ان کو ہماری ساٹھ لاکھ کی رقم، علاوہ اخراجات کے ہمیں ادا کرنا ہو گی۔ میں کیس ختم کروا دوں گا۔"

"ہمیں منظور ہے۔" مسز رب نواز نے جلدی سے خوش ہو کر کہا اور ماں سے گلے ملنے کو اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ماں نے بھی اسے گلے مل کر مسکراتے ہوئے صلح کی مبارک باد دی۔

"چلیں، اب ہم دونوں بہنیں بن گئیں۔ تم اپنا نام تو بتاؤ۔" ماں نے خوش ہو کر پوچھا۔

"میرا نام .... شاہینہ ہے۔" مسز رب نواز نے جبراً مسکرا کر کہا۔

"اور میرا شبینہ۔" ماں نے کہا۔ "کتنے ملتے جلتے نام ہیں ہمارے۔ چلیں، آپ دونوں کھانا کھا کر جانا۔" ماں نے کہا۔

"نہیں۔ ابھی میرے سر پر پریشانی سوار ہے، پھر کبھی سہی۔" مسز رب نواز نے اپنے لہجے میں رسانیت سموتے ہوئے ماں سے کہا۔ جبکہ مجھے ماں کا اس عورت سے گھلنا ملنا قطعاً اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ پھر میری اور کاشانہ کی نگاہیں چار ہوئیں۔ میری طرح اس کے چہرے پر بھی عجیب سی سنجیدگی کھنڈی ہوئی تھی۔ تاہم اس کی آنکھوں میں مجھے ان کہے الفاظ کی ہلکی سی تپش کا احساس ہوا تھا۔

تاہم چائے وغیرہ کے دوران صلح نامے اور رقم وغیرہ کے بارے میں بات چیت ہوتی رہی اور اسی دوران ماں، کاشانہ سے بھی گھل مل کر باتیں کرنے لگیں۔

سارے معاملات خوش اسلوبی سے طے پا گئے۔ بیگم رب نواز نے بلینک چیک ہمارے حوالے کیا تو ماں نے اسے صرف ساٹھ لاکھ کا چیک لکھ دینے کا کہا اور باقی کا ہرجانہ وغیرہ اسے معاف کر دیا۔

دونوں ماں بیٹی رخصت ہو گئیں تو میں نے ماں سے کہا۔ "ماں! آپ کو ہرجانے کی رقم بھی واپس لینی چاہئے تھی۔"

ماں نے مسکرا کر کہا۔ "بیٹا! بس کافی ہے۔ ہمیں ہماری رقم مل گئی۔ اور پھر کاشانہ بھی تو ہماری اچھی دوست ہے۔ وہ کیا سوچے گی؟"

ماں کی بات پر میں جھلا سا گیا۔ تاہم بولا کچھ نہیں۔ ذرا دیر گزری کہ سکینہ نے آ کر بتایا کہ کوئی سلیمان نامی شخص مجھ سے ملنے آیا ہے۔ میں ذرا چونک سا گیا۔ سلیمان میرا وہی قابل اعتماد آدمی تھا جسے میں نے نظر حیات پر کڑی نگرانی کے لئے مامور کیا تھا۔

"بھیج دو اسے اندر۔" میں نے سکینہ سے کہا اور وہ لوٹ گئی۔

ماں متفسرانہ نگاہوں سے میری جانب تکنے لگیں تو میں نے انہیں بتا دیا کہ سلیمان کون ہے۔

"میرا خیال ہے، کوئی اہم اطلاع لے کر ہی آیا ہوگا۔" ماں نے کہا۔ "تم اس سے بات کرو، میں کمرے میں چلتی ہوں۔ مجھے پھر بتا دینا۔" یہ کہہ کر وہ وہاں سے روانہ ہو گئیں۔

ذرا دیر بعد ایک میرا ہم عمر نوجوان شخص اندر داخل ہوا۔ یہ سلیمان تھا۔ میں نے اس کے احساس ذمہ داری، محنت اور اچھی کارکردگی کے باعث مزدوروں کا مانیٹر بنایا ہوا تھا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی بڑے ادب سے مجھے سلام کیا، میں نے اسے بیٹھنے کا کہا۔ پھر صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کر کے بولا۔

"کیا خبریں ہیں؟"

"سر! یہ خبر زیادہ ضروری نہ ہوتی تو میں یہاں آ کر آپ کو زحمت نہیں دیتا۔ مگر بات ہی ایسی تھی کہ مجھے اس وقت آنا پڑا۔" وہ بولا۔ اس کے لہجے میں جوش کی آمیزش تھی۔

"بتاؤ، کیا خبر ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سر! نظر حیات کل صبح اپنی شکاری مہم پر اپنے نو آدمیوں کی ٹیم کے ساتھ نکلنے والا ہے۔" اس نے بتایا اور میرا دل جیسے کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ "اس کے ہمراہ ایک دوست بھی ہے۔"

"کون ہے وہ؟" میں نے فوراً چونک کر پوچھا۔

"کوئی سیاسی شخصیت ہے۔ قومی اسمبلی کا ممبر......... چوہدری ذیشان علی کھدیڑا۔ وہ اسلام آباد میں رہتا ہے۔ آج رات کو وہ اپنے چار آدمیوں کے ہمراہ نظر حیات کے گھر پنڈی آئے گا اور پھر وہیں سے اگلے روز صبح تڑکے یہ مختصر قافلہ بٹ راس اور کمال بن کی جانب روانہ ہو جائے گا۔" سلیمان نے تفصیل بتائی۔ میں ذرا سوچ میں پڑ گیا۔ اس سے پہلے اس کا پروگرام رب نواز کے ساتھ جانے کا تھا مگر اس کے وارنٹ گرفتاری جاری ہونے کے بعد، اب ظاہر ہے وہ نہیں جا سکتا تھا۔ مگر چوہدری ذیشان جیسی بااثر شخصیت کا نظر حیات کے ساتھ جانا مجھے الجھن میں مبتلا کر رہا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے......... تم جاؤ۔ اور اب مجھ سے موبائل پر ہی رابطہ کرنا۔" میں نے ایک گہری سانس خارج کر کے سلیمان سے کہا۔ "جب تک نظر حیات پنڈی سے روانہ نہیں ہوتا تم مجھ سے رابطے میں رہنا۔ اور وہ جیسے ہی روانہ ہوں، تمہیں ان کے تعاقب میں نکلنا ہوگا۔" وہ میری ہدایت پا کر روانہ ہو گیا۔

میں ذرا دیر وہیں بیٹھا کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر اس کے بعد ماں کے پاس آ کر انہیں ساری بات بتا دی۔ میرا خیال تھا نظر حیات کی شکاری مہم میں شامل ایک بااثر سیاسی شخصیت کا سن کر ایک لمحے کو ماں بھی میری طرح اُلجھن آمیز تذبذب کا شکار ہو جائے گی۔ مگر اس نے اس بات کو خاطر میں لائے بغیر پُرجوش مسرت سے کہا۔

"نادر بیٹا! تقدیر ہمارا ساتھ دے رہی ہے۔ نظر حیات کی اس شکاری مہم سے ہمیں فائدہ اٹھا کر اس کی زندگی کی مہم کو ہر قیمت پر آخری بنانا ہوگا۔"

"ماں! ہمیں اس بار ذرا محتاط ہو کر اپنے دشمن نظر حیات پر ہاتھ ڈالنا ہوگا۔ کیونکہ اب اس کے ہمراہ کوئی عام شخصیت نہیں ہے۔"

"تم ایک ایم این اے سے گھبرا گئے؟" ماں نے کہا۔

"بات گھبرانے کی نہیں ماں!" میں نے گہری متانت سے کہا۔ "میں احتیاط کی بات کر رہا ہوں۔ کیونکہ ایک ایم این اے، عوامی نمائندہ ہوتا ہے۔ اگر وہ بھی نظر حیات کے ساتھ براہِ راست ہماری زد میں آ گیا تو ہمارے لئے شاید یہ اچھا نہ ہوگا۔ ہمیں دشمن کے خلاف ایسا قدم اٹھانا ہوگا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

"میں تمہاری بات کا مطلب سمجھ رہی ہوں۔" ماں نے اپنے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

"ماں! اب آپ کا جانا بہتر نہ ہوگا۔ اس مہم کو اب میں خود تنہا ہی سر کروں گا۔" میں نے جوش سے مستحکم لہجے میں کہا تو ماں نے قدرے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"ہاں ماں!......... آپ کا ساتھ جانا ٹھیک نہیں۔ میری بات مانیے اور اپنے بیٹے کے زورِ بازو پر بھروسہ کریں۔ میں ضرور کامیاب لوٹوں گا۔"

میرے سمجھانے پر ماں نے ایک گہری سانس لے کر خاموشی اختیار کر لی اور پھر میری پیشانی پر بوسہ دیا۔

***

رات تقریباً دس بجے مجھے سلیمان نے موبائل پر رابطہ کر کے اطلاع دی کہ شکاری مہم کی ایک ٹیم اسلام آباد سے پنڈی پہنچ چکی ہے۔ اس خبر کے ملتے ہی میں صبح تڑکے روانہ ہونے کی تیاری کرنے لگا۔

صبح چھ بجے سلیمان نے مجھے اس کی خبر دی کہ نظر حیات اور چوہدری ذیشان دو تیز رفتار انٹرکولرز میں روانہ ہو چکے ہیں۔ ان کا رخ بٹ راس کی طرف تھا۔

چنانچہ میں بھی جیپ میں سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔ سلیمان کا کام ختم ہو چکا تھا۔ ماں کو میں شروع ہی

سے ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ ماں کے عزائم نظر حیات سے باقاعدہ دھواں دھار جنگ ک کے تھے اور یہ میں نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی نظر حیات کو میں ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ میرے ذہن میں ا والا منصوبہ تھا کہ میں نظر حیات پر عرصہ حیات اس قدر تنگ کر ڈالوں کہ وہ یہ ملک ہی چھوڑنے پر مجبور جائے۔ اسے اس قدر ذہنی و جسمانی طور پر ٹارچر کروں کہ وہ ساری زندگی اپنے پچیس سال پہلے شرمناک جرم کی یاد کو سینے سے لگائے پچھتاوے کی اذیت ناک زندگی گزارے۔ اس کی زندگی کو موت بھی بدتر کر کے رکھ دوں کہ اسے اپنی نجات صرف موت کی صورت میں نظر آئے اور ساری زندگی س سسک کر گزارتا رہے۔

اس کا مجھے اب ایک موقع تو مل رہا تھا۔ اگرچہ اس میں غیر معمولی خطرات بھی تھے مگر اب نے مجھے ایسے خطرات کا کھلاڑی بنا دیا تھا۔ نظر حیات جن ویران برف زاروں کا رخ کر رہا تھا وہاں اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بہترین مواقع میسر تھے اس لئے میں نے اس سے وہیں نمٹنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ اگر وہ وہاں میرے ہاتھوں جہنم واصل بھی ہو جاتا تو کسی کو کیا پتہ چلنا تھا؟ یہی سب کہ میں نے اس کا تعاقب آخری مقام تک کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔

میرے اندازے کے مطابق یہ لوگ نتھیا گلی سے گزر کر ایبٹ آباد جانے والے راستے کا انتخاب کرتے۔ یہاں سے بٹ راس اور کمال بن کا راستہ قدرے قریب اور محفوظ تھا۔

میں نے اس مین شاہراہ پر پہنچ کر اپنی جیپ ایک جانب ذرا الگ تھلگ روک دی اور انتظار کر لگا۔ سلیمان کی بتائی ہوئی اطلاع کے مطابق ان کا مختصر قافلہ کسی وقت بھی اس مقام سے گزرنے والا چنانچہ میں یہیں کھڑا انتظار کرنے لگا۔

قریباً کوئی بیس پچیس منٹ بعد مجھے کشمیر پوائنٹ سے آنے والی سڑک پر دو گاڑیاں آتی دکھائی ان میں ایک نیلے رنگ کی مٹسوبشی پجارو تھی اور دوسری سرخ رنگ کی ڈبل کیبن انٹرکولر ٹربو تھی۔

میں فوراً محتاط ہو گیا۔ سلیمان کی دی ہوئی معلومات کے مطابق یہی میری مطلوبہ گاڑیاں تھیں۔ دوسری جانب منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ دونوں گاڑیاں زناٹے کے ساتھ قریب سے نکلتی چلی گئیں۔ م سفید فور وہیل ڈرائیو پوٹھوہار جیپ کی طرف دوڑا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی اسے اسٹارٹ کر دونوں گاڑیوں کے تعاقب میں دوڑا دیا۔

تعاقب کے درمیانی فاصلے کا میں نے خصوصی طور پر خیال رکھا تھا۔ مجھے ان کی منزل معلوم تھ لئے زیادہ قریب ہو کر تعاقب کرنے کا کوئی فائدہ بھی نہ تھا۔

میں خود کو ایک طویل سفر کے لئے ذہنی و جسمانی طور پر تیار کر چکا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے کے طور پر اضافی فیول کے دو تین کین ساتھ رکھ لئے تھے۔

سفر جاری تھا......... نتھیا گلی سے نکل کر ایبٹ آباد والے راستے پر گامزن ہونے کے لگ بھگ ایک گھنٹے بعد گاڑیاں مانسہرہ کی طرف جانے والی سڑک پر آ گئیں۔ مری سے ایبٹ آباد چونسٹھ کلومیٹر فاصلے پر تھا۔ بل کھاتے ہوئے پُر خطر راستے کی وجہ سے اسے طے کرنے میں دو یا دو سے زائد گھ لگ سکتے تھے۔ لیکن ماہرانہ انداز کی تیز رفتار اور نان اسٹاپ ڈرائیونگ اسے ایک سے ڈیڑھ گھ محدود کر سکتی تھی۔ اگلے چند گھنٹوں کے اندر شاہراہ ریشم سے گزرتے ہوئے ہم بٹ راس کے کے درمیان محوِ سفر تھے۔ یہاں سرسبز کھیتوں میں رواں شفاف ندیاں جلترنگ سا شور مچا رہی تھیں۔ میں چھپے رنگین پرندوں کی قوس قزح پھیلاتی خوش رنگ اُڑانیں دل و دماغ میں بڑا لطیف احساس

نہیں۔ دور سرسبز ڈھلانوں والی پہاڑیوں پر قبضہ جمائے ہوئے بادل گرج رہے تھے۔ لکڑی کی خوب صورت عمارتیں، شوگران اور سری پائے جیسے بلند مقامات کی جھلکیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔

یہاں سے دریا پر بنے پل کو عبور کیا تو ایک اونچی پہاڑی پر بنے سید اسماعیل شہیدؒ کے مزار پر نظر پڑتی تھی۔ دور سے یوں لگتا تھا جیسے سبز پتوں میں کوئی سفید پھول کھلا ہو۔ اس اونچی پہاڑی سے بالاکوٹ کا بہترین نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ سید اسماعیلؒ اور ان کے ساتھیوں کی شہادت اس سرزمین کی پہچان تھی جس کی مختصر تاریخ یہ تھی کہ دلی سے آنے والے دین اسلام کے شیر دل سپاہی نے سکھوں کی طاقت کو ختم کیا تھا اور اسی مقام پر آخری فیصلہ کن جنگ لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ اس مزار سے نیچے گھاٹی کی طرف دریائے کنہار بپھرتا، شور مچاتا بہہ رہا تھا۔

یہاں ہوٹلوں کی بھی بہتات تھی۔ راستے میں اگرچہ ذرا دیر رک کر چائے وغیرہ کا دور چلا تھا مگر مستقل ٹھکانہ نہیں کیا گیا تھا۔ میں بڑے ڈرامائی انداز میں ان کا تعاقب کر رہا تھا۔

بٹ راس کا جنگل پیچھے رہ گیا تھا حالانکہ مجھے پورا یقین تھا کہ یہاں ان کا چند روز قیام ہو سکتا تھا۔ مگر لگتا تھا جیسے ان کا ارادہ بدل گیا تھا۔

اس وقت ہم سطح سمندر سے 7500 فٹ کی بلندی پر تھے اور بڑی کاٹ دار سردی پڑنے لگی تھی۔ ہمارا سفر اب دریائے کنہار کے ساتھ ساتھ تھا۔

اچانک میں نے اس ہائی ایس وین کو اپنی جیپ سے تیزی کے ساتھ کراس کرتے ہوئے دیکھا جسے میں قریباً ایبٹ آباد سے ہی اپنے پیچھے آتے دیکھ رہا تھا۔ اور میرا خیال یہی تھا کہ یہ سیر و تفریح کی غرض سے نکلے ہوئے سیاحوں کی کوئی گاڑی ہے۔ تاہم اس بار اسے کراس ہوتے دیکھ کر میں نے غیر ارادی طور پر اندر موجود افراد کا بہ غور جائزہ لینا ضروری سمجھا تو ایک بات دل کو کھٹکنے لگی۔ اس میں سوار تقریباً نو دس افراد میں نہ کوئی بوڑھا دیکھا تھا اور نہ ہی کوئی بچہ یا عورت۔ سبھی ہٹے کٹے اور جوان افراد براجمان تھے۔ پھر میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے یہ کوئی فرینڈ شپ ٹولا ہو اور پر ہینڈ ڈونیشن کے ذریعے سیر و تفریح کی غرض سے مشترکہ طور پر نکلا ہو۔

سر دست میرے ذہن میں کسی کے بارے میں شبہ کرنے کا کوئی محل نہ تھا۔ رب نواز والا مسئلہ حل ہو چکا تھا۔ اشفاق شاہین کو میں "رام" کر چکا تھا جبکہ کبیر اور ان دونوں کیلاشی باشندوں کو میں ناکوں چنے چبوا چکا تھا۔ لہٰذا میں مطمئن ہو کر اپنے سفر پر گامزن رہا۔ ہم جس علاقے سے گزر رہے تھے، یہاں دریائے کنہار کے ساتھ مکئی، چاول، آلو، مٹر اور گندم کی کاشت کی جاتی ہے۔

یہاں برف باری کا موسم تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ ان لوگوں نے ابھی تک کسی ہوٹل وغیرہ میں کیوں نہیں بکنگ کروائی۔ جبکہ ان کا رخ کمال بن سے بھی آگے برف زار ویرانوں کی طرف تھا۔ میں نے سوچا، ہو سکتا ہے ان کا ارادہ "کیمپنگ" کا ہو۔ مگر پھر فوراً میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ یہ لوگ جن تفریحی مقامات پر پہنچ کر رکے تھے، وہ "پھاگل" اور "کھنیاں" کے درمیان واقع تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ یہ لوگ کاغان کے بازار میں واقع بہترین اور آرام دہ ہوٹلوں میں بھی رہ سکتے تھے مگر ان کے شکار کی نوعیت ایسی تھی کہ وہ ویران برف زاروں کے قریب برفیلے مقامات پر ہی قیام پذیر ہو سکتے تھے۔ برفانی لومڑیوں کا شکار اس موسم میں بہترین سمجھا جاتا تھا اور اس کے شکاریوں کو بھی سخت جان ہونا پڑتا تھا۔

بہر طور جب میں نے انہیں یہاں قیام پذیر بہ الفاظ دیگر خیمہ زن ہوتے دیکھا تو میں یہاں سے "کھنیاں" کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں خوب صورت اور آرام دہ سرائے تھیں۔

میں نے ایک سرائے کے سامنے جیپ روک دی۔ سرائے کی عمارت بڑی خوب صورت تھی۔ بر
کا نام سرائے تھا مگر یہ کسی ہوٹل سے کم نہ تھی۔
میں جیپ کے محدود اور بند گرم ماحول سے باہر نکلا تو سردی سے ٹھٹھرا کر رہ گیا۔ تاہم اس سردی
ایک خوشگواریت کا احساس بھی تھا۔ میں اندر پہنچا اور سرائے کے مالک سے معاملات طے کرنے کے
اپنے کمرے میں آ گیا۔ یہاں بیڈ وغیرہ نہ تھے، بڑی بڑی چارپائیاں تھیں۔ میں نے بیرے سے چا
پر پہلے سے بچھے رضائی بستر ے کو اٹھوانے کا کہہ دیا اور اپنا گرم کمبل اور تلائی وغیرہ بچھا دی
سرائے کے عقب میں ایک بڑا سا چوبی شیڈ تھا۔ گاڑیاں وہیں کھڑی ہوتی تھیں۔ دو سرائے
ساتھ ہی بنی ہوئی تھیں اس لئے یہ مشترکہ شیڈ تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ دوسری سرائے اس سرائے
مالک کے دوسرے بھائی کی تھی اور یہ ان کی مشترکہ ملکیت تھی۔ میں نے کھانا وہیں کمرے میں ہی منگوا
کھایا۔ سرائے میں زیادہ لوگ نہ تھے۔ اس کی وجہ سیزن کا شاید آف ہونا تھا۔ ہائیکنگ اور برف باری
چند شائقین سیاح جو دیگر شہروں اور ممالک سے آئے تھے، وہی نظر آ رہے تھے۔
بہرحال یہاں کا ماحول اچھا، صاف ستھرا اور آرام دہ تھا۔ اس کے علاوہ سب سے بڑی بات
کہ گنجلک آبادی سے ہٹ کر تھا۔ نظر حیات اور چوہدری ذیشان وغیرہ دوسری سرائے میں فروکش
تھے۔ گویا اب میں ''کھدیاں'' میں مقیم تھا اور نظر حیات وغیرہ ''پھاگل'' کے قریب۔ اب یہ مجھے معلوم
تھا کہ وہ برفانی لومڑیوں کے شکار کے لئے کون سی اور کس طرف کی برف زار وادیوں کا رخ
والے تھے۔
میں نے چوبی کھڑکی کھول کر باہر کا منظر دیکھا۔ لکڑی کی کھڑکی کے چوکھٹے سے دور برف
سجائے سر بہ فلک پہاڑوں کی چوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ سردی میں کاٹ سے زیادہ اب خوشگوار
احساس ہونے لگا تھا۔ ایسا شاید تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہونے والی برف باری کی وجہ سے تھا۔ تاہم
احساس بہرحال اپنی جگہ ہمہ وقت تھا۔
اچانک میری نگاہ اس اُڑی اُڑی رنگت والی ہائی ایس وین پر پڑی جس کے اندر میں نے قریباً
افراد بیٹھے دیکھے تھے مگر میں صحیح طرح ان کی صورتیں نہ دیکھ پایا تھا۔ یہ وہی وین تھی، جسے میں نے
آباد سے نکلتے دیکھا اور میرے ساتھ ساتھ ہی انہوں نے کبھی آگے اور کبھی پیچھے سفر کیا تھا۔ اب
آسانی انہیں وین سے اترتے ہوئے ان کا ایک ایک چہرہ دیکھ رہا تھا۔ مگر ان میں کوئی بھی چہرہ مجھے
نہیں لگا تھا۔ یہ لوگ بھی شاید اس سرائے میں فروکش ہونے کے لئے ٹھہرے تھے۔ پھر میں نے کھڑکی
کر دی اور اپنے مختصر سے سامان کا جائزہ لینے لگا۔
سفر کی تکان اتارنے کی غرض سے تھوڑی دیر بعد میں بستر پر دراز ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اچانک
ہلکا شور سنائی دیا۔ توجہ دینے پر معلوم ہوا کہ یہ ایک سے زائد افراد کی باتوں اور آوازوں کا شور تھا
یونہی پڑا رہا۔ تھوڑی دیر بعد پاس کے کمروں میں کھٹر پٹر کی آوازیں ہونے لگیں۔ میں سمجھ گیا کہ ہائی
وین کے مسافر اپنے کمروں میں ''سیٹنگ'' کر رہے ہیں۔
میں ان کی طرف سے توجہ ہٹا کر ذہن کو ''ریلیکس'' کرنے کی غرض سے اس طرح چارپائی
الذہنی کی حالت میں پڑا رہا۔ اتنا تو مجھے یقین تھا کہ نظر حیات وغیرہ کم از کم آج تو برف زار وادی
نہیں کریں گے۔ کیونکہ سفر کی تھکان سے وہ آرام ہی کر رہے ہوں گے۔ ویسے بھی میں نے ان
دیکھ رکھا تھا۔ میں نے وہ شام کمرے میں ہی گزار دی۔ کمرے میں آتش دان تھا۔ میں نے بیرے

کرا سے سلگا لیا۔ پھر ذرا ہی دیر بعد یونہی کمرے سے نکلا۔ مختصر سی راہداری ویران تھی۔ چھت میں دو بیمار
یرقان زدہ روشنی والے پیلے بلب نصب تھے۔ میں یونہی زینوں کی طرف بڑھا اور نیچے اتر کر سرائے سے
باہر آ گیا۔ باہر ہر سُو سناٹا اور خاموشی کا راج تھا۔ خون کو برف کر دینے والی سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔
تب مجھے بھی احساس ہونے لگا کہ اس موسم میں برفانی لومڑیوں کا شکار کرنا کس قدر جان جوکھم والا کام
تھا۔ میں سرائے کے برآمدے میں کھڑا تھا۔ اچانک مجھے اپنے عقب میں کسی کے قدموں کی آہٹیں سنائی
دیں۔ میں نے غیر ارادی طور پر عقب میں دیکھا تو سرائے کے بیرونی دروازے سے مجھے دو افراد نمودار
ہوتے دکھائی دیئے۔ انہوں نے فر کے لانگ کوٹ اور سروں پر ٹوپیاں چڑھا رکھی تھیں۔ میں انہیں دیکھتے
ہی پہچان گیا تھا۔ ان دونوں کا تعلق ہائی ایس کے مسافروں سے تھا جو میرے کمرے کے اریب قریب
میں رہائش پذیر تھے۔ مجھے باہر تنہا کھڑے دیکھ کر دونوں نے مجھ پر ایک بظاہر اچٹتی سی نگاہ ڈالی پھر اس
کے بعد سرائے کے عقبی گوشے کی طرف بڑھ گئے جہاں بڑے سے چوبی شیڈ کے نیچے گاڑیاں وغیرہ
کھڑی تھیں۔
پھر ذرا ہی دیر بعد میں نے کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی اور دوسرے ہی لمحے میں نے
سرائے کی چوبی مستطیل عمارت کے عقب سے وہی اُڑی اُڑی رنگت کی ہائی ایس وین کو نمودار ہوتے
دیکھا اور ذرا ٹھٹکا۔ کیونکہ اس میں وہی دونوں افراد براجمان تھے۔ ان میں ایک ڈرائیونگ سیٹ سنبھالے
ہوئے تھا جبکہ دوسرا اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ وین تیزی سے غراتی ہوئی ایک طرف نکل گئی۔
مجھے حیرت ہوئی کہ یہ لوگ اس وقت کہاں نکلے تھے؟ میں چند ثانیے کھڑا سرخ بتیوں کو دیکھتا رہا اور پھر
واپس اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ رات کے نو بجنے والے تھے۔ سردیوں میں یوں بھی جلدی بھوک لگ
جاتی ہے۔ مجھے بھی بھوک لگ گئی۔ میں نے بیرے سے کمرے میں ہی کھانا منگوا کر کھایا۔
کھانے سے فارغ ہوا تو اچانک مجھے باہر گاڑی کی گھر گھراہٹ سنائی دی۔ میں نے کھڑکی کے
قریب آ کر ذرا جھری بناتے ہوئے نیچے دیکھا تو مجھے وہی ہائی ایس وین نظر آئی۔ وہ دونوں نیچے اتر رہے
تھے۔ پھر میں نے انہیں سرائے کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ میں کھڑکی سے ہٹ
گیا۔ اسی وقت مجھے مثانے پر پڑنے والے دباؤ کا احساس ہوا تو میں سیدھا ٹوائلٹ کی طرف بڑھ گیا۔
ٹوائلٹ کی ایک طرف کی دیواریں بھی لکڑی کی بنی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ خاصی سیلن چپکی ہوئی تھی۔
اچانک مجھے ٹوائٹ کی بائیں طرف کی دیوار میں ایک کپڑے کی دھجیاں پھنسی ہوئی نظر آئیں۔ مگر اس دیوار
کی دوسری طرف سے مجھے باتوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے جانے کیا سوچ کر کپڑے کی
دھجیاں آہستگی کے ساتھ کھینچیں تو مجھے ایک بڑا سا سوراخ نظر آیا۔ اس سوراخ سے دوسرے کمرے میں
جھانکنا معیوب ہی تھا مگر میں نے اس کے ساتھ اپنی ایک آنکھ چپکا دی اور دوسرے ہی لمحے میرے
پورے وجود میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔
وہ کل سات افراد تھے اور کہیں جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ مگر ان کی ''تیاریوں'' میں مال و
اسباب کی بجائے جنگی اسباب تھا۔ کوئی اپنے پستول کے چیمبر میں گولیاں ڈال رہا تھا اور کسی کو میں نے
پینٹ کی بیلٹ میں پستول اڑستے ہوئے دیکھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ لوگ کسی سے جنگ کرنے جا
رہے تھے۔ مگر کس سے؟ .... یہ میں نہیں جانتا تھا۔ مگر یہ سب دیکھ کر میرے پورے وجود میں
چیونٹیاں سی رینگنے لگی تھیں۔
میں بدستور دھڑکتے دل کے ساتھ سوراخ سے اپنی ایک آنکھ چپکائے یہ سب دیکھے جا رہا تھا۔ ان

دوئم

سب کے چہروں پر جوش کی تمتماہٹ تھی۔

''آج چوہدری ذیشان کی آخری رات ہونی چاہئے .... ہر صورت۔'' ایک نسبتاً لحیم شحیم اور چوڑے شخص نے اپنے پستول میں بلٹ کلپ ٹھونکتے ہوئے خوفناک لہجے میں ہولے سے بڑبڑا کر کہا۔

''تم فکر ہی نہ کرو استاد! ہم بھلا ایسا سنہری موقع ہاتھ سے جانے دیں گے؟'' اس کے ایک ساتھی نے اپنی پتلون کی بیلٹ میں پستول اڑسنے کے بعد اوپر لیدر کی سیاہ جیکٹ پہنتے ہوئے کہا۔

جب ساری تیاریاں مکمل ہو چکیں تو یہ لوگ ایک ایک کر کے کمرے سے باہر نکلنے لگے۔ میں نے جلدی سے کپڑے کی دھجیاں دوبارہ سوراخ میں بھر دیں اور ٹوائلٹ سے نکل آیا۔

میرے سینے میں زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی۔ یہ لوگ چوہدری ذیشان کو نہ جانے کس کے کہنے پر اور کون سی دیرینہ دشمنی کے باعث ہلاک کرنے کا ارادہ رکھتے تھے؟ مجھے چوہدری ذیشان سے کوئی ہمدردی نہیں تھی مگر میرے لئے اُلجھن کی بات یہ تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہئے؟ ان بدمعاشوں کے ارادوں نے میری مہم کو مشکل بنا ڈالا تھا۔ اگر میں اس پرائے پھڈے میں اپنی ٹانگ اڑاتا بھی تو میرا نظر حیات کے سامنے خود کو ظاہر کرنے کے برابر تھا۔ دفعتہً مجھے باہر انجن کی ہلکی گھرگھراہٹ کی آواز سنائی دی اور میں یکدم خیالوں کی دنیا سے باہر نکل آیا۔ میں لپک کر کھڑکی کی طرف آیا اور ایک پٹ ذرا کھولا تو سرد اور برفیلی ہوا کا ایک کاٹ دار جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا۔ میں نے نیچے تاریکی میں اس سرخ رنگ کی ہائی ایس ویگن کی ہیڈ لائٹس دیکھیں جو تیزی سے آگے بڑھ کر ایک طرف کو موڑ کاٹ رہی تھی۔ میں نے تیزی کے ساتھ کھڑکی بند کی۔ اپنی براؤن لیدر کی جیکٹ چڑھائی۔ جیپ کی چابیاں اٹھائیں اور میگزین کی موجودگی کی تسلی کرنے کے بعد کمرے سے باہر نکل آیا۔ ذرا دیر بعد ہی باہر آ کر اپنی جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔

باہر دن بھر ہونے والی بارش کے بعد برف باری شروع ہو چکی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسی برف باری میں انہیں آخر اپنے ''شکار'' کو ٹھکانے لگانے کی کیا پڑی تھی؟ آخر کو میں بھی انہی کی طرح اپنے شکار کے تعاقب میں یہاں آیا تھا۔ لیکن میں تنہا ہوتے ہوئے بھی کسی قسم کی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کر رہا تھا۔ کیونکہ نظر حیات اور چوہدری ذیشان کی یہ مہم ایک آدھ روز پر مشتمل نہ تھی۔ بہرحال میں نے جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ میں نے دانستہ جیپ کی ہیڈ لائٹس گل کر رکھی تھیں۔ البتہ مجھے ونڈ اسکرین کے پار سامنے دور جاتی ہوئی اس ہائی ایس ویگن کی عقبی سرخ بتیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ آسمان روشن تھا۔ طباق چاند کی مدھ بھری رات میں روئی کے گالوں کی طرح گرتی برف بڑا دلکش اور پراسرار منظر پیش کر رہی تھی۔

میری اس اچانک اور انجانی مہم میں کئی طرح کے خطرات تھے۔ ایک تو یہ کہ میں چوہدری ذیشان کے دشمنوں کی نظروں میں آ سکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ دوران لڑائی چوہدری ذیشان کے آدمی مجھے بھی ان کا ساتھی ہی سمجھتے۔ مگر میں پہلے ہی سے ذہن میں ایک مربوط حکمت عملی تیار کر چکا تھا۔ یعنی سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

نظر حیات اور چوہدری ذیشان نے جس مقام پر کیمپنگ کرائی تھی وہ ''کھنیاں'' اور ''پھاگل'' کے درمیان کا ایک ویران برف زار علاقہ تھا جہاں جنگل دور تک جاتا دکھائی دیتا تھا۔

چونکہ مجھے معلوم تھا کہ نظر حیات وغیرہ نے کس مقام پر ''کیمپنگ'' کر رکھی تھی اس لئے میں نے

اب میں باآسانی اس سرخ رنگ کی ہائی ایس ویگن کا راستہ کاٹ سکتا تھا۔ اگرچہ مجھے اس کے لئے اضافی چکر کاٹنا پڑ رہا تھا مگر میں پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ ہائی ایکس ویگن کے مقابلے میں جیپ کی رفتار زیادہ ہی تھی۔ میں نے اپنی جیپ کا ہیٹر آن کر رکھا تھا۔ میں نے جیکٹ کے کالر کھڑے کر کے ہاتھوں پر گرم اونی دستانے چڑھا لئے تھے۔ تیز رفتاری کے باعث مجھے اب بہت سنبھل کر ڈرائیونگ کرنی پڑ رہی تھی۔ راستہ برف سے اٹا پڑا تھا۔ میری جیپ فور وہیل ڈرائیو تھی۔ برف باری میں ابھی اتنی کچھ خاص شدت تو نہ تھی تاہم پھر بھی سلائیڈنگ کا خطرہ تھا۔ مگر راستہ کچا اور ناہموار ہونے کے باعث یہ خطرہ قدرے کم ہو گیا تھا۔

جب میں نے محسوس کیا کہ میں ہائی ایس وین سے راستہ تبدیل کر چکا ہوں تو میں نے اپنی جیپ کی ہیڈ لائٹس روشن کر دیں۔ اب راستہ صاف نظر آ رہا تھا۔ ''کھنیاں'' کا علاقہ اب بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق میں اس وقت جس مقام سے گزر رہا تھا، یہاں مجھے نظر حیات اور چوہدری ذیشان کے ''کیمپس'' کے آثار ملنے چاہئے تھے۔ مگر یہاں چہار اطراف ویرانی کے سوا کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ میری پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔ میں نے ذرا آگے جا کر جیپ روک دی۔ انجن البتہ آف نہ کیا تھا۔ ممکن تھا سخت ٹھنڈ کی وجہ سے دوبارہ اسٹارٹ کرنے میں مشکل پیش آتی۔

میں برف کے ویرانے میں جیپ کے اندر ہی بیٹھا اپنے چہار اطراف گردن موڑے جائزہ لے رہا تھا۔ جہاں تک میری نظریں کام کر سکتی تھیں، میں دیکھتا رہا۔ ذرا دیر بعد برف باری رک گئی اور ایک طرف سے بادل چھٹے تو چاند کی روشنی ہر سُو پھیل گئی۔ یہ نہایت خوب صورت منظر تھا جس میں عجیب پراسراریت تھی۔ میں نے جیپ کا دروازہ کھولا اور باہر اتر آیا۔ میرے پاس برف سے ڈھکے ہوئے چند ٹنڈ منڈ درخت تھے۔ میں ذرا آگے بڑھا تو ایک مقام پر مجھے کسی پڑاؤ کے آثار محسوس ہوئے۔ میں نے فوراً دماغ کے بل جھک کر آس پاس کی زمین کا جائزہ لیا تو ایک جگہ برف میں مجھے ٹائروں کے نشانات آگے جاتے ہوئے نظر آئے۔ گری ہوئی برف کی وجہ سے یہ نشانات دور تک واضح تھے۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دیر نہ لگی کہ نظر حیات اور چوہدری ذیشان کا یہ مختصر سا شکاری قافلہ چند گھنٹوں پہلے ہی یہاں سے کوچ کر چکا تھا۔ میں تیزی سے واپس پلٹا اور دوبارہ اپنی جیپ میں سوار ہوا۔ پھر گیئر بدل کر اسے آگے بڑھا دیا۔ میں نے اسٹیئرنگ موڑ کر جیپ کا رخ ٹائروں کے نشانات کی طرف کر دیا تھا۔ دفعتہً غیر ارادی طور پر میری نگاہ کھڑکی پر لگے بیک ویو مرر پر پڑی۔ میں چونک پڑا۔ دور عقب میں مجھے روشنی نظر آئی۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ وہ سرخ ہائی ایس ہی ہو سکتی تھی۔ میں نے تیزی سے سوچا، ممکن تھا انہیں میری جیپ کی عقبی سرخ بتیاں بھی نظر آ چکی ہوں۔ اور پھر ایک جھماکے سے میرے ذہن میں یہ خیال اُبھرا کہ سرخ ہائی ایس والے مجھے ہی اپنا ''شکار'' سمجھ کر میرے تعاقب میں آ سکتے تھے۔ مجھے فوراً ہیڈ لائٹس گل کرنا پڑیں۔ میں اب مدھم پراسرار چاندنی میں ہی آگے بڑھتا رہا۔

دور سامنے برف پوش پہاڑیوں کے سر بہ فلک ہیولے پراسرار دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی برف ڈھلانوں پر سبزہ زار جنگل سیاہ دھبوں کی صورت میں نظر آ رہے تھے۔ میں نے ممکنہ حد تک جیپ کی رفتار بڑھا دی۔ ساتھ ہی گاہے گاہے میں بیک ویو مرر میں بھی دیکھے جا رہا تھا۔ دور عقب میں روشنی ہنوز نظر آ رہی تھی۔ ایک بات سوچ کر میں بے اختیار ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گیا۔ جیپ کی بتیاں گل کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ برف پر بننے والے میری جیپ کے ٹائروں کے نشانات ان کی رہنمائی کر سکتے تھے۔ دوسرے مجھے بھی بتیاں گل کرنے کے بعد جیپ دوڑانے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ خدشہ تھا کہ جیپ کسی

اندھے گڑھے میں پھنس سکتی تھی۔ ناچار میں نے دوبارہ ہیڈ لائٹس روشن کر دیں۔ اب میں نے جیپ کی رفتار مزید بڑھا دی۔ تھوڑی دیر گزر گئی۔ عقب میں مجھے وہ روشنی نظر نہ آئی۔ یا تو میں اسے پیچھے چھوڑ آیا تھا یا پھر وہ کسی خرابی کے باعث رک چکی تھی۔ میں نے بہرطور اطمینان کی سانس لی تھی۔ اب ڈھلوانی جنگل کے خاصے قریب پہنچ چکا تھا۔ ہیڈ لائٹ کی روشنی میں درخت اور ان کی شاخیں سے ڈھکی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ میں ٹائروں کے نشانات کی رہنمائی میں ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ دائیں مجھے برف سے ڈھکی ہوئی ڈھلوانی چھتوں والے دو تین کاٹیج بھی نظر آئے تھے۔

ٹائروں کے نشان ایک کاٹیج کے قریب سے ہو کر آگے بڑھ گئے تھے۔ شاید نظر حیات وغیرہ کے لئے یہاں رکے تھے اور پھر آگے بڑھ گئے تھے۔ مگر چند کلومیٹر کا سفر طے کرنے کے بعد اچانک سامنے ذرا بائیں جانب مدھم روشنی نظر آئی۔ پھر میں اس وقت چونکا جب ٹائروں کے نشان بتدریج کی شکل میں بل کھاتے ہوئے اس روشنی کی سمت جا رہے تھے۔ میں نے فوراً جیپ کی بتیاں پھر گل کر دیں اور ذرا قریب پہنچا تو روشنی کا "مخرج" ایک چوبی کاٹیج کو دیکھ کر فوراً جیپ ذرا دور روک دی۔ پھر اگنیشن سوئچ آف کر کے میں دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔

باہر بڑی کاٹ دار سردی تھی۔ میرے موبائل میں ٹارچ تھی۔ مگر میں نے اسے روشن کرنے کی ضرورت نہ سمجھی اور کاٹیج کی طرف تیز تیز قدموں سے بڑھنے لگا۔ یہ کاٹیج کا عقبی حصہ تھا جبکہ میں نے ذرا کے رخ درختوں کی آڑ لیتے ہوئے اُبھر کر دیکھا تو مجھے نظر حیات کی نیلے رنگ والی ملسوبشی پجارو چوہدری ذیشان کی سرخ رنگ والی ڈبل کیبن انٹرکولر ٹربو کھڑی نظر آ گئیں۔

میرا دل تیزی سے سینے میں دھڑکنے لگا۔ میں اپنی منزل کے بالکل قریب تھا۔ مگر صورتِ حال اب اور بڑے عجیب انداز میں تبدیل ہو چکی تھی۔ مجھے دوسرا کام بھی انجام دینا پڑ رہا تھا۔ ایک طرف شکار کو چھاپنا تھا اور دوسری طرف کے شکار کو بچانے کی کوشش کرنا پڑ رہی تھی۔ اس پر مستزاد دونوں اکٹھے اور ایک ہی مقام پر موجود تھے۔

میں کاٹیج کے ذرا قریب آ کر ایک درخت کی آڑ سے بہ غور اس کے اطراف و اکناف کا جائزہ لینے لگا۔ آس پاس کوئی ذی نفس موجود نہ تھا۔ یہ کاٹیج دومنزلہ تھا۔ روشنی کاٹیج کی اوپری منزل کے کسی کے دریچے سے آ رہی تھی۔ یہاں شاید بجلی کا انتظام نہ تھا یا پھر یہ روشنی کسی گیس کے ہنڈولے کی تھی۔ میں نے تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی اور کاٹیج کی طرف لپکا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر بری طرح ٹھٹکا۔ دروازے پر ایک بڑا سا تالا نظر آ رہا تھا جو اس بات کی گواہی تھا کہ اندر کوئی موجود نہیں۔ میں اُلجھے ہوئے ذہن کے ساتھ سوچنے لگا کہ ان کی دونوں گاڑیاں ادھر ہی موجود تھیں تو یہ لوگ کہاں ہیں۔ پھر ایک اور خیال بھی آیا کہ ممکن ہے یہ لوگ پیدل ہی شکار کی تلاش میں کہیں قریب ہی ہوں۔ برفانی لومڑیاں بالخصوص اس موسم میں رات کو اپنے ٹھکانوں سے نکلتی تھیں۔ یہ موسم ان کی افزائش کا ہوتا تھا۔

اچانک کہیں قریب سے گولی چلنے کے دھماکے کی آواز اُبھری۔ میں بری طرح ٹھٹکا۔ ذرا وقفے سے دوسری اور پھر تیسری گولی بھی چلی۔ اس کے بعد پھر وہی گہری اور پراسرار خاموشی چھا گئی تھی گولیوں کے بعد دیگرے آوازیں میری داہنی جانب جنگل سے اُبھری تھیں۔ میرا خیال درست ثابت ہوا۔ نظر حیات وغیرہ قریب ہی شکار کھیل رہے تھے۔ مذکورہ سمت کی جانب سے میں نے دیکھا تو وہاں جنگل میں متحرک روشنی نظر آئی اور ساتھ ہی چند انسانی ہیولے بھی دکھائی دیئے جن کا رخ کاٹیج کی جانب ہی تھا۔ میں نے تیزی سے حرکت کی اور جنوبی سمت والی دیوار کی آڑ میں آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی مجھے مذکورہ سمت سے چند لوگ آتے دکھائی دیئے۔ ان کی تعداد پانچ چھ کے قریب تھی۔ دو کے ہاتھوں میں ٹارچیں تھیں جبکہ باقی تین افراد اپنے کاندھوں پر برف جیسی سفید رنگت کے بوجھ اٹھائے ہوئے تھے۔

جب وہ قریب آئے تو میں نے آنکھیں سکیڑ کر انہیں دیکھا۔ جن دو افراد کے ہاتھوں میں ٹارچیں اور کاندھوں پر رائفلیں جھولتی نظر آ رہی تھیں ان میں سے ایک ذرا دراز قامت اور بھاری بھرکم شخص تھا جبکہ اس کا دوسرا ساتھی ذرا دبتی ہوئی جسامت کا مگر تنومند شخص تھا۔ انہوں نے گرم لباس زیب تن کر رکھا تھا اور ٹوپ والے موٹے گرم چسٹر پہن رکھے تھے۔ وہ لوگ آپس میں اونچی آوازوں سے باتیں کرتے ہوئے کاٹیج کے قریب پہنچے تو مجھے یہ دیکھ کر ایک جھٹکا لگا کہ ان میں نظر حیات موجود نہ تھا۔ جبکہ یہ پانچواں اور رعب دار شخصیت والا آدمی بھی میرے لئے اجنبی تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ یہی ایم این اے چوہدری ذیشان ہوگا جو نظر حیات کی شکاری مہم کا ساتھی تھا۔ یہ ممکن تھا کہ نظر حیات ابھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ جنگل کے اندر ہنوز شکار میں مصروف ہو۔ بہرطور میں نے یہ معاملہ فوری طور پر نمٹانے کا سوچا اور دیوار کی آڑ سے نکل کر ان کے سامنے آ گیا۔ وہ پانچوں ایک اجنبی کو دیکھ کر بری طرح ٹھٹکے تھے۔

"کون ہو تم؟" بھاری جسامت اور رعب دار شخصیت کے ساتھ کھڑا وہ ٹھگنے قد کا شخص میرے چہرے پر ٹارچ کی روشنی پھینکتے ہوئے ذرا تیز آواز میں بولا۔

"مجھے چوہدری ذیشان صاحب سے بات کرنی تھی۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں چوہدری ذیشان ہوں۔ بولو......... کیا بات ہے؟" اس بار رعب شخص نے گمبیھر لہجے میں مجھ سے کہا تو میں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

"چوہدری صاحب! وقت کم ہے۔ میرے تھوڑے سے کہنے کو بہت جانیے گا۔ میں کھیاں کی ایک سرائے سے آپ کو تلاش کرتا ہوا یہاں پہنچا ہوں، یہ بتانے کے لئے کہ میں نے........." اس کے بعد میں نے اسے مختصر الفاظ میں ساری بات بتا دی۔

"یہ مجھے انہی کا ساتھی معلوم ہوتا ہے چوہدری صاحب! اسے پکڑ لیجئے۔" اس کے گینڈے جیسی جسامت والے ساتھی نے مجھے سخت نظروں سے گھورتے ہوئے چوہدری ذیشان سے کہا۔ میں نے اس پر ایک کڑی نگاہ ڈالی اور پھر یکسر نظر انداز کر دیا۔ میں نے جو کہنا تھا، وہ کہہ چکا تھا۔ تاہم چوہدری ذیشان کو میں نے گہری سوچ میں مستغرق پایا۔ اس کی پُرسوچ نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے وہاں سے رخصت ہوتے ہوئے آخر میں اس سے پھر کہا۔

"چوہدری صاحب! میں نے انسانیت کے ناتے اپنا فرض پورا کر دیا......... میں اب چلوں گا۔" یہ کہہ کر میں واپس جانے کے لئے مڑا تو عقب سے اس گینڈے جیسی جسامت والے شخص کو میں نے بڑبڑاتے سنا۔

"او چوہدری صاحب! لہنوں پھڑ لوو......... یہ انہی کا بندہ لگتا ہے۔"

"اوئے تُو چپ کر......... اسے جانے دے۔" میں نے چوہدری ذیشان کی آواز سنی۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنی جیپ میں آ کر سوار ہو گیا۔

چوہدری ذیشان سمجھ دار واقع ہوا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا، ایک اجنبی شخص اتنی دور سے اپنی جان خطرے میں ڈال کر یہاں اسے جس خطرے سے آگاہ کرنے آیا تھا، وہ غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی عقل مندی کا ایک اہم اشارہ مجھے یہ ملا تھا کہ اس نے نہ میرا نام پوچھا تھا اور نہ ہی میرے بارے میں کوئی تفصیل جاننے کی

ضرورت سمجھی تھی۔

بہرطور میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنی جیپ کے قریب پہنچا اور پھر اس کا دروازہ کھول کر آگے بڑھ گیا۔ میرا رخ جنگل کی سمت تھا جدھر سے میں نے چوہدری ذیشان وغیرہ کو نمودار ہوتے دیکھا تھا۔

میں خاصی تیز رفتاری کے ساتھ جیپ کو دوڑائے جا رہا تھا۔ مطلوبہ مقام پر پہنچنے کے بعد میں نے جیپ کی رفتار دھیمی کر لی۔ کیونکہ کسی بھی وقت میرا اپنے دیرینہ دشمن نظرحیات سے ''ٹاکرا'' ہونے والا تھا۔

میری متلاشی نظریں ونڈ اسکرین کے پار تیزی سے اطراف میں گردش کر رہی تھیں۔ دفعتہً مجھے جنگل کے شمال کی طرف گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی کسی درندے کی چنگھاڑ بھی اُبھری۔ میرا پاؤں غیر ارادی طور پر بریک پر پڑ گیا۔ جیپ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ درندے کے چنگھاڑ مارنے کی کرختی ہوئی آوازیں اب بار بار سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے آواز پر غور کیا۔ یہ مجھے جنگلی ریچھ کی آواز لگی۔

میں نے جیپ جنگل کی مطلوبہ سمت کی طرف موڑ دی۔ تھوڑا ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے سامنے ٹارچوں کی روشنی میں تین افراد دکھائی دیئے۔ ان کے ہاتھوں میں بڑی بڑی رائفلیں تھیں۔ قریب ہی ایک بھاری بھرکم سفید دودھیا ہیولا دکھائی دیا۔ یہ ایک برفانی ریچھ تھا جو کسی بڑے سے برفانی تودے کی طرح ایستادہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اپنی پچھلی دونوں ٹانگوں پر بالکل سیدھا کھڑا تھا۔ اس کے قریب زمین پر مجھے ایک خون میں لت پت انسانی وجود بھی پڑا دکھائی دیا۔ باقی تینوں افراد اپنی رائفلوں سے اس پر اندھا دھند گولیاں برسا رہے تھے۔

پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے ریچھ نے ایک دل دہلا دینے والی چنگھاڑ ماری اور پھر چاروں پیروں پر ہو کر ان کی طرف لپکا۔ وہ تینوں بدحواس ہو کر الٹے قدموں دوڑے۔ مگر اس خوف ناک صورت حال میں ایک شخص کا پاؤں رپٹ گیا۔ وہ برفیلی زمین پر گر پڑا۔ ریچھ اس کے سر پر آن پہنچا۔ اس نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کرنا چاہی مگر ریچھ نے اسے اپنے بھاری بھرکم اور بڑے بڑے نوکیلے پنجوں میں دبوچ کر چشم زدن میں بھنبھوڑ ڈالا۔ اس بدنصیب شخص کے حلق سے برآمد ہونے والی آخری چیخ بڑی کربناک اور دلدوز تھی۔ باقی دو مختلف سمتوں کی طرف دوڑے۔ ایک کی شاید میری جیپ پر نظر پڑ گئی۔ مجھے اندازہ تھا کہ شکاریوں کا یہ گروپ نظرحیات کے ٹولے سے ہی تعلق رکھتا ہوگا۔ اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر میں نے فوراً اپنی جیپ کا دروازہ اس کے لئے وا کر دیا۔ اس نے قریب پہنچتے ہی جیپ کے اندر جست لگا دی۔ اپنی رائفل وہ پہلے ہی پھینک چکا تھا۔ میں نے اس کے سوار ہوتے ہی فوراً جیپ آگے بڑھا دی۔ خونخوار قوی الجثہ ریچھ اپنے دوسرے شکار کے تعاقب میں بدستور دوڑا جا رہا تھا۔

''جیپ چلاؤ...... جلدی کرو...... ورنہ یہ درندہ ہمیں پھاڑ کھائے گا۔'' وہ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ خوف زدہ لہجے میں مجھ سے بولا۔ میں نے ایک نظر اس کے دہشت زدہ چہرے پر ڈالی۔ جیپ آگے بڑھا دی۔ مگر تھوڑی دور جنگل میں نکل آنے کے بعد میں نے جیپ ایک جھٹکے سے روک دی۔ پھر اس کی طرف سرد نظروں سے تکتے ہوئے کہا۔

''تم لوگ شکاری ہو کر ایک ریچھ سے مقابلہ نہ کر سکے؟''

اس نے میری طرف دیکھا۔ وہ اب کافی سنبھل چکا تھا۔ جھینپی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''ہم شکاری تو ضرور ہیں مگر اتنے بڑے درندوں کو شکار کرنے کا ہمیں خاص تجربہ نہیں۔ ہم تو یہاں برفانی لومڑیوں کا شکار کرنے آئے تھے۔''

''بس...... صرف تین چار افراد؟'' میں نے دانستہ اسے کریدنے کی خاطر کہا۔

''نہیں...... میرے ساتھ اور بھی ساتھی ہیں۔'' اس نے جواباً کہا تو میں نے یونہی اِدھر اُدھر تاریک جنگل میں اپنی نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو تمہارا اور کوئی ساتھی نظر نہیں آ رہا؟''

''وہ آگے نکل چکے ہیں۔ ہم یہاں اس درندے کے چنگل میں پھنس گئے تھے...... مگر تم کون ہو؟ اور یہاں جنگل میں کیا کر رہے تھے؟'' اس نے آخر میں بہ غور میرے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے پوچھا تو میں نے مسکرا کر کہا۔

''میں بھی برفانی لومڑیوں کے ایک شکاری ٹولے کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ مگر میں شکاری نہیں ہوں۔ انہیں یہاں تک چھوڑنے آیا تھا۔ وہ اندر جنگل میں شاید تمہارے ساتھیوں کی طرح دور نکل گئے ہیں۔ میں ان کا انتظار کر رہا تھا۔''

میری بات سن کر وہ الجھن آمیز حیرت سے بولا۔ ''یہاں تو میں نے کسی اور شکاری ٹولے کو نہیں دیکھا۔ تم کون سے شکاری ٹولے کی بات کر رہے ہو؟'' اس بار اس کے لہجے میں شک کی آمیزش تھی۔

''ہم ابھی ابھی یہاں پہنچے ہیں۔ اور چوہدری ذیشان صاحب سے بھی ملاقات کی تھی۔ وہ کاٹیج میں پہنچ چکے تھے۔'' میں نے آدھے سچ اور آدھے جھوٹ کا سہارا لیا۔ وہ قدرے مطمئن ہو کر سر ہلانے لگا۔

''مگر وہ تو بتا رہے تھے کہ ان کے ساتھ ان کا کوئی دوست بھی تھا۔ کہیں وہ چھوٹے قد والے گینڈے جیسے شخص کی بات تو نہیں کر رہے تھے جو ان کے ساتھ ہر وقت سائے کی طرح چپکا رہتا ہے؟'' میں نے چالاکی سے نظرحیات کے بارے میں اُگلوانے کی خاطر ایسا کہا تو وہ مسکرا کر بولا۔

''نہیں...... وہ تو چوہدری صاحب کا مشیر ہے۔ بلکہ مشیر بھی کیا ہے، ان کا لاڈلا سالا ہے۔ دوست تو ان کا نظرحیات ہے۔''

''اچھا...... مگر وہ تو ان کے ہمراہ دکھائی نہیں دیا۔'' میں نے یونہی بظاہر رواروی میں مگر دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''وہ نہیں آ سکا تھا۔ اسے اچانک شدید فلو نے آ لیا تھا۔ وہ وہیں بھاگل کے ''بابا سیاں'' والی سرائے میں رہ گیا ہے۔'' اس نے بتایا اور میری رگوں میں یکلخت خون کی گردش تیز ہو گئی۔ میرا ''شکار'' کہاں تھا، مجھے معلوم ہو چکا تھا۔ اب میں نے اس سے جان چھڑانے کی خاطر خاموشی سے جیپ اسٹارٹ کی، یوٹرن لے کر واپس کاٹیج کی طرف موڑ دی۔

میں اب اپنے دل میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ سرخ ہائی ایس والے ابھی وہاں نہ پہنچے ہوں یا پھر چوہدری ذیشان نے میری اطلاع کے بعد فوری طور پر ان سے نمٹنے کے لئے کوئی قدم اٹھا لیا ہو۔

میں اب اسے کاٹیج تک چھوڑ کر بھاگل کی طرف نکل جانا چاہتا تھا۔ کاٹیج زیادہ دور نہ تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے جیپ آگے بڑھا دی۔ پھر تھوڑی دیر بعد جیسے ہی میں کاٹیج کے ذرا قریب پہنچا تو اچانک گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ سنائی دی۔ میں نے اچانک بریک لگا دیئے۔ جیپ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ میرا دل یکبارگی کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ گو فائرنگ کی آواز کاٹیج کی سمت سے آ رہی تھی۔ دشمنوں سے چوہدری ذیشان کا ٹاکرا ہو چکا تھا۔ میری بروقت اطلاع سے ممکن تھا کہ اب چوہدری ذیشان کے مسلح محافظوں کو اپنے دشمن کے خلاف پہلے ہی گھات لگانے کا موقع مل چکا ہو۔ اور ظاہر ہے جسے پہلے گھات مل جائے، اس کے حریف کو مات ملنا لازمی ہے۔

''ی...... یہ...... فائرنگ کیسی ہے؟'' میرے برابر کی سیٹ پر بیٹھے چوہدری ذیشان کے آدمی

نے مرتعش آواز میں کہا تو میں بولا۔

”کہیں چوہدری صاحب کے کسی دشمن نے ہلّہ تو نہیں بول دیا؟“

”ایسا ہی لگتا ہے۔“ وہ دانت پیس کر بولا اور پھر اپنی شکاری رائفل ایک جانب پھینکنے کے بعد جیب سے پستول نکال لیا اور دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ پھر تیزی کے ساتھ کاٹیج کی طرف دوڑتا گیا۔ وہ چوہدری ذیشان کا کوئی پکا نمک خوار لگتا تھا۔ میں اب شش و پنج کا شکار ہو گیا تھا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے میں نے جیپ آگے بڑھا دی۔ میں نے اپنا جو فرض ادا کرنا تھا، کر چکا تھا۔ اب چوہدری ذیشان جانے اور اس کے نامعلوم دشمن۔

فائرنگ کی آواز مسلسل تاریک جنگل میں گونج رہی تھی۔ میں دانستہ ذرا کاٹیج کی حدود سے دور ہو جیپ دوڑانے لگا۔ اچانک میں نے کاٹیج کی سمت سے آنے والے راستے پر ایک گاڑی کا ہیولا دیکھا۔ تیزی سے دوڑی جا رہی تھی۔ میں نے فوراً اپنی جیپ کی رفتار دھیمی کر لی اور ونڈ اسکرین کے پار بغور دوڑتی ہوئی گاڑی کو دیکھنے لگا۔ اور پھر بری طرح ٹھٹکا۔ وہ سرخ رنگ کی ڈبل کیبن انٹرکولر ٹربو تھی۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں نے اس کے تعاقب میں بھی ایک اور گاڑی کو اندھا دھند دوڑتے ہوئے دیکھا۔ وہی ہائی ایس ویگن تھی جس میں چوہدری ذیشان کے دشمنوں کا سات افراد پر مشتمل ٹولا براجمان تھا۔ مگر نہ جانے ان میں سے کتنے باقی بچے تھے؟ یہ ابھی میں نہیں جان پایا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ زبردست ”... ماری“ کے بعد یقیناً چوہدری ذیشان نے راہِ فرار اختیار کی تھی۔ دونوں گاڑیاں اندھا دھند دوڑی جا رہی تھیں۔ میں اپنے دوسرے راستے پر آ گیا۔ میں نے بھی جانے کیا سوچ کر اپنی جیپ آگے بڑھا دی۔ یہ راستہ ان دونوں آگے پیچھے دوڑتی گاڑیوں کے بالکل متوازی تھا۔ مگر وہ دونوں گاڑیاں میری جیپ سے کافی آگے جا چکی تھیں۔

صورت حال گمبھیر تھی۔ میں بھی اپنی جیپ فل اسپیڈ سے دوڑائے جا رہا تھا۔ میں نے ہائی ایس سے گولیاں چلتے ہوئے دیکھیں جو تاریک جنگل میں جگنوؤں کی طرح آگے دوڑتی ہوئی چوہدری ذیشان انٹرکولر کی طرف لپک رہی تھیں۔ پھر اچانک ایک سماعت شکن دھماکا ہوا اور نظروں نے چوہدری ذیشان انٹرکولر کو ایک جانب جھکتے دیکھا جس کے بعد بتدریج اس کی رفتار دھیمی پڑنے لگی۔ اور بالآخر ایک درخت سے ٹکرا گئی۔ اس کے تعاقب میں دوڑتی ہوئی اس کے خون آشام دشمنوں کی ہائی ایس چشم زدن انٹرکولر کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ میں نے بھی اپنی جیپ کا اسٹیئرنگ موڑا اور ان کی سمت چل دیا۔ نے قریب پہنچتے پہنچتے دیکھا کہ انٹرکولر سے ایک شخص نکل کر تیزی کے ساتھ دوڑا۔ ٹھیک اسی وقت میں ہائی ایس سے تین مسلح افراد کو بھی اترتے دیکھا۔ ایک نے اپنی رائفل کا رخ اس دوڑتے ہوئے شخص کی طرف کر کے برسٹ چلا دیا۔ گولیوں کی مہیب تڑتڑاہٹ اُبھری۔ وہ شخص چیخ مار کر گرا۔ تینوں جیسے ہی کے سر پر پہنچے تو اچانک میری طرف انہوں نے دیکھا۔ میری جیپ آندھی طوفان کی طرح ان کی وحشی درندے کی طرح بڑھ رہی تھی۔ وہ تینوں بوکھلا گئے اور دائیں بائیں دوڑے۔ مگر میری جیپ نے زوردار ٹکر ماری۔ دونوں اچھل کر دور جا پڑے۔ میں نے فوراً جیپ کو بریک لگائے اور اپنا میگارد ہاتھ لیتا ہوا تیزی کے ساتھ نیچے اترا تو تیسرے شخص نے زخمی آدمی کو اپنی گن سے نشانہ بنانا چاہا تو میں اپنی جیپ کے بونٹ کی آڑ لے کر دونوں ہاتھوں سے میگارد تھام کر اس کا نشانہ لے کر ٹرائیگر دبا دیا۔ اس کے گن والے ہاتھ پر لگی تھی۔ کیونکہ دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ سے گن چھوٹ کر گر پڑی۔ نے ایک طرف دوڑ لگا دی۔ میں نے دوبارہ اس کا نشانہ لیا۔ دوسری بار میرے میگارد نے لرزہ خیز آ

تشیں قہقہہ بلند کیا اور وہ شخص کریہہ چیخ کے ساتھ گرا۔ میں تیزی سے زمین پر پڑے زخمی شخص کی طرف بڑھا تو بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ میرا خیال درست ثابت ہوا تھا۔ وہ چوہدری ذیشان تھا۔ اس کی بائیں ٹانگ پنڈلی کی طرف سے لہولہان ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ابھی تک موت کی زردی پھیلی ہوئی تھی۔ صاف لگتا تھا کہ اسے اپنی موت کا یقین ہو چلا تھا۔ میں نے فوراً اسے سنبھالتے ہوئے ہانپتی آواز میں کہا

”چوہدری صاحب!.........آپ ٹھیک تو ہیں نا؟.........اُٹھئے، جلدی کریں۔“

میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور اپنی جیپ کی طرف بڑھا تو اچانک میں نے ذرا دور ایک شخص کو تن سنبھالتے ہوئے لڑکھڑا کر کھڑے ہوتے دیکھا۔ یہ ان دونوں میں سے ایک شخص تھا جنہیں میں نے اپنی جیپ سے اس وقت ٹکر ماری تھی جب وہ دونوں اپنے تیسرے مسلح ساتھی کے ساتھ چوہدری ذیشان کو گولیوں سے چھلنی کرنے کے درپے تھے۔ مجھے فوری طور پر گولی چلانے کا موقع تو نہ مل سکا تاہم میں نے خطرہ بھانپتے ہی زخمی چوہدری ذیشان کو ایک طرف دھکا دے کر گرایا اور خود کو دوسری طرف اچھال دیا۔ ٹھیک اسی وقت دشمن کی رائفل گرجی۔ تڑتڑاتی ہوئی گولیوں کی بوچھاڑ ٹھیک اس سمت پر پڑی جہاں چند ثانیے پہلے ہی میں اور چوہدری ذیشان موجود تھے۔ میں نے محفوظ گوشہ سنبھالتے ہی اپنے میگارد سے اس کا نشانہ لے کر ٹرائیگر دبا دیا۔ میرے میگارد کی مہیب نال نے تیسرا آتشیں قہقہہ اُگلا۔ حریف بھی ایک کائیاں تھا۔ ہمیں تیزی سے جگہ چھوڑتے اور اپنا نشانہ خطا جاتے دیکھتے ہی اس نے بھی بہ سرعت جگہ تبدیل کرنے کی غرض سے ”بلینک پوائنٹ“ کی سمت چھلانگ لگا کر پیرا ٹروپنگ کے انداز میں خود کو میری چلائی ہوئی گولی کی آتشیں زد سے بچایا تھا۔ مگر میں بھی اسے سنبھلنے نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس لئے اوپر تلے گولیاں برساتا چلا گیا۔ وہ بھی شاید کوئی چھلاوا صفت انسان تھا کہ پھرتی کے ساتھ قلابازیاں کھاتا چلا جا رہا تھا۔ اور مجھے اس وقت اس کی چالاکی اور اپنی بے وقوفی کا اندازہ ہوا جب میرے میگارد سے ”ٹرچ“ کی خالی آواز اُبھری۔ میں سناٹے میں آ گیا۔ تاہم میں نے اس نازک صورت حال میں اپنے حواس کو مختل نہ ہونے دیا اور تیزی کے ساتھ اس کے زمین پر بے سدھ پڑے ساتھی کے قریب گری ہوئی رائفل کی سمت لپکا مگر مدمقابل نے سنبھلتے ہی مجھ پر گن تان لی اور دور ہی سے چلّا کر بولا۔

”خبردار!.........اپنی جگہ سے بالکل حرکت مت کرنا.........ورنہ گولیوں سے بھون کر رکھ دوں گا۔“

میں جہاں کا تہاں رہ گیا۔ یکا یک ماحول پر اعصاب شکن خاموشی طاری ہو گئی۔ زمین پر زخمی پڑے چوہدری ذیشان کا چہرہ بھی ست کر رہ گیا تھا جبکہ میرے اعصاب پوری طرح تنے ہوئے تھے اور دل گویا سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑک رہا تھا۔ میری نظریں اس گن بردار شخص پر جمی ہوئی تھیں جواب کینہ توز نظروں سے مجھے گھورتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ پھر میرے قریب پہنچ کر وہ رکا اور مجھ پر رائفل تانے آنکھیں سکیڑے بہ غور مجھے خوفناک نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر میرے دائیں جانب زمین پر زخمی پڑے کراہتے ہوئے چوہدری ذیشان سے سفاکانہ لہجے میں بولا۔

”چوہدری! تیرا آخری وقت تو آن پہنچا ہے۔ پہلے ذرا میں تیرے اس خدائی فوجدار سے بات کر لوں۔“ یہ کہہ کر وہ مجھ سے خوف ناک لہجے میں مخاطب ہوتے ہوئے غرا کر بولا۔

”ہاں.........اب تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ گے، تم کون ہو؟“

”میں ایک شکاری ہوں۔ اور یہاں برفانی لومڑیوں کا شکار کر رہا تھا کہ میں نے تم لوگوں کو ایک نہتے آدمی پر فائرنگ کرتے دیکھا۔“ اتنا کہہ کر میں دانستہ رکا اور اس کی گھورتی ہوئی نظروں سے اپنی نگاہ یکدم

کچھ ایسے چونکتے ہوئے انداز میں اس کے عقب کی جانب ڈالی گویا میں نے اس کے پیچھے کسی کو اچانک دیکھ لیا ہو۔ یہ ایک پرانا حربہ تھا جسے میں نے ذرا بدل کر بالکل فطری اور غیر ارادی اداکاری سے آزمایا تھا۔ کامیاب رہا۔ حسب توقع وہ پیچھے دیکھنے کے لئے ذرا مڑا ہی تھا کہ میں نے "اب نہیں تو کبھی نہیں" کے مصداق بجلی کی پھرتی کے ساتھ اچھل کر فلائنگ کک کے انداز میں اپنی دونوں ٹانگیں اس کے سینے پر دیں۔ وہ اچھل کر کئی قدم پیچھے لڑکھڑاتے ہی زمین پر گرا تو لامحالہ اس کے ہاتھ سے گن چھوٹ کر دور جا پڑی۔ وہ بازی ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر فوراً ہی تڑپ کر سنبھلنے کی کوشش کرنے لگا مگر میں اب اسے کہاں موقع دینے والا تھا۔ میں نے دائیں ٹانگ کو حرکت دی اور لانگ بوٹ کی ٹو اس کی ٹھوڑی پر پڑی۔ وہ ایک بار پھر خاک چاٹنے پر مجبور ہو گیا۔ میں نے لپک کر گن اٹھائی اور اس پر تان لی اور غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔

"بس!......... اب تمہارا کھیل ختم اور ہمارا شروع۔ دونوں ہاتھ بلند کر لو۔"

وہ مجھے قہر ناک نظروں سے گھورنے لگا۔ چوہدری ذیشان بہ مشکل اپنی زخمی ٹانگ پکڑے کراہتے ہوئے بولا۔ "نوجوان! اپنی گن مجھے دو اور تم میری گاڑی سے رسی اٹھا لاؤ۔"

میں ذرا تذبذب میں مبتلا ہو گیا۔ تاہم میں نے ایسا ہی کیا۔ مگر چوہدری ذیشان کو گن تھمانے سے پہلے میں نے مقابل کو درشت حکم دیا۔ "تم نے سنا نہیں؟......... اپنے دونوں ہاتھ سر سے بلند کر کے دوسری طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔"

اس کے پاس میرے حکم کی تعمیل کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اس نے بے بسی سے اپنے دانت پیستے ہوئے میرے حکم کی تعمیل کی تو میں نے چوہدری ذیشان کو رائفل تھماتے ہوئے کہا۔

"چوہدری صاحب! ذرا محتاط رہیں......... آپ زخمی ہیں۔ یہ ذرا حرکت کرے تو بے دریغ اسے گولی مار دیں۔"

"آئی نو بیٹا!......... آئی نو!" چوہدری ذیشان ہانپتی ہوئی آواز سے بولا اور مجھ سے رائفل لے کر اپنے دشمن کی طرف اس کا رخ کر دیا۔ میں تیزی سے دوڑتا ہوا انٹرکولر کے قریب پہنچا تو اچانک مجھے عقب سے گولیوں کی تڑتڑاہٹ سنائی دی......... میں تیزی سے پلٹا اور ششدر سا رہ گیا۔ میں نے مقابل کو تیزی کے ساتھ زگ زیگ انداز میں ایک طرف تاریکی میں دوڑتے دیکھا اور چوہدری ذیشان اس پر گولیاں داغے جا رہا تھا۔ اس کے دشمن نے اندھا جوا کھیلا تھا۔ کیونکہ اسے شاید بہ خوبی اس بات کا اندازہ تھا کہ چوہدری ذیشان زخمی ہونے کی صورت میں اس کا بروقت اور ٹھیک نشانہ نہیں لے سکتا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے مد مقابل نے یہ اندھا جوا بڑی کامیابی سے کھیلا اور چشم زدن میں تاریکی کا فائدہ اٹھا کر اندھیرے جنگل میں غائب ہو گیا۔

مجھے اندازہ ہوا کہ چوہدری ذیشان کے دشمن معمولی حیثیت کے نہیں تھے۔ وہ لڑائی بھڑائی میں خاصی مہارت اور مشاقی رکھتے تھے۔ بہر طور بھاگا ہوا دشمن ہمارے لئے اب کسی وقت بھی خطرناک بن سکتا تھا۔ تعاقب میں دوڑنا عقل مندی نہ تھی۔ میں تیزی سے دوڑتا ہوا چوہدری ذیشان کے پاس آیا۔ اس کے چہرے پر شدید جھنجلاہٹ طاری تھی۔ میں نے اس سے قدرے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"چوہدری صاحب ہمیں اب بلا تاخیر یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ آیئے!" یہ کہہ کر میں نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔ اس کی زخمی ٹانگ سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ کاٹ دار اور سرد ہواؤں کے باعث جریان خون کم کم ہی ہو رہا تھا۔ وہ میرے سہارے جیپ تک آیا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ کے برابر کا

دروازہ کھول کر اسے اندر بٹھانے کے بعد ایک محتاط نگاہ گرد و پیش تاریک جنگل پر ڈالنے کے بعد تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

"نوجوان! تمہاری بہادری سے زیادہ مجھے تمہارے اس سرفروشانہ اور انسانی جذبے نے بے حد متاثر کیا ہے۔" چوہدری ذیشان اپنے زخم کی پرواہ کئے بغیر چند ثانیوں تک مجھے تکتے رہنے کے بعد گہرے لہجے میں بولا۔

"چوہدری صاحب! آپ نے شاید میری اطلاع کو جھوٹ سمجھا تھا۔ ورنہ آپ اس حال کو نہیں پہنچتے۔" میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں......... ایسی بات نہیں تھی۔" وہ مرتعش سی آواز میں بولا۔ "میں نے فوراً اپنے ساتھیوں کو چوکنا کر دیا تھا۔ ہم نے جم کر دشمنوں کا مقابلہ کیا مگر بد قسمتی سے ایک تو دشمنوں کے مقابلے میں ہماری تعداد کم تھی اور پھر ہمارے پاس خاطر خواہ اسلحہ نہ تھا۔ میرا سالا بھی مارا گیا اور میرے ساتھی بھی۔ میں بڑی مشکلوں سے اپنی جان بچا کر بھاگا۔" سانس لینے کے لئے اس نے تھوڑے توقف کے بعد میری طرف احسان مندانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "نوجوان! سچ پوچھو تو مجھے بھی اپنی موت کا یقین ہو گیا تھا۔ مگر تم نے عین وقت پر میری جان بچا کر مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔"

"میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا چوہدری صاحب!" میں ہولے سے بولا۔ پھر گفتگو بدل کر دوبارہ کہا۔ "آپ کو موبائل کے ذریعے علاقائی انتظامیہ کی ہیلپ تو ضرور لینی چاہئے تھی۔"

"بد قسمتی سے رابطہ نہ ہو پایا تھا اور پھر دشمن سر پر پہنچ گئے تھے۔"

میں خاموش ہو گیا۔ اس پر نیم غشی سی طاری ہونے لگی تھی اور اس کا سر سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ایک طرف ٹک گیا۔ میں نے ایک ہاتھ اسٹیئرنگ پر رکھے رکھے دوسرے ہاتھ سے اس کی نبض چیک کی، وہ چل رہی تھی۔ اس پر یقیناً نقاہت کی وجہ سے بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔

میں پریشان ہو گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، اسے کہاں اور کون سے ہسپتال میں لے جاؤں۔ پہلا دیہات پھاگل ہی نظر آتا تھا۔ اگر نظر حیات اس کے ساتھ نتھی نہ ہوتا تو مجھے اتنی پریشانی نہ ہوتی۔ درحقیقت میں چوہدری ذیشان کے ساتھ اپنے دشمن کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ نظر حیات جیسے کمینے، مکار دشمن سے کچھ بھی بعید نہ تھا کہ وہ الٹا چوہدری ذیشان کے دشمنوں کو خفیہ طور پر میرے پیچھے لگا دیتا

اب میں بیک وقت کئی پیچیدگیوں کا شکار ہو سکتا تھا۔ یہ پولیس کیس تھا اور ضابطے کی روایتی کارروائی میں بلاوجہ میں بھی جکڑا جا سکتا تھا۔ ناچار میں نے سب سے پہلے پھاگل پہنچ کر متعلقہ تھانے کا رخ کیا۔ تھانے کے نیند سے اٹھائے ہوئے عملے نے میرا بیزاری سے استقبال کیا۔ مگر جب انہیں ایم این اے چوہدری ذیشان کا نام معلوم ہوا تو سب الرٹ ہو گئے۔ فوراً ایک سنتری کو تھانے دار صاحب کے کوارٹر روانہ کیا گیا۔ وہ سادہ وردی میں ہی چوہدری ذیشان کا نام سن کر بھاگا چلا آیا۔ موبائل تیار کی گئی اور فوراً چوہدری ذیشان کو قریبی ہسپتال لے جایا گیا جہاں اسے فوری طور پر ابتدائی طبی امداد دے کر ہوش میں لایا گیا۔ اس کی ٹانگ کے زخموں کے معائنے اور علاج کے بعد اسے تسلی دی کہ سر دست ایسی خطرے والی کوئی بات نہیں۔ پانچ گولیاں لگی تھیں۔ تین تو پنڈلی کا گوشت پھاڑتی ہوئی پار ہو چکی تھیں، ایک ران کے گوشت میں پیوست تھی۔ اسے نکال دیا گیا تھا۔ جبکہ پانچویں گولی نے پنڈلی کی ہڈی کو تھوڑا بہت نقصان پہنچایا تھا۔ اب انہیں کسی بڑے ہسپتال لے جانا ضروری تھا تاکہ کوئی کنسلٹنٹ آرتھوپیڈک سرجن ان کی ٹانگ کی ہڈی کی پراپر سرجری کر سکے۔

ہوش میں آنے کے بعد چوہدری ذیشان نے میری اندرونی پریشان کن کیفیات بھانپ لی تھیں۔ اس سلسلے میں اس نے مجھے پہلے ہی مسکراتے ہوئے اس بات کی تسلی دے دی تھی کہ وہ مجھے منظر عام پر لانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ وہ اثر و رسوخ والا شخص تھا۔ اس کے لئے یہ کام کیا مشکل تھا۔ چنانچہ دونوں کی آپس کی مختصر بریفنگ کے بعد میں نے پولیس کو یہی بیان دیا تھا کہ میں نے انہیں زخمی حالت میں جنگل میں پڑے پایا اور یہاں اٹھا لایا، وغیرہ۔ پھر چوہدری ذیشان اپنے دشمنوں کے خلاف بیان ایف آئی آر وغیرہ کٹوانے لگا تو مجھے اس نے وہاں سے ''کھسکا'' دیا۔ یوں چوہدری ذیشان نے بڑی خوبصورتی سے مجھے معاملے سے الگ کر دیا تھا۔ بقول اس کے کہ اب اس کے لئے یہی کافی تھا کہ وہ زندہ بچ گیا تھا۔ اب وہ اپنے دشمنوں کو (جنہیں وہ اچھی طرح جانتا بھی تھا) ہرگز نہیں چھوڑے گا۔ رخصت ہوتے وقت چوہدری ذیشان نے مجھے اپنا وزیٹنگ کارڈ دے دیا تھا جس میں اس کا سیل فون نمبر بھی موجود تھا۔ میں وہاں سے واپس روانہ ہوا اور ''سرائے سیاں'' جا پہنچا۔

''سرائے سیاں'' آبادی سے ذرا ہٹ کے تھی مگر تھی خوب صورت۔ یہ ایک چوبی عمارت پر مشتمل تھی۔ اس وقت وہاں ویرانی کا راج تھا۔ میرا شکار ادھر ہی کسی کمرے میں پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ اسے ا... تک چوہدری ذیشان کے سلسلے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ میرے لئے فی الوقت یہ اچھا موقع تھا۔

میں نے دانستہ اپنی جیپ ذرا دور درختوں کے جھنڈ میں روکی اور سرائے کی طرف بڑھ گیا۔ قریب پہنچ کر میں بھی اندر احاطے میں داخل ہوا۔ سامنے بڑا سا محرابی دروازہ تھا جو اس کا داخلی دروازہ تھا اور بند تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ چار بجنے والے تھے۔ سپیدۂ سحر نمودار ہونے میں ابھی دو ڈھائی گھنٹے باقی تھے۔ یہ سرائے تھی، اس لئے یہاں کسی مسافر کی کسی بھی وقت آمد کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی۔ میں نے دوسری بار ذرا زور سے دستک دے ڈالی۔ اندر کسی کے ہولے سے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے چند ثانیوں بعد ایک بوڑھے شخص نے دروازہ کھولا۔

''بابا! میں مسافر ہوں.......... کمرہ چاہئے۔'' میں نے کہا۔

''اندر آ جاؤ'' اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔

یہ ایک ہال نما کمرہ تھا۔ ایک کونے میں بڑا سا آتش دان سلگ رہا تھا۔ وہاں ایک خالی چارپائی تھی اس کے قریب ہی میز کرسی دھری تھی میز پر ایک بڑا سا رجسٹر اور قلم رکھا ہوا تھا۔ ہال میں سات، آٹھ قریب لائن میں چارپائیاں دھری تھیں۔ اوپر رضائیاں اوڑھے کچھ لوگ سوئے ہوئے تھے۔ کمرے کی فضا گرم تھی۔ سامنے کی دیوار پر سیاہ بڑے بڑے جلی حروف سے ''کمرہ، برآمدہ اور چارپائی'' پر سونے کے الگ الگ ریٹ درج تھے۔

وہ بوڑھا شخص مجھے لئے میز کے قریب آ گیا اور کرسی پر بیٹھ کر رجسٹر اور قلم سنبھالتے ہوئے مجھ سے بولا۔ ''ہاں بھائی! کیا چاہئے؟.......... کمرہ یا چارپائی؟''

''کمرہ۔'' میں نے کہا۔

''کمرے کے دو سو روپے ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے۔''

''نام بتاؤ۔''

''اختر حسین۔''

''شناختی کارڈ؟''

''شناختی کارڈ تو میرے پاس نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''کتنے دن رہنا ہے؟''

''بس، آج ہی کی رات۔''

''نکالو دو سو روپے۔''

میں نے دو سو روپے جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔ خانہ پری کے بعد وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر ہال کے دوسرے دروازے سے ایک پتلی نیم تاریک راہداری میں لے آیا۔ یہاں صرف دائیں جانب قطار اندر قطار صرف آٹھ نو کے قریب کمرے نظر آئے تھے۔ وہ مجھے لے کر سب سے آخری سرے میں واقع ایک کمرے کے سامنے پہنچا اور پھر اپنی جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر تالا کھولا اور پھر واپس جانے لگا تو میں نے اسے روک کر کہا۔

''بابا! میرا ایک دوست بھی یہاں آنے والا تھا۔ دراصل ہم برفانی لومڑیوں کے شکار کی غرض سے یہاں اکٹھے ہونا چاہتے تھے۔ اس کا نام نظر حیات ہے۔ وہ کون سے کمرے میں ہے؟''

میری بات پر وہ کچھ سوچتا رہا، پھر بولا۔ ''نام تو مجھے یاد آتا ہے مگر.......... کمرہ نمبر..........؟'' وہ کچھ سوچتا رہا پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا، بولا۔ ''ہاں.......... یہ سامنے والے سے دو کمرے چھوڑ کر۔ مگر اب تم صبح ہی مل لینا۔ اس وقت دروازہ زور سے تمہیں کھٹکھٹانا پڑے گا۔ دوسرے مسافروں کی نیند خراب ہو گی۔''

''ٹھیک ہے.......... میں خود بھی اس کی نیند نہیں خراب کرنا چاہتا۔ تسلی ہو گئی میری کہ وہ ادھر آ چکا ہے۔'' میں نے گویا اس کا مشورہ قبول کرتے ہوئے کہا اور اندر داخل ہو گیا۔ بوڑھا مجھ سے مطمئن ہونے کے بعد واپس لوٹ گیا۔ میں نے دروازہ بند کیا۔ کمرے کا سرسری جائزہ لیا۔

صرف ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ اس پر گرم بستر بھی موجود تھا جو صاف ستھرا تھا۔ ایک اٹیچڈ باتھ بھی تھا۔ ایک کھڑکی تھی جو باہر کھلتی تھی۔ میں نے سب سے پہلے اپنے میگارد کے چیمبر میں گولیاں بھر لیں، اس کے بعد کمرے سے باہر آ گیا۔ راہداری پر دور تک نگاہ ڈالی، کوئی نہ تھا۔

میں نے بوڑھے کے بتائے ہوئے نظر حیات والے کمرے کو ذہن نشین کر لیا تھا۔ یقیناً دوسرے کمرے میں اس کے چند خدمت گار ٹائپ کے ساتھی بھی موجود ہو سکتے تھے۔ تاہم میں دبے پاؤں نظر حیات والے کمرے کے دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ دروازہ ظاہر ہے، اندر سے بند ہی تھا۔ میں سوچنے لگا۔ اچانک مجھے اندر کمرے سے ہلکی سی گنگناتی آواز سنائی دی۔ یکلخت میرے اعصاب تن گئے۔ یہ موبائل کی بیل تھی۔ میں دم سادھے کھڑا رہا۔ تاہم میں نے اپنا ایک کان دروازے سے چپکا دیا۔ بیل تسلسل بج رہی تھی۔ اچانک جب بیل آنا بند ہو گئی تو میں فوراً سمجھ گیا کہ اندر موجود نظر حیات نے جاگ کر کال سننے کے لئے اپنا موبائل آن کر دیا تھا۔

''ہیلو.......... چوہدری صاحب! آپ.......... کیا ہوا؟.......... اوہ نو، کک.......... کب؟.......... کک.......... کیسے ہوا یہ سب؟.......... آپ ٹھیک تو ہیں نا؟.......... مم.......... میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔''

یہ نظر حیات کی بوکھلائی ہوئی آواز تھی اور لکنت زدہ آواز سے میں سمجھ گیا تھا کہ چوہدری ذیشان نے ہی اس سے رابطہ کیا ہو گا اور موجودہ صورت حال کی سنگینی سے باخبر کیا ہو گا۔

پھر اچانک مجھے اندر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی اور یکلخت میرے اعصاب تن گئے۔ وہ یقیناً پہلے اپنے دوسرے کمرے میں موجود ساتھیوں کو جگانے کے ارادے سے باہر

نکل رہا تھا۔ میں نے بہ سرعت اپنی جیکٹ کی جیب سے اپنا میگارڈ نکال لیا اور پھر جیسے ہی اندر سے بلا کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی دروازہ تھوڑا وا ہوا، میں نے دروازے کو زوردار دھکا دیا۔ نظر حیات دروازے سے ٹکرا کر چند قدم پیچھے لڑکھڑا گیا۔ میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنے عقب میں دروازہ بند کیا اور بوکھلائے ہوئے نظر حیات کی پیشانی سے اپنے میگارڈ کی بھیانک نال لگا دی۔ پھر اسے خونناک نظروں سے گھورتا ہوا ہولناک لہجے میں غرا کر بولا۔

"کتے! آج تیری زندگی کا آخری دن ہے۔"

مجھے اس دور دراز برفیلے علاقے کی ایک دور افتادہ سرائے میں بالکل غیر متوقع اپنے سامنے پا کر اس کی آنکھیں مارے دہشت کے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ہونٹ پھڑپھڑا رہے تھے مگر یقینی موت کے خوف تلے اس کے منہ سے الفاظ نہیں برآمد ہو پا رہے تھے۔

میں نے اسے بستر پر دھکا دیا اور اپنی ایک ٹانگ چارپائی پر ٹکا کر اس پر جھک گیا۔

"اب بولو نظر حیات!......... کیا کہتے ہو؟......... صرف ایک گولی......... مگر نہیں، مجھے گولی ضائع کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ میرے ہاتھوں میں اتنی طاقت ہے کہ میں اپنے باپ کے قاتل اور اپنی کو ساری عمر جرمِ بے گناہی بھوگنے والے دشمن کا با آسانی گلا دبوچ سکوں۔"

میرے لہجے سے میری دیرینہ آتشِ انتقام کی تپش کو محسوس کرتے ہی نظر حیات پر یقینی موت کے خوف سے لرزہ طاری ہو گیا۔ اس کی بری طرح گھگھی بندھ چکی تھی۔ وہ ابھی تک ہکا بکا سی کیفیات کا شکار مارے وحشت کے پھٹی پھٹی آنکھوں میں ابھی تک غیر یقینی کے تاثرات بھی مترشح ہو رہے تھے۔

"نظر حیات! میں چاہتا تو کسی بھی وقت تمہارے کھوکھلے محل کی کاغذی دیواروں کو پھلانگ کر تم تک پہنچ سکتا تھا۔ مگر میں نے ایسا اب تک جان بوجھ کر نہیں کیا تھا۔" میں نے دانت پیس کر اور اس پھیلی ہوئی آنکھوں میں زہر کی طرح سرایت کرتی نظروں سے گھور کر دوبارہ کہا۔ "اس لئے کہ تمہارے و دماغ سے یہ خوش فہمی نکل سکے کہ تم میرے انتقام سے دنیا کے کسی گوشے میں بھی محفوظ نہیں رہ سکتے چاہے وہ پاتال کی گہرائیاں ہی کیوں نہ ہوں۔"

یہ کہہ کر میں نے اپنے میگارڈ کی نال اس کی پیشانی سے ہٹا دی اور اسے بائیں ہاتھ میں پکڑ کر دائیں ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی تو وہ گھٹی گھٹی لرزتی آواز میں بولا۔

"مم......... مجھے معاف کر دو......... نن......... نادر!"

"معافی.........!" میں نے بھویں اچکا کر سفاک لہجے میں کہا۔ "معافی کس چڑیا کا نام ہے؟ اور بھی تمہارے سلسلے میں معافی؟......... نہیں، نہیں......... نظر حیات! نہیں......... اب تمہیں میرے ہاتھوں یقینی موت سے کوئی نہیں بچا سکتا۔" میں کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر لرزیدہ آواز میں میری منت سماجت کرتے ہوئے بولا۔ "نن......... نادر! یقین مم......... میں اعصابی مریض ہوں۔ یقین کرو......... جب سے میں نے شاہ میر کی حالت زار دیکھی ہے تب سے اب تک ایک لمحے کو بھی سکون کی نیند سے نہیں سو سکا ہوں۔ تم ماں بیٹے کی دہشت اس لمحے سے ہی میرے اعصاب پر سوار ہو چکی ہے۔ مم......... میں........."

"بند کرو اپنی بکواس......... کتے!" میں نے ابلتی آنکھوں کے ساتھ غرا کر کہا۔ "تو کیا سمجھتا ہے میں تجھے اتنی آسان موت مار دوں گا؟......... ہرگز نہیں۔" یہ کہہ کر میں نے ڈرامائی انداز میں اس کی گردن ایک جھٹکے سے چھوڑ دی۔ اس کے بعد اپنے میگارڈ کے چیمبر سے ساری گولیاں نکال دیں۔ پھر ان

گولیاں اپنی جیکٹ کی جیب میں ڈال کر صرف ایک گولی نظر حیات کی خوف سے پھیلی ہوئی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں مسکرا کر بولا۔

"چلو پھر......... تمہاری قسمت کو آزماتے ہیں نظر حیات! میں ایک گولی چیمبر میں ڈال کر چکری کو گھماؤں گا۔ پھر تمہاری پیشانی پر نال رکھ کر ٹرائیگر دباؤں گا......... ایسا میں تین مرتبہ کروں گا۔ اب یہ تمہاری قسمت ہو گی کہ تینوں مرتبہ پستول خالی ہی چلتا رہے یا پھر کسی ایک بار میں گولی چل جائے۔"

یہ کہہ کر میں نے وہ ایک گولی چیمبر کے اندر ڈالی اور گول چکری کو گھمایا۔ پھر موٹا سا تکیہ اٹھا کر اپنے میگارڈ کی نال کے آگے کیا، پھر اس کے سینے پر رکھ دیا تاکہ گولی چلنے کی صورت میں زیادہ آواز برآمد نہ ہونے پائے۔

یہ محاورتاً نہیں، حقیقتاً زندگی اور موت کا کھیل تھا۔ مگر صرف دشمن کے لئے۔

"نن......... نہیں......... ایسا مت کرو۔" نظر حیات نے چلانے کی کوشش میں اپنے حلق سے یہ کہتے ہوئے آواز بلند کرنا چاہی تو میں نے دوبارہ اس کی گردن دبوچ لی۔

"خبردار!......... اب چیخنے کی کوشش مت کرنا......... ورنہ تین بار نہیں، اس وقت تک ٹرائیگر دباتا چلا جاؤں گا جب تک فائر نہیں ہو جاتا۔" میں نے اسے غرا کر خونناک دھمکی دی۔

اس نے ہولے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے اس کی گردن چھوڑ دی۔ وہ پھنسی پھنسی سی آواز میں التجا کرتے ہوئے بولا۔

"دد......... دیکھو......... تت......... تم تین بار کی بجائے......... صرف ایک بار ٹرائیگر دبا کر مجھے چھوڑ دو........." مگر پھر دوسرے ہی لمحے "اندھی موت" کے تصور سے لرز کر دوبارہ کپکپاتی آواز میں بولا۔ "نن......... نہیں۔ ایک بار بھی ٹرائیگر مت دبانا......... ورنہ......... ورنہ گولی چل جائے گی۔"

موت کے خوف نے اسے بری طرح اعصاب زدہ بنا ڈالا تھا۔

"چچ......... چچ......... اتنا خوف؟" میں جیسے اس کی کیفیاتِ قریب المرگ سے حظ اٹھاتے ہوئے سفاکانہ مسکراہٹ سے بولا۔ "تم تو میرے سامنے بہت اکڑتے تھے۔ اب تمہاری حالت کسی چوہے سے بھی بدتر ہو رہی ہے۔"

دشمن کو موت سے پہلے موت کے جاں گسل خوف تلے مبتلا کر کے مجھے زیادہ تسکین محسوس ہو رہی تھی۔

"بس، اب کھیل شروع ہوا چاہتا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اس کے سینے پر پستول کی نال کو تکیے سے لگا کر ٹرائیگر دبا دیا......... کمرے کے ہولناک ماحول میں "ٹرچ" کی خالی آواز اُبھری۔

میں نے دیکھا، خون کو برف بنا دینے والی کاٹ دار سردی کے باوجود نظر حیات کی پیشانی پر ننھی ننھی بوندیں نمودار ہو گئیں اور اس کی سانس یوں تیز تیز چلنے لگی جیسے وہ کئی میلوں تک دوڑتا ہوا آ رہا ہو۔ وہ لرزیدہ آواز میں دوبارہ مجھ سے بولا۔

"خ......... خدا کے لئے......... اب......... اب دوبارہ ٹرائیگر مت دبانا......... ہو......... ہو سکتا ہے کہ اب کی بار گولی......... سامنے آ گئی ہو۔"

"ہاں! یہ تو عین ممکن ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلا کر اطمینان سے کہا۔ "مگر ابھی تو صرف ایک باری آئی ہے۔ دو مرتبہ ٹرائیگر دبانا باقی رہتا ہے۔"

"نن......... نن......... نہیں۔" وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔ مگر میں نے ٹرائیگر دبا دیا۔ اس بار بھی خالی "ٹرچ" کی آواز اُبھری۔ یقینی موت کے خوف سے کپکپاتے ہوئے نظر حیات کی پھیلی آنکھوں میں

زندگی کا دیا پھر روشن ہوا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ زور زور سے ہانپنے لگا۔ پیشانی تو کیا اس بار اس کا وجود ہی پسینے سے شرابور ہونے لگا تھا۔

"اوہ......میرے دشمن کی قسمت تو اچھی ہے......خیر، اب تیسری اور آخری بار ٹرائیگر دبانا ہے۔" میں نے سنگدلانہ لہجے میں سرسراتی مسکراہٹ سے اس کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

اس کی موت کے خوف سے بری طرح گھگھی بندھی ہوئی تھی۔ مجھے اور میری ماں کو دھونس دھمکی دینے والا دھاڑتا، چنگھاڑتا نظر حیات اس وقت بھیگی بلی بنا ہوا تھا۔ میں نے اس کے تحمل پڑتے حواس، غیر ہوتی حالت سے مزید محظوظ ہونے کی غرض سے آخری "سیشن" کو ذرا طول دیا۔

"کیوں نظر حیات!......آج معلوم ہو رہا ہے نا، موت کا خوف کیا ہوتا ہے؟ اور زندگی کیا اہمیت رکھتی ہے۔ مگر تُو نے اور شاہ میر نے تو بڑی گھناؤنی سازش کے ساتھ میرے باپ کو زہر دے کر مار ڈالا اور میری ماں کو تم نے کھلونا بنانے کی کوشش کی تھی اور......اور پھر تُو نے میری ماں پر دوہرا ظلم یہ ڈالا کہ اس بے چاری کو بھری جوانی میں بیوہ کرنے کے بعد اسے اسی کے شوہر کے قتل کے جھوٹے الزام میں عمر قید بھگتانے کے لئے جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھی دھکیل دیا۔" میرا لہجہ آتش انتقام سے پُرغیظ ہوتا جا رہا تھا۔

"کاش......اس بار گولی چل جائے اور تیرا ناپاک دھڑکتا ہوا وجود موت کی اتھاہ تاریکیوں میں گم ہو جائے......کاش!......میں دبا رہا ہوں ٹرائیگر......آخری بار!"

"نن......نن......" مارے خوف کے اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔ "مم......مم......میرا سب کچھ لے لو نادر!......مم......میں ساری عمر تم ماں بیٹے کے پاؤں چاٹتا رہوں گا۔ مم دیکھو......دیکھو، اب کی بار ٹرائیگر مت دبانا......کیا خبر......کیا خبر......" وہ بری طرح لرزنے لگا۔

"میں دبا رہا ہوں ٹرائیگر......!" میں نے سلگتی آنکھوں سے اسے گھور کر کہا۔ وہ تڑپنے لگا۔ مگر میں بھی اپنے پورے وجود کی طاقت کے ساتھ اسے دبوچے ہوئے تھا۔ اور پھر تیسری بار بھی میں نے اس کے "نا......نا......نا......" کے دوران ٹرائیگر دبا دیا۔ کمرے کے دم بہ خود ماحول میں تیسری بار "ٹرچ" کی آواز اُبھری اور نظر حیات کی آنکھوں کی پتلیاں چڑھنے لگیں۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا اور اس کے موت کے خوف سے زرد پڑتے ہوئے چہرے پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہونے لگی اور پاگلوں کی طرح خوش ہو کر بولا۔

"مم......مم......میں بچ گیا......بچ گیا......میں......نن......نادر! گگ......گولی اس بار بھی نہیں چلی۔"

"ہاں......تُو بچ گیا کتے! مگر میں دوبارہ تیرے پاس آؤں گا۔ اور اگلی بار تیرے ساتھ اس سے بھی زیادہ گھناؤنا موت کا کھیل کھیلوں گا۔" میں نے لہو رنگ لہجے میں اس سے کہا۔ اس کے بعد پستول اس کے سینے سے ہٹا کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ یقیناً موت کے خوف سے اس کا بستر غلیظ ہو چکا تھا۔ تب میں نے اس کے جسم کو تشنجی جھٹکے لگتے ہوئے دیکھا۔ اس کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔

میرا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ میں کمرے سے نکلا اور ہال سے گزر کر سرائے کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگا تو میں نے اس بوڑھے کو آتش دان کے قریب رکھی چارپائی پر خراٹے لیتے دیکھا۔ خاموشی کے ساتھ سرائے سے باہر آ گیا۔

سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا تھا۔ اپنی جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر میں نے اپنا میگارد نکال لیا۔ پھر اس کے چیمبر کو دیکھا، وہ بالکل خالی تھا۔ میرے ہونٹوں پر خود بخود زہریلی مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔ کیونکہ میں نے چیمبر میں ایک گولی بھی نہیں ڈالی تھی۔ محض نظر حیات کو ایک گولی کی جھلک دکھائی تھی اور جس وقت میں چیمبر بند کرنے لگا تھا تو اس دوران میں نے اس کی خوف زدہ نظروں سے بچا کر وہ گولی اپنی جیب میں ڈال لی تھی۔ اس پر خوف طاری تھا جس کی وجہ سے وہ میری یہ "چور" حرکت نہیں دیکھ پایا تھا۔

میں نے چیمبر میں ساری گولیاں بھریں اور پھر بھرے ہوئے میگارد کو اپنی جیب میں دوبارہ رکھتے ہوئے جیپ آگے بڑھا دی......اب میرا رخ "کھیاں" کی طرف تھا۔

اپنی سرائے میں آ کر میں نے چند گھنٹے نیند لی۔ اس کے بعد دوپہر کا کھانا کھا کر واپس رخت سفر باندھا۔ مجموعی طور پر میری یہ مہم کامیاب رہی تھی۔ میں نظر حیات کو ذہنی و دماغی طور پر ایک زبردست شاک سے دوچار کر چکا تھا۔ میں نے اپنے اس انوکھے انتقام کی ابتداء کر ڈالی تھی اور نظر حیات جیسے گھناؤنے دشمن کو میں موت سے پہلے موت کے خوف میں جکڑ چکا تھا۔ یہی میری دیرینہ آرزو تھی کہ میں اسے قطرہ قطرہ موت کا زہر پلاتا رہوں۔

چوہدری ذیشان والا چکر میرے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس کے دشمن کون تھے اور اسے کیوں ہلاک کرنا چاہتے تھے؟ اس نے بھی مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ یا پھر حالات ایسے تھے کہ میں خود بھی اس معاملے سے جلد از جلد دور ہو جانا چاہ رہا تھا۔

میں نے ایک مقام پر گاڑی ری فیول کروائی اور آگے بڑھ گیا۔

سری پائے اور بٹ راس کے گھنے جنگلات سے گزرنے کے بعد جب میں شاہراہ ریشم پر پہنچا تو شام جھکنے لگی تھی۔ وہاں سے ایبٹ آباد پہنچتے پہنچتے مجھے رات نے آن لیا۔

اب یہاں سے مری یا نتھیا گلی تقریباً پچاس ساٹھ کلومیٹر کی مسافت پر تھا۔ میرا نان اسٹاپ سفر جاری تھا کہ اچانک مجھے اپنی جیب میں رکھے موبائل پر وائبریٹنگ کال محسوس ہوئی۔ میں نے فوراً موبائل نکال کر ڈسپلے میں دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ ماں نے مجھ سے رابطہ کیا ہو گا۔ لیکن یہ کال غزالہ کی تھی۔ میں نے احتیاط کے پیش نظر موبائل کو کال ٹون سے وائبریٹنگ الرٹ پر رکھا ہوا تھا۔ بہرطور غزالہ کی اس اچانک کال پر میں چونکے بنا نہ رہ سکا تھا۔

"ہیلو......غزالہ! میں نادر بول رہا ہوں۔ خیریت تو ہے؟"

"نن......نادر! تت......تم اس وقت کہاں ہو؟" دوسری جانب سے اس کی ہراساں آواز اُبھری تو میں نے قدرے چونک کر کہا۔

"کیوں، خیریت ہے؟......میں اس وقت ایبٹ آباد سے واپس اپنی رہائش گاہ جا رہا ہوں۔"

"کک......کیا تم بٹ راس اور کھیاں سے آ رہے ہو؟" اس نے یکدم پوچھا تو مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا۔ میں نے فوراً جیپ کی رفتار ذرا دھیمی کر دی اور جب اسے اثبات میں جواب دیا تو وہ بے اختیار متوحش لہجے میں بولی۔

"اوہ مائی گاڈ!......تت......تو یہ تم ہی تھے؟"

"غزالہ! آخر بات کیا ہے؟ کیا ہوا ہے؟" میں نے اُلجھن آمیز پریشانی سے کہا تو وہ بتانے لگی۔

"کیا تمہارا بھاگل اور کھیاں میں کچھ لوگوں کے ساتھ ٹکراؤ ہوا تھا اور تم نے کچھ مسلح لوگوں کے خونی پنجے سے قومی اسمبلی کے ممبر چوہدری ذیشان کی جان بچائی تھی؟"

''ہاں........''

''نادر! تم سے نادانستگی میں ایک بہت بھیانک غلطی ہوگئی ہے۔'' میرے مختصر اثباتی جواب پر غزالہ نے ہولناک لہجے میں کہا تو میں بھی جھلا کر بولا۔

''آخر بات کیا ہے؟ تم پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو؟ کھل کر کیوں نہیں بتاتیں، معاملہ کیا ہے؟''

''نادر! وہ اشفاق شاہین کے آدمی تھے جو چوہدری ذیشان کو قتل کرنا چاہتے تھے۔'' غزالہ نے بم سا ایک دھماکا کیا اور مجھے حیرت اور پریشانی کا ایک زبردست جھٹکا لگا۔

''مم........ مگر تمہیں یہ سب کیسے پتہ چلا؟'' میں نے اپنے حواس پر ذرا قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے طارق نے بتایا ہے۔''

''طارق........؟'' میں سوالیہ انداز میں بڑبڑایا۔

''کیا تم بھول گئے غفورے کے قریبی ساتھی شکیل کو؟ وہی جو مجھ سے سچی محبت کا دم بھرتا ہے اور اچھا دوست بھی ہے۔'' اس نے مجھے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا کہ غزالہ نے مجھے ایک ایسے نوجوان کے بار میں بتایا تھا جو اشفاق شاہین کے گینگ میں شامل تھا اور غفورے کا دم چھلا بھی تھا۔ وہ غزالہ سے محبت دعوئ دار تھا اور اسی کی طرح وہ ان لوگوں سے بددل ہو چکا تھا۔

''ہاں........ یاد آیا........ بتاؤ، اسے کیسے یہ سب پتہ چلا؟'' میں نے بالآخر کچھ کچھ یاد کر ہوئے کہا تو غزالہ بولی۔

''جب تمہارا ''پھاگل'' میں اشفاق شاہین کے آدمیوں سے ٹکراؤ ہوا تھا تو ایک اعجاز عرف جاجو شخص نے تمہیں فوراً پہچان لیا تھا۔ مگر وہ تمہارے ہاتھوں شدید زخمی ہوگیا تھا۔ پھر نہ جانے کس طر نے گرتے پڑتے کسی قریبی آبادی پہنچ کر اشفاق شاہین کو تمہارے بارے میں مطلع بھی کر دیا کہ ان بنایا کھیل کس نے بگاڑا تھا؟''

''مگر........ اس نے مجھے کیسے اور کب پہچانا؟'' میں نے اُلجھ کر پوچھا تو وہ جواباً بولی۔

''جس وقت تمہاری میرے سلسلے میں پہلی میٹنگ اشفاق شاہین اور غفورے کے درمیان اس گ والی کوٹھی لاہور میں ہوئی تھی، جاجو نے تمہیں وہاں دیکھا تھا اور پھر جب تم سے اشفاق شاہین نے ملاقات کی تھی اور تم نے بڑی چالاکی سے اسے ہموار کر کے اپنا دوست بنا لیا تھا اور صرف یہی نہیں بلکہ کے ساتھ کام کرنے کی ہامی بھر لی تھی تو اشفاق شاہین نے یہ بات غفورے کو بھی بتائی تھی۔ غفورا تمہارے ماضی سے اچھی طرح واقف ہے اور تمہیں بھی اچھی طرح جانتا ہے۔ وہ ایک انتہائی شاط ہوشیار شخص ہے۔ اس کے حلق سے یہ بات نہ اُتر سکی۔ اسے تم پر شبہ ہوگیا تھا کہ تم اس کے اور ا شاہین کے خلاف کسی خفیہ ٹاسک میں مصروف ہو۔ ان لوگوں کی جنگ چوہدری ذیشان سے بھی چل تھی۔ وہ ان کے کالے کرتوتوں سے اچھی طرح واقف ہے اور ان کے خلاف بڑی موثر کارروائی ہے۔ اب یہ اسے راستے سے ہٹانا چاہتے تھے۔ جب انہیں پتہ چلا کہ چوہدری ذیشان، برفانی لو کے شکار پر روانہ ہو رہا ہے تو ان لوگوں نے اسے قتل کرنے کا منصوبہ بنا لیا اور........ اور نو........

اچانک دوسری طرف سے غزالہ بولتے ہوئے رک گئی۔ شاید اس کے ساتھ اچانک کچھ ہوا تھا۔ میں ٹھٹک سا گیا۔

''ہیلو غزالہ!........ کیا ہوا؟........ تم چپ کیوں........'' ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ ا مجھے دوسری طرف سے غزالہ کی اضطرابی چیخ نما آواز سنائی دی۔

''نن........ نہیں........ نہیں........ خدا کے لئے نہیں........''

میں دھک سے رہ گیا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے گولی چلنے کے دھماکے کی آواز سنائی دی۔ میں نے فوراً بریک لگا دیئے۔ جیپ کے ٹائر زور سے چرچرائے اور وہ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ موبائل میرے کان سے لگا ہوا تھا اور میری سانسیں جیسے سینے میں اٹک کر رہ گئی تھیں۔ دل تیزی سے جیسے سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑک رہا تھا۔

میرے اندر زبردست پکڑ دھکڑ ہونے لگی۔ صاف لگتا تھا کہ غزالہ کو کسی نے بروقت ٹارگٹ بنا لیا تھا اسے گولی مار دی تھی۔ پتہ نہیں اب وہ زندہ بھی تھی یا نہیں۔ یقیناً یہ کام اشفاق شاہین کا تھا۔ دوسری طرف سے موبائل کے گرنے کی آواز بھی آئی تھی۔ پھر کسی نے موبائل اٹھا لیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ غزالہ کا کام تمام کرنے والے قاتل کے ہی ہاتھ میں اس کا موبائل تھا اور اب وہ اسے آف کر دے گا۔ مگر دوسرے ہی لمحے مجھے دوسری طرف سے ایک غراتی ہوئی شناسا سی آواز سنائی دی۔

''نادر!........ تم نے ہم سے ٹکر لے کر اچھا نہیں کیا۔''

اس کے ساتھ ہی دوسری جانب سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ میرے دماغ میں سائیں سائیں ہونے لگی کیونکہ یہ آواز غفورے کی تھی۔



غفورے کی آواز اور اس کی دھمکی نے میرے پورے وجود کو عجیب کیفیت سے دوچار کر دیا۔ غیر متوقع طور پر اس کی آواز سن کر جہاں مجھے حیرت ہوئی تھی، وہیں اس کی دھمکی نے گویا میرے غیض وغضب کی بجلیاں دوڑا دی تھیں۔

موبائل پر گولی چلنے اور غزالہ کی اُبھرنے والی آخری چیخ، پھر غفورے کی دھمکی سننے کے بعد مجھے افسوس ناک حقیقت کا اندازہ لگا لینا چاہئے تھا کہ غزالہ غفورے کی بربریت کا نشانہ بن چکی تھی اور شیطان صفت اشفاق شاہین کے خلاف میرے عزائم پوشیدہ نہیں رہ سکتے تھے۔

غزالہ نے مجھے موبائل پر بتا دیا تھا کہ میری اصلیت اب اشفاق شاہین کے سامنے آشکارا ہو چکی ''پھاگل'' کے برف زار ویرانوں میں موت کے ہرکاروں کے ہاتھوں میں نے چوہدری ذیشان کی بچائی تھی، نہ صرف یہ بلکہ میں نے ان ساتوں کو ناکوں چنے بھی چبوائے تھے۔ وہ درحقیقت اشفاق کے ہی ''کارپرداز'' تھے۔ دونوں کی پرانی دشمنی کا سبب وہی تھا جو میرے اور اشفاق شاہین کے مابین یعنی اس کے شیطانی گروہ کا قلع قمع کرنا۔

میرا ذہن اب تیزی کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا اب مجھے اشفاق شاہین سے جنگ لڑنی پڑے گی یا کسی مکاری کی گنجائش ابھی باقی تھی......... تب پھر اچانک جیسے میرے دماغ میں ایک جھماکا ہوا۔

اشفاق شاہین کو دوبارہ بے وقوف بنایا جا سکتا تھا۔ میں نے جب باریک بینی سے پیش آمدہ حالات کا جائزہ لیا تو بے اختیار میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔

یہ حقیقت تھی کہ موجودہ حالات میں بیک وقت دو دشمنوں سے نبرد آزما ہونا فی الوقت میرے لئے آسان نہ تھا۔ نظر حیات وغیرہ سے میری کھلی جنگ تھی تو اشفاق شاہین جیسے گینگسٹر کو میں اس کی گود میں بیٹھ کر مارنا چاہتا تھا اور وقت کا تقاضا تھا کہ میں بھیڑیوں کی صف میں گھس کر دوسری بار مکاری سے کام لوں۔

میں نے غیر ارادی طور پر رسٹ واچ میں وقت دیکھا اور جیپ اسٹارٹ کی اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی......... اب میرا رخ گرین لاج کی بجائے لاہور کی طرف تھا۔

***

وہاں سے لاہور کم وبیش دو ڈھائی سو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔

میں تین ساڑھے تین گھنٹوں کی نان اسٹاپ ڈرائیونگ کے بعد لاہور پہنچا اور سیدھا اشفاق شاہین کی گلبرگ والی کوٹھی کا رخ کیا۔

آئندہ کے غیر یقینی اور خطرناک انداز میں بدلنے والے حالات کو اپنے حق میں کرنے کے لئے ضروری تھا کہ اس سے پہلے اشفاق شاہین کے خونی ہرکارے مجھ تک پہنچتے، مجھے اپنی بات کی سچائی ثابت کرنے کے لئے ازخود اشفاق شاہین سے مل لینا چاہئے تھا۔

کوٹھی کے قریب پہنچ کر میں نے جیپ روک دی اور نیچے اتر آیا۔ گیٹ پر چوکیدار موجود تھا۔ یہ وہ چوکیدار تھا جسے کچھ روز قبل میں اور غزالہ رات کی تاریکی میں تختہ مشق بنا چکے تھے۔

''اشفاق شاہین صاحب سے ملاقات کرنی ہے۔'' میں نے اس سے کہا۔

''وہ تو اس وقت یہاں نہیں ہیں۔'' چوکیدار نے بہ غور میرا جائزہ لینے کے دوران کہا۔

''کہاں جا سکتے ہیں وہ؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ ہمیں بتا کر نہیں جاتے۔''

''کیا میں اندر بیٹھ کر ان کا انتظار کر سکتا ہوں؟......... کب تک آ جائیں گے؟'' میں نے کسی خیال کے تحت کہا۔ چوکیدار ذرا تذبذب میں مبتلا ہوگیا۔ لوہا گرم دیکھ کر میں نے ہولے سے مسکرا کر کہا۔ ''میں ان کا دوست ہوں، پنڈی سے آیا ہوں۔ ملے بغیر تو میں نہیں جا سکتا۔''

''تو پھر آپ کے پاس ان کا موبائل نمبر تو ہوگا۔ آپ ان سے.........''

میں نے دانستہ اس کی بات کاٹی۔ ''مگر یہ کام میں اندر بیٹھ کر ہی کروں گا۔ تاکہ انہیں بتا سکوں کہ میں اس وقت انہی کی رہائش گاہ میں ان کا منتظر ہوں۔'' میں نے کہا۔ پھر دوسرے ہی لمحے کچھ سوچ کر بولا۔ ''ٹھہرو، میرا خیال ہے یہ کام مجھے ابھی کر لینا چاہئے۔'' یہ کہہ کر میں نے اپنے ذہن میں اُبھرنے والے خیال کے تحت اپنی جیب سے موبائل نکالا اور اشفاق شاہین سے رابطہ کیا۔ دوسری جانب ٹون جا رہی تھی۔ میرا دل یکبارگی کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔

''ہیلو.........کون؟'' معاً دوسری جانب سے اشفاق شاہین کی کھردری آواز اُبھری۔ میں نے اپنی بےترتیب دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''جناب! میں......... نادر علی خان، اس وقت پھاگل سے سیدھا یہاں پہنچا ہوں اور آپ کی گلبرگ والی کوٹھی کے گیٹ پر کھڑا ہوں۔ آپ سے بہت ضروری بات کرنا تھی۔''

دوسری جانب ایکا ایکی پُرسوچ خاموشی چھا گئی۔ میں نے شاید اسے تذبذب میں مبتلا کر دیا تھا۔ پھر چند ثانیوں کی پُرسوچ خاموشی کے بعد اشفاق شاہین نے سرد لہجے میں کہا۔

''تم اندر بیٹھو......... میں پہنچ رہا ہوں۔''

اس کے جواب پر میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ اس نے مجھ سے خلافِ توقع کوئی چبھتی ہوئی بات نہیں کی تھی۔ وجہ یہی تھی کہ میں خود اس کے ہاں آن پہنچا تھا جو میری مکارانہ منصوبہ بندی کا پہلا مرحلہ تھا۔

''وہ تو ٹھیک ہے شاہین صاحب!......... لیکن آپ کا چوکیدار.........'' میں نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو اس نے مجھے موبائل چوکیدار کو دینے کا کہا۔ میں نے جھٹ سے اپنا موبائل چوکیدار کو پکڑا دیا۔

''جی سر!......... بہت بہتر۔'' چوکیدار نے موبائل اپنے کان سے لگانے کے بعد یکدم مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ اس کے بعد مجھے موبائل پکڑاتے ہوئے بولا۔ ''آئیے جناب! تشریف لائیں۔'' اب وہ مؤدب ہوگیا تھا۔ میں بغلی دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ وہ مجھے اندر ایک کمرے میں لے آیا۔ یہاں تین افراد موجود تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ یوں اچھل پڑے جیسے انہیں بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

پھر دوسرے ہی لمحے تینوں نے بڑی پھرتی کے ساتھ پستول نکال کر مجھ پر تان لئے۔ چوکیدار ہکا بکا کھڑا ہو گیا۔ مگر میں بے پرواہانہ انداز میں چلتا ہوا صوفے پر براجمان ہوگیا۔ وہ تینوں ایک دوسرے کا

منہ تکنے لگے۔

"بیٹھ جاؤ آرام سے۔ میں نے اشفاق صاحب سے ابھی تھوڑی دیر پہلے بات کی ہے، وہ آنے والے ہیں۔" میں نے ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"تم ہمارے دشمن ہو .... کھڑے ہو جاؤ۔ ہمیں تمہاری اصلیت کا پتہ چل گیا ہے۔" ایک نے بالآخر درشت لہجے میں مجھ سے کہا۔ میں نے سرسراتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پُراعتماد لہجے مگر ناگواری سے کہا۔

"اعجاز عرف جاجو اور غفورے کو میرے سلسلے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے باس سے بات کر لی ہے۔ یقین نہیں آتا تو اس سے پوچھ لو۔" میں نے آخر میں قریب کھڑے حیران پریشان چوکیدار کی طرف اشارہ کیا تو اس نے ان تینوں سے کہا۔

"صاحب نے مجھ سے بھی بات کی تھی۔ انہوں نے مجھے اسے یہاں بٹھانے کی اجازت دی ہے۔"

وہ تینوں چند ثانیے متذبذب نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر ایک نے چوکیدار سے کہا۔ "تم جاؤ۔"

چوکیدار الٹے قدموں واپس لوٹ گیا۔

تینوں نے اپنے پستول جیب میں رکھ لئے اور میرے مقابل صوفے پر چوکنا انداز میں بیٹھ گئے۔ ان کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد اشفاق شاہین اپنے چند کارندوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس کا چہرہ شعلہ بار ہو رہا تھا۔ میں یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ چند ثانیے کھڑا میری طرف شعلہ بار نظروں سے گھورتا رہا، اس کے بعد سامنے والے صوفے پر براجمان ہوگیا۔ میں نے اپنے اعصاب پر قابو پا رکھا تھا۔

"بیٹھو........" اس نے گمبھیر لہجے میں مجھ سے کہا۔ میں خاموشی سے اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

"کیا معاملہ تھا؟........ مختصراً بتاؤ۔ مگر صرف سچ۔ ورنہ اسی وقت تمہیں گولی مار کر تمہاری لاش گم کر دی جائے گی۔" اس نے سرد اور سفاک لہجے میں میری طرف گھورتے ہوئے کہا۔

میں نے اپنے چہرے پر تھوڑے پریشان کن تاثرات لانا ضروری سمجھا اور بولا۔ "سر! میں اپنے د... نظر حیات کے تعاقب میں پھاگل کے برف زاروں میں گیا تھا۔ غفورے نے یقیناً آپ سے ذکر کیا ہو... کہ میری اس کے ساتھ پرانی دشمنی چل رہی ہے۔ میری معلومات کے مطابق اس کے ہمراہ ایم این اے چوہدری ذیشان بھی تھا۔ دونوں برفانی لومڑیوں کے شکار پر گئے تھے۔ مجھے تو چوہدری ذیشان سے ... سروکار نہ تھا مگر جب میں اپنے شکار پر حملہ کرنے وہاں پہنچا تو وہاں اچانک ہی گمنام مسلح افراد بھی آ پڑے جس کے باعث میں بھی چوہدری ذیشان اور اس کے آدمیوں کی نظروں میں آ گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ میرا شکار وہاں موجود نہ تھا لیکن چونکہ میں چوہدری ذیشان وغیرہ کی نظروں میں آ چکا تھا، اس لئے مجبوراً مجھے خود کو ایک عام شکاری کی حیثیت سے متعارف کرانا پڑا اور اس کی مدد کے لئے اس کے دشمنوں کے خلاف مجبوراً مجھے بھی میدان میں اترنا پڑا۔ لیکن سر! .... میں یہ نہیں جانتا کہ وہ آپ کے آدمی ہیں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو اور بات تھی مگر........"

"تمہیں بعد میں کیسے پتہ چلا کہ وہ میرے ہی آدمی تھے؟" اچانک اشفاق شاہین نے اپنی ... ہوئی نظریں بدستور میرے چہرے پر مرکوز رکھتے ہوئے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔

"غزالہ نے مجھے سب سے پہلے فون کر کے مطلع کیا تھا کہ میں جن لوگوں سے نادانستگی میں ...

ہوں، وہ درحقیقت آپ ہی کے آدمی تھے۔" میں نے جواباً کہنا شروع کیا۔ "پھر اسی دوران مجھے غزالہ کے موبائل پر گولی چلنے اور اس کی چیخ کی آواز سنائی دی۔ موبائل اس کے ہاتھ سے یقیناً چھوٹ کر گر گیا تھا۔ مگر پھر چند ثانیوں بعد ہی غفورے کی آواز اُبھری اور اس نے مجھے دھمکی دے کر موبائل آف کر دیا۔ میں یہ سن کر سخت پریشان ہوا۔ غفورا تو نہ جانے اپنی کون سی دشمنی مجھ سے نکال رہا ہے۔ مجھے اپنی صفائی بھی پیش کرنے کا موقع نہ دیا۔ تب میں نے یہی بہتر سمجھا کہ مجھے خود ہی آپ سے ملاقات کر لینی چاہئے اور یوں میں ادھر حاضر ہوگیا۔"

میں اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا اور بھانپتی ہوئی نظروں سے اشفاق شاہین کے چہرے پر اپنی "ادھورے سچ" کی اثر پذیری محسوس کرنے لگا۔

میری وضاحت سن کر اشفاق شاہین کے چہرے پر پُرسوچ تاثرات پھیل گئے تھے۔ پھر اس نے ہولے سے کھنکار کر میری طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"گویا غزالہ کے ساتھ تمہارا خفیہ رابطہ رہا ہے؟ .... اس کی وجہ بتاؤ گے؟ حالانکہ تم جانتے ہو کہ وہ ہماری دشمن بن چکی ہے۔"

میں نے دانستہ کھسیانی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "سر جی! کیا کہوں .... شوقین مزاج ہوں۔ بس یوں سمجھ لیں کہ شکر خورے کو مفت میں شکر مل گئی تھی۔"

"مگر وہ تو اس مزاج کی نہیں ہے۔" اشفاق شاہین نے بغور مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"میں اب کیا کہہ سکتا ہوں سر!" میں نے گول مول سا جواب دیا تو اس نے اگلا سوال کیا۔

"غزالہ کو یہ ساری باتیں کس نے بتائی تھیں کہ تمہارا نادانستگی میں ہی سہی، میرے آدمیوں سے ٹکراؤ ہو چکا ہے؟"

مجھے اس سے اس سوال کی توقع تھی لہٰذا بلا تامل بولا۔ "اس نے اپنے 'سورسز' کے بارے میں مجھے نہیں بتایا تھا۔ یا پھر شاید ممکن ہے، اسے غفورے نے موقع ہی نہ دیا تھا اور اسے شوٹ کر ڈالا۔ حالانکہ غفورے کو غزالہ سے اس سلسلے میں باز پرس کرنی چاہئے تھی۔" میں نے آخر میں اسے اس کے مقرب خاص کے خلاف بھی اُکسایا۔

"ہوں .... وہ یہاں پہنچنے ہی والا ہے۔ بات واضح ہو جائے گی۔" اشفاق شاہین نے ایک سرسراتی ہوئی ہنکاری لیتے ہوئے کہا تو میں نے دانستہ ذرا شکوہ کرنے کے انداز میں اس سے کہا۔

"کیا میری وضاحت کافی نہیں ہے؟ .... اگر غفورے کو میرے سلسلے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے تو میرا خیال ہے، میری یہ تمہید کافی ہونی چاہئے اور میں نے غفورے سے ملاقات کرنے کی بجائے اس امید پر ہی پہلے آپ سے ملاقات کر ڈالی کہ آپ اس سے زیادہ بہتر طور پر میری بات سمجھ پائیں گے۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں، جب سے غفورے کا بھائی غزالہ کے ہاتھوں قتل ہوا ہے، وہ اس کا ذمہ دار مجھے ہی سمجھتا ہے۔ اور اب مجھے ٹارگٹ بنانے پر ہر وقت تُلا بیٹھا رہتا ہے۔"

"ہاں .... ٹھیک ہے۔ آ لینے دو اسے۔" اشفاق نے کہا۔ میں نے دیکھا وہ خاصا اُلجھ گیا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"کیا غزالہ اب اس دنیا میں نہیں رہی ....؟"

"پتہ نہیں۔" اشفاق شاہین نے گول مول سا جواب دیا۔ مگر مجھے محسوس ہوا کہ غالباً ابھی اس کے علم میں پوری بات نہ ہو اور غفورے کی غزالہ کے فلیٹ پر شب خون مارنے کے بعد ابھی یہاں واپسی نہ ہوئی

ہو۔ مگر میری سمجھ میں ایک بات نہیں آ رہی تھی کہ آخر مردود غفورے نے غزالہ کے فلیٹ پر کس وجہ سے شب خون مارا تھا؟ .... پھر لا محالہ ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی تھی۔ غزالہ کے اس گروہ سے باغی ہونے کے بعد ممکن ہے، یہ لوگ اسے ہلاک کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں اور اب یہ غزالہ کی ایک اتفاقی بدقسمتی تھی کہ غفورا عین وقت پر.........!

اچانک دروازہ کھلا اور غفورا اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ دندناتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کی حالت مارے طیش کے غضب ناک ہو رہی تھی۔ پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے دانت پیستے ہوئے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ میں نے بھی اشفاق شاہین کی موجودگی کی پرواہ کئے بغیر اپنے فوری دفاع کے تحت پھرتی کے ساتھ جگہ چھوڑی تو وہ کسی غیظ آلود ریچھ کی طرح میرے صوفے سے ٹکرا گیا۔ چنانچہ میں نے اس کے دماغ سے ہوا نکالنے کی غرض سے اس کی پشت پر ایک زوردار لات جما دی تو وہ صوفے سمیت دوسری طرف الٹ گیا۔ اس کے دونوں ساتھی دانت کچکچاتے ہوئے میری طرف بڑھے تو اشفاق شاہین کی گونج دار تحکمانہ آواز اُبھری۔

''اسٹاپ.........!''

میری طرف بڑھتے ہوئے غفورے کے دونوں ساتھی چابی ختم ہونے والے کھلونے کی طرح یکدم رک گئے۔ جبکہ غفورے کا مارے طیش کے ابھی تک برا حال ہو رہا تھا۔ وہ سیدھا کھڑا ہو چکا تھا اور شعلہ بار نظروں سے میری طرف گھورے جا رہا تھا۔ وہ کسی جنگلی ریچھ کی طرح بپھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔ مگر اپنے باس کی ''تحکمانہ'' مداخلت پر اسے پھر دوبارہ مجھ پر جارحانہ پیش قدمی کی ہمت نہ ہو سکی۔

''بیٹھ جاؤ دونوں آرام سے۔'' اشفاق شاہین نے پاٹ دار آواز میں ہم دونوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ میں اپنی جگہ پر براجمان ہو گیا۔ غفورا ابھی تک مجھے خوف ناک نظروں سے گھورتا اور پھنکارتا ہوا قریبی صوفے پر جا دھنسا مگر بیٹھتے ہی اس نے اشفاق شاہین سے کہا۔

''باس! میری سمجھ میں نہیں آتا، آپ اسے اتنی اہمیت کیوں دے رہے ہیں؟ میں نے پہلے بھی آپ سے کہا تھا کہ یہ سنپولیا ہے اور حرام زادی غزالہ کے ساتھ مل کر ہمارے خلاف.........''

''غزالہ کا کیا بنا؟'' معاً اشفاق شاہین نے اس کی بات کاٹ دی۔

غفورے نے اپنی بات نظر انداز ہوتے دیکھ کر منہ بسورا۔ پھر بڑی بے رحمی سے بولا۔ ''اس کتیا کو میں نے گولی مار دی۔ لاش گہرے کھڈ میں پھینک دی۔ مگر یہ.........حرام.........''

''خاموش!'' اشفاق شاہین کے لہجے میں ڈپٹ تھی۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''نادر علی! تم جا سکتے ہو۔''

اس کی بات پر میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ اور پھر دھیرے سے اشفاق شاہین کو ''شکریہ'' کہتے ہوئے میں کمرے سے نکل گیا۔

گیٹ سے باہر آ کر میں اپنی جیپ میں بیٹھا تو میرا دل اپنی اس چال پر بے حد مسرور ہو رہا تھا۔ میں ایک بار پھر اشفاق شاہین جیسے بڑے گینگسٹر کو ڈاج دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اگرچہ غفورا بدستور میری طرف سے بدکا ہوا تھا۔ ایسا غزالہ کے حوالے سے ہوا تھا۔ اس پر مستزاد عین آخری لمحات میں اس نے غزالہ کو مجھ سے موبائل پر باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اسے اس بے رحم نے گولی مار کر ہلاک کر ڈالا تھا۔ گویا کبیر کی بہن کے بعد اس کے ہاتھوں یہ دوسرا بے گناہ خون تھا۔ اور اب مجھ پر یہ لازم ہو گیا تھا کہ غفورے کو میں ہلاک کر ڈالوں۔ یوں بھی وہ بدبخت میرا جانی دشمن بن گیا تھا اور اب تو اسے یقین ہو

گیا تھا کہ میں نے اور غزالہ نے ہی گٹھ جوڑ کر کے اس کے بھائی شوکی کو ہلاک کیا تھا۔ اس کا ناپاک وجود اب میری اور اشفاق شاہین کی ''دوستی'' میں دراڑ ڈال سکتا تھا۔

اس دوران ماں نے مجھ سے موبائل پر رابطہ کر کے ''صورت حال'' کے بارے میں آگاہی چاہی تھی۔ میں نے انہیں سردست یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ میں ''گرین لاج'' پہنچ کر انہیں ساری تفصیل سے آگاہ کر دوں گا۔

اب میں اس تذبذب میں مبتلا تھا کہ آیا مجھے اشفاق شاہین کے خطرناک گروہ کی بیخ کنی کے سلسلے میں چوہدری ذیشان سے روابط بڑھانے چاہئیں۔ اسی طرح میں اپنے طور پر اشفاق شاہین کے خلاف اپنی خفیہ کارروائی جاری رکھوں۔ اس کے علاوہ چوہدری ذیشان اور اشفاق شاہین کے گرگوں کے درمیان بھاگل کے برف زاروں میں ہونے والی معرکہ آرائی کے بعد یہ بھی ناممکن نہیں تھا کہ چوہدری اپنی بھرپور طاقت سے اشفاق شاہین پر جوابی وار کرتا اور اس کا کام تمام ہو جاتا۔ چوہدری ذیشان اشفاق کا کھلا دشمن تھا۔ جبکہ میں اس کی بنیادوں میں بیٹھ کر اسے کھوکھلا کرنا چاہتا تھا۔

میری پنڈی واپسی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ لاہور کی شہری حدود سے نکل کر میں جب موٹر وے پر آیا تو اچانک میرے موبائل کی بیل گنگنائی۔ میں نے موبائل نکالا۔ حسب عادت ڈسپلے پر کال کرنے والے کا نام دیکھا۔ مگر ڈسپلے پر نام اس کا آتا ہے جس کا نمبر پہلے سے محفوظ کیا جا چکا ہو۔ اجنبی کال کا صرف نمبر اُبھرتا ہے۔ بہرطور میں نے موبائل اپنے کان سے لگا دیا اور ہیلو کہا۔

''مسٹر نادر علی!.........تمہاری جان کو شدید خطرہ ہے۔'' موبائل کے اسپیکر کے ذریعے ایک مضطربانہ مردانہ آواز میرے کانوں میں آئی۔ ''تم کسی خوش فہمی کا شکار ہرگز نہ ہونا۔ غفورا اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ تمہارے تعاقب میں نکل چکا ہے۔''

''تم کون ہو.........؟'' میں نے سرسراتی آواز میں اس کی بات ختم ہونے کے بعد کہا۔ میری رگوں میں خون کی بجائے گویا پھنکارتے ہوئے سانپ رینگنے لگے تھے۔

''فضول سوال ہے۔'' دوسری جانب سے جواب آیا۔

''مگر اشفاق شاہین پر تو میں نے اپنی بے گناہی ثابت کر دی تھی۔'' میں نے بات آگے بڑھائی۔

''ہاں.........اور تم سے زیادہ بعد میں غفورے نے اشفاق شاہین کے سامنے تمہیں گناہ گار ثابت کر دیا۔'' استہزائیہ انداز میں جواب ملا۔ ''اشفاق شاہین اب تمہارے سلسلے میں ذرا بھی شبہ برداشت نہیں کر سکتا۔ تم خوش نصیب تھے کہ اشفاق شاہین کے تذبذب کا فائدہ اٹھا کر وہاں سے نکل آئے۔ اب اپنی فکر کرو۔ غفورا موت کے فرشتے کی صورت تمہارے تعاقب میں نکل پڑا ہے۔''

''تم طارق شکیل تو نہیں ہو؟'' بالآخر میں نے اپنے تئیں گمنام ہمدرد کے بارے میں ایک محتاط اندازہ لگاتے ہوئے کہا تو دوسری جانب سے اچانک گہری خاموشی چھا گئی۔ جو ظاہر کرتی تھی کہ میرا اندازہ غلط نہ تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے اچانک رابطہ منقطع ہو گیا۔ میں نے دوبارہ اس نمبر پر کال بیک کرنے کا ارادہ کیا مگر پھر کچھ سوچ کر میں نے سردست طارق شکیل کے نام پر یہ نمبر محفوظ کرتے ہوئے موبائل جیب میں رکھ لیا۔

مجھے پورا یقین تھا کہ یہ وہی طارق شکیل ہی ہو سکتا تھا جو بدنصیب غزالہ کا ہمدرد اور شاید سچا عاشق ہونے کا دعوے دار تھا۔ تاہم میں اب ایکا ایکی خطرناک حد تک بدلنے والی صورتِ حال کے بارے میں غور کرنے لگا۔ بالآخر اس مردود غفورے نے میری چال ناکام بنا کر ہی چھوڑی تھی۔ میرے جانے کے

بعد یقیناً غفورے نے کسی طرح اشفاق شاہین کو میرے خلاف اس بات پر قائل کر لیا تھا کہ میرا وجود ان کے لئے خطرے سے خالی نہ تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ اشفاق شاہین اس کی بات اس وجہ سے بھی ماننے پر مجبور ہو گا کہ وہ اس کا لاڈلا ساتھی تھا اور میری ذات سے بھی اشفاق شاہین کو کوئی فائدہ محسوس نہیں ہوا ہو گا۔ یوں اس نے غفورے کو بالآخر میرا پتا صاف کرنے کا حکم جاری کر دیا تھا۔

کوئی بھی مجرم کتنا ہی عیار، چالاک اور کتنا ہی بڑا گینگسٹر نہ ہو، کہیں نہ کہیں مار ضرور کھاتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہی ہوتی ہے کہ اسے اپنی طاقت کا کچھ زیادہ ہی زعم ہوتا ہے۔ جبکہ ایسے بڑے گینگسٹر کے مقربِ خاص گرگے دشمنوں پر بڑی تیز نگاہ رکھتے ہیں۔ بہرحال کچھ بھی سہی، غفورا اشفاق شاہین کی شہ پر مجھے ہلاک کرنے کی غرض سے نکل پڑا تھا اور اب کسی بھی وقت اس کا مجھ سے "ٹاکرا" ہو سکتا تھا جو اس بار فیصلہ کن بھی ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اب ہم دونوں کے ہی دل و دماغ میں ایک دوسرے کو پچھاڑ ڈالنے کی خواہش جڑ پکڑ چکی تھی۔

ایک خیال میرے ذہن میں یہ آیا کہ میں سر دست اس سے بھڑنے کی کوشش نہ کروں اور اپنی جیپ کی رفتار بڑھا دوں۔ یا پھر جیپ روک کر اس کا منتظر رہوں۔

مگر میں نے دانش مندی اسی میں سمجھی کہ مجھے سر دست غفورے پر لعنت بھیج کر گرین لاج کی طرف نکل جانا چاہئے۔ کیونکہ اس وقت یوں بھی "پھاگل" والی مہم کے بعد میں خود کو اعصابی طور پر تھکا تھکا سا محسوس کر رہا تھا۔ نئے معرکے کے لئے ضروری تھا کہ میں ذرا آرام کر لیتا۔ چنانچہ یہ فیصلہ کرتے ہی میں نے جیپ کی رفتار بڑھا دی۔

خیریت گزری اور میں بہ خیر و عافیت گرین لاج پہنچ گیا۔ ماں نہایت بے چینی کے ساتھ میری منتظر تھیں۔ میں نے ماں کو ساری بات تفصیل سے سنا ڈالی۔ نیز چوہدری ذیشان کے "نامعلوم" دشمنوں کے درمیان میں کود پڑنے اور بعد ازاں ان سے معرکہ آرائی کے بارے میں بتا دیا۔ مگر اشفاق شاہین سے متعلق بات گول مول کر ڈالی۔

لیکن ماں کو صرف نظر حیات کی موت سے دلچسپی تھی۔ انہیں یہ سن کر حیرت تو ہوئی تھی کہ میں نے موقع ہاتھ آ جانے کے باوجود نظر حیات کو زندہ چھوڑ دیا تھا۔ مگر جب انہوں نے میرے "انوکھے انتقام" کی غایت سمجھی تو ان کے چہرے پر آسودگی پھیل گئی۔

یہ درست تھا کہ کاشانہ نے مجھے اس انتقامی روش پر چلنے سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی اور اس نے اشاروں کنایوں میں مشورہ دیا تھا کہ میں نظر حیات کو اس قدر خوف زدہ کر ڈالوں کہ وہ ہمیشہ کے لئے یہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ میں تو نظر حیات کو اس قدر خوف زدہ کر دینا چاہتا تھا کہ ملک چھوڑنے پر کیا بلکہ خود اپنی موت آپ مرنے پر مجبور ہو جاتا اور یہی میں چاہتا تھا۔

"نگینہ سے رابطہ ہوا تھا؟" ماں نے اچانک پوچھا۔

"نہیں ماں!"

"کب کرو گے؟"

"اس نے مجھے ہسپتال کا نمبر دے رکھا ہے، جہاں شاہ میر داخل ہے...... نگینہ کا زیادہ وقت وہاں گزرتا ہے۔"

ماں خاموش ہو گئیں۔

میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ جیب سے موبائل نکالا اور طارق شکیل سے رابطہ کیا۔

"خدا کے لئے مجھ سے رابطہ مت کرو۔ ورنہ میرا بھی غزالہ والا حشر ہو گا۔" دوسری جانب سے طارق کی آواز اُبھری۔ اس نے بلاتمہید بولنا شروع کر دیا۔ لہجے میں انجانے خوف کا ارتعاش تھا۔ میں نے اسے جوش دلاتے ہوئے کہا۔

"تم کیسے عاشق ہو طارق......؟" میں نے دانستہ اسے اس کے نام سے مخاطب کیا۔ "کیا تم نہیں چاہتے کہ غزالہ کے قاتل......"

"غزالہ کا قاتل غفورا ہے اور میں اسے کسی قیمت پر زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" اس کے لہجے میں یکایک انتقام کی تپش در آئی۔ تاہم غزالہ کے ذکر پر اس کے جوش میں کرب کی رمق بھی تھی۔

"تو پھر تم کو مجھ سے تعاون کرنا چاہئے۔"

"تم سے تعاون کا مطلب میری موت ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔ "جبکہ میں اس ذلیل کتے غفورے کو دھوکے سے ہلاک کرنا چاہتا ہوں۔ اب میں رابطہ اس امید کے ساتھ منقطع کر رہا ہوں کہ تم دوبارہ......"

"سنو، سنو......" میں نے جلدی سے کہا۔ "میں تو غفورے سمیت اشفاق شاہین کے پورے گروہ کا خاتمہ کرنا چاہتا ہوں اور اس سلسلے میں مجھے تمہارے......"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔ "تم اس درندے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر ہونٹ بھینچ لئے۔

چند ثانیے بعد میں نے موبائل پر نگینہ سے رابطہ کرنا چاہا مگر حسب توقع رابطہ نہ ہو سکا تو میں اپنے کمرے سے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ ماں شاید اپنے کمرے میں تھیں۔ میں ٹیلی فون کی طرف بڑھا اور نگین کے بتائے ہوئے ورجینیا کے ہسپتال کا نمبر ملایا۔ ایک مترنم سی نسوانی آواز اُبھری۔

"میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟" شستہ انگریزی میں پوچھا گیا۔

میں نے جواباً انگریزی میں کہا۔ "براہ کرم نیورو سرجری کے وارڈ اے فور نائن سے کنیکٹ کر دیں۔"

"یقیناً!" انگریز لڑکی نے مستعد لہجے میں جواب دیا۔

پھر دوسرے ہی لمحے میوزیکل بیل سنائی دینے لگی۔ میرا دل بے طرح سے دھڑکنے لگا۔

"ہیلو......!" دوسری جانب سے ایک کمزور سی نسوانی آواز اُبھری۔ آواز میں عجیب سا تھکا تھکا پن غالب تھا۔ مجھے لمحے بھر کو چپ سی لگ گئی۔ آواز میں نہیں پہچان پا رہا تھا۔ مگر مجھے اس آواز میں دور کہیں شناسائی کی مہک آتی محسوس ہوئی تھی اور پھر شناسائی کی اس مہک نے میرے دل کی کہیں عمیق گہرائیوں کو گلشن گلشن کر ڈالا اور بے اختیار میرے لبوں سے نکلا۔

"نگینہ......!"

دوسری جانب لمحہ بھر کے لئے عجیب سا سکوت طاری ہوا اور پھر وہی لرزتی ہوئی مانوس اجنبی آواز اُبھری۔

"ہاں...... نن...... نادر!" اب کی بار جیسے میرے دل کا یکتارا بج اُٹھا مگر میں نے فکر آمیز حیرت سے کہا تو خود میری اپنی آواز بھی مرتعش سی ہو گئی۔

"نن...... نگینہ!...... یہ...... یہ تمہاری آواز کو کیا ہو گیا ہے؟"

"تم کیسے ہو نادر؟" نگینہ نے میری بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔ مگر...... نن...... نگینہ! تم شاید ٹھیک نہیں ہو...... تم بہت تھکی تھکی، کمزور سی محسوس ہو رہی ہو۔ تمہاری طبیعت......"

"میں نے کہا نا، میں ٹھیک ہوں۔ مجھے چوبیس گھنٹے یہیں رہنا پڑتا ہے، پپا کے ساتھ۔ ڈاکٹروں نے

سختی سے ہدایت کر رکھی ہے کہ انہیں اکیلا نہ چھوڑا جائے۔ کسی نہ کسی عزیز کی موجودگی ضروری ہے۔ سناؤ، آنٹی کیسی ہیں؟''

مجھے اصولاً اس کے باپ کی بھی خیریت کے بارے میں استفسار کر لینا چاہئے تھا۔ جھوٹے منہ سہی۔ مگر میں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ لیکن نگینہ نے میری ماں کی خیریت پوچھ کر مجھے شرمندہ سا کر دیا تھا۔

''وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ مگر کیا تمہیں ریسٹ کرنے کا وقت نہیں ملتا؟'' میں نے فکرمند لہجے میں پوچھا۔

''ریسٹ ہی تو کرتی ہوں یہاں سارا دن۔'' اس نے اسی تھکے تھکے انداز میں جواب دیا۔

''مگر نگینہ!........ مجھے تو تم خود بھی بیمار سی محسوس ہو رہی ہو۔ پلیز نگینہ! میری خاطر ہی سہی، اپنا خیال رکھا کرو۔'' میری آواز خود بہ خود بھاری ہونے لگی تھی۔ ''تمہارے پپا کی طبیعت کیسی ہے؟........ اب کیا کہتے ہیں ڈاکٹرز؟''

''نیورو سرجنز نے دو بار ان کا آپریشن کیا تھا۔'' وہ لرزتی ہوئی آواز میں بتانے لگی۔ ''وہ اب کومہ کی حالت سے نکل آئے ہیں........ مگر ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ وہ........ وہ........''

انتہائی دکھ سے اس کی آواز بھرانے لگی تھی۔ فرطِ غم نے اسے جملہ مکمل نہ کرنے دیا اور وہ سسک پڑی۔ اس کی حالت کا تصور کر کے میرا دل کٹنے لگا۔ مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ اس کی کیفیت کیا تھی اور میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ یہ سارا کیا دھرا میرا اپنا ہے۔ میں نے ہی اس کے باپ کو اس حالت تک پہنچایا تھا۔ میں شاید اس کا مجرم تھا۔ مگر آفرین تھی اس پر کہ اس نے مجھ سے ایسا کوئی شکوہ نہیں کیا تھا۔

میں نے غم سے بوجھل دل کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''نن........ نگینہ! پلیز، خود کو سنبھالو۔ تت........ تم پھر کب لوٹ رہی ہو؟''

اس نے چند ثانیے خود کو سنبھلنے کے بعد دوبارہ بتانا شروع کیا۔ ''پپا کی حالت سنبھل تو گئی ہے اور وہ ہوش میں بھی آ چکے ہیں۔ مم........ مگر وہ اب ساری عمر نہ کسی سے بات کر پائیں گے اور نہ ہی چلنے پھرنے کے قابل ہوں گے۔''

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ عجیب سی چپ لگ گئی تھی مجھے۔

''تمہیں پپا کی زندگی بچ جانے کی خوشی تو نہیں ہوگی نادر!........ لیکن میں سمجھتی ہوں، تمہارے اور تمہاری ماں کے جذبہ انتقام کو تسکین تو ہوئی ہوگی۔'' مجھے اچانک خاموش پا کر نگینہ نے ہولے سے کہا۔ مجھے اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ سی محسوس ہوئی تھی۔ میرا اندر چھلنی ہونے لگا۔ تاہم میں نے پوچھا۔

''کب تک لوٹ رہی ہو؟''

''ایک ہفتے بعد پپا کو ڈسچارج کر دیا جائے گا۔ اس کے دو تین روز بعد میں لوٹ آؤں گی۔'' اس نے دھیرے سے بتایا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تو وہ اچانک بولی۔

''نادر! ایک بات پوچھوں؟........ برا تو نہیں مناؤ گے؟''

''پوچھو۔''

''کیا تمہاری ماں اب ایک ایسے انسان کو معاف نہیں کر سکتیں جو پہلے ہی زندہ لاش بن چکا ہو؟''

نگینہ کی بات پر میں سن ہو کر رہ گیا۔ مگر پھر جانے کیا ہوا کہ میں نے دوسرے ہی لمحے مستحکم لہجے میں کہا۔ ''ہاں، ضرور........ میں ماں کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ تم ان کی اب بالکل فکر نہ کرو۔ ہاں مگر ماں کو اب تمہارے پپا کی دشمنی بھلانا ہوگی۔ میں........ میں اس کا تم سے وعدہ کرتا ہوں۔''

ایکا ایکی جانے کہاں سے میرے اندر اتنی ہمت آ گئی اور میں نے ماں سے بات کئے یا وعدہ لئے بغیر

نگینہ سے وعدہ کر لیا تھا۔

دوسری جانب سے نگینہ کی پژمردہ آواز ایک دم خوشی کے بے پایاں احساس سے معمور ہو گئی۔

''نن........ نادر!........ تت........ تم نے مم........ میرے پپا........ کو معاف کر دیا؟''

''نگینہ! میں نے تو اس روز ہی انہیں معاف کر دیا تھا جس روز تم نے مجھ سے پہلی بار کہا تھا۔ لیکن ماں کے سلسلے میں، پہلے کبھی میں نے تمہیں امید نہیں دلائی تھی۔ مگر اس بار میں تم سے اب یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں ماں کو بھی سمجھا دوں گا۔''

نگینہ کو خوش ہوتا محسوس کر کے میرے دل کو بھی قرار ملا تھا۔

''نگینہ! تم بس خیریت کے ساتھ واپس لوٹ آؤ۔'' میں نے اپنی بات پر اصرار کیا۔

''میرے دل سے تم نے ایک بہت بڑا بوجھ ہٹا دیا نادر!'' نگینہ نے ایک تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

''نگینہ! بس تم جلدی سے لوٹ آؤ۔ تمہارے بنا میں خود کو بالکل تنہا اور بے کار سا محسوس کرنے لگا ہوں۔'' بے چین و مضطرب دل کی آواز میرے لبوں پر آ گئی تو نگینہ کے لہجے میں تھوڑی مسرت آمیز شوخی آ گئی۔

''تم اپنی ماں کو سمجھانے کا مجھ سے پہلے ہی وعدہ کر لیتے تو یہ جدائی تمہیں برداشت نہ کرنا پڑتی۔''

''پہلے حالات اور تھے۔'' میں نے دھیرے سے کہا۔

''تم کیا سمجھتے ہو نادر! میں بھی یہاں تم سے ہزاروں میل دور جدائی کو خوشی سے برداشت کر رہی ہوں؟''

''مجھے اندازہ ہے۔''

''نادر! اب تمہارے وعدے کے بعد میں اپنے دل میں بوجھ لے کر نہیں بلکہ خوشی کے ایک بے پایاں احساس کے ساتھ آؤں گی اور ضرور آؤں گی۔''

''یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ مجھے تم پر اور تمہارے الفاظ دونوں پر یقین ہے۔ بس تم جلد از جلد واپس آنے کی تیاری کرو۔'' میں نے کہا اور چند رسمی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔

ریسیور رکھ کر میں پلٹا تو چونک پڑا۔ نگینہ سے باتیں کرنے کے دوران مجھے ماں کی عقب میں موجودگی کا بالکل ہی احساس نہ رہا تھا۔ ماں خاموش مگر میری جانب مرکوز اپنی نگاہوں میں ہزاروں طوفان لئے کھڑی تھیں۔

''نگینہ سے تم کس قسم کا وعدہ کر رہے تھے مجھے سمجھانے کا؟'' ماں نے سرسراتے لہجے میں مجھ سے پوچھا تو میں بڑے رسان کے ساتھ چند قدم چلتا ہوا ماں کے قریب آیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے ماں کو تھام کر نہایت تحمل اور رسان سے بولا۔

''ماں!........ نگینہ کو معاف کر دے۔''

''میری نگینہ سے کب دشمنی ہے؟'' ماں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''نگینہ کے باپ سے تو ہے۔''

''ہاں........ اور وہ کبھی ختم نہیں ہوگی۔'' ماں کا لہجہ اٹل تھا۔

''لیکن ماں! شاہ میر اب زندہ لاش کی مثل بن چکا ہے۔'' میں نے کہا تو ماں نے چونک کر پوچھا۔

''کیا مطلب؟........ کیا وہ مردود ابھی زندہ ہے؟''

''ہاں ماں! لیکن نگینہ نے مجھے بتایا ہے کہ وہ اب عمر بھر کے لئے معذور ہو چکا ہے۔ وہ صرف ہاتھ

پاؤں ہلانے سے ہی نہیں، زبان ہلانے تک سے ہمیشہ کے لئے معذور ہو چکا ہے۔'' میں نے بتایا
غور ماں کے چہرے کے تاثرات بھانپنے کی کوشش کرنے لگا۔

ماں چند ثانیوں کے لئے چپ سی کھڑی رہیں۔

''ماں! اپنے بیٹے کی خاطر سہی، شاہ میر کو اب معاف کر دو.......... میں سمجھتا ہوں، اسے اب تک موت سے بھی بدتر سزا مل چکی ہے۔'' میں نے آخر میں ماں سے امید بھرے لہجے میں کہا۔

میری بات سن کر ماں نے ایک عجیب سی نگاہ میرے چہرے پر ڈالی۔ اس کے بعد آہستگی سے میرے دونوں ہاتھ اپنے شانوں سے ہٹائے اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی قریبی صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں ان کی جانب پلٹا، ماں کو صوفے پر بیٹھے کسی گہری سوچ میں مستغرق پا کر دوبارہ خوش امیدی سے ان کی جانب بڑھا۔ پھر قالین پر ان کے قدموں سے جا لگا اور بے اختیار اپنا سر ان کے زانوں پر رکھ دیا۔ تب نہ جانے مجھے کیا ہوا کہ میں آبدیدہ ہو گیا۔ میں شاید اس لمحے پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا۔ مگر نہ جانے کہاں سے مجھ میں وہ طاقت آ گئی کہ میں نے ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ چند لمحے یونہی گزر گئے۔ پھر میں نے دھیرے دھیرے بولنا شروع کیا۔

''ماں! اب نگینہ کے سلسلے میں اپنی دشمنی کا یہ خونیں باب ہمیشہ کے لئے بند کر دے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی میری آواز رندھی ہوئی تھی۔ ''شاہ میر کو اب اپنے کیئے کی سزا مل چکی ہے۔ وہ زندہ لاش بن چکا ہے۔'' اتنا کہہ کر میں نے سر اٹھا کر ماں کے چہرے کی طرف دیکھا، مجھے ان کے چہرے پر بدستور گمبھیرتا نظر آئی۔

''ماں! تُو خود بتا.......... کک.......... کیا اب ایک زندہ لاش سے انتقام لینا بہادری ہو گی؟ ماں دیکھ، میری بات مان لے.......... اپنے بیٹے.......... اپنے نادر کا مان رکھ لے۔ مم.......... میں نے نگینہ سے اس کا وعدہ بھی کر لیا ہے۔''

ماں نے ایک خاموش مگر گہری نگاہ میرے چہرے پر ڈالی پھر آہستگی کے ساتھ صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے بعد مجھ سے کچھ کہے بغیر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی خاموشی کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ میں یک ٹک ماں کو جاتے دیکھنے لگا۔ میں چند ثانیے گم صم سا رہا، مگر میرے دل کو پھر بھی قرار نہ ملا اور میرے قدم از خود ماں کے کمرے کی طرف اُٹھتے چلے گئے۔

ماں کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں آہستگی سے آگے بڑھا اور دروازے پر پہنچ کر اچانک ٹھٹک کر رک گیا۔ میری نگاہ ماں کی پشت پر جمی ہوئی تھی۔ ان کا رخ دوسری طرف تھا اور چہرہ ان کے سامنے دیوار پر آویزاں میرے باپ قادر خان کی تصویر پر اٹھا ہوا تھا۔ تب میری سماعتوں نے ان کی انتہائی کرب و رقت میں ڈوبی ہوئی مرتعش آواز سنی۔ ماں، میرے باپ کی تصویر سے مخاطب تھیں۔

''قادر خان!.......... میرا بیٹا میرے لئے سخت آزمائش بنا ہوا ہے۔ لیکن وہ تیرا بھی خون ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے بیٹے نادر نے تیرے دونوں خونی قاتلوں کی نیندیں حرام کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے اور آج شاہ میر موت سے بدتر زندہ لاش کی صورت میں اور نظر حیات اعصابی مریض بن چکا ہے۔ مگر قادر خان!.......... آج ہمارا بیٹا نادر ہم سے کچھ مانگ رہا ہے.......... اسے دشمن کی بیٹی سے پیار ہو چکا ہے۔ مگر دیکھ، میں اس کی گواہ ہوں کہ ہمارے نادر نے پھر بھی اپنے دشمن شاہ میر کو معاف نہیں کیا۔ میں سمجھتی ہوں، اس نے شاہ میر کی حد تک انتقام لے لیا ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ نگینہ سے نفرت ہو جاتی۔ لیکن قادر خان! میں سمجھتی ہوں کہ نگینہ کو بھی ہمارے نادر علی سے سچی محبت ہے

بالکل ویسی ہی جیسی مجھے تم سے ہوئی تھی۔ ہاں قادر خان!.......... ہم دونوں کا معاملہ بھی تو یہی تھا کہ میں تمہارے دشمن کی بیٹی تھی، جس نے تمہاری بڑی بہن کی آبروریزی کر کے اسے بے گناہ قتل کر ڈالا تھا۔ اور پھر تم نے میرے باپ کو کبھی معاف نہیں کیا تھا۔ لیکن باوجود اس کے میں نے تم سے کبھی نفرت نہ کی تھی۔ کیونکہ میں جانتی تھی کہ تمہارا اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔ بالکل اسی طرح نگینہ کو بھی اپنے باپ شاہ میر کے گھناؤنے جرم کا احساس ہے۔ لیکن اس نے میری طرح کبھی اپنی محبت کو نفرت میں نہیں بدلا۔ قادر خان! آج تیرا بیٹا نادر علی اور نگینہ بھی اسی دوراہے پر کھڑے ہیں.......... اگر میں ان دونوں کی محبت کے بیچ دیوار بننے کی کوشش کرتی ہوں تو کیا یہ ان دونوں کے ساتھ ناانصافی نہ ہو گی؟.......... قادر خان! آج ہمارا بیٹا ہم سے اپنی محبت کی بھیک مانگ رہا ہے۔ تیرے انتقام کی آگ نے مجھے اگر آتش فشاں بنا رکھا ہے تو میرے سینۂ سوزاں میں ایک ممتا بھرا دل بھی دھڑکتا ہے۔ مجھے.......... مجھے نگینہ کے سلسلے میں اپنے بیٹے کی بات ماننا پڑے گی قادر خان!.......... روزِ حشر جب تیرا میرا سامنا ہوا تو تُو میرا گریبان نہ پکڑنا۔ میں تجھے نادر علی اور نگینہ کی محبت کا واسطہ نہیں دیتی، اپنی اور تیری محبت کا واسطہ دیتی ہوں کہ وہ ہمارے بیچ کی محبت سے مختلف تو نہ تھی۔ قادر خان! مجھے معاف کر دینا.......... مجھے معاف کر دینا۔''

ماں کی آواز بھرانے لگی۔ لہجہ کپکپانے لگا۔ اس کا وجود کرب و جذب کے مارے مرتعش ہونے لگا اور ادھر میں بت بنا کھڑا تھا۔ آج مجھ پر ایک نیا اور حیرت انگیز انکشاف ہوا تھا کہ میرے باپ اور میری ماں کی محبت بھی میری اور نگینہ کی محبت سے مختلف نہ تھی۔ ماں کی دوبارہ کپکپاتی آواز اُبھری۔

''قادر خان! اگر میں نے اپنے بیٹے کی بات نہ مانی تو یہ منافقت ہو گی۔ قادر خان! یہ میری اور تیری محبت کی منافقت ہو گی۔ اور ہماری محبت کی گواہی تو آج بھی وادی کی وہ سربلند پہاڑیاں، یہ سرسبز مرغزار، یہ بہتے گنگناتے جلترنگ سے جھرنے بھی دیتے ہیں جو ہماری پیار بھری خلوتوں میں شامل رہے ہیں۔ یہ رنگ، یہ خوشبوئیں، یہ خوش نما پھول ہماری بے لوث وفا کے آج بھی گیت گاتے ہیں۔ اگر.......... اگر میں نے اپنے بیٹے کی محبت پر شب خون مارا تو قادر خان! ان بہتے جھرنوں اور مہکتی خوشبوؤں کے گیت اداس پڑ جائیں گے.......... اور تمہاری اور میری محبت ''چور'' بن کر رہ جائے گی۔ ہاں قادر خان!.......... ہمیں اپنی محبت سے ایک اور محبت کا بیج بونا ہو گا۔ اپنے بیٹے نادر علی خان اور نگینہ کی محبت کا بیج.......... کہ مجھے اس میں تمہاری ہی شبیہ تو نظر آتی ہے۔''

اتنا کہہ کر انہوں نے اپنا سر میرے باپ کی دیوار پر آویزاں تصویر پر ٹکا دیا اور رو پڑیں۔

میرے پورے وجود میں ایک طرف انوکھے جذبات کی آبشاریں پھوٹ پڑیں تو دوسری طرف ماں کی رقت انگیز آہ و زاری سے گہری غم و اندوہ کی ناقابل برداشت لہری اٹھنے لگی اور میں نے بے اختیار آگے بڑھ کر دیوار سے لگی، روتی ماں کو تھام لیا۔

''ماں!'' میں مرتعش لہجے میں صرف اتنا ہی کہہ پایا تھا۔ ماں میرے ساتھ لگی سسکتی رہیں۔ میں بڑی محبت سے ان کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔

❋❋❋

ماں نے میری خاطر، یا پھر اپنی اور میرے باپ کی محبت کی خاطر بالآخر میری بات مان لی تھی۔ میں خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا اور میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اُڑ کر نگینہ کے پاس امریکہ جا پہنچوں اور اسے یہ انوکھی خوش خبری سنا دوں۔ میرا دل بالکل بچوں کی طرح خوش ہو کر مچل مچل رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ نگینہ سے دوبارہ فون پر رابطہ کر کے اسے یہ خوش خبری سنا ڈالوں، لیکن میں نے یہ سوچ کر اپنا ارادہ

بدل لیا کہ اب نگینہ کو یہ خوش خبری اس کی امریکہ سے واپسی پر تحفے کی صورت میں دوں گا۔

اب میری طرف توجہ نظر حیات اور اشفاق شاہین پر مرکوز تھی۔

نظر حیات کے ساتھ میں اب دوسری بار وہی موت کا کھیل کھیلنا چاہتا تھا جو میں پھاگل اور کو سرائے میں اس کے ساتھ کھیل چکا تھا۔ اس بار میں نے اس کی رہائش گاہ پر شب خون مارنے کا تھا۔ دوسری طرف اشفاق شاہین بھی کھل کر میرے خلاف میدان میں اتر آیا تھا۔ اس نے خونخوار سفاک درندے کو میرے پیچھے لگا دیا تھا۔ تاہم میرے ذہن میں رہ رہ کر یہ خیال اُبھر رہا تھا کہ چوہدری ذیشان نے اس کے خلاف اب تک کیا کارروائی کی ہے؟......... اگرچہ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ کام اشفاق شاہین کے آدمیوں کی ہے۔ میں یہ جاننے کے لئے بے چین تھا۔

اگلے روز ٹال پر روزمرہ کے امور نمٹانے کے بعد میں نے چوہدری ذیشان سے موبائل پر رابطہ

''ہیلو.........'' دوسری جانب سے چوہدری ذیشان کی گمبھیر آواز اُبھری۔

''ہیلو چوہدری صاحب! میں نادر علی خان بول رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ارے نادر میاں! بھئی کیسے ہو تم؟......... کہاں ہو؟'' دوسری جانب سے ان کی شفیق آواز اُبھری۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اور اس وقت اپنے مری والے ٹال میں ہوں.........آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہی ہوں......... ڈاکٹروں نے پورے دو ماہ کے مکمل آرام کی ہدایت کی ہے۔ اب بھگت رہا ہوں۔''

''چوہدری صاحب! آپ نے ان نامعلوم حملہ آوروں کے خلاف اب تک کوئی کارروائی کی؟'' میں نے دانستہ ابھی اسے اشفاق شاہین کے متعلق نہیں بتایا تھا۔

''پولیس کارروائی کر رہی ہے۔ رپورٹ تو درج ہو چکی ہے۔'' انہوں نے گول مول سا جواب دیا تو میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''آپ کو تو معلوم ہوگا کہ آپ پر یہ قاتلانہ حملہ کروانے والا کون ہو سکتا ہے؟''

''ارے نادر میاں! جہاں ہم لوگوں کے دوست بے شمار ہوتے ہیں، وہیں دشمن بھی کم نہیں ہوتے۔ کسی دل جلے نے اپنی بھڑاس نکال لی ہوگی۔'' ان کے جواب دینے کے انداز سے صاف ہوتا تھا کہ وہ سب جانتے ہیں مگر بتانے سے کترا گئے تھے۔

''میاں! تم تو بالکل ہی غائب ہو گئے۔'' ان کی گفتگو جاری تھی۔ ''تم نے میری جان بچا کر احسان کیا ہے.........اور میں بھی کیسا بدنصیب اور مجبور ہوں کہ تمہارے احسان کا شکریہ ادا کرنے نہ آ سکا۔ لیکن میرے بچے! تم سے ملنے کو، تمہارا شکریہ ادا کرنے کو بہت بے تاب ہوں۔ تم اپنے گھر کا پتا بتا دو۔ ہم تم سے اور تمہارے والدین سے ملنے کو بے چین ہیں جنہوں نے تم جیسے بہادر اور دلیر بیٹے کو جنم دیا۔''

''چوہدری صاحب.........'' میں نے کچھ کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹ کر بولے۔

''ارے یار! یہ چوہدری کے تکلفات چھوڑو.........کیا تم مجھے انکل نہیں کہہ سکتے؟''

''سوری.........میرا مطلب ہے انکل! کہ آپ آنے کی زحمت نہ کریں۔ اور میں نے آپ پر کوئی احسان بالکل نہیں کیا۔ یہ تو میرا انسانیت کے ناتے فرض تھا۔''

''اچھا تو پھر تم خود ہی آ جاؤ.........کہو تو گاڑی بھیج دوں؟'' وہ فوراً بولے۔

''جی نہیں انکل! شکریہ......... بالکل ضرورت نہیں۔ میں کسی وقت آ جاؤں گا۔ لیکن آپ کو اپنے دشمن سے ازحد محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔'' اتنا کہہ کر میں نے آخر میں کہا۔ ''انکل! ایک بات معلوم کروں.........آپ ناراض تو نہیں ہوں گے؟''

''ارے بھئی پوچھو!......... بھلا تم سے کیسی ناراضگی؟'' وہ فراخ دلی سے بولے۔

''انکل! تھوڑی سی جسارت کروں گا۔ مجھے لگتا ہے آپ اپنے نامعلوم دشمن کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ لیکن مجھے بتانا نہیں چاہتے۔''

دوسری جانب انہیں لمحے بھر کی پُرسوچ چپ لگ گئی۔ پھر ہلکا سا قہقہہ مار کر بولے۔

''میاں! تم بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین بھی ہو......... دراصل یار! بات یہ ہے کہ میں ابھی تک واقعی یہ جان نہیں پایا ہوں کہ آخر یہ میرے کس دشمن کی حرکت ہے۔ جو مجرم گرفتار ہوئے ہیں وہ بھی ابھی کچھ نہیں اگلتے۔''

''انکل!......... اگر میں آپ کے دشمن کا نام بتا دوں تو؟'' میں نے اچانک کہا تو دوسری طرف سناٹا چھا گیا۔ پھر ان کی قدرے اٹکتی ہوئی آواز اُبھری۔ ''کک.........کیا.........مطلب؟''

''آپ اشفاق شاہین کو جانتے ہیں؟'' میں نے جیسے دھماکا کیا تو دوسری جانب سے فوراً ہی ان کی پُرجوش آواز اُبھری۔

''تت.........تم کیسے جانتے ہو اسے؟''

''بس اتفاق سمجھ لیں۔'' میں نے گول مول سا جواب دیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے مستحکم لہجے میں بولا۔ ''انکل! آپ پر حملہ کرنے والے نامعلوم لوگ اشفاق شاہین کے ہی آدمی تھے۔''

''تم.........تم کیسے جانتے ہو اس خبیث شیطان کو؟.........آخر تم بتاتے کیوں نہیں؟''

''انکل! کبھی آپ سے ملاقات ہوئی تو تفصیل بتا دوں گا۔ لیکن میں آپ کو پہلے ہی محتاط کر رہا ہوں۔ آپ ایک بااختیار انسان ہیں اور اِدھر اُدھر بھٹکنے کی بجائے اگر آپ کسی کے خلاف کوئی موثر کارروائی کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو دیر نہیں کرنی چاہئے۔''

دوسری جانب سے ان کے گہرا سانس لینے کی آواز اُبھری۔ پھر وہ پُرسکون لہجے میں بولے۔

''مجھے یہ بات پہلے ہی سے معلوم ہے......... مگر......... مجھے یہ بھی اعتراف کرنا پڑ رہا ہے، میرا یہ دشمن طاقت ور بھی ہے اور بااثر بھی۔ اور میں اسے اپنی گرفت میں لینے کے لئے بہت عرصے سے لگا ہوا ہوں۔ مگر ٹھوس ثبوت حاصل کرنے سے ہنوز قاصر ہی ہوں۔ لیکن اب تم نے مجھے یہ بتا کر میرے شبہے کو تقویت دے دی ہے۔ میں ان گرفتار مجرموں کے منہ سے اُگلوانے کی اب پوری کوشش کروں گا۔''

''میں بھی یہی چاہتا تھا انکل! کہ آپ پوری یکسوئی کے ساتھ اپنی توجہ دشمن پر مرکوز رکھیں۔'' میں نے کہا۔

''یار! تم بھی تو میری کچھ مدد کر سکتے ہو؟'' انہوں نے آخر میں کہا۔

''میں یہی کچھ کر سکتا تھا جو میں نے آپ کو بتایا۔'' میں نے کہا۔

''ہوں.........'' انہوں نے پُرسوچ انداز میں ہنکارا بھرا۔ پھر عجیب سے لہجے میں بولے۔ ''تم اس کے کالے دھندے سے واقف بھی ہو گے؟''

''یقیناً۔'' میں نے مختصراً جواب دیا۔ پھر کسی خیال کے تحت بولا۔ ''ویسے مجھے حیرت ہے کہ وہ کس قدر گھناؤنا کاروبار کر رہا ہے.........لیکن آج تک کسی کے کانوں میں اس کی بھنک بھی نہیں پڑ سکی اور

نہ ہی اس کے خلاف کوئی موثر انداز میں قانونی کارروائی ہو سکی ہے۔"

"ہاں......... اس لئے کہ اشفاق شاہین کوئی معمولی مجرم نہیں۔ وہ زیرِ زمین دنیا کا بہت بڑا گینگ... ہے۔ اور با اثر بھی۔ اس نے درحقیقت انڈر ورلڈ فلم مافیا کے بطن سے جنم لیا ہے اور پھر تیزی سے... اور چند مقتدر سیاسی حلقوں میں اپنا اثر و رسوخ بناتا چلا گیا۔ یہی سبب ہے کہ میں اب تک اس کے خلاف... کوئی فاسٹ ایکشن نہیں لے سکا ہوں۔ مگر مجھے تو اب تمہاری فکر ستانے لگی ہے......... کیا اشفاق شاہین... کو معلوم ہے کہ تم اس کی اصلیت سے واقف ہو؟"

"جی ہاں۔" میں نے مختصراً اثبات میں جواب دیا۔

"اوہ......... مائی گاڈ!" دوسری جانب سے چوہدری ذیشان کی آواز اچانک ہی پُرتشویش ہو گئی۔

"تو......... تو پھر تم بھی کوئی معمولی شخصیت نہیں ہو سکتے۔ تم ایسا کرو، مجھ سے فوراً کسی وقت آ کر... بیٹا! تم میرے محسن ہو......... اور مجھے اب تم اپنی اولاد کی طرح عزیز ہو چکے ہو۔ مجھے تمہاری حفاظت... سلسلے میں بھی کچھ کرنا پڑے گا۔"

"میری حفاظت کے لئے اللہ ہی کافی ہے۔" میں نے مضبوط اور پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ "یہ... شاہین جیسے شیطان میرا بال تک بیکا نہیں کر سکتے۔ آپ میری فکر نہ کریں۔ مجھے اسے تکمیل ڈالنی آتی...

"اچھا........." انہوں نے گہری سانس لی۔ پھر بے تابی سے بولے۔ "پھر کب آ رہے ہو؟"

"فی الحال تو کچھ نہیں کہہ سکتا......... مگر جلد آنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے کہا۔ پھر انہو... مجھ سے وعدہ لیا۔ اس کے بعد میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

چوہدری ذیشان جیسے با اختیار سیاسی شخصیت کو بھی میں نے اشفاق شاہین سے خائف سا ہوتا محسوس... تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید اشفاق شاہین کی پشت پناہی کوئی بڑی شخصیت ہی کر رہی تھی۔ جس کے... چوہدری ذیشان بھی دم مارنے کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔

غفورے نے میری راہ پر لگ کر گویا اپنی موت کو دعوت دے ڈالی تھی۔ مگر بزدل دشمن سے... خطرہ تو رہتا ہی ہے۔ کیونکہ ایسے دشمن پیٹھ پیچھے وار کرتے ہیں۔ میں اب دوسرے خطوط پر غور کر... تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے میں نے ان دونوں با اثر اور طاقت ور دشمنوں نظر حیات اور شاہ میر کے... کیا تھا۔ وہ قانون کی گرفت سے بچ گئے تھے مگر میں نے ان دونوں کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ اشفاق شاہین جیسے شیطان ناسور بن کر ملک و قوم کی نئی نسل کو تیزی کے ساتھ ذہنی اور جسمانی... مفلوج کر رہے تھے۔ اور افسوس ناک بات یہ تھی کہ با اختیار افراد اس کے خلاف کارروائی کرنے... عاجز تھے۔ قانون بھی اشفاق شاہین جیسے ناسور کا علاج نہ کر پایا تھا۔ مگر ایسے مجرموں کا علاج... میرے پاس تھا۔ اور زہر کو زہر سے مارنا تھا۔ چونکہ میں اشفاق شاہین کے گھناؤنے کاروبار سے واقف ہو... چکا تھا اس لئے اب اسے میں گمنامی کی موت مارنا چاہتا تھا جس طرح وہ اب تک دوسرے بے گناہوں کو... بے دردی کے ساتھ قتل کرتا آیا تھا جس میں اداکارہ سپنا، اس کی بہن غزالہ بھی شامل تھی۔

مجھے غزالہ کی موت پر بھی دکھ ہوا تھا......... اس کی موت سے متعلق اخبار میں مختصر سی خبر شائع ہوئی... تھی اور بس۔

ٹھیک اسی وقت گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ اُبھری۔ میں بری طرح ٹھٹک گیا۔ پھر ابھی میں... کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہی ہوا تھا کہ ایک ہائی روف پک اپ ٹال کے گیٹ سے تیزی کے ساتھ اندر... ہوئی۔ اس کے سلائیڈنگ ڈور کھلے ہوئے تھے۔ مجھے اس کے اندر موجود سات آٹھ افراد...

...لباس میں ملبوس، مسلح ڈھاٹے پوش افراد صاف نظر آ گئے۔ مزدور خوف زدہ ہو کر اِدھر اُدھر جا چھپے۔ ...رگوں میں خون آتش فشاں سے بہتے لاوے کی طرح گردش کرنے لگا۔ ہائی روف پک اپ کو اندر ...داخل ہوتا دیکھتے ہی میں نے اپنی جیب سے نہایت پھرتی کے ساتھ اپنا میگارڈ نکال لیا۔

...ہائی روف پک اپ کا رخ سیدھا میرے آفس روم کی طرف تھا۔ گیٹ پر متعین میرے گارڈز پر ...گولیوں کی بوچھاڑ کرنے کے بعد یقیناً ان کا نشانہ میں ہی تھا۔ چنانچہ میں نے پھرتی کے ساتھ اپنی جگہ ...سے حرکت کی اور ہائی روٹ پک اپ کو اپنے آفس کے عین سامنے رکتے دیکھا۔ میں نے جیسے ہی صوفوں ...کی جانب جست لگائی تھی، میرے عقب میں گولیوں کا بھیانک برسٹ فضا میں بکھرتا چلا گیا۔ تواتر کے ...ساتھ برستی ہوئی گولیوں نے میرے آفس کے گلاس ڈور کو کرچی کرچی کر کے بکھیر دیا......... اور پھر زٹ ...زٹ زنازٹ" کی سنسناتی آوازوں سے گولیاں دیواروں پر میری خالی ریوالونگ چیئر پر اور ٹیبل پر بکھری ...ہوئی اشیاء کو تیزی کے ساتھ کھدیڑتی، ادھیڑتی چلی گئیں۔ البتہ آفس کی جنوبی دیوار جدھر میں ایک بڑے ...سے ...رنگ صوفے کی آڑ لئے ہوئے تھا وہ اب تک محفوظ رہا تھا۔ لیکن یہ جگہ بھی زیادہ دیر تک محفوظ نہیں ...رہ سکتی تھی۔ اس وقت میرے پورے وجود میں سنسنی پھیلی ہوئی تھی اور سنسناتی گولیوں سے لہو مثل پارا کی ...طرح گردش کر رہا تھا۔ اپنے دفاع میں جو بھی کرنا تھا، فوری طور پر کرنے کا متقاضی تھا۔ موت کے ...ہرکارے مجھے ایک پل کا بھی موقع دیئے بغیر موت کے گھاٹ اتارنے کے لئے بری طرح بے چین تھے۔

...اچانک دھواں دھار فائرنگ بند ہو گئی۔ میرے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ میں نے ذرا سا سر اُبھارا ...تب سے پہلے دو عدد مسلح ڈھاٹا پوشوں کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ میں نے پھرتی سے اپنے میگارڈ کا ...رخ ان کی طرف کیا اوپر اوپر تلے دو فائر جھونک مارے۔ دونوں کراہت انگیز چیخ مار کر گر پڑے۔

"وہ حرامی اندر ہے۔" باہر سے ایک چلاتی آواز اُبھری جسے سن کر میری کنپٹیاں سنسنانے لگیں۔ یہ ...آواز غفورے کی تھی۔ میں نے پھرتی کے ساتھ ایک ڈھاٹا پوش کی لاش کے قریب پڑی، سب مشین گن ...اٹھا لی۔ میں پھرتی کے ساتھ پلٹا تو گولیوں کی بوچھاڑ آن پڑی۔ ایک ہی جگہ محبوس رہنا موت کو از خود ...دعوت دینے کے مترادف تھا۔ حملہ آوروں کے فاسٹ ایکشن سے عیاں تھا کہ انہوں نے مجھے موت کے ...گھاٹ اتارنے کا بہت کم سے کم وقت متعین کر رکھا تھا۔ چنانچہ میں نے بہ سرعت اپنا میگارڈ جیب میں ...رکھا اور سب مشین گن سنبھال لی۔

...میری جوابی فائرنگ پر حملہ آوروں کو دوبارہ اندر قدم رکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ میں نے جنوبی دیوار کی ...کھڑکی سے ذرا سر ابھار کر دیکھا تو چار پانچ مسلح ڈھاٹا پوش گیٹ سنبھالتے ہوئے دائیں بائیں ہو کر ...آفس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جبکہ باقی دو ہائی روف پک اپ کے دائیں بائیں گرد و پوش پر نظر ...جمائے ہوئے تھے۔ میں نے ان پانچوں کی طرف جیسے ہی اپنی گن کا رخ کیا وہ فوراً زمین پر گر پڑے۔ ...میں نے بھی اس وقت لبلبی دبا دی۔ گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ کے درمیان دو حملہ آوروں کی کریہہ انگیز ...چیخیں ابھریں۔ باقی تینوں نے زمین پر گرتے ہوئے مجھ پر اپنی گنوں کے دہانے کھول دیئے۔ مگر میں ...گن کی آتشیں پیاس بجھانے کے فوراً بعد نیچے جھک گیا تھا۔ اچانک میری نگاہ سامنے بائیں جانب کی ...کھڑکی پر پڑی اور اگر میں پل کے پل نیچے نہ جھک جاتا تو ایک مسلح ڈھاٹے پوش کے چلائے ہوئے ...برسٹ سے میری کھوپڑی چھلنی ہو جاتی۔ گولیوں کی وحشیانہ باڑ نے کھڑکی کے شیشوں کو چکنا چور کر دیا تھا۔ ...دوسرے ہی لمحے اس ڈھاٹا پوش نے غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کیا اور تیزی کے ساتھ کھڑکی سے ذرا ...ہٹ کر ایک بار پھر مجھ پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ میں صوفے کے عقب میں رینگ گیا لیکن جانتا

تھا کہ یہ صوفہ پل بھر میں گولیوں سے چھلنی ہو کر جالی بن جائے گا اور پھر میں بھی نہ بچ سکوں گا۔ تیزی کے ساتھ اپنی پوزیشن بدلی۔ کھڑکی کی طرف گن کا رخ کرتے ہی لبلبی دبا دی۔ میری آتشیں قہقہہ اُگلا۔ جرأت مندانہ انداز دکھانے والا وہ حملہ آور آواز تک نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔

میری جوابی فائرنگ نے اب باقی مسلح حملہ آوروں کی پیش قدمی جام کر کے رکوا دی۔ تاہم اپنے ٹال کے احاطے سے بے دخل اور جوابی کارروائی کو بدستور برقرار رکھنا تھا۔

''واپس چلو......... جلدی!''

دفعتہً ہی چلاتی ہوئی غفورے کی آواز اُبھری۔ میں نے پھرتی سے مگر نہایت احتیاط کے ساتھ سمت کی کھڑکی سے ذرا جھانکا تو مجھے باقی ماندہ حملہ آور، ہائی روف پک اپ میں تیزی کے ساتھ ہوتے نظر آئے۔ چونکہ ان سب نے چہروں پر ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے اس لئے میں غفورے کو پایا تھا۔ ہائی روف پک اپ اسٹارٹ ہو کر تیزی کے ساتھ ریورس ہوتی ہوئی گیٹ سے باہر نکلتی چلی

میں بھی پھرتی کے ساتھ ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر گولی کی طرح اپنے قریب کھڑی طرف بڑھا اور دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ پھر چشم زدن میں اسے اسٹارٹ کر کے تیزی بیک کرتا ہوا گیٹ سے کھلی سڑک پر آ گیا۔ اور پھر ہائی روف پک اپ تیزی سے دوڑتی ہوئی جاتی دی۔ میں نے بہ سرعت گیئر بدلا اور ایکسیلیٹر دبا دیا۔ جیپ غراتی ہوئی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی جاتی ہوئی ہائی روٹ پک اپ کے تعاقب میں دوڑنے لگی۔ فائرنگ کے باعث راہ گیر اور دیگر کے لوگ سہم کر محفوظ جگہوں میں جا دبکے تھے .... ہر سے مصروف نظر آنے والی سڑک پل ویران ہو گئی تھی۔

میں پوری رفتار کے ساتھ جیپ دوڑائے جا رہا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میرا یوں ان خونخوار آوروں کے تعاقب میں نکل پڑنا دانش مندانہ قدم تھا یا نہیں۔ مگر یہ بھی درست تھا کہ اس وقت میرا وجود کسی آتش فشاں کی طرح دہک رہا تھا۔ میرے دماغ میں انگارے سلگ رہے تھے اور دشمنوں کو گھاٹ اتارنے کا جنون سر پر سوار تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ایک تو غفورے کی آواز پہچان کر مجھے معلوم ہو چکا تھا، مجھ پر یوں اچانک قاتلانہ حملہ کرنے والوں کا تعلق اشفاق شاہین کے آدمیوں دوسرے یہ کہ ان میں مردود غفورا بھی شامل تھا اور میں اسے کسی قیمت پر بھی زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

میں جیپ کی رفتار بتدریج بڑھاتا چلا جا رہا تھا۔ ممکن تھا کہ ہائی روف پک اپ سوار حملہ آوروں کو میرے تعاقب کا علم ہو گیا ہو......... مگر انہوں نے گاڑی روکی نہیں تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اپنے کو تعاقب میں آتا دیکھ کر چاہتے بھی یہی ہوں کہ کسی دوسرے ویران مقام تک پہنچنے کے بعد مجھ ڈالنے کی کوشش کریں۔ تاہم میں بھی اتنا تر نوالہ نہ تھا۔ تعاقب جاری تھا۔ لالہ زار سے بائیں مڑنے والی بل کھاتی سڑک صنوبر کے گھنے لانبے پیڑوں کے درمیان جاتی ہوئی نظر آئی تو میں نے کی ہائی روف پک اپ کو اسی سمت کی جانب مڑتے ہوئے دیکھا۔ پھر جب میں مذکورہ چوراہے بائیں جانب مڑنے والی سڑک کی بجائے تیزی کے ساتھ آگے نکلتا چلا گیا۔ ایسا میں نے دانستہ درحقیقت میں جانتا تھا کہ لالہ زار سے بائیں طرف مڑنے والی یہ سڑک آگے جا کر تقریباً تین فاصلہ طے کرنے کے بعد سیدھی موڑ وے سے جا کر ملتی تھی۔ یہ وہی سڑک تھی جس پر میں نے کے آدمیوں گگل خان وغیرہ کا تعاقب کیا تھا۔ مگر اس بار میں دوسری سمت پر تھا۔

لیکن ابھی میں نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ عقب سے مجھے پولیس سائرن کی چیختی چلاتی

دی۔ میں نے بیک ویو مرر میں دیکھا تو بے اختیار ایک گہری سانس لی۔ یہ پولیس موبائل تھی جو رفتار سے میرے تعاقب میں ہولناک سائرن بجاتی ہوئی آ رہی تھی اور ساتھ ہی اپنی ہیڈ لائٹس کو جلا بجھا کر مجھے رکنے کا اشارہ بھی کر رہی تھی۔ ناچار میں نے جیپ کی رفتار بتدریج کم کر دی اور بالآخر سڑک کے کنارے روک دی۔ پولیس موبائل تیزی کے ساتھ سائرن بجاتی ہوئی میرے قریب آن رکی۔ میں انجن سوئچ آف کرنے کے بعد نیچے اتر آیا۔ میں نے موبائل گاڑی کے ڈرائیونگ کیبن سے انسپکٹر شمس کو اترتے دیکھا اور ساتھ ہی موبائل کے پچھلے حصے سے چند مسلح پولیس والے بھی چھلانگیں لگاتے اتر پڑے۔ انسپکٹر شمس کو دیکھ کر مجھے تھوڑی سی پریشانی ہوئی۔ وہ میری طرف معاندانہ نظروں سے گھورتا ہوا آگے بڑھا اور قریب پہنچ کر درشت لہجے میں بولا۔

''یہ کیا خون خرابہ پھیلا کر آئے ہو تم اپنے ٹال پر؟''

مجھے اس کا لہجہ ناگوار گزرا اور میں نے بھی اسی لہجے میں کہا۔ ''یہ خون خرابہ میں نے نہیں بلکہ میرے دشمنوں نے کیا تھا۔''

''تم ماں بیٹوں کا تو پورا شہر ہی دشمن بنا ہوا ہے۔ ہے نا.........؟'' اس نے دانت پیس کر استہزائیہ لہجے میں کہا۔

میں اس کے طنزیہ اور کاٹ دار لہجے میں چھپی کینہ پروری کا مطلب اچھی طرح جانتا تھا۔ کیونکہ یہ شاہ بر اور نظر حیات کی زرخرید کالی بھیڑ تھی۔

''چلو......... موبائل میں بیٹھو۔ تمہیں تھانے چلنا ہو گا۔''

''ٹھیک ہے......... میں اپنی جیپ میں چلوں گا۔'' میں نے بھی رکھائی سے کہا تو وہ دانت پیس کر رہ گیا۔ پھر اس نے اپنے دو پولیس والوں کو میرے ساتھ میری جیپ میں سوار ہونے کا کہا۔

میں جیپ میں بیٹھا تو ایک پولیس والا میرے برابر کی نشست پر اور دوسرا عقبی نشست کی طرف چلا گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے جیپ اسٹارٹ کی، یوٹرن لیا اور واپس ہو لیا۔ پولیس موبائل میرے عقب لگ گئی۔

جیپ چلانے کے دوران میں نے اپنی جیب سے موبائل نکالا اور چوہدری ذیشان سے رابطہ کیا اور اسے ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ نیز دو پولیس والوں کی موجودگی کے باعث میں نے اشفاق شاہین اور بالخصوص غفورے کا نام لینے سے گریز کیا تھا۔ تاہم میں نے چوہدری ذیشان کو اشاروں کنایوں میں ساری باتیں سمجھا دیں۔

''یہ بہت برا ہوا۔ مگر تم بالکل فکر مت کرو۔ میں ابھی متعلقہ ایس پی سے بات کر لیتا ہوں۔'' انہوں نے مجھے تسلی دی۔ ''ویسے تم ٹھیک تو ہو نا بیٹا؟'' ان کے لہجے میں شفقت تھی۔

''جی انکل! اللہ کا شکر ہے۔ میں اس قاتلانہ حملے سے بال بال بچا ہوں۔''

''او کے......... میں ابھی آئی جی سے بھی بات کرتا ہوں اور اسپیشل پولیس ٹیم بھجواتا ہوں۔ تم بالکل فکر مت کرنا۔ اور ہاں، تمہارے ساتھ جو پولیس والا بیٹھا ہے اپنا موبائل ذرا اُسے دینا۔''

''جی اچھا۔'' میں نے یہ کہہ کر اپنے برابر بیٹھے ہوئے پولیس والے کی طرف دیکھا اور اپنا موبائل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولا۔

''لو......... بات کرو۔ ایم این اے چوہدری ذیشان صاحب بات کریں گے۔''

چوہدری صاحب کا نام سن کر پولیس والا ایک دم مرعوب سا نظر آنے لگا۔ پھر میرے ہاتھ سے موبائل

لے کر کان سے لگالیا اور مؤدبانہ بولا۔

’’جی سر!........حکم کریں۔‘‘

وہ تھوڑی دیر تک کچھ سنتا رہا، اس کے بعد شاید دوسری طرف سے چوہدری ذیشان نے انسپکٹر اعجاز شمس کا موبائل نمبر پوچھا تھا کیونکہ وہ پولیس والا انہیں یہ کہہ کر موبائل نمبر بتانے لگا۔

’’جی........جی سر!........انسپکٹر صاحب کا موبائل نمبر مجھے معلوم ہے۔ نوٹ کریں۔‘‘

نمبر نوٹ کروانے کے بعد پولیس والے نے موبائل مجھے لوٹا دیا۔

میں نے کان سے لگایا تو دوسری جانب چوہدری صاحب لائن پر موجود تھے۔

’’ہاں بیٹا!........میں ابھی انسپکٹر اعجاز شمس سے بھی بات کر لیتا ہوں........ٹھیک ہے........ اوکے خدا حافظ۔‘‘

یہ کہہ کر انہوں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر موبائل اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اب میں مطمئن تھا۔

❄❄❄

چوہدری ذیشان کے بیچ میں پڑنے سے میری حد تک معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ ورنہ انسپکٹر اعجاز شمس تو مجھے پہلے ہی ’’اندر‘‘ پہنچانے کے بارے میں پکا ارادہ کر چکا تھا۔ اس کے سان وگمان میں بھی نہ تھا کہ میرے تعلقات اتنے وسیع بھی ہو سکتے ہیں۔

بہرطور........اسے مجھے چھوڑنا ہی پڑا۔ معمولی سی ضابطے کی کارروائی اس نے ضرور نمٹائی تھی۔ آئی جی صاحب کے حکم پر ایس پی ظہیر قریشی صاحب اسپیشل پولیس ٹیم کے ہمراہ خود وقوعے کا جائزہ لینے آ پہنچے تھے۔

میرے ہاتھوں دو حملہ آور مارے جا چکے تھے جبکہ تیسرا زخمی حالت میں مزدوروں نے پکڑ لیا تھا۔

بظاہر سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔ مگر مجھے رہ رہ کر یہ خیال بھی فکرمند کرتا تھا کہ اسپیشل ٹیم کی کارروائی سے اشفاق شاہین اور بالخصوص غفورا پولیس کی گرفت میں آ گیا تو معاملہ الٹا میرے گلے بھی پڑ سکتا تھا۔

کیونکہ یہ بات میرے دشمن شاہ میر اور نظر حیات (مگر اب صرف نظر حیات) بھی جانتے تھے کہ صدف مرڈر کیس میں غفورے کی گرفتاری کس قدر اہم تھی اور نظر حیات انسپکٹر اعجاز شمس کو غفورے کی تلاش کے سلسلے میں پیسوں کے زور پر الرٹ رکھے تھا۔ کیونکہ نظر حیات کی بیٹی صدف مرڈر کیس میں، غفورے کی گواہی میری ماں کو پھانسی پر چڑھانے کا باعث بن سکتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ غفورے نے مجھے بھی ملک سردار خان کا قتل کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ یوں غفورے کا پولیس کی گرفت میں آنا ہم دونوں ماں بیٹوں کے لئے خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ ادھر غفورے کی بھی میرے خلاف چیرہ دستیاں بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ اشفاق شاہین کے دیگر آدمی بھی پولیس کی گرفت میں آ چکے تھے اور ان سے پوچھ گچھ کا سلسلہ جاری تھا۔ یہ ممکن تھا کہ کوئی، اشفاق شاہین یا غفورے کے سلسلے میں زبان کھول سکتا تھا۔ چنانچہ کم از کم غفورے کو اب میرے لئے جلد سے جلد ٹھکانے لگانا اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔ یوں بھی وہ کئی بے گناہ لوگوں کا قاتل بن چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے غفورے کو جلد از جلد اپنے ہاتھوں کیفر کردار تک پہنچانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

مجھ پر ہونے والے قاتلانہ حملے سے ماں اور انکل اعظم خان خاصے پریشان ہو گئے تھے۔ مگر میں نے انہیں نہیں بتایا تھا کہ میرے دشمن کون تھے۔ پھر چوہدری ذیشان جیسی بھاری بھرکم شخصیت نے مجھے

پولیس کی الجھنوں سے بچایا تھا اس پر دونوں کو خاصی حیرت ہوئی تھی کہ میرے بھلا چوہدری صاحب سے کس طرح تعلقات پیدا ہو گئے تھے؟........تاہم میں نے دشمنوں کے سلسلے میں بدستور یہی ظاہر کیا کہ وہ نامعلوم تھے۔ مگر ماں اور انکل اعظم خان کا خیال تھا کہ یہ حرکت پھاگل والی مہم کا ردعمل ہو سکتی ہے جس کے پیچھے یقیناً نظر حیات وغیرہ کا ہاتھ تھا۔ ’’جھوٹ‘‘ سے مجھے یہ پریشانی ہو گئی تھی۔ کیونکہ ماں نے مجھ پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تھا کہ میں نظر حیات کا کانٹا اب نکال ہی دوں۔ یوں میں نے جو نظر حیات کے خلاف ’’اعصابی جنگ‘‘ شروع کر رکھی تھی وہ متاثر ہونے لگی تھی۔ تاہم مجھے ماں سے یہ جھوٹ بولنا پڑا کہ یہ حرکت غفورے کے آدمیوں کی تھی جو ہمارے لئے خطرہ بنتا جا رہا تھا۔

اس ضمن میں میں نے ماں سے یہی کہا تھا کہ تھوڑے دنوں پہلے ہی غفورے نے مجھ سے ایک خفیہ ملاقات کی تھی اور مجھے بلیک میل کرنا چاہ رہا تھا کہ اگر میں نے اسے ماہانہ پچاس ہزار کی رقم باقاعدگی سے نہ دی تو وہ پولیس کو صدف مرڈر کیس اور ملک سردار خان کے قتل کے سلسلے میں وعدہ معاف گواہ بن کر گواہی دے گا اور اس سلسلے میں نظر حیات نے اس کی بھرپور مدد کرنے کا بھی وعدہ کر رکھا ہے وغیرہ۔

غفورے کے ذکر پر ماں بھی پریشان سی ہو گئی تھی۔ مجھ پر قاتلانہ حملے کی خبر اخبارات میں بھی شہ سرخیوں سے شائع ہوئی تھیں۔ کاشانہ بھی مجھ سے ملنے آئی۔ اس نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ حرکت رب نواز کی ہو سکتی ہے۔ تاہم اس نے یہ بھی کہا تھا کہ گزشتہ دنوں ٹرکوں کی چوری والے کیس کے بعد سے اس کے میرے خلاف متوقع ردعمل کے باعث اس نے رب نواز پر کڑی نگاہ رکھنی شروع کر رکھی ہے۔ میں نے کاشانہ کو تسلی دی تھی کہ سردست اس کے غبارے سے ہوا نکل چکی ہے اور اب وہ میرے خلاف کسی ’’مہم جوئی‘‘ کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اعظم خان نے البتہ ہم ماں بیٹے کی سکیورٹی پر زور دینا شروع کر دیا تھا اور مجھے کچھ عرصے کے لئے ٹال پر جانے سے منع کیا تھا۔ مگر میں نہیں مانا تھا۔ میں اب بھی باقاعدگی سے ٹال پر جاتا تھا۔

بظاہر حالات معمول پر آ گئے تھے۔ مگر مجھے اشفاق شاہین اور غفورے کی طرف سے بدستور دھڑکا لگا ہوا تھا۔ اس وقت یہ مسئلہ ’’برننگ پوائنٹ‘‘ پر تھا۔ باقی دشمنوں کو میں نے سردست نکیل ڈال رکھی تھی۔

سکیورٹی کے سلسلے میں البتہ میں نے ماں کی حفاظت کے پیش نظر گرین لاج میں مسلح گارڈز کی تعداد بڑھا دی تھی۔ میں نے اب اشفاق شاہین اور بالخصوص غفورے والے معاملے پر سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیا تھا اور سردست غفورے کو میں نے ٹارگٹ بنا لیا تھا۔ جو ملزمان گرفتار ہوئے تھے ان سے پوچھ گچھ کی جا رہی تھی۔ کسی وقت بھی دھماکا خیز انکشافات کی توقع تھی۔

چوہدری ذیشان بھی اپنا پورا زور لگا رہے تھے۔

ایک روز میں گرین لاج سے ٹال پر جانے کے لئے جیپ میں سوار ہونے لگا تو اچانک مجھے چوہدری ذیشان کی کال موصول ہوئی۔

’’نادر بیٹا!........ایک زبردست خوش خبری ہے تمہارے لئے۔‘‘ ان کا لہجہ پُرمسرت تھا۔ مگر میرا دل ان کی ’’خوش خبری‘‘ پر ایک متوقع اور پُرتشویش خیال سے دھڑکنے لگا۔

’’کیا........کیا خوش خبری ہے؟‘‘ میں نے بہ مشکل اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

’’دونوں طرف کے ملزمان نے زبان کھول دی۔ اب یہ مردود اشفاق شاہین نہیں بچ سکتا۔‘‘ چوہدری ذیشان نے دھماکا کیا۔ مجھے غفورے کی طرف سے زیادہ پریشانی ستانے لگی تھی۔ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"اچھا......... یہ تو بڑی زبردست خوش خبری سنائی ہے آپ نے.........تو پھر اس کے خلاف پولیس کارروائی ہوئی؟"

"اسپیشل پولیس ٹیم نے اشفاق شاہین کی لاہور میں گلبرگ والی کوٹھی پر چھاپہ مارا ہے۔" وہ بتانے لگے۔ اور میرا دل جیسے کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔

"مگر اس بدبخت کو شاید پہلے ہی سے علم ہو گیا تھا۔ وہ اپنے چند قریبی ساتھیوں سمیت روپوش ہو گیا ہے۔" وہ پُرجوش لہجے میں بتانے لگے۔ "مگر وہ اب بچ کر نہیں جا سکتے.........ان کے خلاف پولیس نے بہت مضبوط نیٹ ورک بنا لیا ہے۔ اس کے گرفتار شدہ ساتھیوں سے مزید پوچھ گچھ جاری ہے۔"

"انکل!......... کیا اسپیشل پولیس ٹیم کو چھاپے کے دوران کوئی ثبوت ملے ہیں؟" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

"گلبرگ والی کوٹھی سے تو کچھ نہیں ملا۔ البتہ دو دیگر اڈوں پر چھاپے کے دوران کچھ آبرو باختہ لڑکیوں، عورتوں اور مردوں کو گرفتار کیا ہے۔ وہاں سے بڑے سنسنی خیز ثبوت ملے ہیں۔ باقی تفصیل آج کا اخبار لے کر پڑھ لو۔" انہوں نے آخر میں کہا۔

"تھینک یو انکل!......... آپ نے مجھے ایک بہت بڑی خوش خبری سنائی۔" میں خوش ہو کر بولا تو انہوں نے آخر میں توصیفی انداز میں کہا۔

"نادر بیٹے! یہ سب تمہاری بہادری اور ذہانت کی وجہ سے ہوا ہے۔ ورنہ شاید ہم کبھی اشفاق شاہین جیسے بڑے گینگسٹر کو نہیں چھاپ سکتے تھے۔"

"نہیں، اس میں آپ کی بھی ذاتی دلچسپی اور نیک جذبوں کا دخل ہے۔" میں نے کسرِ نفسی کے ساتھ کہا۔ اس کے بعد انہوں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میرے لئے یہ ایک بڑی خوش خبری تھی کہ بالآخر اشفاق شاہین کے خلاف موثر انداز میں کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ یقیناً کئی اہم ثبوت بھی ہاتھ لگے ہوں گے۔ اگرچہ وہ روپوش ہو گیا تھا، تاہم اس کا اتنا فائدہ تو ضرور ہوا تھا کہ کالا دھندہ بند ہو چکا تھا۔

میں ٹال پر پہنچا تو منیجر مشتاق کو اپنے آفس روم میں اخبار کھولے اور اپنے گال پیٹتے ہوئے پایا۔

"توبہ.........توبہ......... کیسے کمینے لوگ ہمارے سماج میں پیدا ہونے لگے ہیں۔"

وہ اخبار پڑھے جا رہا تھا اور ایک ہاتھ کانوں کو لگائے، بڑبڑائے جا رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اس کے ہاتھ سے اخبار جھپٹا اور اپنی چیئر پر بیٹھ کر اشفاق شاہین کے متعلق خبر پڑھنے لگا۔

شہ سرخیوں میں خبریں چھپی تھیں۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ انڈر ورلڈ فلم مافیا کے چیف اشفاق شاہین کے خلاف اسپیشل پولیس نے کارروائی کے دوران اس کی گلبرگ والی کوٹھی اور دو دیگر خفیہ اڈوں پر چھاپہ مارا تھا۔ کوٹھی سے تو کچھ برآمد نہیں ہوا تھا البتہ اس کے دو اڈوں سے آبرو باختہ عورتیں اور مرد گرفتار کر لئے گئے تھے اور وہاں سے ویڈیو کیمرہ اور فلم میکنگ کے دیگر لوازمات کے علاوہ قابل اعتراض سی ڈیز پولیس کے ہاتھ لگی تھیں جس سے یہ گھناؤنی حقیقت سامنے آئی کہ اشفاق شاہین کا گروہ قابل اعتراض فلمیں بنانے کا گھناؤنا کاروبار کرتا تھا۔ مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔

خبر کے علاوہ ایک چھوٹے سے چوکھٹے میں اشفاق شاہین کے دست راست غفورے کو بھی ہلاک ظاہر کیا گیا تھا۔ بالخصوص اس خبر نے مجھے بری طرح چونکا کر رکھ دیا تھا۔ میں اس خبر کو بھی بغور پڑھنے لگا۔ غفورے کے سلسلے میں یہ انکشافات تھے کہ وہ اداکارہ سپنا کے قتل میں بھی ملوث تھا۔ بلکہ

...کی جواں سال بیٹی صدف کا بھی قاتل تھا۔ علاوہ ازیں ملک سردار خان کے قتل کا چشم دید گواہ بھی تھا۔ گرفتار شدہ ملزمان سے بھی مزید پوچھ گچھ جاری ہے۔ ایک دوسرے چوکھٹے میں لکھا تھا کہ اشفاق شاہین کو متوقع قانونی حراست سے بچانے اور اس کی قبل از گرفتاری ضمانت کے لئے بعض بااثر شخصیت... درون خانہ حرکت میں آ چکی ہیں۔

غفورے سے متعلقہ خبر نے مجھے ایک بار پھر متفکر کر دیا۔ میرے چہرے پر طاری غیر متوقع پریشانی کے تاثرات دیکھ کر میرے سامنے بیٹھا منیجر مشتاق جانے کیا سمجھ کر بولا۔

"سر جی! آپ کو مردود اشفاق شاہین کے گروہ کی گرفتاری پر کوئی خوشی نہیں ہوئی، جی کڑا کے، سر!"

میں نے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔ وہ کچھ گڑبڑا سا گیا۔ "کیا مطلب؟"

"م.........مم......... مطلب......... کک......... کچھ نہیں.........سر!......... جی کڑا کے۔" وہ گھبرا کر بولا۔

اچانک میں نے اپنے آفس کے گلاس ڈور سے ایک پولیس جیپ تیزی سے اندر داخل ہوتے دیکھی۔ میں چونک سا گیا۔ پھر جیپ سے جب میں نے دو پولیس والوں کے ساتھ انسپکٹر اعجاز شمس کو بھی نیچے اترتے دیکھا تو میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ تاہم میں یہی سمجھا تھا کہ شاید وہ گزشتہ دنوں مجھ پر قاتلانہ حملے کے واقعے کے سلسلے میں کچھ ضروری پوچھ تاچھ کی "باقیات" نمٹانے آیا ہے۔

وہ سیدھا میرے آفس روم کی طرف بڑھا۔ میں نے منیجر مشتاق کو وہاں سے جانے کو کہا۔ انسپکٹر شمس اندر داخل ہوا۔ اس کے عقب میں وہ دونوں پولیس والے بھی اندر داخل ہو گئے۔ میں نے بغور انسپکٹر شمس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ مجھے اس کے چہرے پر گہرے معاندانہ جوش کے تاثرات محسوس ہوئے۔

میں نے طوعاً و کرہاً کھڑے ہو کر جبراً مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا اور مصافحہ کرنے کے بعد اسے بیٹھنے کا کہا۔ باقی دو پولیس والے بھی دائیں بائیں کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔

"جی.........!" میں نے استفسار طلب لہجے میں اس کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے کہا تو وہ ذرا کھنکھار کر عجیب سے لہجے میں مستفسر ہوا۔

"نادر صاحب! میرے سوال کا جواب آپ ذرا سوچ سمجھ کر اور اچھی طرح یاد کر کے دیجئے گا۔ کیونکہ آپ کا جھوٹ یا بھول پن ہمارے شبہے کو تقویت دینے کا باعث بن سکتا ہے۔"

میں اس کے اس عجیب و غریب پوچھنے کے انداز پر ذرا پریشان سا ہوا تاہم دوسرے ہی لمحے پُراعتماد لہجے میں بولا۔ "جی......... پوچھئے۔ کیا پوچھنا چاہتے ہیں آپ مجھ سے؟"

وہ ہولے سے کھنکھار کر اور میرے چہرے پر اپنی نظریں گاڑ کر بولا۔ "آپ پر کئے گئے قاتلانہ حملے سے چند روز پہلے اشفاق شاہین آپ سے ملنے یہاں آیا تھا؟"

اس کی بات پر مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا۔ مجھے اس کا فوری طور پر سوچ کر جواب دینا تھا جو میری بیدار مغزی کا امتحان بھی تھا۔

"کیا مطلب؟"

"میں نے بالکل سلیس اُردو میں آپ سے پوچھا ہے نادر صاحب! کہ اشفاق شاہین گزشتہ دنوں یہاں آپ کے ٹال پر آپ سے ملاقات کرنے آیا تھا؟"

اس نے ایک ایک لفظ چبا کر اور پورے مستحکم لہجے میں اپنا سوال دہرایا تو میرے تیزی سے کام کرتے ہوئے ذہن نے فوری طور پر اس کے لہجے کی مضبوطی اور چہرے پر طاری متوقع فاتحانہ جوش کی

سرخی کو بھانپ کر یہ یقینی اندازہ قائم کر لیا تھا کہ چند دنوں پہلے اشفاق شاہین کی یہاں آمد سے متعلق کے ہاتھ کوئی ٹھوس ثبوت لگ چکا تھا اس لئے میرا جھوٹ بولنا مجھے کمزور اور اسے مضبوط بنا سکتا تھا۔ پھر میں نے بہ ظاہر بے پرواہانہ انداز میں اسے گول مول جواب دیتے ہوئے کہا۔

''ممکن ہے یہاں وہ کسی کاروباری سلسلے میں آیا ہو۔ اوپن اسپاٹ ہے......... لکڑیوں کے آرڈر وغیرہ دینے کے لئے یہاں لوگوں کا آنا جانا لگا ہی رہتا ہے۔''

''ہوں......... ٹھیک کہا آپ نے۔'' میری بات پر اس نے اسرار بھرے لہجے میں ایک گہری ہنکاری خارج کرتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ نے اشفاق شاہین کو اس سے قبل دیکھا تھا؟......... یا آپ اسے پہچانتے تھے؟'' اس نے اگلا سوال داغا۔ اس کے طرزِ تخاطب سے اعتماد کی جھلک صاف محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے خلاف ایک گہری سازش کے تحت ہی مجھ پر جال ڈالنے کی غرض سے آیا تھا اور اس کے پاس یقیناً کوئی ٹھوس وجہ تھی۔ نیز وہ اس کی پہلے سے بھرپور تیاری بھی کر کے آیا تھا۔ البتہ میں اس کے اگلے سوال پر کچھ اُلجھ سا گیا تھا کہ میں اسے فوری طور پر کیا جواب دیتا؟ مجھ سے جواب نہ بن پڑا تو میں الٹا اس سے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کر ڈالا۔

''انسپکٹر!......... آپ آخر چاہتے کیا ہیں؟......... ذرا کھل کر بات کریں۔''

اس کی بھانپتی ہوئی نظریں بدستور میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''میں نے بات واضح کر دی ہے۔ پھر وضاحت کرتا ہوں۔ آپ کے اشفاق شاہین سے خفیہ تعلقات رہے ہیں؟'' بالآخر اس نے کہا۔

''یہ جھوٹ ہے......... میں تو اسے جانتا تک نہیں ہوں۔ اور نہ ہی کبھی ملا ہوں اس سے۔'' مجھے بھی غصہ آ گیا۔ انسپکٹر اعجاز شمس میرے تیز لہجے سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا بلکہ اس کے بجائے اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ اور آنکھوں سے بلا کے اعتماد کی جھلک نمایاں تھی۔ کم بخت کا یہی پُراعتماد لہجہ مجھے اندر سے پریشان کئے دے رہا تھا۔

اس کے بعد اس نے اپنی شرٹ کی جیب سے ایک لفافہ نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔

''اسے کھول کر دیکھئے......... کیا یہ بھی جھوٹ ہے؟'' اس نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ اس بار انسپکٹر شمس کی آنکھوں میں تندی عود کر آئی تھی۔

میں نے لفافے کی طرف دیکھا۔ پھر دھڑکتے دل کے ساتھ اسے الٹایا اور اس کے اندر سے چار پوسٹ کارڈ سائز کی تصویریں برآمد ہوئیں۔ میں نے ان پر نظر ڈالی اور میرے تنفس کی رفتار تیز ہونے لگی۔ پورا وجود بری طرح سائیں سائیں کرنے لگا۔ حواس مختل سے ہونے لگے اور ہاتھوں سے جان نکلتی ہوئی سی محسوس ہونے لگی۔ میں نے انسپکٹر شمس کی طرف دیکھا۔

اس کے ہونٹوں پر بڑی اسرار بھری مسکراہٹ تھی جیسے وہ میری کیفیات سے اندر ہی اندر حظ اٹھا رہا ہو۔ پھر سرسراتے لہجے میں بولا۔

''کیوں نادر صاحب!......... یہ ثبوت کافی ہے؟''

میں نے بے اختیار اپنے خشک پڑتے لبوں پر زبان پھیری اور ایک بار پھر تصویروں پر نگاہ ڈالی۔ چاروں تصویروں میں مختلف زاویوں سے میری اور اشفاق شاہین کی ملاقاتوں کا منظر دکھایا گیا تھا۔ تصویریں تو وہ تھیں جن میں پہلی ملاقات میری، اشفاق شاہین کی لاہور میں گلبرگ والی کوٹھی میں ہوئی

تیسری تصویر میری جیپ کی تھی جو اس کی کوٹھی کے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔ جبکہ آخری اور چوتھی تصویر تھی جب گزشتہ دنوں اشفاق شاہین بہ نفس نفیس خود اپنی کار میں مجھ سے ملنے ٹال پر آیا تھا۔

یہ تصویریں کب اور کس نے اتاری تھیں، یہ سوچنا بعد کا کام تھا۔ مگر یہ وقت سامنے خطرناک ارادوں اور تیوروں کے ساتھ بیٹھے انسپکٹر اعجاز شمس کو اس کا جواب دینے کا تھا۔ چنانچہ میں پل کے پل اپنی بدلتی کیفیات پر قابو پاتے ہوئے فوراً اپنے ذہن کو بروئے کار لایا اور بے پرواہی سے مسکرا کر بولا۔

''میں نے تو آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ ممکن ہے میری اس شخص سے کاروباری ڈیلنگ ہوتی رہی ہو۔ اب جبکہ آپ نے یہ تصویریں دکھائیں تو مجھے یاد آ گیا ہے کہ اس شخص نے اپنی لاہور گلبرگ والی کوٹھی میں لکڑی کا کچھ کام کروانا تھا۔ اس کے لئے لکڑی درکار تھی۔ پھر جب میں نے آج کا اخبار پڑھا تو اس کی تصویر دیکھ کر میں بھی یقیناً چونکا تھا۔''

میں نے دیکھا میری بات سن کر اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ تھوڑی دیر قبل اس کے چہرے سے جو بلا کے اعتماد اور فتح مندی کے آثار مترشح تھے وہ اب ماند ہونے لگے تھے جس سے مجھے خود اندازہ ہوا تھا کہ میرا جواب برمحل ہی نہیں بلکہ بہت مناسب اور جچا تلا تھا جس کے باعث اب میرا اعتماد بھی بحال ہونے لگا تھا۔

''ہوں۔'' اس نے میری طرف گھورتی نظروں سے دیکھتے ہوئے ایک طویل ہنکاری لی۔ وہ بے بس سا نظر آنے لگا۔ مگر بدستور اپنی ہٹ پر قائم رہتے ہوئے بولا۔

''میں یہ چاروں تصویریں اسپیشل پولیس ٹیم کے آفیسر اور ایس پی ظہیر قریشی کو بھیجوں گا۔ اس کے ساتھ تمہارے خلاف اپنے ریمارکس بھی۔ اور دوبارہ میں تمہاری گرفتاری کے وارنٹ کے ساتھ آؤں گا۔ لیکن میں نے سوچا تھا کہ اگر تم مجھ سے تعاون کرنے پر تیار ہو تو میں بالا ہی بالا تمہارے تعاون سے ان دونوں مفرور ملزمان اشفاق شاہین اور غفورے کی تلاش میں اسپیشل پولیس پارٹی کی مدد کروں گا۔ اس طرح میرا یہ فائدہ ہو گا کہ میری رکی ہوئی پروموشن بھی جلد ہو جائے گی۔''

اس نے اپنے پروموشن والے جس ''فائدے'' کا ذکر کیا تھا وہ فائدہ نہیں بلکہ ایک دیرینہ سازش تھی اور میرے دشمن نظر حیات کے ساتھ اس کے خفیہ گٹھ جوڑ کی سازش کا طوق تھا جو وہ میرے گلے میں فٹ کرنا چاہتا تھا۔

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''آپ بڑے شوق سے یہ تصاویر جن کے حوالے کرنا چاہیں کر دیں۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ رہی بات آپ سے تعاون کر کے آپ کا پروموشن بڑھانے کی تو اس کارِ خیر کے لئے مجھ سے جو ہو گا میں کرنے کے لئے تیار ہوں.........اور ہاں.........'' میں نے آخر میں اس کے چہرے سے جھلکتی بے اعتمادی پر ایک اور کاری ضرب لگاتے ہوئے مزید کہا۔

''اشفاق شاہین کے گروہ کے خلاف جو کارروائی ہوئی ہے وہ میری ہی نشاندہی پر کی گئی ہے۔ اور شاید یہ کہ یہ بات بھی آف دی ریکارڈ ہے۔''

میری اس بات پر اسے ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ اس کی آنکھوں سے اُلجھن آمیز تاثرات نمایاں ہوئے۔

میں نے آخر میں پوچھا۔ ''بائی دا وے، میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ یہ تصاویر آپ کو کس ذات شریف نے مہیا کی تھیں؟ ممکن ہے وہی اشفاق شاہین کا ساتھی بھی ہو اور مجھے اس دشمنی کی بنا پر پھنسوانا چاہتا ہو۔''

یہ بات میں نے اس سے اس لئے کی تا کہ وہ سمجھ سکے کہ میرے پاس بھی اپنے دفاع اور صفائی میں کہنے کے لئے بہت کچھ ہے۔

''یہ کانفیڈینشل ہے۔'' اس نے مختصراً کہا۔ میرے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ویسے ایک بات تو ڈن ہے۔'' وہ آخر میں بولا۔ ''کہ اشفاق شاہین نہیں تو کم از کم غفورے کی گرفتاری تم اور تمہاری مظلوم ماں کبھی نہیں چاہیں گے، اس لئے کہ یہ بات صرف میں ہی جانتا ہوں کہ صدف اور ملک سردار خان مرڈر کیس میں غفورا ایک اہم گواہ ہے اور تمہاری اطلاع کے لئے یہ بھی بتا دوں کہ میری اس وقت ساری توجہ غفورے کو گرفتار کرنے پر مرکوز ہو چکی ہے۔ او کے.........''

یہ کہہ کر اس نے میز پر رکھی تصاویر اٹھا کر لفافے میں ڈالیں اور اپنے دونوں سپاہیوں کے ساتھ واپس لوٹ گیا۔

وہ خبیث جاتے جاتے غفورے کے سلسلے میں مجھے ایک گمبھیر پریشانی میں مبتلا کر گیا تھا۔ غفورے کی اہمیت کا اسے بھی خوب اندازہ تھا اور نظر حیات نے اپنی بیٹی صدف کے قتل میں جو الزام میری ماں اور مجھ پر تھوپ رکھا تھا، انسپکٹر شمس انہی خطوط پر اپنی ''مہم'' جاری رکھے ہوئے تھا۔ گویا اندر ہی اندر نظر حیات میرے اور میری ماں کے خلاف گہری سازش تیار کرنے میں مصروف تھا۔

وہ شاید اب اپنے حلیف شاہ میر کے زندہ لاش میں تبدیل ہو جانے کے بعد ہمارے خلاف ''مارا ماری'' کا میدان ترک کر کے انسپکٹر شمس کے ساتھ ساز باز میں لگا ہوا تھا۔ یوں دونوں کی توجہ اب غفورے کی جلد یا بہ دیر گرفتاری پر مرکوز تھی۔ یہ ہمارے لئے ایک تشویش ناک امر تھا۔

رہی بات ان چار پوسٹ کارڈ تصاویر کی، جن میں میری اور اشفاق شاہین کی ملاقاتوں کو دکھایا گیا تھا۔ یہ کس کی حرکت ہو سکتی تھی؟......... اس بارے میں مجھے خاصا غور و فکر کرنا تھا۔ اگرچہ اس بارے میں انسپکٹر اعجاز شمس کو میں نے مدلل جواب سے نواز دیا تھا مگر پھر بھی میں سوچ رہا تھا کہ کم از کم چوہدری ذیشان کو اس سلسلے میں پہلے سے آگاہ کر دوں تا کہ کبھی انسپکٹر شمس ان تصاویر کو میرے خلاف ہتھیار بنا کر استعمال نہ کر سکے۔

اس وقت چوہدری ذیشان ہی وہ واحد شخصیت تھی جو مجھے مکمل طور پر قانونی اور دیگر مسائل میں میرا تحفظ کر رہی تھی۔ چنانچہ یہ سوچ کر میں نے چوہدری ذیشان سے رابطہ کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اچانک میرا موبائل گنگنایا۔ میں نے موبائل نکالا۔ کال انکل اعظم خان کی تھی۔ میں نے فوراً کان سے لگا کر ہیلو کہا۔

''جی انکل!......... میں نادر بول رہا ہوں۔ خیریت تو ہے؟''

دوسری جانب سے انکل اعظم خان کی تشویش ناک آواز اُبھری۔ ''تم نے کچھ سنا؟'' ان کی آواز میں کچھ ایسی بات تھی کہ میرے بدن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔

''نن......... نہیں......... کیا ہوا انکل؟......... خیریت تو ہے نا؟'' مجھ پر یکایک ہی بے چینی سی طاری ہونے لگی تھی۔

''ایم این اے......... چوہدری ذیشان کو کسی نے گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے۔''

دوسری طرف سے انکل اعظم خان نے بتایا۔ اور میں جیسے سن ہو کر رہ گیا.........!



چوہدری ذیشان کی اس طرح ہلاکت کی خبر میرے لئے سراسر غیر متوقع تھی۔ اس اچانک اطلاع نے میری سوچنے سمجھنے کی، کچھ بولنے تک کی صلاحیتیں گویا سلب کر لی تھیں۔ ریسیور میرے کان سے لگا تھا اس میں سے اعظم خان کی آواز اُبھر رہی تھی مگر میری سماعت تک نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ یہ خبر ہی ایسی تھی کہ مضبوط سے مضبوط اعصاب رکھنے والا شخص بھی اس کے صدمے سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ چوہدری ذیشان میرے دشمن کے خلاف میرا بہت بڑا پشت پناہ تھا۔ اس کا اس طرح مارا جانا میرے لئے مشکلات اور مصائب پیدا کر سکتا تھا۔ میں نہ جانے کتنی دیر اس صدمے کی کیفیت میں رہا۔ پھر انکل اعظم کی ہیلو ہیلو نے مجھے گویا جھنجھوڑ کر اس حالت سے باہر نکالا۔

''ہیلو نادر!.........'' وہ دوسری طرف سے پوچھ رہے تھے۔ ''تم ٹھیک تو ہو؟......... تم میری آواز سن رہے ہو؟''

''جی......... جی.........'' میں نے ایک گہرا سانس لے کر انہیں جواب دیا۔ ''میں ٹھیک ہوں۔''

''تمہاری اس طویل اور پراسرار خاموشی نے مجھے تشویش میں ڈال دیا ہے......... کیا بات ہے؟ تم کچھ چھپا تو نہیں رہے؟'' ان کے لہجے میں تشویش کے ساتھ ساتھ تادیب کا عنصر بھی موجود تھا۔

''آپ نے خبر ہی ایسی سنائی ہے کہ میرے حواس میرا ساتھ چھوڑ چلے تھے۔'' میں نے جھینپی جھینپی سی آواز میں جواب دیا۔ ''چوہدری ذیشان سے میرے نہایت قریبی تعلقات استوار ہو چکے تھے۔''

''میں سمجھتا ہوں۔'' انہوں نے کہا۔ ''مگر میں تمہیں اس قدر کمزور اعصاب کا مالک نہیں سمجھتا تھا۔ اس لئے مجھے تشویش ہو رہی ہے۔ اصل معاملہ کیا ہے؟''

''اس کے لئے ضروری ہے کہ میں آپ سے تفصیلی ملاقات کروں۔'' میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری مگر اس سے وہ تر نہ ہو سکے۔ کیونکہ میری زبان بھی خشک ہو رہی تھی۔

''تو اس کے لئے انتظار کس بات کا ہے؟'' انہوں نے فوراً کہا۔ ''تم ابھی آ جاؤ۔ بلکہ ایسا کرو ابھی گھر سے نہ نکلو۔ میں گارڈ بھیج رہا ہوں۔ اس کی ہمراہی میں میری طرف آ جاؤ۔''

''نہیں انکل! گارڈ بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے کچھ سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔ میں درحقیقت انکل اعظم کو نہ صرف انسپکٹر اعجاز شمس کے عزائم کے بارے میں آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ بلکہ میرا خیال تھا کہ اب مجھے ان سے اشفاق شاہین اور غفورے کے مابین تعلق کی تفصیلی بات چیت کر لینی چاہئے تھی۔ غفورے کی گرفتاری عین ممکن تھی۔ نیز مجھے اس بات کا بھی علم تھا کہ چوہدری ذیشان کے اس اندوہناک قتل میں اشفاق شاہین اور غفورے کا ہی ہاتھ ہو سکتا تھا اور اب شاید چوہدری ذیشان کے بعد میں ان دونوں سفاک درندوں کی ہٹ لسٹ پر سب سے پہلے نمبر پر تھا۔ انہی سوچوں کے درمیان میں اٹھا اور اپنی جیپ میں سوار ہو کر انکل اعظم خان کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

ان کی رہائش گاہ میرے ٹال سے زیادہ دور نہ تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے میں، میں انکل اعظم خان کی رہائش گاہ پر جا پہنچا۔ وہ میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ ہم دونوں نشست گاہ میں جا بیٹھے۔ میں نے اشفاق

شاہین سے لے کر ''پھاگل'' والے واقعے اور پھر انسپکٹر اعجاز شمس سے متعلق سارے واقعات تفصیل سے ان کو سنا دیئے۔

انکل اعظم خان نے بڑے غور سے میری باتیں سنی تھیں۔

''اس میں شک نہیں ہے کہ انسپکٹر اعجاز شمس درپردہ نظر حیات کے ٹاسک پر کام کر رہا ہے … پہلے ہی سے ہمارے خلاف ہائر کر لیا گیا ہے۔'' انکل اعظم خان نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''… انسپکٹر شمس جیسی بھیڑوں سے نمٹنا اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس لئے تم اپنی طرف سے اس خبیث کو موقع نہ دینا۔ البتہ اشفاق شاہین اور غفورے کا معاملہ خصا تشویش ناک ہے۔ اس پر ذرا غور کرنا … دونوں قانون کی نظروں میں تو آ چکے ہیں اور اگر واقعی چوہدری ذیشان جیسی بھاری بھرکم شخصیت … میں اشفاق شاہین کا ہی ہاتھ ہے تو.........''

''آف کورس انکل! دونوں کے علاوہ اتنی بڑی جرأت اور کون کر سکتا ہے؟'' میں نے فوراً پُرزور … میں کہا۔

''ہاں۔ میں سمجھ رہا ہوں۔'' انکل اعظم خان نے اپنے سر کو تفہیمی جنبش دیتے ہوئے پُرخیال … میں کہا۔

''لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ ان دونوں خطرناک درندوں کو آخر کہاں تلاش کیا جائے؟''

میں نے جو کہنا تھا، کہہ چکا تھا۔ مجھے جانے کیوں گرین لاج جانے کی بے چینی ہو رہی تھی۔ اور غور کرنے کے لئے حالات بھی موافق تھے، وقت بھی۔ چنانچہ میں نے فوراً اجازت چاہی۔ انکل … خان کو میری جلد واپسی پر حیرت ہوئی۔ ان کا خیال ہوگا کہ میں دیر تک وہاں بیٹھ کر پیش آمدہ و پیش … معاملات پر تفصیلی گفتگو کروں گا۔ تاہم انہوں نے مجھے نہیں روکا۔

چوہدری ذیشان کے اندوہناک قتل کے بعد میری چھٹی حس بہ دستور خطرے کا الارم بجا رہی تھی … مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کچھ ہونے والا ہے۔

حقیقت یہ تھی کہ چوہدری ذیشان نے اشفاق شاہین کے خلاف بڑی مؤثر کارروائی کی تھی اور اس … گھناؤنے کاروبار میں ملوث ہونے کے وہ تمام ثبوت حاصل کر لئے تھے جو اس کو قرار واقعی سزا … کے لئے کلیدی کردار ادا کر سکتے تھے۔ اس کام کے لئے وہ بقول خود نجانے کتنے عرصے سے تگ و دو … مصروف کار تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے ہی اشفاق جیسے گاڈ فادر گینگسٹر سے ٹکر لی تھی اور اس … میں ان پر پھاگل کے ویران برف زاروں میں قاتلانہ حملہ بھی ہوا تھا۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ عین … پر یہ سازش مجھ پر ''سرائے سیاں'' میں اچانک ہی آشکار ہو گئی تھی اور یوں میری مداخلت کے باعث … بال بال بچے اور اشفاق شاہین کے جو کارندے میرے ہاتھوں زخمی ہو کر حوالۂ پولیس ہوئے تھے انہیں … میں چوہدری ذیشان ہی کے حکم پر اسپیشل پولیس کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ بعد میں ان سے ضروری کڑی … تاچھ کے فوراً بعد ہی اشفاق شاہین کے خلاف مؤثر اور کامیاب کارروائی کی گئی تھی لیکن ابھی چوہدری … کا مشن ادھورا ہی تھا کہ اشفاق شاہین اور غفورا نہ صرف راہِ فرار اختیار کرنے میں کامیاب ہو چکے … انہوں نے پلٹ کر وار کرنے میں تاخیر نہیں کی تھی اور وار بھی ایسا جس کے باعث چوہدری ذیشان … جان سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔

یہ جاننے والے میرے علاوہ صرف دو ہی افراد تھے جنہیں اس حقیقت کا ادراک تھا کہ اشفاق … جیسے بڑے گینگسٹر کے خلاف چوہدری ذیشان کی کامیاب مہم میں میرا ہی ہاتھ تھا۔ ایک چوہدری ذیشان …

… اشفاق شاہین۔

اور اب......... میں بھی ان ہی دونوں کی ہٹ لسٹ پر تھا۔ ممکن ہے مقتول چوہدری ذیشان کی طرح میرے خلاف بھی کوئی جان لیوا منصوبہ تیار کر چکے ہوتے۔ نظر حیات جیسے دشمن کے معاملے میں تو … کا کھیل کھیلا جا سکتا تھا مگر اشفاق شاہین اور غفورے کے سلسلے میں ایسا کرنا صریحاً اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا۔ وہ دونوں اس وقت میرے لئے زخمی درندے بنے ہوئے تھے اور کسی بھی وقت … چوہدری ذیشان کی طرح مجھے بھی چیر پھاڑ کھانے کے لئے بے چین تھے۔

اب حالات تخت یا تختہ جیسی صورت اختیار کر چکے تھے۔ ہم دونوں میں سے جس کا داؤ چل جاتا وہ دوسرے کو موت کے گھاٹ اتارنے میں لمحہ بھر کی دیر نہ کرتا۔ میں بظاہر خاموشی سے ڈرائیونگ میں مصروف تھا مگر اندر میرے زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی۔

اچانک موبائل کی بیل گنگنائی۔ میں نے حسب عادت موبائل کی اسکرین پر دیکھا اور چونک پڑا۔ وہ ماں کی کال تھی۔

''ہیلو......... ماں! کیا بات ہے؟''

''تم کہاں ہو؟......... خیریت تو ہے نا؟'' دوسری جانب سے ماں کی فکرمند آواز اُبھری۔

''ہاں ماں!......... میں بالکل ٹھیک ہوں اور گھر ہی آ رہا ہوں......... مگر.........''

''اللہ تمہیں خیریت سے پہنچائے۔'' ماں نے بے اختیار دعائیہ لہجے میں کہا۔ میرے دل میں کھٹک سی پیدا ہوئی اور فوراً ہی مضطربانہ بے چینی سے بولا۔

''کیا بات ہے ماں!......... تُو پریشان ہے؟''

''میں نے گرین لاج کے باہر کچھ مشتبہ لوگوں کو دیکھا ہے۔'' ماں نے گویا بادل ناخواستہ مجھے آگاہ کیا اور ایکا ایکی میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہونے لگی۔

''کتنی دور ہیں وہ؟......... اور تعداد میں کتنے ہیں؟'' میں نے تیزی کے ساتھ دھڑکتے دل سے دریافت کیا۔

''میں اس وقت بالائی منزل کے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی ہوں۔ فی الحال تو مجھے تین ہی نظر آئے ہیں۔'' ماں بتانے لگیں۔

''ارے......... ایک قریب آ رہا ہے۔'' ماں نے آخر میں اچانک چونک کر کہا۔ میرا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ اس کے بعد ماں نے بھی رابطہ منقطع کر دیا۔ میں نے فوراً موبائل جیب میں رکھا اور جیپ کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔

صنوبر اور چیڑ کے گھنے درختوں کے درمیان بل کھاتی سڑک پر میری جیپ آندھی طوفان کی طرح دوڑنے لگی۔ میرے پورے وجود میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ میری نظروں کے سامنے بار بار ان دونوں زخمی درندوں اشفاق شاہین اور غفورے کے بھیانک اور مکروہ چہرے گردش کر رہے تھے۔ دل و دماغ وسوسوں کی زد میں تھے۔ بل کھاتی سڑک پر اس قدر تیز رفتار ڈرائیونگ میرے لئے خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ مگر میں نے پوری مہارت کے ساتھ اسٹیئرنگ سنبھال رکھا تھا۔ ایک قدرے تنگ سے موڑ پر تو شکر تھا کہ میں نے بروقت بے قابو ہوتی جیپ کو سنبھال لیا تھا ورنہ جیپ دائیں جانب بنی اندھی کھائی میں لڑھک چکی ہوتی۔

میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اڑ کر گرین لاج جا پہنچوں۔ اگرچہ اب گرین لاج کا فاصلہ کم ہی رہ

گیا تھا لیکن میں نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالا اور موبائل نکال کر ماں سے رابطہ کرنا چاہا مگر پھر ایک خیال ذہن میں ابھرتے ہی میں نے ارادہ بدل دیا۔ ممکن تھا کہ ماں کسی گوشے میں چھپی بیٹھی ہو میری کال پر اس کا گنگناتا موبائل خطرے کا الارم نہ بن جائے۔ چنانچہ موبائل دوبارہ جیب میں رکھنے کے بعد میں نے اب اپنی ساری توجہ جیپ دوڑانے پر مرکوز کر دی تھی۔ میرے اعصاب تن کر اب بوجھل ہونے لگے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی بڑی قیامت آنے والی ہو۔

بالآخر ذرا دور سے مجھے کاہو اور چیڑ کے درختوں کے جھنڈ سے گرین لاج کی سبز چوبی عمارت نظر آنے لگی اور پھر ذرا ہی دیر بعد جب میں گرین لاج کے قدرے قریب پہنچا تو اچانک میری سماعتوں میں گولیاں چلنے کے بیک وقت تین دھماکے گونجے۔

میرے اندر مچی ہوئی ہلچل میں یکدم ہی اضافہ ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے میں نے گرین لاج کے قریب پہنچ کر جیپ کو گیٹ کے سامنے بریک لگائے۔ جیپ کے ٹائر پختہ ڈرائیو وے پر زور سے چرچرائے اور وہ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ میں نے اپنی جیب سے میگارڈ نکالا اور بہ سرعت دروازہ کھول کر باہر اتر آیا اور محتاط مگر تیز نظروں کے ساتھ گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔ ہر سو خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ سہ پہر ڈھل چلی تھی اور دور کہیں مغربی پہاڑی چوٹیوں کے پیچھے سورج کی گیند لڑھک رہی تھی۔

آسمان پر غروب ہوتے سورج کی سرخ تمازت خوب صورت شام کا منظر پیش کر رہی تھی۔ گیٹ پر متعین کردہ دونوں مسلح گارڈز بھی غائب تھے۔

ابھی میں گرین لاج میں داخل ہونے کا ارادہ کرنے ہی والا تھا کہ اچانک میری واپس پلٹتی نظروں نے بائیں جانب ذرا ڈھلوانی سمت پر دو گن بردار آدمیوں کو اُبھرتے دیکھا۔ میں ذرا ٹھٹکا۔ مگر دوسرے لمحے ان دونوں کو پہچان کر میں نے بے اختیار گہری سانس لی اور فوراً ان کی طرف دوڑا۔ وہ دونوں گرین لاج پر متعین مسلح گارڈز تھے۔ ان کے قریب پہنچ کر میں نے ہانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''کیا ہوا؟......ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے گولیاں چلنے کی آواز سنی تھی۔''

ایک نے جواباً کہا۔ ''بیگم صاحبہ کے حکم پر ہم ان تین مشتبہ افراد کے پیچھے لپکے تھے۔ گولیاں انہوں نے ہی چلائی تھیں مگر پھر ہماری جوابی فائرنگ پر وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔''

''کس طرف گئے ہیں وہ؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

دوسرے نے جنوبی سمت کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہیں چیڑ کے جنگل میں ہم نے ان تینوں کو غائب ہوتے دیکھا ہے۔''

''ماں تو ٹھیک ہیں نا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں......وہ بالکل ٹھیک ہیں۔'' پہلے والے نے اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ میں تیزی کے ساتھ گرین لاج کے بڑے سے محراب نما داخلی دروازے کی جانب پلٹا ہی تھا کہ مجھے ماں دکھائی دیں۔ میں دوڑ کر ان کے قریب پہنچا۔

''ماں! تو ٹھیک ہے نا؟'' میں نے اسے دونوں شانوں سے تھام کر پوچھا۔

''ہاں بیٹا!......میں ٹھیک ہوں۔ مگر......''

''میں ابھی آتا ہوں ماں!'' یہ کہہ کر میں تیزی کے ساتھ اپنی جیپ کی طرف پلٹا اور اسٹارٹ کر کے تھوڑا سا ریورس کیا اور تیزی سے گیئر بدل کر دوسری سمت موڑ کاٹا اور ایکسیلیٹر دبا دیا۔ میری طاقتور فور وہیل پوٹھوہار کمان سے نکلے تیر کی طرح نکلی اور مختصر سے ڈرائیو وے پر فراٹے بھرتی ہوئی سڑک پر

میں سڑک کی جانب رخ کرنے کی بجائے اس سمت گیا جہاں گارڈز نے ان تینوں مشتبہ افراد کو راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے اوجھل ہوتے دیکھا تھا۔

میں صنوبر اور کاہو کے درختوں کے درمیان خلا سے اپنی جیپ کو زگ زیگ انداز میں دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ شام ابھی پوری طرح سے گہری نہیں ہوئی تھی۔ ڈوبتے سورج کی کندنی کرنیں چھتنار پیڑوں سے چھن کر برچھیوں کی طرح خود رو جھاڑیوں میں پیوست ہو رہی تھیں۔ ان تینوں مشتبہ افراد کی تلاش میں سرسری طور پر یوں نکلنا بے شک ایک اندھا جوا کھیلنے کے مترادف سہی لیکن میں ایک یہ بھی محتاط اندازہ رکھتا تھا کہ ان تینوں مشتبہ افراد کی راہ گزر یہی ہو سکتی تھی بشرطیکہ ذرا آگے جا کر وہ اپنی کہیں قریب کھڑی گاڑی میں سوار نہ ہو جاتے۔ کیونکہ وہ یقیناً گاڑی میں ہی یہاں تک آئے ہوں گے اور اسے کہیں قریب کھڑا کرنے کے بعد پیدل ہی آگے بڑھے ہوں گے۔ مجھے اپنے اندازے کی درستی کا پورا یقین تھا۔

یہی سبب تھا کہ میں نے ابھی جنگل سے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ اچانک مجھے اس بل کھاتے راستے پر خاصی دور اونچے پیڑوں کے درمیان جیپ نما گاڑی حرکت کرتی نظر آ گئی۔ جسے دیکھتے ہی میرا سینہ جوش سے تن گیا اور پھر میں یکلخت ہی بائیں جانب موڑ کاٹ کر پوری رفتار کے ساتھ جیپ دوڑانے لگا۔

اس ویران اور آبادی سے دور، سنسان جنگل میں بروقت کسی گاڑی کا نظر آنا اس امر کی دلیل تھی کہ ابھی ذرا دیر پہلے ہی گرین لاج کے گرد منڈلاتے ہوئے تینوں مشتبہ افراد اس گاڑی میں ناکام و نامراد راہِ فرار اختیار کئے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے ٹکر لینے کا پختہ عزم کر رکھا تھا۔

میں اب ایک شارٹ کٹ راستہ اپنا کر ان کا راستہ کھوٹا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اُبھرا۔ میں نے ان سے درّانہ وار بھڑنے کا ارادہ بدل کر ان کا تعاقب کرنے کی ٹھانی۔ چنانچہ اب میں ان کا بڑی ہوشیاری اور احتیاط کے ساتھ پیچھا کرنے لگا۔ یوں کہ انہیں اپنے تعاقب کا احساس بھی نہ ہو سکے۔ ان کی گاڑی مجھے نظر آ رہی تھی۔

جنگل سے نکل کر گاڑی ایبٹ آباد جانے والی سڑک پر آ گئی۔ میں نے بھی اپنی جیپ اس سمت موڑ دی۔ آگے جا کر اس سڑک سے تین اور سڑکیں بھی نکلتی تھیں۔ ایک تو مری واپس جاتی تھی جبکہ باقی دو ہری پور ہزارہ اور کھرپار کی طرف جاتی تھیں۔ اس وقت ہم ہزارہ ڈویژن میں داخل ہو چکے تھے۔

اچانک ان کی گاڑی ہری پور جانے والی سڑک پر مڑ گئی۔ یہ ممکن تھا کہ انہیں اپنے تعاقب کا احساس نہیں تو خدشہ ضرور ہو سکتا تھا اس لئے میں نے چند دوسری آنے جانے والی گاڑیوں کے عقب میں ہی اپنی جیپ کو رکھنے کی کوشش کی تھی تاکہ ان کی نظروں میں نہ آ سکوں۔ یوں بھی ان کے سان گمان میں بھی نہ ہوگا کہ میں اس طرح ان کے پیچھے آ سکتا ہوں۔

اس وقت بھی میں نے اپنی جیپ کو ایک تیز رفتار ہائی ایس ویگن اور لگژری مسافر کوچ کے عقب میں رکھا ہوا تھا۔ مشتبہ افراد کی گاڑی لینڈ کروزر ٹائپ کی لمبی سی، پرانے ماڈل کی جیپ ہی تھی جو اب درمیانی رفتار سے دوڑے جا رہی تھی۔ ہری پور جانے والی سڑک کے دونوں جانب سرسبز ڈھلوانوں پر کچے پکے مکانوں کی بے ترتیب قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ اچانک ایک مقام پر میں نے دیکھا کہ گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی اور بالآخر وہ سڑک کے کنارے رک گئی۔ میں نے بھی فوراً ہی اپنی جیپ سڑک کے بائیں جانب درختوں کے جھنڈ میں روک لی اور پھر بجلی کی سی سرعت سے دروازہ کھول کر نیچے اترا اور تیزی کے ساتھ خود رو جھاڑیوں اور درختوں کی آڑ لیتا ہوا گاڑی کی جانب بڑھنے لگا۔

میں ان کے قریب پہنچ کر ان کی صورتیں پہچاننا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں چھپتا چھپاتا ان کی گاڑی کے بالآخر قریب پہنچ گیا تاکہ بہ آسانی ان کے چہرے دیکھ سکوں۔ ان کی تعداد تین ہی تھی۔ لہٰذا اس بات کی تصدیق تو ہو ہی گئی تھی کہ میں نے درست آدمیوں کا تعاقب کیا تھا۔ میں بہ غور انہیں پہچاننے کی کوشش کرنے لگا تو دو افراد کو میں نے اجنبی ہی پایا تھا۔ ان میں سے ایک گاڑی کا بونٹ کھولے اس پر جھکا ہوا تھا۔ شاید ان کی گاڑی میں کوئی خرابی واقع ہو گئی تھی۔ البتہ تیسرا شخص دوسری جانب منہ کئے کھڑا تھا۔ نہ دیکھنے کے باوجود میں نے اس کے ڈیل ڈول سے ہی اندازہ لگانے کی کوشش کی تھی، وہی میرا اصل ہدف غفورا تھا۔ اور پھر اگلے ہی لمحے اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ اس نے گرد و پیش کا جائزہ لینے کے بعد اپنی جیب سے موبائل سیٹ نکالا اور میری جانب مڑ کر کسی سے رابطہ کرنے لگا تو یکلخت میرے پورے وجود میں سنسنی پھیل گئی۔ وہ غفورا ہی تھا۔ میں تھوڑا اور قریب ہو گیا تاکہ اس کی موبائل پر گفتگو سن سکوں۔

''چیف!......... کیا آپ کا موبائل آف تھا؟......... میں آپ سے کافی دیر سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔'' رابطہ ہوتے ہی وہ مؤدبانہ بولا۔

''چیف! میں آپ کو بتانا چاہ رہا تھا کہ ہمیں کامیابی نہیں ہو سکی۔ ہم نادر علی کی ماں کو اغواء کرنے میں ناکام رہے ہیں عین وقت پر نہ جانے کس طرح ہم نظروں میں آ گئے اور ان کے گارڈز نے ہم پر حملہ کر دیا۔ شاید نادر علی بھی گرین لاج کے اندر ہی موجود تھا۔ اس نے بھی بالائی منزل سے ہم پر فائر کر ڈالے تھے۔ ہماری مہم خفیہ نہ رہ سکی۔ اور آپ کو تو حالات کا علم ہی ہے۔ وہ وقت جم کر مقابلہ کرنے کا یا زبردستی کرنے کا نہ تھا اس لئے.........''

دوسری جانب سے بات کاٹی گئی تھی۔ شاید اس کا چیف جو یقیناً اشفاق شاہین ہی ہو سکتا تھا، اسے گالیاں دے رہا تھا۔ کیونکہ غفورے کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہو چکے تھے۔

''جج......... جی چیف! ہم واپس ہی لوٹ رہے ہیں۔ بس ہم ابھی تھوڑی دیر میں پہنچنے والے ہیں۔ او کے چیف! ہم آ رہے ہیں۔ نہیں، نہیں......... آپ بے فکر رہیں، ہمارا کسی نے تعاقب نہیں کیا۔ ویسے چیف! اگر آپ حکم کریں تو میں جیدے اور بشیرے کو آپ کی طرف روانہ کر کے خود اکیلا ہی دوبارہ گرین لاج جا کر صرف نادر کو ہی گولی مار دوں، جس طرح چوہدری ذیشان کو میں نے اپنی گولی کا نشانہ بنایا تھا؟......... ٹھیک ہے چیف! جیسے آپ کی مرضی......... میں بھی واپس پہنچ رہا ہوں۔''

یہ کہہ کر اس نے موبائل آف کر کے جیب میں رکھا اور بونٹ پر جھکے ہوئے اپنے ساتھی سے بولا۔

''جیدے! کیا بڑی خرابی پیدا ہو گئی ہے جو اب تک ٹھیک نہیں ہوئی؟'' وہ اپنے ساتھی سے مخاطب تھا۔ اور میرا دماغ اس کی اشفاق شاہین سے ہونے والی گفتگو پر اس بری طرح سائیں سائیں کر رہا تھا مجھے اپنا لہو جلتی سلگتی کنپٹیوں پر اچھال مارتا محسوس ہونے لگا۔ گویا یہ بات میرے سامنے آشکارا ہو چکی کہ چوہدری ذیشان کو خبیث غفورے نے ہی قتل کیا تھا اور اب یہ لوگ اشفاق شاہین کے خفیہ ٹھکانے کی جانب جا رہے تھے۔ گویا اب میرا اشفاق شاہین اور غفورے سے فیصلہ کن ٹکر لینے کا وقت بہت قریب آ پہنچا تھا۔

❋❋❋

ذرا دیر بعد گاڑی کی خرابی دور کر لی گئی۔ میں تیزی کے ساتھ واپس پلٹا اور اپنی جیپ کے قریب پہنچا۔ غفورے کی گاڑی آگے روانہ ہو گئی۔ میں بھی تیزی سے اپنی جیپ میں سوار ہوا اور آگے بڑھ گیا۔ صورتِ حال اب کافی حد تک واضح ہو چکی تھی۔ اگر غفورے کے ساتھ صرف ملک سردار خان والا معاملہ ہوتا تو یقیناً میں اسی وقت اسپیشل پولیس فورس کو انفارم کر دیتا۔ مگر میں ایسا نہ کر سکا۔ اس

انسپکٹر اعجاز شمس کا ہم ماں بیٹے سے نظریات کے حوالے سے ذاتی عناد تھا۔

چنانچہ یہی سبب تھا کہ دیگر خونی اور سنسنی خیز معرکوں کی طرح یہ معرکہ بھی مجھے مارنا تھا۔ اشفاق شاہین اور غفورا دونوں ناقابل معافی مجرم تھے۔ تقدیر اس وقت میرا بھرپور انداز میں ساتھ دے رہی تھی۔ اگرچہ اس کے پیچھے میری تدبیر کا بھی ہاتھ تھا۔ میں اس وقت نہ صرف غفورے کے بلکہ اشفاق شاہین کے ٹھکانے سے بھی واقف ہونے والا تھا۔ کیونکہ میں بروقت ہوشیاری اور حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے فوراً ہی ان کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا تھا اور یوں اشفاق شاہین اور غفورے کے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ ان دونوں نے ہم ماں بیٹے کے خلاف جو گھناؤنی سازش تیار کی تھی، اب انہی پر الٹنے والی تھی۔ اب میرے لئے اور بھی ضروری ہو گیا تھا کہ میں ان کے اصل ٹھکانے تک پہنچنے کے لئے نہایت احتیاط کے ساتھ ان تینوں کا تعاقب جاری رکھوں۔ ورنہ میری ساری محنت اکارت چلی جاتی۔

ہری پور ہزارہ جانے والی یہ سڑک خاصی طویل تھی اور انہیں اپنے تعاقب کا پتہ نہ چلنے کا ایک سبب یہ تھا کہ سڑک بل کھاتی ہوئی تھی۔ تقریباً کوئی پندرہ بیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک چھوٹے سے دیہاتی علاقائی گاؤں کے آثار نمودار ہونا شروع ہوئے تو گاڑی نے اس جانب ہی موڑ کاٹا۔ گاؤں کی آبادی زیادہ نہ تھی اور نہ ہی یہ کوئی بڑا گاؤں تھا۔ سڑک سے ہٹ کر ایک کچا اور ناپختہ راستہ وہاں تک جاتا تھا۔ دور دور یہ قد آدم خود رو جھاڑیوں کے علاوہ کریر کے ٹھگنے چھتنار درختوں کا بھی سلسلہ ساتھ ساتھ دور تک پھیلا ہوا تھا۔

گاڑی کبھی آنکھوں سے اوجھل ہو رہی تھی تو کبھی نمودار ہوتی تیزی کے ساتھ ہچکولے کھاتی ہوئی آگے بڑھی جا رہی تھی۔ میرا خیال تھا ان لوگوں کا ٹھکانا اس گاؤں میں کہیں ہوگا۔ مگر میرا خیال غلط تھا۔ ان کی جیپ گاؤں کے برابر سے گزرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ آگے کا سارا علاقہ کاہو اور جنگل جلیبی کے درختوں سے اٹا پڑا تھا۔ گاڑی اس جنگل میں داخل ہوئی۔ میری نظریں آس پاس کے علاقے کا بغور جائزہ لے رہی تھیں کہ اچانک ہی مجھے ایک گول گنبد نما عمارت کی جھلک سی نظر آئی۔ پھر میں نے جیسے ہی دیکھا کہ گاڑی اس عمارت کے سامنے پہنچ کر رک چکی ہے تو میں نے بھی ذرا دور ہی اپنی جیپ روک دی اور نیچے اتر آیا۔

اس کے بعد میں قد آدم جھاڑیوں کی آڑ کا فائدہ اٹھاتا ہوا جھکا جھکا تیزی کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے اس عمارت کے بالکل نزدیک جا پہنچا۔

قریب پہنچنے پر پتہ چلا کہ وہ کوئی سرائے ٹائپ کی عمارت تھی۔ مگر اس کی خستہ حالی اور کہنہ سالی سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے یہاں رہنا تو ایک طرف، ذرا دیر کو رکنا بھی شاید ہی گوارا کیا ہوگا۔ عمارت کی چھت ڈھلوانی تھی۔ رقبہ بھی کچھ ایسا زیادہ نہیں تھا۔ زیادہ تر کام لکڑی ہی کا نظر آتا تھا۔ یہ دو منزلہ عمارت تھی۔ پہلی اور دوسری منزل کی طویل گیلری کے ساتھ کمروں کے دروازے اور چوبارے نظر آ رہے تھے جہاں کہنہ سالی اور سال خوردگی چپکی ہوئی تھی۔ محرابی دریچوں کے پٹ ٹوٹ، کر اکھڑ گئے تھے اور بغیر ڈیلوں والی آنکھوں کی طرح تاریک اور ہولناک نظر آ رہے تھے۔ بڑی ہی پراسرار عمارت تھی۔ جس میں بھی اسرار بھری خاموشی کا راج تھا۔

گاڑی عمارت کے احاطے میں داخل ہو کر بیرونی دروازے کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ تینوں گاڑی سے نیچے اترے اور اندر داخل ہو گئے۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے بھی ان کے جانے کے بعد دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی تیزی کے ساتھ حرکت کی تھی اور نہایت محتاط تیز رفتاری سے

چلتا ہوا دروازے پر پہنچا۔ اندر مدھم سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں نے دروازے کے قریب پہنچ کر جھانکا۔ یہ ہال نما کمرہ تھا۔ چار پانچ ٹوٹی پھوٹی جھلنگا سی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دیواروں کا پلستر جگہ جگہ سے اُکھڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ایک جانب آتش دان بنا ہوا تھا جو سرد تھا۔ دو تین کرسیاں اور ایک سی میز بھی دھری تھی۔ روشنی بائیں جانب کے کسی کھلے کمرے سے آتی محسوس ہو رہی تھی، جس پر ابھی میری نظر نہیں پڑی تھی۔

غفورے اور اس کے دونوں ساتھیوں نے اندر داخل ہوتے ہی شاید کمرے کا رخ کیا تھا۔ کیونکہ وہ تینوں نظر نہیں آ رہے تھے۔ تاہم ذرا غور کرنے پر مجھے اس سمت سے باتوں کی گونج سنائی دی مگر سمجھ نہیں آ سکے تھے۔ یہ تسلی ہوتے ہی کہ اب ہال میں کوئی نہ تھا، میں داخلی دروازے سے آگے بڑھ کر اندر داخل ہوا اور مذکورہ سمت کی طرف سر ابھار کر دیکھا تو اسی وقت میری گردن سے ایک سرد نال لگی اور ساتھ ہی ایک درشت آواز عقب سے اُبھری۔

''خبردار!.........کوئی غلط حرکت مت کرنا.........ورنہ گولی چلا دوں گا۔''

❄❄❄

میرے پورے وجود میں کاٹ دار سنسناہٹ دوڑ گئی۔ عین لب بام پر مجھے اپنی ساری محنت اکارت جاتی محسوس ہوئی تھی۔ پھر دوسرے ہی لمحے میرے اندر کے جنگجو اور ایتھلیٹ انسان نے چلّا کر کہا۔

'نادر! یہی تو وقت ہے دشمن پر شب خون مارنے کا'۔

دوسرے ہی لمحے میں نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ جھکائی دی اور گن پوائنٹ سے ''آؤٹ'' ہوتے ہی میں نے اپنے دائیں بازو کی کہنی بھرپور قوت کے ساتھ اپنے مدمقابل کے پیٹ پر رسید کر دی۔ اس کے حلق سے بے اختیار اوغ کی گھٹی گھٹی آواز خارج ہوئی مگر ساتھ ہی اس بدبخت نے دانستہ یا غیر ارادی طور پر پستول بھی چلا دیا۔

پُرہول سناٹے میں گولی چلنے کے دھماکے کی آواز جنگل میں بہت دور تک گونجی تھی۔ میں چونکہ پھرتی سے کام لے کر گن پوائنٹ سے دور ہو چکا تھا اس لئے گولی کی بھیانک قربت سے محفوظ رہا۔ اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ گولی چلنے کے دھماکے نے اندر موجود افراد کو یقیناً چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب جو بھی کرنا تھا نہایت پھرتی اور چابک دستی کے ساتھ کرنا تھا۔

میری کہنی کی بھرپور ضرب مدمقابل کے پیٹ پر پڑنے کی وجہ سے وہ بے اختیار اپنا پیٹ پکڑ کے بل جھک گیا تھا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا ذرا بھی موقع دیئے بغیر گھٹنے کی ضرب اس کی ناک پر دی اور ساتھ ہی اس کے پستول والے ہاتھ کی کلائی پر بھی کراٹے والے انداز میں ہاتھ رسید کر دیا۔

وہ دہری تہری تکلیف کے باعث ڈھے سا گیا۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکلتے ہی میرے ایک پر وہ جھاڑیوں میں جا گرا۔ آخری بھرپور ضرب میں نے اپنی لات کی اس کے پیٹ اور ناف کے نازک ترین مقام پر جڑ کر اسے ڈھیر کر دیا۔ میری یہ کارروائی لمحوں میں مکمل ہو گئی تھی اس لئے جیسے ہی سرائے کے ہال میں دوڑتے قدموں کی گونجیلی آواز سنائی دی، میں پھرتی کے ساتھ قد آدم جھاڑیوں اندر رینگ کر اس سال خوردہ عمارت کی جنوبی دیوار کی آڑ میں آ گیا اور اپنی نظریں دروازے پر گاڑ دیں۔

مجھے غفورے سمیت اس کے وہی دونوں ساتھی نظر آئے جن کے تعاقب میں تھوڑی دیر پہلے یہاں تک پہنچا تھا۔ ان تینوں کے ہاتھوں میں پستول نظر آ رہے تھے۔

پھر شاید غفورے کی نگاہ اپنے زمین بوس ساتھی پر پڑی تھی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اسے

ساتھیوں سے جلدی جلدی کچھ کہتے سنا اور پھر یکدم واپس پلٹا۔ باقی اس کے دونوں ساتھی باہر نکل کر نہایت محتاط انداز میں گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے دائیں بائیں کی جھاڑیوں کی سمت تیزی کے ساتھ بڑھے تھے۔

مجھے غفورے کے اچانک پلٹنے پر اچنبھا ہوا تھا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ ممکن تھا سرائے کے عقبی حصے کی طرف بھی کوئی دروازہ ہو اور غفورا اسی جانب سے باہر نکل کر مجھے عقب سے گھیرنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ میں بھی بہ سرعت سرائے کی عقبی دیوار کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے عقب میں سرکا۔ مگر دوسری سمت پہنچ کر میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ سرائے کی عقبی دیوار سپاٹ تھی۔ یعنی وہاں کوئی دروازہ نہ تھا۔ تب پھر اچانک غیر اختیاری طور پر میری نظریں بالائی منزل پر اٹھیں۔ میرے وجود میں سنسنی دوڑ گئی۔ اگر میں بروقت اور بہ سرعت اپنی جگہ تبدیل نہ کرتا تو پہلی منزل کی سال خوردہ بالکونی پر کھڑے اپنی پستول سے میرا نشانہ باندھے غفورے کی چلائی ہوئی گولی کی زد میں ضرور آ جاتا۔ چنانچہ جونہی میں نے اپنی جگہ چھوڑی، اسی لمحے غفورے نے بھی مجھ پر گولی چلا دی تھی۔ عین وقت پر جگہ تبدیل کرتے ہی میں نے بھی پھرتی کے ساتھ اپنی جیب سے میگارد نکال کر اس پر فائر کر دیا۔ میرے نیلگوں میگارد کی طاقتور گولی غفورے کی بجائے بالکونی کی کھڑکی میں پیوست ہو گئی۔ غفورے نے اوپر تلے مجھ پر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ میرے لئے بھی جوابی فائرنگ ضروری تھی۔ مگر میں نے دانستہ ایسا نہیں کیا اور تیزی سے قد آدم جھاڑیوں میں رینگ کر قدرے دور چلا گیا۔

شام کے سائے دراز ہو کر اندھیرے میں بدلنے لگے تھے۔ تاریکی کا فائدہ اٹھانا میں خوب جانتا تھا۔ اچانک مجھے اپنی داہنی جانب جھاڑیوں میں سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ میں میگارد کی نال کا رخ مذکورہ سمت کر کے سانس روکے دبک گیا۔ اچانک روشنی ہوئی۔ میں لمحے بھر کو ٹھٹکا۔ یہ ٹارچ کی روشنی تھی جو دو مختلف سمتوں سے آ رہی تھی۔ ایک سامنے کی جھاڑیوں سے، دوسری بائیں جانب سے۔ یہ دونوں غفورے کے ساتھی ہی ہو سکتے تھے۔

میں غفورے کی نظروں میں آ چکا تھا۔ میں نے بالکونی کی طرف بھی دیکھا تھا، وہ اب وہاں موجود نہ تھا۔ گویا وہ یہ جاننے کے لئے ہی بلندی پر آیا تھا کہ دیکھ سکے، حملہ آور کون تھے اور کتنے تھے؟ اب صرف مجھ اکیلے کو دیکھ کر وہ نئے عزم کے ساتھ دوبارہ نیچے آ کر مجھ سے نمٹنا چاہتا تھا۔

ٹھیک اسی وقت میں نے سامنے کی جھاڑیوں سے ایک ہیولے کو ابھرتے دیکھا۔ میں نے پھرتی کے ساتھ اس کے ٹارچ والے ہاتھ پر گولی چلائی۔ ایک کریہہ چیخ اُبھری اور ٹارچ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر جھاڑیوں میں جا گری۔ دوسری سمت سے اُبھرنے والی روشنی نے حرکت کی اور میں نے اسی وقت تیزی کے ساتھ اپنی جگہ تبدیل کر ڈالی۔ میں نے اس سمت پر گولی چلا دی۔ میں جھاڑیوں کی اوٹ لیتے ہوئے ایک بار پھر متروک سرائے کی عمارت کی جانب پیش قدمی کرنے لگا اور ٹھیک اس لمحے میں بری طرح ٹھٹکا۔ میں نے اشفاق شاہین اور غفورے کو تیزی کے ساتھ گاڑی میں سوار ہوتے دیکھا۔ میری رگوں میں یکلخت خون کی گردش تیز ہو گئی۔ میرے لئے یہ ان کی غیر متوقع حرکت تھی۔ وہ دونوں فرار ہو رہے تھے۔

مگر کیوں.........؟ میں نے جیپ میں سوار ہوتے وقت اشفاق شاہین کے ہاتھ میں ایک بریف کیس بھی دیکھا تھا۔ میرے دماغ میں الجھا ہوا سوال اُبھرا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جب غفورے نے مجھے یہاں تنہا دیکھ بھی لیا تھا تو اسے اشفاق شاہین کے ساتھ اس قدر جلدی یہاں سے فرار ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ انہیں تو میرے مقابلے پر اتر آنا چاہئے تھا۔

کیا انہیں کہیں پہنچنے کی جلدی تھی؟.........مگر کہاں؟

ٹھیک اسی وقت جیپ اسٹارٹ ہوئی اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھی۔ ایکا ایکی میرے پورے وجود میں بجلی سی دوڑ گئی۔ میں بھی پلٹا اور اس سمت پر بے درنگ دوڑنا شروع کر دیا جدھر میری جیپ کھڑی تھی۔

میں جب تک اپنی جیپ کے نزدیک پہنچا، ان کی گاڑی آگے نکل چکی تھی۔ میں نے پھرتی کے ساتھ اپنی جیپ کا دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی جیپ آگے بڑھا دی۔

راستہ بل کھاتا ہوا اور ناہموار تھا۔ دونوں گاڑیاں زبردست ہچکولے کھاتی ہوئی آگے پیچھے دوڑی جا رہی تھیں۔ تاریکی کے باعث میں نے اپنی جیپ کی ہیڈ لائٹس روشن کر رکھی تھیں۔ یقیناً اشفاق شاہین اور غفورے کو بھی اپنے تعاقب کا احساس تھا۔ یہی سبب تھا کہ اب وہ دونوں بھی اپنی توجہ راہِ فرار اختیار کرنے پر مرکوز کئے ہوئے تھے۔ اس طرح مجھ سے مقابلہ کئے بغیر راہِ فرار اختیار کرنے پر مجھے سخت حیرت تھی۔ ان کے لئے تو یہ سنہری موقع تھا کہ وہ مجھے تنہا دیکھ کر اپنے ارمان پورے کر سکتے تھے۔ میں اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔

کہیں یہ دونوں مردود ملک سے ہی تو کوچ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے؟......... اور اس وقت اُنہیں شاید ایئر پورٹ پہنچنے کی جلدی ہو؟

مگر پھر میں نے اُلجھے ہوئے ذہن سے سوچا کہ بھلا اس طرح مجھے اپنے پیچھے لگا کر یہ یوں فرار ہونے کا ارادہ کیسے کر سکتے تھے؟......... میں پولیس کو بھی ان کے بارے میں مطلع کر سکتا تھا۔ یا پھر ممکن تھا کہ غفورے کی طرح اشفاق شاہین بھی جانتا تھا کہ میں کم از کم پولیس کو انفارم کرنے کی ''غلطی'' کبھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اشفاق شاہین کے سلسلے میں تو یہ ہو سکتا تھا۔ لیکن غفورا اس کے ساتھ تھا لہٰذا یہ ناممکن تھا۔ کیونکہ لامحالہ وہ بھی پولیس کی گرفت میں آ جاتا اور یوں غفورے کی گرفتاری سے ''صدف اینڈ ملک سردار خان مرڈر کیس'' ایک بار پھر ری اوپن ہو جاتا۔

ان کے اچانک نکل بھاگنے کی ایک وجہ یہ بھی سمجھ میں آتی تھی کہ میں ان کے خفیہ ٹھکانے سے واقف ہو چکا تھا اور ممکن تھا کہ میں اپنے ساتھیوں وغیرہ کو مطلع کر کے مدد کے لئے بلا لیتا۔ مگر اس کا مجھے یقین کم ہی تھا۔ لے دے کر پہلی ہی صورت قرین قیاس تھی۔

بہر طور، کچھ بھی تھا، میں اب ان دونوں کو کسی قیمت پر بھی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ جبکہ غفورے کو تو زندہ ہی نہیں چھوڑنا تھا۔ وہ کئی بے گناہ لوگوں کا قاتل تھا۔ اگرچہ اس نے یہ سب اشفاق شاہین کے کہنے پر کیا تھا مگر اشفاق شاہین کو میں نے قانون کی گرفت میں دینے کا عزم کر رکھا تھا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں گاڑیاں اندھا دھند ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتی ہوئی پختہ سڑک پر آ گئیں۔ پختہ سڑک پر آتے ہی ان کی گاڑی کی رفتار مزید تیز ہو گئی۔ ادھر میں نے بھی اپنی پوٹھوہار کی اسپیڈ بڑھا دی تھی۔ سڑک کے دو رویہ چیڑ اور صنوبر کے درختوں پر دھیرے دھیرے رات کی سیاہی گھلنے لگی تھی۔ ایسے وقت میں ٹریفک بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ یہ سڑک ہری پور جاتی تھی۔

میرے ذہن میں دو ہی شہر تھے جہاں کا یہ دونوں رخ کر سکتے تھے۔ ایک اسلام آباد، دوسرا لاہور۔ مگر جب تک یہ مری روڈ پر نہیں آ جاتے، ابھی کچھ کہنا محال تھا۔ اچانک ان کی گاڑی نے بائیں جانب موڑ کاٹا تو میں بری طرح ٹھٹک گیا۔ کیونکہ یہ راستہ نہ اسلام آباد کی طرف جاتا تھا اور نہ ہی لاہور کی طرف سے کوئی شارٹ کٹ آتا۔

طرح الجھ کر رہ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر کہاں کا رخ کئے ہوئے ہے؟ تب پھر اچانک ذہن میں ایک ہولناک خدشہ اُبھرا۔

کہیں دونوں مردود اس ویران علاقے میں مجھے گھیرنے کا ارادہ تو نہیں رکھتے تھے؟' یہ خیال اچانک میرے ذہن میں اُبھرا اور مجھے پورے وجود میں چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہونے لگیں۔

ٹھیک اسی وقت آگے ایک تنگ موڑ آیا۔ ان کی گاڑی کی رفتار دھیمی پڑی۔ مگر میں نے اپنی جیپ کی رفتار نہیں گھٹائی تھی۔ ان کی گاڑی نے تیزی کے ساتھ موڑ کاٹا، موڑ کے قریب پہنچتے پہنچتے میں نے بھی اپنی جیپ کی رفتار دھیمی کر دی اور پھر جیسے ہی موڑ کاٹا، میرے ہولناک اندیشے کی تصدیق ہو گئی۔

موڑ کاٹتے ہی ان کی گاڑی سڑک کا راستہ روکے عین بیچوں بیچ کھڑی ہو گئی۔ میں نے فوراً بریک لگائے۔ میری جیپ کے ٹائر زور سے چرچرائے مگر پھر رکتے رکتے وہ سڑک کے درمیان میں ترچھی کھڑی گاڑی سے ٹکرا ہی گئی۔

جیپ ایک جھٹکے سے رکی تھی کہ دفعتہً دائیں بائیں جانب سے گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ اُبھری۔ میں تیزی کے ساتھ نیچے کو جھک گیا۔ اندھا دھند برسائی ہوئی گولیاں گونجیلی آوازوں کے ساتھ میری جیپ کی باڈی میں پیوست ہونے لگیں۔ کھڑکیوں کے شیشے بھی زبردست چھناکوں کے ساتھ چکنا چور ہو گئے۔ ونڈ اسکرین بھی ایک چھناکے دار دھماکے سے ٹوٹ کر بکھر گئی۔ میں سیٹ پر نیم دراز سا ہو کر اپنا چہرہ چھپائے ہوئے تھا۔ پل کے پل میں فائرنگ کے ''آہنگ'' سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ پستولوں کی فائرنگ تھی۔ ورنہ اگر برسٹ چھوڑنے والی خودکار رائفلیں ہوتیں تو بچنا محال ہی تھا۔

میرا پورا وجود بری طرح سنسنا رہا تھا۔ میں اسی طرح جھکے جھکے اگلی دونوں سیٹوں پر پڑا رہا۔ مگر اس دوران میں نے میگارڈ نکال کر اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ مگر اب میں پشت کے بل ہو گیا تھا تاکہ ٹوٹی ہوئی کھڑکی اور ونڈ اسکرین کے باہر کا منظر میری آنکھوں کے سامنے رہے۔

فائرنگ رک گئی۔ ہر سُو پراسرار اور ہولناک خاموشی طاری ہو گئی۔

کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ تب میرے دل میں ایک خطرناک خیال اُبھرا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے میگارڈ کو پکڑ لیا اور اپنے پیروں کی طرف والے دروازے پر نال کا رخ کر کے ایک لات سکیڑ کر زوردار انداز میں دروازے پر دے ماری۔ دروازہ دھڑ سے کھلا اور سامنے ہی مجھے اشفاق شاہین پستول ہاتھ میں لئے محتاط انداز میں بڑھتا ہوا نظر آیا۔ وہ بری طرح ٹھٹکا۔ مگر میں ٹرائیگر دبا چکا تھا۔ میرے میگارڈ کی مہیب نال سے شعلہ نکلا مگر ادھر اشفاق شاہین نے بھی بروقت غیر محسوس پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حرکت کی اور میری چلائی ہوئی گولی اس کے پستول پر لگی۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ تیزی کے ساتھ ایک طرف دوڑا۔ میں نے بھی جیپ سے کودنے میں کوئی لمحہ ضائع نہیں کیا۔ اس وقت دائیں جانب سے غفورا ہاتھ میں پستول لئے نمودار ہوا۔ میں نے حواس بحال رکھتے ہوئے اس کے پستول والے ہاتھ پر لات جما دی۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکلا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں اپنے میگارڈ کا رخ اس کی طرف کرتا، اس کے چہرے پر ایک لمحے کو زردی کھنڈ گئی۔ مگر اسی لمحے اچانک کسی نے عقب سے میری پشت پر زوردار لات رسید کر دی۔ میں غفورے سے ٹکرایا۔ غفورا موقع پاتے ہی میرے پستول پر لپکا۔ پستول اس کے قبضے میں تو نہ آ سکا البتہ دور سڑک کے کنارے اُگی ہوئی خود رو جھاڑیوں میں جا گرا۔ اس نے میری ٹھوڑی پر مُکا رسید کرنا چاہا مگر میں نے ایک ہاتھ کی کلائی سے اس کے گھونسے کو روک کر اس کے پیٹ پر دوسرے ہاتھ سے گھونسا رسید کر دیا اور پلٹا۔ عقب سے اشفاق شاہین جو تھوڑی دیر

پہلے ہی میری پشت پر اپنی لات رسید کر چکا تھا اور اب دوبارہ مجھ پر حملہ کرنے کو پر تول رہا تھا۔ میں نے یکدم جھک کر اس کے پیٹ پر اپنے سر کی ٹکر رسید کر دی اور اسے دھکیلتا ہوا خاصی دور تک لے گیا۔ وہ توازن قائم نہ رکھ سکا اور گر پڑا۔ اسی لمحے غفورے نے خود کو فوراً ہی سنبھالتے ہوئے مجھ پر چھلانگ لگا دی اور مجھے رگیدتا ہوا سڑک پر آ رہا۔ میں پارے کی طرح مچلا اور ریچھ جیسے بھاری بھرکم غفورے کو اپنے اوپر سے دھکیل دیا۔ اس وقت قریب ہی پشت کے بل گرے ہوئے اشفاق شاہین نے لات چلا دی جو میرے چہرے پر پڑی۔ ایک لمحے کو مجھے اپنا دماغ جھنجھناتا محسوس ہوا۔ میں ابھی سنبھلنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ بدبخت غفورا وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ مجھ پر دوبارہ جھپٹا۔

اس کے بھاری ڈیل ڈول میں جانے کیسی پھرتی سمائی ہوئی تھی کہ اس نے مجھ پر جھپٹتے ہی اپنے دونوں ہاتھ کا شکنجہ میری گردن کے گرد کس دیا اور ساتھ ہی مجھے دھوبی پاٹ لگا کر گرا دیا۔ اب اس کی گرفت میری گردن کے گرد اور بھی مضبوط ہو گئی تھی۔ میرا دماغ گھٹنے لگا۔

"مار ڈالو اسے غفورے!........ مار ڈالو۔ ہماری فلائٹ نکلنے والی ہے۔"

اشفاق شاہین نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا جس میں میرے لئے شدید نفرت بھری ہوئی تھی۔ غفورے کو مکمل طور پر گرفت جمانے کی پوزیشن حاصل تھی اور میں بے بس تھا۔ اس کا یہ داؤ خالصتاً دیسی طرز کا تھا جس میں مدمقابل کے پاس بے بسی کے ساتھ اپنی موت کا انتظار کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ مگر مجھے دفاع کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ میرے دونوں ہاتھ آزاد تھے مگر گردن پر غفورے کے آہنی بازو کے شکنجے نے میرے جسم کی طاقت ہی گویا مفلوج کر کے رکھ دی تھی۔ تب پھر اچانک ہی میرے اندر جنوں خیز کی شدید لہر اُبھری اور میں نے دائیں ہاتھ کی کہنی اس کے پہلو پر رسید کر دی۔ مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ شاید میری کہنی کا وار بھرپور نہ تھا۔ ادھر وہ خبیث اپنے دوسرے ہاتھ سے بھی میری گردن کے گرد کسے ہوئے شکنجے کو جکڑ کر میری گردن کی ہڈی توڑنے میں اب دونوں بازوؤں کی قوت صرف کرنے لگا۔ میرے بجھتے ہوئے وجود میں ایک بار پھر جوشِ جنوں خیز کی لہر اُبھری اور پھر میں نے اپنے دونوں بازو غفورے کی کمر اور پیٹ کے گرد کس لئے۔

غفورا بے شک ریچھ جیسا گٹھا ہوا ڈیل ڈول رکھتا تھا مگر میں بھی لمبے چوڑے جثے کا مالک تھا۔ چنانچہ میں نے ایک آخری کوشش کے تحت اپنے وجود کی پوری طاقت اپنے دونوں بازوؤں پر مجتمع کرتے ہوئے غفورے کو پورا زور لگا کر زمین سے تقریباً ایک دو فٹ اوپر اٹھا لیا اور پھر عقب میں اس کے سمیت خود بھی سڑک پر گرا دیا۔ سڑک پر گرنے سے ہم دونوں کو کوئی خاص چوٹ تو نہیں لگی تھی البتہ اتنا ضرور ہوا کہ گرنے سے غفورے کے بازو کی گرفت میری گردن کے گرد ذرا ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ نیز مجھے بھی اس کے پہلو پر زوردار کہنی کا وار کرنے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ ضرب کھاتے ہی اس کے حلق سے بھاری ڈکراہٹ اُبھری اور میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی بھرپور طاقت صرف کرتے ہوئے اس کے ڈھیلے پڑتے بازو کے شکنجے کو مزید وا کر دیا اور پھر دوسرے ہی لمحے میں چیتے کی سی پھرتی کے ساتھ اس کے خطرناک شکنجے سے اپنی گردن چھڑا چکا تھا۔

اشفاق شاہین جو ایک جانب خاموش تماشائی بنا کھڑا تھا، مجھے غفورے کے شکنجے سے نکلتا دیکھ کر تیزی کے ساتھ اپنی گاڑی کی جانب لپکا۔ اسے شاید ایئر پورٹ پہنچنے کی جلدی تھی کیونکہ ابھی ذرا دیر پہلے ہی اس نے غفورے کو میرا معاملہ "نمٹانے" کی تلقین کرتے ہوئے یہی کہا تھا کہ ان کی فلائٹ کا وقت جا رہا ہے۔

میرا دھیان ذرا ہٹا تو غفورے نے دوبارہ مجھ پر جھپٹنا چاہا مگر میں اب اس کے قابو میں آنے والا نہیں تھا۔ ایک زوردار مُکا میں نے اس کے جبڑے پر رسید کر دیا۔ ایک لمحے کو وہ جھنجھنا سا گیا۔ میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی اور جیپ میں سوار ہوتے ہوئے اشفاق شاہین کی طرف لپکا۔ دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اس نے جیپ اسٹارٹ کر دی۔ مگر ابھی گیئر ڈالنے ہی والا تھا کہ میں نے کھڑکی سے ہی ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن ناپ لی۔

ادھر غفورے کی طرف سے بھی میں غافل نہ تھا، جو تیزی کے ساتھ دوڑتا ہوا میری جانب آ رہا تھا۔ مگر اشفاق شاہین نے ایک عجیب حرکت کر ڈالی۔ وہ بری طرح بوکھلایا ہوا تھا۔ اس نے اپنی گردن پر میری گرفت کی پرواہ کئے بغیر گیئر بدلا اور ایکسیلیٹر دبا دیا۔ گاڑی کے پچھلے دونوں ٹائر تیز چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ گردش کرنے لگے اور گاڑی ایک طوفانی جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھی۔ میں اس خبیث شیطان کو کسی قیمت پر بھی فرار ہونے نہیں دینا چاہتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ میں نے اس کی گردن کے گرد ڈالا ہوا اپنے بازو کا شکنجہ نہیں چھوڑا اور چلتی ہوئی گاڑی کے دروازے پر جھول گیا۔ اس کی گردن میرے بازو تلے ایک طرف جھک گئی۔ وہ اسٹیئرنگ پر اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت قائم نہ کر سکا۔ نتیجتاً طوفانی انداز میں بتدریج اسپیڈ پکڑتی ہوئی گاڑی سڑک سے کنارے میں اتر گئی اور زوردار دھماکے سے درخت سے جا ٹکرائی۔ میں اچھل کر دور جھاڑیوں میں جا پڑا۔ مگر گرتے ہی پھرتی کے ساتھ اٹھا۔ میں نے اشفاق شاہین کا سر اسٹیئرنگ پر پڑا پایا۔ پتہ نہیں وہ زندہ تھا یا نہیں؟........ البتہ میں اس وقت بری طرح چونکا جب غفورا دوسری جانب کے دروازے کی کھڑکی سے ایک بریف کیس نکال رہا تھا۔ میں لپک کر آگے بڑھا۔ وہ بریف کیس اپنے قبضے میں کئے میری جیپ کی طرف دوڑ رہا تھا اور میں اس کے پیچھے دیوانہ وار بھاگ رہا تھا۔ پھر نہ جانے اسے کیا ہوا، وہ اچانک رک گیا اور پھر بڑے ڈرامائی انداز میں میری طرف پلٹا۔ میں بھی سڑک پر قدرے ٹھٹک کر رک گیا۔

ہم دونوں حریفوں کی وحشیانہ نظریں ایک دوسرے کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ تب غفورے نے ہانپتی ہوئی آواز میں مجھ سے کہا۔

"نادر علی! اشفاق شاہین ختم ہو چکا ہے........ مجھے اب جانے دو۔ اسی میں تمہاری اور تمہاری ماں کی بھلائی ہے۔ ورنہ اگر میں پکڑا گیا اور پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو یاد رکھو، تمہارے دشمن مجھے وعدہ معاف گواہ بنانے میں دیر نہیں کریں گے۔"

میں اس خبیث کی بکواس پر بھنا اُٹھا اور دانت پیس کر خوفناک لہجے میں بولا۔

"میں تجھے زندہ چھوڑوں گا تو تُو وعدہ معاف گواہ بنے گا نا........ خبیث! تُو نے معصوم غزالہ اور بے گناہ چوہدری ذیشان کا قتل کیا اس سے پہلے تُو نے غزالہ کی بہن سپنا کا بھی خون کیا تھا۔ تیرا ناپاک وجود میرے لئے ہی نہیں، اس دھرتی پر بھی بوجھ بن چکا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اس کی جانب قدم بڑھائے۔ وہ اپنے ایک ہاتھ میں بریف کیس پکڑے پیچھے ہٹتے ہوئے دوبارہ بولا۔

"ہوش میں آؤ نادر علی!........ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ مجھے جانے دو۔ میں ہمیشہ کے لئے یہ ملک چھوڑنے والا ہوں۔"

"اب تو صرف تیری روح ہی تیرا جسم چھوڑے گی ذلیل کتے!" میں نے دانت پیس کر کہا اور پھر اس پر جھپٹا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بریف کیس کو فضا میں لہرا کر میرے چہرے پر رسید کرنا چاہا لیکن میں نے پھرتی کے ساتھ جھکائی دیتے ہوئے ایک زوردار لات اس کے پہلو پر رسید کر ڈالی۔ وہ کئی

قدم عقب میں لڑکھڑاتا ہوا میری جیپ کے بونٹ سے جا ٹکرایا۔ اس نے بریف کیس سڑک پر پھینکا اور کسی وحشی سانڈ کی طرح میری طرف لپکا۔

ایک بار پھر ہم گتھم گتھا ہو گئے تھے اور ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی اپنی سی جان توڑ کوشش کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ ہم لڑتے لڑتے بے حال سے ہونے لگے۔ ایک موقع پر ہم دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو کر چند قدموں کے فاصلے پر آمنے سامنے کھڑے ہو گئے اور بری طرح ہانپنے لگے۔

”اب بھی وقت ہے...... میری بات مان لو نادر! مجھے یہاں سے جانے دو۔ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“ وہ ہانپتی ہوئی آواز میں مجھ سے بولا۔

”ہرگز نہیں...... کتے! میرے بازوؤں میں اب بھی اتنا دم ہے کہ میں تیرا خاتمہ کر سکوں۔“ میں نے جنون خیز لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر کہا اور اچانک ہی میں نے اس کے چہرے کے تاثرات بدلتے دیکھے۔ اس کی آنکھوں میں شدید حیرت اُبھری اور وہ میرے عقب میں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ناقابل یقین منظر دیکھ رہا ہو۔ اچانک میری چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا اور یکدم میں نے عقب میں مڑ کر دیکھا اور دوسرے ہی لمحے میں نے اچھل کر اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اسی لمحے میرے عقب میں سڑک پر لیٹے ہوئے اشفاق شاہین نے اپنے دونوں ہاتھوں سے تھامے پستول کا ٹرائیگر یکدم دبا دیا تھا۔ گولی چلنے کا دھماکا ہوا اور غفورا ایک بھیانک چیخ مار کر اپنے دونوں ہاتھ پیٹ پر رکھے لہراتا ہوا گرا۔ ادھر میرے بجائے اپنے ہی ساتھی کو گولی لگتے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے اشفاق شاہین کو سانپ سونگھ گیا۔ میں نے اس کی اس کرب ناک حیرت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی اور اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس نے پستول کی نال کا رخ میری جانب موڑنا چاہا مگر میں اس سے پہلے ہی پل کے پل اس کے اوپر گرا۔ میری ایک لات اس کے سر پر پڑی تھی۔ اس کا سر زور سے سڑک پر لگا۔ اس کے حلق سے بھیانک کراہ خارج ہوئی۔ پستول ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے۔

میں ایک لمحے سڑک پر کھڑا ہانپتا رہا، پھر سڑک پر اوندھے منہ پڑے اشفاق شاہین کے بے سدھ وجود کا جائزہ لیا۔ میں نے چاند کی مدھم روشنی میں سڑک پر خون کے بڑے بڑے دھبوں کی بے ترتیب لکیر دیکھی جو درخت سے ٹکرا کر کھڑی ان کی گاڑی سے ہو کر یہاں آتی محسوس ہو رہی تھی۔

مجھے یہ جاننے میں چنداں دیر نہ لگی کہ اشفاق شاہین گاڑی کے درخت کے موٹے تنے سے ٹکرانے کے بعد ذرا دیر کے لئے زخمی ہو کر نیم بے ہوش سا ہو گیا تھا۔ مگر پھر نہ جانے کس طرح اپنی سخت جانی کی بنا پر جوشِ انتقام کے جذبے تلے وہ کسی طرح جیپ سے اُترا۔ پھر کسی طرح اپنا ہی گرا ہوا پستول اس کے ہاتھ لگا اور شدید زخمی ہونے کے باعث شاید اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو پایا تو سڑک پر ہی اپنے لہولہان زخمی وجود کو گھسیٹتا ہوا میرے ذرا عقب میں پہنچ کر اس نے مجھے گولی سے نشانہ بنانا چاہا تھا۔ یہ تو اچانک ہی غفورے کی میرے عقب میں نگاہ پڑی تھی تو میں نے اس کے ایکا ایکی بدلتے ہوئے تاثرات کو دیکھ کر پل کے پل کسی ہولناک خطرے کو بھانپتے ہی نہایت پھرتی کے ساتھ اپنی جگہ عین اس وقت چھوڑی تھی جب اشفاق شاہین نے مجھ پر گولی چلائی، جو بالآخر اس کے مقرب خاص غفورے کے پیٹ میں جا لگی۔

میں نے پستول کو ٹھوکر مار کر پرے سرکا دیا اور سب سے پہلے غفورے کی جانب بڑھا۔ وہ بھی گولی کھا کر سڑک پر اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے سیدھا کیا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی اور ساکت تھیں۔ میں نے نبض چیک کی، وہ مر چکا تھا۔ پھر میں اشفاق شاہین کی طرف بڑھا۔ وہ بھی آخری سانسوں پر تھا۔

گاڑی کے درخت سے ٹکرانے کے باعث اس کی پسلیاں بری طرح مجروح ہو چکی تھیں۔ سر پھٹا ہوا تھا اور سر سے خون بہہ رہا تھا۔

اچانک اشفاق شاہین کے بے سدھ وجود نے ایک تشنجی جھٹکے کے ساتھ ہچکی لی اور اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

خس کم جہاں پاک...... شرم ناک اور گھناؤنا دھندا کرنے والے یہ دونوں ابلیس صفت جہنم واصل ہو چکے تھے۔ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور بریف کیس اٹھا لیا اور اپنی جیپ کے بونٹ پر رکھ کر اسے کھولا۔

اس کے اندر دونوں کے پاسپورٹ وغیرہ موجود تھے۔ دو عدد ہوائی ٹکٹ بھی تھے۔ کئی کریڈٹ کارڈز کے علاوہ سوئس بینک کی چیک بکس اور کتابچے بھی نظر آئے۔ خاصی تعداد میں امریکی ڈالرز بھی تھے۔ گویا یہ دونوں امریکہ فرار ہونے والے تھے۔

میں نے بریف کیس وہیں پھینک دیا اور اپنی جیپ کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

❋❋❋

اس اعصاب شکن اہم ترین مہم کو کامیابی کے ساتھ سر کرنے کے بعد میں گرین لاج پہنچا اور ماں کو یہ خوش خبری سنا دی کہ اب غفورے کی طرف سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے ہی ساتھی کی گولی کا نشانہ بن چکا ہے۔ انکل اعظم کو بھی میں نے اشاروں کنایوں میں آگاہ کر دیا تھا۔

غفورے کے سلسلے میں نظر حیات کی ہم ماں بیٹے کو قانونی جال میں پھنسانے کی جو دیرینہ آرزو تھی وہ اب ختم ہو چکی تھی۔ ”سرائے سیاں“ میں نظر حیات کو ذہنی طور پر ٹارچر کرنے کے بعد میں اب اس کے دوسرے مرحلے پر کام کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اگلے دن میرا سارا وقت ٹال میں گزرا اور شام ہوتے ہی میں نے پنڈی کا رخ کیا۔

میں نے سنا تھا کہ قسمت کی دیوی ایک بار دروازہ ضرور کھٹکھٹاتی ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ جب انسان یہ محسوس کرنے لگے کہ ایسی تقدیر و خالصتاً تدبیر پر منتج ہو کر ہر محاذ پر انسان کو فتح و کامرانی سے دوچار کرے تو پھر انسان کو کسی محاذ پر بھی پیچھے نہیں ہٹنا چاہئے۔ بلاتاخیر دشمنوں کے خلاف ڈٹ کر میدانِ کارزار میں اُتر آنا چاہئے۔

میری سب سے پہلی کامیابی نگینہ کو خبیث کیلاشی عامل عاروب کے شیطانی چنگل سے چھڑانا اور اپنے سفاک ترین دشمن کالا ناگ کو اپنے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔ اس کے بعد شاہ میر میرے اور ماں کے ہاتھوں اپنے بھیانک انجام کو پہنچ کر زندہ لاش کی مثل قرار پایا۔ اس کے بعد رب نواز کے خلاف مہم کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور اب اشفاق شاہین اور غفورا بھی اپنے منطقی انجام کو پہنچے۔

میں سمجھتا تھا کہ اب نظر حیات ہی میرا ایک اہم دشمن باقی بچا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کے بیٹے کبیر کا کیلاشی عامل سے گٹھ جوڑ بھی مجھ سے چھپا ہوا نہ تھا۔

یہ گٹھ جوڑ ممکن ہے پہلے پہل اس نے اپنی خلاصی کے لئے کیا ہو۔ مگر اب جبکہ نگینہ بھی کیلاشی مہم کے بعد سے اس سے شدید نفرت کرنے لگی تھی اس لئے کبیر کے ہاتھ میں میرے خلاف، میری اور نگینہ کی راہ کھوٹی کرنے کے لئے عامل عاروب کی صورت ایک مؤثر ہتھیار آ گیا تھا۔

اخبارات میں غفورے اور اشفاق شاہین کی موت کی خبر آ چکی تھی۔ اسپیشل فورس نے دونوں کی پراسرار موت کا یہی سبب نکالا تھا کہ دونوں میں کسی بات پر ان بن ہو گئی اور پھر سخت مقابلے کے بعد

دونوں ہی ایک دوسرے کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ کیونکہ اشفاق شاہین کے پستول کی چلائی ہوئی گولی سے ہی غفورا ہلاک ہوا تھا۔ جبکہ اشفاق شاہین کی موت ایکسیڈنٹ قرار دی گئی تھی۔

شام کی ملگجاہٹ رات کی تاریکی میں بدل رہی تھی جب میں پنڈی پہنچا۔ نظر حیات جس علاقے میں رہتا تھا، وہ زیادہ دور نہ تھا۔ میں نے قریب ہی ایک گیراج میں اپنی جیپ روکی اور ٹیوننگ کرانے کے بہانے اسے وہیں چھوڑ کر پیدل ہی آگے چل پڑا۔ اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ گیراج والے نے مجھے بارہ سے پہلے پہلے آ کر اپنی جیپ لے جانے کا کہا تھا۔ ابھی میرے پاس تین گھنٹے تھے۔

غفورے کے جہنم واصل ہونے کے بعد میں اب اور بھی دلیر ہو گیا تھا۔ انسپکٹر اعجاز شمس کی طرف سے اب مجھے کوئی خطرہ نہ تھا۔ تاہم مجھے باوجود اس کے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا تھا۔ سرائے سیالہ میں نظر حیات کو نفسیاتی طور پر ٹارچر کرنے کے دوران میں نے اسے یہ دھمکی بھی دے رکھی تھی کہ میں دوبارہ اس کے پاس وہی زندگی اور موت کا کھیل کھیلنے ضرور آؤں گا اور اس وقت تک کھیلتا رہوں گا جب تک کہ اسے ہلاک نہ کر دوں۔ یقیناً اسے بھی میری دھمکی اچھی طرح یاد ہو گی۔ اور اس کا ہر گزرتا لمحہ اسے اپنے سائے سے بھی ٹھٹکنے پر مجبور کر رہا ہو گا۔

یہی سبب تھا کہ جب میں نظر حیات کی عظیم الشان رہائش گاہ کے ذرا نزدیک پہنچا تو وہاں مجھے غیر معمولی سکیورٹی کا احساس ہوا۔ چار مسلح گارڈز گیٹ پر مستعد کھڑے تھے بلکہ ان میں سے دو تو باقاعدہ رہائش گاہ کے گرد گشت بھی کر رہے تھے۔ باقی ہر سُو گہری خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔

مجھے پورا یقین تھا کہ میری تصویر ان چاروں مسلح گارڈز کو ضرور دکھائی گئی ہو گی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ مجھے اس طرح مٹرگشت کرتے دیکھ کر شبہے میں مبتلا ہو سکتے تھے۔

میں نے اس کا حل یہ نکالا کہ عقبی سمت کا رخ کیا۔ رہائش گاہ کے چہار اطراف گردش کرنے والے باقی دو گارڈز ایک ایک کر کے رہائش گاہ کا نصف طواف کر کے واپس لوٹ جاتے۔ باقی نصف دوسرا گارڈ طے کرتا۔

عمارت ایک ہی منزلہ تھی۔ عقب میں آ کر میں نے باؤنڈری وال کا جائزہ لیا جو کافی بلند تھی اور منڈیروں پر خم دار آہنی بریکٹ نصب تھے۔ جبکہ ان میں تین رویہ خاردار باڑ بھی کھنچی ہوئی تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے یہ ''التزامات'' دیکھنے میں نہیں آئے تھے۔ میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ رقصاں ہو گئی تھی۔ گویا نظر حیات میری طرف سے بری طرح خوف میں مبتلا تھا۔

بہر طور اب میرے لئے مسئلہ اندر کود کر کسی آرام دہ بیڈ روم میں محو خواب نظر حیات کی شہ رگ تک پہنچنا تھا۔ اس نے اپنی حفاظت اور سکیورٹی کا جس قدر سخت بندوبست کر رکھا تھا، اسی قدر میرا اس تک پہنچنا اسے پہلے سے بھی زیادہ ذہنی ہی نہیں بلکہ جسمانی طور پر بھی ٹارچر کرنا تھا۔

میں اطراف میں بنی کوٹھیوں اور بنگلوں کی بیرونی دیواروں تک پھیلی ہوئی کیاریوں اور پودوں کی آڑ لیتا ہوا گشتی مسلح گارڈز کی نظروں میں آئے بغیر رہائش گاہ کی تین اطراف پھیلی ہوئی کمپاؤنڈ وال کا بغور جائزہ لیتا رہا تو مجھے شمال مغربی سمت کی دیوار کی طرف اچانک چند نوجوان لڑکے کھڑے نظر آئے۔ ان کی تعداد سات آٹھ کے قریب تھی اور انہوں نے ایک سیاسی تنظیم کے بینر، جھنڈے پکڑ رکھے تھے۔ ایک جانب لکڑی کی اونچی ''گھوڑی'' بھی کھڑی نظر آئی۔ وہ کافی بلند تھی۔ اس پر دو رویہ سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں جس پر چڑھ کر بلندی پر بینر وغیرہ ایک پول سے دوسرے پول یا دیواروں کی اُبھری ہوئی آہنی ''گل میخوں'' پر لپیٹ کر باندھے جاتے تھے۔ لکڑی کی گھوڑی کے نیچے چار چوبی پہیے بھی نصب تھے تاکہ

اسے ادھر اُدھر دھکیل کر لے جایا جا سکے۔

ایکی میرے تیزی سے کام کرتے ہوئے ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اُبھرا۔ اگر نظر حیات کی رہائش گاہ پر نقب لگانے کے لئے اس چوبی گھوڑی کو بروئے کار لاتا تو میرا کام بن سکتا تھا مسئلہ یہ تھا کہ اتنے سارے لڑکوں کی موجودگی میں یہ کام مجھے مشکل تو کجا ناممکن ہی نظر آتا تھا۔ اس دوران میں نے نظر حیات کے ایک مسلح گارڈ کو بھی وہیں کھڑے پایا جو ان پر نظر رکھے ہوئے مگر خاموش کھڑا تھا۔

میں ابھی پودوں کی آڑ میں دبکا اپنے ہونٹ باہم پیوست کئے کوئی ترکیب لڑانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک لڑکے کے موبائل کی بیل گنگنائی۔ اس نے موبائل نکال کر کان سے لگایا اور کہا۔ ''ہیلو!'' میری نظریں اس لڑکے کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات اُبھرتے دیکھے۔ اس کے بعد اس نے غصیلی آواز میں گالی دیتے ہوئے کہا۔

''ان حرام زادوں کی تو...... اکرم! تم فکر مت کرو، ہم ابھی پہنچتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے جلدی سے موبائل آف کیا اور اپنے ساتھیوں سے با آواز بلند بولا۔ ''ننھے بھاٹا پر بینر لگاتے ہوئے مخالف تنظیم کے لڑکوں سے ہمارا جھگڑا ہو گیا ہے۔ چلو...... جلدی کرو۔''

اس کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ وہ سب لڑکے جھنڈے اور بینر وہیں پھینک کر ایک طرف دوڑ پڑے۔ میرا دل یکبارگی مسرت کی لہر تلے زور سے دھڑکا۔ شاید ان لڑکوں کے دوسرے ساتھیوں کا کسی مخالف تنظیم کے لڑکوں سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ وہ سب بلی کے بل دوڑ پڑے تھے۔ میرا دل تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگا۔ اب میری نظریں قریب کھڑے مسلح گارڈ پر بھی جمی ہوئی تھیں۔ وہ بھی چند ثانیے وہاں کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر اس کے بعد اپنا سر جھٹکتے ہوئے وہاں سے پلٹ گیا۔

میں نے اطراف میں ایک نگاہ ڈالی اور چیتے کی سی پھرتی کے ساتھ اپنی جگہ سے اُبھرا اور چوبی گھوڑی کی طرف بڑھا۔ پھر چوبی گھوڑی کو آہستہ آہستہ دھکیلتے ہوئے باؤنڈری وال کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ کسی بھی لمحے گشتی گارڈ دوبارہ یہاں آ سکتا تھا۔ اس اندیشے کی خاطر میں نے ایک قلیل وقت مقرر کیا اور پھر تیزی کے ساتھ چوبی گھوڑی پر چڑھتا ہوا باؤنڈری وال تک جا پہنچا۔

اس کے بعد نہایت احتیاط کے ساتھ میں نے منڈیر پر ایک قدم جمایا اور اس خم دار آہنی بریکٹ پر لگی خاردار فولادی باڑ میں الجھے بغیر میں نے دوسری جانب ایک ایک کر کے اپنے دونوں پاؤں جمائے اور پھر بے خطر ہو کر نیم تاریک خلا میں کود گیا۔

میں نے کریپ سول کے جوتے پہن رکھے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میرے کودنے سے کچھ زیادہ دھمک نہیں اُبھری تھی۔ تاہم پھر بھی میں چند ثانیے وہیں دبکا اطراف میں ''مشتبہ'' سن گن لیتا رہا۔ مگر ہر سُو ویرانی چھائی رہی۔ گویا سب ٹھیک تھا۔

لیکن ایک سقم رہ گیا تھا۔ باہر چوبی گھوڑی کا دیوار کے ساتھ لگے رہنا گشتی گارڈ کو شک میں مبتلا کر سکتا تھا بشرطیکہ وہی گارڈ وہاں آ کر چوبی گاڑی کی بدلی ہوئی جگہ کو دیکھتا۔ بصورت دیگر دوسرے گارڈ کو علم نہ تھا کہ یہ ''گھوڑی'' کچھ دیر پہلے کہاں ''کھڑی'' تھی۔

میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے چہرے پر رومال کی نقاب چڑھا لی۔ بہر طور اب میں اندر داخل ہو چکا تھا۔ چند ثانیے میں نے آگے پیش قدمی کی۔ سامنے وسیع و عریض لان تھا جہاں چھوٹے سائز کے پائپوں والے ننھے ننھے قمقمے روشن تھے۔ مجھے کتوں کا بھی خدشہ تھا اس لئے میں نہایت احتیاط کے ساتھ آگے بڑھا۔ میں

جہاں موجود تھا، یہ باؤنڈری وال اور کوٹھی کی دیوار کا درمیانی خلا تھا جس نے ایک طویل راہداری کی صورت میں کوٹھی کی اصل چاردیواری کو تین اطراف سے گھیرا ہوا تھا۔ میں نے اپنے چہرے پر رومال کے نقاب کو ذرا درست کیا اور آخری سرے پر ذرا سر اُبھار کر دیکھا۔ سامنے خوب صورت ڈرائیو وے تھا گیٹ بند تھا۔ اندر کی طرف کوئی ذی نفس نظر نہ آتا تھا۔ کار پورچ میں دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اوپر بالکونی تھی۔ یہ اوپر بنے ہال کمرے کی ہی غالباً بالکونی تھی اور اندر داخل ہونے کا اس مذکورہ بالکونی سے بہتر شارٹ کٹ راستہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ کام میں کار پورچ کے نیچے کھڑی گاڑیوں کی چھت پر چڑھ کر انجام دے سکتا تھا۔ لیکن اس طرح باہر موجود چوکنا کھڑے مسلح گارڈ کی نظر مجھ تک پہنچ سکتی تھی۔ اس لئے یہ خیال میں نے سردست رد کر ڈالا۔

گیٹ کے دائیں جانب سیمنٹ کا بنکر نما کیبن اس طرح بنا ہوا تھا کہ اس کا نصف حصہ باہر اور نصف اندر تھا۔ یوں بڑے گیٹ کے علاوہ ”گارڈ کیبن“ کے اندر اور باہر کھلنے والے دروازوں سے بھی کوٹھی میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔

میں پلٹا، راہداری کا ایک طویل تین چوتھائی چکر کاٹ کر دوسری جانب سے اُبھرا۔ یہاں راہداری کا سرا دوسرے لان سے جا ملتا تھا۔ یہاں سے گیٹ دور تھا مگر کوٹھی کا خوبصورت اور ساگوان کی بیش قیمت لکڑی والا محرابی چوکھٹا صاف نظر آتا تھا اور قریب ہی پڑتل کا مرکزی دروازہ تھا۔ میں نے رومال کی نقاب کے افق سے گیٹ کی طرف دیکھا، مجھے ابھی وہاں کھڑے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک میں نے باہر کسی گاڑی کے ہارن کی آواز سنی۔ میں ذرا ٹھٹکا۔ ٹھیک اسی وقت گارڈ کیبن میں انٹرکام سسٹم کی بیل بھی گونجی۔ ذرا دیر بعد گیٹ کھول دیا گیا۔

ایک کار اندر داخل ہوئی اور دوسرے ہی لمحے کوٹھی کے داخلی دروازے سے میں نے کبیر کو عجلت میں باہر نکلتے دیکھا۔ کار محرابی دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گئی تھی۔ میں دیوار کی آڑ کے عقب سے نظریں جمائے ہوئے تھا۔ تب میں نے کار سے تین تیم تحیم اور سرخ و سفید افراد کو اترتے دیکھا۔ کبیر ان سے بڑے پُرتپاک انداز میں ملا۔ میں ان تینوں افراد کے رنگ و روپ سے فوراً ہی یہ اندازہ قائم کر چکا تھا کہ ان کا تعلق شمالی علاقے سے لگتا تھا۔ ان کے نقوش چینی اور کوریائی نمونے کے لگتے تھے۔ ناک چپٹی، آنکھیں چندی ہوئیں۔ یہ مجھے کیلاشی باشندے لگتے تھے۔ میرا خیال فوراً کیلاشی عامل عاروب کی طرف چلا گیا اور بے اختیار میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ عامل عاروب کے تین کارندے نئے محاذ کے ساتھ یہاں آن پہنچے تھے اور ان کی میزبانی کا شرف کبیر کو حاصل تھا۔

وہ ان تینوں کو لئے اندر داخل ہو گیا۔ اب مجھے دو مسلح گارڈز کیبن کے اندر بھی چوکس کھڑے نظر آنے لگے۔ ٹھیک اسی وقت گارڈ کیبن کے دروازے سے میں نے ایک تیسرے گارڈ کو قدرے بوکھلائے ہوئے انداز میں نمودار ہوتے دیکھا۔ میں اسے دیکھ کر چونک سا گیا۔ یہ وہی گارڈ تھا جسے میں نے باہر کوٹھی کے شمال مغربی سمت کی دیوار کے قریب کھڑے دیکھا تھا۔

وہ اندر کھڑے اپنے دونوں ساتھی گارڈز سے کچھ کہہ رہا تھا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے میں نے ” گارڈز کو تیزی سے حرکت کرتے دیکھا۔ ایک نے سامنے کا رخ کیا تھا جدھر پورچ کی طرف سے راہداری کا سرا اُبھرتا تھا۔ جبکہ دوسرا راہداری کے اس سمت تیز تیز قدموں سے بڑھنے لگا جدھر میں چھپا کھڑا تھا۔

ان دونوں کی بیک وقت چوکنا انداز کی حرکات و سکنات نے مجھے پریشان سا کر دیا۔ صاف لگتا تھا اس گارڈ نے باہر شمالی دیوار سے لگی کھڑی ”چوبی گھوڑی“ کو دیکھ لیا تھا اور ساتھ ہی اسے اس بات کا بھی

ہو گیا تھا کہ ضرور کوئی نہ کوئی اندر داخل ہوا ہے۔

ممکن ہے، ایسا اس نے اپنا خدشہ ختم کرنے کی غرض سے بھی کیا ہو۔ مگر مجھے کیا کرنا تھا؟......... فوری طور پر سوچنے والی بات یہ تھی۔ وہ گارڈ نہایت تیزی کے ساتھ اس سمت آ رہا تھا جبکہ دوسرا گارڈ دوسری جانب سے راہداری میں اب تک داخل ہو چکا ہوگا۔ گویا میرے لئے دونوں جانب ”نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن“ والا معاملہ پیدا ہو گیا تھا۔

فوری طور پر مجھے اور تو کچھ نہ سوجھا، میں نے سر اٹھا کر کھڑکی کے چھجے کی طرف دیکھا اور پھر تیزی کے ساتھ کھڑکی کی آہنی گرلوں پر پاؤں اٹکاتا پھنساتا ہوا اونچے چھجے پر جا چڑھا۔ یہ خاصا بلند تھا۔ میں چھجے کے ”سلیب“ پر بالکل سپاٹ ہو کر سینے کے بل لیٹ گیا تاکہ نیچے راہداری پر بھی نظر رکھ سکوں۔ مگر چھجے کی سلیب پر میرا لمبا چوڑا وجود پوری طرح نہ چھپ سکا۔ چنانچہ قریب کی سمت سے اندر راہداری میں داخل ہونے والے اس گارڈ کی نظروں میں تو میں نہیں آ سکا البتہ عقب سے پورا چکر کاٹ کر آنے والے سامنے دور سے اُبھرنے والے دوسرے گارڈ نے چھجے پر مجھے کسی شے کی صورت میں دیکھ لیا۔ مجھے اس کا تب پتا چلا جب وہ مذکورہ گارڈ اپنے ساتھی سے ذرا بلند آواز میں بولا۔

”شیرے!........ تیرے سر کے اوپر والے چھجے میں مجھے کچھ نظر آ رہا ہے۔ ذرا اُچھل کر تو دیکھنا۔ کہیں وہی چور تو نہیں ہے جو گھوڑی دیوار سے لگا کر اندر داخل ہوا ہے؟“

اب تو میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ گویا ساری محنت اکارت چلی گئی۔ اب جو بھی کرنا تھا، پل کے پل کرنا تھا۔ جس گارڈ کی مجھ پر نگاہ پڑ چکی تھی، وہ مجھے گولی کا بھی نشانہ بنا سکتا تھا چنانچہ میں نے چھجے پر پھرتی کے ساتھ لوٹ لگائی اور گارڈ پر آن گرا۔

اس نے سنبھلنے کی کوشش میں مجھ پر آہنی گن کا کندا رسید کرنا چاہا تو میں نے اس کی کنپٹی پر اپنے گھونسے کی زوردار اور جچی تلی ضرب رسید کر ڈالی۔ وہ آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔

سامنے سے آنے والا گارڈ یکدم رک کر مجھ پر اپنی گن تانے کھڑا ہو گیا۔ مگر میں نے عقل مندی یہ کی تھی کہ اس کے بے ہوش ساتھی کے بے سدھ وجود کو ایک ہاتھ سے تھام کر اپنی ڈھال بناتے ہوئے دوسرے گارڈ پر اس کی گن تان لی اور غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔

”اپنی گن پھینک دو .... ورنہ گولیوں سے بھون کر رکھ دوں گا۔“

وہ تذبذب میں مبتلا ہو گیا۔ وہ مجھ پر فائر کرنے کی پوزیشن میں بھی نہ تھا۔ کیونکہ میں نے اس کے بے ہوش ساتھی کے بے سدھ وجود کو اپنے ایک بازو کے حلقے میں خود سے ڈھال بنائے چمٹا رکھا تھا۔

”میں آخری بار کہہ رہا ہوں، گن پھینک دو۔ ورنہ........“

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک میرے سر کے پچھلے حصے پر قیامت ٹوٹی اور میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا........!

***

ہوش آیا تو میرے دونوں ہاتھ پشت کی سمت پر مضبوطی کے ساتھ جکڑے ہوئے تھے اور دونوں پیروں کو بھی نائلون کی مضبوط رسی سے بندھی ہوئی تھی۔

یہ ایک کشادہ کمرہ تھا۔ میں فرش پر بچھے دبیز قالین پر بے بسی سے گٹھری بنا پہلو کے بل پڑا ہوا تھا۔ سامنے صوفے پر نظر حیات، سلیپنگ گاؤن پہنے بیٹھا میری جانب نفرت انگیز نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا بیٹا کبیر بھی براجمان تھا۔ اس کا چہرہ بھی جوشِ غیظ سے پھنک رہا تھا۔ جبکہ دوسرے

قریب کے صوفے پر تینوں کیلاشی باشندے بھی فروکش تھے اور سنسناتی نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔

نظر حیات بری طرح تلملاتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنے پاؤں کی ایک زوردار ٹھوکر میرے چہرے پر رسید کر ڈالی۔ میرا اوپری ہونٹ پھٹ گیا اور خون رسنے لگا۔ اذیت کی لہر میرے وجود میں نفرت کی چنگاریاں بن کر بھڑک گئی تھی۔

"تم خود کو بڑا تیس مار خان سمجھتے تھے......... ہے نا؟" وہ نفرت سے اپنے ہونٹ سکیڑ کر قہرناک لہجے میں بولا۔ "لیکن اب دیکھ لو کہ کس طرح ہم تمہیں حقیر کیڑے کی موت مارتے ہیں۔"

"پپا! آپ کیوں غصے میں خود کو ہلکان کر رہے ہیں؟" کبیر نے میری جانب نفرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے باپ سے کہا۔ "آپ یہاں آرام سے بیٹھ جائیں، اس کے کریا کرم کا بندوبست میں نے کر لیا ہے۔"

نظر حیات قہر و غضب کے عالم میں لرزتا کانپتا ہوا دوبارہ اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔

"تم لوگوں کا شکار حاضر ہے۔" باپ کے صوفے پر دھنسنے کے بعد کبیر نے ان تینوں کیلاشی باشندوں سے کہا تو نظر حیات چونک کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھ کر حیرت سے بولا۔

"کیا مطلب؟......... یہ تو ہمارا شکار ہے بیٹا! ہم اسے ہرگز زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"پپا! زندہ تو یہ لوگ بھی اسے نہیں چھوڑیں گے۔ آپ بے فکر رہیں۔" کبیر نے اپنے باپ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "میرا ان سے معاہدہ ہوا تھا کہ میں نادر علی کو ان کے حوالے کر کے چھوڑوں گا۔"

"مگر بیٹا! یہ لوگ اس کا کیا کریں گے؟......... یہ بہت شاطر اور چالاک انسان ہے۔ اس کے جسم میں جن کی روح ہے۔ یہ انہیں بھی چکمہ دے کر بہ آسانی نکل بھاگے گا۔ میری مانو تو اسے گولی مار کر اس کی لاش راول ڈیم میں پھینک دو۔" نظر حیات نے دانت پیس کر کہا۔ وہ میری طرف سے بری طرح دہشت میں مبتلا تھا۔

"پپا! آپ بات سمجھنے کی کوشش کریں۔" کبیر نے باپ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "ان لوگوں کو آپ معمولی نہ سمجھیں۔ آپ بھول گئے، میں انہی لوگوں کی قید میں تو تھا اتنے عرصے۔ پھر ان کے روحانی پیشوا عاروب سے میں نے اپنی جان بخشی کے سلسلے میں یہ معاہدہ کیا تھا کہ میں ان کے مجرم نادر علی خان کو ان کے حوالے کرنے میں ان کی بھرپور مدد کروں گا۔ کیلاشی وادی میں ان کی پوری قوم آباد ہے۔ یہ اپنے دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کرتے۔ اور ہم ان لوگوں کی دشمنی مول نہیں لے سکتے۔ آپ بے فکر رہیں۔ یہ معاملہ میرے سپرد کر دیں۔ میں نے پہلے سے جال پھیلا رکھا تھا۔"

کبیر نے اتنا کہا اور پھر ان تینوں کیلاشی باشندوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ "میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے......... تمہارا شکار حاضر ہے۔"

اس کی بات پر ان تینوں نے ایک دوسرے کے چہروں کی طرف دیکھا اور اپنی زبان میں کھسر پھسر کی۔ پھر ایک نے کبیر نے گونجیلی آواز میں ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا۔

"مگر ہمارا دوسرا شکار ابھی باقی ہے......... وہ کب ملے گا؟"

جواباً کبیر نے کہا۔ "وہ پرسوں صبح کی فلائٹ سے یہاں پہنچ رہی ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اپنے باپ کے علاج کی غرض سے امریکہ گئی ہوئی ہے۔ اس کی رہائش گاہ بھی تمہیں میں نے دکھا کر دی تھی۔ مگر یہ شکار میں سمجھتا ہوں تم لوگوں کے لئے زیادہ اہم ہے۔ پہلے اسے اپنے ٹھکانے لے جاؤ۔ دوسرا شکار ہاتھ لگنا بہت آسان ہے۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔ یہ بہت خطرناک ہے۔ ابھی تم لوگ

سنبھالو۔"

"ہاں......... یہ تو ہمارا مجرم ہے۔ اس بدبخت نے ہمارے روحانی پیشوا کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔" دوسرے نے میری طرف دیکھ کر خوفناک لہجے میں دانت پیس کر کہا۔

ان کی گفتگو سن کر میری کنپٹیاں بری طرح سائیں سائیں کر رہی تھیں۔ ساتھ ہی کبیر کے بھیانک عزائم بھی کھل کر سامنے آ گئے تھے۔ ان کا آپس میں "دوسرے شکار" کے متعلق سوال جواب کرنا مجھے سخت تشویش میں مبتلا کر رہا تھا۔ کیونکہ مجھے بخوبی ادراک تھا کہ ان کی دوسرے شکار سے مراد لامحالہ نگینہ ہی ہو سکتی تھی۔ اور مردود کبیر کا یہ کہنا کہ دوسرے شکار کا ہاتھ لگنا آسان تھا، مجھے سخت تشویش میں مبتلا کر رہا تھا اور یہ بات حقیقت بھی تھی کہ نگینہ ان کے بھیانک عزائم سے ناواقف تھی اور بہ آسانی ان خبیثوں کے ہاتھ لگ سکتی تھی۔ میرے وجود میں کبیر کے خلاف نفرت کی ایک طوفانی لہر اُبھری اور میں نے رسن بستہ ہونے کے باوجود حلق کے بل دھاڑ کر کبیر سے کہا۔

"کتے!......... اگر نگینہ کا بال بھی بیکا ہوا تو میں تجھے بھیانک موت سے دوچار کروں گا۔ سن لے کان کھول کر اچھی طرح تُو۔"

میری دھمکی پر نظر حیات کے چہرے پر ہلکی تشویش کی لہر سی اُبھری تھی۔ مگر کبیر بڑی طمانیت سے مسکرا کر بولا۔ "ممکن ہے تمہاری بدروح مجھ سے انتقام لینے کی کوشش کرے۔ مگر نادر! میں تمہیں جس کے حوالے کر رہا ہوں، تم اسے اچھی طرح جانتے ہو......... وہ انسان کی روح کو نہیں چھوڑتا۔"

"آگے کیا ہو گا، اس کا تجھے کیا پتہ۔" میں نے نفرت سے منہ بگاڑ کر کہا۔ "کس کی جان جاتی ہے اور کس کی بچتی ہے، اس کا فیصلہ تُو کیسے کر سکتا ہے؟"

"اسے لے جاؤ۔ ورنہ میں اسے گولی مار دوں گا۔" اس بار نظر حیات نے بھڑک کر ان تینوں کیلاشی باشندوں سے کہا۔ اس کے بعد ان میں سے ایک نے کہا۔

"ہم ابھی اسے ادھر اپنے خفیہ ٹھکانے پر رکھیں گے۔ جب دوسرا شکار بھی ہمارے ہاتھ آ جائے گا تب ہم اپنی وادی کا رخ کریں گے۔" یہ کہہ کر وہ تینوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے دیکھا، کیلاشی کی بات سن کر باپ بیٹا کچھ بے چین سے نظر آنے لگے۔ تب پھر کبیر نے کھڑے ہو کر ان سے کہا۔

"تم نہیں جانتے، یہ کس قدر خطرناک انسان ہے۔ بہتر یہی ہو گا اسے یہاں کہیں اپنے کسی خفیہ ٹھکانے میں یرغمال بنانے کی بجائے فوراً اپنی وادی میں لے جاؤ۔ اگر یہ تمہاری قید سے نکل گیا تو ہم سب کا حشر کر دے گا۔ کیا تم اپنے پہلے دو ساتھیوں کا انجام بھول گئے؟"

مجھے کبیر کے لہجے میں چھپی تشویش اور بے نام خوف کی جھلک صاف محسوس ہوئی تھی۔

"یہ ہمارا مسئلہ ہے۔ تم چھوڑو ان باتوں کو۔ چلتے ہیں اب ہم۔" ایک کیلاشی نے روکھے لہجے میں کہا تو میں نے دیکھا، کبیر اور نظر حیات بے بسی سے دانت پیس کر رہ گئے۔ صاف نظر آتا تھا کہ ان دونوں خبیث باپ بیٹوں کو ان تینوں کیلاشیوں کی فرمائش ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ بہرطور انہوں نے چپ سادھ لی۔

ایک کیلاشی نے مجھے بوری کی طرح اٹھا کر کاندھوں پر لاد لیا اور پھر یہ سب لوگ باہر آ گئے۔ ایک جیپ باہر موجود تھی۔ مجھے عقبی دروازہ کھول کر سیٹوں کے درمیان فرش پر ڈال دیا۔ ایک کیلاشی وہیں پر براجمان ہو گیا جبکہ باقی دونوں اگلی سیٹوں پر سوار ہو گئے۔ جیپ کے اسٹارٹ ہونے کی غراہٹ اُبھری اور پھر وہ ایک جھٹکے سے ریورس ہوتی ہوئی گیٹ سے باہر نکلی۔ اس کے بعد ذرا رک

کر آگے نامعلوم منزل کی طرف بڑھ گئی۔ میں اپنے گٹھڑی بنے وجود کے ساتھ جیپ کے عقبی حصے پر فرش پر پڑا بری طرح مچل رہا تھا۔ مجھے اس بات کی تسلی تو تھی کہ سردست یہ مجھے فوری طور پر اپنے ساتھ کیلاش وادی لے جانے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ ان کے آئندہ منصوبے کے مطابق یہ لوگ نگینہ پر ہاتھ ڈالنا چاہتے تھے اور اس کے بعد یہ ہم دونوں کو لئے کیلاش وادی روانہ ہونے کا ارادہ رکھتے تھے۔

میں ان کا خطرناک مجرم تھا اور ان کی نظروں میں میرا ناقابل تلافی جرم یہ تھا کہ میں نے ان کے بدخصلت روحانی پیشوا عامل عاروب کو ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی اور وہ میرے ہاتھوں مرتے مرتے بچا تھا۔ جبکہ نگینہ کا معاملہ اپنی جگہ سنگین تھا۔ وہ مردود کیلاشی عامل عاروب نگینہ کو اپنے ''دابولا میزی'' نامی خودساختہ دیوتا کے آگے قربانی کی بھینٹ چڑھانا چاہتا تھا۔ گویا ہم دونوں ہی کی زندگیاں شدید خطرے سے دوچار تھیں۔ لیکن مجھے خود سے زیادہ نگینہ کی فکر کھائے جا رہی تھی۔

وہ پہلے سے ہی جاں گسل حالات سے گزر رہی تھی اور اپنے باپ شاہ میر کی زندہ لاش واپس لا رہی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ یہاں اس کے خلاف کس قدر بھیانک سازش تیار کی گئی تھی۔ اگرچہ کیلاشی مہم کے دوران ہم جن کڑے حالات سے گزر کر یہاں پہنچے تھے اس کے ہنگامہ خیز روز و شب اس کے ذہن میں بھی ابھی تازہ ہوں گے۔ مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ ابھی اس کی قیمت ہم دونوں کو چکائی جانے والی تھی۔

میں بے شک رسیوں سے بندھا ہوا تھا لیکن میں نے باوجود اس کے یہ پختہ عزم کر رکھا تھا کہ میں عامل عاروب کے ان تینوں کارندوں کو اپنے گھناؤنے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ اور شاید کچھ سے اس ''خطرے'' کا ان دونوں سانپ اور سنپولیے باپ بیٹوں کو بہ خوبی ادراک تھا۔

اب برفیلے پہاڑوں کا علاقہ شروع ہو چکا تھا۔ کافی دیر بعد جیپ ایک ویرانے میں ایک کاٹیج کے باہر رکی۔ ہر طرف سکوت طاری تھا۔ انہوں نے مجھے جیپ سے نکالا اور مکان کے اندر ایک کمرے میں بند کر دیا اور دروازہ بند کر کے کمرے سے نکل گئے۔ مجھے نہیں معلوم میں کتنی دیر وہاں پڑا رہا تھا۔

راہِ فرار کی ابھی تک کوئی صورت نظر نہ آئی۔ حتیٰ کہ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی بندشوں کو بھی زور لگا کر کھولنے اور توڑنے کی سعی کی تھی مگر کامیاب نہ ہو پایا تھا۔

عالم تشویش کی ان گھڑیوں میں مزید وقت سرکا اور شام ہو گئی۔

مجھے حیرت تھی کہ ابھی تک کوئی بھی اندر میرے کمرے میں داخل نہیں ہوا تھا۔

''آخر یہ لوگ کہاں چلے گئے تھے؟'' میں اُلجھ کر سوچنے لگا۔ ''کہیں یہ لوگ مجھے یہاں دور برف زار ویرانوں میں بھوکا پیاسا چھوڑ کر واپس کبیر کی میزبانی کا شرف حاصل کرنے اور نگینہ کی صورت میں اپنے دوسرے شکار پر ہاتھ ڈالنے کے لئے نظر حیات کی رہائش گاہ پر ڈیرا تو نہیں ڈالے بیٹھے تھے؟''

ممکن تھا کہ میرا یہ خیال درست ہی ہو۔ اس خیال نے جہاں مجھے انجان سی تشویش میں مبتلا کر رکھا تھا وہاں پہلی بار ایک موہوم سی امید بھی پیدا ہو چلی تھی کہ اب میں اس منحوس کاٹیج میں تنہا تھا۔ گویا میں اب پورے اطمینان کے ساتھ کچھ نہ کچھ کر سکتا تھا۔

لہٰذا یہ سوچتے ہی میرا ذہن پہلے سے بھی تیزی کے ساتھ کام کرنے لگا۔ میں دیوار کا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ سب سے پہلے دروازے کی طرف بڑھا۔ میرے دونوں ہاتھ کلائی کی طرف سے جکڑ کر باندھے گئے تھے مگر میرے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آزاد تھیں۔ میں سب سے پہلے پشت کے بل ہو کر دروازے کے لٹو کو گھما کر اسے کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ دو تین جھٹکے دیئے۔ دروازہ مضبوطی کے ساتھ

اور تب اچانک ہی دوسری سمت سے قدموں کی چاپ اُبھری اور اگلے ہی لمحے دروازہ زوردار جھٹکے سے کھلا۔ میں نے غیر ارادی طور پر پلٹنا چاہا مگر اسی وقت کسی نے میری پشت پر لات رسید کر دی اور میں منہ کے بل ذرا دور فرش پر جا پڑا۔ میرے حلق سے بے اختیار کراہ آمیز آوازیں برآمد ہو گئیں۔

پہلو کے بل ذرا ہٹ کر میں نے دیکھا تو ان تینوں کیلاشیوں میں سے ایک کو ہاتھ میں پستول لئے اپنی طرف خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے پایا۔ مجھے سانپ سونگھ گیا۔ میرا خیال غلط ثابت ہوا تھا۔ کاٹیج میں میرے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔

''م...... مجھے پپ...... پیاس لگی تھی۔ میں نے کچھ نہیں کھایا پیا۔'' بند دروازے پر زور آزمائی کا کوئی جواز پیش کرنا لازمی تھا۔

میری بات پر وہ غراہٹ سے مشابہہ آواز میں بولا۔ ''یہاں کسی قسم کے کھانے پینے کی توقع نہ رکھو۔ سمجھے تم؟''

''ل...... لیکن مجھے...... چند گھونٹ پانی تو پلا دو۔'' میں نے کہا۔

''بکواس بند کرو اپنی۔'' وہ غصیلی آواز میں گھور کر بولا۔ ''اور ہاں...... اپنی جگہ سے ہلنا بھی مت، ورنہ مار مار کر بھرکس نکال دوں گا تمہارا۔'' یہ کہہ کر اس نے زور سے دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ زوردار دھماکے کی آواز سے بند ہوا تو اچانک میری سماعتوں سے ایک چھنکتی، کھنکتی آواز ٹکرائی۔ بالکل ایسے جیسے کوئی کنگن پختہ فرش پر گرنے کی آواز اُبھری ہے۔

میں نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا تو مجھے ایک گول رِنگ (Ring) پڑا نظر آیا۔ میں بغور اسے تکنے لگا۔ فولادی رِنگ یقیناً دروازے پر لگے لٹو سے اُکھڑ کر گرا تھا۔ اور ایسا دروازہ زور سے بند کرنے کے باعث ہوا ہوگا۔ شاید یہ ڈھیلا تھا۔ لیکن میں اس کا کیا کرتا؟...... تب پھر اچانک میری نگاہ دروازے پر پڑی۔ لٹو کے عقب میں رخنہ نظر آیا جو غالباً رِنگ کے اُکھڑ کر گرنے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ مجھے اس میں کچھ خاص فرق محسوس ہوا۔

میں بہ مشکل دروازے تک آیا اور ذرا جھک کر لٹو کے عقب میں بنے اس آہنی رخنے کو دیکھنے لگا جہاں سے رِنگ گرا تھا۔ کمرے کے اکلوتے بلب کی روشنی میں مجھے رخنے والی جگہ پر ایک کند فولادی دھار اُبھری ہوئی دکھائی دی۔ میرے ذہن میں یکبارگی ایک خطرناک خیال اُبھرا۔ اگر میں اپنی کلائیوں میں بندھی رسّی کو کسی طرح اس تیز دھار پر رگڑتا تو یہ ممکن تھا کہ میری پیہم کوشش سے رسّی کٹ جاتی۔ ''خطرناک'' کا عنصر یہ تھا کہ رسّی کو زور سے رگڑنا تھا اور ایسی صورت میں دروازے پر زور لگا کر رگڑنے سے آواز اُبھرتی اور باہر کہیں قریب موجود دشمن باخبر ہو سکتا تھا اور کوئی بعید نہ تھا کہ وہ اس بار مجھے دروازے سے زور آزمائی کرتے دیکھ لیتا تو میرے دونوں پیروں میں رسّی باندھ دی جاتی اور میں قطعی بے بس ہو کر رہ جاتا۔

اس خطرے کو اگر میں خاطر میں لاتا تو پھر ہاتھ پر ہاتھ دھرے ہی بیٹھا رہتا۔ چنانچہ میں نے فی الحال اس کوشش کو ترک کرنا ہی مناسب سمجھا۔ رات کے کسی نصف پہر میں یہ عمل کرنا زیادہ مناسب تھا کیونکہ ممکن تھا اس پہر باہر موجود تینوں کیلاشی بھی سو رہے ہوتے۔ ایک اور خیال بھی میرے ذہن میں اُبھرا تھا کہ ہو سکتا ہے، اس کے دو ساتھی کہیں چلے گئے ہوں اور یہاں ایک ہی پہرے دار موجود ہو۔

بہرطور میں نے صبر کا دامن ہاتھ میں تھامے رکھا اور دوبارہ اپنی جگہ پر آ کر دیوار سے پشت ٹکائے میری نظریں کھڑکی کے پار مقدور بھر آسمان پر جمی ہوئی تھیں جہاں شام کی ملگجاہٹ رات کی تیرگی

دوئم

میں بدل رہی تھی۔

مزید دو تین گھنٹے اس صبر و خاموشی کے ساتھ بیت گئے تو میں اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا اور دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے کے قریب پہنچ کر ذرا رکا۔ چند ثانیے باہر کی سن گن لیتا رہا۔ سناٹا پا کر میں پشت کی طرف گھوما......... میری انتہائی کوشش یہی تھی کہ دروازے پر کھڑ کھڑاہٹ نہ اُبھرنے پائے۔

میں نے اللہ کا نام لیا اور اپنی سی ''کوشش'' شروع کر دی۔ ذرا رکوع کے بل جھک کر میں نے رسّی لٹو کے عقبی کند دھار پر رگڑنا شروع کر دیا۔ احتیاط کے پیش نظر پورا زور نہیں لگا پا رہا تھا۔ رسّی بالکل کھردرے انداز میں رگڑ کھانے لگی جس کا مطلب تھا کہ رسّی پر اب تک ذرا سا بھی چرکا نہیں لگا تھا۔ بہ صورت دیگر رسّی کا اگر ایک ''ریشہ'' بھی اُدھڑ جاتا تو وہ ''رف'' انداز میں رگڑ کھاتی اور مجھے بھی اپنی امید بَر آنے کا تھوڑا بہت احساس ہوتا۔

چنانچہ میں نے زور بڑھا دیا اور دروازے پر تھوڑی کھڑ بڑاہٹ اُبھری۔ میں نے یکدم اپنی کوشش ترک کر ڈالی۔ میرا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔ میں چند ثانیے باہر کی سن گن لینے کی کوشش کرتا رہا۔ دوسری جانب اتھاہ خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔

میں نے دوبارہ کوشش شروع کر دی۔ اب مجھے احساس ہوا کہ اس رگڑ سے رسّی کھردری ہونے لگی تھی۔ میرے اندر ایکا ایکی امید بھری مسرت کی لہر اُٹھی۔ میں نے انگلیوں کی مدد سے رسّی کو چھوا۔ اس کے کچھ ریشے اُدھڑے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔

لگاتار کوئی نصف پون گھنٹے کی محنت نے مجھے تھکا ڈالا۔ میں ذرا ستانے کے لئے واپس اپنی جگہ جا کر بیٹھ گیا۔ وقت گزر رہا تھا۔ صبح ہونے میں چند ہی گھنٹے رہ گئے تھے۔ اور نگینہ......... نگینہ کی کل ہی کی واپسی کی فلائٹ تھی۔ نہ جانے ان بدبختوں نے اسے کہاں اور کس جگہ سے کڈنیپ کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا؟......... مگر میں تو اس سے پہلے ہی ان مردودوں کو ان کے گھناؤنے منصوبے سمیت ڈھیر کر دینا چاہتا تھا۔

تھوڑی دیر ہانپنے اور ستانے کے بعد میں پھر دیوار کا سہارا لئے ابھی کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا۔ میں سناٹے میں آ گیا۔ سامنے وہی کیلاشی کھڑا تھا جس نے کچھ دیر قبل میری پسلیوں پر لات رسید کی تھی۔

اسے دوبارہ دروازے پر دیکھ کر یکبارگی میرا دل سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ وہ بڑی تیز نظروں سے گھور رہا تھا۔ مجھے یہی ڈر تھا کہ کہیں یہ بدبخت میرے ہاتھ میں بندھی رسّی کا جائزہ لینے کی کوشش نہ کرے۔ ورنہ اسے اُدھڑے ہوئے ریشے نظر آ جاتے اور وہ شک میں مبتلا ہو سکتا تھا۔ شاید وہ اپنے اطمینان کی خاطر آیا تھا۔ میں نے لہجے میں بے چارگی سموتے ہوئے ایک بار پھر اس سے کہا۔ ''مجھے پیاس لگی ہے، پانی تو پلا دو۔''

مگر اس نے بڑی نفرت کے ساتھ مجھے دیکھ کر ''ہنہ'' کہا اور دوبارہ دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ میں نے بے اختیار طمانیت کی سانس خارج کی۔ میرے ذہن نے اس کی اچانک مگر ''خاموش'' آمد پر یہی محمول کیا تھا کہ وہ شاید آخری بار اطمینان کرنے کے بعد اب اپنی جگہ پر جا کر سونے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے بھی مزید نصف گھنٹے کے لئے اپنی ''کوشش'' مؤخر کر ڈالی۔

پھر خاصی دیر بعد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بالآخر کافی دیر بعد میری پیہم کوشش رنگ لائی اور رسّی کٹ گئی۔

ے دونوں ہاتھ اب آزاد تھے۔ میں نے اپنی کلائیوں کو سہلایا۔

میرے سینے میں اب مسرت کے علاوہ جوش کی سی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ میں دشمنوں کی گردن مروڑنے کے لئے اب بری طرح بے چین تھا۔ قید و بند سے مفر کی طرف میری کوششوں کا یہ پہلا مرحلہ کامیابی سے سر ہو چکا تھا۔

اب اس کمرے سے نکلنا باقی تھا۔ ظاہر ہے، میں دروازے پر دستک دے کر تو نکلنے سے رہا۔ تاہم اس کا دوسرا حل سوچنے لگا۔

اس کے لئے میں دوبارہ اپنی جگہ پر آ کر سابقہ پوزیشن میں اپنے دونوں ہاتھ پشت کی سمت کر کے اس طرح بیٹھ گیا گویا میرے دونوں ہاتھ ہنوز جکڑے ہوئے تھے۔ اگر کوئی اچانک میرے کمرے میں در آتا تو اسے پتہ بھی نہ چلے۔

رات شاید اپنے آخری پہر پر تھی۔ ایک تدبیر کارگر ثابت ہوئی اور اب دوسری تدبیر کرنا تھی۔ کمرے سے نکلنے کی اب دو ہی صورتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ میں دوبارہ دروازے پر کھڑ پڑ کروں یا پھر زور زور سے پانی کے لئے چلاؤں اور سامنے آنے پر اس کیلاشی کو چھاپ لوں۔

دوسری صورت یہ ذہن میں آتی تھی کہ میں اطمینان سے کسی کے اندر داخل ہونے کا انتظار کرتا اور اچانک دھوکے سے ان پر قابو پانے کی کوشش کرتا۔

مگر انتظار مجھ سے نہیں ہو رہا تھا۔ میرے پاس اب بہت کم وقت بچا تھا۔ صرف چند گھنٹے یا شاید اس سے بھی کم۔ ایسے میں ذرا سی بھی جلد بازی سارے کئے کرائے پر پانی پھیر سکتی تھی۔ میں ایک بار پھر غور کرنے لگا۔ بالآخر یہی سمجھ میں آیا کہ مجھے کچھ کرنا چاہئے۔ لہٰذا یہ سوچ کر میں اٹھا اور دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا۔

دروازے کے لٹو کو پکڑا اور اسے زور زور سے ہلانے لگا۔ دروازے پر اگر میں دونوں ہاتھوں سے ''ہتھڑ'' مارتا تو یقیناً پتہ چل سکتا تھا کہ میرے دونوں ہاتھ آزاد ہو چکے تھے۔ یوں وہ چوکنا ہو جاتے۔ اس طرح کم از کم وہ اس زعم میں تو ہوتے کہ میرے دونوں ہاتھ ابھی تک جکڑے ہوئے تھے۔

کافی دیر تک میں اسی طرح دروازے کو کھڑکھڑاتا رہا۔ مگر مجھے خاصی حیرت ہوئی کہ خاصی دیر تک کسی نے بھی ادھر توجہ نہ دی۔ یہ ممکن تھا کہ وہ گہری نیند سو رہے ہوں۔ تب میں نے یہی مناسب سمجھا کہ مزید کھڑ کھڑ کرنے کی بجائے زور زور سے چلا کر انہیں اپنی طرف متوجہ کرنا ہی زیادہ بہتر تھا۔ چنانچہ ابھی میں نے منہ کھولا ہی تھا کہ اچانک میری سماعتوں میں کسی گاڑی کے انجن کی گھرگھراہٹ اُبھری۔ میں یکدم سناٹے میں آ گیا اور ساتھ ہی ایک سنسناتا ہوا خیال اُبھرا۔

'کہیں یہ لوگ اپنے دوسرے منصوبے پر عمل پیرا ہونے کے لئے روانہ تو نہیں ہو رہے؟'

میں نے زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ ''پانی......... مجھے پانی چاہئے......... سخت پیاس لگی ہے۔''

یہ کہتے ہوئے میں نے ناچار دونوں ہاتھوں سے دروازے کو دھڑدھڑانا شروع کر دیا۔ اس کے بعد باہر کی سن گن لینے کی کوشش کرتا رہا۔ گاڑی کی آواز دور جاتی ہوئی سنائی دی۔

'کیا یہ لوگ چلے گئے تھے؟......... نگینہ اب ان کے ہاتھوں اغواء ہونے والی تھی؟'

میرے دل و دماغ میں اذیت ناک خیال اُبھرا۔

ٹھیک اسی وقت دروازے کے باہر قدموں کی آہٹ اُبھری جسے سن کر یکلخت میرا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ میں ایک طرف ہو گیا۔ میرے اعصاب تن گئے تھے۔ گویا ان کا ایک ساتھی ادھر ہی رہ گیا تھا۔

اچانک دروازہ کھلا۔ سب سے پہلے میں نے رائفل کی نال دروازے سے نمودار ہوتے دیکھی اور تو جیسے میرے بدن میں بجلی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے جھپٹ کر اپنے دونوں ہاتھوں سے نال پکڑ کر کھینچ دی اور ساتھ ہی ایک ٹھوکر رائفل بدست کو لگا دی۔

وہ اس اچانک حملے کے لئے قطعی طور پر تیار نہ تھا۔ نتیجتاً رائفل اس کی گرفت سے نکل گئی اور وہ قدم عقب میں لڑکھڑا گیا۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے اس نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ جب تک رائفل کی نال چھوڑ کر پوری طرح اس پر گرفت جماتا، اس نے اچانک ہی مجھ پر چھلانگ لگا دی اور مجھے رگیدتا ہوا اندر کمرے میں آ پڑا۔ رائفل میرے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گری۔ اس بار اس نے مجھے سنبھلنے کا ذرا بھی موقع دیئے بغیر میرے چہرے پر مُکا رسید کر دیا۔ مجھے ایک لمحے کو اپنا دماغ جھنجھناتا محسوس ہوا۔ وہ مجھے چھوڑ کر قریب گری رائفل کو اٹھانے کے لئے لپکا۔ یہ بڑے فیصلہ کن اور جان گسل لمحات تھے۔ لہٰذا میں نے پل کے پل سنبھلتے ہی اس کی ٹانگ پکڑ لی۔ وہ منہ کے بل فرش پر گرا مگر گرتے گرتے بھی اس کا ایک ہاتھ رائفل تک پہنچ ہی گیا اور اس نے وہیں سے ایک ہی ہاتھ میں رائفل پکڑ کر لٹھ کی طرح گھما دی جو میرے سر پر تو نہ لگی البتہ میرے بائیں کاندھے پر پڑی۔ مجھے اپنا کاندھا ٹوٹتا محسوس ہوا۔

مگر یہ وقت اپنی چوٹ سہلانے کا نہ تھا۔ اس نے رائفل سیدھی کرنے کی کوشش کرنی چاہی مگر میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اٹھ کر اپنے سر کی زوردار ٹھوکر نہ صرف اس کے پیٹ پر رسید کر دی بلکہ اسے دھکیلتا ہوا دیوار سے ٹکرا دیا۔ اس نے اپنا دایاں گھٹنا چلا دیا۔ جو میرے پیٹ پر لگا۔ مارے اذیت کے میرے حلق سے کراہ خارج ہوگئی۔ اس نے رائفل کا بٹ دوبارہ میرے سر پر رسید کرنا چاہا مگر میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی رائفل پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ اب ہمارے درمیان ایک دوسرے سے رائفل جھپٹنے کی کشمکش ہونے لگی۔ ہم دونوں ڈیل ڈول میں برابر ہی تھے اور اپنی سی پوری کوشش کر رہے تھے کہ اچانک اس نے رائفل چھوڑ کر مجھے زور سے پرے دھکیل دیا۔ میں رائفل سمیت کئی قدم پیچھے جا کر لڑکھڑایا مگر چونکہ یہ اپنے اور اس کے دیے ہوئے دوسرے دھکے کا اثر تھا اس لئے میرے قدم زمین سے اکھڑ گئے اور وہ چشم زدن میں دروازے سے نکل کر باہر کو دوڑا۔ میں پرے جا کر گرا اور گرتے ہی سنبھل کر میں نے اس پر برسٹ فائر کرنا چاہا مگر وہ کمرے سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ میں رائفل ہاتھ میں سنبھالتا ہوا بہ سرعت اٹھا اور تیزی کے ساتھ باہر کو دوڑا۔ میرا رواں رواں اس وقت جوش غیظ کے مارے کپکپا رہا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، کاٹیج بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ میں نے پورا کاٹیج دیکھ ڈالا مگر وہ نظر نہ آیا۔ میں باہر آ گیا۔ دور مغربی پہاڑیوں کی سمت سے صبح کاذب کی سپیدی نمودار ہو رہی تھی۔ فضا میں ابھی تیرگی نیم شب کا اثر غالب تھا۔ سامنے جنگل تھا۔ میں پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر دوڑ کر دشمن کو تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگا مگر وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔

مجھے اس کے نکل جانے کا از حد افسوس تھا۔ تاہم مجھے خوشی بھی ہوئی تھی کہ اب میں آزاد تھا۔ مگر اس وقت میری خوشی ایک اندیشے میں بدل گئی کہ اب میں کس طرح ان دور دراز برف زار ویرانوں سے نکلوں جبکہ مفرور کیلاشی کے دو ساتھی نکل چکے تھے۔ ان کے پاس تیز رفتار جیپ تھی۔ جبکہ خود میرے پاس دور دراز علاقے سے نکلنے کے لئے کوئی سواری نہ تھی۔

میں گہری اور اُلجھن آمیز تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے اب کیا کرنا چاہئے تھا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ صبح کی سپیدی اب روشنی میں بدل رہی تھی۔ میں نے وقت کا

صبح چھ اور سات بجے کا وقت ہی ہو سکتا تھا۔ مجھے شدید بے چینی نے آ لیا۔ میرے پاس بہت باقی بچا تھا۔ میں نے اپنی جیبوں کی تلاشی لی تھی۔ حسب توقع میرا میگارد اور موبائل اس وقت لے لیا گیا تھا جس وقت نظر حیات کے گارڈ نے اچانک عقب سے میرے سر پر وار کر کے مجھے بے دیا تھا۔ حتیٰ کہ میری رسٹ واچ تک اُتار لی تھی۔ گویا یہ واچ ٹرانسمیٹر ہو۔

کنپٹیاں سائیں سائیں کر رہی تھیں اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ بار بار یہی خیال میرے دماغ کو جھنجھنائے دے رہا تھا کہ اب میں کیا کر سکتا تھا؟ کدھر جاتا؟

خیال ذہن میں آیا کہ کسی قریبی آبادی تک پہنچ کر میں ٹیلی فون پر انکل اعظم سے رابطہ کر کے والے خطرے سے آگاہ کر دوں یا پھر ادھر ہی کہیں چھپ کر ان دونوں کیلاشیوں کی واپسی کا روں کہ نگینہ کو اگر وہ ایئرپورٹ سے ہی اغواء کرنے میں (جس کا مجھے قوی اندیشہ تھا) کامیاب ہو تے تو یقیناً وہ ادھر ہی کا رخ کریں گے۔ اور پھر میں بڑے آرام سے ان دونوں پر ہاتھ ڈالنے کی کرتا۔ لیکن پھر اچانک مجھے ان کے تیسرے ساتھی کا خیال آیا۔ وہ کمبخت جانے کس طرح مجھ سے ل بھاگا تھا۔ اس کی جانب سے ہی مجھے انجانا خطرہ لگا ہوا تھا۔

یہاں چھپ کر اولالذکر ان دونوں کیلاشیوں کا انتظار کرتا تو ممکن تھا کہ ان کا تیسرا ساتھی جو تھا، عین وقت پر میرا کام بگاڑ سکتا تھا۔ جبکہ مجھے سردست دور دور تک کسی ایسی قریبی آبادی کے نہیں آ رہے تھے کہ میں وہاں کا رخ کرتا اور کسی طرح فون وغیرہ پر انکل اعظم خان سے رابطہ بہر طور دھاگے کے دونوں سروں میں سے ایک سرا میرے ہاتھوں سے نکل چکا تھا جبکہ دوسرا میرے اگرچہ وہ بھی ابہام کا شکار تھا۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے بہتر تھا کہ کچھ نہ کچھ کیا جاتا۔ جتنی جلدی تھی، اتنا ہی وقت بھی تیزی کے ساتھ میرے ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا۔ چنانچہ میں ب سے پہلے بلندی کی جانب رخ کیا اور آگے قدم بڑھا دیئے۔ ایک سبزے اور برف سے ڈھکی پہاڑی پر چڑھ کر میں نے آس پاس نظریں دوڑائیں۔ مشرقی برفیلے اُفق سے سورج اُبھر آیا تھا۔ چٹانوں کے کگر کسی اونچے گنبد پر لگے کلس کی طرح چمک رہے تھے۔

دور پار کسی آبادی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں سخت مایوس ہو رہا تھا۔ وقت کا ایک سرا ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ اب میں دوسرا سرا گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ میں آبادی کی واپسی میں بھٹک جاتا اور میری غیر موجودگی میں وہ دونوں کیلاشی باشندے کاٹیج کا رخ کرتے نہ پا کر وہ کیلاش وادی کی طرف کوچ کر جاتے۔ کم از کم یہاں رہ کر میں ان کی واپسی کا انتظار کر چھاپ تو سکتا تھا اور نگینہ کو بھی ان کے متوقع چنگل سے چھڑا سکتا تھا۔

آخر مجھے یہ تسلیم کرنا ہی پڑا کہ میں اب سردست نگینہ کو اغواء ہونے سے تو نہیں بچا سکتا تھا۔ پھر کم از ادھر ہی رہ کر ان کی واپسی کا انتظار کرنا چاہئے تھا۔

طرف مجھے تیسرے مفرور کیلاشی باشندے کی طرف سے بھی تشویش ہو رہی تھی۔ کہیں وہ اپنے ساتھیوں کو میری طرف سے محتاط نہ کر دیتا۔ اتنا تو مجھے بھی یقین تھا کہ وہ بھی کہیں آس پاس ہی ہو گا۔ اب میں یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ لوگ موبائل کا استعمال جانتے تھے کہ نہیں۔

کافی غور و خوض کے بعد میں نے یہی سوچا کہ جس راستے سے یہ لوگ آئے تھے اور پھر دوبارہ مجھے بھی اس راستے پر آگے بڑھنا چاہئے۔ کیونکہ پھر دوبارہ (نگینہ سمیت) ان کی واپسی بھی اسی ہو سکتی تھی۔

بہر طور یہ تجویز مجھے زیادہ بھائی تھی۔ لہٰذا میں نے رائفل سنبھالی۔ گرد و پیش پر ایک نگاہ ڈالی اور نام لے کر اس اکلوتے راستے پر آگے بڑھ گیا۔

❄❄❄

اس بار میرے ستارے گردش میں نظر آ رہے تھے۔

نگینہ کے واپس ملک پہنچنے کے بعد میری خوشی ادھوری ہی رہ گئی تھی۔ میں تیز تیز قدموں سے کھاتے راستے پر چلا جا رہا تھا۔ دھوپ کی تمازت میں بھربھری مٹی والے راستے پر مٹی کے تودوں کے درمیان برف کے کندن ریزے بھی چمک رہے تھے۔ میں خاصی دیر تک بغیر رُکے چلتا رہا۔ مجھے مفرور کیلاشی کی طرف سے بھی اچانک حملے کا دھڑکا لگا ہوا تھا کیونکہ اس کے دوسرے ساتھیوں کے کے بعد بازی پلٹ کر کسی حد تک میرے حق میں ہو گئی تھی اور یہ بات وہ بھی جانتا تھا۔ مگر اس کے ساتھی نہیں۔ ہو سکتا ہے اس نے بھی میری طرح اس راستے کا انتخاب کیا ہوتا کہ راستے ہی میں دونوں لوٹتے ہوئے ساتھیوں سے مل کر وہ انہیں موجودہ صورت حال سے آگاہ کر دے۔

مجھے اب اپنی اس موجودہ پیش قدمی کا خیال بروقت اور درست ہی معلوم ہوا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اب دس بج چکے تھے۔ گویا اب تک عامل عاروب کے ان دونوں کارندوں نے نگینہ کو اغوا کر لیا ہوگا یا اغواء کرنے والے تھے۔ اگر وہ دونوں خبیث اپنے مذموم مقصد میں کامیاب ہو بھی گئے تب بھی انہیں واپس یہاں تک پہنچنے میں دو سے تین گھنٹے درکار تھے۔

اچانک میں چلتے چلتے ٹھٹک کر رک گیا۔ ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ بڑی عجیب آواز تھی۔ مجھے چونکہ تیسرے مفرور دشمن کی طرف سے دھڑکا لگا ہوا تھا اس لئے میں اپنے سائے سے بھی چوکنا ہو کر چل رہا تھا۔

میں نے رک کر آواز پر ذرا غور کیا تو یہ آواز مجھے اپنے دائیں جانب ایک قدرے اونچے ٹیلے سے آتی محسوس ہوئی۔ تاہم آواز میں کرب کا تاثر موجود تھا۔

میں نے فوراً مذکورہ ٹیلے کی طرف رخ کیا۔ ٹیلا زیادہ وسیع نہ تھا۔ اس کی ڈھلان پر بھی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ ذرا قریب پہنچنے پر میں بری طرح ٹھٹکا۔ دو افراد مجھے زخمی حالت میں پڑے ہوئے ملے۔ میں جلدی سے ان کی طرف لپکا۔ بہ غور ان کی طرف دیکھا۔ یہ دو جواں سال لڑکا لڑکی تھے۔ نوعمر ہی تھے۔ لڑکی کے مقابلے میں لڑکا زیادہ زخمی اور لہولہان نظر آ رہا تھا اور اس کا جسم ساکت تھا۔ جبکہ لڑکی زخمی حالت میں کراہ رہی تھی۔

دونوں نے قیمتی مگر مقامی پوشاکیں پہن رکھی تھیں۔ میں سب سے پہلے لڑکی کی طرف بڑھا۔ وہ خوب صورت تھی۔ بال ہلکے براؤن تھے۔ اس نے فر کا قیمتی لباس پہن رکھا تھا اور پیروں میں لانگ بوٹ تھے۔ ذرا دیر کے بعد اس کا سر بھی ایک طرف کو ڈھلک گیا۔

میں نے جلدی سے اس کی نبض چیک کی اور سینے کی دھڑکنیں سنیں۔ وہ ابھی زندہ تھی مگر بے ہوش ہو گئی تھی۔ میں نے فوراً لڑکے کی طرف رخ کیا۔ وہ بھی ایک خوش شکل نوجوان تھا۔ مجھے دونوں لڑکے لڑکی کی صورتوں میں بہن بھائی کی مماثلت محسوس ہوئی۔ میں نے لڑکے کی نبض چیک کی اور دھڑکنیں سنیں تو افسوس ناک انکشاف ہوا کہ وہ جان کی بازی ہار چکا تھا۔

ناچار مجھے بے ہوش پڑی لڑکی کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اس برف زار ویرانے میں مجھے کیا کرنا چاہئے تھا؟........ یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ مگر میں لڑکی کو زخمی حالت میں چھوڑ کر بھی نہیں جانا چاہتا تھا

گوارا نہیں کر رہا تھا کہ میں ایک انسان کو یوں موت و زیست کی کشمکش میں چھوڑ کر اپنی راہ لیتا۔

بہر یہ ان دونوں بے چاروں پر کس نے قیامت ڈھائی تھی؟

لڑکے کی عمر بیس سال کے قریب لگتی تھی جبکہ لڑکی بہ مشکل سترہ اٹھارہ کے پیٹے میں نظر آتی تھی۔ میں نے زخموں کا جائزہ لیا۔ اس کے صرف سر پر چوٹ تھی اور چہرے پر بھی خراشوں کے نشان نظر آئے۔ گردن پر بھی سرخی مائل لکیریں تھیں۔ جبکہ لڑکے کا سر بالکل پھٹ چکا تھا اور پیشانی بھی تڑخی ہوئی تھی۔ اور یہی زخم اس کے لئے مہلک ثابت ہوا تھا جس نے بالآخر اس کی جان لے لی تھی۔ ان سے کچھ یوں لگتا تھا کہ انہوں نے ایک یا ایک سے زائد حملہ آوروں کے ساتھ نبرد آزمائی کی اور زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکے تھے۔ یوں بھی یہ نوعمر ہی تھے۔ لیکن میری سمجھ میں ایک بات نہیں آ رہی تھی کہ یہ دونوں یہاں اکیلے اس ویرانے میں کیا کرنے آئے تھے؟

کیا ان کا گھر قریب ہی تھا؟........ یہی ایک بات میرے ذہن میں آئی تھی۔

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال اُبھرا۔ میں نے زمین کا بہ غور جائزہ لیا تو مجھے چوڑے ٹائروں کے واضح نشان دکھائی دے گئے۔ یہ ان کی کسی پرانی قبائلی دشمنی کا شاخسانہ معلوم ہوتا تھا۔

بہر طور میں نے یہی مناسب سمجھا کہ کم از کم لڑکی کو اٹھا کر واپس کاٹیج کا رخ کرنا چاہئے یا پھر یہاں قریبی آبادی کو تلاش کرنا چاہئے۔ یہ سوچ کر میں اٹھا اور ٹیلے کی بلندی پر چڑھ کر چہار اطراف میں نظر دوڑائی۔ تب ایک جانب بہت دور مجھے سبزے اور برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑی ڈھلان پر چھدری سی آبادی کے آثار نظر آئے۔

یہاں سے دیکھنے پر وہ قریب ہی محسوس ہوتی تھی۔ ممکن تھا جب میں وہاں کا قصد کرتا تو فاصلہ طویل پڑتا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ایک بل کھاتا راستہ بھی اس سمت کی طرف جاتا ہوا ہی نظر آ رہا تھا۔

میں نے زخمی لڑکی کو فوراً اپنے کاندھے پر اٹھایا اور اس سمت کا رخ کیا۔ لڑکی کا وجود نازک اور پھول کی طرح ہلکا تھا۔ میں تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ ابھی میں نے بہ مشکل تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ اچانک مجھے سامنے آبادی کی طرف جاتے ہوئے راستے پر گرد و غبار کے بادل اُڑتے ہوئے دکھائی دیے۔ میں ٹھٹک کر رک گیا اور بہ غور اپنی آنکھیں سکیڑے سامنے تکنے لگا۔ یہ تین چار کے قریب بھاری گاڑیاں تھیں۔ میں چلتے چلتے رک گیا۔ ذہن میں یہی خیال اُبھرا کہ شاید ان دونوں بدنصیب بھائی بہن کے وارثوں سے ان کا تعلق ہو۔ یہ بھی اچھا تھا۔ میرا کافی وقت بچ گیا تھا۔ تاہم دل و دماغ کو ایک عجیب پریشانی بھی لاحق ہونے لگی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں تینوں گاڑیاں آندھی طوفان کی طرح اُڑتی ہوئی میرے قریب پہنچ کر ایک جھٹکے سے رک گئیں۔ گرد و غبار کا ایک طوفان سا اُمڈا اور پھر میں نے تقریباً دس بارہ کیم شحیم مقامی افراد کو دیکھا۔ ان کی پشت سے رائفلوں کی نالوں کی جھلک صاف نظر آ رہی تھی۔ میں نے انہیں دیکھ کر کاندھے سے بے ہوش لڑکی کو اٹھا کر آہستگی سے زمین پر لٹا دیا تو وہ لوگ تیزی سے میری جانب بڑھے اور اپنی رائفلیں پشت سے اتار کر مجھ پر تان لیں۔

پھر ایک لڑکی کی طرف بڑھے اور تب ایک نے چلّا کر مقامی زبان میں کہا۔

"یہ تو شہزادی صاحبہ ہیں۔"

مجھے یہ زبان آتی تھی۔ میں نے انہیں ساری بات بتا دی۔ لڑکے کا سن کر ان کے چہرے تاریک ہو

گئے۔ پھر کچھ لوگ میری نشاندہی پر اس طرف دوڑے جہاں بدنصیب لڑکے کی لاش پڑی ہوئی تھی
اس کی لاش اٹھائے وہاں آ گئے اور بیشتر دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

''لالہ مجھے یہ بھی انہی کا ساتھی معلوم ہوتا ہے۔ اسے گولیوں سے بھون دینا چاہئے۔'' ایک پُرطیش لہجے میں نسبتاً دراز قامت اور بارُعب شخصیت والے آدمی سے کہا۔ اس کی انگارے برساتی ہوئی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں پریشان ہو گیا۔ بارعب شخص نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا تو میں نے اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''اگر میں آپ کے دشمنوں کے ساتھ ہوتا تو بھلا میں فرار ہونے کی بجائے لڑکی کو آبادی کی طرف کیوں اٹھا کر لے جاتا؟ میں تو یہ چاہ رہا تھا کہ اس کی جان بچ جائے۔''

میری دلیل معقول تھی۔ اب ان کے چہروں پر چھائے درشتی کے آثار تذبذب اور اُلجھن آمیز خاموشی میں بدل گئے تھے۔ تاہم باوجود اس کے وہ مجھ سے مطمئن نظر آ رہے تھے۔

اس بار رعب شخص نے مجھ سے گونج دار آواز میں کہا۔ ''جب تک شہزادی بٹی کو ہوش نہیں آ جاتا اور وہ ہمیں اصل حقیقت نہیں بتاتی، تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہو گا۔''

اس کی بات سن کر میں بری طرح پریشان ہو گیا۔ مجھے یہ نیکی گلے پڑتی نظر آ رہی تھی۔ انہوں نے میری بات سنے بغیر مجھے جیپ میں سوار ہونے کا حکم دیا اور ناچار مجھے حکم کی تعمیل کرنا پڑی۔

بستی زیادہ گنجان اور بڑی نہ تھی مگر بہرحال زندگی اپنی پوری ہماہمی کے ساتھ متحرک تھی۔ بستی میں کہرام مچ گیا تھا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ یہ دونوں بدنصیب نوعمر لڑکا لڑکی آپس میں واقعی سگے بہن بھائی تھے اور یہاں کے سردار زور آور خان کی اولاد تھے۔ جبکہ وہ بارعب شخصیت سردار زور آور خان کا چھوٹا بھائی وزیر خان تھا۔



سردار زور آور خان کی عمر ساٹھ کے پیٹے میں تھی۔ مگر اپنی قابلِ رشک صحت سے ساٹھا پاٹھا ہی نظر آتا البتہ سر اور بھنوؤں کے بال سفید دودھیا تھے۔ رنگت سرخ و سپید تھی۔

قریب قریب ڈھلوانی کھپریل کی چھتوں والے جھونپڑ اور مکانات نظر آتے تھے۔ جبکہ سردار کا مکان وسیع ی قطع اراضی پر محیط ایک حویلی نما تھا جس کے گرد نو فٹ اونچی دیواروں کا ایک قلعہ نما ''کوٹ'' بنا ہوا اندر اعلیٰ نسل کے گھوڑوں کا طویلہ بھی تھا۔ سردار زور آور خان کے بدنصیب بیٹے کا نام شہ زور خان تھا بیٹی کا نام شہزادی تھا۔

ماحول میں بڑے غم و غصے کی لہر پائی جاتی تھی۔ مجھ پر بھی پُرطیش نظروں کی برچھیاں پڑ رہی تھیں۔ خلاف بھی فتوے جاری کئے جا رہے تھے جس کا لب لباب روایتی ہی تھا۔ یعنی میں حملہ آوروں کا تھا۔ کم و بیش سردار زور آور خان کا بھی یہی خیال تھا۔ جبکہ اس کا لمبا تڑنگا بھائی وزیر خان سمجھ دار آدمی اس نے میری دلیل دہراتے ہوئے اپنے بھائی اور دیگر مشتعل لوگوں کو قدرے ٹھنڈا کیا مگر میرے سلسلے بھی دبا دبا اشتعال پایا جاتا تھا۔

سردار کی حالت غم ناک ہو رہی تھی۔ مگر وہ مرد تھا۔ اپنے کرب پر ضبط کئے ہوئے تھا جبکہ اس کی بیوی جواں مرگی پر مارے غم کے نڈھال ہو رہی تھی۔ اس پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔

شہزادی کو ہوش آ گیا تھا۔ اس سے فوراً اس اندوہناک واقعے کے بارے میں استفسار کیا گیا تو اس نے سب سے پہلے اپنے بھائی شہ زور کے بارے میں دریافت کیا۔

اس کی حالت زار کو دیکھتے ہوئے یہی جھوٹ بولا گیا کہ وہ زندہ ہے۔ تب اس کی حالت کچھ سنبھلی اور اس نے جو کچھ بتایا وہ دیگر لوگوں کے لئے تو اتنا چونکا دینے والا ثابت نہ ہوتا مگر میں بری طرح تشویش پریشان کن بے چینی کا شکار ہو گیا۔

شہزادی نے بتایا کہ وہ اور اس کا بھائی اپنی گاڑی میں سیر کی غرض سے نکلے تھے۔ دونوں بہن بھائی لکھے تھے اور شہر میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور وہیں ہوسٹل میں رہتے تھے۔ آج کل اپنے گاؤں آئے تھے۔

راستے میں ایک لحیم شحیم شخص نے ہاتھ کے اشارے سے ان کی جیپ کو روکا۔ اس کے بعد اچانک اس نے حملہ کر دیا۔ وہ ان کی جیپ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ شہ زور جوش میں آ گیا اور اس سے بھڑ گیا۔ شہزادی بیچ میں آئی تو اس اجنبی حملہ آور نے اسے بھی پتھر اور ڈنڈے مار کر زخمی کر دیا اور بعد میں جیپ کی فولادی شہ زور کا سر بے دردی سے مار مار کر بری طرح زخمی کر ڈالا اور ان کی جیپ لے کر فرار ہو گیا۔

سردار زور آور کی بیٹی شہزادی نے اس اجنبی حملہ آور کا جو حلیہ بتایا تھا اسے سن کر میں بری طرح چونک گیا اعالی عاروب کا مفرور کارندہ معلوم ہوتا تھا اور میں سمجھ گیا تھا کہ وہ بدبخت ان کی جیپ کیوں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد شہزادی سے میرے بارے میں استفسار کیا گیا تو اس نے میرے سلسلے میں قطعاً

لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔

مگر اس کے باوجود میری گلوخلاصی نہ ہوئی اور قبیلے کے معتبر لوگوں کے سامنے مجھے پیش کیا گیا۔ میرے سلسلے میں چھوٹا موٹا جرگہ ہو گیا جس میں سردار زور آور خان اور اس کا بھائی وزیر خان بھی شامل تھے۔ مجھ سے میرے بارے میں تفصیلات پوچھی گئیں کہ میں اکیلا وہاں کیا کر رہا تھا؟ اب مجھے لازماً سچ بتانا پڑا تھا کہ میرے ساتھ بھی کیسی ٹریجڈی ہو گئی تھی۔ نیز یہ کہ میں اس اجنبی حملہ آور قاتل کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ ایسا میں نے اس لئے کیا تھا کہ اب تک اس سارے "کھٹ راگ" میں میرا جتنا وقت ضائع ہوا تھا، اس کی تلافی ہو سکے۔

یہی سبب تھا کہ میں نے انہیں اپنے بارے میں تفصیلاً آگاہ کر دیا تا کہ وہ میرے سلسلے میں تصدیق اور تشفی کر سکیں........لیکن میری کہانی پر انہیں شاید پوری طرح یقین نہ آیا۔ تاہم سردست جرگے کے اراکین اور سردار وغیرہ میری کہانی غور سے سنتے رہے۔ اس کے بعد آپس میں وہ دھیمے لہجے میں کھسر پھسر کرتے رہے۔

مجھے سردار زور آور خان کے بھائی وزیر خان سے امید تھی کہ وہ میری گلوخلاصی کی کوشش کرے گا۔ کافی دیر تک آپس میں کھسر پھسر کرنے کے بعد بالآخر سردار زور آور خان نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے بلکہ سلا کرتے ہوئے کہا۔

"ہمارے بیٹے شہ زور کا وہ قاتل بے شک تمہارا دشمن سہی لیکن وہ تمہاری وجہ سے ہی یہاں آیا تھا اور تم سے جھگڑے کے دوران وہ کاٹیج سے فرار ہوا۔ یوں راہ فرار اختیار کرتے ہوئے اس مردود کا سامنا ہمارے دونوں بچوں سے ہوا۔ اس طرح سے تم بھی قصوروار ثابت ہوئے ہو۔ لیکن ابھی ہم تمہاری سزا کے سلسلے میں حتمی فیصلہ محفوظ رکھتے ہیں۔ مگر تم ذہنی طور پر خود کو کڑی سے کڑی سزا کے لئے تیار کر لو۔"

وزیر خان کی بے تکی ضد نے مجھے بری طرح جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ میری بے گناہی سمجھنے کے باوجود اپنے سردار بھائی زور آور خان کے فیصلے پر مجبور ہو۔ لیکن میں بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔ مجھے رہ رہ کر نگینہ کا خیال پریشان کر رہا تھا اور اس کے حوالے سے میرے دل و دماغ میں وسوسوں کے سانپ کلبلانے لگے تھے۔

جیپ نے واپسی کے سفر پر یوٹرن لیا اور پوری رفتار سے دوڑنے لگی۔ میرا ذہن تیزی سے موجودہ سنگین حالات اور اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں غور کرنے لگا۔ میرے پاس دو ہی راستے تھے۔ پہلا تو یہ کہ میں خاموشی سے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیتا۔ سردار زور آور خان کے فیصلے کا انتظار کرتا۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ میں اس وقت ان سے بھڑ جاتا اور مار ماری کر کے ان کے چنگل سے فرار ہونے کی کوشش کرتا۔ میں نے لمحوں میں دونوں راستوں پر باریک بینی سے غور کیا۔ مجھے پہلا راستہ زیادہ سود مند لگا۔ کیونکہ موجودہ حالات کا تقاضا تھا کہ میں زیادہ خطرات مول لئے بغیر صبر و استقامت کے ساتھ بہتر وقت کا انتظار کروں۔ اگر میں دوسرا راستہ اپنانے کی کوشش کرتا تو وہ مجھے سردار زور آور خان کے پورے قبیلے کی نظروں میں مجرم بنانے کا باعث بنتا اور موجودہ حالات اس نئی دشمنی کے آغاز کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ لیکن مجھے اس بات کی بھی پریشانی ستا رہی تھی کہ نگینہ اگر ان تینوں کیلاشیوں کے ہتھے چڑھ چکی تھی تو وہ اسے بلا تاخیر کیلاش لے جا کر عامل عاروب کے حوالے کر سکتے تھے جہاں اس شیطان نے نگینہ کو اپنے نام نہاد مقدس دیوتا "دابولا میزی" کی بھینٹ چڑھانے کا ناپاک اور خطرناک عزم کر رکھا تھا۔ ایسا نہ ہوتا کہ میں دوسری بار تاخیر کی وجہ سے خدانخواستہ ہمیشہ کے لئے نگینہ کو کھو بیٹھتا۔

جیپ کا سفر جاری تھا اور میں نگینہ کے حوالے سے ایک بار پھر شدید شش و پنج کا شکار ہو گیا تھا۔ مجھے

فیصلہ ہو نہیں پا رہا تھا۔ میں نے دوبارہ اور آخری بار غور کیا کہ اگر میں چپ چاپ ان کے ساتھ ہو لیتا تو ضروری تھا کہ ہٹ دھرم سردار زور آور خان مجھے یوں آسانی سے چھوڑ دیتا؟ اس طرح بہتر وقت کے انتظار میں تو نگینہ کی جان کو لاحق خطرے کی سنگین گھڑیاں مختصر ہوتی چلی جاتیں۔ بالآخر میں نے پہلے راستے پر چلنے کا ارادہ ترک کر ڈالا اور دوسرے مگر خطرناک راستے کو اپنانے کا آخری اور پُرعزم فیصلہ کر لیا۔ اس "خطرے" میں بہرحال نگینہ کی زندگی کو فائدہ تھا۔ چنانچہ ایک موقع پر میں نے پیشاب وغیرہ کی حاجت کے لئے وزیر خان سے درخواست کی۔ اس نے بڑی ناگوار نظروں سے میری طرف دیکھا۔ پھر بالآخر اس نے ڈرائیور سے جیپ روکنے کو کہا۔

ڈرائیور نے جیپ سڑک کے کنارے پر روک لی۔ دو گن بردار افراد میرے ساتھ ہی جیپ سے اترے۔ میں نے سڑک کے کنارے قدرے نشیب میں جھاڑیوں کی سمت پیش قدمی کی تو ایک گن بردار میرے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ تب پھر موقع پاتے ہی میں نے یکدم پلٹ کر اس پر حملہ کر دیا۔

سب سے پہلے میں نے اس کی گن پر جھپٹا مارا اور اپنا گھٹنا اس کے پیٹ پر رسید کر دیا۔ اس کے حلق سے "اوغ" کی بھیانک کراہ خارج ہوئی اور گن پر اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی میں نے برق رفتاری سے وہ اس سے جھپٹ لی۔ گن میرے قبضے میں آتے ہی اس کا ٹھوس آہنی بٹ میں نے دشمن کے جھکے ہوئے چہرے پر رسید کر دیا۔ وہ اپنے حلق سے بھیانک کراہ خارج کر کے زمین بوس ہوتا چلا گیا۔ اس کا دوسرا ساتھی ہی نہیں، سڑک کے کنارے کھڑی جیپ میں موجود وزیر خان سمیت اس کے دیگر ساتھیوں کو بھی جھاڑیوں کی اوٹ میں ہونے والی گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا۔ پھر جب تک وہ سب قریب آتے، میں تیزی کے ساتھ ایک جانب جھاڑیوں کی اوٹ لیتا ہوا رینگ گیا۔ دفعتہً ہی پھر عقب میں مجھے وزیر خان کی طیش میں جھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ اپنی زبان میں اپنے ساتھیوں سے کچھ کہہ رہا تھا۔ لیکن ادھر میں نے اپنی "فرار" پیش قدمی ترک کی۔ میرا ارادہ ان کی جیپ پر قابض ہونے کا تھا اس لئے میں سردست ان پر گولیاں برسانے کی حماقت نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں تیزی سے جھاڑیوں کی اوٹ لیتا، سڑک کے کنارے آگے بڑھتا رہا اور ایک لمبا چکر کاٹ کر دوسری طرف اُبھرا تو میرے ہونٹوں پر بے اختیار مسرت و کامرانی کی مسکراہٹ اُبھری۔

میں دشمنوں کو بھٹکانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ کیونکہ ان کی جیپ ذرا فاصلے پر کھڑی نظر آ گئی تھی۔ مگر وہ لوگ سب غائب تھے۔ ان سنگین اور پُرخطر لمحات میں ایک پل بھی ضائع کرنا حماقت ہوتی۔ چنانچہ میں نہایت پھرتی مگر محتاط روی کے ساتھ جیپ کی سمت بڑھا۔ جیپ کے قریب پہنچتے پہنچتے میں نے ایک نگاہ اطراف میں ڈالی اور ڈرائیونگ سیٹ پر سوار ہو گیا۔ حسب توقع چابی اگنیشن سوئچ میں موجود تھی۔ میں نے جیسے ہی چابی گھمائی، اچانک گولی چلنے کا دھماکا ہوا۔ مجھے اپنے چہرے کے قریب سے گزرتی گولی کی مہیب "سنسناہٹ" صاف محسوس ہوئی تھی جس نے دوسری طرف کی کھڑکی کا شیشہ ایک دھماکے سے چکنا چور کر دیا۔ میں لرز سا گیا۔ تاہم اوسان بحال رکھتے ہوئے میں نے جیپ کے اسٹارٹ ہوتے ہی اسے ایک طوفانی جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ پھر تو عقب میں جیسے طوفان اُمڈ پڑا۔ گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ نے خاموش فضا کے سناٹے کو بری طرح مجروح کر ڈالا تھا۔ کئی گولیاں جیپ کی باڈی میں پیوست ہوئی تھیں مگر شکر تھا کہ کوئی بھولی بھٹکی گولی نے جیپ کے ٹائروں تک رسائی نہیں حاصل کی تھی۔

میں بتدریج جیپ کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ "فائرنگ رینج" سے خاصی دور نکل گیا۔ مخدوش تر حالات میں اپنی اس کامیاب اور دلیرانہ پیش قدمی نے میرے حوصلے دوچند کر ڈالے۔ اب میری ساری

توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز تھی

ذرا دور تک تیز رفتار ڈرائیونگ کے بعد میں نے شارٹ کٹ اپنایا۔ اب میرا رخ نتھیا گلی کی بجائے مری کی طرف تھا۔ میں سب سے پہلے انکل اعظم خان سے ملنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے میں اپنے مال پہنچا۔ مزدور اپنے کام میں مگن تھے۔ میں نے جیپ روکی اور اپنے آفس میں آ کر انکل اعظم خان کے موبائل پر ان سے رابطہ کیا۔ اس دوران میں نے کئی بار نگینہ کے موبائل پر بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

''تم اچانک کہاں غائب ہو گئے تھے نادر؟ تمہاری ماں بہت پریشان.........''

میں نے ان کی بات کاٹی اور دھڑکتے دل کے ساتھ جلدی سے بولا۔ ''انکل! پہلے میری بات سن لیں'' اور پھر میں نے انہیں ساری بات بتا دی۔

''اوہ مائی گاڈ!.........تو آج صبح اسلام آباد ایئر پورٹ پر اغواء ہونے والی واردات نگینہ کے متعلق تو نہیں تھی؟'' میری مختصراً صراحت پر وہ اچانک چونک کر بولے۔ میں سر تا پا لرز گیا۔ وہی ہوا تھا جس کا مجھے ڈر تھا۔ میرا دل کنپٹیوں پر دھڑ دھڑانے لگا اور رگوں میں سنسناتی ہوئی لہو کی گردش خود بخود ہی بڑھنے لگی تھی۔

''انکل! اب میرے پاس بالکل وقت نہیں ہے۔ میں نے آپ کو ساری باتیں بتا دی ہیں۔ آپ پلیز ماں کو میری خیریت اور موجودہ حالات کے بارے میں بتا دیجئے گا۔ میں اس وقت نکل رہا ہوں۔'' پھر اچانک ذہن میں ابھرنے والے ایک خیال کے تحت میں نے دوبارہ ہانپتی سی آواز میں کہا۔ ''انکل! آپ پلیز میرا ایک اور کام کر دیجئے گا۔''

''ہاں، ہاں نادر!......... بولو، کیا بات ہے؟'' وہ پُرشفقت لہجے میں بولے۔ البتہ ان کے لہجے سے پریشانی اور تشویش مترشح ہو رہی تھی۔

''انکل! میں آپ سے رابطے میں رہنے کی کوشش کروں گا۔ آپ تب تک یہ بات واقعی کنفرم کر لیں کہ کیا واقعی نگینہ کو امریکہ سے لوٹتے وقت اغواء کیا گیا ہے؟''

''ٹھیک ہے بیٹا! یہ کون سی بات ہے۔ میں ابھی اسلام آباد کی انتظامیہ سے کنفرم کر لیتا ہوں۔ لیکن تم بھی نگینہ کے موبائل پر رابطہ تو کر کے دیکھو۔'' وہ بولے۔

''وہ میں کر کے دیکھ چکا ہوں۔ کوئی جواب نہیں ملا تھا مجھے۔ اچھا انکل! ایک اور اہم بات۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''ہاں، میں سن رہا ہوں۔''

''سردار زور آور والے معاملے سے متعلق میں نے آپ کو ساری بات بتا دی۔ ممکن ہے وہ گرین لاج کا رخ کریں۔ کیونکہ میں نے انہیں.........''

''نادر! میں سب سمجھ چکا ہوں۔ اور سنبھال بھی لوں گا ساری سچویشن۔ تم اللہ کا نام لے کر بس نکلنے کی کرو۔'' وہ میری بات کاٹ کر مہربان اور متفکر آواز میں بولے۔ میرا دل ان کی مہربانی پر بھر آیا۔

''اچھا انکل! میری کامیابی کی دعا کیجئے گا، خدا حافظ۔'' آخر میں میری آواز رندھ گئی۔

میں نے ٹریولنگ ایجنسی کو فون کیا اور چترال کے لئے کسی فلائٹ میں جگہ طلب کی۔ خوش قسمتی سے مجھے ساڑھے چار کی فلائٹ میں جگہ مل گئی۔ میرے پاس وقت کم تھا۔ چنانچہ میں نے منیجر مشتاق سے نقد رقم لی اور آندھی طوفان کی طرح راولپنڈی ایئر پورٹ روانہ ہو گیا۔

میرے اندر زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں پلک جھپکتے میں اسلام آباد تو کیا سیدھا وادی کیلاش جا پہنچوں۔ میری جلتی ہوئی چشم تصور نگینہ کو لمحہ بہ لمحہ جیسے مقتل گاہ کی جانب بڑھتے

ہوئے دیکھ رہی تھی۔ میری تشویش آمیز پریشانی اور بے چینی اب وحشت میں بدلنے لگی تھی۔ میری فلائٹ براستہ پشاور تھی جو اسلام آباد سے 172 کلومیٹر مغرب میں واقع تھا اور بہ مشکل آدھے گھنٹے کا فضائی سفر تھا۔ وہاں سے پچاس منٹ کی پرواز مجھے چترال پہنچا دیتی۔ اس کے بعد کسی فلائنگ کوچ یا ویگن کے ذریعے ڈھائی تین گھنٹوں میں کیلاش پہنچا جا سکتا تھا۔

فاصلہ تیزی سے سمٹنے کی امید پر دل و دماغ کو کچھ قرار ملا تھا۔ کیونکہ میں نے مجموعی طور پر یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اگلے چند گھنٹوں کے اندر اندر کیلاش وادی میں قدم رکھ چکا ہوں گا جبکہ وہ تینوں کیلاشی نگینہ کو اگر اغواء بھی کر چکے تھے تو یہ واردات آج صبح دس یا گیارہ کے درمیان کی گئی ہو گی اور اب یہ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کب اور کون سے راستے سے اپنے تیسرے ''مفرور'' ساتھی سے ملنے کے بعد واپس کیلاش کا عزم ہوں گے۔

بہر طور میں تیز رفتاری اور نان اسٹاپ ڈرائیونگ کے بعد ڈیڑھ گھنٹے کے اندر اسلام آباد پہنچا اور سب سے پہلے ایئر پورٹ کے قریب ہی جیپ سے چھٹکارا پانے کے بعد میں نے ایک قریبی پی سی او سے انکل اعظم خان سے رابطہ کیا تو انہوں نے میرے خدشے کی تصدیق کر ڈالی کہ آج صبح ایئر پورٹ سے واپسی پر لگ بھگ گیارہ بجے نگینہ کو دو نامعلوم افراد نے ان کی ٹیکسی روک کر اغواء کر لیا تھا۔ شاہ میر کو وہ ٹیکسی ڈرائیور کے پاس ہی چھوڑ گئے تھے اور ٹیکسی ڈرائیور تھانے میں تھا۔ نیز انکل اعظم خان سے میں نے شاہ میر کو اپنے ساتھ لے جانے کی گزارش کی اور پھر رابطہ منقطع کرنے کے بعد میں سیدھا پیدل ہی ایئر پورٹ کی طرف بڑھ گیا۔

ٹھیک ساڑھے چار بجے جہاز نے پشاور کے لئے ٹیک آف کیا۔ نصف گھنٹے کی پرواز کے بعد میں پشاور ایئر پورٹ پر اترا اور ساڑھے پانچ بجے دوبارہ وہی فلائٹ چترال روانہ ہو گئی۔

چترال ایئر پورٹ پر پہنچنے میں طیارے نے پچاس منٹوں کی بجائے پورا ایک گھنٹہ لگایا تھا۔ یوں تقریباً سوا چھ بجے میں چترال ایئر پورٹ سے نکلا۔ اب مجھے کیلاش وادی جانے کے لئے کسی جیپ یا ویگن کا سفر کرنا تھا۔

اڈے پر پہنچا تو مسافر ویگن نہ ملی مگر ایک جیپ والے سے کرایہ طے کیا۔ اس نے پورے ہزار روپے لے کر کیلاش وادی کے علاقے ''بمبریت'' پہنچانے کا وعدہ کیا۔

نگینہ کے سامنے بھلا اس معمولی رقم کی کیا حیثیت تھی! میں اس میں سوار ہو کر تقریباً دو ڈھائی گھنٹوں بعد رات نو بجے ''بمبریت'' پہنچا۔ یہاں ایک ہوٹل میں، میں نے رہائش اختیار کی۔ یہ وہی ہوٹل تھا جہاں کیلاش وادی کی اپنی پہلی مہم کے دوران آ چکا تھا۔ یہی سبب تھا کہ مجھے دوسری بار یہاں کا رخ کرنے میں معمولی سی بھی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

یہ علاقہ پاکستان کے انتہائی شمال میں ہونے کی وجہ سے بہت سرد تھا اور میں جن حالات اور تیزی کے ساتھ یہاں تک پہنچا تھا، مجھے گرم کپڑوں کا خاص اہتمام کرنے کا موقع یا وقت تک نہ مل سکا تھا۔ تاہم حسب معمول میں نے پینٹ شرٹ اور لیدر جیکٹ پہن رکھی تھی۔

منحوس عامل عاروب ''رمبور'' کے علاقے ''کالاش آگرم'' میں رہتا تھا اور وہیں نواح میں آبادی سے متصل علاقے میں اپنے پگوڈا نما عبادت خانے میں ہی رہتا تھا۔

پیٹ پوجا کے بعد میں پیش آمدہ حالات پر غور کرنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ اغواء کنندگان کیلاشیوں نے یہاں پہنچنے کے لئے ہوائی جہاز ہرگز استعمال نہیں کیا ہو گا۔ یہی صورت ٹرین یا پبلک ٹرانسپورٹ وغیرہ کی تھی۔ وہ یقیناً اپنی جیپ میں ہی کیلاش کے لئے روانہ ہوئے ہوں گے۔

میں ان کے بائی روڈ سفر کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ اسلام آباد سے پشاور بائی روڈ 172 کلومیٹر یعنی تقریباً تین سے چار گھنٹے، پھر پشاور سے چترال سات سے آٹھ گھنٹے، اس کے بعد وادی کیلاش، چترال شہر سے کوئی 40 کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ یعنی لگ بھگ انہیں اسلام آباد سے بارہ تیرہ گھنٹے کا سفر درکار تھا۔ جس میں دو تین گھنٹوں کا اضافہ بھی ہوسکتا تھا۔

اب اگر وہ نگینہ اور اپنے تیسرے ساتھی کے ساتھ ایک بجے اسلام آباد سے روانہ ہوئے تھے تو اب تک وہ نو دس گھنٹوں کا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ جبکہ یہاں پہنچنے تک انہیں مزید پانچ سے چھ گھنٹے درکار تھے۔ گویا رات تین بجے کے بعد ان کی بمبریت آمد متوقع تھی۔

مجھے چونکہ ان پر اب چھ گھنٹے پہلے کی برتری حاصل ہوگئی تھی اس لئے میری کوشش تھی کہ میں انہیں اپنے قبیلے یا عامل عاروب تک پہنچنے سے قبل ہی چھاپ لوں۔ لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ چترال سے کیلاش وادی میں داخلے کے تین راستے تھے۔ یعنی ''ریمبور''، ''بمبریت'' اور ''بریر'' خدا جانے وہ کون سے راستے کا انتخاب کرتے؟ تاہم کافی غوروفکر کے بعد میں نے یہی مناسب سمجھا کہ جدھر عامل عاروب کا پورا قبیلہ آباد تھا، اس کا ایک ہی راستہ تھا یعنی ''کیلاش آگرم'' یہ ان کے علاقے سے آٹھ، نو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔

تاہم یہاں معاملہ اب صرف نگینہ کو ان کے چنگل سے چھڑانے کا ہی نہ تھا بلکہ اس مردود عاروب کا قضیہ بھی ہمیشہ کے لئے نمٹانا تھا ورنہ ان خبیثوں کا خطرہ ہر وقت میرے اور نگینہ کے سر پر سوار رہتا۔ ان معاملات پر غور کرتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ کیلاش قبیلے کا ایک سردار ''آگرموشی'' عامل عاروب کے قبیلے کا دشمن تھا۔ اگر میں اس سے ملاقات کرتا تو ممکن ہے ہمارا مفاد ''مشترکہ'' ہونے کی وجہ سے میرا کام بھی آسان ہوسکتا تھا مگر اس سے پہلے یہ ضروری تھا کہ میں ان تینوں کا راستہ روک کر نگینہ کو عامل عاروب کے چنگل میں جانے سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کروں۔

میری یہ تنہا کوشش ناکامی سے بھی دوچار ہوسکتی تھی۔ کیونکہ میرے پاس ہتھیار نام کی کوئی شے نہ تھی اور میں کم از کم اس آخری اور نازک وقت میں اتنا بڑا رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔

تو پھر مجھے کیا کرنا چاہئے تھا؟......... کیا اس وقت کیلاش قبیلے کے سردار آگرموشی سے ملنا چاہئے تھا؟......... میرے ذہن میں فوراً ہی ایک خیال اُبھرا۔

میرے پاس ابھی پانچ چھ گھنٹے تھے۔ سردار آگرموشی کا قبیلہ بھی اس علاقے میں تھا۔ لیکن اس وقت رات کے نو دس بجے اور اس کاٹ دار سردی میں جبکہ ہر سمت گہری دھند اور پُرہول ٹھٹھرتے ہوئے سناٹے کا راج تھا، کسی ''خچر سواری'' کے ملنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

اچانک مجھے اس نوعمر چترالی گائیڈ داور خان کا خیال آیا، جو قریب ہی ایک جھونپڑی میں اپنے ماموں کے ساتھ رہتا تھا۔ داور خان وہی چترالی لڑکا تھا جس نے میری پہلی کیلاشی مہم میں خاصی مدد کی تھی اور ایک ہوشیار اور سمجھ دار لڑکا تھا اور غریب بھی۔ اپنے ماموں کے ساتھ وہ تنہا رہتا تھا۔ وہ سیاحوں کے لئے گائیڈ کا کام کرتا تھا۔ پہلی کیلاشی مہم میں بھی اس نے ہی میری رہنمائی کی۔ اس کے پاس ایک موٹا تازہ خچر بھی تھا۔ چنانچہ داور خان کا خیال آتے ہی میں اسی وقت ہوٹل سے نکلا اور پیدل ہی سنسان، ٹھٹھرتے ہوئے راستوں پر اس کی جھونپڑی کی طرف چل پڑا۔ داور خان اپنی اس جھونپڑی کو مڑھی کہتا تھا جو ہوٹل سے تھوڑے فاصلے پر ہی تھی۔ یہ حصہ آبادی کے کچے پکے مکانوں سے ذرا ہٹ کر شمال مغرب میں تھا۔

دیہاتی علاقہ ہونے کے باعث ہر طرف اندھیرا اور سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ آوارہ کتے تک سردی کے مارے کہیں کونوں کھدروں میں دبک گئے تھے۔ ہر سُو ہُو کا عالم تھا۔ میں اللہ کا نام لئے اپنی جیکٹ کی زپ گلے تک لگائے، دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔

داور خان کی ''مڑھی'' تک پہنچنے میں مجھے بہ مشکل پندرہ بیس منٹ لگے تھے۔ مڑھی کے آس پاس ویرانی کا راج تھا۔ ہر سُو خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مڑھی کے دروازے پر ٹاٹ جھول رہا تھا۔ دائیں جانب چھپر نما سائبان تلے دو خچر توبڑوں میں منہ دیئے کھڑے تھے۔ ایک خچر چھوٹی عمر کا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازے کا ٹاٹ ہٹایا۔ سنگل پٹ کا دروازہ بند تھا۔ میں نے دستک دی، کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے دوسری بار اور ذرا تیز دستک دی تو اندر سے ہلکی کھڑ پڑ کی آواز اُبھری۔ میں دل میں یہی دعائیں مانگنے لگا کہ آنے والا داور ہی ہو۔ کیونکہ پہچاننے کے بعد اس وقت وہی میری مدد کو تیار ہوسکتا تھا۔ دفعتہً اندر سے کھانسنے کی آواز کے ساتھ ہی بلغمی آواز اُبھری۔ یہ آواز قدرے ضعیف اور عمر رسیدہ شخص کی محسوس ہوتی تھی۔ اجنبی زبان میں ہی شاید اندر سے کچھ پچھا گیا تھا۔ داور خان کو اُردو بھی ٹوٹی پھوٹی آتی تھی۔ یقیناً اس کے ماموں کو بھی ٹوٹی پھوٹی اُردو آتی ہوگی۔ کیونکہ آخر کو بقول داور خان کے ''راہبر'' کا کام اس کے ماموں نے ہی اسے سکھایا تھا۔ اور ان لوگوں کو ٹوٹی پھوٹی ہی سہی، مختلف زبانیں بھی آتی ہوں گی۔ بہرطور میں نے ذرا کھنکار کر بلند آواز سے کہا۔

''میں مسافر ہوں......... رات گزارنا چاہتا ہوں۔ مناسب کرایہ دے دوں گا۔'' میں نے دانستہ یہ کہا تھا۔ کیونکہ داور خان کی زبانی مجھے معلوم تھا کہ یہ لوگ اکیلے دکیلے مسافر کو رات گزارنے دیا کرتے تھے۔

دروازہ فوراً ہی کھلا۔ لالٹین تھامے ایک عمر رسیدہ شخص نمودار ہوا۔ اس نے موٹی سرمئی اور بوسیدہ چادر کی بکل ماری ہوئی تھی۔ اس نے لالٹین والا ہاتھ ذرا اونچا کیا اور میرے چہرے کو آنکھیں سکیڑ کر دیکھنے لگا۔ مجھے یہ داور خان کا ماموں ہی لگا تھا۔ وہ بہ غور میرا جائزہ لینے کے بعد بولا۔

''اور کون ہے تمہارے ساتھ؟......... تمہارا سامان؟''

وہ خاصا محتاط معلوم ہوتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس کی آنکھوں سے مجھ اکیلے اور خالی ہاتھ مسافر کو دیکھ کر شک کی رمق اُبھری تھی۔

''میں اکیلا ہی ہوں۔'' میں نے مختصراً جواب دیا۔ مگر اس کی تسلی نہ ہوئی۔ اسے تذبذب میں پا کر میں مزید بولا۔ ''تم شاید داور خان کے ماموں ہو۔ اس سے پہلے بھی میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہاں آچکا ہوں۔ داور نے ہمیں یہاں کی سیر کروائی تھی۔ دراصل ایک ضروری کام کے سلسلے میں مجھے فوراً تنہا اور خالی ہاتھ نکلنا پڑا۔ کیونکہ اس بار میں سیر کرنے نہیں اپنے کچھ ساتھیوں کی تلاش میں آیا ہوں۔''

اس بار مختصراً وضاحت اور اپنے بھانجے کا ذکر سن کر اس نے مجھے اندر آنے کا کہا۔ میں اس کے عقب میں اندر تنگ و تاریک کوٹھڑی میں آگیا۔ اندر دو جھلنگا سی چارپائیاں رکھی تھیں۔ ایک پر کوئی موٹا سا بوسیدہ کمبل اوڑھے سو رہا تھا۔ بابا نے لالٹین دیوار پر اُبھری ہوئی کیل پر لٹکا دی۔ مجھے چارپائی پر بیٹھنے کو کہا۔ داور خان کے مقابلے میں اس کی اُردو صاف تھی۔ میں خاموشی سے چارپائی پر پاؤں جھلائے بیٹھ گیا۔ وہ بھی میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

''کیا نام ہے تمہارا.........؟''

''نادر۔'' میں نے جواب دیا۔

''کہاں سے آئے ہو؟'' وہ گھاگ اور تجربہ کار لگتا تھا۔

''لاہور سے۔'' میں نے جھوٹ بولا۔

''تمہارے کون سے ساتھی کھو گئے ہیں؟''

''میرا دوست اور اس کی بیوی۔ وہ دونوں دراصل ایک اخبار کے لئے کام کرتے ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ ہی اخبار میں کام کرتا ہوں۔ ان کی تلاش میں آیا ہوں۔''

''ہاں......... یہاں سیاحوں کے علاوہ اخبار والے بھی آتے ہیں۔'' وہ سر ہلا کر بولا۔ میں نے شکر کیا کہ وہ میری باتوں سے مطمئن نظر آ رہا تھا۔ میں نے یونہی لقمہ دیا۔

''بابا! تمہارا کیا خیال ہے، میری اس معاملے میں کون مدد کر سکتا ہے؟''

''پولیس میں رپورٹ درج کروائی تھی تم نے؟'' اس نے غالباً کسی خیال کے تحت مجھ سے پوچھا۔

''ہاں۔ چترال کے ایک تھانے میں۔'' میں نے جھوٹ بولا۔ ''لیکن وہ بھی ناکام ہو گئے ہیں۔ یا پھر انہوں نے کوئی خاص کوشش نہیں کی ہوگی۔''

''تم نے ٹھیک کہا۔ یہاں برف پوش وادیوں میں کسی کو تلاش کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔''

''ہاں بابا! اس لئے میں خود بھی آیا ہوں۔ میرا خیال ہے میری اس معاملے میں کوئی مقامی بااثر شخصیت ہی مدد کر سکتی ہے، تمہارا کیا خیال ہے؟'' میں نے گیند اس کی کورٹ میں پھینکی تو وہ کچھ سوچنے لگا۔ میں بھی اس کے بولنے کا منتظر رہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے سردار آگرموشی سے ملنے کا ہی مشورہ دے گا مگر اس کے برعکس وہ چند ثانیے کی پُرسوچ خاموشی کے بعد بولا۔

''تمہیں خود ہی کوشش کرنا پڑے گی۔ یہاں کے سردار کسی ایسے معاملے میں نہیں پڑتے۔ میرا خیال ہے میرا بھانجا داور خان تمہاری مدد کر سکتا ہے۔ اگر تم کچھ دینے دلانے کی بات کرو تو۔''

اس نے گویا میرے دل کی بات کر ڈالی۔ وہ مجھے لالچی لگا تھا۔ ممکن ہے اس نے کسی سردار کے اس معاملے میں نہ پڑنے والی بات بھی اسی لئے کی ہو۔ بہرطور میں نے فوراً اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''درحقیقت میں خود بھی یہی چاہتا ہوں۔ مجھے تمہارے بھانجے داور خان کی قابلیت پر پورا بھروسہ ہے۔ کیا تمہارا بھانجا داور خان سو رہا ہے؟'' میں نے آخر میں سامنے والی ایک دوسری چارپائی پر سوئے شخص کی طرف اشارہ کر کے پوچھا تو اس نے فوراً اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔''

میں نے اب اصل بات کی طرف آتے ہوئے اس سے کہا۔ ''بابا! درحقیقت بات یہ ہے کہ میں اس معاملے کو خود بھی خفیہ رکھنا چاہتا ہوں۔''

''کیوں......... کوئی خاص بات؟'' اس نے قدرے چونک کر پوچھا تو میں نے دانستہ عامل عاروب کے قبیلے کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا۔ ''میرے دونوں گمشدہ ساتھی درحقیقت یہاں کے کسی مخصوص قبیلے پر تفصیلی فیچر لکھنا چاہتے تھے جو کسی دابولامینزی نام کے دیوتا کے پجاری ہیں۔ سنا ہے کہ ان کا ایک روحانی پیشوا جس کا نام غالباً عاروب ہے، وہ بہت بڑا عامل ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ میرے دونوں ساتھیوں کی گمشدگی میں اسی قبیلے کا ہاتھ ہے۔'' یہ کہہ کر میں اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری اس بات پر وہ بری طرح چونک کر میرا چہرہ تکنے لگا۔ میں نے دیکھا، اس کے ضعیف اور جھریوں بھرے چہرے پر کچھ عجیب سے تاثرات پھیل گئے تھے۔ وہ بغور اور مسلسل میرا چہرہ تکنے لگا کہ بالآخر میں نے پوچھا۔

''کیا ہوا بابا! کیا میری بات پر یقین نہیں آیا تم کو؟''

''نہیں......... ایسی بات تو نہیں۔'' وہ جلدی سے میرے چہرے سے اپنی نظریں ہٹا کر بولا۔

''میں درحقیقت یہ سوچ رہا تھا کہ اگر تمہارے ساتھی واقعی عامل عاروب کے قبیلے والوں کے ہتھے چڑھ چکے ہیں تو ان کا زندہ بچنا بہت مشکل ہے۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو بابا تم؟'' میں نے دانستہ اپنے چہرے پر پریشانی سموتے ہوئے اس سے کہا۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں اس مہم میں اپنے بھانجے داور خان کی جان کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔ ہاں، تم رات یہاں گزار سکتے ہو مگر صرف آج کی رات۔'' اس کے متوقع جواب پر میں نے اصل بات کی ...آتے ہوئے کہا۔

''اچھا بابا!......... مگر میں اکیلا ہی اس مہم کو سر کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن دراصل پہلے یہ بات کر ...چاہتا ہوں کہ آیا میرے دونوں ساتھی انہی لوگوں کے قبیلے میں ہیں بھی یا نہیں؟ اگر وہ دونوں ان کی قید ...زندہ ہیں تو میں فوراً واپس چترال جا کر پولیس کو خبر دوں گا اور پھر ساری آگے کی کارروائی وہ لوگ کریں ...اور اس مہم کے لئے بہترین وقت یہی ہے۔ اگر تم اپنے بھانجے کو میرے ساتھ نہیں بھیجنا چاہتے تو مجھے اپنا ...ے دو۔ میں واپس لوٹ کر خچر تمہارے حوالے کر دوں گا۔ تم بے شک اس کا جتنا چاہے معاوضہ مجھ سے ...لو۔''

...میرا خیال تھا وہ میری اس بات پر کچھ لیت و لعل سے کام لے گا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے حیرت ہوئی ...وہ بلا تامل میری بات مان گیا۔ پھر چارپائی سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

''اچھا......... سردی میں نکلو گے......... میں تمہارے لئے قہوہ بنا کر لاتا ہوں۔ تم آرام سے بیٹھو۔''

...کے منع کرنے کے باوجود وہ قہوہ بنانے کے لئے کوٹھڑی سے باہر نکل گیا۔

...اس کے یوں اچانک مان جانے اور پھر قہوہ کی دعوت دینے پر نہ جانے کیوں میرے دل و دماغ کو ...ایک بے چینی نے جکڑ لیا۔ مگر پھر تھوڑی ہی دیر بعد وہ ایک چھوٹی سی پیالی میں میرے لئے قہوہ بنا کر ...لایا اور مجھے تھما دیا۔

''لو......... قہوہ پیو۔''

...میں نے قہوے کی پیالی اس کے ہاتھ سے لی اور ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگا۔ قہوہ خوش ذائقہ اور خوشبودار ...تھا۔ جیسے ہی میں نے قہوے کی پیالی ختم کی، اچانک مجھے اپنے وجود میں بے جانی کی سی کیفیات محسوس ...ہونے لگیں۔ میرے ہاتھ سے قہوے کی خالی پیالی بھی چھوٹ کر گر پڑی۔ پھر میں بھی چارپائی پر بے جان ہو ...کر گر پڑا۔ بڑی عجیب کیفیت ہو گئی تھی......... میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ میں سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ ...سماعت بھی پوری طرح بیدار تھی مگر میرا پورا جسم بے حس و حرکت ہو کر رہ گیا تھا۔ میں نے اپنے بے ...جان وجود کو ہلانے جلانے کی بھی کوشش کی مگر بے سود۔ میں تو اپنی ایک انگلی کو بھی جنبش دینے کا روادار نہ ...تھا۔ مضبوط اعصاب کا مالک ہونے کے باوجود میں سرتاپا لرز اٹھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر میرے ...ساتھ اچانک یہ ہوا کیا تھا؟......... میں نے اپنی آنکھوں کو گردش دی اور قریب بیٹھے میزبان کی طرف مدد ...طلب نظروں سے دیکھا۔ مگر اس کے چہرے پر عجیب سی سرد مہری کھنڈی ہوئی تھی۔ پھر وہ چارپائی سے اٹھا ...اور کوٹھڑی سے باہر نکلتا چلا گیا۔

...میں نے حلق کے بل منہ کھول کر چلانے، چیخنے کی کوشش بھی کی مگر آواز تک نہ نکل سکی۔ حتیٰ کہ منہ بھی اپنا ...ہلا سکا تھا میں۔ بڑی ہی عجیب و غریب اور پراسرار و پیچیدہ مصیبت تھی یہ۔ اور اس کا مقصد؟ ...میں صرف دیکھنے اور سوچنے کے قابل تھا۔ میزبان بابا کی نیت پر مجھے شبہ ہونے لگا۔ اس کے سرد مہر رویے اور ...اس کے ساتھ کوٹھڑی سے باہر نکل جانے پر مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ اب تو یہ ساری کارستانی اسی ...بڈھے کی تھی۔ اس نے مجھے کوئی ایسی دوا قہوے میں گھول کر پلا دی تھی کہ جس نے میرا تمام وجود ...مفلوج کر ڈالا تھا۔

''مگر کیوں؟''

یہ سوالیہ نشان نشتر کی طرح میرے ذہن میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ کیونکہ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ پتہ نہیں میری تقدیر میں کیا لکھا تھا۔ میں جب بھی نگینہ کو مشکل حالات سے نکالنے کی تدبیر کرتا۔ کسی نہ کسی نئی مصیبت میں گرفتار ہو جایا کرتا تھا۔ وقت ہر ایک لمحہ مجھے ٹائم بم کی ٹک ٹک کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ خبیث بڈھا کچھ دیر بعد واپس لوٹے گا۔ مگر کافی دیر گزر گئی، وہ نہ لوٹا۔ اب تو میری پریشانی فزوں تر ہونے لگی۔ ادھر مجھے نگینہ کی بھی تشویش کھائے جا رہی تھی۔ شاید ایک بار پھر میں تاخیر کی زد میں آ رہا تھا۔

میں اپنی گردن بھی ہلانے کا روادار نہ تھا۔ میں نے پھر حلق سے آواز نکالنے کی کوشش کرنی چاہی کہ قریب کی چارپائی پر لیٹے ہوئے داور خان کو نیند سے بیدار کر دوں۔ جب میں نے خود کو ہر طرح سے بالکل بے بس پایا تو میں یہی دعائیں مانگنے لگا خدا سے کہ کاش داور خان خود ہی بیدار ہو جائے۔ وہ خبیث نہ جانے مجھے یوں مفلوج بنانے کے بعد کہاں دفعان ہو گیا تھا۔ اچانک پھر جیسے میری دعا قبول ہو گئی۔ میں نے کھانسنے کی آواز سنی۔ میں اپنی گردن تو نہیں موڑ سکتا تھا مگر محسوس کر سکتا تھا کہ یہ آواز داور خان کی چارپائی سے ابھری تھی۔ میرا دل امید تلے زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پھر میں نے چارپائی کے چرچرانے کی آوازیں سنی۔ میرا دل پھر یکبارگی دھڑکا۔ میرا چہرہ چھت کی طرف تھا۔ تاہم آنکھوں کے ڈیلے گھما کر میں نے قریب بچھی چارپائی کی طرف دیکھنے کی کوشش کی تو میں نے کسی کو کمبل ہٹا کر چارپائی پر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے دیکھا۔

تب پھر دوسرے ہی لمحے میری نظروں کے سامنے داور خان کھڑا تھا جو مجھے یوں بے سدھ چارپائی پر اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکتے جا رہا تھا۔ میری آنکھیں بھی اس کے چہرے پر جم گئی تھیں۔ میری آنکھوں میں التجا آمیز بے بسی کے سائے تھے۔ داور خان لالٹین کی مدھم روشنی میں شاید میرا چہرہ پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے شاید پھر بھی تسلی نہ ہوئی تو اس نے فوراً آگے بڑھ کر دیوار سے لالٹین اتاری۔ اس کی لو بڑھا کر پھر لالٹین میرے چہرے کے ذرا قریب لاتے ہوئے خود بھی جھک کر بغور میرے چہرے کو تکنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اس کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ شناسائی کی چمک ابھرتے دیکھی۔ تب بے اختیار اس کے لبوں سے برآمد ہوا۔

''ارے صیب! تم........تم تو وہی والے صیب ہو۔'' وہ مجھے پہچان چکا تھا۔

''پھر........تم بولتے کیوں نہیں ہو؟........کیا ہوا ہے تمہیں؟'' وہ حیرانی سے بولا مگر میں اپنے ہونٹوں کو باوجود کوشش کے ایک ذرا سی جنبش بھی نہ دے سکا۔ تب اس نے خود ہی میرے بے سدھ جسم کو ہلایا جلایا اور میں پھر بھی کچھ نہ بول سکا تو وہ سیدھے کھڑے ہو کر اپنے ہونٹ بھینچے کچھ سوچنے لگا۔ اس کے بعد اس نے اپنے ماموں کو چترالی زبان میں آوازیں دیں۔ وہ باہر بھی گیا۔ ذرا ہی دیر بعد لوٹا تو اچانک اس کی نظر شاید فرش پر گری ٹوٹی ہوئی قہوے کی پیالی پر پڑی۔ میری کھلی نظریں بدستور اس کے چہرے کا طواف کئے جا رہی تھیں کہ شاید اب یہ میرے لئے کچھ کرتا۔

وہ چند ثانیے ہاتھ میں اپنی لالٹین پکڑے پُرسوچ انداز میں کھڑا رہا۔ اس کے بعد خود کلامیہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ''یہ ضرور ماما کی ہی حرکت ہو سکتی ہے۔ اس نے تمہیں ہڑ کی بوٹی گھول کر پلا دی۔ مگر کیوں؟........کیا وہ تمہیں کوئی چور یا راہزن سمجھتا تھا؟''

میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اپنا حلق پھاڑ کر اس سے یہ استدعا کروں کہ خدا کے لئے مجھے اس جلد فالج زدہ حالات سے نجات دلانے کی فوری طور پر کوئی تدبیر کرے۔ اس نے ابھی ابھی جس ''ہڑ'' نام والی بوٹی کا ذکر کیا تھا، یقیناً اس میں کوئی ایسی تاثیر تھی جس کے گھول کر پینے سے انسان کی حالت ایسی ہو جاتی تھی جیسی کہ میری ہوئی تھی۔

''صیب! تم فکر نہ کرو۔'' معاً داور خان نے مجھ سے ازراہ تشفی کہا۔ وہ شاید میری آنکھوں کی التجا پڑھ چکا تھا۔ ''لگتا ہے، میرے ماما کو تمہاری طرف سے کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر وہ کہاں غائب ہو گیا ہے؟ ویسے تمہاری یہ حالت مستقل نہیں رہے گی۔ میں کوشش کرتا ہوں۔'' بالآخر اس نے کہا تو بے اختیار میں نے سکون کی سانس لی۔ اس نے لالٹین آگے بڑھ کر دوبارہ دیوار میں نصب کیل پر لٹکائی اور پھر ایک چھوٹی سی کٹوری میں جانے کیا شے بھر لایا۔ اس میں کوئی روغن تھا جسے وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر ملنے کے بعد میرے ہاتھوں پیروں پر رگڑنے لگا۔ ابھی اسے یہ سب کرتے ہوئے ذرا ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک مڑھی کے باہر خچروں کے خرخرانے کے علاوہ چند لوگوں کے باتیں کرنے کی آوازیں ابھریں۔

میرا دل یکبارگی کسی نامعلوم اندیشے سے دھڑک اٹھا۔ میرے ہاتھوں پیروں پر ہلکی ہلکی سی روغنی مالش کرتے ہوئے داور خان بھی چونک پڑا اور پھر وہ میری چارپائی سے اٹھ کر جیسے ہی تیزی کے ساتھ باہر نکلنے لگا، اچانک کوٹھڑی میں اس کا خبیث بڈھا ماموں دو تین لحیم شحیم پہاڑی افراد کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ نہ جانے کیوں وہ تینوں مجھے شناسا سے محسوس ہوئے۔ اس خبیث نے اپنے بھانجے داور خان کو گھورا۔ اس دوران اس کے ہمراہ آنے والے تینوں پہاڑی سرخ و سپید افراد میری چارپائی کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے اور بغور میرے چہرے کو گھورنے لگے۔ اس دوران اس خبیث بڈھے نے اپنے بھانجے داور خان سے غصیلے لہجے میں مقامی زبان میں کچھ کہا۔ غالباً یہی پوچھ رہا ہو گا کہ یہ میرے ساتھ کیا کر رہا تھا۔

داور کی آنکھوں میں حیرت تھی اور وہ حیران پریشان تھا۔ اس نے اپنی زبان میں اپنے خبیث ماموں سے کچھ پوچھا بھی تھا لیکن اس کے ماموں نے اسے جھڑک کر خاموش کرا دیا۔ پھر ان تینوں سے میری طرف اشارہ کر کے کچھ پوچھا۔ ان تینوں لحیم شحیم سرخ و سپید پہاڑی افراد کی جلتی سلگتی نظریں بدستور میرے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ مجھے ان کی آنکھوں سے نفرت و غیظ کی چنگاریاں سی پھوٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔ میرے لئے ان کے تاثرات بالکل ایسے ہی تھے، جیسے کوئی بہت عرصے بعد اپنے جانی دشمن کو قریب سے دیکھ رہا ہو۔ ان تینوں کی جلتی ابلتی کیفیات پر میرے اندر بھی ہولناک خدشات نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ اب تو میرے رہے سہے ماندہ اوسان بھی خطا ہونے لگے تھے اس اندیشناک خیال سے کہ کہیں یہ تینوں اس خبیث عامل عاروب کے اہلکاروں میں سے تو نہیں تھے۔ یوں یہ خبیث بڈھا میزبان دھوکے سے مجھے اب ان کے حوالے کرنے والا تھا۔

تب پھر ان تینوں نے بیک وقت اثبات میں سر ہلایا اور پھر مجھے ڈنڈا ڈولی کر کے خچر گاڑی تک لے گئے۔ لڑکا داور خان بھی ایک طرف حیران پریشان کھڑا تھا۔ یہ لوگ مجھے خچر گاڑی میں ڈال کر روانہ ہو گئے۔ یہ چھکڑا یعنی خچر گاڑی قدیم طرز کی تھی۔ ہالی وڈ کی فلموں میں برف باری کے دوران سانتا کلاز ایسی چھکڑا گاڑی میں قتل و غارت گری کا بازار گرم کرتے تھے۔ میں بے حس و حرکت تقدیر کی اس کارفرمائی پر حیران و پریشان تھا۔ میری ساری تدبیریں دھری رہ گئی تھیں اور میں اپنی بدقسمتی یا عاروب کی خوش قسمتی کے باعث خود ہی اس کا شکار بن گیا تھا۔ دوسری طرف نگینہ تو اس کے کارندوں کے قبضے میں تھی ہی اور اب میں فالج زدہ شخص کی طرح عاروب کی طرف کشاں کشاں لے جایا جا رہا تھا۔

داور خان کو اگر کچھ وقت مزید مل جاتا تو وہ یقیناً میرے ہاتھ پیروں کی اس مخصوص روغن سے مالش کر کر درست حالت میں لاسکتا تھا۔ مگر عین وقت پر اس کا خبیث ماموں ان تینوں دشمنوں کے ساتھ آن ٹپکا تھا۔

چھکڑے کا سفر جاری تھا۔ میں پچھلے حصے میں بھیڑ بکری کی طرح پٹخ دیا گیا تھا۔ عامل عاروب کا ایک ہر میرے ساتھ موجود تھا۔ دوسرا چھکڑا چلا رہا تھا۔ تیسرا شاید چھت پر تھا۔

راستہ ناہموار تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ چھکڑے کی رفتار بھی خاصی تیز تھی۔ میں چھکڑے کے چوبی تختے پر بے سدھ پڑا کسی بوری کی طرح اِدھر اُدھر لڑھک رہا تھا۔

اچانک میں نے پہلی بار اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں اور پیروں کے تلووں میں سنسناہٹ اُبھرتی محسوس کی۔ اب پتہ نہیں یہ روغن کی مالش کے تھوڑے بہت اثرات تھے یا پھر چھکڑے کے ہچکولوں کی اٹھاخ پٹاخ کہ جس نے میری سن پڑتی رگوں میں خون کی گردش تیز کر ڈالی تھی۔ یوں بھی مجھے یاد آیا کہ داور خان نے میری کیفیات دیکھتے ہی مجھے تسلی دیتے ہوئے یہ کہا تھا کہ میری یہ کیفیت عارضی ہوگی۔ میں نے فوراً اس اٹھاخ پٹاخ کے دوران اپنے ہاتھوں پیروں کو حرکت دینا شروع کر دی، جن میں جان پڑتی محسوس ہوئی تھی۔ چھکڑے میں ڈولتی ہوئی لالٹین کی یرقان زدہ روشنی پھیلی ہوئی تھی مگر اس کے باوجود وہ ہرکارہ میری حرکات و سکنات پر غور کرنے سے قاصر تھا۔ کیونکہ میں ہچکوؤں سے ہلنے جلنے کے دوران اپنے ہاتھوں پیروں کو اس طرح ہلا رہا تھا کہ اسے شبہ نہ ہو کہ میں وارم اپ کر رہا تھا۔ تب پھر جس طرح اچانک میرے ہاتھوں پیروں کی طاقت زائل ہوئی تھی، وہ اب یکدم دوبارہ بحال ہوتی محسوس ہونے لگی۔ چند ہی لمحوں میں میرے وجود کی کھوئی ہوئی طاقت بحال ہوگئی۔ اس کے ساتھ جوش میرے روئیں روئیں میں بجلی بن کر دوڑنے لگا۔ میں موت بن کر اندر بیٹھے ہرکارے پر جھپٹا۔ اس کے سان وگمان میں بھی نہ رہا ہوگا کہ میں قضا کی طرح اس پر آ پڑوں گا۔ اس کی گردن میرے بازوؤں کے شکنجے میں آ گئی۔ اس وقت میری نس نس میں جنون کا جوالا مکھی اُبل رہا تھا۔ یہی سبب تھا کہ میں نے اسے ایک لمحے کا بھی موقع دیئے بغیر اس کی گردن کو زوردار جھٹکا دیا۔ ''کڑاک'' کی آواز سے اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی اور وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ اس نے سمور کا لباس پہن رکھا تھا۔ میں نے جلدی جلدی اس کی تلاشی لی تو ایک عجیب وضع کی ''سنان'' برآمد ہوئی جس کی دھار دو رویہ اور تیز تھی۔

چھکڑا کمرہ نما تھا۔ عقبی حصہ کھلا ہوا تھا جہاں سے چاندنی میں نہایا ہوا برف زار علاقہ صاف نظر آ رہا تھا۔ دور برف پوش چوٹیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ میں ''سنان'' ایک ہاتھ میں لئے مذکورہ کھلے حصے کے ایک بیرونی چوبی تختے پر اپنے دونوں پاؤں جمائے کھڑا ہوا اور چھت کی طرف جھانکا۔ مجھے دوسرا اگر گا بیٹھا ہوا نظر آیا۔ وہ بے خبر تھا۔ میں نے سردست ان دونوں سے بھڑنے کا فیصلہ ترک کیا اور چھکڑے کے چوبی تختے سے برف زار راستے پر چھلانگ لگا دی۔

چھلانگ میں نے مخالف سمت کی بجائے چھکڑے کے رخ پر متوازی لگائی تھی اور ذرا دیر تک دوڑتا رہا تھا۔ ورنہ میں گر سکتا تھا۔ پھر میں رک گیا اور ہانپتا ہوا کھڑا ہو گیا اور چھکڑے کو دور تاریکی میں جاتا دیکھتا رہا۔

ذرا ہی دیر بعد وہ چھکڑا نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

میں نے اپنی سانسیں بحال کیں، پھر اپنی ریڈیم ڈائل والی رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔ رات کا ایک بجنے والا تھا۔ گویا تین چار گھنٹوں بعد عامل عاروب کے وہ تینوں ہرکارے نگینہ کو اپنی جیب میں لئے یہاں والے تھے۔ لیکن اب بات میرے حوالے سے بھی خاصی تشویش ناک ہو چکی تھی۔

اگر تو یہ چھکڑا سوار ہرکارے عامل عاروب کے ہی ساتھی تھے، جس کا امکان بہرحال بہت زیادہ تھا تو اب پوری وادی میں میری تلاش جاری ہو سکتی تھی۔ یعنی اب میری اس علاقے میں موجودگی راز نہیں رہی۔

اب مجھے کیا کرنا چاہئے تھا؟........ پہلا خیال میرے ذہن میں یہی آیا تھا کہ مجھے واپس پلٹ کر اس بڈھے میزبان کی خبر لینا چاہئے تھی جس نے مجھے دھوکے سے قہوے میں کوئی ہڑ نامی جڑی بوٹی پلا کر ...ج کر دیا تھا اور بعد میں ان کے حوالے بھی کیا تھا۔ اس سے کم از کم یہ تو دریافت ہو سکتا تھا کہ آیا ان ہرکاروں کا کیا واقعی عامل عاروب سے ہی تعلق تھا؟ اور اگر تھا تو کیا وہ فریبی بڈھا ان کے ساتھ ملا ہوا ان کا پیروکار بن چکا تھا؟

ابھی میں اسی شش و پنج میں کھڑا تھا کہ اچانک جس طرف سے میرا چھکڑا آیا تھا، اس سمت ایک حرکت ہی۔ میری پوری توجہ اس جانب مرکوز ہوگئی۔ اسی وقت ایک خوف ناک خیال میرے ذہن میں اُبھرا اور ...تیزی سے قریبی جھاڑی کی اوٹ میں ہو گیا۔ یہ جھاڑیاں ایک برفیلی ڈھلان میں اُگی ہوئی تھیں۔ چند ...وں بعد میں نے ذرا سر ابھار کر دیکھا تو وہ کوئی خچر سوار تھا۔ اس نے گرم موٹا بوری نما لباس پہن رکھا تھا۔ ...ذرا قریب آیا تو میں بری طرح چونک اٹھا۔ وہ داور خان تھا۔ میں فوراً جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلا۔ وہ بھی ...ٹھٹکا مگر پھر مجھے پہچاننے کے بعد فوراً خچر کی پیٹھ سے اتر کر میری جانب لپکا۔

''صیب!........ صیب! تم........ ٹھیک تو ہو نا؟''

میرا دل اس لڑکے کی محبت اور دوست نوازی پر بھر آیا۔ میں نے بے اختیار اسے گلے لگا لیا۔

''تمہارے روغن نے میرے مفلوج جسم کی طاقت لوٹائی ہے۔'' میں نے تشکر آمیز لہجے میں اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا اور پھر اسے ساری بات بتا دی۔

''صیب!........ یہ تینوں، عامل عاروب کے ہی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔'' وہ پُر جوش لہجے میں بتانے ...اور میں اس کا چہرہ تکنے لگا۔ میری استفسار طلب نظریں اپنے چہرے پر مرکوز پاتے ہوئے اس نے مزید ...''میرا ماموں یوشے، ایک لالچی انسان ہے۔ تم نے یقیناً اپنے بارے میں اسے سب بتا دیا ہوگا۔''

''ہاں........ مگر کچھ زیادہ نہیں........ لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ........''

''صیب! آپ کی جان کو یہاں سخت خطرہ ہے۔'' وہ اچانک میری بات کاٹ کر متوحش لہجے میں بولا۔ ...یہ انہی لوگوں کا علاقہ ہے۔ پہلے یہاں سے فوراً نکلنا ہوگا۔ آؤ۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے خچر پر سوار ہو گیا اور مجھے ...اپنے پیچھے سوار ہونے کا کہا۔

''یہ وزن سہار لے گا ہم دونوں کا؟''

''ہاں صیب! یہ بہت سخت جان ہے۔ آ جاؤ۔'' وہ مسکرا کر بولا اور میں اس کے پیچھے خچر کی پیٹھ پر سوار ہو ...یا۔ داور خان نے خچر کی لگام تھام کر اسے واپس موڑا اور درمیانی رفتار سے دوڑانے لگا۔

''کیا اب تم مجھے واپس مڑھی کی طرف لے جا رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' وہ نفی میں سر ہلا کر بولا۔ ''میں آپ کو وادی سے باہر کسی محفوظ مقام پر چھوڑ آتا ہوں۔''

''تم ایسا کرو۔'' میں نے اس کی بات سن کر کہا۔ ''میں نے یہاں سے قریب ہی ایک ہوٹل میں کمرہ ...ے رکھا ہے۔ تم اس طرف چلو۔''

''مگر صیب! آپ کی جان کو خطرہ ہے۔''

''تم چلو۔ وہاں مجھے کوئی خطرہ نہیں۔ میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

اس کے بعد ہم ہوٹل میں آ گئے۔ اس نے ہوٹل کے پچھواڑے اپنا خچر باندھا اور پھر میں اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔ ''اب تم مجھے سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارے ماموں پوشے کا کیا معاملہ ہے؟ پھر میں تمہیں اپنے یہاں آنے کا مقصد بتاؤں گا۔''

میری بات پر اس نے مجھ سے جو سنسنی خیز انکشافات کیے ان کا لب لباب یہ تھا کہ میری سابقہ مہم جوئی اور اس کے نتیجے میں ہونے والی خونریزی اور میری فتح کے بعد پوری وادی میں سنسنی دوڑ گئی تھی۔ اس معرکے میں عامل عاروب کے زخمی ہونے سے اس کا حریف قبیلہ بہت خوش تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ عاروب کسی کے مقابلے میں ہلکا پڑا تھا۔ اس سے پہلے خود آگرموشی سردار کے قبیلے کا دو مرتبہ عاروب اور اس کے پیروکاروں سے مقابلہ ہو چکا تھا اور دونوں مرتبہ بدقسمتی آگرموشی سردار کے ساتھ رہی۔ یہی سبب تھا کہ جب آگرموشی کو عاروب کے زخمی ہونے کی اطلاع ملی تو انہوں نے ایک مرتبہ پھر عاروب کے قبیلے پر حملہ کیا۔ مگر حیرت ناک طور پر اس مرتبہ بھی عامل عاروب کے قبیلے نے ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا اور انہیں تیسری مرتبہ شکست دے دی تھی۔ تاہم اس فتح کے بدلے میں نہ صرف انہیں بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا تھا بلکہ خود عاروب بھی مرتے مرتے بچا تھا۔ اس مقابلے کے بعد دونوں طرف سے خاموشی طاری تھی۔ مگر واقفانِ حال سمجھتے تھے کہ یہ خاموشی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھی۔ یہ معاملہ ایک طرف تھا، دوسری طرف میرے ہاتھوں عاروب کی ہزیمت ایسا واقعہ نہیں تھا جسے اس کے قبیلے والے خاموشی سے بھلا دیتے۔ ایک طرف عاروب نے نگینہ اور مجھے پکڑوانے کے لئے اپنے مہم جو راولپنڈی بھجوائے تھے تو دوسری طرف اس کے ایک خاص گرگے بوغا نے اپنے جاسوس اس علاقے میں پھیلا دیئے تھے جن کا کام باہر سے آئے لوگوں پر نظر رکھنا تھا اور ان میں سے جب کوئی عامل عاروب کے متعلق بات کرتا تو اس کی اطلاع بوغا کو فراہم کرتے تھے۔ داور خان کا ماموں بھی اس جاسوس گروپ کا اہم رکن تھا۔

داور خان کی زبانی یہ ساری تفصیل جان کر میں حیران رہ گیا تھا۔ پھر میں نے داور خان کو اپنی تازہ ترین مہم کے بارے میں آگاہ کیا اور اسے بتایا کہ درحقیقت میں ہوٹل سے اس سے ملنے اس کی مڑھی آیا تھا کہ میرا سامنا اس کے خبیث لالچی ماموں پوشے سے ہو گیا۔

''صیب! اگر یہ بات ہے تو پھر آپ کو میرے ساتھ ابھی چلنا پڑے گا۔ کیونکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ تینوں نگینہ بی بی کو کس راستے سے لے کر اپنے قبیلے کی حدود میں داخل ہوں گے۔''

یہ سنتے ہی میں ساری کلفت بھول گیا اور بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''تم نے تو میرا مسئلہ حل کر دیا۔ یہ بتاؤ، کب چلنا ہے؟''

''فوراً چلو صیب! وہ تینوں حرام زادے نگینہ بی بی کو اگر ایک بار اپنے قبیلے میں لے گئے تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔'' وہ آخر میں خاصے تفکر سے بولا۔

''چلو پھر.........'' میں نے کہا۔ اس کے بعد ہم ایک بار پھر تاریکی میں خچر پر سوار ہو کر آگے بڑھ گئے۔ عاروب کے پیروکاروں سے چھینی ہوئی ''سنان'' میرے قبضے میں تھی۔

داور خان نے مجھے بتایا کہ وہ تینوں فرستادے نگینہ سمیت جس راستے سے اپنے قبیلے کی حدود میں داخل ہو سکتے تھے، وہ یہاں سے تقریباً پندرہ سولہ کلومیٹر دور ویران برف زاروں میں تھا۔

داور خان نے مجھے اپنے بارے میں بھی بتایا تھا کہ وہ ایک یتیم و یسیر لڑکا تھا۔ اس کا آبائی وطن چترال تھا۔ مگر ماں باپ کے مرنے کے بعد اس کا لالچی اور خود غرض ماموں پوشے اسے یہاں لے آیا تھا۔ پوشے خود بھی گائیڈ کا کام کرتا تھا مگر داور خان کے آنے کے بعد اس نے سارا بوجھ اسی پر ڈال دیا تھا اور کاہلوں کی

طرح چارپائی پر پڑا رہتا تھا۔ تاہم داور اس کے باوجود خوش تھا۔

ابھی ہم نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ ہمیں دائیں جانب کے ڈھلوانی برفیلے ٹیلوں سے جگنوؤں کی طرح بہت سی روشنیاں اُمڈتی نظر آئیں۔

''دشمن.........!'' داور خان سرسراتے لہجے میں ان روشنیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ میں بھی ٹھٹک گیا۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ ''صیب! یہ ہمارے دشمن بھی ہو سکتے ہیں۔ ہمیں راستہ بدلنا پڑے گا۔ وہ شاید ماموں پوشے سے ملنے آ رہے ہیں۔ تمہارے فرار کا انہیں پتہ چل گیا ہو گا۔'' بڑبڑاتے ہوئے اس نے راستہ تبدیل کر لیا۔ داور خان بہت ہوشیار اور وادی کے چپے چپے سے واقف تھا۔ جلد ہی وہ متوقع دشمنوں سے دور ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہ جگنوؤں کی طرح چمکتی ہوئی روشنیاں بھی غائب ہو گئیں

''کتنی دور ہے اب ہمارا مطلوبہ راستہ؟'' ذرا دیر بعد میں نے اس سے دریافت کیا۔

''بس تھوڑی دور ہے صیب!'' وہ بولا۔ لیکن ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ہمارے دائیں جانب سے روشنیوں کا سیلاب اُمڈ آیا۔ میں اور داور خان بری طرح ٹھٹکے۔ پھر یہ دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے کہ تقریباً پندرہ بیس افراد کا مشعل بردار ٹولا تھا جنہوں نے سیاہ لمبے چغے پہن رکھے تھے اور ہاتھوں میں مشعلیاں، سنان اور رائفلیں تھام رکھی تھیں۔

آن کی آن میں ان سب نے ہمیں گھیر لیا.........ان میں ایک نسبتاً دراز قد اور کرخت چہرے والا شخص بھی تھا۔

''صیب! برے پھنسے......... یہ بوغا ہے۔ عامل عاروب کا کمانڈر۔'' داور خان نے لرزتی آواز میں اس دراز قامت اور کرخت چہرے والے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میرے پورے وجود میں سنسنی دوڑ گئی۔ انہوں نے بھی شاید مجھے پہچان لیا تھا۔ سنان اور رائفلوں کا رخ میری جانب کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس دراز قامت اور کرخت چہرے والا بوغا مجھے خوف ناک نظروں سے گھورتا ہوا میری جانب بڑھا۔ اس کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں غضب کا کینہ بھرا ہوا تھا۔ اس نے منگولوں کے انداز میں ایک دل دہلا دینے والی چیخ ماری جو شاید اپنے دشمن کو پہچان لینے کی فتح مندی کا نعرہ ہی ہو سکتا تھا۔ مگر اس بدبخت نے نہ صرف دل دہلا دینے والا بہ الفاظ دیگر فتح کے نشے سے چور نعرہ بلند کیا تھا بلکہ خونخوار اور وحشیانہ غراہٹ بھی حلق سے خارج کرتے ہوئے میرے چہرے پر مُکا جڑ دیا تھا۔

بوغا کا ہاتھ انسانی ہاتھ نہیں تھا، کسی روبوٹ کا ہاتھ تھا۔ اس کے ایک ہی زوردار مکے نے مجھے برف چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ میری آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے ستارے چمک رہے تھے۔ میرے زمین پر گرتے ہی ٹولے کے چار تنومند افراد مجھ پر جھپٹے اور مجھے بے بس کر کے میری مشکیں کر دیں۔

میرا خیال تھا وہ داور کے ساتھ بھی کوئی ''مناسب'' سلوک کریں گے۔ مگر مقامِ شکر تھا کہ انہوں نے اس سے محض درشت لہجے میں کچھ گفتگو کر کے چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر بعد میں، بوغا اور اس کے گرگوں کی حراست میں کسی نامعلوم منزل کی طرف رواں دواں تھا۔

❄❄❄

عامل عاروب کے پیروکاروں کا یہ ٹولا گھوڑوں اور گھنے بالوں والے خچروں پر سوار اپنے قبیلے کی طرف بڑھا جا رہا تھا اور میرے دل و دماغ میں طوفان سے اٹھ رہے تھے۔ لگتا تھا کہ اس بار میں حالات کے ہاتھوں پھنسا تھا۔ پتہ نہیں کیوں اس بار نگینہ کے معاملے میں میرے ستارے گردش میں تھے۔ میں ہر بار کسی نئی مصیبت کا شکار ہوا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ مجھے یہ احساس بھی کچوکے لگا رہا تھا کہ نگینہ اس وقت خود بھی

مصائب کا شکار تھی اور تنہا ان برے لمحات میں وہ مجھے یاد کر رہی ہو گی۔ مگر میں اس کی مدد کے قابل نہ تھا۔ میں تو خود اسے یہ خوش خبری سنانا چاہتا تھا کہ میری ماں نے اس کے باپ شاہ میر کو معاف کر دیا تھا۔ میں اسے فون پر ہی یہ خوش خبری اس کے امریکہ میں قیام کے دوران ہی سنا ڈالتا۔ میں نے کیوں یہ سوچا کہ میں خود اس سے مل کر اسے یہ عظیم خوش خبری سناؤں گا جس کی وہ تمنائی تھی۔ میں نے کیوں اسے اچانک سرپرائز دینے کے چکر میں دیر کر دی تھی۔ کاش!.........کاش!.........مگر اب میرے پاس سوائے پچھتاوے کے اور کیا تھا؟ ان سارے خیالات اور پریشان کن سوچوں نے مجھے بالکل ادھ موا کر کے رکھ دیا تھا۔

ادھر ان سفاک اور بے رحم کیلاشیوں کا سفر جاری تھا۔ سرد رات شاید اپنے آخری پہر میں تھی اور میں بے دست و پا ان خونی بھیڑیوں کے چنگل میں پھنسا اپنی قسمت کی ستم ظریفیوں سے اُلجھ رہا تھا۔

اندیشوں اور وسوسوں بھرا یہ سفر نصف گھنٹے میں طے ہوا تھا۔ اپنے قبیلے میں داخل ہونے کے بعد ان کے دیگر مشعل بردار افراد بھی ان سے آن ملے تھے اور عجیب و غریب آوازوں کے ساتھ نعرے بلند کر رہے تھے۔ اپنے روحانی پیشوا پر قاتلانہ حملے کرنے والے کی گرفتاری پر وہ اپنے طور پر بیک وقت خوشی اور غصے کا اظہار کر رہے تھے۔ ان کی تو جیسے دیرینہ مراد پوری ہو گئی تھی۔ اس کے بعد مجھے خچر سے اتار کر نہایت بے دردی سے گھسیٹتے ہوئے اس کی مخروطی چھت والی پگوڈا نما عمارت سے اندر لایا گیا جہاں ان کے دیوتا زابولا میزی کی بدہیئت مورتی اور قربان گاہ تھی۔ اس میں وہ سنگلاخ قید خانہ بھی تھا جہاں میں پہلے بھی قیدی بنا جا چکا تھا۔

مجھے یہاں تک مکے، ٹھوکریں اور لاتیں مارتے، گھسیٹتے ہوئے لایا گیا تھا۔ ساتھ ہی بوغا اپنی زبان میں ایک ہاتھ بلند کر کے اونچی آواز میں کچھ کہہ بھی رہا تھا۔ اس کے انداز و لہجے سے خوشی کا اظہار ہوتا تھا۔ میں ان کی زبان نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ اگرچہ عامل عاروب سمیت اس کے چند قریبی ساتھیوں کو ٹوٹی پھوٹی اُردو آتی تھی لیکن بوغا شاید اس سے بالکل ہی کورا دکھائی دیتا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ عامل عاروب نے بھلا ایسے آدمی کو کیوں کمانڈر بنا رکھا تھا؟ شاید اس کی وجہ بوغا کا غیر معمولی خونخوار جثہ، وحشیانہ انداز و اطوار، جنگجوانہ مہارت رہی ہو گی۔

اس وقت بوغا ہی مجھے نہایت بے دردی کے ساتھ خچر سے اتار کر جیکٹ کے کالر سے پکڑے گھسیٹتا ہوا لے جا رہا تھا۔ اندر ہال کمرے کے وسط میں لا کر مجھے پٹخ دیا گیا۔ پھر تین اطراف یہ سب لوگ ہاتھوں میں مشعلیں، سنان اور رائفلیں تانے کھڑے ہو کر وحشیانہ انداز میں اپنے حلق سے عجیب و غریب چیخیں خارج کرنے لگے۔ چوتھی سمت چبوترا تھا اور چبوترے کے وسط پر ان کے دیوتا دابولا میزی کا بدہیئت بت رکھا ہوا تھا۔ اس کے بالکل ساتھ ایک اونچی اور چوڑی پشت گاہ والی تخت نما عجیب وضع کی کرسی پر عامل عاروب سیاہ چغہ پہنے بڑے طنطنے کے ساتھ براجمان تھا۔

اس نے دائیں ہاتھ میں بیل کے پیڑو کی ہڈی تھامی ہوئی تھی مگر درحقیقت یہ اس کی سنان تھی۔ عامل عاروب کی چندی چندی آنکھوں سے مقناطیسیت پھوٹ رہی تھی۔ ان میں میرے لئے نفرت کی چنگاریاں بھی مترشح تھیں۔

مجھے یوں لگا جیسے میں افریقہ کے کسی دور دراز جزیرے کے وحشی قبائل کے نرغے میں پھنس گیا ہوں۔ عامل عاروب جیسے ہی کھڑا ہوا، یکدم شور تھم گیا۔ مخروطی چھت والی عبادت گاہ میں ایکا ایکی جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ پھر اس نے بائیں ہاتھ کا اشارہ کیا تھا۔ یکدم دو افراد نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ پاؤں کھول دیئے اور مجھے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ عامل عاروب چبوترے کے مختصر قد مچے اتر

کر میرے قریب پہنچا اور بہ غور اپنی چھوٹی چھوٹی مقناطیسی آنکھوں سے مجھے گھورنے لگا۔ گویا قریب سے دیکھ کر یہ تصدیق کرنا چاہ رہا ہو کہ میں اس کا وہی دشمن ہی تھا جو کچھ عرصہ پہلے یہاں بے جگری سے ان کا مقابلہ کرتے ہوئے نہ صرف نگینہ کو ان کے چنگل سے چھڑا لے گیا تھا بلکہ اس مردود عاروب کو بھی شدید زخمی کر ڈالا تھا۔

''ہوں.........تو تم وہی ہو۔'' معاً ہال میں عامل عاروب کی سنسناتی آواز اُبھری۔ پھر دوسرے ہی لمحے شدید غیظ و غضب کے عالم میں اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہڈی نما سنان کی انی سے میرے چہرے پر چرکا لگا دیا۔ مجھے اپنے گال کی کھال چیرتی ہوئی محسوس ہوئی اور اذیت کی شدت سے بے اختیار میرے حلق سے کراہ آمیز چیخ خارج ہو گئی۔ میرے گال سے خون کی پتلی دھار بہہ نکلی تھی۔ اس کے بعد نہ جانے عامل عاروب کے دل میں کیا سمائی کہ وہ فوراً ہی الٹے قدموں واپس ہوا پھر چبوترے کے مختصر قد مچے الٹے پیروں ہی طے کرتا ہوا واپس چبوترے پر جا کھڑا ہوا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی حکم صادر کرتا، اچانک باہر شور سا سنائی دیا۔ سب لوگ چونک پڑے اور میں بھی غیر ارادی طور پر چونک کر ہال کے بڑے سے بیرونی دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اپنا ایک ہاتھ اپنے زخمی گال پر رکھا ہوا تھا۔ ہال میں تین افراد داخل ہوئے۔ انہوں نے الم نصیب نگینہ کو دبوچ رکھا تھا۔

میں ان تینوں کیلاشیوں کو پہچان گیا۔ ان میں تیسرا وہی ہرکارہ تھا جو مکش پور کے ایک چھوٹے سے گاؤں کے سردار زور آور خان کی بیٹی شہزادی کو زخمی اور بیٹے شہ زور کو بے دردی سے قتل کرنے کے بعد ان کی جیپ میں فرار ہو کر اپنے انہی دونوں ساتھیوں سے جا ملا تھا۔

نگینہ کو دیکھتے ہی میرے پورے تن بدن میں آتش فشاں سا دہکنے لگا۔ نگینہ کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اور پھر جیسے ہی وہ تینوں اسے قریب لائے تو مجھے دیکھ کر وہ بری طرح چونکے۔ جیسے انہیں دہری خوشی کی توقع نہ تھی۔ دونوں شکار ان کے قبضے میں تھے۔ نگینہ نے جیسے ہی نڈھال نگاہوں کے ساتھ مجھے بھی ان کے قبضے میں دیکھا تو ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پھر دوسرے ہی لمحے مجھے دیکھ کر اس کے اندر جانے کدھر سے قوت اُمڈ آئی کہ وہ دامن چھڑا کر چیختی ہوئی میری طرف دوڑی۔

''نادر.........!''

لیکن راہ میں ہی مردود بوغا نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑ لیا۔ نگینہ اس کی آہنی گرفت میں کسی بے بس کمزور چڑیا کی طرح تڑپنے لگی۔

میری سلگتی ہوئی کنپٹیوں پر ٹھوکریں مارتا خون پارے کی مانند تڑپ رہا تھا۔ مجھے بھی کچھ ہوش نہ رہا اور میں نے وحشت جنوں خیز انداز میں زخمی شیر جیسی دھاڑ ماری اور دوڑ کر بوغا پر جھپٹا۔ پھر اس کے چہرے پر زوردار مُکا جڑ دیا۔ اس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا۔ ڈیل ڈول میں ہم دونوں کا انیس بیس کا ہی فرق تھا۔ بوغا کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں اور پھر ان میں نفرت و غیظ کے الاؤ دہکنے لگے۔ اس وقت دیگر ہرکاروں نے وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ میری جانب جارحانہ پیش قدمی کی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے بوغا نے خوں ناک غراہٹ آمیز آواز کے ساتھ انہیں بڑھنے سے روک دیا۔ پھر بہ آواز بلند چیخ کر کچھ کہا اور ساتھ ہی نگینہ کو ایک جانب دھکیل کر دو ہاتھ فضا میں بلند کر کے کوئی مخصوص اشارہ کیا۔ اس وقت اس کے دیگر ہرکارے تین اطراف سے ہمارے گرد گھیرا ڈال کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئے۔

اب درمیان میں صرف میں اور بوغا آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کو غضب ناک نظروں سے گھورنے لگے۔ بوغا نے ایک نظر عامل عاروب پر ڈالی اور مؤدبانہ آواز میں اس سے کچھ کہا تو عامل عاروب

کے پتلے پتلے مکروہ ہونٹوں پر بدہیئت مسکراہٹ اُبھری۔ پھر وہ اپنی تخت نما کرسی پر براجمان ہو گیا اور دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پل کے پل میں جان چکا تھا کہ اب میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا؟......... میری قسمت کا فیصلہ متفقہ طور پر بوغا کے سپرد کر دیا گیا تھا اور بوغا نے بھی غالباً میری اس جرأت کا مجھے مزہ چکھانے کی خاطر عامل عاروب سے یہ اجازت طلب کی تھی۔

ہال میں اب کسی وقت بھی رن پڑنے والا تھا۔

اس وقت بوغا نے غضب ناک چنگھاڑ ماری اور کسی وحشی درندے کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ میں پہلے ہی اس کی متوقع جارحانہ پیش قدمی کے لئے تیار تھا۔ چنانچہ جیسے ہی وہ غضب ناک درندے کی مانند مجھ پر جھپٹا، میں نے اپنے گال کے زخم کو بھلا کر فوراً ہی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ جھکائی دی تو اس کا پیٹ میرے دائیں کاندھے کی زد میں آ گیا اور میں نے اپنے پورے لمبے چوڑے وجود کی طاقت صرف کرتے ہوئے بوغا کو اسی کاندھے پر اٹھا کر ہال کے پختہ فرش پر دے مارا۔

ہال میں غضب کا شور گونجا۔ بوغا کی کمر یقیناً درد سے دہری ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھی چیخ چیخ کر اس کی ہمت افزائی کرنے لگے۔ تاہم بوغا نے دوبارہ اٹھ کر کھڑے ہونے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگائی تھی۔

وہ ان کا کمانڈر تھا۔ ابتداء میں ہی میرا گھونسا کھانے اور دوسری بار میرے ہاتھوں پٹخے جانے پر اس کا چہرہ احساسِ ذلت سے مسخ ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں انتقام اور غیظ کی وحشیانہ چمک اُبھری۔ پھر دوبارہ وہ غراہٹ آمیز چنگھاڑ کے ساتھ مجھ پر جھپٹا۔ اس بار میں نے اسے ڈاج دینے کی غرض سے بظاہر دوبارہ وہی داؤ کھیلا۔ بوغا یکدم رک کر مجھے چھاپنے کے لئے جھکا تو میں نے ایک زوردار لات اس کے چہرے پر رسید کر دی۔ حالات کا تقاضا تھا کہ بوغا جیسے حریف کو صرف پچھاڑنے کے لئے نہیں بلکہ اسے نابود کرنے کے لئے میری ہر ضرب زوردار اور کاری ہو۔ کیونکہ میں اس اکا اکی ہونے والے اپنے اور بوغا کے درمیان مقابلے کا مقصد جان چکا تھا۔

یہ بالکل ایسا ہی مقابلہ تھا جسے ''پٹ فائٹنگ'' (PIT FIGHTING) کہا جاتا تھا جو امریکہ کی ریاست کیلی فورنیا اور نیو میکسیکو سٹی کے انڈر ورلڈ کے درمیان خفیہ تہہ خانوں میں دو حریفوں کے درمیان لڑی جاتی تھی اور اس کا فیصلہ دوسرے حریف کی صرف موت پر ہی ہوتا تھا۔ یہ غیر قانونی مقابلہ ہوتا تھا۔

یہاں بھی مجھے کچھ ایسا ہی لگتا تھا۔

بوغا نے عامل عاروب سے شاید اسی بات کی اجازت طلب کی تھی کہ وہ ایک طرف اپنی بے عزتی کا بدلہ اتارنا چاہتا تھا تو دوسری جانب دشمن کو بھی موت کی نیند سلانا چاہتا تھا۔

اور نادر علی خان بھلا ایسے مقابلوں سے کہاں پیچھے ہٹنے والا تھا۔ یہ تو میری سرشت میں تھا کہ اپنے حریف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے پنجہ آزمائی کا لطف ہی کچھ اور تھا۔

تیسری بار میرے ہاتھوں پٹخنے کے بعد بوغا کی ساری مہارت دھری کی دھری رہ گئی اور وہ اس قدر مشتعل ہو گیا کہ ہوش وحواس کا دامن چھوڑ بیٹھا اور یہی میں چاہتا تھا۔ وہ غراتا، دھاڑتا ہوا میری جانب لپکا اور اپنے دونوں ہاتھوں کے پنجے میری جانب بڑھا دیئے۔ یہ ایک چیلنج تھا پنجہ آزمائی کا۔ یعنی میں ادھر اُدھر ہوئے بغیر اس کے پنجوں میں اپنے ہاتھوں کے پنجے پھنسا دوں۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو بزدل تصور کیا جاتا اور میں نے اس کی یہ دعوت قبول کر لی میں نے پنجے سے پنجہ ملا دیا۔

بوغا کے ہونٹوں پر پیشگی فاتحانہ مسکراہٹ اُبھری اور آنکھوں کی خونخوار اور وحشیانہ چمک میں بھی اضافہ ہو

گویا اپنے تئیں اس نے مجھے اپنی طاقت کے جال میں پھنسا دیا۔ اسے شاید اپنی جسمانی طاقت کا کچھ ہی غرور تھا۔

اب ہماری نظریں ایک دوسرے کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ طاقت آزمائی شروع ہو چکی تھی۔

ہم دونوں پوری قوت صرف کر کے ایک دوسرے کے ہاتھ، پنجوں سمیت مروڑنے کی کوشش کر رہے تھے اس زور آزمائی کے دوران کبھی وہ مجھے اپنے زور پر چند قدم پیچھے دھکیل رہا تھا، کبھی میں اسے دھکیلتا ہوا بھی لے جا رہا تھا۔ پھر جب دونوں کی دال نہ گل سکی تو بوغا نے ایک روایتی سا داؤ آزمایا اور بجلی کی سی ی کے ساتھ مجھے لئے چند قدم پسپائی اختیار کرتے ہوئے یکدم رک کر بہ سرعت اچھلا اور پھر اپنے دونوں میرے سینے پر جما دیئے۔ پھر مجھے زور سے عقب میں اچھال دیا۔ میں پشت کے بل اس کے ہرکاروں ندموں میں جا گرا۔ وہ خوشی سے شور مچاتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔ ادھر بوغا مجھے ذرا بھی سنبھلنے کا موقع ے بغیر جھپٹا اور میری کمر پر سوار ہو گیا اور ریسلروں کے سے انداز میں دونوں ٹانگیں پشت کی سمت موڑ کر بل دیئے۔ اس پر اپنے بھاری بھرکم وجود کا دباؤ ڈالنے لگا۔ اس داؤ میں میری ریڑھ کی ہڈی ٹوٹنے کا ہ تھا۔ تکلیف کے باعث پہلی بار میرے حلق سے تیز چیخ خارج ہوئی اور دشمن کی تکلیف دہ چیخ سن کر ہال موجود اس کے پیروکاروں نے خوشی سے نعرے بلند کر کے اپنے کمانڈر کی حوصلہ افزائی کی۔

ان چیخوں اور نعروں کے بیچ مجھے نگینہ کی دکھ بھری آہ بھی سنائی دی۔ میری جان پر نہیں بلکہ نگینہ مصیبت تھی اور میری زندگی خدا کے بعد نگینہ کی ہی امانت تھی۔ اگر مجھے کچھ ہو جاتا تو یقیناً نگینہ بھی زندہ نہ رہتی۔ یوں میں نے اپنے مضروب اور ریختہ وجود کی طاقت کو اپنے دونوں بازوؤں میں سمیٹا۔ پھر اپنے دونوں وں کی ہتھیلیاں فرش پر جما کر اپنا بالائی جسم بوغا کے بھاری بھرکم وجود سمیت اوپر اٹھانے لگا۔ اس جاں ل اور پُرزور قوت سے مجھے دانتوں تلے پسینہ آ گیا اور میرا چہرہ سرخ ہو گیا۔ جب میں نے دیکھا کہ میں خواہ طریقے سے اپنے بالائی وجود کو ایک حد تک اوپر اٹھا چکا ہوں تو میں نے بازوؤں کے زور پر ہی دار پلٹی کھائی مگر بوغا نے میرا داؤ فوراً بھانپ لیا اور پھرتی کے ساتھ میری ٹانگیں پکڑ کر الف کھڑا ہو گیا۔ میں سر کے بل فرش پر جھول رہا تھا۔ بس یہی موقع تھا جب بوغا دوسرا مہلک داؤ مجھ پر آزمانے کی رت ہی کر سکا۔ کیونکہ میں نے سر کے بل جھولتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اس کے پیروں کی پنڈلیوں پر ئے اور مضبوطی سے پکڑ کر انہیں زوردار جھٹکا دیا۔ نتیجتاً بوغا کے قدم زمین سے اکھڑ گئے اور مجھ سمیت ت کے بل ''دھپ'' کی زوردار آواز کے ساتھ فرش پر گرا۔ ہال میں سب کو سانپ سونگھ گیا۔ اب بازی کسی تک میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے اچھل کر اپنی ٹانگوں کے دونوں گھٹنے اس کے پیٹ پر رسید کر دیئے۔ کے حلق سے اذیت ناک اور کریہہ چیخ خارج ہوئی۔ میں تڑپ کر اس سے علیحدہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ٹھیک اُت مجمع سے کسی نے سنان بوغا کی طرف اچھال دی۔ بوغا نے لپک کر اسے پکڑ لیا۔ اسی وقت مجھے یاد آ کہ اس کے ایک ساتھی سے چھینی ہوئی سنان میری جیکٹ کے اندر قمیض کے نیچے بھی محفوظ تھی۔ میں نے گریبان میں ہاتھ ڈال کر پھرتی سے وہ سنان نکال لی۔ گویا اب مقابلہ پھر برابر کا تھا۔

ہم دونوں کے ہاتھوں میں سنانیں تھیں۔ سنانیں سنبھالے ہم دونوں ایک دوسرے کو خونی نظروں سے گھورتے ہوئے دائرے کی صورت میں گھوم رہے تھے۔ ہم دونوں ہی مدمقابل کی طرف سے پہل کے ش مند تھے یا پھر موقع ملتے ہی سنان پیوست کرنے کے متمنی۔ جب میری طرف سے کوئی جارحانہ پیش نہ ہوئی تو بالآخر بوغا نے ہی جارحانہ طور پر قدم بڑھایا۔ مگر مجھ پر اپنی سنان کا وار کرنے کی بجائے یکدم ں پر جھک کر لڑھکنی لگائی اور جب تک میں اس کا یہ مکارانہ داؤ سمجھتا، اس کی ایک ٹانگ فرش پر ''سوئپ''

کے انداز میں لہرائی اور میری ٹانگوں سے ٹکرائی اور میں اچھل کر پشت کے بل فرش پر گرا تو لامحالہ میرے ہاتھ سے سنان چھوٹ کر دور جا گری۔ پس یہی وہ موقع تھا جب عیار اور سفاک لڑاکا بوغا نے اپنی سنان اچھال کر میرے پیٹ میں گھونپنی چاہی مگر میں نے بھی گرتے ہی بروقت لوٹ لگا دی۔ بوغا خالی جگہ پر گرا اور میں نے زوردار لات اس کے چہرے پر رسید کر دی اور وہ چیخ مار کر الٹ پڑا۔ مگر سنان اس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹی تھی۔ میں نے اپنی سنان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا مگر وہ غائب تھی یا پھر ''غائب'' کر دی گئی تھی۔ ادھر بوغا وحشیانہ چنگھاڑ کے ساتھ دوبارہ مجھ پر جھپٹا۔ میری نظریں چونکہ فرش پر گری اپنی سنان کی طرف متوجہ تھیں اس لئے میں مار کھا گیا۔ بوغا نے اپنی سنان سے مجھ پر وار کر دیا۔ میں نے اپنے تئیں خود کو دہری سنان کے مہیب وار سے بچانے کی کوشش کرنی چاہی مگر وہ میرے دائیں بازو میں پیوست ہو گئی۔۔۔۔۔۔۔ اذیت کی روح تک اترنے والی ناقابل بیان لہر نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا۔ اسی وقت عاروب کے چیلوں نے نعرہ ہائے تحسین بلند کیا۔ مگر مجھے نگینہ کی پُر درد آواز اس شور پر بھاری لگی۔

''نادر۔۔۔۔۔۔۔'' اُس نے دکھ بھرے لہجے میں بے اختیار پکارا تھا۔

بوغا نے سنان میرے بازو سے کھینچی اور اس بار میرے سینے میں اتارنے کی کوشش کی مگر میں اپنے زخمی بازو کی تکلیف بھلا کر یکدم ایک طرف ہٹا اور کوشش یہی کی کہ بوغا سے زیادہ دور نہ ہو سکوں۔ چنانچہ جیسے ہی بوغا کا سنان والے ہاتھ کا وار خالی گیا تو میں نے کراٹے کے انداز کا ایک زبردست وار اس کی کلائی پر کیا۔ سنان اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ بوغا جان چکا تھا کہ وہ خالی ہاتھ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا اس لئے مجھ سے بھڑنے کی بجائے وہ فوراً فرش پر گری ہوئی اپنی سنان اٹھانے کو لپکا۔ مگر میں نے بھی اس کے ساتھ ہی سنان اچکنے کے لئے جست لگائی۔ ہم دونوں ہی کے ہاتھ سنان پر پڑے۔ مگر بدقسمتی سے میری گرفت میں سنان کا دو دھاری پھل آیا تھا اور بوغا کے ہاتھ کی گرفت میں سنان کا دستہ۔ اس نے جیسے ہی دستے کو پکڑ کر سنان میرے ہاتھ کی گرفت سے کھینچی تو میری ہتھیلی کٹ گئی۔ بائیں بازو کی تکلیف ابھی تازہ تھی کہ سنان کے دو دھاری چرکے نے مجھے نڈھال کر دیا۔ میرے منہ سے کرب ناک سسکاری خارج ہوئی۔

سنان قابو میں آتے ہی بوغا نے پھرتی سے میرے پہلو پر وار کیا مگر میں نے پلٹ کر خود کو نہ صرف اس وار سے بچا لیا بلکہ اس کی پشت پر ایک زوردار لات رسید کر دی۔ بوغا کئی قدم لڑکھڑاتا ہوا بیرونی دروازے کے قریب جا پڑا۔ وہاں سے اس کے خونی ہرکاروں کا مجمع چھٹ کر دائیں بائیں ہو گیا۔ میں نے وہیں سے جست لگائی۔ اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بوغا پر چھلانگ لگا دی اور اسے رگیدتا ہوا بیرونی دروازے پر جا پڑا۔ اس کے حلق سے بھیانک اور کریہہ چیخ خارج ہوئی۔ گرنے کے باعث نہ جانے کس طرح اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سنان اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر پیوست ہو گئی۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے پتہ ہی نہ چلا تھا کہ اس کے ساتھ ہوا کیا تھا؟ مگر جب بوغا نے اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے تو حقیقت کا ادراک ہوا۔ ٹھیک اسی وقت ہال میں کئی چیخیں گونج اُٹھیں۔ عاروب کے چیلوں کو اپنے کمانڈر کی اذیت ناک شکست اور موت کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ سب میری جانب لپکے۔ یکایک میرے ذہن میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک خیال اُبھرا۔

سرِ دست میرا یہاں سے نکل جانا بہتر ہے۔

چنانچہ میں نے زخمی ہونے کے باوجود اٹھنے میں دیر نہیں لگائی اور چھلاوے کی طرح باہر تاریکی میں غائب ہو گیا۔ ہرکارے چیختے دھاڑتے ہوئے میرے تعاقب میں ہو لئے تھے۔ مگر میں نے ایک عقل مندی یہ کی تھی کہ باہر کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً عبادت گاہ کی دیوار سے چپک گیا تھا اور بیرونی

دروازے کے باہر کو کھلے ایک دیوہیکل چوبی پٹ کے عقب میں جا چھپا تھا۔ وہ سارے وحشیانہ یلغار اور چیخوں کے ساتھ میری تلاش میں کافی دور وادی کی طرف لشکر کی صورت میں دوڑ گئے۔ اچانک مجھے عبادت گاہ کے اس چور دروازے کا خیال آیا جو درحقیقت بالائی منزل کے زینے میں کھلتا تھا۔ مگر اس کا ایک اور چھوٹا دروازہ اندر ہال کے چبوترے کی طرف بھی کھلتا تھا۔ کیونکہ پہلے والی مہم کے دوران میں نے اس راستے سے ہال عاروب پر شب خون مارا تھا۔ قدرت نے ایک بار پھر مجھے یہ سنہری موقع فراہم کر دیا تھا۔ کیونکہ اس کے تقریباً سارے ہرکارے میری تلاش میں وہاں سے جا چکے تھے۔ مگر وہ جلدی واپس لوٹ سکتے تھے۔ وقت کم تھا اور مجھے فوراً منصوبے کے آخری مرحلے کو عملی جامہ پہنانا تھا۔ چنانچہ میں نے بہ احتیاط عبادت گاہ کی دیوار کے ساتھ ساتھ تیزی کے ساتھ کھسکنا شروع کر دیا۔ پھر میدان صاف پاتے ہی میں مذکورہ دروازے کے قریب آ گیا۔ دروازے کو میں نے کھولنا چاہا مگر وہ اندر سے بند تھا۔ میں دروازے کی متوازی جھری سے اندر جھانکنے کے لئے ابھی جھکا ہی تھا کہ اچانک مجھے اپنے عقب میں آہٹ سنائی دی۔ میں جیسے ہی پلٹا تو دو ہرکاروں کو وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ خود پر جھپٹنے کی کوشش کرتے دیکھا۔ میں یکدم ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ دونوں دروازے سے ٹکرائے۔ میرا بایاں بازو اور دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پہلے ہی بری طرح زخمی تھی مگر میں نے ان سے بھڑ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دونوں دروازے سے ٹکرا کر میری طرف پلٹے تو اچانک دم بخود تاریکی اور ٹھٹھکی فضا میں گولی چلنے کے دو دھماکے ہوئے اور میں نے ان دونوں ہرکاروں کو کریہہ چیخوں کے ساتھ زمین بوس ہوتے دیکھا۔

میں نے بری طرح چونک کر فائر کی آواز کی سمت دیکھا تو مجھے چند قدموں کے فاصلے پر کوئی کھڑا نظر آیا۔ وہ دوڑ کر جیسے ہی میرے قریب آیا تو میں بری طرح چونک گیا۔ وہ میرا دوست، داور خان تھا۔

''صیب!۔۔۔۔۔۔۔تم ٹھیک تو ہو نا؟'' وہ ہانپتی ہوئی آواز میں مجھ سے بولا۔ میں ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اچانک عبادت گاہ کی دوسری دیوار کی سمت مشعل بردار ہزاروں کا جلوس سا آتا دکھائی دیا۔

''صیب!۔۔۔۔۔۔۔جلدی نکل چلو۔۔۔۔۔۔۔آؤ'' داور خان مجھ سے بولا اور اب میرے پاس یہاں سے نکلنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

میں اور داور خان تھوڑی دور دوڑتے ہوئے اس کے خچر کے قریب پہنچے، اس کے بعد اس نے اپنے خچر کو ایڑ لگائی۔ عقل مندی کا یہی تقاضا تھا کہ سردست وہاں سے میں نکل جاتا۔ مگر میں نگینہ کو عامل عاروب کے چنگل سے چھڑانے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔

داور خان مجھے برفیلی ٹیلوں کی بھول بھلیوں میں لئے اپنے خچر پر سوار کئے بہت دور لے آیا۔

''صیب!۔۔۔۔۔۔۔تم بہت زخمی ہو۔'' وہ بولا ''مگر تم فکر نہ کرو۔ میں تمہیں سیدھا سردار آگرموشی کے پاس لے جا رہا ہوں۔''

''لیکن دوست! میری ایک ساتھی ان لوگوں کے قبضے میں ہے۔'' میں نے جواباً کہا۔

''سردار آگرموشی تمہاری ضرور مدد کرے گا۔ جب اسے یہ پتہ چلے گا کہ تم نے ایک بار پھر عامل عاروب سے جنگ کی ہے تو وہ تمہاری بہت عزت اور قدر کے علاوہ تمہاری مدد بھی کرے گا۔ تم ایک بار میرے ساتھ اس کے پاس چل کر دیکھو۔''

میرے پاس اس کا مشورہ ماننے کے سوا اور کیا چارہ تھا۔ ناچار میں نے چپ سادھ لی۔

خاصی دیر بعد ہم سردار آگرموشی کے قبیلے کی حدود میں داخل ہوئے تو یکدم چند خچر سوار مسلح افراد نے ہمیں روک لیا۔ داور خان نے شاید انہیں پہچان لیا تھا۔ ادھر میرے بازو سے خون بہنے اور جاں گسل حالات

نے میرے اعصاب شل کر دیئے تھے اور میرا دماغ ماؤف ہونے لگا تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے میرا سر چکرانے لگا اور مجھ پر غشی طاری ہونے لگی۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

❋❋❋

دوبارہ جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو آرام دہ مسہری پر پڑے پایا۔ میرے زخمی بازو اور ہتھیلی مرہم پٹی کی ہوئی تھی۔ تکلیف میں اب کافی حد تک کمی آ گئی تھی۔ میں نے حیران پریشان نظروں سے لیٹے لیٹے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرہ زیادہ بڑا نہ تھا مگر اس کی چھت قدرے بلند اور ڈھلوان تھی۔

''اب کیسی طبیعت ہے صیب؟'' اچانک داور خان کی آواز پر میں چونکا۔ آواز کی سمت دیکھا جہاں ایک کرسی پر وہ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر اٹھا تھا اور اب میرے قریب مسہری پر آ ٹکا تھا۔

''اب بہتر ہوں۔'' میں نے کمزور سی آواز میں کہا۔ مگر........''

''یہاں آپ کو کوئی خطرہ نہیں ہے صیب!'' وہ یکدم دوستانہ مسکراہٹ سے بولا۔

''مگر دوست! میری ساتھی نگینہ کی جان تو خطرے میں ہے۔'' میں نے تشویش آمیز تفکر سے کہا۔

''میں نے سردار آگرموشی سے مل کر انہیں ساری بات بتا دی۔ تم بے فکر رہو۔''

''کیا یہ جگہ........''

''ہاں صیب! ہم سردار آگرموشی کے گھر میں ہی ہیں۔'' وہ بولا۔

''میں اب یہاں سے جانا چاہوں گا۔'' میں فکرمند ہو کر مسہری سے اٹھنے لگا تو اچانک ایک بھاری بھرکم، عمر رسیدہ مگر چاق و چوبند شخص زرق برق لباس میں اندر داخل ہوا۔ اس کے ہمراہ دو اور مسلح افراد بھی تھے۔ وہ ایک طرف مؤدبانہ انداز میں کھڑے ہو گئے جبکہ داور خان بھی احتراماً اپنے ہاتھ باندھے ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ میں اٹھ کر مسہری پر بیٹھ گیا تھا۔

''کیسے ہو نوجوان!'' آنے والی بارعب شخصیت نے ملائمت بھرے لہجے اور شستہ اردو میں مجھ سے پوچھا۔ میں نے اس کی بارعب شخصیت سے اندازہ لگایا تھا کہ یہی سردار آگرموشی تھا۔

''میں ٹھیک ہوں........آپ........؟'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے بولا۔

''ہم سردار آگرموشی ہیں اور تم جیسے بہادر نوجوانوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہمیں اب بھی یقین نہیں آ رہا ہے کہ تم ایک بار پھر اس ذلیل عاروب کو شکست دے کر زندہ سلامت لوٹ آئے ہو۔ کیا نام ہے تمہارا اے بہادر، جری نوجوان؟''

''نادر علی خان۔'' میں نے ہولے سے اپنا نام بتایا۔

''کہاں سے آئے ہو؟''

''پنڈی میں رہتا ہوں۔ مری کے ایک گاؤں میں۔''

''خوب!........ یہ لڑکا بتا رہا تھا کہ تمہاری کوئی نگینہ نام کی ساتھی لڑکی اس مردود عامل عاروب کی قید میں ہے؟'' اس نے قریب خاموش کھڑے داور کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے پوچھا تو میں نے جلدی سے اپنا سر اثبات میں ہلاتے ہوئے ساری بات بتا دی۔ جب اسے عامل عاروب کے کمانڈر بوغا کی میرے ساتھ دوبدو خون ریز جنگ اور پھر میرے ہاتھوں اس کی عبرت ناک شکست اور ہلاکت کا علم ہوا تو میں نے دیکھا، سردار آگرموشی کے چہرے پر پہلے حیرت اور ناقابل یقین تاثرات ابھرے، پھر اس کے بعد دیدنی حد تک خوشی سے بھرپور لہجے میں گویا یقین طلب لہجے میں بولا۔

''کک........کیا تم نے........عاروب کے سالار........بوغا کو موت کے گھاٹ اتار دیا؟''

اس کے لہجے میں ابھی تک بے یقینی کے تاثرات تھے۔

''ہاں........مگر........'' میں نے ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ مگر پھر فکرمندانہ لہجے میں دوبارہ اس سے بولا۔ ''لیکن........میری ساتھی نگینہ کی زندگی اس وقت شدید خطرے میں ہے۔ عامل عاروب اسے اپنے کسی دیوتا دابولامیزی کی بھینٹ چڑھانا چاہتا ہے۔ مم........مجھے اسی وقت جانا ہو گا۔'' میں نگینہ کی طرف سے پھر بے چین ہونے لگا تو سردار آگرموشی نے بڑے اطمینان کے ساتھ کہا۔

''بہادر نوجوان! تم اب اس کی بالکل فکر نہ کرو۔ سالار بوغا کے مرنے کے بعد عامل عاروب کی طاقت و برتری اس علاقے میں نصف ہو چکی ہے۔ ہم اس وقت عامل عاروب پر فوج کشی کرنے والے ہیں۔ مگر نگینہ کی طرف سے بے فکر رہو۔ کیونکہ یہ قربانی اس وقت نہیں بلکہ ان کے ایک خاص تہوار کے موقع پر عمل میں لائی جائے گی اور اس تہوار میں ابھی نو دن باقی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے ساتھی کو عاروب سے چھڑانے کے لئے یہ عرصہ بہت ہے۔''

سردار آگرموشی کی بات میں مجھے وزن محسوس ہوا تھا۔ کیونکہ اس سے پہلے بھی نگینہ کو وہ مردود عاروب اپنے دیوتا دابولامیزی کی بھینٹ چڑھانا چاہتا تھا تو بدقسمتی سے اس روز ہی ان کے خاص تہوار کا دن تھا۔ جس کے باعث میں فوری طور پر حرکت میں آیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ مجھے سردار آگرموشی کی بات پر کسی حد تک تسلی تو ہوئی تھی کہ نگینہ کی جان کو فوری طور پر خطرہ نہ تھا مگر اس دوران وہ ذہنی طور پر شدید پریشانی کا شکار رہے گی۔ اور میں جانتا تھا کہ اسے زیادہ پریشانی اپنے باپ شاہ میر کی طرف سے بھی لاحق ہو گی۔ کاش میں اسے بتا سکتا کہ اس کے باپ شاہ میر کو انکل اعظم خان کی تحویل میں دے دیا گیا تھا۔

''معزز سردار! مجھے آپ کی بات سے کچھ تسلی تو ہوئی ہے اور ساتھ ہی میں آپ کی مدد کا شکر گزار بھی ہوں۔ لیکن میری ساتھی بہت کمزور دل کی ہے۔ وہ ان خونی اور سفاک لوگوں کے نرغے میں جس ذہنی اذیت اور پریشانی کا شکار ہو گی اس کا صرف میں ہی تصور کر سکتا ہوں۔ اگر ہم اس سلسلے میں فوری قدم اٹھائیں تو کیا یہ بہتر نہ ہو گا؟'' ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے آگرموشی سردار سے کہا۔

''ہاں، مجھے تمہاری پریشانی کا احساس ہے بہادر نوجوان!'' سردار آگرموشی نے کہا۔ ''میں اپنے آدمیوں کو عاروب کے قبیلے پر آخری اور فیصلہ کن حملے کے لئے آج ہی تیار کر رہا ہوں اور........''

''معزز سردار! معذرت چاہوں گا۔'' میں نے دھیرے سے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ میری ساتھی نگینہ کی جان خطرے میں ہے۔ ممکن ہے وہ جنگ کے نتیجے میں وقت سے پہلے ہی اسے جانی نقصان پہنچانے کی کوشش کریں۔ جنگ سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ اپنی ساتھی نگینہ کو عامل عاروب کے چنگل سے چھڑانے کی کوشش کروں۔''

سردار آگرموشی ایک سمجھ دار انسان تھا۔ میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ چند ثانیے پُرسوچ خاموشی میں مستغرق رہنے کے بعد بولا۔

''تمہاری بات ٹھیک ہے........تمہیں میرے جتنے بھی آدمی چاہئیں، وہ تم لے جا سکتے ہو۔ مگر تم تو خود زخمی ہو؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں معزز سردار!'' میں نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''یہ چھوٹے موٹے زخم مجھے آتے رہتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اپنے اس مشن کو میں تنہا اور خفیہ طریقے سے ہی پورا کر سکتا ہوں۔ آدمیوں کے ساتھ سے معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے۔''

میری بات پر سردار آگرموشی حیرت بھری نظروں سے مجھے تکنے لگا، پھر اسی لہجے میں بولا۔

''تم تنہا......... یہ مہم سر کر سکتے ہو؟......... مگر کیسے؟''

''یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں معزز سردار! کیونکہ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ نہ صرف میں اپنی ساتھی نگینہ کو اس مردود عامل عاروب سے چھڑاؤں گا بلکہ اس خبیث کا پتا بھی ہمیشہ کے لئے صاف کر دوں گا۔ کیونکہ بعد میں بھی وہ پہلے کی طرح ہمارے سروں پر لٹکتی ہوئی تلوار بنا رہے گا۔ اس کے خاتمے کے بعد آپ اس کے قبیلے پر لشکر کشی کر سکتے ہیں۔''

میری بات پر سردار آگرموشی نے اپنے سر کو ہولے سے تفہیمی جنبش دی۔

''مجھے تھوڑا اسلحہ درکار ہے......... صرف ایک پستول اور فاضل راؤنڈز۔'' میں نے آخر میں اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

''وہ تمہیں مل جائے گا۔ ابھی تم آرام کرو۔ صبح ہونے والی ہے۔ میں کچھ کھانے کے لئے بھجواتا ہوں۔''

سردار آگرموشی یہ کہہ کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے بھی چپ سادھ لی۔ وہ کمرے سے نکل گیا۔ سردار آگرموشی اور اس کے دونوں مصاحب خاص کے جانے کے بعد داور خان مجھ سے بولا۔

''صیب! میں بھی اب چلوں گا۔ خدا آپ کی مدد فرمائے۔''

''سنو!'' میں نے کہا۔

''جی صیب؟'' وہ دھیرے سے بولا۔

''تم اپنے ماموں پوشتے کو کیا جواب دو گے؟ وہ تو تمہارا بھی دشمن بن گیا ہوگا۔'' میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا تو اس کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔ پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔

''ارے صیب! وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا......... میں اسے چھوڑ کر چترال واپس چلے جانے کی دھمکی دوں گا تو وہ تیر کی طرح سیدھا ہو جائے گا۔''

''اچھا، ایک بات تو بتاؤ۔'' میں نے کہا۔

''جی صیب!'' وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولا۔

''کیا تم اپنے ماموں پوشتے کے ساتھ یہاں خوش ہو؟''

''اور کیا کروں صیب!'' وہ عجیب سے دکھ سے بولا۔ ''میں چاہوں تو مجھے چترال میں اس سے زیادہ اچھی نوکری مل سکتی ہے۔ مگر صیب! دل نہیں مانتا کہ اپنے بوڑھے ماموں کو چھوڑ کر چلا جاؤں۔ کچھ بھی ہے وہ میری ماں کا بھائی ہے۔ میں اپنی ماں سے بہت پیار کرتا تھا صیب! ماموں پوشتے کی صورت میں مجھے اپنی ماں کا چہرہ نظر آتا ہے۔'' ماں کو یاد کرتے ہی اس کی آواز رندھنے لگی تو وہ جلدی سے کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

''اچھا صیب!......... اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔ میں اب چلتا ہوں۔ آتا رہوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔ میں خاموش نظروں سے خالی دروازے کو گھورتا رہا۔ اس کے بعد خالی بستر پر لیٹ گیا۔ مگر نیند مجھے نہیں آئی۔

نگینہ کی طرف سے میرا دل سخت بے چین اور پریشانی کا شکار تھا۔ میں یونہی بے چین ہو کر اُٹھا۔ کھڑکی بند تھی۔ میں نے وقت کا اندازہ کرنے کی خاطر کھڑکی ذرا وا کر کے باہر دیکھا۔ سرد اور کاٹ دار برفیلی ہوا کا جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا۔ ممکن ہے صبح طلوع ہو چکی ہو لیکن آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا ہونے کے باعث ہنوز اندھیرے کا سا سماں تھا۔ میں نے کھڑکی بند کی، پھر اپنے زخموں کا جائزہ لیا۔ مرہم پٹی ہونے

اب کافی آرام تھا۔

مسہری پر آ کر دراز ہو گیا۔ یونہی پُرسوچ انداز میں اپنی آنکھیں موند لیں۔ ابھی ذرا ہی دیر گزری مجھے ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔ میں بظاہر سوتا بنا ہوا تھا تاہم میرا چہرہ دروازے کی طرف تھا۔ یونہی دل میں جانے کیا خیال آیا کہ میں آنکھیں کھولے بغیر سوتا بنا رہا۔ مگر ایک آنکھ کی جھری سے میں ے کی طرف دیکھتا رہا۔ دروازے کا ایک پٹ دھیرے دھیرے وا ہو رہا تھا۔ اس بات نے مجھے ر مجبور کیا تھا۔

میں نے ایک تنومند مگر گینڈے جیسی جسامت کے ٹھگنے قد و قامت والے شخص کو اندر داخل ہوتے میں اسے دیکھ کر چونک پڑا۔ اس کے چہرے پر ڈھاٹا بندھا ہوا تھا اور دائیں ہاتھ میں تیز دھار والی لی ہوئی تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ رگوں میں یکلخت خون کی گردش تیز ہو گئی۔ دل بے تحاشا دھڑکنے لگا۔ میں اب بھی سوتا بنا پڑا رہا اور اس مشکوک اجنبی شخص پر اپنی ادھ کھلی نگاہ جمائے رکھی۔ اس کے ارادے اف جھلک رہا تھا کہ وہ مجھے قتل کرنے کی نیت سے آیا تھا یا بھیجا گیا تھا۔ مگر کیوں؟......... میں جب ں ''کیوں'' کے بارے میں سوچتا، وہ قرولی بدست نقاب پوش قاتل میری مسہری کے بالکل نزدیک یا تھا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے اس نے جیسے ہی اپنا قرولی والا ہاتھ فضا میں لند کیا اور ابھی میرے سینے رنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ایک زوردار لات کے پیٹ پر رسید کر دی۔ وہ لڑکھڑا گیا مگر سنبھلنے میں اس نے ذرا بھی دیر نہ لگائی تھی۔ میں نے مسہری سے کی کوشش کرنی چاہی مگر اس نے پھر مجھ پر وار کر ڈالا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی کلائی دبوچ لی ت کے پتے کی شکل کی نگینے جیسی سرخ انگشتری پر یونہی میری نگاہ پڑ گئی۔ وہ بھی بلا کی طاقت رکھتا تھا۔ نے میرے زخمی بازو پر زوردار ٹھوکر رسید کر ڈالی۔ میرے حلق سے چیخ سی نکل گئی اور میں مسہری پر جا یرا خیال تھا یہ ڈھاٹا پوش قاتل مجھ پر دوبارہ حملہ کرے گا مگر وہ نہایت پھرتی کے ساتھ دروازے سے کل گیا اور اتنی ہی تیزی کے ساتھ باہر سے دروازے کو کنڈی بھی چڑھا دی۔

میں ہونٹ بھینچ کر اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ پھر ایک ہاتھ سے دروازہ پیٹنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ اس بدبخت ڈھاٹا پوش کی ٹھوکر سے میرے بازو کا زخم بھی کھل تھا۔ سفید پٹی خون بہنے سے سرخ ہونے لگی تھی۔

باہر سے دروازے کی کنڈی کھولی گئی اور چار پانچ مسلح افراد اندر داخل ہو گئے۔ میں نے انہیں ساری بتا دی۔ وہ چاروں الٹے پیروں دوڑ گئے۔ ذرا دیر بعد ایک مسلح شخص ایک عمر رسیدہ آدمی کو لے کر آ یہ کوئی وید تھا۔ اس کے ہاتھ میں چوبی باکس تھا۔ اس نے مجھے لیٹ جانے کو کہا اور پھر میرے بازو کھول کر نئے سرے سے دوبارہ باندھ دی۔ وہ مسلح شخص چلا گیا۔ وید نے مجھے ایک پیالی میں دوائی کہا۔ نارنجی رنگ کے محلول والی وہ دوائی خوش ذائقہ تھی جسے پیتے ہی مجھے بدن میں توانائی سی دوڑتی ہوئی۔

وید ایک باریش شخص تھا۔ اس نے ایک نظر دروازے پر ڈالی، پھر رازدارانہ لہجے میں مجھ سے بولا۔

''تم نے حملہ آور کی صورت دیکھی تھی؟''

''نہیں......... اس نے چہرے پر ڈھاٹا چڑھا رکھا تھا۔'' میں نے جواباً کہا۔ وہ کچھ سوچتا بن گیا۔

''کون ہو سکتا ہے یہ؟'' میں نے اسے سوچتا پا کر پوچھ لیا۔ وہ بولا۔

''راس کے سوا یہ حرکت کسی کی نہیں ہو سکتی۔ اس نے ہی تمہیں قتل کرنے کے لئے اپنے کسی آدمی کو

بھیجا ہوگا۔"

"رامس؟......... یہ کون ہے؟" میں نے الجھے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

"رامس، سردار آگرموشی کا چھوٹا بھائی ہے۔"

"اوہ........" حیرت کے باعث میرے ہونٹ سکڑ گئے تھے۔ پھر پوچھا۔ "مگر رامس یہ حرکت کیوں کرنا چاہتا تھا؟ اس کی بھلا مجھ سے کیا دشمنی ہے؟ میں نے اسے دیکھا بھی نہیں ہے۔"

اس سے پہلے کہ وید کوئی جواب دیتا، اچانک کمرے میں سردار آگرموشی اپنے دو مسلح ساتھیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس کے سرخ و سپید چہرے پر پریشانی اور تشویش کے آثار تھے۔ شاید اسے مجھ پر ہو والے قاتلانہ حملے کے متعلق آگاہ کر دیا گیا تھا۔ باریش وید فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم خیریت سے تو ہو نا؟" اس نے فکرمند لہجے میں پوچھا۔

"ہاں......... ٹھیک ہوں۔ عین وقت پر میری آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا میرا بازو زخمی کر گیا تھا۔ اب دوبارہ مرہم پٹی کی ہے۔" میں نے کہا۔

"تم نے اس کی صورت دیکھی تھی؟"

"نہیں......... اس نے چہرے پر ڈھاٹا چڑھا رکھا تھا میں نے اس سے مقابلہ بھی کیا تھا مگر وہ مجھے دھکا دے کر بھاگ کھڑا ہوا۔ باہر سے دروازے کو بھی کنڈی چڑھا دی۔"

"ہوں۔" سردار آگرموشی نے ایک گمبھیر اور پُرسوچ ہنکاری بھری۔ پھر مجھے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ "فکر نہ کرو......... میرے آدمی اس نامعلوم حملہ آور کو تلاش کر رہے ہیں۔ اب تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ میں تمہارے کمرے کے باہر دو پہرے دار بھی تعینات کر دیئے ہیں۔"

"کیا پوچھ سکتا ہوں معزز سردار! یہ حرکت کس کی ہو سکتی ہے؟" میں نے سردار آگرموشی کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے پوچھا تو وہ تھوڑا متذبذب سا دکھائی دینے لگا۔ پھر گومگو سا جواب دیتے ہوئے بولا۔

"فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا......... خیر، جلد پتہ چل جائے گا۔" اس کے بعد اس نے قریب ہی خاموش کھڑے بوڑھے وید سے تحکمانہ انداز میں مخاطب ہو کر اپنی زبان میں کچھ پوچھا شاید میرے زخم کے بارے میں پوچھا تھا۔ وید نے میرے زخم کی طرف دیکھ کر اسے مختصراً کوئی جواب دیا تھا۔ اس کے بعد دھیرے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے چلا گیا۔ اس کے بعد جب وید بھی وہاں سے جانے لگا میں نے آواز دے کر اسے روکا۔ وہ رکا اور میری جانب مڑا۔

"تم مجھے رامس کے بارے میں بتانا چاہ رہے تھے؟" میں نے اسے یاد دلایا۔ وہ میرے ذرا قریب آ کر انتہائی رازداری سے بولا۔ "ابھی اس کا نام بھی مت لینا......... بس محتاط رہو اور میرا مشورہ مانو، یہاں سے چلے جاؤ۔"

"لیکن مجھے........." میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہ تیز تیز قدموں سے میری بات سنی ان سنی کر کے کمرے سے نکل گیا۔ میں عجیب شش و پنج کا شکار ہو گیا۔

مجھے اب دوہری بے چینی نے آن گھیرا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سارا کیا چکر تھا۔ سردار آگرموشی کے چھوٹے بھائی رامس کو بھلا مجھ سے کیا دشمنی ہو سکتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد میرے لئے ایک آدمی کھانے کی بڑی سی سینی اٹھائے اندر داخل ہوا اور نہایت ادب کے ساتھ میرے سامنے مسہری پر رکھ دی۔

"مجرم کا کچھ پتہ چلا؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ وہ میرا منہ تکنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ اسے

ری زبان نہیں آتی تھی۔ ناچار مجھے بھی چپ ہو جانا پڑا۔ وہ چلا گیا۔ میں نے ٹرے پر سے کپڑا ہٹایا۔ مرغ ی بھنی ہوئی ران، بڑے بڑے تین چار نان کے علاوہ ایک آب خورے میں نیلے رنگ کا مشروب تھا۔ میں نے نہ جانے کب سے کھانا نہیں کھایا تھا۔ میری بھوک چمک اٹھی۔ کھانے کے بعد میں نے نیلے رنگ کا شروب پیا تو جسم میں توانائی کی لہریں دوڑتی محسوس ہوئیں۔

کھانے کے بعد میری سوچوں کا دفتر ایک بار پھر کھل گیا تھا۔ ان سوچوں میں نگینہ کا خیال سب سے یاں اور بھاری تھا۔

ذرا دیر بعد ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے سرخ رنگ کا مخصوص لباس پہنا ہوا پشت پر رائفل جھول رہی تھی۔ پہلو میں نیام کے اندر سنان کا منقش دستہ بھی جھلک رہا تھا۔ اس نے ٹوٹی ی اردو میں مجھ سے کہا۔

"میرے ساتھ آئیں۔"

میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ کمرے سے نکلا تو دائیں بائیں دو مسلح پہرے داروں کو چوکس کھڑے پایا۔ وہ ص مجھے لئے ایک مختصر سی راہداری کے بعد ایک نسبتاً بڑے کمرے میں لے آیا۔ یہاں کسی دربار کا سا ول تھا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ دائیں بائیں عجیب وضع کی کرسیاں اور صوفے بچھے ہوئے تھے۔ ان ے سرے پر سامنے دو اونچی اور چوڑی پشت گاہ والی کرسیوں میں سے ایک پر سردار آگرموشی خود براجمان تھا کے بائیں جانب ایک سرخ و سپید اور خاصی فربہی مائل عورت زرق برق لباس میں بڑے طمطراق کے ساتھ براجمان تھی۔ اس کے بال اخروٹی رنگ کے تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور گال پھولے ہوئے تھے۔ وہ موٹے ں کی ہونے کے باوجود خاصی پُرکشش تھی۔ سردار آگرموشی کے دائیں جانب ایک صوفے نما چوڑی سی ست پر ایک چالیس سالہ تنومند شخص بھی براجمان تھا۔ بائیں جانب یعنی سردار کی بیوی کی قطار والی ستوں پر یقیناً قبیلے کے دیگر امراء بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ کئی مسلح سنان بردار محافظ دائیں بائیں ق مستعد کھڑے تھے۔

سردار آگرموشی نے مجھے ایک قریبی نشست کی طرف اشارہ کر کے بیٹھنے کو کہا۔

میں خاموشی سے بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے سردار آگرموشی نے وہاں موجود سب سے اپنی زبان میں میرا رف کروایا۔ پھر مجھ سے اُردو میں ان سب کا تعارف کرواتے ہوئے آخر میں اپنے بائیں جانب بیٹھے اس لیس سالہ کرخت رو چہرے والے سے تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

"یہ میرا چھوٹا بھائی رامس ہے۔"

میں اس شخص کے نام پر ذرا چونکا۔ اچانک ہی مجھے وید کی بات یاد آ گئی۔ میں بغور اس کا چہرہ تکنے لگا۔ ب سے میرے چہرے پر اپنی تیز اور چبھتی ہوئی نظریں مرکوز کئے ہوئے تھا۔ پھر میرے ساتھ آئے ے شخص کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

"یہ ہماری فوج کا سالار موشد ہے۔"

موشد نام کا وہ شخص بھی ایک نشست پر بیٹھ چکا تھا۔ سب کی نظریں اس وقت میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ذرا دیر بعد سردار آگرموشی نے ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد مجھ سے کہا۔

"نوجوان! ہم سب نے ہی متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ عامل عاروب کے قبیلے پر لشکر کشی کرنے سے پہلے تمہیں اپنی ساتھی نگینہ کو عامل عاروب کے چنگل سے چھڑانے کا پورا پورا موقع دیا جائے۔ حالانکہ یہ ہمارے جنگی اصولوں کے خلاف ہے کیونکہ ہماری اس سے پرانی عداوت چل رہی ہے۔ ہم کسی وقت

بھی اس پر جنگ مسلط کرنے کا غیر مشروط حق رکھتے ہیں۔ لیکن چونکہ تم نے عامل عاروب کے کمانڈر کو دوبدو لڑائی میں موت کے گھاٹ اتارا ہے اس لئے اب تم بھی ہمارے ساتھ براہِ راست اس جنگ میں شامل ہو چکے ہو۔ پھر تم نے عامل عاروب کو بھی ٹھکانے لگانے کا تہیہ کر رکھا ہے، اس لئے........"

وہ ذرا رکا۔ پھر کہنا شروع ہوا۔ "ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں تنہا اس خطرناک مہم پر بھیجنے کی بجائے تمہارے ہمراہ اپنے چھوٹے بھائی رامس کو بھی روانہ کریں گے۔"

میں سردار آگرموشی کی اس آخری بات پر چونکے بنا نہ رہ سکا تھا۔ تاہم جب وہ اپنی بات مکمل کر چکا تو میں نے کہا۔

"معزز سردار! کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ مجھے اس مہم پر تنہا ہی جانے کی اجازت دے دی جاتی۔"

میری بات پر سردار آگرموشی کی بجائے اسکا چھوٹا بھائی رامس مجھ سے مخاطب ہو کر ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولا۔

"سردار کا یہی حکم ہے اور قبیلے کے دیگر معززین کا بھی۔ تمہیں کیوں اعتراض ہے؟"

میں نے محسوس کیا اس کا لہجہ جھٹکے دار تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میں معزز سردار کی حکم عدولی کی بات نہیں کر رہا ہوں........ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ........"

"اب کچھ سوچنے یا سمجھنے کی کوئی گنجائش نہیں۔" رامس نے چبھتے ہوئے لہجے میں میری بات کاٹ ڈالی۔ "معزز سردار نے تمہاری بھلائی کے لئے ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔ کیونکہ تمہارا تنہا اس مہم میں جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ تم زخمی بھی ہو اور تمہاری جان کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔"

اس کی بات پر مجھے مجبوراً خاموشی اختیار کرنا پڑی۔ تاہم مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس میں بھی خود اس کی مرضی کا دخل ہوگا۔ وہ میرے ساتھ دانستہ اس مہم میں جانا چاہتا تھا۔ حالانکہ سردار آگرموشی کے پاس آدمیوں کی کمی نہ تھی۔

ذرا دیر بعد نشست برخواست ہوئی اور ہم دونوں کی مہم پر روانگی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ سردار آگرموشی کے پاس ایک سے ایک جدید ہتھیار تھے۔ چینی ساختہ کلاشنکوف کے علاوہ راکٹ لانچر تک تھے۔ اس گوریلا مہم پر روانگی اسی وقت عمل میں لائی جا رہی تھی۔ رامس نے مجھے فقط ایک پستول تھمایا تھا۔ فاضل راؤنڈز بھی نہیں دیئے تھے۔ جبکہ خود اس نے بھی ساتھ کچھ خاص اسلحہ نہیں رکھا تھا۔ ماسوائے ایک سنان اور پستول کے۔ اسلحے کی تو مجھے بھی زیادہ ضرورت نہ تھی۔ لیکن مجھے رامس کی طرف سے تشویش محسوس ہو رہی تھی۔

وجہ یہی تھی کہ اس بوڑھے وید نے مجھے پہلے سے رامس کی طرف سے محتاط رہنے کی ہدایت کر رکھی تھی۔ وہ اس اہم مشن میں میرے ساتھ کر دیا گیا تھا اور رامس کے ساتھ اپنے اس مشن پر نکلنے کا مقصد بھی عاروب عامل کی سرکوبی نہیں بلکہ اپنے ہی گلے کا پھندا محسوس ہو رہا تھا۔

میرے معترض ہونے کا کوئی فائدہ بھی نہ تھا۔ بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے سردار آگرموشی کے چھوٹے بھائی رامس کے بارے میں شبہ کرنا سردار سے ناراضگی مول لینے کے مترادف ہی ہوتا۔ تاہم میں نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اگر رامس نے میرے ساتھ راہ میں دھوکا کرنے کی کوشش کرنی چاہی تو میں اسے معاف نہیں کروں گا۔

ہم دونوں خچروں پر سوار ہو کر عامل عاروب کے قبیلے کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایکا ایکی موسم کے تیور بدلنے لگے۔ آسمان پر کالے کالے بادلوں نے یلغار کر دی اور تیز موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔

میں اور رامس خاموشی کے ساتھ آگے پیچھے اپنے اپنے خچروں پر چلے جا رہے تھے۔ تیز بارش کی وجہ سے ہم ایک چٹانی چھجے کے نیچے آن رکے۔ میری نظریں بدستور اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہی

نہیں۔ میں نے اس کے چہرے سے البتہ دبا دبا جوش محسوس کیا تھا جس سے اس کے اندر کے منفی جارحانہ عزائم کا اندازہ ہوتا تھا۔ میرے سینے میں زبردست ہلچل جاری تھی۔

"یہاں کب تک رکنا پڑے گا؟........ بارش کے تو رکنے کے آثار نظر نہیں آ رہے؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ میری کوشش تھی کہ میں اس سے ذرا فاصلہ رکھوں اور ایک لمحے کے لئے بھی اس کی طرف سے غافل نہ رہوں۔ اس نے میری بات سن کر ایک لمحے کو بہ غور میری جانب دیکھا۔ اس وقت بہتے آسمان پر زور سے بجلی کڑکی اور وہ اپنی جیب سے پستول نکال کر یونہی اس کا ہوائی نشانہ باندھنے لگا۔ میرا دل یکبارگی کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ میرا پستول جیب میں تھا۔ جبکہ رامس کا ہاتھ میں۔ اسنے ابھی بھی میری بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ اپنے پستول کے نشانے پر اپنی ایک آنکھ بھینچے ہوئے وہ نال کا رخ آہستہ آہستہ میرے چہرے کی طرف لا رہا تھا۔ میرے وجود میں تھرتھراہٹ اُبھری۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" میں نے بالآخر حلق تر کر کے پوچھا۔

اس نے فوراً پستول نیچے کر دیا۔ بے اختیار میرے حلق سے گہری سانس خارج ہو گئی۔

"تم مجھ سے خوف زدہ ہو نا؟" اس نے اچانک ایک چونکا دینے والا اور بالکل غیر متوقع سوال مجھ سے کیا اور میں اس کے اسرار بھرے لہجے پر چونکے بنا نہ رہ سکا۔

"نہیں........ بھلا میں تم سے کیوں خوف زدہ ہونے لگا؟" میں نے ہولے سے ہنس کر کہا۔

"تمہارے انداز و اطوار اور چہرے کی چابک دستی اور ہر لمحے کے چوکنا پن سے تو ایسا ہی لگتا ہے۔" وہ پھر اسی لہجے میں بولا۔ میں نے بے اختیار ایک گہری ہمکاری خارج کی اور نظریں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تو پھر تم ہی وجہ بھی بتا دو کہ بھلا مجھے تم سے کس بات کا خوف ہو سکتا ہے؟"

میری بات پر اس نے ایک عجیب سا قہقہہ لگایا۔ اس کے قہقہے میں عجیب سی سنسنی مجھے محسوس ہوئی تھی۔

"اس بڈھے وید نے ہی تمہیں یقیناً میری طرف سے خائف کیا ہو گا۔" اس نے میرے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں........ اس نے تو مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔" میں نے جھوٹ بولا۔

"میں نے سن لی تھی اس خبیث بڈھے کی بات کہ تم پر قاتلانہ حملہ میں نے ہی کروایا تھا۔" اس نے ایک اور چونکا دینے والا انکشاف کیا۔ پستول ابھی تک اس کے ہاتھ میں مچل رہا تھا۔ بارش کا زور ٹوٹنے لگا تھا۔ سردی کی کاٹ میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ پھر جیسے ہی بارش رکی تو برف باری شروع ہو گئی۔ ایسے بعید ترین شمالی علاقوں میں بارش کے بعد برف باری ہونا لازمی تھا۔

"کیا اب میں جھوٹ بولوں گا؟" اس نے میری طرف سرسراتی نظروں سے گھور کر کہا اور میری سمجھ میں نہیں آ سکا کہ میں اسے کیا جواب دیتا۔ صورتِ حال ایسی تھی کہ وہ مجھ پر بلا تاخیر گولی چلا دیتا تو میں اپنے دفاع میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ تب میں نے سچ کہنا ہی بہتر جانا اور پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔

"ہو سکتا ہے اس بڈھے وید کو تمہاری طرف سے کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو؟"

اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ اُبھری۔ "تو گویا اس نے تم سے میرے خلاف بات کی تھی؟"

"ہاں........ مگر وہ زیادہ تفصیل نہیں بتا سکا تھا۔ صرف اتنا ہی کہا کہ یہ حرکت تمہارے ہی کسی آدمی کی ہو سکتی ہے۔"

"میرا اندازہ درست نکلا۔"

"کیا مطلب؟......... کیا تم جھوٹ بول رہے تھے کہ تم نے اس کی باتیں سن لی تھیں؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں......... اس نے ایسا کچھ غلط بھی نہیں کہا تھا۔ کیونکہ اس نے میرے کہنے پر ہی تم سے وہ سب کہا تھا۔"

اس بار اس نے ایسی بات کہہ ڈالی کہ میں سر سے پاؤں تک لرز اٹھا۔ میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ سانس سینے میں اٹکنے لگی اور حلق خشک ہونے لگا۔ وہ پھر بولا۔

"میں تمہیں اس کے ذریعے خوف زدہ کر کے یہاں سے بھگانا چاہتا تھا۔ مگر وہ......... خیر، اپنی پستول نکالو۔" اچانک اس نے سنسناتی آواز میں کہا۔ میرا پورا وجود مرتعش سا ہونے لگا۔

"نکالو پستول۔" اس بار اس کے لہجے میں تحکمانہ درشتی تھی۔ میں نے اپنا پستول نکال لیا۔

"اس میں نقلی گولیاں ہیں......... محض پٹاخے......... فلموں کی شوٹنگ میں استعمال ہونے والے پٹاخے۔ ہاہا........." اس نے سرسراتے لہجے میں کہا اور پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگا۔ ایسے میں وہ مجھے کوئی خطرناک پاگل محسوس ہونے لگا۔

یہ بات اب شک وشبے سے بالاتر ہو چکی تھی کہ وہ میرے سامنے کھل چکا تھا۔ بلکہ اس نے خود میرے سامنے اپنی اصلیت کا اعتراف کیا تھا۔

"ڈرو نہیں......... یہ سچ ہے کہ پہلے میں تمہیں مروانا چاہتا تھا۔ مگر اب میرے ناکام حملے کے بعد صورت حال بدل چکی ہے۔" وہ پھر یکدم سنجیدہ ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ بدبخت میرے ساتھ چوہے اور بلی کا کھیل، کھیل رہا تھا۔

"اب تم مجھے یہاں چالاکی سے ویرانے میں لا کر قتل کرنا چاہتے ہو؟" میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"یہ کام مجھے بہت پہلے کر لینا چاہئے تھا۔ مگر اب نہیں کر سکتا۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "تم میرے بڑے بھائی آگرموشی کے دل میں اپنا مقام پیدا کر چکے ہو۔ اور دوسری خرابی یہ ہو گئی کہ مجھے تمہارے ساتھ کر دیا گیا۔ مگر پھر بھی میرے پاس تمہیں قتل کرنے کے سو بہانے ہیں۔ لیکن میں اپنے بھائی کے دل میں اپنے لئے ذرا سے بھی شک وشبے کی گنجائش نہیں پیدا کرنا چاہتا۔ تم مجھ سے معاہدہ کرو، اپنی جاں بخشی کے سلسلے میں۔" وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"کیسا معاہدہ؟......... یہ بھی تم خود ہی بتا دو۔" میں نے بظاہر بے پرواہانہ انداز میں پوچھا۔

"عامل عاروب کو قتل کرنے کا خیال دل سے نکال دو۔"

"میری اس سے پہلے کوئی دشمنی رہی ہے نہ اب ہے۔" میں نے آدھے سچ اور آدھے جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے مکاری سے کہا۔ "وہ تو خود ہی میری ساتھی نگینہ کو اپنے دیوتا دابولامینزی کی بھینٹ چڑھانا چاہتا ہے۔ اس سے پہلے بھی اس نے اسی مقصد کے لئے ہی نگینہ کو اغواء کروایا تھا۔"

"اگر نگینہ تمہیں زندہ سلامت مل جائے تو؟" اس نے پراسرار انداز میں میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"یہ......... یہ کس طرح ممکن ہے؟" مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"ہاں یا نہ میں جواب دو۔" وہ سپاٹ وسرد آواز میں بولا۔ پیچھے سے باہر برف روئی کے گالوں کی طرح

ر رہی تھی۔

"مگر عامل عاروب نے تو نگینہ کو اپنے دیوتا کی بھینٹ چڑھانے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ اگر میں نگینہ کو اپنے ساتھ لے بھی جاتا ہوں تو بھی خطرہ اس کے سر پر بدستور مسلط رہے گا۔"

"عامل عاروب کو دوسری لڑکی مہیا کر دی جائے گی۔ میں خود اس سے جا کر مذاکرات کروں گا۔" اس نے جواب دیا۔

مجھے اس کی بات پر ناقابل بیان حیرت سی ہوئی اور میں اُلجھ سا گیا۔ پھر اسی لہجے میں بولا۔ "عامل عاروب تمہاری یہ بات بھلا کیونکر مانے گا؟"

"اسے ماننا پڑے گی میری بات۔ یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ چالاک شخص اندر ہی اندر کون سی گہری سازش کے تانے بانے بُننے میں مصروف تھا؟ کیا یہ درونِ خانہ اقتدار کی جنگ تھی؟

وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولا۔ "تم نہیں جانتے کہ تم نے اس کے بہادر اور جنگجو سالار بوغا کو ہلاک کر کے اسے کتنا بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ اس کی کمر ٹوٹ گئی ہے۔ ادھر میرا بھائی سردار آگرموشی اس پر حملے کے لئے پَر تول رہا ہے۔ اور مجھے ہی نہیں، عامل عاروب کو بھی اس بات کا پورا احساس تھا کہ اس بار عبرت ناک شکست اس کا مقدر ہو گی۔ اچھا ہی ہوا کہ تم میرے قاتلانہ حملے سے بچ گئے اور تمہاری وجہ سے جنگ کا خطرہ ٹل گیا۔ اگر مجھے ناگاسی تم سے معاہدہ کرنے کا بروقت مشورہ نہ دیتی تو حالات مختلف ہوتے۔"

"ناگاسی......... یہ کون ہے؟" میں نے قدرے چونک کر پوچھا۔

"ناگاسی......... میرے بھائی کی بیوی۔"

"تو......... تو گویا یہ بات........." میں چونکتے ہوئے بڑبڑایا اور اسے مزید کھولنے کی غرض سے بولا۔ "مگر میں یہ کیسے یقین کر لوں کہ عامل عاروب تمہاری بات مان لے گا، ہرگز نہیں۔"

ایسا میں نے اس کا منہ کھلوانے کے لئے کہا تھا جس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ چنانچہ یہی سبب تھا کہ وہ ہولے سے خود کلامیہ بڑبڑایا۔

"لگتا ہے تمہیں پوری بات بتانا ہی پڑے گی۔"

"ہاں، تب ہی مجھے تسلی ہو سکتی ہے۔" میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

وہ ایک گہری سانس لے کر صراحت بتانے لگا۔

"یہ دو قبیلوں کے درمیان اقتدار کی جنگ ہے۔ ناگاسی درحقیقت میری بیوی بننا چاہتی تھی مگر بعض حالات میں اسے میرے بھائی آگرموشی سے شادی کرنا پڑی۔ میرے بھائی کی یہ دوسری شادی تھی۔ خیر، قبیلے کی روایت کے مطابق سردار پچپن سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد از خود قبیلے کی سرداری سے دستبردار ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد اس کی سرداری اس کے جوان بیٹے یا خاندان کے کسی دوسرے فرد کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ مگر میرا بھائی بے اولاد ہے۔ اگر وہ صاحب اولاد ہوتا تو یقیناً اپنی دستار اپنے بیٹے کو پہنا دیتا۔ مگر اپنے سگے بھائی کے حق پر وہ ڈاکا مارے ہوئے ہے۔ پہلے اس نے مجھ سے ناگاسی کو چھینا اور اب سرداری کے حق سے بھی مجھے محروم کر دیا۔ یہی سبب تھا کہ میرے دل میں اپنے ہی بھائی کے خلاف نفرت جڑ پکڑنے لگی۔ میں نے انتقاماً بغاوت کرنا چاہی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ ناگاسی سے میرے اب بھی خفیہ تعلقات ہیں۔ اس نے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کے شوہر سردار آگرموشی نے اپنی سرداری قبیلے میں کس قدر مضبوطی سے جما رکھی ہے۔ اس دوران عاروب سے جنگیں لڑی گئیں۔ مگر دونوں بار ہمیں شکست

اٹھانا پڑی۔ میں سمجھ گیا کہ عامل عاروب ہی وہ شخص ہے جو میرا اقتدار مجھے واپس دلانے میں میری مدد کر سکتا ہے۔ یوں میں نے اس کے ساتھ خفیہ معاہدہ کر لیا۔ اب تم خود سوچ لو کہ کون حق پر ہے، کون ناحق۔''

وہ اتنا بتا کر خاموش ہو گیا۔ ایک لحاظ سے اس کی بات درست محسوس ہو رہی تھی۔ اگرچہ یہ سب یکطرفہ داستان تھی تاہم مجھے ان کی آپس میں دو بھائیوں کے درمیان اقتدار کی رسہ کشی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ تاہم اگر اس طرح بغیر کسی خون خرابے کے میرا اور نگینہ کا مسئلہ حل ہوا چاہتا تھا تو مجھے کوئی اعتراض نہ تھا۔ اور اب میں رامس کی یہ بات بھی سمجھ گیا تھا کہ وہ عاروب کو اب کس طرح قائل کر سکتا ہے۔

''اب عاروب سے جا کر میں کیا کہوں گا، اس کا تمہیں بہ خوبی اندازہ ہو چکا ہو گا۔ یا پھر کہو تو اس کی میں تفصیل سنا ڈالوں؟'' تھوڑے توقف کے بعد وہ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''ہاں......اب تم اسے جا کر یہی کہو گے کہ وہ تمہارے بھائی کی لشکر کشی سے بچنا چاہتا ہے تو مجھے فارغ کر ڈالے۔ لیکن بات تو پھر وہی ہو جائے گی، یعنی تمہارا بھائی تو پھر اس پر چڑھائی کرنے سے پیچھے نہیں ہٹے گا۔'' میں نے آخر میں کہا۔

''وہ زندہ رہے گا تو تب ہی کرے گا نا۔'' اس نے سفاک لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے آخر میں کہا۔

''تم نے شاید میری پہلی بات پر غور نہیں کیا۔'' وہ بولا۔ ''میں نے تم سے کہا نا کہ میں تمہیں ہلاک کرنے کی فاش غلطی کرنے لگا تھا۔ تمہارے زندہ رہنے سے تو ہمیں مہلت ملی ہے مگر صرف ایک دن کی۔ ناگاسی نے مجھے خوش خبری سنائی ہے کہ وہ اندر ہی اندر اس کے چند معتبر امراء کو اپنا ہم خیال بنا چکی ہے۔ درحقیقت قبیلے کی اکثریت عامل عاروب سے جنگ کرنا نہیں چاہتی۔ اس خیال کو ہم نے بھی اندر ہی اندر ہوا دے دی کہ سردار آگرموشی بلاوجہ پورے قبیلے کو دو جنگیں ہارنے کے باوجود جنگ کی آگ میں جھونک رہا ہے۔

اب ہم نے آج کی فیصلہ کن رات میں بیک وقت دو چالیں چلنے کی کوشش کی ہے۔ پہلی تو یہ کہ عامل عاروب سے جنگ ٹال دی ہے۔ کیونکہ اس بار ہمیں یقین تھا کہ سردار آگرموشی کو فتح ہو گی اور اس فتح کا مطلب اس کی سرداری کی درازی عمر ہے۔ دوسری چال یہ کہ میں تمہارے بہانے عامل عاروب کو اس خطرے سے آگاہ کر کے اسے اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ نگینہ کو تمہارے حوالے کر دے اور عین اس وقت سردار آگرموشی کے خلاف جنگ چھیڑ دے جب میرے باغی ساتھی اس کی صفوں میں خانہ جنگی کی صورتِ حال پیدا کر دیں۔ یوں سردار آگرموشی کا سورج غروب ہو جائے گا اور ایک معاہدے کے تحت سرداری مجھے سونپ دی جائے گی۔'' وہ اتنا بتا کر چپ ہو رہا۔

لیکن اس کی باتوں سے میں اب بھی مطمئن نہیں ہوا تھا۔ اب بھی کئی سوال میرے دل و دماغ میں اُبھر رہے تھے۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے پوچھ لیا۔

''مگر کیا ضروری ہے کہ تمہاری بغاوت کامیابی سے ہمکنار ہو؟......وہ چکلی بھی تو جا سکتی ہے۔ بہ قول تمہاری منظورِ نظر ناگاسی کے شوہر سردار آگرموشی نے قبیلے میں اپنی سرداری مضبوطی کے ساتھ جما رکھی ہے۔ اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ عامل عاروب کے ساتھ تمہارے مذاکرات کامیاب ہوں۔ وہ تمہاری بات رد بھی تو کر سکتا ہے؟''

''اندر کے معاملات اور صورتِ حال کا مجھے علم ہے۔ تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہے۔'' وہ بولا۔ ''تم بھی میرے ساتھ عامل عاروب کے پاس چلو گے۔ اور ہاں، تمہیں اس حقیقت کا بھی اندازہ نہیں ہے کہ اگر تم آج کے دن عامل عاروب کے چنگل سے اپنی ساتھی نگینہ کو نہ چھڑا سکے تو سردار آگرموشی انتظار نہیں کرے گا

آج ہی کی رات عامل عاروب پر لشکر کشی کر ڈالے گا۔ اور ممکن ہے کہ عامل عاروب تہوار والے دن کا انتظار کئے بغیر ہی تمہاری ساتھی کو موت کے گھاٹ اتار دے۔''

مجھے اس کی بات میں کچھ وزن محسوس ہوا تھا۔ ''کیا میرا تمہارے ساتھ عامل عاروب کے پاس مذاکرات کے لئے جانا ضروری ہو گا؟'' میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''ہاں......تمہاری موجودگی کے بغیر میں اسے قائل نہ کر سکوں گا۔'' وہ بولا۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ میرے ذہن میں خدشہ بھی اُبھرا تھا کہ کہیں اس طرح یہ مجھے چالاکی سے عامل عاروب کے حوالے تو نہیں کرنا چاہ رہا ہے۔ مگر اس کی بغاوت والی بات نے میرے اس خدشے کو رد کر ڈالا۔ یوں بھی وہ اس وقت مجھے گولی مار سکتا تھا۔ میں پوری طرح اس کے رحم و کرم پر تھا۔

بالآخر میں نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''ٹھیک ہے......لیکن میں تمہارے ساتھ عامل عاروب کے ہاں نہیں جاؤں گا۔ یہ مذاکرات تمہیں خود ہی نمٹانے ہوں گے۔ البتہ میں تمہارا اس جگہ پر انتظار کروں گا۔ عاروب کی خانقاہ یہاں سے زیادہ دور تو نہیں ہے۔''

اگر اس کی نیت میں فتور تھا تو وہ میری یہ بات نہیں مانتا۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں نے دیکھا وہ فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا اور پُر جوش لہجے میں بولا۔

''لگتا ہے تم اب بھی مجھ پر شبہ کر رہے ہو۔ خیر، تم تسلی رکھو۔ تم پھر میرا ادھر انتظار کرنا۔ میں بہت جلد لوٹوں گا۔''

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا۔ پھر رکا اور میری جانب گردن موڑ کر عجیب سی مسکراہٹ سے بولا۔ ''تمہارے پستول کی گولیاں نقلی نہیں، اصلی ہیں۔ چاہو تو ایک ہوائی فائر کر کے دیکھ سکتے ہو۔ چلتا ہوں۔''

وہ آگے بڑھ گیا اور میں گویا اپنی جگہ پر سن بیٹھا اسے جاتا دیکھتا رہا۔



برف باری اسی رفتار سے جاری تھی۔

رامس کے جانے کے بعد میں کافی دیر تک اس کی باتوں پر غور کرتا رہا تھا۔ حقیقت یہی تھی کہ مجھے رامس کی باتوں پر یقین نہیں ہو پا رہا تھا کہ مردود عاروب، نگینہ کو رامس کے حوالے کر دے گا اور مجھے اس بات کا بھی خدشہ تھا کہ کیا خبر، عاروب سے مل کر رامس میرے خلاف کوئی اور کھچڑی پکانا چاہتا ہو؟ یہ بھی ممکن تھا کہ اس کی واپسی نگینہ کی بجائے عاروب کے خونی ہرکاروں سمیت ہو اور یہاں پہنچ کر وہ لوگ آناً فاناً مجھے اپنی گرفت میں لے لیں۔ غرضیکہ رامس کے جانے کے بعد میرے دل و دماغ میں عجیب و غریب وسوسے اور خدشات پلنے لگے تھے۔ بہرطور میں اپنی طرف سے محتاط ہو کر بیٹھ گیا۔

میں نے پستول نکالا، اس کا چیمبر چیک کیا۔ پھر ایک گولی نکال کر دیکھی۔ گولی اصلی محسوس ہوئی۔ تاہم میں نے اس کی اصلیت جانچنے کی خاطر ایک ہوائی فائر کیا۔ دھماکا ہوا اور گولی ایک برفیلی چٹان میں لگی۔ مطمئن ہونے کے بعد میں آرام سے بیٹھ گیا۔

مجھے وہاں بیٹھے ہوئے کافی دیر ہو گئی۔ برف باری اب رک چکی تھی۔ میں نے احتیاط کے پیش نظر اپنی جگہ چھوڑی اور اس چٹانی چھجے سے خاصی حد تک دور ہو کر ایک ایسی جگہ پر آ گیا جدھر سے میں باآسانی اپنی پچھلی جگہ پر بھی نظر رکھ سکوں۔

میرا دل و دماغ اب بھی رامس کی جانب سے شکوک و شبہات کا شکار تھا۔ مزید کافی دیر گزری، برف باری رک چکی تھی اور ماحول اب صاف ہو چکا تھا۔ تاہم سہ پہر ہو چلی تھی۔ دھوپ البتہ اب بھی نہیں نکلی تھی۔

میں نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا، بادلوں کی آوارہ ٹولیاں ہنوز گردش کر رہی تھیں۔

اچانک میں نے ایک سمت سے ذرا دور دو افراد کو ایک خچر پر آتے دیکھا تو میرا دل یکبارگی زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یہ وہی والی سمت تھی جدھر رامس نے رخ کیا تھا۔

کیا رامس اپنے وعدے کے مطابق عامل عاروب سے کامیاب مذاکرات کے بعد نگینہ کو لے کر واپس لوٹ رہا تھا......؟ میرے ذہن میں یکبارگی یہ جاں فزا خیال اُبھرا تھا۔

نگینہ سے ملنے کی مسرت انگیز و متوقع گھڑیوں نے مجھ پر عجیب سی سرشاری طاری کر دی تھی۔ میں دھڑکتے دل اور پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ دور خچر پر سوار آتے ہوئے ان دونوں افراد کو دیکھ رہا تھا۔ پھر جب خچر چٹانی چھجے والی سابقہ پناہ گاہ کے قریب آن کر رکا تو میں دیوانوں کی طرح اس کی طرف دوڑ پڑا۔

میں خچر پر سوار رامس اور نگینہ کو پہچان چکا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میری دنیا، میری کائنات، میری محبت، میری نگینہ یوں آسانی سے مجھے مل جائے گی۔ مجھے واقعی اب تک اس کی توقع نہ تھی۔

میں پاگل دیوانے کی طرح ہانپتا دوڑتا ہوا ان کے قریب پہنچا تو نگینہ نے مجھے دیکھ لیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کو غیر یقینی کے تاثرات اُبھرے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر "نادر" چلاتی ہوئی یکدم خچر سے اُتری اور میری جانب دوڑ پڑی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے فلمی انداز میں لپٹ گئے۔

"نن......نگینہ! تت......تم ٹھیک تو ہو نا؟" میں اسے دھیرے سے خود سے الگ کر کے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر بے تابانہ انداز میں بولا۔ رامس خچر سے اتر کر خاموش کھڑا ہماری طرف ہی تکے جا رہا تھا۔

"ہاں......نن......نادر! مم......میں......میں بالکل ٹھیک ہوں......مگر تمہارا بازو؟"

"یہ معمولی زخم ہے......تم بالکل فکر مت کرو۔ اب مردود عاروب کا خاتمہ قریب ہے۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"مگر نادر! یہ سب کیا چکر ہے؟......اس نے مجھے اتنی آسانی سے کیوں چھوڑ دیا؟ اور یہ......یہ کون ہے؟" اس نے متوحش لہجے میں قریب خچر کے پاس کھڑے رامس کی طرف دیکھ کر پوچھا تو میرے کوئی جواب دینے سے قبل رامس بولا۔

"اب نکل چلو یہاں سے۔" وہ یہ کہتا ہوا اپنے خچر کی رسی پکڑے ہمارے قریب آ گیا۔ میرا خچر بھی ایک طرف چٹانی چھجے کے ساتھ بندھا کھڑا تھا۔

"آؤ نگینہ! میں تمہیں بعد میں ساری باتیں بتا دوں گا۔" میں نے نگینہ سے کہا اور پھر اسے لے کر اپنے خچر کی طرف بڑھا۔ پھر پہلے نگینہ کو سہارا دے کر خچر پر سوار کروایا، اس کے بعد خود بھی اس کے عقب میں خچر کی لگامیں تھامے بیٹھ گیا۔

رامس بھی اپنے خچر پر سوار ہو کر آگے بڑھ چکا تھا۔ میرا خچر بھی اس کے عقب میں چلا جا رہا تھا۔ راستے میں، میں نگینہ کو اب تک کے سارے حالات سے آگاہ کرتا رہا۔

اسے یہ سن کر بہت خوشی و تسلی ہوئی تھی کہ اس کا باپ شاہ میر خیریت سے تھا اور جب اسے یہ پتہ چلا کہ ماں نے بالآخر شاہ میر کو معاف کر دیا تھا اور کن حالات میں معاف کیا تھا تو نگینہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہا تھا۔

میں نے نگینہ کو مکش پور کے چھوٹے سے قصبے کے سردار زور آور خان کے متعلق بھی بتایا تھا، وہ تشویش زدہ ہو گئی۔

"تو پھر......اب واپس جا کر وہ مصیبت بھی گلے پڑے گی ہمارے۔" وہ فکرمندانہ لہجے میں بولی۔

"تم فکر نہ کرو نگینہ! میں وہ سب بھی سنبھال لوں گا۔ ویسے میں نے انکل اعظم خان کو آگاہ کر دیا تھا۔ پرائس میں ان کا اثر و رسوخ بہت کام آتا ہے۔ یوں بھی عاروب کے اس ہرکارے کو نظروں میں رکھا ہے۔ اس نے سردار زور آور خان کی بیٹی شہزادی کو شدید زخمی اور بیٹے شہ زور کو مار ڈالا تھا۔ پھر ان کی لے کر اپنے دونوں ساتھیوں سے جا ملا تھا۔"

"ہاں......میں بھی اس کے تیسرے ساتھی کو پہچانتی ہوں۔" وہ بولی۔ "وہ ہمیں واپسی میں راستے ہی مل گیا تھا۔ اس نے تمہارے متعلق بتایا تھا۔ میں تب ہی سمجھ گئی تھی تم اسی لئے ایئرپورٹ مجھے ریسیو کرنے آئے تھے۔"

"بس نگینہ! اب تم فکر نہ کرو۔ ہماری دوریاں ختم ہوا چاہتی ہیں۔ میں اب کسی طرح اس آدمی کو بھی نت میں لینا چاہتا ہوں تاکہ اسے سردار زور آور خان کے سامنے پیش کر سکوں۔ کیونکہ مجھے پورا یقین ہے اس کی بیٹی شہزادی اپنے بھائی شہ زور کے قاتل کو پہچان لے گی۔"

"ہاں......ایسا ہی کرنا پڑے گا۔" نگینہ نے بھی کہا۔ "ویسے نادر! مجھے اس آدمی کا نام معلوم ہے جو دونوں سے ملا تھا، جو مجھے ایئرپورٹ سے اغواء کر کے واپس مکش پور کی طرف لا رہے تھے۔"

"اچھا......کیا نام تھا اس بدبخت کا؟" میں نے قدرے چونک کر پوچھا۔

"بڑا عجیب سا نام تھا......سنکھال۔"

"ہوں......سنکھال۔" میں نے زیرلب بڑبڑاتے ہوئے گویا یہ نام ذہن نشین کر لیا۔

ہمارا خچروں پر سفر جاری تھا۔ جب منزل قریب تھی تو رامس نے مجھے ہدایت کی کہ آگرموشی کو یہی بتایا ئے کہ نگینہ کو ایک لڑائی کے بعد عاروب سے چھینا گیا ہے۔ مجھے اس کی بات ماننی تھی۔ چنانچہ سردار موشی کو بھی ہم نے یہی بتایا۔

سردار آگرموشی نے مجھے اور اپنے بھائی رامس کو اس کامیابی کی مبارک باد دی۔ تب پھر اچانک سردار موشی نے مجھ سے کہا۔

"تمہارے کچھ ساتھی مہمان گاہ میں موجود ہیں، ان سے مل لو۔"

سردار آگرموشی کی بات پر مجھے حیرت ہوئی۔ بھلا میرے یہاں کون سے مہمان ساتھی مجھ سے ملنے آ ؟ سردار آگرموشی نے یہ بھی بتایا کہ انہیں یہاں میرا چترالی نوعمر دوست داور خان ہی لایا تھا۔ میں نے فوراً ان گاہ کا رخ کیا تو انکل اعظم خان اور وزیر خان سمیت اس کے تینوں ساتھیوں کو دیکھ کر بری طرح چونک نگینہ بھی اس وقت میرے ساتھ تھی۔

ان سب افراد کو غیر متوقع طور پر یہاں دیکھ کر مجھے حیرت اور دبی دبی پریشانی کا شدید جھٹکا لگا۔ رامس ہمارے پیچھے پیچھے وہیں چلا آیا تھا۔

"نادر بیٹے!......کیسے ہو تم؟" انکل اعظم خان یہ کہہ کر میری طرف لپکے۔ پھر نگینہ کو بہ خیریت پا کر کے سر پر دستِ شفقت رکھتے ہوئے اس کی بھی خیر خیریت پوچھی۔ از روئے اخلاق میں وزیر خان سے ملا۔

انکل اعظم خان نے مجھے بتایا کہ انہیں سردار آگرموشی نے سارے حالات سے آگاہ کر دیا تھا کہ میں اور کس مقصد کے لئے اور کہاں گئے تھے؟ یوں اب خاصی حد تک وزیر خان کی غلط فہمی بھی دور ہو گئی اور کو بھی انہوں نے دیکھ لیا تھا اور میں نے اسے بتا دیا کہ یہی وہ میری ساتھی تھی جس کی تلاش میں مجھے

یہاں پہنچنے کی اس قدر جلدی تھی۔

انکل اعظم خان نے مجھے وزیر خان سے متعلق یہ بھی بتایا تھا کہ جب میں نے انہیں سردار زور آور خان کے بیٹے شہ زور کے قتل کے معاملے پر یہاں آنے سے قبل آگاہ کیا تھا تو انہوں نے فوری طور پر یہ دانش مندانہ قدم اٹھایا تھا کہ اپنے چند ذمہ دار افسر دوستوں کے ساتھ مکش پور کے سردار زور آور خان سے ملاقات کی۔ اپنی بات کی سچائی ثابت کرنے اور ہماری مدد کی خاطر یہاں کا رخ کیا تھا۔

رامس وہاں موجود تھا اور بڑے غور سے ہماری باتیں سن رہا تھا۔ عاروب اور سنکھال کے متعلق لرزہ خیز واقعے کے بارے میں سن کر وہ کچھ پریشان سا نظر آنے لگا تھا اور وہ کیوں پریشان ہو گیا تھا، اس کا بھی مجھے ادراک تھا۔

میں نے ایک نظر رامس پر ڈالی۔ درحقیقت مجھے اس کی یہاں آمد ناگوار ہی گزری تھی۔ بالآخر وزیر خان نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''سنکھال کو ہم کسی صورت میں معاف نہیں کر سکتے۔ اور اسے ہم پکڑ کر اپنے سردار کے سامنے پیش کریں گے۔ یقیناً ہماری بھتیجی شہزادی اس قاتل سنکھال کو پہچان لے گی۔ اس کی تصدیق کے بعد ہی ہمارا اور تمہارا معاملہ ختم ہو سکتا ہے۔''

اس کی بات ایک حد تک درست ہی تھی اور میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ سنکھال کو زندہ پکڑ کر ان کے سپرد کر دوں۔ اور یہ اچھا ہی ہوا تھا کہ اب وزیر خان بھی انکل اعظم خان کے ساتھ یہاں آ گیا تھا۔

اتفاق تھا کہ ان لوگوں نے اسی ہوٹل میں رہائش اختیار کی ہوئی تھی جہاں میں نے بھی اپنے لئے کمرہ بک کروا رکھا تھا۔ میں نے جواباً وزیر خان کی طرف دیکھ کر کہا۔

''میں خود بھی یہی چاہتا ہوں۔ اس لئے میں نے تمہارے بھتیجے کے قاتل سنکھال کو اپنی نظروں میں رکھا ہوا ہے لیکن.........''

اچانک انکل اعظم خان نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے مجھے ٹوکا۔ ''نادر بیٹے! مجھے بات کرنے دو۔''

پھر وہ وزیر خان سے مخاطب ہو کر انتہائی متانت سے بولے۔ ''دیکھو وزیر خان! تمہیں اب تک سچائی کا اندازہ ہو ہی چکا ہو گا۔ تمہارے بھتیجے شہ زور کا قاتل سنکھال اس وادی میں موجود ہے۔ مگر اب اسے پکڑنا ہماری ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ کام تمہیں خود نمٹانا ہو گا۔''

جواباً وزیر خان نے انکل اعظم خان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''سنکھال کو ہم نہیں پہچانتے۔ اسے ہم کیسے اپنی گرفت میں لے سکتے ہیں؟ اس کی نشاندہی بھی نادر ہی کو کرنا ہو گی۔''

''لیکن یہ ایک غیر مشروط مدد تصور کی جائے گی۔'' انکل اعظم خان نے بارعب لہجے میں وزیر خان سے کہا تو اس نے کچھ سوچ کر اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

اچانک رامس اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے فوری طور پر انکل اعظم خان اور وزیر خان کو روانہ ہونے کا مشورہ دیا۔ یہاں آج رات کیا ہونے والا تھا، اس کا میرے اور رامس کے سوا کسی کو علم نہ تھا۔ اس لئے میں نے یہاں سے نکل کر اپنے ہوٹل میں جانے کو ترجیح دی۔ یہاں کھل کر میں انکل اعظم وغیرہ سے بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔

یوں بھی میں ہوٹل جا کر تنہائی پاتے ہی انکل اعظم خان سے چند مشورے بھی کرنا چاہتا تھا۔ کبھی میرے جی میں آتا کہ اسی وقت جا کر سردار آگرموشی کو آج کی رات اس کے خلاف ہونے والی بغاوت کے بارے

گاہ کر ڈالوں۔ مگر پھر رامس کے ساتھ کئے گئے معاہدے کا خیال آتا تو اپنا ارادہ بدلنا پڑتا۔

ہم نے جب سردار آگرموشی سے جانے کی اجازت طلب کی تو اس نے انکار کر دیا۔ رات کے کھانے اتھ اس نے وہ رات بھی مہمان خانے میں گزارنے پر اصرار کیا۔ مگر میں جانتا تھا کہ آج رات کیا والا تھا۔ اس لئے میں نے مزید وہاں رکنے سے انکار کر دیا اور انتہائی معذرت کے ساتھ کچھ ضروری ش کر اسے قائل کر ہی لیا۔

البتہ رامس جانے کیوں ہمارے وہاں سے جانے پر شدید متذبذب نظر آ رہا تھا۔ صاف عیاں تھا کہ وہ ے بلکہ بالخصوص میرے اور نگینہ کے وہاں سے جانے پر قطعی تیار نہ تھا۔ اس بات پر میں اندر سے ذرا گیا تھا۔ تاہم جب ہم گاڑی میں سوار ہونے لگے، گاڑی چترال سے کرائے پر لی گئی تھی تو رامس نے ے پوچھا۔

''میرا خیال ہے اب تو تم لوگ ادھر ہی رہو گے، ہوٹل میں۔''

''ہاں......... کیونکہ سنکھال والا معاملہ بھی تمہارے علم میں آ ہی چکا ہے۔ وہ بھی نمٹانا پڑے گا۔'' میں دانستہ سنکھال والے معاملے کا ذکر کیا تھا۔

اس وقت سب لوگ جیپ میں سوار ہو چکے تھے۔ جیپ کا ڈرائیور بھی موجود تھا۔ صرف میں اور رامس ڑے باتیں کر رہے تھے۔ سردار آگرموشی ہمیں رخصت کر کے جا چکا تھا۔

''میں تم سے ملنے آؤں گا ہوٹل۔ پھر اس سلسلے میں مزید بات ہو گی۔ مگر تم مجھ سے ملے بغیر وادی سے نکلنا۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

مجھے اس کی اس بات نے ایک بار پھر تشویش میں مبتلا کر دیا۔ مجھے دال میں کچھ کالا نظر آ رہا تھا۔ بہرطور ں جیپ میں سوار ہو گیا۔ ہم اپنے ہوٹل میں آ گئے۔ انکل اعظم نے دو کمرے لے رکھے تھے۔ میں نے ان کو صبح تک کے لئے ٹال دیا اور پھر نگینہ کے ساتھ انکل اعظم خان کو بھی لئے اپنے کمرے میں آ گیا۔ کمرے کا دروازہ اچھی طرح بند کیا۔ پھر میں اور انکل اعظم خان موجودہ صورتِ حال پر تبادلہ خیال نے کے لئے سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ میں نے انہیں رامس کی باتوں سے آگاہ کر دیا۔

''تم نے بہت بڑی بے وقوفی کی ہے نادر بیٹے!'' پوری بات جاننے کے بعد انہوں نے تشویش زدہ ں کہا۔ ''مجھے ایسا لگتا ہے کہ رامس اور عامل عاروب نہ صرف سردار آگرموشی کے خلاف بلکہ تمہارے ے کے خلاف بھی ضرور کوئی گہری چال چلنا چاہتے ہیں۔ یہ تو تمہاری اور نگینہ کی خوش قسمتی تھی کہ ایسے میں جب رامس کے اقتدار حاصل کرنے والے معاملے پر زد پڑتی تھی تو اس نے کسی طرح عامل ب کو بھی اس معاہدے کے لئے سردست قائل کر لیا کہ وہ نگینہ کو رہا کر دے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو سردار شی بغاوت سے پہلے ہی عامل عاروب پر لشکر کشی کر دیتا۔ نگینہ والے مسئلے کی وجہ سے نہ صرف رامس ل عاروب کو بھی اپنے لئے خطرہ محسوس ہوا تھا اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ تم نے عامل عاروب کے بونا کو موت کے گھاٹ اتار ڈالا جس کے باعث عامل عاروب کی کمر ہی ٹوٹ گئی۔ لہٰذا انہیں نگینہ کو نا پڑا تا کہ ادھر رامس مقررہ مدت کے اندر اندر قبیلے کی دستار حاصل کر لے اور ادھر عامل عاروب لے پر بھی فیصلہ کن جنگ کا خطرہ ٹل جائے۔ اور نادر بیٹے! میں تمہیں ایک بات بھی بتا دوں۔''

نا کہہ کر انکل اعظم خان نے تھوڑا توقف کیا، پھر بولے۔

اگر رامس کی یہ بغاوت کامیابی سے ہمکنار ہو گئی تو ایک بار پھر تم اور نگینہ عامل عاروب کے چنگل میں جاؤ گے۔ رامس خود تمہیں تحفتاً عاروب کے حوالے کرے گا۔''

انکل اعظم خان کی باتوں اور تجزیے نے مجھے دہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں دنگ رہ گیا۔ انہوں نے اپنے جن خدشات کا اظہار کیا تھا، موجودہ حالات کے تناظر میں ایسا ہونا ہرگز ناممکن نہیں تھا۔

"تو پھر انکل! ہمیں سردار آگرموشی کو اس خطرے سے فوری آگاہ کرنا ہوگا۔"

"ایسا کرنا ہمارے لئے بے حد ضروری ہے۔" انہوں نے تائیدی اور تاکیدی دونوں انداز میں کہا۔ "تم پر ویسے بھی یہ اخلاقی ذمے داری بنتی ہے۔ سردار آگرموشی بہرحال تمہارا محسن ہے۔ کم از کم اتنا ہی سہی، جب تم زخمی تھے تو سردار آگرموشی نے ہی تمہاری مرہم پٹی کروائی تھی۔ باقی رہی یہ رامس کی قصہ کہانی تو ان کے اندرونی معاملات میں ہمیں دخل اندازی نہیں کرنا چاہئے۔"

"تو پھر اب کیا، کیا جائے؟......... پانی تو سر سے گزر چکا۔" مجھے پہلی بار تشویش کا احساس ہوا۔

"تم اسی وقت سردار آگرموشی سے ملنے کی کوشش کرو۔ اور میں نگینہ کو لے کر یہاں سے نکل جاتا ہوں۔" وہ بولے۔ "سردار آگرموشی کو عاروب کے قبیلے پر لشکر کشی کرنے دو۔ عاروب کی شکست سے ہمیں یہ فائدہ ہوگا کہ اس موذی سے ہمیشہ کے لئے جان چھوٹ جائے گی۔ اس کے ساتھ سنکھال بھی ہماری گرفت میں آ جائے گا جسے ہم وزیر خان کے حوالے کر دیں گے۔ میں صبح تڑکے یہاں سے نگینہ کو لے کر روانہ ہو جاؤں گا۔ جاؤ، اب دیر مت کرو۔"

ان کی باتوں سے میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ مگر نگینہ فوراً پریشان ہو گئی اور ساری شرم و حیا کو بالائے طاق رکھتے ہوئے میرا ہاتھ تھام کر تشویش زدہ لہجے میں بولی۔

"نادر! میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گی۔ تم بھی ہمارے ساتھ واپس چلو۔"

میں نے بڑی ملائمت سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"نگینہ! حوصلہ رکھو......... اللہ نے اب تک ہماری مدد کی ہے۔ آگے بھی وہ کرم نوازی فرمائے گا۔ تم میرے لئے دعا کرنا۔"

نگینہ کی آنکھوں میں تشویش اور محبت دونوں کا تاثر تھا۔ طوعاً و کرہاً اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں نے روانگی کا ارادہ کیا تو انکل اعظم خان نے مجھے ٹھہرنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے ہم اس صورتِ حال سے وزیر خان کو بھی آگاہ کر دیں تو بہتر ہوگا۔ ورنہ وہ خواہ مخواہ تمہاری روانگی کے بعد الٹی سیدھی باتیں سوچتا رہے گا۔ پھر یہ بھی ہے کہ اس کی گاڑی تمہارے کام بھی آ سکتی ہیں۔"

ان کی بات معقول تھی۔ میں ٹھہر گیا اور پوچھا۔ "کیا اسے ساری باتوں سے آگاہ کرنا ہوگا؟"

"ہاں......... میرا خیال ہے اس کا دل اب صاف ہو چکا ہے۔ سنکھال کو گرفت میں لینے کا وہ بھی خواہاں ہے۔"

ہم دونوں دروازے کی طرف بڑھے۔ اور جیسے ہی میں نے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھولا، اچانک رائفل کی لمبی نال میرے سینے سے آن لگی......... وہ دو افراد تھے۔ میں بری طرح ٹھٹک گیا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے میں نے نہایت پھرتی کے ساتھ رائفل کی نال اپنے سینے سے ہٹا کر اس کے پیٹ پر لات جما دی۔ مگر رائفل پر اپنی گرفت مضبوط نہ کر سکا۔ وہ لڑکھڑا کر اپنے ساتھی سے جا ٹکرایا۔ دونوں نے سنبھلنے کی کوشش میں اپنی رائفلوں کی نالوں کا رخ میری جانب موڑنے کی کوشش کی۔ مگر ایک پر انکل اعظم خان نے حملہ کر دیا اور دوسرے پر میں پل پڑا۔ ہم نے ان کی رائفلیں چھین لیں اور اس سے پہلے کہ سنبھل کر ان کی رائفلیں ان پر ہی استعمال کرتے، وہ ناقابلِ یقین پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے راہداری میں دوڑتے چلے گئے۔

میں نے ان کے عقب میں برسٹ فائر کرنے کی کوشش کی لیکن انکل اعظم خان نے مجھے منع کر دیا۔ تاہم میں دوڑتا ہوا ان کے تعاقب میں گیا اور ہوٹل کی مختصر مگر ویران لابی سے ہوتا ہوا باہر آ گیا۔ میں نے ایک ڈبل ڈور جیپ کو تیزی سے اسٹارٹ ہو کر تاریکی میں بڑھتے دیکھا۔ وہ دونوں نامعلوم حملہ آور فرار ہونے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ باہر چہار سُو تاریکی، سردی اور سناٹے کا راج تھا۔ میں واپس پلٹا۔ انکل اعظم خان کو منتظر کھڑے پایا۔ ہم دونوں واپس اپنے کمرے میں آ گئے۔

"یہ دونوں یقیناً رامس کے بھیجے ہوئے جاسوس ہو سکتے ہیں۔" میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "اور یقیناً ان دونوں نے ہماری باتیں سن لی ہوں گی۔" انکل اعظم خان نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

"اس لئے یہ ہمارا راستہ روکنا چاہ رہے تھے۔ بلکہ مجھے تو لگتا ہے رامس نے ہی ہماری نگرانی کے لئے ان دونوں آدمیوں کو یہاں بھیجا ہوگا۔" پھر تھوڑے توقف کے بعد مجھ سے بولے۔ "نادر بیٹے! میرا خیال ہے اب تمہارا سردار آگرموشی کے پاس جانا مناسب نہ ہوگا۔ اب اللہ پر چھوڑ دو، جو ہوگا کل صبح دیکھا جائے گا۔ شاید اسی میں ہماری بہتری ہو۔"

وہ رات ہم نے اپنے کمروں میں گزاری۔ وزیر خان کو اس سلسلے میں کچھ بتانے کا ارادہ بھی ترک کر دیا گیا تھا۔

❋❋❋

بقیہ رات بے چینی میں گزر گئی۔ میری خواہش تھی کہ انکل اعظم جلد از جلد نگینہ کو لے کر اس علاقے سے نکل جائیں۔ صبح ہوتے ہی ہم نے وزیر خان کو ان تمام معاملات سے آگاہ کیا۔ تمام واقعات جاننے کے بعد وہ بھی فکرمند ہو گیا تھا۔ تاہم اسے اعظم خان کی وہاں سے روانگی پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ بلکہ اس کی تجویز تھی کہ وہ اپنے دو کارندوں کو آگرموشی کے حالات جاننے کے لئے وہاں بھجوا دے۔ ہماری تائید کے بعد اس نے دو افراد کو ان کی طرف روانہ کر دیا۔

یہ معاملات طے ہوئے تو اعظم خان نے روانگی کا ارادہ باندھ لیا۔ نگینہ ان کے ساتھ تھی۔ ہم لوگ اڈے تک انہیں چھوڑنے کے لئے ہوٹل سے نکل آئے۔

اڈہ آبادی سے کوئی سات آٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور ابھی ہم نے تقریباً تین چار کلومیٹر کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ پچھلی سیٹ پر بیٹھے وزیر خان کے آدمی نے بتایا کہ عقب میں دو تیز رفتار جیپیں دکھائی دی ہیں۔ ان کے پیچھے پندرہ سولہ خچر اور گھوڑوں پر سوار مسلح افراد بھی ہمارے تعاقب میں نظر آ رہے تھے۔

میں درمیانی سیٹ پر نگینہ اور انکل اعظم خان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ جبکہ وزیر خان اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے برابر براجمان تھا۔ اس انکشاف پر ہم سب سناٹے میں آ گئے۔ میں نے چلا کر ڈرائیور سے کہا۔

"جیپ دوڑاؤ......... ہماری جانیں خطرے میں ہیں۔"

ڈرائیور بوکھلا سا گیا۔ کیونکہ اسے حالات کا اندازہ نہ تھا۔ وزیر خان نے پُرجوش آواز میں کہا۔

"ہمیں رک کر ان کا مقابلہ کرنا ہوگا۔"

"ہم اتنے سارے مسلح لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے وزیر خان!......... ڈرائیور سے کہو جیپ دوڑائے۔" میں نے تیز لہجے میں کہا تو وزیر خان نے وہی ہدایت ڈرائیور کو دی۔ مگر ڈرائیور پریشان ہو گیا۔ اس نے گاڑی کی رفتار میں کچھ خاص اضافہ نہیں کیا تھا۔ میں نے غصے سے دانت پیس لئے اور گردن گھما کر دیکھا تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ متعاقب لشکر گویا سر پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے ڈرائیور کو کالر سے پکڑ کر چلاتے ہوئے کہا۔

''جیپ دوڑاؤ خبیث آدمی!.........ہماری جانیں خطرے میں ہیں۔''

تب کہیں جا کر اس نے جیپ کی رفتار یکدم تیز کردی۔ میرے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ ڈرائیور کو گردن سے پکڑ کر اس کی سیٹ سنبھالنے کی کوشش کرتا۔

اچانک عقب سے گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ اُبھری۔ ہم سب غیر ارادی طور پر نیچے جھک گئے۔ عقب سے برسنے والی گولیاں ''ٹھک.........ٹھک'' کی آوازوں سے جیپ کی باڈی میں پیوست ہو گئیں۔ گولیاں عقبی شیشے کو توڑتی ہوئی اندر سے ہی آر پار ہو کر جیپ کی ونڈ اسکرین میں پیوست ہوئی تھی۔ دونوں اسکرینیں زوردار چھناکے سے ٹوٹ گئیں۔

نگینہ نے غیر ارادی طور پر چیخ ماری۔ ڈرائیور کا ہاتھ اسٹیئرنگ پر بہکنے لگا۔ عقب سے بدستور فائرنگ جاری تھی۔ ہم سب نے اپنے سروں کو نیچے جھکا دیا۔ مگر بدقسمتی سے ایک گولی ڈرائیور کے سر میں عقب سے پیوست ہو گئی۔ وہ آواز نکالے بغیر ڈرائیونگ سیٹ پر لڑھک گیا۔ بھیجا پار ہونے کے باعث اس کے خون آلود لوتھڑوں کے چھینٹے میرے اوپر پڑے تو مجھے ڈرائیور کے افسوس ناک انجام کا ادراک ہوا۔ میرا پورا وجود سائیں سائیں کرنے لگا۔

اتفاق سے وزیر خان نے ہمت اور پھرتی سے کام لیا اور ڈرائیور کی لاش کو اپنی طرف کھینچا۔ میں نے بھی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ عقبی سیٹ سے اچھل کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اب بدقسمت ڈرائیور کی لاش بیٹھنے کے انداز میں میری اور وزیر خان کے بیچ میں پھنسی ہوئی تھی۔

اسٹیئرنگ سنبھالتے ہی میں نے جیپ کی رفتار بڑھا دی۔ جبکہ وزیر خان نے اپنا پستول نکال لیا اور تیزی کے ساتھ عقبی حصے کی طرف چلا گیا۔

اب وزیر خان اور اس کے آدمی نے متعاقبین حملہ آوروں پر جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ بعد میں انکل اعظم خان بھی اپنا پستول نکال کر اس جوابی فائرنگ میں شریک ہو گئے۔ جبکہ میں نے نگینہ کو سختی سے دونوں سیٹوں کے درمیان لیٹے رہنے کی تاکید کی تھی۔

میرے برابر میں ڈرائیور کی لاش دوسری خالی سیٹ پر لڑھکی ہوئی تھی۔ میری ساری توجہ اب جیپ دوڑانے پر مرکوز تھی۔ میری کنپٹیاں بری طرح سنسنا رہی تھیں اور دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ فائرنگ کا تبادلہ بدستور جاری تھا۔ مجھے ہردم یہی خدشہ لاحق تھا کہ کہیں دشمن حملہ آوروں کی گولی سے جیپ کا ٹائر برسٹ ہو جائے۔

اچانک مجھے زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی۔ میرا دل اُچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ شاید ٹائر برسٹ ہو گیا تھا۔ مگر جلد ہی مجھ پر یہ خوش کن انکشاف ہوا کہ یہ دھماکے کی آواز تعاقب میں آنے والے نامعلوم دشمنوں کی گاڑی کے ٹائر برسٹ ہونے کی تھی۔ میرا حوصلہ سوا ہو گیا۔ راستہ بل کھاتا ہوا ہونے کے باعث جیپ کو زگ زیگ دوڑانے کی ضرورت نہیں تھی۔ تاہم جیپ زبردست ہچکولے کھا رہی تھی بلکہ ایک نسبتاً تنگ موڑ کاٹتے وقت جیپ تیں پینتیس ڈگری تک ایک جانب جھکتے ہوئے الٹتے الٹتے بچی تھی۔ مگر میری دونوں ہاتھوں کی گرفت اسٹیئرنگ پر مضبوط تھی۔

ہم آبادی سے کافی دور نکل آئے تھے۔ جیپ اب ایک دوسرے اور نسبتاً کشادہ راستے پر دوڑی جا رہی تھی۔ اگرچہ یہ راستہ بھی بل کھاتا ہوا اور ناہموار تھا۔ تاہم یہ خدشہ بدستور موجود تھا کہ میں اڈے کے راستے سے بھٹک سکتا تھا۔ کیونکہ یہاں تو ایک کے بعد ایک دوسرا راستہ پہلے راستے کے بطن سے نکل رہا تھا اور مجھے سمت کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ ہم برفیلے اور ٹھٹھرتے ہوئے ویرانوں میں بھی نکل سکتے تھے۔

اچانک مجھے اپنی جیپ کے عقبی حصے سے ایک کرب ناک انسانی چیخ سنائی دی۔ یہ چیخ وزیر خان کے ...ی تھی۔ میں مزید پریشان ہو گیا۔

اچانک مجھے انکل اعظم خان کی چلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''نادر!......... جیپ اور تیز دوڑاؤ۔ دشمن ...ب آتے جا رہے ہیں۔''

مجھے خود بھی عقب میں آتی ہوئی گاڑیوں اور خچروں وغیرہ کے دوڑنے کی آوازیں لحظہ بہ لحظہ قریب آتی ...دے رہی تھیں۔ مگر راستہ بتدریج پُرخطر ہونے کے باعث میں اپنی جیپ کی رفتار اس سے زیادہ نہیں ...سکتا تھا۔

''ہمارے پاس فرار کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے.........فاضل راؤنڈز ختم ہونے لگے ہیں۔'' وزیر ...نے بوکھلائی ہوئی آواز میں کہا۔

میں نے اپنی ساری توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز رکھی تھی۔ مجھے پورا یقین ہو چلا تھا کہ ہم راستے بھٹک چکے اور جیپ کی فیول بتانے والی سُوئی بھی خاتمے (E) کی طرف جھک رہی تھی۔

معاً مجھے سامنے بائیں جانب ایک تنگ موڑ نظر آیا۔ ادھر عقب میں متعاقبین حملہ آوروں کی گاڑیوں اور ...وں وغیرہ کے دوڑنے کی آوازیں لحظہ بہ لحظہ قریب آتی محسوس ہو رہی تھیں۔ مگر یہ تنگ موڑ کاٹنے کے لئے ...ری تھا کہ میں جیپ کی رفتار چالیس سے بھی کم کروں اور میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ ...جیسے ہی میں نے رفتار دھیمی کی اور موڑ کے قریب پہنچتے ہی اسٹیئرنگ بائیں جانب گھمایا، اچانک سماعت ...ن دھماکا ہوا۔ ہماری جیپ نے ایک زبردست جھٹکا کھایا۔ بدقسمتی سے موڑ کاٹنے کے دوران ہی کوئی گولی ...ر کو برسٹ کر چکی تھی۔ نتیجتاً جیپ اُلٹتے اُلٹتے بچی تھی۔ اگر میں فوراً بریک نہ لگا دیتا تو جیپ دائیں جانب ...ایک نمودار ہونے والی گہری کھائی میں جا گرتی۔ چشم زدن میں دشمنوں نے ہمیں گھیر لیا۔ وزیر خان اور ...ل اعظم ''سرنڈر'' کر چکے تھے۔ میں نے بھی بے اختیار ایک گہری سانس خارج کر کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے ...ڑ دیئے۔ جیپ کا انجن بند ہو چکا تھا۔

اس کے بعد تنومند شحیم مسلح افراد نے ہم سب کو بے دردی کے ساتھ گھسیٹ کر باہر نکالا۔ ان سب کے ...ے پر خونخواری تھی۔ آنکھوں سے پُرغیظ اور فاتحانہ چمک مترشح تھی۔ نگینہ سہم کر میرے ساتھ آن لگی تھی۔ انہوں نے ہم سے کوئی بات نہ کی اور ہماری تلاشی لے کر نہتا کرنے کے بعد گاڑیوں میں ڈال دیا گیا۔ ...لوگوں کے تیور اس قدر جارحانہ اور خطرناک نظر آ رہے تھے کہ ہمیں ان سے کچھ پوچھنے میں بھی جان کا ...رہ محسوس ہو رہا تھا

نگینہ کی حالت زیادہ خراب تھی۔ اس نے جوں ہی امریکہ سے پاکستان، اسلام آباد ایئرپورٹ پر قدم ...اٹھا، نامساعد حالات کی ایک کے بعد ایک ٹرابڑی کا شکار ہو کر رہ گئی تھی۔

مختصر سا قافلہ ہمیں لے کر روانہ ہوا اور جب ہم سردار آگرموشی کے قبیلے میں داخل ہوئے تو وہاں ہر ...ف مجھے خانہ جنگی کا نقشہ نظر آیا۔ کئی خون آلود لاشیں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ دھوئیں اور گرد و غبار کے ...ا بارود کی ناگوار سی بُو پھیلی ہوئی تھی۔

مجھے یہ سمجھنے میں لحظہ بھر کی بھی دیر نہ لگی تھی کہ وہ کچھ ہو چکا تھا جس کی مجھے اور انکل اعظم خان کو توقع تھی۔ ...ایسا لگتا تھا کہ گزشتہ شب بغاوت کے دوران سردار آگرموشی کے جاں نثاروں نے اس بغاوت کو کچلنے کی ...اپنی پوری کوشش کی تھی لیکن شاید وہ اپنی جانوں کا نذرانہ دینے کے باوجود بھی کامیاب نہ ہو سکے تھے۔

لیکن میرے لئے تشویش کی بات یہ تھی کہ اگر راس اپنے مقصد میں کامیاب ہو بھی چکا تھا تو پھر اس

نے اپنے حواری ہمارے تعاقب میں کیوں روانہ کئے تھے؟......کیا انکل اعظم خان کے بدترین خدشات درست ثابت ہونے والے تھے؟ مکار اور شاطر رامس نے ہمیں اپنے مقصد کی خاطر استعمال کیا تھا۔ درحقیقت رامس نے میرے ساتھ نہیں بلکہ عامل عاروب کے ساتھ اصل معاہدہ کیا تھا۔ گویا اب اس طرح دونوں کے مقاصد پورے ہو چکے تھے۔ رامس ہمیں تحفے کی صورت میں عامل عاروب کے حوالے کر چاہتا تھا۔

ہمیں سردار آگرموشی کے درباری حجرے میں پیش کیا گیا تو وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔

رامس کو میں نے سردار آگرموشی کی تخت نما کرسی پر زرق برق لباس میں ملفوف براجمان پایا۔ اس کے سر پر سرداری کی سرخ دستار بھی نظر آ رہی تھی جس میں سنہری تاروں سے ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ اس کے دائیں جانب کی نشست پر سردار آگرموشی کی فربہ اندام سرخ وسپید بیوی ناگاسی بھی موجود تھی۔ رامس بلکہ سردار رامس کے چہرے پر کروفر اور پرُغرور تاثرات پھیلے ہوئے تھے۔ ہمیں اس کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

''رامس! یہ کیا حرکت ہے؟......تم نے میرے ساتھ معاہدہ کیا تھا۔ پھر یہ سب کیا ہے؟'' میں نے رامس کے چہرے پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے بلند لہجے میں اسے مخاطب کر کے کہا۔

اس کی آنکھوں میں مکارانہ جھلک اور ہونٹوں پر بڑی مکروہ مسکراہٹ ابھری۔ پھر وہ حقارت سے اور گونجیلی آواز میں بولا۔

''بددیانتی کی ابتداء تم نے کی تھی نادر! اس رات میرے دونوں آدمیوں نے ہوٹل میں تمہاری گفتگو سن لی تھی۔''

میں اس کی بات پر چونکا اور اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ گزشتہ رات ہمارے کمرے کے باہر باتیں سننے والے وہ دونوں جاسوس اس کے بھیجے ہوئے تھے جنہوں نے مجھ پر رائفل بھی تانی تھی۔ مگر بعد میں فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ مگر میں نے مرعوب ہوئے بغیر کہا۔

''میں جن حالات سے دوچار تھا، مجھے اس بات پر شبہ تھا کہ کہیں تم ہمارے ساتھ بھی دھوکا کر سکتے ہو۔ اگر میرا خدشہ غلط تھا تو پھر تم نے اپنے جاسوس کیوں روانہ کئے تھے ہمارے پیچھے؟''

وہ بڑی ڈھٹائی سے ایک بدمست قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

''بے وقوف! تمہیں اگر خطرے کا احساس ہو گیا تھا تو پھر تمہیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہئے تھا۔ بلکہ میں تو تمہارے یہاں سے جاتے ہی پریشان ہو گیا تھا۔ خیر......اب تمہارا فیصلہ جلد ہو جائے گا۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنے مسلح حواریوں کو حکم دیا۔ ''انہیں لے جا کر قید خانے میں ڈال دو۔''

❋❋❋

میں نے اس بات پر خدا کا شکر تو ادا کیا تھا کہ نگینہ کو مجھ سے جدا نہیں کیا گیا تھا مگر اس کا مطلب ہرگز یہ نہ تھا کہ خطرہ سر سے ٹل چکا تھا۔ بلکہ ہم چاروں ہی اس مہیب خطرے کی ان دیکھی ہولناک زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔

یہ اٹھارہ بائی بارہ کا مستطیل نما کمرہ تھا۔ چھت قدرے بلند اور سپاٹ تھی۔ دیواروں کے دائیں بائیں چربی سے جلنے والے لیمپ نصب تھے۔ زمین پر گھاس پھونس بکھری ہوئی تھی۔ فرش کھردرا اور کہیں کہیں سے ناپختہ تھا۔

بادی النظر میں یہ قید خانہ زمین دوز ہی نظر آتا تھا۔ بہ الفاظ دیگر تہہ خانہ ہی معلوم ہوتا تھا کہ جہاں روشن

ان کی بجائے دائیں جانب کی دیواروں کی بلندی پر روزن نظر آ رہا تھا۔ وہاں سے روشنی کی ہلکی سی کرن پوٹ رہی تھی

چربی جلنے کی بساند کے ساتھ ساتھ در و دیوار سے وحشت اور سیلن سی ٹپک رہی تھی۔ جی بہت گھبرا رہا تھا۔ آواز بھی ہماری گونج رہی تھی۔ ہم چاروں وسط میں کھڑے حیران و پریشان ارد گرد دیکھ رہے تھے کہ یایک نگینہ نے وحشت زدہ سی چیخ ماری۔

''کیا ہوا......؟'' میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''وہ......وہ کون ہے؟'' نگینہ ایک کونے کی طرف انگلی کا اشارہ کر کے کپکپاتی آواز میں بولی۔

ہم تینوں نے مذکورہ سمت کی طرف دیکھا تو چونک پڑے۔ ہمارے علاوہ بھی کوئی قید تھا۔ کونے میں یوار گیر آہنی کڑوں سے منسلک فولادی زنجیروں میں کوئی جکڑا ہوا سر جھکائے بیٹھا نظر آیا۔ میں ہی سب ے پہلے لپک کر اس کی جانب بڑھا......مدھم روشنی میں قریب جا کر میں نے دیکھا، وہ قیدی تھا۔ اس کا جھکا ہوا تھا۔ شاید وہ بے ہوش تھا۔ پکی عمر کے اس شخص کا جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ وہ زخمی بھی تھا۔ اس ے کپڑوں پر جگہ جگہ خون لگا ہوا تھا۔ سر اور پیشانی سے بہتا ہوا خون بھی جم کر چپک رہ گیا تھا۔ میں نے ڑکتے دل کے ساتھ اس کے قریب اکڑوں بیٹھ کر اس کا سر دھیرے سے اوپر کیا تو مجھے زبردست جھٹکا لگا۔

وہ بدنصیب سردار آگرموشی تھا۔

معزول سردار آگرموشی کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے گہرے دکھ اور کرب کا احساس ہوا۔ وہ زندہ تھا۔ ں کی آتی جاتی سانسیں گواہ تھیں کہ اس کے مضروب جسم سے روح کا رابطہ ابھی باقی ہے

میں اس کا گال تھپتھپا کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے دونوں پیروں میں ٹخنوں ے گرد آہنی کڑے لگے ہوئے تھے جن سے زنجیر منسلک تھی اور دوسرا سرا دیوار میں آہنی کنڈوں کے ساتھ نی تھا۔

وہ میری ذرا سی کوشش کے بعد ہوش میں آ گیا۔ اس نے سر اٹھا کر اور نیم مردہ آنکھوں سے ہماری طرف یکھا۔ پھر ہولے سے کپکپاتی آواز میں بولا۔

''افسوس!......صد افسوس......'' اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ مارے نقاہت کے اس کی سانسیں ل گئیں۔

میں نے ہولے سے کہا۔ ''معزز سردار! حوصلہ رکھئے۔''

میں صرف اتنا ہی کہہ سکا تھا۔ میری خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس سے کیا کہوں؟''

''اب کیسا حوصلہ......؟'' وہ ہمت کر کے اپنے ریختہ وجود کی طاقت کو بہ مشکل سمیٹتے ہوئے بولا۔ ب تباہ ہو گیا......میرے اپنے ہی سگے بھائی نے میرے خلاف بغاوت کر دی۔ اقتدار کے لالچ ا۔لل......لیکن اس کا کوئی قصور نہیں......مم......میری اپنی ہی بیوی اس کے ساتھ ملی ہوئی تھی۔ ......کیسا بدنصیب شخص ہوں میں۔ مجھے دشمنوں نے نہیں اپنوں نے مارا۔ میری پیٹھ میں خنجر گھونپ کر۔

اس کے ایک ایک لفظ سے کرب اور شکست خوردگی، اس کی بدنصیبی کی طرح ٹپک رہی تھی۔ مایوسی بھی کو پہنچی ہوئی تھی۔

میں اب اس سے کیا کہتا کہ یہ سارا کیا دھرا اسی کا تھا۔ میں نے اس سے مزید کوئی بات نہ کی اور اٹھ راہوا۔

بغاوت کا زہر نہ جانے کب سے اس کے بھائی کے وجود میں سرایت کئے ہوئے تھا جس سے یہ غافل

رہا تھا۔ اگر شب گزشتہ میں بتا بھی دیتا تو بھی یہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ بغاوت کا علم یکدم ہی بلند نہیں ہوتا۔ پہلے اس کی بنیادیں بھری جاتی ہیں، طویل عرصے تک۔ اس کے بعد شب خون مارنے کا وقت آتا ہے۔ اس لئے میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہ تھا۔

انکل اعظم خان نے میرے کاندھے پر دھیرے سے ہاتھ رکھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم خود قیدی تھے، اس کی کیا مدد کرتے؟ اس لئے اسے مجبوراً ایسی حالت میں چھوڑ کر واپس اپنی جگہ پر آ کر فرش پر بیٹھ گئے۔

قید خانے کا دروازہ سپاٹ تھا۔ اس میں جھری تک نہ تھی۔ اندر کی جانب بھی کنڈی نہیں تھی۔ ہم چاروں سر جوڑے بیٹھ گئے۔

''نہ جانے یہ خبیث رامس ہم سے اب کیا سلوک کرتا ہے۔ اس چکر میں بلاوجہ میں بھی پھنس گیا۔'' وزیر خان نے تلملا کر کہا۔ میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا اور انکل اعظم خان سے بولا۔

''انکل! یہاں سے نکلنے کا ایک ہی طریقہ سمجھ میں آتا ہے۔''

''کون سا؟'' انہوں نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ وزیر خان کی مستفسرانہ نظریں بھی میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''دروازے کے ساتھ اکھاڑ پچھاڑ کرنا پڑے گی۔''

''یہ کس طرح ہوگا؟......... باہر یقیناً پہرے دار موجود ہوں گے۔'' انکل اعظم نے کہا۔

''میرا خیال ہے ہمیں ایسی کوشش کرنے کی بجائے وقت کا انتظار کرنا چاہئے۔ ورنہ نیا سردار رامس مشتعل ہو کر ہمارے خلاف اس سے بھی زیادہ سخت قدم اٹھا سکتا ہے۔'' وزیر خان پریشانی سے بولا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ پانچ فٹ سے زیادہ نہ تھا اور چوکھٹ پر مضبوطی سے جما ہوا تھا۔ میں نے کان لگا کر دوسری جانب سے سن گن لینے کی کوشش کی مگر گہری اور وحشت انگیز خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔

''واپس آجاؤ.........کوئی فائدہ نہیں۔'' اچانک قیدی سردار آگرموشی کی آواز ابھری۔ ''اب ہمیں موت ہی یہاں سے باہر نکال سکتی ہے.........روحوں کی صورت میں......... ہا......... ہا......... ہا۔''

وہ پاگل پن کے مارے قہقہے لگانے لگا۔ معزول ہونے اور قید میں ڈالے جانے کے بعد اس کے حواس بری طرح متاثر نظر آ رہے تھے۔

مجھے دروازے پر گرفت جمانے کا ایک ذرا سا رخنہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ چند گھنٹوں بعد دروازے پر آہٹ ہوئی۔ ہم سب غیر ارادی طور پر گردنیں گھما کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

دوسرے ہی لمحے دروازہ کھلا، چار عدد مسلح لحیم شحیم افراد اندر داخل ہوئے۔ مجھے دروازے کے باہر بھی چند مسلح افراد کھڑے نظر آئے تھے اور ایک اوپر جاتے تنگ اینٹوں کے سنگی زینے کی بھی جھلک نظر آئی تھی۔ ہمیں گن پوائنٹ پر باہر چلنے کا درشت حکم دیا گیا۔ ہم چاروں خاموشی سے اٹھے اور دروازے کی طرف بڑھے۔

زینے چڑھنے کے بعد جب ہمیں سردار رامس کے بڑے سے درباری حجرے میں لایا گیا تو مجھے دھچکا لگا۔ نگینہ کے حلق کے بھی مارے سراسیمگی کے گھٹی گھٹی چیخ برآمد ہوگئی۔

وہاں باغی سردار رامس سمیت اس کے دیگر امراء بھی موجود تھے اور انہی میں مجھے وہ مردود و ملعون عامل عاروب بھی بیٹھا ہوا نظر آ گیا۔ اس کے چند مسلح ہرکارے بھی اس کے عقب میں چوکس کھڑے تھے۔

ا عاروب بڑی پُر غضب خونخوار نظروں سے ہماری جانب ہی دیکھے جا رہا تھا۔ باغی سردار رامس نے بھری نگاہ ہم پر ڈالی اور پھر قریب بیٹھے عامل عاروب سے گونجیلی آواز میں بولا۔

م نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔ یہ لو عاروب! ہم تحفے کے طور پر یہ چاروں تمہارے حوالے کرتے ہم ان کے ساتھ جو چاہو سلوک کرو۔''

ا دماغ جلنے لگا۔ ہمارے بدترین اندیشوں کی تصدیق ہو چکی تھی۔ میرا اس وقت رواں رواں جوشِ زت کے مارے کانپ رہا تھا۔

دونوں میرے لئے اجنبی ہیں.........کون ہیں یہ؟'' عاروب نے انکل اعظم خان اور وزیر خان کی شارہ کر کے سردار رامس سے پوچھا۔

اس کا نام اعظم خان ہے۔ یہ نادر کا کوئی رشتے دار ہے۔ جبکہ یہ دوسرا شخص وزیر خان ہے۔'' رامس ۔''وزیر خان تمہارے ایک آدمی سنکھال کی تلاش میں آیا ہے۔ اُس نے اس کے بھتیجے شہ زور کا قتل وہ اپنے علاقے کے سردار کا بیٹا تھا۔ یہ وزیر خان اس کا بھائی ہے۔''

ل عاروب وزیر خان کے متعلق یہ سب رامس کی زبانی جان کر بری طرح چونکا۔ پھر دوسرے ہی لمحے لہجے میں رامس سے بولا۔

مجھے صرف یہ دونوں چاہئیں۔ بس۔'' اس کا اشارہ میری اور نگینہ کی طرف تھا۔ ''باقی یہ تمہارے حوالے جو چاہے ان کے ساتھ سلوک کرو۔''

ل عاروب یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے اور نگینہ کو آناً فاناً بیڑیاں پہنائی جانے لگیں۔ میں غصے سے لال ر رامس کو خوف ناک نظروں سے گھورتے ہوئے شیر کی طرح دھاڑا۔

رامس! یہ تُو اچھا نہیں کر رہا.........تجھے اس کا حساب دینا پڑے گا۔''

لے جاؤ اسے.........کہیں میں اِدھر ہی ان دونوں کا خاتمہ نہ کر ڈالوں۔'' رامس نے شعلہ بار نظروں ی طرف گھور کر عامل عاروب سے کہا۔

ا کے بعد عامل عاروب کے پانچ چھ مسلح ہرکاروں نے مجھے اور نگینہ کو بازوؤں سے پکڑا اور نہایت ی کے ساتھ گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔

ر تین چار جیپیں کھڑی تھیں۔ کچھ مسلح افراد خچروں اور گھوڑوں سمیت کھڑے تھے۔ ان کے مخصوص وں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ سب عامل عاروب کے ہرکارے ہی تھے.........ایک بڑی سی بگھی ی تھی جس میں چار تنومند خچر جتے ہوئے تھے۔ عامل عاروب کو میں نے اسی بگھی میں سوار ہوتے

ں نے بہ غور اطراف میں نگاہ ڈالی تھی۔ ہمیں لینے کے لئے عامل عاروب کا دستہ تقریباً بیس پچیس ں پر مشتمل تھا۔

ال عاروب کے چنگل میں پھنسنے کی وجہ سے نگینہ بری طرح خوف زدہ تھی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ا کہ وہ اس مردود کے خونی عزائم سے واقف تھی جو اسے اپنے دیوتا دابولا مینزی کی بھینٹ چڑھانے کا ارادہ باندھے ہوئے تھا۔ میں خود اندر سے بری طرح پریشان اور تشویش زدہ ہو رہا تھا۔ مگر میں نے واس مختل ہونے نہیں دیئے۔

اب کک.........کیا ہوگا.........نن.........نادر!'' معاً نگینہ نے سہمی ہوئی آواز میں مجھ سے کہا۔ پورا وجود کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی اور فی الحال خاموش رہنے کا

کہا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ مصیبت تو یہ تھی کہ میرے ہاتھ پاؤں آہنی زنجیروں سے جَ
ہوئے تھے۔

سفر جاری رہا۔ مجھے عامل عاروب کے قبیلے تک کے فاصلے کا یہاں سے بہ خوبی اندازہ تھا جو گھنٹے
محیط تھا۔ راستہ تنگ اور ناہموار ہونے کے باعث گاڑی کی رفتار زیادہ نہ تھی۔ میں جلتے سلگتے ذہن پر زو
رہا مگر لگتا تھا شاید اس بار یقینی طور پر مفر کی تمام راہیں ہی مسدود و مفقود ہو چکی تھیں۔ دل و دماغ میں
طرح کے اندیشوں اور وسوسوں کے ناگ بار بار پھن کاڑھے ڈسنے کو تیار معلوم ہوتے تھے۔ کوئی را
سجھائی دے رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس ایکا ایکی بدلتی ہوئی خطرناک اور سنگین تر صورت
سے کس طرح چھٹکارا پایا جاتا۔

جب سوچ و خرد کے تمام راستے مفقود ہو جائیں اور کوئی دوا کام نہ کرے......... جب مایوسیوں
نا اُمیدیوں کے مہیب اندھیروں میں اُمید کی ایک کرن بھی نہ نظر آئے تو انسان ایسے میں اپنے خالق
اور معبود ہی کو پکارتا ہے۔ اللہ......... جتنا بڑا نام ہے، اتنا ہی بڑا آسرا۔ میں نے بھی ایک مجبور و بے بر
عاجز بندے کی طرح صدقِ دل اور بہ زبانِ دل اللہ کو پکارا۔

"اے اللہ!......... اے میرے معبود!......... تُو نے مجھے جتنی عقل اور طاقت دی، میں اسے اب
بروئے کار لاتے ہوئے اپنے دشمنوں پر حاوی ہوتا رہا، ان پر غلبہ پاتا رہا۔ لیکن آخر کب تک۔؟ آج مجھے
جسمانی طاقت ہی نہیں بلکہ ذہنی قوت بھی شاید ایسے کڑے حالات سے نہیں نکال سکتی۔ اب تُو ہی میری
نگینہ کی دست گیری فرما سکتا ہے۔ تیرے فضل کی ایک ہی جھلک مجھے اور نگینہ کو اس نا اُمیدی کے اندھیر
سے نجات دلا سکتی ہے۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ سچے دل سے نکلی ہوئی دعا اور دیدۂ تر سے بہنے والی
فریاد ضرور پوری ہوتی ہے۔"

دعا مانگنے کے بعد مجھے اپنے اندر عجیب سا روحانی سکون محسوس ہوا۔ میں ایکا ایکی خود کو ہلکا پھلکا محس
کرنے لگا۔

میں اور نگینہ جیپ کے عقبی حصے میں تھے۔ ہمارے دائیں بائیں دو مسلح ہرکارے براجمان تھے۔
درمیانی سیٹوں پر، ایک ڈرائیور کے برابر والی نشست پر۔

سفر کو تقریباً نصف گھنٹہ گزر چکا تھا۔ گویا "مقتل گاہ" تک پہنچنے میں آدھا گھنٹہ باقی رہا تھا۔

عامل عاروب سمیت اس کے خونی ہرکاروں کا یہ قافلہ اس وقت برف زار ویرانوں سے گزر رہا تھا۔ ا
پھر اچانک جیسے میری دعا سن لی گئی۔ لیکن جو بھی کچھ ہوا، وہ عقل سے بالاتر بہرحال نہیں تھا اور نہ ہی اسے
کوئی معجزہ کہہ سکتے تھے......... تاہم جو کچھ ہوا تھا، وہ بالکل فطری اور منطقی انداز میں ہوا تھا۔



کچھ بھی ہوا تھا، وہ شاید غیر متوقع تھا۔ مگر فطری ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ رات کی تاریکی میں دشوار گزار
راستوں پر عامل عاروب کے خونی ہرکاروں کے ٹولے کی جیپیں آگے پیچھے دوڑی جا رہی تھیں کہ
گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ اُبھری۔ ہم سب بری طرح چونک گئے۔ پھر ہم سنبھلنے بھی نہ پائے تھے
آنکھوں نے عقبی سیٹ سے سامنے ونڈ اسکرین کے پار ہماری جیپ کے آگے چلنے والی جیپ کو کسی
بلاسٹ ہوتے دیکھا......... شاید اس پر راکٹ لانچر داغا گیا تھا۔ یہی نہیں، ایسے پے در پے مزید
بھی سنائی دیئے تھے۔ مزید دو جیپوں کا مع سواروں کے خانہ خراب ہو گیا تھا۔ اب صرف ہماری اور
جیپ سلامت تھی، جس پر عامل عاروب سوار تھا۔

رتِ حال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے دونوں جیپوں کے سواروں نے مذکورہ سمت سے داغی جانے
اور راکٹوں کی سمت پر اپنی گنوں کے منہ کھول دیئے اور پلک جھپکتے ہی جیپوں سے نیچے اتر گئے۔
پ سواروں کو اپنی پڑی تھی اس لئے وہ ہمیں بھی خاطر میں لائے بغیر اچانک شب خون مارنے
نامعلوم ٹولے سے جنگ کرنے کے لئے نیچے اتر گئے تھے۔ میرے اندر زبردست ہلچل مچ گئی۔
بیر کے نہیں، تقدیر کے وسیلے قسمت نے ہمیں فرار ہونے کا موقع دیا تھا جبکہ نگینہ اس اچانک افتاد پر
ح ہراساں ہو گئی تھی۔

ن تھا کہ معزول سردار آگرموشی کے جاں نثار مسلح ٹولے نے عامل عاروب کے اس کارواں کو باغی
س کا حلیف ہونے کی سزا دی ہو۔ اور اس خیال کو بھی مدنگاہ رکھنا ضروری تھا کہ کسی پل وہ ہماری
می راکٹ لانچر کا نشانہ بنا سکتے تھے۔ اسی لئے میں نے موقع سے فائدہ اٹھانے کا فوری طور پر ارادہ
رب سے پہلے نگینہ سمیت سیٹوں کے درمیان میں دبک گیا۔ کیونکہ گولیوں کی بوچھاڑ ہنوز جیپ کو
رہی تھی۔ جیپ کے ٹائر، کھڑکیوں اور ونڈ اسکرین کے شیشے چکنا چور ہو چکے تھے، تاہم دونوں جیپیں
مت تھیں۔ شاید بروقت جوابی کارروائی نے نامعلوم حملہ آور ٹولے کو کسی حد تک دور رکھنے میں کامیابی
لی تھی۔

مت سے کام لو......... گھبرانا نہیں......... ہم یہاں سے نکلنے والے ہیں۔" میں نے جوش سے
واز میں اسے مخاطب کیا۔ شکر تھا کہ ہمارے پاؤں آزاد تھے۔ میں نے ذرا سر ابھار کر گرد و پیش کا
۔ تاریک ماحول میں شعلہ فشاں لکیروں کے سوا کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ میں جھکے جھکے رینگ کر جیپ کی
ون پر آ گیا اور نگینہ نے بھی ذرا حوصلہ پکڑتے ہوئے میرا ساتھ دیا تھا۔ ہم دونوں کے ہاتھوں میں
کے گرد فولادی زنجیریں جکڑی ہوئی تھیں، تاہم میں نے ہمت نہ ہاری تھی۔ حملہ بائیں جانب سے
جبکہ دائیں جانب کی جگہ خالی تھی۔ ہم دونوں جیپ سے باہر تاریکی میں اتر گئے۔ گولیوں کی سمع
تڑاہٹ جاری تھی۔ بادی النظر میں مجھے نامعلوم حملہ آور ٹولے کا پلڑا بھاری محسوس ہوتا نظر آ رہا تھا۔
میں نے عامل عاروب کے ہرکاروں میں سے چند ایک کی لاشیں بھی پڑی دیکھی تھیں۔ میں اور نگینہ

تاریکی کا حصہ بنے سنگلاخ چٹانوں کے خلا میں آ گئے۔ سر دست ہمارا ادھر محبوس رہنا بہتر تھا۔ باہر گھمسا
رن پڑا ہوا تھا۔ بے تحاشا فائرنگ کی زد میں ہم دونوں بھی آ سکتے تھے۔ بلکہ عاروب کے کسی خونی ہرکار
اگر ہم پر نظر پڑ جاتی تو مشتعل ہو کر وہ ہمیں بھی گولیوں سے چھلنی کر سکتا تھا۔

عامل عاروب کے خونی ہرکاروں کے ٹولے کے مقابلے میں نامعلوم حملہ آور کا گروہ شاید زیادہ بڑ
اور خطرناک اسلحہ رکھتا تھا۔ کیونکہ وہ نہ صرف گولیوں کی بوچھاڑ جاری رکھے ہوئے تھے بلکہ گاہے گا
گرینیڈ، راکٹ لانچرز کا بھی آزادانہ استعمال کر رہے تھے۔ وہ یقیناً پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے۔

جبکہ عامل عاروب کا خونی ہرکاروں کا ٹولا بھی کم نہ تھا۔ تاہم انہیں اس حملے کی ذرا سی بھی توقع نہ
ہی وہ پیشگی ایسی کسی بھرپور تیاری میں تھے۔ مگر باوجود اس کے وہ بھی ڈٹ کر مقابلہ کر رہے تھے۔

میں سمجھتا تھا کہ جس قدر سرعت کے ساتھ میرے ذہن نے اس بات کا اندازہ لگایا تھا کہ ہم پر اچا
ہلہ بول دینے والا گروہ کون ہو سکتا تھا؟ شاید عامل عاروب یا اس کے ہرکاروں کو ادراک نہ ہو سکا تھا۔
سبب تھا کہ انہوں نے واپسی پر متوقع جنگی "احتیاط" نہیں برتی تھی۔

بہرطور چونکہ مجھے سو فیصد اندازہ ہو چکا تھا اور میں نے کسی حد تک اس کی فائٹنگ سے بھرپور فائدہ اٹ
تھا اور "برننگ پوائنٹ" سے خود کو اور نگینہ کو بہ حفاظت نکال کر "بلینک پوائنٹ" پر آ گیا تھا۔

فائرنگ کا شور بتدریج تھمنے لگا۔ کہیں کہیں سے اِکا دُکا برسٹ چلنے کی آتشیں گرج اُبھرتی اور پھ
طرف پراسرار اور بھیانک سناٹا چھانے لگتا۔

میں نے سنگلاخ خلاء سے ذرا اُبھر کر مدھم چاندنی میں گرد و پیش کا جائزہ لینے کی کوشش کی تو مجھے سوا
بے ترتیب پڑی لاشوں کے کچھ نظر نہ آیا۔ فضا میں بارود کی ناگوار بو رچی ہوئی تھی۔ دفعتہً میں نے چند
ہیولوں کو متلاشی انداز میں مڑتے دیکھا۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ یہ لوگ بہر
عامل عاروب کے ہرکارے نہ تھے۔ اچانک پھر ایک کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ میں یکدم اندر ہو گیا۔ لیکن چونکہ
دیکھ لیا گیا تھا اور ساتھ ہی کسی کو چلا کر کچھ کہتے سنا تو مجھے خدشہ ہونے لگا کہ کہیں ہمیں بھی دشمن سمجھ کر یہ
ہم پر گولیاں نہ داغ دے۔ چنانچہ میں نے یہی بہتر سمجھا کہ نگینہ کے ساتھ باہر نکل آؤں۔ میں نے ایسا ہی کیا
ہم دونوں بندھے ہوئے ہاتھ بلند کئے سنگلاخ خلاء سے باہر آ گئے۔

وہ بھی ادھر ہی کو تیزی کے ساتھ لپکے تھے۔ ہمیں ہاتھ اٹھائے نمودار ہوتے دیکھ کر وہ سب ٹھٹک کر
گئے اور ہم پر گنیں تان لیں۔ ایک نے تیز روشنی ہم پر پھینکی تھی۔ کسی نے عجیب سی بولی میں اپنے ساتھ
سے کچھ کہا تھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے انہوں نے ہمیں کسی حوالے سے یا تو پہچان لیا تھا یا پھر ہمارے قید
ہونے کا اندازہ لگا لیا تھا۔

ہر سُو چٹکی ہوئی چاندنی میں کئی اور مسلح ساتھی بھی ان سے آن ملے۔ یہ سب چست لباس میں تھے۔ ا
میں ایک نسبتاً خاصا لحیم شحیم بھی تھا۔ اس کی شخصیت خاصی رعب و دبدبے والی تھی۔

اس نے بہ غور ہماری طرف دیکھتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی اردو میں مجھ سے کہا۔ "تم دونوں وہی تو نہیں ہو
سردار آگرموشی کے مہمان تھے؟"

"ہاں......... ہم وہی ہیں۔" میں نے فوراً دھڑکتے دل سے کہا۔ "میرا نام نادر ہے......... اور یہ میر
ساتھی نگینہ ہے۔ ہمیں غاصب سردار رامس نے عامل عاروب کے حوالے کر دیا تھا۔"

میری بات پر وہ چند قدم چلتا ہوا میرے ذرا قریب پہنچ کر رکا تو میں نے بہ غور اس کے چہرے
تاثرات بھانپنے کی کوشش کی اور دوسرے ہی لمحے میرے اندر بھیانک وسوسوں نے سر اٹھایا۔ اس

ئم

ثرات میں برہمی کا عنصر غالب تھا اور مجھے ڈر ہوا تھا کہ کہیں یہ ہمارے دشمن ہی نہ ہوں۔ کم از کم اس کے
رے کے غصیلے تاثرات سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا۔

پھر اس نے اپنے ساتھیوں سے سخت لہجے میں کچھ کہا اور یہ لوگ ہمیں اپنے ساتھ لے جانے لگے۔
قریب ان کی دو تین لمبی لمبی اور اونچے چوڑے ٹائروں والی جیپیں کھڑی تھیں۔ ایک میں ہمیں سوار کرایا
لیا اور پھر یہ لوگ ہمیں لے کر تاریکی میں انجان منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

میرا دل وسوسوں کے باعث بری طرح دھڑک رہا تھا اور بار بار ذہن میں یہی تشویش ناک خیال اُبھر
تھا کہ کہیں ہمارے ساتھ، آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والا معاملہ تو نہیں ہوا تھا؟......... بہرطور سفر
اموشی سے جاری رہا۔

لگ بھگ کوئی نصف، پون گھنٹے بعد جیپیں رکیں۔ ہمیں نیچے اتارا گیا۔ مجھے سامنے چند چھوٹی بڑی
چھولداریاں نظر آئیں۔ یہاں پیٹرومیکس کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہمیں ایک نسبتاً بڑی چھولداری میں لایا
گیا۔ یہاں بھی ایک پیٹرومیکس روشن تھا۔ اس کی روشنی میں مجھے یہاں مقدور بھر ضرورت کا ہر سامان نظر آ
رہا تھا۔ ہمارے ساتھ بارعب شخصیت والا لمبا تڑنگا آدمی بھی دو مسلح ساتھیوں کے ساتھ داخل ہوا تھا۔ ہمیں
ایک طرف کونے میں کھڑا کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہی لحیم شحیم شخص ہمیں گھورنے لگا۔

میری تشویش ناک بے چینی فزوں تر ہونے لگی۔ میں کچھ دیر تو اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ پھر
ب وہ کچھ نہ بولا تو میں نے کہا۔

"میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے ہمیں عامل عاروب کے خونی چنگل سے رہائی دلائی۔ کیا میں تمہارا
ام پوچھ سکتا ہوں؟"

میرے تشکر آمیز لہجے کے باوجود وہ بہ دستور مجھے سنسناتی نظروں سے گھورتا رہا۔ اس کے چڑھے ہوئے
یور بتا رہے تھے کہ وہ کسی وقت بھی مجھے اور نگینہ کو گولی سے اُڑا دینے کا حکم جاری کرنے والا تھا۔ میں نے
مت کر کے دوبارہ کہا۔

"مجھے کچھ اندازہ تو ہوتا ہے کہ ہم دوستوں میں ہیں۔ کیا وہ کمینہ عاروب مر گیا؟" اس بار وہ بڑے
نفرت آمیز لہجے میں مجھ سے بولا۔

"بکواس بند کرو اپنی۔ ہم صرف سردار آگرموشی کے جاں نثار ساتھی ہیں اور تم نے اپنے میزبان کے
ساتھ دھوکا کیا۔" اس کے انداز اور جملے نے مجھے بری طرح چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ صورت حال تقریباً وہی
تھی جو میں نے سوچی تھی تاہم اس کا رخ تبدیل ہو چکا تھا۔ ہم مصیبت سے نکلنے کے باوجود مصیبت میں
گھرے ہوئے تھے۔

میں نے امید اور حوصلے کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور دوستانہ انداز کی مسکراہٹ سے قدرے حیرت زدہ
لہجے میں بولا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو دوست!......... تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"میں سب جانتا ہوں۔" وہ درشت لہجے میں بولا۔ "تم نے رامس سے مل کر ہمارے سردار آگرموشی
کے خلاف بغاوت کی سازش میں اس کی مدد کی۔"

"یہ غلط ہے۔" میں نے بھی پُرزور لہجے میں احتجاج کیا۔ "شاید تمہارے علم میں یہ بات نہیں کہ سردار
آگرموشی نے خود مجھے اپنی ساتھی نگینہ کو عامل عاروب کی قید سے چھڑانے کی غرض سے رامس کے ساتھ روانہ
کیا تھا اور........."

"ہاں......... مجھے پتہ ہے۔" وہ دانت پیس کر گونجیلی آواز میں بولا۔ "اور مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ راستے

میں رامس نے تمہارے ساتھ کیا سازباز کی تھی۔'' اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔ مجھے جھٹکا لگا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

''تم نے عامل عاروب کو ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا لیکن راستے میں اس سازشی رامس نے تمہارے ساتھ ایک خفیہ سازباز کر ڈالی کہ اگر وہ خود عامل عاروب کے ٹھکانے پر جا کر تمہاری ساتھی کو مذاکرات کے ساتھ چھڑا لایا تو تم عامل عاروب کے خلاف سردار آگرموشی کے جنگ کے سلسلے کو روکنے کی کوشش کرو گے۔ تم نے فوراً ہامی بھر لی اور یوں رامس اپنے پرانے اور خفیہ دوست عامل عاروب کے پاس جا کر تمہاری ساتھی کو لے آیا۔ ہمیں تم پر پہلے ہی شبہ تھا۔ یوں بھی ہم کافی عرصے سے رامس کی جاسوسی کر رہے تھے۔ یہ باتیں ہمارے ہی ایک جاسوس نے بتائی تھیں جسے کچھ روز پہلے ہی رامس کی طرف سے متوقع بغاوت کو بے نقاب کرنے کے لئے اس کے پیچھے لگایا گیا تھا۔ اس نے یہ ساری باتیں خود سنی تھیں۔ بولو، اب کیا کہتے ہو؟'' اتنا کہہ کر وہ مجھے گھورنے لگا۔

میرے منہ سے بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس خارج ہوگئی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس کی غلط فہمی کی اصل وجہ کیا تھی۔ میں نے پُرسکون لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''تمہیں معلوم ہوگا کہ جب میں معزز سردار آگرموشی کا مہمان ہوا تھا تو ہمارے درمیان مشترکہ طور پر عاروب عامل کو ہمیشہ کے لئے نابود کرنے کا منصوبہ طے پا چکا تھا۔ معزز سردار آگرموشی عامل عاروب کے خلاف تیسری بار فیصلہ کن جنگ کرنا چاہتا تھا۔ مگر میں نے اس سے استدعا کی تھی کہ اس طرح عامل عاروب اشتعال میں آ کر میری ساتھی کو جانی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس لئے پہلے مجھے خود تنہا جا کر اپنی ساتھی کو گوریلا آپریشن کے ذریعے اس کی قید سے چھڑانا ہوگا۔ اس کے بعد عامل عاروب کے خلاف جنگ کا بگل بجایا جا سکتا ہے۔ یہ معاملہ طے پا گیا مگر اس سے ایک رات قبل رات مہمان خانے میں مجھ پر کسی نامعلوم شخص نے قاتلانہ حملہ کیا۔ میں خوش قسمتی سے بال بال بچا تھا۔ پھر اسی رات ایک بوڑھے وید نے مجھے بڑی رازداری کے ساتھ بتایا تھا کہ مجھ پر یہ قاتلانہ حملہ کرانے والا معزز سردار آگرموشی کا بھائی، رامس ہو سکتا ہے۔ کیونکہ عامل عاروب کے ساتھ رامس کے خفیہ دوستانہ تعلقات ہیں اور وہ نہیں چاہتا کہ عامل عاروب کے خلاف جنگ کی جائے۔ اس لئے کہ میں نے ایک خون ریز مقابلے میں عامل عاروب کے کمانڈر بوغا کو ہلاک کر ڈالا تھا اور اس وقت عامل عاروب کی جنگی پوزیشن کمزور تھی۔ لہٰذا میں اب رامس سے بچنا چاہتا تھا کہ اگلے دن معزز سردار آگرموشی نے خود مجھے اس کے ہمراہ عامل عاروب کے خلاف میرے ساتھی کو چھڑانے کی مہم میں روانہ کر دیا۔ میں مجبور تھا۔ بغیر ثبوت کے میں بھلا کس طرح معزز سردار آگرموشی سے یہ کہتا کہ مجھے اس کے اپنے بھائی رامس سے بغاوت اور غداری کی بُو آتی ہے۔ ناچار مجھے اس مہم میں ایک دوست نما دشمن کے ساتھ روانہ ہونا پڑا۔ راستے میں مجھے معلوم ہوا کہ میرے پستول میں گولیاں نہیں ہیں جبکہ بدخصلت رامس نے اپنی گولیوں سے بھرا پستول مجھ پر تان لیا اور مجھے اس معاملت پر مجبور کیا۔ میرے پاس اس کی بات ماننے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ تاہم میں نے یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ چاہے کسی طرح بھی سہی، ایک بار اپنی ساتھی کو حاصل کر لینے کے بعد میں یہی چال رامس پر الٹ دوں گا۔ مگر افسوس کہ مجھے اس کا موقع نہ مل سکا اور ادھر راتوں رات رامس کے ساتھیوں نے معزز سردار کے خلاف بغاوت کر ڈالی۔ اور میں اور میرے دیگر ساتھی (انکل اعظم اور وزیر خان وغیرہ) بھی اس کے قیدی بنا لئے گئے۔ پھر ہمیں اس قید خانے میں ڈالا گیا جدھر معزز سردار آگرموشی بھی مقید تھے۔ اب تم ہی بتاؤ، اس میں میرا کیا قصور ہے؟......... میں تو آج بھی عامل عاروب پر بری طرح ادھار کھائے بیٹھا ہوں۔''

میں نے یہ ساری باتیں بیان کرنے کے بعد خاموشی اختیار کر لی۔

میں نے دیکھا، اس کے چہرے پر اب یکلخت درشتی اور نفرت کی جگہ اُلجھن آمیز تذبذب نے لے لی ی۔ میں نے لوہا گرم ہوتے دیکھ کر ایک آخری چوٹ کی۔

''مجھے خود افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا۔ معزز سردار آگرموشی میرا میزبان نہیں، میرا محسن بھی ہے۔ میں نے بھی تہیہ کر رکھا تھا کہ اس سلسلے میں مجھ سے جو ہوگا میں اپنی جان کی بازی لگا کر انجام دوں گا۔ مجھے خوشی ہوگی کہ اگر مجھے تم اپنے ساتھ مہم میں شامل کر لو تو۔''

وہ میری بات پر چند ثانیے کچھ سوچتا رہ گیا۔ اس کے چہرے پر دوستانہ تاثرات نمودار ہونے لگے تھے۔ ا نے اپنے ساتھیوں کو کوئی حکم دیا۔ اس کے بعد سب سے پہلے میرے اور نگینہ کے ہاتھوں کی آہنی یریں توڑ دی گئیں۔ اب ہم مکمل طور پر دوستانہ ماحول میں فرش پر بچھی کھال کی دری پر بیٹھ گئے۔ اس شخص ے مجھے اپنا نام رشنی گال بتایا تھا اور وہ سردار آگرموشی کے اس خفیہ دستے کو کمانڈ کر رہا تھا۔

اس نے میرے دوبارہ استفسار پر بالآخر بتایا کہ اس کے تازہ حملے میں عامل عاروب بچ نکلا تھا۔

''ہمارے ساتھیوں کی تعداد کتنی ہے؟'' میں نے رشنی گال سے پوچھا۔

''پچیس، تیس کے قریب ہوں گے۔'' وہ جواباً بولا۔ ''جبکہ اس سے دگنی تعداد ابھی منتشر ہے۔ مگر ہم جلد انہیں اپنے ساتھ شامل کر لیں گے۔''

''قبیلے میں، سردار آگرموشی کے ہم خیال لوگوں کی تعداد کا کچھ اندازہ ہے تمہیں؟'' میں نے کسی خیال تحت پوچھا۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''میرا خیال ہے......... تیس، چالیس فیصد لوگ ہوں گے۔''

''تمہارا آئندہ کا کوئی منصوبہ......... غاصب سردار رامس کے خلاف؟''

''اس کا قتل۔'' رشنی گال پُرغیظ لہجے میں بولا۔

''ابھی یہ ناممکن تو نہیں، مشکل ضرور ہے۔'' میں نے محتاط لہجے میں کہا۔ ''لیکن میرا خیال ہے سب سے ، ہمیں معزول سردار آگرموشی کو اس کی قید سے آزاد کرانا ہوگا......... میرے ساتھی بھی رامس کی قید ہیں۔''

''ہم یہ دونوں کام بیک وقت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں......... اور ساتھ ہی ساتھ، عامل عاروب کو بھی انے لگانا چاہتے ہیں۔'' وہ بولا۔

''سنو میری بات۔'' میں نے اس کے چہرے پر اپنی نظریں جماتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ''ابھی ں کا قتل قبل از وقت ہوگا۔ جب تک کہ ہم معزز سردار آگرموشی کو اس کی قید سے نہ چھڑا لیں۔ یہ معرکہ اگر ہم کامیابی سے سر کر لیں تو بہت ہوگا۔ بہ صورت دیگر رامس مظلوم قرار پائے گا۔ اقتدار اور سیاست جنگ میں ایسا ہی غلط قدم اٹھانے کے باعث مظلوم، ظالم اور ظالم، مظلوم قرار پاتا ہے۔ پھر کیا ہوگا، ں کی جگہ دوسرا سردار آ جائے گا۔ رامس اپنی کابینہ مضبوط بنا چکا ہے لیکن اگر ہم پہلے معزز سردار آگرموشی ں کی قید سے چھڑا لیں تو قبیلے میں ہمارے تیس فیصد ہم خیال لوگوں کے حوصلے بلند ہو جائیں گے، بلکہ میں ہماری رامس کے خلاف کارروائی بھی مؤثر ثابت ہوگی۔''

رشنی گال کے چہرے پر میری بات کی اثر پذیری کے تاثرات اُبھرے۔ میری تجویز اس کی سمجھ میں آ گی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی راہ نہیں تھی۔ تھوڑی سی بحث کے بعد اسے میری ماننا پڑی۔

''اب میں تمہیں آئندہ کا لائحہ عمل بتاتا ہوں۔'' میں نے آخر میں کہا۔ ''اپنے ساتھیوں کو تین حصوں میں بانٹ دو۔ ایک قبیلے کے تیس فیصد ہم خیال آبادی میں داخل ہو کر ان کے ساتھ مل کر دیگر لوگوں کو غاصب سردار رامس کے خلاف اکسائیں گے۔ دوسرے عامل عاروب کے گروہ پر نگاہ رکھیں گے۔ اس کی کمانڈ تم کرو گے۔ جبکہ تیسرا میرے ساتھ غاصب سردار رامس کی رہائش گاہ پر شب خون مار کر معزول سردار آگرموشی اور دیگر قیدیوں کو چھڑانے کی مہم پر روانہ ہوگا۔''

میں نے اسے اپنے تئیں جنگی حکمت عملی ترتیب وار بتاتے ہوئے کہا۔ وہ بڑی توجہ اور غور سے میری بات سن رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے میرے لئے ستائش کے تاثرات جھلکنے لگے تھے۔

اب اس کا میرے ساتھ گفتگو کا انداز بھی احترام آمیز اور دوستانہ ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میری جنگی حکمت عملی اسے بہتر لگی تھی۔ جس سے میرا اخلاص ظاہر ہوتا تھا۔ وہ آخر میں بولا۔

''کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تمہارے ٹولے والی مہم میں خود میں بھی شامل رہوں؟''

میں نے اس کے کاندھے پر دوستانہ انداز میں تھپکی دی اور اسی لہجے میں بولا۔ ''دوست! میں نے مختلف مہمات کے لئے جن لوگوں کی گروپ بندی کی ہے وہ بہت سوچ سمجھ کر کی ہے۔ تم دیکھنا، ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے......... مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' بالآخر اس نے اس کی تائید کر ڈالی۔

غیر محسوس طریقے سے معزول سردار آگرموشی کے جاں نثار ٹولے کی کمان میرے ہاتھ میں آ چکی تھی۔ چنانچہ میں نے ہی رشنی گال کے ساتھیوں کے ساتھ ایک نشست جمائی اور راتوں رات سب کو اپنی اپنی مہمات سر کرنے سے متعلق آگاہی دے ڈالی۔ میں نے اپنے ہمراہ صرف نو افراد رکھے تھے۔ دسواں میں خود تھا۔

ہم نے اگلے دن پہلے ایک ٹولے کو قبیلے کی طرف روانہ کر دیا۔ نیز دو مخبر بھی ہم نے الگ سے چن کر چھوڑ دیئے۔ ان دو مخبروں نے اگلے دن کا سورج ڈھلنے سے قبل ہمیں ایک خوفناک خبر دی۔ اطلاع یہ تھی کہ معزول قیدی سردار آگرموشی کو عامل عاروب کے ''بے گناہ'' قبیلے پر تین مرتبہ جنگی جارحیت کے جرم میں اور اپنے قبیلے کو بھی بلاوجہ اس جنگ کی آگ میں جھونکنے اور تینوں بار ناکامی کی صورت میں دونوں طرف کے لوگوں کو بے گناہ اموات کی پاداش میں امراء کے متفقہ فیصلے کے مطابق علی الصباح سر عام پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی۔ جبکہ اس کے دیگر معاونت کار دو مہمان قیدی ساتھیوں یعنی انکل اعظم خان اور وزیر خان کو بھی یہی سزا سنائی گئی۔ اس اطلاع نے نہ صرف مجھے پریشان کر ڈالا تھا بلکہ معزول قیدی سردار آگرموشی کے جاں نثاروں میں بھی غم و غصے اور تشویش کی لہر دوڑا دی تھی۔

''ہم آج ہی اس غاصب سردار رامس کی رہائش گاہ پر شب خون ماریں گے۔'' رشنی گال نے غضب ناک لہجے میں کہا تو میں بولا۔

''نہیں دوست!......... یہ اتنا آسان نہ ہوگا۔ اس طرح اپنے ہی ساتھی بلاوجہ اور بے دردی سے موت کے گھاٹ اتر جائیں گے۔ رامس سرداری رہائش گاہ کسی معمولی انسان کی رہائش گاہ نہیں ہے بلکہ میرے ذہن میں اب موجودہ حالات کے مدنظر ایک نئی منصوبہ بندی تشکیل پا چکی ہے۔ اب گوریلا کارروائی ہی کرنا پڑے گی۔'' میں نے آخر میں پُرسوچ لہجے میں کہا۔ مگر رشنی گال مطمئن نہ ہوا۔ وہ بولا۔

''اب اس نئی اطلاع کے بعد ہماری گوریلا کارروائی (کمانڈو ایکشن) کا کوئی مقصد؟''

''میری بات سمجھنے کی کوشش کرو رشنی گال!'' میں نے پُرزور لہجے میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''گوریلا

کارروائی ہی موثر رہے گی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہمیں اب اپنی کارروائی کرنے کے لئے ایک آسان موقع مل چکا ہے۔''

''آسان موقع؟'' رشنی گال نے اُلجھے ہوئے لہجے میں دہرایا۔

''ہاں......... آسان موقع۔'' میں نے اسرار بھرے لہجے میں کہا اور مزید بولا۔ ''تم نے شاید مخبر کی باتوں پر غور نہیں کیا۔ قیدیوں کو کل صبح سرِ عام پھانسی دی جائے گی اور اس کے لئے راتوں رات غاصب سردار رامس کی رہائش گاہ سے تقریباً گیارہ کلومیٹر دور ایک میدان میں پھانسی گھاٹ کی تعمیر بھی شروع کر دی گئی ہے۔ مذکورہ مقام آبادی کے بیچوں بیچ واقع ہے اور ظاہر ہے وہاں تک قیدیوں کو لانے کے لئے غاصب سردار رامس کی رہائش گاہ کے تہہ خانے والے قید خانے سے باہر بھی نکالا جائے گا۔ ہم درمیانی فاصلے پر گھات لگا کر بیٹھ جائیں گے۔ اور جیسے ہی قیدیوں کو پھانسی گھاٹ تک لے جانے والا یہ مختصر کارواں وہاں سے گزرے گا، ہم اس پر اچانک ہلّہ بول دیں گے۔ اب یہی صورت ہو سکتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مجھے اپنے ٹولے کے ساتھیوں کی تعداد بڑھانا ہوگی۔''

''ٹھیک ہے......... پھر میں اس مہم میں شامل رہوں گا۔'' وہ یکدم بولا۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

اب میرے کاندھوں پر بڑی بھاری اور مشکل ذمے داری آن پڑی تھی۔ مجھے سب سے زیادہ فکر انکل اعظم خان کی طرف سے لاحق تھی۔ انہوں نے ہم ماں بیٹے کا ہر مشکل وقت میں ساتھ دیا تھا اور اب تک دیتے چلے آرہے تھے۔ میں ان کا مشفقانہ رویہ بھلا کیسے بھلا سکتا تھا؟

ہم نے بھی اپنی جان پر کھیلنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور علی الصباح منہ اندھیرے اپنی خطرناک مہم کی طرف نکل پڑنے کی تیاری مکمل کر چکے تھے۔ البتہ نگینہ میری طرف سے بری طرح پریشان ہو گئی تھی۔ ذرا تنہائی پاتے ہی مجھ سے بولی۔

''نادر! میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گی۔''

میں نے مسکرا کر اسے ملائمت سے سمجھایا۔ ''نگینہ! حوصلہ رکھو اور میری کامیابی کی دعا کرو......... اس وقت انکل اعظم کی زندگی داؤ پر لگی ہے۔ تم خود سوچو، بھلا میں انہیں کل بے گناہ پھانسی پر چڑھتا کیسے دیکھ سکتا ہوں؟''

میری بات پر نگینہ خاموش تو ہو گئی تھی لیکن اس کی سرمگیں آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔ اسے روتا دیکھ کر میرا دل پسیج گیا۔ میں نے اس کے دونوں شانے محبت بھرے انداز میں تھامتے ہوئے کہا۔

''پلیز نگینہ!......... تمہارے یہ آنسو مجھے کمزور بنا دیں گے۔ کیا یہ خوشی کی بات نہیں کہ ہم اس خونی اور سفاک عامل عاروب کے شیطانی چنگل میں جانے سے بچ گئے ہیں اور اس وقت ہم دونوں محفوظ پناہ گاہ میں ہیں۔ بس صرف کل کا دن اور سہہ لو اور میرے لئے دعا کرو۔ پھر نامساعد حالات کے قفس سے ہماری قیدی زندگی آزاد ہو جائے گی اور ہمیشہ کی خوشیاں ہمارا مقدر ہوں گی۔''

''مم......... مگر......... نن......... نادر! کک......... کل ہماری زندگیاں ہمیشہ کے لئے غم کے قفس کی قیدی بھی تو.........'' وہ لرزتی آواز میں کچھ کہتے کہتے رہ گئی۔ مگر میں اس کی ادھوری بات کا مطلب سمجھ کر بولا۔

''اللہ سے اچھی امید رکھو......... تم نے دیکھا، اس رب العزت نے آج تک مجھے ہر خطرناک مہم میں کامیابی ہی نصیب کی ہے اور ایسا ہوتا آیا ہے کہ حق و باطل کی جنگ میں ہمیشہ حق کی فتح ہی ہوئی ہے۔''

"حق کی جنگ میں خون کا نذرانہ دے کر بھی تو فتح حاصل ہوتی ہے نادر!" اچانک نگینہ نے سراسیمہ اور گھٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مم......... مگر نادر! میرے اندر اتنا بڑا حوصلہ نہیں ہے کہ میں تمہاری اس کامیابی کو خون سے رنگا ہوا دیکھ سکوں۔"

میں نے بے اختیار نگینہ کو خود سے لگا لیا۔ ہم یک جان دو قالب کی حقیقی تفسیر بنے اپنے جسم و جاں اور محبت فشاں وجود کی حلاوتیں کشید کرتے رہے۔ پھر میں نے ہولے سے اپنے مرتعش ہونٹ اس کے کان کی پُرتپش لو کے قریب وا کر کے دل کی عمیق گہرائیوں سے سرگوشی میں کہا۔

"نگینہ! جنگ میں صرف شہید تو نہیں ہوا جاتا......... غازی بن کر بھی تو لوٹا جاتا ہے نا۔ محبت کی قسم! مجھے پورا یقین ہے، تمہاری بے لوث چاہت کی طاقت مجھے زندہ ایک بار پھر تمہاری طرف کھینچ لائے گی۔"

میں نے محسوس کیا کہ نگینہ کا ڈھیلا پڑتا جسم ایکا ایکی تن گیا۔ شاید ہماری الوہی محبت کی قسم نے اسے پُراُمید اور باحوصلہ کر دیا تھا۔

ہم دونوں دھیرے سے علیحدہ ہوئے۔

اس وقت چھولداری میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ باہر ویران برف زاروں میں شام کا کاجل گہرا ہونے لگا تھا۔

❋❋❋

کئی گھنٹوں بعد جب دور برفیلی چوٹیوں پر طباق چاند کا روشن رتھ ماند پڑنے لگا اور دور مشرقی چوٹیوں کی سمت پو پھٹنے لگی تو میں اور رشنی گال اپنے گیارہ منتخب کردہ ساتھیوں کے ساتھ دو جیپوں میں روانہ ہو گئے۔

نگینہ کو رشنی گال کے دیگر ساتھیوں کی حفاظت میں دے کر میں اس کی طرف سے مطمئن تھا۔ ہم غاصب سردار رامس کے قبیلے کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہم نے وقت کا خاص خیال رکھا تھا۔ ایک محتاط اندازے اور پری پلاننگ کے تحت ہمیں غاصب سردار رامس کی رہائش گاہ (قید خانے) سے لے کر پھانسی گھاٹ تک جانے والے راستے پر گھات لگا کر بیٹھنا تھا جہاں سے قیدیوں کو گاڑی میں ڈال کر مسلح افراد کا مختصر قافلہ گزرنے والا تھا۔

مذکورہ مقام تک ہمیں پہنچنے میں پون گھنٹہ لگا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو دو گروپوں میں بھانٹ لیا۔ ایک گروپ رشنی گال کی سرکردگی میں دے دیا۔ وہ راستے کے دوسری جانب برفیلی ڈھلوانوں میں گھات لگا کر فروکش ہو گیا اور دوسری مخالف سمت پر بعینہ ایسی ہی پوزیشن میں نے بھی اپنے گروپ کے ساتھیوں کے ساتھ سنبھال لی تھی۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق اب کسی وقت بھی مختصر قافلہ قیدیوں کو یہاں سے لے کر گزرنے والا تھا۔ صبح کاذب کا اُجیارا ہنوز مشرقی چوٹیوں تک محدود تھا۔ باقی پوری وادی میں ملگجا سا اندھیرا چھایا ہوا تھا جو ہمیں مکمل سپورٹ دے رہا تھا۔

ہماری بے چین و مضطرب نظریں راستے کے اس طرف مرکوز تھیں، جدھر سے مذکورہ قافلے کی آمد متوقع تھی۔ ابھی ہمیں وہاں گھات لگائے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا اور رگوں میں خون کی گردش تیز تر ہونے لگی۔

میری ٹھٹکی ہوئی نظروں نے مطلوبہ منظر کی جھلک دیکھ لی تھی۔ مذکورہ سمت کی طرف مجھے متحرک دھبے دکھائی دیئے۔ میں نے مخصوص آواز منہ سے نکال کر اپنے ساتھیوں کو باخبر کر دیا۔

میری عقابی نظریں بدستور مذکورہ سمت پر نظر آنے والے متحرک دھبوں پر مرکوز تھیں۔ ہم نے اپنی گنیں

سیدھی کر لیں۔ جب وہ متحرک دھبے ایک بڑی سی جیپ اور پانچ چھ خچر سواروں کے مختلف سے قافلے میں بدلتے نظر آنے لگے تو میرے اعصاب یکلخت تن گئے۔

میں نے بہ غور پہلے اپنی آنکھیں سکیڑ کر ان کی تعداد کا جائزہ لیا۔ چھ خچر سوار مسلح افراد کے علاوہ جیپ کے اندر بھی چار پانچ مسلح افراد کی موجودگی یقینی تھی۔ ان میں مجھے غاصب سردار رامس کے مسلح دستے کا سالار بھی دکھائی دیا تھا۔ اس کی مخصوص وردی سے میں اسے پہچان سکا تھا۔ سردار کی سواری ان میں شامل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ اسی سمت میں روانہ ہونے والا تھا، اپنی الگ سواری پر۔

پھر جیسے ہی قافلہ نزدیک پہنچا تو میں نے سب سے پہلے اپنا سر تھوڑا مزید اُبھار کر جیپ کے اندر موجود "سواروں" میں قیدیوں کی موجودگی کی تصدیق کر ڈالی۔ مجھے تینوں قیدیوں بہ شمول معزول سردار آگرموشی سمیت انکل اعظم خان اور وزیر خان کی جھلک نظر آ گئی تھی۔

حملے کا وقت سر پر تھا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے ہم قیامت بن کر اس قافلے پر ٹوٹ پڑے۔ میرے ساتھیوں نے سب سے پہلے خچر سواروں پر اچانک اپنی گنوں کے منہ کھول دیئے۔ جبکہ میں نے جیپ کے ٹائروں کا نشانہ بنایا تھا۔

فضا میں بیک وقت گنوں کی گھن گرج گونجی تھی اور ہر طرف بھگدڑ اور افراتفری کا سماں بندھ گیا تھا۔

ہم نے یہ "کام" جلد سے جلد نمٹانے کا ایک وقت مقرر کر دیا تھا۔ یعنی پندرہ سے بیس منٹ۔ وقت کو "مقرر" کرنے کی وجہ یہ تھی کہ ذرا سی بھی اضافی تاخیر پر غاصب سردار رامس کے دیگر ساتھی مسلح دستے بھی ہم پر ٹوٹ پڑتے۔ جبکہ ہماری گوریلا کارروائی (کمانڈو ایکشن) پورے مسلح لشکر سے بہرحال جنگ کرنے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے میں نے رشنی گال کو بھی اس بات کی سختی سے تاکید کی تھی کہ اس محدود وقت کے اندر اندر "کام" نمٹانا ہو گا۔

خچر سوار مسلح دشمنوں میں سے سوائے سالار کے سب ہی چشم زدن میں لقمۂ اجل بن گئے تھے جبکہ سالار نے بروقت خچر سے چھلانگ لگا کر خود کو بچا لیا تھا۔ پھر زمین پر گرتے ہی لڑھکنیاں کھاتا ہوا جیپ کی آڑ میں ہو گیا تھا۔ مگر جلد ہی دوسری سمت سے رشنی گال کے ٹولے نے اسے گولیوں سے بھون ڈالا۔ جبکہ جیپ کے اندر سے ہم پر دشمنوں نے جوابی فائرنگ کر ڈالی تھی۔

دونوں طرف سے فائرنگ کا تبادلہ جب طول پکڑنے لگا اور ہمارے پاس صرف آٹھ منٹ بچے تو میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ زمین پر رینگتا ہوا جیپ کی طرف بڑھا اور اس کے اگلے دونوں ٹائروں کے نیچے پہنچ جانے میں کامیاب ہو گیا۔

میرا یہ عمل بہت خطرناک تھا۔ اس طرح میں اپنے ہی ساتھیوں کی "کراس فائرنگ" کی زد میں بھی آ سکتا تھا۔ تاہم مجھے بہرحال انکل اعظم خان سمیت تین بے گناہ قیدیوں کی جان بچانے کے لئے جان کی بازی لگانا تھی۔ میں دوطرفہ چلنے والی گولیوں کی دھنا دھن میں جیپ کے نیچے سے رینگتا ہوا عقبی گوشے سے اُبھرا تو میری دیکھا دیکھی رشنی گال نے بھی اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ اسی طرح پیش قدمی کی۔ وہ جیپ کی دوسری سمت سے اُبھرا تھا اور یکدم اس نے کھڑکی کی سمت پر اُبھرتے ہی اندر موجود دشمنوں کو اپنی گولیوں سے نشانہ بنا لیا۔ جیپ میں سوار دشمن اس سمت متوجہ ہوئے تو میں نے جیپ کے عقبی دروازے سے اُبھر کر پچھلی ٹوٹی ہوئی اسکرین سے ان پر گولیاں داغ ڈالیں۔ ان کی خوں ریزی میں ہمارے تین ساتھی کام آ گئے تھے۔ تاہم دشمنوں کا صفایا ہو گیا۔

ہم نے تینوں قیدیوں کو جلدی جلدی جیپ سے نیچے اتارا اور انہیں لے کر اپنی جیپوں کی طرف

دوڑے۔تب پھراچانک رشنی گال کے ٹولے کے ایک ساتھی نے حلق کے بل چیخ کر رشنی گال سے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ انداز مجھے انتباہ ہی لگا تھا۔ میں نے ذرا ٹھٹک کر اس کی جانب دیکھا تو اس کی عقبی سمت میں جہاں قدرے ڈھلان کی جانب چٹیل سا میدان تھا، کئی مسلح افراد کا ایک پورا دستہ خچروں اور دو جیپوں میں اسی سمت بڑھا چلا آ رہا تھا۔

''بھاگو.........!'' میں حلق کے بل چیخا۔

''ہمیں ان کا مقابلہ کرنا ہوگا نادر!'' رشنی گال چلاّ کر پُر جوش آواز میں بولا۔ ''یہ لوگ اتنی آسانی سے ہمیں نہیں جانے دیں گے۔''

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو، گال!'' میں نے اس کی بات رد کر دی۔ ''واپس چلو۔''

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ ہم تینوں قیدیوں کو ساتھ لئے اپنی جیپوں کی طرف دوڑے۔ اور پھر چشم زدن میں سوار ہو کر جیسے ہی روانہ ہونے لگے، دشمنوں کے دوسرے دستے نے ہمارے قریب پہنچتے ہی ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ دے ماری۔ رشنی گال تو اپنی جیپ آگے بڑھا لے گیا جبکہ میری جیپ اور میرے ساتھی دشمن دستے کی فائرنگ کی زد میں آ گئے۔ میرے دو ساتھی کرب ناک چیخوں کے ساتھ جیپ سے نیچے گرے تھے جبکہ جیپ کی کھڑکیوں کے شیشے گولیاں لگنے سے ٹوٹ کر کرچیوں میں بکھر گئے تھے۔ میں پھرتی سے نیچے جھک گیا۔ تینوں قیدی رشنی گال کی جیپ میں سوار تھے۔ شکر تھا کہ ابھی میری جیپ کا کوئی ٹائر گولیوں کی زد میں نہیں آیا تھا۔

میں نے ذرا ہمت سے کام لیا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی ایک جھٹکے سے جیپ آگے بڑھائی۔ عقب سے دشمنوں کی وحشیانہ اور اندھا دھند فائرنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ اچانک سماعت شکن دھماکہ ہوا اور میری جیپ جس نے ابھی پوری طرح سے رفتار بھی نہیں پکڑی تھی، بری طرح ڈولنا شروع ہو گئی۔ بدقسمتی سے جیپ کا ایک ٹائر گولی لگنے سے برسٹ ہو چکا تھا۔

''سب نیچے اُترو!'' میں چلاّیا اور پھر اپنی گن سنبھالے ڈولتی جیپ سے چھلانگ لگا دی۔ جبکہ رشنی گال اپنے ساتھی ٹولے اور تینوں قیدیوں کو لے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

اب میرے پاس دشمنوں کی بھاری تعداد کے سامنے ڈٹ جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ ہماری تعداد دشمنوں کی کثیر تعداد کے مقابلے میں مٹھی بھر تھی۔

چنانچہ ہم نے فوراً پوزیشن سنبھالی اور دشمنوں پر اپنی گنوں کے منہ کھول دیئے۔ خچر سوار تین چار مسلح دشمنوں کو تو میں نے پہلے ہی برسٹ میں ڈھیر کر ڈالا۔ تاہم انہوں نے بھی فوراً اپنی پیش قدمی روک کر خچروں اور جیپوں سے اتر کر مورچے سنبھال لئے۔

میرے ساتھیوں کی تعداد صرف پانچ تھی۔ اس کے باوجود ہم جم کر بے جگری سے لڑے تھے۔ مگر میں جانتا تھا کہ ہم زیادہ دیر تک اچانک اٹد پڑنے والے دشمنوں کے اس بھاری مسلح دستے کے سامنے نہیں جم سکیں گے۔ چنانچہ میں نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی کہ جسے موقع ملے وہ پیچھے ہٹتے ہوئے اپنے اپنے طور پر راہِ فرار اختیار کرنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ خود میں بھی یہی حکمت عملی اپنانا چاہتا تھا۔

میں نے فوراً جوابی فائرنگ موقوف کر ڈالی۔ اس طرح دشمنوں کو میری موجودگی کا پتہ چلتا تھا۔ میں دھیرے دھیرے عقب میں کھسکنے لگا مگر دشمن میری توقع سے زیادہ ہوشیار اور چالاک ثابت ہوئے۔ وہ پہلے ہی ہم سب کو گھیرے میں لے چکے تھے۔ میرے دو ساتھیوں نے دشمنوں کے گھیراؤ کو توڑنے کی کوشش میں اپنی جانیں گنوا دیں تو میں نے خود سمیت اپنے باقی ساتھیوں کو ہلاکت میں ڈالنے کی بجائے ہتھیار پھینکنے کا

فیصلہ کر ڈالا مگر انہوں نے میری بات نہ مانی اور بدستور اپنی ہٹ پر قائم رہے۔ نتیجتاً ان تینوں کو بھی دشمنوں نے بڑی بے دردی کے ساتھ گولیوں سے بھون کر رکھ دیا۔ جبکہ میرے پاس اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ میں ہتھیار پھینک دیتا۔ لیکن جیسے ہی میں نے خود کو دشمنوں کے حوالے کرنے کا ارادہ کیا تو اچانک میری چشم تصور میں نگینہ کا رنجور چہرہ رقصاں ہو گیا۔ کوئی بعید نہ تھا کہ میرے ہتھیار پھینک دینے کے باوجود دشمن مجھے بھی بعد میں زندہ نہیں چھوڑتے۔ ابھی میں یہ ارادہ باندھ ہی رہا تھا کہ اچانک اردگرد سے مجھ پر کئی مہیب نالیں تن گئیں۔

میں نے بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس خارج کر کے اپنی گن پھینک دی۔ دشمنوں کے تیور خطرناک نظر آ رہے تھے۔ پھر وہیں ان کے درمیان بحث چھڑ گئی۔ اگرچہ وہ اپنی مقامی زبان میں ہی آپس میں باتیں کر رہے تھے، جس سے بہرحال نابلد تھا۔ تاہم کچھ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ بحث مجھے زندہ گرفتار کر کے لے جانے یا پھر یہیں ہلاک کر ڈالنے کے سلسلے میں ہو رہی تھی۔ میرا رواں رواں وسوسوں کی زد میں مرتعش ہو رہا تھا۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ آئندہ میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ بالآخر یہی فیصلہ ہوا کہ مجھے گرفتار کر لیا جائے۔ یہ فیصلہ صادر ہوتے ہی انہوں نے مجھے بری طرح دھکیلتے ہوئے اپنی جیپ میں ڈالا۔ دوسری جیپ میں کچھ دشمن رشنی گال کے تعاقب میں روانہ ہو چکے تھے۔ مجھے جیپ میں سوار کرا دیا گیا اور یہ لوگ واپس پلٹے۔

ان لوگوں کے چہروں اور آنکھوں سے میرے لئے انتہائی درجے کی نفرت اور غیظ و غضب کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مجھے یہ لوگ ادھر ہی گولیوں سے بھون ڈالتے۔ جبکہ خود میں نے اپنے حواس پر قابو پا رکھا تھا اور سینے میں بے طرح دھڑ دھڑاتے دل کے ساتھ میں ہنوز فرار کے موقع کی تلاش میں تھا۔

میری عادت تھی کہ چاہے حالات کتنے ہی مایوس کن اور خطرناک کیوں نہ ہوں، میں امید اور حوصلے اور کچھ کر گزرنے کی جستجو ترک نہیں کرنا چاہتا تھا۔

یہ جیپ نسبتاً چھوٹی تھی۔ اس میں ڈرائیور کے علاوہ صرف چار مسلح افراد ہی موجود تھے۔ تین میرے ساتھ عقبی نشستوں پر مجھے گن پوائنٹ پر لئے ہوئے تھے، جبکہ بعد میں جب جیپ روانہ ہوئی تو تیسرا بھی ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر جا کر براجمان ہو گیا۔ جبکہ باقی دشمن خچروں پر سوار تھے اور وہ سب جیپ کی مناسب رفتار کے ساتھ دوڑے چلے آ رہے تھے۔

مجھے رشنی گال اور تینوں قیدیوں کی بھی فکر تھی جن کے تعاقب میں مسلح دشمنوں کی تقریباً نصف تعداد ایک جیپ اور خچروں پر روانہ ہو چکی تھی۔ میں اپنے ساتھیوں بہ شمول رشنی گال اور تینوں قیدیوں کے کامیابی سے نکل جانے کی بس دعائیں ہی مانگ سکتا تھا۔

جیپ مناسب رفتار سے ناہموار اور کچے بل کھاتے راستے پر ہچکولے کھاتی ہوئی دوڑی جا رہی تھی۔ مجھے گرفتار کرنے کے بعد کم از کم ایک بات تو میرے حق میں تھی کہ ابھی تک مجھے رسن بستہ نہیں کیا گیا تھا۔ یعنی میرے ہاتھ پیر آزاد تھے۔ انہوں نے مجھے نہتا کر کے صرف گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا اور یہی وہ موقع تھا جس سے ''بروقت'' فائدہ اٹھانے کے بارے میں میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ معاً ایک موڑ پر جیپ تیزی سے دائیں جانب مُڑی تو میرے ساتھ چپکے ہوئے مسلح دشمن کا توازن ذرا دیر کو بگڑا۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش میں اپنی گن کا رخ غیر ارادی طور پر اس جانب کیا جدھر اس کا دوسرا ساتھی موجود تھا۔ میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس کی گن پر اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت جمائی اور اس کے ٹرائیگر پر اپنی انگلی کو جنبش بھی دے ڈالی۔ اس کی گن شاید سنگل شاٹ پر ''ایڈجسٹ'' تھی۔ سماعت شکن دھماکا ہوا اور گولی کی

بھیانک قربت نے دوسرے ساتھی کو اگلا سانس بھی نہیں نصیب ہونے دیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر میں نے دوسری جارحانہ حرکت کر ڈالی اور کہنی کی زوردار ضرب پہلے والے کی ٹھوڑی پر رسید کر دی۔ گن پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑی تو میں نے گن جھپٹ کر اس کا رخ پھرتی سے ڈرائیور کے برابر کی سیٹ پر براجمان دوسرے ساتھی کی طرف موڑا جو میری جانب اپنی گن کا رخ موڑ چکا تھا۔ مگر لبلبی دبانے کا موقع میرے ہاتھ لگا۔ میری گن نے دوبارہ آتشیں قہقہہ اُگلا اور گولی اس کی پیشانی توڑتی ہوئی آر پار ہو گئی۔ پہلے والے نے مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کرنا چاہی تو میں نے گن کا ٹھوس بٹ اس کی کنپٹی پر رسید کر دیا۔ وہ بے سدھ ہو گیا۔ اُدھر ڈرائیور نے جیپ روکنا چاہی۔ میں نے اس کی گردن پر فائر کر دیا۔ وہ بھی آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔ جیپ بری طرح ڈولنے لگی تو میں نے برق رفتاری سے ڈرائیور کی آڑی ترچھی لاش کو زبردست ٹھوکر مار کر باہر دھکیل دیا اور خود اسٹیئرنگ سنبھالتے ہی اس کی رفتار بڑھا دی۔

میری جیپ میں دشمن کا صرف ایک ہی ساتھی زندہ بچا تھا مگر وہ بے ہوش تھا۔ سردست مجھے اس کی طرف سے کوئی تشویش نہ تھا۔ باہر خچر سوار دشمنوں کو جب تک ''اندر'' کی صورتِ حال کا ادراک ہوتا، میں جیپ آندھی طوفان کی طرح دوڑا کر ان سے کافی دور نکل چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ان کے توانا مگر سست رو خچر جیپ کی رفتار کا مقابلہ ہرگز نہیں کر پائیں گے۔ تاہم انہوں نے بے دریغ جیپ پر فائرنگ ضرور کر ڈالی تھی۔ ٹھک، ٹھک کر کے کئی گولیاں جیپ کی باڈی میں پیوست ہوئی تھیں مگر اب میں ان کے ہاتھ کہاں آنے والا تھا۔

میں نے جیپ کو دائیں جانب نسبتاً میدانی علاقے میں اُتارا اور ایک طویل چکر کاٹ کر واپسی کی جانب اس کا رخ موڑ کر رفتار بتدریج بڑھاتا چلا گیا۔

میں اب خچر سوار دشمنوں کی فائرنگ رینج سے دور نکل چکا تھا۔ معاً جانے کس طرح عقبی سیٹ پر بے سدھ پڑے اکلوتے دشمن کو ہوش آ گیا اور وہ خوفناک غراہٹ کے ساتھ مجھ پر جھپٹا۔ میری گن میرے پہلو میں پڑی ہوئی تھی اور دونوں ہاتھ مضبوطی سے اسٹیئرنگ پر جمے ہوئے تھے۔ اس کم بخت نے عقب سے اپنے دونوں ہاتھوں کے شکنجے سے میری گردن کس لی تھی اور زور زور سے جھٹکے دینے شروع کر دیئے۔ میرے دونوں ہاتھ ہچکولے کھاتی اور پُرخطر راستوں پر دوڑتی جیپ کے اسٹیئرنگ پر جمے رہنے ضروری تھے۔ بہ صورت دیگر جیپ کسی وقت بھی ہزاروں فٹ گہری کھائی میں گر سکتی تھی۔ تاہم دوسری طرف اس حملہ آور کو بھی جواب دینا ضروری تھا جو اچانک ہی بلائے جان بن آیا تھا۔ حالانکہ مجھے اس کی طرف سے تقریباً دو گھنٹوں تک ''انثاغفیل'' پڑے رہنے کی پوری توقع تھی۔ مگر وہ سخت جان واقع ہوا تھا اور جلد ہی ہوش میں آ گیا تھا۔

وہ اپنے دونوں ہاتھوں کے شکنجے سے میری گردن کو بدستور بھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ حتیٰ کہ مجھے اپنی سانسیں سینے میں گھٹتی محسوس ہونے لگیں۔ یہ صورتِ حال بھی کم خطرناک تو نہ تھی۔ چنانچہ اس کا فوری حل بھی اچانک ہی میرے ذہن میں اُبھرا تھا۔

شکست خوردہ دشمنوں کا ٹولہ پیچھے رہ گیا تھا۔ سردست ان کی طرف سے مجھے کوئی خطرہ نہ تھا۔ میں نے اچانک بریک پر پاؤں رکھ دیا۔ جیپ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ حملہ آور کو بھی ایک زبردست جھٹکا لگا۔ اس نے باوجود اس کے میری گردن تو نہیں چھوڑی البتہ اس کی گرفت ضرور ڈھیلی پڑ گئی۔ ادھر میں نے جیپ کے رکتے ہی اسٹیئرنگ چھوڑا اور ایک گھونسا اس کی ناک پر رسید کر دیا۔ اس کے حلق سے بھیانک کریہہ چیخ اُبھری اور میں نے پھرتی سے اپنی گردن اس کے شکنجے سے چھڑا لی۔ اس نے اپنی تکلیف بھلا کر میرے پہلو میں رکھی گن پر جھپٹا مارا تو میں نے قدرے پلٹ کر اپنے ایک بازو کی کہنی اس کے چہرے پر دوبارہ رسید کر

دی جو اس کے جبڑے پر لگی مگر اس نے گن پر اپنی گرفت جماتے ہی اسے اچک لیا۔ یہ خطرناک صورت حال تھی۔ میں بجلی کی طرح اپنی سیٹ سے تڑپا اور پلٹ کر اس پر جھپٹ پڑا۔ ہم دونوں اب جیپ کے عقبی حصے میں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے تھے اور ہم دونوں کے ہاتھ گن پر مضبوطی سے گرفت جمائے ہوئے تھے اور کوئی بھی گن چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ تب پھر اچانک اس نے اپنے سر کی ٹکر میرے چہرے پر رسید کر دی۔ میرا دماغ ایک لمحے کو جھنجنا سا گیا۔ لامحالہ میری گرفت گن پر کمزور پڑی اور اس نے میرے ہاتھوں سے ایک جھٹکے کے ساتھ گن چھین لی۔ مگر جب تک وہ مجھ پر گن کی نال سیدھی کرنے کی کوشش کرتا، میں نے بھی پل کے پل سنبھلتے ہی ایک لات اس کے پیٹ پر ناف کے ذرا نیچے رسید کر دی۔ اس کے حلق سے بھیانک ڈکراہٹ نکلی اور وہ تکلیف کی شدت کو دبانے کے لئے جیسے ہی فطری ردِعمل کے تحت رکوع کے بل جھکا، میں نے گھٹنا اس کی پہلے سے مضروب اور پچکی ہوئی ناک پر رسید کر دیا۔

میرے یہ دونوں حملے کارگر ثابت ہوئے تھے جنہوں نے اسے بالکل ہی نڈھال کر کے رکھ دیا۔ میں نے گن بہ آسانی اس سے جھپٹ لی اور اس کے لہراتے اور بے سدھ پڑتے وجود کو ایک عدد لات رسید کر دی۔ وہ اچھل کر جیپ کے پچھلے کھلے حصے سے باہر جا گرا۔

میں نے فوراً ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور جیپ اسٹارٹ کر کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

❄ ❄ ❄

دن کا اُجالا چاروں طرف پھیلنے لگا تھا۔ میں اپنے ٹھکانے پر بہ خیر و عافیت پہنچا تو نگینہ سمیت سب بے چینی کے ساتھ میرے منتظر تھے۔ مجھے زندہ سلامت دیکھ کر وہ خوشی سے دیوانے ہو گئے۔ بالخصوص انکل اعظم اور نگینہ۔ وزیر خان میرا تہہ دل سے شکر گزار تھا۔

رشی گال البتہ کچھ پریشان اور متفکر نظر آ رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ دشمنوں کے ٹولے نے ان کا کافی دور تک تعاقب کیا تھا۔ تاہم وہ اس کے نزدیک نہیں پہنچ پائے تھے اور وہ انہیں جل دے کر قیدیوں کو با حفاظت لے کر اپنے ٹھکانے تک آ پہنچا تھا۔

''لیکن نادر!........ ہمیں اب اپنا یہ ٹھکانا بدلنا پڑے گا۔'' وہ آخر میں اپنی تفکر آمیز پریشانی کی وجہ ظاہر کرتے ہوئے گہری متانت سے بولا۔

''تمہیں اس کا کیسے اندازہ ہوا؟'' میں نے اس کے تفکر بھرے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔

''دشمنوں نے ہمارا خاصی دور تک تعاقب کیا تھا اور وہ لوٹ گئے تھے۔ ان کی سمت بالکل درست تھی۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ وہ مکمل تیاری اور بھاری تعداد کے ساتھ ادھر کا بھی رخ کر سکتے ہیں۔''

میں اس کی بات پر پریشان ہو گیا، پھر بولا۔ ''اگر یہ بات ہے تو پھر ہمیں فوراً سے پیشتر اپنا یہ ٹھکانا چھوڑنا ہو گا۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں۔'' وہ فوراً بولا۔

چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا۔ دشمنوں سے چھینی ہوئی دو جیپوں کے علاوہ ہماری ایک جیپ اور بھی تھی۔ باقی بڑی تعداد میں خچر بھی تھے۔

ہم نے اسی وقت وہ ٹھکانا چھوڑ دیا۔ رشی گال کے ذہن میں ایک اور خفیہ ٹھکانہ تھا جو وہاں سے کم و بیش ساڑھے پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ ہم سب لگ بھگ ایک گھنٹے بعد وہاں پہنچ گئے۔

یہ مقام چاروں طرف سے برفیلی پہاڑیوں میں گھرا ہوا تھا اور یہاں خاصی روئیدگی بھی پائی جاتی تھی۔

مجھے یہ نیا ٹھکانا پہلے والے ٹھکانے سے نسبتاً زیادہ اچھا اور محفوظ لگا تھا۔

حالات اپنی جگہ پُرخطر تھے۔ میں چاہتا تھا کہ فی الفور نگینہ اور انکل اعظم خان کو یہاں سے واپس روانہ کر دوں۔ لیکن یہ اتنی جلدی ممکن نہ تھا۔

یہ اسی روز سرِ شام کا ذکر تھا۔ ہم اس معاملے پر سر جوڑے گفتگو میں مصروف تھے۔ نگینہ کو میرے اس فیصلے سے سخت اختلاف تھا۔ وہ میرے بغیر یہاں سے نہیں جانا چاہتی تھی۔ جبکہ انکل اعظم کا بھی یہی خیال تھا۔ البتہ وزیر خان اپنے بھتیجے کے قاتل سنکھال کو لئے بغیر ہرگز نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس کا یہ الگ اور ذاتی معاملہ تھا۔ میں اس پر زور نہیں دے سکتا تھا۔ البتہ نگینہ اور انکل اعظم خان سے میں نے پُرزور اصرار کیا کہ میری بات مان لیں۔ انکل اعظم نے تو بعد میں چپ سادھ لی مگر نگینہ اپنے فیصلے پر اٹل رہی تھی۔ یہ بہت مشکل مرحلہ تھا۔

''نادر!.........تم آخر کب تک مجھے اس طرح آزمائش میں ڈالتے رہو گے؟'' نگینہ کا جیسے اب پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا تھا۔ اس کے لہجے میں کرب بھی تھا اور شکوہ بھی۔ وہ سرکش سی ہونے لگی تھی۔ اور اپنی جگہ درست بھی تھی۔ تاہم اس حقیقت کو تو وہ بھی جانتی تھی کہ میں یہ سب اسی کی خاطر ہی کر رہا تھا۔ میں نے اسے دوسرے انداز میں سمجھانا چاہا۔

''نگینہ! اُس موذی عاروب کا خاتمہ ضروری ہے۔ وہ ایک خطرناک وائرس کی طرح ہماری زندگی کا دشمن بن چکا ہے۔ اور پھر وزیر خان کا بھی تو معاملہ اٹکا ہوا ہے۔ جب تک میں سنکھال کو اس کے حوالے نہ کر دوں، میری بے گناہی کیسے ثابت ہو سکتی ہے؟''

وہ شکوہ کناں نگاہوں سے میری طرف دیکھتی رہی، پھر یکدم سسک کر بولی۔

''نادر! آخر یہ آزمائشیں کب ختم ہوں گی؟.........ایک کے بعد دوسری آزمائش، ایک اور امتحان۔ کہیں یہ میری جان ہی نہ لے لے۔''

میرا دل پسیج گیا۔ میں نے اس کے آنسو پونچھ ڈالے اور ملائمت سے کہا۔

''نگینہ! میرا دل کہتا ہے، اب یہ آزمائشیں ختم ہونے والی ہیں۔ اب سب کچھ ٹھیک ہونے والا ہے۔ شبِ ستم گزیدہ کے بعد سحرِ مسرت ضرور طلوع ہو گی۔ تم میری بات مان لو۔ انکل اعظم خان کے ساتھ چلی جاؤ۔ حالات ایسے رہے کہ میں تمہیں یہ خوش خبری بھی نہیں سنا سکا کہ ماں کا دل تمہاری طرف سے صاف ہو چکا ہے۔ یہی نہیں، انہوں نے تمہارے پپا (شاہ میر) کو بھی معاف کر دیا ہے۔ کیا یہ خوشی کی بات نہیں ہے کہ اب تمہارے پپا ہمارے پاس گرین لاج میں ہیں اور تمہیں بھی ان کے پاس جا کر رہنا چاہئے۔''

میری بات پر نگینہ کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ اُبھری تھی۔ مگر چہرے پر آزردگی جوں کی توں رہی۔

اچانک باہر گولیوں کی تڑتڑاہٹ اُبھری۔ میں بری طرح چونک گیا اور رگوں میں خون کی گردش یکلخت تیز تر ہو گئی۔ میں نگینہ کو وہیں چھوڑ کر گن سنبھالے چھولداری سے باہر نکلنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک رشنی گال بوکھلایا ہوا اندر داخل ہوا اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''نادر!.........دشمنوں نے بھاری تعداد میں ہماری پناہ گاہ پر حملہ کر دیا ہے.........ہمیں نکلنا ہو گا۔''

میں اس کی بات پر پریشان ہو گیا۔ ''مم.........مگر.........انہیں یہاں ہمارے ٹھکانے کا علم کس طرح ہوا؟'' میں نے تفکر سے پوچھا۔ مگر رشنی گال میری بات سنی ان سنی کر کے واپس مڑ گیا۔

چھولداریوں کے باہر وقفے وقفے سے جاری رہنے والی گولیوں کی گھن گرج اب ایک تواتر سے ہونے لگی تھی۔ انکل اعظم خان اور نگینہ بری طرح پریشان اور ہراساں تھے۔ جبکہ وزیر خان آمادہ بہ جنگ نظر آ رہا

…اس کے پاس گن تھی۔ میں نے وزیر خان کو وہیں انکل اعظم خان اور نگینہ کے پاس رہنے کا کہا اور خود …نکل آیا۔

فائرنگ دو اطراف سے ہو رہی تھی۔ رشنی گال کے ساتھی مورچے سنبھالے جنگ میں مصروف تھے۔ …ازہ یہی ہوتا تھا کہ یہ حملہ غاصب سردار رامس کے جنگی ٹولے کا ہی ہو سکتا تھا۔ ممکن ہے وہ ہمارے پہلے …لے ٹھکانے پر پہنچے ہوں اور قدموں کے نشانات پر چلتے ہوئے یہاں آ گئے ہوں۔

اب میں بھی اس جنگ میں شریک ہو چکا تھا۔ مگر ذرا ہی دیر میں اندازہ لگا چکا تھا کہ دشمنوں کی افرادی …ت بہرحال ہم سے زیادہ تھی۔

میرے پاس ایک گن تھی۔ جبکہ فاضل راؤنڈز کے دو کلپ میری پتلون کی بیلٹ میں اڑسے ہوئے …تھے۔ میں نے کچھ سوچ کر پھرتی سے اپنی جگہ بدلی۔ میں درحقیقت اس چھولداری کے ذرا قریب ہی رہنا …چاہتا تھا، جدھر نگینہ اور انکل اعظم خان موجود تھے۔ میں نے جیسے ہی اپنی جگہ بدلی، خود رو جھاڑیوں اور …درختوں کے گھنے جھنڈ سے ہوتا ہوا دشمنوں کی صفوں کے ذرا نزدیک پہنچا تو مجھے سرمئی شام کی ملگجی تاریکی میں …مورچہ سنبھالے دشمنوں کی کثیر تعداد ہیولوں کی صورت نظر آئی۔ میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔ اچانک میں …نے چار مسلح ہیولوں کو چھولداری کی طرف رینگتے دیکھا۔ یکبارگی میرا دل زور سے دھڑکا۔ بہ سرعت میں نے …اس جانب رینگتے ہوئے حرکت کی تھی۔ نہ جانے ان خبیثوں کو کیسے اس بات کا ادراک ہوا تھا کہ ان کے …اس چھولداری میں تھے۔

فائرنگ بدستور جاری تھی۔ سردست رائفلوں ہی کا استعمال ہو رہا تھا جس سے مجھے فوراً اتنا اندازہ تو ضرور …ہوا تھا کہ دشمنوں کا اسلحہ صرف رائفلوں اور گنوں تک ہی محدود تھا۔ ان کے پاس بھاری ہتھیار نہ تھے۔ …اس پر حیرت بھی ہوئی تھی۔ اگر یہ غاصب سردار رامس کا ٹولہ تھا تو ان کے پاس میں نے ہینڈ گرنیڈ کے …اور راکٹ لانچر بھی دیکھے تھے۔

بہرطور میں جیسے ہی اپنی چھولداری کے ذرا قریب پہنچا تو میں نے ان چاروں مشتبہ حملہ آوروں کو …چھولداری کا نشانہ بناتے ہوئے دیکھا۔ پل کے پل میں نے اپنی گن سیدھی کر کے ان پر برسٹ فائر کر …دیا۔ دو دشمنوں کو میں نے کریہہ چیخوں کے ساتھ ڈھیر ہوتے دیکھا۔ جبکہ دو نے فوراً خود کو نیچے گرا لیا تھا۔ …میں سے ایک نے میری سمت پر برسٹ فائر کر دیا تھا۔ میں نے جھکائی دے کر خود کو گولیوں کی مہیب زد …سے بچا لیا تو مجھے اگلے ہی لمحے دوسرا برسٹ چلنے کی بھی گھن گرج سنائی دی تھی۔ مگر یہ برسٹ مجھ پر نہیں داغا …گیا تھا۔ میں نے تیزی کے ساتھ اپنی جگہ بدلی۔ دوسری سمت سے ذرا سر اُبھار کر دیکھا تو میں نے ان دو …میں سے ایک دشمن کو اپنی پہلی والی جگہ کی سمت محتاط انداز میں بڑھتے دیکھا۔ جبکہ اس کا دوسرا ساتھی …چھولداری پر اندھا دھند گولیاں برسا رہا تھا۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے اس کا نشانہ لے کر لبلبی …دبا دی۔ گولیوں کی بوچھاڑ نے اسے پل بھر میں واصلِ جہنم کر دیا۔

اس کے دوسرے ساتھی کو فوراً ہی میری پوزیشن کا اندازہ ہوا اور اس نے یکدم زمین پر لیٹ کر میری …جانب گن کا منہ کھول دیا۔ میں نے بہ سرعت خود کو جھکا لیا اور تیزی کے ساتھ پوزیشن بدلی۔ اب میں ''فائر …کرو اور جگہ بدلو'' کی حکمتِ عملی کے تحت آخری دشمن پر بدستور گولیاں داغے جا رہا تھا۔ مگر میرا آخری دشمن …بھی محتاط ہو چکا تھا۔ وہ بھی بڑی سرعت اور چابک دستی کے ساتھ نہ صرف اپنی جگہ بدل رہا تھا بلکہ مجھ پر …بھی فائر داغے جا رہا تھا۔

اچانک میں نے چھولداری سے کسی کو گن سنبھالے باہر نکلتے دیکھا۔ میرا فاصلہ چونکہ اس سے خاصا

قریب تھا اس لئے میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ وزیر خان تھا۔ میں نے چلا کر اسے دوبارہ اندر جانے کا کہا تو وہ میری آواز پر ٹھٹکا مگر اس وقت قریب آتے آخری دشمن نے اسے بد قسمتی سے اپنی گن کے نشانے پر لے لیا تھا اور جب تک وزیر خان کچھ سمجھتا، اس نے فائر برسٹ کر دیا تھا۔

وزیر خان کو چھولداری سے شاید اس کی موت ہی کھینچ لائی تھی۔ وہ گولیوں سے چھلنی ہو کر گرا تو مجھے قریب آئے آخری دشمن پر برسٹ فائر کرنے کا موقع مل گیا مگر میری گن سے خالی ''کلچ، کلچ'' کی آواز ابھری۔ میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ دوسرا میگزین کلپ گن کے ساتھ ''اٹیچ'' کیا اور دشمن کی سمت دیکھا مگر وہ غائب ہو چکا تھا۔ میں تیزی کے ساتھ چھولداری کی طرف بڑھا۔ وہ اندر داخل ہوا مگر دوسرے ہی لمحے بری طرح ٹھٹک گیا۔ چھولداری کا عقبی حصہ چاک تھا اور سامنے فرش پر سردار آگرموشی خون میں لت پت پڑا نظر آیا۔ میں بری طرح دہل گیا اور اس کی جانب لپکا۔ اس کے سینے میں ایک لمبی قرولی عین دل کے مقام پر دستے تک پیوست تھی۔ میں نے اس کا جائزہ لیا، وہ مر چکا تھا۔

میں اٹھ کر چاک شدہ حصے سے باہر آ گیا۔ اس دوران فائرنگ کا سلسلہ بتدریج موقوف ہونے لگا تھا۔ کچھ ایسا لگتا تھا جیسے رشنی گال کے ساتھیوں نے ہتھیار ڈال دیئے تھے یا پھر راہ فرار اختیار کر لی تھی۔ مجھے نگینہ اور انکل اعظم خان کی پراسرار گمشدگی کی فکر ستا رہی تھی۔

میں محتاط انداز میں مگر دیوانوں کی طرح نگینہ اور انکل اعظم خان کو تلاش کرنے لگا کہ اچانک بیک وقت کئی مسلح افراد میرے دائیں بائیں نمودار ہوئے اور آناً فاناً مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ ان کی وضع قطع سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ لوگ غاصب سردار رامس کے ہی آدمی تھے۔ میری مشکیں کس دی گئیں اور پھر مجھے ایک جیپ میں سوار کرا دیا گیا۔

میں نے ان سے نگینہ اور انکل اعظم کے بارے میں جاننے کی کوشش کرنا چاہی تھی مگر یہ لوگ شاید میری زبان نہیں جانتے تھے اور مجھے محض درشت اور خوف ناک نظروں سے گھور کر رہ گئے۔

میں یہ سوچ کر خاموش ہو رہا کہ ممکن ہے وہ دونوں ہی بدقسمتی سے ان کے ہتھے چڑھ گئے ہوں یا ان کے دوسرے ساتھیوں کی گرفت میں آ چکے ہوں۔

ہر سُو خاموشی کا راج تھا۔

مجھے غاصب سردار رامس کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس کی حالت خارش زدہ کتے کی سی ہو رہی تھی۔ وہ مجھے یوں خوف ناک نظروں سے گھورنے لگا جیسے میری بوٹیاں تک نوچ لے گا۔

میری زبان صرف اس کو ہی آتی تھی۔ وہ چند ثانیے جلنے کڑھنے اور مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورنے کے بعد غضب ناک لہجے میں بولا۔

''نادر!.........تم نے باغیوں کے ساتھ مل کر مجھے جو نقصان پہنچایا ہے، اس کی تلافی تو تمہاری موت بھی نہیں کر سکتی۔ لیکن میں تمہاری زندگی کو اس قدر بھیانک کر دوں گا کہ تمہیں اپنی اذیت ناک زندگی کی نجات بھی صرف موت ہی کی صورت نظر آئے گی اور تم مجھ سے موت کی بھیک مانگو گے۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''مجھے تم لوگوں کے داخلی معاملات سے نہ پہلے دلچسپی تھی اور نہ اب ہے۔''

''بکواس بند کرو مکار آدمی!'' وہ مارے طیش کے دھاڑتے ہوئے بولا۔ ''اگر یہ بات تھی تو پھر تم نے باغی ٹولے کے ساتھ ساز باز کر کے ہمارے اہم قیدیوں کو کیوں آزادی دلائی تھی؟''

''ان قیدیوں میں میرے اہم ساتھی بھی شامل تھے جنہیں تم نے بے گناہ قید میں رکھا ہوا تھا۔'' میں نے

بھی جچا تلا جواب دیا تو وہ چند ثانیے مجھے خشمناک نظروں سے گھورتا رہا، پھر دوسرے ہی لمحے ایک بدمست اور فاتحانہ قہقہہ لگا کر بولا۔

''باغی ٹولے کو تو ہمارے ساتھیوں نے چن چن کر ہلاک کر ڈالا ہے۔ اور سردار آگرموشی بھی ختم ہو چکا۔ بہت جلد میرے ساتھی دوسرے باغیوں سمیت رشنی گال اور تمہارے ساتھیوں کو بھی پکڑ کر یہاں لانے والے ہیں۔ ابھی تم انتظار کرو۔ پھر تمہاری نظروں کے سامنے تمہارے پیاروں کو اذیتیں دے کر جان سے ماروں گا تاکہ میرے انتقام کی آگ ٹھنڈی ہو سکے۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنے مسلح ساتھیوں سے کچھ کہا۔ وہ فوراً حرکت میں آئے اور مجھے پکڑ کر قید خانے میں ڈال دیا گیا۔

یہ وہی منحوس قید خانہ تھا جو تہہ خانے میں بنا ہوا تھا اور میں پہلے بھی یہاں مقید رہ چکا تھا۔ مجھے سردار رامس کی ان باتوں سے کچھ ڈھارس بندھی تھی کہ ابھی تک نگینہ، انکل اعظم خان اور باغی رشنی گال سمیت اس کے دیگر ساتھی ان کے ہتھے نہیں چڑھ سکے تھے۔

مگر سوچنے کی بات یہ تھی کہ وہ کہاں غائب ہو گئے تھے؟......... جبکہ معزول اور بدنصیب سردار آگرموشی کا سفاکانہ قتل تو یہی ظاہر کرتا تھا کہ دشمنوں کا ایک ٹولہ عقب سے چھولداری پر حملہ کر کے اندر داخل ہوا تھا اور انہوں نے سردار آگرموشی کو قتل کر ڈالا ہوگا۔ پھر بعد میں وہ نگینہ اور انکل اعظم خان کو اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے۔ مگر یہاں آ کر تو مجھے کچھ اور کہانی سنائی جا رہی تھی۔ میں بری طرح اُلجھ کر رہ گیا تھا۔ پھر میرے ذہن میں ایک چونکا دینے والا حوصلہ افزا خیال یہ بھی اُبھرا تھا کہ ممکن ہے، سردار رامس کے آدمی سردار آگرموشی کو ہلاک کرنے کے بعد نگینہ اور انکل اعظم خان کو اپنی گرفت میں لے جا رہے ہوں تو رشنی گال نے عین وقت پر اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر انہیں ان کے چنگل سے چھڑا لیا ہو۔ اس خیال میں پورا وثوق دکھائی دیتا تھا۔ کیونکہ میں بہر حال رشنی گال کی بے جگری اور بہادری کا معترف تو تھا۔

بہر طور اب دیکھنا یہ تھا کہ آگے کیا ہونے والا تھا؟ بقول اس خبیث سردار رامس کہ اس کے جنگجو ساتھی رشنی گال اور میرے دونوں ساتھیوں کو تلاش کر رہے تھے۔ سر دست مجھے حالات مخدوش سے مخدوش تر ہوتے نظر آ رہے تھے۔

سردار رامس کے بھیانک اور خونیں عزائم نے مجھے لرزا کر رکھ دیا۔ اس خبیث اور بے حد سفاک شخص نے اقتدار کے لالچ میں آ کر اپنے ہی سگے بھائی کو بالآخر قتل کر ڈالا تھا اور اس کے ہمراہ اس گھناؤنی سازش میں خود بدنصیب اور آنجہانی سردار آگرموشی کی بیوی ناگاسی بھی شامل تھی جس نے اب نئے سردار یعنی اپنے ہی دیور رامس سے شادی رچا لی تھی۔ مجھے ان کے معاملات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مگر مجھے زیادہ فکر نگینہ اور انکل اعظم کی طرف سے لاحق ہو رہی تھی۔ اور میں یہ بھی دعائیں مانگ رہا تھا کہ وہ دونوں رشنی گال کے پاس ہوں اور محفوظ ہوں۔ سردار رامس کے سفاک آدمیوں کے ہتھے نہ چڑھ جائیں۔

البتہ اس خونی جنگ میں مجھے وزیر خان کی موت کا زیادہ افسوس ہو رہا تھا۔ مکش پور کی بستی کے سردار زور آور خان نے اپنی روایتی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری بات کا یقین نہیں کیا تھا کہ اس کے بیٹے کو قتل کرنے والا میں نہیں بلکہ سنکھال نامی وہ کیلاشی باشندہ تھا جو عامل عاروب کے گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ مگر اس نے میری ایک نہ سنی تھی اور بالآخر اپنے بھائی وزیر خان کو چند ساتھیوں سمیت میری راہ پر لگا دیا تھا۔ اب کون جانتا تھا کہ وزیر خان کی موت ہی اسے یہاں کھینچ لائی تھی۔ مگر وزیر خان اور علی الترتیب اس کے چند ساتھیوں کی موت کے بعد میرے لئے سردار زور آور خان والا معاملہ مزید پیچیدہ ہو گیا تھا۔ لامحالہ وہ مجھ

پر ہی شک کر سکتے تھے۔ اس کے بیٹے شہ زور کو ہلاک کرنے کے بعد وزیر خان وغیرہ کو بھی میں نے ہی قتل کیا ہو گا۔ اب تو سنکھال ہی ایسا شخص تھا جو میری بے گناہی کو ثابت کر سکتا تھا۔ وہ نہ بھی کرتا تو کم از کم میرے لئے یہ ضروری تھا کہ میں اس خبیث کو زندہ گرفت میں لے کر کمش پور کے سردار زور آور خان کے سامنے پیش کر دوں تا کہ اس کی بیٹی اپنے جوان بھائی شہ زور کے قاتل کی حیثیت سے سنکھال کو پہچان سکے۔ گویا مجھے ابھی یہاں مزید پُرخطر مہمات سر کرنا تھیں۔ لیکن یہ معاملات تو بعد کی بات تھے۔ اس وقت میں خود دوہرے تہرے حالات کا شکار ہو چکا تھا۔

سردار رامس کی قید میں آنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ وہ خبیث مجھ پر بری طرح ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ تہہ خانے کے سیلن زدہ اور گھٹن آمیز ماحول اور مخدوش حالات کی سنگینیوں میں میرے دل و دماغ کو ایک پل کے لئے بھی سکون نہیں مل رہا تھا۔ یہاں گھپ تاریکیوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ وقت گزرتا رہا۔ میرے اندر وسوسوں اور اندیشوں کے سانپ کلبلاتے رہے۔

پھر اسی طرح کئی گھنٹے بیت گئے۔ نہ دن کا پتہ معلوم ہو رہا تھا نہ رات کا۔ کچھ بھائی ہی نہیں دے رہا تھا سوائے کالی گھپ تاریکی کے۔

میں ایک جگہ دیوار سے پشت ٹکائے بیٹھا رہا۔ گھنٹوں پر گھنٹے گزرنے لگے۔ میں کبھی اُٹھ کر تاریکی میں بے چینی سے ٹہلنے لگتا تو کبھی بیٹھ جاتا۔ میرا سکون غارت ہو چکا تھا۔ مجھے کسی پل چین نہیں مل رہا تھا۔ چشم تصور میں بار بار نگینہ کا ستم رسیدہ چہرہ گردش کرنے لگتا تھا۔

جب حد سے زیادہ میرے اعصاب کشیدہ ہونے لگے تو میں نے پاگلوں کی طرح زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ مگر لگتا تھا شاید میری چیخیں، میری آوازیں اس منحوس تہہ خانے کی پُرہول فضا میں ہی آسیبی چمگادڑوں کی طرح گردش کر کے رہ گئی ہوں۔ باہر سے ان کا کوئی تعلق نہ ہو۔ یہ قید تنہائی تھی جو مجھے کاٹنے لگی تھی۔ بالآخر چیختے چیختے میرا گلا دُکھنے لگا اور میں نڈھال ہو کر وہیں بیٹھ گیا۔ میں بری طرح ہانپنے لگا۔ پھر مجھے نہ جانے کب نیند نے آلیا۔

نہ جانے کتنی دیر میں پڑا سویا رہا۔ بیدار ہوا تو میں نے روشنی دیکھی۔ وہ تہہ خانے کا دروازہ تھا۔ چار افراد کے ہیولے نظر آئے۔ ان میں سے تین مسلح نظر آ رہے تھے۔ جبکہ چوتھے کے ہاتھ میں کوئی ٹرے نما شے تھی۔ صرف وہی آگے بڑھا تھا۔ باقی تینوں گنیں تانے چوکس انداز میں وہیں کھڑے رہے تھے۔ اندر داخل ہونے والے نے ٹرے زمین پر رکھی اور پھر یہ سب واپس لوٹ گئے۔ دروازہ بند ہو گیا۔

ایک بار پھر وہی کالی تاریکی چھا گئی۔ میں اندھیرے میں ٹٹول کر ٹرے میں جو کچھ بھی رکھا تھا، جلدی جلدی اپنے بھوک سے اینٹھتے ہوئے معدے میں منتقل کرنے لگا۔ پانی کی آدھ بھری چھاگل بھی تھی۔

بھوک پیاس کا کچھ تدارک ہوا تو ذہن بھی ذرا سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا۔ خوراک اگرچہ ناکافی تھی مگر بہرحال تنِ مردہ میں کچھ تو جان پڑی تھی۔ سردست مجھے فرار کی ساری راہیں مسدود ہی نظر آ رہی تھیں۔ کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا کہ کیا کروں؟ حالات تھے کہ اوپر تلے پلٹا کھا رہے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی کہ میں چوکھی حالات زدگی کا شکار تھا۔ کبھی فتح میرے نصیب میں آ رہی تھی اور کبھی دشمنوں کا مقدر بنتی۔

سوچ سوچ کر مجھے احساس ہونے لگا کہ مجھ سے کہیں فاش غلطی سرزد ہوئی تھی۔ مجھے عامل عارب کا قضیہ نمٹانے کی مہم مؤخر کر دینی چاہئے تھی۔ یہ کام بعد میں بھی انجام دیا جا سکتا تھا۔ مجھے نگینہ اور انکل اعظم کے ساتھ اس وادی سے فی الفور نکل جانا چاہئے تھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟ اب تو میرا سب کچھ داؤ پر لگا ہوا تھا۔ مجھے یہ بات جاننے کی بے چینی لاحق تھی کہ خدانخواستہ نگینہ اور انکل اعظم بھی دشمنوں کے ہتھے نہ چڑھ

گئے ہوں۔ ویسے مجھے کچھ تسلی تو تھی کہ اس صورت میں وہ دونوں بھی یہاں میرے ساتھ تہہ خانے میں ہوتے۔

میں نہیں جانتا تھا کہ مجھے وہاں قید خانے میں رہتے ہوئے کتنے دن بیت گئے تھے۔ تاہم میں نے گزرے ہوئے وقت اور گھنٹوں سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے آج دوسرا دن ہی ہوا تھا۔ چند گھنٹے اور گزرے تو چار مسلح اشخاص اندر داخل ہوئے۔ میں نے ان سے کچھ پوچھنا چاہا مگر وہ مجھے کوئی جواب دیئے بغیر گھسیٹتے ہوئے اپنے ساتھ تہہ خانے سے باہر لے آئے۔ جس کے بعد مجھے سردار رامس کے سامنے پیش کیا گیا۔

میں نے خلاف توقع اس کے چہرے پر درشتی کے بجائے اُلجھن آمیز فکرمندی کے تاثرات دیکھے۔ میں یہی سمجھا تھا کہ اب مجھے یہ خبیث شخص تختہ مشق بنانے والا تھا۔

وہ میری طرف خوف ناک نظروں سے چند ثانیے گھورتا رہا، پھر بولا۔ ”تمہاری قسمت اچھی ہے کہ تمہیں آسان موت دی جا رہی ہے۔“

میں اس کی اسرار بھری گفتگو پر بری طرح دہل گیا تاہم حلق تر کر کے بولا۔

”میں سمجھا نہیں......اس مہربانی کی وجہ.........؟“

”اس بات کو چھوڑو۔“ وہ جھٹکے دار لہجے میں بولا۔ اس کے بعد اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا۔

میرے دونوں ہاتھ پشت کی جانب جکڑ دیئے گئے۔ میرا دل گویا کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ مجھے پھانسی دی جانے والی تھی۔ یہ کرب ناک حقیقت میں کس طرح گوارا کر سکتا تھا۔ مگر یہ ہو رہا تھا، ہونے والا تھا اور میں یعنی نادر علی خان بالکل بے بس تھا......کیا واقعی میں بے بس تھا؟......کیا میری زندگی اتنی ہی سستی تھی کہ میں ان برف زاروں میں بے بسی کی موت مارا جاؤں؟......میں نے تو آج تک حق و صداقت کے لئے جنگ لڑی تھی۔ پھر ایسی بے بسی والی موت میرا مقدر کیوں بننے والی تھی؟ اور وہ بھی بے گناہی کی موت!

’نہیں نادر علی خان!......نہیں‘ میرے اندر دور کہیں کوئی چلایا تھا۔ جس کی بازگشت مجھے اپنی سماعتوں تک میں سنائی دی تھی۔

مجھے ایک جیپ میں سوار کرایا گیا۔ سردار رامس بھی دوسری گاڑی میں اپنے چند مسلح محافظوں کے ساتھ سوار ہوا۔ خچر سوار مسلح دستے بھی موجود تھے۔ پھر یہ مختصر قافلہ پھانسی گھاٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔

دیگر امراء بھی ایک الگ گاڑی میں موجود تھے۔ باغیوں کے حملے کے پیش نظر اس بار مسلح دستے کی تعداد دُگنی کر دی گئی تھی۔

مگر ابھی یہ قافلہ سردار رامس کی قلعہ نما رہائش گاہ سے صرف چند گز آگے ہی گیا تھا کہ اچانک شور مچ گیا۔ قافلے کو روکنے کا بگل بجا دیا گیا۔ سب لوگ وہیں رک گئے۔ جس جیپ میں مجھے سوار کرایا گیا تھا، وہ بھی ایک جھٹکے سے روکی گئی تھی۔ نہ جانے کیا انہونی ہو گئی تھی، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ دوسرے بھی حیران پریشان اور سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگے تھے۔ دو تین کچھ جاننے کی جستجو میں جیپ سے اترے اور پھر ذرا ہی دیر بعد وہ جب پریشان اور بوکھلائے ہوئے لوٹے تو میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ وہ دونوں اپنی زبانوں میں حواس باختہ لہجے میں اپنے ساتھیوں کو کچھ بتانے لگے۔ میں نے بھانپتی ہوئی نظروں سے ان کے چہروں پر تفکر اور پریشانی کے آثار نمودار ہوتے دیکھے تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ جانے ایسی کیا بات اچانک رونما ہو گئی تھی جس نے پورے قافلے میں پریشانی، تشویش اور بے چینی کی لہر دوڑا رہی تھی اور قافلے کو اچانک روک دیا گیا تھا۔

میں نے بھی گردن موڑ کر جیپ کی کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کی تھی مگر مجھے وہاں سوائے افراتفری کے کچھ نظر نہ آیا۔ اس کے ذرا ہی دیر بعد قافلے کو واپسی کا حکم ملا۔ مجھے مسرت آمیز حیرت نے گھیر رکھا تھا کہ نہ جانے کاتب تقدیر نے میری تقدیر میں کیا لکھا تھا جو ظہور پذیر ہونے والا تھا؟

چونکہ ہم سردار رامس کی رہائش گاہ کے قریب ہی تھے، اس لئے فوراً ہی ہم وہاں پہنچ کر رکے۔ پھر مجھے جیپ سے نیچے اتارا گیا تھا۔ میری سب سے پہلے نگاہ سردار رامس کی گاڑی پر پڑی تھی اور یہ دیکھ کر مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا تھا کہ جیپ سے سردار رامس کے بے سدھ وجود کو چار افراد اٹھائے تیزی کے ساتھ رہائش گاہ کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ مجھے بھی اندر لایا گیا تھا۔ رہائش گاہ میں کہرام مچ گیا تھا۔ قرائن سے اندازہ ہوتا تھا کہ سردار رامس کی اچانک طبیعت بگڑ گئی تھی۔

پھر میں نے سردار آگرموشی کی بیوہ اور رامس کی بیوی ناگاسی کو روتے پیٹتے دیکھا۔ البتہ مجھے دوبارہ اسی منحوس تہہ خانے میں پہنچا دیا گیا تھا اور میرے دونوں ہاتھوں کی رسیاں بھی نہیں کھولی گئی تھیں۔

نہ جانے یہ کیا معاملہ تھا۔ سردار رامس کی اچانک طبیعت کیوں بگڑ گئی تھی؟......... یہ مجھے نہیں معلوم ہو سکا تھا۔ میں بہرحال اس انہونی پر اللہ کا شکر ہی ادا کر سکتا تھا کہ جس نے میری آئی ٹال دی تھی۔

نہ جانے مجھے اب اور مزید کب تک یہاں مقید رہنا پڑتا۔ اس طرح عجیب و غریب خیالات اور حالات میں کئی گھنٹے بیت گئے۔ مجھے ایک بار پھر بھوک پیاس ستانے لگی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ رشنی گال اور اس کے باقی ساتھی میری رہائی کے سلسلے میں کیا منصوبہ بندی کر رہے تھے؟ مگر مجھے زیادہ بے چینی اس بات کی ستا رہی تھی کہ آخر سردار رامس کے ساتھ یوں اچانک اور غیر متوقع طور پر ہوا کیا تھا؟ اور آیا وہ زندہ بھی تھا یا نہیں؟

انہی پُرسوچ خیالات میں چند گھنٹے اور بیت گئے۔ میری اُلجھن آمیز پریشانی فزوں تر ہونے لگی اور مجھے بھوک سے زیادہ پیاس ستانے لگی تھی۔

میرے محتاط اندازے کے حساب سے مجھے ایک دن گزر چکا تھا۔ پھر دوسرے دن بھی مزید کئی گھنٹے بیت گئے تو مجھے خوراک اور پانی نصیب ہوا۔ تین مسلح افراد کے ساتھ وہ چوتھا شخص ٹرے لے کر اندر داخل ہوا تھا، میں نے باہر سے آنے والی مدھم روشنی میں ان چاروں کے چہروں کو بغور دیکھا تھا۔ مجھے وہ مغموم سے نظر آئے تھے مگر چونکہ وہ میری زبان نہیں سمجھ سکتے تھے اس لئے ان سے کچھ پوچھنا بے کار ہی تھا۔

اگلے روز پھر مجھے اسی طرح خوراک فراہم کی گئی۔ اس دوران میں نے یہ بات محسوس کی تھی کہ پہلے مجھے صرف دن میں ایک بار خوراک دی جاتی تھی اور وہ بھی ناکافی ہوتی۔ باقی سارا دن میں بھوکا پیاسا ہی رہتا تھا۔ مگر اب جب سے دوبارہ مجھے داخلِ زندان کیا گیا تھا تو مجھے نہ صرف دن میں دو بار خوراک دی جا رہی تھی بلکہ خوراک کی مقدار میں بھی کچھ اضافہ ہو رہا تھا۔ اس میں بھیڑ کے گوشت کے بھنے ہوئے پارچے اور تنوری روٹیاں بھی ہوتی تھیں۔ دودھ کا گلاس، پانی کی پوری بھری ہوئی چھاگل بھی ہوتی تھی، اُبلے ہوئے چاول بھی ہوتے تھے۔

میں اس خوشگوار تبدیلی پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ بلکہ اس وقت تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی تھی کہ جب مستقل طور پر میری پشت پر بندھے ہوئے دونوں ہاتھوں کی رسیاں بھی کھول دی گئی تھیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ مجھ پر اچانک یہ کس نوعیت کی مہربانیاں ہونے لگی تھیں۔

نہ جانے وہ کون سا پہر تھا کہ ایک روز تہہ خانے کا دروازہ کھلا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ رات کا کوئی درمیانی پہر تھا۔ پورے دن میں میرے تہہ خانے کا دروازہ صرف دو مرتبہ کھولا جاتا تھا اور اس دوران

مجھے دو بار خوراک وغیرہ پہنچائی جاتی تھی۔ جبکہ آج کے روز تیسری بار دروازہ کھلا تھا جو ظاہر ہے خلافِ معمول ہی تھا۔ مجھے حیرت بھی ہوئی۔ میری مضطرب نظریں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے دیکھا، دو کیم شحیم افراد اندر داخل ہوئے۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے مجھے گن پوائنٹ پر رکھ لیا اور باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ میں حیران پریشان مگر خاموشی کے ساتھ سر جھکائے ان کے آگے آگے چل پڑا۔

میرے اندر زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ اچانک کس نوعیت کی پُراسرار کایا کلپ ہو گئی تھی؟.........اور اب میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا؟

بہرطور سردست تو میں ان دونوں مسلح افراد کے آگے آگے گن پوائنٹ پر چلتا رہا۔ یہ لوگ مجھے ایک چکر دار زینے سے اوپر ایک راہداری میں لے آئے۔ میرا اندازہ درست تھا کہ یہ رات کا ہی کوئی درمیانی پہر تھا۔

نہ جانے یہ پُراسرار حالات کا اونٹ کس کروٹ بیٹھنے والا تھا۔ حالات کی عجیب طرفہ کاری جاری تھی۔

مجھے ایک شاہانہ طرز کے وسیع و عریض کمرے میں لایا گیا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ جبکہ وسط میں خوب صورت اور نقشین نشست گاہ کا انتظام کیا گیا تھا۔ مجھے ایک نشست پر بیٹھنے کا حکم ملا۔ اس کے بعد ان دونوں مسلح افراد نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

اب ہم تینوں کے علاوہ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ میرے لئے یہ دونوں مسلح افراد اجنبی ہی تھے۔ مراد یہ کہ اس سے پہلے تہہ خانے میں خوراک لانے والے کے ساتھ جو تین مسلح پہرے دار آتے تھے، ان میں سے بہرحال یہ دونوں نہیں تھے۔

بہرطور میں حکم کے مطابق ایک آرام دہ نشست پر بیٹھ چکا تھا۔ اور وہ دونوں کیم شحیم مسلح کار نہایت مستعدی سے میرے عقب میں خاموش کھڑے ہو گئے تھے۔

کمرے میں روشنی تھی۔ اس کے باوجود کمرے کے محدود ماحول میں عجیب سا اسرار بھرا سکوت طاری تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کوئی اہم شخصیت ذرا ہی دیر بعد اندر داخل ہونے والی تھی اور پھر چند ثانیوں بعد جو متوقع ''اہم شخصیت'' زرق برق لباس میں اندر داخل ہوئی، میں اسے دیکھ کر بری طرح ٹھٹکا تھا۔

وہ ناگاسی تھی.........سردار رامس کی بیوی اور آنجہانی سردار آگرموشی کی بیوہ، ناگاسی۔ میں اسے دیکھ کر احتراماً کھڑا ہو گیا۔

وہ بہت باوقار انداز میں چلتی ہوئی ایک دوسرے اندرونی دروازے سے اندر داخل ہوئی تھی اور میرے سامنے والی نشست پر براجمان ہو گئی۔ ساتھ ہی مجھے بھی اس نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میری دھڑکتی ہوئی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ انداز و اطوار سے تمکنت ظاہر ہو رہی تھی۔ چہرہ بھی شاداب اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔

میں سردار رامس کی آمد کی توقع کر رہا تھا۔ لیکن اس کی بیوی ناگاسی سے باقاعدہ آج یوں ''ون ٹو ون'' سامنا ہو رہا تھا۔

میری حیرت بھری آنکھیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ مگر اب میں حیرت کا سبب ڈھونڈنے کی بجائے اپنے ذہن کو تیزی سے کام میں لا رہا تھا۔

آنجہانی سردار آگرموشی، غاصب سردار رامس، بوڑھا وید، سردار رامس کا سالار، عامل عاروب اور رشنی گال کے علاوہ ناگاسی کا بھی ان افراد میں شمار ہوتا تھا جنہیں میری زبان آتی تھی۔ مگر صاف اور رواں زبان صرف دو افراد کو ہی بولتے سنا تھا یہاں میں نے۔ ایک بوڑھے وید کو، دوسرے عامل عاروب کو۔ باقی سب ''کام چلاؤ'' بولی بول لیتے تھے۔

میری نظریں چند ثانیے ناگاسی کے چہرے پر جمی رہیں، پھر کچھ سوچ کر میں نے اپنی نظریں جھکا دیں۔

تب پھر ناگاسی نے کچھ کہا تھا جو میں نہ سمجھ سکا۔ اس نے اپنی زبان میں کچھ بولا تھا۔ میں سمجھا تخاطب میں ہی تھا اس لئے میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نظریں میرے عقب میں کھڑے دو مسلح افراد پر جمی ہوئی تھیں۔ میں سمجھ گیا۔ ناگاسی نے انہی سے کچھ کہا تھا۔ کیونکہ دوسرے ہی لمحے وہ دونوں کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔ اب کمرے میں صرف میں اور ناگاسی تھے۔

مجھ پر ایک بار پھر حیرتوں کے دورے پڑنے لگے۔ نہ جانے یہ کیسا اور کیا اسرار تھا؟.........ایک سردار کی بیوی کا یوں نصف رات کے پہر میں میرے ساتھ یہاں تنہا بیٹھنا۔ غرضیکہ میں بری طرح اُلجھن کا شکار ہوگیا تھا اور بار بار میرے دل و دماغ میں یہی سوال اُبھر رہا تھا کہ آخر سردار رامس کہاں گیا؟ اور اس کی پری جمال بیوی.........؟ میں آگے کچھ نہ سوچ پایا۔ کیونکہ دوسرے ہی لمحے ناگاسی نے ہولے سے میرا نام پکارتے ہوئے گویا مجھے مخاطب کر کے کہا۔

''نادر! سردار رامس مر چکا ہے۔''

اس نے فقط اتنا ہی کہا اور میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ میں غیر یقینی نظروں سے اس کے چہرے کو تکنے لگا۔

''قبیلے کے قانون کی رو سے اب میں ہی سردار ہوں۔'' وہ دوبارہ ہموار لہجے میں بولی تو میں نے اخلاقاً اظہارِ افسوس کے طور پر کہا۔

''مجھے بہت دکھ ہوا.........معزز سردار کو آخر اچانک کیا ہوگیا تھا؟''

میری بات پر اس کے عنابی اور گداز ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ اُبھری اور وہ بہ دستور اپنی سرگیں نگاہیں میرے چہرے پر جمائے بولی۔

''نہیں.........افسوس کرنے اور یہ جاننے کی ضرورت نہیں کہ سردار رامس کی اچانک موت کیسے واقع ہوگئی؟ کیونکہ مجھے بھی اس کا کوئی دکھ نہیں ہے۔''

مجھے اس کا لہجہ عجیب پُراسرار لگا تھا۔ میں خاموشی سے اس کے مزید بولنے کا منتظر تھا۔

''میں تم سے دوٹوک گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔ اور اس میں تمہاری ہی بھلائی ہے۔''

''جی مادام!.........میں سن رہا ہوں۔'' میں نے بھی مختصراً کہا۔ البتہ میرے اندر بری طرح ہلچل مچی ہوئی تھی۔

''سردار رامس نے تمہیں پھانسی پر چڑھانے کا پختہ عزم کر رکھا تھا۔ لیکن یہ میں نہیں چاہتی تھی۔'' اس بار میں اس کی بات پر چونکا تھا اور بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

''میں اس کرم نوازی کی وجہ جان سکتا ہوں؟''

''میں نے ہی اسے زہر دے کر ہلاک کیا تھا.........اور اس سلسلے میں عامل عاروب نے میری خفیہ طور پر مدد بھی کی تھی۔''

مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا مگر ناگاسی کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی۔

''مجھے یقین ہے کہ تم اس راز کو افشاء کرنے کی کوشش میں خود کو ہلاکت میں نہیں ڈالو گے اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس طرح تم اس فائدے سے محروم ہو جاؤ گے جو میری وجہ سے تمہیں پہنچنے والا ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر رُکی۔ گویا مجھے کچھ کہنے کا موقع دیا گیا ہو۔

مجھے اب کیا کرنا تھا اور کیا کہنا تھا؟.........میرے تیزی سے کام کرتے ہوئے ذہن نے کچھ سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے محتاط لہجے میں سوال کیا۔

''اگر یہ بات ہے تو ظاہر ہے کہ میں اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی نہیں مار سکتا۔ دوسرے یہ کہ میں آپ کا شکرگزار ہوں، آپ نے ایک اجنبی کی جان بچانے کے لئے ایسا کیا۔ لیکن کیا ہی اچھا ہوتا اگر اس راز میں آپ عامل عاروب کو شامل نہ کرتیں۔ کیونکہ وہ بہرحال ایک دھوکے باز اور فریبی نسان ہے۔ آپ کو اس پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے تھا۔''

عامل عاروب کے سلسلے میں یہ آخری بات میں نے قدرے ڈرتے ڈرتے کہی تھی۔ کیونکہ میں نہیں جانتا تھا کہ ان دونوں میں درونِ خانہ نہ جانے کس قسم کے ''روابط'' استوار ہو چکے تھے۔ اور میرا عامل عاروب کے لئے اس قسم کا منفی تبصرہ کہیں ناگاسی کو ناگوار نہ گزرے۔ لیکن چونکہ ناگاسی نے مجھے دوٹوک گفتگو کرنے کا کہا تھا اس لئے میں نے کچھ ایسے انداز میں یہ بات کہہ دی تھی تاکہ ناگاسی بھی مجھے اپنا خیر خواہ سمجھے۔

میں نے دیکھا، میری بات پر اس کے چہرے پر ہلکی اسرار بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ مگر اس کی آنکھیں دور کہیں کسی غیر مرئی نقطے پر جمی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ پھر دوسرے ہی لمحے وہ اپنے سر کو ہولے سے تفہیمی جنبش دیتے ہوئے بولی۔

''تم نے بالکل ٹھیک کہا۔''

اسے اپنی بات کی تائید کرتے دیکھ کر بے اختیار میں نے اطمینان کی سانس لی تھی اور مجھے مزید کچھ کہنے اور پوچھنے کا حوصلہ بھی ہوا تھا۔ تاہم مجھے گہری اور پُراسرار سازش کی بُو محسوس ہو رہی تھی۔ ایسی سازش جو بڑی کامیابی کے ساتھ انجام پذیر بھی ہو چکی تھی۔

''اسے ہمراز بنانا میری مجبوری تھی.........درحقیقت جو میں چاہتی تھی، وہ بھی وہی چاہتا تھا۔''

میں نے اندازہ لگایا کہ وہ بہت مختصر اور چھوٹے چھوٹے جملے کہنے کی عادی تھی۔

''یعنی.........سردار رامس کی موت.........؟'' میں نے بھی لقمہ دیا۔

''ہاں.........''

''کیا پوچھ سکتا ہوں کہ عامل عاروب کو سردار رامس سے کیا دشمنی تھی؟ کیونکہ وہ دونوں تو ایک دوسرے کے زبردست حلیف تھے۔'' میں نے اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں.........یہ بات درست ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے دوست تھے۔ لیکن یہ دوستی صرف مفادات کی حد تک تھی۔ سردار رامس کو تم سے خاص قسم کی پرخاش ہو چکی تھی۔ وہ تمہیں ہر قیمت پر پھانسی چڑھا دینا چاہتا تھا لیکن جب عامل عاروب کو اس بات کا علم ہوا کہ اس کا شکار یعنی تم سردار رامس کی قید میں ہو تو اس نے سردار رامس سے دوستانہ درخواست کی کہ تمہیں اس کے حوالے کر دیا جائے۔ کیونکہ تم درحقیقت عامل عاروب کے ہی شکار تھے بلکہ تمہیں سردار رامس سے حاصل کرنے کا اہم ترین مقصد عامل عاروب کا یہ تھا کہ وہ تمہیں یرغمال بنائے رکھتے ہوئے تمہاری ساتھی نگینہ کو قابو میں کرنا چاہتا تھا۔'' ناگاسی نے تھوڑے توقف کے بعد ایک گہری سانس لے کر گویا بات سمیٹنے کی غرض سے کہا۔

''سردار رامس نے عامل عاروب کی یہ بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کا اس سلسلے میں کہنا تھا کہ تم ایک خطرناک انسان ہو اور عامل عاروب کی قید سے کسی وقت بھی دوبارہ نکل بھاگ سکتے ہو۔ لہٰذا اب تمہیں پھانسی دینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوگا۔ یہ بات عامل عاروب کو بری لگی اور یوں دونوں دوستوں کے درمیان سرد جنگ شروع ہوگئی۔ مجھے ان ساری باتوں کا علم تھا۔ میں نے ایک روز عامل عاروب سے خفیہ ملاقات کی اور میں تمہیں پھانسی سے بچانا اور سردار رامس کو ہلاک کرنا چاہتی تھی۔ مگر تمہیں بچانے والی بات عامل عاروب سے میں نے چھپا رکھی ہے۔ تاہم میں نے عامل عاروب سے وعدہ کر لیا تھا کہ اگر وہ کسی طرح

سردار رامس کو ہلاک کرنے میں میری مدد کرے تو میں تمہیں اس کے حوالے کر دوں گی۔ اور یوں عامل عاروب نے ہی مجھے ایک ایسا خطرناک زہر فراہم کیا جس کے اثرات زہر خورانی نہیں بلکہ طبعی موت کی صورت ہی میں اُبھرتے تھے۔''

ناگاسی نے اتنا کہہ کر خاموشی اختیار کر لی۔ میری حالت دگرگوں ہونے لگی۔ میں ایک بار پھر سوالیہ نشان بن کر رہ گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ناگاسی نے میری خاطر یہ سب کچھ کیوں کیا؟ سب سے پہلے سردار رامس سے خفیہ گٹھ جوڑ کر کے اپنے پہلے عمر رسیدہ شوہر آگرموشی کے لئے ہلاکت کا سامان پیدا کیا اور پھر سازش کامیاب ہوتے ہی ناگاسی نے عامل عاروب سے خفیہ گٹھ جوڑ کر کے اپنے دوسرے اور نسبتاً جوان شوہر رامس کو بھی ہلاک کر ڈالا اور اب......... یہ مجھ سے کیا چاہتی تھی؟ چاہئے تو اسے یہ تھا کہ عامل عاروب سے کئے گئے خفیہ معاہدے کی رو سے مجھے اس کے حوالے کر ڈالتی۔ لیکن اس نے ایسا کرنے کے بجائے مجھے یہاں بلا لیا اور میں سمجھ رہا تھا کہ اس خفیہ اور انتہائی رازدارانہ نشست سے صرف چند وہی افراد آگاہ ہو سکتے تھے جو ناگاسی کے قریبی وفادار تھے۔ یہ محلاتی سازشیں تھیں۔ تاریخ ایسے عبرت ناک واقعات سے بھری پڑی تھی۔ کبھی اقتدار کی ہوس تھی تو کبھی حسین عورت کے حصول کی۔ کبھی غلام آقا بن جاتا تو کبھی آقا غلام۔ حتیٰ کہ بادشاہوں تک کو گدا بنتے دیکھا۔

مجھے ان معاملات سے کوئی غرض نہ تھی۔ لیکن ناگاسی کی جانب سے ابھی تک میں ایک پُراسرار اُلجھن کا شکار تھا کہ آخر اس نے یہ سب کیوں کیا؟......... میری خاطر بھی کیوں؟......... میرے دل میں آئی تو سہی کہ میں اس سے اپنے حوالے سے بھی دریافت کروں کہ آخر یہ عامل عاروب سے حسب منشاء اپنا کام کرانے کے باوجود اس کے خلاف دھوکا یا وعدہ خلافی کیوں کر رہی تھی؟ چند لمحوں کے سکوت کے بعد میں نے زبان کھولی۔

''سب سے پہلے تو میں آپ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے یہ سب میری خاطر کیا۔ لیکن اب جبکہ آپ مجھے عامل عاروب کے حوالے بھی نہیں کرنا چاہتیں تو میں اس کے لئے بھی آپ کا احسان مند رہوں گا۔ مگر اس طرح عامل عاروب آپ کا بھی دشمن بن سکتا تھا۔ مانا کہ وہ سردار رامس کو زہر دینے والا راز بھی نہیں اُگل سکتا کیونکہ اس سازش میں وہ خود بھی شریک رہا ہے۔ لیکن پھر بھی آپ کو اس سے خطرہ تو ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے آپ نے کیا سوچا ہے؟''

میری بات پر ناگاسی اپنی جگہ سے اُٹھی۔ میں نے بھی دانستہ ازراہِ احترام کھڑے ہونا چاہا مگر اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ وہ چند ثانیے دبیز قالین پر پُرسوچ انداز میں ٹہلتی رہی اس کے بعد دوبارہ اپنی نشست پر براجمان ہو کر میری طرف بہ غور تکتے ہوئے بولی۔

''تم ایک بہادر اور جری انسان ہو۔ میں جانتی ہوں کہ عامل عاروب کو صرف تم ہی موت کے گھاٹ اتار سکتے ہو۔ کیونکہ اس سے پہلے بھی تم اسے کئی بار نقصان پہنچا چکے ہو۔ وہ تمہاری طرف سے بری طرح خائف رہتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کا قضیہ ہمیشہ کے لئے اب نمٹایا جائے۔ عامل عاروب کی موت تمہاری بھی سب سے بڑی خواہش ہو گی۔''

میں اب اس کی آغاز سے آخر تک ساری گفتگو کا مقصد سمجھ چکا تھا......... تاہم پھر بھی سردار رامس کی ایک سازش کے تحت قتل کے حوالے سے ابہام کا شکار تھا اس لئے ذرا محتاط انداز اختیار کرتے ہوئے اس سے کہا۔

''اب جبکہ ہمارے درمیان رازدارانہ دوستی کا رشتہ استوار ہو ہی چکا ہے تو میں اپنی آخری اُلجھن بھی دُور

کر دینا چاہتا ہوں۔'' میں نے ذرا توقف کیا اور اصل بات کی طرف آتے ہوئے بولا۔ ''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آخر آپ کو اپنے دوسرے شوہر سردار رامس کو قتل کرنے کی ایسی کیا ضرورت آن پڑی تھی؟ حالانکہ معافی چاہتا ہوں، آپ نے اس کے ساتھ مل کر ہی اپنے پہلے شوہر سردار آگرموشی.........''

''بتاتی ہوں۔'' اس نے اچانک میری بات کاٹ کر سپاٹ لہجے میں کہا اور میں اس کا چہرہ تکنے لگا۔
''درحقیقت میں دونوں بھائیوں کو دل ہی دل میں سخت ناپسند کرتی تھی۔ اس کی بڑی ٹھوس اور اہم وجہ ہے۔''
اس نے ذرا رک کر ایک گہری ہمکاری لی، پھر بولی۔

''میں ایک دوسرے قبیلے سے تعلق رکھتی تھی۔ بہت چھوٹا اور امن پسند قبیلہ تھا۔ میں وہاں کے سردار کی بیٹی تھی۔ جبکہ سردار آگرموشی کا قبیلہ ایک جارح اور سرکش قبیلہ تھا۔ میرے باپ کی ذرا سی غلطی پر سردار آگرموشی کے قبیلے نے اس پر چڑھائی کر دی۔ میرا باپ قتل کر دیا گیا اور ہمارے چھوٹے سے قبیلے کا شیرازہ بکھیر دیا گیا۔ مجھے بھی قیدی بنا لیا گیا۔ مگر بعد میں میرے حُسن سے دونوں بھائی یعنی آگرموشی اور رامس متاثر ہو گئے تھے۔ میں نے بھی اپنے قبیلے کا انتقام لینے کی خاطر ان دونوں بھائیوں سے خاموش انتقام لینے کی ٹھان رکھی تھی اور چونکہ اس وقت سردار آگرموشی ہی قبیلے کا سردار تھا اس لئے میں نے یہ چالاکی کی کہ اس کی بیوی بن گئی اور بعد میں خفیہ طور پر اس کے بھائی رامس کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنے لگی۔ اس کا بھی میری وجہ سے اپنے بڑے بھائی سردار آگرموشی کی طرف سے دل خراب ہو چکا تھا۔ یوں وہ بغاوت پر اتر آیا اور یوں میں نے بعد میں ان دونوں بھائیوں کا خاتمہ کر ڈالا۔ تم اور تمہارے ساتھی رشنی گال نامی جس باغی کی پناہ میں تھے، وہ درحقیقت میرے ہی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا اور میرا منگیتر بھی تھا۔ ہم دونوں بچپن سے ہی ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ مگر پھر حالات نے پلٹا کھایا اور سب کچھ تباہ و برباد ہوتا چلا گیا۔ مگر اب میری منزل قریب آ چکی ہے۔''

وہ اتنا بتا کر خاموش ہوئی تو میں اس کے ان انکشافات پر انگشت بدنداں رہ گیا۔ اب ساری بات واضح ہو چکی تھی۔ میں ناگاسی کے استقلال، ذہانت اور طویل منصوبہ بندی اور پھر اس کی کامیابی پر عش عش کر اٹھا تھا۔ اس وقت اس کا چہرہ تمتمایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اپنے عبرت سوز ماضی کے متعلق ذکر کرتے ہوئے اس کے سینے میں چھپی آتش انتقام، تمتماتی آنکھوں اور چہرے پر غیظ کی سرخی کی مانند مترشح ہونے لگی تھی۔ وہ اس وقت مجھے کسی منتقم ناگن کی صورت میں نظر آ رہی تھی۔ بہر طور یہ اس کا ذاتی معاملہ تھا۔ اور وہ خاصی حد تک اس میں کامیاب ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے قبیلے کو دربدر کرنے اور اپنے باپ کے قتل کا دونوں بھائیوں (آگرموشی اور رامس) سے خاطر خواہ انتقام لے لیا تھا۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے، عورت انتقام پر اتر آئے تو ناگن سے زیادہ خطرناک ہو جاتی ہے اور اس کا ڈسا پانی بھی نہیں مانگتا۔ تاہم میرے ذہن میں ایک سوال اُبھرا اور میں نے پوچھا۔

''کیا آگرموشی کے قبیلے نے آپ کو دل سے اپنا سردار تسلیم کر لیا ہے؟''

میرے استفسار پر اس کے عنابی ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ اُبھری۔ ''ہاں......... اس لئے کہ جن امراء کے انتخاب کے سلسلے میں، میں نے سردار آگرموشی کا ساتھ دیا تھا، ان میں سے چند ایک کو چھوڑ کر تقریباً سب ہی قبیلے کے لوگ تھے۔ اب اگر عامل عاروب کا خاتمہ ہو جائے اور میں رشنی گال سے شادی کر لوں تو قبیلے کے قانون کی رو سے شادی کے بعد رشنی گال کو قبیلے کی سرداری از خود منتقل ہو جائے گی اور یوں میرا برسوں کا خواب پورا ہو جائے گا۔''

''عامل عاروب کے سلسلے میں جس وقت چاہیں مجھے آپ مہم پر روانہ کر سکتی ہیں۔'' بالآخر میں نے گفتگو

سمیٹنے کی غرض سے کہا۔

"ہاں.........." وہ بولی۔ "لیکن تمہاری یہ مہم جوئی مجھے خفیہ رکھنا پڑے گی۔ تمہیں قید میں رکھتے ہوئے خفیہ طور پر فرار کروانا ہوگا۔ میں نے ایک تفصیلی خفیہ پیغام رشنی گال کو پہنچا دیا ہے اور تمہارے لئے یہ خوش خبری بھی ہے کہ تمہارے دونوں ساتھی نگینہ اور اعظم خان اس کی پناہ میں ہیں اور میں رشنی گال کی مکمل مدد کر رہی ہوں۔"

نگینہ اور انکل اعظم خان کی خیریت معلوم ہوتے ہی میں نے یک گونہ طمانیت بھری سانس لی تھی۔

"میرا خیال ہے اب تم نے ساری باتیں سمجھ لی ہوں گی۔"

"جی........." میں نے ہولے سے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی۔ "میں تیار ہوں......... اور عامل عاروب کی سرکوبی کے لئے جس قدر ممکن ہو سکے ہمیں جلد سے جلد اقدام اٹھانا چاہئے۔" یہ کہہ کر میں نے کسی خیال کے تحت آخر میں کہا۔ "مگر میں سب سے پہلے اپنے دونوں ساتھیوں یعنی نگینہ اور اعظم خان کو بہ حفاظت واپس یہاں سے لوٹانے کا بندوبست کرنا چاہوں گا۔ کیونکہ وہ دونوں کسی وقت بھی میرے پاؤں کی زنجیر بن سکتے ہیں۔"

"یہ کام میں اپنے آدمی کے سپرد کرتی ہوں۔" اس نے بلا تامل جواب دیا۔ "میں ابھی اپنے ایک جاسوس کے ذریعے یہ خفیہ پیغام رشنی گال تک پہنچاتی ہوں۔ مگر اس سے پہلے تمہیں یہاں سے فرار ہونا پڑے گا اور منہ اندھیرے تم رشنی گال سے جا ملو گے۔ باقی میں سنبھال لوں گی۔" اس نے بات ختم کر دی۔

میں نے بے اختیار اس معجزے پر خدا کا شکر ادا کیا۔

میرے اور ناگاسی کے درمیان نصف رات کی یہ 'ون ٹو ون' ملاقات کافی حوصلہ افزا ثابت ہوئی۔ اندرونی محلاتی سازشوں نے کم از کم میرا کام "آسان" بنا دیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ میری جان بغیر کسی خون خرابے کے بچ گئی تھی بلکہ آئندہ کے لئے بھی راہیں ہموار نظر آنے لگی تھیں۔

ناگاسی نے اپنے جاسوس کے ہمراہ رات کے پچھلے پہر مجھے خفیہ طور پر ایک تیز رفتار جیپ میں سوار کر کے روانہ کر دیا۔

رشنی گال کا نیا ٹھکانا زیادہ دور نہ تھا۔ اسے اب کوئی خطرہ نہ تھا۔ میں وہاں پہنچا تو میں نے رشنی گال کو غیر معمولی طور پر خوش اور ہشاش بشاش پایا۔ نگینہ اور انکل اعظم خان بھی مجھے دیکھ کر خوش ہو گئے تھے۔

میں نے رشنی گال کو اس کی سابقہ منگیتر ناگاسی کے ساتھ ہونے والی خفیہ نشست کے بارے میں تفصیلاً آگاہ کر ڈالا۔ سردار راسں کی موت اور ناگاسی کے قبیلے میں سرداری سنبھالنے پر رشنی گال اور اس کے ساتھیوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

تاہم رشنی گال نے مجھے بتایا تھا کہ اب وہ جلد از جلد ناگاسی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ قبیلے کے قانون کی رو سے عورت زیادہ عرصہ تک سردار نہیں رہ سکتی۔ اسے بہت جلد اپنے نئے جیون ساتھی کا انتخاب کر کے دستار سرداری اسے منتقل کرنا تھی۔ بہ صورت دیگر قبیلے کے معتبر امراء کے ہاتھ میں از خود اس کا فیصلہ چلا جاتا اور پھر وہ متفقہ طور پر قبیلے کے کسی بہادر شخص کو دستار سرداری سونپ دیتے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ انہی معتبر امراء میں سے کوئی شخص سردار بن جاتا۔ یہ یہاں ہر قبیلے کا اپنا قانون تھا۔

چنانچہ ناگاسی بھلا یہ کیسے چاہتی کہ دستار سرداری کسی اور کو منتقل ہو جاتی۔ چنانچہ اس نے فوراً اپنے سابقہ منگیتر رشنی گال کا انتخاب کر لیا تھا۔

میری حیثیت بہ دستور ایک مفرور قیدی کی تھی جس کا کام صرف اور صرف عامل عاروب کو خفیہ طور پر

نے لگانا تھا۔ لیکن درپردہ ناگاسی اور متوقع سردار رشنی گال میری سپورٹ کرتے رہتے۔ تاہم رشنی گال نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ لوگ بعد میں میری موت کا یا جان سے مار دینے کا اعلان کر کے میرے قصے ے بھی جان چھڑا سکتے تھے۔

منصوبے کے تحت سب سے پہلے نگینہ اور انکل اعظم خان کو فی الفور یہاں سے روانہ کر دیا جاتا۔ انکل ظم خان تو خاموش رہے۔ لیکن ظاہر ہے نگینہ کو یہ کب گوارا تھا۔

انکل اعظم خان نے البتہ ایک گمبھیر مسئلے کی طرف میری توجہ دلاتے ہوئے فکر مندی سے کہا۔

"نادر بیٹے! اللہ تمہیں اپنی امان میں رکھے۔ لیکن مٹش پور کے سردار زور آور والا مسئلہ مزید گمبھیر اور تشویش ناک ہو چکا ہے۔ اس کے بھائی وزیر خان کی لاش سمیت اگر ہمارے ہتھے سنکھال چڑھ جاتا تو میں سمجھتا ہوں تمہارے لئے اچھا ہوتا۔ ورنہ وہ لوگ وزیر خان کا قتل بھی شہ زور کے قتل کی طرح تمہارے کھاتے میں ڈال دیں گے۔"

اس کی بات قابل غور تھی۔ مگر سنکھال کا زندہ حصول اتنی جلدی ممکن نہ تھا۔ پھر حالات بھی ایسے نہ تھے کہ ب تک انکل اعظم خان اور نگینہ کو یہاں روکا جاتا۔ ہم بہر حال دونوں طرف سے مفرور قیدی ہی تھے۔ ناگاسی سے معاملت کے باعث اب بظاہر ہمارا کہیں ٹھکانہ نہ تھا۔ موجودہ حالات کے پیش نظر میں بے اماں ہو چکا تھا اور رشنی گال اور اس کے باقی ٹولے کی جیسے لاٹری کھل گئی تھی۔ وہ عنقریب سرداری ٹولے میں شامل ہونے والے تھے۔ اس لئے اس موقع سے جس قدر اور جلد فائدہ اٹھانا تھا، اٹھا لینا چاہئے تھا۔

میں نے انکل اعظم خان کو اسی تناظر میں سمجھانے کی کوشش کی تو وہ چپ ہو رہے۔ بالآخر یہی طے پایا۔

نگینہ کی اس وقت بڑی غیر حالت تھی جب اسے انکل اعظم خان سمیت میں خود سے رخصت کر رہا تھا۔ مگر پھر میرے اور انکل اعظم خان سمیت رشنی گال نے بھی اسے سمجھایا تو اس کی کچھ ڈھارس بندھی تھی۔ رشنی گال نے یہ وعدہ بھی ہم سے کیا تھا کہ وہ میرا بھرپور ساتھ دے گا بلکہ عاروب کو ختم کرنا تو اب ہمارا مشترکہ مفاد بن چکا تھا۔

بالآخر ان کڑے حالات سے گزرتے ہوئے نگینہ اور انکل اعظم خان کو رشنی گال کے ایک مسلح دستے کی حفاظت میں وادی سے رخصت کر دیا گیا۔ وزیر خان کی لاش بھی ان کے حوالے کر دی گئی تھی۔ رشنی گال اس سے اگلے روز ناگاسی سے جا ملا۔ البتہ اس کے بیس پچیس کے قریب مسلح ساتھی جواب 'باغی' نہ رہے تھے میرے ساتھ اس خفیہ ٹھکانے پر موجود رہے۔

حالات کی کایا پلٹ میرے حق میں بدل گئی تھی اور اب مجھے عامل عاروب کی بیخ کنی کے ساتھ ساتھ سنکھال کو زندہ گرفت میں لینا تھا۔

ادھر اب رشنی گال ناگاسی سے شادی اور اس کے بعد دستار حاصل کرنے کی تیاریوں میں مشغول تھا اور ادھر میں رشنی گال کے ساتھیوں کے ساتھ اس برف زار ویرانے میں عامل عاروب کے خلاف فیصلہ کن ضرب وحرب کی منصوبہ بندی جوڑنے میں مصروف تھا۔

❊❊❊

عامل عاروب کے سلسلے میں ناگاسی نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ممکن ہے میرے فرار کے ڈرامے کو وہ جھوٹ سمجھے اور یہ ممکن بھی تھا تو یہ عامل عاروب سے جنگ کرنے کا جواز بھی بن سکتا تھا۔

مگر میں جانتا تھا کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ عامل عاروب ایک شاطر اور مکار انسان تھا۔ وہ زخمی سانپ کی طرح کنڈلی مارے بیٹھ جاتا اور ڈسنے کے موقع کی تلاش میں رہتا۔

تاہم مجھے یہ قضیہ ضرور جلد از جلد نمٹانے کا کہا گیا تھا۔ اس سلسلے میں مجھے ناگاسی کی طرف سے خفیہ ہی سہی، مکمل سپورٹ حاصل ہوگئی تھی۔

میں نے پہلا حملہ عامل عاروب کے ٹھکانے پر رات کے پچھلے پہر کیا تھا اور اپنے چند ساتھیوں کی جان کا نذرانہ دے کر اسے خاصا بھاری جانی نقصان پہنچایا تھا۔ اس دوران میں نے عامل عاروب کو ٹھکانے لگانے اور سنکھال کو زندہ گرفت میں لینے کی بھی جان توڑ کوشش کی تھی مگر کامیاب نہ ہو سکا تھا۔

یوں پھر ہماری عامل عاروب کے خلاف ایسی گوریلا کارروائیاں معمول کا حصہ بن گئیں۔

عامل عاروب کا جلد از جلد قضیہ نمٹانے کی خاطر رشنی گال اور ناگاسی میری مکمل طور پر مدد کر رہے تھے۔ ادھر رشنی گال اور ناگاسی کی شادی عمل میں آ چکی تھی۔ بالآخر سرداری رشنی گال کو منتقل ہوگئی تھی۔

ہماری پے در پے گوریلا کارروائیوں سے اتنا ضرور ہوا تھا کہ عامل عاروب کے گروہی ساتھی اب خوف زدہ ہو کر اس کا ساتھ چھوڑنے لگے تھے۔

عامل عاروب کا کوئی ایک قبیلہ نہ تھا۔ صرف مخصوص گروہ تھا جو کیلاش وادی کے مختلف قبیلوں کے آدمیوں کو طے شدہ منصوبے اور پروگرام کے تحت اپنے گروہ میں شامل کر لیا کرتا تھا۔

اسی دوران ایک روز سردار رشنی گال کا ایلچی ناگاسی اور رشنی گال کا مشترکہ پیغام لے کر میرے پاس پہنچا۔ یہ زبانی پیغام تھا۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ عامل عاروب کا قضیہ جلد سے جلد نمٹایا جائے۔ کیونکہ اس نے ان کے خلاف پروپیگنڈا اور بلا اشتعال جارحیت کا الزام لگانا شروع کر دیا تھا۔ اس پیغام کے ساتھ ہی عامل عاروب پر مجھے آخری بار اور فیصلہ کن حملہ کرنے کی خاطر بھاری تعداد میں جدید ہتھیاروں سے لیس گوریلوں کی خاصی تعداد روانہ کر دی گئی۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ جلد از جلد عامل عاروب کو ٹھکانے لگا دوں۔

میں جانتا تھا کہ اب عامل عاروب جیسے شاطر انسان کو اندازہ ہو چکا ہوگا کہ ناگاسی نے مجھے اس کے خلاف ہتھیار کی طرح استعمال کرتے ہوئے کیسی زبردست سازش تیار کی تھی۔

اس رات میں نے اپنے پورے ساتھیوں کے ساتھ عامل عاروب کے گروہ پر ہلّہ بول دیا۔ بڑی زبردست مارا ماری ہوئی۔ عامل عاروب کا بچا کھچا گروہ تتر بتر اور بری طرح انتشار کا شکار ہوگیا۔

اس حملے کے دوران مجھ پر ایک سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ عامل عاروب حملے سے کئی گھنٹے پہلے ہی اپنے چند قریبی ساتھیوں کے ساتھ جن میں سنکھال بھی شامل تھا، نکل بھاگا تھا۔

یہ بات ہمیں اس کے گروہ کے ایک گرفتار پیرو نے بتائی تھی اور اس نے راستہ ہمیں سمجھا دیا تھا۔ بہرحال اسے چھوڑ دیا گیا اور باقی گروہ کے آدمی قیدی بنا کر سردار رشنی گال کے حوالے کر دیئے گئے۔

لیکن اب میرے ساتھ عامل عاروب کے تعاقب میں جانے کے لئے کوئی تیار نہ تھا۔

یہی نہیں، سردار رشنی گال اور ناگاسی کے لئے بھی یہی کافی تھا کہ عامل عاروب کو بالآخر بے خانماں برباد کر کے وادی سے فرار ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ نیز مجھے بھی یہی مشورہ دیا گیا تھا کہ اب میں بھی اپنی یہ مہم ترک کر کے وادی سے جلد از جلد نکل جاؤں۔ ورنہ ان دونوں کے لئے قبیلے میں میری وجہ سے پھوٹ پڑنے کا اندیشہ تھا۔

صورتِ حال گمبھیر اور خطرناک ہوگئی تھی۔ اگر میں سردار رشنی گال اور اس کی بیوی کی بات نہ مانتا تو کچھ بعید نہ تھا کہ میں اپنے ہی ساتھیوں کے ہاتھوں ''پیارا'' کر دیا جاتا۔ بہرطور میں نے اللہ کا نام لیا اور ایک تیز رفتار جیپ میں خود ہی تنہا، عامل عاروب اور سنکھال کے تعاقب میں روانہ ہوگیا۔

***

جیپ کی ٹینکی ایندھن سے بھری ہوئی تھی۔ ایک فاضل کین بھی تھا۔ میرے اندازے کے مطابق عامل عاروب کو افغانستان کے سرحدی علاقے نورستان کے اریب قریب ہونا چاہئے تھا۔

بہ قول اس کے ساتھی کہ وہ سنکھال سمیت چار ساتھیوں کے ہمراہ چھ خچروں پر فرار ہوا تھا۔ نیز اس کی منزل ''نورستان'' ہی تھی۔ وہاں عامل عاروب کے پیش رووں کا خاصا بڑا گروہ تھا۔ نورستان درحقیقت افغانستان کا ایک صوبہ تھا۔

میں جیپ کو ناہموار راستوں پر دوڑاتے ہوئے آبادی سے کوسوں دور نکل آیا تھا۔ میرے پاس تھوڑا بہت زاد راہ بھی تھا۔ جیپ بہت طاقت ور تھی۔ حقیقت یہ تھی سردار رشنی گال اور ناگاسی کی مہربانی تھی کہ انہوں نے جیپ مجھے عنایت کی تھی۔ مگر عامل عاروب کے تعاقب کے لئے نہیں، بلکہ مجھے یہاں سے نکل جانے کی غرض سے۔ مگر میں واپسی کے سفر کی بجائے عامل عاروب اور سنکھال کے تعاقب میں روانہ ہوگیا تھا۔

جیپ میں فاضل ٹائر بھی موجود تھا۔ اپنی حفاظت کے لئے مجھے ایک طاقت ور ایم پی فائیو رائفل اور دو بھرے ہوئے فاضل کلپ بھی دیئے گئے تھے۔ نیز میری پنڈلی پر بندھی ہوئی ایک چھوٹی سی نیام میں قرولی بھی تھی۔ میں عامل عاروب کی موت بن کر اس کے تعاقب میں گامزن تھا اور شام کے آثار ہونے تک میں ایک پیالہ نما برف زار وادی میں پہنچ کر رکا۔ جیپ کا انجن میں نے اسٹارٹ رہنے دیا تھا۔ ورنہ اس غضب کی ٹھنڈ میں اسے سیلف اسٹارٹ کرنا ممکن نہ ہوتا اور دھکا لگانا پڑتا۔ جبکہ میں بہرحال تنہا جیپ کو دھکا لگا کر اسٹارٹ نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے جیپ روکی تو اس کے انجن نے دھواں چھوڑنا شروع کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جیپ کے ''ریڈی ایٹر'' کا پانی خشک ہوگیا تھا۔ یہاں کہیں پانی کا حصول بھی سردست ناممکنات میں نظر آ رہا تھا۔ ناچار میں نے اپنے پینے والے پانی کی ایک ڈیڑھ بوتل ریڈی ایٹر میں انڈیل دی۔

سردی کے باعث مجھے پیاس سے زیادہ خوراک کی طلب ہو رہی تھی اور وہ میرے پاس بھنے ہوئے چنوں کی صورت میں موجود تھی۔ تاہم پانی کی ایک لیٹر کی بوتل بھی تھی۔ وادی میں شام اترتے ہی گویا رات کا گمان ہونے لگتا تھا۔ راستہ پُرخطر اور دشوار تھا۔ اس لئے پہلے میں نے صبح تک سفر مؤخر کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے یہ سوچ کر اپنا ارادہ بدل دیا کہ یہ تساہل کے زمرے میں آتا۔ عامل عاروب کے پاس خچر تھے۔ جیپ کے مقابلے میں اسے راستوں کی زیادہ سہولت تھی۔ جبکہ میرے لئے جیپ کا راستہ دشوار اور کہیں کہیں تو بالکل ہی ناممکن تھا۔ جس کے لئے مجھے ایک لمبا چکر کاٹنا پڑتا تھا۔ حالانکہ میں نے سردار رشنی گال سے خصوصی طور پر یہ گزارش بھی کی تھی کہ مجھے جیپ کے بجائے خچر کی سواری عنایت کر دی جاتی۔ کیونکہ مجھے آگے کا راستہ سوائے خچر سواری کے عبور کرنا ناممکن ہی نظر آ رہا تھا۔ جانے کیا سوچ کر سردار رشنی گال نے مجھے جیپ دے دی تھی اور کہا تھا کہ ریمبور پہنچ کر میں اسے ایک ''وار'' نامی سرائے کے مالک سوریا کے حوالے کر دوں۔ پھر خود آگے چترال وغیرہ کی طرف نکل جاؤں۔ مگر چونکہ مجھے عامل عاروب کے تعاقب میں نکلنا تھا اس لئے یہاں نکل آیا تھا۔

بہرطور ذرا رک کر میں نے اندازہ لگایا کہ مفرور عامل عاروب کے تعاقب میں کہاں تک میں فاصلہ طے کر چکا تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق مجھے اس کے اریب قریب ہونا چاہئے تھا۔ میں نے جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور آگے بڑھ گیا۔ مگر چند کلومیٹر چلا تھا کہ راستہ مسدود ہوگیا۔ مجھے کوئی ایسا راستہ بھی نظر نہ آ رہا تھا کہ میں جیپ کو دوسری سمت سے موڑ کر آگے سفر جاری رکھتا۔ بالآخر مجھے احساس ہوگیا کہ اب

پیدل سفر جاری رکھنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے جیپ سے مختصر سامان کی کٹ سنبھال کر پشت پر باندھی، رائفل ہاتھ میں پکڑی اور جیپ کو وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

ایک سنگلاخ درّے سے اُبھر کر جب میں پیالہ نما وادی سے نکل کر ایک قدرے ڈھلان کے سرے پر نمودار ہوا تو مجھے سامنے خاصی تعداد میں روئیدگی اور کچھ برف سے ڈھکے ہوئے درختوں کا مختصر سا جنگل نظر آیا۔ بہ غور دیکھنے پر میرا دل یکبارگی ٹھٹکا۔ مجھے روشنی سی چمکتی نظر آئی۔ میں محتاط ہو کر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا تو اچانک وہ روشنی ایک الاؤ میں تبدیل ہوتی دکھائی دینے لگی۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔

مذکورہ روشنی والی سمت پر مجھے کسی مختصر سے پڑاؤ کا گمان ہوا۔ میں سنگلاخ اور برفیلی چٹانوں کی آڑ لیتا ہوا خودرو جھاڑیوں کے جھنڈ کے نزدیک پہنچ کر رکا اور سامنے نظریں جما دیں۔ آسمان صاف اور شفاف تھا۔ تاروں کے جھرمٹ میں کسی شہزادے کے چہرے کی طرح دمکتے طباق چاند کی پراسرار روشنی میں مجھے الاؤ کے گرد بیٹھے چند افراد کے ہیولے نظر آئے اور ان کے قریب ہی اتنی ہی تعداد میں خچر بھی کھڑے دکھائی دیئے۔

میرا دل گویا کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ نس نس میں جوشِ غیظ کی حرارت لاوے کی طرح کھولنے لگی۔ مجھے پورا یقین ہوگیا تھا کہ یہ عالل عاروب اور اس کے ساتھیوں کے سوا کوئی نہیں ہو سکتے تھے۔ تاہم فاصلہ زیادہ ہونے کے باعث میں ان کے چہرے پہچاننے سے قاصر تھا۔ تصدیق ضروری تھی۔ میں برف سے ڈھکی خودرو جھاڑیوں اور درختوں کی آڑ سے فائدہ اٹھاتا ہوا دھیرے دھیرے ان کی طرف بڑھنے لگا۔

جب میں ان کے تقریباً بیس پچیس گز کے فاصلے پر پہنچ کر رکا تو مجھے عالل عاروب اور اس کے پانچوں ساتھیوں سمیت سنکھال بھی نظر آ گیا۔

اپنے دشمنِ دیرینہ کو قریب پا کر میرا دل مارے جوشِ غیظ کے تیزی سے دھڑکنے لگا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں ان پر شب خون مارنے کی سوچتا، اچانک مجھے اپنے عقب سے ایک سنسناتی ہوئی تیز غراہٹ سنائی دی۔ میں بری طرح ٹھٹک کر مڑا۔ میں سرتاپا لرز گیا۔ میں نے اپنے عقب میں صرف چند گز کے فاصلے پر گوشت کے ایک سفید تودے کو کھڑے پایا۔ یہ برفانی ریچھ تھا...... خاصا بھاری بھرکم اور جسیم۔ وہ اپنے دونوں پچھلے پیروں پر کھڑا تھا اور کسی چھوٹے برفانی تودے کی طرح ہی دکھائی پڑتا تھا۔

مجھے ریچھ جیسے درندوں کا تجربہ تھا۔ عموماً یہ انسانوں سے کترایا ہی کرتے تھے۔ مگر بعض شرارتی اور ضدی یا بھوک کے مارے ہوئے ریچھ بسا اوقات مقابلے پر بھی اتر آتے تھے۔ مگر میں اس نازک وقت میں اس سے مقابلے کا بہرحال متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے اپنے دھڑکتے دل پر قابو پایا اور پھر ریچھ کو مخصوص انداز میں ''ششکارے'' دینے لگا۔ اس احتیاط کے ساتھ کہ پڑاؤ کی جانب بیٹھے دشمنوں تک آواز نہ جائے۔ ان کی شاید ابھی تک ریچھ پر نگاہ نہیں پڑی تھی۔

تب پھر اچانک میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے اُبھرا۔ میں اگر عالل عاروب سمیت اس کے ساتھیوں کو ریچھ کی جانب متوجہ کر دیتا تو وہ یقیناً اس سے اُلجھ جاتے اور میں اپنا کام بھی باآسانی نمٹا سکتا تھا۔

مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی۔ ریچھ نے شاید چند گز کے فاصلے پر اپنے سامنے الاؤ کی روشنی دیکھ لی تھی۔ وہ آہستگی سے اپنے چاروں پیروں پر جھکا اور ڈولتا، دوڑتا پڑاؤ کی طرف لپکا۔ میرے ہونٹوں پر معنی خیز

مسکراہٹ عود کر آئی۔

ریچھ اور انسان کا پرانا ٹکراؤ ہے۔ وہ انسان کا دوست بننے میں بھی دیر نہیں لگاتا اور دشمن بننے میں بھی۔ عموماً انسانوں کے پڑاؤ میں اسے اپنی خوراک کی خاطر خواہ موجودگی کی توقع ہوتی ہے اور اس ریچھ نے بھی شاید اسی لئے ادھر کا رخ کیا تھا۔ مگر راہ پاتے ہی اس نے اعلانِ جنگ کر دیا تھا۔ تاہم میں نے اسے جیسے ہی گویا ''پروانۂ راہداری'' جاری کیا تو اپنے اصل ''ہدف'' کی طرف بڑھ گیا۔ اب مجھے صرف تماشا دیکھنا تھا۔

میں تھوڑا اور نزدیک سرک آیا۔ اسی وقت میں نے عالل عاروب اور اس کے پانچوں ساتھیوں کو بری طرح بدکتے ہوئے دیکھا۔ ریچھ بڑے دھڑلے کے ساتھ ان کی طرف اپنے بھاری بھرکم وجود کے ساتھ دوڑا جا رہا تھا۔ انہوں نے ریچھ پر فائرنگ کر دی۔ رات کے پُرہول ٹھٹھرتے سناٹے میں ریچھ کی لرزا دینے والی چنگھاڑ اُبھری اور وہ مزید غضب ناک ہو کر ان پر جھپٹ پڑا۔

میں نے عالل عاروب کے دو ساتھیوں کو خونخوار گرفت کے نرغے میں پایا۔ اور پھر چشم زدن میں غضب ناک ریچھ نے اپنے تیز نوکیلے پنجوں سے ان دونوں کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔ ان کے حلق سے برآمد ہونے والی چیخوں نے ماحول کو دہلا کر رکھ دیا تھا۔

عالل عاروب اور اس کے باقی تینوں ساتھیوں پر دہشت ناک بوکھلاہٹ طاری ہوگئی تھی۔ یقیناً اتنے بڑے جسیم اور خونخوار ریچھ کو اچانک اپنے سامنے پا کر ان کی یہی کیفیت ہونی تھی۔ اور کچھ غلط بھی نہ تھی۔ اچھے اچھے شکاری بھی اس اچانک سچویشن پر بدحواس ہو جاتے تھے۔

البتہ انہوں نے ریچھ پر فائرنگ ترک نہ کی تھی۔ ریچھ کے جسم پر شاید کچھ زیادہ ہی موٹی چربی چڑھی ہوئی تھی اور یوں بھی میں جانتا تھا کہ جس ہلکی ساخت کے ہتھیاروں سے یہ لوگ اتنے بڑے درندے کو نشانہ بنا رہے تھے، وہ اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ ہاں، اگر اس کی تھوتھنی پر دو چار اوپر تلے گولیاں داغی جاتیں تو اور بات تھی۔ مگر یہاں تو مسئلہ یہ تھا کہ بلی کی گردن میں گھنٹی کون باندھے؟

میں بڑی دلچسپی کے ساتھ ریچھ اور انسانوں کی یہ جنگ دیکھ رہا تھا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے میں نے سوچا کہ ریچھ کا ''کام'' آسان کر دینا چاہئے۔

چنانچہ میں نے اپنی رائفل سیدھی کی اور سب سے پہلے عالل عاروب کے دو ساتھیوں کو نشانے پر لیا اور لبلبی دبا دی۔ گولیوں کا برسٹ دھماکے سے بوچھاڑ کی صورت اُنڈا اور میں نے دونوں کو کربہ چیخیں مار کر تڑپتے دیکھا۔ عالل عاروب اور سنکھال کے اچانک اس دوسری افتاد پر ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ پھر عالل عاروب اور سنکھال نے ریچھ کو چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کی تو ریچھ ان کی طرف دوڑا۔ یہ دیکھ کر میں نے بھی ان کے تعاقب میں دوڑ لگا دی۔

ان دونوں نے جب ریچھ کو اپنے تعاقب میں آتے دیکھا تو سنکھال نے فوراً اپنی سمت بدل ڈالی۔ میں نے دوڑتے دوڑتے دیکھا کہ ریچھ اب عالل عاروب کے تعاقب میں تھا اور بہت غضب ناک ہو رہا تھا۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے عالل عاروب کا پاؤں رپٹا اور وہ گر پڑا۔

ریچھ اس کے سر پر پہنچ چکا تھا اور خود میں بھی۔ مگر میں نے عالل عاروب کو چھوڑ کر سنکھال کا نشانہ لیا، اس کی ٹانگ کا نشانہ لے کر میں نے ایک گولی داغ دی۔ وہ چیخ مار کر گرا اور گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ ادھر ریچھ کے خونی پنجوں سے بچنے کے لئے عالل عاروب اپنی کہنیوں اور پشت کے بل پیچھے پیچھے کھسک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بلا کی دہشت طاری ہوگئی تھی۔ پھر اس کی مجھ پر بھی نگاہ پڑ گئی تھی۔ وہ لرزتی آواز میں مجھ سے التجا کرتے ہوئے بولا۔

''نن.........نادر!.........مم......... مجھے اس درندے سے بچالو.........بچالو مجھے۔''

میں زور سے چلاّ کر بولا۔ ''تمہارا یہی انجام ہونا چاہئے تھا۔ اب آواز دو اپنے جھوٹے دیوتا دابولا میزی کو کہ جس کی بھینٹ تم ایک بے گناہ اور معصوم لڑکی کو چڑھانے والے تھے۔

''مم......... مجھے معاف کر دو۔ مم......... مجھے معاف کر دو۔'' وہ معافیاں مانگنے لگا۔ مگر ریچھ اپنے پورے بھاری بھرکم پہاڑ جیسے وجود کے ساتھ اس پر چڑھ دوڑا اور پھر اپنے نوکیلے شکاری دانتوں اور تیز پنجوں سے اسے نوچنے، بھنبھوڑنے لگا۔ عامل عاروب کے حلق سے برآمد ہونے والی چیخیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ اور پھر ریچھ کا سفید تھوتھنا اور پنجے عامل عاروب کے ناپاک خون سے رنگین ہو گئے۔ ریچھ نے اسے بری طرح بھنبھوڑ ڈالا تھا۔

عامل عاروب کے جہنم واصل ہونے کا یقین کرنے کے بعد میں سنکھال کی جانب متوجہ ہوا جو میری چلائی ہوئی گولی سے زخمی ہو چکا تھا۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں بری طرح چونک پڑا۔ وہ زمین پر لیٹے لیٹے قریب گری ہوئی اپنی رائفل اٹھانے کے لئے اس کی جانب رینگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ادھر میں نے جیسے ہی اس کی جانب قدم بڑھایا تو ریچھ ایک لرزا دینے والی چنگھاڑ کے ساتھ میری طرف متوجہ ہوا۔

میں یک دم اپنی جگہ پر رک گیا۔ میں نے ریچھ پر گولی چلانے کی سردست ''بے وقوفی'' نہیں کی تھی اور اسی طرح کھڑا رہا۔ ٹھیک اسی وقت سنکھال نے یہ بے وقوفی کر ڈالی کہ اس نے اپنی رائفل پر قبضہ جماتے ہی مجھ پر گولی چلا دی۔ میں اگر بروقت زمین پر نہ لیٹ جاتا تو یہ گولی میرا کام تمام کر ڈالتی۔

ریچھ غضب ناک ہو کر سنکھال کی طرف پلٹا۔ میں تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ریچھ میرے آخری اہم شکار کا بھی عامل عاروب جیسا حشر کرے۔ چنانچہ ادھر جیسے ہی ریچھ نے سنکھال کی طرف دوڑ لگائی، اس نے دہشت زدہ ہو کر ریچھ پر فائرنگ کر ڈالی۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ سنکھال اس کا شکار بن جائے۔ کیونکہ میں اسے زندہ اپنی گرفت میں لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں اپنی رائفل سے ریچھ کے تھوتھنے کا نشانہ بنانے کی کوشش کرنے لگا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی پیٹھ میری جانب تھی۔

میں نے چلاّ کر سنکھال سے کہا۔ ''میری طرف رخ کر کے دوڑو۔ تاکہ میں اس کا نشانہ لے سکوں۔ ورنہ مارے جاؤ گے۔''

میری بات پر سنکھال نے ایسا ہی کیا اور لنگڑاتا ہوا میری جانب دوڑنے لگا۔ اس کی رائفل خالی ہو گئی تھی۔ جسے اس نے پھینک دیا تھا۔ ریچھ اس کے تعاقب میں ذرا مڑا تو اس کا لمبوترا تھوتھنا میرے نشانے پر آ گیا۔ میں نے لبلبی دبا دی۔ گولیوں کا پورا برسٹ ریچھ کے تھوتھنے پر پڑا اور وہ آخری غضب ناک چیخ مار کر وہیں برف پر ہی ڈھیر ہو گیا۔

❄❄❄

اس خوف ناک اور زبردست ہنگامے کے بعد ماحول پر ایکا ایکی پراسرار سناٹا طاری ہو گیا تھا۔

سنکھال نے اپنی زخمی ٹانگ پر برف لگا لی تھی جس سے کسی حد تک خون بہنا بند ہو گیا تھا۔ وہ ہانپ رہا تھا اور عجیب وغریب وحشت ناک نظروں سے اپنے ساتھیوں اور بالخصوص قریب پڑی نچی ہوئی عامل عاروب کی لاش کو دیکھ رہا تھا۔

سنکھال متذکرہ بالا ان لوگوں میں سے تھا جسے میری زبان آتی تھی۔ مگر اس وقت وہ اپنا سر عجیب انداز میں ہلاتے ہوئے اپنی ہی بولی میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کہہ رہا ہو، یہ سب بہت برا ہوا۔

پھر وہ میری جانب متوجہ ہوا۔ اس کے چہرے پر خونخواری اور نفرت کی گہری پرچھائیاں اُبھر آئی تھیں۔ مجھ سے بولا۔

''تم ہم سب کے لئے واقعی بہت خطرناک ثابت ہوئے ہو۔ بہت خطرناک.........لیکن اب تمہارا اہم دشمن عامل عاروب تو ختم ہو چکا۔ اب میرا کیا کرو گے؟......... مجھے جانے دو۔''

''خبردار! یہاں سے ذرا بھی ہلنے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ گولیوں سے بھون کر رکھ دوں گا۔''

میں نے اسے گھورتے ہوئے غرا کر کہا تو میں نے دیکھا ایکا ایکی اس کے ہونٹوں پر پراسرار مسکراہٹ عود کر آئی۔ مجھے اس کمبخت کی مسکراہٹ زہریلی لگی۔ وہ قامت میں مجھ سے دبتا ہوا ضرور تھا مگر جسم توانا تھا۔ اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں غضب کا کینہ بھرا پڑا تھا۔

''تم مجھے نہیں مار سکتے نادر!.........اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم مجھے کیوں نہیں ہلاک کرنا چاہتے۔ مجھے عاروب نے بتا دیا تھا۔''

''ہاں.........تم نے بالکل درست کہا۔'' یہ کہہ کر میں دانت پیس کر اس کی جانب بڑھا اور اپنی رائفل کو نال سے پکڑ کر لٹھ کی طرح گھما کر اس کی کنپٹی پر رسید کر ڈالا۔ وہ کریہہ چیخ کے ساتھ ڈھیر ہو گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا اور اس کے بے سدھ وجود کو اپنے کاندھے پر ڈال کر واپسی کے سفر پر ہو لیا جدھر میری جیپ کھڑی تھی۔

جیپ زیادہ دور نہ تھی۔ میں رات کی تاریکی کے پچھلے پہر اس مقام تک پہنچا جدھر میری جیپ کھڑی تھی۔ میں نے بے ہوش سنکھال کو جیپ کے عقبی حصے میں پٹخا اور پھر اس کے ہاتھ پاؤں مضبوط رسّی کے ساتھ باندھ کر میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور رائفل اپنے برابر والی سیٹ پر رکھ دی۔ پھر اگنیشن میں لگی ہوئی چابی گھمائی۔ مگر جیپ اسٹارٹ نہ ہوئی۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ سخت کڑکڑاتی سردی میں خاموش پڑے پڑے انجن واقعی ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

میں نے جھلا کر اسٹیئرنگ پر دو ہتڑ رسید کر ڈالے۔ تب پھر اچانک ایک مختصر اور نشیبی ڈھلان کو دیکھ کر میرے ذہن میں ایک اچھوتا خیال اُبھرا۔ میں جیپ سے اُترا اور اپنے وجود کی ساری طاقت اپنے دونوں بازوؤں میں سمو کر جیپ کو دھکا لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ جیپ تھوڑا سرکی اور چیونٹی کی رفتار سے گھسٹتی رینگتی ہوئی ڈھلان کے قریب جا پہنچی۔ اور جیسے ہی اس کے اگلے دونوں ٹائر ڈھلان سے ذرا نیچے اترے تو میں یکدم چھلانگ لگا کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا اور جلدی سے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ جیپ ڈھلان سے نیچے کی طرف تیزی سے اُترنے لگی تو میں نے فوراً سیلف لگا کر کلچ دبایا اور گیئر ڈال کر کلچ پلیٹ سے پاؤں ہٹا دیا۔ جیپ کو ایک دھچکا لگا اور پھر اس کا انجن یکدم غرا کر اسٹارٹ ہو گیا۔

ڈھلان سے اترنے کے بعد میں نے جیپ واپسی کی طرف موڑ لی اور مناسب رفتار سے آگے بڑھانے لگا۔ میری کیلاش وادی کی مہم بالآخر کامیابی سے ہمکنار ہو چکی تھی۔ میں اب آگے کی سوچ رہا تھا۔ میں نے چترال تک اس جیپ کو استعمال کرنے کا ارادہ باندھ رکھا تھا۔ سنکھال کو ان حالات میں میرا پنڈی تک لے جانا مناسب نہ تھا۔ اس کے لئے مجھے بہرحال چترال کے پولیس ڈیپارٹمنٹ سے مدد حاصل کرنا تھی اور وہیں میں نے انکل اعظم خان وغیرہ سے رابطہ کر کے اپنی خیریت اور کامیابی کی اطلاع دینا تھی۔

میں دشوار گزار راستوں پر مسلسل سفر کرتا ہوا بالآخر ''ریمبور'' کے راستے کیلاش وادی سے نکل آیا اور اب چترال کی سمت اُڑا جا رہا تھا۔

سنکھال کو ہوش آ گیا تھا اور اپنے رسن بستہ ہونے کے باوجود اس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا تھا۔ مگر میں

تو جیسے اس کی طرف سے بہرہ بن چکا تھا۔ اس ویرانے میں اس کی چیخیں بھلا کون سننے والا تھا۔ بالآخر دن کی روشنی پھیلنے تک میں نے سیدھا قریبی پولیس اسٹیشن کا رخ کیا۔

وہاں کا تھانہ انچارج بھلا مانس تھا۔ میں نے اسے ساری کتھا سنا ڈالی اور ساتھ ہی میں نے اس سے فون کی اجازت بھی طلب کر لی جو اس نے مجھے دے دی۔ میں نے سب سے پہلے انکل اعظم خان سے ہی رابطہ کرنا ضروری سمجھا۔ انہیں مختصراً ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ ذرا دیر بعد انکل اعظم نے ایس پی ظہیر قریشی کی مدد سے تھانہ انچارج انسپکٹر بہرام بزدار کو ہدایات دلوا دیں۔

اس کے بعد بھلے مانس انسپکٹر بہرام نے جیپ اپنی کسٹڈی میں لے لی اور سنکھال کو ہتھکڑیاں پہنا دیں۔ پھر وہاں سے ہمیں اسلام آباد روانہ کرنے کے انتظامات بھی اس نے کئے۔

انکل اعظم خان کی وجہ سے باقی سارے کام آسان ہوتے چلے گئے تھے اور میں سنکھال کے ساتھ اسلام آباد ایئرپورٹ پر اترا۔ وہاں متعلقہ تھانے کی پولیس کے ہمراہ انکل اعظم خان، نگینہ اور ماں بھی میرے استقبال کے لئے موجود تھے۔

ماں نے مجھے گلے لگایا۔ نگینہ نے پُرمسرت نگاہوں سے میرا استقبال کیا۔ اس کے بعد ہم سب پولیس کے مختصر قافلے کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

بعد میں ماں اور نگینہ کو میں نے واپس گرین لاج روانہ کر دیا۔ جبکہ میں اور انکل اعظم خان ضابطے کی کارروائی نمٹانے متعلقہ تھانے کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایس پی ظہیر قریشی صاحب بھی بہ نفسِ نفیس ہمارے ساتھ تھے۔

مکش پور کی مذکورہ بستی کے سردار زور اور خان سے رابطہ کیا جاتا رہا۔ انکل اعظم خان نے یہاں پہنچ کر یہ عقل مندی کی تھی کہ سردار زورآور خان کے بھائی وزیر ان کی لاش بذاتِ خود ان کے حوالے کرنے کی بجائے ایس پی ظہیر کی معرفت اس تک پہنچائی تھی اور اس کے ساتھ ایک خصوصی نشست کے دوران ساری باتیں گوش گزار کر ڈالی تھیں۔ مگر سردار زورآور خان کی ایک ہی ہٹ تھی کہ جب تک اس کے بیٹے شہ زور کے قاتل کو وہ سامنے نہ دیکھ لے اور مزید یہ کہ اس کی بیٹی شہزادی اپنے بھائی کے قاتل کو نہ پہچان لے، وہ کسی بات کو تسلیم نہیں کرے گا۔ چنانچہ ہم نے سنکھال کو ساتھ لیا اور پولیس کی جمعیت کے ساتھ مکش پور پہنچے۔

سردار زورآور خان مجھے دیکھ کر چراغ پا ہو گیا تھا مگر جب میرے ساتھ سنکھال کو دیکھا تو فوراً اپنی بیٹی شہزادی کو طلب کیا۔ شہزادی قاتلانہ حملے اور اپنے جوان بھائی شہ زور کو قتل کرنے والے سفاک انسان سنکھال کو دیکھ کر فوراً چیخ پڑی۔ تب کہیں جا کر میری طرف سے سردار زورآور خان کا ابال کچھ سرد ہوا تو سنکھال کی حوالگی کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔

”یہ ہمارا مجرم ہے۔ اسے ہمارے حوالے کرنا ہو گا۔ اسے ہم خود سزا دیں گے۔“ سردار زورآور خان نے آخر میں ایس پی ظہیر قریشی صاحب سے کہا۔

میں اور انکل اعظم خان خاموش تھے۔ ایس پی صاحب نے بردبارانہ لہجے میں اس سے کہا۔

”دیکھئے سردار صاحب! آپ لوگ اسٹیٹ سے باہر نہیں ہیں۔ اور دوسری بات جو سب سے اہم ہے وہ یہ کہ یہ آپ کا قبائلی جھگڑا بھی نہیں تھا۔ سنکھال ایک غیر معروف گروہ سے تعلق رکھتا تھا جس کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ یہ وادی کیلاش سے تعلق رکھتا تھا اور نہ ہی اس کی آپ سے کوئی دشمنی تھی۔ مگر بہر حال یہ قانون کا اور آپ کا مجرم ہے۔ اسے کڑی سے کڑی سزا دلوانے کا میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں اس پر نہ صرف آپ کے بیٹے کے قتل کی فرد جرم عائد ہو گی بلکہ آپ کی بیٹی شہزادی پر قاتلانہ حملے سمیت آپ کے بھائی وزیر خان

مرحوم کا قتل بھی اسی کے سر جائے گا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔ بہ صورت دیگر اگر آپ نے قانون کی راہ میں روڑے اٹکانے کی کوشش کی تو ہو سکتا ہے اس کا فائدہ آپ سے زیادہ مجرم سنکھال کو ہو جائے اور آپ بھی بلاوجہ سرکار سے ٹکر لے کر معتوب ٹھہریں گے۔“

ایس پی ظہیر قریشی صاحب کی بات پر سردار زور آور کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے دیگر امراء و مشیروں سے صلاح مشورہ کیا، اس کے بعد چپ سادھ لی۔

میرے سر سے بوجھ اتر گیا۔ میں خود کو بالکل ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے اب میرے نامساعد حالات کے سمندر میں تیرتی ہوئی بے پتوار ناؤ کو ایک کنارہ، ایک ساحل ملنے والا تھا جہاں خوشیاں تھیں، بے پایاں مسرتیں تھیں۔ یا شاید یہ میرا وہم تھا۔ کچھ ایسا لگتا تھا کہ میری خوشیوں اور مسرتوں پر کوئی بڑا مگر خاموش طوفان ایک اور شب خون مارنے کے لئے تیار تھا۔

گرین لاج میں ماں اور نگینہ بے چینی کے ساتھ ہماری منتظر تھیں۔ شاہ میر کو ماں نے ایک الگ کمرہ دے رکھا تھا اور نگینہ بھی وہیں رہتی تھی۔

ہم نے بڑے عرصے بعد اپنی کامیابی کا جشن منایا۔ اور مجھے یوں لگا جیسے گرین لاج سے عرصے سے روٹھی ہوئی خوشیاں دوبارہ لوٹ آئی تھیں۔

میں، ماں اور نگینہ بہت خوش تھے۔ میں سمجھتا تھا ماں نے شاہ میر کے سلسلے میں دشمنی کی ایک نئی مثال قائم کی تھی اسے معاف کر کے اور کڑے وقت میں اسے اور اس کی بیٹی کو اپنے ہاں پناہ دے کر.........مگر نگینہ بھی ماں کے اس حسن سلوک سے ازحد متاثر ہوئی تھی۔ بہر طور نگینہ نے اب اپنے گھر جانے کی فرمائش کر ڈالی۔

”لو بیٹی! تم گھر جانے کی بات کر رہی ہو۔ میں تو تمہیں اپنی بہو بنا کر یہاں لانا چاہتی ہوں۔“ ماں نے نگینہ کے سر پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے ملائمت سے کہا تو اس کا چہرہ شرم کے مارے گلنار ہو گیا۔ تاہم وہ سر جھکا کر ماں سے بولی۔

”ماں جی! اب تو آپ ہی میری ماں ہیں۔ لیکن مجھے اپنے گھر تو جانا ہے.........ابھی یہاں رہنا اچھا نہیں لگتا۔“

”لیکن بیٹی! میں تو تمہیں یہ مشورہ دوں گی کہ اپنے انکل اعظم خان کے ہاں رہ لو۔ صرف چند دنوں کی تو بات ہے۔ میں اور نادر تمہیں عنقریب منگنی کی انگوٹھی پہنانے آ جائیں گے۔“

ماں نے بڑے پیار سے کہا تو بے اختیار انکل اعظم خان بھی نگینہ کے سر پر ازراہِ شفقت ہاتھ رکھتے ہوئے دھیرے سے بولے۔

”ہاں بیٹی! اب تم ہمارے لئے غیر تھوڑی ہو؟.........ہم سب تمہارے اپنے ہیں۔ تم میری بیٹیوں جیسی ہو۔ دیکھنا میں تمہیں کس طرح ایک باپ بن کر اپنے ہاں سے رخصت کروں گا۔“

باپ کے ذکر پر بے اختیار نگینہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ہم سب اس کی آنکھوں سے اچانک ہی بہہ نکلنے والے ان آنسوؤں کا مطلب سمجھ چکے تھے۔

اچانک کال بیل بجی تو ملازم نے آ کر بتایا کہ کوئی کاشانہ صاحبہ آئی ہیں۔ میں ذرا چونکا۔ نگینہ نے فوراً آنسو پونچھ کر میری طرف دیکھا۔ میں بے اختیار ہولے سے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ اس دوران خود کاشانہ کو دروازے پر جا کر اندر لے آیا۔ کاشانہ حسب معمول اپنے لاابالی لباس میں تھی۔ یعنی ینگی اسٹائل کی شرٹ اور نیچے بلیو جینز، پیروں میں جوگر۔ وہ بہت نکھری نکھری اور اُجلی نظر آ رہی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ میں نے جب نگینہ کا تعارف کروایا تو وہ بے اختیار خوشی سے بے قابو

ہو کر اس کی طرف بڑھی اور اسے گلے لگا لیا۔ نگینہ بے چاری ابھی تک حیران پریشان نظروں سے کبھی کاشانہ کو اور کبھی مجھے تکے جا رہی تھی۔

تب پھر میں نے نگینہ سے مختصراً الفاظ میں کاشانہ کا تعارف کروا دیا۔

''نگینہ! میری بہن!.........خبردار، کسی غلط فہمی کا شکار مت ہونا۔ نادر صاحب میرے اچھے دوست ہیں اور بس۔''

کاشانہ نے حسب عادت نگینہ سے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ بے اختیار نگینہ ہنس پڑی۔

''اللہ جانتا ہے، آج مجھے تمہیں اور نادر کو ساتھ دیکھ کر کس قدر خوشی ہو رہی ہے۔'' کاشانہ نگینہ کو خود سے لگاتے ہوئے خلوصِ دل سے بولی۔ ''یو آر ریئلی اے لکی گرل۔ نادر جیسا بہادر اور پیار کرنے والا انسان تمہارا شریک حیات بننے والا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ مجھ سے بولی۔ ''نادر صاحب! اپنی اور نگینہ کی شادی کی تاریخ مجھے ضرور بتایئے گا۔ میں ایک مہینے پہلے ہی یہاں آ کر ڈیرا جما لوں گی۔ میں اپنی بہن نگینہ کی ہر رسم میں شریک رہنا چاہتی ہوں۔ بلکہ ہم دونوں شادی کی شاپنگ بھی اکٹھے ہی کریں گے۔''

وہ اپنی رو میں کہتی جا رہی تھی اور میری نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ جانے کیوں مجھے اس کا چہرہ تہہ در تہہ نظر آیا۔ اوپر چہرے سے خوشی کے سوتے پھوٹ رہے تھے جبکہ اس کی تہہ میں ان کہے درد کی دراڑ سی پڑی محسوس ہوتی تھی۔ جسے غالباً صرف میری ہی نظریں بھانپ رہی تھیں۔

کاشانہ کے اچانک آ جانے سے ایک بار پھر محفل گرم ہو گئی تھی۔ مزید ایک ڈیڑھ گھنٹہ کاشانہ کے ساتھ باتوں میں گزر گیا۔ وقت کے بیتنے کا اندازہ ہی نہ ہو سکا۔ نگینہ بھی اب اس کے ساتھ اس مختصر عرصے میں خاصی گھل مل گئی تھی۔

کاشانہ نے جانے کی اجازت لی تو محفل برخواست ہوئی۔ اس کے جاتے ہی انکل اعظم بھی رخصت ہونے لگے تو نگینہ نے بھی جانے کی اجازت لی اور انکل سے استدعا کی کہ اسے گھر تک ڈراپ کر دیں۔

نگینہ کی بات پر ہم چونکے۔ البتہ انکل نے نگینہ سے کہا۔ ''نہیں بیٹی! تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا۔''

''نہیں انکل! میں اپنے گھر جاؤں گی، پلیز!'' نگینہ نے بڑے رسان سے اصرار کیا تو ہم بھی چپ ہو رہے۔ تاہم میں نگینہ کو پنڈی تک چھوڑنے کے لئے تیار ہوا تو انکل اعظم خان نے کہا۔

''نہیں بیٹا! میں چھوڑ دوں گا.........کوئی مسئلہ نہیں۔''

مگر میں نہیں مانا۔ چنانچہ میں نے نگینہ اور شاہ میر کو اپنی جیپ میں سوار کرایا۔ شاہ میر واقعی زندہ لاش کی مثل تھا۔ اپنے جسم کے ایک ذرا سے وجود کو بھی وہ جنبش دینے سے قاصر تھا۔ ماسوائے آنکھوں کی پتلیوں کے۔ اب پتہ نہیں اس کی یادداشت بھی لوٹی تھی کہ نہیں۔ اور اگر لوٹ آئی تھی تو اسے ہمارے درمیان ضرور حیرت ہو رہی ہو گی۔

میں نگینہ کو لے کر پنڈی روانہ ہو گیا۔

دو ڈھائی گھنٹوں کے اندر اندر ہم پنڈی پہنچ گئے۔ میں نے بہ خیر و عافیت نگینہ کو اس کے باپ سمیت ان کی رہائش گاہ پر چھوڑا اور پھر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

میں اب نظر حیات کے سلسلے میں حکمت عملی تیار کرنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا وہ ایک زخمی سانپ کی طرح میری تاک میں ہو گا۔ میں یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ اسے اور اس کے سپولیے بیٹے کبیر کو اب تک یقیناً ہمارے بارے میں علم ہو چکا ہو گا۔ اگلے روز مجھ سے نگینہ نے فون پر رابطہ کیا۔

''نادر! انکل نظر حیات اور کبیر آئے تھے، مجھ سے ملنے۔''

میں بری طرح چونکا۔

''کیا کہہ رہے تھے وہ دونوں خبیث؟.........تمہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا انہوں نے؟'' میں نے ی فکرمندی سے پوچھا۔

''نہیں۔'' وہ بولی۔ تاہم اس کی آواز میں گھبراہٹ کا ارتعاش موجود تھا۔ ''مجھ سے ملنے آئے تھے اور ریت پوچھنے۔ دوبارہ پھر آئیں گے نادر!.........'' وہ اچانک کچھ کہتے کہتے رکی تو میں نے فوراً اس کی یشانی بھانپ کر پوچھا۔

''مگر کیا؟.........کوئی دھمکی تو نہیں دی ان خبیثوں نے تمہیں؟''

''نہیں.........ایسی بات تو نہیں تھی۔ لیکن.........انکل نظر حیات نے.........شاید میرا خیال غلط ہو، ہوں نے باتوں باتوں میں مجھ پر یہ جتانے کی کوشش کی تھی کہ اب میں انہیں ہی اپنا باپ سمجھوں۔ مزید یہ وہ مجھے اپنی بہو بنانے کا بھی اشارہ دے رہے تھے۔''

''کتا.........ذلیل.........خبیث!'' میں نے غضب ناک انداز میں نظر حیات کو گالیاں دے ڈالیں۔ ''تم نے ان کی حوصلہ افزائی تو نہیں کی؟''

''نہیں.........میرا رویہ شروع سے سرد رہا تھا۔ میں بھلا یہ کیسے بھول سکتی ہوں کہ کبیر نے تمہارے ساتھ مجھے بھی اپنے ساتھی کالا ناگ کے ذریعے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔'' نگینہ نے بھی تلخی سے کہا۔

میری طرح وہ کیلاش وادی کی وہ پہلی مہم نہیں بھولی تھی، جب میں اور نگینہ جہنم واصل عامل عاروب کے نرغے میں تھے اور اس وقت کبیر نے کالا ناگ کے ساتھ وہاں ہم پر حملہ کیا تھا اور ہم دونوں پر بے دریغ گولیاں برسانے کی ٹھانی تھی۔

''دیکھو نگینہ!'' میں نے اپنے طیش اور ابال پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''نظر حیات اور کبیر سے تم زیادہ الجھنے کی کوشش مت کرنا۔ میں اس سے نمٹتا ہوں.........میری طرف سے ڈھیل ملنے پر وہ دونوں شاید اپنی وقات بھول گئے ہیں۔''

اس کے بعد رابطہ منقطع ہو گیا۔ تاہم میں نے نگینہ کو ہدایت کر دی تھی کہ جس وقت وہ دونوں دوبارہ آنے کے پروگرام سے آگاہ کر دیں تو وہ مجھے بتا دے۔ میرا پورا وجود غیظ و غضب کی آگ میں پھنکنے لگا۔ مجھے نظر یات اور کبیر کی اس جرأت پر حیرت بھی ہو رہی تھی۔ میرے دل میں تو آئی کہ اسی وقت نظر حیات کے ہاں پہنچ کر اس کی گردن مروڑ ڈالوں اور دیگر قضیوں کی طرح یہ آخری قضیہ بھی نمٹا دوں۔ مگر اب میں قانون کو ہاتھ میں لے کر اپنے آخری اور اہم ترین دیرینہ دشمن کو کوئی موقع فراہم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ غفورے کے جہنم واصل ہونے کے بعد سے میری اور ماں کی قانونی پوزیشن مستحکم ہو گئی تھی جس کے بعد نظر حیات اور نفی، تعصب اور احساسِ کمتری کا مارا ہوا انسپکٹر اعجاز شمس اپنا سا منہ لے کر رہ گئے تھے اور میں انہیں دوبارہ موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ انکل اعظم خان نے بھی مجھے یہی تلقین کی تھی۔

میں نے اب ان دونوں کینہ پرور باپ بیٹے سے اس وقت ہی نمٹنا مناسب جانا تھا جب وہ دوبارہ نگینہ کے ہاں آنے والے تھے۔

مجھے ان دونوں باپ بیٹے کی ڈھٹائی پر حیرت ہو رہی تھی۔ آخر یہ دونوں کس منہ سے اور کس برتے پر نگینہ سے ملنے آئے تھے؟ حتیٰ کہ نظر حیات نے اشاروں کنایوں میں نگینہ کو اپنی بہو کا بھی عندیہ دے ڈالا تھا۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی کہ کبیر نے نگینہ کو ہلاک کرنے کی مذموم کوشش بھی کی تھی۔ نگینہ کو تو اب کبیر

سے ہی نہیں نظر حیات سے بھی شدید نفرت ہو چکی تھی۔ مزید یہ کہ ان دونوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ نگینہ درحقیقت مجھ سے شادی کی خواہاں تھی۔

ٹھیک ایک دن بعد ہی شام چار بجے نگینہ کی مجھے اپنے ٹال پر کال موصول ہوئی کہ نظر حیات اور کبیر چھ بجے شام اس کے ہاں پہنچنے والے ہیں۔ میں اسی وقت اپنی جیپ میں سوار ہوا اور پنڈی جا پہنچا۔

میں جب وہاں پہنچا تو مجھے خاصی تاخیر ہو چکی تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ راستے میں دو بار میری جیپ خراب ہوئی تھی۔

میں وہاں پہنچا تو دونوں باپ بیٹا نگینہ کے ہاں تھے۔ نگینہ کو میں نے سخت طیش میں پایا تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اب نظر حیات اور کبیر مجھے دیکھ کر کچھ پریشان اور بے چین سے ہو گئے تھے۔

میں نے ایک تیز سنسناتی ہوئی نظر ان دونوں باپ بیٹے کے چہروں پر ڈالی اور اچانک میری نگاہ قالین پر گری ایک سونے کی انگوٹھی پر پڑی جس میں ہیرا جگمگا رہا تھا۔ ایک جانب چھوٹی سی سرخ رنگ کی مخملی ڈبیہ بھی پڑی تھی۔ یہ دونوں چیزیں نظر حیات اور کبیر کے قدموں کے قریب پڑی ہوئی تھیں۔ کبیر نے جلدی سے یہ دونوں اچک لیں۔

"نگینہ! یہ سب کیا ہے؟......... ان دونوں نے یہاں آنے کی جرأت کیسے کی؟" میں نے ان دونوں کی طرف بدستور گھورتے ہوئے دانستہ نگینہ سے پوچھا تو وہ تلخ لہجے میں جواباً مجھ سے بولی۔

"یہ مجھے انگوٹھی پہنانے آئے تھے۔"

میں بھنا کر رہ گیا۔ اور استہزائیہ نظروں سے دونوں کی طرف دیکھ کر بولا۔

"اچھا......... بلی کو ابھی تک خواب میں چھیچھڑے نظر آ رہے ہیں۔" میں نے ان دونوں سے سردست بات بھی نہ کرنے کی کوشش کی اور نگینہ سے پوچھا۔ "تم نے انہیں کیا جواب دیا ہے؟"

جواباً نگینہ بھی ان دونوں کی طرف دانت پیستے ہوئے دیکھ کر بولی۔

"فی الحال تو میں نے انہیں زبانی جواب دے دیا ہے کہ یہ دوبارہ یہاں آنے کی جرأت نہ کریں۔ اس کے باوجود یہ دونوں بے غیرت باپ بیٹا یہاں بیٹھے ہوئے ہیں؟"

"نادر! زبان سنبھال کر بات کرو۔" کبیر اپنی بے عزتی کے احساس تلے چراغ پا ہو کر بولا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اس کی جرأت پر ششدر رہ گیا۔ البتہ نظر حیات مجھ سے اب تک بری طرح خائف نظر آ رہا تھا۔ میں کبیر کو قہرناک نظروں سے گھورتا ہوا چند قدم اس کی جانب بڑھا اور ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔

"اگر تم اس وقت یہاں نگینہ کے گھر نہیں ہوتے تو میں تم دونوں خبیث باپ بیٹا کو اس سے زیادہ بے عزتی کر کے یہاں سے دھکے دے کر نکالتا۔ تمہیں جرأت کیسے ہوئی یہاں قدم رکھنے کی؟......... تم تو نگینہ کی جان کے دشمن بنے ہوئے تھے۔"

"وہ سب تمہاری وجہ سے تھا۔" وہ بولا۔

"گیٹ آؤٹ......... گیٹ آؤٹ......... یہاں سے اپنی منحوس صورتیں لے کر فوراً دفع ہو جاؤ۔ ورنہ........." میں غصے سے بے قابو ہو کر مٹھیاں بھینچتے ہوئے بولا۔

"چلو بیٹے!......... چلو......... یہاں سے۔" فوراً ہی نظر حیات نے اپنے بیٹے کا بازو پکڑا اور دونوں وہاں سے کھسک گئے۔

"مجھے تو اب ان دونوں سے ڈر لگنے لگا ہے۔" ان کے دفعان ہوتے ہی نگینہ نے مرتعش لہجے میں مجھ سے کہا تو میں اس سے بولا۔

"یہ دونوں ہمارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔ تم دیکھنا، میں ان دونوں کا بہت برا حشر کرنے والا ہوں۔"

نگینہ کو کچھ حوصلہ ہوا۔ ہم دونوں صوفے پر بیٹھ گئے۔ میں نے نگینہ سے کہا۔

"نگینہ! ماں تمہیں انگوٹھی پہنانے کے لئے آنے والی ہیں۔"

اس نے میری طرف مسکرا کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر حیا کی سرخی تھی۔ پھر اس کے گداز ہونٹوں نے جنبش کی۔

"تمہیں بہت جلدی ہو رہی ہے؟" اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

"ہاں نگینہ!" میں نے ایک گہری ہمکاری لی۔ "درحقیقت میری اب تک کی زندگی میں برائے نام ہی خوشیاں رہی ہیں۔ اور میری ماں........." میں نے تھوڑا توقف کیا۔ شاید میرے حلق میں کرب کی رقت اتر آئی تھی۔ "ماں بے چاری کی تو ساری زندگی دکھوں اور مصائب سے ہی عبارت رہی ہے۔" میں نے کرب کی نمی کو محسوس کرتے ہوئے نگینہ کی طرف دیکھ کر گمبھیر لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"نگینہ! یہ تصور صرف میں ہی کر سکتا ہوں کہ ہم دونوں کی شادی پر ماں کے دل کو کس قدر مسرت ہو گی۔ نگینہ! مجھے پورا یقین ہے کہ جب وہ میرے سر پر سہرا دیکھے گی تو یہ خوشی اس کے اب تک کے سارے دکھوں کا درماں بن جائے گی۔ گویا اسے ایک نئی زندگی مل جائے گی۔"

"انشاء اللہ......... ایسا ضرور ہو گا۔" بے اختیار نگینہ نے وفورِ جذبات تلے کہا۔

"نگینہ! ماں منگنی کی اس رسم کو بڑی دھوم دھام سے ادا کرنا چاہتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن میرا خیال ہے تم انکل اعظم خان کے ہاں شفٹ ہو جاؤ تو بہتر ہے۔"

"نہیں نادر!" نگینہ نے دھیرے سے کہا۔ "میں یہیں ٹھیک ہوں۔ میری ایک دور کی رشتے کی خالہ اسلام آباد میں رہتی ہیں۔ میں نے انہیں فون کیا ہے۔ بے چاری سلائی کڑھائی کر کے گزارہ کرتی ہیں۔ مگر وہ بڑی خوددار......... بہرحال میری بات انہوں نے مان لی ہے۔ وہ آج کل میں آنے والی ہیں۔ اور پھر میری سہیلیاں بھی تو ہیں۔ وہ بھی ادھر آ جاتی ہیں۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر میں امی کو منگنی کی تاریخ تو دے دوں نا......... دو روز بعد کی تاریخ چل رہے گی؟"

نگینہ نے اثبات میں ہولے سے اپنا سر ہلا دیا۔

❊❊❊

اس روز منگنی کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہو گئیں۔ میں ماں کا خوشی سے گلنار ہوا چہرہ دیکھ کر پھولے نہ سما رہا تھا۔ نگینہ کی اسلام آباد سے خالہ بھی آ چکی تھیں۔ ان کا نام رحمت خاتون تھا۔ ہم نے ان سے ایک ملاقات بھی کی تھی۔ بھلی مانس اور نیک بزرگ خاتون تھیں۔ ہر وقت تسبیح ہاتھ میں رہتی تھی۔

منگنی کے تیسرے دن شادی کی تاریخ تھی۔ گویا چٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ تھا۔

بالآخر وہ دن بھی آن پہنچا جب میں، ماں اور انکل اعظم کے ساتھ رسم منگنی کے لئے نگینہ کی طرف پنڈی روانہ ہوا۔

میں اور ماں اپنی جیپ میں تھے اور جیپ میں ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ افضل چاچا مرحوم کی بیوہ سکینہ بھی میرے ساتھ تھی۔ جبکہ انکل اعظم خان اور ان کی فیملی اپنی الگ کار میں تھے۔

ہم پنڈی پہنچے تو میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ نگینہ نے اپنی رہائش گاہ کو بڑی خوبصورتی سے سجایا ہوا تھا۔ اس کی رہائش گاہ کسی ہیرے کی مانند جگمگا رہی تھی۔ ایک اکیلی اور تنہا لڑکی کا یہ سارا انتظام اور انصرام

یقیناً حیرت ہی کی بات تھی۔

بہرطور ہمارا استقبال اس کی قریبی، عزیز سہیلیوں اور ان کے والدین نے کیا تھا۔ اگرچہ منگنی کی یہ شاندار رسم کسی ہال وغیرہ میں بھی ہوسکتی تھی۔ مگر اس میں نگینہ کی خواہش کا دخل تھا کہ خوشیوں کے شادیانے اس کے گھر کے درو دیوار کے اندر گونجیں۔ خود اپنی طرح یہ اس کی ایک معصوم خواہش تھی اور مجھ پر تو ظاہر ہے اس کی ہر خواہش کا احترام کرنا لازم تھا۔ جانے کیوں اب میرے دل کو بھی نگینہ کو جلد سے جلد پانے کی خواہش بے چین کرنے لگی تھی۔ نگینہ کا بھی یہی حال تھا۔

گویا عرصہ دراز سے اب دو پیاسے دلوں اور بے قرار نگاہوں کو شب وصل کی گھڑیاں مطلوب تھیں۔ دلِ بے قرار اور نگاہِ تمنا نے بہت جدائیاں جھیلی تھیں۔ اور ان منتظر نگاہوں نے اپنے مقدر کے آسمان کی بے کراں وسعتوں میں اپنی خوش نصیبی کے چاند کو دیکھنے کی بارہا آرزوئیں کی تھیں، بہت دعائیں مانگی تھیں۔ اب یہ منزل دور تو نہ تھی۔ حالانکہ رسمِ منگنی تھی مگر نگینہ کو تو دُلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔

میں اسے دیکھ کر مبہوت رہ گیا اور مجھے حقیقتاً اپنی قسمت پر رشک آنے لگا تھا کہ میں نگینہ جیسی معصوم، سندر، سجل اور حسین و جمیل اپسرا مثل لڑکی کا شوہر بننے والا تھا۔ محبت کی ملکیت کے الوہی احساس تلے میرا دل فخر سے لبریز ہوگیا۔ نگینہ کو دُلہن کی طرح سجانے اور اہتمام کرنے میں سارا ہاتھ کاشانہ کا ہی تھا۔ یہ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ اس نے منگنی سے دو دن پہلے ہی یہاں ڈیرے جما لئے تھے۔ وہ خود بھی بہت بنی سنوری ہوئی تھی اور خاصی پُرکشش نظر آرہی تھی۔

نگینہ کو گہرے سبز رنگ کا ریشمی شرارے والا لباس پہنایا گیا تھا جس پر زرتار کا خوب صورت کام کیا ہوا تھا۔ میک اپ بھی بڑا مناسب کیا گیا تھا۔ نگینہ کے چہرے پر حسن سے زیادہ حیا کی سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ کاشانہ نے بے اختیار بے تکلفی کے ساتھ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے نگینہ کے ساتھ صوفے پر بٹھا دیا تھا۔

میں نے بھی موقع کی مناسبت سے اپنی تیاری کررکھی تھی۔ لارنس پور کا تھری پیس کشمشی سوٹ زیب تن کر رکھا تھا میں نے اور بالوں میں ''ہیئر جیل'' لگا کر الٹی کنگھی کر رکھی تھی۔

ماں نے بھی ہلکے آسمانی رنگ کی ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی اور ہمیشہ کی طرح باوقار نظر آرہی تھیں۔ جبکہ انکل اعظم خان نے گرے کلر کا سفاری سوٹ پہن رکھا تھا۔

کاشانہ کی تو ادا ہی اسی کی طرح نرالی تھی۔ اس نے اسکن ٹائٹ آسان اُردو میں ''تنگ موریوں'' والی پتلون پہن رکھی تھی جو اس کی گوری گوری اور بھری بھری پنڈلیوں کو جکڑے ہوئے تھیں۔ اوپر گلابی رنگ کا ڈھیلا ڈھالا کُرتہ تھا۔ نیچے کھسے۔ بڑا ہی عجیب گیٹ اپ تھا اس کا۔ مگر بہرحال اس کا حُسن بھی جداگانہ ہی نظر آتا تھا۔ میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

ماں نگینہ کے دائیں طرف ساتھ بیٹھ گئیں۔ جبکہ نگینہ کی خالہ رحمت خاتون میرے بائیں جانب براجمان تھیں۔ انکل اعظم بھی ایک جانب اپنی مختصر سی فیملی کے ساتھ موجود تھے۔ ماں کے چہرے سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔ نگینہ کا چہرہ گلنار تھا اور میں مسرور۔

ماں نے نگینہ کے لئے منگنی کی انگوٹھی بہت خوب صورت بنائی تھی۔

رسمِ منگنی کی ابتداء ہونے لگی۔ گانے باجے چل رہے تھے۔ ڈھولک کی تھاپ پر سکھیاں خوشی کے گیت گا رہی تھیں۔ اس کے بعد ماں نے نگینہ کو انگوٹھی پہنا دی۔ بڑی خوشی اور محبت کے ساتھ اسے اپنے ساتھ بھینچ کر اس کا بوسہ بھی لے لیا۔

رات گئے ہم وہاں سے فارغ ہوئے۔ تین دن بعد شادی تھی۔ رسمِ حنا باقی تھی اور سب کچھ معمول کے

مطابق ہورہا تھا۔ اور بظاہر سب کچھ ٹھیک ہی معلوم ہوتا تھا۔ نگینہ کا شادی کے بعد رخصتی وغیرہ کا انتظام کسی ''میرج ہال'' کے بجائے اپنی ہی رہائش گاہ پر منعقد کرانے کا اصل مقصد یہی تھا کہ وہاں اس کا باپ شاہ میر تھا۔ جو ظاہر ہے، بستر پر تھا۔ بہرطور ہمیں کوئی اعتراض نہ تھا۔ جبکہ ہم نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ میری دعوتِ ولیمہ کا بندوبست بھی ''گرین لاج'' کے سامنے والے وسیع و عریض سرسبز گھاس کے میدان میں تھا۔

تین دن ہوتے ہی کتنے ہیں۔ پلک جھپکتے ہی گزر گئے۔ البتہ یہ الگ بات تھی کہ میرے لئے یہ تین دن کاٹنا دوبھر ہوگیا تھا۔

نگینہ کی طرف شادی کی تقریب عروج پر تھی۔ اس کی رائش گاہ بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ نکاح ہوا، نگینہ سرخ عروسی جوڑے میں بہت ہی حسین اور پُرکشش نظر آرہی تھی۔ شادی کا ہنگامہ عروج پر تھا۔ اس کے بعد نگینہ کو میرے ہمراہ رخصت کیا گیا تو نگینہ نے باپ کے کمرے میں چلنے کی خواہش کی۔ ہم اس کے کمرے میں پہنچے۔ نگینہ بے اختیار بستر پر زندہ لاش کی مثل اپنے باپ شاہ میر کے وجود سے لپٹ کر رو دی۔ میرا دل پسیج گیا۔ ماں بھی ہمارے ساتھ وہاں موجود تھی۔ نگینہ نے اشک بار چہرے اور گلوگیر لہجے کے ساتھ باپ سے کہا۔

''پپا!.........کاش آپ مجھے اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر آج رخصت کرتے۔ کاش.........کاش اس وقت کوئی معجزہ ہو جائے پاپا!'' وہ اپنی رو میں کہے جارہی تھی۔ میری نظریں شاہ میر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جہاں مجھے ہلکے سے غیر محسوس ارتعاش کا احساس ہوا۔ اس کے بعد میں نے شاہ میر کی آنکھیں بھیگتے دیکھیں تو میں نے دھیرے سے نگینہ کے کاندھے پر ہاتھ دھرا اور کہا۔

''نگینہ! تمہارے پپا کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ وہ تمہیں وداع کررہے ہیں۔''

نگینہ چونک کر اپنے باپ کا چہرہ دیکھنے لگی۔ پھر اس کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو دیکھ کر مزید رو پڑی۔ ٹھیک اسی وقت ماں آگے بڑھی۔ اس نے آہستگی سے شاہ میر کا بے جان سا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور نگینہ کے سر پر رکھ دیا۔ نگینہ نے چونک کر سر اٹھایا تو ماں کو اپنے باپ کا بے جان ہاتھ پکڑے اپنے سر پر رکھتے دیکھا تو بے اختیار ماں سے لپٹ کر رو پڑی۔

''بیٹی! دل چھوٹا مت کر.........سب کی کوششوں سے ایک دن شاہ میر اپنے قدموں پر ضرور کھڑا ہوگا۔ یہ میں کہہ رہی ہوں۔ تمہاری ماں.........یہ میرا وعدہ ہے۔''

ماں نے پُرعزم لہجے میں کہا اور نگینہ کو کچھ ڈھارس بندھی تو ماں نے مجھ سے پوچھا۔

''نادر بیٹے! شاہ میر کو گرین لاج پہنچانے کا تم نے بندوبست کرلیا ہے.........یہ بھی ہمارے ساتھ جائیں گے۔''

''جی امی!'' میں نے ہولے سے کہا۔ ''انکل اعظم نے انہیں اپنی گاڑی میں لے جانے کا پورا انتظام کر رکھا ہے۔ بس وہ وہیل چیئر لے کر آتے ہی ہوں گے۔''

اس کے بعد ہم تینوں مہمانوں کے جھرمٹ میں رہائش گاہ کے وسیع احاطے میں آگئے تو اچانک میری نگاہ سامنے کھڑے کبیر پر پڑی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں گلاب کے پھولوں کا ایک بڑا سا گلدستہ تھا اور چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ۔ کبیر جیسے زہریلے سنپولیے کو یوں اچانک اور غیر متوقع طور پر اس اہم موقع پر پا کر میرے اندر اندیشناک وسوسوں کے سانپوں نے کلبلانا شروع کردیا۔ نگینہ اور ماں کی بھی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

''نگینہ!.........تم نے مجھے اپنی شادی پر نہیں بلایا۔ دیکھو، میں خود ہی آگیا۔ تمہیں مبارک باد دینے۔''

اس کے لہجے میں شکست خوردگی تھی۔

اچانک میری نگاہ اس کے ہاتھوں میں تھمے ہوئے گلدستے پر پڑی تو مجھے گلاب کی پتیوں سے جھانکتی ہوئی مہیب نال کی جھلک نظر آئی جس کا رخ نگینہ کے سینے کی طرف تھا۔ میرے تن بدن میں جیسے سنسنی کی تیز لہر دوڑ گئی۔ اور پھر اس سے پہلے کہ میں حرکت کرتا، ایک دھماکا ہوا اور نال نے آتشیں شعلہ اُگلا......... نگینہ کے حلق سے کرب ناک چیخ بلند ہوئی۔ گولی کی بھیانک قربت نے اس کے سینے کو پل بھر میں رنگین بنا دیا۔

اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ اُبھری اور بے اختیار اسے گرنے سے سنبھالنے کو میرے دونوں ہاتھ آگے بڑھے اور وہ ان میں جھول گئی......... کبیر کے ہاتھوں سے گلدستہ چھوٹ کر گر چکا تھا۔ اب پستول کی دھواں اُگلتی نال کا رخ میری جانب تھا۔ اس پر شدید دیوانگی کا دورہ طاری تھا اور وہ اسی لہجے میں بولا۔

''نادر!......... میں ہار گیا۔ مگر میں نے تمہیں بھی جیتنے نہیں دیا۔ تم بھی اب نگینہ کے ساتھ اوپر آسمانوں میں سہرا سجاؤ۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنی نال کا رخ میری جانب موڑا تو اچانک ماں سامنے آگئیں......... گولی چلنے کا دوسرا دھماکا ہوا اور ماں کے حلق سے کرب ناک چیخ خارج ہوگئی۔

میرا سکتہ ٹوٹا اور پھر جیسے میرے اردگرد آتش فشاں کھولتا ہوا لاوا اُگلنے لگے۔ میں جنونی انداز میں کبیر پر جھپٹا اور اس کے ہاتھ سے پستول جھپٹ کر اسے دھکا دیا اور پستول میں جتنی بھی گولیاں تھیں اس پر صرف کر ڈالیں۔

مرتے وقت بھی کبیر کے چہرے پر عجیب سی طمانیت آمیز مسکراہٹ تھی۔ مہمانوں میں زبردست چیخ و پکار اور بھگدڑ مچ گئی۔

میں نے بیک وقت خون میں لت پت ماں اور نگینہ کو سنبھال لیا تھا۔ ماں شاید دم توڑ چکی تھیں۔ مگر نگینہ میں ابھی چند سانسیں باقی تھیں اور مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میری سانسیں جیسے نگینہ کی سانسوں کی ٹوٹتی ڈور کے ساتھ نتھی ہو چکی تھیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری کائنات میرے ہاتھوں میں دم توڑ رہی ہو۔ میرے اندر دل و دماغ میں وحشتوں کے سناٹے چیخ رہے تھے۔

میں نے فوراً نگینہ کو اٹھانا چاہا۔ مگر نگینہ نے ٹوٹتی لرزتی آواز میں کہا۔

''نن......... نادر!......... مم......... مجھے آ......... آخری لمحات میں اپنے بازوؤں سے......... خود سے الگ نہ کرو......... آہ.........''

''نن......... نگینہ! تت......... تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ مم......... میں......... تمہیں.........'' مجھ سے بولا نہ گیا۔ لفظ ٹوٹنے لگے۔ نگینہ کے لبوں نے جنبش کی۔

''میری قسم تمہیں......... نن......... نادر!......... مم......... مجھے اپنے ساتھ بھینچ لو......... مم......... میری سانسیں اُکھڑ رہی ہیں......... مم......... مجھے اپنے سینے سے لگالو......... پپ......... پلیز!''

اس کا دم رکنے لگا۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ میں نے اسے اپنے سینے سے بھینچ لیا۔

''نگینہ!......... تت......... تم مجھے......... چھچ......... چھوڑ کر نہیں جا سکتیں......... تت......... تم......... یہ......... مم......... میرے ساتھ بے وفائی نہیں.........''

میں نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک میں نے محسوس کیا کہ جیسے نگینہ کے نرم و نازک وجود میں ایک ٹھہراؤ آ گیا ہو۔ اس کا وجود ابدی سکوت میں ڈوب گیا تھا۔ میں سرتا پا لرز گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے آسمان ٹوٹ گیا ہو۔ جیسے......... جیسے زمین ہل گئی ہو......... جیسے قیامت آ گئی ہو......... اور سب کچھ ختم ہو گیا ہو۔

میں نے عالم وحشت کے سے انداز میں نگینہ کے چہرے کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ مگر ہرادل نہیں مان رہا تھا کہ نگینہ مر چکی تھی۔ وہ......... وہ مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو کر کبھی نہ لوٹنے والے فر پر جا چکی تھی اور اپنی ان مٹ یادیں، کبھی نہ بھرنے والے زخموں کی صورت میں میرے لئے چھوڑ چکی ی۔ لیکن......... میں یہ کیسے یقین کرلوں......... کہ نگینہ مر چکی تھی۔

''نن......... نہیں......... نہیں......... نگینہ!......... تت......... تم مجھے چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہو؟......... پس آجاؤ......... واپس لوٹ آؤ۔''

مجھ پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا۔ میں دیوانوں کی طرح چلانے لگا۔ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے ا۔ میرے اعصاب منتشر ہو رہے تھے۔ میرے حواس میرا ساتھ چھوڑنے لگے تھے۔ میری جان نکل رہی ی۔ میں پاگل ہو رہا تھا، ادھ موا ہو رہا تھا۔ میں......... نادر علی خان......... مضبوط اعصاب اور دل ردے کا مالک، نامی گرامی بدمعاشوں اور خطرناک ترین دشمنوں کو پچھاڑنے والا نادر علی خان جیسے زندہ گور ہو رہا تھا۔ نگینہ کی لاش کو خود سے لپٹائے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا......... اور پھر مجھے چھ ہوش نہ رہا۔

***

ماں اپنی بہو کو عروسی جوڑے میں لے جانے کی بجائے کفن پہنائے اپنے ساتھ آخری سفر پر جا چکی تھیں......... دوہرے غموں کی اذیت ناکیوں کو زخم ناسور کی طرح سہنے کے لئے میں نے دوبارہ آنکھیں کھول دی تھیں۔

ہسپتال سے لے کر پولیس اسٹیشن کی کارروائیاں نمٹائی جانے لگیں۔ مگر مجھے تو جیسے ہوش ہی نہ تھا۔ میرے ساتھ انکل اعظم خان اور کاشانہ تھے۔

کبیر میرے ہاتھوں جہنم واصل ہو چکا تھا اور نظر حیات اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کے بعد پاگل ہو چکا تھا۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو چکا تھا اور اسے پاگل خانے میں ایڈمٹ کر دیا گیا تھا۔

نگینہ اور ماں کی تدفین گرین لاج کے عقبی گوشے میں عمل میں لائی گئی تھی۔

چوتھے روز پتہ چلا کہ پاگل خانے میں نروس بریک ڈاؤن کے دوران نظر حیات کے دماغ کی نس پھٹ جانے کے باعث اس کی بھی موت واقع ہو چکی تھی۔

یہ پانچویں روز کا ذکر تھا۔

مجھے چپ سی لگ گئی تھی۔ میرے اندر سناٹے آن بسے تھے۔ مجھے کھانے پینے تک کا ہوش نہیں رہا تھا۔ دن میرا زیادہ وقت گرین لاج کے پچھواڑے ماں اور نگینہ کی قبروں کے قریب بیٹھے ان پر ہر روز نئے، تازہ پھول چڑھانے، پانی کا چھڑکاؤ کرنے میں گزرتا تھا۔ انکل اعظم خان اور بالخصوص کاشانہ مجھے اپنے تئیں مقدور بھر سنبھالے ہوئے تھے۔

مگر میں نگینہ اور ماں کی جدائی کا غم بھلا کیسے بھلا سکتا تھا؟......... یہ زخم تو اب میرے جسم و جاں کا حصہ بن چکا تھا جو بھلائے نہیں بھولتا۔

ایک روز میں سرمائی دھوپ میں نگینہ اور ماں کی قبروں کے قریب زمین پر گم صم بیٹھا تھا کہ مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ جانے کون دھیرے دھیرے چلتا ہوا میرے عقب میں آن کھڑا ہوا تھا۔

مجھے کچھ ہوش نہ تھا۔ میری مہجور و غمگسار نظریں نگینہ کی قبر پر مرتکز تھیں کہ اچانک کسی نے میرے دائیں کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں جیسے بے حس ہو گیا تھا۔ جب میں کچھ نہ بولا تو مجھے ایک لرزتی آواز سنائی دی۔

''نن.........نادر! پلیز.........خود کو سنبھالو۔''

اس آواز پر میں ذرا چونکا تھا۔ مگر میری یک ٹک اور گم صم نظریں نگینہ کی قبر سے نہیں ہٹتی تھیں۔ تاہم بے اختیار میرے کپکپاتے ہونٹوں سے برآمد ہوا۔

''میں زندہ ہوں.........نگینہ کے بغیر.........کیا یہ کافی نہیں؟''

''شاید!'' وہ ہولے سے بولی تھی۔ پھر میرے قریب زمین پر بیٹھ گئی۔ ''نادر! مجھے احساس ہے تمہارے غم کا۔لل.........لیکن کیا مرنے والوں کے ساتھ مرا جاتا ہے؟''

''نہیں.........لیکن میں مر رہا ہوں۔'' میرے لہجے میں شکستگی تھی۔

''مم.........مگر میں تمہیں ایسے نہیں مرنے دوں گی۔'' وہ بولی۔

میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں بھی میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

میں نے کہا۔ ''اب میں کس کے سہارے جیوں گا؟''

''نادر.........!'' وہ ہولے سے بولی۔ ''میں تمہارے غم کا مداوا تو نہیں کر سکتی.........اور نہ ہی نگینہ جیسی محبت تمہارے دل میں جگا سکتی ہوں۔لل.........لیکن تم نے مجھے دوست تو کہا تھا نا.........تو کیا دوستی کے ناتے ہی سہی.........میں تمہارا سہارا نہیں بن سکتی؟.........کیا دوستی کے ناتے، دوستی کا حق بھی نہیں ادا کر سکتی میں؟''

اس کی بات پر میں نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔

''لیکن میں نگینہ کو پھر بھی نہیں بھلا سکتا کاشانہ! تم خود کو اس صلیب پر نہ چڑھاؤ۔''

''مگر میں تمہیں چھوڑ کر بھی تو.........'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ مگر میں اس کی ادھوری بات کا مطلب سمجھ کر خاموش ہو رہا۔ وہ پھر بڑے رسان سے بولی۔

''تمہاری خاطر نادر!.........مجھے سب کچھ عزیز ہے۔ بس یوں سمجھو، میں ایک ٹوٹے ہوئے اور بکھرے ہوئے نسان کو سمیٹنا چاہتی ہوں۔ اپنی خاطر نہ سہی، نگینہ کی خاطر ہی سہی۔ تم خود بتاؤ، تمہاری ایسی حالت پر نگینہ کی روح کو تکلیف نہیں ہو رہی ہو گی؟.........اور پھر تمہاری ماں کی روح، اپنے لخت جگر کی اس حالت پر سکون حاصل کر سکتی ہے؟.........پلیز نادر!.........پلیز! میرا ہاتھ تھام لو.........محبت کے لئے نہ سہی محبت کی روح کے سکون کی خاطر.........اس دوستی کا ہاتھ تھام لو، جو عمر بھر قائم رہے گی۔''

اتنا کہہ کر اس نے اپنی نگاہیں جھکا دیں۔ میں یک ٹک اس کا چہرہ تکنے لگا۔

اس کا ہاتھ ابھی تک میرے کاندھے پر دھرا پڑا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کون سی غیبی طاقت تھی جس نے میرا ہاتھ اٹھا کر اپنے کاندھے پر دھرے کاشانہ کے ہاتھ پر رکھ دیا تھا.........!

(ختم شد)